



# مُنْتَخَبُ التَّوَارِيخِ

اُردو ترجمہ مع ضروری تشریحات

تصنیف

مُلا عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی

ترجمہ

محمود احمد فاروقی



ہندوستان کے شاہان اسلام کا تذکرہ  
محمود غزنوی سے عہد اکبری تک



# منتخب التواضع

اردو ترجمہ مع ضروری تشریحات

تصنیف

ملا عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی

ہندوستان کے شاہان اسلام کا تذکرہ، محمود غزنوی سے عہد اکبری تک

(کامل ۳ حصے)

مترجم

محمود احمد فاروقی

ناشران

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز،

۱۹۹۔ سرکر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۵۴۰۰۰





### جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز محفوظ ہیں۔ اس کتاب کا مکمل یا کوئی بھی حصہ کسی طرح بھی نقل نہیں کیا جاسکتا۔ اشاعت کی غرض سے مکمل یا جزوی طور پر اس کی فوٹو کاپی بھی نہیں کی جاسکتی۔ خلاف ورزی کرنے والے کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

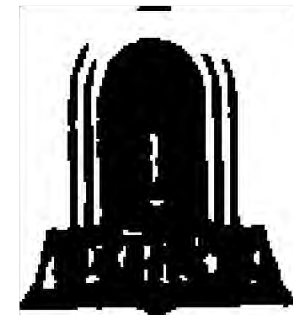
### ALL RIGHTS ARE RESERVED

No part of this book may be reproduced or utilized in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying and recording or by any information storage and retrieval system, without the written permission of the publisher.

طابع: شیخ نیاز احمد

مطبع: غلام علی پرنٹرز اشرفیہ پارک

فیروز پور روڈ لاہور



### مقام اشاعت:

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

199-سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور-54000



# فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	<b>جلد اول</b>	۲۷		<b>طبقتہ دوم — غوری عہد حکومت</b>	۵۴
۱	حمد و نعت اور سبب تالیف کتاب	۳۹	۲۱	سلطان معز الدین المعروف بہ سلطان شہاب الدین غوری	۵۴
۲	حمد	۳۹	۲۲	سلطان قطب الدین ایبک	۵۸
۳	نعت	۳۹	۲۳	سلطان آرام شاہ بن قطب الدین ایبک	۶۴
۴	علم تاریخ	۳۹	۲۴	سلطان شمس الدین التمش المتخاطب بہ یمین امیر المومنین	۶۴
۵	سبب تالیف کتاب	۳۱	۲۵	سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن شمس الدین التمش	۶۸
	<b>طبقتہ اول — غزنوی عہد حکومت</b>	۳۵	۲۶	سلطانہ رضیہ بنت سلطان شمس الدین التمش	۷۰
۶	سلطان محمود بن ناصر الدین بکتگین	۳۶	۲۷	سلطان معز الدین بہرام بن شمس الدین التمش	۷۱
۷	سلطان محمد بن سلطان محمود غزنوی	۴۲	۲۸	سلطان علاؤ الدین مسعود شاہ بن رکن الدین فیروز شاہ	۷۳
۸	شہاب الدولہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی	۴۲	۲۹	سلطان ناصر الدین محمود بن شمس الدین التمش	۷۴
۹	سلطان مودود بن مسعود بن محمود غزنوی	۴۶	۳۰	سلطان غیاث الدین بلبن خورور	۷۸
۱۰	سلطان مسعود بن مودود بن مسعود بن محمود غزنوی	۴۷	۳۱	امیر خسرو کی گرفتاری	۸۱
۱۱	سلطان علی بن مسعود بن محمود غزنوی	۴۷	۳۲	بلبن کی وفات	۸۱
۱۲	سلطان عبدالرشید بن محمود غزنوی	۴۷	۳۳	سلطان معز الدین کی قیادت	۸۲
۱۳	سلطان فرخ نادر بن مسعود بن محمود غزنوی	۴۸	۳۴	تخت نشینی کا دربار	۸۲
۱۴	سید السلاطین ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی	۴۸	۳۵	کیقباد کی عیش پسندی	۸۳
۱۵	علاؤ الدین مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود	۴۹	۳۶	باپ اور بیٹے کی ملاقات	۸۳
۱۶	سلطان شیر نادر بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود	۴۹	۳۷	آخری نصیحت	۸۴
۱۷	سلطان ارسلان شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود	۵۰	۳۸	شمس الدین کی تخت نشینی	۸۵
۱۸	سلطان بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم	۵۰	۳۹	شائستہ خاں کی بغاوت	۸۵
۱۹	خسرو شاہ بن بہرام شاہ	۵۲	۴۰	کیقباد کا انجام	۸۶
۲۰	خسرو ملک ابن خسرو شاہ	۵۳	۴۱	سلطان شمس الدین کی کاؤس	۸۶



## خاندان خلجی

سلطان جلال الدین خلجی :

شہر نو کی تعمیر

ملک چبچو کی مشاورت

سیدی مولا جلدیش

سیدی مولا کی شہادت

نوسلم مغل

علاؤ الدین کی غلام پسندی

دکن کی فتح

علاؤ الدین کی واپسی

علاؤ الدین کی سازش

جلال الدین دام میں

سلطان جلال الدین کا قتل

قدر خاں کی تخت نشینی

دہلی پر قبضہ

جلال الدین کے عہد کے شاعر

سلطان علاؤ الدین خلجی :

ملتان پر فوج کشی

مغلوں کا پہلا حملہ

مغلوں کا دوسرا حملہ

مغلوں کا تیسرا حملہ

مغلوں کا چوتھا حملہ

مغلوں کا پانچواں حملہ

شراب کی ممانعت

علاؤ الدین کی خام خیالیاں

گجرات پر فوج کشی

رنتھمبور کا معرکہ

چتوڑ کی فتح

شاہزادہ کی وفات

علاؤ الدین خطرہ میں

حاجی مولا کی بغاوت

چار نکاتی لائحہ عمل

نرخوں کا تعین

مالوہ پر حملہ

قلعہ سورت پر حملہ

دکن پر ملک کافور کا حملہ

درنگل کی تسخیر

علاؤ الدین کی علالت

علاؤ الدین کا انتقال

امیر خسرو اور امیر حسن

سلطان شہاب الدین خلجی

سلطان قطب الدین خلجی :

خضر خاں کا قتل

دیوگیر پر حملہ

سلطان قطب الدین کی بد اعمالی

حسام الدین کی سرکشی

دکن پر خسرو خاں کا حملہ

خسرو خاں کا اقتدار

آخری عبرت انگیز بات

ناصر الدین خسرو خاں :

ہندوؤں کا غلبہ

غازی الملک میدان میں

غازی الملک کا حملہ

خسرو خاں مقابلہ پر



۱۴۳	محمّد تغلق کی پریشانیوں	۱۲۱	۱۱۹	خسرو خاں کی شکست	۹۵
"	محمّد تغلق کی غلطیاں	۱۲۲	۱۲۰	خاندان تغلق	
۱۴۴	خونی شاہ	۱۲۳	"	سلطان غیاث الدین تغلق شاہ	۹۶
"	شیخ زادہ جام کی حتی گوتی	۱۲۴	۱۲۱	ایخ خاں کی فوج کشی	۹۷
۱۴۵	ٹھٹھہ پر چڑھائی	۱۲۵	۱۲۲	بنگالہ کی مہم	۹۸
"	محمّد تغلق کی وفات	۱۲۶	۱۲۴	تغلق کی وفات	۹۹
۱۴۶	سلطان فیروز شاہ	۱۲۷	۱۲۵	مہنوز دہلی دوراست	۱۰۰
"	حضرت چوراغ دہلوی	۱۲۸	۱۲۵	سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ	۱۰۱
۱۴۷	مغلوں کی شورش	۱۲۹	۱۲۶	دکن پر فوج کشی	۱۰۲
۱۴۸	خواجہ جہاں کی اطاعت	۱۳۰	"	دار الخلافہ کی منتقلی	۱۰۳
"	فیروز شاہ کی تخت نشینی	۱۳۱	۱۲۷	بیرام اللہ کی بغاوت	۱۰۴
"	لکھنوی پر حملہ	۱۳۲	"	مغلوں کا حملہ	۱۰۵
۱۴۹	ہنروں کی کھدائی	۱۳۳	۱۲۸	سلطان کی سخت گیری	۱۰۶
"	فرمان خلافت	۱۳۴	"	دہلی کی خانہ ویرانی	۱۰۷
"	بنگالہ کے معاملات	۱۳۵	"	تہنچے کا سکہ	۱۰۸
۱۵۰	ہاتھیوں کا شکار	۱۳۶	۱۲۹	کوہ ہمالیہ کی مہم	۱۰۹
"	نہر سیلجہ	۱۳۷	۱۳۰	بنگالہ کی شورشیں	۱۱۰
"	نگر کوٹ کا کوسہستان	۱۳۸	۱۳۱	بنگالہ کا پہلا سلطان	۱۱۱
۱۵۱	قدیم کتابیں	۱۳۹	۱۳۳	دکن کی بغاوت	۱۱۲
"	ٹھٹھہ پر فوج کشی	۱۴۰	۱۳۴	کھوکھروں کی بغاوت	۱۱۳
۱۵۲	فوزیہ اور شاہزادہ کی رحلت	۱۴۱	"	دہلی کو واپسی	۱۱۴
"	شمس الدین کی بغاوت	۱۴۲	۱۳۶	فرمان خلافت	۱۱۵
"	امادہ پر فوج کشی	۱۴۳	۱۳۸	دکن کے باغی	۱۱۶
۱۵۳	سامانہ اور سنتور کی مہم	۱۴۴	۱۳۹	عین الملک کی بغاوت	۱۱۷
"	کیتھل کی مہم	۱۴۵	۱۴۰	ارسلے صدہ کی سرکشی	۱۱۸
"	قلعہ فیروز پور کی تعمیر	۱۴۶	۱۴۱	دولت آباد پر حملہ	۱۱۹
"	خان جہاں کی فتنہ پردازی	۱۴۷	۱۴۲	حسن کاٹھو بہمنی	۱۲۰



۱۶۶	خضر خاں اور سارنگ خاں	۱۴۵	۱۵۴	خان جہاں کی شکست	۱۴۸
"	سارنگ خاں کی شکست	۱۴۶	"	فیروز شاہ کی گوشہ نشینی	۱۴۹
"	مغلوں کا حملہ	۱۴۷	"	خان جہاں کا قتل	۱۵۰
۱۶۷	اقبال خاں کی حوصلہ افزائی	۱۴۸	"	امیرانِ صده کا فساد	۱۵۱
۱۶۸	ہندوستان پر امیر تیمور کا حملہ	۱۴۹	"	لشکر یوں کی بغاوت	۱۵۲
۱۷۰	تیموری لشکر دو آبہ میں	۱۸۰	۱۵۵	فیروز شاہ میدانِ جنگ میں	۱۵۳
"	سلطان محمود کا فرار	۱۸۱	"	فیروز شاہ کی وفات	۱۵۴
"	تیمور دہلی میں	۱۸۲	"	عہدِ فیروز شاہی کے شاعر	۱۵۵
"	شیخ احمد کشو	۱۸۳	"	ملک احمد کی اصلاحیں	۱۵۶
۱۷۱	لاہور پر تیمور کا حملہ	۱۸۴	۱۵۷	سلطان تغلق شاہ	۱۵۷
"	تیمور کی واپسی	۱۸۵	۱۵۸	سلطان ابوبکر شاہ بن ظفر خاں:	۱۵۸
۱۷۳	ہندوستان کی طوائف الملوکی	۱۸۶	"	سامانہ کے امیرانِ صده	۱۵۹
"	اقبال خاں کی کارروائیاں	۱۸۷	"	دہلی پر محمد شاہ کی چڑھائی	۱۶۰
۱۷۵	سلطان محمود دہلی میں	۱۸۸	"	محمد شاہ اور ابوبکر شاہ کا مقابلہ	۱۶۱
۱۷۶	تاتار خاں کی ہلاکت	۱۸۹	۱۵۹	ہمایوں خاں کا حملہ اور شکست	۱۶۲
۱۷۷	اقبال خاں کا انجام	۱۹۰	"	ایک شہر "رودباد شاہ"	۱۶۳
"	سلطان محمود کی دوبارہ تخت نشینی	۱۹۱	"	دہلی پر محمد شاہ کا قبضہ	۱۶۴
"	دہلی پر سلطان ابراہیم کا حملہ	۱۹۲	۱۶۰	سلطان محمد بن فیروز شاہ:	۱۶۵
"	دہلی پر خضر خاں کا حملہ	۱۹۳	"	بغاد میں	۱۶۶
۱۷۸	خضر خاں کا دہلی پر دوسرا حملہ	۱۹۴	"	محمد شاہ کی علالت	۱۶۷
"	سلطان محمود کی وفات	۱۹۵	۱۶۱	سلطان علاؤ الدین بن سکندر شاہ	۱۶۸
"	محمد محمودی کے شاعر	۱۹۶	"	سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ:	۱۶۹
۱۷۹	ہولت خاں اور خضر خاں کے مقابلے	۱۹۷	"	خواجه جہاں کی مساعی	۱۷۰
۱۸۰	دہلی پر خضر خاں کا تیسرا حملہ	۱۹۸	۱۶۲	سارنگ خاں کا حملہ	۱۷۱
"	سلطان خضر خاں بن ملکہ اشرف:	۱۹۹	۱۶۳	مقرب خاں اور سعادت خاں	۱۷۲
"	خضر خاں کا خاندان	۲۰۰	۱۶۵	نصرت شاہ	۱۷۳
"	"نریات اعلیٰ"	۲۰۱	"	شہر نچ کے بادشاہ	۱۷۴



۱۹۰	جسرت اور شیخ علی کا قرار	۲۲۹	۱۸۱	تاج الملک کی فرج کشی	۲۰۲
"	مخدوم جہاں کی وفات	۲۳۰	"	شہزادہ مبارک	۲۰۳
"	جسرت کی دوبارہ پسپائی	۲۳۱	۱۸۲	گوالیار اور بیانہ پر حملہ	۲۰۴
"	شیخ علی کا تیسرا حملہ	۲۳۲	"	ترکوں کی سرکشی	۲۰۵
"	شیخ علی کا لاہور پر قبضہ	۲۳۳	"	گوالیار پر خضر خاں کا حملہ	۲۰۶
۱۹۱	شیخ علی کی کابل کو واپسی	۲۳۴	"	شاہی لشکر کے اقدامات	۲۰۷
"	سرفار الملک کی سازش	۲۳۵	"	بادشاہ کے خلاف بغاوت	۲۰۸
"	شہر مبارک آباد	۲۳۶	"	نعلی سارنگ خاں	۲۰۹
"	مبارک شاہ کی ہلاکت	۲۳۷	۱۸۳	تاج الملک کا انتقال	۲۱۰
۱۹۲	سلطان محمد شاہ بن فرید خاں :	۲۳۸	"	میوات اور گوالیار پر حملہ	۲۱۱
"	سروار الملک کا اقتدار	۲۳۹	"	خضر خاں کی وفات	۲۱۲
"	امیروں کی بغاوت	۲۴۰	"	سلطان مبارک شاہ بن خضر خاں :	۲۱۳
"	کمال الملک کی بغاوت	۲۴۱	"	جسرت کھوکھر کی بغاوت	۲۱۴
۱۹۳	باغی امیروں کا دہلی پر حملہ	۲۴۲	۱۸۵	لاہور کی آباد کاری	۲۱۵
"	سروار الملک کا قتل	۲۴۳	"	لاہور پر جسرت کی بیخودش	۲۱۶
"	مفسد کفتریوں کا انجام	۲۴۴	۱۸۶	شمس آباد پر بیخوار	۲۱۷
"	محمد شاہ کی مستقل حکمرانی	۲۴۵	"	الپ خاں کی سرکشی	۲۱۸
"	ہٹان کا سفر	۲۴۶	"	ہندوستان کا قتل	۲۱۹
۱۹۴	فتنوں کا آغاز	۲۴۷	۱۸۷	گوالیار کے سلاطین کی اطاعت	۲۲۰
"	محمود علی کا دہلی پر حملہ	۲۴۸	"	ملک شرقی سے مقابلہ	۲۲۱
۱۹۵	بہلول لودھی کا دہلی پر حملہ	۲۴۹	"	ملک شرقی کا قرار	۲۲۲
"	سلطان محمد شاہ کی وفات	۲۵۰	۱۸۸	حاکم بیانہ کی اطاعت	۲۲۳
"	علاء الدین بن محمد شاہ :	۲۵۱	"	قولاد کی فتنہ انگیزی	۲۲۴
"	بہلول لودھی کے منصوبے	۲۵۲	"	شیخ علی حاکم کابل کا حملہ	۲۲۵
۱۹۶	بدایوں کا سفر	۲۵۳	۱۸۹	شیخ علی کی شکست اور قرار	۲۲۶
"	بہلول لودھی کا دہلی پر قبضہ	۲۵۴	"	جسرت کی سرکشی	۲۲۷
"	علاء الدین شاہ کی بے نیازی	۲۵۵	"	شیخ علی کا دوسرا حملہ	۲۲۸



۲۰۹	حاکم دہلی کی سرکشی	۲۸۲	۱۹۸	سلطان علاؤ الدین کی وفات	۲۵۶
"	دھول پور کی مہم	۲۸۳	۱۹۹	خاندان لودھی	
۲۱۰	سید محمد ہمدی	۲۸۴	"	سلطان بہلول بن کالا لودھی	۲۵۷
۲۱۱	تباہ کن زلزلہ	۲۸۵	۲۰۰	محمود شرقی کا دہلی پر حملہ	۲۵۸
"	اونٹ گڑھ اور نردور کی فتح	۲۸۶	"	شمس آباد پر قبضہ	۲۵۹
"	نعمت خاتون	۲۸۷	"	بہلول کا خون پوندہ پر حملہ	۲۶۰
"	آگرہ کو واپسی	۲۸۸	۲۰۱	سلطان حسین اور بہلول کی صلح	۲۶۱
۲۱۲	محمد خاں ناگوری کی اطاعت	۲۸۹	"	تین سالہ التوائے جنگ	۲۶۲
"	چندی ری کا الحاق	۲۹۰	"	سلطان حسین کا دہلی پر حملہ	۲۶۳
"	سید نعمت اللہ حسینی	۲۹۱	"	سلطان حسین کا بدایوں پر قبضہ	۲۶۴
"	دولت خاں کی اطاعت	۲۹۲	"	دہلی پر دوسرا حملہ	۲۶۵
۲۱۳	سلطان سکندر لودھی کی وفات	۲۹۳	۲۰۲	بہلول کی عہد شکنی	۲۶۶
"	سکندر لودھی کی شعر گوئی	۲۹۴	"	نوبید خرابی	۲۶۷
"	عہد سکندی کے علماء	۲۹۵	"	سلطان حسین کی پسپائی	۲۶۸
"	شیخ عبد اللہ	۲۹۶	"	راپری کا معرکہ	۲۶۹
۲۱۴	شیخ عبدالعزیز طہینی	۲۹۷	"	کاپی کا معرکہ	۲۷۰
"	شیخ الدایہ	۲۹۸	۲۰۳	بہلول لودھی کا خون پور پر حملہ	۲۷۱
"	عہد سکندی کے شعراء	۲۹۹	۲۰۴	خون پور پر قبضہ	۲۷۲
۲۱۵	تذکرہ سیر العارفین	۳۰۰	"	سلطان بہلول لودھی کی وفات	۲۷۳
"	سلطان ابراہیم بن سکندر لودھی	۳۰۱	۲۰۵	سلطان سکندر بن بہلول لودھی	۲۷۴
"	جلال خاں کا دعویٰ بادشاہت	۳۰۲	"	سکندر کی تخت نشینی	۲۷۵
"	ابراہیم لودھی کی لشکر کشی	۳۰۳	"	مبارک شاہ سے مقابلہ	۲۷۶
"	جلال خاں کا اظہار اطاعت	۳۰۴	۲۰۶	بیانہ کی تسخیر	۲۷۷
۲۱۶	جلال خاں کا فرار	۳۰۵	"	بجگوٹی قوم کی بغاوت	۲۷۸
"	گوالیار کی تسخیر	۳۰۶	"	پٹنہ اور بہار پر فوج کشی	۲۷۹
"	جلال خاں کا قتل	۳۰۷	۲۰۸	قحط اور تنگدستی	۲۸۰
"	اعظم ہمایوں کی گرفتاری	۳۰۸	۲۰۹	امیروں کی سازش	۲۸۱



۲۳۳	نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ :	۳۳۵	۲۱۶	اسلام خاں کی بغاوت	۳۰۹
۲۳۴	ہمایوں کی لشکر کشی	۳۳۶	۲۱۷	امیروں سے بدگمانی	۳۱۰
۲۳۵	سلطان بہادر گجراتی	۳۳۷	"	بہادر خاں کی خود مختاری	۳۱۱
۲۳۶	سلطان بہادر سے مقابلہ	۳۳۸	"	سلطنت مغلیہ کا محرک	۳۱۲
۲۳۷	مرزا عسکری کی سرکشی	۳۳۹	"	بابر سے ہمایوں کی مراسلت	۳۱۳
۲۳۸	طہماسپ کا حملہ	۳۴۰	۲۱۸	بابر کی لشکر کی یلغار	۳۱۴
۲۳۹	شیر خاں کا فتنہ	۳۴۱	"	بابر کا ہندوستان پر حملہ	۳۱۵
۲۴۰	بنگال پر فوج کشی	۳۴۲	"	سیالکوٹ کی تباہی	۳۱۶
۲۴۱	جنت آباد میں قیام	۳۴۳	"	عالم خاں کی شکست	۳۱۷
۲۴۲	مرزا ہندال کی بغاوت	۳۴۴	"	بابر کی پیش قدمی	۳۱۸
۲۴۳	شیر خاں کا حملہ	۳۴۵	۲۱۹	شہزادہ ہمایوں کا حملہ	۳۱۹
۲۴۴	صلح کا پیغام	۳۴۶	"	پٹھانوں کی سرکوبی	۳۲۰
۲۴۵	ہمایوں کی شکست	۳۴۷	"	بابر کا توپ خانہ	۳۲۱
۲۴۶	ہمایوں کے بھائی	۳۴۸	"	بابر پانی پت میں	۳۲۲
۲۴۷	ہمایوں کی پریشانی	۳۴۹	۲۲۰	پانی پت کی پہلی خونریز لڑائی	۳۲۳
۲۴۸	بھائیوں کی نا اتفاقی	۳۵۰	"	ابراہیم لودھی کا قتل	۳۲۴
۲۴۹	خرابی ملک دلی	۳۵۱	"	بابر دہلی میں	۳۲۵
۲۵۰	لاہور میں مشورے	۳۵۲	۲۲۱	ترک افغان سلاطین کا تین سو سالہ دورِ حکمرانی	۳۲۶
۲۵۱	ہمایوں کا فرار	۳۵۳	۲۲۲	خاندان مغلیہ	۳۲۷
۲۵۲	شہزادہ ہمایوں کا فرار	۳۵۴	"	نصیر الدین محمد بابر شاہ غازی :	۳۲۸
۲۵۳	شیر شاہ بن حسن سور	۳۵۵	۲۲۳	سنبھل پر حملہ	۳۲۹
۲۵۴	شیر شاہ کے ابتدائی حالات	۳۵۶	"	رانا سائیکا کی جدوجہد	۳۳۰
۲۵۵	شیر خاں بہار میں	۳۵۷	۲۲۴	رانا سائیکا کی شکست	۳۳۱
۲۵۶	شیر خاں مغل لشکر میں	۳۵۸	"	نقی حسن خاں	۳۳۲
۲۵۷	شیر خاں بابر کے حضور میں	۳۵۹	۲۲۵	بابر کی وفات	۳۳۳
۲۵۸	بنگال میں حوصلہ آزمائی	۳۶۰	۲۲۶	عبدالباہر کے عالم	۳۳۴
۲۵۹	سلطان محمود لودھی			بابر کی علم دوستی	۳۳۵



۲۵۹	اعظم بہاولپور کی بغاوت	۳۸۸	۲۵۰	بہاولپور اور شیر خاں کا اختلاف	۳۶۱
"	نیازیوں کی شکست	۳۸۹	"	شیر گڑھ	۳۶۲
۲۶۰	خواص خاں کا حملہ	۳۹۰	"	شیر شاہی سڑک	۳۶۳
"	خواص خاں کی ببادری	۳۹۱	"	عدل و انصاف	۳۶۴
"	سزا دل خاں کی سرکشی	۳۹۲	۲۵۱	قاضی قضیت	۳۶۵
۲۶۱	سلیم شاہ کے انتظامات	۳۹۳	"	ملو گیدی	۳۶۶
"	سلیم شاہی لاشہ عمل	۳۹۴	"	پورن مل کا قتل	۳۶۷
۲۶۲	نیازیوں کی تحقیر	۳۹۵	۲۵۲	راجہ مال دیو پر حملہ	۳۶۸
"	پٹھانوں سے بدگمانی	۳۹۶	"	جنگی تدبیر	۳۶۹
"	فرہی کا لطیفہ	۳۹۷	۲۵۳	رفیع الدین محدث	۳۷۰
۲۶۳	نیازیوں کا حشر	۳۹۸	"	شیر شاہ کے نیک ارادے	۳۷۱
"	کامران مرزا کی توہین	۳۹۹	۲۵۴	قلعہ کانجر کا محاصرہ	۳۷۲
۲۶۴	کامران مرزا کا فرار	۴۰۰	"	غیبی امداد	۳۷۳
۲۶۵	شاہ محمد دہلوی کا قصہ	۴۰۱	۲۵۵	شیر شاہ کا انتقال	۳۷۴
۲۶۶	قتل کی واردات	۴۰۲	"	شیر شاہ کی زندگی ایک نظر میں	۳۷۵
"	شیخ علائی کا واقعہ	۴۰۳	"	سلیم شاہ بن شیر شاہ سوری	۳۷۶
۲۶۷	عبداللہ نیازی کا مسلک	۴۰۴	"	سلیم شاہ کا خط	۳۷۷
۲۶۸	شیخ علائی کی تحریک	۴۰۵	۲۵۶	تخت نشینی کا جشن	۳۷۸
"	شیخ علائی کا سفر	۴۰۶	"	سلیم شاہ کی مکاری	۳۷۹
۲۶۹	علائی و دربار شاہی میں	۴۰۷	۲۵۷	عادل خاں کی دوسراندیشی	۳۸۰
۲۷۰	شیخ علائی کی تقریر	۴۰۸	"	سونے کی زنجیر	۳۸۱
"	ہمدویت پر مباحثہ	۴۰۹	"	عادل خاں کی بلیغ	۳۸۲
"	ملا جلال کا لطیفہ	۴۱۰	"	بھائیوں میں مقابلہ	۳۸۳
۲۷۱	سلیم شاہ سے گفتگو	۴۱۱	۲۵۸	جلال خاں کا قتل	۳۸۴
"	شیخ علائی کی جلا وطنی	۴۱۲	"	محمود خاں کا قتل	۳۸۵
۲۷۲	دکن میں ہمدویت	۴۱۳	"	دیوار مرگ	۳۸۶
۲۷۳	عبداللہ نیازی کا واقعہ	۴۱۴	"	کمال خاں کا قصہ	۳۸۷



۲۸۷	ہیمو کا دسترخوان	۲۸۳	شیخ نیازی لشکر شاہی میں	۲۱۵
۲۸۸	محمد خاں سود کی بغاوت	۲۸۴	شیخ نیازی کی ہمدونیت سے توبہ	۲۱۶
"	ابراہیم خاں ٹھٹھڑ میں	"	مخدوم الملک کی فتنہ پر داری	۲۱۷
"	حاکم مالوہ باز بہادر	"	علائی شیخ بدھ کی خدمت میں	۲۱۸
۲۸۹	گوریوں سے لڑائی	۲۸۵	شیخ بدھ کا خط	۲۱۹
۲۹۰	عدلی کی ہلاکت	"	شیخ علائی کی شہادت	۲۲۰
"	عدلی بہ حیثیت موسیقار	"	سلیم شاہ کا بغض	۲۲۱
"	مجاہد خاں بجگت	۲۸۶	خواص خاں کا قتل	۲۲۲
۲۹۲	ہمایوں کی ہندوستان کو واپسی	۲۸۷	سلیم شاہ پر قاتلانہ حملہ	۲۲۳
"	بکر کا معرکہ	"	ہمایوں کے خلاف لشکر کشی	۲۲۴
۲۹۴	راجہ مالدیو کا بلادا	۲۸۸	گوالبار کو واپسی	۲۲۵
۲۹۵	ہمایوں کی صحرائی دوری	"	سلیم شاہ کی بیماری	۲۲۶
"	امرکوٹ میں قیام	۲۸۹	سلیم شاہ کی وفات	۲۲۷
"	اکبر کی ولادت	"	سلیم شاہ کی طیفہ گوئی	۲۲۸
۲۹۶	بھائیوں کی سازش	۲۹۰	فیروز شاہ بن سلیم شاہ	۲۲۹
"	اکبر کی گرفتاری	"	سلطان محمد عادل عرف عدلی	۲۳۰
"	ہمایوں طہاسپ کی پناہ میں	۲۹۱	بغاوتوں کا آغاز	۲۳۱
۲۹۷	ہمایوں کی مدد	"	دربار شاہی میں ہنگامہ	۲۳۲
۲۹۸	قزلباشوں کی یلغار	۲۹۲	تاج خاں کی سرکشی	۲۳۳
"	قندھار کی فتح	"	ابراہیم خاں کی بغاوت	۲۳۴
۲۹۹	قزلباشوں کی پپائی کے سبب	"	ابراہیم اور سکندر کا مقابلہ	۲۳۵
"	قزلباشوں پر حملہ	۲۹۳	فتح آباد آسمانی شد	۲۳۶
"	کابل کی فتح	۲۹۴	ابراہیم خاں کی شکست	۲۳۷
۳۰۰	کامران سے آخری جنگ	۲۹۵	ابراہیم کی ناکامی	۲۳۸
۳۰۱	کامران کی ہمدونیت	"	ہیمو کی یلغار	۲۳۹
"	کامران کی وفات	"	ہولناک قحط	۲۴۰
۳۰۲	ہندال کا قتل	۲۹۸	قلعہ آگرہ کی آتشزدگی	۲۴۱



۳۲۸	بیرم خاں کا قصیدہ	۴۹۳	۳۰۳	مولانا زین الدین محمود	۴۶۹
"	ابو المعالی کی جان بخشی	۴۹۴	۳۰۴	ہندوستان کی طرف کوچ	۴۷۰
"	ابو المعالی کا فرار	۴۹۵	۳۰۵	سکندر سور سے مقابلہ	۴۷۱
۳۲۹	سکندر سے مقابلہ	۴۹۶	"	پٹھانوں کی شکست	۴۷۲
"	پٹھانوں سے مقابلہ	۴۹۷	۳۰۷	غازی محمد خاں کا قتل	۴۷۳
۳۳۰	ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ	۴۹۸	"	قبر دیوانہ	۴۷۴
۳۳۱	تردی بیگ کا قتل	۴۹۹	۳۰۸	ہمایوں کی وفات	۴۷۵
"	پانی پت میں فوجوں کی آمد	۵۰۰	۳۰۹	ہمایوں کی ذاتی خوبیاں	۴۷۶
"	پانی پت کی دوسری لڑائی	۵۰۱	۳۱۱	عہد ہمایوں کے شعراء	۴۷۷
۳۳۲	مغل فوج کی کامیابی	۵۰۲	"	جنوبی	۴۷۸
۳۳۳	سکندر افغان کی اطاعت	۵۰۳	۳۱۲	وفائی	۴۷۹
۳۳۴	اکبر کی لاہور کو روانگی	۵۰۴	"	نادری	۴۸۰
"	دہلی میں داخلہ	۵۰۵	۳۱۴	فارغی	۴۸۱
"	خان زماں اور شاہم بیگ کا معاشقہ	۵۰۶	"	جاہی	۴۸۲
۳۳۵	آرام جاں	۵۰۷	۳۱۶	حیدر تونی	۴۸۳
۳۳۶	شاہم بیگ کا انجام	۵۰۸	۳۱۷	طاہر دکنی	۴۸۴
"	خان زماں کی معرکہ آرائی	۵۰۹	۳۱۸	خواجہ ایوب	۴۸۵
۳۳۷	اکبر کا آگرہ میں داخلہ	۵۱۰			
۳۳۸	پیر محمد خاں کا عروج و زوال	۵۱۱	۳۲۱		
۳۳۹	شیخ گدائی کا اقتدار	۵۱۲	"		
۳۴۰	میر عبداللطیف قزوینی	۵۱۳	۳۲۳		
"	قلعہ گوالیار پر قبضہ	۵۱۴	"		
"	رختیہ پور کا قصبہ	۵۱۵	۳۲۴		
۳۴۱	قلعہ چنار کا قصبہ	۵۱۶	۳۲۵		
۳۴۲	شیخ محمد غوث گوالیاری	۵۱۷	۳۲۷		
۳۴۳	اکبر دہلی میں	۵۱۸	"		
"	بیرم خاں کے خلاف سازشیں	۵۱۹	"		

## جلد دوم

### عہد اکبری

سبب تصنیف منتخب التواریخ

فن تاریخ کی اہمیت

منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی

مصنف کے مآخذ

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ :

تخت نشینی

ابو المعالی کی سرکشی



۳۵۸	قلعہ چنارہ پر قبضہ	۵۴۷	۳۴۴	بیرم خاں کی مکہ کو روانگی	۵۲۰
"	خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک	۵۴۸	"	ابو المعالی کی گرفتاری	۵۲۱
"	سانی درگاوتی	۵۴۹	"	بیرم خاں کا تعاقب	۵۲۲
۳۵۹	ہاتھیوں کا شکار	۵۵۰	۳۴۵	بیرم خاں کی شکست	۵۲۳
"	چنگیز خاں حاکم گجرات	۵۵۱	"	بیرم خاں کی فیاضی	۵۲۴
۳۶۰	شہر نگہ جبین کی تعمیر	۵۵۲	۳۴۷	منعم خاں کی وزارت	۵۲۵
"	صدر الصدور کا عہدہ	۵۵۳	"	بیرم خاں کی اطاعت	۵۲۶
۳۶۱	کابل پر تیسرا حملہ	۵۵۴	۳۴۸	خارجہ مغیلاں	۵۲۷
"	خواجہ حسن نقشبندی	۵۵۵	"	بیرم خاں کی شہادت	۵۲۸
۳۶۲	شیخ الاسلام فتح پوری	۵۵۶	۳۵۰	مالوہ کی فتح	۵۲۹
۳۶۳	قلعہ آگرہ کی تعمیر	۵۵۷	"	خان زماں سے بدگمانی	۵۳۰
"	اوزبک سرداروں کی بغاوت	۵۵۸	۳۵۱	اجمیر کی زیارت	۵۳۱
۳۶۴	باغیوں پر اکبر کی فوج کشی	۵۵۹	"	قلعہ میرٹھ کی تسخیر	۵۳۲
"	جون پور میں چھاؤنی	۵۶۰	"	باز بہادر کا انجام	۵۳۳
۳۶۵	آصف خاں کا فرار	۵۶۱	۳۵۲	سفیر ایران کی آمد	۵۳۴
"	قلعہ رہتاس	۵۶۲	"	ادیم خاں کی سرکشی	۵۳۵
"	صلح کی گفت و شنید	۵۶۳	۳۵۳	منعم خاں کا فرار اور گرفتاری	۵۳۶
۳۶۶	معز الملک کی فوج کشی	۵۶۴	۳۵۴	لکھنؤ کی شکست	۵۳۷
"	التوائے جنگ کی پیشکش	۵۶۵	"	مدرسہ مخس	۵۳۸
۳۶۷	معز الملک کی شکست	۵۶۶	"	کابل کے ہنگامے	۵۳۹
"	باغیوں کی اطاعت اور معافی	۵۶۷	۳۵۵	جو بک بیگم کا اقتدار	۵۴۰
۳۶۸	خان زماں کی عہد شکنی	۵۶۸	"	شاہ ابو المعالی کی بغاوت	۵۴۱
"	بادشاہ کی سالگرہ کا جشن	۵۶۹	۳۵۶	ابو المعالی کا کابل پر قبضہ	۵۴۲
"	آگرہ کو اکبر کی واپسی	۵۷۰	"	مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت	۵۴۳
۳۶۹	مرزاؤں کی بغاوت	۵۷۱	۳۵۷	دہلی میں بلبل	۵۴۴
"	حسین خاں کی مصاحبت	۵۷۲	"	قاتلانہ حملہ	۵۴۵
۳۷۰	آصف خاں کا فرار	۵۷۳	"	مرزا سلیمان کی کابل پر فوج کشی	۵۴۶



۳۹۴	حسین خاں کا سوا لک پر حملہ	۶۰۱	۳۷۰	کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ	۵۷۴
"	حسین خاں کی ناکام واپسی	۶۰۲	۳۷۱	مرزا سلیمان کی واپسی	۵۷۵
۳۹۵	بھائی اور بیٹے کا استقار	۶۰۳	"	خوش خبر خاں کی فتنہ پردازی	۵۷۶
"	مقبورہ ہمایوں کی تعمیر	۶۰۴	۳۷۲	مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ	۵۷۷
"	شاہزادہ سراو کی ولادت	۶۰۵	۳۷۳	سیرو شکار	۵۷۸
۳۹۶	قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد	۶۰۶	"	خان زمان کی دوبارہ بغاوت	۵۷۹
"	بکھر کی فتح	۶۰۷	"	مہا بھارت کی یادگار	۵۸۰
۳۹۷	اسکندر خاں اوزبک کی اطاعت و وفات	۶۰۸	"	باغیوں کے خلاف اکبر کی فوج کشی	۵۸۱
"	شیخ سلیم چشتی کی وفات	۶۰۹	۳۷۴	باغیوں پر اکبر کا حملہ	۵۸۲
"	خمیاڑہ عشق	۶۱۰	"	خان زمان کی شکست	۵۸۳
۳۹۸	بدالوں کی آتش زدگی	۶۱۱	۳۷۵	بہادر خاں کا قتل	۵۸۴
۳۹۹	گجرات پر فوج کشی	۶۱۲	۳۷۷	آگرہ میں افواہیں	۵۸۵
"	شاہزادہ دانیال کی ولادت	۶۱۳	"	قاضی طہا سی کی حق گوئی	۵۸۶
"	سروہا کی جنگ	۶۱۴	"	سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی	۵۸۷
۴۰۰	احمد آباد کی فتح	۶۱۵	۳۷۸	چتوڑ کے قلعہ پر حملہ	۵۸۸
"	ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ	۶۱۶	۳۷۹	قیامت خیز محاصرہ	۵۸۹
۴۰۱	قلعہ سورت کی فتح	۶۱۷	۳۸۰	قلعہ چتوڑ کی فتح	۵۹۰
۴۰۲	قلعہ سورت کی تعمیر کا سبب	۶۱۸	"	اجمیر کا پیدل سفر	۵۹۱
۴۰۳	باغیوں کے مشورے	۶۱۹	۳۸۲	باغی مرزاؤں کا تعاقب	۵۹۲
"	شیر خاں فولادی کی ببادری	۶۲۰	"	قلعہ رتنپور کی فتح	۵۹۳
۴۰۵	گجرات سے واپسی	۶۲۱	۳۸۳	اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں	۵۹۴
"	ابراہیم حسین مرزا کی شورش	۶۲۲	۳۸۴	ایک دل گداز داستان عشق	۵۹۵
۴۰۶	راجا ویر سے لڑائی	۶۲۳	۳۹۱	شیخ زادہ دام محبت میں	۵۹۶
"	خونناک حملہ	۶۲۴	"	قلعہ کا لہجہ پر قبضہ	۵۹۷
"	حسین خاں کی فوج کشی	۶۲۵	۳۹۲	شاہزادہ سلطان سلیم کی پیدائش	۵۹۸
۴۰۷	امرائے سنہس سے مشورے	۶۲۶	۳۹۳	رافضیوں کو قتل کی سزا	۵۹۹
"	مرزا کا لگاتار تعاقب	۶۲۷	"	کوہ سوا لک کے بت خانے	۶۰۰



۴۲۸	شیخ داؤد قادری جہنی وال	۴۰۸	۶۵۵	سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ	۴۲۱
۶۲۹	مرزا ابراہیم حسین کا فرار	۴۰۹	۶۵۶	خواجہ عبدالشہید کی بددعا	۴۲۲
۶۳۰	مرزا ابراہیم بیگ کی گرفتاری	"	۶۵۷	اکبر کی دہلی میں آمد	"
۶۳۱	راجہ بیرب کی قدر و منزلت	۴۱۱	۶۵۸	اجیر کی زیارت کے لیے روانگی	۴۲۵
۶۳۲	نگر کوٹ پر حملہ	"	۶۵۹	دار الخلافہ کو واپسی	"
۶۳۳	حاکم بنگالہ کا انتقال	۴۱۲	۶۶۰	قلعہ سیوانہ کی تسخیر	"
۶۳۴	گجرات پر دوسرا حملہ	"	۶۶۱	خواجہ امینا خواجہ جہاں کی وفات	۴۲۶
۶۳۵	اوشنیوں پر بادشاہی یلغار	۴۱۳	۶۶۲	ایک دلچسپ واقعہ	۴۲۷
۶۳۶	باغیوں کا زبردست حملہ	۴۱۴	۶۶۳	یادِ رفتگان	"
۶۳۷	محمد حسین مرزا کی گرفتاری	"	۶۶۴	پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر	"
۶۳۸	اختیار الملک کا اکبر پر حملہ	۴۱۵	۶۶۵	داغ و محلہ کا مضابطہ	۴۲۸
۶۳۹	محمد حسین مرزا کا قتل	"	۶۶۶	امرائے فوج کی چال بازی	۴۲۹
۶۴۰	اعظم خان سے ملاقات	"	۶۶۷	داؤد کا تعاقب	"
۶۴۱	گجرات کا نظم و نسق	۴۱۶	۶۶۸	پٹھانوں سے خوتریزہ لڑائی	۴۳۰
۶۴۲	اکبر کی اجیر کو دعا لگی	"	۶۶۹	صلح کی گفت و شنید	۴۳۱
۶۴۳	جنتی شاہانہ	"	۶۷۰	داؤد اور خان خانان کی ملاقات	۴۳۲
۶۴۴	دبیر اکبری میں رسائی	۴۱۷	۶۷۱	شیخ ابوالفضل کی یاریابی	۴۳۳
۶۴۵	ہرن پتار	"	۶۷۲	بادشاہی عبادت خانہ	۴۳۴
۶۴۶	جنگل پر فوج کشی	"	۶۷۳	عبادت خانہ کی محفلیں	"
۶۴۷	امیر الامراء لودھی کا قتل	۴۱۸	۶۷۴	مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری	۴۳۵
۶۴۸	دلچسپ دریائی سفر	"	۶۷۵	شیخ عبدالنبی	۴۳۶
۶۴۹	الہ آباد میں قیام	۴۱۹	۶۷۶	شیخ عبدالنبی کا غرور و تکبر	"
۶۵۰	سید میر منجم کی پیشین گوئی	"	۶۷۷	منصب امامت پر تقرر	۴۳۷
۶۵۱	شاہی بجرہ جوہر میں	۴۲۰	۶۷۸	مسئلہ تعدد ازدواج	۴۳۸
۶۵۲	قلعہ حاجی پور کی فتح	"	۶۷۹	جزیرہ اور اللہ اکبر	۴۳۹
۶۵۳	داؤد کا فرار اور پٹنہ کی فتح	۴۲۱	۶۸۰	حکیم ابوالفتح گیلانی اور ملا محمد زینہ دی	۴۴۰
۶۵۴	جنگل سے واپسی	۴۲۲	۶۸۱	شیخ بدر الدین کی عزیمت	۴۴۱



۴۵۵	بادشاہ کا عزم بنگال	۷۰۹	۴۴۱	چوتھے وید کا ترجمہ	۶۸۲
۴۵۶	داؤد کی شکست اور قتل	۷۱۰	۴۴۲	گلبدن بیگم کی حج کو روانگی	۶۸۳
"	اکبر کی اجیر کو روانگی	۷۱۱	"	مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد	۶۸۴
"	شاہ طہماسپ کا انتقال	۷۱۲	۴۴۳	مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال	۶۸۵
۴۵۷	خواجہ شاہ منصور کی باریابی	۷۱۳	۴۴۴	فاتحہ خوانی کی بحث	۶۸۶
"	شاہ اسماعیل کا قتل	۷۱۴	"	تورہ چغتائی	۶۸۷
۴۵۸	قلعہ ایدر پر حملہ	۷۱۵	"	مستم خاں خان خاناں کی وفات	۶۸۸
"	بادشاہ کی مالوہ کو روانگی	۷۱۶	۴۴۶	حسین خاں کا کوہستان پر حملہ	۶۸۹
"	جلوس کا تیسواں سال	۷۱۷	"	حسین خاں کا انتقال	۶۹۰
۴۵۹	راجہ نارائن داس کی شکست	۷۱۸	۴۴۷	حسین خاں کے اوصاف	۶۹۱
۴۶۰	شریف آملی کی آمد	۷۱۹	۴۴۸	داؤد، اورنگزے	۶۹۲
۴۶۱	فتح پور کو واپسی	۷۲۰	"	دنیا سے بے نیازی	۶۹۳
۴۶۲	مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ	۷۲۱	۴۴۹	بہادری اور سخاوت	۶۹۴
"	راجہ علی خاں سے مصالحت	۷۲۲	"	جلوس کا بائیسواں سال	۶۹۵
"	حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی	۷۲۳	۴۵۰	خان جہاں کے نام فرمان	۶۹۶
۴۶۳	حج کے لیے قافلہ کی روانگی	۷۲۴	"	سانا کیلکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر	۶۹۷
"	منوہر پور کی تعمیر	۷۲۵	"	جہاد کا شوق	۶۹۸
۴۶۴	میری سیال کو روانگی	۷۲۶	۴۵۱	داؤد کی دوبارہ سرکشی	۶۹۹
"	جلوس کا چوبیسواں سال	۷۲۷	"	چوگان کی بازی	۷۰۰
"	اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور	۷۲۸	"	کوکنڈہ پر لشکر کشی	۷۰۱
۴۶۵	مدد معاش کا نیا قانون	۷۲۹	۴۵۲	سانا کیلکا کا زبردست حملہ	۷۰۲
"	بادشاہ کی فتح پور کو واپسی	۷۳۰	"	مہتر خاں کی ہوشیاری	۷۰۳
"	عبادت خانہ میں علماء کے ہنگامے	۷۳۱	"	ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی	۷۰۴
"	لکناؤں کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی	۷۳۲	۴۵۳	سانا کیلکا کا فرار	۷۰۵
۴۶۶	اکبر کی بے دینی کا آغاز	۷۳۳	"	شاہی فوج کو کوندہ میں	۷۰۶
"	بے دینی کے اسباب و محرکات	۷۳۴	۴۵۴	رام پرشاد ہاتھی	۷۰۷
"	وعدت ادیان کا تصور	۷۳۵	۴۵۵	بارگاہ شاہی میں حاضری	۷۰۸
۴۶۷	عقیدہ تناسخ کا اقرار	۷۳۶			



۴۸۱	جزیرہ کی غسونی	۷۶۳	۴۶۸	وحدت الوجود کا اثر	۷۳۶
"	علامہ محمد نیر دی کا فتویٰ	۷۶۴	۴۶۹	انسان کامل کا تصور	۷۳۷
"	علماء کا اخراج اور تباہی	۷۶۵	"	خیر و شر کی اضافیت	۷۳۸
۴۸۲	صاحبِ زمان کی پیشین گوئی	۷۶۶	۴۷۰	شیعیت کی حجاب	۷۳۹
"	وظائف و مددِ معاش کی قطع و برید	۷۶۷	۴۷۱	عقیدہ تثلیث کا اثبات	۷۴۰
۴۸۳	بنگال میں مظفر خاں کی سخت گیری	۷۶۸	"	آفتاب پرستی کا آغاز	۷۴۱
۴۸۴	قشقالیوں کی بغاوت	۷۶۹	"	آتشکدہ کا قیام	۷۴۲
"	امرائے بہار کی بغاوت	۷۷۰	۴۷۲	آفتاب اور آگ کی پرستش	۷۴۳
"	مظفر خاں کا قتل	۷۷۱	"	ابوالفضل کی بے دینی	۷۴۴
"	بنگال کی خود مختاری	۷۷۲	۴۷۳	ابوالفضل کی دریدہ دہنی	۷۴۵
۴۸۵	راجہ ٹوڈر مل کی فوج کشی	۷۷۳	"	دربار سے پہلو تھی	۷۴۶
"	باغیوں کی پسپائی	۷۷۴	۴۷۴	تحریفِ ہوائی کا عمل	۷۴۷
۴۸۶	حاکم مالوہ کا قتل	۷۷۵	"	آبی محل کی تعمیر	۷۴۸
"	بنگال پر اعظم خاں کا تقرر	۷۷۶	۴۷۵	معصوم خاں کی باریابی	۷۴۹
"	مشائخین کی آزمائش	۷۷۷	"	قائدِ حجاج کی دعا کی	۷۵۰
۴۸۷	امامت و نبوت کا ادعا	۷۷۸	"	خان جہاں کا انتقال	۷۵۱
۴۸۸	شاہ منصور کی معزولی	۷۷۹	۴۷۶	تحائف و نذرانے	۷۵۲
"	بغیر کان کا آدمی	۷۸۰	۴۷۷	اکبر کی خطبہ خوانی	۷۵۳
"	گنگ محل کا تجربہ	۷۸۱	"	بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی	۷۵۴
۴۸۹	معصوم خاں کا تبادلہ	۷۸۲	"	خیرات کا مظاہرہ	۷۵۵
"	نیابت خاں کی بغاوت	۷۸۳	"	شہزادہ سلیم کی اتالیقی	۷۵۶
"	معصوم خاں کی بغاوت	۷۸۴	۴۷۸	اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علماء کا محضر	۷۵۷
۴۹۰	ارغنون بے کی نمائش	۷۸۵	۴۷۹	محضر نامہ کا متن	۷۵۸
"	اخلاص کے چار درجے	۷۸۶	"	اجمیر کا آخری سفر	۷۵۹
"	مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ	۷۸۷	۴۸۰	بادشاہی کلمہ	۷۶۰
۴۹۱	شاہ منصور کے خلاف سازش	۷۸۸	"	غیرت مند حق گو امیر	۷۶۱
"	مرزا عبدالحکیم کا فرار	۷۸۹	"	علماء وائمہ کی بد حالی	۷۶۲
				خدمتِ شاہی پر دوبارہ تقرر	



۵۰۱	جشن نوروز کی محفلیں	۸۱۷	۴۹۲	اکبر کا عزم کابل	۷۹۰
۵۰۲	نقش قدم کا استقبال	۸۱۸	"	مرزا عبدالحکیم کی شکست	۷۹۱
"	مخدوم الملک کا انتقال	۸۱۹	"	کابل میں ورود شاہانہ	۷۹۲
۵۰۳	شیخ عبدالنہی کا عبرتناک انجام	۸۲۰	۴۹۳	اکبر کی واپسی	۷۹۳
۵۰۴	حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل	۸۲۱	"	چند دن کیفیت و مستی میں	۷۹۴
"	برہان قاطع کا اعلان	۸۲۲	۴۹۴	ترہت میں بغاوت	۷۹۵
"	قاضی جلال ملتانی پر تہمت	۸۲۳	۴۹۵	معصوم خاں کا قتل	۷۹۶
۵۰۵	قاضی عبدالسمیع مادر اءالنہری	۸۲۴	"	نیابت خاں کا قتل	۷۹۷
"	افغان اور نماز کی موقوفی	۸۲۵	"	عیسائی راہبوں سے مناظرہ	۷۹۸
"	میر فتح اللہ شیرازی کی باریابی	۸۲۶	"	فقراء کی جلا وطنی	۷۹۹
۵۰۶	معراج نبوی سے انکار	۸۲۷	۴۹۶	اعظم خاں کی بنگالہ سے آمد	۸۰۰
"	ملا احمد ٹھٹھہ کی آمد	۸۲۸	"	جلوس کا اٹھائیسواں سال	۸۰۱
۵۰۷	تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم	۸۲۹	"	دین الہی کا نفاذ	۸۰۲
۵۰۸	مہابھارت کا ترجمہ	۸۳۰	۴۹۷	دین الہی کی بدعتیں	۸۰۳
۵۰۹	اٹھائیسویں سن جلوس کا آغاز	۸۳۱	"	شیطان پورہ	۸۰۴
"	ٹانڈہ پر قبضہ	۸۳۲	۴۹۸	گاؤ کشی کی ممانعت	۸۰۵
۵۱۰	شیخ فرید بخاری کی سفارت	۸۳۳	"	دار بھی تر شوانے کا جواز	۸۰۶
"	برہان الملک کی آمد	۸۳۴	"	تشلیٹ پرستی	۸۰۷
۵۱۱	جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت	۸۳۵	"	دین الہی کے اقرار نامے	۸۰۸
"	مہابی اکبر کے درشن	۸۳۶	۴۹۹	سکتے اور سوہ کی پاکی	۸۰۹
۵۱۲	اکبر پر پیشو کا اوتار	۸۳۷	"	غسل جنابت کی تحریم	۸۱۰
"	گجرات کی بغاوت	۸۳۸	"	آتش حیات	۸۱۱
"	مظفر شاہ کی یلغار	۸۳۹	"	سونے اور ریشم کا جواز	۸۱۲
۵۱۳	امرٹے شاہی کی پسپائی	۸۴۰	۵۰۰	سن الہی کا اجراء	۸۱۳
"	شیر خاں فولادی کی واپسی	۸۴۱	"	عربی زبان کی مخالفت	۸۱۴
۵۱۴	بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ	۸۴۲	"	مسائل دینی کا تسخیر	۸۱۵
"	مرزا خاں کی لشکر کشی	۸۴۳	۵۰۱	مجلس چیل گانہ	۸۱۶

۵۲۷	روشنائی قبیلہ کی فوج کشی	۸۷۱	۵۱۵	منظر شاہ کی شکست اور فرار	۸۴۴
"	محمد زمان میرزا کا کارنامہ	۸۷۲	۵۱۶	اکبر کی الہ آباد کو روانگی	۸۴۵
۵۲۸	جلوس شاہانہ کا بتیسواں سال	۸۷۳	"	راجہ رام چند کی اطاعت	۸۴۶
۵۲۹	سلطان خسرو کی پیدائش	۸۷۴	۵۱۷	بادشاہ کی فتح پور کو واپسی	۸۴۷
"	بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ	۸۷۵	"	رامائن کے ترجمہ کا حکم	۸۴۸
۵۳۰	گجرات کے حالات کا اعادہ	۸۷۶	"	تبدیلی جنس کا واقعہ	۸۴۹
۵۳۱	دکن پر فوج کشی اور پسپائی	۸۷۷	۵۱۸	اتیسواں سن جلوس	۸۵۰
۵۳۲	میر ابو الغیث بخاری کی وفات	۸۷۸	۵۱۹	امرائے شاہی کا انتقال	۸۵۱
"	عربی علوم پر پابندی	۸۷۹	۵۲۰	میرزا شاہ رخ کی آمد	۸۵۲
۵۳۳	مان سنگھ کا بے باکانہ جواب	۸۸۰	"	شاہزادہ سلیم کی شادی	۸۵۳
"	تقرر اور تبادلے	۸۸۱	"	تیسواں سن جلوس	۸۵۴
"	ملا احمد کا قتل اور قصاص	۸۸۲	۵۲۱	دکن پر حملہ کی تیاریاں	۸۵۵
۵۳۴	جلوس کا چونتیسواں سال	۸۸۳	۵۲۲	گجرات میں دوبارہ بغاوت	۸۵۶
"	ٹوڈر مل پر قاتلانہ حملہ	۸۸۴	"	معاشقہ کا انجام	۸۵۷
"	کمایوں کے راجہ کی آمد	۸۸۵	۵۲۳	پیر روشن کی لوٹ مار	۸۵۸
"	رامائن کا ترجمہ	۸۸۶	"	مرزا محمد حکیم کا انتقال	۸۵۹
۵۳۵	مکار قلندر کا فریب	۸۸۷	"	بادشاہ کا عزم کابل	۸۶۰
"	رامائن کے ترجمہ کا صلہ	۸۸۸	۵۲۴	روشنائی قبیلہ پر فوج کشی	۸۶۱
۵۳۶	امرائے کشمیر کی وفات	۸۸۹	۵۲۵	بیربر کی ہلاکت	۸۶۲
"	کشمیر کو اکبر کی روانگی	۸۹۰	"	بیربر کا ماتم	۸۶۳
"	شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات	۸۹۱	"	روشنائی قبیلہ کی شکست	۸۶۴
۵۳۷	حکیم ابو الفتح کا انتقال	۸۹۲	"	اتیسواں سن جلوس	۸۶۵
"	ٹوڈر مل اور بھگوان داس کا انتقال	۸۹۳	۵۲۶	حاکم کشمیر سے صلح	۸۶۶
۵۳۸	کابل اور گجرات کے لیے تقرر	۸۹۴	"	اکبر کی لاہور کو واپسی	۸۶۷
"	خداوند خاں دکنی کا انتقال	۸۹۵	"	شہزادہ سلیم کا خداوند اور بھگوان داس کی خودکشی	۸۶۸
"	اکبر شاہی کا پینتیسواں سال	۸۹۶	"	یعقوب کشمیری کی بغاوت	۸۶۹
"	اعظم خاں کی فتوحات	۸۹۷	۵۲۷	یوسف اور یعقوب کا انجام	۸۷۰



۵۴۸	منظفر گجراتی کی خودکشی	۹۲۵	۵۴۹	دوبہ رنگوں کا انتقال	۸۹۸
"	خان اعظم کی حجاز کو روانگی	۹۲۶	"	سندھ اور بلوچستان پر حملہ	۸۹۹
۵۴۹	گجرات کے امراء کے تبادلوں	۹۲۷	"	شہاب الدین احمد خاں کی وفات	۹۰۰
"	شیخ مبارک کی وفات	۹۲۸	"	تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین	۹۰۱
"	میرزا رستم کی آمد	۹۲۹	"	شیخ ابراہیم چشتی کا انتقال	۹۰۲
"	دکن کی مہم پر دانیال اور خانخاناں کا تقرر	۹۳۰	"	عرفی شیرازی کا انتقال	۹۰۳
۵۵۱	اٹالیسواں سن جلوس	۹۳۱	۵۴۰	معجم البلدان کا فارسی ترجمہ	۹۰۴
"	کوٹوالی کے انتظامات	۹۳۲	"	چیتیسواں سن جلوس	۹۰۵
"	لین دین کے قاعدے	۹۳۳	"	تبت کی سفارت	۹۰۶
"	قانون ازدواج	۹۳۴	۵۴۱	سجدہ سے انکار	۹۰۷
۵۵۲	تبدیل مذہب کی آزادی	۹۳۵	"	شاہی خطاب	۹۰۸
"	ملکی قوانین کی تفصیلات	۹۳۶	۵۴۲	دکن کو سفیروں کی روانگی	۹۰۹
"	تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب	۹۳۷	۵۴۳	اکبر کی علالت	۹۱۰
"	فیضی کی غیر منقوط تفسیر	۹۳۸	"	شاہزادہ مراد کی فوج کشی	۹۱۱
۵۵۳	محمد قاسم خاں میرزہ بحر کا انتقال	۹۳۹	۵۴۴	جونا گڑھ کی فتح	۹۱۲
۵۵۴	داستان تل و دمن کی تصنیف	۹۴۰	"	ٹھٹھہ کی فتح	۹۱۳
"	مرزا نظام الدین احمد کا انتقال	۹۴۱	"	سینتیسواں سال	۹۱۴
۵۵۵	اعظم خاں کی واپسی اور بے براہ روی	۹۴۲	"	کرہی کا نیا قانون	۹۱۵
"	جلوس سلطان کا چالیسواں سال	۹۴۳	"	جلالہ تاپکی پر فوج کشی	۹۱۶
"	مہابھارت کی ایک حکایت کا قصیدہ	۹۴۴	۵۴۵	یادگار گل کا کشمیر پر قبضہ	۹۱۷
۵۵۶	ہندومت میں بڑے اعمال کا تصور	۹۴۵	"	یادگار گل کی تخت نشینی	۹۱۸
"	اجمیر کی تولیت کی تجویز	۹۴۶	۵۴۶	یادگار گل کی شکست اور قتل	۹۱۹
"	بحر الاسماء کی تصنیف	۹۴۷	"	جامع رشیدی کے ترجمہ کا حکم	۹۲۰
۵۵۷	دکن کی مہم پر شاہزادہ مراد اور خانخاناں کا تقرر	۹۴۸	۵۴۷	کشمیر کی سیر	۹۲۱
"	شاہ بیگ خاں کی فوج کشی اور فتح	۹۴۹	"	لہرنے والا درخت	۹۲۲
"	شیخ یعقوب کشمیری کی وفات	۹۵۰	"	پشاور میں درویشاں ہانہ	۹۲۳
"	حکیم عین الملک کا انتقال	۹۵۱	۵۴۸	جلوسِ سلطانی کا اڑتیسواں سال	۹۲۴





۶۲۲	شیخ سہلول دہلوی	۱۰۳۱	۶۰۴	قاضی جلال الدین ملتانی	۱۰۰۴
"	شیخ عبدالحق دہلوی	۱۰۳۲	۶۰۵	قاضی طوائس	۱۰۰۵
۶۲۷	مولانا الہداد سلطان پوری	۱۰۳۳	"	قاضی یعقوب مانک پوری	۱۰۰۶
"	مولانا عثمان سامانہ	۱۰۳۴	"	شیخ عبدالباقی صدر الصدور	۱۰۰۷
"	حاجی سلطان تھانیسری	۱۰۳۵	۶۰۸	شیخ احمدی فیاض انیسٹیٹو وال	۱۰۰۸
۶۲۸	سید شاہ میر سامانہ	۱۰۳۶	"	قاضی صدر الدین جلندری	۱۰۰۹
"	سید یاسین	۱۰۳۷	۶۰۹	میاں الہداد لکھنوی	۱۰۱۰
۶۲۹	شیخ ضیاء اللہ	۱۰۳۸	"	میر سید جلال الدین قادری آگرہ	۱۰۱۱
۶۳۰	میر ابو الغیث بخاری	۱۰۳۹	۶۱۰	شیخ حسین اجمیری	۱۰۱۲
"	میاں کمال الدین حسین شیرازی	۱۰۴۰	۶۱۱	شیخ عبد القادر	۱۰۱۳
۶۳۱	شیخ ابوالفتح تھانیسری	۱۰۴۱	۶۱۲	شیخ کبیر	۱۰۱۴
۶۳۲	مولانا عثمان بنگالی	۱۰۴۲	۶۱۳	میر سید علی لودھیانہ	۱۰۱۵
"	شیخ حسین بڑہری	۱۰۴۳	۶۱۴	شیخ معین	۱۰۱۶
"	مولانا اسماعیل عرب	۱۰۴۴	۶۱۵	میر عبد اللطیف قزوینی	۱۰۱۷
"	قاضی مبارک گوپالوی	۱۰۴۵	۶۱۶	مرزا غیاث الدین علی	۱۰۱۸
۶۳۵	مولانا ویس گوالیاری	۱۰۴۶	"	خواجہ محمد یحییٰ	۱۰۱۹
۶۳۶	شیخ محمد شامی	۱۰۴۷	۶۱۸	شیخ حسین بدخشی	۱۰۲۰
"	شیخ حسن علی موصلی	۱۰۴۸	"	شیخ عبد القادر	۱۰۲۱
"	قاضی نور اللہ شوستری	۱۰۴۹	"	شیخ ابوالمعالی	۱۰۲۲
۶۳۷	حاجی ابراہیم محدث	۱۰۵۰	۶۲۰	مولانا جمال تہ	۱۰۲۳
۶۳۸	شیخ جلال واصل کاپی والے	۱۰۵۱	"	مولانا عبد الشکور لاہور	۱۰۲۴
"	ملک محمود پیارو	۱۰۵۲	۶۲۱	شیخ کبیر ولد شیخ منور	۱۰۲۵
"	صدر جہاں پھانی	۱۰۵۳	"	شیخ سعد اللہ نجومی	۱۰۲۶
۶۳۹	شیخ یعقوب کشمیری	۱۰۵۴	۶۲۲	شیخ نصیر الدین	۱۰۲۷
۶۴۰	مولانا میرزا سمرقندی	۱۰۵۵	"	شیخ مبارک الوری	۱۰۲۸
"	قاضی ابوالمعالی	۱۰۵۶	۶۲۳	شیخ چائیں لدہ سنہی	۱۰۲۹
"	مولانا میر کلاں	۱۰۵۷	"	شیخ عبد المعنی بدایونی	۱۰۳۰

۶۵۶	غزالی مشہدی	۱۰۸۵	۶۴۴	مولانا سعید ترکستانی	۱۰۵۸
۶۵۸	قاسم کاہی	۱۰۸۶	"	حافظ کوہلی	۱۰۵۹
۶۶۰	خواجہ حسین مروی	۱۰۸۷	"	قاضی نظام بدخشی	۱۰۶۰
۶۶۱	قاسم ارسلان	۱۰۸۸	۶۴۵	مولانا الہداد لنگر خانی	۱۰۶۱
۶۶۳	آتش قندھاری	۱۰۸۹	"	مولانا محمد مفتی	۱۰۶۲
"	اشرف خاں میرمنشی	۱۰۹۰	"	میر فتح اللہ شیرازی	۱۰۶۳
۶۶۴	امیر قاضی اسیری	۱۰۹۱	۶۴۶	شیخ منصور لاہوری	۱۰۶۴
"	میرا ماحی بچویہ	۱۰۹۲	"	ملا پیر محمد شیروانی	۱۰۶۵
۶۶۵	میر شریف امانی اصفہانی	۱۰۹۳	۶۴۷	میرزا مفلس اوزبک	۱۰۶۶
"	قاضی احمد غفاری قزوینی	۱۰۹۴	"	مولانا نور الدین محمد ترخان	۱۰۶۷
۶۶۶	میراشکی قبی	۱۰۹۵	"	مولانا الہداد اروہر	۱۰۶۸
"	یوحنا قلی انیس	۱۰۹۶	۶۵۰	دور اکبری کے حکماء	۱۰۶۹
۶۶۷	ملا غنی امنی	۱۰۹۷	"	حکیم الملک گیلانی	۱۰۷۰
"	ابتری بدخشی	۱۰۹۸	۶۵۱	حکیم سیف الملوک دماندی	۱۰۷۱
"	الفتی قلیچ خاں	۱۰۹۹	۶۵۲	حکیم زینل شیرازی	۱۰۷۲
"	الفتی یزدی	۱۱۰۰	"	حکیم مسیح الملک شیرازی	۱۰۷۳
۶۶۸	الفتی عراقی	۱۱۰۱	۶۵۳	حکیم مصری	۱۰۷۴
"	بیرم خاں خانخاناں	۱۱۰۲	"	حکیم علی	۱۰۷۵
۶۶۹	بکیسی غزنوی	۱۱۰۳	۶۵۴	حکیم ابوالفتح گیلانی	۱۰۷۶
۶۷۰	باقی کولابی	۱۱۰۴	"	حکیم حسن گیلانی	۱۰۷۷
"	بیاضی	۱۱۰۵	"	حکیم ہمام	۱۰۷۸
۶۷۱	پیروی	۱۱۰۶	"	حکیم احمد بختیاری	۱۰۷۹
"	بقائی	۱۱۰۷	۶۵۵	حکیم لطیف اللہ گیلانی	۱۰۸۰
۶۷۲	ملا نور الدین محمد ترخان	۱۱۰۸	"	حکیم مظفر از دستانی	۱۰۸۱
۶۷۳	ترودی اردوہ	۱۱۰۹	"	حکیم فتح اللہ گیلانی	۱۰۸۲
"	توسنی	۱۱۱۰	"	حکیم شیخ بینا	۱۰۸۳
۶۷۵	تدرونی ابھری	۱۱۱۱	۶۵۶	دور اکبری کے شعراء	۱۰۸۴



۶۹۸	سیری	۱۱۳۹	۶۷۶	تشبیبی کاشی	۱۱۱۲
"	پہری	۱۱۴۰	۶۷۷	تقی الدین شستری	۱۱۱۳
"	سیانی	۱۱۴۱	"	ثانی خاں ہروی	۱۱۱۴
۶۹۹	مہی	۱۱۴۲	۶۷۸	ثانی مشدی	۱۱۱۵
"	سقا	۱۱۴۳	۶۸۰	جدائی	۱۱۱۶
۷۰۰	سیاہی	۱۱۴۴	"	خزنی	۱۱۱۷
"	نہرمدی اصفہانی	۱۱۴۵	۶۸۱	جمیلی کاپی وال	۱۱۱۸
۷۰۱	ساقی جزائری	۱۱۴۶	۶۸۲	چشتی	۱۱۱۹
"	سیدی	۱۱۴۷	۶۸۳	جعفر	۱۱۲۰
۷۰۲	شاہ ابوالمعالی	۱۱۴۸	"	جعفر بیگ	۱۱۲۱
"	شیری	۱۱۴۹	۶۸۴	حیدری تبریزی	۱۱۲۲
۷۰۵	شکیبی اصفہانی	۱۱۵۰	۶۸۵	حزنی	۱۱۲۳
"	شجاعتی	۱۱۵۱	"	حیاتی گیلانی	۱۱۲۴
۷۰۶	شعوری تربتی	۱۱۵۲	۶۸۶	خیاتی	۱۱۲۵
"	ملا صادق حلوانی سمرقندی	۱۱۵۳	"	حالتی	۱۱۲۶
۷۰۷	صبوحی	۱۱۵۴	۶۸۷	خان اعظم	۱۱۲۷
"	صالحی	۱۱۵۵	۶۸۸	خنجر بیگ	۱۱۲۸
۷۰۸	صادقی	۱۱۵۶	۶۹۰	خسروی	۱۱۲۹
"	صرنی	۱۱۵۷	"	میردندی	۱۱۳۰
۷۰۹	صرنی ساؤجی	۱۱۵۸	۶۹۱	دابہنی	۱۱۳۱
"	صبوری بہرائی	۱۱۵۹	۶۹۲	دوانی	۱۱۳۲
"	صالح دیوانہ	۱۱۶۰	۶۹۳	رفیعی	۱۱۳۳
۷۱۰	طارجی	۱۱۶۱	۶۹۴	رہائی	۱۱۳۴
"	طریق ساؤجی	۱۱۶۲	"	روغنی	۱۱۳۵
۷۱۱	طالب اصفہانی	۱۱۶۳	۶۹۵	زین خاں کوکہ	۱۱۳۶
۷۱۲	طالعی یزدی	۱۱۶۴	"	سلطان سپہکی	۱۱۳۷
"	طغی	۱۱۶۵	۶۹۷	سلطان	۱۱۳۸

۷۳۶	قومی	۱۱۹۳	۷۱۳	ظہوری	۱۱۶۶
"	قیدی شیرازی	۱۱۹۴	۷۱۴	عالم کابلی	۱۱۶۷
۷۳۷	قدری	۱۱۹۵	۷۱۵	میر عبدالحی مشہدی	۱۱۶۸
"	قندی	۱۱۹۶	۷۱۷	عتابی	۱۱۶۹
"	کامی	۱۱۹۷	۷۱۸	عبیدی	۱۱۷۰
"	کلاہی	۱۱۹۸	"	عشقی خاں	۱۱۷۱
"	کلامی	۱۱۹۹	۷۱۹	علمی	۱۱۷۲
۷۳۸	کامی قومی	۱۲۰۰	"	✓ میر عزیز اللہ	۱۱۷۳
"	نقائی استرآبادی	۱۲۰۱	۷۲۰	✓ میرزا عزیز کوکہ	۱۱۷۴
"	لوائی	۱۲۰۲	"	✓ عہدی شیرازی	۱۱۷۵
"	علی	۱۲۰۳	۷۲۱	✓ عنایت اللہ کاتب	۱۱۷۶
۷۳۹	✓ لطفی منجم	۱۲۰۴	۷۲۲	✓ عرفی شیرازی	۱۱۷۷
"	میر مرتضیٰ شیرازی	۱۲۰۵	۷۲۳	غزنوی	۱۱۷۸
"	مخوی	۱۲۰۶	۷۲۴	غباری	۱۱۷۹
۷۴۱	میر محسن رضوی مشہدی	۱۲۰۷	۷۲۵	✓ غربتی حصاری	۱۱۸۰
"	موجی	۱۲۰۸	۷۲۶	✓ غیرتی شیرازی	۱۱۸۱
۷۴۲	میرزاہ علی خاں	۱۲۰۹	"	✓ فارغی شیرازی	۱۱۸۲
۷۴۳	معزی ہروی	۱۲۱۰	۷۲۷	✓ فاضل طہرانی	۱۱۸۳
"	مرادی استرآبادی	۱۲۱۱	"	✓ فاضل سمرقندی	۱۱۸۴
"	مشفق بخاری	۱۲۱۲	"	فلکی	۱۱۸۵
۷۴۴	میلی ہروی	۱۲۱۳	۷۲۸	✓ فنائی	۱۱۸۶
۷۴۵	ملک قومی	۱۲۱۴	"	✓ فسونی ہندی	۱۱۸۷
۷۴۶	مدامی بدخشی	۱۲۱۵	"	✓ فیروز کابلی	۱۱۸۸
"	ملا مقصود قزوینی	۱۲۱۶	۷۲۹	✓ فہمی التآبادی	۱۱۸۹
۷۴۸	محنتی حصاری	۱۲۱۷	"	✓ ملک الشعراء شیخ فیضی	۱۱۹۰
"	موسوی مشہدی	۱۲۱۸	۷۳۰	✓ فارسی	۱۱۹۱
۷۴۹	✓ خواجہ معظم	۱۲۱۹	۷۳۱	✓ قرندی گیلانی	۱۱۹۲



۷۶۲	نامی	۱۲۳۷	۷۶۹	موزوں	۱۲۳۰
۷۶۳	نظیری نیشاپوری	۱۲۳۸	۷۷۰	محمد یوسف	۱۲۳۱
"	نوائی	۱۲۳۹	"	منظری سمرقندی	۱۲۳۲
۷۶۵	نوبیدی نیشاپوری	۱۲۴۰	۷۷۱	مداحی ہمدانی	۱۲۳۳
"	نظمی تبریزی	۱۲۴۱	"	مقیم سبز واری	۱۲۳۴
۷۶۶	وقوعی نیشاپوری	۱۲۴۲	"	محمی	۱۲۳۵
۷۶۷	وداعی ہروی	۱۲۴۳	۷۷۲	منظری کشمیری	۱۲۳۶
۷۶۸	واقعی ہروی	۱۲۴۴	"	شیخ محمد دہلوی	۱۲۳۷
"	وصفی	۱۲۴۵	۷۷۳	نویزی تربتی	۱۲۳۸
"	وصلی	۱۲۴۶	۷۷۴	نشانی	۱۲۳۹
۷۶۹	وقوفی ہروی	۱۲۴۷	۷۷۵	نامی	۱۲۴۰
"	وفائی اصفہانی	۱۲۴۸	"	ملا نویدی	۱۲۴۱
"	ہمدی	۱۲۴۹	۷۷۶	نہانی	۱۲۴۲
۷۷۰	ہجری	۱۲۵۰	"	نجاتی گیلانی	۱۲۴۳
۷۷۱	ہاشم	۱۲۵۱	"	نوعی	۱۲۴۴
۷۷۲	خاتمہ	۱۲۵۲	"	"	"
۷۷۳	مصنف کے حالات	۱۲۵۳	"	نیازی	۱۲۴۵

# جلد اول



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## حمد و نعت اور سببِ تالیف کتاب

اے یافتہ نامہ ز نام تو رواج شاہانِ بدرت چو ما بدیشاں محتاج  
 حالے کہ رسیدِ صدمت غیرت تو نے پائے بکفش ماند نے فرق تباج  
 اے شاہنشاہِ دو جہاں! اس دلِ بے حاصل کے ساتھ جو دیو و وحوش کا مسکن ہے، تیری تعریف و توصیف کا خیال  
 کیسے کروں اور اس بیہودہ گو فرسودہ زبان کے ساتھ جو گریہ و سگ لقمہ ہے تیری مدح سراٹی کیوں کر کروں  
 چہ زہرہ خاک مسکین را کہ توحیدِ خدا گوید  
 بدیں آلودگی خاکِ مقدس را شتا گوید  
 مزید برآں اس راستہ میں کہ جس کے پیچ و خم سے میں ناواقف ہوں، یہ پائے جستجو لنگ ہے اور میری زبان سست بیان  
 کے لیے اس بے پایاں بیابان میں گفتگو کی فضا تنگ ہے

آپنجہ دل داندِ حدوث است آپنجہ لب گویدِ حروف  
 من بدل چوں دانمت یا باز باں چوں خوانمت  
 اس لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے قلم کو اس داوی کے طے کرنے سے روکوں اور حیران و پریشانِ دماغ کو دنیا اور اس کے انسانوں کے  
 بارے میں غور و فکر کرنے سے باز رکھ کر دیدہٴ عبرت باری تعالیٰ کی پُرکمال صنعت اور اس کے لازوال ملک کی معرفت کے لیے وا کروں اور  
 کائنات کے احوال اور ان کے تغیرات سے اس کی بلند پایہ ذات تک پہنچ کر توحید اور تقریر کے عالم میں اپنا سراٹھاؤں تاکہ یقین کی  
 آنکھوں سے نہ صرف دیکھ سکوں بلکہ پہچان بھی سکوں کہ

دُوئی را نیست رہ بحضرت تو

ہمہ عالم توئی و قدرت تو

اور زبان کو اس سرودِ کائنات، صاحبِ حوضِ کوثر حضرت محمدؐ کے نام کے درد اور اس کی جلالت سے تر کر دیں، جن کے  
 اولوالعزم و جودِ مقدس پرانہ اور ابدی بادشاہت کی خلعتِ شریف چست آئی اور جن کے نامِ عالی سے خداوند تعالیٰ کی  
 لازوال مملکت کا سکہ رواں ہوا۔ رباعی

شاہِ عربی کہ شد جہاں مظہر او سو گندِ سرش گفت جہاں داور او

ہمسایہٴ حق بود ازاں سایہٴ نداشت تا پانہند کسے بجائے سر او

ہزاروں ہزار تحسین و آفرین ہوان کی آلی برگزیدہ اور اصحابِ حق ہیں، خصوصاً خلفائے راشدینؓ پر جنہوں نے پرچمِ اسلام بلند کرنے

اور اعلائے کلمۂ حق کے لیے اپنی جانیں نثار کیں، اپنے ہر فرد کیے اور ہر طرح کے کفر و بدعت کے خار و خاشاک سے ملکِ شرع کی وادی کو پاک کیا۔

**علم تاریخ** | حمد الہی اور نعتِ حضرت رسالت پناہی کے بعد اس امر کی وضاحت لازمی ہے کہ علم تاریخ بذاتہ ایک علم شریف اور فنِ لطیف ہے۔ اس لیے کہ اہلِ خبر کا سرمایہٴ عبرت اور اہلِ عقل کا آئینہٴ تجربات ہے۔ اصحابِ قصص و سیر نے حضرت آدمؑ سے لے کر زمانہٴ حال تک اس فن میں بڑی معتبر اور ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور اس کی حقیقت کا ثبوت دلائل و براہین سے ہم پہنچا ہے۔ اس لیے یہ خیال کبھی دل میں نہیں لانا چاہیے کہ ضعیف العقیدہ اور شکی طبیعت رکھنے والوں نے اس علم کے مطالعہ کے متعلق جو خیال آرائی کی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ اس سے مسلمان شریعتِ محمدی کی راہِ مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں اور ہوا و بدعت کے مکدر چشموں کے کنارے اترتے ہیں، اس لیے کہ جس گروہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اسے فطری طور پر دینِ حق سے لگاؤ نہ ہو اور کلامِ ازلی جو سعادتِ ابدی کی کلید ہے اور دونوں جہاں کے لیے رحمت و شفا ہے اس کی تلاوت سے بھی اس کی شقاوتِ قلبی نہ گئی ہو اور وہ خسرانِ جاوید میں رہ گیا ہو اذ ایستدوا بہ فیقولون ہذا افاک قد ایدرجب قرآن مجید کے بارے میں اس کی یہ رائے ہو تو پھر علم تاریخ اس کی زد سے کیسے بچ سکتا ہے۔

چو حسن سمع از مایخو لیاضائع شود کس را  
نیابد بہرہ از مرزا بردادی و الحاش

مگر ہمارے مخاطب وہ اصحاب ہیں جو سلامتی طبع، اجودت ذہن اور شیوۃ انصاف کے حامل ہیں نہ کہ وہ جماعتیں جو شرع شریف کی پابند نہیں اور اصل و فرع کی منکر ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے لوگ مخاطب کے قابل نہیں کہ ان کا شمار اہل اعتبار اور اولی الابصار کے زمرہ میں نہیں ہوتا۔ بھلا ایسے علم کا کوئی شخص کیسے منکر ہو سکتا ہے جس کی فضیلت کا یہ حال ہو کہ اسے سبعِ مثانی کی ساتویں آیت کا درجہ حاصل ہو اور سبعِ مثانی کی اہمیت ظاہر ہے کہ اسے ایمان اور یقین کی بنیاد قرار دیا گیا ہے وکلا نقص علیک من انباء عابد سل ما نثبت بہ فو ادک۔ یہ آیت شریفہ اس کا ثبوت ہے اور علمائے حدیث و تفسیر کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں امام بخاریؒ اور قاضی بیضاویؒ سے لے کر ہمارے اپنے زمانہ تک کے علمائے کرام شامل ہیں۔ ان سب نے اس دل پذیر علم کو اپنا مشغلہٴ نحر یہ بنائے رکھا اور اقوامِ مشرق و مغرب جو اگرچہ مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی ہیں وہ بھی ان کے قول و عمل کو مستند سمجھتی ہیں۔ اس کے برعکس اہلِ بدعت کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے اور اس کی یہ بدبختی ہے کہ اپنے نفسِ آمارہ کے تعصبِ سلاطین کی کوتاہ بینی سے اس نے اس حد تک جرأت کی کہ قابلِ یادگار اور صحیح تاریخ کے واقعات کو باہم خلط ملط کیا اور اس طرح ان کے حقیقی مفہوم کو خبط کر دیا۔ اس نے مسلمہ ترکیبوں، تشریحوں اور وضاحتوں کے اسلوب کو ترک کر کے صحابہ کرامؓ اور تابعینِ عظامؓ کے معرکوں اور مناظروں کا قیاس اپنے ناویہٴ نظر سے کیا اور ان کی بنا حصولِ دولت اور خاندانی جاہ و شتم کے ذاتی تقاضوں پر رکھی۔ یقیناً یہ گروہ ایسے سادہ لوح لوگوں کی گمراہی کا باعث

۱۔ سبعِ مثانی - بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں جن سے قرآن مجید کی ابتدا ہوتی ہے، اور وہ سورہ فاتحہ ہے۔

۲۔ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن حسن اسماعیل بن ابراہیم بن المغیرت بن الاضاف آپ صحیح بخاری کے مصنف ہیں ۱۹۲ھ میں پیدا ہوئے تھے اور ۲۵۶ھ میں انتقال کیا۔

۳۔ قاضی لمیل بن ابو الخیر عبد اللہ بیضاوی ابن عمر بن محمد۔ جائے پیدائش بیضا اس لیے بیضاوی کہلائے۔ بیضا شیراز کا ایک گاؤں ہے۔ قاضی القضاۃ کے عمدہ جلیلہ پر فائز متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے الخایۃ فی المفقہ شرح المصباح والمناہج اور تفسیر بیضاوی زیادہ مشہور ہیں ۵۷۷ھ میں انتقال ہوا اور شیراز میں دفن ہوئے۔



ہوا جو پہلے ہی ضحیت الاعتقاد تھے اور اس نے اپنی غلطیوں کو ان پر محمول کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے آپ کو بھی اور اپنے ساتھ ان کو بھی دارالہوارِ جہنم میں پہنچا دیا۔

اذا كان الغراب دليل قوم سجد يهمل سبيل الهالكنا

اور جس شخص کی آنکھیں سرمہ توفیق اور نور یقین سے منور ہوں ہر وہ سانحہ جو اس عالم کون و فساد میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کی سطح سے بالاتر ہو کر وہ اس ذوالجلال صانع قدیم کی وحدت کو پالیتا ہے، جو حدوث کے عیب سے میرا اور تغیر و انتقال کے داغ سے پاک ہے، اور جب میں اپنے چاروں طرف بغور دیکھتا ہوں تو یہ دنیا مجھے بذاتِ خود ایک کتاب قدیم نظر آتی ہے جس کا کوئی سرمہ نہ پیر اور اس کے تمام ادباق پر لگندہ ہیں، مگر اس کے ہر ورق پر افرادِ انسانی کی کسی ایسی جماعت یا گروہ کے احوال و کوائف درج ہیں جس کے ہاتھ میں مامِ اختیار دی گئی تھی۔

ز احوالِ شہاں گیتی بود شہنا مہ کہتہ تو دالم از سہرِ حیرت دروچی بین و میخویش

فسونِ ایں فسانہ خوابِ خوش می آورد آنرا کہ مر سائے است و از سودا داغ آید پریشانش

ولے بیدار ہم می سازد آن کس را کہ از نخوت بخواب غفلت افتاد است بازی دادہ شیطان

**سبب تالیف کتاب** بنی نوع انسان کے اس دعا گو عید القادر بن ملوک شاہ بدایونی نے ۹۹۹ھ کے اوائل میں حشر خلیفہ زمانِ ظل الہی اکبر شاہ کے حکم کی تعمیل میں انتخاب تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے فراغت پائی مجھے چونکہ بچپن سے بڑھاپے تک اس علم تاریخ سے انسیت رہی ہے اس لیے اس عرصہ میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا کہ میں اس علم کے مطالعہ یا تحریر میں مشغول نہیں ہوا خواہ اپنی رغبت سے تھا یا کسی دوسرے کے حکم کی تعمیل میں، چنانچہ بارہا میرے دل میں آیا کہ دارالسلطنت دہلی کے بادشاہوں کے بارے میں اختصار کے ساتھ کچھ لکھا جائے۔

جملہ عالم روستانید آل سواد اعظم است

یعنی ابتدائے اسلام کے زمانہ سے لے کر اس زمانِ تحریر تک مختصراً لکھا جائے تاکہ ہر بادشاہ کے احوال کی وہ ایک ایسی اجمالی یادداشت ہو جو احباب کے لیے تذکرہ کا کام دے اور باب بعیرت کی نظر میں اسے تبصرہ کی حیثیت حاصل ہو۔ اگرچہ میرے پاس اس موضوع پر کوئی کتاب یا تصنیف نہیں پھر بھی بقول شاعر

ایں گمن اوراق گروں کش ز انجم زیور است

گمنہ تاریخ بے شاہان انجم شکر است

ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے عالم ملکوت اور ہر غیب کا کوئی فرستادہ ناظرین میں سے کسی مقبل کے دل پر اپنا نورانی پر تو ڈالے اور وہ ملک دنیا کے جذبات کے تحت اس سرائے فانی کی محبت اپنے دل سے نکال کر ان ادباقِ جامع کی جانب دستِ اعانت بڑھائے چنانچہ میری یہ امید مہم نہیں تھی، جب کہ ہر وہ نئے نئے غم و اندوہ کے ساتھ طلوع ہوتا اور بے اندازہ مصائب و آلام اپنے ساتھ لاتا۔ امداد کم ملتی

۱۔ یہ عربی مادہ اصل میں اس طرح ہے من یكون الغراب له دليل يهمل سبيل الهالكنا  
۲۔ تاریخ کشمیر کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے کیا تھا۔

اور موافقات زیادہ پیش آتے اور زمانے کے رنج و محن کے باعث کسی ایک جگہ قیام و شواہ ہوتا،

ہر روز بمنزلے و ہر شب جاٹے

اودان پر مستزاد یہ کہ میرے ذریعہ معاش کی کوئی مستقل اور یقینی صورت نہ تھی اور وہ زمین و آسمان کے مابین معلق تھا نیز میل اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی میں پریشان تھا، اس لیے میرے مقصد کی تکمیل میں تاخیر لازمی تھی، مگر اسے حسن اتفاق کیسے کہ میرے مہربان اور مشفق دوستوں میں سے ایک نے تاریخ نظامی کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ میرے اس دوست کو دین سے کافی لگاؤ تھا، اس فقیر کے ساتھ بھی اسے محبت تھی اور اس فقیر کو بھی اس کے ساتھ انس تھا مگر عمر نے وفات کی اور وہ رختِ حیات باندھ کر فردوسِ اعلیٰ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اور فت و رویم ما بدنبال آخر ہمہ را بود ہمیں حال

اس مرحلہ پر جب کہ زمانے نے مجھے قدرے فرصت سے نوازا تو میں نے اپنی زندگی کے گونا گوں اوقات کا ایک حصہ چرایا جس میرے اس مقصد میں نئی جان آگئی اور میرا ارادہ مزید محکم ہو گیا۔ چونکہ ماضی ہمیشہ مستقبل پر اثر انداز رہا ہے بقول شاعر

اگر دہقاں تہ خرم من کند پاک

گزارد حصہ کنج شک و رخت ناک

میں نے بھی مناسب سمجھا کہ ہندوستان کے صاحبِ استقلال سلاطین کے حالات قلمبند کروں، چنانچہ تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو میں نے اپنے پیش نظر رکھا۔ کچھ مواد ان سے اخذ کیا اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ میری اس تصنیف کو ان دونوں تاریخوں سے وہی نسبت ہے جو تہذیب کو بجز خازن سے اور حباب کو تیز و تند طوفان سے۔ میں نے اپنی اس تصنیف میں حد سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے اور استعارات سے بھی احتراز کیا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ کا نام میں نے ”منتخب التواریخ“ رکھا جس کا مقصد وحید یہ ہے کہ بادشاہانِ اسلام کے فرزند فرجام ناموں کو باقی رکھا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس مؤلف کی ایک یادگار بھی اس سرائے مستعار میں رہ جائے۔ امید ہے کہ یہ تمام تالیف آخرت میں بھی میری مغفرت کا موجب ہوگی نہ کہ باعثِ اضافہ گناہ۔

تو اے بلبل چو بختِ رامی دریں باغ

بہر لجنے نہ گیری نکستہ بر زاغ

۱۔ تاریخ نظامی کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد بن خواجہ مقیم ہروی ہیں۔ خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے اور خواجہ نظام الدین احمد اکبر بادشاہ کے دیوان خانگی جنہیں بعد میں ترقی دے کر گجرات میں بخشی مقرر کر دیا گیا۔ تاریخ نظامی کا شمار بڑی مستند اور شہرہ آفاق کتابوں میں ہوتا ہے۔ مصنف نے اس کا نام طبقات اکبر شاہ رکھا تھا اور یہ طبقات اکبری کے نام سے بھی مشہور ہے۔ فرشتہ کی رائے میں ان تمام تاریخوں میں سے یہ سب سے زیادہ معتبر ہے جو اس کے مطالعہ میں آئیں۔ خواجہ نظام الدین احمد نے ۳۰۰۰۰۰ مطابق ۱۵۹۴ء میں انتقال کیا۔

۲۔ تاریخ مبارک شاہی۔ یہ بیگلی ابن احمد ابن عبداللہ سرہندی کی تصنیف ہے اور اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ مبارک شاہ کے عہدِ حکومت کے حالات اور واقعات قلمبند کیے جائیں۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام باقی سلطنتِ غوری سے ہوتی ہے اور اختتام سلطان سید محمد پر۔

۳۔ نظام التواریخ۔ اس نام کی کتاب سے ملا بدایونی کی مراد وہی تاریخ نظامی ہے جس کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد ہیں۔



چونکہ میری اس تحریر کی بنیادِ انتہائی داری ہے، اگر اتفاقاً کوئی سہوار لغو زبانِ قلم پر آجائے تو اُمید ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اسے اپنے کرمِ عظیم سے درگزر کرے گا اور بخش دے گا۔

بہ بدگفتن زبان من مگر داں

زبان من زبان من مگر داں

چونکہ محمد بن قاسم (عم زادہ اور داماد حجاج بن یوسف ثقفی) بلادِ سندھ، ملتان اور گجرات فتح کرنے کے بعد ولید بن عبد الملک مروانی کے حکم نامہ کی تعمیل میں شہرِ اودے پر سے روانہ ہوا تھا اور رستہ ہی میں اپنے آپ کو چرمِ خام میں سلوا کر جان بحق تسلیم ہو گیا تھا۔ اس لیے ہندوستان کے مفتوحہ شہروں میں احکامِ اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام نہ ہو سکا۔ یہ سعادت ناصر الدین سبکتگین اور اس کے فرزند سلطان محمود غزنوی ہی کو نصیب ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اسلام کا جھنڈا بھی اس سرزمین پر گاڑا اور احکامِ اسلامی کی ترویج اور پابندی کا انتظام کیا۔ سلطان محمود غزنوی جو ہر سال غزوہ اور جہاد کی نیت سے ہندوستان آتا تھا، اس کی اولاد نے لاہور کو پایۂ تخت بنایا یہاں تک کہ ان علاقوں میں اسلام کے پیر مضبوطی سے جم گئے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تصنیف کی ابتدا اس سلطانِ عاقبت محمود سے کی جائے جس کی ابتدا بھی مسعودی اور اتہا بھی محمود۔ واللہ خیر الناصرین والمعین۔

۱۔ چرمِ خام۔ اس کا تعلق راجہ داہر کی دو کنواری لڑکیوں سے تھا جنہوں نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے دروغ بیانی سے کام لیا۔ واقعہ یوں ہے کہ جب ۹۳ھ میں راجہ داہر قلعہ راور کے محاصرہ میں لڑتا ہوا مارا گیا تو محمد بن قاسم نے اس کی دونوں کنواری لڑکیوں کو حبشی غلاموں کی نگہبانی میں بغداد بھیج دیا۔ جب انھیں خلیفہ ولید بن عبد الملک مروانی کے حضور پیش کیا گیا تو دیکھتے ہی وہ ان پر فریفتہ ہو گیا اور انھیں اپنے حرم میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ ان لڑکیوں نے موقع غنیمت جان کر خلیفہ وقت کو ہر ممکن طریقے سے اس امر کا یقین دلایا کہ یہاں بھیجے سے پہلے محمد بن قاسم نے ان کو تین روز اپنے پاس رکھا تھا، اس لیے وہ خلیفہ وقت کے حرم میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہیں۔ یہ سن کر خلیفہ ولید کو بے حد غصہ آیا اور ایک حکم نامہ کے ذریعے محمد بن قاسم کو لکھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوا اپنے آپ کو چرمِ خام میں سلوا کر دارالخلافہ پہنچے۔ محمد بن قاسم اس وقت اودے پر میں تھا، چنانچہ حکم پاتے ہی اس نے تعمیل کی اور اپنے آپ کو چرمِ خام میں بند کر کے سلوا دیا۔ جب چرمِ خام کا یہ سلا ہوا تھیلہ خلیفہ ولید کے حضور لایا گیا تو محمد بن قاسم اس کے اندر جان بحق تسلیم ہو چکا تھا۔ خلیفہ ولید نے سبزمندی کی ٹہنیوں کا ایک ستہ ہاتھ میں لے کر لاش کی طرف اشارہ کیا اور ان دونوں لڑکیوں کو دکھایا جسے دیکھتے ہی لڑکیاں فوراً بول اٹھیں کہ یہ دروغ بیانی تھی اور انہوں نے اس لیے اختیار کی تھی تاکہ محمد بن قاسم سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک محمد بن قاسم ان کے باپ کا قاتل تھا۔ اس دروغ بیانی کی پاداش میں خلیفہ ولید نے یہ حکم دیا کہ دونوں لڑکیوں کو دس دیواروں کے درمیان چن دیا جائے۔ (آئین اکبری جلد دوم صفحہ ۳۴۵)

# غزنوی عہد حکومت

سلطان ناصر الدین سبکتگین سے خسرو ملک تک

سرزمین ہند پر اسلامی حکومت کا بانی جس نے دہلی فتح کرنے سے قبل ہی اسلام کا ڈنکا بجا دیا

دورانِ عہد حکومت ۳۶۷ھ سے ۵۸۲ھ تک ۲۱۵ سال

حکمرانوں کی تعداد ۱۵

سلطان ناصر الدین ترک نژاد تھا اور اپتگین کا غلام، اور اپتگین خود امیر منصور بن نوح سامانی کا غلام تھا۔ اپتگین کے فرزند ابوالفتح کی وفات کے بعد فوج اور رعایا کی متفقہ رائے سے سبکتگین تخت نشین ہوا۔ اس نے پرچم فتح و نصرت بلند کیا اور غزوہ و جہاد کے جذبہ بے پناہ سے وہ کوہِ بخارا کے راستہ حازم ہندوستان ہوا اور راجبے پال کے ساتھ جو اس وقت ہندوستان کا ایک فرمانروا تھا، ایک عظیم جنگ لڑی مگر اس کا انجام باہمی مصالحت پر ہوا۔ بعد میں راجبے پال نے عمد شکنی کی اس لیے سبکتگین نے دوبارہ ایک لاکھ سوار اور بے شمار کوہ پیکہ ہتھیار کے ساتھ اس پر چڑھائی کی اور لغمان کے نواح میں طرفین کی فوجوں کی آپس میں مد بھڑھڑ ہوئی۔ اس بار بھی نسیم ظفر مندی ناصر الدین سبکتگین کے پرچم کی طرف چلی اور راجبے پال نے شکست کھا کر نامہ فرار اختیار کی۔ لغمان کا تمام علاقہ سبکتگین کے قبضہ میں آیا، اس کے نام کا خطبہ ہر طرف پڑھا گیا اور اسی کا سکہ بھی جاری ہوا۔ پھر وہ یہاں سے لوٹا اور امیر نوح بن منصور سامانی کی مدد کو خراسان اور ماوراء النہر کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں کی عظیم فتوحات اسی کی مرہونِ منت تھیں۔ اس نے ماہِ شعبان ۳۸۷ھ میں انتقال کیا۔ مدتِ حکومت بیس سال تھی۔

۱۔ امیر منصور بن نوح سامانی۔ خاندان سامانی کا آٹھواں حکمران جس نے ۲۲ سال حکومت کی۔ اس حکومت کی بنیاد بن سامان نے ڈالی تھی بد خراسان سے ماوراء النہر تک تھی امیر منصور کا انتقال ۳۸۷ھ میں ہوا تھا، اس کے بعد اس کا فرزند ابوالقاسم نوح تخت نشین ہوا تھا۔

۲۔ کوہِ بخارا۔ غزنی اور لاہور کے درمیان ایک کوہستانی علاقہ کا نام۔

۳۔ لغمان۔ غزنی کے پاسوں کا ایک حصہ ہے۔ ابوالفدا اور لباب اس پر متفق ہیں۔

## ..میں الدولہ سلطان محمود بن ناصر الدین سبکتگین

غزنی کے راستہ ہی میں جب ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں سبکتگین نے داعی حق کو لبیک اجابت کہا تو انتقال سے قبل ہی اس نے اپنے فرزند خرد و اسماعیل کو ولی عہد سلطنت مقرر کر دیا تھا۔ جب اس کی خبر محمود کو ملی تو اس نے اپنے برادر خرد و اسماعیل کو تعزیتی خط لکھا۔ جس میں بطور مصالحت یہ تجویز بھی پیش کی کہ وہ غزنی کا علاقہ محمود کے حوالے کر دے اور اس کے عوض بلخ کی گورنری قبول کرے۔ اسماعیل نے اس سے صاف انکار کر دیا، چنانچہ دونوں بھائیوں کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ محمود فتح مند ہوا اور اسماعیل چھ ماہ تک حصار بند ہو کر بیٹھا رہا۔ آخر اس خاندان کے چند خیر خواہوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں بھائیوں میں صلح کرا دی۔ اسماعیل خود محمود کے پاس گیا اور اس کے بعد عنان حکومت میں الدولہ سلطان محمود کے ہاتھ آئی۔ اس اثنا میں سلطان محمود اور امیر منصور بن نوح سامانی اور اس کے بھائی عبدالملک بن نوح سامانی کے درمیان کشیدگی بیان تک بڑھ گئی تھی کہ جنگ کی نوبت آئی۔ عبدالملک کے ساتھی امراء فائق اور یکتوزون بھی میدان جنگ میں اترے، مگر ان میں سے کوئی بھی سلطان محمود کے مقابلے کی تاب نہ لاسکا، سب نے شکست کھائی اور غزنی سے لے کر خراسان اور حدود ہندوستان تک کی تمام سلطنت سلطان محمود کے قبضہ میں آئی۔ چونکہ اس کی ماں رئیس زابل (قندھار) کی دختر تھی اس لیے اسے بھی محمود زابی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فردوسی بھی شاہنامہ میں لکھتا ہے۔

خجستہ در گہ محمود زابی دریا ست چگونہ دریا کا زراکت را پیدا نیست

شدم بدریا، غوطہ زدم، ندیدم در گناہ بخت من است اس گناہ دریا نیست

حکومت کے ابتدائی ایام میں خلیفہ بغداد القاضی باللہ عباسی اور سلطان محمود کے درمیان کسی وجہ سے تلخ اور ناگوار خط و کتابت شروع ہو گئی۔ خلیفہ عباسی نے اسے بڑے تدبیر کے ساتھ ختم کیا۔ چنانچہ اس نے ایک خلعت فاخرہ دے کر پیش بہا تحائف و جواہر کے ساتھ سلطان محمود کے لیے بھیجی اور اسے امیر الملت میں الدولہ کا خطاب عطا کیا۔ سلطان محمود ۳۸۷ھ میں غزنی سے بلخ اور ہرات پہنچا اور وہاں کے جھگڑے طے کرنے کے بعد واپس غزنی آیا۔ اس کے بعد متعدد بار ہندوستان پر چڑھائی کی اور چند قلعے فتح کیے۔ مسجدی نے انہی اطراف کے ایک سفر میں یہ قصیدہ لکھا تھا۔

بچوں شاہ خسرواں سفر سومات کرد

کر دار خویش را علم معجزات کرد

ماہ شوال ۳۹۱ھ مطابق سنہ ۱۰۰۰ء میں سلطان محمود نے غزنی سے ہندوستان کا رخ کیا۔ اس کے ہمراہ دس ہزار سوار تھے۔ پہلے اس نے پشاور فتح کیا۔ پھر انہی حدود پر اس کا مقابلہ راجہ جے پال سے ہوا جو بے شمار سوار اور پیادہ لشکر اور تین سو ہاتھیوں کے ساتھ مقابلہ میں آیا۔ دونوں طرف سے خوب داد و شجاعت دی گئی مگر آخر کار سلطان محمود فتح یاب ہوا۔ راجہ جے پال اپنے پندرہ رشتہ داروں سمیت گرفتار ہوا جن میں اس کے بھائی اور بیٹے بھی شامل تھے۔ اس معرکہ میں پانچ ہزار کا فرتہ تیغ ہوئے اور مال غنیمت کی کثیر مقدار غازیوں کے ہاتھ آئی۔ راجہ جے پال کے گلے کا ہار جس کی قیمت ایک لاکھ اسی ہزار دینار کے قریب تھی، نیز اس کے دوسرے رشتہ داروں کے گلے کے بیش قیمت ہار بھی اس میں شامل تھے۔ سلطان محمود کو یہ فتح بروز ہفتہ ۸ محرم الحرام ۳۹۲ھ مطابق سنہ ۱۰۰۱ء کو نصیب ہوئی۔ یہاں سے وہ



تبرہندہ کی جانب بڑھا۔ یہ مقام راجہ جے پال کی قیام گاہ تھی محمود نے اسے فتح کر لیا۔

اس کے بعد پھر ماہ محرم ۳۹۳ھ میں وہ غزنی سے براہ سیستان عازم ہندوستان ہوا اور ملتان کے نواح میں بھاتیہ پہنچا جہاں کے راجہ بیجی رائے نے اس کی آمد کی خبر پاتے ہی ڈر کے مارے اپنے آپ کو خنجر سے ہلاک کر لیا۔ اس کا سر سلطان محمود کے حضور لایا گیا۔ علاوہ انہیں ہندوؤں کی ایک بے شمار تعداد تیغ بے دریغ سے عدم آباد کو روانہ ہوئی۔ سلطان محمود کے ہاتھ دو سو ستر ہاتھی مال غنیمت میں آئے۔ داؤد بن نصر ملحد حاکم ملتان نے بھی خائف ہو کر اطاعت قبول کر لی اور سالانہ بیس مرتبہ بیس بیس ہزار درم تانوان دینے کا عہد کیا۔ سلطان محمود جس وقت ملتان کی جانب بڑھ رہا تھا تو راجہ جے پال کے بیٹے اسند پال سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی تھی مگر جنگ کے بعد وہ کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان محمود اس کے بعد براہ راست ہندوستان ملتان پہنچا اور یہ واقعہ ۳۹۶ھ کا تھا۔

اس کے اگلے ہی سال ۳۹۷ھ میں سلطان محمود اور ماوراء النہر کے بادشاہ ایلک خاں کے مابین جنگ ہوئی جس میں سلطان محمود غالب آیا اور ۳۹۸ھ مطابق ۱۲۰۱ء میں ایلک خاں وفات پا گیا۔

۳۹۸ھ مطابق ۱۲۰۱ء میں سلطان محمود ترکستان میں داخل ہوا اور ترکوں کے جھگڑے سے فارغ ہو کر اس نے سندھ کے راجہ سکھ پال نورسہ شاد کا تعاقب کیا۔ وہ گرفتار ہوا اور قید ہی میں مر گیا۔ اسی راجہ سکھ پال نے ایک مرتبہ اسلام بھی قبول کیا تھا اور اسی بنا پر اسے ابو علی سنجر کی قید سے رہا بھی کیا گیا تھا مگر وہ دوبارہ اہل شرک و ارتداد میں شامل ہو گیا تھا۔

۳۹۹ھ مطابق ۱۲۰۲ء میں سلطان محمود نے پھر ہندوستان کا رخ کیا اور راجہ اسند پال کے ساتھ اس کی جنگ ہوئی جس میں راجہ اسند پال ہار گیا اور بے حد و حساب مال غنیمت سلطان محمود کو ملا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر قلعہ بھیم نگر میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا اور وہاں کے خزانوں اور دینیوں پر بھی قبضہ کیا جو بھیم نگر کے مانے سے مدفون اور محفوظ تھے۔ ۴۰۰ھ میں اس نے حکم دیا کہ سونے چاندی کے وہ تمام تخت بے اندازہ دولت اور کثیر اموال غنیمت جسے وہ ہندوستان سے لایا تھا۔ دربار میں پیش کئے جائیں۔ چنانچہ سونے چاندی کے تخت دربار میں بچھائے گئے اور تمام مال دولت کو اس پر تلے رکھ دیا گیا اس نمائش سے اس کا مقصد لوگوں کو مغرب کرنا تھا۔

۴۰۱ھ مطابق ۱۲۰۳ء میں سلطان محمود نے پھر غزنی سے ملتان کا قصد کیا، اور اس علاقہ کے باقی ماندہ حصے پر بھی قابض ہو گیا۔ اس نے یہاں کے بہت سے قرامطہ اور ملاحہ کو بھی موت کے گھاٹ اتارا، اور جو بچ رہے انھیں قلعہ بند کر دیا یہاں تک کہ وہ مر گئے۔ داؤد

۱۔ تبرہندہ۔ فرشتہ کے نزدیک بھٹنڈہ ہے۔ ۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۲۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۳۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۴۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۵۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۶۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۷۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۸۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۱۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۲۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۳۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۴۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۵۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۶۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۷۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۸۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۹۹۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔ ۱۰۰۔ بھٹنڈہ کے قریب ہے۔

۱۔ امیر محمد غزنوی پہلا مشرقی حکمران تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا (شاہان غزنوی کے سیکے "مصنف طامس") و (سیاست نامہ نظام الملک طوسی) ۲۔ فرشتہ کے نزدیک براہ راست ہندوستان کے بجائے براہ راست بھٹنڈہ صحیح ہے۔

۳۔ یہ قلعہ قصبہ بھیم سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے اور قلعہ نگر کوٹ بھی کہلاتا ہے اور کوٹ کا نگرہ سے ۲۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔

۴۔ قرامطہ۔ ملحد مسلمانوں کا ایک فرقہ، جس کا بانی ایک شخص قرامطہ تھا۔ اس نے ۳۸۰ھ میں اس کی بنا ڈالی تھی ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جبروت تشدد سے بہرہ کم مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے چنانچہ ۳۸۹ھ میں اس کے ایک معتقد ابو طاہر کی قیادت میں مائے معظمہ میں خونریز جنگ ہوئی تھی جس میں بیشمار آدمی قتل ہوئے تھے اور بڑی لوٹ مارچی تھی قرامطہ خانہ کعبہ سے بھی اس کا تعلق تھا کہ لے گئے تھے جو بیس سال تک انہی کے پاس رہا (کتاب الملل المفلوغل صفحہ ۱۴۷) و (سیاست نامہ نظام الملک طوسی)

بن نصر حاکم ملتان کو غزنی لے جا کر قلعہ غوری (غورک) میں مقید کر دیا اور وہ اسی کے اندر مر گیا۔

۱۰۲ھ مطابق ۱۱۱۱ء میں سلطان محمود نے تھانیسر کا عزم کیا اور راجہ جے پال ثانی پچاس ہاتھی اور دیگر اموال و تحائف بطور نذرانہ لے کر پیش ہوا مگر سلطان محمود نے اسے قبول نہ کیا اس لیے کہ تھانیسر بہتوں اور مندروں کی وجہ سے مشہور تھا اور سلطان محمود کے پیش نظر بھی (صرف بت شکنی) تھی اور وہ اسی مقصد سے یہاں آیا بھی تھا، اس لیے وہ نذرانہ کیسے قبول کرتا۔ چنانچہ اس نے تھانیسر کے بتوں کو توڑا اور مندروں کو مسمار کیا۔ ان میں سے ایک بت چکر سوم نامی تھا جس کی حفاظت کی خاطر بے شمار ہندوؤں نے اپنی جانیں دیں۔ سلطان محمود اس بت کو اٹھوا کر غزنی لے گیا اور حکم دیا کہ اسے دربار کے آستانہ پر رکھ دیا جائے تاکہ لوگ اس کے اوپر سے چل کر گزریں اور اسے پامال کریں۔

۱۰۳ھ مطابق ۱۱۱۲ء میں سلطان محمود نے گرجستان فتح کیا۔ اسی سال ایک قاصد عزیز مہر کی طرف سے آیا اور جب سلطان کو معلوم ہوا کہ قاصد مذکور کا تعلق فرقہ باطنیہ سے ہے تو ذلت کے ساتھ اسے واپس کر دیا۔

۱۰۴ھ مطابق ۱۱۱۳ء میں سلطان محمود نے شہر بند نہ پر لشکر کشی کی۔ یہ شہر بال تاتھ کے پہاڑوں میں واقع تھا۔ راجہ جے پال ثانی نے کچھ قورج اس قلعہ کے دفاع کے لیے مقرر کی اور خود درہ کشمیر کی جانب چلا گیا۔ چنانچہ سلطان محمود نے یہ قلعہ بڑی آسانی سے مسخر کر لیا اور اس کی نگرانی اور حفاظت کا کام ساریغ کو توال کے سپرد کر کے خود راجہ جے پال ثانی کے تعاقب میں نکلا۔ اس کو ہتانی علاقہ سے اس کے ہاتھ کثیر مال و دولت آیا۔ یہ شمار کا فرقہ تیغ ہوئے اور ان کی ایک بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی اور کچھ کو قیدی بنا کر غزنی روانہ کیا گیا۔

۱۰۵ھ مطابق ۱۱۱۵ء میں سلطان محمود پھر کشمیر کی تسخیر کے لیے نکلا اور موہ کوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر جلد ہی اسے اس محاصرہ سے دست کش ہونا پڑا اس لیے کہ برف باری اور بارش کی زیادتی نے اسے پریشان کر دیا تھا اور کشمیریوں کو پیچھے سے مسلسل لک بھی پہنچ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی پوزیشن پر مضبوطی سے ڈٹے رہے۔ غزنی واپس جا کر سلطان محمود نے اپنی ہمشیرہ کا عقد ابو العباس شاہ ابن نامو خوارزم شاہ کے ساتھ کر دیا اور اپنی ہمشیرہ کو اس کے پاس بھیج بھی دیا۔

۱۰۶ھ مطابق ۱۱۱۶ء میں کچھ بد معاشوں اور اوباشوں نے سلطان محمود کے بہنوئی ابو العباس شاہ کو قتل کر دیا۔ جب اسے اس کی خبر ملی تو وہ غزنی سے بلیخ اور پھر ہان سے خوارزم پہنچا اور وہاں کے سپہ سالار سے اس کی خونریز جنگ ہوئی۔ جس میں سلطان محمود فتح یاب ہوا اور اس نے اس علاقہ کی حکومت پر القون ماش کو مقرر کیا اور اسے خوارزم شاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بہنوئی کے قاتلوں کی خبر لی اور انہیں کیفر کردار کو پہنچا کر غزنی واپس آگیا۔

۱۰۸ھ مطابق ۱۱۱۸ء میں قنوج پر قبضہ کرنے کی غرض سے سلطان محمود غزنی سے روانہ ہوا اور ہندوستان کے سات خوفناک دریاؤں کو عبور کر کے جب وہ قنوج پہنچا تو یہاں کے فرمانروا کو گھنے نے بلاچون وچرا اطاعت قبول کر لی، تحفے نذر گزارنے اور جان کی

۱۔ چکر سوم بت یا چکر سومن اس کے معنی چکر کا آقا یا دیوتا ہے۔ ایرونی جلد اول صفحہ ۱۱ پر اس کی پوری تفصیل درج ہے۔

۲۔ بنانہ یا بندانہ البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ اینٹوں کا ایک قلعہ ہے جو کشمیر کے پہاڑوں میں واقع ہے۔ (البیرونی ترجمہ انگلیزی از سچا و صفحہ ۳۱۷)

۳۔ فرشتہ کے نزدیک وہ کوٹ ہے۔

۴۔ فرشتہ نے قنوج کے فرمانروا کا نام بجائے کورہ کے کنوہ لکھا ہے۔

امان مانگی۔ اس کے بعد سلطان محمود نے قلعہ برہنہ کا رخ کیا جہاں کے حکمران بروٹ نے جب یہ سنا تو قلعہ اپنے عزیزوں کے سپرد کر کے گزشتہ نیشی ہو گیا۔ اہل قلعہ نے بھی جب یہ دیکھا کہ وہ مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتے تو ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور تیس ہاتھی بطور نذرانہ پیش کیے اور پناہ چاہی۔ یہاں سے دریائے جمنہ کے کنارے کنارے قلعہ ہماون پہنچا، جہاں کے حاکم کل چندر کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ہاتھی سواروں کو حکم دیا کہ وہ اسے دریا کے پار بھگا کر لے چلیں، اسی اثنا میں سلطان محمود کے لشکر بھی آنودار ہوئے۔ کل چندر نے یہ دیکھ کر اپنی ہی تلوار سے خودکشی کر لی، ع

### رفت بدوزخ ہم از آل راہ آب

زیستن چوں بکام خشم بود مردن از زیستن بے بہتر

قلعہ قنوج سر کرتے وقت ۸۵ ہاتھی اور بے شمار مال غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان محمود شہر متھرا کی جانب بڑھا۔ یہ شہر کافروں کا معبد تھا اور کرشن بن یاس دیو کی جائے پیدائش اور ہندو کرشن کو خدا مان کر پوجتے تھے۔ یہاں اتنے بت خانے تھے کہ اگر اسے کفر کی کان کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔ اس شہر کو سلطان محمود نے بغیر جنگ و جدل پامال کیا اور بے شمار مال غنیمت اس کے ہاتھ آیا۔ یہاں سونے کا ایک بت بھی تھا جسے سلطان محمود کے حکم سے توڑ ڈالا گیا۔ اس بت کا وزن ۹۹۳۰۰ مثقال اصلی سوتا تھا اور یاقوت کا ایک ٹکڑا بھی اس میں ایک جگہ پیوست تھا جس کا وزن ۴۵۰ مثقال تھا۔ ایک کوہ پیکر ہاتھی جو ہندوستان کے راجوں میں سے ایک راجہ گو بند چند کی ملکیت تھا۔ سلطان محمود نے اس کی شہرت سن رکھی تھی اور اس کے دل میں اس کو خریدنے کی تمنا تھی مگر وہ کسی طرح پوری نہیں ہوتی تھی۔ اسے حسن اتفاق کہئے کہ ایک روز وہی ہاتھی بغیر فیل بان خیمہ شاہی میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر سلطان محمود کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، چنانچہ اس نے اس کا نام اسی مناسبت سے خدا داد رکھا۔ اس یلغار کے بعد جب سلطان محمود غزنی پہنچا تو اس کے ساتھ ۴ کروڑ ۵۳ ہزار درم اور ساڑھے تین سو سے زیادہ ہاتھی مال غنیمت کے طور پر تھے۔

۱۱۹ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں سلطان پھر ہندوستان آیا اور کالنجر کے راجہ نندا کے ساتھ دریائے جمنہ کے کنارے اس کا سخت مقابلہ ہوا۔ راجہ نندا کے پاس ۲۵ پیادہ فوج اور ۶۴۰ ہاتھی تھے۔ اس نے راجہ قنوج کو بھی اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی اور راجہ جے پال جو متعدد بار سلطان محمود سے ہزیمت کھا کر بھاگا تھا اس کی بھی مدد کی تھی مگر اتنے لاؤشکر کے باوجود وہ سلطان محمود کی ظفریاب فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور ڈر کے مارے اپنا جملہ ساز و سامان چھوڑ کر چند خاص مصاحبوں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ جب سلطانی حصار شہر میں داخل ہوئے تو اسے خالی پایا۔ فوج اور دیگر حفاظتی دستوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا چنانچہ اسے خوب لوٹا۔ پھر اس کے بعد راجہ نندا کا تعاقب کرتے ہوئے جب سلطانی عساکر ایک جنگل میں پہنچے تو وہاں ۵۸ ہاتھی اس کے ہاتھ آئے۔ سلطان محمود یہ تمام مال و دولت لے کر غزنی پہنچا۔ ان معرکوں میں کفار کے اکثر شرابل اسلام کے قبضہ میں آئے اور ان شہروں کے باشندوں نے طوعاً و کرہاً اسلام قبول کیا۔

۱۲۰ھ مطابق ۱۲۱۱ء میں سلطان محمود پھر کشمیر پہنچا اور ایک ماہ تک اس نے قلعہ موہر کوٹ کا محاصرہ کیا مگر

۱۵ برہنہ - یہی وہ مقام ہے جسے بدن اور بعد میں ہندو شہر کہا گیا۔

۱۶ ہماون، دوسرے لفظوں میں جہاں ہے۔



وہ اتنا مستحکم تھا کہ فتح نہ ہو سکا۔ سلطان محمود اسے چھوڑ کر جانب لاہور روانہ ہوا اور موسم بہار کے شروع ہوتے ہی غزنی لوٹ گیا۔  
 ۱۳ھ مطابق ۱۰۲۲ء میں سلطان محمود نے پھر راجہ نندا کے علاقہ کا رخ کیا اور جب قلعہ گوالیار پہنچا تو بغیر کسی رکاوٹ کے وہ فتح ہو گیا اور وہاں کے حاکم سے نذرانے قبول کرنے کے بعد سلطان محمود نے پھر اُسی کو حاکم مقرر کر دیا۔ اس نذرانہ میں ۳۵ ہاتھی بھی شامل تھے۔ یہاں سے کالج پھنچا جہاں کے حکمران راجہ نندانے تین سو ہاتھی کی پیشکش کی اور جان کی امان مانگی۔ علاوہ انہیں راجہ نندا نے ہندی زبان میں ایک قصیدہ سلطان محمود کی مدح میں کہہ کر بھیجا جسے سلطان نے فصیحائے ہند اور اپنے ملک کے شاعروں کو بھی سنوایا سب نے اسے بے حد پسند کیا اور سلطان محمود کو خود بھی اس پر بہت فخر و تازہ تھا۔ چنانچہ اس کے صلہ میں اس نے راجہ نندا کو پندرہ قلعوں کا حکمران مقرر کر دیا۔ راجہ نندانے بھی سلطان محمود کے حضور بے حساب زر و مال اور جواہر ہر ہیت بھیجے۔ اس ہم سے سلطان محمود کامران اور دلشاد غزنی واپس پہنچا۔

۱۴ھ مطابق ۱۰۲۳ء میں سلطان محمود نے اپنے عساکر کا ہرہہ کا اور ان لشکروں کا جو اطراف میں متعین تھے محاسبہ کیا یہ سب ۵۴ ہزار سوار اور تیرہ سو ہاتھی احاطہ تحریر میں آئے۔

۱۵ھ مطابق ۱۰۲۴ء میں سلطان محمود بلخ پہنچا۔ جب اس نے دریائے جیخون پار کیا تو ماوراء النہر کے سردار اس کے استقبال کو آئے اور یوسف قدر خاں جو پورے ترکستان کا بادشاہ تھا وہ بھی آیا اور سلطان محمود کی ملاقات سے فیض یاب ہوا۔ ایک محفل جشن آراستہ کی گئی اور دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو تحفے اور نذرانے پیش کیے۔ علی تگین کے ہاتھوں ماوراء النہر کے عوام سخت پریشان تھے جب اسے سلطان محمود کے آنے کی خبر ملی تو وہ بھاگ بھاگ کھڑا ہوا مگر تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا گیا اور ہندوستان کے ایک قلعہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان محمود واپس غزنی پہنچا اور موسم سرما وہیں گزارا۔

سلطان محمود نے ایک بار پھر سومات کی جانب لشکر کشی کی۔ سومات بحر ہند کے کنارے ایک بڑا شہر ہے جو برہمنوں کا معبد ہے۔ ان کا معبود ایک بہت بڑا بت ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے سونے کے بت ہیں۔ اگرچہ بعض مودخوں نے اس بڑے بت کا نام ستا لکھا ہے اور اس کے بارے میں یہ خیال آرائی بھی کی ہے کہ یہ ویسا ہی بت ہے جیسا کہ مشرکین عرب حضرت محمد کے عہد رسالت میں ہندوستان کے ساحل پر لائے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے نزدیک بے بنیاد ہے اس لیے کہ ہندوستان کے برہمنوں کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ یہ بت کرشن کے وقت سے اسی جگہ موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے چار ہزار سال کے قریب ہو چکے ہیں اور اس کا نام بھی ہندی زبان میں سو بھاتا تھ یعنی خالق حسن ہے۔ اس غلطی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان دونوں ناموں میں کافی مشابہت ہے۔ اس ہم میں سلطان محمود نے پہلے پتن فتح کیا جو ہنروالہ کے نام سے مشہور ہے اور گجرات میں واقع ہے۔ جہاں سے خاصا سامان رسد لے کر وہ سومات پہنچا۔ اس کے پہنچتے ہی اہل قلعہ نے دروازہ بند کر لیا جس کی پاداش میں قلعہ مفتوح ہونے پر ان کو سخت خمیازہ برداشت کرنا پڑا اس بڑے بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے غزنی بھیجے گئے جہاں انھیں جامع مسجد کے دروازہ پر رکھ دیا گیا اور لوگ آتے جاتے اُسے

۱۶ھ ابو الفضل نے آئین اکبری میں بجائے ۱۳ھ کے ۱۶ھ لکھا ہے۔ (آئین اکبری حصہ اول صفحہ ۴۲۳)

۱۷ھ ابیرنی لکھتا ہے کہ سومات کا بت مادید کا لنگ تھا جسے چاند کا کوڑھ پن دور کرنے کے لیے نصب کیا تھا۔ اس کے نزدیک لفظ سومات کا معنی چاند کا دیوتا ہے۔

(ابیرنی حصہ اول صفحہ ۱۷۶)

۱۸ھ پتن۔ مادھن پور سے بیس میل اور گجرات سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

پامال کرنے لگے۔ واپسی کے وقت بیرم دیو سلطان محمود کی راہ میں حائل ہوا۔ اس کا شمار ہندوستان کے بڑے راجوں میں ہوتا تھا مگر سلطان محمود نے مصلحتاً اس سے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھا، اور راستہ کاٹ کر سندھ کی جانب نکل گیا اور ملتان پہنچا۔ یہاں خوراک اور پانی کی قلت کے باعث فوج کو بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ اس لیے قیام کیے بغیر وہ واپس غزنی چلا گیا۔

۱۱۸۷ھ میں خلیفہ عبدالقادر باللہ نے نامہ نیابت کے ساتھ حکومت خراسان، ہندوستان، نیمروز اور خوارزم کا علم بھی سلطان محمود کو بھیجا اور اس کے بھائیوں اور فرزندوں کو مختلف خطابات سے نوازا۔ سلطان محمود کو کھت الدولہ والا سلام، اس کے فرزند اکبر امیر مسعود کو شہاب الدولہ و جمال الملتہ اور برادر خرد و امیر محمد کو جلال الدولہ اور امیر یوسف کو عضد الدولہ وغیرہ کے خطابات دیئے۔ اسی سال نواح ملتان کے جاٹوں نے سر اٹھایا تو ان کی سرکوبی کے لیے سلطان محمود نے ملتان پر چڑھائی کی۔ جاٹوں کے پاس چار ہزار کشتیاں تھیں اور بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد آٹھ ہزار تھی۔ ان کشتیوں میں جاٹوں کے جملہ اہل و عیال بھی تھے۔ عین دریا میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ جاٹوں کی بہت سی کشتیاں غرقاب ہو گئیں۔ جو بچ گئیں ان کے اکثر لوگ تلوار کا لقمہ بنے۔ جاٹوں کے اہل و عیال گرفتار ہوئے۔ اس شکست کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو سلطان محمود کی کشتیوں کی تعداد مقابلتہ زیادہ تھی دوسرے اس نے لڑائی بڑی حکمت عملی سے لڑی۔ اس لڑائی سے سلطان محمود مظفر و منصور غزنی لوٹا۔

۱۱۸۸ھ میں وہ باوردی جانب روانہ ہوا اور اس شہر کے ترکوں کا قلع قمع کرنے کے بعد رے پہنچا اور اس علاقہ کے ان خزانوں اور دقینوں پر قبضہ کیا جو ایک مدت سے موجود تھے اور بھوٹے مذاہب کے معتقدین اور قرامطہ کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔ اس کے بعد وہ اصفہان اپنے فرزند اکبر امیر مسعود کے سپرد کر کے غزنی واپس چلا گیا جہاں اس نے ابھی زیادہ دن قیام نہیں کیا تھا کہ مرضِ دق میں مبتلا ہو گیا، روز بروز کمزور ہوتا گیا تاہم اپنے آپ کو تندرست اور طاقتور ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔ بحالت مرض وہ بلخ بھی گیا اور موسمِ بہار میں وہ وہاں سے واپس آیا مگر اس مرتبہ اس کا پیمانہ عشر بیز ہو چکا تھا اور آخر کار بروز منگل ۲۳ ربیع الاول ۵۷۲ھ وفات پائی اور غزنی میں دفن ہوا۔ اس کی عمر ۶۰ سال تھی، ۳۱ سال حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ جب سلطان محمود نزع کی حالت میں تھا تو اس نے حکم دیا کہ تمام خزانے، مال و دولت اور تحائف و نوادرا اس کے سامنے لائے جائیں چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور اس نے جملہ املاک کی طرف بار بار حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور آپس بھرتا رہا مگر ایک چھدام بھی کسی کو دینے کے لیے نہ کہا۔ سلطان محمود نے بارہ مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی اور ہر مرتبہ وہ بے پناہ جذبہ جہاد کے ساتھ سرگرم عمل تھا انہماکِ حسابہ عند ربہ اور فردوسی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا مشہور خاص و عام ہے، چنانچہ عارف جامی لکھتا ہے:

خوش است قدر شناسی کہ چوں خمیدہ پیر      سهام حادثہ را کرد عاقبت قوسی

گذشت شوکت محمود و در زمانہ نہ ماند      جز این فسانہ کہ شناخت قدر فردوسی

اور تذکرہ محمد عرفی میں بھی یہ قطعہ سلطان محمود سے منسوب ہے۔

زہیم تیغ جہاں گیرد گرز قلعہ کشاد      جہاں مسخر من شد چو من مسخر لے

گئے یفرود بدولت ہی شستم شاد      گئے بحر من ہی رفتے زجلے بجائے

گئے تفاخرے کرم کہ من کسے ہستم      کنوں براہدے بنیم ہی امیر و گداستے

ہزار قلعہ کشادہ بیک اشارتِ دست      بسے مصافِ شکستہ بیک فشردنِ پائے  
چو مرگ تا ختن آور و بیچ سودداشت      بقا بقائے خدایے است ملک ملک خدائے

## سلطان محمد بن سلطان محمود غزنوی

لقب جلال الدولہ ۴۲۱ھ میں اپنے باپ کی وصیت کے مطابق اور اسی کے ایک رشتہ دار ابن ارسلان کے استصواب اور رائے سے غزنی میں تختِ سلطنت افرودہ ہوا۔ ابھی ڈیڑھ ماہ گزرا تھا کہ امیر ایاز نے بعض دوسرے ملازمین کے ساتھ مل کر سازش کی افرودہ سب کے سب شاہی اصطبل کے گھوڑوں پر سوار ہو کر شہاب الدین مسعود کے پاس ملازمت کی غرض سے روانہ ہو گئے۔ شہاب الدین مسعود اصفہان میں تھا جہاں پہنچنے کے لیے انھوں نے نبط کا راستہ اختیار کیا۔ امیر محمد نے سوندھی رائے ایک ہندو کو شکر بیار کے ساتھ ان کے تعاقب میں بھیجا، مگر امیر ایاز جنگ میں اس پر غالب آیا۔ اس نے سوندھی رائے کو ہندوؤں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ قتل کر دیا۔ ان کے سر کاٹ کر امیر محمد کے پاس بھیج دیئے اور خود نیشاپور میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملا۔ چار ماہ بعد امیر محمد نے اپنے خیموں کو بسط کی جانب منتقل کر دیا اور پوری جمعیت کے ساتھ اپنے بھائی کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے نکلا۔ جب تلگین آباد پہنچا تو تمام امراء اس سے برگشتہ ہو گئے اور اسے اندھا کر کے جہرستان کے علاقہ کے قلعہ بچ میں ڈال دیا۔ اس کے بعد تمام فوجوں اور خزانوں کے ساتھ وہ ہرات میں امیر مسعود کے ساتھ جا ملے اندھے سلطان محمد نے صرف پانچ ماہ حکومت کی مگر بقول قاضی بیہناوی ۴ سال میں سے نو سال اس نے قید میں گزارے۔ واللہ اعلم۔

صاحبِ لب التواریخ لکھتا ہے کہ محمد بن محمود نے پہلے پہل اپنے باپ کی زندگی میں چار سال بادشاہی کی تھی اس کے بعد نو سال وہ قید میں رہا اور اپنے بھائی مسعود کے قتل کے بعد اس نے ایک سال اور حکومت کی۔ اس کے بعد انتقال کیا۔

امیرے را کہ بر قدش ہزاراں پاسباں بینی      کنوں بر قہ گورش کلاغاں پاسباں بینی  
مہر اسپ ارسلان دیدی نہ رفت رفتہ برگردی      برو آقا بخاک اندرتن اسپ ارسلان بینی

## شہاب الدولہ سلطان مسعود بن محمود غزنوی

سلطان محمود کے امیروں اور وزیریوں کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا اور ہرات سے بلخ جا کر اس نے موسمِ سرما گزارا۔ احمد بن حسن میمنہ کو سلطان محمود نے قلعہ کالجری میں قید کر رکھا تھا، اسے بلا کر اپنا وزیر بنایا۔ پھر بلخ سے غزنی واپس آیا اور وہاں سے اصفہان اور رے کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ جب ہرات پہنچا تو ترکمانوں سے مقابلہ ہو گیا، ان سے شکست کھائی اور غزنی واپس چلا گیا۔ اس کی کمزوری کے باعث ترکمان روز بروز دیر ہوتے گئے، ان کے حوصلے حد سے زیادہ بڑھ گئے جس کا ثبوت آئندہ کے واقعات سے ملے گا۔

۴۲۳ھ میں احمد بن میمنہ کی انتقال ہو گیا اور ۴۲۴ھ میں سلطان مسعود ہندوستان کی تخیل کے عزم سے براستہ قلعہ سرستی روانہ ہوا۔ یہ قلعہ کشمیر میں واقع ہے۔ سب سے پہلے اس نے اس کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ کثیر مالِ غنیمت ہاتھ آیا جسے کہ



وہ غزنی لوٹ گیا۔ ۴۲۵ھ میں سلطان مسعود نے آمل اور ساری کو تسخیر کیا اور کالنجراور طبرستان تک اپنے قاصد بھیجے تاکہ ہر جگہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور اسی کا سکہ رواں ہرے تغدی بیگ اور حسین ابن علی ابن میکال کو ایک لشکر عظیم کے ساتھ نیشاپور سے بھیجا تاکہ وہ ترکمانوں کی سرکوبی کریں۔ ذیقین میں سخت جنگ ہوئی۔ حسین قید ہو گیا اور تغدی بیگ بھاگ کر سلطان مسعود کے پاس پہنچ گیا۔

امیر احمد نہال تگین خازن سلطان محمود کو کسی قصور میں منراٹے جرمانہ دی گئی تھی، اسے بلا کر ہندوستان بھیجا مگر یہاں آ کر اس نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان مسعود نے ایک ہندو جرنیل ناہر کو اس کے مقابلہ کے لیے نامزد کیا۔ امیر احمد مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان جنگ سے بھاگ کر منصورہ سندھ پہنچا اور غرقاب ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر غزنی بھیج دیا گیا۔

۴۲۶ھ مطابق ۱۰۳۶ء میں ایک نیا محل تعمیر ہوا جس میں جواہرات سے مرصع تخت نصب کیا گیا تھا، اس پر ایک مرصع تاج بھی آویزاں تھا۔ سلطان مسعود اس تخت پر جلوہ افروز ہوا، سر پہ وہی تاج پہنا اور رعایا کو بار بار پی بجھتی۔ اسی سال اس نے اپنے فرزند امیر مود کو طبل و علم کے اعزاز کے ساتھ بلخ بھیجا اور خود ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ سب سے پہلے قلعہ ہانسی فتح کیا پھر قلعہ سون پت پہنچا جہاں کا حاکم دیپال بھاگ کر جنگل میں جا چھپا اور قلعہ بغیر کسی دقت کے فتح ہو گیا۔ یہاں سے کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ اور دیپال کی فوج کی ایک بڑی تعداد مسعودی عساکر کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ پھر سلطان مسعود آگے بڑھا تو وادی رام میں داخل ہوا جہاں کے حاکم رام نے بہت سارے مال نذرانہ کے طور پر بھیجا، ساتھ ہی ایک عرضداشت کے ذریعہ اپنی غیر حاضری کی معذرت بھی کی۔ امیر مسعود نے اس کی معذرت قبول کر لی۔ اس کے بعد اس نے اپنے فرزند امیر مود کو طبل و علم کے اعزاز کے ساتھ لاہور بھیجا اور خود غزنی کی طرف مراجعت کی۔

۴۲۸ھ مطابق ۱۰۳۸ء میں سلطان مسعود اس ارادہ سے بلخ روانہ ہوا کہ ترکمانوں کو قرار واقعی سزا دے۔ جب ترکمانوں نے اس کی آنکھیں غمگین کی تو وہ بلخ چھوڑ کر اس کے اطراف و نواح میں پناہ گزین ہو گئے اور سلطان مسعود دریائے جیون سے گزر کر تمام ماوراءالنہر پر مسلط ہو گیا۔ داؤد ترکمان جس نے تغدی بیگ اور امیر حسین کو قبل ازین شکست دی تھی پوری جمعیت کے ساتھ جانب بلخ روانہ ہوا۔ اس دوران میں سلطان مسعود بھی وہاں پہنچ گیا۔ داؤد ترکمان ابھی مرو میں تھا کہ یہ اطلاع آئی کہ تغدی بیگ نے گورگاں کے نواح میں ظلم و ستم برپا کر رکھا ہے۔ سلطان مسعود نے جب یہ دیکھا تو حکم دیا کہ اُسے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے۔ سلطان مسعود نے اس قبیلہ کے

۱۔ آمل۔ طبرستان کا پایہ تخت اور طبرستان علامہ طبری کا مولد ہے۔

۲۔ ساری یعنی سرپاہ۔ یہ بھی طبرستان کا ایک قصبہ ہے مگر لیاب کی رائے میں یہ ماثر ندان میں واقع ہے۔

۳۔ امیر احمد نہال تگین۔ تاریخ سبکتگین میں اسے سلطان محمود کا خالہ زاد بیٹا لکھا ہے۔

۴۔ جرنیل ناہر کے بجائے یہ قتی تلک لکھتا ہے اور فرشتہ امرائے ہند میں سے ناٹھ کا نام بتاتا ہے۔

۵۔ المنصورہ سندھ میں واقع ہے جو پہلے ہمنوا کا شہر تھا۔ محمد بن قاسم نے اسے فتح کر کے اس کا یہ نام رکھا۔ (آئین اکبری از ابوالفضل)

۶۔ ہانسی۔ شہر صہا کے مشرق کی جانب ۱۱ میل کے فاصلہ پر ہے۔

۷۔ سون پت۔ جسے اب سونی پت کہتے ہیں۔ دہلی کے شمال کی جانب ہے۔

ہر دار بیغوترکمان سے بھی اس امر کا اہم لیا کہ آئندہ وہ کسی قسم کی ناشائستہ حرکات کا مرتکب نہیں ہوگا اور اس کے لیے مناسب حدود مقرر کر کے سلطان مسعود ہرات چلا گیا۔ راستہ میں ترکمانوں کی ایک جماعت اس پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے سلطان مسعود کے ہمراہیوں میں سے چند ایک کو قتل کیا اور سامان لوٹ لیا۔ سلطان مسعود نے اس کا بدلہ لینے کے لیے جن لشکریوں کو نامزد کیا انھوں نے ترکمانوں کی اس جماعت کو تہ تیغ کر دیا اور ان کے اہل و عیال کو مقتولین کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ سلطان مسعود کے حضور پیش کیا۔ سلطان نے ان سروں کو گدھے پر لدا کر بیغوترکمان کے پاس بھیجا اور بیٹوں نے معذرت خواہی کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ وہی بیغو ہے جس کی مدح میں ایران کے ایک شاعر ضیائی نے قصیدے لکھے تھے، جن میں سے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:-

کاراوقادہ بے تو مرا با گریستن	عیب است عیب در غم تو ناگریستن
شب تابروز کار من و روز تابشب	تالیدن است و از غم تو با گریستن
گفتی ز عشق من نگری و بر حقی	فرقے است از فشاندن خوں ناگریستن
ما را بدولت غم عشق تو ہر زمان	صد گونہ محنت است نہ تنہا گریستن
نے جید ز مہر تو الا گداختن	نے چارہ زورد تو الا گریستن
از روزگار وعدہ مرا در فراق تو	امروز خفہ خوردن و فردا گریستن
از عہد تست فتنہ و گرنہ چہ لائق است	از من بعد خسرو و نیا گریستن
بیغو ملک شد آنکہ پدید آورد ز تیغ	از پر دلاں بوقف ہیجا گریستن
خسرو نظام دیں کہ بوقت نبرد او	آمد ز خاک رسم و دارا گریستن

ترکمانوں کی سرکوبی کے بعد سلطان مسعود ہرات سے نیشاپور اور پھر طوس پہنچا۔ ترکمانوں کی ایک جماعت راستہ میں اس کے ساتھ جنگ آزما ہوئی مگر جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بادرود کے باشندے اپنا شہر ترکمانوں کے حوالے کر چکے تھے، سلطان مسعود نے اس کے قلعہ پر قبضہ کر کے سب کو مرواڈالا اور اس کے بعد موسم سرما نیشاپور میں گزارا۔

۴۳ھ میں ترکمان طغرل کا سر کچلنے کے لیے سلطان مسعود روانہ ہوا۔ اس نے بادرود میں علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ جب طغرل بھاگ گیا تو سلطان مسعود وہاں سے لوٹ کر ہمنہ کے راستے سرخس پہنچا۔ اس نے ہمنہ کے قلعہ کو زمین دوز کر دینے کا حکم دیا اور وہاں کی رعایا میں سے بعضوں کو مرواڈالا اور اکثروں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے۔ وہاں سے وہ زیرقان کی طرف بڑھا جہاں ترکمانوں نے ایک لشکر عظیم کے ساتھ سلطان مسعود کا مقابلہ کیا۔ اس معرکہ میں غزنی کے اکثر سپہ سالار برگشتہ ہو کر دشمن سے جاملے اور سلطان تن تنہا میدان میں رہ گیا اور آخر کار ہزارہو ہند اس معرکہ سے صیج و سلامت نکل آیا۔ یہ واقعہ ۴۳ھ میں پیش

۱ ضیائی - ضیاالدین مجندی الفارسی شیراز کا باشندہ تھا جو ان ہی میں اس نے خجند میں سکونت اختیار کر لی تھی وہ سلطان کا مداح تھا۔

۲ ہمنہ فارسی میں مینہ ہے جو ضلع خادیاں کا ایک قصبہ ہے

۳ سرخس - اس شہر کو کیکاؤس نے آباد کیا تھا۔

۴ زیرقان - معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام غلطی سے لکھا گیا ہے اصل میں زندخان ہے جو سرخس سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔

آیا تھا۔ اس کے بعد سلطان مسعود مروپنچا۔ اس کے اطراف کے کچھ لشکری اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور وہ غور کے راستہ غزنی پہنچا۔ سردار بغیر جنگ کے میدان سے بھاگ نکلے تھے ان کو سزائیں دیں اور بعضوں کو مثلاً علی دایہ، حاجب بزرگ اور بیگ تغدی وغیرہ کو ہندوستان بھیج کر قلعوں میں بند کر دیا اور وہ سب قید میں مر گئے۔

ترکمانوں کی سرکوبی کے لیے سلطان مسعود نے طے کیا کہ پہلے وہ ہندوستان جا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرے۔ یہاں سے لشکر عظیم لے کر واپس آئے اور ترکمانوں پر چڑھائی کر کے انہیں قرار واقعی سزا دے، چنانچہ اس نے امارت بلخ امیر مودود کے سپرد کی اور خواجہ محمد بن عبد اللہ کو اس کا وزیر مقرر کیا۔ اس کے بعد اپنے بیٹے امیر مجدود کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ ملتان روانہ کیا۔ اپنے دوسرے بیٹے امیر ابن دیا کو غزنی کے پہاڑوں کے دامن میں متعین کر دیا تاکہ دوسرے صانع کے افغانوں کی روک تھام کرے جنہوں نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ اپنے باپ سلطان محمود کے ان خزانوں کو اونٹوں پر لاد کر ہندوستان روانہ ہو گیا جو غزنی اور اس کے نواح کے قلعوں میں محفوظ تھے اور راستہ ہی میں اپنے اندھے بھائی امیر محمد کو لانے کے لیے کچھ کو اس کے پاس بھیجا۔ وہ بزرگ خاندان میں مقید تھا۔ سلطان مسعود ابھی ماریکہ کے سرحدی قلعہ تک پہنچا تھا کہ اس کے اپنے ہی ملازموں اور غلاموں نے وہ تمام مال و دولت لوٹ لیا جو اس کے ہمراہ تھا۔ اس آشنائیں امیر محمد بھی پہنچ گیا چنانچہ سلطان مسعود کے مظالم کا خاتمہ کرنے کے لیے وہ امیر محمد کے پاس گئے اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد کلم بغاوت بلند کر کے وہ سلطان مسعود پر حملہ آور ہوئے۔ بگڑے ہوئے حالات کے پیش نظر اس نے قلعہ میں پناہ لے رکھی تھی۔ دوسرے دن تمام فوج اٹھ کھڑی ہوئی اور سلطان مسعود کو قلعہ سے باہر نکال کر لے آئی اور قیدی بنا کر اسے قلعہ کیری میں بند کر دیا یہاں تک کہ ماہ جمادی الاول ۴۳۲ھ ایک جھوٹا حکم امیر محمد کے نام سے اس قلعہ کے کوتوال کے پاس پہنچا کہ وہ سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھیج دے۔ کوتوال نے اس کی تعمیل کی اور سلطان مسعود کا سر کاٹ کر بھجوا دیا۔ قطعہ

زحادثاتِ زمانم ہمیں پسند آمد کہ خوب وزشت و بدونیک در گذر دارم

کے کہ تاراج مرقع بسر نہاد صباح نماز شام در آخشت زیور سر دارم

یہ تفصیل کتاب نظامی کے بموجب ہے مگر قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اس کے نزدیک سلطان مسعود ۴۳۲ھ میں سلجوقیوں سے شکست کھا کر ابھی غزنی پہنچا تھا کہ امیر محمد نے اسے گرفتار کر لیا جو اس کی غیر حاضری میں اپنی پوزیشن کافی سے زیادہ مضبوط کر چکا تھا مگر فتاری کے بعد اس نے اسے قلعہ میں بند کر دیا تھا جہاں امیر محمد کے بیٹے نے جا کر اسے قتل کر دیا۔

سلطان مسعود کی حکمت گیارہ سال رہی، مگر یہ امر قابل غور ہے کہ قاضی بیضاوی نے اس کی وفات کا سال ۴۳۳ھ لکھا ہے۔ ان تمام شاعروں میں سے جنہوں نے سلطان مسعود کے عہد حکومت میں نشوونما پائی ایک شاعر ستو چہری بھی تھا جس نے اس کے وزیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

ہمی ناز و بعدش شاہ مسعود

چو بینمیر چو نوشیروان عادل

لے بزرگ خاندان۔ بزرگ خاندان

لے ماریکہ۔ فرشتہ دے مرکارہ لکھا ہے بعضوں کے نزدیک یہ قصبہ دریائے جہلم کے کنارے تھا ایک انگریز مصنف راولپنڈی اپنے ایک نوٹ میں اسے ایک دشوار گزار دروازہ بتا رہے ہیں اور راولپنڈی اور لکھ کے درمیان تھا۔



## سلطان مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

بامیان میں اپنے باپ کے قتل کے بعد سلطان مودود وزیروں اور امیروں کی متفقہ رائے سے تخت نشین ہوا۔ باپ کے قتل کا انتقام لینے کے لیے اس نے ماریکلہ کی جانب کوچ کا ارادہ کیا مگر ابو نصر احمد بن محمد بن عبدالصمد نے اسے اس سے باز رکھا اور غزنی لے گیا۔ یہاں سے ایک لشکر عظیم کے ساتھ سلطان مودود اپنے اندھے چچا امیر محمد بن چڑھائی کرنے کے لیے نکلا۔ وہ ابھی دیپور کے قریب تھا کہ امیر محمد کے ساتھ اس کی ٹڈ بھڑ ہو گئی، جس نے آخر خونریز جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ دن بھر لڑائی ہوتی رہی، رات ہونے پر فریقین اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو سلطان مودود نے امیر محمد کے ایک معتبر جرنیل کو اپنے ساتھ بلا لیا۔ امیر محمد اور اس کا لڑکا احمد دونوں گرفتار ہو گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا۔ سلطان مودود نے اس مقام پر ایک شہر آباد کیا جس کا نام فتح آباد رکھا۔ یہ فتح اسے ماہ شعبان ۴۳۲ھ میں ہوئی تھی اور ایک دوسرے قول کے مطابق ۴۳۳ھ ہے۔

چونکہ سلطان مودود خواجہ احمد بن عبدالصمد سے ناراض تھا اس لیے اس نے اسے غزنی میں قید کر دیا جہاں آخر کار وہ مر گیا۔ اسی سال اس نے ابو نصر محمد بن احمد کو ہندوستان بھیجا تاکہ نامی ابن محمد کے ساتھ جنگ کرے۔ نامی اس جنگ میں مارا گیا۔

۴۳۴ھ میں سلطان مودود کے حکم سے ارتگیں کو ایک جمعیت کے ساتھ بلوچستان کی جانب روانہ کیا گیا تاکہ وہ داؤد ترکمانی کے ساتھ جنگ کرے اس جنگ میں اس کے بہت سے آدمی کام آئے۔ ارتگیں پھر بلخ کی طرف بڑھا اور وہاں اس نے سلطان مودود کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اسی کے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا۔ ارتگیں کو وہاں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ترکمانوں نے پوری طاقت کے ساتھ اس پر چڑھائی کر دی۔ وہ ان کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکا اس لیے واپس غزنی چلا آیا۔ ۴۳۵ھ میں سلطان مودود نے غزنی کے کوتوال ابو علی کو قید کر دیا مگر چند روز کے بعد پھر اس کی رہائی کا حکم بھی جاری ہو گیا اور کوتوال غزنی کے علاوہ اسے دیوان مملکت بھی بنا دیا گیا اور اس کے بجائے بسوری بن المینور دیوان کو قید خانہ میں ڈال دیا جو وہیں مر گیا۔ سلطان مودود نے ارتگیں کو بھی بغیر سزا دیئے نہ چھوڑا۔

۴۳۶ھ میں جب خواجہ ظاہر نے جسے خواجہ احمد کے بعد وزیر مقرر کیا گیا تھا انتقال کیا تو خواجہ امام ابو الفتح عبدالرزاق کو اس کی جگہ وزیر مقرر کیا گیا۔ اسی سال طغرل حاجب کو بلط کی جانب بھیجا جو زنگی ابو منصور برادر ابو الفضل کو گرفتار کر کے غزنی لایا۔ پھر سیستان چلا گیا۔ رباط امیر کے مقام پر ترکمانوں کے ساتھ اعلیٰ کی خونریز جنگ ہوئی۔ طغرل حاجب اس جنگ میں فتح یاب ہوا۔ اس کے بعد وہ گرمیہ پہنچا اور اس علاقہ کے ترکمانوں کو جنھیں سرخ کلاہ کہا جاتا تھا تیغ کے گھاٹ اتارا اور ان کی کافی تعداد کو گرفتار کر کے غزنی لے آیا۔ سلطان مودود نے طغرل حاجب کو ۴۳۷ھ میں تکیہ آباد بھیجا جہاں پہنچ کر اس نے حکم بغاوت بلند کر دیا۔ جب سلطان مودود کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے علی بن ربیع کو اس کی سرکوبی کے لیے نامزد کیا۔ طغرل حاجب ڈر کے مارے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ بھاگ گیا۔ علی بن ربیع نے اس کی فوج کو غارت کیا اور کچھ سپاہیوں کو گرفتار کر کے غزنی بھیج دیا۔

۴۳۹ھ میں امیر قصدار نے بغاوت کی، اور جب اس نے حاجب بزرگ ارتگیں کے ہاتھ سے شکست کھائی تو اطاعت قبول کر لی۔ ۴۴۰ھ میں سلطان مودود نے اپنے فرزند ان ابوالقاسم محمود اور منصور کو بیک وقت خلعت اعزاز اور طبل و علم عطا کیا۔ ان میں سے

لے سرخ کلاہ یعنی قرلباش۔ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ترکی میں قزل کے معنی سرخ اور باش کے معنی سر ہے

ایک کو ہندوستان بھیجا اور دوسرے کو پُرشور۔ علاوہ انہیں ابو علی حسن کو توال غزنی کو بھی ہندوستان روانہ کیا تاکہ وہ جاگیر سرکشوں کو قرار واقعی  
مزا دے اور جب وہ خدمات شائستہ بجالانے کے بعد غزنی واپس ہوا تو اسے میرک بن حسن کے سپرد کر دیا گیا جس نے اسے قید کر دیا اور قید خانہ  
اسی میں مروا ڈالا۔ چونکہ میرک بن وکیل نے ابو علی حسن کو سلطان کے حکم کے بغیر مروا ڈالا تھا اور وہ اسے پردہ اخفا میں رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس  
نے سلطان مودود کو کابل جانے پر اکسایا۔ مگر جب سلطان مودود قلعہ سیالکوٹ پہنچا اور درو قونج میں بنلا ہونے کے باعث اسے واپس  
جانا پڑا تو غزنی پہنچتے ہی اس نے میرک کو حکم دیا کہ ابو علی کو توال کو فوراً رہا کر دیا جائے مگر میرک نے ایک ہفتہ کی مہلت مانگی۔ اسی اشارہ  
میں ۲۴ رجب ۵۸۷ھ کو سلطان مودود نے اس دنیا سے رخت سفر باندھ لیا۔ اس کی مدت حکومت ۹ سال تھی لب التواریخ میں  
لکھا ہے کہ سلطان مودود نے چغز بیگ کی دختر کے ساتھ شادی کی تھی اور اس سے ایک لڑکا بھی تولد ہوا تھا جس کا نام مسعود رکھا  
گیا۔ اس نے سات سال حکومت کی۔ ماہ رجب ۵۸۷ھ میں سلطان مودود چغز بیگ سے ملاقات کے لیے خراسان سے روانہ ہوا  
مگر راستہ ہی میں درو قونج سے انتقال کر گیا۔

## سلطان مسعود بن مودود بن مسعود بن محمود غزنوی

مسعود بن مودود صرف تین سال کا بچہ تھا مگر علی بن ربیع نے اپنی حکمت عملی سے اسے تخت پر بٹھا دیا، مگر یہ صورت حال  
زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ اس کی حکومت کے قیام کو صرف پانچ ماہ ہوئے تھے کہ لوگوں نے اس کے چچا علی کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔

## سلطان علی بن مسعود بن محمود غزنوی

امراؤ کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا، مگر جب عبدالرزاق بن احمد مہمندی سیستان سے بسط اور اسفراز کے درمیانی قلعہ  
تک پہنچا اور اسے معلوم ہوا کہ سلطان مودود کے حکم سے اس قلعہ میں عبدالرشید ابن محمود مقید ہے تو وہ اسے قید خانہ سے نکال لایا  
اور تخت سلطنت پر بٹھا دیا۔ علی کی حکومت کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ یہ واقعہ ۵۸۷ھ مطابق ۱۱۵۲ء کا ہے۔

## سلطان عبدالرشید ابن محمود غزنوی

سلطان عبدالرشید نے تخت پر رونق افروز ہوتے ہی عبدالرزاق کے مشورہ سے غزنی کا رخ کیا۔ علی ابن مسعود بغیر  
جنگ کے چھاگ گیا اور طغرل حاجب جو سلطان محمود کا خانہ زاد غلام تھا۔ سیستان فتح کرنے کے بعد غزنی کی جانب بڑھا۔ سلطان عبدالرشید  
نے ڈشکر مقابلہ کیا مگر ۵۸۷ھ میں طغرل حاجب نے موقعہ پا کر اسے اور اس کے ساتھ سلطان محمود کے تمام وارثوں کو قتل کر ڈالا۔  
سلطان محمود کی دختر کے ساتھ اس کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ ایک روز جب کہ وہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، دیہر سپہ سالاروں کی ایک ٹولی کی  
رگ حکمت وغیرت پھرک اٹھی اور انھوں نے جوش میں آ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ سلطان عبدالرشید کا عہد حکومت صرف

۱۱۵۲ء پر مشور۔ پشاور جس کا اصلی نام پر مشورہ تھا۔

۱۱۵۲ء فرشتہ کے نزدیک اسفراہیں ہے جو نیشاپور کے نواح میں ہے۔

چار سال رہا، مگر نظام التواریخ کے نزدیک سات سال اور لب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کا انتقال ۳۴۵ھ میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

## سلطان فرخ زاد بن مسعود بن محمود غزنوی

سلطان فرخ قید خانے سے رہائی کے بعد امراء کی رائے سے تخت نشین ہوا۔ جب سلجوقیوں کی ایک جماعت نے غزنی پر چڑھائی کی تو اس نے ان کی ایک کثیر تعداد کو قتل کرادیا اور آخر ان پر غلبہ پایا۔ جو سلجوقی گرفتار ہوئے انہیں غزنی بھیجوا دیا۔ الپ ارسلان سلجوقی بادشاہ عراق اور خراسان سے فوج کشی کر کے غزنی پر چڑھا آیا۔ جب وہ جنگ میں فتح مند ہوا تو غزنی کے بہت سے سرداروں کو قید کر کے اس نے خراسان بھیج دیا، مگر جب دونوں میں مصالحت ہو گئی تو فریقین نے ایک دوسرے کے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا اور وہ اپنے اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ چونکہ زابلستان ویران اور خراب ہو گیا تھا اس لیے سلطان فرخ زاد نے اس کا تاوان معاف کر دیا اور وہاں کے عوام کے ساتھ بطریق احسن پیش آیا۔ وہ تین ماہ تک مسلسل روزے رکھتا اور رات کا زیادہ وقت نماز اور عبادت میں گزارتا۔ آخر ۳۵۰ھ میں درو قونج میں مبتلا ہوا۔ اور ۳۵۱ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کی مدت حکومت چھ سال تھی۔

## سید السلاطین ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی

وہ ایک عادل، زاہد اور متقی بادشاہ تھا۔ ہر سال اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا کرتا۔ اس نے اپنے لیے کوئی محل سرا تعمیر نہیں کرایا تھا، سوائے ایک مسجد اور مدرسہ کے اور وہ بھی خدا کے لیے تھا۔ جب امور سلطنت کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر پڑی تو اس نے سب سے پہلے سلجوقیوں کے ساتھ مصالحت کی اور پھر پوری دل جمعی اور اطمینان کے ساتھ ہندوستان کی جانب روانہ ہوا۔ راستہ میں بہت سے قلعوں اور علاقوں کو فتح کیا۔ ان میں سے ایک شہر ایسا بھی تھا جہاں ان خراسانیوں کی نسل آباد تھی جنہیں افراسیاب نے شہر خراسان سے شہر بدر کیا تھا، انھوں نے ہندوستان آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ سلطان ابراہیم نے اس شہر کے ہزاروں خراسانی النسل باشندوں کو گرفتار کر کے غزنی بھیجوا دیا اور علیٰ ہذا القیاس بے شمار مال غنیمت بھی وہ اپنے ہمراہ لے گیا۔ اس نے اپنے دوران قیام میں چند قصبوں کی بنا ڈالی ان میں سے خیر آباد اور امین آباد وغیرہ بھی ہیں۔ اسے سید السلاطین بھی کہا جاتا ہے اور اسے ولی اللہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عہد حکومت میں غزنی کے لوگوں کو داروئے چشم، شربت امد و یگر دوائیں اور غذائیں غرض تمام اشیاء خزانہ شاہی سے مفت ملا کرتی تھیں۔ چالیس سال حکومت کرنے کے بعد اس نے ۳۹۲ھ میں وفات پائی قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا دور حکومت ۳۵۰ھ سے ۳۹۲ھ تک تھا۔ مسعود و سعد سلمان سلطان ابراہیم کے زمانہ ہی کا شاعر تھا۔ ذیل کے اشعار اسی کے ایک قصیدہ کے ہیں جو اس نے سلطان کی مدح میں لکھے تھے۔

لے فرشتہ لکھتا ہے کہ اس کی جان پینے کے لیے حمام میں اس پر حملہ کیا گیا تھا۔



ابوالقاسم ملک محمود ابراہیم بن مسعود      کہ ناز و چار چیز ازو نے کند ہر یک بد و مفتخر  
یکے افروختہ چترے دوم افراختہ رایت      سوم دینارگوں کلکے چہارم آب گوں خنجر

ولہذا

اے عزم سفر کہ وہ دبستہ کمر فتح      بکشا و چپ و راست فلک بر تو در فتح  
مسعود جب انگیر کہ از دہر سعادت      ہر لحظہ بسوئے تو فرستاد نفر فتح  
مانند سناں سر بسوئے رزم نہادی      چوں تیر میان تو بہ بند و کمر فتح  
صد فتح کنی بے شک و صد سال ازین پس      در ہند بہر خطہ بہ بند اثر فتح

استاد ابوالفرح روشنی بھی سلطان ابراہیم کا مداح تھا اور اس کے قبل وہ سلطان مسعود کا مداح تھا۔ ان دونوں کی مدح میں اس نے بے شمار قصیدے لکھے تھے جو اس کے کلیات میں موجود ہیں وہ روئیں نامی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں نواح لاہور میں واقع تھا مگر مرور ایام میں اس حد تک ویران اور برباد ہو گیا کہ آج اس کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ استاد ابوالفرح نے ذیل کا قصیدہ بھی سلطان ابراہیم کی مدح میں لکھا تھا۔

زہے باز و لے شمشیر کا مگار ترا      شبیر نفس عزیز و نظیر عقل عدیم  
اسیر کردہ آں بے نفس چو خلق گلو      یتیم کردہ آیں بے عقب چو در یتیم

اور مسعود سعد سلمان نے از روئے حمد جو شعر کا لازمی خاصہ ہے استاد ابوالفرح کی مذمت کی تھی جس کی بنا پر اسے دس سال قید میں رہنا پڑا اور یہ رباعی اس نے قید خانہ ہی میں کہی تھی۔

زندان ترا ملک شہی می باید      تابند پائے خدار می شاید  
آں کس کہ ز پشت سعد سلمان زاید      گمر مار بود ملک ترا بگزاید  
اور یہ شعر بھی اسی کا ہے۔

چو شانہ خد جگرم شاخ شاخ از حسرت      کہ موئے دیدم شاخ سفید در شانہ  
اس کے کلیات عربی فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں ہیں۔

علاء الدین مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے بعد تخت نشین ہوا، اور ۵۷۰ھ میں انتقال کر گیا۔ مدت حکومت ۱۷ سال تھی۔

سلطان شیر زاد بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

باپ کے فرمان کے مطابق بادشاہ ہوا۔ صرف ایک سال حکومت کی۔ اس کے بھائی ابوسلان شاہ نے بغاوت کی اور ۵۸۰ھ میں اسے قتل کر ڈالا۔

## سلطان ارسلان شاہ بن مسعود بن ابراہیم بن سلطان مسعود

نخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے تمام بھائیوں کو گرفتار کر لیا، مگر بہرام شاہ بھاگ کر سلطان سنجر کے پاس چلا گیا جو اس کا خالو زاد بھائی تھا۔ سلطان سنجر نے ہر چند سفارشی خطوط لکھے مگر ارسلان شاہ کے کان پر جوں بھی نہ رہی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان سنجر نے مجبور ہو کر اس پر چڑھائی کر دی۔ ارسلان شاہ تیس ہزار فوج لے کر اس کے مقابلہ پر آیا مگر شکست کھائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔ سلطان سنجر چالیس روز غزنی میں رہا۔ پھر تمام علاقہ بہرام شاہ کے حوالے کر کے لوٹ گیا۔ ارسلان شاہ ہندوستان سے ایک لشکر عظیم کے ساتھ غزنی پہنچا۔ بہرام شاہ اس کے مقابلہ میں کھڑا نہ ہو سکا اور قلعہ بامیاں میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان سنجر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ مدد کو آیا اور بہرام شاہ نے دوبارہ غزنی پر قبضہ کر لیا۔ ارسلان شاہ گرفتار ہوا اور سلاطین میں اسے مروا دیا گیا۔ ارسلان شاہ کی مدت حکومت ۷ سال تھی۔

## سلطان بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم

سلطان بہرام شاہ جب تخت پر بیٹھا تو حکیم سنائی اس کا مداح تھا۔ کلیلہ و منہ اور بہت سی دوسری کتابیں اس کے عہد حکومت میں احاطہ تحریر میں آئیں۔ اس کی تخت نشینی کے روز سید حسن غزنوی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کا مطلع یہ ہے ۵

ندائے برآمد ز ہفت آسمان

کہ بہرام شاہ است شاہ جہاں

اور ذیل کا قصیدہ مکہ معظمہ میں کہہ کر اس کی خدمت میں بھیجا

ہر گز بود کہ باندہ بینم لقائے شاہ

بہرام شاہ کہ جان سلاطین فدائش باد

ستارگان چرخ و افتد چوں شہاب

پاد از بدون نہند ز حد و فائے شاہ

حکیم سنائی نے اپنی مشہور تصنیف ”حلیۃ حقیقت“ اپنے اسی ممدوح سلطان بہرام شاہ کے نام منسوب کی تھی۔ حکیم سنائی کو قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں اس کی وجہ غزنوی تعصب تھا۔ جب یہ تصنیف دار الخلافہ بغداد پہنچی اور اکابرین اور بزرگان دین کی نظر سے گزری تو ان سب نے حکیم سنائی کے معتقدات کی تائید کی اور اس سلسلہ میں ایک یادداشت بھی لکھی جس کی وجہ سے حکیم سنائی کو رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہے اور رحلت کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ مجدد نے اس تصنیف کی بنا پر حکیم سنائی پر رافضی ہونے کا اہتمام لگایا تو اس نے بہرام شاہ کو یہ خط لکھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و صلوة علی خیر خلقہ محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جو چیزیں عمر کی دوازہ بار پیش کی گئیں اور رختوں کے اُگنے کا باعث ہوتی ہیں وہ یہ ہیں، ایک مظلوموں کی حمایت، دوسرے حق کا دفاع اور تیسرے قہر

اس کی تائید میں حضرت محمدؐ کا یہ قول شاہدِ عادل ہے کہ آسمان عدل کی وجہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے اور عدل کی مثال اس پرندے کی سی ہے کہ جہاں کہیں وہ سایہ فگن ہو دولت میں فراوانی ہوتی ہے اور جہاں کہیں وہ آشیانہ بنائے اس کا آشیانہ استدامت کا قبلہ ہوتا ہے اور بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ظلم اور عدوان ایک ایسے پرندے کی طرح ہے کہ جس طرف بھی وہ پرواز کرے فحط و بامعام ہوتی ہے اور انسانوں کے دل سے زندگی اور حیا معدوم ہونے لگتی ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ حق سبحانہ و تعالیٰ سلطان اسلام و بادشاہ عادل بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن ابراہیم شاہ بن مسعود شاہ بن محمود غزنوی کو جو ر و ظلم سے محفوظ اور مصئون رکھے۔ اگر تمام دنیا بھی جمع ہو جائے تو اس فقیر کے دل میں علم و معرفت کا جو سرمایہ اور دولت ہے، اس کی حقیقت کے اظہار سے قاصر ہے اور جو درخت کہ مالک الملک نے اسرارِ غیب کا مشاہدہ کرنے کے لیے لگایا ہے اور جبرئیل اور میکائیل کو بھی اس کی کنہ تک رسائی نہیں، یہ امر یقینی ہے کہ عادل کے لیے وہ ہر حال میں موجبِ سعادت ہے اور جابر کے لیے باعثِ شقاوت، اور بدترین ظلم وہ ہے کہ کسی جماعت کی کتاب یا مضمون کو پڑھے مگر اس کے مفہوم اور معنی سے بے بہرہ رہے، مگر اس کے باوجود وہ مغرور اور خود پسند ہو اور علماء کے خلاف زبانِ طعن و تشنیع کھولے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہمارے پیغمبر صلعم نے فرمایا: ارحموا ثلثا غنيا فتنقوا و عزیز قوم ذل و عالما بین الجہال

ترجمہ: تین آدمیوں پر رحم کھاؤ ایک وہ دولت مند جو غریب ہو جائے، دوسرے قبیلہ کا وہ بزرگ جو ذلیل ہو جائے، تیسرے وہ عالم جو جہلا میں پھنس گیا ہو)

جو کتاب کہار باب معرفت و کمال کی زبان میں لکھی گئی ہو، بایزیدؒ اور شبلیؒ ایسے بنیادی عارف ہی اس میں کوئی تصرف کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں کو مذہبی علوم اور دینیات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں یہ بڑی نادانی اور حماقت ہوگی کہ وہ اس کتاب پر نکتہ چینی کریں۔ ان کی کور چشمی کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ آل مروان کو قابلِ نفرت و شقاوت ٹھہرتے ہیں اور آلِ مصطفیٰؐ کی بے حد تعریف کرتے ہیں اور امیر المومنین علیؑ کو اللہ وجہہ کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے ہیں، مگر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کا درجہ صدیق، فادوق اور ذی النورین کے بعد رکھا گیا ہے اور آل مروان کے عیوب اور آلِ محمد صلعم کے مناقب کے بارے میں حضرت محمد صلعم کے ارشادات کافی ہیں اور ہمارے لیے وہی دلیلِ راہ ہیں۔

کلمہ حق یہ ہے کہ اے خدا تو دنیا کو ایسے عالموں کے وجود سے آراستہ کر جو تجھ سے ڈریں اور عوام سے شرم و حیا ملحوظ رکھیں اور تو ہمیں ایسے لوگوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ جو تیری محبت کی راہ سے بھٹک گئے ہوں۔ "بفضلک وجودک و کرمک" یا ارحم الراحمین۔ یہ شعر حقیقہ ہی کا ذیل میں لکھتا ہوں۔

عرش گز بارگاہِ رانید شاہ بہرام شاہ را زید

سلطان بہرام شاہ نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور ان مقامات کو فتح کیا جنہیں اس کے اسلاف فتح نہیں کر سکے تھے۔ وہ اپنے امراء میں سے ایک کو ہندوستان چھوڑ کر واپس غزنی چلا گیا۔ اس امیر نے بغاوت کی۔ سلطان امیر کی سرکوبی کے لیے آیا۔ ملتان کے نواح میں زبردست جنگ ہوئی۔ امیر گرفتار ہو کر سلطان کے سامنے آیا، اسے قتل کر دیا گیا اور دوسری بار پھر ہندوستان اس کے قبضے میں آگیا۔ جب علاؤ الدین حسن بن حسین سوری جو ملوکِ غور میں سے تھا اس نے اس کے خلاف بغاوت



کی اور غزنی تک آپہنچا تو بہرام شاہ بھاگ گیا اور علاؤ الدین اپنے بھائی سیف الدین سوری کو غزنی چھوڑ کر وہاں سے پلا گیا۔ بہرام شاہ نے واپس آ کر پھر غزنی پر قبضہ کر لیا اور سیف الدین کو گدھے پر سوار کر کے شہر میں اس کی تذلیل کی اور بدترین طریقہ سے اُسے قتل کر دیا۔ جب علاؤ الدین کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بے حد رنج ہوا اور ایک لشکر عظیم کے ساتھ غزنی کو چل پڑا، مگر اس کے غزنی پہنچنے سے پہلے بہرام شاہ ملک آخرت کا سفر اختیار کر چکا تھا۔ اس کے بجائے اس کا بیٹا تخت نشین تھا۔ علاؤ الدین نے اپنے بھائی کا سخت انتقام لیا اور غزنی کی خاک پر جو ہزاروں کشتوں کے خون کی حامل تھی خون کی ندیاں بہا دیں۔ بہرام شاہ ۵۴۶ھ مطابق ۱۱۵۶ء اس دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ اس کی مدت حکومت ۳۲ سال تھی۔ مسعود سعد سلمان نے اس کی مدح میں یہ مسدس کہا تھا:

بہرام شاہ خسرو گیتی کشتائے گشت      خورشید دہر و سایہ فرخندائے گشت  
چترش کہ شد ہمایوں فرہمائے گشت      اورا خدائے عز و جل رہنمائے گشت

## خسرو شاہ بن بہرام شاہ

اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا، علاؤ الدین حسین بن حسن غوری اس کے مقابلہ پر بھی آیا۔ خسرو شاہ نے بھاگ کر لاہور کا رخ کیا اور جب علاؤ الدین غزنی سے کامیاب واپس ہوا تو خسرو شاہ جو موقع کی تاک میں تھا فوج کشی کی اور غزنی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور جب قبیلہ غزآں نے سلطان سمر کو گرفتار کر لیا تو علاؤ الدین اُدھر جاتے ہوئے غزنی پہنچا خسرو شاہ کو جب یہ خبر ملی تو وہ دوبارہ بھاگ کر لاہور چلا آیا۔ یہاں ۵۵۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ۸ سال حکومت کی۔ اس کے عہد حکومت میں بہت بڑے بڑے شاعر تھے جنہوں نے خسرو شاہ کی مدح میں قصیدے لکھے تھے یہ شعر ایک ترجیع بند سے لیا گیا ہے:

شاہنشہ معظم خسرو شہ آں کہ آساں  
بایتخ و گداز گیر داند ہند تا خراساں

مخفی نہ رہے کہ قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ خسرو شاہ کا انتقال غزنی ہی میں ہوا تھا۔ علاؤ الدین نے جب غزنی کو تباہ و برباد کر کے قتل عام کیا تھا تو وہ اپنے بھتیجوں غیاث الدین ابوالفتح اور شہاب الدین ابوالمنظر کو وہاں چھوڑ آیا تھا انہوں نے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے مختلف حیلوں اور تہکیوں سے خسرو شاہ کو اپنی اس پسندی اور وفاداری کا اظہان دلایا تھا مگر ۵۵۵ھ میں انہی کے ہاتھ سے خسرو شاہ گرفتار ہوا اور اسی سال اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ خسرو شاہ کے انتقال کے بعد غزنوی خاندان کا عہد حکومت ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی تمام سلطنت شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آ گئی تھی۔ چونکہ نظام الدین احمد نے تاریخ نظامی میں لکھا ہے اور انہوں نے اسے روضۃ الصفا سے اخذ کیا ہے کہ خسرو ملک ابن خسرو شاہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس لیے میں نے بھی ان کی پیروی کی ہے: واللہ اعلم بالصواب۔

## خسرو ملک ابن خسرو شاہ

خسرو شاہ کے انتقال کے بعد خسرو ملک لاہور میں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش تھا اس لیے اس کے عہد حکومت میں ہر طرف بڑی ابتری پھیل گئی۔ غزنوی حکومت جو پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی، خسرو ملک اس کی مردہ لاش کو بس ڈر مار کر گھسیٹتا رہا۔ غوری خاندان کا ستارہ اوج پر تھا اور وہ دن رات ترقی کر رہا تھا اس لیے عنان حکومت عملاً غوریوں کے ہاتھ منتقل ہو گئی۔ سلطان معز الدین محمد سام المعروف سلطان شہاب الدین غوری نے غلبہ پاکر غزنی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور غزنوی بادشاہوں کی طرح اس نے بھی ہندوستان پر لشکر کشی کی اور لاہور کے نزدیک آپہنچا۔ خسرو ملک کے پلے تو کچھ بھی نہیں تھا، سلطان شہاب الدین کا مقابلہ کیسے کرتا، اس لیے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر امان چاہی۔ سلطان شہاب الدین غوری اسے اپنے ہمراہ غزنی لے گیا اور وہاں سے اُسے غیاث الدین کے پاس بھیج دیا جس نے اسے فیروز کوہ میں قید کر دیا اور دس سال کے بعد خسرو ملک نے شہریت فنا نوش کیا۔

دل میں دید دیں دہر کہ بے بنیاد است!

نوعرو سے است کہ در عقب بے داماد است

خسرو ملک نے ۵۸۳ھ میں وفات پائی تھی، وہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا۔ اس نے ۲۸ سال تک حکومت کی، اس کے بعد غوری خاندان کی باری آئی اور اس نے زمام حکومت سنبھال لی۔ ترقی الملک من یشاء۔ بقا بقائے خدائے ست و ملک ملک خدائے

اور قاضی بیضاوی غزنوی مملکت کی مدت سلطان محمود سے خسرو شاہ تک ۱۶۱ سال بتاتے ہیں اور اس کے بارہ بادشاہوں نے حکومت کی مگر قاضی بخیتی قزوينی کے نزدیک ۱۵۵ سال تھی اور ۱۴ بادشاہوں نے حکومت کی۔ تاریخ نظامی کے مصنف کی رائے میں جیسے کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، ۲۱۵ سال ہوتی ہے اور ۱۵ بادشاہوں نے حکومت کی، واللہ اعلم بالصواب۔

# غوری عہد حکومت

جس نے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنایا اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت قائم کی  
سلطان شہاب الدین غوری نے اس کی بنا رکھی۔

## سلطان معز الدین محمد سام المعروف بہ سلطان شہاب الدین غوری

معز الدین کا بڑا بھائی سلطان غیاث الدین غوری، عراق اور خراسان کا بادشاہ تھا۔ سلطان شہاب الدین غوری اسی کا نائب  
اسطنت ہونے کی حیثیت سے غزنی میں تخت نشین ہوا۔ اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا نیز اپنے برادر کلاں کے حکم  
سے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور نعرہ غزوہ و جہاد بلند کیا۔ اسی کے عہد حکومت میں دلی فتح ہوئی تھی، اس پر پرچم اسلام لہرایا  
تھا اور ہندوستان میں مستقل اسلامی حکومت کی بنا ڈالی گئی تھی سلطان غیاث الدین نے تگین آباد پر جو گرم سیر کے توابع میں سے  
تھا قبضہ کر کے سلطان شہاب الدین کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا اور خود غزنی پر لگا تار حملے کرتا رہا یہاں تک کہ اسی سال کے اندر  
وہ اس ملک کو اپنے دائرہ فتوحات میں لے آیا۔ اس نے غزنی سے قبیلہ غزآن کو بھی نکال باہر کیا جو سلطان سنجر کی گرفتاری  
کے بعد اس پر قابض ہو گیا تھا اور معز الدین کو سلطان شہاب الدین کا لقب دیا۔ سلطان شہاب الدین نے اپنے برادر کلاں  
کی نیابت کے پہلے سال کے دوران ہی ۵۵۷ھ میں گورنر کو فتح کر لیا اور پھر اچھ اور بتان پر قبضہ کر لیا اور قرامطیوں کے  
طائفوں کو وہاں سے نکال دیا۔ قبیلہ ہتتہ نے اپنے آپ کو قلعہ بند کر رکھا تھا ان کا بھی قلعہ فتح کیا اور اس کے بعد یہ پورا علاقہ  
علی کرمانی کے سپرد کر کے غزنی لوٹ گیا۔

۵۵۷ھ میں سلطان شہاب الدین اپنی فوج کے ساتھ گجرات پہنچا۔ اس علاقہ کے حکمران بھیمن دیو کے ہاتھ سے شکست کھائی  
اور بڑی مشکل سے غزنی پہنچا۔ ۵۵۸ھ میں اس نے پور شہر فتح کیا اور ۵۵۸ھ میں لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان خسرو شاہ کو  
جو غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اطلاع ملی تو وہ لاہور کے قلعہ میں بند ہو کر بیٹھ گیا کافی نامہ و پیام کے بعد

۱۰ اچھ۔ پنج در کے مشرقی کنارے واقع ہے اور ملتان سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

۱۱ قبیلہ ہتتہ کے بارے میں تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے اس نام کا ایک قلعہ بھی ملتان اور لاہور کے درمیان واقع تھا۔ مراٹ جہاں نمایاں لکھا ہے کہ  
اس قبیلہ کا ایک راجہ بھی تھا۔ ۱۲ پور شہر۔ پشاور



اس نے اپنے بیٹے کو ایک ہاتھی کے ساتھ بطور نذرانہ بھیجا تو سلطان شہاب الدین نے اس کی عرضداشت صلیح قبول کر لی۔ اسی موقع پر اس نے قصبہ سیالکوٹ کی بنا ڈالی اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے غزنی چلا گیا۔ ۸۱ھ میں وہ دیول کی جانب بڑھا۔ دیول لکھ کا مطلب دوسرے لفظوں میں ٹھٹھہ ہے) اور بحر شور کے ساحلی شہروں کو تیس تیس کر کے ان کا کافی سے زیادہ مال و اسباب لوٹ کر لوٹ گیا۔

۸۲ھ میں وہ پھر لاہور آیا، اس کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کیا اور حسین کو قلعہ سیالکوٹ کا نگران مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ تاریخ نظامی جو اس منتخب التواریخ کا ماخذ ہے اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سیالکوٹ کی بنیاد اسی سال ڈالی گئی تھی۔ یہ مبارک شاہی کے اس خیال سے مختلف ہے کہ اس کی بنیاد اس سے دو سال قبل ڈالی گئی تھی، واللہ اعلم۔ چوتھے تاریخ کا خانہ بھی خانہ خواب اور دوسری چیزوں کی طرح خراب ہے اس لیے اختلاف کی عذر خواہی ظاہر ہے اور اسی سال خسرو ملک کھوکھرو کی مدد سے ایک مدت تک حصار سیالکوٹ کا محاصرہ کیا گیا مگر ناکام واپس ہوا۔ اسی سال سلطان شہاب الدین نے دوبارہ لاہور پر چڑھائی کی۔ خسرو ملک قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا مگر تابہ کے، آخر مجبور ہو کر اسے سلطان شہاب الدین کے حضور میں آنا پڑا۔ سلطان اسے اپنے ہمراہ لے گیا اور اپنے بھائی سلطان غیاث الدین کے سپرد کر دیا جس نے اسے فیروز کوہ میں بند کر دیا اور وہ اسی حالت میں مر گیا۔ فیروز کوہ گرجستان کے قلعوں میں سے ایک ہے۔ اس تاریخ سے حکومت بلاخوف و خطر غوریوں کے پاس چلی گئی۔

اگر ابلق دہر بر نہی کشی      وگر خنگ چرخت جینیت کشد  
مشو غرقہ کیں دورِ دوں ناگمت      رقم بر سر حرفِ دولت کشد  
وگر روضہ عیشت از خرمی      خط نسخ بر ذکرِ جنت کشد  
زمانہ چو باد است و باد از نخت      نقاب از رخ گلِ بغزت کشد  
پس از ہفتہ در میان چمن      تنش را بجایِ مذلت کشد

اسی سال سلطان شہاب الدین نے حاکم ملتان علی کرمانی کو لاہور میں اپنا نائب السلطنت مقرر کیا اور ۸۳ھ میں پھر غزنی سے

لاہ دیول کا محل وقوع ثابت شدہ کے نقشہ کے مطابق کراچی اور ٹھٹھہ کے درمیان ہے، کراچی سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر اور ٹھٹھہ سے ستر میل کے فاصلہ پر۔ کراچی سے مشرق کی جانب اور ٹھٹھہ سے شمال مغرب کی جانب یہ سمندر سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر ہے ان دو حصوں میں سے ایک میں واقع ہے جنہوں نے کسی زمانہ میں مہران (سندھ) کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اگر موجودہ نقشہ پر دیکھا جائے تو اس کے وجود کا کہیں پتہ نہیں چلتا، یا تو وہ بالکل غائب ہو گیا ہے یا اس حد تک کہ کہیں نظر نہیں آتا۔

۸۵ھ برہمنوں کے نزدیک شہر سیالکوٹ کی بنا پانچ ہزار سال قبل ایک صاحب سول یا سال نے رکھی تھی جو پانڈوؤں کا چچا یا ماموں تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اس کا نام بھی سیالکوٹ رکھا تھا۔ اس خاندان نے ڈیڑھ ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ اس کے بعد ایک سیلاب عظیم نے اسے اس حد تک تباہ و برباد کر دیا کہ ایک ہزار سال تک وہ ویران اور اجاڑ رہا۔ ایک دوسرے صاحب سالیاہن نے اسے دوبارہ آباد کیا اور اس میں قلعہ بھی تعمیر کیا۔ اس کا تعلق سیانسل سے تھا اور اسی وجہ سے موصول کا خیال ہے کہ سیالکوٹ کا نام سالیاہن ہی نے رکھا تھا اور لفظ سیال کی بنا پر اس کا نام سیالکوٹ رکھا۔ بلاشبہ شہاب الدین غوری اس وقت لاہور پر حملہ آور ہوا تھا۔ جب وہاں غزنی خاندان کا آخری بادشاہ خسرو ملک حکمران تھا اور سیالکوٹ پر بھی اس نے چڑھائی کی تھی جو ایک ہندو راہب کے زیر نگیں تھا اور وہ اس پر غالب آیا تھا۔ مگر جہاں تک سیالکوٹ کی بنیاد رکھنے کا تعلق ہے وہ غلط ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد تو کئی ہزار سال قبل رکھی گئی تھی۔ البتہ اتنا صحیح ہے کہ راہب سالیاہن نے جو قلعہ بنایا تھا اس کی حالت خراب و شہتہ تھی اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس نے اس کی مرمت کی تھی۔ (پنجاب گزٹریٹر سیالکوٹ)

روانہ ہو کر قلعہ تبرہندہ کو سر کیا۔ یہ مقام ہندوستان کے بڑے بڑے راجوں کا پایہ تخت رہ چکا تھا۔ ملک ضیاء الدین تو کلی کو ایک ہزار بیس منتخب سواروں سمیت اس قلعہ میں چھوڑ کر اس نے واپسی کا ارادہ کیا مگر حاکم اجمیر رائے پتھورا اور اس کے بھائی کھندی رائے دونوں کے ساتھ اس کا مقابلہ عظیم ہوا۔ کھندی رائے پہلے حاکم دہلی تھا وہ ایک کثیر لشکر کے ساتھ موضع ترائن پہنچا جو دریائے سرسوتی کے کنارے واقع ہے اور دہلی سے سات کوس کے فاصلے پر ہے اور آج کل تراوری کے نام سے مشہور ہے شکر اسلام اس معرکہ میں ہار گیا اس لڑائی میں سلطان نے بڑی پھرتی دکھائی اس نے کھندی رائے پر جو ہاتھی پر سوار لشکر کے آگے آگے تھا جھپٹ کر حملہ کر دیا جس سے اس کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ کھندی نے بھی جوابی حملہ کیا اور سلطان کے سر پر نیزہ سے وار کیا جس سے سلطان کا بازو زخمی ہو گیا مگر دونوں کی جان سلامت رہی۔ سلطان گھوڑے سے اترا آیا اور اپنے بیٹے غلی کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ غلی نے ایڑ لگائی اور گھوڑا سر پٹے دوڑا کر دونوں کو صبح و سلامت میدان جنگ سے باہر لے کر نکل گیا۔ رائے پتھورا نے قلعہ تبرہندہ کا ایک سال ایک ماہ تک محاصرہ کیا اور آخر صلح و صفائی کے بعد اس پر قابض ہو گیا۔

۸۸ھ میں سلطان شہاب الدین غوری چالیس ہزار نامور سواروں کے ساتھ پھر ہندوستان آیا اس نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور موضع تبرہندہ کے نواح میں جنگ کی اور اسے فتح کر لیا۔ رائے پتھورا گرفتار ہوا اور کھندی رائے میدان جنگ میں مارا گیا اور اس کے بعد سلطان نے ہانسی اور سرستی کے قلعوں پر چڑھائی کی اور ان پر بھی قبضہ کیا۔ اس کے بعد اجمیر کی جانب بڑھا یہ شہر رائے پتھورا کا پایہ تخت تھا اس پر قبضہ کیا۔ اس کے نواح کو خوب تاخت و تاراج کیا اور ایک کافی تعداد کو گرفتار بھی کیا۔ ایک دوسرے ذریعہ سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس اللہ سرہ العزیز جو دیار ہند کے مشائخ عظام کا سرچشمہ ہیں اور جن کا مزار متبرک اجمیر میں ہے۔ اس معرکہ میں سلطان شہاب الدین غوری کے ساتھ تھے اور یہ فتح اسی قطب ربانی کے فیوض و برکات کے طفیل تھی۔ اسی سال سلطان اپنے غلام اور متبقی اور جانشین ملک قطب الدین ایک کو قصبہ کھرام میں (جو دہلی سے ۷۰ کوس کے فاصلے پر ہے) چھوڑ کر خود کوہ سواک (جو شمالی ہندوستان میں واقع ہے) کے راستہ غزنی پہنچا۔ بعد میں قطب الدین ایک نے دہلی کو مسخر کیا اور رائے پتھورا اور کھندی رائے کے خویش و اقربا کے ہاتھ سے اسے چھین لیا۔

۸۹ھ میں سلطان شہاب الدین نے چندوار اور اٹاواہ کے حدود میں راجہ جے چند حاکم فوج کے ساتھ جنگ کی اور اسے مار ڈالا۔ اس کے بعد غزنی روانہ ہو گیا اور قلعہ کوٹل قطب الدین ایک کے قبضہ میں آیا۔ اس نے دہلی کو پایہ تخت بنایا اور اس کے اطراف و نواح میں شاہی نظم و نسق قائم کر دیا۔ اس دن سے دہلی سلاطین اسلام کا دار السلطنت قرار پایا اور مینا را اور دوسری عمارتیں اور مسجد وغیرہ سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں تعمیر ہوئیں۔ چنانچہ ان سب کا ذکر اپنی اپنی جگہ کیا جائے گا۔

۹۱ھ میں سلطان شہاب الدین غوری نے قلعہ کھنگا اور بداؤں پر قبضہ کیا اور ۹۲ھ میں گجرات فتح کر کے نر والہ پٹن کی جانب بڑھا۔ بھیم رائے دیو سے بہت سامان غنیمت سلطان کے ہاتھ آیا جسے وہ اپنے ساتھ لے کر واپس پہلا گیا۔ اسی

۱۔ طبقات ناصری میں اس کا نام نرائن لکھا ہے۔

۲۔ آگرہ کے شمالی جانب ۱۰ میل پر ہے۔

۳۔ یہ ایک تکوہ قلعہ ہے جو آنولہ ضلع بریلی میں واقع ہے اور آنولہ سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے راجہ ہرچن نے تعمیر کیا تھا۔

سال سلطان غیاث الدین کا انتقال ہو گیا۔ سلطان شہاب الدین کو جب اس کی خبر ملی تو وہ طوس اور سرخس کی حدود میں تھا وہ فوراً بادغیس کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر مراسم عزاداری ادا کیے اور پھر اپنے بھائی کے ملک کو رشتہ داروں میں تقسیم کر کے غزنی روانہ ہو گیا۔ پھر خوارزم پر چڑھائی کی۔ سلطان محمد خوارزم شکست کھا کر پسپا ہوا۔ اور ہٹتے ہٹتے خلیج تک پہنچ گیا یہ مقام دریائے جیحون کے مشرق کی جانب ہے۔ یہاں دوبارہ اہل خوارزم کے ساتھ جنگ ہوئی اور غوریوں کی کافی تعداد اس معرکہ میں کام آئی مگر اس کے باوجود سلطان خوارزم غوریوں پر فتح نہ پاسکا۔ اس اثنا میں ترکستان کے تمام بادشاہوں کی طرف سے محمد خوارزم کو کمک پہنچ گئی اور سلطان شہاب الدین کو اس لشکر عظیم کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں سلطان نے شکست کھائی اور ایک ہزار سوار فوج کے ساتھ وہ قلعہ اندخود میں بند ہو گیا۔ امان پانے کے بعد وہاں سے غزنی واپس آیا۔

اس درمیان میں نواحی لاہور کے کھوکھروں کے ایک گروہ نے سر اٹھا کر کھا تھا۔ سلطان شہاب الدین نے ان پر چڑھائی کر دی اور مدد کے لیے قطب الدین ایبک کو بھی دہلی سے بلوا بھیجا۔ دونوں نے مل کر کھوکھروں کی خوب گوشمالی کی۔ اس کے بعد سلطان غزنی لوٹ گیا۔ راستہ میں ابھی تو ایبک غزنی کے ایک مقام دمیک پہنچا تھا کہ ایک فدائی کھوکھر نے موقع پا کر اسے شہید کر دیا۔ اس کی وفات سے متعلق یہ قطعہ تاریخ ہے،

شہادت ملک بحر و بر شہاب الدین      کہ ابتداءً جہاں پہچو اُنیا مد یک  
سومر عزتہ شعبان سال شش صد بود      فتادہ در رو غزنیں بمنزل دمیک

اس کی مدت حکومت ۳۲ سال اور کچھ مہینے تھی۔ اس کے پس ماندگان میں سے اس کی وارث صرف ایک لڑکی تھی۔ اس نے سونے پاندی اور جواہرات کے بے بہا خزانے اپنے پیچھے چھوڑے تھے ان میں سے ایک خزانہ پانچ سو من الماس کا تھا۔ الماس کا شمار نفیس ترین جواہرات میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دوسرے خزانوں کا بھی اندازہ لگا یا جاسکتا ہے۔ اس نے نو مرتبہ ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ دو مرتبہ معرکوں میں شکست کھائی تھی اور سات مرتبہ فتح پائی تھی۔

معز الدین محمد سام را دیدی کہ در ہیجا      قومی تر بود باز و دول از سام و نریانش  
میسر گشت پشوں محمود از فیلان ہندوستان      سیاست ہائے ساسان و ولایت ہائے ساسان  
گذشت از عالم و گویند و بر ما وی بود عهد      کہ پانصد من فزوں الماس ماند از گنج نہانش

اس کے بعد حکومت میں علماء اور فضلاء کی ایک کثیر تعداد نے شہرت پائی تھی۔ ان میں سے ایک امام فخر الدین رازی بھی تھے جنہوں نے لطائف غیاثی اور دیگر کتب لکھیں اور سلطان شہاب الدین کے بھائی سلطان غیاث الدین ابوالفتح کے نام سے منسوب کیں۔ امام موصوف کا قیام سلطان معز الدین المعروف سلطان شہاب الدین غوری کے لشکر میں تھا۔ وہ ہفتہ میں ایک بار وعظ فرمایا کرتے۔ وعظ کے خاتمہ پر سلطان پر رقت طاری ہو جاتی۔ چونکہ امام راندی اس دوا می سلسلہ ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے تھے ایک روز جب وہ منبر پر کھڑے ہوئے تو سلطان کو مخاطب کر کے انہوں نے کہا کہ اے سلطان معز الدین کچھ عرصہ کے

لے دیئے آگ کے اس پار غزنی کی شاہراہ پر ہے۔ فرشتہ اسے رہنک لکھتا ہے جو غلط ہے۔

بعد نہ یہ تیری عظمت و شوکت باقی رہے گی اور نہ رازی کا یہ تعلق اور نفاق اور یہ قطعہ انہی کا ہے ۛ  
اگر دشمن نہ سازد یا تو اسے دوست  
وگرنہ چنند روز سے صبر فرما  
نہ اُو ماند نہ تو نہ مخسر رازی

سلطان کے قتل کے بعد بعض فتنہ انگیزوں نے از روئے حسد امام رازیؒ پر یہ الزام لگایا کہ ان کا تعلق فدائیوں سے ہے اور وہ ان کے منصوبوں سے بخوبی واقف ہیں۔ فتنہ پردازوں نے جب امام رازیؒ کی جان لینے کا قصد کیا تو انھوں نے ذی  
مؤید الملک سنجر جو سلطان کے معتمد اراعیں سے تھے حفاظت جان کی التجا کی۔ کسی شاعر نے سلطان کی تعریف میں قصیدہ  
کہا جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں ۛ

سلطان معزالدین شاہ غازی کہ درجہاں  
سلطان حق محمد سام آں کہ حلق را  
تیرغش چو ذوالفقار علی مرتضیٰ شداست  
مہرش چو حمردوستی مصطفیٰ شداست  
اور ایک دوسرے شاعر نے لکھا ہے ۛ

شاہ زمانہ خسرو غازی معز دین  
اصل ظفر محمد بن سام بن حسین  
کنز دے فروز زینت تاج و کلاہ را  
آں حضرتش نشانہ شدہ فر شاہ را  
نازکی مراغہ بھی اس کی مدح میں لکھتا ہے ۛ

شہ معزالدین کنز دولت اوست  
وقت بر تخت چو گل در وقتے  
آں کہ در آتش قمرش بدخواہ  
شکر دین و گل دولت را  
یارب این گل شکر دولت و دین  
اور قاضی حمید بلخی نے کہا ہے ۛ

خسرو غازی معزالدین والد دنیا کہ ہست  
بوالمظفر شہریار مشرق کا ندرہ معرکہ  
روزہ میجا باہمایوں رایتش ہمسر ظفر  
گو نیا دارد ہمائے چترش اندر ظفر

## سلطان قطب الدین ایبک

ایبک سلطان معزالدین المعروف بہ شہاب الدین غوری کے خاص برگزیدہ غلاموں میں سے تھا چونکہ چاندگرہن کے  
وقت اس کی چھوٹی انگلی ٹوٹ گئی تھی اس لیے اس کے نام کے ساتھ ایک لفظ کا اضافہ ہو گیا۔ اسے قطب الدین لکھنؤ بھی کہتے تھے۔

لے ملاحظہ کی ایک جماعت جن کا سرغنہ حسن بن مبارک تھا جسے قلعہ الموت کا ساحر بھی کہتے ہیں۔

لے سلطان قطب الدین کے نام کے ساتھ لفظ ایبک کا اضافہ اور اس کی تشریح کے بارے میں اختلاف ہے ملا بدایونی نے جو لکھا ہے دوسرے (باقی حاشیہ صفحہ  
آئندہ پر)



ہندوستان کے اُمراء کی متفقہ رائے سے دہلی کے استحکام و حفاظت کے لیے اس نے یہاں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ سلطان مغربی کی شہادت کے بعد اس کے برادر زادہ غیاث الدین محمود نے فیروز کوہ سے چتر اور خلعت بادشاہی دونوں چیزیں ملک قطب الدین کو بھیجیں اور سلطان کے نام سے مخاطب کیا۔ سلطان غیاث الدین محمود کی مدح میں یہ شعر کہا گیا تھا۔

سلطان مشرقین، جہاندار مغربین

محمود بن محمد بن سام بن حسین

سلطان قطب الدین ایک سالہ میں دہلی سے لاہور جا کر بروز منگل ۱۶ ماہ ذی قعدہ کو تخت سلطنت پر چلواؤ اور ہوا۔ وہ خود و سخا میں اپنی مثال آپ تھا اور مستحقین کو حوصلہ سے بڑھ چڑھ کر انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ لکھ بجشی کے طریقہ کا بانی مبنی بھی وہی تھا۔ فضلاء عصر میں سے فاضل بہاؤ الدین اوشی نے یہ شعر اسی کی مدح میں لکھا تھا۔

اے بخشش نک تو درجہاں آوردہ کاں راکت تو کار بجہاں آوردہ

از رشک کف تو خوں گرفتہ دل کان دزد لعل بہانہ درمیاں آوردہ

زیادہ روز نہیں گزرے تھے کہ سلطان قطب الدین ایک اور تاج الدین یلدوز کے باہمی تعلقات کشید ہو گئے۔ تاج الدین یلدوز سلطان فخر الدین کے بندگان خاص میں سے تھا۔ اس نے غزنی میں اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھوا دیا اور لاہور پر بھی چڑھ آیا۔ چنانچہ پنجاب کی حدود میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی جس میں تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور اپنے مستقل مستقر کرمان کی جانب بھاگ نکلا۔

سلطان قطب الدین اس کے بعد رفتہ رفتہ غزنی پر بھی قابض ہو گیا اور چالیس روز وہاں مقیم رہا۔ اس دوران میں اس نے اپنے اوقات خوب لہو و لعب اور عیش پرستی میں گزارے، یہاں تک کہ غزنی کے باشندے اس سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انھوں نے خفیہ طور پر تاج الدین یلدوز سے ساز باز کی اور اُسے بلوا بھیجا۔ وہ اس انتظار ہی میں بیٹھا تھا۔ چنانچہ فوراً آپہنچا سلطان

قطب الدین اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سنگسورخ کے راستہ لاہور چلا آیا۔

چو سلطان سرا اندازہ باشد بے

فتد بے خبر از سرکش تاج کے

ابھی اس کی حکومت کو زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کہ سالہ میں جب کہ وہ لاہور میں مصروف چوگان بازی تھا گھوڑے سے گر کر جان بحق تسلیم ہوا اور اسی شہر میں دفن کر دیا گیا۔ اس کی قبر آج بھی زیارت گاہ مردم ہے۔ وہ پہلا مسلمان فاتح ہند تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مورخین کی اکثریت بھی رائے رکھتی ہے اور اس ترکیب لفظ ایک کے معنی بھی یہی لیے گئے ہیں حالانکہ ترکی زبان میں ایک کے معنی مرغ کی کلنی ہے اور انگلی کے لیے لفظ پرتق استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر اس لفظ کو مرکب سمجھ لیا جائے تو اس کے معنی مختلف ہو جائیں گے۔ ترکی میں اُسے کے معنی چاند اور بگ کے معنی آقا یعنی چاند آقا یا چاند دینا کے ہیں۔

بہاؤ الدین اوشی فرخانی عالم و فاضل شخص تھا۔ غزنی کے نزدیک وہ بہت بڑا مقرر بھی تھا اور نظم و نثر دونوں اصنافِ تحریر میں خوب لکھتا تھا۔

سنگسورخ غزنی اور پنجاب کے درمیان ایک شاہراہ کا نام۔

مذکورہ کی مراد "ہندوستان کا پہلا بادشاہ" ہے۔

جس کی کل مدت حکومت بیس سال تھی مگر اس میں سے صرف چار سال وہ بحیثیت سلطان رہا۔

گردن گرداں شکست این کہنہ چرخ چنبری

تا توانی دل منہ بر مهر و ماہ و مشتری

سلطان معز الدین کے دوسرے امیروں اور غلاموں میں سے سات نے ہندوستان، غزنی اور بنگال وغیرہ میں حکومت کی تھی اور ان کے حالات اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک تاج الدین یلدوز تھا جو ترائن عرف تراوری کے حدود میں سلطان شمس الدین التمش کے خلاف جنگ کرتا ہوا گرفتار ہوا۔ دوسرا سلطان ناصر الدین قباچہ جس نے تاج الدین یلدوز کی ایک بیٹی سے شادی کی تھی اور اس کی دوسری بیٹی سلطان قطب الدین ایبک سے بیاہی گئی تھی۔ سلطان معز الدین نے اپنی زندگی ہی میں سلطان ناصر الدین قباچہ کو اچھلے اور ملتان کی حکومت عطا کر دی تھی۔ سلطان قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد اس نے اپنی حدود سلطنت میں توسیع کی، سرستی اور کھرام تک کے علاقہ کو بھی قبضہ میں لے آیا نیز لاہور پر بھی قابض ہو گیا۔ ملک تاج الدین یلدوز کا جو لشکر غزنی سے مؤید الملک سجری کی قیادت میں آ رہا تھا سلطان ناصر الدین قباچہ نے اس کے ساتھ بھی جنگ کی مگر ہار گیا اور سندھ کی جانب چلا گیا جہاں اس نے دوبارہ اپنی قوت بحال کی۔

سلطان معز الدین قباچہ نے چالیس روز تک ملتان کا محاصرہ کیا۔ سلطان ناصر الدین قباچہ نے خزانہ شاہی کے دروازے عوام پر کھول دیے اور اتنی بہادری دکھائی کہ مغلوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے آخر کار ۲۲ سال کی حکومت کے بعد وہ سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھ گرفتار ہوا اور راہ آخرت اختیار کی۔

سلطان ناصر الدین قباچہ کے علاوہ سلطان معز الدین کے امیروں اور غلاموں میں ایک اور شخص کا بھی شمار ہوتا تھا اور وہ ملک بہاؤ الدین طغرل ہے۔ جب سلطان معز الدین نے قلعہ بھنگرہ فتح کیا تو اسے اسی ملک طغرل کے حوالے کر دیا جس نے بھسیانہ کے علاقہ میں قلعہ تعمیر کیا اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

وہ ہمیشہ گوالیار کے نواح کو تاخت و تاراج کرتا تھا۔ سلطان معز الدین نے جب گوالیار سے مراجعت کی تھی تو اس نے اسی وقت وعدہ کیا تھا کہ یہ قلعہ بھی ملک بہاؤ الدین طغرل کو دے دیا جائے گا۔ وہ گوالیار سے تین چار میل کے فاصلہ پر بڑی مضبوطی سے

۱۵ مگر طبقات ناصری میں اس سے مختلف یہ لکھا ہے کہ قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد قباچہ اس نیت سے اوچھلے اور ملتان کی جانب روانہ ہوا تھا کہ ان مقامات پر قبضہ مخالفانہ کر لے نیز اس نے قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں کے ساتھ شادی کی تھی۔

۱۶ اوچھلے۔ یہ ملتان سے ۷۰ میل جنوب مغربی جانب ہے۔ ٹائیفیٹھلر لکھتا ہے کہ اس نام کے تحت سات گاؤں کی ایک بستی ہے ان میں سے ایک گاؤں میں سید بخاری کا مقبرہ ہے اور یہی گاؤں ان تمام گاؤں میں زیادہ ممتاز ہے اور اوچھلے کہلاتا ہے۔

۱۷ تاج المآثر میں سلطنت لکھا ہے۔

۱۸ طبقات ناصری کے مطابق وہ ڈوب کر مرا تھا۔

۱۹ طبقات ناصری اور الفی میں قید لکھا ہے۔

جم کر بیٹھا تھا، اس نے اہل قلعہ پر عرصہ مسیات تنگ کر رکھا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں ایک سال گزر گیا آخر اہل قلعہ نے پیغامات اور تحائف بھیج کر سلطان قطب الدین ایبک کو بلوایا اور قلعہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس بات پر سلطان قطب الدین ایبک اور ملک بہاؤ الدین طغرل کے درمیان چل گئی جس نے آخر کار سخت عداوت کی صورت اختیار کر لی، مگر ملک بہاؤ الدین طغرل کی مہم نے وفات کی اور تھوڑے عرصہ کے اندر ہی وہ انتقال کر گیا۔

سلطان معز الدین کے سلسلہ امرائے ایک اور شخص ملک محمد بختیار خوری بھی تھا جو بلاد غور اور گرم سیر کے کابریں سے تھا۔ وہ جملہ اوصاف حمیدہ کا مالک تھا۔ سلطان معز الدین کے عہد حکومت میں وہ پہلے غزنی آیا پھر ہندوستان پہنچا مگر یہاں پہنچ کر اس نے اسے پسند نہ کیا کہ سلطان قطب الدین کے ساتھ لاہور میں مقیم رہے۔ اس لیے وہ حسام الدین اوغلیگ کے پاس چلا گیا جو وہاں رہا اور دریائے گنگا کے اس پار کے علاقے کا حاکم تھا اور کنیلا اور پٹیالی اسے بطور انعام ملے تھے۔ ملک محمد بختیار خوری وہاں سے اودھ کو روانہ ہوا، اسے فتح کیا۔ اس کے بعد بہار اور منیر کی جانب بڑھا اور اسے مسخر کیا جہاں انواع واقسام کا مال قیمت اس کے ہاتھ آیا۔ سلطان قطب الدین ایبک کو جب اس کی روز افزوں فتوحات کی اطلاع ملی تو ملک محمد بختیار خوری کے لیے اس نے ازراہ قدر وانی خلعت شاہی اور لوٹے سلطنت بھیجا۔ ملک محمد بختیار خوری نے بھی اس کے عوض بے شمار تحائف سلطان کی خدمت میں بھیجے اور مزید انعام و اکرام سے مالا مال ہوا۔ بارگاہ سلطانی کے امرائے جب ملک محمد بختیار خوری کی بڑھتی ہوئی مقبولیت دیکھی اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں بالکل بے بس پایا تو حسد اور جلن سے انہوں نے اس کے خلاف سلطان کے کان بھرنے شروع کیے یہاں تک کہ سلطان ان کی باتوں میں آگیا اور اس نے ملک محمد بختیار خوری کو مست ہاتھی کے ساتھ لڑنے کا حکم دے دیا۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو ملک خوری نے ہاتھی کے خرطوم پر ایک بھاری گرز سے اتنی کاری ضرب ماری کہ وہ چکرا کر میدان سے بھاگ نکلا۔ سلطان اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ملک خوری کے لیے لکھنوتی کے تمام علاقہ کی حکومت کا فرمان جاری کر دیا۔ اس کے دوسرے سال ملک خوری اپنے لشکر کے ساتھ لکھنوتی سے ندیا پہنچا۔ یہ شہر آج ویران و خراب حال ہے اس کا حاکم رائے لکھنوتی (لکھینہ)

ہے اسے محمد بختیار خلی بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے بنگال پر چڑھائی کی اور دنیا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ندیا شہر کو اس نے زمین کے ساتھ لکھنوتی کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے بعد ہی سے بنگال کی سرزمین دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے تحت رہی۔ (آئین اکبری)

میں بھی نام لکھتا ہے۔ (امپریل گزٹیر)

وہ مقام جہاں شیخ شرف الدین منیری کا روضہ مبارک ہے۔

لکھنوتی۔ یہ بنگال کا قدیمی پایہ تخت تھا جس کا اصلی نام کشمپوتی تھا بعد میں لکھنوتی ہو گیا۔ اکبر بادشاہ نے اس کا نام جنت آباد رکھا۔ (آئین اکبری)

طبقات ناصری، (امپریل گزٹیر)

ندیا یا نواب یہ بھاگپتی دریا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی بنا کشمپوتی یعنی میر بلال سین بنگالی کے راجہ نے رکھی تھی (طبقات ناصری اور امپریل گزٹیر)

اس راجہ کی ملاوت کا حال آئین اکبری اور طبقات ناصری دونوں میں یوں درج ہے کہ نجومیوں کی پیشین گوئی کے مطابق جو وقت مقرر تھا۔ اس کی پیدائش اس سے تھوڑی

بڑھ کر ہونے والی تھی مگر عینہ وقت کو پورا کرنے کے لیے اس کی ماں کو اٹھ لگا دیا گیا یعنی سر نیچے اور پاؤں اوپر اور اس کی ٹانگیں باندھ دی گئیں۔

تھا جس نے ملک محمد بختیار خوری اور اس کی طاقت کے متعلق پہلے ہی نجومیوں سے سن رکھا تھا، چنانچہ اس کی آمد کی خبر پاتے ہی وہ  
کامروکی جانب فرار ہو گیا اور بے شمار مال و اسباب غنیمت اہل اسلام کو ملا۔ محمد بختیار نے کفار کے معبودوں اور بت خانوں کو مسمارا اور  
دیران کیا، ان کی جگہ مسجدیں اور مکتب تعمیر کیے۔ اس نے دارالسلطنت کی بنا ڈالی اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور (خوری) رکھا۔

آنجا کہ بود نعرہ و غوغائے مشرکاں  
اکنون خروش و غلغلہ اللہ اکبر است

اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے اور سکہ جاری کرانے کے بعد ملک بختیار خوری نے تبت اور ترکستان کے ممالک فتح کرنے کا تہیہ کیا۔  
اور ایک بہت بڑی جمیعت کے ساتھ ادھر روانہ ہوا جو امیر علی مسیح کی کمان میں تھی۔ اس کے مقابلہ کے لیے بارہ ہزار سرتاپا مسلح  
سوار بردھن شہر پہنچ گئے۔ ملک خوری کے راستہ میں دریائے برہم پتر اپڑتا تھا جس کا دوسرا نام برہمکڑی تھا۔ یہ دریا گنگا سے  
میں پار گنا ہے۔ شاہ گشتا سپ جب ادھر آیا تھا تو اس نے اس دریا پر ایک پل بنایا تھا اور کامرو کے پاس سے اسے عبور کر کے  
آگے بڑھا تھا۔ ملک بختیار نے بھی اسی پل سے کام لیا اور اسی مقام پر دریا کو عبور کیا۔ پل کی نگہانی اور راستہ کی حفاظت کے لیے  
اس نے اپنے پیچھے چند قابل اعتماد جرنیلوں کو بھجوا دیا۔ پھر وہ تبت پہنچا، دس روز پہاڑوں کے دشوار گزار راستے طے کرنے میں گزارا۔  
آخر اسے ایک صحرا دکھائی دیا جہاں ایک بے حد مستحکم قلعہ تھا۔ اہل قلعہ گشتا سپ کی نسل سے تھے اور اس قلعہ کی بنیاد بھی گشتا  
نے ڈالی تھی۔ چنانچہ اہل قلعہ جنگ کرنے کے لیے میدان میں نکل آئے اور شام تک لڑتے رہے۔ محمد بختیار کے بہت سے آدمی ہلاک  
ہوئے، اس نے اسی جگہ خیمے گاڑ دیے تو اسے خبر ملی کہ اس شہر سے سات آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک اور شہر ہے جہاں بچا  
ہزار جنگجو ترک ہیں اور وہ اہل قلعہ کی امداد کو آئیں گے اس لیے دوسرے دن محمد بختیار نے وہاں ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا۔  
چونکہ اس میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی اسی پل پر واپس آ گیا مگر اس کے پہنچنے سے قبل ہی جن جرنیلوں کو اس نے پل کا نگہان اور  
راستہ کا محافظ مقرر کیا تھا کسی وجہ سے وہ آپس میں لڑ پڑے تھے جس کی وجہ سے کفار کو پل کے دو طاق توڑنے کا موقع مل گیا تھا۔  
جب محمد بختیار پل کی جانب واپس آ رہا تھا تو کفار اس کے تعاقب میں تھے۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر حملہ کیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور  
مقام کے قریب ہی ایک مضبوط خانہ تھا، محمد بختیار نے رات وہیں گزار دی، صبح دریا پار کرنے کا سوال درپیش ہوا تو قریب ہی ایک جگہ  
دریا پایاب نظر آیا اور اس کے چند آدمی وہاں سے گزر کر پار ہونے لگے مگر ریت ریگ رواں بن گئی اور جہاں کہیں وہ پاؤں رکھتے ریت  
نیچے سے کھسک کر زمین میں دھنس جاتی اور اس کے بجائے پانی کا چشمہ ابل پڑتا۔ چنانچہ محمد بختیار کے اکثر لشکری اس بحر فنا میں غرق  
ہو گئے اور جو بچ گئے وہ تیغ کفار کا لقمہ بنے اور شہادت کا مقام حاصل کیا۔ اتنے ہزار آدمیوں میں سے محمد بختیار صرف چار سو کے ساتھ

۱۔ اس امر کا کہیں تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ محمد بختیار خوری کے نام کی مناسبت سے اس کا نام گور (خوری) رکھا گیا تھا۔ (امپریل گزیٹ)  
۲۔ کنج اور بیج قبیلوں کا سردار۔ یہ قبیلے تبت اور بکھنوقی کے درمیانی علاقوں میں رہتے تھے اور ترکوں سے مشابہت رکھتے تھے اور زبان بھی مختلف تھی۔  
۳۔ ہندوستان سے ملتی تھی نہ تبت سے، محمد بختیار کے ہاتھوں مشرق بہ اسلام ہوئے اور اسی کو انھوں نے اپنا مرشد مان لیا تھا۔ (طبقات مصری)



دیو کوٹ پہنچا اور رنج و اندوہ کے باعث بیمار پڑ گیا یہاں تک کہ اس کی بیماری نے مرضِ دق کی صورت اختیار کر لی۔ اس حالت میں وہ اکثر کہتا کہ شاید سلطان معز الدین سام کو جو حادثہ پیش آیا تھا اس کی وجہ سے دولت اس سے برگشتہ ہو گئی ہے۔ روز بروز اس کی حالت گرتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے امراء میں سے ایک بڑے امیر علی مروان نے جو نازنول کے علاقہ سے دیو کوٹ پہنچا تھا جب محمد بن اختیار کو صاحبِ فراش دیکھا تو اس کے چہرہ سے چادر ہٹا کر خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ واقعہ سن کر رونا ہوا جب کہ سلطان معز الدین سام وفات پا چکا تھا۔ اسی علی مروان نے سلطان قطب الدین کی وفات کے بعد بھی بڑی حکمت عملی سے عمان حکومت چھین لی تھی۔ لکھنوتی میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا تھا، اپنا ہی سکہ جاری کیا تھا اور سلطان علاؤ الدین کے نام کی آرٹے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا، چونکہ وہ پرے درجے کا کابینہ، مغرور اور بیہودہ تھا اس لیے لکھنوتی میں بیٹھا اپنے آدمیوں میں ممالک ایران و توران کی تقسیم کرتا رہتا اور کسی کو اس سے یہ دریافت کرنے کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ ممالک تو بادولت کے احاطہ تصرف سے باہر ہیں اس لیے ان کی تقسیم یہاں کے آدمیوں میں کیسے کی جاسکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مصیبت زدہ شاہر نے سلطان علاؤ الدین سے اپنے افلاس اور غربت کی شکایت کی۔ چنانچہ اس سے دریافت کیا گیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے اصفہان کا نام بتایا۔ یہ سنتے ہی اس نے حکم دیا کہ ایک فرمانِ حاکم اصفہان کے نام جاری کر دیا جائے کہ وہاں کی زمین کا ایک قطعہ گزارہ کے لیے تاجر مذکور کو دے دیا جائے۔ تاجر نے اس قسم کا فرمان لے جانے سے انکار کر دیا، مگر وزیروں میں سے کسی کو اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سلطان کو اس امر کی اطلاع کرتا۔ ایک مرتبہ سلطان سے یہ کہا گیا کہ حاکم اصفہان کو خرچہ راہ داری اور اس علاقہ میں نظم و ضبط بحال کرنے کی غرض سے فوجوں کو اکٹھا کرنے کے لیے خرچ کی ضرورت ہے۔ اس پر اس نے حکم دیا کہ اسے ایک رقم خطیر بھیج دی جائے جو توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ جب اس کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے تو امرائے خلج نے متحد و متفق ہو کر اسے قتل کر ڈالا اور اس کی جگہ ملک حسام الدین کو تخت پر بٹھا دیا جو خلج اور گرم سیر کے امرا اور محمد بن اختیار کے خدمت گاروں میں سے تھا۔ علی مروان کی مدت حکومت ۳۲ سال تھی۔ ملک حسام الدین تخت نشین ہوتے ہی تربہٹ، بنگال، جاج نگر اور کامرد کے تمام علاقوں پر متصرف ہو گیا۔ اس نے سلطان غیاث الدین کا خطاب پایا۔ ۶۲۲ھ میں اس نے سلطان شمس الدین التمش کو ۳۸ ہاتھی اور ستر ہزار تنگہ در نقد بطور نذرانہ بھیجا اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکہ جاری کیا چنانچہ اس کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ انشاء اللہ۔

۶۲۲ھ میں ملک ناصر الدین محمد بن سلطان شمس الدین التمش اپنے بعض امیروں کے ورغلانے اور کسانے پر اودھ سے لکھنوتی روانہ ہوا۔ غیاث الدین اس وقت فوج کے ساتھ کامرد گیا ہوا تھا۔ یہ سن کر واپس آگیا اور ملک ناصر الدین محمد کے ساتھ اس کی خونریز جنگ ہوئی مگر وہ اپنے امراء کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ گرفتار ہو گیا اور بعد میں ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی مدت حکومت دو سال تھی۔

دیلمیوں کے ان چند مسلمان بادشاہوں کا ذکر وہلی کے سلاطینِ عالی شان کے سلسلہ میں ضروری اور مناسب تھا اور باقی ملوک

لے اسے ناز کوئی بھی کہتے ہیں۔

۶۲۵ تنگہ۔ آئینہ کبریٰ کے مطابق موجودہ ایک روپیہ کے برابر سکہ تھا۔

معزی کے حالات جو ملتان اور دوسرے مقامات پر قابض رہے دوسری جگہ درج ہیں۔

## سلطان آرام شاہ بن قطب الدین ایبک

باپ کے بعد اس کا جانشین ہوا۔

جہاں رانا تندرے کد خدائے کیے گر رود دیگر آید بجائے  
ہیں است رہم سرائے فریب پدر رفت و پائے پسرور رکیب

امراء کی متفقہ رائے سے آرام شاہ نے لاہور سے دہلی کی جانب کوچ کیا۔ اس اثنا میں سپہ سالار علی اسماعیل کی استدعا پر ملک شمس الدین التمش ہردوار اور بدایوں سے آکر دہلی پر متصرف ہو گیا تھا۔ واضح رہے کہ ملک شمس الدین التمش سلطان قطب الدین کا غلام، منہ بولا بیٹا اور داماد تھا۔ ملک ناصر الدین قباچہ کے ساتھ بھی اس کے باج گزارانہ تعلقات تھے۔ جب آرام شاہ نواح دہلی میں پہنچا تو ملک شمس الدین التمش اس کے مقابلہ کے لیے ایک لشکر عظیم کے ساتھ دہلی سے باہر صفت آرا ہوا۔ اس معرکہ میں آرام شاہ کو شکست ہوئی۔ اس کا عہد حکومت ایک سال سے بھی کم رہا۔

ہمہ مرگ رانیم پیرو جواں بگیتی مناند کے جاوداں  
چنین است کہ دار چرخ بلند بدستے کلاہ بدستے کند

## سلطان شمس الدین التمش المناط بزمین امیر المومنین

شہ ۶۱۷ھ میں تخت دہلی پر متمکن ہوا۔ التمش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی پیدائش چاند گرہن کی شب کو ہوئی تھی اور ترک ایسے بچہ کو التمش کہتے ہیں۔ اس کا باپ قبائل ترکستان کا سردار تھا۔ اس کے رشتہ دار ایک روز التمش کو سیر کے بہانے باغ میں لے گئے۔ اور حضرت یوسف کی طرح ایک تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا جہاں سے وہ بخارا پہنچا اور اس کے بعد سلطان محمد سام کے عہد حکومت میں غزنی آیا۔ عین اس وقت قطب الدین ایبک نہروالا اور گجرات کی تسخیر کے بعد غزنی پہنچا تھا چونکہ بغیر حکم سلطان محمد سام کوئی شخص التمش کو خرید نہیں سکتا تھا اس لیے اس نے سلطان سے اجازت طلب کی۔ سلطان محمد سام نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ

لہ منہاج الراج میں لکھا ہے کہ آرام شاہ کے انتقال کے وقت ہندوستان کی حکومت چار بڑے بڑے صوبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ سندھ، ناصر الدین قباچہ کے قبضہ میں تھا۔ دوسرا لکھنوتی خلیجی سرداروں میں سے علی مروان کے پاس۔ تیسرا لاہور، سندھ، دہلی اور غزنی کے حکمرانوں کا میدان جنگ اور چوتھا دہلی پر شمس الدین التمش کا تصرف تھا۔ (پہچٹان بادشاہ صفحہ ۴۰۴)

۱۱۷۷ھ پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے دہلی میں ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی۔ اسے خلیفہ بغداد المستنصر باللہ سے سند خلافت بھی ملی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بغداد کے خلیفہ نے ہندوستان کے کسی مسلمان بادشاہ اور اس کی حکومت کے وجود کو اس طرح تسلیم کیا تھا۔

۱۱۷۸ھ یہ ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی مقدمۃ البجیش یا دستہ ہراول ہے۔ اگر اس کی املا یوں لکھی جائے ایلتمش تو سورج گرہن کے معنی حاصل ہوتے ہیں

چونکہ وہ حکم دے چکے ہیں کہ غزنی میں اسے کوئی نہ خریدے اس لیے اسے دہلی لاکر فروخت کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قطب الدین ایبک دہلی واپس آیا اور یہاں آکر اس نے ایک لاکھ تنگہ میں دو غلام خریدے۔ ایک اس کا ہم نام ایبک تھا اور دوسرا یہ التمش ایبک غلام کا نام امیر متعاج رکھا اور اسے تبرہ ہندہ کا امیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ جب قطب الدین ایبک کی جنگ تاج الدین یلدوز سے ہوئی تو اس ایبک غلام نے شہرت فنا چکھا۔ اس کے بعد اس نے التمش کو اپنا منظور نظر بنایا اور فتح گوایار کے بعد وہاں کا قلعہ وراثت اس کے سپرد کیا۔ اس کے بعد بہمن اور اس کے نواح کی حکومت بھی اسے دے دی۔ جب اس سے زیادہ آثارِ جلالت رونما ہوئے تو بدایوں کا علاقہ بھی اس کے تحت کر دیا۔ کھوکھروں کی جنگ میں التمش ایک بہت بڑا لشکر لے کر سلطان معز الدین کی مدد کو گیا تھا اور اپنے مسلح گھوڑوں کو دریا میں ڈال کر اس نے ان کے ساتھ مردانہ وار جنگ آزمائی کی تھی جس کے صلہ میں سلطان نے اسے القابات خسروانہ اور شایان شان خلعتوں سے نوازا تھا۔ ملک قطب الدین نے اس کی بہت سفارش کی تھی اور اس کی تربیت کی تعریف کی تھی۔ اسی دن قطب الدین نے اسے خطِ آزادی مرحمت فرمایا، پھر رفتہ رفتہ اسے امیر الامراء کے منصبِ جلیلہ پر فائز کر دیا یہاں تک کہ وہ اس عالی مرتبہ تک پہنچ گیا جہاں تک کہ اسے پہنچنا تھا۔ اس کے عہدِ حکومت کے ابتدائی ایام میں معز الدین اور قطبی امراء میں سے بعض نے بغاوت کی، ان کی سرکوبی کی گئی اور وہ تیغِ بے دریغ کا لقمہ بنے۔ جب ملک تاج الدین یلدوز خوارزم کے لشکر سے شکست کھا کر لاہور پہنچا تو التمش دہلی سے اس کے استقبال کے لیے لاہور روانہ ہوا۔ ۱۲۱۱ء میں ترائن جو سرائے توراوی کے نام سے مشہور ہے اس کی حدود میں دونوں کی فوجیں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئیں اور خونریز جنگ ہوئی جس میں ملک تاج الدین یلدوز نے شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ اسے بدایوں بھیج دیا گیا جہاں اس کا مرغِ اوج زندانِ تن سے پرواز کر کے آشیانہٴ آخرت کی جانب پرواز کر گیا۔ اسی شہر میں اسے دفن کر دیا گیا۔

۱۲۱۲ء میں سلطان ناصر الدین قباچہ سے سلطان التمش کی جنگ ہوئی۔ قباچہ نے سلطان قطب الدین ایبک کی دو بیٹیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے شادی کی تھی۔ اس معرکہ میں بھی سلطان التمش کو فتح ہوئی۔ تیسری مرتبہ پھر اس کا مقابلہ سلطان ناصر الدین قباچہ سے ہوا۔ وہ حصارِ پتھر کو مستحکم کر کے خود قلعہ بھنگنے کی جانب چلا گیا۔ نظام الملک وزیرہ جندی نے اس کا تعاقب کیا۔ اس اثنا میں سلطان التمش نے قلعہ پتھر فتح کر لیا۔ جب اس کی خبر سلطان ناصر الدین قباچہ کو ملی تو اس نے اپنے بیٹے بہرام شاہ کو سلطان التمش کی خدمت میں بھیجا اور صلح کی درخواست کی۔ بعد میں قلعہ بھنگر بھی مسخر ہو گیا۔

۱۲۱۵ء میں ناصر الدین قباچہ پنجاب میں غرقِ بحر فنا ہو گیا اور اس نے اپنا تخت و جہد سیلابِ اجل کے سپرد کر دیا۔ اس لیے سلطان التمش دہلی واپس آ گیا۔ ۱۲۱۶ء میں اس نے سلطان جلال الدین منکیرنی سرخوارزم شاہ پر لشکر کشی کی جو چنگیز خاں سے

۱۲۱۷ء تک کے نزدیک یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں کے درمیان اس طرح مخالفت ہوئی۔ طبقاتِ ناصری کی رائے اس کے برعکس ہے۔ اس کے نزدیک ان دونوں کے درمیان امدادی مخالفتِ جذبات پرورش پاتے رہتے تھے ان دونوں کے مقابلہ میں ملا بدایونی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لے ترکی زبان میں منکیرہ کے معنی سیاہ تل ہے۔ چونکہ اس کی ناک پر ایک تل تھا اس لیے اسے منکیرنی کہا گیا۔ (طبقاتِ ناصری)

شکست کھا کر تاج الدین یلدوز کے بعد غزنی پہنچا تھا۔ پھر وہاں سے بھی خائف ہو کر اپنے متعلقین کے ساتھ لاہور آگیا تھا۔ سلطان جلال الدین اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر سندھ اور سیستان کی جانب چلا گیا، وہاں سے کچھ اور کرمان کے راستہ کرمان اور عراق پہنچا۔

۶۲۲ھ میں سلطان التمش نے ہار اور لکھنؤ کی کاؤرخ کیا اور سلطان غیاث الدین خلجی جس کا ذکر سطور ماضی میں کیا جا چکا ہے اسے مطیع کیا اور جس تحفہ کا ذکر سطور ماضی میں کیا گیا ہے اسے قبول کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنا سکہ جاری کیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے کو سلطان ناصر الدین محمد کا خطاب دے کر دلی عہد مقرر کیا اور وہ علاقہ اس کے سپرد کر کے خود مراجعت فرمائے دہلی ہوا۔ بعد میں سلطان ناصر الدین محمد اور سلطان غیاث الدین خلجی کے درمیان جنگ چھڑ گئی، جس میں سلطان غیاث الدین خلجی کو شکست ہوئی اور وہ سلطان ناصر الدین محمد کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس معرکہ میں لوٹ مار کا جو سامان سلطان ناصر الدین محمد کو ملا اس نے اسے کئی حصوں میں تقسیم کیا اور امرائے دہلی میں سے ہر ایک کو الگ الگ حصہ بدیتہ بھیجا۔

کہتے ہیں کہ ناصر علی نامی ایک شاعر دہلی سے خواجہ قطب الدین اوشی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کو بتایا کہ اس نے ایک قصیدہ سلطان التمش کی مدح میں کہا ہے اس نے حضرت قدس سرہ سے درخواست کی کہ وہ فاتحہ خوانی کریں تاکہ اسے معتد بہ صلہ ملے۔ چنانچہ انھوں نے فاتحہ خوانی کی، اس کے بعد وہ سلطان التمش کی مجلس میں آیا اور یہ مطلع پڑھا:

اے فتنہ از نہیب تو زہنا را خواستہ

تیغ تو مال و فیل ز کفار خواستہ

ایک ہی بار پڑھنے سے یہ مصرع سلطان التمش کو از بر ہو گیا۔ اس کے بعد جب شاعر نے تمام قصیدہ سنایا تو سلطان نے دریافت کیا کہ کل شعر کتنے ہوئے؟ جب شاعر نے بتایا کہ ۵۳ شعر، تو سلطان نے حکم دیا ۵۳ ہزار تنگہ سفید ناصری شاعر کو انعام دیے جائیں۔

۶۲۳ھ میں سلطان التمش نے بڑے متھبور کا قصد کیا اور اسے فتح کیا۔ اس کے بعد ایک لشکر کثیر کو ۶۲۴ھ میں قلعہ مندر کی تسخیر کے لیے بھیجا جو کوہ شوالک کے ساتھ اسے بھی مسخر کر کے اس کے سلسلہ فتوحات میں لایا اور دہلی واپس آگیا۔ اسی سال امیر روحانی جس کا شمار افاضل روزگار میں ہوتا تھا، چنگیز خاں کے ہاتھوں تنگ آ کر بخارا سے عازم دہلی ہوا۔ اس نے فتوحات کی تقریب میں تہنیتی قصائد لکھے۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

خبر باہل سما بر و جبریل امین ز فتح نامہ سلطان عہد شمس الدین

کہ اے ملائکہ قدس آسمانہ را بدیں بشارتے بنید کلمہ آمین

کہ نور بلاد ملاحظہ شہنشاہ اسلام کشادہ بار و گر قلعہ سپہر آئین

شہ مجاہد غازی کہ دست تیغش را روان حیدر کردار می کند تحسین

۱۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی جن کا مزار مبارک دہلی میں زیارت گاہ خواص و عام ہے۔ کاکی یعنی کاک جس کے معنی کیک یا روٹی ہے۔ حضرت خواجہ کے خاندان کے لیے روٹیاں بھیجا کرتے تھے اس لیے وہ کاکی کہلاتے۔ (آئین اکبری)



اس کے علاوہ بھی اس کی مدح میں اس نے دل پذیر اشعار رکھے ان میں ایک قصیدہ یہ بھی ہے ۵

قصۂ خویش از زبانِ قلم      کردہ ام یاد در بیانِ قلم  
رقم رنج گویا بود است      بر خطِ عمر من نشانِ قلم  
باقلم تا قریں شدم بحال      روز من گشت چوں جهانِ قلم  
ناگہاں بانگِ دفتہ من      زان ورشتی کند سنانِ قلم  
آخر احوال من نگوید کس      پیش صاحب مگر زبانِ قلم  
خواجہ منصور بن سعید کز دست      تیز باز را امتحانِ قلم

۶۲۶ھ میں کچھ عرب سفیر اس کے لیے انقاب اور خلعت مصر سے لے کر آئے اس خوشی میں شہر کو آراستہ کیا گیا، خوبصورت محرابیں بنائی گئیں اور محفلِ جشن و نشاط منعقد کی گئی۔ اسی سال اسے اطلاع ملی کہ اس کا فرزند کلاں سلطان ناصر الدین محمد لکھنوتی میں انتقال کر گیا ہے۔ مراسم عزاداری سے فراغت پا کر سلطان نے اپنے پسر خورد کا نام بھی ناصر الدین رکھ دیا۔ کتاب طبقاتِ ناصری اسی کے نام سے موسوم ہے۔ ۶۲۷ھ میں وہ خود لکھنوتی پہنچا، وہاں کی شورش کو فرو کیا اور عثمان حکومتِ غزالمملک ملک علاؤ الدین خانی کے سپرد کر کے خود پائے تخت کو واپس چلا آیا۔ ۶۲۹ھ میں اس نے قلعہ گوالیار فتح کیا اور دہلی مملکت تاج الدین یلدرغ نے اس قلعہ کی تسخیر کے موقعہ پر ذیل کی رباعی کہی جسے پتھر پر کندہ کر دیا گیا ۵

بر قلعہ کہ سلطانِ سلاطین گرفت      از دعویٰ خدا و نصرتِ دیں گرفت  
آں قلعہ کا لیور و آں حصن حصین      در ستمایہ سنِ ثلاثین گرفت

ظاہر ہے تاریخِ حاضرہ ہے جو ایک سال پہلے کہی گئی تھی، قلعہ ایک سال کے بعد مسخر ہوا۔ ۶۳۱ھ میں اس نے صوبہ مالوہ کی طرف یورش کی، بھیلسا کو فتح کیا۔ اس کے بعد شہر اوجین کی طرف بڑھا اور اس پر بھی قبضہ کیا۔ اس میں ایک بت خانہ تھا جس کا نام مہاکال تھا، اس کی تعمیر کو چھ سو سال ہو چکے تھے اسے برباد کیا یہاں تک کہ اس کی بنیادوں کو بھی اکھیڑ پھینکا۔ راجہ بکرماجیت کا ایک مجسمہ بھی وہاں نصب تھا اسے بھی گرا دیا۔ واضح رہے کہ یہی وہ بکرماجیت ہے جس کے نام سے ایک سن بھی جاری ہے اور دلاقم الحروف نے خلیفہ الرحمانی شہنشاہی ظلِ اللہی کے حکم سے پہلے ۹۷۲ھ اور دوبارہ ۱۰۰۳ھ میں ہندو پنڈتوں کی مدد سے اسی راجہ کے متعلق ۲۲ نادر اور عجیب و غریب کہانیوں کا ہندی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس مجموعہ کا نام خرد افزا رکھا۔ یہاں سے سلطان، پتیلی کے کچھ مجسمے بھی اپنے ہمراہ لے گیا۔ جنہیں اس نے دہلی کی جامع مسجد کے دروازہ

۱۰ مہر کے بجائے غالباً بغداد ہوگا اس لیے کہ خلیفہ المستنصر باللہ نے بغداد ہی سے اسے سند خلافت وغیرہ بھیجی تھی۔ ۲۶ ۵۲ ماہ صفر ۶۳۳ھ طبقاتِ ناصری

۶۳۳ھ (طبقاتِ ناصری)

۱۰ بھیلسا۔ ہندو یہاں یا ترا کے لیے جاتے ہیں اور اس کے قریب ہی متعدد بدھ دھارے ہیں۔

۱۰ طبقاتِ شاہجہانی کے مطابق لاہور کی آمد کا انتقال ۶۳۳ھ میں ہوا تھا۔ نامہ خرد افزا سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ہے۔

کے پاس رکھ دیا اور حکم دیا کہ لوگ آتے جاتے انہیں پامال کر دیں۔ وہ ایک بار پھر لشکر لے کر ملتان پہنچا، مگر بد قسمتی سے اسی سفر میں اسے ایک جسمانی عارضہ لاحق ہو گیا اور دہلی واپس آ گیا اور ۶۳۲ھ میں اس سرے مستعار سے عالم جاودانی کو سدھارا۔ اس کی مدت حکومت ۲۶ سال تھی۔

وزراں سرو آمد این کا رخ دلاؤ زینہ  
کہ چوں جاگرم کردی گویدت خیز

اور خسرو شاعر نے کہا ہے

ہمہ ہندوستان ویدی غبارِ جیش التمش      کنوں میں بادہ نوش دیکھاں در سیرِ مدائن  
ہماں دہلی است این گویا کجا شد چترِ فیروزش      ہماں ملک است این آخر کجا رفت آں قدرِ خائن  
ز میں ماتم کدہ است بہرِ خود ماتم ہی وارو      بگاہِ نژادن آں طفلے کہ می بیند گریبان

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ سلطان التمش سرور مزاج تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس کے جی میں آیا کہ کسی خوبصورت اور حسین کنیز کی صحبت سے لطف اندوز ہو مگر قوتِ مردمی نے اس کا ساتھ نہ دیا اور متعدد بار ایسا ہی ہوا۔ ایک روز جب کہ وہ کنیز سلطان کے سر میں تیل ڈال رہی تھی تو اس حسین کنیز کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے سلطان کے سر پر گر پڑے۔ سلطان نے سراٹھا کر دیکھا اور اس سے رونے کا سبب دریافت کیا۔ بڑے پس و پیش کے بعد آخر کنیز نے بتایا کہ اس کا ایک بھائی تھا جس کا سر سلطان کی طرح گنجا تھا۔ اس لیے سر میں تیل ڈالتے ہوئے کنیز کے دل میں اپنے گنجنے بھائی کی یاد تازہ ہو گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ کنیز نے یہ بھی بتایا کہ اس کا بھائی ایک مرتبہ مقید بھی ہوا تھا۔ چونکہ سلطان بھی مقید ہوا تھا اس لیے اسے یوں محسوس ہونے لگا گویا کنیز مذکورہ اسی کی بہن ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ نے اس کنیز کو شاید اسی وجہ سے حرام کاری سے بچائے رکھا۔ راقم الحروف نے خلیفہ آفاق اکبر شاہ خلد اللہ ملکہ کی زبانی پہلے فتح پور اور اس کے بعد لاہور میں بھی ایک رات یہ بات سنی تھی جب کہ انھوں نے پاپے تخت کی خلوت گاہ میں بلا کہ راقم الحروف کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کی تھیں۔ علاوہ ازیں سلطان غیاث الدین بلبن سے بھی یہی روایت منقول ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ جب سلطان التمش نے ارادہ مباشرت کیا تھا تو کنیزہ کو حیض جاری ہو گیا تھا۔

## سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن شمس الدین التمش

اپنے والد کے عہدِ حکومت میں سلطان رکن الدین فیروز شاہ چند مرتبہ بدایوں کے اضلاع کا مختار رہا تھا۔ اس کے بعد چتر پور اور عصلے اختیارات بھی حاصل ہوا تھا اور جب لاہور کے سیاہ و سفید کا مالک تھا تو اس کی حیثیت ولی عہد کی تھی۔ سلطان التمش کے انتقال کے بعد تمام اہل حل و عقد کی متفقہ رائے سے ۶۳۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس کے دبیر ملک تاج الدین یلہ وز نے اس تقریب سعید میں یہ تہنیتی قصیدہ کہا تھا

مبارک باد ملک جاودانی      ملک را خاصہ در عہد جوانی

یمن الدولہ رکن الدین کہ آمد درش از یمن چوں رکن یمانی

جب تخت نشین ہوا تو شاہی خزانوں کے منہ کھول کر اس نے خوب داد عیش و عشرت دی اور اپنے اوقات گرامی طوائف اور رذیلوں کی صحبت میں صرف کیے۔

دل چوبیٹے حسانہ گراید ترا

جز مرغ و مطرب کہ شاید ترا

اُس کی والدہ ترکان خاتون ایک ترک کی کنیز تھی۔ از روئے غلبہ قوت و رشک وہ حرم کی دوسری خواتین کو بہت تنگ کرتی۔ سلطان کا پسربزرگ قطب الدین ایک دوسری حرم کے بطن سے تھا، اس نے اُسے بھی قتل کرا دیا تھا۔ سلطان رکن الدین کی عیش کو شہی اور غفلت شعاری کے باعث خزانہ عامرہ خالی ہوتا جا رہا تھا۔ جب اس کے برادرِ خورد ملک غیاث الدین محمد شاہ حاکم اودھ نے یہ حالت دیکھی تو اس نے علم بغاوت بلند کیا۔ ساتھ ہی اس نے عز الدین و کبیر خاں سلطانی والی ملتان اور ملک سیف الدین ضابط ہانسی کو بھی خطوط لکھے اور انھیں آمادہ کیا کہ سلطان کی مخالفت کریں۔ سلطان رکن الدین کو جب اس کا علم ہوا تو فتنہ کو دبانے کی غرض سے منصور پور اور ترائی کے حوالی میں پہنچ گیا۔ اس واقعہ سے پہلے نظام الملک جنیدی وزیر وکیل ممالک ہند سلطان کے در سے کیلو کھاری کو راہ فرار اختیار کر کے کول میں ملک عز الدین محمد سالاری سے جا ملا تھا۔ لشکر کے دوسرے باقی ماندہ معتبر امراء منصور پور کے نواح ہی سے واپس دہلی چلے گئے اور وہاں رضیہ خاتون سے بیعت کر لی جو سلطان التمش کی دختر بزرگ تھی اور اپنے والد کی وصیت کے مطابق اسی کو حق ولی عہدی پہنچتا تھا۔ وہ شجاعت، سخاوت، فراست ایسی پسندیدہ خصلتوں کی حامل تھی۔ انھوں نے اسے تخت سلطنت پر بٹھا دیا اور ترکان خاتون کو مقید کر دیا۔ جب سلطان واپس ہوا اور ابھی کیلو کھاری پہنچا تھا، تو سلطان رضیہ اس کے استقبال کے لیے ایک لشکر کثیر کے ساتھ دہلی سے باہر نکلی اور بغیر جنگ کیے اسے گرفتار کر کے محبوس کر دیا، چنانچہ وہ قید کی حالت میں ہی انتقال کر گیا۔ اس کی مدتِ حکومت چھ ماہ سے کچھ ہی زیادہ تھی۔

منہ بر جہاں دل کہ بیگانہ ایست

چو مطرب کہ ہر روز در خانہ ایست

سلطان رکن الدین کے جملہ شعرائے عصر اور اساتذہ زمان میں سے ایک شہاب الدین مہمرہ بدایونی تھا۔ امیر خسرو نے اپنے ایک قصیدہ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ

در بدایوں مہمرہ سر مست بر خیزد ز خواب

گر بر آید غلغلہ مرغان دہلی زیں تو

۱۔ ترکان خاتون اعلیٰ قلب بہ خداوندہ جہاں۔

۲۔ مصافحات دہلی کا ایک حصہ۔

۳۔ مارچ الاقل ۱۳۱۳ھ۔

۴۔ شاعر کا پورا نام شہاب الدین امین جمال الدین مہمرہ ہے۔ غلطی سے مہمرہ لکھا گیا ہے وہ شہاب الدین مہمرہ کے نام سے مشہور ہے۔

ملک الکلام فخر الملک توکلی نے اسے استاد کی لحاظ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ استاد الشعراء شہاب مہرہ بدایونی کے چند قصائد کا انتخاب تیمنا و تبرکاً مندرج ذیل ہے تاکہ احباب کے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہو اور راقم الحروف کا حق ہم شہری ادا ہو۔

انعم بلوح ہستی ہمراہیچ در نشانی      بقاء غیر قائم ز وجود خویش فانی  
صف آخر ایستادہ بامید بہ نشینی      ز تحرک آرمیدہ بصفات بے نشانی  
صفت الف ندارم کہ الف کثری ندارد      ہمہ نقش من کثر آمد ز صحیفہ امانی  
یہ قصیدہ بھی اسی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، موٹے اور مور کے التزام کے ساتھ توحید و لغت ختمی پناہ صلعم کی تشریح کا حق ادا کیا ہے۔

از زباں گر چہ شکافم موٹے ہنگام بیاں      در ثنائے حق ز حیرت ہچو مورم بے بیاں  
ورپے زنجیر مویان پر پرواز ہوس      بستہ ام بسیار چوں موراں ز دل جاں بریں  
وز برے مور چشماں شکر لب و ز خیال      سفتہ ام موٹے سخن صدرہ ز روئے آسماں  
تا ذخیرہ باشدیم چوں مور اندر مدح او      مود و نیمہ کردم و یک موندیدہ از کس نشاں  
بعد ازیں چو مور بندم بر در بچوں کمر      وز بیں ہر موٹے توفیقش کشاں صدر بیاں  
اور یہ قصیدہ بھی اسی نے سلطان رکن الدین کی مدح میں کہا تھا۔ اس میں چار چیزوں کا التزام رکھا گیا ہے۔  
ہر زماں ایں کرگ و کرگ و نیل و شیر طفل خواں      آن کند با من کہ پیل و کرگ وقت کار تار  
آسمان نیلگوں مالہ تنم را کرگ ساں      روزگار شیر و شصبرم را بید کرگ مار  
زور کرگم نے و با من تند پیل آسماں را      شیر مردی می کند چوں کند کرگ روزگار  
پیل با کرگ آن نکرد و کرگ با پیش آنچہ کرد      شیر چرخ از جور با ایں شخص چوں موٹے شرار

## سلطان رضیہ بنت سلطان شمس الدین التمش

۱۳۷ھ میں تخت نشین ہوئی۔ اس نے اپنے پیش نظر عدالت و انصاف کا مسلک رکھا اور ان محنت علی کو انجام دیا جو خلل پذیر تھیں۔ کرم و رزائی کا وہ طریق کار جو عورتوں کے لیے اسی طرح معیوب تھا جس طرح مردوں کے لیے بخل۔ سلطان رضیہ نے اس پر عمل درآمد کیا۔ اس نے نظام الملک جندی کو اپنا وزیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے امراء کے مابین بعض امور کے باعث آپس میں مخالفانہ جذبات پیدا ہو گئے اور وہ علانیہ لڑنے جھگڑنے لگے۔ سلطان رضیہ نے ناخن تدبیر سے کام لے کر نالائق امیروں کے گروہ میں انتشار پیدا کر دیا اور وہ تتر بتر ہو کر ادھر ادھر بھاگ گئے۔ بعض کا تعاقب کر کے انھیں قتل کر دیا گیا۔ نظام الملک سرخو کہ چلا گیا اور اس نے نہ ناناخانہ عدم میں سکونت اختیار کر لی۔ خواجہ مہذب نائب اس کی جگہ وزیر اعلیٰ مقرر ہوا۔ سلطان رضیہ کی حکومت بڑی طاقتور اور مستحکم ہو گئی۔ چنانچہ اس نے رنتمبور فوج بھیجی اور سلطان التمش کی وفات کے بعد جی



مسلمانوں کو ہندوؤں نے محصور کر رکھا تھا انھیں غلامی دلوائی۔ جمال الدین یا قوت حبشی جو میرا خور (سرور اسپہا) تھا وہ اس کا اس حد تک معتمد علیہ ہو گیا کہ سلطان رضیہ ہاتھی اور گھوڑے کی سواری کے وقت اس کے بازو یا کندھے پر تکیہ لگا کر بیٹھتی۔ اس سے دوسرے امراء کے دل میں آتش حسد بھڑک اٹھی۔ سلطان رضیہ نے پردہ نشینی بھی ترک کر دی اور مروانہ لباس زیب تن کر لیا۔ وہ بڑی دلیری سے قبا پہنتی اور سر پر کلاہ رکھ کر تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتی اور فرائض حکومت سرانجام دیتی۔

۶۳۷ھ میں ملک عزالدین ایاز حاکم لاہور نے کھلے بندوں اس کی مخالفت شروع کر دی، چنانچہ سلطان رضیہ وہاں پہنچی اور اسے اپنے حلقہ اطاعت میں لائی۔ مزید برآں اس کے علاقہ میں ملتان کا اور اضافہ کر دیا۔ اسی سال اس نے تبرہندہ کی جانب بھی لشکر کشی کی۔ راستہ ہی میں ترک امراء نے جب اس کی بعض ناشائستہ حرکات دیکھیں تو بغاوت کر دی اور سلطان رضیہ اور جمال الدین یا قوت حبشی جو امیر الامراء کے منصب جلیلہ پر فائز تھے ان دونوں کو گرفتار کر کے قلعہ تبرہندہ میں بند کر دیا۔

مجدورستی عہد ارجمانِ صست نہا کہ این مجوزہ عروس ہزار داماد است  
نشانِ عہد و فانیست در تبسم گل بنال بیل بیدل کہ جائے فریاد است

## سلطان معزالدین بہرام بن شمس الدین التمش

سلطان رضیہ کے بعد سلطان معزالدین بہرام تخت نشین ہوا اور وہی پہنچا۔ اس وقت ملک اختیارالدین التونیہ حاکم تبرہندہ نے سلطان رضیہ کے ساتھ عقد نکاح کر کے تمام زمینداروں، جاٹوں اور کھوکھروں کی جماعت اور ان کے امراء میں سے چند ایک کو اپنا ہم نوا بنا لیا تھا اور ان کی مدد اور اعانت سے وہی کی جانب فوج کشی کی تھی۔ سلطان معزالدین بہرام نے ملک بلین خور کو بعد میں سلطان غیاث الدین بلین کے نام سے مشہور ہوا۔ ملک اختیارالدین التونیہ کے مقابلہ میں بھیجا۔ رضیہ بھی ملک التونیہ کے ساتھ تھی۔ جب ملک بلین خور کی فوجیں میدان جنگ میں آئیں۔ رضیہ کے لشکر میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ تبرہندہ واپس چلی گئی مگر چند روز کے اندر ہی دوبارہ فوجوں کو اکٹھا کر کے تسخیر دہلی کے ارادہ سے چل پڑی اور قصبہ کیتھل پہنچی، مگر اس بار بھی ملک بلین خور کے مقابلہ کی تاب نہ لاسکی اور شکست کھا کر بھاگ نکلی۔ راستہ میں التونیہ اور رضیہ دونوں گواروں کے ہاتھ آگئے اور سلطان معزالدین بہرام کے حکم سے انھیں قتل کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۶۳۷ھ کا تھا۔

۱۰ طبقات نامری میں لکھا ہے کہ جمال الدین کو قتل کر دیا گیا۔

۱۱ کیتھل سنسکرت میں اس کا نام کپسٹھا لکھا۔ کنال سے ۳۸ میل کے فاصلہ پر ہے اور دہلی سے سومیل مغرب کی جانب۔

۱۲ یہ ہندو جاٹوں کی ذات ہے صحیح لفظ گٹوارہ معلوم ہوتا ہے اس ذات کے لوگ گوبانہ کے دیہات اور دریائے جمن کے اس پار دو آبہ میں پائے جاتے ہیں۔

۱۳ تاریخ وفات کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ فوجوں کی مدد سے ۴ ربیع الاول ۶۳۷ھ کو ہوئی تھی اور رضیہ اور التونیہ دونوں اسی ماہ کی ۲۵ تاریخ کو قتل کر دیئے گئے تھے چونکہ رضیہ ۶۳۷ھ کو تخت نشین ہوئی تھی اس لیے ۶۳۷ھ سن وفات زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

سلطان رضیہ کی مدت حکومت ۳ سال ۶ ماہ ۶ روز تھی۔

سرے را کہ گردن بر آرد بلند  
ہمیش باز در گردن آرد کمند

جب سلطنت کی زمام اختیار سلطان بہرام شاہ کے ہاتھ آئی تو ملک اختیار الدین اتیگین جو پہلے حاجب تھا اور سلطان کی ہمیشہ اس کے نکاح میں تھی اور نظام الملک مہذب الدین کی تائید و حمایت سے مملکت کے جملہ امور پر وہ حاوی تھا۔ اور ہمیشہ ایک بہت بڑا باہق بادشاہوں کی طرح اپنے دروازے پر باندھے رکھتا تھا، ۱۳۳۸ء میں اسے اور نظام الملک مہذب الدین وزیر دونوں کو چند فدائیوں نے سلطان کے اشارے پر قتل کر دیا۔ اسی سال سلطان نے امراء، اکابر، اعیان، صدوق و قاضیوں کی ایک جماعت کو جو درپردہ یہ سازشیں کرتی تھی کہ کسی طرح سلطان کو تبدیل کر کے اس کی جگہ کسی دوسرے کو بٹھایا جائے، تنہا تنہا کیا۔ ان میں سے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو جیسے بدرالدین سنقر امیر حاجب وغیرہ کو بدایوں بھیج دیا جہاں وہ قید خانے ہی میں مر گئے۔ ان میں سے ایک قاضی جلال الدین کاشانی کو فوجی عہدہ سے معزول کر کے بدایوں کا قاضی مقرر کر دیا اور قاضی شمس الدین قاضی مارہرہ کو ہاتھی کے پاؤں میں روندوا دیا۔

۱۳۳۹ء میں مغل چنگیز خاں کی فوجوں نے آکر لاہور کا محاصرہ کیا اور ملک قراٹش حاکم لاہور آدھی رات کے وقت بھاگ کر دہلی چلا گیا اور سلطان کو جملہ حالات سے آگاہ کیا۔ سلطان نے مناسب سمجھا کہ ایسے نازک وقت پر امراء سے انہیں بیعت لی جائے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور ان سب کے مشورہ سے نظام الملک وزیر کو مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پنجاب بھیجا۔ نظام الملک کا دل پہلے ہی سلطان کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے مکر و نفاق سے سلطان کو ایک خط لکھا، جس میں اپنے ہمراہی امراء کی شکایت کی اور سلطان سے درخواست کی کہ وہ بنفس نفیس تشریف لائیں۔ خط کے مضمون سے سلطان نے فوراً بھانپ لیا کہ دال میں کالاف ضرور ہے اس لیے اس نے بڑے سادہ لفظوں میں نظام الملک کو ایک فرمان کے ذریعہ اطلاع دی۔ کہ منافق امراء اپنے وقت پر اس کی ہنرائیں پائیں گے مگر نظام الملک کو یہ لازم ہے کہ اس وقت ان کے ساتھ خاطر و مدارات سے پیش آئے۔ نظام الملک نے سلطان کا یہ فرمان بجنسہ امراء کے سامنے رکھ دیا اور اس طرح ان کو اپنا طرف دار بنالیا۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ نے شیخ الاسلام خواجہ خواجگان قطب الدین بختیار راوشی قدس سرہ العزیز کو نظام الملک کے امیروں کے پاس بھیجا کہ وہ انہیں سمجھائیں اور اصلاح حال کریں مگر بے سود۔ شیخ الاسلام دہلی واپس تشریف لے گئے اور ان کے پیچھے پیچھے نظام الملک اور دوسرے امراء بھی پہنچ گئے اور انہوں نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کو گرفتار کر کے قید کر لیا اور چند روز کے بعد اسے دوسرے عالم میں پہنچا دیا اور اس کی جگہ دوسرے کو بادشاہ بنا دیا۔

۱۷ فرشتہ کے نزدیک دو ترک شراب میں مست تھے۔

۱۷ طبقات نامری میں اس کی یہ تفصیل لکھی ہوئی ہے کہ ایک درویش کی چال بازیوں اور حیلہ سازیوں کا یہ نتیجہ تھا جو حسد کے مارے قاضی مارہرہ کی مقبولیت و مہاشت نہیں کر سکتا تھا۔

۱۷ ہفتہ ۱۹ شعبان ۷۳۹ھ کو محاصرہ کیا جو شعبان کے مہینہ تک رہا۔ (طبقات نامری)

زمانہ دیر شد کیں رسم داد  
کزیں بستاند و با آن سپارد  
اس کی مدت حکومت ۲ سال ایک ماہ اور ۱۵ روز تھی۔

## سلطان علاؤ الدین مسعود شاہ بن رکن الدین فیروز شاہ

سین مذکورہ ماسبق کے آخر میں اپنے چچا سلطان ناصر الدین محمد اور سلطان جلال الدین جو اولاد سلطان شمس الدین التمش سے تھے ان سب کی متفقہ رائے سے وہ تخت نشین ہوا۔ اگرچہ وہ اس وقت قید خانہ میں تھا مگر عز الدین بلبن بزرگ نے اپنی ایک روزہ تخت نشینی کے دوران ہی اس کی رہائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ملکوں اور امیروں میں سے کوئی بھی عز الدین بلبن بزرگ کی تخت نشینی پر خوش نہیں تھا اس لیے جب انھوں نے علاؤ الدین کے بارے میں سنا تو سب نے ادھر رجوع کیا۔ ملک قطب الدین حسن کو نائب اور ملک مہذب الدین نظام الملک کو وزیر ممالک مقرر کیا گیا مگر ۶۴۰ھ میں سلطان علاؤ الدین مسعود شاہ کے امرا نے مہذب الدین نظام الملک کو قتل کر دیا۔

بناید تیز دولت بعد چوں گل  
کہ آب تند روز و افگند بیل

اب وزارت صدر الملک نجم الدین ابوبکر کے سپرد ہوئی۔ ملک غیاث الدین خور و جو پہلے الغ خاں کے نام سے مشہور تھا اور بعد میں سلطانی کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا اسے امیر حاجب مقرر کیا گیا۔ ناگور، سندھ اور اجمیر کی عنان حکومت ملک عز الدین بلبن کے ہاتھ دی گئی اور بدایوں ملک تاج الدین یلدز کو عطا کیا گیا۔ اسی سال طغا خاں نے جو آگرہ سے لکھنؤ کی جانب گیا تھا۔ خنز الملک اشعری کو ایک خط دے کر سلطان علاؤ الدین کی خدمت میں بھیجا اور سلطان نے چتر لعل اور خلدت خاں حاکم آگرہ کے توسط سے نجف خاں کے پاس لکھنؤ بھیجی اور اپنے مذکورہ صدر چچا کو قید سے رہا کر دیا۔ ان میں سے قنوج کا علاقہ ملک جلال الدین کے سپرد کیا اور میراٹھ ملک ناصر الدین محمد کے حوالے کیا۔ ان دونوں علاقوں میں انھوں نے پسندیدہ کارنامے دکھائے۔

۶۴۲ھ میں مغلوں کی فوجیں لکھنؤ پہنچ گئیں۔ قیاس یہ ہے کہ مغل تبت اور خطہ کے راستہ آئے ہوں گے، چنانچہ سلطان علاؤ الدین نے تیمور خاں قراہیگ کو طغا خاں کی مدد کے لیے بھیجا اگرچہ ان دونوں نے مل کر مغلوں کو شکست دی مگر ان کے درمیان آپس میں الہین ہو گئی۔ طغا خاں دہلی چلا آیا اور لکھنؤ میں تیمور خاں برقرار رہا۔ اسی سال مغلوں کے لشکر نے اچھ کے نواح میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سلطان کو جب معلوم ہوا تو وہ پوری تیزی کے ساتھ کونج پر کوچ کر تادریائے بیاہ کے کنارے پہنچا۔ جب مغلوں کو اس کی خبر ملی تو وہ اچھ کے محاصرہ سے دستبردار ہو کر بھاگ گئے۔ اس کے بعد سلطان دہلی واپس آ گیا اور اس نے گرفتاریوں اور خون ریزی کا بازار گرم کیا کہ امرا اور اکابر اس سے برگشتہ ہو گئے اور انھوں نے متفقہ

۱۔ آگرہ غلط ہے، اس کے بجائے کٹڑہ ہونا چاہیے جو دریدے گنگا کے کنارے ہے۔ یہ مقام اکبر بادشاہ سے پہلے پائے تخت تھا۔ (امیر علی گڑھ)۔  
۲۔ قاضی جلال الدین کاشانی۔

راٹے سے ملک ناصر الدین محمود کو بہرائچ سے بلا بھیجا۔ جب وہ وہلی پہنچا تو ۱۲۴۲ھ میں انھوں نے سلطان علاؤ الدین مسعود کو گرفتار کر کے قید کر دیا جہاں سے وہ قید خانہ جاوید کو چلا گیا۔

چنین است آئین گزدندہ دہر

کہ بخشد بطفت دستا ند بقر

اس کی مدت حکومت چار سال ایک ماہ تھی۔

## سلطان ناصر الدین محمود بن شمس الدین التمش

۱۲۴۲ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے غیاث الدین بلبن خور و جو معنایزرگ تھا، اپنا وزیر بنایا وہ اس کے والد کا غلام اور داماد تھا۔ جلوس کے وقت بے شمار تحفے سلطان ناصر الدین کی خدمت میں پیش کیے گئے اور شاعروں نے اس کی تہنیت میں اشعار کہے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں۔

آں خداوندے نہ ماتم نبل و رستم کوشش است ناصر دنیا و دیں محمود بن التمش است

آں جہاں دارے کہ سقف چرخ درایوان او در علوم تربیت گوئی فرد دیں پوشش است

سکہ ز انقاب نیمونش چہ انداز دست تو خطبہ راز سم ہمایونش چو مایہ تازش است

اس کے عدل و انصاف اور اخلاق حمیدہ کی یادگار کتاب طبقات نامری ہے جو اس کے نام سے منسوب ہے۔ سلطان

نے جمیع امور سلطنت غیاث الدین بلبن کے سپرد کر کے اسے خطاب الغ خانی دیا، ساتھ ہی تاکید کی کہ جملہ اختیارات کی عنان اس کے ہاتھ اس لیے دی جاتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے کل حضرت بے نیاز کے حضور اسے اور سلطان دونوں کو ندامت اٹھانی پڑے۔ سلطان کا اپنا یہ مشغلہ تھا کہ وہ حجرہ میں بیٹھ کر زیادہ تر وقت حق سبحانہ تعالیٰ کے ذکر و تلاوت اور عبادت میں صرف کرتا اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ دربار عام میں سر و پائے شام نہ سے اپنے جسم کو مزین کرتا اور خلوت میں پرانی گدڑی پہنتا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اپنی بسر اوقات قرآن مجید کی کتابت کی آمدنی سے کیا کرتا۔ سلطان ناصر الدین محمود کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں زبان زد خاص و عام تھیں جن سے خلفائے راشدین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک کتاب میں راقم الحروف نے یہ پڑھا کہ ایک روز اس کی بیوی نے شرکایت کی کہ اس کے پاس کوئی کینز نہیں، جس کی وجہ سے روٹی پکاتے پکاتے اس کے ہاتھ میں پھلے پڑ گئے ہیں۔ اس کے جواب میں سلطان نے رو کر کہا کہ یہ جہاں گزراں ہے چند روٹیاں تکلیف پر صبر کرو، خداوند تعالیٰ کل قیامت کو آما و صدقہ اس مصیبت کے عوض ایک حور خدمت کے لیے عطا کرے گا۔ اس وقت اس سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بیت المال کے خرچ سے کوئی کینز خریدے۔ یہ سن کر اس کی بیوی مطمئن ہو گئی۔

جہاں خوابے است نزد چشم بیدار

بخوابے دل نہ بند و مرد ہشیار

سلطان ماہ رجب میں لشکر کے ساتھ جانب ملتان روانہ ہوا اور ذیقعدہ میں اس نے دریائے راوی عبور کیا۔ الغ خاں کو



مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے کوہ جوہ اور اطرافِ تندہ میں بھیجا اور خود دریائے سندھ کے کنارے توقف کیا۔ اس اثنا میں انخ خاں نے اس نواح کے سرکشوں کی سرکوبی کی اور اسے اپنے احاطہ اختیار میں لایا۔ اس نے کھوکھروں اور دوسرے شورہ پشتوں کی بھی گوشمالی کی، اس کے بعد سلطان کے ساتھ آ ملا پھر دونوں ایک ساتھ دہلی واپس ہو گئے۔ ۱۴۹۵ء میں سلطان نے میوات کا قصد کیا اور اسے مسخر کرنے کے بعد علاقہ دوا بہ کی جانب بڑھا، نیز اسی سال انخ خاں کو کٹرہ کی حدود سے سرکشوں کو نکالنے کے کام پر مامور کیا اور وہ کثیر مال غنیمت کے ساتھ دہلی لوٹ آیا۔

۱۴۹۶ء میں سلطان نے رتھبور کی جانب لشکر کشی کی، اس شہر کے مفسدوں اور قتلہ پردازوں کا سر کچلا اور واپس آیا۔ ۱۴۹۷ء میں اس نے انخ خاں کی دختر کے ساتھ نکاح کیا۔

۱۴۹۸ء میں اس نے ملتان پر چڑھائی کی۔ چند روز بعد جب ملک عزالدین بلبن بزرگ حاکم ناگور نے سرکشی کی تو سلطان ادھر متوجہ ہوا۔ اس نے امان چاہی اور پھر وفادار امرائے بارگاہ میں شامل ہو گیا۔

۱۴۹۹ء میں سلطان نے گوالیار، چندیری اور مالوہ کی جانب مارچ کیا۔ راجہ جاہر دیو پانچ ہزار سوار اور دو لاکھ پیادہ فوج کے ساتھ مقابلہ کے لیے باہر نکلا مگر شکست کھائی اور قلعہ بزور مفتوح ہوا، اسی سال شیر خاں حاکم ملتان اور ملک عزالدین بلبن بزرگ جو اس کی ملک کے لیے ناگور سے روانہ ہوا تھا ان دونوں نے قلعہ اچھہ فتح کیا۔ شیر خاں اسی قلعہ میں رہا مگر عزالدین بلبن بزرگ سلطان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ سلطان نے اسے اضلاع بدایوں کی جگہ عطا کی اور خطاب کشو خاں سے نوازا۔

۱۵۰۰ء میں سلطان نے دہلی سے لاہور کا قصد کیا، وہاں سے پھر ملتان اور اچھہ کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں کشو خاں دریائے بیاد تک اس کے ہمراہ تھا۔

۱۵۰۱ء میں سلطان دہلی سے کوچ کر کے تبرہندہ، اچھہ اور ملتان پہنچا۔ یہ علاقہ شیر خاں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور سندھی اس پر قابض تھے اس نے دوبارہ اس پر قبضہ کیا۔ پھر اسلانی خاں کے حوالے کر دیا اور خود دہلی لوٹ گیا۔

۱۵۰۲ء میں سلطان نے بجنور کے پہاڑوں کے دامن میں اپنا لشکر جمع کیا اور جو الاپور کے پاس سے دریائے گنگا پار کیا۔ پھر دامن کوہ کے ساتھ چلتے چلتے دریائے رباب تک پہنچا۔ راستہ میں جہاں کہیں پہنچا تاخت و تاراج کرتا گیا اور آدمیوں کی ایک کثیر تعداد کو اس نے گرفتار کیا پھر کٹھیر کی جانب بڑھا وہاں سے بدایوں اور ادوہ پہنچا اور اس کے بعد پائے تخت کو روانہ ہو گیا۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے خبر ملی بعض امراء مثلاً انخ خاں اعظم، اسلانی خاں وغیرہ جن کو سلطان کے برادر ملک جلال الدین کی تائید و حمایت حاصل تھی، ان سب نے مل کر مخالفت شروع کر دی۔ خبر ملنے ہی سلطان نے فوراً دہلی سے کوچ کیا مگر جب وہ تبرہندہ اکرام اور کیتیل کے نواح میں پہنچا تو چند امراء کی مداخلت سے معاملہ رفع و دفع ہو گیا۔ مخالف امراء آمادہ صلح و آتش ہو گئے۔ اور انھوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنے جان و مال کی پناہ چاہی اور وعدہ کیا کہ وہ حسب سابق سلطان کے مطیع و فرمانبردار رہیں گے۔ سلطان نے لاہور کی حکومت ملک جلال الدین کے سپرد کی اور خود پائے تخت دہلی واپس چلا آیا۔

۱۵۰۳ء میں سلطان کا مزاج اپنی والدہ ملکہ جہاں کی طرف سے کچھ بدل سا گیا۔ چنانچہ اس نے قلعہ خاں کو جس کے جبارہ عقد میں ملکہ جہاں تھی کچھ جاگیر عطا کی اور چند روز بعد اسے وہاں سے ہر پانچ بھیج دیا، مگر بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر وہ اتنا مخالف تھا کہ ہر پانچ میں زیادہ دن قیام نہ کر سکا اور کوہ سرور کی جانب چلا گیا۔

جہاں ملک عز الدین کشلو خاں اور بعض دوسرے امراء نے اس کی ہمت افزائی کی، پھر سب نے مل کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان نے ان لوگوں کو لشکر عظیم کے ساتھ ادھر بھیجا۔ جب فریقین ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو شیخ الاسلام سید قطب الدین، قاضی شمس الدین بہرائچی اور کچھ دوسرے امراء نے قتلخ خاں کو ترغیب دی کہ وہ دہلی پر دھاوا بول دے اور اس پر قبضہ کر لے دہلی کے باشندوں نے بھی اس سلسلہ میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جب انخ خاں نے سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے حکم دیا کہ جن لوگوں نے قتلخ خاں کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں اپنی جگہ چھوڑ کر منتشر ہو جائیں۔ قتلخ خاں اور ملک عز الدین کشلو خاں نے سو کر وہ کی مسافت دو روز میں طے کی اور سامانہ سے دہلی پہنچے، مگر دہلی کی جس جماعت نے ان کو طلب کیا تھا اس کے آدمیوں کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا۔ یہ دیکھ کر دونوں کی بے حد حوصلہ شکنی ہوئی اور انھوں نے الگ الگ راہ قرار اختیار کی، جدھر متہ اٹھا چل دیئے، مگر بعدہ انخ خاں سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

۶۵۵ھ میں سلطان نے دہلی کے چند اکابر و اعیان کے اخراج کا حکم دیا۔ اسی سال کے آخر میں مغل اوچھ اور ملتان کی حدود میں آوارہ ہوئے جب کہ عز الدین کشلو خاں ان کے ساتھ مصروف جنگ آزمائی تھا سلطان بھی تیزی سے آپہنچا۔ مغل اس کا مقابلہ نہ کر سکے اس لیے وہ خراسان کی جانب لوٹ گئے۔ اس کے بعد سلطان نے بھی لوٹے مراجعت پایہ تخت کی جانب اٹھایا اور ملک جلال الدین جانی کو خلعت و اکڑ کے ملکہ نوقی بیج دیا۔

۶۵۶ھ میں ترکستان کے کچھ ایلیچی سلطان کے پاس آئے جنہیں سلطان نے بے شمار انعام و اکرام کے ساتھ واپس کیا۔ اسی سال حضرت گنج شکر صلی اللہ علیہ وسلم ذکرہ اس سرائے بعد و حرمات سے واپس قرب و رضوان کی جانب تشریف لے گئے۔

۶۵۸ھ میں لکھنؤی سے بے شمار ہاتھی اور خزانے اور بے حد حساب جواہرات بطور تحفہ بھیجے گئے۔ اسی سال ماہ رجب میں ملک عز الدین کشلو خاں بلین اس دنیا سے فانی کی تنگ و دو سے تنگ آکر ملک آخرت کو سدھارا اور اسی سال غوث العالم حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی قدس سرہ نے بھی خیمہ وصال، ذوالجلال عز ثناء کے جوار قدس میں جالصب کیا۔ ایک عزیز نے یہ مہر تاریخ کہلے

### زیر عشق ربانی کے زخمی دگر خون شد

۱۸۰۰ میل لکھا ہے۔

۱۸ طبقات ناصری کے نزدیک یہ دونوں ملک شوالک کی جانب چلے گئے۔

۱۹ طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ یہ واقعات ۶۵۶ھ میں رونما ہوئے تھے۔

۲۰ لکھ حضرت شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر فرخ شاہ کابل کے پوتے تھے، والد کا نام کمال الدین سلیمان تھا۔ شباب الدین غوری کے عہد حکومت میں آپ کابل سے ملتان آئے تھے۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کا انتقال اپنے پیرو مرشد کے انتقال کے دو سال بعد ہوا تھا ان کا مقبرہ پاکستان میں ہے۔ شیخ مخدوم گنج شکر کے سن وفات کے بارے میں اختلاف ہے۔ ملا ہایونی نے ۶۵۶ھ لکھا ہے۔ اسی طرح شیخ بہاؤ الدین زکریا کا سن وفات بھی ۶۵۶ھ لکھا ہے، مگر فرشتہ کے نزدیک شیخ بہاؤ الدین زکریا کا سن وفات ۶۶۶ھ تھا اور شیخ گنج شکر کا ۶۶۸ھ۔ آپیں اکبری میں بھی شیخ گنج شکر کا سن وفات ۶۶۸ھ لکھا ہے اور شیخ زکریا کا ۶۶۵ھ۔ ۵۵ اصلح کے بجائے اجل ہونا چاہیے۔

۶۵۸ء میں سلطان ناصر الدین محمود نے میوات وغیرہ کے علاقوں کی تنبیہ کی اور جب ملک پر اس کا پوری طرح قبضہ ہو گیا تو  
۶۶۴ء میں بیمار پڑ گیا اور عالم خواب و خیال سے آنکھیں بند کر کے ملک باقی میں چلا گیا۔ اس کا کوئی وارث تخت و تاج نہیں تھا۔  
مدت حکومت ۱۹ سال ۳ ماہ اور چند روز تھی۔ اس کی قبر دہلی میں ہے، ہر سال اس پر ایک اجتماع عظیم ہوتا ہے۔

بیادیک نظر اعتبار کن در خاک

کہ خاک تکیہ گہ خسروان معتبر است

اس جماعت میں سے جس نے کہ عہد ناصری میں شاعری کا ڈنکا بجایا اور ملک العلّامی کے درجہ پر پہنچا، ایک شاعر شمس الدین دبیر  
تھا جس کے فضائل و کمالات حد بیان و تعریف سے مستغنی ہیں۔ امیر خسرو قدس اللہ سرہ نے اپنے اشعار کا معیار اس کے کلیجے کو  
قرار دیا اور اس پر بے حد فخر و مباحات کیا۔ دیباچہ غر انکمال اور اپنے کلام ہشت بہشت کے خاتمہ پر اس نے شمس الدین دبیر کی  
خوبیوں کے ذکر اور اس کے اوصاف کے اظہار سے اپنی کتابوں کو مزین کیا ہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن خور و نے جب کہ شمس الدین  
دبیر کی عمر کا آخری حصہ تھا، اسے مملکت بنگالہ اور کامرود کا منشی مقرر کر کے اپنے پسر بزرگ نصیر الدین بغرا خاں کے پاس بھیج  
دیا تھا۔ یہ چند اشعار اس کے ایک قصیدہ کے ہیں۔

ادہ دوش مرا وعدہ مہمانی خام	ایں ہمہ کار و دم از تو بنا دانی خام
طمع بود ازاں گو نہ کہ میدانی خام	پنختہ کردم ہمہ شب چشم ندانستم کاں
رنگ تو پنختہ ہمیں نقرہ پیشانی خام	پنختہ دارم دل از اندیشہ روت کہ چہ راست
رسمی نے است زمن تا بہ پریشانی خام	سست میدارم و ہر چند قوی میکندم
غم تو میخوردم این ست مسلمان خام	گفتیم بیچ مسلمان نخورد خام بہیں
کار نہ نا پنختہ من ماندہ نہ حیرانی خام	بسکہ در تو دفتر ملک حیرا نم
کارم از دولت خسرو ملک ثانی خام	چوں ملک خسرو ثانی است نما نہ ہرگز
شد ز شامان ہوس ملک سلیمانی خام	ناصر دنیا و دیں آنکہ بہ پیش ملکش
یکساں در آرزویش نیست سلطانی خام	شاہ محمودشہ آں سلطان کہ فر پدیر

ملک الملوک والکلام امیر فخر الدین عمید توکل نے بھی ایک قصیدہ میں لکھا ہے۔

زندنا بید را صد زخم غیرت بر جگر ناخن	چو بہ وارد نگارم چنگ بندہ زخم بر ناخن
بہوش گرو داز تاثیر آن بت سر سہر ناخن	در شک چنگ او تا ہمیدرات پگزیر آن عات
ز چنگ خشک نے ناگہ بخت و کر و تر ناخن	خا بہر ناغش خویش سمرکز وقت رگ حبش
عروس ماہ خون دل ز اشک آوردہ در ناخن	بیادردہ بلطف اے ہر لداری کہ بار دیت

شہنشاہ ناصر دنیا و دیں محمود کنز عدش

بمنقار اگند تہونہ بانہ تیر پر ناخن

جبکہ عمید کا ذکر درمیان میں آگیا جو جملہ ممالک ہند کا کنٹرول کرتا تھا، تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ اور نادرا وجود اشعار درج کیے جائیں، چنانچہ ذیل میں ملاحظہ ہوں ۛ

برخیز عمیدارتہ فرداست دل تو بگنہ ز غزل حمد خداوند جہاں گو  
مداحی در گاہ خدا کن کہ برافراشت بے زحمت آلات بے گنبد مینو  
دوشاہ رواں کرد بریں طارم ارزق پس داد ز سیارہ شاں فیل زہر سو

مراسم دیدہ محیط و خیال جاں کشتی بر آب دیدہ ز غم میکند رواں کشتی  
در آب دیدہ شب و روزم و چگونہ بود فراز و ثیب زخوں موج و درمیاں کشتی  
چہ سود دارم آں بادباں و آں لنگر چو شد ز موج اجل غرق تا گہاں کشتی

زہے ز نرگس مست تو پر خمار آہو ز بند ناف خشک تو شرمسار آہو  
بجیر تست در آں چشم دیدہ ز نرگس بغیر تست در آں زلف مشکبار آہو  
چہ صنعت است در آں نرگش کہ آن غمزہ درویش صید دلست و بروں خشکار آہو

قد چو نادش کہ دخیز ماں روزہ زانخواستش بروں دادہ زعفران روزہ  
چہ زعفران کہ نخدم ازاں واز گریہ زہیر کہ درخ و اشکم ارغماں روزہ  
چہ لالہ بود کہ خیریش مے دہد گو نہ چہ سرد بود کہ میدادش نواں روزہ  
گل شکفتہ اوتا بغنچہ باز نہ شد یقین نشد کہ گرفت است گلستاں روزہ

منکہ چون سیمرخ در بیک گوشہ مسکن کردام اورٹے مرکزہ خاکی نشین کردہ ام  
ننگ بر مرغے دریں بزم از چہ معنی مے کشم رفتہ ام عتقا صفت رکوہ مسکن کردام  
مرغ ہمت تا نگر دو خرمن بسفلی گرا خرمن چرخش زانجم پڑ نہ از دن کردہ ام

## سلطان غیاث الدین بلبن خور

الغ خانی خطاب تھا۔ علامہ میں تمام امراء اور ملوک کی متفقہ رائے سے قصر سفید میں اس نے تخت سلطنت کو زینت بخشی۔ یہ سلطان التمش کے ان چالیس غلاموں میں سے تھا جن میں سے ہر ایک منصب امارت پر فائز ہوا۔ جب کہ وہ ابھی بالغ خاں تھا اور تمام مملکت اس کے ہاتھ میں تھی اس نے مملکت کے کاموں پر بخوبی قابو پایا تھا۔ وہ رذیلوں کو بھی اپنے امور



میں مداخلت کا موقع نہیں دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ فخر نام ایک رئیس بازار سالہا سال تک اس کی ملازمت میں رہا۔ ایک مرتبہ اس نے سلطان کے مقربین میں سے ایک تک کسی طرح رسائی پیدا کر لی اور اس سے یہ التجا کی کہ اگر اسے ایک بار سلطان غیاث الدین کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل جائے تو وہ اپنی تمام قیمتی جائیداد اور مال و زر اس کے عوض دے دے گا۔ جب یہ التجا سلطان کے گوش گزار کی گئی تو اس نے اسے قابل قبول نہ سمجھا اور یہ کہہ کر رو کر دیا کہ سفیہوں اور رذیلوں کے ساتھ بات کرنا اس کے وقار کے خلاف اور نقصان دہ ہے۔ وہ ظلم و تشدد کے بالکل خلاف تھا چنانچہ اپنی حکومت کے ابتدائی ایام میں اس نے چند امراء کو محض اس بنا پر سزا دی تھی کہ انھوں نے رعایا پر ظلم و تشدد کیا تھا۔ ان میں سے ایک دو کو تو مدعیوں کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ خود ان سے قصاص لیں۔ جن امیروں نے زرقصاں ادا کر دیا وہ جب تک زندہ رہے شرم کے مارے اپنے گھر سے باہر نہ نکلے یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

نادر علی بعدل و داد بود

ظلم و شاہی چسراغ و باد بود

اس کے تمام اوصاف حمیدہ کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کبھی بے طہارت نہیں رہتا تھا اور مجالس و غلطیوں سے حد گریہ و زاری کیا کرتا۔ مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ہی وہ سرکشوں اور باغیوں کا سر کچلنے میں بڑی سختی برتتا تھا۔

فر کیخسروی اندیش جب خواست

کہ جہاں را بعلم و عدل آراست

روز خلوت گلیم پوشیدے

بنماز و نیاز کو شیدے

روئے بربیک دل چو دیگ بخوش

دل سخن گستر و زباں خاموش

تا بدیدے دلش بدیدہ راز

وید پنهانے این نشیب و فراز

اسی سال تاتار خاں پسر ارسلان خاں نے لکھنؤ سے ۶۳ ہاتھی بطور تحفہ بھیجے اور اسی سال نیپالی اور کپیلہ جاتے ہوئے بھوجپور، کچھ، نیپالی، کپیلہ کے قلعے مسخر کیے۔ پانچ ہزار سوار کے ساتھ کوہ جو کی مہم کی تیاری کے بہانے اس نے دریائے گنگا عبور کیا۔ مدانگی موہلی سے دودھ نر کے اندر ہی وہ کا تہر کے علاقہ میں پہنچ گیا جہاں اس نے ہر مرد کو قتل کر دیا یہاں تک کہ آٹھ سال کے بچے کو بھی نہ چھوڑا، اور عورتوں کو قید کر دیا۔ اس علاقہ کے باشندوں کو اس نے ایسی سزائیں دیں کہ جلال الدین کے عہد تک بدایوں اور امر وہم کی مملکت کا پتھر یوں کے شہر سے محفوظ رہی۔ بہار، جون پور اور مشرقی ہندوستان جانے والے تمام راستے جو پہلے بند تھے، اس نے ان سب کو کھول دیے نیز میوات کی مملکت جو دو آبہ کے درمیان واقع ہے اسے طاقتور سرداروں کے سپرد کیا اور ان کو حکم دیا کہ باغیوں کو قتل کر دیں۔ چنانچہ اس کی تعمیل کی گئی اور کچھ باغیوں کو قید بھی کیا گیا۔ اس کے بعد

۱۔ تحصیل علی گڑھ میں ہے ایٹھ سے ۲۲ میل شمالی جانب۔ مسماز قلعہ کے نشانات آج بھی موجود ہیں (امپریل گزٹیر)

۲۔ فرخ آباد ضلع میں ہے۔ مہا بھارت میں اکثر اس کا ذکر آتا ہے۔ (امپریل گزٹیر)

۳۔ بھوج پور۔ اوجین راجاؤں کی راجدھانی۔ آ رہ کے مغربی جانب اور مسراہم سے شمالی جانب ہے۔

۴۔ کا تہر۔ دو میل کھٹک کا ایک ضلع۔ داتا ریخ فیروز شاہی

سلطان نے کوہ سنتور کے وامن میں آباد علاقہ پر چڑھائی کی اور وہاں ایک قلعہ تعمیر کیا، اس کے گرد حصار نو کھڑا کر کے پھر وہ کوہ جو دی کی جانب روانہ ہو گیا۔ لشکر کے ساتھ لاہور پہنچا۔ اس نے قلعہ لاہور سے سر نو تعمیر کیا۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ کے عہد حکومت میں یہ مغلوں کے ہاتھوں بڑی طرح ویران ہوا تھا اور اس وقت تک اسی حالت میں تھا۔ یہاں سلطان بیمار ہو گیا۔ اس کی بیماری کی خبر لکھنوتی پہنچی تو طغرل نائب امین خاں نے جسے شیر خاں کے بعد وہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، سرکشی کی اور اپنے آقا امین خاں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ امین خاں نے اسے مغلوب کیا اور قید کرنے کے بعد شان و شوکت شاہی کے جہد ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور اپنے آپ کو سلطان معز الدین کا خطاب دیا۔ سلطان غیاث الدین بھی طغرل کے خلاف فوج لے کر پہنچا تھا مگر وہ حاج نگر اور تارکینہ کی جانب نکل گیا اس لیے ملک اختیار الدین برلاس کو اس کے تعاقب کا حکم دیا گیا۔ سارگام کے راجہ دسونج نے سلطان کو یہ پیش کش کی کہ وہ طغرل اور ملک اختیار الدین کو پکڑ کر لائے گا۔ طغرل جنگل کی جانب بھاگ گیا تھا۔ ایک روز غفلت میں پا کر اس کا سر کاٹ دیا اور اسے سلطان کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے وہ مملکت اپنے پسر خور و بغیر خاں حاکم سامانہ کو چتر اور عصائے اختیار کے ساتھ دے دی۔ بغیر خاں بعد میں سلطان ناصر الدین کے خطاب سے مشہور ہوا۔ اس کے بعد سلطان پایے تخت کو لوٹ آیا۔ چونکہ شیر خاں کی وفات کے بعد مغلوں کی آمدورفت کا راستہ کھل گیا تھا۔ واضح رہے کہ شیر خاں سلطان کا عم زاد بھائی اور سلطان شمس الدین التمش کے چالیس غلاموں میں سے تھا، اسے لاہور اور دیپال پور کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اس نے غزنی میں سلطان ناصر الدین کے نام کا خطبہ بھی پڑھوایا تھا۔ اس کے ایام حکومت میں مغلوں کو اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ ہندوستان کا رخ کرتے مگر اس کی وفات کے بعد وہ بات قائم نہ رہ سکی اس لیے سلطان بلبن نے اس فتنہ کے تدارک کے لیے اپنے پسر بزرگ سلطان محمد کو جو خان شہید اور قان ملک کے لقب سے ملقب ہوا۔ چتر اور عصائے اختیار اور سلطنت کے دیگر امتیازی نشانات اور ساز و سامان دے کر دلی عہد بنایا اور سندھ مع توابع مضافات اس کے سپرد کر کے ملتان بھیجا۔ ٹھٹھہ تک کا تمام علاقہ اور ساحل بحر کا کنارہ اس کے قبضہ میں تھا۔ امیر خسرو دہلوی اور میر حسن دہلوی ملتان میں پانچ سال تک اس کی خدمت میں رہے اور ان کا شمار قریبی دوستوں کے زمرہ میں ہوتا تھا۔ سلطان نے ملتان سے دو مرتبہ بے شمار زر نقد شیراز بھیجا اور شیخ سعدیؒ سے آنے کی درخواست کی۔ شیخ نے پیرانہ سالی کا عذر کیا اور خط میں اس نے سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ امیر خسروؒ کی اچھی طرح خاطر و مدارات کی جائے، علاوہ ازیں امیر خسروؒ کی حد سے زیادہ تعریف کی اور اپنے ہاتھ سے سفینہ اشعار لکھ کر بھیجا۔

سلطان محمد کا معمول تھا کہ ہر سال سلطان بلبن کو دیکھنے کے لیے دلی آتا اور خلعت اور انعام و اکرام سے ممتاز ہو کر واپس جاتا۔ آخری بار جب کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی۔ سلطان نے خلوت میں سلطان محمد کو کچھ نصائح بلیغ اور حواصط دلیذیر کیں اور اسے اجازت روانگی دے کر ملتان روانہ کیا۔ اسی سال ایتھر مغل نے تیس ہزاروں سواروں کے ساتھ دریائے

۱۔ ایک دوسرے نسخہ میں کوہ بار سنہور ہے اس سے مراد غالباً کمایوں کے پہاڑ ہیں۔

۲۔ ایک دوسرے نسخہ میں حصار نو نام منادہ ہے یعنی اس کا نام حصار نو رکھا۔

۳۔ گلستان اور بوستان۔

۴۔ ضیا الدین برنی اس کا نام سمر تہستے ہیں، فرشتہ لے تیمور خاں لکھتا ہے۔ صحیح کونسا نام ہے واللہ اعلم بالصواب۔

راوی کو لاہور کے پل کے ذریعہ عبور کیا اور اس شہر میں ایک فتنہ عظیم برپا کیا۔ حاکم لاہور نے اس امر کی اطلاع خان شہید کو لکھ کر بھیجی مگر اس نے اپنی مجلس میں جب خط پڑھ کر سنایا تو بجائے تیس ہزار فوج کے تین ہزار پڑھا پھر ایک لشکر عظیم کے ساتھ تیزی سے کوچ پر کوچ کرتا ہوا باغ سریر پہنچا جو دریائے راوی کے کنارے ہے کفار کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے اس نے درجہ شہادت پایا۔ یہ واقعہ ماہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ میں رونما ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں میر حسن دہلوی نے ایک مرثیہ نثر میں لکھ کر دہلی بھیجا۔

اس لطافتی میں امیر خسرو بھی سلطان محمد کے ساتھ تھے۔ انہیں ایک مغل سردار کے غلام نے گرفتار کر لیا۔ وہ ظالم ان کے سر پر اپنے گھوڑے کی بھول اور تو بڑھ اٹھوایا کرتا تھا۔ اس سارے واقعہ کو انھوں نے نہایت مؤثر پیرائے میں نظم کیا ہے اور سلطان محمد کی شہادت کے متعلق یہ مرثیہ بھی لکھے ہیں۔ ان کی پہلی نظم کا مطلع ہے ۵

منکہ بر سر نمی نہاد و گل  
بار بر سر نہاد و گفتا جہل

جب یہ مرثیہ دہلی پہنچے تو ایک عینہ تک لوگ انہیں مجلسوں میں پڑھتے اور اپنے ہلاک ہونے والے عزیزوں کو یاد کر کے روتے رہے۔

جب سلطان بلبن کو اس شکست اور سلطان محمد کی شہادت کی اطلاع ملی تو اسے بہت صدمہ ہوا اور دنوں تک اس کے ماتم میں مشغول رہا۔ ان مراسم سے فراغت ہوئی تو اس نے اپنے دوسرے لڑکے بغراخان کو جسے ناصر الدین کا خطاب دے کر لکھنوتی کی حکومت عطا کی تھی خط لکھا کہ ”تمہارا بھائی اس طرح مارا گیا اب تم ہی اس کے قائم مقام ہو اور میں اب تمہاری ہی صورت دیکھ دیکھ کر اس کے غم کو بھلانا چاہتا ہوں اس لیے تم فوراً ہی یہاں چلے آؤ۔“

۵ باغ سریر، باغ سبز، باغ سرا، ان تینوں میں تیز کرنا مشکل ہے کہ صحیح نام کیا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی مقام ہو جو آج کل لاہور کے قریب بادامی باغ کے نام سے مشہور ہے۔ ۶ ضیاء الدین برنی کے نزدیک ۶۸۳ھ ہے (صفحہ ۹۰ تاریخ شاہی برنی)

۷ ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ یہ نثری مرثیہ امیر خسرو نے لکھا تھا۔ فرشتے نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ امیر خسرو شہادت کے وقت خان شہید کے ہمراہ تھا مگر کسی وجہ سے اس کی جان بچ گئی اس کے بعد اس نے یہ نثری مرثیہ کہا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ”منتخب التواریخ“ کے کاتب نے غلطی سے میر حسن کا نام گھڑ دیا۔ علامہ بلاذری سے ایسی فاش غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔ ۸ یہ دونوں مرثیے ترکیب بند ہیں اور امیر خسرو کے دیوان ”غرة الکمال“ میں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے ۵

آفت است این یا قیامت، در جہاں آمد پدید  
باچہ ساعت بد کہ کافر بر سر شکو رسید

دوسرے مرثیہ کا مطلع ہے ۵  
اے دل بزم نشین کہ از شادی نشان نماند  
دے غم جہاں استاں کہ طرب در جہاں نماند  
امیر خسرو نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دیوان غرة الکمال کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔

بغراخاں کو لکھنؤ میں مستقل حکومت ملی ہوئی تھی اور وہاں اس کا دل لگ گیا تھا اس لیے اس نے باپ کے بلانے پر  
 چل دیں اور آنے میں کافی دیر کر دی۔ بادشاہ نے اسے تاکید خطوط لکھے تو وہ دل برداشتہ دہلی پہنچا لیکن حوصلہ آزمائی  
 کی اُمنگ اور حکومت کی چاٹ ایسی لگی تھی کہ جب تک دہلی میں رہا اس کا دل گھبراتا ہی رہا۔ آخر ایک مرتبہ شکار کا بہانہ کر کے  
 چند سرداروں اور مصاحبوں کے ساتھ شہر سے باہر آیا اور شکار گاہ سے سیدھا لکھنؤ چلا گیا۔  
 بیٹے کی موت نے بورٹھے بلین کو بہت مغمم کر دیا تھا۔ اس کی عمر بھی اس وقت اسی سے کچھ اوپر ہی ہو چکی تھی۔ چنانچہ  
 اس نے محمد خاں شہید کے بیٹے کینخسرو کو خسرو خاں کا خطاب اور تمام لوازمات سلطنت عطا کیے اور اپنا ولی عہد بنالیا۔ ملتان کا  
 علاقہ اسے بطور جاگیر کے دے دیا اور وصیت کی کہ بغراخاں کے بیٹے کیتقباد کو اس کے باپ کے پاس لکھنؤ بھیج دیا جائے۔  
 ان سارے انتظامات سے فراغت کے بعد وہ صرف تین دن اور زندہ رہا اور بائیس برس چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۶۸۶ھ  
 میں عالم جاودانی کو کوچ کر گیا۔

### سلطان معز الدین کیتقباد

سلطان بلین نے خسرو خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا لیکن ایک امیر ملک کچھن نے جسے ایتھر بھی کہتے تھے کچھ اور مارا  
 کے ساتھ مل کر (جو خسرو خاں کے باپ خان شہید کے مخالف تھے) خسرو خاں کے بجائے بغراخاں کے لڑکے معز الدین کیتقباد  
 کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس وقت کیتقباد کی عمر صرف ۸ سال کی تھی۔ تخت نشین ہونے کے بعد کیتقباد نے سب سے پہلی  
 کارروائی یہ کی کہ خسرو خاں اور اس کے متعلقین کو ملتان روانہ کر دیا اور وہاں کی عملداری اس کے نام  
 بحال رکھی۔ خسرو خاں کے جتنے ہوا خواہ اور حامی تھے سب کو جلاوطن کر دیا۔ جب ملک کا نظم و نسق حسبِ مرضی  
 ترتیب پا گیا تو کیتقباد نے ملک نظام الدین کو "داد بیگی" اور ملک قیام الدین کو "وکیل" مقرر کیا اور باقی امرا کو ان کے پرانے  
 عہدوں پر ہی بحال رکھا۔

تخت نشینی کا دربار | چھ ماہ بعد سلطان کی سواری دہلی سے قبضہ کیلو کھری پہنچی۔ اس موقع پر کیلو کھری کو خوب  
 ہی آراستہ کیا گیا تھا۔ سلطان نے یہاں اپنا پہلا دربار عام منعقد کیا۔ اسی دربار میں خواجہ غفر الدین  
 کو "خواجہ جہانی" اور ملک شاہک امیر حاجب کو "وزیر خانی" کے خطابات ملے۔ ملک نظام الدین وزیر کے کہنے سے  
 سلطان نے دربار میں نو مسلم مغلوں کو پکڑ بلوایا اور ان سب میں سے اکثر کو قتل کر دیا۔  
 کیتقباد نے ملک چھوٹے کی لڑکی سے شادی کی۔ ملک چھوٹے کو صلہ میں سامانہ کی جاگیر ملی۔  
 اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں سلطان کو خبر ملی کہ تاتاریوں نے ایتھر کی قیادت میں ملتان اور لاہور کے نواح میں

۱۰ یہ وہی ملک نظام الدین ہے جس کے نام سے "جامع الحکایات" اور محمد عونی کا "تذکرہ شعرا" منسوب ہے۔

۱۱ اس کی تعریف امیر خسرو نے "قران السعدین" میں کی ہے جس کا مطلع ہے۔

خانکرہ چھو کشر کشادے کز لب خاناں گرہ بستہ پیالے



فتنہ و فساد مچا رکھا ہے۔ بادشاہ نے شاہک بار یک کو ”خان جہانی“ کا خطاب عطا کیا اور تیس ہزار سوار دے کر تاتاریوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ شاہک نے تاتاریوں پر دلیرانہ حملے کیے اور ان کو بھگا کر کوہ جو تک تعاقب کیا، بہت سے تاتاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کی ایک بڑی جماعت کو گرفتار کر کے دارالسلطنت میں لے آیا۔

**کیقباد کی عیش پسندی**  
سلطان معزالدین کیقباد اپنے دادا کے زمانہ میں معلموں اور اتالیقوں کی سخت نگرانی اور تربیت میں پرورش پاتا رہا تھا، اب غیر متوقع طور پر عین عالم شباب میں ایک بہت بڑی سلطنت اس کے ہاتھ آگئی تھی، ملک میں چاروں طرف امن و امان تھا، فارس، البالی اور خوش حالی کی وجہ سے لوگ نہایت اطمینان اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان حالات میں نوجوان بادشاہ بہت ہی جلد عیش و عشرت کا شکار ہو گیا اور اس کے اوقات رنگ ربوں میں بسر ہونے لگے۔ اس کے دادا کے عہد کے برخلاف بھانڈوں، قوالوں اور بازیگروں نے بادشاہ کے مزاج میں دخل پایا اور علم و زہد کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کی بن آئی۔ وہ شاہی خاندان کو ختم کر کے اپنی سلطنت کے سہرے خواب دیکھنے لگا۔ اس غرض کے لیے اس نے بادشاہ کو بھگا کر کئی ایک فساد برپا کیے۔ پہلے تو اس نے بادشاہ کو خان شہید کے رٹ کے کیخسرو کے قتل پر آمادہ کیا، چنانچہ سلطان نے خسرو کو ملتان سے بلوا کر قصبہ رہتک میں شہید کر دیا اس کے بعد خاں جہاں پر بھوٹی تہمت لگا کر اس کی تشہیر کرائی اور ان تمام امیروں کو جن کی نو مسلم مغلوں سے قرابت داری تھی قید کر کے درواز قلعوں میں روانہ کر دیا۔ بادشاہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے دربار کی وہ رونق و سطوت نہیں رہی جو بلیں کے زمانہ میں تھی۔

**باپ اور بیٹے کی ملاقات**  
جب بغرا خاں ناصر الدین نے لکھنوتی میں اپنے بیٹے کا یہ حال سنا تو اس نے ایک نصیحت آمیز خط لکھا اور اشارتاً نظام الملک کی شرارت کی طرف اسے توجہ دلائی لیکن وہ بادشاہ کی سرستیوں میں ایسا سرشار تھا کہ باپ کی ایک نہ سنی۔ آخر کار طویل مراسلت کے بعد طے پایا کہ باپ بیٹا دونوں امدہ میں ملاقات کریں یہ ملاقات کافی دیر تک رہی اور دونوں نے تفصیلی طور پر آپس میں مشورے کیے ناصر الدین بادشاہ سے مل کر اپنے ڈیرے میں آیا تو اس نے لکھنوتی کے نفیس تحفے بیٹے کے پاس بطور پیش کش روانہ کیے معزالدین نے بھی باپ کی نذر کے لیے عراقی گھوڑے اور طرح طرح کا عمدہ اسباب روانہ کیا۔ اس وقت دونوں طرف کے لشکریوں نے بڑی

لے امیر خسرو کی قرآن السعید اور تاریخ مبارک شاہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاقات اس قدر مصالحانہ اور پُر امن ماحول میں نہیں ہوئی بلکہ بغرا خاں ناصر الدین بنگالہ سے دہلی پر فوج کشی کے لیے ایک بھاری لشکر لے کر آیا تھا۔ معزالدین اس کی مدافعت کے لیے اودھ پنچا دونوں لشکر سرونڈی کے مقابل کے کناروں پر ٹھہر گئے۔ اس موقع پر بلیں کے قدیم امیروں اور سرداروں نے بیچ میں پڑ کر باپ بیٹے میں صلح کرا دی اور طے پایا کہ سلطان ناصر الدین دہلی دار کے بیٹے کی ملاقات کو آئے بیٹا تخت پر بیٹھے اور باپ تخت کے نیچے کھڑا ہو اس طرح ایک دوسرے کی تعظیم کریں۔ حسب قرار داد جب ناصر الدین دریا اتر کر آیا تو معزالدین پر باپ کی ملاقات کا شوق ایسا غالب ہوا کہ وہ ننگے پاؤں اس کی طرف دھا اور چاہتا تھا کہ قدم پر گر پڑے لیکن ناصر الدین نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ دونوں بغلیگر ہو کر دیر تک روتے رہے۔ باپ نے ہر چند چاہا کہ تخت کے نیچے کھڑا ہو لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔

خوشیاں منائیں اور ان کے افسر بھی ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے آتے جاتے رہے۔ امیر خسرو نے "قراں السعدین" میں ان صحبتوں کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شد      زہے عہدش چو دو پیمان یکے شد  
اسی نظم کا ایک شعر ہے۔

سلطان معز دین و ابن کیقباد بادشاہ      یک دیدہ و مرد یک چار بادشاہ

**آخری نصیحت** | دوسرے دن سلطان ناصر الدین و داعی ملاقات کے لیے بادشاہ کے پاس آیا۔ نظام الملک اور قوام الملک دونوں سزداروں کے سامنے بادشاہ کو بڑی نصیحتیں کیں اور کثرت شراب نوشی، عیاشی، جماع، نظم و نسق سے بے پروائی، بعض پرانے سرداروں اور کینسروں کے قتل پر اسے سرزنش کی اور نماز روزہ، زہد و تقویٰ کی طرف رغبت دلائی اور جہاں بانی کے قاعدوں اور ضابطوں سے آگاہ کیا۔ بغل گیر ہوتے وقت چپکے سے کان میں کہا کہ "نظام الملک کا قصہ جلد ختم کر دو، اگر اس نے قابو پا لیا تو پھر تمہاری خیر نہیں۔" دونوں نے بڑے رنج و افسوس کے ساتھ ایک دوسرے کو رخصت کیا۔ معز الدین چند دن تو باپ کی نصیحتوں پر کار بند رہا آخر کار حسین و جمیل لڑکیوں، خوب صورت مطربوں اور بازیگروں نے بادشاہ کو اپنی عشوہ گری کے اُجال میں پھانس لیا اور نوجوان بادشاہ کی توبہ شیشہ نازک کی طرح چور چور ہو گئی۔ چنانچہ چند ہی منزل آگے بڑھا تھا کہ وہ اس طرح رنگ رلیوں میں مصروف ہو گیا۔ دہلی تک یہ سارا سفر اسی عیش و عشرت میں کٹ گیا۔ دہلی میں سلطان کی واپسی ۶۸۹ھ میں ہوئی۔

بادشاہ کا یہ حال دیکھ کر بعض سردار بدول ہو کر پہاڑی علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں سے شیر خاں پشیمان ہو کر بعد میں لوٹ آیا تھا لیکن بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور وہ اسی قید میں مر گیا۔ بادشاہ نے فیروز خاں یغزش خلجی کے بیٹے کو شائستہ خاں کا لقب دے کر علاقہ برہن پر مامور کیا۔

امیر الدین بیٹے سے رخصت ہو کر جب قیام گاہ پر پہنچا تو کھانا نہ کھایا اور مصاحبوں سے کہا: "میں دیکھ رہا ہوں کہ نہ تو یہ لڑکا زندہ سلامت رہے گا اور نہ دہلی کا تخت۔" (فیروز شاہی)

لے "فیروز شاہی" میں تفصیل سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ بادشاہ کی عیاشی کی لاگ میں اطراف و اکناف سے آکر بہت سی طوائفیں اور اہل طرب شکر کے ساتھ ہو گئے تھے۔ جب بادشاہ چلا تو حسین و جمیل لڑکیاں ناز و ادا دکھا دکھا کر اس کو اپنی طرف مائل کرتی تھیں بادشاہ کا دل تو بہت کھینچتا تھا لیکن باپ کی نصیحتوں کے خیال سے جی مار کر رہ جاتا تھا۔ ایک دن جب کہ سواری جا رہی تھی، ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی گھوڑے پر سوار چتر شاہی کے قریب پہنچ گئی اور بڑے ناز سے یہ شعر پڑھا:

سرو سیمینا بھرا میر دی      نیک بد عہدی کہ بے ما میر دی  
بس سلطان کو یارائے ضبط نہ رہا اور اسی وقت شراب منگائی اور اس ماہر کو بغل میں بٹھا کر یہ شعر پڑھا:  
شب زمی توبہ کتم از بیم ناز شاہاں      با مراں روی باقی باز درکار آور و  
اس آفت پر کالہ نے فوراً ہی جواب دیا

غمزہ عابد فزیم ز اہر صد سالہ را      موسے پیشانی گرفتہ پیش خم اسافند  
پیشانی میر میرے جو بعد میں جلال الدین خلجی کے نام سے تخت پر بیٹھا۔

## شمس الدین کی تخت نشینی

ملک ایبمر کچھن نے بادشاہ کے قتل کی سازش کی تھی۔ سلطان نے اسے بڑی حکمت عملی سے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ باپ کی نمائش کے مطابق اس نے نظام الملک کی بھی فکر کی اور اس کو ملتان جانے کا حکم دیا مگر نظام الملک سلطان کے ارادہ کو بھانپ گیا اور وہاں جانے میں پس و پیش کرنے لگا۔ اس دوران میں بادشاہ نے خفیہ طور پر زہر دلو کر اس کا بھی قصہ ختم کر دیا۔ نظام الملک کی ہلاکت سے نظم و نسق میں کافی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ ادھر بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اس کے شب و روز حالتِ مستی میں گزرتے تھے اور مے و معشوق کے سوا اسے کسی بات کی فکر تھی نہ خبر۔ چنانچہ کثرتِ عیاشی کی وجہ سے وہ لقمہ کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نہایت ضعیف اور کمزور ہو گیا اس کے قوی اور اعصاب بالکل ناکارہ ہو چکے تھے۔ سلطنت کا کاروبار بری طرح درہم برہم ہو چلا تھا۔ یہ حال دیکھ کر چند خیر خواہ امیروں نے اس کے ایک کم عمر لڑکے کیکاؤس کو شمس الدین کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

## شائستہ خاں کی بغاوت

۶۸۸ھ میں شائستہ خاں غلجی نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنی عملداری "برن" سے ایک فوج لے کر وہلی پر چڑھائی کر دی۔ بادشاہی امراء بھی فوجی تیاریاں کر کے مقابلہ پر روانہ ہوئے اور سلطان معز الدین کو جو بیماری اور کمزوری کی وجہ سے ایک بے جان تصویر بن کر رہ گیا تھا قصر کیلویکھری کی چھت پر چتر شاہی کے نیچے بٹھا دیا۔ ملک چھو غیاث الدین کے بھتیجے نے باوازِ بلند اعلان کیا کہ ہم چاہتے ہیں معز الدین کو کشتی میں سوار کر کے لکھنوتی میں اس کے باپ کے پاس بھجوا دیں اور سلطان شمس الدین کیکاؤس کی خدمت میں حاضر باش رہیں۔ اس اعلان پر وہلی والے شمس الدین کیکاؤس کی حمایت کے لیے شائستہ خاں کے مقابلہ پر تیار ہو گئے اور بدایونی دروازہ کے سامنے جمع ہو گئے۔

## کیقباد کا انجام

لڑائی میں پانستہ شائستہ خاں کے ہاتھ رہا۔ ملک الامراء معز الدین کو قوال کے لڑکے قید کر لیے گئے اور ملک ایبمر مرخہ جس نے شائستہ خاں کے قتل کا وعدہ کیا تھا شائستہ خاں کے بیٹے اختیار الدین کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ملک الامراء نے جب اپنے آپ کو مقابلہ سے عاجز پایا تو اپنی جمیعت کو پیچھے ہٹا لیا اور فاتح غنیم کے سپاہیوں نے شمس الدین کیکاؤس کو تخت سے اٹھا کر شائستہ خاں کے پاس بہار پور روانہ کر دیا شائستہ خاں نے ایک شخص کو جس کے باپ کو معز الدین نے قتل کر دیا تھا قیصر کیلویکھری پر قبضہ کے لیے بھیجا۔ وہ جب اس بد نصیب سلطان کے پاس پہنچا تو اس کا حال یہ تھا کہ وہ گم سم بیٹھا تھا اور بس اس کی سانس ہی باقی رہ گئی تھی۔ اس شخص نے دو تین لاتیں مار کر اسے جہنم میں دھکیل دیا۔ یہ واقعہ نصف ماہ محرم ۶۸۹ میں پیش آیا۔ سلطان معز الدین

۱۰ غلیوں نے جب شاہزادہ شمس الدین کیکاؤس کو تخت سے اتار کر گرفتار کر لیا تو اسی وقت معز الدین کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اسی حال میں بھوک پیاس کے صدمہ سے وہ جاں بحق ہو گیا۔ مرنے وقت اس نے یہ باجی پڑھی۔

اسپ ہنرم بر سر میسداں ماندہ است دست کہ دم درتہ سندان ماندہ است  
چشم کہ نند دکان و گمرک دیدے امروز برائے تان چہ میران ماندہ است

کیکاؤس برائے نام بادشاہ تھا۔ اسے کم سنی میں شائستہ خاں اور ملک چھجوکش خاں نے ۱۹۶۷ء میں تخت پر بٹھایا تھا ان دنوں شائستہ خاں کے چچا ملک حسین نے جو کیلو کھری میں معزالدین کا محافظ تھا کافی اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ جب سارے انتظامات حسبِ مرضی طے پا گئے تو شائستہ خاں نے ملک چھجوکش خاں سے کہا کہ تم بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے دارالخلافہ میں رہو۔ تبرہندہ اور دیپال پور کو ملیں اپنی جاگیر قرار دے کر یہاں سے رخصت ہو جاتا ہوں، ملک چھجوتے اس ذمہ داری کو اپنے سر لینے سے انکار کر دیا اور شائستہ خاں کا نائب رہنے کے لیے اصرار کرنے لگا اور اپنے لیے کٹرہ کا ملا جاگیر میں رہنے کی درخواست کی۔ ملک الامراء معزالدین نے شائستہ خاں کو سمجھایا کہ چھجوک کو جلنے دو، وہ نکل گیا تو پھر سب کچھ تمہارا ہی ہے۔ چنانچہ شائستہ خاں نے ملک چھجوک کی تجویز فوراً ہی قبول کر لی۔

شاہستہ خاں کی کاؤس کو تخت پر بٹھا کر قریباً دو ماہ تک ملک کا نظم و نسق چلاتا رہا اس کے بعد وہ نو عمر بادشاہ کو سوار کر کے کیلو کھری لے کر آیا اور وہاں اسے قید کر دیا، پھر چند دن بعد ہی اسے قتل کر دیا۔ سلطان شمس الدین کی کاؤس کی کل مدت حکومت تین مہینے اور کچھ دن ہے۔



# خاندان خلجی

## سلطان جلال الدین بن بختیش خلجی

سلطان جلال الدین کا اصل نام ملک فیروز اور خطاب شائستہ خاں تھا۔ کیکاؤس کو قتل کرنے کے بعد دہلی کے چھوٹے خاں کے اتفاق و تائید سے تخت پر بیٹھا۔

”تاریخ طبعات محمود شاہی“ کے مصنف شہاب الدین حکیم کرمانی جو پوری نے سلطان جلال الدین اور سلطان محمود دہلوی کو چنگیز خاں کے داماد قالج خاں کی اولاد بتایا ہے اور اس بارے میں ایک طویل قصہ بھی نقل کیا ہے لیکن یہ غلط معلوم ہوتا ہے ”قالج“ اور ”خلج“ میں کوئی مناسبت نہیں۔ ”قالج“ ترکی زبان کا لفظ بھی نہیں ہے، اگر ہو بھی تو اس لفظ کے معنی تلوار کے ہوں گے۔ دوسری بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ یافت بن نوح علیہ السلام کے کسی لڑکے کا نام ”خلج“ تھا اور خلجی اس کی طرف منسوب ہیں۔

**شہر نو کی تعمیر** سلطان جلال الدین نے تخت نشین ہونے کے بعد حکومت کے بڑے بڑے عہدے اپنے بھائیوں اور بیٹوں میں تقسیم کر دیئے۔ بڑے بیٹے کو خان خاناں اور منجھلے کو ارکلی خاں اور چھوٹے بیٹے کو قدر خاں اور اپنے چچا ملک حسین کو ”تاج الملک“ کا خطاب دیا۔ سلطان جلال الدین نے جہان کے کنارے معز الدین کے محل کے مقابل ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی، اس میں ایک مضبوط قلعہ اور باغ بنوایا، جب شہر بن گیا تو اس کا نام ”شہر نو“ رکھا۔

**ملک چھو کی شورش** سلطان جلال الدین کی تخت نشینی کے بعد حسب قرار داد ملک چھو کشل خاں کٹرہ کی جاگیر پر چلا گیا تھا لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اس نے تخت نشینی کے دوسرے ہی سال ماہ شعبان میں خود سری اختیار کی اور اس نواح کے اکثر جاگیردار جو غیاث الدین کے امراء تھے اس سے مل گئے اور لشکر تیار کر کے یہاں امیر اپنے مقام سے بدایوں میں آکر جمع ہو گئے۔ گھٹاکو بجلاؤ کے گھاٹ سے عبور کر کے وہاں ملک چھو کے انتظار میں شہر پہنچے کہ وہ آجائے تو پھر دہلی پر یورش کریں۔

سلطان جلال الدین کو جب اس شورش کی خبر ملی تو اس نے خان خاناں کو دہلی میں چھوڑا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے

روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ فوج کے ساتھ خود کول کے راستہ سے بدایوں روانہ ہوا اور دوسرے حصہ کو ارکلی خاں کی قیادت میں ملک چھجو کے لیے امر دہر روانہ کر دیا۔

ارکلی خاں رہب کے کنارے ملک چھجو کی فوج سے چند دن تک برسر پیکار رہا۔ اسی اثنا میں راجہ برم دیو کو لہ نے (اس کو کوئلہ بھی کہتے ہیں) ملک چھجو کو اطلاع دی کہ ارکلی خاں کی کمک کے لیے سلطانی لشکر بھی آ رہا ہے یہ سنتے ہی وہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ راتوں رات بھاگ گیا لیکن راستہ میں گنواروں نے گھیر کر اسے پکڑ لیا۔

ارکلی خاں نے رہب ندی کو عبور کر کے غنیم کی بھاگتی ہوئی فوج پر حملہ کیا اور بیرم دیو کو قتل کر دیا۔ ملک چھجو اور دوسرے باغی امیروں کو حراست میں لے کر بہاری اور کسم کور شمس آباد کی طرف کوچ کیا۔

جب ملک چھجو اور بلین کے وقت کے بہت سے امراء طوق و سلاسل میں گرفتار سلطان جلال الدین کی بارگاہ میں پیش کیے گئے تو انہیں دیکھ کر سلطان کو اپنا اور ان کا پچھلا زمانہ یاد آ گیا اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ انہیں فوراً رملہ کے حمام میں بھجوا دیا اور خلعتیں عطا کیں اور ان کے قصور معاف کر کے اپنا ہم نشین بنا لیا اور ملک چھجو کو بڑے احترام اور عزت کے ساتھ ملتان بھیج دیا اور کٹرے پر اس کی جگہ اپنے بھتیجے اور داماد علاؤ الدین کو جو اس وقت بدایوں پر متعین تھا روانہ کر دیا۔ اس کے بھائی الماس بیگ کو آخوڑ بیگی کا عہدہ عطا کیا۔

اسی دوران میں بڑے شاہزادے خاں خاناں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کا سلطان کو بہت رنج اور قلق ہوا۔ امیر خسرو نے اس کا مرثیہ کہا ہے ۵

چہ روز است ایں کہ من خورشید تاباں را منی . بینم

دگر شب چہرا ماہ درخشاں را منی بینم

دوسرے سال جب ارکلی خاں ملتان سے واپس آیا تو بادشاہ نے اسے دہلی میں چھوڑ کر منداور کا رخ کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اسے غدر کی اطلاعات ملیں، اس کے لشکر میں غیاتی امراء بھی شامل تھے۔ ان امیروں کی طرف سے اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں غدر کی خبریں سن کر یہ کوئی سازش نہ کریں۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ملک مغلتی کو بلایوں، ملک مبارک کو تبرہندہ کی طرف رخصت کر دیا اور جب منداور کا قلعہ فتح ہو گیا تو بلا تاخیر شب و روز کچھ کرتا ہوا دہلی واپس آ گیا، سلطان کو اطلاع ملی تھی کہ دہلی میں بغاوت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس غدر کا بانی مہانی سیدی مولا ہے چنانچہ دہلی آکر اسے سیدی مولا اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

سیدی مولا نہایت عابد و زاہد اور صاحب کرامات بزرگ تھے، وہ مجھ سے ہند میں آئے

سیدی مولا درویش

اور پہلے احمد سن میں حضرت قطب الاولیاء مخدوم شیخ فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے پھر ان سے رخصت ہو کر ہندوستان کے شہروں کی سیر کرتے ہوئے دہلی آکر ٹھہر گئے۔ شیخ فرید نے رخصت ہوتے وقت ان کو وصیت کی تھی کہ ”لوگوں کے ہجوم اور امراء مملوک کی صحبت سے بچتے رہنا“ دہلی میں سیدی مولا نے بہت

۱۰ آخوڑ بیگی۔ اصطبل شاہی اور رسالہ فوج کا سردار۔

ہی جلد شہرت عام حاصل کر لی اور بڑے بڑے امیران کے معتقد ہو گئے، یہاں تک کہ سلطان کا بڑا شاہزادہ خان خاناں مرحوم بھی ان کا عقیدت مند تھا۔ بدین کے عہد کے اکثر معزول امراء بھی ان کے ہاں آتے رہتے تھے۔ دونوں وقت ان کے دسترخوان پر بہت سے امیر حاضر رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں روزانہ ہزار من میوہ اور پانچ سو من گوشت اور تین سو من شکر خرچ ہوتی تھی۔ امیر و غریب سب کے لیے ان کا دسترخوان عام تھا۔ محتاجوں کے لیے لنگر بٹا کرتا تھا۔ وہ کبھی کسی سے کوئی تحفہ یا معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس خرچ پر لوگ گمان کرتے تھے کہ وہ کیمیا بناتے ہیں۔ سیدی مولانا زروزہ کے نہایت پابند تھے لیکن جمعہ میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ جو بڑے بڑے لوگ ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے ان میں قاضی جلال الدین کاشانی اور قاضی اردو بھی شامل تھے۔

**سیدی مولا کی شہادت** | سلطان کو جب اس قسم کی اطلاعات ملیں کہ سیدی مولا کی خانقاہ میں بغاوت کی سازشیں ہوتی ہیں تو ایک دن وہ خود بھیس بدل کر خانقاہ میں گیا اور جیسا سنا تھا اس سے زیادہ لوگوں کو سید کا معتقد پایا اور اس کے شبہات قوی ہو گئے۔ چنانچہ اس نے دوسرے دن صبح ایک بڑی مجلس منعقد کی اور بے گنا سیدان کے معتقد امیروں اور قاضی کو پاہ زنجیر حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان کو بڑی اہانت کے ساتھ دربار میں لایا گیا اور ان پر سلطنت کے اوعا اور بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ سلطان نے ہر ایک سے اس الزام کے سلسلہ میں باز پرس کی۔ سیدی مولا نے انکار کیا اور قسم بھی کھائی۔ قاضی جلال الدین پر بھی سلطان نے بہت عتاب کیا لیکن اس نے بھی اس الزام سے انکار کیا۔ سلطان نے اس کو وہی کے عہدہ قضا سے معزول کر کے بدایوں تیار کر دیا۔ سیدی مولا کا امتحان لینے کے لیے نرو کی طرح بہت سی آگ جلوائی، ان کو مع ساتھیوں کے اس آگ میں جھونک دینے کا حکم دیا مگر حق گو علماء نے فتویٰ دیا کہ ”یہ شرعاً جائز نہیں، آگ ہر ایک چیز کو جلا دیتی ہے اس طرح کے امتحان کا کوئی اعتبار نہیں“ اس فتوے کی وجہ سے سلطان اس وحشیانہ حرکت سے باز رہا۔ اسی مجلس میں سید کے معتقد اکثر امیروں کو سزا دی اور بعض کو جلاوطن کر دیا۔ سلطان نے خود بالمشافہ سیدی مولا سے مباحثہ کیا اور سخت جرح کی۔ سید نے ہر بات کا معقول جواب دیا اور سلطان ان پر کسی شرعی الزام کو ثابت نہ کر سکا، رنج ہو کر اس نے دیو بکر طوسی کو جو آزاد منش قلندروں کا سرغنہ تھا مخاطب کر کے کہا ”فقیر تم ہی اس ظالم سے میرا انصاف بردار“ یہ سن کر ایک قلندر کو ذکر آگے آیا اور اس نے ان کو زخم لگائے دارحی موندھری اور سونیاں چھوئیں۔ استغناء ارگلی خاں کے اشارہ پر ایک فیل بان نے مسرت ہاتھی ان پر چھوڑ دیا۔ غرض وہ حق پسند مرد درویش بڑے عذابوں سے شہید ہوا۔ مشہور ہے کہ سیدی مولا اس حادثہ سے دو سال

بلکہ تاجرانہ دکاندار جب اپنے مال کی قیمت سیدی مولا سے طلب کرتے تو وہ ان سے کہتے تھے کہ ”فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے اس قدر تنگ رکھے ہوئے ہیں کہ وہ چنانچہ تپتے ہوئے مقام پر اسی قدر تنگ ان کو مل جاتے اور یہ سکتے ایسے نہ ہوتے تھے جیسے ابھی ٹکسال سے ڈھل کر نکلتے ہیں۔“

(فیروز شاہی صفحہ ۲۰۹)

لے اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ سیدی مولا بادشاہت کی بنا پر ملک کو ”دارالاسلام“ نہیں سمجھتے ہوں گے اور جو جگہ دارالاسلام نہ ہو وہاں جمعہ فرض نہیں سمجھا گیا ہے۔

پہلے ہی سے اکثر یہ دو شعر پڑھ کر ہنسا کرتے تھے ۵

در مبلغ عشق جز نکو را نہ کشند      لاغر صفتاں زشت خود را نہ کشند  
گر عاشق صادق ز کشتی مگرینہ      مردار بود ہر آنکہ اورا نہ کشند

جس دن سیدی مولا کو شہید کیا گیا اُس دن بڑی سخت سیاہ آندھی آئی۔ اُس سال بارش بھی نہیں ہوئی اور ایسا سخت قحط پڑا کہ دیہات اجڑ گئے اور دیہاتوں سے ہندو جو حق درجہ جو حق شہر میں آگئے، فاقہ کی تاب نہ لا کر بیس بیس تیس تیس آدمی ہاتھ میں ہاتھ دے کر جہنا میں کود کود کر خودکشی کرنے لگے۔ ہزاروں مسلمان بھی قحط سے بے حال ہو کر مر گئے۔ ان حادثوں سے لوگوں کو عام طور پر یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ اس بے گناہ شہید پر ظلم کا وبال ہے لیکن یہ باتیں زیادہ قابل اعتبار نہیں، اتفاقی طور پر ایسے حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سیدی مولا کے ساتھ بہت سے بے گناہ پکڑے گئے تھے، ان میں سے بعض کو ارکلی خاں کی سفارش پر رہائی مل گئی۔

اسی سال سلطان نے دوبارہ رنٹھمبور کا قصد کیا اور اس کے گرد و نواح کو تباہ و برباد کر دیا اور وہاں کے بہت خانوں کو بالکل ہی تاراج کر دیا۔ لیکن وہ قسماً بفتح نہیں کر سکا اور ویسے ہی لوٹ آیا۔ اسی سال ارکلی خاں بادشاہ کی اطلاع و اجازت کے بغیر دہلی سے ملتان چلا گیا۔ شہزادہ کی اس حرکت سے سلطان کو بہت رنج پہنچا۔

۹۱ء میں چنگیزی مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ سنام کے قریب ہندوستانی فوج سے ان کا مقابلہ ہوا۔ ہندوستانی فوج کی قوت اور کثرت کو دیکھ کر انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور صلح کی گفتگو کی۔ ان کے سردار نے بادشاہ کو باپ کہہ کر فرزند کی اختیار کرنے کی خواہش کی۔ بادشاہ نے بھی صلح کر لی اور اسے بیٹے سے مخاطب کیا۔ دونوں طرف سے بہت سے تحائف کا تبادلہ ہوا اور مغل ہندوستان کی سرحد سے لوٹ گئے۔ اسی دوران میں چنگیز خاں کا فراسہ انھوں نے کئی ہزار مغلوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور سلطان کی حمایت میں آگیا، سلطان نے اسے خیانت پور میں رہنے کے لیے جگہ دی اور اپنی بیٹی کا بھی اس سے نکاح کر دیا۔ ان مغلوں کو لوگ نو مسلم کہنے لگے۔

اسی سال کے آخر میں بادشاہ نے منداور پر حملہ کیا اور اس کے مضافات کو تباہ کر کے لوٹ گیا۔ بادشاہ کے داماد اور بھتیجے علاؤ الدین نے جو کٹرہ پر حاکم تھا بھیکہ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی اور اس کو فتح کر کے کافی مال غنیمت لے کر سلطان کی خدمت میں لوٹ آیا۔ علاؤ الدین بھیکہ سے ایک بہت بھی اٹھوا لایا تھا جس کی ہندو بہت زیادہ پر جاکھا کرتے تھے اس بت کو

اے صاحب فیروز شاہی کا بیان ہے کہ اس نے خود اس آندھی کو دیکھا تھا۔

۹۱ء سلطان جلال الدین نے ملک چھو اور دوسرے امرا کو ہار کرتے وقت کہا تھا بحالہ فیروز شاہی کہ میں مسلمان کے خون سے ہاتھ دھو چاہتا ہوں اگر بادشاہت کے لیے قتل و خون ضروری ہے تو میں مغل کافروں کے خلاف جہاد کیوں نہ کروں اور یہی وہ سلطان ہے جس نے اس قتل و خون کو پسند کر لیا اور اس کے بے گناہ ساتھیوں کے خلاف اس طرح کی سفاکانہ کارروائی کی۔

۹۱ء مغل حملہ آوروں کا سردار ہلاکو کا فراسہ عبداللہ تھا۔

لکھ یہ وہی جگہ ہے جہاں اب حضرت نظام الدین اولیاء کا مزار ہے، اسے مغل پورہ بھی کہتے ہیں۔



اس نے بدایوں کے دروازے کے سامنے راستہ میں ڈال دیا۔ علاؤ الدین کے اس کارنامہ پر سلطان بہت خوش ہوا، اور اودھ کا علاقہ بھی اس کی جاگیر میں دے دیا۔

**علاؤ الدین کی محم پسندی** | علاؤ الدین کو اپنی بیوی اور ساس سے بڑی رنجش تھی وہ دونوں بادشاہ کے سامنے اس کی برائی کرتی رہتی تھیں۔ اس کو ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں بادشاہ کو اس کے خلاف کر کے اس کو کسی خطرہ میں نہ مبتلا کر دیں۔ اس لیے وہ بادشاہ کی عملداری سے کسی اور طرف نکل جانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنے لشکر میں نئے نئے آدمیوں کو بھرتی کیا اور سلطان سے چندیری پر حملہ کی اجازت لے کر کٹرہ آیا۔ وہاں اس نے اپنے ایک نائب علاؤ الملک کو متعین کر کے اسے ہدایت کی کہ کوئی کارروائی ایسی نہ ہو جو بادشاہ کی ناراضی کا باعث بنے۔ پھر وہ کٹرہ سے چل کر ایلیچ پور آیا لیکن یہاں سے بجائے چندیری کے دیوگرھ کے راستہ پر روانہ ہو گیا۔

**دکن کی فتح** | چند دن تک بادشاہ کو علاؤ الدین کی کوئی خبر نہیں ملی جس کی وجہ سے وہ بڑی تشویش اور فکر میں مبتلا رہا۔ ایک عرصہ بعد خبر آئی کہ علاؤ الدین نے دیوگیر اور تقریباً سارے دکن کو فتح کر لیا ہے اور وہاں سے وہ بہت سا مال غنیمت، ہزاروں گھوڑے ہاتھی اور تحائف و اسباب لے کر کٹرہ کو واپس آ رہا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ بہت خوش ہوا لیکن لوگوں کو گمان تھا کہ علاؤ الدین نے اپنی ساس اور بیوی کے ہاتھوں بہت رنج اٹھا یا ہے اور وہ دیوگرھ میں بغیر اجازت کے ہی چلا گیا تھا اب اس کے پاس کافی مال و اسباب بھی جمع ہو گیا ہے ممکن ہے وہ کوئی فتنہ برپا کرنے کی فکر میں ہو۔ لیکن کسی کو جرأت نہیں تھی کہ بادشاہ کے سامنے ان اندیشوں کو ظاہر کرے، نہ بادشاہ کو ہی اس کی اطلاع تھی کہ اس کو ساس اور بیوی کے خلاف اتنا شدید رنج ہے۔ وہ اس کے خلاف جب بھی کچھ کستی تھیں بادشاہ ان کو اہمیت نہیں دیتا تھا اور ٹال دیا کرتا تھا۔

**علاؤ الدین کی واپسی** | جس وقت بادشاہ کو علاؤ الدین کی واپسی کی خبر ملی تو وہ گوالیار میں تھا۔ اس نے امراء کی مجلس مشاورت طلب کی اور ان سے کہا کہ علاؤ الدین اس شان و شوکت کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب ہم چندیری کے راستہ پر آگے جا کر اس کا استقبال کریں یا اس سے اسی جگہ ملیں یا وہی واپس چلے جائیں۔ ملک احمد چپ جلال الدین کا نہایت خیر خواہ اور دانش مند وزیر تھا۔ اس نے بادشاہ کو سمجھا یا کہ میری رائے میں تو یہی مناسب ہے کہ سلطان مع لشکر کے چندیری کی طرف کوچ کرے اور علاؤ الدین کو راستہ ہی میں روک لے اور جو کچھ ساز و سامان وہ لے کر آ رہا ہے اس سے لے لے اور اتنی قوت رہنے نہ دے کہ وہ بغاوت کا خیال کر سکے، اس نے اپنی تائید میں ملک چھجو کی سرکشی کا بھی حوالہ دیا لیکن بادشاہ نے اس کی تجویز نہیں مانی اور یہی کہتا رہا کہ علاؤ الدین میرے ہی ملک کا پروردہ ہے۔ میں نے ہی اسے اس بلند مرتبہ پہنچایا، میں نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی کہ جو وہ کسی فاسد خیال کو اپنے دل میں جگہ دے۔ بعض امیر بھی ہاں میں ہاں ملائے مگر حالانکہ احمد چپ کی رائے نہایت معقول اور دوراندیشی پر مبنی تھی۔ ملک احمد نے جب مجلس کا یہ رنگ دیکھا تو وہ غصہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ: ”اگر خدا نخواستہ علاؤ الدین کٹرہ جگہ کے بعد ہردی جوہر کے ٹکڑے تو کی کا امادہ کرے تو میں کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں پاتا کہ اس کو روک لے۔“ ہر حال بادشاہ اس

خطرہ کا اندازہ نہیں کر سکا جس کو احمد چپ بھانپ چکا تھا اور وہ وہاں سے کوچ کر کے دہلی کو چلا گیا۔

**علاء الدین کی سازش** | علاؤ الدین نے کٹرے میں پہنچ کر بادشاہ کو متعدد عرضیاں لکھیں اور بہت سے ہاتھی اور تحائف روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی لکھا کہ اگر میری طلبی کا فرمان صادر ہو تو حاضر

ہو کر باریابی کا شرف حاصل کروں۔ لیکن ان سب باتوں سے اس کی غرض صرف یہ تھی کہ اسے کچھ مہلت مل جائے۔ اس عرصہ میں اس نے لکھنوتی جانے کی تیاریاں کر لیں اور اپنے چھوٹے بھائی ظفر خاں کو اودھ رخصت کر دیا کہ وہ سرہندی میں کشتیاں تیار کر رکھے۔

**جلال الدین دہلی میں** | سادہ لوح بادشاہ نے اس کے حسب تحریر عہد الملک اور ضیا مال دین دوسرے داروں کے ذریعے حاضری کا فرمان ارسال کیا۔ علاؤ الدین نے ان کو فوراً ہی حراست میں لے کر قید میں ڈال دیا۔ اپنے دوسرے بھائی الماس بیگ کو جو دہلی میں تھا ایک خط لکھا کہ ”میں نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر دیوگیر پر حملہ کیا تھا۔ اس کو بہانہ بنا کر لوگوں نے بادشاہ کو مجھ سے بدظن کر دیا ہے حالانکہ میں ان کا ویسا ہی فرمانبردار فرزند اور غلام ہوں اگر وہ خود تنہا آ کر مجھے لے جائیں تو میں اطاعت کے لیے موجود ہوں اور اگر بادشاہ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا ہے اور وہ اس کو صحیح سمجھے ہیں جو لوگوں نے ”شور کر رکھا ہے تو میں مایوس ہو کر جس طرف سینک سمائیں گے چلا جاؤں گا پھر میرا پتہ تک نہیں ملے گا۔“ الماس بیگ نے یہ خط بادشاہ کو سنا دیا۔ بادشاہ نے اسی وقت الماس بیگ کو علاؤ الدین کے پاس روانہ کر دیا اور کہا کہ تم چلو میں بھی پیچھے آ رہا ہوں۔ الماس بیگ کشتی کے ذریعے ساتویں دن علاؤ الدین کے پاس پہنچ گیا اور اس کو لکھنوتی چلے جانے کا مشورہ دیا لیکن بعض ہوشیار خیر خواہوں نے کہا کہ لکھنوتی جانے کی کیا ضرورت ہے، دیوگر ٹھہر کے ہاتھیوں گھوڑوں اور مال و اسباب کا لالچ بادشاہ کو اسی برسات میں یہاں کھینچ لائے گا۔ اس وقت وہ تمہارے قابو میں ہو گا جو چاہو اس سے سلوک کرو۔ ان کا یہ خیال ٹھیک تھا۔ سلطان جلال الدین کی قضا اسے کشاں کشاں اپنے بھتیجے کے پاس کھینچ لائی اور مال کی طمع میں اس نے آگے پیچھے کو کوئی خیال نہیں کیا اور اپنے سرداروں کے ساتھ ایک ہزار سوار لے کر کٹرے کی طرف کوچ کر دیا۔ ملک احمد چپ کو خشکی کے راستہ شکر لے کر آنے کا حکم دیا۔ چپ نے بادشاہ کو اس ارادہ سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا اور بڑی تیزی سے کوچ پر کوچ کرتے ہوئے رمضان کی سترہ تاریخ کو کٹرہ پہنچ گیا۔

**سلطان جلال الدین کا قتل** | علاؤ الدین کٹرے اور ماتنگ پور کے درمیان گنگا اتر کر اپنی فوج کے ساتھ تیار کھڑا تھا۔ جب بادشاہ کے قریب آنے کی خبر سنی تو اس نے الماس بیگ کو بادشاہ کے لیے

کئی ایک جواہر نذرانہ دے کر بھیجا کہ کسی تدبیر سے وہ اسے تنہا شکر میں لے آئے۔ مکار الماس بیگ نے بادشاہ کے پاس جا کر بڑی چالوسی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر میں یہاں نہ آتا تو علاؤ الدین تو ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا کیونکہ دشمنوں نے آپ کی طرف سے اسے بہت بدگمان کر دیا تھا، میں نے بہت کچھ اس کی دلجمعی کر دی ہے لیکن آپ کی ہیبت اس کے جی پر اسی طرح چھائی ہوئی ہے، مصلحت یہی ہے کہ حضور شفقت و عنایت کا اظہار کریں اور تنہا جا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔ بادشاہ کی تو مت پھر چکی تھی وہ ان جھانسنوں میں آگیا اور ایک ہزار سواروں کو وہیں چھوڑ کر چند مسلح محافظوں کو لے کر الماس بیگ کے

ہو لیا۔ کچھ دور جانے کے بعد الماس بیگ نے پھر عرض کیا کہ میرا بھائی اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ جب حضور کے ساتھ ان ہتھیار بند آدمیوں کو دیکھے گا تو دہشت کے مارے بھاگ جائے گا۔ بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو ہتھیار کھول دینے کا حکم دیا۔ یہ ان لوگوں پر بہت شاق گزرا لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ جب آگے بڑھے تو ایک بڑے لشکر کو وہاں صفت آراستہ پایا۔ محافظ سرداروں نے الماس بیگ سے کہا آخر یہ کیا معاملہ ہے تم نے ہم سے ہتھیار تک رکھوا لیے اور یہاں یہ فوج لڑائی کے لیے مستعد دکھائی دے رہی ہے۔ اس نے کہا اندیشہ نہ کرو اصل میں بھائی مع لشکر کے بادشاہ کو سلامی دینا چاہتے ہیں تاکہ ساری فوج حضور کے ملاحظے سے گزر جائے۔ ان باتوں پر بھی بادشاہ نہیں چونکا۔ اس کو نہ معلوم کیوں ایسا اعتماد تھا کہ وہ کسی دہم میں نہ پڑا اور چلتا رہا۔ اس طرح جب کافی مسافت طے ہو گئی تو بادشاہ نے الماس بیگ سے کہا: ”میں بوڑھا آدمی یہاں تک چلا آیا اور تیرے سنگ۔ دل بھائی کو اب تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ کسی کشتی میں بیٹھ کر میرے پاس آجائے“ اس نے عرض کیا کہ ”وہ آپ کے حضور خالی ہاتھ کیسے آئے، وہ تو اس وقت پیش کش اور نذرانوں کی ترتیب اور ہاتھی گھوڑوں کے انتخاب میں مشغول ہو گا“ بادشاہ نے اس وقت قرآن کی تلاوت شروع کر دی اور عصر کے وقت کشتی دوسرے کنارے پہنچی۔ بادشاہ کشتی سے اتر کر جب مقررہ مقام پر پہنچا تو علاؤ الدین اپنی جمیعت کے ساتھ آگے بڑھ کر آیا اور حکمران چچا کے قدموں میں گر گیا۔ بادشاہ نے اسے اٹھایا اور مسکرا کر محبت سے اس کے رخساروں پر ایک طمانچہ مارا اور اسے نصیحتیں کیں اور اپنے شوقِ ملاقات کا حال بیان کیا۔ وہ تسلی آمیز باتیں کرتے ہوئے اس کا منہ چومتا جاتا تھا اور اپنے قریب کھینچتا جاتا تھا۔ اسی عالم میں بدبخت بھتیجے نے بادشاہ کا پنجہ زور سے پکڑ لیا اور اپنے آدمیوں کو جو پہلے سے تیار کھڑے تھے اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ پر محمود سالم ایک کینہہ شخص نے جو سامانہ کا رہنے والا تھا بادشاہ پر تلوا سے حملہ کر دیا۔ بادشاہ زخمی ہو کر کشتی کی طرف بھاگا اور کہا علاؤ الدین نامراد یہ تو نے کیا کیا! اتنے میں اختیار الدین نے جو بادشاہ کا پروردہ تھا پیچھے سے ایسا کاری ہاتھ مارا کہ اس کا کام تمام ہو گیا اور سر کاٹ کر علاؤ الدین کے پاس سے آیا۔ اس کے حکم سے بادشاہ کا سر ایک نیزہ پر چڑھا کر کھڑے اور مانک پور میں پھرایا گیا۔ اس کے بعد برید سر کو اودھ بھیج دیا گیا۔ بادشاہ کے تمام ساتھیوں کو بھی وہیں قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے کچھ دریا میں کود کر ڈوب گئے ملک فخر الدین کو بھی زمرہ گرفتار کر لیا گیا۔

**قدر خاں کی تخت نشینی** | جب احمد چپ کو اس حادثہ جانکاہ کی خبر ملی تو وہ فوراً ہی دہلی لوٹ گیا۔ ارکلی خاں جو بادشاہ کا بڑا بیٹا اور تخت کا وارث تھا ان دنوں ماتان میں تھا۔ احمد نے اس کا انتظار کرنا مناسب نہ جانا اور چھوٹے شہزادے قدر خاں کو سلطان رکن الدین ابراہیم کا خطاب دے کر ملکہ جہاں کے تعاون سے تخت نشین کر دیا۔ مرحوم سلطان کے تمام امراء نے بھی قدر خاں کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور مبارک باد دی لیکن قدر خاں کی بادشاہت بس برائے نام رہی۔

**دہلی پر قبضہ** | علاؤ الدین نے اسی دن جس دن جلال الدین شہید ہوا تھا چتر شاہی سر پر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوں کیا اور باوجود برسات کے شب و روز کوچ کرتا ہوا دہلی روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر اس نے کافی

روپے اور اشرافیاں خیرات اور انعام میں تقسیم کیں، جب وہ بدایوں پہنچا تو اس کے لشکر میں ساٹھ ہزار سوار تھے۔ ملک رکن الدین چونکہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ ارکلی خاں کے پاس ملتان چلا گیا۔ علاؤ الدین نہایت اطمینان کے ساتھ دہلی پہنچ گیا۔ وہاں اس نے جہنا کے کنارے اپنے باغ میں قیام کیا۔ قدیم امراتہ اور سردار روپے کے لالچ میں اس سے آکر مل گئے۔

جلال الدین کے عہد کے شاعر | سلطان جلال الدین کی شہادت کا حادثہ ۱۲۹۲ء رمضان ۶۹۲ھ میں ہوا۔ سات برس بعد اس نے سلطنت کی۔ مرحوم سلطان کو شعر و سخن کا بھی خاص ذوق تھا۔ سلطان نے معز الدین کے قتل کے بعد امیر خسرو کو اس نے اپنی مجلس میں شریک کر لیا تھا۔ بادشاہ کا مصحف ان کی تحویل میں رہتا تھا۔ اور ہر سال ان کو ایک بھاری خلعت ملتی تھی۔ اس کے ذمیوں میں امیر حسن موید حاجی، امیر ارسلان کاتبی، سعد منطقی اور قاضی خلیب جیسے صاحب علم و ادب لوگ شامل تھے۔ اسی عہد کے سب سے بڑے عالم قاضی مغیث ہانسوی تھے جن کی ایک غزل بڑی مشہور ہے، یہ غزل فن کا ایک نادر نمونہ تھی، اسے انیس بحروں میں پڑھ سکتے تھے اس غزل کا مطلع ہے۔

دو درگوش و قد خوش و دود خوب و خط تر

فر تو فری پری و پرے و یا کرو فر

سلطان جلال الدین خود بھی شعر کہتا تھا۔ اس کا نمونہ کلام درج ذیل ہے۔

آں زلف پریشانت زولیدہ نمیخوام آں روئے چو گلنارت تغیدہ نمیخوام

بے پیرمنت خواہم یک شب بکنار آئی ہاں بانگ بندست این پوشیدہ نمیخوام

سلطان نے جس زمانہ میں گوالیار کا محاصرہ کیا تھا تو وہاں اس نے ایک بڑا گنبد تعمیر کرایا تھا اس کے قتبہ کے لیے

خود ہی یہ رباعی کہی تھی۔ رباعی

مرا کہ قدم بوسرگرہ دل ساید از توہ سنگ و گل چہ قدر افزاید

این سنگ شکستہ ناں نہادیم و ریت باشد کہ دل شکستہ آساید

سلطان نے اس رباعی کو ہم نشین شاعروں خاص طور سے سعد منطقی کو سنا کر اس پر تنقید و حرج کرنے کا حکم دیا۔

سب نے بے حد تعریف کی اور کوئی غلطی نہیں بتائی۔ سلطان نے کہا تم لوگ میرا پاس و لحاظ کر رہے ہو اس رباعی کے عیب

میں خود ایک دوسری رباعی میں ظاہر کیے دیتا ہوں۔ رباعی

باشد کہ دریں جاگز ر کس باشد کس خرقہ رواٹے چرخ اطلس باشد

شاید کہ زمین قدم میمونش یک ذرہ بمارسد ہماں بس باشد

۱۷ جس وقت علاؤ الدین کے لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو ملکہ جہاں نیر بادشاہ رکن الدین اور چند فادانہ کو بے کر ملتان چل گئی۔ علاؤ الدین نے بغیر

کسی مزاحمت کے دارالسلطنت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ (نیر و شاہی)



## سلطان علاؤ الدین خلجی

سلطان علاؤ الدین خلجی نے دہلی میں ۲۲ رزی الحجہ ۶۹۵ھ کو جلوس کیا۔ تخت نشینی کی رسم سلطان کے بھائی الماس بیگ کی تائید و اتفاق سے انجام پائی۔ سلطان نے الماس بیگ کو الخ خاں، اپنے سارے سنجر کو جو میر مجلس تھا الپ خاں، ملک نصرت جلیسری کو نصرت خاں اور ملک بدر الدین کو طغر خاں کا خطاب دیا۔

تخت نشینی کے بعد سلطان نے ایک میدان میں لشکر کا کپ لگوایا اور وہاں دربار عام منعقد کر کے غوام و خواص سب کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا۔ اس مجلس میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور امیر اور سرداروں کو مناصب اور جاگیر عطا کی گئیں۔

جب پائے تخت کا بندوبست بحسن و خوبی ہو گیا تو سلطان نے سب سے پہلے سلطان جلال الدین ملتان پر فوج کشی کے بیٹوں کی سرکوبی کی طرف توجہ کی اور ۶۹۶ھ میں الخ خاں اور الپ خاں کو بھاری لشکر دے کر اکل خاں اور سلطان رکن الدین کے مقابلہ پر ملتان کی طرف روانہ کیا۔ دونوں شہزادے قلعہ ملتان میں محصور ہو گئے۔

ابہ کہتے ہیں یہ قدیم شہر قبل مسیح سے آباد ہے۔ سب سے قدیم علاقہ قطب صاحب کی لاٹھ کے ارد گرد کا ہے جو موجودہ پرانی دہلی یعنی شاہ جہاں آباد سے گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہندو راجاؤں کے آخری دور حکومت میں پر تھوی راج عرف رائے پتھورہ کا دارالسلطنت اندلا کوٹ کے نام سے مشہور تھا ۸۹۳ھ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے رائے پتھورہ کو شکست دے کر اس کو ہندوستانی مقبوضات کا مرکز بنایا۔ اس کے بعد قطب الدین ایک اور اس کے جانشینوں کا دارالسلطنت رہا۔

لال کوٹ سے پہلے یہاں کی آبادی اندرپت کہلاتی تھی اور اسے اندر دیوتا کا استھان سمجھا جاتا تھا۔ انگ پال کا پرانا قلعہ بھی اندرپت میں شامل تھا۔ بعد میں انگ پال تو دوم نے سمت ۱۱۰۹ھ میں لال کوٹ بسایا تھا۔ لوہے کی لاٹھ پر ہی تاریخ درج ہے۔

دہلی کا دوسرا قدیم مستقر تغلق آباد، یہ قلعہ اور شہر قطب صاحب سے چار میل مشرقی جانب متھرا کی سڑک کے قریب ہے۔ یہاں غیاث الدین تغلق شاہ کا مقبرہ ہے اس مقبرہ میں سلطان محمد بن تغلق شاہ بھی دفن کیا گیا تھا۔ یہ شہر غیاث الدین تغلق شاہ کا آباد کیا ہوا تھا۔ دہلی کا تیسرا مرکزی مقام تغلق شاہ کے لڑکے سلطان محمد کا بسایا ہوا شہر جہاں پناہ تھا جو دہلی اور سیری کے درمیان تھا۔ جہاں اس کے محل اور ہزارستان کے گھنڈر ہیں۔

چوتھا شہر سلطان علاؤ الدین کا بسایا تھا جسے شہر سیری کہا جاتا ہے، یہاں سلطان نے قلعہ بھی تعمیر کرایا تھا اس کو قلعہ علاؤل کہتے تھے اس کے گھنڈر قطب کو جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

دہلی کی پانچویں صودت وہ بڑا شہر تھا جسے محمد تغلق نے دہلی اور سیری کو ایک شہر پناہ سے ملا کر تعمیر کرایا تھا۔ یہ علاقہ شمال اور مشرق کی طرف سے پھاڑیوں کی وجہ سے قدرتی طور پر حصار بند تھا، ابن بطوطہ نے اسی شہر کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت یہ نہایت وسیع اور عظیم الشان شہر بن گیا تھا۔

دہلی کا چھٹا مستقر فیروز آباد تھا۔ یہ شہر ہمایوں کے مقبرہ سے موجودہ شہر کے شمال کی طرف پھاڑی تک پھیلا ہوا تھا جہاں فیروز شاہ کی لاٹھ کھڑی ہوئی ہے یہ قلعہ کا ایک حصہ تھا اسے فیروز شاہ نے بسایا تھا۔

ساتواں مرکز شاہ جہاں آباد ہے جسے شاہ جہاں نے ایک مرتبہ نقشہ پر تعمیر کرایا جس میں لال قلعہ اور جامع مسجد شامل ہیں۔ آٹھویں شکل نیو دہلی کی ہے جو انگریزوں کے عہد کا تعمیر کردہ شہر ہے۔ یہ سارے مقام اگرچہ الگ الگ ناموں سے آباد ہوئے لیکن سب کے سب دہلی ہی کہلائے۔ بلاشبہ یہ سارا علاقہ قدیم شان و شوکت کا بے مثل مرقع ہے۔

بادشاہی لشکر نے شہر پر حملہ کر دیا لیکن کوتوال شہر اور باشندوں نے امان طلب کر کے صلح کر لی۔ شہزادوں میں بھی مقابلہ کیا گیا۔ کی تاب نہیں تھی اس لیے انھوں نے بھی شیخ رکن الدین قریشیؒ کو واسطہ بنا کر مصالحت کی درخواست کی اور انھیں خالی کے پاس آگئے۔ انھیں خالی نے نہایت عزت و توقیر کے ساتھ ان سے ملاقات کی اور فتح کی خوشخبری دہلی کو روانہ کر دی۔ اور خود بھی اسیر شہزادوں کو لے کر دہلی کی طرف چلا۔ جب وہ ضلع ہانسی میں بھوبہر گاؤں پہنچا تو نصرت خاںؒ اس کے نام ایک شاہی فرمان لے کر آیا جس کے بموجب انھیں خالی نے دونوں شہزادوں اور مرحوم سلطان کے مغل داماد الغویگ اور وانش مندو زیر ملک احمد چپ کو اندھا کر دیا۔ ارکلی خالی کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا اور دونوں شہزادوں کو ہانسی کے کوتوال کی حراست میں دے کر باقی اسیروں کو مع اہل و عیال کے دہلی روانہ کر دی۔ سلطان نے الغو مغل اور احمد چپ کو قلعہ گوالیار میں بھیج دیا اور دوسروں کو دہلی ہی میں قید کر رکھا۔ اس زمانہ میں افغان دوسرے بہت سے قدیم امراء کو بھی اندھا کر دیا گیا اور کچھ کو جلا وطنی کا حکم دیا گیا۔ غرض سلطان جلال الدین کا سال خاندان دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو گیا اور اس طرح قدرت نے حق پسند درویش سیدی مولا کے خون کا بدلہ پوری طرح چکا دیا۔

اس دایہ مکافات میں سن اے غافل  
بیدار کرے گا آج کل پائے گا !

۶۹۷ء میں نصرت خاں منصب وزارت پر فائز ہوا۔ اس نے لوگوں سے وہ سارے انعامات بڑی سختی سے کر کے واپس لے لیے جو علاؤ الدین نے ابتداء میں تالیفِ قلب کے لیے عطا کیے تھے۔ اس طرح سرکاری خزانہ میں بے انتہار روپیہ داخل ہو گیا۔ علاؤ الملک دہلی کا کوتوال تھا۔ سلطان نے اسے کٹرے کی حکومت عطا کر کے روانہ کیا دیا تھا لیکن دوبارہ اسے کٹرے سے بلا کر اس کے قدیم عہدہ پر فائز کر دیا۔ ملتان کا علاقہ الپ خاں کو بطور جاگیر ملا۔ ۶۹۸ء میں مغلوں نے چنگیزی نامی مغل سردار کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ سندھ سے آگے تک بڑھا آیا۔ سلطان نے اس کے مقابلہ کے لیے انھیں اور تغلق خاں غازی الملک کو جو دیپال پور کا حاکم تھا روانہ کیا۔ شاہی لشکر کی مغلوں سے جدتِ بخور کے علاقہ میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار مغلوں کو شکست ہوئی اور کئی ایک مغل میدان میں مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور شاہی لشکر مال و غنائم لے کر فاتح و کامیاب واپس آیا۔

مغلوں کا پہلا حملہ | ۶۹۸ء میں مغلوں نے چنگیزی نامی مغل سردار کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ سندھ سے آگے تک بڑھا آیا۔ سلطان نے اس کے مقابلہ کے لیے انھیں اور تغلق خاں غازی الملک کو جو دیپال پور کا حاکم تھا روانہ کیا۔ شاہی لشکر کی مغلوں سے جدتِ بخور کے علاقہ میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار مغلوں کو شکست ہوئی اور کئی ایک مغل میدان میں مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور شاہی لشکر مال و غنائم لے کر فاتح و کامیاب واپس آیا۔

مغلوں کا دوسرا حملہ | ۷۰۰ء میں مغلوں نے چنگیزی نامی مغل سردار کی قیادت میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ وہ سندھ سے آگے تک بڑھا آیا۔ سلطان نے اس کے مقابلہ کے لیے انھیں اور تغلق خاں غازی الملک کو جو دیپال پور کا حاکم تھا روانہ کیا۔ شاہی لشکر کی مغلوں سے جدتِ بخور کے علاقہ میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار مغلوں کو شکست ہوئی اور کئی ایک مغل میدان میں مارے گئے اور بہت سے گرفتار ہوئے اور شاہی لشکر مال و غنائم لے کر فاتح و کامیاب واپس آیا۔

پوری طرح ناکہ بندی کر دی جس کی وجہ سے شہر میں غلہ کا قحط پڑ گیا اور گرائی کی وجہ سے لوگ تنگ آ گئے۔ سلطان نے حملہ آوروں کے مقابلہ کے لیے انخ خاں اور ظفر خاں کو ایک بڑا لشکر دے کر متعین کیا۔ گیلی کی سرحد پر لڑائی ہوئی۔ اس معرکہ میں ظفر خاں مارا گیا۔ کہتے ہیں اس کی ہلاکت خود سلطان کی مرضی کے مطابق ہوئی۔ قتلغ خواجہ شکست کھا کر خراساں بھاگ گیا اور وہیں انتقال کیا۔

**مغلوں کا تیسرا حملہ** | تیسری بار مغلوں نے ترخی مغل کی قیادت میں جو بڑا ماہر تیر انداز تھا ہندوستان پر حملہ کیا۔ ترخی کی کمان میں ایک لاکھ اور بیس ہزار سوار تھے، وہ کوہستانی علاقوں کو فتح کرتا ہوا قصبہ برن تک آپہنچا۔ برن کا حاکم ملک نخر الدین امیر دار قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان نے اس کی کمک کے لیے ملک تغلق غازی الملک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا جس وقت شاہی لشکر وہاں پہنچا تو ملک نخر الدین بھی قلعہ سے نکل کر اس سے آملا۔ دونوں نے مل کر رات کو مغل فوج پر چھاپہ مارا یہ شب خون آٹنا زبردست تھا کہ مغل بدحساس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے اور ترخی کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

**مغلوں کا چوتھا حملہ** | علاؤ الدین کے عہد میں مغلوں نے چوتھی بار خراسان کے شہزادوں محمد تبرہ باقی اور علی بیگ کی قیادت میں ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا۔ اس مرتبہ مغلوں نے اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان کا ایک لشکر ناگور کی طرف بڑھا اور دوسرا سر مور کے پہاڑوں کو فتح کرتے ہوئے بیاہ یعنی کالی ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ سلطان نے ملک مانگ غلام اور حاکم دیپال پور ملک تغلق کو ان کے مقابلہ پر امر وہہ کی جانب روانہ کیا۔ مغل غنیمت میں ملا ہوا کافی مال و اسباب لیے ہوئے رہب ندی کو عبور کر رہے تھے کہ ملک مانگ نے ان پر پشت سے حملہ کر دیا۔ اس موقع پر بڑی خوں ریز لڑائی ہوئی، دونوں مغل شہزادے خوب جہم کر لڑے اور انہوں نے بڑی بہادری دکھائی لیکن وہ گرفتار ہو کر قتل ہوئے اور ان کا ایک بڑا لشکر گاجر مولیٰ کی طرح کٹ گیا جو بچے وہ جان بچا کر اپنے ملک کو بھاگ گئے۔ شہزادوں کے سر قلعہ بدایوں کے کنگرے پر لٹکا دیئے گئے۔ کسی شاعر نے اس موقع پر بدایوں کے جنوبی دروازہ پر یہ قطعہ لکھ دیا:

اے حصن کہ تائیدِ خدا یا ر تو باد فتح و ظفر شاہ علم دار تو باد  
از نو ملک زمانہ مہمار تو شد ترخی جو علا بیگ گرفتار تو باد

**مغلوں کا پانچواں حملہ** | مغلوں نے پانچویں بار وکیٹ نامی مغل سردار کی قیادت میں حملہ کیا۔ وکیٹ دونوں شہزادوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ایک بڑا لشکر لے کر ملتان کی طرف آیا سلطان نے اس بار

یہ ظفر خاں نہایت دلیر اور بہادری سے سالار تھا مغلوں پر اس نے بڑھ کر بھرپور حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں ان کو کافی دور پیچھے ہٹا دیا۔ جن وقت وہ ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا مغلوں کے ایک دستہ نے پیچھے سے اسے گھیر لیا اس موقع پر انخ خاں نے ظفر خاں سے دشمنی کی وجہ سے سخت غداہی کی اور بجائے آگے بڑھ کر ان حملہ آوروں کو روکنے کے اپنی جگہ ٹھہرا رہا۔ ظفر خاں نے آخر دم تک بہادری سے لڑتے ہوئے جان دے دی، اس کے مرنے کے باوجود مغلوں پر اس کے حملے کا ایسا خوف طاری تھا کہ وہ خراسان لوٹ گئے۔ (فیروز شاہی) ملے امیر خسرو نے ملک مانگ کی اس دلیرانہ لڑائی کا پورا حال اپنے رزمیہ خزانہ المختصر میں تحریر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ رزمیہ خسرو کی فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی اور سے ایسے کلام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بھی ملک مانگ اور ملک تعلق کو ہی ان کے مقابلہ پر بھیجا۔ شاہی لشکر عین اس وقت جبکہ مغل ملتان کو لوٹ کر واپس ہو رہے تھے، ان کے سر پر جا پہنچا اور ایسا بھرپور حملہ کیا کہ مغل سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے۔ لشکر نے ان کا تعاقب کر کے کئی ایک مغل سرداروں اور وکیٹ کو گرفتار کر لیا۔ کافی غنیمت جس میں ملتان کی لوٹ بھی شامل تھی شاہی لشکر کے ہاتھ آیا۔ اس شکست کے بعد مغل ایسے پست ہمت ہوئے کہ پھر ہندوستان کا رخ کرنے کی جرأت نہ کی۔

### شراب کی ممانعت

ان پے درپے فتوحات کی وجہ سے پورے ملک پر سلطان علاؤ الدین کا رعب چھا گیا اور ملک کی سرحدیں بھی محفوظ ہو گئیں۔ سلطان نے ان فتوحات کی خوشی میں جشنِ شاہانہ منعقد کیا اور ساری رات شراب و رنگ کا دُور چلتا رہا۔ اس رات جب کافی وقت گزر گیا تو اہل مجلس اٹھنے کے لیے ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے، سلطان نے جو نہایت مدہوش ہو رہا تھا یہ گمان کیا کہ یہ لوگ میرے قتل کے لیے اشارے کر رہے ہیں وہ گھبرا کر "عذر عذر" چلانے لگا اور اپنے محافظوں کو قاضی بہار کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا۔ قاضی بہار سلطان کا نہایت چہیتا اور ظریف مصاحب تھا۔ اسی وقت سب لوگ مجلس سے اٹھ کر چلے گئے، جب صبح ہوئی اور بادشاہ کے ہوش ٹھکانے آئے تو اسے خیال آیا کہ رات اس نے خواہ مخواہ بدگمانی کی تھی چنانچہ اس نے قاضی بہار کو بلوایا بھیجا۔ خدام نے عرض کیا وہ تو اسی وقت قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ سن کر سلطان کو سخت صدمہ ہوا اور ایسی پیشانی ہوئی کہ اس نے اسی وقت شراب سے توبہ کی اور منادی کرا دی کہ پوری مملکت میں کسی جگہ بھی شراب فروخت نہ کی جائے۔ شاہی محل میں جتنے شراب کے ذخیرے تھے سب بہا دیئے گئے۔ اس حکم کے بعد جو بھی حالتِ مستی میں پایا جاتا اسے سزا دی جاتی تھی۔ میخانے بند ہو گئے اور محتسبوں کی بن آئی، زہد و تقویٰ کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔

۶۹۷ھ میں نو مسلم مغلوں نے شورش کا ارادہ کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری عمال نے ان سے سرکاری روپیہ اور سلطان کے دیئے ہوئے انعامات واپس لینے میں بڑی سختی کی۔ تنگ آ کر انھوں نے طے کیا کہ جس دن سلطان شکار میں مقرر ہو وہ عذر برپا کر دیں۔ سلطان کو ان کے ارادوں کا علم ہو گیا۔ اس نے خفیہ احکام جاری کر دیئے کہ فلاں جہینے کی فلاں تاریخ کو جو بھی مغل نظر آئے قتل کر دیا جائے، چنانچہ مقررہ دن پورے ہندوستان میں بچا رہے یہ پر دیسی نو مسلم اس قدر قتل ہوئے کہ شمار سے باہر رہے۔

دنیاوی کامیابیاں انسان کو اپنے متعلق ایسی ایسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی ہیں  
علاؤ الدین کی خام خیالیاں کہ وہ آسمان کی پرواز کرنے لگ جاتا ہے۔ علاؤ الدین کو بھی جب متواتر کئی ایک

کامیابیاں ہوئیں اور ساہا ملک اس کے زیرِ نگیں ہو گیا تو وہ بھی طرح طرح کے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ ایک تو یہ بھی کہ دین محمدی کی طرح ایک اور دین ایجاد کرے۔ اس نے خلفاءِ اربعہ کی طرح الف خاں، الب خاں، ظفر خاں اور نصیر خاں کو چار خلفاء بنانا بھی طے کر لیا۔ دوسرا یہ خیال سوار ہوا کہ سکندر کی طرح تمام دنیا کو فتح کر لے۔ چنانچہ اس نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سکندر ثانی پڑھنے کا حکم دے دیا۔ لیکن خدا نے اسے اپنی مہربانی سے اس گمراہی سے بچا لیا۔ سلطان نے ان دونوں باتوں کے لیے علاؤ الملک کو توالی شہر سے مشورہ کیا۔ علاؤ الملک زیرک آدمی تھا اس نے ان دونوں باتوں سے منع کیا کہ



وین کسی بندہ کے ایجاد کرنے سے نہیں بن جاتا یہ تو صرف اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے، پھر اس کے ساتھ معجزوں کا ہونا بھی ضروری ہے بغیر اس کے صرف دولت اور قوت کے زور سے دین کو بدل دینا ممکن نہیں، ایسے کسی اقدام سے تو طرح طرح کے فتنے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے جن کے نتیجہ میں بجز رسوائی اور پریشانی کے کچھ حاصل نہ ہوگا البتہ ملک گیری کا ارادہ نہایت معقول اور مناسب ہے لیکن سکندر کا سا ساز و سامان میسر ہے نہ اوسطہ جیسا وزیر۔ آپ اگر تمام ہندوستان کے قلعوں کو کافروں سے اور دہلی کے نواح کو سرکشوں سے پاک کر دیں تو یہ کارنامہ سکندر کی جہانگیری سے کم نہ ہوگا بغرض علاؤ الملک نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس کے ان دونوں ارادوں کے متعلق بڑی معقول اور چچی تلی باتیں کہیں۔ سلطان کو بھی اس کی یہ تقریر نہایت پسند آئی اور اس نے جب بخوبی غور کیا تو اسے علاؤ الملک کا مشورہ ہی مناسب معلوم ہوا اور وہ اپنی ان خام خیالیوں سے باز آ گیا اور خوش ہو کر علاؤ الملک کو خلعت اور انعامات عطا کیے۔ دربار کے دوسرے امراء جو بادشاہ کی ہدایت اور بد مزاجی کی وجہ سے خلاف مرضی کوئی بات کہنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے، وہ بھی علاؤ الملک کی اس بے باکی اور حق گوئی پر بہت خوش ہوئے اور اس کی بہت تعریف و تحسین کی اور اس کے پاس تحفے بھیجے۔ اسی سال بادشاہ نے دیوگیر لے کر دوبارہ فتح کیا اور اس فتح کے نتیجے میں وہاں سے کافی مال غنیمت اور نفیس تحفے ہاتھ آئے۔

۶۹۸ھ میں سلطان نے گجرات کے راجہ رائے کرن پر فوج کشی کے لیے انج خاں کو ایک بڑا لشکر دے کر روانہ کیا۔ رائے کرن تیس ہزار سوار، اسی ہزار پیادے اور تیس ہاتھی لے کر مقابلہ پر آیا لیکن شاہی لشکر کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ انج خاں نے سروالہ کو لوٹ لیا اور رائے کرن کا تعاقب کیا۔ وہ دیوگیر (دکن) کے راجہ رام دیو کے پاس جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ اس کے اہل و عیال اور گجرات کا خزانہ مسلمانوں کو غنیمت میں مل گیا۔

## گجرات پر فوج کشی

لے دیوگیر کو اب دولت آباد کہتے ہیں۔ یہ شہر حیدر آباد دکن کے صوبہ اورنگ آباد سے دس میل کے فاصلہ پر بمبئی سے ۱۷۰ میل پر ہے۔ موجودہ آبادی دہترارہائی۔ دولت آباد کا قلعہ ایک پہاڑ کی چٹان پر ہے حصار پورے تین میل کا ہے، بالا حصار ۲۱۰ فٹ بلند ہے۔ اس پہاڑ کی بلند ترین زمین سے چھ سو فٹ ہے۔ سلطان علاؤ الدین خلجی کے وقت ۱۲۹۷ء میں یہاں خاندان یو کا راجہ رام چند تھا۔ علاؤ الدین جب نذرانہ لے کر لوٹ گیا تو دوبارہ راجہ نے بغاوت کی تو ملک کا فوراً بادشاہ کے سپہ سالار نے اس قلعہ اور شہر کو فتح کیا اس کے بعد راجہ کے بیٹے شکر نے بغاوت کی تو ملک کا فوراً تیسری بار اس کو فتح کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد راجہ کے داماد ہریال نے بغاوت کی تو مبارک خلجی نے اسے شکست دے کر زندہ جلا دیا۔ ۱۳۲۹ء میں محمد شاہ تغلق نے دہلی کو ہار کر اس شہر کو دارالخلافہ بنایا۔ دیوگیر دہلی سے پورے ۸۰۰ میل پر ہے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں دکن کے خردختار سرداروں نے دولت آباد پر قبضہ کر لیا تھا، پھر یہ صوبہ ۱۵۲۶ء تک ہمنی سلطنت کے زیر نگین رہا۔ ہمنیوں کے زوال پر احمد نگر کے نظام شاہی سلاطین قابض رہے ان سے عالمگیر اول نگر زب نے چھین لیا۔ ۱۷۰۷ء میں یہ سلطنت اکسفیہ دکن کا حصہ بن گیا۔ ۱۷۶۲ء میں ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا۔

۱۷۶۲ء میں ”انج“ کے معنی بڑے کے ہیں اور ”اکت“ کے معنی چھوٹے کے۔ اس زمانہ میں انج خاں ”امیر الامراء“ کے مساوی عہدہ تھا۔ چنانچہ نامہ لکھنؤ نے ان کو ہی خطاب دیا تھا۔ علاؤ الدین نے اپنے بھائی الماس بیگ کو اس عہدہ پر فائز کیا۔ محمد تغلق کو بھی اس کے باپ نے انج خاں کا خطاب دیا۔ ۱۷۶۲ء گجرات و راجے کے شمال میں سمندر کے کنارے کا علاقہ گجرات کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ زبردستی سے صحرائے مارواڑ (جو وہ پور تک وسیع ہے۔ اس کے مغربی حصے کا نام کاٹھیاواڑ ہے جو تین طرف سے سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ اس سارے علاقہ میں گجراتی زبان بولی جاتی ہے۔ گجرات کا مطلب (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مائے کرن کی ایک بیوی دیول رانی نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ سلطان کا بڑا ارٹ کا خضر خاں اس پر عاشق ہو گیا۔ خضر خاں نے امیر خسرو سے اس معاشقہ کو نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ انہوں نے ان دونوں کے قصہ کو بڑے عمدہ پیرایہ میں نظم کیا۔ ان کی یہ نظم بہت مشہور ہے۔ انخ خاں نہروالہ سے ایک بڑا بت جس کی ہندو بہت پرستش کرتے تھے دہلی لے کر آیا تھا۔ اس نے یہ بت دہلی کی سڑک پر ڈال دیا تاکہ راہ گیر اسے پامال کرتے ہوئے گزریں۔ جس وقت رائے کرن شکست کھا کر بھاگا تھا انخ خاں اس کے تعاقب میں سومات تک گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اس مشہور بت خانہ کو دوبارہ تباہ کر دیا اور وہاں ایک مسجد بنوائی۔

اس زمانہ میں نصرت خاں نے کھمبایت پر جو ساحل سمندر پر ایک مشہور بندر گاہ ہے حملہ کیا۔ کھمبایت سے نصرت خاں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میدان دریائے نہر یا ساہتی اور مہی سے سیراب ہوتا ہے۔ کاٹھیاواڑ اپنی بندرگاہوں اور گھوڑوں کی تجارت کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس سرزمین کو ہندو ہما دیو اور سری کرشن کا دیں بتاتے ہیں۔ ہندوؤں کے قدیم مندر دوار کا، سومات اور پالی ٹانہ میں ہیں۔ سومات کے مشہور مندر پر سلطان محمود نے ۱۰۱۶ھ میں حملہ کیا تھا۔ احمد آباد اور سورت گجرات کے بڑے شہر ہیں۔ زمانہ قدیم میں گجرات پر بدھ مت والوں کی حکومت تھی۔ پھر یہاں راجپوتوں کی عملداری رہی، ان کا صدر مقام موجودہ ریاست بڑودہ کے ضلع کٹری کی تحصیل "انلوار" میں تھا اس کو اب پٹن کہتے ہیں۔ محمود غزنوی اور قطب الدین ایبک کے حملوں کے بعد ۱۲۹۸ھ میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں گجرات دہلی کا ماتحت صوبہ بن گیا۔ ۱۳۹۸ھ میں دہلی کے گورنر ظفر خاں نے خود مختار ہو کر بادشاہی کی بنیاد رکھی۔ ۱۵۰۲ھ میں اکبر نے اس صوبہ کو دوبارہ دہلی کا باج گزار بنالیا۔ مغل بادشاہوں کا قبضہ ۱۱۱۹ھ تک قائم رہا۔ محمد شاہ رنگیلے کے زمانہ میں ۱۱۵۰ھ میں گالوار خاندان نے بغاوت کر کے خود مختار اختیار کی، ان کے بعد انیسویں صدی کے آغاز میں یہ علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔

لے سومات۔ بزرگہ مائے کاٹھیاواڑ کے موضع پٹن میں یہ بت خانہ ہے جو دراول ریلوے اسٹیشن سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ پہلے ریاست جوناگڑ کے ماتحت تھا یہاں سے احمد پور کا فاصلہ تقریباً تین سو میل ہو گا۔ دراول سے پٹن تک سڑک کے دونوں طرف مسلمانوں کی بے شمار قبریں ہیں بلاشبہ انہی شہداء کی یادگار ہیں جنہوں نے اس خانہ کفر کو ٹھکانے میں جانیں قربان کر دی تھیں۔ پٹن کے پہلے دروازہ پر عربی اور سنسکرت میں دو کتبے ہیں، دوسرے پھاٹک پر علاؤ الدین کا فتح نامہ ہے۔ مندر کی عمارت پختہ اور دیران ہے۔ ہندوؤں کے عقیدہ میں یہ ہما دیو کا مندر ہے، سورج اور چاند گرہوں کے وقت سارے ہندوستان کے یاتری یہاں جمع ہوتے تھے اور یہ بہت بڑا تیر تھا۔ ہندو اعتقاد میں اس مندر سے آواگون (تناسخ) کے مطابق روحوں کو جسم عطا کیے جاتے ہیں۔ سومات دیوتا کی مورت ۵ گز لمبی تھی ۸ گز زمین میں سگڑاوپہ۔ اس میں چھین ستون ۷ صغ جواہرات کے تھے، پھت میں دو صومس سونے کی زنجیر تھی، چھ سو کوئی سے گنگا جل دیوتا کا نشان کے لیے روزانہ لایا جاتا تھا۔ ۵ سوارٹکیاں، تین سو گویے، تین سونائی، دو ہزار پنڈت مندر کے ملازم تھے۔ سلطان محمود نے اس بت کی ناک تیر سے اڑا دی۔ مورت توڑنے پر اس کے پیٹ میں سے بے شمار ہیرے موتی جواہرات نکلے۔ اس بت کے دو کتبے مکہ اور مدینہ کی جانب کیے گئے اور ان میں سے ایک غزنی کی جامع مسجد اور دوسرا دیوان عام کے سامنے ڈالوا گیا۔ شیخ سعدی نے ساتویں صدی ہجری میں اس مندر کی سیر کی ہے اس وقت یہ آباد تھا۔ سعدی نے یوستان میں اس کا ذکر کیا ہے کہ "تھے دیدم از عاج در سومات، ۷ مرصع چو در جاہلیت منات"۔ سومات سے مراد مندر ہے نہ کہ بت۔ شیخ فرید الدین عطار کا یہ شعر بھی اس کی تائید کرتا ہے "شکر محمود اندر سومات، یا فتنہ اس بت کہ نامش بود ذات" فرشتہ کتا ہے سوم بادشاہ کا نام تھا اندرات بت کا۔ اس بادشاہ کی نسبت سے شہر کا نام سومات پڑ گیا۔ جس طرح بعلبک بت اور شہر دونوں کا نام ہے۔ نویں صدی میں سلاطین گجرات نے مندر پر حملہ کر کے بت توڑ ڈالا، اس کے بعد یہ آباد نہیں ہوا۔ موجودہ بھارتی حکومت نے اس میں دوبارہ مورتی رکھوائی ہے۔ مندر کا طول و عرض دس پندرہ گز ہے، باہر کی دیواروں پر کئی طرح کے نقش و نگار ہیں۔

لے کھمبایت کے متعلق توڑک جمانگیری میں سب سے زیادہ عمدہ اور معتبر بیان ہے۔ جمانگیری کہتا ہے: "یہ قدیم بندر گاہ ہے، یہاں اس کی بنا ہزار سال قبل (باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱ پر)"

بے شمار مال و دولت محل و جواہرات حاصل ہوئے۔ مشہور فاتح اکافور ہزار دیناری بھی اسی لڑائی میں گرفتار ہو کر آیا تھا جس نے ترقی کر کے سلطان کے نائب کی حیثیت اختیار کر لی۔

الغ خاں جب گجرات فتح کر کے الوری میں آیا تو اس نے لشکریوں پر بڑی سختی کر کے مال غنیمت وصول کیا۔ اس کا روانی سے مغل لشکری بگڑ گئے اور مقابلے پر تیار نہ ہو سکے، لیکن الغ خاں نے ان کو نہ پر کر کے سخت نراڑھی اور انھیں منتشر کر دیا۔ ان میں سے کچھ مغل تو رنتھمبور کے قریب جھابن میں راجہ ہمیر دیو کے پاس چلے گئے اور الغ خاں مسلسل کوچ کرتے ہوئے دہلی لوٹ آیا۔  
**رنتھمبور کا معرکہ** | الغ خاں نے ۶۹۹ھ میں رنتھمبور اور جھابن پر جو نو شہرہ کے نام سے موسوم ہے حملہ کیا۔ یہاں کا راجہ رائے پتھورا کا پوتا ہمیر دیو تھا۔ وہ دس ہزار سوار، بکثرت پیدل فوج اور بے شمار ہاتھی لے کر مقابلہ پر آیا لیکن اسے بڑی طرح شکست ہوئی وہ اپنا مال و اسباب سمیٹ کر رنتھمبور کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔ الغ خاں اس حملہ کے متعلق تفصیلی رپورٹ دہلی روانہ کی اور سلطان کو رنتھمبور پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔

**چتوڑ کی فتح** | سلطان علاؤ الدین نے الغ خاں کے مشورہ پر بڑی بھاری فوج کے ساتھ کوچ کیا اور رنتھمبور ہی مدت میں اس قلعہ کو بڑے تنگ و اختتام کے ساتھ فتح کر لیا اور ہمیر دیو کو قتل کر وا دیا۔ مفتوحہ قلعہ سے کافی دھننے اور ذخیرے حاصل ہوئے۔ سلطان نے اس کی حفاظت کے لیے ایک قلعہ دار مقرر کیا اور جھابن کا علاقہ الغ خاں کے حوالے کر کے چتوڑ کی طرف روانہ ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ کھبایت صفحہ گذشتہ) بتاتے ہیں، اس کا پہلا نام تر بنافٹو تھا اور یہاں کا راجہ تہنک کمار تھا۔ راجہ امھے کمار کے عہد میں اس شہر پر آسمانی عذاب نازل ہوا اور سارا شہر مٹی میں دھنس گیا۔ ہما دیو کی مورتی نے جو لکڑی میں نقش تھی امھے کمار کو خواب میں اس عذاب سے آگاہ کر دیا تھا وہ اس بت کو جہاز میں رکھ کر بحال و حیاں و خزانہ سوار ہو گیا، جہاز بھی سمندر کے طوفان میں لوٹ گیا۔ راجہ اس لکڑی کے بت کے سہارے بچ گیا اور دوبارہ اس نے اس شہر کو تعمیر کرایا اور اس بت والے ستون کو یادگار و برکت کے لیے نصب کر وا دیا۔ ہند میں ستون کو کھبا اور تھمب کہتے ہیں اس لیے اس کا نام تھمب نگری اور کھنیاؤتی پڑ گیا جو کثرت استعمال سے کھبایت بن گیا۔ جہاز کھبایت کی کھاڑی میں نہیں آتے اور قریب کے بندر گوگرہ پر ٹنگر کرتے ہیں۔ مشہور سیاح مسعودی نے بھی اس بندر کا ذکر کیا ہے۔ ساتویں صدی کے آخر میں ایران سے پادری ہندوستان آئے تو وہ سورت سے ۷۰ میل پر مقام سیجھم میں ٹھہرے۔ وہاں سے رفتہ رفتہ گجرات کے سارے ساحل پر پھیل گئے۔ کچھ عرصہ تک کھبایت پر انہی پارسیوں کا قبضہ رہا۔ بعد میں مغل صوبہ دار گجرات موہن خاں نے اس کو خود مختار جاگیر کی حیثیت دے دی کھبایت کے فواید نے مرہٹوں کی اطاعت قبول نہیں کی، حالانکہ وہ اپنے دور عروج میں پورے گجرات پر قابض تھے۔ یہ شہر سنو سے ۳۰۶ میل اجمہا پور سے ۵۲ میل پر ہے، آبادی چالیس ہزار ہے۔ شہر کی جامع مسجد سلطان محمد تغلق کی بنائی ہوئی ہے۔ مارکو پولو اور ابن بطوطہ نے بھی اس بندر گاہ کا ذکر کیا ہے۔

لے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کا قتل عام الغ خاں کے دہلی پوٹ کر آنے کے بعد ہوا ہے۔ مورخین نے قدیم و تاخیر کا خیال کیے بغیر اس واقعہ کا پہلے ہی ذکر کر دیا ہے۔ اگر پہلے ہی قتل عام ہوا پھر اس کا ذکر مغلوں کے ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔  
 ۱۷۶ میل اور اندور ۱۹۱ میل ہے۔ ریل کا اسٹیشن شہر سے دو میل پر اسی پارٹی کے دامن میں ہے جس پر مشہور تاریخی قلعہ ہے۔ آبادی تقریباً آٹھ ہزار ہے۔ قلعہ چتوڑ کی عمارت پانچ فٹ سطح ارضی سے بلند پارٹی پر ہے۔ اس کا طول سواتین میل اور عرض نصف میل ہے۔ ایک چکر دار سڑک سے اوپر جاتے ہیں۔ سڑک کے گرداگرد مستحکم و باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

سلطانی لشکر نے مختصر عرصہ میں چتوڑ کو فتح کر لیا۔ سلطان نے اس کا نام خضر آباد رکھا اور خضر خاں محل کو ایک چتر عطا کر کے چتوڑ کی سربراہی پر مامور کر دیا۔

اس مہم میں جو واقعات پیش آئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ بادشاہ کی روانگی سے پہلے شاہزادہ کی وفات | نصرت خاں نے انج خاں کی کمک کے لیے رتھبور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ایک دن قلعہ والے مورچوں پر سنگ باری کر رہے تھے کہ ایک پتھر نصرت خاں کو لگا، جس کے صدمہ سے وہ مر گیا۔ اس سے پہلے ظفر خاں کے مرجانے سے بادشاہ کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا، اب نصرت خاں کے شہید ہونے کے بعد اس کا دوسرا بازو بھی ٹوٹ گیا۔

دوسرا واقعہ خود بادشاہ کے ساتھ پیش آیا۔ جب بادشاہ ہنٹ کے قصبہ میں پہنچا تو وہ ایک مرنہ علاقہ الدین خطرہ میں | ساری رات ”قمر غم“ میں مصروف رہا، دوسرے دن صبح فوجوں کو تقسیم کر کے مختلف سمتوں پر روانہ کیا۔ اس وقت وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر فوجوں کی روانگی کا معائنہ کر رہا تھا۔ عین اس موقع پر اکت خاں ان نو مسلم مغلوں کو جو پہرہ پر متعین تھے ساتھ لے کر بادشاہ پر حملہ کے ارادہ سے بڑھا۔ باغیوں نے تیرہ سالے شروع کر دیئے۔ بادشاہ کے بازو میں بھی ایک تیر لگا اور وہ زخمی ہو گیا لیکن خوش قسمتی سے موسم سرما کی وجہ سے روئی کا موٹا کوٹ پہنے ہوئے تھا اس لیے تیر زیادہ کارگر نہیں ہوئے تاہم سلطان نیم جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اکت خاں نے گھوڑے سے اتر کر چاہا کہ سلطان کا سر کاٹ لے تاکہ سارا قصہ ہی ختم ہو جائے لیکن سرداروں نے اکت خاں کا استقبال کرتے ہوئے دوستانہ باتیں کیں اور عرض کیا بادشاہ کا کام تمام ہوا اب سر کاٹنے کی کیا حاجت ہے۔ اکت خاں پس و پیش میں پڑ گیا اور سیدھا شاہی خیمہ میں جا کر سلطان کے تخت پر بیٹھ گیا، کسی امیر نے مزاحمت نہیں کی اور سب نے نذرانے پیش کیے۔ اکت خاں کم حوصلہ آدمی تھا اس سے صبر نہ ہو سکا اور وہ اسی وقت شاہی حرم سرا میں گھسنے لگا۔ ملک دینار (کافور) اپنی جہنیت کے ساتھ پہرہ پر تھا۔ اس نے اچھے

(بقیہ صفحہ گزشتہ سلسلہ چتوڑ) فیصل ہے جس میں سات دروازے ہیں۔ بلندی پر چٹھے تالاب اور باولیاں بنے ہوئے ہیں اکبر کے حملہ کے وقت اس قلعہ میں آٹھ ہزار فوجی اور چالیس ہزار باشندے تھے مشہور ہے اس قلعہ کو ساتویں صدی مسیح میں چترانگ نامی ایک راجا نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چتر اکوٹ پھر بگڑ کر چتوڑ ہو گیا۔ سولہویں صدی عیسوی تک چتوڑ اودے پور کے راجاؤں کا پایہ تخت رہا۔ تاریخ میں یہاں کے راجپوتوں کی بہادری اور حریت پسندی کے قصے مشہور ہیں۔ علاؤ الدین نے سب سے پہلے ۷۳۳ھ میں اس کو فتح کیا۔ علاؤ الدین کے دور میں حملہ میں ہی پدمنی کا وہ مشہور سانحہ ہوا جو زبان زد عام ہے۔ پدمنی نے پاک داسی کے لیے چتا میں جل کر جان دے دی تھی۔ بعد میں سلطان محمد تغلق کو بھی چتوڑ پر قبضہ کے لیے سخت معرکے لڑنے پڑے۔ اس کے بعد بہادر شاہ وایے گجرات نے سخت لڑائی کے بعد قبضہ کیا۔ پھر اکبر نے غور سے معرکوں کے بعد اسے فتح کیا۔ قلعہ میں بہت سے قدیم محل اور مندر ہیں، ان عمارتوں میں ”جے ہسٹمب“ کا مینار قابل دید ہے، جس کو راجا کھیا نے ۱۴۶۶ء اور ۱۵۲۳ء میں شایان مالوں اور گجرات کی متحدہ فوجوں پر کامیابی کے بعد فتح کی یادگار میں بنوایا تھا۔ اس کی بلندی ۱۲۰ فٹ ہے اس کے فوارے ہیں قطب مینار ۲۳۸ فٹ بلند ہے۔

”قمر غم“ شکار کا نام ہے۔ ایک بڑے احاطہ میں ہرن، بکری، مارہ سنگھاد وغیرہ جو پایوں کو گھیر کر ہانکا جاتا ہے اور شکاری گھوڑوں پر ان کا شکار کرتے ہیں



روک دیا اور کہا جب تک تم بادشاہ کا سر نہ لاؤ گے میں اندر جانے نہ دوں گا۔ ادھر علاؤ الدین جب ہوش میں آیا تو اس کی مہم چلی ہوئی، اس نے دل میں سوچا کہ یقیناً امرا اکت خاں سے مل گئے ہیں ان کی موافقت کے بغیر اکت خاں کی یہ جرات نہیں ہو سکتی، اس لیے اس وقت لشکر گاہ میں جانا خطرہ سے خالی نہ ہو گا۔ اب جو پچاس ساٹھ ہمراہی رہ گئے ہیں ان کے ساتھ افغان خاں کے پاس چھابن میں چلے جانا ہی بہتر ہو گا۔ لیکن بعض سرداروں نے اس کی تائید نہ کی اور اسے مجبور کر کے لشکر گاہ کی طرف لے چلے۔ ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ پچاس سوار اور آکر بادشاہ کے ہمراہ ہو گئے۔ جیسے ہی اکت خاں کو یہ خبر ملی کہ بادشاہ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے، وہ حواس باختہ ہو کر افغان پور کی طرف بھاگ نکلا۔ لشکر والوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ نے اس کے سارے کنبہ کو قتل کر دیا، اس حادثہ میں اس کا بھائی قتلخ خاں بھی مارا گیا۔

اسی زمانہ میں بادشاہ نے دو بھتیجیوں عمر خاں اور لنگو خاں نے بدایوں میں بغاوت کی۔ دو تین شاہی سردار وہاں جا کر ان دونوں کو پکڑ لائے، ان کی آنکھوں میں سلابی پھیر دی گئی۔

**حاجی مولا کی بغاوت** | محاصرہ رتھبور کے موقع پر بھی ایک قابل ذکر واقعہ پیش آیا تھا۔ ملک الامراء کو تو ال کے ایک غلام حاجی مولا نامی نے چند فتنہ پروازوں کو ساتھ لے کر ایک سازش کی۔ وہ بادشاہ کا ایک جلی فرمان لے کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بدایوں دروازہ سے دہلی میں آیا اور وہ فرمان بتا کر کو تو ال شہر ترمذی نامی کو قتل کر دیا اور شہر کے دروازے بند کرادیئے۔ پھر اپنے آقا علاؤ الملک کو جو قلعہ کے کو تو ال تھے کہلایا کہ بادشاہ کے پاس سے فرمان آیا ہے اسے آکر پڑھو۔ علاؤ الملک ہوشیار آدمی تھا وہ اس کے پاس نہیں گیا۔ حاجی مولا نے کوشک لعل میں جتنے قیدی تھے سب کو رہا کر کے انھیں مسلح کر دیا اور انہیں شہر کے خزانہ سے رقم دے کر اپنا موافق بنالیا اور ایک علوی سید بنسہ نامی کو جس کی ماں شمس الدین التمش کی اولاد میں سے تھی کوشک لعل میں تخت سلطنت پر بٹھا کر تمام امیروں سے جبراً نذر دلوائی۔ حاجی مولا کی ان سب حرکتوں کی خبر بادشاہ کو پہنچتی رہی لیکن اس نے ان سب خبروں کو راز ہی میں رکھا اور نہ پائے تخت کی اس شورش پر کچھ زیادہ پریشان ہوا اور پوری دل جمعی کے ساتھ فوج کشی میں لگا رہا۔ حاجی مولا کی سرکشی پر ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ حکم عبداللہ بن جوہر کوٹی کے عہدہ پر فائز تھا اپنے بیٹوں اور ظفر خاں کے کچھ سواروں کو جو امر وہر سے آئے تھے ساتھ لیا

۱۰۲ میل پر ریل کھنڈ ریلوے لائن پر ہے۔ یہ ایک قدیم شہر ہے اسلامی تاریخ میں اس کا تذکرہ ۱۲۰۲ھ سے ملتا ہے جبکہ قطب الدین ایبک نے بدایوں کے قلعہ کو فتح کیا تھا۔ وسط شہر میں سلطان شمس الدین التمش کی یادگار ایک عالیشان مسجد ہے، بڑی نہیں لیکن نہایت خوش منظر اور نفیس ہے، چاروں طرف سے ریل کھنڈ میں ایسی کوئی مسجد نہیں۔ بدایوں قدیم دور میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ یہاں سے بڑے بڑے لوگ ملے ہیں۔ حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء، مشہور شاعر ضیاء الدین بنجشی اور مؤلف کتاب ہذا ملا عبدالغفار بدایونی اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ شہر کے باہر شاہیر علماء و صوفیاء کی قبریں ہیں۔

۱۰۳ میل پر ہے۔ قلعہ مراد آباد میں تحصیل کا صدر مقام ہے آبادی چالیس ہزار مراد آباد سے ۲۳ میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ دہلی سے بذریعہ ریل ۱۲ میل پر ہے۔ امر وہہ گاؤں اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ غیاث الدین بلبن کے زمانہ میں ۱۲۶۵ھ میں کٹھرنی بغاوت فرو کرنے کے لیے اس جگہ آیا تھا۔ امر وہہ کسی اور وجہ سے مشہور ہوا نہ ہو شیخ سدوکی وجہ سے ضرور مشہور ہے ان کا خیالی مزار جامع مسجد کے اندر سے عورتیں گوا شیخ سدوکی صنت مانتی ہیں تاکہ بھیت پریت کا اثر نہ ہو۔ امر وہہ کے قریب ایک دلدل ہے جس میں ایک ندی نکلتی ہے اس کا نام سوت کی ندی ہے، عام طور پر اسے یارو قدار بھی کہا جاتا ہے۔

اور حاجی امید مذکور کو گھیر کر قتل کر دیا اور ان کے سر و تنہوں میں سلطان کے پاس بھیج دیئے۔ سلطان نے ان تمام امیروں کو جو اس غدر میں شریک تھے قتل کر دیا اور اس خیال سے کہ یہ شورش ملک الامراء کے اشارہ سے ہوئی ہوگی اس کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیا۔

منتہور کا قلعہ فتح ہو گیا تو سلطان نے یہ قلعہ الخ خاں کی جاگیر میں دے دیا اور وہاں سے دار السلطنت مراجعت کا ارادہ کیا، لیکن شومئی تقدیر سے انہی دنوں الخ خاں نے وفات پائی۔ منتہور کا قلعہ اس کے لیے گویا شہاد کی جنت بن گیا۔ قلعہ فتح ہونے پر یہاں جاوڑ کے مغرور باغی بھی پکڑے گئے جو قلعہ میں بند تھے۔ ان کا سردار محمد شاہ زخمی تھا، اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا: ”اگر میں تجھے رہا کر دوں اور تیرے زخموں کا علاج کروں تو صحت پانے کے بعد تو میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟“ اس نے بے باکی سے جواب دیا: ”اگر مجھے قابو ملے تو تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اور ہمیر دیو کے بیٹے کو بادشاہ بنا دوں گا۔“ اس کے اس جواب پر سلطان کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ سرکشی اور بغاوت کے اسباب اور باغیوں کی نفسیات پر غور کرنے لگا۔ اپنے تمام وزیروں کو جمع کر کے اس نے پوچھا: ”بغاوت کے محرکات کیا ہیں اور اس کا انسداد کس طرح ممکن ہے؟“ وزیروں اور مشیروں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ ان چار باتوں میں آ جاتا ہے:

اول یہ کہ بادشاہ ملک کے اچھے برے تمام حالات پر نگہبان اور ان سے باخبر رہے۔

دوم یہ کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے اس کو یک لخت موقوف کر دیا جائے۔

سوم یہ کہ امیروں کو ایک دوسرے سے ملنے نہ دیا جائے، وہ ایک دوسرے کے گھر جائیں اور نہ باہم مشورہ کریں۔ چہارم یہ کہ خواہ فوجی ہوں یا رعیت کسی کو دولت کا فراوانی کا موقع نہ دے، سارے فتنے مال و دولت ہی سے اٹھتے ہیں۔

بادشاہ نے یہ چاروں باتیں قبول کر لیں، شراب کی ممانعت تو پہلے ہی کر چکا تھا جس کا ذکر آچکا ہے، بقیہ تین باتوں کے لیے بھی احکام جاری کر دیے۔

**نرخوں کا تعین** | سلطان علاؤ الدین نے کچھ نئے قاعدے اور ضابطے بھی مدون کرائے کہ ایسے قوانین نہ اس سے پہلے کسی بادشاہ نے رواج دیئے تھے اور نہ اس کے بعد، ان قوانین میں شریعت کی موافقت و مخالفت کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا۔ منجملہ ان قوانین کے اشیاء کے نرخ کا تعین بھی تھا۔ سلطان نے غلہ، کپڑا، گھوڑے اور دوسری اشیاء ضرورت کے لیے ایک انڈا نرخ مقرر کر دیا تاکہ خاص و عام باسانی فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کی تفصیل منیا ہرنی کی تاریخ تعمیر و زشاہی ہیں درج ہے۔ اس ارزانی سے رعایا کو بڑی سہولت ہو گئی اور مغلوں کے حملوں کا بھی اس طرح سد باب ہو گیا۔

لے جب مغلوں کے مسلسل حملے ہونے لگے تھے تو علاؤ الدین غلجی کو ان کی روک تھام کے لیے ایک بڑا لشکر ہمیشہ تیار رکھنا پڑتا تھا حسب حساب کیا گیا تو معلوم ہوا اتنے بڑے لشکر پر کافی سے زیادہ خرچ اٹھے گا۔ فوج کے خرچ کو کم کرنے کے لیے اس نے اشیاء کی ارزانی کی یہ تدبیر کا۔ چنانچہ اس نے سوار کی تنخواہ کم مقرر کی اور نرخ ایسا رکھوایا کہ اس تنخواہ میں اس کی گزر ہو جائے۔ اس طرح اس نے پانچ لاکھ سوار بقیہ عاشرہ آئندہ صفحہ پر

ہاں تک ہم نے جو واقعات تحریر کیے ہیں تاریخ کی کتابوں میں ان کی سن وار ترتیب قابل اطمینان نہیں ہے جس طرح لکھا ہوا تھا ہم نے اسی طرح بیان کر دیا۔

**مالوہ پر حملہ** | شہ میں سلطان نے عین الملک شہاب ملتان کی کوڑی بھاری فوج دے کر مالوے کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ مالوے کی رانی کوکانے چالیس ہزار سواروں اور ایک لاکھ پیادوں کی کثیر فوج لے کر عین الملک کا مقابلہ کیا۔ لیکن شکست کھا کر وہاں سے فرار ہو گئی۔ عین الملک نے اس کے ملک کو خوب لٹا اور کافی مال غنیمت لے کر وہاں سے دارالسلطنت کو واپس آ گیا۔ اس قصے کو عین الملک نے بھی نظم کیا ہے۔

بعین الملک اشارت کرد نہ ابرو کہ تا آرد بسوئے مالوہ رُو

**قلعہ سورت پر حملہ** | اسی سال بادشاہ شکار کے ارادہ سے سورت کی طرف گیا قلعہ سورت میں ایک قلعہ پر دوازہ ستلانیو نامی نے ایک کثیر جمیعت فراہم کر کے شورش مچا رکھی تھی اور شاہی لشکر کے قابو میں نہیں آتا تھا۔

(بقیمہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) رکھنے کا باسانی انتظام کر لیا۔ تنخواہ کی شرح دو سو چونتیس ٹنکہ (روپیہ) ایک گھوڑے کے لیے اور تین سو بارہ ٹنکہ دو اسپہ سوار کے لیے تھی اور اشیاء کا نرخ گندم فی من (۱۴ سیر بچتہ) ساٹھ سات جیتل (دو آنے کے مساوی) جوئی من چار جیتل، چاول فی من ۵ جیتل، ناش فی من ۵ جیتل، نخودی من ۵ جیتل، موٹھی من ۳ جیتل۔ اس کے علاوہ ہر چھوٹی بڑی چیز کا نرخ بھی مقرر کر دیا۔ چنانچہ سوئی سے لے کر گھوڑے تک کا نرخ خود بادشاہ نے متعین کیا۔ نرخ کی نگرانی کے لیے مخبر متعین تھے اور خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اصطبل کے ملازم بچوں کو جیتل دے کر بھیجتا تھا۔ اس کے زمانہ میں خشک سالی اور قحط کے وقت بھی یہی نرخ رہے۔ خالصہ کے دیہات سے وہ بجائے نقدی کے محصول میں غلہ لیا کرتا تھا اور خشک سالی میں یہ غلہ شاہی گودام سے مقررہ نرخ پر فروخت کیا جاتا تھا۔ سلطان علاؤ الدین کے بعد یہ سارا انتظام ختم ہو گیا اور اب ایک عرصہ ملازمت پر موجودہ حکومتیں عین نرخ کے لیے حیران دہر گرداں نظر آتی ہیں۔

لے مالوہ۔ یہ خطہ دریائے سپر کے کنارے واقع ہے اس کا دارالسلطنت اجین تھا جو اب گوالیار کی ریاست میں شامل ہے۔ موجودہ آبادی ۳۵ ہزار ہے۔ ملاؤ الدین خلجی کے بعد شہ ۱۲۸۵ء سے ۱۵۳۱ء تک مالوہ کے بادشاہ خود سر رہے۔ شاہ گجرات بہادر شاہ نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ۱۵۵۷ء میں اکبر نے اسے دوبارہ دہلی کے ماتحت کر دیا۔ ۱۶۵۷ء میں اورنگ زیب افنداراشکوہ کی آخری فیصلہ کن لڑائی اسی نواح میں ہوئی تھی۔ ۱۷۹۲ء میں ہوکر مرہٹہ سردار نے اس علاقہ کو غارت کر کے اس میں کوہلا دیا۔ ۱۸۱۸ء تک یہاں مرہٹوں کی عملداری رہی اور یہ سندھیا مرہٹہ کا دارالخلافہ رہا۔ اس کے بعد مالوہ کا پختہ گوادر ہو گیا۔ اجین کو ہندو جیت دن مرکز مان کر طویل عرصہ کا حکم کیا کرتے تھے۔ یہاں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں راجہ جے سنگھ نے ایک رصد گاہ بھی تعمیر کرائی تھی۔ اس وقت شہ کا رقبہ ۶ کوہ ہے۔ قدیم شہر کے کھنڈرات ایک میل کے فاصلہ پر عظمت رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔ سلاطین مالوہ کا تفصیلی حال آگے بیان ہو گا۔

سورت۔ یہ بھی سے ۱۶ میل شمال میں دریائے ٹاپچی کے کنارے پر آباد ہے۔ صوبہ گجرات میں تجارتی و تاریخی حیثیت سے مشہور ہے۔ اسے شاہان گجرات نے ۱۲۹۳ء میں آباد کیا تھا۔ سمندر دریا کے راستہ یہاں سے ۴۴ میل پر ہے۔ یہ شہر تجارتی اغراض کے لیے تعمیر ہوا تھا اسی لیے کسی خطرے پر وہاں تارکے کیا ہے۔ باد آباد بندر سورت۔ اس شہر نے ایسی ترقی کی کہ یہاں ایران، عرب، شام اور روم کے باشندے آکر مقیم ہو گئے۔ اب تک سورت کے محلوں کا نام ان نو وارد قوموں کی یادگار ہیں۔ سترھویں صدی میں سورت پر تگیز، طبع اور دوسرے مغربی تاجروں کی آمد گاہ رہا۔ ۱۲۹۳ء میں انگریزوں کے سفیر نے شہنشاہ ہند سے تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت لی۔ یہ ہندوستان میں انگریزوں کی سب سے پہلی کوٹھی تھی۔ قحط سے ہی عرصہ میں سورت مغربی ہند کا تجارتی مرکز بن گیا اور اس کی آبادی آٹھ لاکھ ہو گئی۔ مرہٹوں نے بھی سورت کو بہت تباہ و برباد کیا۔ ۱۷۳۳ء میں آتش زدگی کی وجہ سے سورت جل کر خاکستر ہو گیا تھا جس وقت بحری تجارت سورت سے بمبئی منتقل ہو گئی تو پھر اس کی رونق بھی جاتی رہی۔ سورت کا قلعہ ۱۵۹۱ء میں سلطان مظفر والی گجرات نے پر تگیزوں کی روک تھام کے لیے تعمیر کرایا تھا۔ کسی شاعر کا مادہ تاریخ ہے:

”سد بعد بہ سینہ مجاہد فرنگی این بنا“

سلطان نے پہلا شکار اسی کا کیا اور اسے گرفتار کر کے جہنم رسید کر دیا۔

**دکن پر ملک کا فور کا حملہ** | ۱۰۶ھ میں جالندیس کے قلعہ کو شاہی سردار کمال الدین کرک نے فتح کیا اور وہاں کے باغی کنیر دیو کو قتل کر دیا۔ ۱۰۷ھ میں سلطان نے ملک کا فور نائب کو کافی ساز و سامان اور بڑے لشکر کے ساتھ مرہٹوں اور تنگوں کے ملک پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ ملک کا فور نے وہاں سے کافی بڑا خزانہ، ہاتھی، گھوڑے، جواہرات، قیمتی کپڑے غنیمت میں حاصل کیے۔

**ورنگل کی تسخیر** | ۱۰۹ھ میں ملک کا فور نے دوبارہ ورنگل پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ ندر دیو کو شکست دے کر بہت بڑا خزانہ، بہتر ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے اس سے ہرجانہ میں لیے اور سالانہ خراج مقرر کر کے آگے بڑھا۔ پھر پورے ملک دکن کو سمندر کے کنارے تک فتح کر لیا۔

۱۱۰ھ میں ملک کا فور دکن کی فتوحات سے فارغ ہو کر دہلی واپس پہنچا اور تین سو بارہ ہاتھی، بیس ہزار گھوڑے ۹۶ ہزار من سونا، جواہرات اور عمارت کے بے شمار صندوق اور ہر طرح کے مال و اسباب کے ذخیرے بادشاہ کے سامنے لاکر ڈھیر کر دیے۔ ان فتوحات کا تذکرہ امیر خسرو نے اپنی کتاب ”خزائن الفتح“ میں کیا ہے۔

سلطان علاؤ الدین کی ان پے در پے عظیم الشان فتوحات کو لوگ علاؤ الدین کی کرامت پر محمول کرنے لگے۔ بعض لوگ اسے جادو اور سحر سمجھتے تھے اور بعض کو یہ یقین تھا کہ یہ ساری فتوحات شیخ نظام الدین اولیاء کی برکت و دعا کا نتیجہ ہیں۔

۱۱۰ھ (ورنگل، ورنکال، ورنگل) یہ سلطنت آصفیہ کا ضلع تھا، اس جگہ پہلے قلعہ کی تعمیر ہوئی بعد میں شہر آباد ہوا۔ یہ قلعہ بارہویں صدی میں راجہ گنپتی روادیو نے بنانا شروع کیا تھا۔ اس راجہ نے ۱۱۹۰ء تا ۱۲۵۸ء تک حکومت کی اس کے بعد اس کی رانی، درامہ دیوی نے ۳۸ سال حکومت کی۔ اس قلعہ کو اسی رانی نے مکمل کر لیا۔ پھر کی فصیوں کی وجہ سے اس کا نام ”ایکا سلانگرم“ پڑ گیا جس کا ترجمہ اموی زبان میں ”راور کا دل“ ہے۔ یہی لفظ بگڑ کر ”ورنگال“ بن گیا۔ ۱۲۹۶ء تک یہاں ہندوؤں کی حکمرانی رہی، ملک کا فور نے ۱۳۰۳ء سے ۱۳۰۹ء تک دوبارہ اس کو فتح کیا تھا۔ ۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق کے بیٹے جو ناخاں نے اس قلعہ پر حملہ کیا تھا۔ ۱۳۲۳ء میں جو ناخاں کے سردار شہاب خاں یا غیاث نامی نے فتح کر کے ہندو سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ آخری راجہ جو گرفتار ہو کر دہلی بھیجا گیا ”پرتاپ رواد“ تھا، مسلمان مورخ اس کو ”لدا دیو“ کہتے ہیں۔ یہ راجہ ۱۳۴۱ء میں فوت ہوا۔ اس کے رے کے لشکر نے ۱۳۴۴ء میں دھار سمدر اور سیانگر کے راجاؤں سے سازش کر کے ورنگل پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳۵۸ء میں محمد شاہ بہمنی نے ورنگل پر حملہ کر کے راجہ کو ماتحت بنالیا۔ ۱۳۷۵ء میں احمد شاہ ولی بہمنی نے یہ علاقہ فتح کر کے گجپتی (ماتحت) راجاؤں کا اقتدار ختم کر دیا۔ اب یہاں کی آبادی (۴۴۸۵۰) سے زائد ہی ہے۔ زبان ملگلی ہے۔ ہزار کھم کی دیول تارینی یادگار ہے، ایک کولہ کی کان بھی ہے۔

۲ علاؤ الدین پہلا حکمران ہے جس کے عہد میں ہما، سے اس کماری تک پورا ہندوستان پائے تخت۔ ہلی کے زیر نگین ہو گیا تھا۔ دوسرا مسلمان بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہے جو کابل سے اس کماری تک پورے ہندوستان کا حکمران تھا۔

۳ اصل نام شیخ نظام الدین تھا، لوگوں میں سلطان نظام الدین اولیاء مشہور تھے۔ بڑے فقیہ اور صوفی گزرے ہیں۔ آپ کے والد احمد بن علی شرف سے آکر بہایوں میں متوطن ہوئے، آپ کی ولادت ۱۳۳۵ھ میں ہوئی، پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے، ۲۵ سال کی عمر میں اپنی والدہ کو لے کر (ماتنی آئندہ صفحہ ہے)



جب ساری قلمرو ہند سلطنت دہلی کے تحت آگئی اور سلطان ان تمام مہمات سے فارغ ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کرائیں اور ان کو علیحدہ علیحدہ علاقے جاگیر میں دے دیے۔ خضر خاں کا نکاح اس کی محبوبہ دیول رانی کے ساتھ ہوا۔ امیر خسرو کی لکھی ہوئی مثنوی جو اس واقعہ کے متعلق ہے ہم آگے تحریر کریں گے۔ خضر خاں کو سلطان نے ”چتر“ اور ”دور باشت“ عطا کر کے اپنا ولی عہد بنایا اور اسے ہستنا پور کے کوہستانی علاقہ کی طرف بھیج دیا۔

**علاؤ الدین کی علالت** | کچھ عرصہ کے بعد ہی سلطان علاؤ الدین بیمار ہوا۔ بڑھاپے نے اسے کمزور کر ہی دیا تھا۔ بہت جلد کئی ایک بیماریاں لاحق ہو گئیں یہاں تک کہ تپ و ق کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ آخر زمانہ میں اس کے حواس خلل پذیر ہو چکے تھے، مزاج پر چڑچڑاہٹ اپن اور بدگمانی غالب آگئی تھی۔

**علاؤ الدین کا انتقال** | خضر خاں کو جب باپ کی علالت کی خبر ملی تو اس نے باپ کی صحت کے لیے منت مانی تھی۔ جب درمیان میں سلطان کو بیماریوں سے کچھ افاقہ ہوا تو وہ ہستنا پور سے دہلی بزرگوں کی زیارت کے ارادہ سے تنگہ پیر آیا اور اتفاق یہ کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاء کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، حالانکہ وہ ان کا بہت زیادہ معتقد تھا۔ ملک کافور کو خضر خاں سے ولی عداوت تھی اس نے اس کی آمد کو بادشاہ کے سامنے رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا اور کہا کہ اس کا ماموں الپ خاں بھی گجرات سے اسی لیے آیا ہوا ہے کہ خضر خاں کو بادشاہ بنا کر خود اس کا نائب بن جائے سلطان اس کے جھلنے میں آگیا اور اسی وقت الپ خاں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ملک نائب کافور اور ملک کنال الدین گرگ نے اس بے گناہ کو شاہی قلعہ میں لاکر بھڑکی طرح ذبح کر ڈالا۔ ملک کافور نے اب بادشاہ کو سمجھایا کہ ماموں کے قتل کی وجہ سے خضر خاں ہراساں اور ناراض ہو گا اس لیے اب اس کو واپس جانے دینا مناسب نہیں، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ خضر خاں امر و ہر چلا جائے اور ہم جب تک نہ بلائیں وہ وہاں شکار میں مصروف رہے۔ خضر خاں نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی۔ کچھ دن بعد اس نے باپ کے پاس عرضی لکھ کر معلوم کیا کہ آخر مجھ سے کون سا ایسا قصور ہوا کہ مجھے اس عتاب کا منراد سمجھا گیا؟ عرضی

دقیقہ حاشیہ مضمون گذشتہ (دہلی آگئے۔ وہاں خواجہ شمس الدین خواہ زمی کی جو غیاث الدین کے وزیر بھی تھے شاگردی اختیار کر لی لیکن اکثر وہ شیخ نجیب الدین متوکل کی صحبت میں رہے۔ یہ بزرگ باوا فرید الدین گنج شکر کے بھائی تھے، ان سے بھائی کی تعریف سن کر جو دہن باوا کی خدمت میں چلے گئے۔ یہاں ہی ان کو خرقہ و درویشی عطا کیا اور دہلی میں رہنے کا حکم دیا۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن مشہور شاعر آپ کے مرید تھے سلطان علاؤ الدین نے خضر خاں اور شادی خاں اپنے دونوں بیٹوں کو بھی سلطان الاولیاء کا مرید کرایا تھا۔ اسی وجہ سے قطب الدین مبارک شاہ آپ کا مخالف ہو گیا تھا اور حکم دیا کہ ہر ماہ آخری تاریخ دربار میں حاضری دیا کریں، لیکن وہ اس تاریخ سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح جب غیاث الدین تعلقہ بنگال میں تھا تو اس نے سلطان نظام الدین کو پیغام دیا ”یا شیخ آنجا باشد یا من“ سلطان جی نے فرمایا ”ہنوز دہلی دور است“ چنانچہ ہنگامہ میں بادشاہ کے دہلی پہنچنے سے پہلے سلطان جی کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ بھی افغان پور کے محل میں دب کر مر گیا۔ خضر خاں نے آپ کی زندگی میں ایک عالی شان مقبرہ بنوا دیا تھا لیکن سلطان جی کی وصیت کے مطابق آپ کو اس کے سامنے دفن کیا گیا اور مقبرہ کو مسجد بنادیا گیا۔ مسجد پر آپ کی تاریخ وفات درج ہے۔

نظام دو گیتی شدہ مابین      سراج دو عالم شدہ بالیقین  
چو تاریخ فوغم بہ زحمت غیب      ندا داد ہاتھ شہنشاہ دین  
مزا پر اس وقت جو مقبرہ ہے اسے اکبری عہد میں سنہ ۹۷۰ میں سید فریدوں خاں نے تعمیر کرایا تھا۔

بیچ کر وہ صاف دلی بٹیا پاپ سے ملنے بے اختیار چلا آیا۔ اسے دیکھ کر محبت پداری نے جوش مارا اور سلطان نے اسے اپنے سینہ سے لپٹا لیا اور اس کے رخساروں کا بوسہ لے کر ماں کے سلام کے لیے رخصت کیا۔ ملک کا فوراً پھر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اور اسے باور کرا دیا کہ خضر خاں پھر بن بلائے برے ارادے ہی سے آیا ہے۔ بادشاہ کی عقل سٹھیا گئی تھی وہ خضر خاں سے دوبارہ بدگمان ہو گیا۔ آخر اسے اس کے بھائی شادی خاں کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قید کرا دیا۔ ان دونوں کو سر سے ٹالنے کے بعد ملک کا فوراً چوتھے شہزادے شہاب الدین کو جو خضر خاں کا سوتیلی بھائی تھا ولی عہد بنا دیا اور اس سے اپنی نیابت کے لیے پختہ عہد کرا لیا۔ اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہی سلطان نے اس دنیا سے فانی سے منہ پھیر لیا۔ اس نے اکیس سال حکومت کرنے کے بعد ۷۱۸ھ میں رحلت کی ۷

علاؤ الدین کہ از مہر علائی سکے بر زر زو جہاں بگرفت زیر ز رکت دست زرافشان  
ز دور چرخ گشت آں سکے دگر گوں ولی آں رہماں شاہ ماندور عالم کہ بیٹی دست گردان  
امیر خسرو اور امیر حسن | علاؤ الدین کے زمانہ کے شاعروں میں امیر خسرو ممتاز اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے علاؤ الدین کے نام پر پانچ کتابیں دو سال کے عرصہ میں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے مجموعہ کا نام ”خمسة“ رکھا۔ خمسہ کی تکمیل ۷۹۸ھ میں ہوئی۔ اس میں ”مطلع الانوار“ کا حصہ دو ہفتہ میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ۷

سال کزین چرخ کہن گشتہ بود از پس کشش صد نو و ہشت بود  
از اثر اختر گردوں خسروام شدد و ہفتہ مہ کامل تمام  
اپنی دوسری کتاب ”نعمات“ میں انھوں نے اپنے متعلق شیخ نظام الدین اولیاء کا قول نقل کیا ہے۔  
”روز قیامت ہر کسے یہ چیزیں باز دو تا ز من بسوز سینہ این ترک اللہ است“  
خسرو کا یہ شعر بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے ۷

خسرو من کوش براہ صواب تات شود ترک خدائی خطاب  
امیر خسرو کا انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا۔ ان کی قبر سلطان الاولیاء کے پائیں ہے۔ مولانا شہاب معنائی نے قطعہ تاریخ  
کہہ کہ لوح قبر پر کندہ کرا دیا ہے ۷

میر خسرو خسرو ملک سخن آں محیط فضل و دیلئے کمال

امیر خسرو خسرو کا تعلق ماورالنہر کے شہر نکش میں متوطن ترک قبیلہ ”لاجین“ سے ہے، ان کے والد سیف الدین قبیلہ کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ سلطان شہاب الدین ایلتوتمش کے عہد میں چنگیزی حملوں سے بچ کر ہند میں آ گیا تھا۔ خسرو کی والدہ بلبن کے وزیر عیاد الملک کی بیٹی تھیں۔ خسرو کی پیدائش ۷۱۵ھ مطابق ۱۲۵۵ء میں شہر پٹیالی میں ہوئی۔ خسرو کا پہلا مربی علاؤ الدین محمد کشیل خاں عرف ”ملک چھوٹا“ ان کی یہ ملازمت ۷۲۴ھ کی ہے۔ بعد میں وہ بلبن کے بیٹے بغیر خاں کے مصاحب بنے جو سامانہ کا گورنر تھا اس کے ساتھ وہ لکھنوتی میں بھی رہے، بعد میں وہ دہلی آئے اور بلبن کے بیٹے سلطان محمد کے ساتھی بن گئے۔ ایک روائی میں وہ مغلوں کی قید میں بھی کچھ عرصہ تک رہے۔ شہزادہ کی شہادت کے بعد وہ اپنی ماں کے پاس پٹیالی میں رہے۔ سلطان جلال الدین کے زمانہ میں وہ ”امیر مصحف“ کے عہدہ پر فائز ہوئے، اس کے بعد وہ سلطان علاؤ الدین کے مدداری شاعر و مدیر خسرو نظام الدین اولیاء کے مرید اور عاشق تھے، علاؤ الدین کے بعد وہ مبارک شاہ کے مصاحب رہے۔ نظام الدین اولیاء کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

نہراؤ و لکش تراز ماع معین      نظم اوصافی تراز آب زلال  
ببل دستاں سرائے بے قریں      طوطی شکر مقال بے مثال  
از پے تاریخ سال فوت او      چوں نہادم سر بنائے خیال  
شد عذیم المثل یک تاریخ او      دیگر می شد طوطی شکر مقال

علاء الدین کے دربار کا دوسرا شاعر امیر حسن تھا، اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے جس سال سلطان محمد نے دہلی کو ویران کر کے دکن میں دولت آباد کو پائے تخت بنایا تھا، امیر حسن کو بھی دولت آباد جانا پڑا اور اسی جگہ اس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر دولت آباد میں مرجع خاص دعام ہے۔

عارف جامی نے ان دونوں شاعروں کے متعلق کہا ہے ۵

آں دو طوطی کہ بنو خیزئی شاں      بود در ہند شکر ریزی شاں  
عاقبت سخرہ افلاک شدند      خامشاں قفس خاک شدند

## سلطان شہاب الدین خلجی

علاء الدین کی وفات کے بعد ملک کافور نے شوال ۷۸۷ھ میں شہاب الدین کو نو عمری میں تخت نشین کیا اور ملک اختیار الدین سنبل کو گوالیار کے قلعہ میں بھیج کر خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کر دیا۔ ان کی والدہ ملکہ جہاں کی حرم سرا بھی لوٹ لی گئی اور اس کو شاہزادہ مبارک خاں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔ کافور ان کی بھی آنکھیں نکلوادینا چاہتا تھا لیکن تقدیر نے ایک اور ہی پانسہ پھینکا۔ مبشر اور بشیر ملکہ جہاں کے ملازم اور قصر ہزار ستون کے محافظ سرور تھے۔ ان دونوں نے ایک رات ملک کافور کو گھیر کر قتل کر دیا اور مبارک خاں کو قید سے نکال کر ملک کافور کی جگہ بادشاہ کا نائب مقرر کر دیا۔ مبارک خاں نے ایک دو مہینے میں تمام امراء کو اپنے موافق بنا کر شہاب الدین کو تخت سے اتار دیا اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ وہ اسی قلعہ میں ۸۸۷ھ میں مارا گیا۔ اس کی مدت حکومت صرف تین ماہ رہی۔ مبارک شاہ نے تخت پر بیٹھنے کے بعد مبشر اور بشیر دونوں سرداروں کو بھی جنہوں نے اسے قید سے رہائی دلائی تھی قتل کر دیا۔

نکو نیک و بد را بد شمار است      بہ پا دانش عمل گیتی بکار است

## سلطان قطب الدین خلجی

مبارک شاہ نے اپنے بھائی شہاب الدین کو ٹھکانے لگانے کے بعد تمام امراء کے اتفاق و تعاون سے ۸۸۷ھ میں

۱۱۷۱ھ فرشتہ نے شمال ۸۸۷ھ لکھا ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ علاؤ الدین کی وفات ۸۸۷ھ میں ہوئی تھی اور دوسرے ہی دن ملک کافور نے شہاب الدین کو تخت پر بٹھایا تھا۔ ۸۸۷ھ یہ سن بھی غلط معلوم ہوتا ہے ۸۸۷ھ میں تو وہ بادشاہ بناتھا ۸۸۷ھ میں کیسے مارا گیا؟

۸۸۷ھ امیر خسرو نے مثنوی ”نہ سپر“ میں تخت نشینی کا نظم کیا ہے ۵

ستہ شانزدہ بعد ہر قصد شدہ      کہ سلطان بہ تخت نہ بر جد شدہ

تحتِ سلطنت پر جلوس کیا۔ اپنے ہوا خواہوں اور مقربوں کو جاگیریں اور منصب عطا کیے۔ سلطان علاؤ الدین کے نائب خاص اور حاجب ملک شادی کے پاس قوم بردار بچہ کا ایک نہایت حسین و جمیل غلام حسن نامی تھا جو مالوہ سے اسیر ہو کر دہلی پہنچا تھا۔ مرحوم سلطان نے بڑی محبت و شفقت سے اس کی پرورش کی تھی۔ مبارک شاہ اس غلام پر دل و جان سے فریفتہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ جیتے ہی اس نے جوشِ محبت میں اس خوبصورت غلام زادہ کو خسر و خاں کا خطاب دے کر عہدہ وزارت پر فائز کر دیا۔ حالانکہ وہ اس ذمہ داری کی اہلیت قطعاً نہ رکھتا تھا۔

گرت مملکت باید آراستہ مدد کار اعظم بنو خاستہ

نخواہی کہ ضائع شود روزگار بنا کار ویدہ مضر مائی کار

چونکہ سلطان قطب الدین نے قید و اسارت کی بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اس لیے اس نے بادشاہ ہوتے ہی تمام قیدیوں کو عام رہائی دے دی۔ ملک فخر الدین کو جس کا لقب محمد عادل تھا اور جو غازی الملک کا بیٹا تھا بادشاہ نے اپنا "میر آخور" مقرر کیا۔ سلطان نے پہلے ہی سال دیوگیر عرف دولت آباد پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن امیروں نے اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ ۱۸ھ میں سلطان نے اپنے کو تو ال قطب الدین کو گوالیار بھیج کر خضر خاں اور شادی خاں کو شہید کرادیا اور خضر خاں کی محبوبہ دیول رانی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

**خضر خاں کا قتل**

جب علاؤ الدین کے خاندان کا یہ حشر ہوا تو کسی نے ایک مجذوب سے پوچھا۔ "آخر یہ کیا ہوا ہے؟" اس نے جواب دیا علاؤ الدین نے جو آگ اپنے ولی نعمت اور محسن چچا کے خاندان میں لگائی تھی اُسی آگ میں اس کا خاندان جل رہا ہے۔

دریں ہر صد گنبد مانوی سخن ہر چہ گوئی ہماں نشینوی

سلطان قطب الدین عیش پسند آدمی تھا اس لیے اس کے عہد میں وہ سارے قاعدے اور ضابطے جو علاؤ الدین نے بڑے تدبیر اور مصلحت سے مقرر کیے تھے درہم برہم ہو گئے۔ ملک میں ہر طرف فسق و فجور کا زور ہو گیا۔

سلطان نے گجرات سے الپ خاں کو واپس بلا کر قتل کرادیا اور اس کی جگہ کمال الدین گرگ کو وہاں متعین کیا لیکن گرگ وہاں

۱۹ھ یہ گجرات کی ایک ادنیٰ قوم ہے جو خدمت گزاری اور معمولی کاموں پر گزراوقات کرتی تھی یہ قلم "بزدل" "مردار" تینوں طرح لکھا گیا ہے۔ ۲۰ھ امیر خسرو نے اس واقعہ پر جو شبنوی لکھی ہے اس کے چند شعر یہ ہیں۔

کہ چوں مبارک شاہ بے مہر ز تمنی گشت بر خویشاں تشرش پھر

نہاں سوئے خضر خاں کس فرستاد نموداری بعد از دل بروں داد

دول رانی کہ در پیشیت کنیز است کنیز ارہ مہر بود ہم سہل چیز است

دول رانی کہ با فرخندگی بود خضر خاں را زلال زندگی بود

بر آمد جان عاشق خوں نشاناں ولی می گشت گرداگرد جاناں

گلی کزدی چکید ی قطرہ خونی نشاندی خوں مدد وئی بروئی

بجائے آب ارناں گل خوں کشیدند نگہ کن تا گلابش چو کشیدند



جا کر شہید ہو گیا۔ اس کی جگہ سلطان نے عین الملک ملتان کو متعین کیا۔ عین الملک نے گجرات کی بغاوت کو ختم کر کے نہروالہ اور گجرات کے دوسرے تمام شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

سلطان قطب الدین نے ملک دینار کی لڑکی کے ساتھ شادی کی اور دینار کو ظفر خاں کا خطاب دے کر گجرات روانہ کیا۔ اس نے اس علاقہ کے نظم و نسق کو عین الملک کی نسبت کہیں بہتر طریقہ پر سرانجام دیا۔

**دیوگیر چھلہ** | سلطان قطب الدین نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ دیوگیر کا رخ کیا، جب لشکر شاہی وہاں پہنچا تو سرکش راجہ ہریال دیو جو راجہ رام دیو کا جانشین تھا اور اس نے دہلی کی سلطنت کو کمزور دیکھ کر بغاوت اختیار کر لی تھی سلطان کا مقابلہ نہ کر سکا اور اسیر ہو گیا۔ سلطان نے اس کی کھال کھینچوا دی۔ دیوگیر سے فارغ ہو کر سلطان نے مرہٹوں پر حملہ کیا اور ان کے ملک پر بھی قبضہ کر لیا۔ خسرو خاں کو ”چتر اور دور باش“ کا اعزاز دے کر علیبارہ پر فوج کشی کے لیے روانہ کیا اور لکھی قوم کے ایک غلام کو اپنا نائب بنا کر دیوگیر میں متعین کر دیا اور دہلی کی طرف مراجعت کی۔

واپسی میں کسی فوجی نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ بغرض خاں کبھی ملک اسد الدین نے یہ سلطان علاؤ الدین کا چچرا بھائی اور ملک غموش کے نام سے مشہور تھا، ساکون کی گھاٹی کے قریب بغاوت کی تیاریاں کر رکھی ہیں اور بادشاہی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اس خبر کے سننے پر سلطان نے اسد الدین پر یلغار کر کے اسے پکڑ لیا اور اسے اسی وقت قتل کر دیا۔ اس کے کنبہ میں آدمی بھی جو اس واقعہ سے قطعاً بے خبر تھے بادشاہ کے حکم سے مارے گئے۔ ان مقتولین میں نو عمر معصوم بچے بھی تھے۔ جہاں میں پہنچنے کے بعد سلطان نے شادی خاں کتھہ سلاح دار کو دوبارہ گوالیار روانہ کیا اور اس نے وہاں جا کر حکم شاہی کے بموجب شہاب الدین کو قتل کر دیا اور خضر خاں اور مقتول شادی خاں کے اہل و عیال کو جو وہاں رہ گئے تھے قلعہ گوالیار سے دہلی لے آیا۔

لے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے خضر خاں کا قتل پہلے ہی ظہور میں آچکا تھا۔ امیر خسرو نے مثنوی ”خضر خاں اور دیول رانی“ میں اس کے قتل کا سبب اس طرح بیان کیا ہے کہ مبارک شاہ نے خضر خاں کو پیغام بھیجا کہ میں تجھے کسی علاقے کا حاکم بنا دوں گا اگر تو دیول رانی کو میرے پاس بھیج دے لیکن خضر خاں نے انکار کیا۔

چو باس ہمسرت این یار جانی  
سرمین دور کن زان پس بدانی  
ارشاد اس جواب پر ناراض ہو گیا ہے

بہ تندی سرسلاخی را طلب کرد  
او اندر گالیوں میں دم نہ پس دیر  
کہ باید صد کردہ امروز شب کرد  
سر شیراں ملک افکن بہر شمشیر  
فرشتہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

مہمل بھیاں رسید شادی کتھہ سردار سلاح داراں را بگو ایار فرستاد تا خضر خاں و شادی و ملک شہاب الدین را کہ قبل ازیں میل در شہم کشیدہ بودند بہ قتل رسانند و اہل و عیال ایشان را بدہلی آورد و سلطان قطب الدین دیول دیوی منکوحہ خضر خاں را داخل محرم ساخت۔  
ضیاء الدین برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں اس شخص کا نام شادی خاں کتھہ سردار سلاح داراں لکھا ہے۔

قلعہ گوالیار گوالیار کا قلعہ ۳۴ فٹ بلندی پر ہے۔ ڈیڑھ میل لمبا اور تین سو گنت چوڑا ہے، دروازہ پر ہاتھی کی صورت کھڑی ہے۔ اس دروازہ کو ہاتھی پوٹ کہتے ہیں۔ قدیم گوالیار قلعہ کے مشرقی جانب پہاڑی کے نیچے ہے یہاں شیخ محمد غوث گوالیاری کی خانقاہ کی قابل دید عمارت ہے۔ سراج محل راجہ مان سنگ نے (۱۵۸۷ء) بنایا تھا۔ اس کے قریب بکر ماجیت، جہانگیر، شاہ جہان کے محل ہیں۔ محلات کا باقی آئندہ صفحہ پر

## سلطان قطب الدین کی بد اعمالی | سلطان قطب الدین حضرت نظام الدین اولیاء سے بھی برگشتہ تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ خضر خاں شیخ کامرید تھا، چنانچہ سلطان نے حضرت کی ضد میں

زبانی حاشیہ بلسلہ گوالیار صفحہ گزشتہ) یہ مجموعہ بڑا دلکش منظر رکھتا ہے۔ مندرجہ بالا بیان ہنر سے ماخوذ ہے، ولفورڈ صاحب کی تحقیق کے مطابق گوالیار کا قلعہ راجہ سورسین نے ۱۲۴۳ء میں بنایا تھا۔ ۱۲۴۳ء میں محمود غزنوی نے اس پر حملہ کیا اور لوٹ گیا۔ ۱۲۹۹ء میں محمد غوری نے اسے فتح کیا۔ ۱۲۱۱ء میں شاہان دہلی کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۲۳۱ء میں شمس الدین التمش نے اسے فتح کیا۔ اکبر کے زمانہ سے یہ امر اور شاہزادوں کے لیے قید خانہ بنا دیا گیا۔ ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق اس کے زمانہ میں بھی یہ قلعہ اسی غرض کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن لارڈ ڈفرن کے عہد میں شہر جھانسی کے عوض اسے سندھیا مرہٹہ کو واپس کر دیا گیا۔ گوالیار آگرہ سے ۱۵ میل پر ہے بابر نے بھی ہتھیاروں کا ذکر اپنی توڑک میں کیا ہے۔ ”در برج ضلع شرقی در ہتھیاروں است پیل را با ہتھی گونید دروازہ را پول۔ بر ایں دروازہ صورت یک فیہے را مجسم کردہ اند و بالائے او فیل یاں ہم ساختہ بعینہ فیل را مشاہدہ اند“ جب اکبر نے قلعہ آگرہ تیار کرایا تو اس کے مغربی دروازہ پر اس کی نقل میں دو ہاتھی مع فیل بانوں کے تیار کر کے جن کو شاہیہاں لال قلعہ دہلی لے آیا تھا۔ عالمگیر نے ان کو بت پرستی کے شائبہ کی وجہ سے علیحدہ کر دیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے دفن کر دیا۔ ان سب میں سے ایک ہاتھی کو جو بچ گیا تھا اور ایک دوسرا تیار کر کے لارڈ کرزن نے قلعہ دہلی کے دروازہ پر کھڑا کر دیا۔ بریئر نے بھی اپنے سفر نامہ میں ان ہاتھیوں کا ذکر کیا ہے وہ ہاتھیوں کے بتوں کو اکبر کے دشمنوں جیل اور قتل کے بت بتلاتے ہیں یہ غلط قیاس ہے کیونکہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں جیل اور قتل کا کوئی ذکر نہیں کیا صرف اتنا لکھا ہے: ”گیتی خداوند قلعہ از سنگ سرخ بر ساخت کہ جہاں دیدگان ہمت لے او نگذارند دروازہ با خرد و فیل سنگیں با پول باناں بس نیکو تراشیدہ اند“ بریئر کے وقت جیل اور قتل کا واقعہ تازہ تھا اسی لیے لوگ ان فیل بانوں کو ان کے بت سمجھتے ہوئے گئے۔ اور یہاں بیرونی نے بھی قلعہ گوالیار کے استحکام کا ذکر کیا ہے۔ قلعہ کے اندر ایک تالاب سورج کنڈ نامی ہے کہتے ہیں ۱۲۳۲ء میں راجہ بسواپتی نے سورج کے ایک مندر کے ساتھ بنوایا تھا۔ مغربی جانب ڈھونڈ دروازہ کے مقابل قلعہ کی حد سے باہر نکلا ہوا دروازہ تاریخی قید خانہ ہے جس میں امراء اور شاہزادے قید رہتے تھے، اس کو ”نوجوگی“ کہتے ہیں تان سین کا مقبرہ بھی اسی قلعہ میں ہے۔ فضل علی نے ”تاریخ گوالیار“ میں جسے اس نے ایک برہمن گھنٹام کی تاریخ سے مرتب کیا ہے بیان کیا ہے کہ یہ قلعہ سمت ۳۳۲ بکر ماجیتی میں بنایا گیا۔ اس کی ایک مشہور روایت یہ ہے کہ اس پہاڑی پر ایک رشی گوالی پانامی رہتا تھا، راجہ سورسین کچھواہ کو جدام ہو گیا تھا۔ ایک زندہ شکار میں اسے پیاس لگی تو وہ اس رشی کے مڑے میں پانی پیئے آیا وہاں پانی پیتے ہی اچھا ہو گیا۔ راجہ نے کہا ”میں شکار نہ میں کیا کروں؟“ رشی نے کہا ”اس پہاڑی پر قلعہ بناؤ اور جس تالاب کا یہ پانی ہے اسے بچتے اور وسیع کر دو“ رشی نے یہ بھی کہا ”آج سے تیرا نام سہمن پال ہے، تیری اولاد میں جو راسی راجہ راج کریں گے، جب تک ان کے نام میں پال ہوگا ان کا نال نہ ہوگا۔ کہ گ رائے کہتا ہے جو راسی دیں راجہ نے اپنا نام بیج کر رکھ لیا۔ یہ راجہ ۱۲۳۳ء میں راجہ انمل کی بیٹی سے شادی کرنے دیا گیا، بیٹی کو وہاں ایک سال لگ گیا، اس کے بھانجے پر مل دیوں پوار نے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور راجہ بن بیٹھا۔ قطب الدین ایک نے اسے فتح کیا تھا لیکن اس کے قبضہ میں نہیں رہا۔ ۱۲۳۳ء میں التمش نے فتح کیا۔ ۱۲۳۳ء سے ۱۲۹۹ء تک مسلمان سلاطین کے قبضہ میں رہا۔ تیمور کی آمد سے پہلے اس پر مورخاندان کے ایک راجہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ ابراہیم لودھی کے زمانہ میں بکر ماجیتی نے ایک سال مقابلہ کے بعد قلعہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ہمایوں کے زمانہ میں پھر بکر ماجیتی کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ ہمایوں کے حملہ سے ڈر کر اس کے گھر والے بھاگ نکلے لیکن ہمایوں نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا، اس احسان کے صلہ میں انہوں نے ہمایوں کو وہ مشہور ہیرا دیا جس کا وزن تین سو تیس رتی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ کوئی نور تھلہ ہیرا ہے علاؤ الدین خلجی کے پاس تھا، رانا کھمبارا راجہ چتوڑ اور سلطان کی لڑائی میں گوالیار کا راجہ رانا کھمبارا کا معاون تھا معلوم ہوتا ہے اس وقت یہ ہیرا اس کے ہاتھ لگ گیا۔ بابر کے وقت رحیم داؤد خاں اور شیخ مہر غوث نے قلعہ کو دہلی قلعہ دار تارخاں سے چھپی لیا۔ قلعہ میں خوبصورت مسجد جو عالمگیری دروازہ کے پاس ہے معتد خاں کی بنوائی ہوئی ہے۔ کرنل سلیمن کہتا ہے: ”یہ مسجد ایسی خوبصورت ہے گویا اس پر سے آج ہی معمار اترے ہیں“۔ سلاطین غلیہ کے زوال پر گوہر کے ایک جٹ رئیس نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۲۳۳ء میں مالدھو کا سندھیا نے اس سے قلعہ چھپی لیا۔ اگر یہی کا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

مندان سے شیخ رکن الدین کو بلا کر دہلی میں ٹھہرایا اور حضرت کے منکر شیخ زادہ جام کو بھی اپنا مقرب بنایا۔

سلطان قطب الدین نے بھی اپنے باپ کی طرح خوں ریزی شروع کر دی۔ ظفر خاں حاکم گجرات کو اس نے بے سبب قتل کرادیا۔ اک لکھی دیوگیر کا سرکش اور باغی سردار تھا خسرو خاں نے اسے گرفتار کر کے دہلی بھیج دیا۔ بادشاہ نے اسے فوراً قتل کرادیا۔ ملک شاہین کو جس کا خطاب و فام ملک تھا لوگوں کے کہنے سے قتل کرادیا۔ اس خوں ریزی کے علاوہ قطب الدین کے مزاج میں بڑا اوچھا پن پیدا ہو گیا، یہاں تک کہ وہ مجلسوں میں عورتوں کا سالباں اور زیور پہن کر آتا تھا اور علانیہ شراب پی پی کر فسق و فجور کے مظاہرے کرتا رہتا تھا۔ شہدے اور مسخرے اس کے اشارہ پر محل ہزار ستون کی چھت پر بیٹھ کر معتبر اور نامور لہجے میں الملک متانی اور قراہیک وغیرہ کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور چھیڑا کرتے تھے، نقیص اتار کر ان کی اہانت کرتے اور مادر زاد ننگے ہو کر بے حیائی کی حرکتیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء کے کپڑوں پر اپنا پیشاب چھڑکتے تھے۔ قطب الدین کی ان بیہودہ حرکتوں سے اس کی تباہی کا سامان خود بخود تیار ہو گیا۔

شاہ زمرے گراں چہ بر خواہد خاست وز مستی بیکراں چہ بر خواہد خاست

سر مست و جہاں خراب و دشمن پس و پیش پیدا ست کز پس میاں چہ بر خواہد خاست

**حسام الدین کی سرکشی** | ظفر خاں کے قتل کے بعد بادشاہ نے حسام الدین کو جو خسرو خاں کا رشتہ میں بھائی ہوتا تھا جمع کر کے وہاں بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں اور ظفر خاں کے زمانہ کے تمام امیروں کو قید کر کے دہلی روانہ کر دیا۔ سلطان اس کی اس حرکت پر کھٹکا ضرور اور ان امیروں کو اسی وقت رہا کر دیا لیکن محض اپنے محبوب خسرو خاں کی خاطر داری کے خیال سے حسام الدین کی باز پرس نہ کی بلکہ اسے کچھ زیادہ مراعات دیں اور قدردانی کا سلوک کیا لیکن یہ ضرور کیا کہ اس کو گجرات سے بلایا اور اس کی جگہ ملک وحید الدین قریشی کو جس کی کوششوں سے اک لکھی گرفتار ہوا تھا گجرات کی عملداری پر بھیج دیا۔

**دکن پر خسرو خاں کا حملہ** | اسی زمانہ میں خسرو خاں نے دکن میں تلنگانہ پر فوج کشی کی اور وہاں کے قلعہ کا محاصرہ کر کے راجہ سے کافی مال و دولت اور ایک سو سے زائد ہاتھی کی نذر لے کر سینٹھلی کی طرف کوچ کیا۔ وہاں سے ۹۲۰ ہاتھی اور چھ مدم وزن کا ایک الماس لے کر ملیبار میں آیا۔ اس وقت اس کے پاس کافی مال و متاع اور

بقیہ حاشیہ سلسلہ گویا یہ صفحہ گزشتہ پہلا قبضہ ۱۸۴۲ء میں ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہاں کی فوج بھی باغی ہو گئی تھی، دو سال پھر انگریزوں کے قبضہ میں آیا پھر آخر تک یہ ریاست پٹیالہ کے ہمارا راجہ کے پاس رہا۔

۱۔ ملیبار یعنی پٹاڑ کو کہتے ہیں، بار معنی ملک کے ہیں، قدیم زمانہ میں اسے "کوالہ" کہتے تھے۔ اب عرصہ دیر بعد یہی نام رکھا گیا ہے، اس علاقہ کی قدیم حد واس کمار سے لے کر سنداپور یعنی گواتیک تھیں انگریزی عہد میں ٹراونکور، کوچین کی ریاستیں مالا بار جنوبی کانٹرا کے ضلع قدیم مالا بار کی حد میں ہیں۔ ساحل مالا بار ۲۵ میل سے ۷۰ میل تک پھیلا ہوا ہے، ساحل کے متوازی کوہ مغربی گھاٹ کا سلسلہ جس کی بلندی تین ہزار سے سات ہزار فٹ تک ہے ہمارے چلا گیا ہے۔ ۱۸۲۷ء میں اس علاقہ کے راجہ چیرامن پیر مل نے اسلام قبول کیا، یہ راجہ ہجرت کر کے عرب کے ساحل ظفار چلا گیا تھا۔ وہاں ۱۸۳۳ء میں مر گیا۔ اس کی قبر ظفار میں ہے۔ اس نے ہجرت سے پہلے اپنے ملک کو اپنے سرداروں پر تقسیم کر دیا تھا ان میں کالی کٹ کا سامری اور ہیلی کا کو لاٹھی بڑے سردار تھے۔ فرشتہ نے لکھا ہے، عراق عرب کے کچھ درویش بابا آدم کے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لاؤ لشکر جمع ہو گیا تھا۔ اس کے سر میں بھی بادشاہی کی دھن سوار ہوئی اور کئی ایک امیروں کو اس نے قتل کر دیا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے ملک تلخیصہ بغداد، ملک تلخیصہ ناگوری اور ملک حاجی نائب نے اس کی سرکشی کا اندازہ کر لیا اور موقع پا کر اسے اغوا کر لیا اور ایک ڈولی میں بٹھا کر سات دن کے اندر دیوگیر سے دہلی میں لے آئے اور بادشاہ سے اس کے فاسداروں کا حال بیان کیا لیکن خسرو خاں نے خلوت میں اپنے عاشق و فریفتہ سلطان کو ناز و نخروں، حیلوں بہانوں سے راضی کر لیا اور اٹا امیروں کے خلاف اسے بھڑکا دیا۔ بادشاہ اس کی اداؤں پر مٹا ہوا تو تھا ہی اس کے کہنے پر یقین کر کے وہ ان ہوا خواہ امیروں سے ملکہ ہو گیا اور ان پر خطاب کر کے انھیں خوب ذلیل و رسوا کیا۔ باوجود اس کے کہ ان امیروں نے سچے گواہ اور شہادتیں پیش کیں لیکن بادشاہ نے باور نہیں کیا اور ان کو گواہوں کو بھی سزا دلوائی، فرزدق عربی شاعر کا یہ شعر یہاں پوری طرح صادق آتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ فرزدق کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہو گیا، دونوں میاں بیوی خلیفہ ہارون رشید کے ہاں فریادی ہوئے۔ جعفر بن یحییٰ نے فرزدق کی سفارش اور حمایت کی اور ملکہ زبیدہ نے اس کی بیوی کی پشت پناہی کی۔ خلیفہ نے زبیدہ کے پاس خاطر ہے اس کی بیوی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس پر فرزدق نے یہ شعر پڑھا:

لیس الشفیع الذی یاتیک متورا

مثل الشفیع الذی یاتیک عربیانا

یعنی وہ سفارشی جو تیرے پاس ازار پہن کر آئے اس سفارشی کے برابر نہیں ہو سکتا جو تیرے پاس برہنہ آتا ہو۔ یہ شعر اس دن سے بطور مثل کے عرب میں مشہور ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ ملیبار صفحہ گزشتہ) قدم کی زیارت کے لیے سرانذیب گئے، راستہ میں سامری کے دار الخلافہ کرنگلور میں قیام کیا۔ راجہ نے پیغمبر اسلام کے معجزے اُن سے سنے اور شوق القمر سے متعلق اپنے پستک نویسوں سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ایک دفعہ چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ ان کی پستک میں درج ہے۔ اس تصدیق سے وہ ایمان لے آیا، بعد میں وہ انہی زائرین کے ساتھ پوشیدہ طریقہ پر جہاز میں بیٹھ کر حضروت کے بند شجر میں چلا گیا اور وہیں مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے مالک بن دینار کے ذریعہ اپنے مقرر کردہ راجاؤں کے پاس وصیت بھیجی کہ عرب تاجروں کو مسجد، سرسے، مکان بنانے کی اجازت دی جائے۔ مالک بن دینار نے راجاؤں کی اجازت سے کرنگلور، گولم، سیلی ماراوی، جرفتن، درفتن، فندریہ، چالیات، وناکنہ، اور بنگلور میں نو مسجدیں بنائیں۔ سرزمین ہند میں خدا کے یہ پہلے گھر تھے جن کے ذریعے اس ساحل ملک میں اسلام پھیلا۔ پرتگیزیوں کی آمد سے پہلے ساحل ملیبار کی سامری تجارت مسلمان تاجروں کے ہاتھ میں تھی۔ ان بطور بھی اس علاقہ پر پہنچا ہے۔ اس کے بعد ان کے مطابق اس وقت تک ملیبار کے راجہ پیرول کی وصیت پر عمل پیرا تھے اور مل جل کر اپنا اپنا کام سنبھالے ہوئے تھے۔ مسئلہ میں ان کے درمیان نزاع ہو گئی، ان میں سے کسی نے یسود کے راجہ سے کمک چاہی اور اسی ہاتھ سے حیدر علی نے جو اس وقت یسور کا نالک تھا اسے شکست دے دی۔ وہ ملیبار پر چلے گئے اور اس کو فتح کر لیا۔ شکستہ میں شیہ سلطان نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے صلح کر کے یہ علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ ملیبار میں مسلمان کافی تعداد میں ہیں مقامی باشندے نائیر ہندو ہیں جو زیادہ تر ہندو ہیں۔

۱۵ تاریخ ابن خلکان میں یہ واقعہ دوسری طرح ہے کہ فرزدق کی بیوی نے عبداللہ ابن زبیر کی بیوی خولہ بنت منظور سے زیان کو اپنا سفارشی بنایا تھا اور فرزدق کے سفارشی حمزہ بن عبداللہ ابن زبیر (جو خولہ مذکور کے بطن سے ہیں) تھے۔ یہ واقعہ عبداللہ ابن زبیر کے سامنے پیش ہوا تھا کہ ہارون رشید نے کیونکہ فرزدق ہارون سے پہلے گزرا ہے اس قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے:

اما نبوہ فلو تسجع شفاعتہم . وشفعت بنت منظور بن زہانا

خلکان کا بیان صحیح ہے۔



خسرو خاں کا اقتدار | اس قضیہ کے رفع ہونے کے بعد خسرو خاں نے دوبارہ اپنی قوم کو دارالسلطنت میں بلانے کی بادشاہ سے اجازت لے لی اور کوشش کر کے ان کو بادشاہ کا مصاحب بنا دیا۔ عیش پسند بادشاہ نے بھی اپنے محبوب پر اوصاف کے گنگن پہ بھروسہ کیا، سلمہ نظم و نسق ان کے حوالے کر دیا اور خود عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔

مصطفیٰ و شمشیر بہ نذاہمت

جام و صراحی عوضش ساختہ

صبح بادہ و جام سے گزرتی ہے شبنم و لآرام سے گزرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گزرتی ہے

اُمراء نے جب یہ رنگ دیکھا اور کوئی چارہ نہ پایا تو مجبوراً وہ خسرو خاں کی خوشامدیں لگ گئے، دربار سرکار میں براؤ بچہ قوم کے لوگ چھا گئے۔ یہ لوگ خسرو خاں کے گھر پر بادشاہ کے خلاف بغاوت کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ قاضی ضیاء الدین نے جن کا خطاب قاضی خاں تھا ایک دن ان سازشوں کی خبر بادشاہ کو دے دی لیکن بادشاہ نشہ ہوس سے ایسا مخمور تھا کہ اسے اچھے بُرے کی تمیز ہی نہیں رہی تھی چنانچہ اس مدہوش نے اسی وقت خسرو خاں کو بلا کر یہ قصہ بیان کر دیا۔ اس نے جواب دیا کہ چونکہ میرے حال پر بادشاہ کی غیر معمولی عنایات ہیں یہ لوگ حسد کے مارے ایسے بہتان لگانے کے درپے رہتے ہیں۔ بادشاہ نے اس کی بات کی دل و جان سے تصدیق کی اور اسے تو شک خانہ خاص وغیرہ کی چابیاں بھی حوالے کر دیں۔ چابیوں کی سواکی کو اس نے پہنے حق میں نیک فال سمجھا۔

آخری عبرت انگیز رات | ایک رات بادشاہ خسرو خاں کے ساتھ بیٹھا شراب کے جام پر جام لٹھا رہا تھا، کافی رات گزر گئی، چوکی پر وہ داسے امیر اپنی اپنی نوبت سے اٹھ کر جا چکے تھے اور قاضی خاں

ہزار ستون کی چھت سے اتر کر دروازوں کی حفاظت اور پرہ داروں کی نگرانی میں مصروف تھا کہ خسرو خاں کا چچا مدہو نامی اپنے آدمیوں کو لے کر چانک آپہنچا اور قاضی خاں کو باتوں میں لگا کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ وہ عریض اسی جگہ جان بحق ہو گیا۔ اس حادثات کی وجہ سے شور و غل ہوا تو بادشاہ نے خسرو خاں سے پوچھا کیا بات ہے؟ وہ دریافت حال کے بہانے اٹھ کر اپنے آدمیوں کے پاس گیا اور بادشاہ کے قتل پر ان کو آمادہ کر کے چلا آیا اور بادشاہ سے کہنے لگا۔ طویلہ کے گھوڑے کھل گئے تھے اور بٹنے لگے تھے بس اسی کا شور ہو رہا ہے۔ اتنے خسرو کا ماموں جابر نامی اپنی جماعت کو لے کر ہزار ستون کی چھت پر چڑھ آیا اور وہاں کے محافظوں کو قتل کر کے بادشاہ کی طرف لپکا، اب بادشاہ کے کچھ مدہوش ٹھکانے آئے اور وہ اس نیمستی کے عالم میں زمانہ محل کی طرف بھاگنے لگا لیکن خسرو خاں نے پیچھے سے سر کے بال پکڑ لیے۔ بادشاہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہا تھا کہ جابر شمشیر بکف آپہنچا اور اس کے پہلو پر وار کیا اور سر کاٹ کر چھت کے نیچے پھینک دیا۔ امیروں نے جب حال دیکھا تو چپکے سے اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ کئی ایک محل کے دروازے پر قتل کر دیئے گئے۔ خسرو خاں اپنے ساتھیوں کو لے کر شاہی محل میں گھس گیا اور فریدوں خاں، منگو خاں شیرخوار شہزادوں کو ان کی ماؤں کی گود سے کھینچ کر ان کے سامنے ذبح کر ڈالا۔ حملہ آوروں

نے عورتوں پر ظلم کر کے ان کے ساتھ جیسا جی میں آیا سلوک کیا اور سلطان علاؤ الدین و قطب الدین کانگ و ناموس دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں مل گیا۔

دگرگوں حال ہو جاتا ہے دم بھر میں زمانہ کا

ان ہنگاموں سے فارغ ہو کر خسرو خاں نے عین الملک ملتان میں فخر الدین جوہا (جو بعد میں سلطان تغلق بنا) ملک و جید الدین قریشی اور قراہیگ کے بیٹوں کو اسی رات بلا کر صبح تک ہزار ستون کے بالا خانہ میں نظر بند کر دیا اور حبس و نکل تو شہر کے تمام اعیان و اکابر کو بلا یا گیا اور دربار سچا کہ خسرو خاں کے نام پر بیعت لی گئی جس کے متعلق بھی مخالفت کا اندیشہ ہوا اسے دھوکہ سے پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ قاضی ضیاء الدین کی بیوی کسی طرف بھاگ گئی لیکن اس کا سارا خانوادہ مدہول کے سپرد کر دیا گیا۔ حسام الدین خاں نے جو خسرو خاں کا سگا ماموں تھا خاں خاناں کا خطاب پایا اور مدہول رائے رایا بن گیا۔ سلطان قطب الدین کے حرم، دوسرے شہزادوں اور مقریین کی عورتوں کو ان لوگوں نے آپس میں تقسیم کر دیا۔ سلطان کی بلکہ سے خسرو خاں نے خود نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ ۱۲۰۷ھ میں پیش آیا۔ سلطان قطب الدین کی مدت حکمرانی چار سال چند ماہ تھی۔

تاجاں بود چنیں بود و چنیں خواہد بود

ہمہ را عاقبت کار چنیں خواہد بود

## ناصر الدین خسرو خاں

پہلے اس کا نام ”حسن بردار بیچ“ تھا۔ ۱۲۰۷ھ میں مبارک شاہ مارا گیا تو اپنے قبیلہ والوں کی حمایت سے اس نے ناصر الدین کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ علاؤ الدین قطبی امیروں نے بھی چار و ناچار اطاعت اختیار کر لی اور اسے بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس انقلاب سے ہندوستان میں اسلامی شعائر کا تزلزل ہونے لگا۔ ہندوؤں کے رسم و رواج ترقی کرنے لگے، علانیہ بت پرستی ہونے لگی، مسجدیں ویران ہونا شروع ہو گئیں۔ خسرو خاں نے حرام و حلال کی تالیف قلب کے لیے اُن خزانوں کا منہ کھول دیا جو علاؤ الدین اور قطب الدین کے وقت سے جمع تھے لیکن اس کی نمک حرامی اور بے دینی کی وجہ سے لوگ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

۱۲۰۸ھ میں خسرو خاں نے علاؤ الدین کی اولاد میں سے ابو بکر خاں، علی خاں اور مبارک خاں کو ہار کر اویار۔ عین الملک اور دوسرے بڑے امراء اور وزراء کو بھی دود و دمانہ علاقوں میں بھیج کر منتشر کر دیا۔

ہندوؤں کا غلبہ

۱۲۰۸ھ میں ناصر الدین برقی مصنف فیروز شاہی نے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح لکھی ہے: ”سلطان قطب الدین جوتے پہن کر حرم کی جانب دوڑا۔ خسرو خاں مفعول“ (بقول مصنف) نے سوچا کہ اگر سلطان حرم میں چلا گیا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے دوڑ کر چھپے سے سلطان کے پیچھے چلے، سلطان نے اسے زمین پر پچھاڑ دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا لیکن حرام زادے نے کسی طرح بھی گیسو نہ چھوڑا۔ اس حال میں چار بار چلا وہاں پہنچ گیا اور اس نے سلطان کے سینہ پر تیر چلایا۔ خسرو خاں کے سینہ پر سے اسے گھسیٹ لیا اور زمین پر گرا کر ذبح کر دیا۔“

امور سلطنت پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا اور مسلمان تباہ و برباد ہونے لگے۔ یہ تباہی ویسی ہی تھی جیسی سلطان سنجر کے زمانہ میں غزوں کی یورش میں رونما ہوئی تھی۔

خسرو خاں نے ہر طرف فرامین روانہ کر کے لوگوں کو اپنا حامی بنانے کی کوشش کی۔ یوسف صوفی براؤ بیچہ کو صوفی خاں اور اختیار الدین سبیل کو حاتم خاں کے خطاب عطا کیے۔ کمال الدین صوفی کو وکیل دربار اور ملک فخر الدین جو ناغازی الملک کے بیٹے کو آخر بیگی کا منصب دیا۔ قرہ قمار کے بیٹے کو عارض الملک کا عمدہ ملا۔ غازی الملک کے بیٹے کی وہ بڑی خاطر داری کیا کرتا تھا غرض یہ تھی کہ اس کا باپ علاؤ الدین کے زمانے کا بڑا نامی گرامی امیر تھا اور اس نے مغلوں کے خلاف بڑے معرکے سر کیے تھے۔ چاہتا تھا کہ وہ دیپال پور سے آکر اس کے پھندے میں پھنس جائے تاکہ کوئی کھٹکا باقی نہ رہے۔ عین الملک ملتانی کو بھی اس نے عالم خاں کا خطاب دے کر اپنے ساتھ ملا لینا چاہا، لیکن وہ اس لالچ میں نہ آیا بلکہ اس نے غازی الملک کو لکھ بھیجا کہ اگر تم مقابلہ کے لیے تیار ہو تو میں معرکہ کارزار میں خسرو خاں کا ساتھ نہیں دوں گا بلکہ اپنے ملک مالوے کو چلا جاؤں گا اور جب سب امیر تمہارے ساتھ ہو جائیں گے تو میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔ غرض کچھ امیر تو ایسے تھے جو منصب اور جاگیر کے لالچ میں خسرو خاں کے حامی ہو گئے اور کچھ اس سے برگشتہ خاطر ہی رہے۔

**غازی الملک میدان میں** جب غازی الملک کو یہ تمام پریشانی کن خبریں ملیں تو اسلامی غیرت اور اپنے آقا کے خون اور عزت و ناموس کی حمیت نے جوش مارا، اس نے خسرو خاں سے بدلہ لینے کے لیے کمر ہمت باندھ لی اور دوسرے امراء سے بھی اس مهم کے لیے مدد مانگی۔ فخر الدین جو نانے بھی اب خفیہ خط باب کے پاس بھیجا کہ اگر آپ گھوڑوں کی ڈاک بٹھادیں تو میں یہاں سے بھاگ آؤں، چنانچہ اس انتظام کے ہوتے ہی اس نے ایک رات اچھڑ اور ملتان کے حاکم بیرام اللہ کے بیٹے کو ساتھ لیا اور دہلی سے نکل کر اپنے باپ کے پاس دیپال پور بھاگ گیا۔ باپ کو بیٹے کے صحیح سلامت چلے آنے پر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی وہ قلعہ سرستی میں دو سو سواروں کو متعین کر چکا تھا۔ جب خسرو خاں کو فخر الدین جو نا کے بھاگ جانے کی خبر ملی تو وہ نہایت پریشان ہوا اور قرہ قمار کے لڑکے کو اس کے

لے فرشتہ نے فرار کا وقت رات کے بجائے دوپہر لکھا ہے۔ ابن بطوطہ بھی دن کا وقت ہی بتلاتا ہے۔  
 لے اچھ۔ اچھ۔ اوچھ: یہ شہر دریائے پنجند کے کنارے ہے اور اب ریاست بہاول پور میں شامل ہے۔ یہاں سے ملتان کا فاصلہ ۱۰ میل ہے۔ پہلے سندھ اور پنجاب کے پانچوں دریا اسی مقام پر آ کر ملتے تھے۔ اب یہ سنگم چالیس میل نیچے مٹھن کوٹ کے قریب ہٹ گیا ہے۔ سنگم صاحب کا خیال ہے کہ یہ شہر سکندر اعظم نے بسایا تھا۔ ناصر الدین قباچہ کے وقت یہ شہر سندھ کا دار الخلافہ تھا۔ بخاری اور گیلانی روایات کی سکونت اسی جگہ رہی۔ سید جلال الدین بخاری اور مخدوم جہانیاں کے مزار اسی شہر میں ہیں۔ ان کے مقبرہ کے دروازہ پر یہ شعر درج ہے: تاریک گشت جہاں بے جلال شاہ تاریخ بود ہفت صد و ہشتاد و پنج سال  
 سنجر الامین نے ان کا سال ولادت لکھا ہے

ہفت صد ہفت ہشتاد و پنج سال بھری بود کاں مہ ہج دیں طلوع بنمود

ابن بطوطہ بھی اوچھ کا ذکر کرتا ہے اس وقت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی عمر غالباً ۲۷ سال تھی۔ ان کو وہ سید جلال الدین حیدری علوی لکھتا ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں برنی کا حوالہ ہے: سید جلال الدین نے ۷۱۰ھ میں فیروز شاہ اور حاکم سندھ جام بانہیہ کے درمیان صلح کرائی تھی۔

تغاقب میں روانہ کیا لیکن وہ قلعہ سرستی تک جا کر لوٹ آیا اور خسرو خاں کو غازی الملک کی تیاریوں کی اطلاع دی۔

**غازی الملک کا حملہ** جب سارا ساز و سامان جمیا ہو گیا تو غازی الملک نے نہایت دلیری اور مردانگی کے ساتھ دیپال پور سے دہلی کی طرف یلغار کر دی۔ خسرو خاں نے اس کے مقابلہ پر اپنے بھائی غانی خاں کو چتر اور دور باش کا اعزاز دے کر روانہ کیا اور صوفی خاں جیسے نالائق اور کمینے امیروں کو بھی ساتھ کر دیا۔ غازی الملک زلمے کے سرد گرم دیکھا ہوا پرانا امیر تھا۔ مغلوں کے مقابلہ میں اس نے فتح و شکست کے بڑے بڑے تجربے حاصل کیے تھے اور نمایاں فتوحات حاصل کی تھیں۔ اوچھا اور ملتان کا حاکم میرام اللہ بھی اس کی مدد کے لیے آگیا تھا، ایسے بھگتے بھگتائے امیروں کے مقابلہ میں خسرو خاں کے بھیجے ہوئے امیر نہایت کم حوصلہ اور ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب تھانیسری میں دونوں فوجیں مقابل ہوئیں تو پہلے ہی حملہ میں غازی خاں نے دشمن کو مار بھگایا اور نمایاں فتح حاصل کی۔ غنیم ہاتھی گھوڑے اور سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گیا، غازی الملک بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا دہلی کے سامنے پہنچ گیا۔

**خسرو خاں بمقابلہ** خسرو خاں نے شکست خوردہ لشکر کو جمع کر کے خزانے کا دروازہ کھول دیا۔ سپاہیوں کو تین تین چار چار ماہ کی تنخواہیں پیشگی دیں، بڑے بڑے عہدے اور جاگیروں کے وعدے

لے کر سرستی۔ قدیم تاریخوں میں سرسہ کا نام سرستی لکھا ہے۔ آئین اکبری میں سرسہ ہے۔ یہ شہر دریائے سرسوتی کے کنارے ہے۔ اسی دریا سے منسوب ہے۔ جو لوگ اسے راجا سارن کے نام سے منسوب کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ پرانا شہر ۱۲۴۲ء کے قحط میں برباد ہو گیا تھا۔ موجودہ شہر ۱۲۴۲ء میں مہاجر تھار پسی نے آباد کیا اس کی آبادی سترہ ہزار ہے۔ پہلے شہر کے کھنڈر موجود آبادی کے جنوب مغرب میں نظر آتے ہیں پہلے یہاں سے دیا گھگر کی ایک شاخ بہتی تھی جو خشک ہو گئی۔ ابن بطوطہ نے یہاں کے چادلوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس وقت شاید حامل اچھا اور بکثرت ہوتا تھا۔ اب یہاں نہیں ہے۔ ۱۲ دیپال پور۔ ضلع منٹگمری میں دریائے بیاس کے قریب پاک پٹن سے ۲۸ میل مشرق کو واقع ہے۔ اوکاڑہ کے اسٹیشن سے ۱۱ میل جنوب میں ہے جنرل کننگھم کی تحقیق ہے کہ اسے راجہ دیو پال نے آباد کیا تھا۔ بطیموس نے جس کو ڈیڈا شہر کا ذکر کیا ہے وہ یہی دیپال پور ہے۔ فیروز شاہ تغلق نے یہاں تک ایک نرنہوائی تھی اور جامع مسجد بھی تعمیر کی تھی۔ غلاموں اور خلیجیوں کے وقت میں یہ شہر پنجاب کا دار الخلافہ تھا۔ چونکہ ملہو اور ملتان کے درمیان تھا اس لیے چنگیز خانی حملوں کی روک تھام کے لیے اس کی بڑی اہمیت تھی، یہاں سے دونوں سمتوں کا باسانی انتظام ہو سکتا تھا۔ پرانے شہر کے کھنڈر جنوب مغرب میں ملتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ خاص شہر تین میل کے رقبہ میں آباد تھا۔ موجودہ شہر کی آبادی چار ہزار ہے۔ تیمور کے حملہ کے وقت یہ ملتان کے برابر کا شہر تھا۔ اس میں ۱۱۰ مسجدیں تھیں۔ باہر کے وقت میں لاہور کے برابر کا شہر تھا۔ ۱۲ ابن بطوطہ کی نام شکو خاں لکھتا ہے لیکن یہ اس کا خطاب تھا نام نہیں تھا۔

۱۳ تھانیسری۔ لاہور سے ۲۲۸ اور دہلی سے ۸۰ میل دریائے سرستی کے کنارے آباد ہے۔ تھانیسری قدیم آریا قلعہ کا پلاٹاؤ ہے۔ اسی شہر سے ہندو مذہب اور تہذیب نے جنم لیا۔ ہندوؤں کی پرانی زیارت گاہ ہے۔ پانچویں صدی ہجری میں (۱۱۷۱ء) سلطان محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ کیا۔ یہاں کی دلچسپ عمارت شیخ چلی کا مقبرہ ہے جو اکبر کے عہد کا بنا ہوا ہے۔ شیخ چلی کا اصل نام عبدالمناقی تھا، بکثرت چلتہ کشی کی وجہ سے ان کو شیخ چلی کہنے لگے۔ ان کے لطیفے بہت مشہور ہیں لیکن یہ سب یارانِ مجلس کے تراشے ہوئے ہیں، وہ ایک عابد و ریش تھے اور بس۔ شیخ جلال الدین تھانیسری (۱۲۹۹ء) کا روضہ اور مسجد بھی ہے۔ شیخ چلی کے مقبرہ میں ایک دینی مدرسہ بھی لگا ہوا ہے۔ تھانیسری ہندوؤں کے مقدس تالاب کلچیتر کی وجہ سے بھی مشہور ہے، اس کا طول ایک میل عرض چھ تھائی میل ہے۔ یہاں دریا سے یاتری غسل کرنے آتے ہیں۔ جہاں بھارت کی مشہور تاریخی جنگ بھی اسی شہر کے نواح میں ہوئی تھی۔ یہ میدان ستر میل لمبا بیس میل چوڑا ہے اور ہندوؤں کے نزدیک بڑی متبرک جگہ ہے۔



جئے۔ خاندان علانی کے جن شہزادوں کو اندھا کر رکھا تھا ان کو مرما ڈالا اور کافی ساز و سامان لے کر دہلی سے باہر نکلا۔ اس کی لشکر گاہ حوض خاص سے اندر پت تک پھیلی ہوئی تھی۔ غازی الملک سلطنت رضیہ کے روضہ میں کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ اس وقت عین الملک عہد و قرار کے مطابق اپنی جمیعت کو لے کر دہار اور اجین کی طرف نکل گیا۔ اس کے اس طرح کٹ جانے سے خسرو کا دل ٹوٹ گیا۔

**خسرو خاں کی شکست** | دوسرے دن لڑائی ہوئی۔ پہلی بار غازی الملک کے لشکر کو شکست ہوئی اور وہ منتشر ہو گیا لیکن غازی الملک نے تین سو سواروں کے ساتھ جو گھات میں چھپے ہوئے تھے یکبارگی خسرو خاں کے فاتح لشکر پر حملہ کر دیا اور اسے پر اگندہ کر دیا۔ ملک تلیغہ اور قمار قرہ کے بیٹے اور خسرو کے دوسرے طرف دار کئی ایک امیر مارے گئے۔ لیکن خسرو بڑی بہادری سے شام تک لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر تلیغہ کی طرف بھاگ گیا۔ چتر شاہی اور دوسرا اسباب شاہانہ جو چند روز کے لیے خسرو کو برائے نام مل گیا تھا غازی الملک کے قبضہ میں آ گیا۔ جب خسرو نے راہ قرار نہ پائی تو تلیغہ سے لوٹ کر اپنے پرانے رفیق ملک شادی کے بلخ میں تنہا چھپ گیا۔ دوسرے دن اس کو بڑے بڑے حال میں پکڑ کر غازی الملک کے روبرو پیش کیا گیا اور اس نے اپنے کیے کی سزا پائی۔

دوسرے دن غازی الملک تلیغہ سے سوار ہو کر سبز کوشک میں آیا اور اسی جگہ قیام کیا۔ دہلی کے خاص و عام آ آ کر اس کو مبارک باد دینے لگے۔ دوسرے دن وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ حرامی خانخاناں بھی کسی باغ میں چھپا بیٹھا ہے، ملک فخر الدین جو ناسے پکڑ لایا۔ غازی الملک کے حکم سے اس کے ناک کان ہاتھ پاؤں کاٹ کر سارے شہر میں پھرایا گیا۔ یہ واقعہ ۷۲۰ھ میں پیش آیا۔ خسرو خاں چار ماہ کچھ دن تخت شاہی پر قابض رہا۔

لہ دہار۔ بحوالہ آئین اکبری، دہار راجہ بھوج کا پایہ تخت تھا۔ پورا راجا جاؤں کا پہلا دارالخلافہ اجین تھا، بھوج نے دہار کو اپنا مستقر بنایا۔ موہو راجہ بھی اپنے آپ کو بکرماجیت کی اولاد جانتا ہے۔ سنہ ۱۱۰۰ھ میں پورا خاندان کمزور ہو گیا اور دکن میں پونا کی طرف چلا گیا۔ مسلمانوں کے وقت میں مارہ کا مال اختلافات دہار ہی تھا بعد میں منڈو مقرر ہوا۔ انگریزوں کے زمانہ میں دہار چھوٹی ریاست تھا۔ آبادی سولہ سترہ ہزار ہے۔ موہو اور بڑوہ کی مرگ پر موہو سے ۳۳ میل مغرب میں ہے۔ بڑوہ سے ۸۳ میل مشرق میں۔ دو سنگ مرنج کی مسجدیں مسلمانوں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔ یہاں کے انگرہ کافی مشہور تھے اور سال میں دو مرتبہ بھیل دیتے تھے۔

۱۱۰۰ھ ابن بطوطہ کی صراحت ہے کہ اس وقت خسرو خاں کا لشکر مال غنیمت لوٹنے میں مصروف تھا۔

۱۱۰۰ھ خسرو خاں پیش ہوا تو اس نے کھانا مانگا اسے کھانا کھلایا گیا۔ پھر اس نے کہا مجھے رسوا نہ کرو اور میرے ساتھ شاہانہ سلوک کرو۔ غازی الملک نے اسی جگہ جہاں قطب الدین قتل ہوا تھا لے جا کر اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش بھت پر سے نیچے پھینکوا دی۔ ابن بطوطہ

# خاندان تغلق

## سلطان غیاث الدین تغلق شاہ

دہلی میں داخل ہونے کے بعد غازی الملک نے تمام امیروں کے اتفاق رائے سے ۱۲۰۷ء میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور غیاث الدین تغلق لقب رکھا۔

تغلق بڑا منتظم اور مدبر شخص تھا۔ اس نے ایک ہفتہ کے اندر ہی سلطنت کے اس درہم برہم کارخانہ کو سنبھال دیا۔ جس تیزی اور ہوشیاری سے اس نے نظم و نسق کی اصلاح کی وہ شاید دوسروں سے سالہا سال میں بھی نہ ہوتے۔ اپنے عزیزوں اور قریبوں کو اس نے مجرے اور منصب عطا کیے، علاؤ الدین اور قطب الدین کے زمانہ کے اکثر امراء کے

لہ ابن بطوطہ کہتا ہے ”تغلق“ قوم سے ترک قرون تھا۔ یہ لوگ ترکستان اور سندھ کے درمیانی پہاڑوں میں رہتے تھے، مارکو پولو نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے: ”قرون ان کو کہتے ہیں جن کے باپ تاتاری اور ماں ہندی ہو، ان کا پیشہ لوٹ مار اور قزاقی ہے، جہاں جلتے ہیں اس علاقہ کو بے چراغ کر دیتے ہیں، ان کا سردار نکودار ہے جو چغتائی کا بھتیجا ہے۔ یہ شخص اپنے چچا کے پاس سے بھاگ کر قرون کے لشکر کو لے کر براہ بدخشاں کشمیر چلا گیا۔ لاہور کو فتح کیا اور مغلوں سے رط تار ہا۔“

دوسری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے پہلے قرون کا طومان (دس ہزار کا دستہ) مغلوں کے لشکر کے ساتھ رہا کرتا تھا بعد میں انھوں نے قزاقی کو اپنا پیشہ بنالیا۔ اس قوم کا اصل مسکن شمالی چین میں قرون جیدن یا خیدن نامی پہاڑ ہے۔ کرنل یول مارکو پولو کی بتائی ہوئی وجہ تسمیہ کو غلط کہتا ہے لیکن خلاصۃ التواریخ کا مصنف لکھتا ہے: ”پدر سلطان ترک زاد با اسم تغلق از غلامان سلطان غیاث الدین بلبن و مادر از قوم جاٹ پنجاب بود۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرون کے لفظ سے ابن بطوطہ کے سادی نے یہی مراد لی ہے کہ سلطان تغلق دو غلا تھا اور جو کچھ مار کو لوٹنے وجہ تسمیہ لکھی ہے صحیح ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”تغلق“ اس کی قوم کا نام نہیں بلکہ اس کے باپ کا نام تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں شمس سراج عقیف نے لکھا ہے: ”میں تغلق شاہ کے نسب کا حال اپنی کتاب ”مناقب سلطان تغلق“ میں لکھا ہوں۔ اس لیے یہاں نہیں لکھتا۔“ اس کتاب کا کوئی پتہ نہیں چلتا وہ اگر سستی نہ کرتا تو تغلق کا کل حال معلوم ہو جاتا۔ تغلق کے سکون پر سلطان غیاث الدین و الدین والدین ابو المظفر تغلق شاہ السلطان ناصر امیر المومنین ”درج ہے۔ اس کے بیٹے کے سبب ”المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ“ ”الواجی رحمۃ اللہ محمد بن تغلق شاہ“ ثبت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تغلق قوم کا نام نہیں یا تو خود غیاث الدین کا نام تھا یا اس کے باپ کا۔ تغلق کے ترکی زبان میں لغوی معنی ”پہاڑی“ کے ہیں اور یہ پشتو کے لفظ ”رہیلہ“ کے مترادف ہے۔ فرشتہ کا کہنا ہے: ”میں نے بادشاہ تغلق کے نسب کی بابت لاہور اور دوسرے شہروں میں ہر چند تحقیقات کی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔“ نوادر المعانی میں ”تغلق“ اور ”قتلخ“ کے معنی ”اوسط“ اور ”میان“ لکھے ہیں۔ قتلخ کے یہ معنی درست ہوں گے۔ کیونکہ الخ خاں اور اکت خاں کے علاوہ بعض امیر ”قتلخ خاں“ خطاب کے بھی ملتے ہیں لیکن ”تغلق“ کوئی علیحدہ مستقل لفظ ہے، اب بھی متان کے مصنفات میں تو نے خاں (یعنی تغلق خاں) کا کثرہ موجود ہے۔

ساتھ مہربانی کا سلوک رکھا اور ان کو بھی جاگیریں عطا کیں۔ ان سارے انتظامات کے بعد قلعہ تغلق آباد تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ تیس سال میں تیار ہوا۔ جب قلعہ تیار ہو گیا تو وہاں ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر بدر شاشی شاعر نے قلعہ تعمیر کی تاریخ ”فادخلو“ نکالی جو بلاشبہ یہ ایک نادر تاریخ ہے۔ سلطان نے ان تمام لوگوں کو جن کے مشورے سے خضر خاں قلعہ الدین کی ملکہ سے عقد کیا تھا اور جو اس کی سرکش قوم کے مددگار بنے تھے سب کو متزائیں دیں۔ اپنے بیٹے ملک فخر الدین کو جس کے قیادہ سے ہی شاہانہ صلاحیتیں جھبکتی تھیں انخ خاں کا خطاب چتر وغیرہ شاہی اعزازات دے کر اپنا ولی عہد یا اور بہرام اللہ کو جسے سلطان تغلق نے اپنا بھائی بنایا تھا کشلو خاں کا خطاب دے کر پورے سندھ اور ملتان کا حاکم بنا دیا۔ دوسرے چار بیٹوں کو بہرام خاں، ظفر خاں، محمود خاں اور نصرت خاں کا خطاب عطا کیا۔

**انخ خاں کی فوج کشی** | ۱۲۱ھ میں تغلق نے انخ خاں کو چندیری، بدالیوں اور پورب کے دوسرے شہروں کی فوجیں دے کر دیوگیر اور ملنگانہ کی مہم پر روانہ کیا۔ انخ خاں نے دیوگیر پہنچ کر وہاں کی متعینہ فوج کو بھی اپنے ساتھ لیا اور اس سارے لاؤ لشکر کے ساتھ یلغار کرتے ہوئے قلعہ ارنگل کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ گزشتہ سات سو برس سے رائے سردر جہادیو اور اس کے آباؤ اجداد کے تصرف میں تھا۔ انخ خاں نے قلعہ کے باہر کا کچھ حصار بہت جلد فتح لیا اور قریب تھا کہ وہ اندر کے سنگین حصار کو بھی فتح کر لے کہ اس عرصہ میں دہلی کی ڈاک آنے میں خاصی تاخیر ہو گئی۔ مفصل و ہما خاں مشغول ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ شہنشاہ زادہ و مشقی اور عبید شاعر نے یہ خبر اڑائی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس

تغلق آباد۔ یہ قلعہ اور شرق قطب صاحب سے چار میل مشرقی جانب متھرا کی سڑک سے متصل واقع ہے۔ نیم دائرہ کی شکل میں بنا ہوا ہے۔ محیط چار میل سے ایک فیر لنگ کم ہے۔ نیم دائرہ کا قاعدہ جنوب کی طرف ہے۔ اس کا طول ایک میل ہے، نیچے بند باندھ کر ایک جھیل بنائی ہے، پہاڑ کی چٹان کو تراش کر اس کے اوپر قلعہ کی فصیل بنائی گئی ہے، میدان سے کل اونچائی ۹۰ فٹ ہے۔ جنوب مغربی گوشہ میں قلعہ اور شاہی محل تھے، اس کے قریب ہی خلیفہ الدین تغلق شاہ کا مقبرہ ہے جو جھیل کے وسط میں ہے۔ یہ مقبرہ سنگِ سرخ اور سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ نیچے سے گنبد کی چوٹی تک ۸۰ فٹ بلند ہے، گنبد کا قطر باہر سے ۴۴ فٹ ہے۔ کہتے ہیں دونوں باپ بیٹے ایک ہی مقبرہ میں آسودہ ہوئے۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ شہنشاہ واقع سندھ میں مراٹھا وہاں سے اس کی لاش غالباً دہلی لائی گئی تھی۔ قلعہ میں اب گوجروں کی آبادی ہے۔ اس کے احاطہ میں مسلمان زمینداروں کے گھر ہیں، یہ لوگ خود کو تغلق کی اولاد بتاتے ہیں۔ لکڑیاں لا کر دہلی میں فروخت کرتے ہیں۔ بہادر شاہ وقت میں یہ لوگ شاہ جہاں آباد کے قلعہ میں لکڑیاں فروخت کرنا کسر شان سمجھتے تھے خواہ کتنی ہی قیمت دی جائے وہاں ہرگز نہیں جلتے تھے۔ یہ شہر پٹنہ تھانڈی کے کنارے تھا اب ایک گاؤں رہ گیا ہے۔ گوالیار سے ۱۰۵ میل آگرہ سے ۱۷۰ میل اور دہلی سے ۲۸۰ میل پر پہاڑی پر ایک سنگین قلعہ اب بھی موجود ہے۔ بابر نے اس قلعہ کا مفصل بیان اپنی ترک میں اور ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ یہ قلعہ چودہ ہزار سنگین مکان میں سو چھتراسی باناتین سو ساٹھ گھراؤں اور بارہ ہزار مسجدیں تھیں۔ اس تعداد میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ہے کہ اس شہر میں ایک خندہ اس قدر بڑا تھا کہ نقارہ بجنے کی آواز اس سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ بابر کہتا ہے: ”میں نے اس شہر میں گھڑی میں فتح کر لیا تھا۔ انگریزوں نے جہانسی کے عوض یہ شہر لے لیا تھا۔“

شاعر۔ پیش نظر نسخہ (کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی) میں تو نہیں المبتداؤنی کے بعض دوسرے نسخوں میں ”عبید شاعر زاکانی“ ہے۔ زاکانی اور عبید ایک شخصیت نہیں ہیں۔ عبید زاکانی ایران کا مشہور مسخرہ جو گو شاعر ہے۔ جو ابواسحاق شاہ شیراز کے دربار میں تھا۔ اس کا نام بھی اسی کے قریب ہے۔ فرشتہ نے وضاحت کر دی ہے کہ ”ابن عبید زعبید شاعر مشہور است یہ عبید امیر خرم کا“ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

خبر سے لشکر میں بڑا اضطراب پھیل گیا۔ عبید نے امراء لشکر کو بھی خوب بہکایا کہ انہی خاں تم لوگوں کی فکر میں ہے۔ لشکر کی اس پریشانی سے غنیم نے بروقت فائدہ اٹھایا اور قلعہ سے نکل کر حملہ کیا اور بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ ملک تلگین اور دوسرے امیروں نے انہی خاں سے غداری پر کمر باندھ لی۔ ملک تلگین تو پچاس سواروں کو ساتھ لے کر فوراً ہی دہلی بھاگ گیا اور دوسرے امیر بھی اسے چھوڑ کر اپنے اپنے علاقہ کی طرف نکل گئے۔ ان میں سے ملک تلگین ملتان اور جیسلمیر کے درمیان پکڑا گیا۔ تاج الدین طالقانی اور اس کا داماد جو قید خانہ سے نکل بھاگا تھا، ہر وندی کے کنارے گرفتار ہوا۔ عبید شاعر کو بھی بڑی مشکل سے گرفتار کر کے لایا گیا۔ ان سب کو ان کے ساتھیوں سمیت ہاتھی کے پاؤں سے پکڑا دیا گیا۔ چونچ گئے وہ جہاں تھے مارے گئے۔

۱۲۳ھ میں انہی خاں نے دوبارہ تلنگانہ کا رخ کیا۔ انہی کا راجہ رائے سدر مہا دیو پھر قلعہ بند ہو گیا۔ اس مرتبہ انہی خاں نے بیرونی حصار کو فتح کر کے راجہ کو مع اس کے ساتھیوں کے گرفتار کر لیا اور وہاں عامل مقرر کر کے مال غنیمت جو ہاتھیوں، جواہرات اور دوسرے قیمتی سامان پر مشتمل تھا، راجہ سمیت دہلی روانہ کر دیا۔ انہی کا نام سلطان پور رکھ کر خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

۱۲۴ھ میں بنگالہ کے حاکم کی شورشوں کی خبر ملی تو خود سلطان تغلق نے اس طرف توجہ کی اور انہی خاں کو تغلق بابا، بنگالہ کی مہم، ملی اور انہی امور کی نگرانی کے لیے اپنا نائب مقرر کر دیا۔

جب سلطان لکھنوتی پہنچا تو وہاں کا حاکم سلطان ناصر الدین اور اس نواح کے تمام راجہ اور امرار استقبال کے لیے آئے۔ تغلق نے ناصر الدین کو چتر دودھ، باش اور سلطنت کے اعزاز دے کر دوبارہ اسے لکھنوتی کی حکومت کا پروانہ عطا کیا۔

رقیبہ حاشیہ بسلسلہ عبید صفحہ گزشتہ (مخالف تھا۔ جب امیر خسرو نے نظامی کے جمنہ کے جواب میں اپنا "جمنہ" لکھا تو اس نے یہ شعر،

غلط افتاد خسرو را نہ خامی کہ سگ پا پخت در دیگر نظامی  
امیر خسرو نے بھی اپنی تصنیفات میں اس عبید اور سعد فلسفی کی کئی جگہ شکایت کی ہے۔ عبید نظم کافی کا حال "تذکرہ دولت شاہ بمرقندی" میں درج ہے۔ اس کے حق میں مشہور شاعر سلمان ساوجی نے یہ کہا، کیونکہ زاکان قزوین کے پاس ایک گاؤں ہے۔  
جہنمی و ہجا گو عبید زاکانی مقرر است بہ یہ دولتی و بیہ دنیا  
اگرچہ نیست ز قزوین ز دستاراد است ولیک فی شود اندر حدیث قزوینی  
دولت شاہ کا بیان ہے۔ ایک دن خواجہ سلمان ساوجی کے پاس زاکانی گیا، سلمان نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ کہا قزوین سے۔ سلمان نے کہا، تم کو سلمان کا کوئی کلام یاد ہے؟ عبید نے اس کا یہ قطعہ پڑھا۔  
من خرابایم و بادہ پرست در خرابات مغاں عاشق و مست  
مے کشند چو سب و دوش بدوش مے برندم چو قدح دست بدست  
قطعہ پڑھ کر کہا یہ شعر خواجہ سلمان کے نہیں معلوم ہوتے غالباً خواجہ کی بیگم نے یہ قطعہ کہا ہو۔ سلمان یہ سن کر شرمندہ ہو گئے اور مجھ گئے یہ شخص عبید زاکانی ہے۔

۱۲۵ھ لکھنوتی۔ قدیم نام گور تھا۔ بنگال کے ہندو اہل اول کا دارا سلطنت تھا۔ بعض کا خیال ہے شہر کا نام لکھنوتی یعنی لکھنوتی تھا اور علاقہ کا نام گور بنگالہ تھا۔ ۱۲۵ھ میں جب مسلمانوں نے بنگال کو فتح کیا تو اپنا دارا حکومت اسی کو بنایا۔ تین سو سال تک مسلمان بادشاہ اسی جگہ رہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)



اور فتح نامہ دہلی بھیجا۔ لکھنؤی سے تعلق نے ظفر آباد کے حاکم تاجا خاں کو جسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا فوج کشی کے

بقیہ حاشیہ بسلسلہ لکھنؤی صفحہ گزشتہ) درمیان میں بعض بادشاہوں نے پنڈو کو جسے حضرت پنڈو بھی کہتے ہیں اور وہ گور کے قریب ضلع مالہ میں واقع ہے، اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ فیروز آباد بھی اسی شہر کے قریب تھا۔ فیروز شاہ نے ۱۵۵۷ء میں لکھنؤی پر حملہ کیا تو اس کا نام فیروز آباد رکھا تھا دشمن سراج عقیف، لیکن یہ غلط ہے کیونکہ اس سے پہلے کے سکوں پر بھی "فیروز آباد" درج ہے۔ قیاس ہے کہ سلطان شمس الدین فیروز بن ناصر الدین بھیرا بن بلہن کارکھا ہوا ہے۔ جب گنگا کی وہ شاخ خشک ہو گئی جس پر یہ شہر آباد تھا تو دلدل کی وجہ سے شہر کی آب و ہوا بگڑ گئی۔ اس وقت سے بنگال کے بادشاہوں کا پائے تخت تبدیل ہو گیا۔ ۱۵۵۷ء میں شیر شاہ نے اسے لوٹ لیا تھا۔ ۱۵۵۷ء میں منعم خاں خان خاناں اکبر کے سپہ سالار نے یہاں حملہ کیا تھا۔ آب و ہوا کی خرابی سے اس کے لشکر میں وبا پھیل گئی اور خان خاناں بھی مر گیا۔ کہتے ہیں اس کے بعد سے گور بالکل ہی اجڑ گیا لیکن ابوالفضل کی آئین اکبری سے اس کی تردید ہوتی ہے اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے جب شاہ شجاع نے راج محل کو بنگالہ کلدار لکھنؤ بنایا تو گور ویران ہو گیا اور پھر آباد نہ ہو سکا۔ قدیم کھنڈرات ۲۵ - ۲۳ مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں جن سے بازاروں، مسجدوں اور محلات کا نشان ملتا ہے۔ اُبڑنے کے بعد یہاں گھنا جنگل ہو گیا تھا، انگریزوں نے جنگل کاٹ کر اس جگہ کی اینٹوں سے انگریز آباد، مرشد آباد، مالہ اور پرانیہ کی عمارتیں بنائیں۔ کھنڈر بتاتے ہیں کہ کبھی یہ شہر قدیم کلکتہ سے کم نہیں تھا، کم از کم چھ سات لاکھ کی آبادی ہوگی۔ فصیل کی بنیاد شمال کی طرف سو فٹ چوڑی تھی، خندق سوا سو فٹ سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ فصیل کے شمال مشرقی کنارہ پر جس محل کے کھنڈر ہیں وہ چار سو گز لمبا اور چار سو گز چوڑا تھا۔ اس کو راجہ بلال سین کا محل کہتے ہیں۔ فصیل کے باہر کی آبادی کے کھنڈروں میں ایک تالاب اب بھی موجود ہے یہ سولہ سو گز لمبا، آٹھ سو گز چوڑا تھا۔ اس کو ساگر ڈکی کہتے ہیں۔ دیواریں پختہ اینٹوں کی اور پانی نہایت صاف شفاف ہے۔ قلعہ کے پاس جو تالاب پیاس یاڑی نام کا ہے اس کا پانی کھاری ہے۔ کہتے ہیں یہ تالاب قیدیوں کے استعمال کے لیے بنایا گیا تھا۔ ابوالفضل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ قلعہ اور پیاس یاڑی کے درمیان سنہری مسجد ہے جو ۶۰ گز لمبی، ۲۰ گز چوڑی اور ۲۰ گز اونچی ہے۔ کہتے ہیں اس کی چھت میں ۳۴ گنبد تھے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے "جنت آباد پرانا شہر ہے پہلے پائے تخت تھا، اس کو لکھنؤی کہتے تھے۔ ہمایوں بادشاہ نے اس کا نام جنت آباد رکھا۔ یہاں ایک نہایت عمدہ قلعہ ہے۔ مشرق میں ایک تالاب "چھیتا بہتا" ہے۔ اس میں بہت سے ٹاپر ہیں۔ اگر اس کا بند ٹوٹ جائے تو سارا شہر ڈوب جائے۔ شہر کے شمال میں ایک کوس کے فاصلہ پر ایک عمارت ابدا ایک حوض ہے جس کا پانی نہر کی خاصیت رکھتا ہے۔ اس حوض کو پیاز (پیاس) یاڑی کہتے ہیں۔ جن قیدیوں کو قتل کرنا ہوتا تھا ان کو وہاں رکھا جاتا تھا۔ وہ یہ پانی پی پی کر تھوڑے ہی دنوں میں مر جاتے تھے۔ ہمارے بادشاہ نے اس کی ممانعت کر دی ہے۔ شیخ انصاری سراج کی خانقاہ بھی گور میں تھی۔ آپ سلطان المشائخ نظام الدین اولیا کے خلیفہ تھے۔ یہ خانقاہ ساگر ڈکی کے قریب شمال مشرقی گور تھے۔ پھر بعد ایشور کے موضع میں ہے۔ آپ کا انتقال ۱۵۵۷ء میں ہوا۔ باہر کے دروازہ پر جو کتبہ ہے اس پر ۱۵۵۷ء درج ہے۔ یہ دروازہ حسین شاہ سلطان بنگال کا بنایا ہوا ہے۔ خانقاہ غالباً سکندر شاہ کی بنائی ہوئی ہے۔ کتبہ کی جگہ خالی ہے۔ کلکتہ کے عجائب گھر میں گور کی جو اینٹیں ہیں ان پر غیاث الدین بن سکندر شاہ کا نام لکھا ہوا ہے۔ تاریخ سات سو پر کچھ معلوم ہوتی ہے۔ کنگم صاحب کا خیال ہے یہ اینٹیں اس کتبہ کی جگہ کی ہیں، ممکن ہے درست ہو، لیکن یہ محض قیاس ہے۔ یہ غیاث الدین سکندر شاہ کا بیٹا تھا اور وہ بادشاہ ہے جس نے شیراز سے خواجہ عافظ کو آنے کی دعوت دی تھی۔ آپ نے ایک غزل بھیج کر معذرت کی۔ اس غزل کا شعر ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطی ن ہند  
زین قند پارسی کہ بہ بنگال می رود

یہے رعانہ کیا۔ تاتار خاں نے سنار گاؤں کے حاکم بہادر شاہ عرف تورہ کو جو کچھ عرصہ سے خود مختار بن بیٹھا تھا گرفتار کر کے پابجولاں اس کے تمام ہاتھیوں سمیت بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔

## تغلق کی وفات

مندرجہ بالا فتوحات کے بعد تغلق بہادر شاہ مذکور کو ساتھ لے کر دہلی واپس ہوا۔ یہ سفر اس نے نہایت سرعت کے ساتھ طے کیا، چنانچہ دو دو منزل پر پٹاؤ کرتے ہوئے کوچ کیا جاتا تھا الخ خاں نے سلطان کی آمد کی خبر سن کر تغلق آباد سے تین کوس کے فاصلہ پر افغان پور میں ایک بہت بڑا اور بلند قلعہ نما محل میں دن کے اندر تیار کرایا تاکہ بادشاہ اسی جگہ رات میں قیام کرے اور صبح کو نیک ساعت دیکھ کر تغلق آباد میں داخل ہو۔ چنانچہ بادشاہ نے حسب انتظام اسی محل میں جا کر قیام کیا، وہاں استقبال کے لیے الخ خاں تمام امیروں کو لے کر آیا اور ضیافت کا بڑا شانہ انتظام کرایا۔ اس جگہ وہ ہاتھی جو بنگلے سے آئے تھے بادشاہ کے حکم سے دوڑائے گئے۔ محل چونکہ نیا بنا تھا ہاتھیوں کے دوڑنے سے دہل گیا۔ بادشاہ نے محل کے اندر کھانا کھایا۔ لوگوں کو چونکہ یہ اطلاع تھی کہ کھانا کھاتے ہی فوراً سوار ہو جائیں گے اس لیے محل میں جتنے لوگ دسترخوان پر حانہ تھے کھانا کھاتے ہی ہاتھ دھوئے بغیر ہی سواری کے انتظام کے لیے جلد ہی باہر چلے آئے، البتہ بادشاہ ہاتھ دھونے کے انتظار میں بیٹھا رہا، لیکن اچانک چھت گر پڑی اور اس کو جان سے ہی ہاتھ دھونے پڑے۔

اس واقعہ کے متعلق عوام میں مشہور ہے کہ الخ خاں نے قصداً اس کی دیواریں اندر سے کھوکھلی رکھی تھیں۔ اتنی جلدی نیا محل تعمیر کرنے سے شبہ ہوتا ہے کہ عوام کا خیال ممکن ہے سچ ہو۔ تاریخ فیروز شاہی میں اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔

لہ سنار گاؤں۔ غالباً یہ شہر ہندوؤں کے زمانہ سے مشرقی بنگال کا دار الحکومت چلا آتا تھا۔ تاریخ میں اس کا ذکر پہلی بار مغیث الدین طغرل کے ذکر میں ملتا ہے کہ جب اس نے بلین سے بغاوت کی تو بھاگ کر سنار گاؤں چلا گیا۔ اس وقت وہاں کا راجہ ذریج رلے تھا، بلین سے اس کی صلح ہو گئی تھی۔ یہ علاقہ لکھنؤ سے کافی دور تھا۔ برسات میں دریاؤں کی طغیانی سے وہاں جانا دشوار ہو جاتا تھا اس لیے یہاں کے حاکم شاہان دہلی یا شاہان بنگالہ سے باغی ہو جاتے تھے۔ ابن بطوطہ بھی سنار گاؤں گیا تھا۔ اس نے وہاں کے باغی فخر الدین عرف فخر و کا ذکر کیا ہے جب یہ شہر بسا گیا تھا تو دریائے برہم پتر اور میگنا کے اتصال پر دونوں کے درمیان تھا اور بنگال کی دونوں سمتوں کے لیے دریائی سفر کا مرکز بن گیا تھا۔ بڑا تجارتی مقام تھا۔ اب اس جگہ ایک گاؤں "پے نام" رہ گیا ہے۔ پرانے شہر کے کھنڈر بید کے جنگل میں پوشیدہ ہیں۔ بید کا جنگل اس قدر گھنا ہے کہ پیدل آدمی بھی بمشکل وہاں جاسکتا ہے۔ یہ مقام ڈھاکہ سے پندرہ میل پر برہم پتر کے کنارے دو میل اندر کی طرف ہے۔ شاہی دور میں وہاں بنگال کا بادشاہ عیسیٰ خاں اکبر کے حملوں سے بچنے کے لیے جا کر رہ گیا تھا۔ اس زمانہ میں ایک انگریز سوداگر راجہ فتح محمد دہلی آیا تھا وہ لکھتا ہے: "سنار گاؤں میں سارے ہندوستان سے اچھا روٹی کا کپڑا تیار ہوتا ہے" ابو الفضل نے بھی آئین اکبری میں وہاں کے کپڑوں کی تعریف کی ہے۔ یہاں سے قریب ایک قصبہ "گیارہ سدر" ہے وہاں ایک حوض ہے جس کے پانی کی تاثیر یہ ہے کہ کپڑا اس میں دھویا جائے تو اس میں رڑی مٹاتی اور سفیدی پیدا ہو جاتی ہے "ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس جگہ ایک کوٹھی بنائی تھی۔ یہ جگہ اب آم اور پان کے لیے مشہور ہے۔ یہاں کا شاہ سندور یہ آم اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے اور کافی پان تمام ہندوستان میں جاتا ہے۔ یہاں کا وہی بھی بہت مشہور ہے۔ شیر شاہ کی مشہور جنگ جو ایک شرمع ہوتی ہے اسی جگہ آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس جگہ سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کا مقبرہ ہے جس نے خواجہ حافظ کو بلایا تھا۔

لہ قسرافغان پور۔ اس محل کے متعلق دو خیال ملتے ہیں۔ بدایونی کے الفاظ ہیں: "از ساختن این چہنیں قصرے کہ بیچ ضروری نبود لیے آن محل آمد کہ الخ خاں قصر را محوت ساختہ باشد چنانچہ مشہور در عوام است" یہی رائے ابو الفضل اور مصنف طبقات نامری کی ہے لیکن ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ یہ محل الخ خاں نے اپنی خواہش سے نہیں بلکہ بادشاہ کے حکم سے بنوایا تھا۔ اس لیے اس کو غیر ضروری نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن ابن بطوطہ محلی کی ساخت (دانی حاشیہ آئندہ صفحہ)

باغ رہے کہ اس کا مصنف فیروز شاہ کا طرفدار ہے۔

**بہنوز ولی دُور است** | یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا۔ غیاث الدین نے کل چار برس کچھ ماہ تک حکومت کی۔ ہندوستان کے عوام میں یہ بھی مشہور ہے کہ غیاث الدین کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء سے رنجش تھی۔ اس نے لکھنوتی سے دہلی آتے ہوئے شیخ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ ”اب کی بار دہلی میں یا میں رہوں گا یا نظام الدین“ اس کے جواب میں شیخ کی زبان سے نکلا: ”بہنوز ولی دُور است“ اسی دن سے یہ قول ضرب المثل بن گیا۔ امیر خسرو کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ ان کی سب سے آخری تصنیف ”تغلق نامہ“ ہے جو اسی بادشاہ کے نام پر لکھی گئی۔

## سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ

سلطان غیاث الدین تغلق کی وفات کے بعد الخ خاں نے تمام امیروں کے اتفاق اور تائید سے سلطان محمد عادل کے لقب سے ۷۲۵ھ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا اور چالیس دن تک باپ کا ماتم کرتا رہا۔ اس کے بعد قدیم شاہی محل

البقیہ راشیہ قصر افغان پور صفحہ گذشتہ کے متعلق لکھتا ہے: اس کی بنیاد لکڑی کے ستونوں پر اس طرح رکھی گئی تھی کہ اگر اس کے ایک خاص موقع پر ہاتھی کھڑا کیا جائے تو تمام مکان گر پڑے۔ جو ناخاں نے بادشاہ سے کہا: اے اتھو نہ عالم نماز عصر کا وقت قریب ہے آئیے نماز پڑھیں۔ سب لوگ باہر نکل آئے، محل میں صرف بادشاہ اور اس کا لاڈلا شہزادہ محمود رہ گیا۔ اس وقت ہاتھی کو اس خاص مقام پر لایا گیا۔ ہاتھی کا وہاں پہنچنا تھا کہ سارا مکان ایک دھماکا سے بادشاہ اور شہزادہ کے سر پر گر پڑا۔ جو ناخاں نے لمبے ہٹلنے میں بھی تاخیر سے کام لیا۔ جب طبع کھودا گیا تو بادشاہ اپنے بیٹے پر جھکا ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا اس کو بچانے کے لیے اس کو اٹھاتا چاہتا ہے۔ بعض کہتے ہیں بادشاہ اس وقت زندہ تھا لیکن اس کا کام تمام کر دیا گیا اور اسے راتوں رات تغلق آباد کے مقبرہ میں لے جا کر دفن کر دیا گیا (سفر نامہ ابن بطوطہ) ابن بطوطہ نے اس پر اسرار علی کے مہار کا نام احمد بن یاز لکھا ہے جو بادشاہ کا میر عمارت تھا اور محمد تغلق شاہ (الخ خاں) نے اپنے عہد میں اسے خواجہ جہاں کا لقب عطا کیا تھا غالباً اسی (حسن خدمت) کے عہد میں۔ فرشتہ اس روایت کو کہ مکان ادا تھا اس قسم کا بنایا گیا تھا تسلیم نہیں کرتا اور وہ تاریخ حاجی محمد قندھاری کی اس روایت کو کہ ”بجلی گری اور مکان گر پڑا“ کو ترجیح دیتا ہے۔ ضیا الدین بھٹی نے بھی ”فیروز شاہی“ میں یہی لکھا ہے لیکن ابن بطوطہ کے راوی فیض رکن الدین ملتانی ہیں وہ اس واقعے کے وقت تغلق کے پاس موجود تھے۔ انھوں نے خود ابن بطوطہ سے بیان کیا کہ ”وہ عصر کے لیے محل سے نکل آئے اور جب شور مچا تو نماز پڑھے بغیر چلے آئے“ ان شیخ کا بھی یہی خیال ہے کہ ”مکان ایسی صنعت سے بنایا گیا تھا کہ جس وقت ہاتھی اس مکان پر پڑے تو وہ فوراً گر پڑے“ عہد جہاں گجراتی نے اس صنعت کو طلسم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ پچھلے سب مورخ ضیا الدین بھٹی کو الزام ہے کہ اس نے ادا تھا فیروز شاہ کی خاطر سے جو اپنے چچے بھائی سلطان محمد تغلق کا ممنون احسان اور مداح تھا اصل کیفیت بیان نہیں کی اس کے انجنیر خواجہ ایاز کو وزیر اعظم بنا دینا اور تمام زندگی میں اس کی قدر افزائی کرنے کو بھی ابن بطوطہ اور اس کے راوی نے ایک محبت کے عہد پر پیش کیا ہے۔ ان حالات میں بجلی کے گرنے کا قصہ محض بہانہ ہے۔ اگر یہی سبب تھا تو شیخ رکن الدین ملتانی اس کا ابن بطوطہ سے ذکر کرتے اور لوگوں سے بھی یہ بات پوشیدہ نہ رہتی۔ سیرالتخریر میں درج ہے: ”شیخ رکن الدین ملتانی ہر کے ملاقات سلطان داراں قفر رفتہ بود و برزوا لیا و برخواستن سلطان استیصال می نمود و سلطان فہم نہ کرد چوں شیخ برخواست قصر بر سلطان فرد آید“ سلطان محمد تغلق شیخ رکن عالم پر بڑا احسان رکھتا تھا یہاں تک کہ اس نے اپنے باپ کا مقبرہ جو قلعہ ملتان میں ہے جس میں شیخ رکن عالم کا مزار ہے شیخ کو عنایت کر دیا تھا۔ ایک موقع پر گاؤں بھی لگے تھے دیئے۔ یہ مہربانیاں بھی غالباً شیخ کا منہ بند رکھنے کے لیے ہوں۔ اس مہربانی کے باوجود شیخ نے ابن بطوطہ سے صحیح واقعہ بیان کر دیا تھا اور تمام مورخوں سے ان کی رائے ہی زیادہ درست ہے۔

اس نے یوں منعقد کر کے کافی روپیہ خیرات کیا۔ اس نے اپنے چچا ناد بھائی ملک فیروز کو جو بعد میں سلطان فیروز کے نام سے تخت نشین ہوا اپنا نائب مقرر کیا۔ دوسرے امیروں کو بھی اپنے مذاہب پر تہتی دی۔ چنانچہ حمید لوبکی بادشاہ کا مقرب بن گیا۔ ملک فیروز نے نیز کو عمار الملک، ملک خرم کو ظہیر الدین، ملک پندار غلی کو قدر خاں اور ملک اعز الدین یحییٰ کو اعظم الملک کا خطاب ملا۔ اعظم الملک کو ست گاؤں کا علاقہ جاگیر میں ملا۔

**۱۲۷ء** | **وکن پر فوج کشی** | بادشاہ نے دیوگیر کی طرف کوچ کیا۔ دہلی سے دیوگیر تک ہر کوس پر ڈاک چوکی مقرر کی گئی۔ ہر منزل پر ایک خالقاہ اور مسافر خانہ بنوایا گیا۔ ہر مسافر خانہ میں ایک ملا متعین رہتا تھا۔ مسافروں کے لیے طعام و قیام کے سارے اسباب مہیا رہتے تھے اور چوکی داروں کو تاکید کر دی گئی تھی کہ مسافروں کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہونے پائے۔ ان خالقاہوں کے آثار برہسوں تک باقی رہے۔

**دار الخلافہ کی منتقلی** | سلطان نے دیوگیر پہنچ کر اس کا نام دولت آباد رکھا اور یہ سوچ کر کہ دیوگیر مملکت کے وسط میں ہے اسے اپنا دار السلطنت بنالیا۔ دہلی سے اپنی والدہ مخدومہ جہاں کو مع اہل و عیال کے اور دوسرے سب امیروں، لشکر کے سرداروں اور غلاموں کو دولت آباد بلالیا اور سارے خزانے بھی منگوا لیے۔ مخدومہ جہاں کی وجہ سے بہت سے سید مشائخ اور عالم بھی دولت آباد چلے گئے۔ بادشاہ نے سب کے انعام اور وظائف دگنے گنے کر دیئے۔ خانہ دیرانی کی مصیبت بڑی ہوتی ہے، دہلی کے بسے بسے گھرانے اُجڑ کر دولت آباد گئے تو لوگوں کو بڑی پریشانیوں اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بیمار اور ضعیف آدمی تو راستہ ہی میں سفر کی صعوبتوں سے جاں بحق ہو گئے۔ جو پہنچے وہاں اُن کا رہنا مشکل ہو گیا۔ ان مصیبت زدوں سے اگر کوئی نام پوچھتا تو ان کا یہ حال تھا کہ وہ زبان حال سے میر تقی میر کا یہ قطعہ ادا کرتے تھے۔

دہلی جو ایک شہر تھا رشکِ چین کبھی رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے مار کے دیران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

**۱۲۸ء** کے آخر میں فوج کے بخشی ملک بہادر گر شاہ نے دہلی میں بغاوت کی لیکن ملک احمد ایاز خواجہ جہاں نے اسے

لے کر شاہ سپ۔ ابن بطوطہ اس کا پورا نام بہادر الدین گشتاسب لکھتا ہے۔ یہ سلطان تغلق کا بھانجا تھا۔ اس نے قتل کے مرتبے کے بعد محمد عادل کی بیعت قبول نہیں کی۔ جب خواجہ جہاں نے شکست دی تو اسے کبیلہ (بیجا نگر کے پاس اسلام پوری کا مقام) کے پاس بھاگ گیا۔ شاہی لشکر نے کبیلہ کا محاصرہ کر لیا۔ رائے کبیلہ نے مقابلہ کیا اور جب بچاؤ کی صورت نہ رہی تو اس نے گر شاہ سپ کو تو ایک اور راجہ کے پاس بھیج دیا۔ اس کی سورتیں الاڈ میں جل کر مر گئیں اور راجہ نے چند بہادروں کے ساتھ شاہی لشکر سے مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ یہاں سے فارغ ہو کر شاہی لشکر نے گر شاہ سپ کو پناہ دینے والے راجہ پر حملہ کیا۔ اس راجہ نے اسے پا بہ زنجیر بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ نے اس کی کھال کھنچوا کے ٹھوس پتھر وادیا۔ مندرجہ بالا سارا بیان ابن بطوطہ سے ماخوذ ہے۔ جس راجہ نے گر شاہ سپ کو گرفتار کر دیا اس کا نام ابن بطوطہ نے نہیں لکھا ہے۔ "رہ برٹ سول" اس کا نام بلال دیو بتاتا ہے۔ یہ پیوز کے قریب تاقہہ کا راجہ تھا اور ہوسیا خاندان کا تھا۔ گر شاہ سپ اس کے پاس "عسکریہ" میں گیا تھا۔ "بداؤلی" نے جیسا کہ مٹی میں ذکر ہے "عسکریہ" میں یہ واقعہ لکھا ہے اور اس کی گرفتاری دہلی ہی میں بتاتا ہے۔ اس کے برخلاف فرشتہ کے بیان سے ابن بطوطہ کی تصدیق (نقشہ اگے صفحہ ۱۲۷)



شکست دے کر گرفتار کر لیا اور بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں اسے بغاوت کی سزا دی گئی۔

**بیرام اللہ کی بغاوت** | دوسری بغاوت ملک بیرام اللہ نے جیسے سلطان تغلق اپنا بھائی کہا کرتا تھا ملتان میں برہا کی۔ جب بادشاہ نے اسے لانے کے لیے علی خطیطی کو اس کے پاس بھیجا تو اس نے

علی کو قتل کر دیا۔ بادشاہ اس فتنہ کو دبانے کے لیے دولت آباد سے کوچ پر کوچ کرتا ہوا دہلی آیا اور شب و روز بے یار کرتے ہوئے دہلی سے ملتان پہنچا۔ بیرام نے جم کر مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور قتل ہو گیا۔ اس کا سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ بیرام کی سرکشی کے بدلے ملتان میں قتل عام کرانا چاہتا تھا لیکن حضرت شیخ رکن الدین نے اپنی دستار اتار کر بادشاہ سے سفارش کی اور پچارے ملتان والوں کی جان بچی۔

از ابتدائی دور آدم تا زمان بادشاہ

از بزرگان عقویودہ و از فرودستان گناہ

سلطان نے ملتان قوام الملک کے حوالہ کیا اور دہلی مراجعت کی۔ چند دن بعد اس کی جگہ ملتان کی حکومت پر بہزاد کو روانہ کر دیا۔ بہزاد کو شاہرود بھی پٹھان نے بغاوت کر کے قتل کر دیا۔ جب بادشاہ شاہرود کو سزا دینے کے لیے دیپال پور پہنچا تو وہ بھاگ کر پہاڑوں پر چلا گیا۔ سلطان دہلی واپس آ گیا۔

**مغول کا حملہ** | ۱۵۱۹ء میں ترمہ شیریں مغل نے جو قتلغ خواجہ کا بھائی تھا دہلی پر یورش کی۔ یہ قتلغ خواجہ وہی ہے جس نے اس سے قبل ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ ترمہ شیریں نے لاہور، سامانہ اور

(بقیہ گر شاسپ صفحہ گذشتہ) ہوتی ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے ”بہاؤ الدین گر شاسپ بادشاہ کا عم زاد بھائی تھا اور ساگر کا صوبہ اڑ تھا۔ اس نے بغاوت کی تو دہلی سے خواجہ جہاں اس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ دولت آباد میں لڑائی ہوئی، دو دفعہ خواجہ جہاں نے شکست کھائی اس لیے خود بادشاہ دولت آباد گیا لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی خواجہ جہاں نے رلے کمپیلہ اور گر شاسپ کو شکست دے کر اسے بلال دیو کے ملک میں بھاگ دیا تھا۔ بلال دیو نے اسے شاہی لشکر کے حوالے کر دیا۔ خواجہ جہاں نے اسے قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دستکش کدہ پر کاہ ساختہ و در شہر گردانید۔“ اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے دولت آباد کو دار الخلافہ بنانے کا حکم دیا۔ بہر حال محل کا قلعہ مزید مستحکم نہیں ہو سکتا۔ غیا برنی نے اس بغاوت کا ذکر تک نہیں کیا البتہ وہ بہاؤ الدین کو تغلق شاہ کی بن کار کا بتاتا ہے یہی بن بطوطہ نے بھی کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اس کو شاہ افغان لکھا ہے۔ بدافنی اور فرشتہ شاہ افغان لکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے ”جب وہ دشوار گزار پہاڑوں پر بھاگ گیا تو بادشاہ نے خضر میں اپنے اہلکاروں کو لکھا کہ جہاں کہیں کوئی پٹھان ہو پکڑ لیا جائے۔ یہی قاضی جلال الدین کی بغاوت کا سبب بنا۔“ فرشتہ نے اس بغاوت کا زمانہ وہ لکھا ہے جب بادشاہ ۱۵۱۹ء میں دکن سے واپس آتا ہوا گجرات میں بیمار ہو گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”بادشاہ نے خضر میں کشتی سے پاکی میں سوار ہو کر بیماری کی حالت میں چلا آیا“ ابن بطوطہ اس کو سب بغاوتوں کے آخر میں بیان کرتا ہے۔ غرض شاہ افغان کی یہی وہ بغاوت ہے جس کی وجہ سے گجرات اور دکن کے امیران صدی جو جموؤا افغان تھے باغی اور مخوف ہو گئے اور اس کا سلسلہ دکن میں من کا نکولی کی ہمینی سلطنت کے قیام پر جا کر ختم ہوا۔ بدافنی ۱۵۲۹ء سے پہلے اس بغاوت کا ذکر کرتا ہے لیکن دکن کی تاریخوں میں قیاس ہوتا ہے کہ یہ بغاوت ۱۵۲۲ء کی ہے جبکہ جامی اللہ فی ۱۵۲۲ء میں بادشاہ سندھ گیا تھا۔

۱۵۲۹ء میں قیام زمانہ میں یہ راجپوت فرمانرواؤں کی راہدہانی تھا۔ مسلمان چوتھی صدی ہجری کے آخر میں یہاں آئے جبکہ سلطان محمود غزنوی نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں اس کی اولاد میں سے خسر و شاہ نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

اندھڑی سے بدایوں تک بہت سے قلعے فتح کر لیے اور اس علاقہ میں بڑی لوٹ مار مچائی لیکن جب ان کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر بڑھا تو سب چھوڑ چھاڑ لٹے پاؤں بھاگ گئے۔ بادشاہ نے کلاتور تک ان مغلوں کا پیچھا کیا اور وہاں کا قلعہ ڈھلنے کے لیے مجید الدین پورجا کو متعین کر کے دہلی واپس آ گیا۔

**سلطان کی سخت گیری** | سلطان کو دو آئبہ کے درمیانی علاقہ کی رعایا سے بھی سرکشی اور بغاوت کی سخت شکایات تھیں اس لیے اس نے ان پر بھاری خراج لگا دیا۔ اس علاقہ کی غریب رعایا پر عمال نے بھی طرح طرح کے ظلم توڑنے شروع کر دیئے۔ ان کے مظالم سے تنگ آ کر لوگ وہاں سے بھاگ گئے جس سے سارا علاقہ اجڑ گیا جو لوگ باقی رہ گئے انھوں نے قزاقی اور لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنالیا۔

**دہلی کی خانہ ویرانی** | بادشاہ نے دوسرا سخت حکم دہلی والوں کو یہ دیا کہ جو بھی لوگ شہر میں دولت آباد جانے سے روکے ہیں وہ سب کے سب اور دہلی کے گرد و نواح کی ساری رعیت بھی دولت آباد منتقل ہو جائے۔ بادشاہ نے سارے مکانات خریدیے شاہی خزانہ سے ان کی قیمت لوگوں کو ادا کی۔ اس طرح دولت آباد تو خوب آباد ہو گیا لیکن دہلی ایسی اجڑی کہ وہاں کتوں اور بلیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔

**تانبے کا سکہ** | سلطان کی ان انوکھی تدبیروں سے خزانہ بالکل ہی خالی ہو گیا۔ تلافی کے لیے اس نے تانبے کے سکے کو رواج دیا اور اس کی قیمت چاندی کے سکے کے برابر رکھی۔ جو اس شرح پر لینے میں تامل کرتا تھا اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس کا رروائی سے بھی ملک میں بڑی خرابی اور انتشار پھیل گیا۔ مفلس اور شہر پسند لوگوں نے اپنے اپنے

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ لاہور صفحہ گزشتہ بتایا۔ اس کے بیٹے خسرو ملک تک غزنوی خاندان کی حکومت رہی۔ سندھ کے بعد یہ پہلا شہر ہے جہاں اسلامی حکومت کی داغ بیل پڑی۔ غوریوں کے عہد میں دہلی کے حکماء اختلاف ہو جانے سے لاہور کی رونق ماند پڑ گئی۔ لاہور کی موجودہ آبادی کا آغاز اکبر سے ہوتا ہے جس نے دسویں صدی ہجری میں پختہ فضل اور ایک خوبصورت قلعہ بنا کر اسے صوبہ پنجاب کا مرکز بنایا۔ جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانہ میں بھی یہاں عالیشان عمارتیں بنائی گئیں۔ مغلوں کے ضعف کے بعد یہاں سکھوں نے قبضہ کر لیا اور ہمارا جہ رنجیت سنگھ کی حکومت قائم ہوئی ۱۷۶۱ء میں انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ مشہور عمارتوں میں مسجد وزیر خان ۱۵۶۵ء بہ عہد شاہ جہاں، سنہری مسجد ۱۶۳۳ء بہ عہد محمد شاہ، حضور ی باغ بادشاہی مسجد ۱۶۵۵ء بہ عہد عالمگیر، قلعہ بہ عہد اکبر شاہ، شالامار باغ ۱۶۴۲ء بہ عہد شاہ جہاں، مقبرہ جہانگیر ۱۶۳۱ء بہ عہد شاہ جہاں، تاریخی اور قابل دید مقامات ہیں۔

لے دہلی کی بربادی۔ یہ حکم ۱۵۲۹ء میں دیا گیا اس سے پہلے ۱۵۲۷ء میں جو منتقلی عمل میں آئی تھی اس میں زبردستی نہیں کی گئی لیکن اس مرتبہ جبراً اور حکماً لوگوں کو دہلی سے نکالا گیا۔ فرشتہ نے بھی یہی واقعات لکھے ہیں۔ ضیاء البینی نے دہلی چھوڑنے کا یہی سبب لکھا ہے کہ بادشاہ نے دولت آباد کو اپنی سلطنت کا وسط سمجھ کر اسے دار الخلافہ بنانا چاہا تھا لیکن ابن بطوطہ نے جو اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد دہلی پہنچا تھا اس نے لکھا اور سبب بتایا ہے: "لوگ دہلی بادشاہ کی خونریزی اور قتل سے نالاں تھے، رقبے لکھ لکھ کر ان پر مہر لگاتے تھے اور نفاق پر لکھتے تھے کہ بادشاہ کے سر کی قسم کہ سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہ کھوے اور یہ رقبے رات کو دیوان خانہ میں ڈال جایا کرتے تھے۔ جب بادشاہ ان کو کھوتا تھا تو اس نام گالیاں درج ہوتی تھیں، اس لیے بادشاہ نے دہلی سے اجاڑنے کا ارادہ کیا۔" آگے کتا ہے: ایک معتبر بادی نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ ایک رات اپنے محل کی چھت پر چڑھا اور شہر کی طرف دیکھا تو اس کو آگ، دھواں یا چراغ کچھ نظر نہ آیا۔ بادشاہ نے کہا اب میرا دل ٹھنڈا ہوا۔ یہ سبب کسی اور مورخ نے نہیں لکھا ہے ممکن ہے کچھ یہ بھی وجہ ہو لیکن اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوب اور شمال دونوں کے وسط میں مرکزی مقام کو مستقر بنانا چاہتا تھا تاکہ شمال کے حملہ آوروں اور دار السلطنت محفوظ رہے مگر یہ اس کی فاش غلطی تھی۔

گھروں میں نکالیں بنالیں۔ وہ تانبے پر سکے لگا کر بازار سے سونا چاندی گھوڑے ہتھیار اور ہر طرح کا عمدہ سامان خرید لیتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان لوگوں نے کافی دولت پیدا کر لی۔ غیر ملک کے پر دینی چونکہ تانبے کے سکے کو کسی صورت میں بھی قبول نہیں کرتے تھے اس لیے بہت سے کاروبار مندرے ہو گئے۔ جب یہ تشویشناک صورت حال پیدا ہوئی تو سلطان نے حکم دیا کہ جس کے پاس تانبے کا سکہ ہو خزانہ میں داخل کر دے اور اس کے عوض چاندی کے سکے لے جائے۔ اس حکم کے ہوتے ہی لوگوں نے منوں تانبہ خزانہ میں داخل کر دیا اور ڈھیروں چاندی معاوضہ میں حاصل کر لی۔ اس بہانہ سے لوگوں کے ہاتھ کافی دولت آگئی اور بادشاہ خزانہ تانبے سے اٹ گیا۔

۳۸۱ء میں سلطان نے کوہ ہماچل کی تسخیر کے لیے اسی ہزار سواروں کی ایک فوج کو روانہ کیا۔ کوہ ہماچل چین اور ہندوستان کے درمیان حائل ہے۔ اسے کوہ قراچیل بھی کہتے ہیں۔ اس فوج کو حکم تھا کہ فاصلہ فاصلہ سے رستہ کے بندوبست کے لیے کچھ آدمیوں کو بھجواتے جائیں۔ اس پہاڑ کی ایک عجیب خصوصیت ہے کہ وہاں آدمیوں

لے مبارک شاہی کا مصنف کہتا ہے مبارک شاہ کے وقت تک تعلق آباد میں تانبے کے وہ ڈھیر اینٹ پتھر کی طرح بیکار پڑے تھے۔ لے ہماچل قراچیل۔ بقول فرشتہ قراچیل، یہ سب کوہ ہمالیہ کے نام میں۔ ابن بطوطہ نے کوہ قراچیل کی لمبائی ”تین ماہ کا راستہ“ لکھی ہے۔ بیس میل فی روز کے حساب سے یہ طول ۱۸ سو میل کا ہوتا ہے جو غلط نہیں۔ فرشتہ، بدادنی، بدنی اور دوسرے مورخوں نے اس ہم کا ذکر کیا لیکن کسی نے وہ مقام نہیں بتایا جہاں سے لشکر ہمالیہ میں داخل ہوا۔ ہمالیہ سے ہو کر چین جانے کی یہ مسلمانوں کی دوسری کوشش تھی۔ اس سے پہلے ۱۲۶۳ء میں محمد تغلق غلجی نے آسام کے راستہ سے چین جانے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت ۳۳۰ھ میں چونکہ سلطان غزالدین بنگالہ میں خود سر ہو گیا تھا اس لیے آسام کے راستہ اس ہم کو سبنا ممکن نہ تھا۔ ابن بطوطہ نے لشکر کے داخلہ کے وقت کا ذکر کیا ہے ”جدیدہ“ اور ”دارنگل“۔ دارنگل کا اس علاقہ میں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ دکن کے درنگل سے جس کا قلعہ بھی پہاڑ پر تھا۔ ابن بطوطہ کو غلط سمجھتے ہو گیا ہو گا۔ البتہ آئین اکبری میں جدید یا جڑیہ نام کا ایک محال سرکار کماؤں میں درج ہے۔ ابن بطوطہ نے دہلی سے اس پہاڑ کا فاصلہ دس منزل بتایا ہے۔ اس لیے قیاس یہ ہے کہ شاہی لشکر ترائی کماؤں اور گڑھوال کے راستہ داخل ہوا تھا۔ گڑھوال اور کماؤں سے درہ بیتی اور درہ مانا دو دروں سے چین کا راستہ ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: ”اس راجہ کا علاقہ پہاڑ کے نیچے بھی تھا۔“ یہ بیان بھی کماؤں پر صادق آتا ہے۔ ہنر کماؤں کے متعلق لکھتا ہے: ”یہ علاقہ شاہان دہلی کے ماتحت کبھی پوری طرح نہیں آیا لیکن راجہ کا علاقہ چونکہ میدان میں بھی تھا اس لیے اس کو دہلی کی اطاعت کرنی پڑتی تھی“ ایک اور شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ سے محمد تغلق کا لشکر گھا ہو گا۔ علی محمد خاں رومیوں کے سردار نے ۱۲۶۴ء میں کماؤں پر حملہ کیا۔ راجہ مقابلہ نہ کر سکا۔ رومیوں نے انھیں لے لیا اور وہ سات ماہ تک پہاڑ میں رہے لیکن موسم کی تاب نہ لا کر تین لاکھ روپیہ نقد لے کر واپس چلے آئے۔ نواب علی محمد خاں نے ۱۲۶۵ء میں دوبارہ لشکر کشی کی، اس مرتبہ ہارا کھیڑی میں پہاڑ کے اندر جاتے ہی ان کو شکست ہو گئی یہی حال محمد تغلق کے لشکر کا بھی ہوا۔ بدادنی نے میر لشکر کا کوئی نام نہیں لیا۔ فرشتہ اس امیر کا نام خسرو ملک لکھتا ہے۔ ابن بطوطہ نے ملک نگہ اور دوسری جگہ ملک بغرا لکھا ہے۔ لشکر کی تعداد بدادنی نے اسی ہزار فرشتہ نے ایک لاکھ لکھی ہے۔ ۳۳۰ھ میں یہ لشکر تباہ ہوا۔ اس کے بعد ہی سادے علاقے خود سر ہو گئے اور معبر دکن گجرات کے فساد شروع ہو گئے جو تیرہ سال تک جاری رہے اور دہلی کی مرکزیت میں منصف آگیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: ”فقط تین آدمی بچ کر آئے۔ ایک امیر نگہ، دوسرا بدرالدین دولت شاہ تیسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔“

اور گھوڑوں کے شور و غل سے بادل گھبراتے ہیں اور شدت کی بارش ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب یہ فوج پہاڑ پر چڑھنے لگی تو برف باری اور بارش بکثرت ہونے لگی اور سرد کا سلسلہ بالکل ہی موقوف ہو گیا۔ کھانے کو نہ ملا تو جو راہ دار راستہ میں متعین کیے گئے تھے وہ کھسک گئے اور ساری فوج نہایت پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ پہاڑی قوموں نے موقع پا کر حملہ کر دیا۔ اور شکست دے کر اس فوج کو بھگا دیا۔ فوج بھاگ کر بھی پناہ حاصل نہ کر سکی۔ پہاڑیوں کے تیروں معلوم ہوتے تھے جیسے زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ پھر چٹانوں پر سے جو پتھروں کی مار پڑتی تھی، بس پناہ بخدا۔ ان مصیبتوں سے شاہی لشکر کے ہزاروں آدمی مارے گئے اور ہزاروں پہاڑیوں کی قید میں چلے گئے جو بچے مدتوں ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہے۔ کچھ لوگ جو مصیبتیں اٹھاتے آفتیں جھیلنے وطن پہنچے تو بادشاہ نے بھاگ آنے کے جرم میں ان کو قتل کرادیا۔ ایسی منظم اور آراستہ فوج پھر بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی اور وہ سارا روپیہ جو اس مہم میں لگا تھا خاک میں مل گیا۔

**بنگالہ کی شورش** ۱۷۳۹ء میں بہرام خاں حاکم سنار گاؤں کا انتقال ہو گیا۔ اسی سال ملک فخر الدین سلاحدار نے بغاوت اختیار کی اور اپنے آپ کو بادشاہ کہنے لگا۔ لکھنؤ کی طرف سے فوجیں بھیجی گئیں۔ فوجیں شکست دے کر اس کا جمع کیا ہوا سارا خزانہ اور مال و اسباب بھین لیا۔ قدر خاں نے بہت سا خزانہ اور طرح طرح کے نفیس تحفے بادشاہ کی پیشکش کے لیے اپنے گھر میں ذخیرہ کیے حسام الدین نے اس طرح علانیہ مال اور روپیہ جمع کرنے سے منع کیا اور اسے سمجھایا کہ مال کے لالچ میں لوگ دشمن بن جاتے ہیں اور طرح طرح کے فتنے پیدا کر دیتے ہیں، لیکن قدر خاں نے اس عاقلانہ مشورہ کو قبول نہ کیا۔ آخر حسام الدین کا کہنا ہی آگے آیا۔ ملک فخر الدین دوبارہ تیاری کر کے مقابلہ پر آگیا اور اس نے قدر خاں کے آدمیوں کو اندر ہی اندر اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ قدر خاں کو اسی کے آدمیوں نے مار ڈالا اور وہ سارا مال اور روپیہ فخر الدین کو مل گیا۔ سنار گاؤں کی حکومت بھی مفت ہاتھ آگئی۔ اس نے اپنے غلام مخلص نامی کو لکھنؤ کی طرف روانہ کیا لیکن قدر خاں کی فوج کے سردار علی مبارک نے مخلص کو قتل کر دیا اور خود مستقل حاکم بن کر بیٹھ گیا۔ پھر بادشاہ کے پاس بھی مصلحت آمیز عرضیاں دہلی روانہ کیں۔

سلطان نے فخر الدین پر حملہ کرنے کے لیے ملک یوسف کو متعین کیا لیکن وہ راستہ ہی میں مر گیا۔ پھر بادشاہ کچھ دوسرے معاملات میں ایسا الجھ گیا کہ اس طرف کوئی توجہ نہ کر سکا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھایا فخر الدین کے علی المرتضیٰ علی مبارک نے علانیہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا خطاب سلطان علاؤ الدین رکھ لیا۔

۱۷۴۱ء خلیفہ الدین بلبن کے زمانہ میں اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین محمود بغیر بنگال پر مستقل حکمران تھا۔ محمد تغلق کے وقت اس کا پوتا خلیفہ الدین بھنورا قید میں تھا۔ بادشاہ نے اسے رہائی دی اور بنگال پر اپنے بھتیجے ابراہیم خاں کی شرکت میں بادشاہت کرنے کے لیے رخصت کیا۔ پھر اس سے ناراض ہو کر دلچلی تاتاری (تاتار خاں) کو اس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اسے شکست ہوئی اور اس کی کھال کھجور کے پتھر سے بھرا دیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے تاتار خاں کو سنار گاؤں میں اور ملک بیدار خلجی یعنی قدر خاں کو لکھنؤ کا حاکم مقرر کیا۔ بھولا بن بھولا ابوالفضل لکھنؤ ہے کہ سلطان تغلق کی طرف سے قدر خاں بنگالہ میں متعین تھا۔ ملک فخر الدین نے اسے شکست دی اور ملک فخر الدین کو



**بنگالہ کا پہلا سلطان** | کچھ دن بعد ہی ملک الیاس حاجی نے جس کی جمجیت کافی بڑی تھی، لکھنوتی کے بعض امیروں سے ساز باز کر کے علاؤ الدین کو قتل کر دیا اور اپنا خطاب شمس الدین رکھ کر

بقیہ حاشیہ بنگال کی بغاوت معمرہ گذشتہ قدر خاں کے سردار علی مبارک نے مار کر سلطان علاؤ الدین کے نام سے اپنی بادشاہت قائم کی اسے حاجی الیاس امیر بنگالہ نے قتل کر کے شمس الدین کے نام سے اپنی شاہی قائم کی۔ نظام الدین احمد بخشی نے فخر الدین کی مدت حکومت دو سال چند ماہ اور سن وفات ۷۴۱ھ لکھا ہے۔ فرشتہ نے اسے قدر خاں کا سلاح دار بتایا ہے اور فخر الدین کے اعلان شاہی کا ۷۳۹ھ لکھا ہے۔ بدادنی لکھتا ہے: سلطان محمد تغلق نے فوج کشی کر کے فخر الدین کو گرفتار و قتل کیا لیکن فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان شمس الدین در ۷۴۱ھ لشکر بہ سارگاؤں کشید و فخر الدین را زندہ گرفتہ بہ لکھنوتی آورد و بہ خلق کشیدہ خطبہ دسکہ را بنام خود گردانید۔ تا سیزدہ سال و چند ماہ احدی از بادشاہان دہلی معترض او نہ شدہ در کمال استقلال بادشاہی می کرد تا آنکہ شوال ۷۵۱ھ فیروز شاہ بالشکر گراں از دہلی متوجہ لکھنوتی گردید و جنگ کردہ بہ سبب بر شکال واپس شد در ۷۵۵ھ شمس الدین پیشکش لائق فرستادہ صلح نمود سلطان شمس الدین در ۷۵۹ھ فوت شد۔ فرشتہ، بدادنی احمد نظام اور ابو الفضل کا یقین کیا جائے تو عجب الجحش ہوتی ہے کوئی کہتا ہے فخر الدین کو ۷۴۱ھ میں کوئی کہتا ہے سلطان شمس الدین نے۔۔۔۔۔ کوئی کہتا ہے علی شاہ نے کوئی کہتا ہے سلطان محمد تغلق نے مار ڈالا۔ ان سب کے برخلاف ابن بطوطہ جو ۷۴۶ھ کے شروع میں بنگال پہنچا تھا کہتا ہے: بنگالہ کا بادشاہ فخر الدین ہے۔ اسے وہ ناصر الدین بن بلبن کا ملازم بتاتا ہے۔ شاہان بنگال کی ترتیب ابن بطوطہ کے قول کے مطابق یہ ہے: (۱) سلطان ناصر الدین بلبن (۲) اس کا بیٹا شمس الدین (۳) اس کا بیٹا شہاب الدین (۴) غیاث الدین بہادر بہنورا (۵) اس کے بعد اس کا داماد بادشاہ ہوا اسے لشکر نے قتل کر دیا (۶) اس کے بعد علی شاہ لکھنوتی میں بادشاہ بن گیا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: جب فخر الدین نے دیکھا کہ اس کے آقا ناصر الدین کے خاندان سے بادشاہت نکلی جا رہی ہے تو اس نے سدگاؤں میں بغاوت کی۔ مسرطاس نے شاہان بنگال کے جن سکوں کا ذکر کیا ہے ان میں سلطان فخر الدین کے سکے ۷۵۰ھ تک ملتے ہیں جن کی ترتیب اس طرح ہے:

سلطان فخر الدین۔ دار الضرب سارگاؤں۔ وزن ۱۶۶ گریں  
 ۷۳۹ھ، ۷۴۱ھ، ۷۴۲ھ، ۷۴۳ھ، ۷۴۴ھ، ۷۴۵ھ، ۷۴۶ھ، ۷۴۷ھ، ۷۴۸ھ، ۷۴۹ھ، ۷۵۰ھ  
 نمونہ رخ اقلی "السلطان الاعظم فخر الدین والدین ابو المنظر مبارک شاہ سلطان"  
 "رخ مدم ہمیں خلیفۃ اللہ ناصر امیر المؤمنین"  
 سکے کے حاشیہ پر سن مزب درج ہے۔

ان سکوں کی وجہ سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ ابن بطوطہ کا بیان صحیح ہے اور ہمارے مورخوں نے شاہان بنگال کے تذکرہ میں غلطی کی ہے ان مورخوں میں سے کسی کے بیان کے مطابق فخر الدین نے قدر خاں کو، کوئی کہتا ہے تاتار خاں کو، مار ڈالا۔ حالانکہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ وہ غالباً تاتار خاں کا شمشیر بردار تھا۔ جب تاتار خاں مر گیا تو اس نے موقع پا کر ۷۳۹ھ میں نہیں (جیسا کہ ہمارے مورخوں کا بیان ہے) بلکہ ۷۴۳ھ میں مشرقی بنگال کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ مذکورہ بالا سکوں کے جدول میں اس کا پہلا سکہ ۷۳۶ھ میں ملتا ہے اس کے آگے فرشتہ کا یہ کہنا البتہ درست ہے کہ "فخر الدین کی بغاوت کی خبر سن کر بادشاہ نے قدر خاں حاکم لکھنوتی کو لکھا اور اس کی مدد کے لیے حسام الدین اور ابوالجبار وغیرہ کو نامزد کیا۔ انھوں نے فخر الدین کو شکست دی اور جنگل میں بھگا دیا" معلوم ہوتا ہے یہ لڑائی کئی سال تک جاری رہی کیونکہ ۷۴۳ھ کے بعد تین سال تک اس کے نام کا کوئی سکہ نہیں ملتا۔ بعد میں جیسا کہ بدادنی نے لکھا ہے: اس نے قدر خاں کے آدمیوں سے سازش کی اور اس کو اسی کے آدمیوں نے قتل کر دیا اور خزانہ وغیرہ بے کر فخر الدین کے پاس چلے گئے۔ سارگاؤں میں مستقل بادشاہ بن گیا۔ بدادنی نے اس کے خود مختار ہونے کا ذکر ۷۳۹ھ میں کیا ہے لیکن یہ زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اگر وہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تخت پر بیٹھ گیا۔

۱۳۱ھ میں سلطان نے سنار گاؤں کی تسخیر کا ارادہ کیا اور فوج کشی کر کے فخر الدین کو گرفتار کر لیا۔ اسے لکھنؤ لاکر قتل کر دیا۔ شمس الدین اس طرح لکھنؤ کا مستقل حاکم بنا رہا۔ اس کی اولاد میں مدت تک سلطنت قائم رہی۔

(بقیہ حاشیہ بنگال کی بغاوت صفحہ گزشتہ) ۱۳۹ھ میں خود مختار بادشاہ بن گیا تھا تو پھر اس سن کا ۱۴۲ھ کا سکھ ہونا چاہیے تھا۔ یہ واقعہ لازماً ۱۴۲ھ میں پیش آیا ہو گا کیونکہ اس کے بعد سے ۱۴۵ھ تک برابر اس کے سکتے ہیں۔ بداؤنی سے فخر الدین کی گرفتاری اور قتل کے بارے میں غلطی ہوئی ہے، وہ کہتا ہے ۱۴۱ھ میں بادشاہ نے فخر الدین پر فوج کشی کی اور اسے گرفتار کر کے لکھنؤ لاکر قتل کر دیا۔ حالانکہ اس کے سبب برابر ۱۴۵ھ تک دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ بطوطہ ۱۴۶ھ میں بنگال گیا ہے، اس وقت مغربی بنگال یعنی لکھنؤ میں سلطان شمس الدین (ملک ایاس) حکمران تھا اور مشرقی بنگال یعنی سنار گاؤں میں فخر الدین بادشاہ بنا ہوا تھا۔ ۱۴۷ھ کے بعد ابن بطوطہ یہاں سے چلا گیا اور سکے شہادت دیتے ہیں کہ ۱۴۷ھ تک فخر الدین زندہ اور برہمراقتدار تھا۔ اصل میں ہمارے اکثر مورخوں نے مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے دو خود مختار حکمرانوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا اور ان دونوں کے بیان کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اصل میں لکھنؤ یعنی مغربی بنگال میں علی شاہ اور سنار گاؤں یعنی مشرقی بنگال میں فخر الدین نے علیحدہ علیحدہ بادشاہت قائم کر رکھی تھی۔ علی شاہ کا پہلا سک ۱۴۲ھ کا ہے۔ بداؤنی کا یہ کہنا درست ہے کہ ”فخر الدین کے علی الرغم علی مبارک نے سلطان علاؤ الدین خطاب رکھ کر بادشاہت کا اعلان کر دیا۔“ بداؤنی نے آگے لکھا ہے ”ملک ایاس علی نے لکھنؤ کے بعض امیروں سے ساز باز کر کے علی شاہ (علاؤ الدین) کو قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن گیا۔“ لیکن وہ یہ ساری باتیں ۱۴۲ھ سے پہلے کی بیان کرتے ہیں حالانکہ علی شاہ کے سکھ مضروب ۱۴۷ھ سے معلوم ہوتا ہے وہ ۱۴۷ھ میں بھی زندہ تھا۔ حاجی ایاس کے نام کا بھی ایک سک ۱۴۷ھ کا ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے علی شاہ اور حاجی ایاس میں عرصہ تک کش مکش رہی ہے اور ۱۴۷ھ میں حاجی ایاس بھی مستقل بادشاہ بن چکا ہے اور اپنا سکھ ضرب کر چکا ہے، پھر اسے علی شاہ نے تخت سے ہٹا دیا اور علاؤ الدین کے نام سے بادشاہ بن گیا۔ پھر حاجی ایاس نے بداؤنی کے بیان کے مطابق علی شاہ کو سازش سے قتل کر کے دوبارہ تخت حاصل کر لیا اور شمس الدین کے نام سے خود بادشاہ بن گیا لیکن یہ واقعہ یقیناً ۱۴۷ھ کے بعد میں پیش آیا اس سے پہلے نہیں ۱۴۷ھ کے بعد فخر الدین کے سکے نہیں ملتے، اس کے بعد کوئی شخص اختیار الدین غازی دو سال تک بادشاہ رہا، اس کے سکے پر ”سلطان ابن سلطان“ ثبت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے غالباً وہ فخر الدین کا ہی بیٹا تھا لیکن ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ ”اس کا ایک ہی لڑکا تھا جسے شیدائے مارڈالا تھا۔“ معلوم ہوتا ہے بطوطہ کے جانے کے بعد فخر الدین کو کوئی لڑکا ہوا اور مارڈالنے فخر الدین کے بعد سے کم عمری میں تخت پر بیٹھا دیا۔ شمس الدین (لکھنؤ) فخر الدین (سنار گاؤں) کے درمیان لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اس کی تصدیق ابن بطوطہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن کوئی کسی پر غالب نہیں آ سکا۔ بعد میں ۱۴۷ھ میں کہیں جا کر سلطان شمس الدین کے سکے سنار گاؤں کی ضرب کے لئے ہراس سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان شمس الدین نے فخر الدین کے کم عمر جانشین پر فوج کشی کر کے ۱۴۷ھ کے لگ بھگ سنار گاؤں یعنی مشرقی بنگال کو فتح کر لیا تھا اور تمام بنگال کا مستقل بادشاہ بن گیا تھا۔ فیروز شاہ نے بھی اس کے قدم مضبوط دیکھ کر اس سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ۱۴۷ھ میں نمانہ لے کر اسے اپنے محل پر چھوڑ دیا۔ یہ سلطان شمس الدین بنگال کا پہلا مستقل بادشاہ ہے۔ اس کی وفات ۱۴۷ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کی اولاد بنگال میں کئی پشت تک حکمران رہی۔ اس سارے بیان میں سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ سلطان ناصر الدین یلین کے عہد سے لے کر بنگال کے پہلے سلطان شمس الدین بھنگرہ تک بنگال کی تاریخ ہمارے مورخوں کے پاس نہایت خلط ملط اور الجھی ہوئی ہے۔ اس کی صحت ابن بطوطہ کے سفر نامے اور مسٹر طامس کے دریافت کردہ سکوں سے ہو سکتی ہے۔

## دکن کی بغاوت | شاہی کے باپ سید حسن کیتھلی نے جو حسن کانگو کے نام سے مشہور تھا سرکشی اور بغاوت کی۔

۱۷۰۰ء میں گھاٹ کو کیتھلی میں عرب دکن کے مشرقی ساحل کو معبر اور مغربی ساحل کو ملی بارکتے تھے۔ بعض مورخوں نے معبر اور ملیبار میں تمیز نہیں کی، اور ان کو خط ملط کر دیا۔ تیرہویں چودھویں صدی عیسوی میں عرب اور ایرانی ہندوستان کے صرف اسی ساحل کو جسے ہم کار و منڈلی اور کیتھلی کہتے ہیں معبر کہا کرتے تھے۔ اور اسی کے جغرافیہ میں معبر کا نام نہیں ہے۔ بارہویں صدی سے پہلے اس لفظ کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ اس کے بعد ابوالفداء نے لکھا ہے: "اس کی راہ پر مالابار ختم ہو جاتا ہے اور معبر شروع ہو جاتا ہے اور نیلور تک اس کی حد ہے"۔ "وصاف نے بھی یہی لکھا ہے کہ" معبر کا ملک کوٹم سے نیلور تک ہے اس کا طول تین سو فرسنگ ہے۔ "وصاف نے معبر کو "ہندوستان کی کنجی" کہا ہے اور اس کے راجہ کا نام سندرا پانڈے اور وزیر کا قتی الدین عبدالرحمن لکھا ہے۔ اس راجہ کی وفات ۱۲۹۳ء میں ہوئی اس کا دار الخلافہ مدرا تھا جسے شہر پانڈی بھی کہتے ہیں جو بگڑ کر فارسی تاریخوں میں مانڈی اور منڈی ہو گیا۔ مانڈی راجاؤں کا خاندان اس ملک پر کئی ہزار سال حکمران رہا ہے۔ یونانی مورخ نے غاس تھی نیس لکھ کر ق م ہنے بھی اس خاندان کا ذکر کیا ہے ۱۳۱۱ء سے ۱۳۵۰ء تک مہتر تنسن نے آٹھ صوبہ داروں کا نام لیا ہے جو بادشاہ دہلی کی طرف سے اس علاقہ پر حاکم رہے ان میں پہلا تو بلک نائب کا فور اور آخری فندق ملک کا نام ہے لیکن یہ فہرست معتبر نہیں ان میں اکثر نام فرضی اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں صحیح طور پر پتہ نہیں چلتا کہ ۱۳۱۱ء سے ۱۳۵۰ء تک جب کہ محمد تغلق کے عہد میں جلال الدین احسن شاہ نے بغاوت کی جس کا تذکرہ ابن بطوطہ نے کیا ہے۔ شاہان دہلی کی طرف سے کون کون صوبہ دار رہا۔ ابن بطوطہ نے معبر کے حاکموں کے جو نام دیئے ہیں ان میں سے صرف دو نام علاؤ الدین اور قطب الدین نس کی فہرست سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے: "قطب الدین علاؤ الدین کا داماد تھا اور وہ جلال الدین احسن شاہ کے بعد معبر آباد شاہ تھا" ۱۳۲۵ء سے پہلے سید جلال الدین احسن شاہ صوبہ دار تھا پھر خود مختار ہو کر وہ ۱۳۲۵ء تک بادشاہ رہا اس کے بعد ۱۳۲۵ء میں اس کا داماد قطب الدین بادشاہ ہوا لیکن صرف چالیس دن اس کے بعد اسی سن میں غیاث الدین دامغانی اس کے بعد ناصر الدین بادشاہ بنا۔ ان بادشاہوں کا شاہان دہلی سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ان کے اندر یعنی بادشاہوں کے درمیان بھنگر کی ہندو مملکت حائل تھی۔ اس لیے ان کو شمال سے کوئی مدد نہ مل سکی اور بھنگر کے ہندو راجاؤں نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان مسلمان بادشاہوں کی حکومت ختم کر دی۔ ہمارے کسی مورخ نے معبر کے ان سلاطین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر ابن بطوطہ نے لکھتا تو ان کا ہماری تاریخ میں نشان لگ نہ ملتا۔ واضح رہے معبر کو سب سے پہلے فتح کرنے والا علاؤ الدین خلجی کا سپہ سالار ملک کا فور تھا جس نے اس وقت کے راجہ دیبا پانڈی کو شکست دے کر اسے فرج کر لیا تھا۔ بدافونی نے یہاں جو معبر کا نام لیا ہے اس سے اس کی مراد دکن سے ہے خاص اس علاقہ سے نہیں جس کا ہم نے تفصیلی ذکر کیا ہے۔ کیونکہ من کانگو نے معبر میں نہیں بلکہ بالائی دکن دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر کے علاقہ میں بغاوت کی تھی۔

۱۷۰۰ء میں کانگو نے معبر اور دکن کی طرح حسن کانگو کی شخصیت کے بارے میں بھی سخت غلط فہمیاں ہو گئیں اس کی پیروی دوسرے مورخوں نے بھی کی ہے۔ بدافونی سید جلال الدین احسن شاہ کو حسن کانگو لکھ رہا ہے اگرچہ وہ سید جلال کا نام "سید حسن کیتھلی" لکھتا ہے۔ بلاشبہ سید جلال الدین احسن جس نے معبر میں بغاوت کی تھی اور جس کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے کیتھلی کا رہنے والا تھا لیکن حسن کانگو دہلی کا تھا اور قوم کا سید نہیں تھا۔ بدافونی دونوں بغاوتوں کو دو ٹوکوں اور دونوں شخصوں میں فرق نہیں کر سکا۔ دکن کو معبر لکھ دیا: "سید" اور کیتھلی کے درمیان حسن کے بجائے "حسین" لگا کر دونوں کے نام کو الجھا دیا بغیر اس کے کہ اس نے یہ لکھ دیا: "وہ حسن کانگو کے نام سے مشہور تھا" بدافونی نے لکھا ہے: "آخر کار سلطنت دکن بدو قرار یافتہ مخاطب علاؤ الدین بہمنی شاہ تخت" یہ جملہ حسن کانگو کے لیے بالکل صحیح ہے لیکن سید حسن کیتھلی یعنی سید جلال الدین احسن شاہ کے متعلق صحیح نہیں کیونکہ حسن کانگو نے تلنگانہ میں بہمنی سلطنت قائم کی تھی اور سید جلال نے معبر یعنی کرناٹک میں علیحدہ بادشاہت کی۔ اس کے علاوہ سید جلال الدین کی بغاوت فرشتہ کی تحریک کے مطابق ۱۷۰۲ء میں اور حسن کانگو کی بغاوت ۱۷۰۳ء میں ہوئی۔ سید جلال الدین کی بغاوت کا سن ۱۷۰۲ء بھی حسن کانگو سے جوڑ دیا ہے حالانکہ آگے جا کر وہ خود ۱۷۰۳ء کے واقعات میں حسن کانگو کی بغاوت اور اس کے بادشاہ بننے کا ذکر کرتا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ۱۷۰۳ء کے درمیان امیران صوبہ کی بغاوت کے بعد ہی دولت آباد اور تلنگانہ میں بغاوت ہوئی جن کا سرغنہ حسن کانگو تھا۔ فرشتہ اور بدافونی نے جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت کا جویر سن ۱۷۰۳ء دیا ہے وہ خود بھی اپنی جگہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ابن بطوطہ کے بیان اور معبر کے بادشاہوں کے سن دیکھ کر تو یہی یقین کرنا پڑتا ہے کہ جلال الدین کی معبر میں بغاوت اس سے پہلے ہوئی ہوگی، زیادہ صحت کے ساتھ معبر کی بغاوت ۱۷۰۳ء میں ہی ہو سکتی ہے اس کے بعد ہرگز نہیں حسن کانگو کے حالات آگے ایک اور حاشیہ کے تحت ہم بیان کریں گے۔

اور اپنا خطاب علاؤ الدین بہمن شاہ رکھ کر مستقل بادشاہت قائم کر لی۔ وہاں جو شاہی لشکر تھا وہ بھی اس کا حامی ہو گیا تھا اس لیے جس نے اس کی مخالفت کی اس کی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے سلطان لکھنؤ سے دیوگیر بھیجا اور وہاں سے تلنگانہ تک گیا مگر وہاں اچانک بیمار پڑ گیا، مجبوراً اس نے مراجعت کی اور رات دن کوچ کر کے دہلی واپس آ گیا۔ بادشاہ نے قلعہ خاں کو دولت آباد کے بندوبست کے لیے وہاں چھوڑ دیا تھا لیکن معبر کا فتنہ دب نہ سکا۔

۱۳۳۳ء میں ملک ہلاچون، گل چند کھوکھڑ اور ملک تارخورد نے غدر کر کے لاہور کے حاکم کو قتل کر دیا۔ بادشاہ نے خواجہ جہان کو ان کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ باغیوں نے مقابلہ کیا لیکن شاہی لشکر سے بڑی طرح شکست کھا کر بھاگ گئے۔

۱۳۴۲ء میں بادشاہ نے سام اور سامانہ سے آگے بڑھ کر کیتھل کے سیدوں پر حملہ کیا اور سید حسن کیتھلی کے بغض اور حلی میں یہاں کے تمام سیدوں کا قتل عام کر دیا۔ ان کے علاقہ میں پرہانوں کو بسا کر ان کی جاگیریں، غلعتیں اور زرعی ٹکے عطا کیے۔

دہلی کو واپسی | اسی سال (۱۳۴۲ء) میں چونکہ سخت قحط پڑا ہوا تھا، بادشاہ نے حکم دیا کہ جس کا جی چاہے پورب کے

لے کھوکھڑ۔ بدادئی نے ”کھوکھڑ“ لکھا ہے اور فرشتہ کی تحریر ہے ”دیر ۱۳۴۲ء ملک چندر کہ سردار مسکراں“ بود علم مخالفت بلند ساختہ“ بدادئی نے اس قوم کا نام ”کھوکھڑ“ غلط لکھا کیونکہ ”کھوکھڑوں“ کی قوم پنجاب میں کبھی اس قدر ملاقہ نہ رہی، لیکن گھکڑوں کا زور سلطان شاہ الدین کے وقت اکبر بادشاہ کے عہد تک چار سو سال کے قریب شمالی پنجاب میں برابر رہا کچھ سیدوں تک ان کی لوٹ مار کی وجہ سے خراسان کا راستہ ملتان اور دیپال پور کی جانب بھاگا اور لاہور کی جانب سے بند ہو گیا۔ کنگھم صاحب کی تحقیقات کے مطابق یہ قوم ترکی الاصل ہے سکندر کے مورخوں نے لکھا ہے: ”سویانی کا دیر باسی ملک سے نکلتے“ ”راج ترہینی“ میں درج ہے ”مری اور مارگلہ کے درمیان کا ملک ابھی سا کا ملک تھا“ چونکہ گھکڑ اس علاقہ میں سکندر کے زمانہ سے پہلے رہتے تھے اور یونانی مورخوں نے بھی لکھا ہے ”ابھی سا کے بھائی کے پاس دو بڑے بڑے سانپ تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا“ اس لیے تپاس کیا گیا ہے کہ وہ ”وہ اک“ قوم سے تھا۔ اب دیکھیے گھکڑوں میں بھی ایک روایت ملی آتی ہے کہ ”ان کو افراسیاب نے کید کی مانتی میں ہندوستان کی طرف نکال دیا“ اس روایت کی تصدیق فرشتہ بھی کرتا ہے۔ وہ سلطان ابراہیم غزنوی کے حال میں لکھتا ہے کہ ”اس نے دارا نامی قلعہ پر حملہ کیا“ ”وہ منوطان آں جاز نسل خراسانیان بودند افراسیاب از سرکشی ویشاں سنگ آمدہ یاندن دفرزند از دلایت خراسان خارج کردہ بود و ہندوستان فرستادہ مردم آں شہر بالا تمام آں جماعت بودند و با بیگانہ پیوند و صلعت نمی کردند و بعبادت اصنام و فسق بروام مشغول بودند و ملوک ہند بہ سبب آں کہ استیلا و بر آں جماعت از محلات می دانستند معترض ایشان نمی شدند“۔ دارا سے مراد دارا پور ہے جو دریائے جہلم پر جلال پور کے متصل واقع ہے۔ اب وہاں گھکڑ نہیں رہتے بلکہ اب پنجوہوں کا مرکز ہے۔ ان علاقوں سے بہر حال یہ معلوم ہوتا ہے گھکڑ ہندی الاصل نہیں ہیں بلکہ کسی زمانہ میں خراسان یا غلزم کی طرف سے آئے ہیں۔ یہ رسم اب بھی گھکڑوں میں ہے کہ وہ اپنی قوم کے باہر رشتہ داری نہیں کرتے۔ حالانکہ راجپوتوں کی مختلف قومیں اس طرح کرتی ہیں۔ باہر سے ترک و تاتاریاں آ کر گھکڑوں کے سردار باغی نامی کا ذکر کیا ہے اس میں پہلا نام مسلمانوں جیسا ہے اور دوسرا مشترک۔ بدادئی نے جو یہ سن لکھا ہے ”جس کا جی چاہے پورب کے“ صحیح نہیں کیونکہ گھکڑوں نے اس وقت بغاوت کی تھی جب کہ سید جلال الدین احسن شاہ کی بغاوت دفع کرنے بادشاہ معبر کی طرف گیا تھا اس لیے ان کی بغاوت بھی ۱۳۴۲ء سے پہلے ہی ہوئی ہوگی بعد میں نہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں معبر کی بغاوت ۱۳۴۲ء یا ۱۳۴۳ء میں ہوئی تھی۔ ۱۳۴۵ء قوط ابن بطوطہ لکھتا ہے ”جب بادشاہ معبر کی طرف گیا تو ہندوستان میں بڑا سخت قحط پڑا اور نہخ یہاں تک منگا ہوا کہ ایک سی کی قیمت ساٹھ درہم ہو گئی پھر اس سے بھی زیادہ گرانی ہوئی“ فرشتہ لکھتا ہے ”در عہد آں بادشاہ دوم مرتبہ مساک باباں شد و در ہر گز مردم قریب سر سال اوقات بہ عبرت گزاریندند“ فرشتہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب بادشاہ سید حسن شاہ حاکم معبر کی بغاوت دفع کرنے کے لیے روانہ ہوئے



ملکوں میں چلا جائے اور جس کا جی چاہے دولت آباد چھوڑ کر دہلی میں جا بیسے۔

بقیہ حاشیہ سلسلہ قحط صفحہ گزشتہ) کہنے کے لیے دکن گیا تو وہ چند منزل چلا تھا کہ قحط شروع ہو گیا جب واپس آیا تو تمام ملک کو قحط میں مبتلا پایا۔ فرشتہ نے معبر کی بغاوت کا ذکر ۱۲۸۰ھ میں کیا ہے۔ اس طرح قحط کا سن ۱۲۸۰ھ ہوتا ہے۔ بداؤنی قحط کا ذکر ۱۲۸۰ھ میں کرتا ہے لیکن اس کے لفظ ہیں ”قحط پڑا ہوا تھا۔“ کتبہ شروع ہوا اور ایک ختم ہوا؛ اس کی کوئی وضاحت نہیں۔ دوسری تاریخوں میں ۱۲۸۰ھ میں بھی قحط کی حالت کا ذکر ہے جبکہ بادشاہ دولت آباد سے طغی کی بغاوت دبانے کے لیے گجرات گیا ہے۔ ان تمام مورخوں کے حساب سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قحط دو مرتبہ پڑا۔ جیسا کہ فرشتہ نے لکھا ہے ”دو مرتبہ اساک باراں شد“ اول دفعہ ۱۲۸۰ھ اور ۱۲۸۱ھ میں۔ دوسری دفعہ ۱۲۸۰ھ میں تاریخ مبارک شاہی میں تحریر ہے ”قحط عام و گرائی غلہ ہفت سال چناں شد کہ قطرہ از آسمان نبارید“ گویا ۱۲۸۰ھ سے ۱۲۸۹ھ تک قحط رہا درمیان میں صرف ایک سال انزانی رہی۔ لیکن برنی مؤلف فیروز شاہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ جب گجرات گیا ہے تو اہلکاروں کو تقادی کی تقسیم کے لیے کافی رقم دے گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس وقت قحط ختم ہو چکا تھا۔ تقادی قحط کے بعد بارش ہونے پر ہی دی گئی ہوگی۔ برنی لکھتا ہے ”اگر بادشاہ گجرات کی جہ سے واپس آتا اور ۱۲۸۰ھ کے ماہ محرم میں ٹھٹھ میں مرنے جاتا تو ان لوگوں سے جو تقادی کی رقم غن کر گئے تھے خوب اچھی طرح روپیہ وصول کرتا۔“ برنی کے قول کے مطابق قحط بادشاہ کی معبر سے واپسی پر شروع ہوا تھا۔ فرشتہ کی نسبت یہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہم لکھ آتے ہیں معبر کی بغاوت کا صحیح سن ۱۲۸۰ھ ہے۔ اس لیے پہلا قحط ۱۲۸۰ھ سے ۱۲۸۹ھ نہیں بلکہ ۱۲۸۰ھ سے ۱۲۸۹ھ کے درمیان ہونا چاہیے اور دوسرا قحط ۱۲۸۰ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۸۵ھ، ۱۲۸۶ھ، ۱۲۸۷ھ میں ہونا چاہیے۔ برنی بھی لکھتا ہے کہ بادشاہ ۱۲۸۰ھ میں تقادی کی رقم دے کر گجرات گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۲۸۰ھ تک قحط ختم ہو چکا تھا پہلے قحط کا ۱۲۸۰ھ کے بجائے ۱۲۸۰ھ اور ۱۲۸۱ھ کے درمیان ہونا یوں بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ سارے لشکر کو لے کر سرگداری کی چراگاہوں میں چلا گیا تھا۔ ابن بطوطہ کے بیان سے سرگداری کے قیام کا یہی زمانہ معلوم ہوتا ہے وہ خود بھی اس وقت وہاں موجود تھا اور وہاں علی الملک کے خلاف جوڑائی لڑنی پڑی اس میں وہ خود کو شریک بناتا ہے۔ بداؤنی کے بیان سے سرگداری میں بادشاہ کے قیام کا زمانہ ۱۲۸۰ھ اور ۱۲۸۱ھ معلوم ہوتا ہے جو صحیح نہیں۔ بداؤنی نے شاہی لشکر کے سرگداری میں جانے کا سبب بھی نہیں لکھا ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ قحط کی وجہ سے مویشیوں کو چارہ نہیں مل رہا تھا اس لیے بادشاہ سارے لشکر کو سرگداری میں لے آیا۔ یہاں یہ بات بھی نکل آتی کہ عین الملک کی بغاوت بھی ۱۲۸۰ھ میں ہوئی نہ کہ ۱۲۸۱ھ میں، جیسا کہ بداؤنی کا بیان ہے۔ غرض تمام واقعات کی صحیح ترتیب سے قحط کے زمانہ کا جو تعین ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ پہلا قحط ۱۲۸۰ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۸۵ھ تک جب تک کہ بادشاہ سرگداری کی چراگاہ میں رہا قحط کی حالت رہی۔

دوسرا قحط برنی کے قول کے مطابق ۱۲۸۵ھ سے شروع ہوا اور ۱۲۸۵ھ تک رہا، لیکن واقعات کی صحیح ترتیب سے جس کو ہم آگے اپنی جاشیوں کے ذیل میں واضح کریں گے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کی بغاوت دو کرنے بادشاہ ۱۲۸۰ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۸۵ھ میں گیا ہے، اس لیے زیادہ محبت کے ساتھ دوسرا قحط گجرات جانے سے پہلے ۱۲۸۰ھ یا ۱۲۸۱ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۸۵ھ میں ختم ہو گیا۔

اس قحط کے نسخہ کی بابت فرشتہ لکھتا ہے: ”ایک سیر غلہ بہ ہفتہ درم یافت نمی شد و درم لی قحط بہ مرتبہ بود کہ آدم آدم راجی خورد“ ابن بطوطہ نے ”فی من چھ دینار“ نرخ لکھا ہے۔ دوسری جگہ ”ایک من غلہ کی قیمت ساٹھ درہم اور اس سے بھی زیادہ لکھی ہے۔ ابن بطوطہ جب درہم کہتا ہے تو اس کی مراد اس وقت کے مروجہ ”ہشتگان“ سے ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ”شکے یا شکہ کے آٹھویں حصہ کو درہم سمجھتا ہے“ یہی سالک لابصار کا مصنف بھی لکھتا ہے۔ فرشتہ نے ایک سیر کی قیمت سترہ درہم غلط لکھی ہے۔ تاریخ فیروز شاہی میں ضیاء الدین برنی نے ایک سیر کی قیمت ۱۶ جیتل یا ۱۶ جیتل لکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے برنی سے نقل کرتے ہوئے فرشتہ نے جیتل کے بجائے درہم لکھ دیا۔ اس جیتل کے حساب سے ایک سیر کی قیمت دو درہم ہوتی ہے۔ اس وقت کا سیر ابن بطوطہ کی تحریر کے مطابق ”دہلی کا رطل (وہ رطل من کوکتا ہے) مصر کے ۱۵ رطل کے برابر ہوتا ہے۔“ ابن بطوطہ کے فرانسیسی مترجموں نے اس رطل کے حساب سے من کا وزن ۲۹ ۱/۲ پونڈ نکال لیا یعنی چودہ ستر پختہ۔ سالک لابصار کا مصنف لکھتا ہے ”دہلی کا سیر، مثقال کا ہوتا ہے۔“ اگر مثقال کو ساٹھ چارمانے کا سمجھیں تو سیر کا وزن ۲۹ ۱/۲ پونڈ (دہلی حاشیہ برصغیر اُسندہ)

اسی سال خراسان، عراق اور سمرقند کے لوگ بادشاہ کی بخششوں کا حال سن کر کافی تعداد میں ہندوستان آئے چنانچہ جدھر دیکھدا نہی کے قافلے نظر آتے تھے۔

**فرمان خلافت** | اس سال حاجی سعید مصری خلیفہ عباسی کی طرف سے جو مصر میں برائے نام خلیفہ تھا، بادشاہ کے لیے فرمان خلافت، نشان، خلعت اور ناسر المومنین کا خطاب لے کر آیا۔ بادشاہ نے اس دن سارے شہر میں آئینہ بندی کرائی اور شہر کے تمام اکابر و اعیان مشائخ و سادات کو لے کر حاجی سعید کے استقبال کے لیے گیا۔ پیادہ پا ہو کر حاجی سعید کے پاؤں چومے اور ان کے جلو میں پیچھے پیچھے چلا۔ خلیفہ کی اجازت اور فرمان کے آنے تک بادشاہ نے جمعہ اور عیدین کی جماعت موقوف کر رکھی تھی۔ اس دن نہایت خوشی سے جماعت قائم کرنے کی اجازت دی۔ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس خطبہ میں سے کچھ بادشاہوں کے نام خارج کر دیئے، صرف سلطان محمود غزنوی کا نام رہنے دیا۔ حاجی سعید کو بادشاہ نے اتنا زر نقد اور تحائف دیئے کہ خزانہ خالی ہو گیا۔ خلیفہ مصر کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ موتی کہ اس جیسا خزانہ

رہتیہ قحط صفحہ گزشتہ) دولٹے ہوا، اور من کا ۱۳ سیر چھٹانک، اور اگر شمال ۵ ماشہ کالیں جیسا کہ بابر نے اپنی تذکرہ میں لکھا ہے تو من کا وزن ۱۴ سیر ۹ چھٹانک دو تولہ کا ہوا۔ اب بھی پاکستان و ہند میں کچا من ۱۲ سیر پختہ سے لے کر ۱۸ سیر پختہ تک کا ہوتا ہے۔ اکبری سیر ۵۲ تولہ ۲ ماشہ ۲ رتی کا تھا۔ عالمگیری سیر ۲ تولہ کا تھا یعنی موجودہ پختہ سیر سے تین تولہ کم۔ غرض محمد شاہ تغلق کے وقت کا من موجودہ پختہ من کے حساب ۱۴ سیر کا سمجھنا چاہیئے۔ اس حساب سے ایک دینار کے عوض غلہ کا نرخ ۱ سیر، چھٹانک کے قریب ہوا اور دوسری روایت کے مطابق پورے آٹھ روپیہ کا چودہ سیر آٹھ چھٹانک یعنی کچھ کم دو سیر کا نرخ ہوا۔ برنی اور فرشتہ کی تحریر کے مطابق ایک سیر راج الوقت کی قیمت ۱۶ جیتل یعنی دو روپہ ہم یعنی چار آنہ ہوتی۔ اس لیے ایک من کی قیمت دس روپے کے قریب ہوتی یعنی ایک روپیہ کے تقریباً ڈیڑھ سیر پختہ۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے اس سے بھی زیادہ نرخ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کا اور برنی کا بیان مطابق ہے اس قحط کا حال ابن بطوطہ لکھتا ہے: "میں نے دیکھا تین عورتیں مرے ہوئے گھوڑے کی کھال کاٹ کاٹ کر کھاتی تھیں۔" لوگ چمڑوں کو پکا پکا کر بانار میں بیچتے تھے۔" فرشتہ نے آدمی کو آدمی کے کھانے کا جو ذکر کیا ہے، ابن بطوطہ سے بھی اس تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے بعض خراسانی طالب علم اگر وہر گئے تو سارا شہر خالی پڑا تھا ایک خالی مکان میں ایک شخص آگ جلا کر کسی آدمی کی ٹانگ بھون بھون کر کھا رہا تھا۔ بادشاہ کے حکم سے تمام دہلی کے باشندوں کو چھ ماہ کا گزارا یومیہ ڈیڑھ رطل کے حساب سے دیا گیا۔

لے خلیفہ مصر خلیفہ بغداد مستعصم باللہ کے قتل کے تین برس بعد ۶۵۹ھ میں اس کا چچا امیر ناصر الدین متہا کے ساتھ مصر پہنچا وہاں اس کی بیعت کی گئی اور مستعصم باللہ نام رکھا گیا، پھر ملک طاہر میرس نے اسے لشکر دے کر بغداد فتح کرنے بھیجا۔ ۶۶۰ھ میں حدیشیہ کی لڑائی میں وہ یا تو مارا گیا یا گرفتار ہوا، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بھاگنے والوں میں سے ایک شخص جو خلیفہ مسترشد باللہ کی پانچویں پشت سے تھا، مصر کو چلا گیا۔ وہاں ۶۶۱ھ میں ملک طاہر نے مصلحتاً مغلوں کے حملوں سے بچنے اور مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس کو خلیفہ بنالیا اور حاکم بامر اللہ ابوالعباس احمد اس کا نام رکھ کر اس سے بیعت کی۔ ۶۶۲ھ تک وہ خلیفہ رہا اس کے بعد اس کا بیٹا المستکفی باللہ خلیفہ ہوا۔ وہ ۶۶۳ھ تک رہا۔ اس کا بھتیجا الواق باللہ ابراہیم ایک سال رہا۔ ۶۶۴ھ میں مستکفی باللہ کا بیٹا الحاکم بامر اللہ احمد ابوالعباس خلیفہ ہوا جو ۶۶۵ھ تک رہا۔ اگرچہ ۶۶۶ھ تک ہندوستان کے سکوں پر خلیفہ مستکفی باللہ کا نام چلا آتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس وقت تک اس کے فوت ہونے کی خبر نہیں پہنچی ہوگی۔ فرشتہ لکھتا ہے "بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ خلفائے عباسیہ کی اجازت کے بغیر کوئی شخص سلطنت کا مستحق نہیں ہو سکتا اس لیے خائبانہ خلیفہ کے نام پر بیعت کر کے سکے خلیفہ کے نام کا شروع کر دیئے۔ اگرچہ خلیفہ کا منشور ۶۶۷ھ میں حاجی سعید مصری کے ہاتھ پہنچا لیکن عملدرآمد پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ان دو تین سال کے اندر وہاں تیسرے خلیفہ خلافت پر آچکا تھا۔ تمام مسلمان بادشاہ آل عباس کے خلفاء کو برحق سمجھتے تھے اور ان کی اجازت کے بغیر سلطنت کرنا ناجائز سمجھتا تھا۔

میں دوسرا نہ تھا اور دوسرے قیمتی اور نادر تحفے روانہ کیے۔ فرمان خلافت کیا ملا، سلطان بزعم خود خلیفہ سی بن بیٹھا خلیفہ کا فرمان لے کر اس کے احکام سب کو سنایا کرتا تھا اور خلیفہ کے نام پر لوگوں سے بیعت لیتا تھا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) اس لیے ایران و ترکستان کے اکثر بادشاہ خلفائے ہند اسے حکمرانی کی سند حاصل کر لیا کرتے تھے چنانچہ محمود غزنوی نے کافی روپیہ خرچ کر کے یہ سند اور بلین الدولہ ولی امیر المومنین کا خطاب حاصل کیا تھا۔ ان دنوں خلفائے عباسی کی حکومت برائے نام تھی اور وہ اس سرپرستی کو غنیمت سمجھتے تھے۔ غزنی اور غوری سلاطین اکثر ایسا کرتے تھے کہ سکہ پر ایک طرف خلیفہ وقت کا نام ضرب کرتے تھے۔ امیر المومنین سے ہمیشہ عباسی خلیفہ وقت مراد ہوتا تھا۔ چنانچہ قطب صاحب کی لاٹ پر ”مظہر کلمۃ اللہ علیا ابو المظفر محمد بن سام قسیم امیر المومنین خلد اللہ ملکہ“ اور جامع مسجد دہلی کے دروازے پر ”محرر الدینا والدین محمد بن سام ناصر امیر المومنین“ سلطان معز الدین غوری کے دینار کے ایک طرف ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ الناصر۔۔۔۔۔ امیر المومنین اور التمش کے ٹکڑے کے ایک رخ پر ”فی عہد الایام المستعصر امیر المومنین“ اور ناصر الدین محمود بن التمش کے ایک سکہ پر یہی عبارت اور ضیہ سلطان کے ایک سکہ پر بھی ایک رخ پر یہی عبارت درج ہے، یہاں تک کہ بغداد کا آخری خلیفہ مستعصم باللہ ۵۶۱ھ میں قتل بھی ہو گیا اور خلافت کا خاتمہ ہو گیا تو بھی ۶۸۸ھ کے سکوں میں جو غیاث الدین کے وقت میں مضروب ہوئے ”الامام المستعصم امیر المومنین“ ضرب ہوتا رہا۔ گدھ مکتبہ کی مسجد کے کتبہ میں جو سلطان غیاث الدین بلین کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی ”غیاث الدین والدین ابو المظفر بلین السلطان ناصر امیر المومنین ۶۸۲ھ“ درج ہے بلکہ فیروز شاہ خلجی کے وقت میں جو سکے مضروب ہوئے یعنی ۷۹۱ھ تک ایک رخ پر ”الامام المستعصم امیر المومنین“ لکھتے رہے، یہی حال ۶۹۵ھ تک رہا۔ علاؤ الدین خلجی کے سکوں پر سکندر ثانی بمین الخلافت ناصر امیر المومنین ۸۰۹ھ ”لکھا جاتا تھا لیکن اس کا خطا قطب الدین مبارک شاہ خود ہی امام اور امیر المومنین بن بیٹھا چنانچہ اس کے سکہ کے ایک طرف ”الامام الاعظم خلیفہ رب العالمین قطب الدین والدین ابو المظفر مبارک شاہ“ اور دوسری طرف ”السلطان ابن السلطان الواثق باللہ امیر المومنین ۸۱۵ھ“ درج ہے۔ خسرو نو مسلم اپنے سکوں پر ولی امیر المومنین اور سلطان غیاث الدین تغلق ”ناصر امیر المومنین“ لکھتے رہے۔ جنگالہ کے بادشاہ ۸۱۵ھ تک ”الامام المستعصم امیر المومنین“ لکھتے رہے۔ سلطان محمد تغلق نے ۸۲۱ھ تک اپنے سکوں پر نہ تو کسی خلیفہ کا نام لکھا اور نہ خود کو امیر المومنین لکھا۔ سرگدواری کے قیام میں شاید خراسان، عراق، شام اور مصر کے لوگوں کی صحبت کے اثر سے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ خلیفہ کی اجازت کے بغیر بادشاہی کرنا قطب میں داخل ہے۔ اس نے ۸۲۱ھ میں غائبانہ خلیفہ کے نام پر بیعت کر کے سکوں میں اس کا نام اپنے نام کے بجائے شروع کیا اور خلیفہ کے پاس ایک عرضداشت بھی بلائی۔ میں خلیفہ مستکفی باللہ مرچکا تھا لیکن ہندوستان میں اس کی وفات کی خبر نہیں پہنچی جب تک کہ خلیفہ کا قاصد سعید مصری ۸۲۲ھ میں سندے نہ آیا۔ اس سے ۸۲۲ھ اور ۸۲۳ھ کے سکوں پر محمد تغلق المستکفی باللہ کا نام لکھتا رہا۔ جس وقت یہ قاصد پہنچا تو مستکفی کے بعد ابراہیم واثق باللہ ایک سال خلیفہ رہ کر اس کے بجائے ابو العباس احمد الحاکم بامر اللہ ۸۲۴ھ میں خلیفہ مقرر ہو چکا تھا لیکن ہندوستان میں اس کے تقرر کی خبر نہیں پہنچی تھی۔ حاجی سعید کے آنے کے بعد بادشاہ نے حاجی رجب کو پھر خلیفہ کے پاس بھیجا۔ ضیا الدین برنی نے فیروز شاہی میں حاجی سعید کے آنے کی تاریخ ۸۲۴ھ لکھی ہے اور یہ لکھا ہے ”دو سال کے بعد حاجی رجب اور شیخ رکن الدین آئے“ ہرجاچ کے شعبہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ہم بتا رہے ہیں کہ ماہ از سال ہفصد شد فزونی  
ذیں سفر ماہ محرم سابق شعبان رسید

”سابق شعبان“ سے حاجی رجب مراد ہے۔ فرشتہ نے حاجی سعید مصری اور حاجی رجب کے آنے کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن بطوطہ نے حاجی سعید کا کچھ ذکر نہیں کیا اور شیخ رکن الدین کا بھی مختصر ذکر کیا ہے وہ حاجی سعید کی آمد کے وقت جزائر مالدیپ میں تھا۔ شیخ رکن الدین کا حال بھی اس سے بعد میں سنا ہوگا یہ دونوں اس کے سامنے نہیں آئے تھے۔ فیروز شاہ نے بھی یہ اجازت حاصل کی تھی۔ فتوحات فیروز شاہی میں ہے۔۔۔۔۔ خلیفہ نے اجازت نامہ سید سلاطین کا خطاب، ایک خلعت، علم و شمشیر، انگشتری اور حضور اکرم کے قدم کا نشان بھیجا تھا۔ یہ قدم اب شاہزادہ فتح خاں کی قبر پر لگا ہوا ہے، یہ ۸۵۵ھ میں آیا تھا، بارہ وفات پر یہاں بڑا میلہ لگتا تھا۔ بدواؤنی نے مخدوم زادہ بغدادی غالباً شیخ رکن الدین کو ہی لکھا ہے کیونکہ یہ حاجی سعید کے دو سال بعد آیا تھا۔



سلطان کے نام خلیفہ کے اور بھی فرمان ورتین مرتبہ آئے۔ دوسری بار خلیفہ کی طرف سے مخدوم زادہ بغدادی آیا تھا۔ بادشاہ نے اس کا پیادہ پا پالم تک جا کر استقبال کیا۔ جب دُور سے اس کی سواری نظر آئی تو بادشاہ نے آگے بڑھ کر ملاقات کی۔ اُسے اپنے تخت پر برابر میں بیٹھا لیا۔ مخدوم زادہ کو سلطان نے کیلی کا شہر اور وہاں کی ساری اراضیات اور باغ جاگیر میں دے دیے تھے۔

۴۵ء میں کٹرہ کے حاکم ملک نظام الدین نے بغاوت کی تھی۔ عین الملک کے بھائی شہر اللہ نے اودھ کی طرف سے حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا اور یہ بغاوت جلد ہی ختم ہو گئی۔ اسی سال بیدر میں شہاب الدین نے علم بغاوت بلند کیا۔ بادشاہ نے قتلخ خاں کو اس کی طرف روانہ کیا۔ شہاب الدین تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد اپنے بیٹے سمیت قلعہ بند ہو گیا۔ قتلخ خاں نے اسے امن کا قول نامہ دے کر قلعہ پر قبضہ کر لیا اور اسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔

۴۶ء میں ظفر خاں علانی کے بھانجے علی شیر نے ایک بڑا جتھا بنا کر گلبرگہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر اس نے بیدر کے شاہی ناظم کو قتل کر کے کافی مال و سیلاب جمع کر لیا۔ قتلخ خاں نے علی شیر کو بھی شکست دی اور وہ بھاگ کر قلعہ بیدر میں محصور ہو گیا۔ قتلخ خاں نے اسے گرفتار کر کے مرگداری میں جو ضلع شمشاد میں واقع ہے اور جہاں شاہی لشکر ان دنوں مقیم تھا، بھیج دیا۔

۴۷ء کٹرہ ضلع الہ آباد میں گنگا کے کنارے شہر الہ آباد سے ۲۴ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ اکبر نے جب قلعہ اکبر آباد بنایا تو یہاں سے صوبہ کا مستقر قلعہ میں منتقل ہو گیا۔ اس قصبہ کی موجودہ آبادی چھ سات ہزار ہے۔ پہلے کبھی یہاں کا کاغذ بھی مشہور تھا۔

۴۸ء بیدر۔ یہ ریاست نظام حیدر آباد کا ضلع تھا۔ شہر حیدر آباد سے ۴۵ میل شمال مغرب میں ہے۔ بیدر بیدر شاہی بادشاہوں کا دارالخلافہ رہا ہے۔ بیدر میں تانبہ بھرت اور رنگ ملا کر ایک سیاہ دھات تیار کرتے ہیں، اس سے برتن، بٹن اور دوسرے نفیس تحفے تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کی خاص صنعت ہے۔ محمود گاہاں کا دربار بیدر کا قلعہ مشہور مقام ہے۔ بیدر تلنگانہ اور مرہٹوں کی سرحدوں پر واقع ہے اور نہایت پُر قبضہ مقام ہے۔

۴۹ء ابن بطوطہ اس باغی کوہ تاج الملک نائب سلطان نصرت خاں لکھتا ہے۔ فرشتہ نے وضاحت کی ہے: جب بادشاہ تلنگانہ سے واپس ہوا تو واپس میں پہنچا تو اس نے شہاب الدین سلطان کو نصرت خاں کا خطاب دے کر تلنگانہ بھیجا اور ایک کرور حکم کے عوض وہ علاقہ سے دے دیا۔ وہ چونکہ یہ رقم وہاں سے وصول نہ کر سکا اس لیے باغی بن گیا لیکن ابن بطوطہ نے لکھا ہے۔ ”جب بادشاہ واپس سے واپس لڑا تو دولت آباد اور بیدر کے راستہ میں بیمار ہو گیا اور اس کی وفات کی خبر پھیل گئی۔ یہ خبر سن کر نصرت خاں باغی ہو گیا۔ ضیاء الدین برنی کی تحریر سے فرشتہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ فرشتہ نے بھی یہ واقعہ ۴۵ء میں بتایا ہے، اس جگہ ابن بطوطہ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

۵۰ء گلبرگہ۔ یہ شہر دکن کے ہندو راجاؤں کی قدیم یادگار ہے تقریباً چھ سو سال مسلمان بادشاہوں کے زیر حکم رہا۔ آٹھویں صدی ہجری کے وسط میں ہمنی سلاطین کا دارالسلطنت بنا اس وقت یہ دکن کا سب سے زیادہ بارونق اور مرکزی شہر تھا۔ شہر کے گرد پختہ فصیل اور وسط میں نوارہ تھا جہاں سے چاروں طرف مڑکیں تھیں۔ مغربی جانب گلبرگہ کا قدیم قلعہ ہے کسی زمانہ میں یہاں شاہی محل تھی اب وہاں سے قلعہ کے وسط میں قرطبہ کے نمونہ پر ایک بڑی مسجد ہے جس کا صحن نہیں ہے، یہ مسجد ہمنی خاندان کے دوسرے بادشاہ محمود شاہ ہمنی کی یادگار ہے۔ سن ۱۷۶۷ء میں مغربی جانب فصیل پر سلاطین ہمنی کے مقبرے ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلہ پر دکن کے مشہور بزرگ میر سید گیسو داز کا روضہ ہے۔ ہمنی الدین بدشاہ دہلی کے خلیفہ تھے۔ ۵۱ء ہداؤنی نے اس باغی سردار کا نام ”علی شیر خواہر زادہ ظفر خاں علانی“ لکھا ہے۔ ابن بطوطہ اسے قتلخ خاں (جسے ہداؤنی نے قتلخ خاں لکھا ہے) کا ہمراہی بتاتا ہے اور اس کا نام علی شاد بتاتا ہے۔ اسے اس نے خوبصورت، نیک خصلت، بہادر اور ساقی ہی بہرا لکھا ہے اور یہ صراحت کی ہے کہ اس نے بدر کوٹہ یعنی بیدر کو اپنا دارالخلافہ بنایا تھا۔



بادشاہ نے ان قیدیوں کو پہلے تو غزنی کی طرف روانہ کرنے کا حکم دیا، پھر واپس بلوا کر ان کو قتل کر دیا۔

**عین الملک کی بغاوت** | سندھ میں اودھ اور ظفر آباد سے عین الملک کافی مال و اسباب اور نفیس تحفے بادشاہ کی نذر کے لیے لے کر آیا۔ بادشاہ نے اس نذرانہ سے خوش ہو کر طے کیا کہ قتلغ خاں کہ دکن سے بلا کر عین الملک کو اس کی جگہ بھیج دے اس تجویز سے عین الملک بجلے خوش ہونے کے دُور دراز اندیشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا وہم اس قدر بڑھ گیا کہ ایک رات موقع پا کر سرگرداری سے بھاگ کر گنگا عبور کی اور اودھ چلا گیا۔ اس کا بھائی شہر اللہ شاہی لشکر کے تمام ہاتھی اور گھوڑے جو چرائی کے لیے جنگل میں چھوڑ گئے تھے ہانکے گئے۔

بادشاہ نے عین الملک کی سرکوبی کے ارادہ سے کوچ کیا اور قنوج پہنچا۔ عین الملک کو اس کے بھائیوں اور ملک فیروز نائب باریک کے آدمیوں نے جو شاہی لشکر کے ہاتھی گھوڑوں کی رکھوالی اور چرائی پر متعین تھے، بادشاہ کے خلاف بہکایا اور مقابلہ پر آمادہ کیا۔ عین الملک نے گنگا اتر کر صف آرائی کر لی لیکن بڑی غلطی کی کہ ڈاکوؤں اور گنواروں کے طریقہ پر پیادہ ہو کر حملہ کیا۔ بادشاہ کے فیل سنواروں اور تیراندازوں نے گھیر کر اسے اپنی زد پر لے لیا۔ چنانچہ وہ جلد ہی میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کے دو بھائی جس میں سے ایک کا نام شہر اللہ تھا اور اس کے دوسرے بہت سے حامی سزا گنگا میں ڈوب کر مر گئے اور جو تیر کر بمشکل پار پہنچے ان کو جالوں اور گنواروں نے لوٹ لیا اور ہلاک کر دیا۔ اس وار و گیر میں عین الملک بھی پکڑا گیا اور اسے اس حال میں چار پائی پر بربہتہ جسم باندھ دیا گیا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ دن بعد بادشاہ نے اس کی سابقہ خدمات کا لحاظ کر کے رہا کر دیا اور پھر مزید مہربانی اور عنایت کا اظہار کر کے دوبارہ اس کا علاقہ بھی اسے عطا کر دیا۔

لے ہاؤٹی کے اس بیان کے خلاف ابن بطوطہ کی تحریر ہے: ”علی شاہ خود خلاف حکم غزنی سے سندھ آ گیا تھا۔ اسے بادشاہ کے پاس گرفتار کر کے لے گئے تو اس نے کہا: ”تو میرے ملک میں پھر فساد کرنے کے لیے آیا ہے۔“ پھر اس نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔  
ابو الفضل کے وقت ظفر آباد سرکار جون پور کا ایک محال تھا اسے علاؤ الدین خلجی کے وقت غالباً ظفر خاں نے آباد کیا تھا۔  
مگر فرشتہ احمدی اس کو بادشاہ کا استاد بتاتے ہیں یہ دولت آباد دکن کا صوبہ دار تھا ابن بطوطہ اس کو قتلوا خاں لکھتے ہیں۔  
گم سرگرداری۔ ضلع فرخ آباد کے قریب شمس آباد کے نواح میں ایک چراگاہ تھی، یہاں شاہی لشکر قحط کے زمانہ میں آکر ٹھہرا تھا اور عارضی مجوزہ سے بندھے تھے۔ اسی موقع کو سرگرداری کہتے ہیں۔

گنگا دیا کے گنگ ریاست گڑھوال میں کوہ ہمالیہ سے نکلتا ہے اور ۵۵۷ میل بہہ کر خلیج بنگال میں گر جاتا ہے۔ گنگوتری کی چوٹی جہاں سے ایک چشمہ باگیری نام کا نکلتا ہے۔ سمندر سے ۱۳۸۰۰ فٹ بلند ہے۔ جب باگیری کے ساتھ جہانوں اور الگ ننداشا مل ہو جاتے ہیں تو یہ سب مل کر گنگا کہلاتے ہیں۔ الگ ننداشا باگیری سے دیو پریاگ میں ملتی ہے اور ہرودار میں پہاڑ سے نکلتی ہے۔ پریاگ یعنی الہ آباد میں جہاں بھی گنگا سے آکر مل جاتی ہے۔ گنگا منبع سے لے کر وہاں تک ہندوؤں کے ہاں متبرک ہے۔ ویدوں کے زمانہ میں گنگا کے تقدس کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ یہ رتبہ اس نے غالباً پچھلے دو ڈھائی ہزار کے اندر اندر حاصل کیا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کے دریاؤں میں سے سندھ و گندھارا بہہ پتہ گنگا سے بھی لمبے دریا ہیں لیکن جس قدر بڑا حصہ اس دریا کا میدان سے گزرتا ہے اور اراضی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اس قدر کوئی دوسرا دریا نہیں پہنچاتا۔ سمندر میں گرنے سے ۲۲۰ میل پہلے اس کی بے شمار شاخیں ہو جاتی ہیں، سب سے بڑی شاخ کو میگن کہتے ہیں اور مغربی شاخ کو ہو گلی۔ ان دونوں کے درمیان بھی بے شمار شاخیں ہیں۔ ہمالیہ اور ہندوستان پہاڑوں کے درمیان کا تمام پانی اس دریا میں آتا ہے۔ ماہ سنی سے طغیانی شروع ہوتی ہے، ستمبر میں طغیانی شباب پر ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام دریاؤں میں اس کے شکم سے سب سے زیادہ پانی آکر سمندر میں گرتا ہے۔

اس بغاوت کے رفع ہونے کے بعد بادشاہ سرگدواری سے دہلی واپس آگیا۔

بادشاہ نے دولت آباد سے قلعہ خاں کو واپس بلالیا۔ قلعہ خاں نے سارے ملک وکن کو بخوبی سنبھال رکھا تھا اس کے وہاں سے ہلتے ہی وکن میں طرح طرح کے فتنے اڑ رہے تھے کھڑے ہوئے۔

**امراٹے صدہ کی سرکشی** | سلطان نے عزیز خمار کو جو ایک کمینہ اور پست فطرت آدمی تھا مالوے کی حکومت پر متعین کر دیا۔ اس نے بادشاہ کے اشارے سے وہاں کے اکثر امراٹے صدہ یعنی یوزباشی

کے امیروں کو قتل کر ڈالا، جس کی وجہ سے مالوے میں بھی بڑے فتنے پیدا ہو گئے۔ اس قتل کا حال سن کر شاہ نے میں گجرات کے امراٹے صدہ بھی بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ ان امیروں نے خواجہ جہان کے غلام مقبل نامی پر جو گجرات میں وزیر کا نائب مقرر ہوا تھا اور کافی خزانہ لے کر سلطان کے پاس جا رہا تھا، شب خون مارا اور تمام شاہی خزانہ، مال و اسباب گھوڑے وغیرہ لوٹ لیے۔ اس بغاوت کو دبانے کے لیے خود بادشاہ کو گجرات جانا پڑا۔ بادشاہ نے ملک علی سر جان دار اور احمد لاجپس کو بعض دوسرے امیروں کے ساتھ دولت آباد روانہ کیا تاکہ وہاں جا کر یہ لوگ وکن کے باغی امیروں کی سرکوبی کے لیے گجرات سے دیوہری اور بڑوڈہ کی طرف گیا تھا لیکن وہ بھی مقابلہ کرتے ہوئے گرفتار ہو گیا۔ ان ناکامیوں اور امیرانہ

۱۰ فرشتہ لکھتا ہے جس عرصہ میں بادشاہ سرگدواری میں رہا تو چار امیروں نے بغاوت کی (۱) نصرت خاں (۲) علی شاہ (۳) نظام مائیں (کٹوا) (۴) عین الملک (۵) اودھا، بداؤنی نے ان چاروں بغاوتوں کے جو سن دیئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) نظام مائیں ۱۷۵۵ء (۲) نصرت خاں ۱۷۵۶ء (۳) علی شاہ ۱۷۵۷ء (۴) عین الملک ۱۷۵۸ء ابن بطوطہ اس کے برخلاف ان تمام واقعات کو صرف سن ۱۷۵۲ء تک بتاتا ہے۔ برنی لکھتا ہے: سرگدواری سے آکر بادشاہ تین چار سال دہلی میں رہا اور یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ کو پورے چار سال گجرات، دولت آباد اور طغنی کی بغاوتوں میں لگے۔ اگر ہم فرشتہ اور بداؤنی کے قول کے مطابق عین الملک کی بغاوت کو ۱۷۵۶ء میں سمجھیں تو بادشاہ کی وفات (محرم ۱۷۵۸ء) میں صرف چار سال رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مدت سات آٹھ سال کی ہوتی ہے۔ اس لیے ابن بطوطہ کے علاوہ برنی کی روایت کے مطابق یعنی فرشتہ اور بداؤنی کا دیا ہوا سن غلط معلوم ہوتا ہے۔ ایڈورڈ ٹامس نے جو سکے جمع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا وہ سکہ جس میں بادشاہ نے خلیفہ کا نام ضرب کرایا ۱۷۵۸ء کا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ۱۷۵۸ء میں بادشاہ سرگدواری سے دہلی واپس آچکا تھا۔ کیونکہ خلیفہ مصر کا بیٹا سرگدواری سے بادشاہ کے دہلی واپس آنے کے بعد ہی فرمان خلافت لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس حساب سے بھی عین الملک کی بغاوت کا سن ۱۷۵۶ء یا ۱۷۵۷ء ہونا چاہیے، کیونکہ عین الملک کی بغاوت سرگدواری کے قیام کے دوران میں ہوئی تھی۔ عجیب بات ہے کہ محمد تقی کے سن ہمارے اکثر مورخوں نے غلط لکھے ہیں جیسا کہ حسن کاکو کی بغاوت کے سلسلہ میں بھی ہم اس غلطی کی صراحت کر آئے ہیں۔ ان کی تصحیح ابن بطوطہ کے سفر نامے اور ٹامس کے سکوں سے ہو جاتی ہے۔

۱۱ یوزباشی "ترکی میں سوسا تھیوں کے سردار کو کہتے ہیں۔

۱۲ بڑوڈہ۔ سورت سے ۸۱ میل پر یہ ہمارا جہا گائیک واٹر کا دارالسلطنت ہے اور سورت سے پہلے کا بسا ہوا ہے۔ اس وقت اس کی آبادی دو لاکھ ہوگی۔ یہاں کی جامع مسجد ۱۵۹۰ء کی تعمیر اور شاہی زمانہ کی یادگار ہے۔ موجودہ ہمارا جہا کی مملکت میں سورنے اور چاندی کی دو تاریخی توپیں بھی ہیں ریاست بڑوڈہ کا بانی پہلا جی گائیک کراڑ ہے جس نے محمد شاہ رنگیلے کے وقت میں خود مختاری اختیار کر لی تھی۔ ۱۷۶۱ء میں اس شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس نے چالیس برس تک گجرات اور کاٹھیاواڑ کے سب راجاؤں سے لڑائی کی اور ان کو اپنا باج گزار بنا لیا احمد آباد اور پٹن بھی اس کے قبضے میں آگیا تھا پہلے اس کی ریاست کامرکز جو ناگڑہ تھا۔ آخر میں بڑوڈہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بڑوڈہ کی موجودہ ریاست

(باقی صفحہ آئندہ پر)

کی خود سری کی خبریں سن کر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

جب ملک مقبل ملہ اور عزیز خمار کے یہ واقعات مشہور ہوئے تو سارے ملک میں ہر مقام کے امیران صدہ باغی بن بیٹھے سب نے اپنے اپنے گروہ بنا کر بادشاہ سے کھلم کھلا مخالفت شروع کر دی۔

**دولت آباد پر حملہ** | ان باغی امیروں نے ملک عالم کے کارندوں سے دولت آباد کا قلعہ بھی چھین لیا اور اسماعیل فتح خاں نامی ایک امیر کو سلطان ناصر الدین کا خطاب دے کر بادشاہ بنالیا۔

دیوہری اور بڑوہ کے امیران صدہ پر بادشاہ نے فوج کشی کی۔ وہ بھی شکست کھا کر دولت آباد آگئے۔ اس طرح دولت آباد باغیوں اور سرکشوں کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ سلطان نے پوری تیاری کے ساتھ دولت آباد پر حملہ کیا۔ اسماعیل مذکور نے شاہی لشکر کا تھوڑا بہت مقابلہ کیا، آخر شکست کھا کر اس نے دہرا نگر یعنی دولت آباد کے قلعہ میں پناہ لی۔ اس فتنے میں بھی ہزاروں مسلمان دولت آباد میں قتل و قید ہوئے۔ کچھ امرائے صدہ بیدہ کی طرف بھاگ نکلے۔ بادشاہ نے عماد الملک سرتیز کو ان کے تعاقب پر متعین کر دیا۔

ابھی بادشاہ ان باغیوں کی سرکوبی ہی میں مصروف تھا کہ گجرات میں غدر ہو جانے کی خبریں ملیں۔ معلوم ہوا کہ ملک تنی نے گجرات کے حاکم ملک مظفر کو قتل کر دیا ہے اور تمام گھوڑوں اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا ہے ان تشویشناک خبروں کے ملتے ہی بادشاہ نے ملک جوہر اور خداوند نادرہ قوام الدین اور شیخ برہان بلگرامی کو دہرا نگر چھوڑا اور خود تلنگانہ سے گجرات

(بقیہ حاشیہ بسلسلہ بڑوہ صفحہ گزشتہ) ۱۸۵۲ء میں انگریزوں سے معاہدے کے تحت متعین ہوئی۔ اس ریاست کا کل رقبہ ۸۵۰۰ مربع میل ہے۔ ریاست کے مشہور فرماں روا گنپت راؤ گائیگ کو ۱۸۴۷ء کو ناٹے راؤ گائیگ داڑ ۱۸۵۶ء گزرے ہیں۔ اب یہ ریاست بھارت یونین میں شامل کر لی گئی ہے۔

۱۸۵۶ء میں بطلوہ کتا ہے یہ وزیر خواجہ جہاں کی طرف سے گجرات اور یہ والہ کا حاکم تھا۔ اس کا صحیح نام ملک مقبول تھا۔ ملک مقبول نے والا اور وہاں کا ایک صاحب کے پاس بڑے عہدے پر فائز تھا۔ جب یہ راجہ بادشاہ سے ملنے دہلی آیا تو یہ بھی اس کے ساتھ دہلی آ کر مسلمان ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کا نام مقبول رکھا تھا۔ اس وقت کی سرکاری زبان فارسی سے واقف نہیں تھا۔ لیکن نہایت ہوشیار اور عقلمند آدمی تھا کچھ دن بعد ہی بادشاہ نے اسے قوام الملک کا خطاب دے کر ملتان کا حاکم مقرر کیا۔ اسی کا لڑکا جو نانا شاہ نامی گزرا ہے۔ فیروز شاہ نے احمدیائے خواجہ جہاں کے مرنے کے بعد ملک مقبول کو اپنا وزیر بنا کر خواجہ جہاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا جو نانا شاہ وزیر علی اور خواجہ جہاں بنا اور بیس سال تک اس عہدے پر معمور رہا۔ شاہ جہاں آباد کے ترکمان دروازے کے انتظامی رکلاں مسیحی خواجہ جہاں شاہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس مسجد کا سن تعمیر ۱۸۹۹ء ہے۔

۱۸۵۷ء ناصر الدین تمام مورخ متفق ہیں کہ دولت آباد کے باغیوں نے پہلے جس شخص کو بادشاہ بنایا وہ اسماعیل ہی تھا۔ بناؤنی اس کا نام اسماعیل فتح کتا ہے۔ کچھ دوسرے اسماعیل فتح افغان بتاتے ہیں۔ لیکن ابن بطوطہ اس کو دولت آباد کے ملک مل کا لڑکا اور اس کا نام ناصر الدین لکھتا ہے۔ ملک مل دولت آباد کے راجہ کا نو مسلم لڑکا تھا۔ ابن بطوطہ نے یہاں غلطی کی ہے کسی ہم عصر کا شعر بھی اس کا تردید کرتا ہے۔

سماعیل فتح را در راں دارو گیر بشا ہی بخواندند شاہ نصیر  
تلنگانہ۔ نظام حیدر آباد کی ریاست دو علاقوں پر مشتمل تھی، ایک تلنگانہ جو جنوب مشرقی سمت تھا، دوسرا مرہٹو اڑہ شمال مغربی جانب تھا۔ تلنگانہ وہ علاقہ جہاں تلنگی یا تلگو زبان بولی جاتی ہے اور مرہٹو اڑہ جہاں کی زبان مرہٹی ہے وکن میں ان دو بڑی زبانوں کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

چلا گیا۔

بادشاہ کے جاتے ہی امیرانِ صمدہ جو دولت آباد سے بھاگ گئے تھے پھر اکٹھے ہو گئے، عماد الملک حسن کانکو بہمنی سرنیز سے مقابلہ کر کے اسے قتل کر دیا اور دولت آباد پر حملہ کر دیا۔ ملک جوہر اور قوام الدین وغیرہ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور شہر خالی کر کے بھاگ گئے۔ حسن کانکو نے جو تمام امیرانِ صمدہ کا سردار اور اس بغاوت کا سرغنہ تھا شہر پر قبضہ کر لیا اور اسماعیل فتح کو علیحدہ کر کے خود سلطان علاؤ الدین کے خطاب سے بادشاہ بن گیا۔ اس وقت سے دولت آباد کی سلطنت اس کے خاندان سے مخصوص ہو گئی۔ واضح رہے "تاریخ فتوح السلاطین" بھی اسی کے نام پر نظم میں لکھی گئی ہے۔

(بقیہ حاشیہ تلنگانہ صفحہ گذشتہ) علاوہ کنٹری، تامل، ملیالم بھی بولی جاتی ہیں۔ تلنگانہ دریائے نریدا کے جنوب اور کرشنا کے شمال میں واقع ہے۔ قدیم کتابوں میں اس ملک کا نام لنکا اور آندھرا درج ہے۔ موجودہ بھارتی حکومت نے بھی جنوب کے تلگو پورے واسے اور ریاست نظام کے تلنگانہ کے علاقہ کو ملا کر آندھرا کا صوبہ بنایا ہے۔ بلیمس نے اس کا نام کانگا لکھا ہے اور بلینا اس نے دونوں نام لیے ہیں۔ اس علاقہ کا قدیم دارالحکومت واندنگول تھا جسے اب درنگل کہتے ہیں۔ بلندہ حیدر آباد نظام کا دارالسلطنت اور موجودہ صوبہ آندھرا کا مرکز بھی تلنگانہ میں ہے۔

اسے حسن کانکو۔ یہ دہلی کا رہنے والا تھا۔ ایک برہمن نے اس کی خدمت گزاری سے خوش ہو کر یہ بشارت دی تھی کہ تجھے بادشاہی ملے گی اور یہ اقرار دیا تھا کہ جب تو بادشاہ ہو جائے تو اپنے نام کے آخر میں میرا نام بھی شامل کرنا۔ چنانچہ کانکو بہمنی اسی شرط کی تکمیل میں اس کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں شیخ نظام الدین اولیاؒ نے بھی اسے بادشاہت کی بشارت دی تھی۔ مصیبت کے دنوں میں حسن دولت آباد چلا گیا اور وہاں قلعہ خاں کے پاس ملازم ہو گیا۔ جب اسماعیل ناصر الدین کو امرائے صمدہ نے دولت آباد میں بادشاہ بنالیا تو حسن کو ظفر خاں کا خطاب اور گلبرگہ جاگیر میں ملا تھا، اس وقت جس نو ہزار سپاہیوں کا سردار تھا۔ حسن کانکو نے اطراف و اکناف کے حاکموں کو شکست دے کر کافی طاقت پیدا کر لی اور اس کی جمعیت بیس ہزار ہو گئی۔ پھر وہ ایک مہینہ تک دہلی کے بہر سے جو دکن کی مہم پر آیا تھا لوٹا رہا۔ اس لڑائی میں غازی الملک مارا گیا اور حسن کانکو کے پاس اس فتح سے کافی مالِ غنیمت اور دولت جمع ہو گئی اس وقت تک وہ اسماعیل مخ ناصر الدین کا برابر حامی بنا رہا۔ آخر کاماس کے پاس پچاس ہزار فوج ہو گئی۔ انہی دنوں اسماعیل مخ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور امرائے صمدہ نے مشورہ کر کے ۱۷۴۷ء میں ۲۴ ربیع الآخر یہ وزجمع اسے تخت شاہی پر بٹھادیا۔ اس کا لقب سلطان علاؤ الدین حسن کانکو بہمنی تھا۔ دارالسلطنت گلبرگہ تھا جس کا نام اس نے حسن آباد رکھ دیا تھا۔ اپنے قدیم آقا کانکو برہمن کو بلا کر فرائض اس کے سپرد کی۔ اسماعیل مخ کو امیر الامراء کا عہدہ ملا۔ اس نے کولاس، درنگل، کونامک، دکن کا کافی بڑا علاقہ فتح کیا۔ گجرات کو فتح کے خیال سے روانہ ہوا تھا کہ تپ محرقہ میں مبتلا ہو گیا۔ گلبرگہ میں پچھ ماہ تک بیمار رہ کر غرہ ربیع الاول ۱۱۵۷ء میں ۶۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مدتِ حکومت گیارہ برس ورمہ سات دن "سراج التواریخ" اور "بہمن نامہ" و "کنی" میں اسے ایلیا کے بہمن اور اسفندیار بادشاہوں کی اولاد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ بہمن نامہ علامہ شیخ آذری کی تصنیف ہے۔ کتب خانہ "نظام شاہیہ" کی ایک کتاب میں اسے بہرام گور کی اولاد بتایا گیا ہے اور باقاعدہ اس کا سلسلہ کی قباد سام اور بہرام گور تک ملایا گیا ہے۔ حسن کانکو نے جس بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی اس نے اس قدر ترقی کی کہ سارا دکن بہمنی بادشاہوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس خاندان کے بیس بادشاہوں نے حکومت کی۔ اس عہد میں دکن صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن، علم و فن کا مرکز بن گیا تھا اور شمال کی ساری رونق جنوب میں کھینچ آئی تھی حسن کانکو کے زمانہ کے مشہور اہل علم شیخ عین الدین بیجا پوری اور شیخ محمد سراج گذرے ہیں۔



**محمد تغلق کی پریشانیوں** | ادھر گجرات میں ملک طغی نے دو مرتبہ شاہی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہ قزاقوں کی طرح جگہ جگہ مارا مارا پھرتا تھا۔ بادشاہ بھی برابر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے بادشاہ نے دہلی سے ملک فیروز کو بھی بلا لیا تھا۔

اسی سال ملک گیر نے جو ملک قبول کا بیٹا تھا انتقال کیا۔ بادشاہ کے سارے معاملات کی سربراہی اسی کے ہاتھ تھی۔ اسی کی طرف سے بادشاہ نے ایک خط مصر کے خلیفہ مہباسبی کے پاس حاجی برقعی کے ہاتھ روانہ کیا تھا۔ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کے اس آخری عہد میں سارے ملک کا انتظام احمدایا زخواجہ جہاں، ملک قبول، ام الملک دہلی میں بیٹھ کر سرانجام دیتے تھے۔ بادشاہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرگرداں پھر رہا تھا۔ اس وقت بغاوتوں اور فتنوں کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف کے بندوبست سے بادشاہ فارغ نہیں ہوتا تھا کہ دوسری طرف غدر برپا ہو جاتا۔

**محمد تغلق کی غلطیاں** | سلطان محمد تغلق کے اس آخری عہد میں ملک کی جوتباہی اور بربادی ہوئی اس کی بہت سی وجوہ تاربخ "فیروز شاہی" اور "مبارک شاہی" کے مصنفوں نے تحریر کی ہیں۔ ان تمام اسباب و وجوہ خلاصہ یہ سات باتیں ہیں :-

اول :- نرمہ شیریں مغل کی تباہ کن غارتگری۔  
دوم :- دوآبہ کے وسیع علاقہ میں دس گنا اور بیس گنا محصول مقرر کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ گاؤں شماری اور خانہ شماری اور اجرات علیحدہ وصول کیے گئے اور غریب رعایا تنگ آکر مفسد امیروں کے حتمہ میں شامل ہو گئی اور بغاوت و غارتگری کا یہی سلسلہ شروع ہو گیا اس طرح محصول زیادہ وصول ہونے کے بجائے اور کم ہو گیا اور سارے دوآبہ کا علاقہ بڑ گیا۔  
سوم :- ایک طویل اور تباہ کن قحط پڑا جو سات سال تک جاری رہا۔  
چہارم :- بادشاہ نے دہلی کو برباد کر کے دولت آباد بسانا چاہا اور جب ساری دہلی اجڑ گئی تو اس میں گرد و نواح کے لوگوں کو لا بسایا گیا۔ پھر انہیں بھی جبراً دولت آباد ہانک دیا۔ اس جلا وطنی سے دہلی والوں کا سارا مال و متاع تلف ہو گیا اور وہ سارے سال بھر نصیب نہ ہو سکا۔

پنجم :- کہ ہمالیہ کی مہم میں اسی ہزار کا راستہ ویرانہ لشکر تمام کا تمام تباہ ہو گیا اور ان کے گھر بار تباہ و برباد ہو گئے۔  
ششم :- لوگوں کو بادشاہ کی خوں ریزی کے شوق کی وجہ سے اپنی اپنی جانوں کا بڑا ڈر ہو گیا تھا۔ مجبور ہو کر انھوں نے ہر کسی اور بغاوت کی راہ اختیار کی۔ ان فتنوں میں بہت سی مخلوق خداماری گئی اور شاہی کارندوں نے اکثر پر بھوٹی تہمتیں لگائیں اور ان کے خاندانوں کو قتل کر دیا۔ غرض ہر طرح مخلوق تباہ اور شرویان ہونے لگ گئے۔

ہفتم :- بادشاہ کو قتل و خونریزی کا کچھ ایسا جنون اور شوق تھا کہ اس نے سیدوں، عالموں، مشائخوں، شریفوں، بیٹوں، پیشہ مندوں، تاجروں، کسانوں اور سپاہیوں غرض ہر طبقہ اور ہر گروہ کے بے شمار آدمیوں کو بے تامل قتل کر دیا۔ چنانچہ کے دسواں ہزار پر عموماً لاشوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ جلا دمارتے مارتے اور بھنگی اٹھاتے اٹھاتے عاجز آ گئے تھے۔ مگر

نہ رعایا فساد سے باز آتی تھی اور نہ بادشاہ خونریزی سے۔

آخر اس کثرت سے فتنے برپا ہوئے کہ بادشاہ عاجز آ گیا۔ اسے ان بغاوتوں کی وجہ سے اتنے سفر کرنے پڑے کہ دم بھر کے لیے چین لینا حرام ہو گیا لیکن اس بندہ خدا نے تنوار نیام میں نہ کی، حالانکہ اس خوں ریزی سے بجائے کسی فائدے کے روز بروز خرابیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

## خونی شاہ

سلطان محمد تغلق کو غالباً سزائیں دینے میں خاصا لطف ملتا تھا، اس نے اسے اپنا مشغلہ بنا رکھا تھا۔ وہ بڑے اہتمام کے ساتھ سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس کی عدالت میں چار مفتی علیحدہ علیحدہ مقرر تھے جب کوئی شامت کا مارا کسی جرم میں پکڑا ہوا آتا تو بادشاہ اس کو سزا دینے کا تہیہ کر کے ان مفتیوں سے باقاعدہ بحث کرتا۔ مفتیوں کو یہ تاکید بھی کر رکھی تھی کہ تم سچ کہنے میں ہرگز ہرگز کوتاہی نہ کرنا، اگر کوئی ناحق مارا گیا تو اس کا مواخذہ تمہاری گردن پر ہوگا۔ ان مفتیوں سے جی بھر کر جرح اور بحث کرنے کے بعد انھیں قائل کرتا اور خواہ آدمی رات ہی کا وقت کیوں نہ ہو مجرم کی گردن مار کر ہی دم لیتا، صبح تک انتظار کرتا اس کے لیے دو بھر ہو جاتا تھا۔ اگر مفتیوں کی کسی پُر زور دلیل خود اسے قائل ہو جانا پڑتا تو مقدمہ کو دوسرے وقت کے لیے ملتوی کر دیتا، پھر فرصت میں مفتیوں کے دلائل کے جوابات سوچ کر ان سے دوبارہ بحث کرتا۔ اس بحث میں مفتی اور قاضی لاجواب ہو جاتے تو اسی وقت مجرم کو قتل کر دیتا تھا اور اگر اس بار بھی خود اسے بحث میں ناکامی ہوتی تو چار دن چار مجرم کی جان بخشی پر راضی ہو جاتا۔

## شیخ زادہ جام کی ختی کوئی

ایک بار قاضی کمال الدین صدر جہاں کی عدالت میں پیادہ پا چلا گیا اور استغاثہ کیا کہ شیخ زادہ جامی نے مجھ کو ظالم کہا ہے اس کو طعنا کر دتا کہ وہ میرا ظلم ثابت کرے، اگر

اے بادشاہ کی خوں ریزی۔ ابن بطوطہ سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ خوں ریزی برنٹا دیر تھا، ایسا کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ اس کے دروازہ پر کوئی شخص قتل نہ کیا جاتا ہو۔ اکثر دروازے پر نعشیں پڑی رہتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے اس کے مقتولین میں اس کے بھائی مسعود شیخ شہاب الدین احمد جام خراسانی فقیہ عقیف الدین کاشانی۔ شیخ رکن الدین طائی کے پائے، شیخ زادہ ہود۔ شیخ شمس الدین ابن تاج العارفین۔ باشندہ کوئٹل اور کھمبایت کے شیخ حیدری کا نام خاص طور پر لیا ہے۔

۱۵ شیخ زادہ جامی۔ ابن بطوطہ کہتا ہے: شیخ شہاب الدین شیخ احمد جام خراسانی بڑے شیخ تھے، چودہ دن تک برابر روزہ رکھتے تھے سلطان قطب الدین اور سلطان تغلق ان کے معتقد تھے۔ سلطان محمد تغلق کے ساتھ بتدریج ان کے تعلقات بہت اچھے تھے، بادشاہ بھی بہت لحاظ کرتا تھا، لیکن بعد میں یہ تعلقات کشیدہ ہو گئے، چنانچہ بقول ابن بطوطہ بادشاہ نے ان کو بلایا، وہ نہیں گئے اور صاف صاف کہہ دیا میں اس ظالم بادشاہ کی خدمت ہرگز نہ کروں گا۔ بادشاہ نے انھیں پکڑ لیا اور ظالمی کی وجہ پر بھی شیخ نے۔ شہر دہلی اجاڑنے (بقول ابن بطوطہ) کا ذکر کیا۔ چودہ دن تک قید میں رہے اور قتل کر دیئے گئے۔ (بحوالہ ابن بطوطہ)

شیخ شہاب الدین جامی شیخ الاسلام احمد جام زندہ پیل کی اولاد میں سے تھے اور یہ بزرگ حضرت جرید بن عبد اللہ بکلی کی اولاد میں سے تھے احمد جام زندہ پیل کے متعلق مشہور ہے کہ ۲۲ سال تک بالکل امی رہے بعد میں ان پر سارے علوم کا کشف ہوا۔ ان کی تصنیفات میں سورہیں۔ ان کے ہاتھ پر ایک لاکھ اسی ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ ان کی پیدائش ۵۳۰ھ میں اور وفات ۵۳۵ھ میں ہوئی۔ مشہور فارسی شاعر مولانا عبدالرحمن جامی نے انہی کی نسبت سے اپنا تخلص جامی رکھا۔ ہالیوں کی بیوی اور اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم انہی بزرگ احمد جام کی اولاد میں سے تھی۔ (بحوالہ سفینہ دارا شکوہ)

نہ کر سکے تو اس پر تم شرعی حد جاری کرو۔ عدالت کے حکم سے شیخ زادہ موصوف حاضر ہوئے اور علانیہ اقرار کیا کہ ”میں بے ریب و شک تم کو ظالم کہتا ہوں“ بادشاہ نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ”جس کسی کو تم سزا دیتے ہو اس کے اہل و عیال کا کیا قصور ہوتا ہے کہ تم ان کو بھی جلاوٹ کے حوالے کر دیتے ہو؟ یہ کون سے مذہب و ملت میں جائز ہے؟“

یہ سن کر بادشاہ کو چپ لگ گئی، کوئی جواب نہیں بن پڑا، اپنا سامنہ لے کر عدالت سے اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن ظالم نے اس حق گو بیباک شیخ زادہ کو آہنی پنجرہ میں قید کر دیا۔ جب دولت آباد گیا ہے تو اس مظلوم مرد خدا کا پنجرہ بھی ہاتھی پر رکھا ہوا ہمراہ تھا۔ دولت آباد سے لوٹ کر دہلی آیا تو اس خونی سلطان نے دارالقضا کے آگے پنجرہ کھلوا دیا اور شیخ زادہ کو باہر نکال کر اپنے سامنے اس کے دو ٹکڑے کرادیئے۔

سلطان محمد عادل شاہ تغلق کی شخصیت بھی عجیب مجموعہ صفت اور تھی۔ نام عادل تھا رینہ عم خود عدل و فیاضی کا پورا اہتمام کرتا تھا، لیکن طبعی، اچھا ظلم و خون ریزی کی طرف تھا۔ اس کی خوں ریزیوں کی وجہ سے اس کا لقب بھی ”خونی شاہ“ پڑ گیا تھا۔

جب سلطان محمد تغلق کا ظلم و جور حد سے سوا ہو گیا تو ملک کے نظم و نسق اور امور مملکت میں **ٹھٹھہ پر چڑھائی** بڑا خلل ادا انتشار پیدا ہو گیا اور وہ اپنی پوری سعی و جہد کے باوجود ان فتنوں کا کسی صورت بھی تدارک نہ کر سکا۔ اپنی اس بے بسی اور لاچارگی پر اسے اس قدر رنج و غم ہوا کہ آخر کار اس غم نے تپن کی صورت اختیار کر لی۔ اسی حالت مرض میں بادشاہ نے آخری کوشش کی اور ٹھٹھہ پر جہاں ملک طغی نے پناہ لے رکھی تھی یورش کی۔ خوش قسمتی سے اسی موقع پر شاہ خراسان کے نائب قرغن نے التون ہادر کی سرکردگی میں پانچ ہزار سوار اس کی کمک کے لیے روانہ کیے۔ اس بروقت امداد سے بادشاہ کو بڑی خوشی اور ایک گونہ اطمینان ہو گیا، جس سے اس کے مرض میں بھی قدرتی طور پر کچھ کمی ہو گئی۔

غرض جب وہ یہ لاؤ لشکر لے کر ٹھٹھہ میں داخل ہوا تو عاشورہ کے دن اس نے روزہ **محمد تغلق کی وفات** رکھا۔ ان دنوں گرمی کافی شدت سے پڑ رہی تھی، اس پر یہ حرکت کی کہ افطار میں مچھلی کھائی، مرض نے یکبارگی شدت پکڑ لی اور اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔ سلطان محمد عادل شاہ تغلق نے ۲۱ محرم ۸۵۷ھ کو ٹھٹھہ میں انتقال کیا اور ہندوستان کی رعایا کو اس کے خونی پنجرے سے رہائی ملی۔

لے خراسان۔ ایمان کا ایک بڑا صوبہ ہے، دارالخلافہ مشہد ہے جہاں آٹھویں امام علی بن موسیٰ رضا کا مقبرہ ہے۔ تقریباً پورے دو لاکھ کی آبادی ہے۔ ایک جانب کے علاقہ کو سرولایت اور دوسرے کو پائین کہتے ہیں۔ طوس۔ نیشاپور۔ سبزوار۔ خراسان کے بڑے شہر ہیں۔ یہاں کے قبائل میں اعوان، شاد، توہڑے قبیلے گزرے ہیں۔ یہ صحرائیں اور گلہ بان ہیں۔ ہندوؤں کے نشانہ میں ماہر ہوتے ہیں۔ یہاں کے ایک قبیلہ افشار سے مشہور فاتح نادر شاہ کا تعلق تھا۔

اس کے زمانہ کے مشہور شاعروں میں بدہ شاشی گزرا ہے جس نے اس کے نام پر تیس ہزار اشعار پر مشتمل ایک شاہنامہ نظم کیا ہے۔

## سلطان فیروز شاہ

فیروز شاہ سلطان محمد عادل کا چچا زاد بھائی تھا۔ سلطان محمد نے مرتے وقت اسے جانشین اور ولی عہد بنایا تھا چنانچہ اس کے انتقال پر فیروز شاہ نے اسی سن ۷۵۲ھ میں ٹھٹھہ کے نواح میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ اس کی تخت نشینی میں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور مخدوم زادہ عباسی بغدادی کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ عوام میں اس کا عام چرچا تھا کہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی نے بادشاہ کی زندگی ہی میں فیروز شاہ کو برسر اقتدار لانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں

بادشاہ کو بھی ان حضرات کی کوششوں کا علم ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ان پیر و مرید **حضرت چراغ دہلوی** (یعنی فیروز شاہ) دونوں کو دہلی سے قید کر کے ہمارے لشکر میں لے آؤ۔ شاہی کارندے حسب الحکم ان دونوں کو قید کر کے لے چلے لیکن جب ہانسی کے قریب پہنچے تو ملک فیروز نے محافظوں کو کسی نہ کسی طرح راضی کر کے حضرت شیخ بدالدین بنیرہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسی کی خدمت میں حاضری کی مہلت لے لی جب

کہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے خلیفہ بزرگ تھے۔ ان کے وصال پر دہلی کی ولایت شیخ چراغ دہلوی سے متعلق ہو گئی۔ ان کے دوا مہید اللطیف یزدی تھے، والد کا نام بھی تھا اور یہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے، لیکن چراغ دہلوی کی ولادت اودھ میں ہوئی۔ ابتداء میں مولانا عبدالکریم شیروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی آکر سلطان المشائخ کی ارادت و عقیدت سے وابستہ ہو گئے، حضرت نے ان کو محمود گنج کا خطاب اور چراغ دہلوی کا لقب عطا کیا کہتے ہیں سلطان محمد تغلق نے جو عام طور مشائخ کا مخالف تھا، ایک دن چراغ دہلوی کو اپنے پاس دعوت دی اور کھانا سونے چاندی کے برتنوں میں پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کھائیں تو ان پر حجت شرعی قائم ہو جائے کہ سونے چاندی میں کھا کر حرام کے مرتکب ہوئے اور نہ کھائیں تو بادشاہ کی حکم عدولی میں سزا دی جائے۔ حضرت اس کی نیت بھانپ گئے۔ آپ نے تھوڑا سا کھانا ان برتنوں میں سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور کراہت سے کھالیا حسد ایک دوسرے کا منہ نہ کھتے رہ گئے آپ کے خلفاء میں میر سید محمد گیسو دراز گزرے ہیں جن کا مزار گلبرگہ دکن میں ہے۔ مخدوم جہانیاں جلال الدین جہاں گشت جیسے بڑے بزرگ آپ کے مرید تھے ۶۵ سال کی عمر میں شب جمعہ ۸ ماہ رمضان المبارک ۷۵۲ھ میں وصال فرمایا۔

۷۵۲ھ ہانسی۔ یہ شہر ضلع حصار میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ موجودہ آبادی سولہ ہزار کے قریب ہے۔ ابن بطوطہ کہتا ہے: "یہ خوبصورت اور مستحکم شہر ہے اس کی تفصیل بھی اونچی ہے، اسے ایک ہندو راجہ نے بنایا تھا" ابن بطوطہ "تورا" راجہ اشک پال تو کہہ رہا ہے جس نے یہ شہر بسایا تھا۔ ۷۵۲ھ میں قحط سے یہ ویران ہو گیا تھا۔ ۷۹۵ھ میں جارج طامس نے دوبارہ آباد کیا، ۸۵۲ھ میں سرکار انگریزی کے مکمل قبضہ میں آ گیا اور یہاں فوجی پھاؤ فی قائم ہوئی۔ شہاب الدین خوری اور محمود غزنوی نے بھی اس شہر پر حملہ کیا تھا۔ آئین اکبری میں صرف اتنا لکھا ہے "قلعہ داروازہ شست بختہ"

۷۵۲ھ شیخ بدالدین۔ ایک شیخ بدالدین اسحاق سمرقندی کا ذکر غزنیۃ الاصفیاء میں ملتا ہے جو شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے ہندوستان آکر نظام الدین اولیاء کی خدمت میں رہے۔ ۷۵۲ھ میں موضع شگولہ میں وفات پائی۔ یہ بدالدین کوئی دوسرے بزرگ ہیں کیونکہ یہ ۷۵۲ھ بقید حیات ہیں۔



اتفاق کی بات کہ اسی دن بادشاہ کا بیٹا کہیں شکار پر گیا ہوا تھا اور باپ کے آخر وقت موقع پر موجود نہ تھا جب بادشاہ کا انتقال ہو گیا تو فیروز شاہ اراکین سلطنت کی تائید و اتفاق سے تخت پر بیٹھ گیا اور بادشاہ کے بیٹے کو علیحدہ کر دیا۔

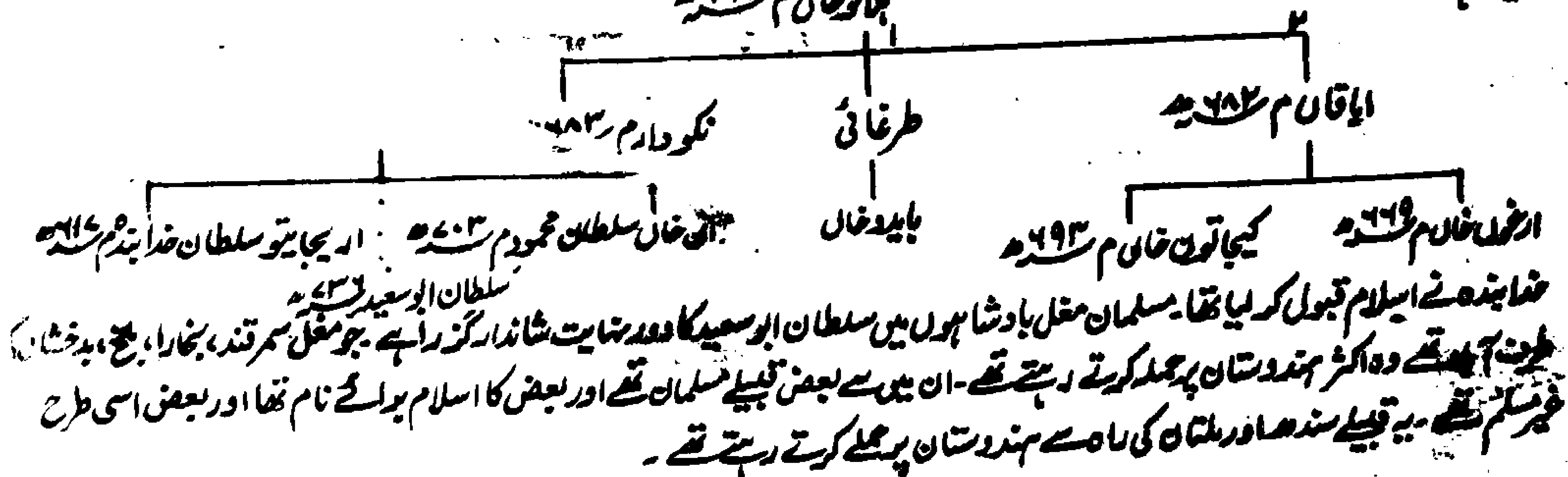
جب فیروز شاہ ٹھٹھ سے دہلی آیا تو اس نے حضرت شیخ بدر الدین کی خاتقاہ اور لنگر کے لیے ہانسی کے ماتحت ضلع چوراسی کو وقف کر دیا۔

عام طور سے یہ دلچسپ واقعہ بھی مشہور ہے کہ سلطان محمد تغلق نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کو اپنی جامہ داری کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ ایک دن آپ نے اس کے کپڑے میں گرہ لگا کر فرمایا ”نصیر الدین بندہ و خدا کشاید“ کہتے ہیں اسی دن سلطان محمد کا انتقال ہو گیا۔

**مغلوں کی شورش** | سلطان محمد تغلق شاہ کے انتقال کی خبر سن کر مغل شہر اٹھانے لگے۔ انہوں نے شاہی لشکر پر چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ چنانچہ فیروز شاہ نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ لشکر کے ساتھ جو مغل ہیں ان کا گروہ شاہی لشکر سے علیحدہ فاصلے پر منزل کیا کرے۔ اس احتیاط کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو بادشاہ نے بذاتِ خود نگہبانی اور نگرانی کا فرض انجام دیا اور ان مغلوں کی اچھی طرح گوش مالی کر کے فوج کو ان کی

۱۷ مغل۔ وسط ایشیاء کے مشہور خونی فاتح چنگیز خاں کے زمانہ یعنی چھٹی صدی ہجری میں مغلوں کے مختلف قبیلے چین سے لے کر بحر روم کے کناروں تک پھیل گئے۔ چنگیز خاں کے چار بیٹے تھے: سب سے بڑا تو لے خاں، دوسرا اوکتائی قاآن، تیسرا چغتائی، چوتھا جو جی۔ چنگیز کے بعد اس کا جانشین اوکتائی قاآن ہوا، اس کے بعد اس کا بیٹا کیک قاآن۔ اس کے بعد تو لے خاں کا بیٹا منگو قاآن قائم مقام ہوا۔ اس کے بعد قوبلاک چین میں بڑا قاآن ہوا۔ اس نے اپنے بھائی ہلاکو خاں کو ایران کا امیر ایل خاں، رما تحت بادشاہ) بنا دیا۔ یہاں سے ہلاکو کی اولاد ایران پر حکومت کرتی رہی اور قوبلاک کی چینی میں۔ ان کے درمیان رسمی ماتحتی کے سوا کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہلاکو کے بیٹوں کا سلسلہ نسب مندرجہ ذیل ہے:

ہلاکو خاں ۱۲۶۳ء



دست درازیوں سے نجات دلائی

## خواجہ جہاں کی اطاعت

فیروز شاہ سیلوستان کی راہ سے متواتر کوچ کرتے ہوئے دہلی پہنچا۔ یہاں احمد یاز خواجہ جہاں ایک مجہول النسب لڑکے کو غیاث الدین محمود شاہ کا خطاب دے کر بادشاہ بنا بیٹھا تھا اور خود اس کا وکیل بن گیا تھا، لیکن اس کے لیے کچھ نہ بنا اور فیروز شاہ کی بادشاہت قائم ہو گئی۔ آخر بڑی رد و قح اور گفت و شنید کے بعد خواجہ جہاں اشرف الملک اور دوسرے امراء کی وساطت سے ہانسی آیا اور پگڑی گلے میں ڈال کر شاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے معاف کر کے ہانسی کے کوتوال کے حوالہ کر دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس کا رروائی میں خواجہ جہاں کے شریک تھے مختلف سمتوں میں منتشر کر دیا۔

جس دن فیروز شاہ نے دہلی جاتے ہوئے سرستی میں منزل کی تھی اسی دن شاہزادہ فتح خاں کے پیدا ہونے کی خوشخبری ملی تھی اور اسی جگہ گجرات سے ملک طنی کے فتنہ و فساد کی بھی اطلاع آئی۔

## فیروز شاہ کی تخت نشینی

فیروز شاہ نے ۲ رجب ۷۵۲ھ میں دہلی کے تخت پر جلوس کیا اور امرا کو از سر نو منصب کیا اور پائے تخت واپس آگیا۔ اسی سال ماہ رجب میں شاہزادہ محمد خاں کی ولادت ہوئی جس کا بعد میں ناصر الدین محمد خطاب ہوا۔ ۷۵۲ھ میں سلطان کلانور کی طرف شکار کے لیے گیا اور دریائے سرستی کے کنارے ایک عمدہ اور وسیع عمارت بنوا کر شیخ صدر الدین ملتانی کے حوالہ کی۔ ملک قبول نائب وزیر کو خان جہاں کا خطاب عطا کیا۔

۷۵۲ھ کے آخر میں فیروز شاہ نے بنگال کے باغی حاکم حاجی الیاس کی سرکوبی کے لیے لکھنوتی پر حملہ کیا۔ یہاں حاجی الیاس نے شمس الدین خطاب رکھ کر مستقل بادشاہی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ شاہی لشکر سے ڈر کر حاجی نے بنگال کے سب سے زیادہ مضبوط قلعہ اکدالہ میں پناہ لے لی لیکن چند ہی حملوں میں اسے ہتھیار رکھ دینے پڑے اور اس کا بہت سا ساز و سامان فیروز شاہ کے ہاتھ آگیا۔ سوء اتفاق سے بارش کا موسم سر پہ آگیا جس سے مجبور

۱۵ سیوستان۔ فرشتہ نے محمد بن قاسم ثقفی کے ذکر میں لکھا ہے: ”مجھے از معتبران شہر ہمراہ گرفتہ متوجہ بلدہ سیوستان کردہ میں عصر بسیموان شہر دار و گردید۔“ ابن بطوطہ کہتا ہے: ”یہ ایک بڑا شہر ہے اور ایسے ریگستان میں ہے جس میں سوائے لیکر کے کوئی اور درخت نہیں پھلی اور بھینس کا دودھا فراط سے ملتا ہے۔ یہاں کے باشندے سقنقور یعنی ریگ ماہی کھاتے ہیں۔ گرمی نہایت سخت پڑتی ہے۔“ سیوان یا سیوان ضلع کراچی کا ایک قصبہ ہے کراچی سے ۱۹۰ میل پر ہے، آبادی ۵۸ ہزار سے زائد ہوگی۔ یہاں شہباز قلندر کی مشہور خانقاہ ہے جو ۱۳۵۹ء میں تعمیر ہوئی کہتے ہیں یہاں کا قلعہ سکندر اعظم کا بنایا ہوا ہے۔ شہر کے قریب ایک جھیل ملچھر نامی ہے جو برسات میں ۲۰ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہو جاتی ہے ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: ”نزدیک سیوان بزرگ کوٹلا بیست آں سا پھو گوند بر فراز آب زمینا ساختہ بر خے ماہی گیراں بسر بر ند“ ابن بطوطہ نے جو سقنقور یعنی ریگ ماہی کا ذکر کیا ہے یہ جانور بقول ابن بطوطہ ”پاؤں پر چلتا اور گوہ کی طرح ہوتا ہے“ عربی میں سقنقور فارسی میں ریگ ماہی ہندی میں ”بن روہر“ کہتے ہیں۔ اسے خشکی کی گوہ سمجھنا چاہیے۔ سانڈہ سے بڑا ہوتا ہے۔ مصر میں نیل کے کنارے بھی پایا جاتا ہے۔ صاحب مخزن نے لکھا ہے: ”اس نے بن روہر شہد آباد میں دیکھا ہے جو ۱۵۱۵ء میں پٹر کے ملک سے لائے تھے۔ یہ دو ہاتھ لمبا نصف ہاتھ چوڑا تھا، چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے۔“

ہو کہ بادشاہ نے حاجی الیاس سے صلح کر لی اور وہاں سے لوٹ گیا۔

۵۵ء میں بادشاہ مانک پور کے راستے دہلی پہنچا اور جہنا کے کنارے فیروز آباد کا قلعہ تعمیر کرایا۔

۵۶ء میں دیپال پور گیا اور ستلج سے ایک ہزار کال کمرہ ۴۴ کوس کے فاصلہ پر مقام بھیجے تک پہنچائی۔ ۵۷ء میں مندول اور سرود کے قریب جہنا سے بھی ایک ہزار کالی اور اس میں دوسری سات ہزار ملا کر ہانسی تک اور وہاں سے اسے راس تک پہنچایا۔ اس جگہ ایک قلعہ حصار فیروز کے نام سے بنوایا اس قلعہ کے نیچے ایک بڑا خوش بھی بنوایا تھا جس میں نہر سے پانی آ کر جمع ہوتا تھا۔ ایک اور نہر کھڑی سے نکال کر قلعہ برستی کے نیچے تک اور وہاں سے ہرن کھڑے تک پہنچائی اور ان دونوں کے درمیان ایک اور قلعہ فیروز آباد کے نام سے بنایا۔ ۵۸ء میں مصر سے خلیفہ الحاکم بامر اللہ ابو الفتح ابو بکر بن ابو البرکات سلیمان کے پاس سے فرمان خلافت ہندوستان کی بادشاہی کا فرمان اور خلعت آئی۔

اسی سال لکھنوتی سے حاجی الیاس کے قاصد نہایت نفیس تحائف اور تذرے کر آئے۔ بادشاہ نے ان قاصدوں پر بڑی مہربانی کی اور حکم دیا کہ حاجی الیاس ان تحفوں کے عوض ہمیشہ عمدہ ہاتھی بھیجا کرے۔ فیروز شاہ کی سلطنت یوں تو سارے ہندوستان کو احاطہ کیے ہوئے تھی، لیکن لکھنوتی پر صلح کے بموجب حاجی الیاس ہی کی حکمرانی تھی اور دکن میں سلطان محمد مرحوم کے زمانہ ہی سے حسن کاٹو بہمنی بادشاہ ہو گیا تھا۔ ۵۹ء میں بادشاہ نے سامانہ کا ارادہ کیا۔ مغلوں نے دیپال پور پر حملہ کر دیا تھا۔ ان کی گوشمالی کے لیے اس نے ملک قبول کو روانہ کیا۔ جب شاہی لشکر پہنچا تو مغل حسب عادت ڈر کر ولایت بھاگ گئے اور بادشاہ دہلی واپس آ گیا۔

۶۰ء میں بادشاہ نے بہت سے تازی گھوڑے، نفیس ولایتی سامان اور دوسرے عمدہ تحفے حاجی الیاس کے قاصدوں کے ہمراہ کر کے انھیں رخصت کیا لیکن ابھی یہ قاصد راستہ ہی میں تھے کہ لکھنوتی سے حاجی الیاس کے مرنے کی خبر پہنچی اور معلوم ہوا اس کی جگہ اس کا لڑکا سلطان سکندر تخت نشین ہوا ہے اس خبر کے ملنے پر بادشاہ نے وہ گھوڑے اور تحائف بہار میں واپس منگالیے اور قاصدوں کو کٹڑے میں بلوایا۔ ۶۱ء میں بادشاہ نے خاصا بڑا لشکر لے کر دوبارہ لکھنوتی کا ارادہ کیا۔ اس نے خاں جہاں کو تو دہلی کے انتظام کے لیے چھوڑا اور غزنی کی سرحد سے ملتان تک کی جگہ اس کا رخاں یعنی ملک تار کے سپرد کر دی، خود طغر آباد میں آ کر بارش کے موسم کی وجہ سے ٹھہر گیا۔

اسی مقام پر اعظم ملک شیخ زادہ بسطامی مع ملک احمد یاز کے جسے بادشاہ نے ملک بدر کر دیا تھا خلیفہ مصر کی طرف سے ایک خلعت لے کر آیا۔ بادشاہ نے اسے اعظم خاں کا خطاب دیا۔

طغر آباد سے ہی بادشاہ نے سید رسول دار کو لکھنوتی سے آئے ہوئے قاصدوں کے ساتھ سلطان سکندر کے پاس روانہ کیا۔ سکندر نے بھی وہاں سے پانچ ہاتھی اور کچھ تحفے بارگاہ میں روانہ کیے۔ اس سفارت اور تحائف کے

باوجود فریقین میں صلح کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور بارش ختم ہونے کے بعد فیروز شاہ نے ظفر آباد سے لکھنوتی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستہ میں شاہزادہ فتح خاں کو سامان سلطنت، ہاتھی اور فراش خانہ لعل جو بڑی عزت کا نشان تھا عطا کیا اور اس کے نام کا سکہ بھی ضرب کرایا۔

جب بادشاہ کا لشکر پنڈورہ پہنچا تو سکندر بھی اسی قلعہ اگرالہ میں جہاں اس کے باپ نے پناہ لی تھی محصور ہو گیا۔ بادشاہ نے کچھ عرصہ تک قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا، آخر سکندر نے ۳۷ ہاتھی اور بے شمار عمدہ تحائف دے کر صلح کر لی۔

۳۸ء میں فیروز شاہ پنڈورہ کے راستہ سے جوینپور لوٹ آیا اور برسات کی فصل اسی جگہ گزاری۔ اس سال کے آخر میں بہار کے راستہ سے حاج نگر روانہ ہوا اور لکھنوتی سے جوہاتھی اور خیمہ خرگاہ ملا تھا کٹرے بھجوا دیا۔

جب شاہی لشکر ست کھرہ پہنچا تو وہاں کا راجہ کسی طرف روپوش ہو گیا۔ وہاں سے لشکر بارہی پہنچا۔ وہاں کا راجہ بڑا نامی گرامی راجہ تھا وہ ڈر کر تلنگانہ کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ کچھ دور تک اس کا تعاقب کر کے واپس آ گیا اور شکار کھیلتے ہوئے رلے پر بھان دیو کے علاقہ میں پہنچا۔ رلے نے ۳۲ ہاتھی اور کچھ تحائف پیش کیے۔ یہاں سے بادشاہ پدماوتی اور پریم تلک کے جنگل میں جہاں ہاتھی بکثرت تھے شکار کے لیے گیا۔ اس نے خود دو ہاتھی مار گرائے اور ۳۳ ہاتھی زندہ پکڑوائے۔ ضیاء الدین برنی نے اس کا زمانہ پر یہ رباعی کہی ہے:

شاہی کہ زحق دولت پایندہ گرفت      اطراف جہاں چوہر تابندہ گرفت

از ہر شکار فیل در حاج نگر      آمد و بکشت دسی و سہ زندہ گرفت

سیر و شکار کے بعد سلطان نے بہت جلد وہاں سے مراجعت کی اور کٹرہ پہنچ گیا۔

۳۹ء میں سلطان کٹرہ سے دہلی آیا اور کچھ دن قیام کے بعد نہر سیلمہ کی طرف گیا۔ یہ نہر ایک ریتیلے ٹیلے سے نکل کر ستلج میں جا گرتی تھی۔ اس کو سرستی بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس کے برابر ہی ایک دوسری نہر بھی جاری تھی۔ وہ ریتلا پستہ دونوں نہروں کے درمیان حائل تھا۔ اس پستہ کے کھد جانے سے سرستی کا پانی دوسری نہر سے مل کر سہرند، منصور پور اور سامانہ کی طرف جاری ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ پچاس ہزار میلدار جمع ہو کر اس پستہ کو کھودیں۔ جب اسی پستہ کو کھودا گیا تو اس میں سے ہاتھیوں اور آدمیوں کی بہت سے ہڈیاں برآمد ہوئیں۔ آدمیوں کے ڈھانچوں میں ہاتھیوں کی ہڈیاں تھیں۔ گز لمبی تھیں، کچھ گلی ہوئی تھیں اور کچھ اس طرح باقی تھیں۔ بہر حال وہ نہر کھد نہ سکی۔

انہی دنوں بادشاہ نے اس ضلع سے سہرند کی جمع بندی سے دس کوہ مسافت کی اراضی علیحدہ کر کے ضیاء الملک شمس الدین ابورجاء کے حوالہ کی۔ اس نے اس مقام پر فیروز شاہ کے نام سے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔

نگر کوٹ کا کوہستان | یہاں سے سلطان نگر کوٹ گیا اور لڑائی کے بعد قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ آخر وہاں کا راجہ

لے جوینپور اس وقت معمولی مقام تھا۔ فیروز شاہ نے یہاں ایک شہر کاسنگ بنوا دیکھا اور مرحوم سلطان فخر الدین جوہا کے نام پر جوینپور نام رکھا۔ بعد میں اس شہر نے بڑی ترقی کی۔ یہاں ایک مستقل خاندان بھی حکمران رہا۔

لے نگر کوٹ۔ جوہا آئین اکبری پہاڑ پر آباد ہے اکبر کے صوبہ لاہور سے متعلق تھا۔ اس کے قلعہ کا نام کانگرہ ہے، ایک ہندو دیوی ماہا بانی کی زیارت گاہ ہے۔



امن کا طالب ہوا اور حاضر بارگاہ ہو گیا۔ بادشاہ نے مرحوم سلطان کے نام پر نگر کوٹ کا نام محمد آباد رکھ دیا۔ اس مقام پر پہاڑی لوگ بادشاہ کے لیے برف لے کر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے فرمایا اسی مقام پر سلطان محمد مرحوم کے لیے بھی لوگ برف لے کر آئے تھے، چونکہ میں اس وقت حاضر نہیں تھا اسی لیے سلطان نے بھی اس برف کا شربت نہیں پیا تھا۔ اس واقعہ کو یاد کر کے بادشاہ نے اس برف میں مصری ڈلوانی جو کسی ہاتھیوں اور اونٹوں پر لدی ہوئی ہمراہ تھی اور شربت تیار کرایا اور سلطان محمد کی فاتحہ کے لیے قرآن ختم کرا کے سارے لشکر میں تقسیم کرایا۔

اس موقع پر لوگوں نے بادشاہ کو بتایا کہ جب سکندر ذوالقمرین ہندوستان آیا تھا اس وقت سے اس علاقہ کے لوگ نوشاہی کی تصویر اپنے گھروں میں رکھتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے بت خانہ میں جسے لوگ "جوالا کھی" کہتے ہیں۔ اگلے زمانہ کے برہمنوں کی ایک ہزار تین سو کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ اس جگہ سے آگ کے شعلے کافی اونچے نکلتے رہتے ہیں کہ ہزاروں مشک پانی بھی ڈالا جائے تو یہ آگ نہیں بجھ سکتی۔

**قدیم کتابیں** | بادشاہ نے وہاں کے برہمنوں کو بلا کر وہ کتابیں منگوائیں اور ان کا فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ ان کتابوں میں سے ایک کتاب کو عز الدین خالد قاضی نے جو اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے تھا علم نجوم کے بیان میں نظم کیا اور اس کا نام "دلائل فیروزی" رکھا۔ میں نے بھی (مصنف کتاب بدوئی) اس کتاب کو لاہور میں مستندہ میں اول سے آخر تک دیکھا ہے۔ کچھ ایسی عمدہ اور لائق تعریف نہیں ہے۔

**ٹھٹھہ پر فوج کشی** | محمد آباد سے بادشاہ ٹھٹھہ گیا۔ وہاں کا حاکم جسے جام کہتے ہیں، قلعہ بند ہو گیا۔ اس ضلع میں بارش کی کثرت سے ندی نالوں اور دریاؤں کا جال سا بچھا ہوا تھا غلبہ بھی گراں تھا اس لیے بادشاہ زیادہ عرصہ تک محاصرہ جاری نہیں رکھ سکا اور وہاں سے گجرات چلا گیا۔ وہاں کے حاکم نظام الملک کو نائب وزیر بنا کر دہلی روانہ کر دیا اور اس کی جگہ ظفر خاں کو گجرات کی حکومت پر مقرر کر دیا۔ وہاں سے پھر ٹھٹھہ لوٹ آیا۔ اس مرتبہ جام نے امن کی درخواست کی اور بارگاہ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ کے رکاب ہی میں دہلی آیا، وہاں نوازش خسروانہ سے حسب سابق ٹھٹھہ کی حکومت پر دوبارہ فائز ہو گیا۔

لہ ان کتابوں میں جو سلطان فیروز کے نام پر ترجمہ ہوئی تھیں، کچھ تو فن موسیقی سے متعلق تھیں اور بعض میں کشتی کے دانیچ کا ذکر تھا۔ دوسری ایسے ہی مختلف اور عام موضوعات پر تھیں۔

۱۷۱۱ء افضل آئین اکبری میں لکھتا ہے: "یہ قدیم زمانہ سے خود مختار جداگانہ ریاست تھی۔ پہلے اس کا پائے تخت برہمن آباد تھا۔ یہاں ایک مستحکم قلعہ ہے اور اس کے ساتھ ایک بڑا شہر ہے۔ اس قلعہ میں ۱۲۰۰ برج ہیں، اب بھی اس کے نشان ملتے ہیں۔ زیادہ تر آبادی بلوچیوں کی رہی ہے۔ یہاں زمانہ قدیم میں ایک راجہ سہرس نامی حکمران تھا، ایرانیوں سے جنگ میں یہ مارا گیا اور اس کا لڑکا رائے ساہی تخت نشین ہوا۔ اس کے وزیر رام کے پاس ایک برہمن جو پچ (پچ) ملازم تھا بتدیچ اس کا اقتدار بڑھتا گیا اور یہ وزیر کا جانشین ہو گیا۔ رانی سے اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ راجہ کے مرنے پر رانی کی مدد سے یہ تخت نشین ہو گیا پچ کے خاندان سے ہی راجہ داسر تھا جسے محمد بن قاسم نے شکست دی تھی۔ محمد بن قاسم کے زمانہ سے بنی امیہ کے عہد میں فرزند ان تمیم انصاری سندھ پر قابض رہے۔ اس کے بعد سومر گاں (سمرہ) خاندان نے ۵۰۰ سال حکومت کی۔ اس کے بعد تقریباً پون صدی مسیح خاندانوں کے بادشاہ جو جام کہلاتے تھے حکمران رہے۔ پھر ٹھٹھیس برس تک تغلق خاندان کی بالادستی قائم رہی جس وقت فیروز شاہ نے حملہ کیا، جام باہتیم حکمران تھا۔ ابوالفضل کہتا ہے مذکورہ جام سے فیروز شاہ کی تین مرتبہ لڑائی ہوئی اور تیسری بار اس نے اطاعت اختیار کی۔

۲۲ھ میں خاں جہاں وزیر نے انتقال کیا تو اس کی جگہ اس کا لڑکا جو نائب وزیر بنا۔  
**وزیر اور شہزادہ کی رحلت** | اسے بھی خاں جہاں کا خطاب عطا ہوا۔

۲۳ھ میں ظفر خاں کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ گجرات کی حکومت پر اس کا بیٹا مامور کیا گیا۔  
 ۲۴ھ میں شاہزادہ فتح خاں کے انتقال کا سانحہ پیش آیا جس سے بادشاہ کو بہت صدمہ ہوا۔

اسی سال شمس الدین دامغانی کو زیریں کمرپٹے اور تقریبی چندول کا اعزاز عطا ہوا۔  
**شمس الدین کی بغاوت** | اس نے گجرات کی حکومت اس شرط پر قبول کی تھی کہ ہر سال سو ہاتھی اور دو سو تازی گھوڑے اور چار غلام ہر سال واسیاب اور نقدی بارگاہ شاہی میں روانہ کرے گا، لیکن وہ اس قدر مال وہاں سے حاصل نہ کر سکا اور بغاوت اختیار کر لی۔

۲۸ھ میں گجرات کے امیران صدمہ نے اسے قتل کر دیا اور اس کا سر بادشاہ کے پاس دہلی بھیج دیا۔ اس کے بعد گجرات کی عملداری فرحتہ الملک عرف ملک مفرح سلطانی کو عطا کی گئی۔

۲۹ھ میں بادشاہ نے اٹاؤہ اور اکچک کے علاقہ پر حملہ کیا، وہاں کے راجاؤں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور ان کو مع اہل و عیال دہلی روانہ کر دیا۔ اس علاقہ کے فتح ہونے کے بعد یہاں حکم شاہی سے کئی ایک قلعے بنائے گئے۔ فیروز پور اور بتلاہی ملک تاج الدین ترک کے لڑکے کو اور اکچک کا علاقہ ملک افغان کو سپرد کر کے بادشاہ دہلی واپس آ گیا۔

اسی سال حاکم اودھ ملک نظام الدین کا جو اس ہم میں بادشاہ کے ہمراہ تھا انتقال ہو گیا اور اس کا علاقہ اس کے بیٹے سیف الدین کے سپرد کر دیا گیا۔

۱۰ مولانا داؤد نے لورک اور چاند کے عشق کی داستان شنوی چناب کے نام سے اسی خاں جہاں سے منسوب کی ہے۔ یہ شنوی بڑی اثر انگیز اور صاحبان ذوق کے لیے وجد آور ہے۔ ہندوستان کے گویے اسے بڑے مزے سے گایا کرتے تھے۔ مخدوم شیخ تقی الدین دامغانی اس کے بعض شعریں میں منبر پر پڑھا کرتے تھے اور اسے سن کر لوگوں پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ ایک عالم نے شیخ مخدوم سے پوچھا منبر پر اس ہندی شنوی کو آپ کیوں پڑھا کرتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا اس کے سارے مطالب اہل تصوف کے اقوال و آیات قرآنی کے مطابق ہیں۔ یہ شخص ملک پور کا رہنے والا تھا۔

۳۰ اٹاؤہ۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے "قلعہ ہے دریائے جون کے کنارے پر" یہاں چوہاں راجاؤں کی حکومت تھی۔ کانپور اور آگرہ کے درمیان اب یہ ایک اوسط درجہ کا شہر ہے۔

۳۱ ایک فیروز پور تو بنگال میں ہے، اس فیروز پور کا ذکر آئین اکبری میں نہ کیا گیا ہے۔ قلعہ دامن کوہ میں واقع ہے اور اس پہاڑ میں ایک چشما ہے اور اس جگہ ہادیو کی مورت بنائی گئی ہے۔ یہ ہندوؤں کا معبد ہے۔ چشما ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ یہاں کے زمیندار میٹو ہیں۔

۳۲ اودھ۔ بادشاہی زمانہ میں اس صوبہ کی حدود کم و بیش گورکھ پور سے قنوج اور شمالی کوہستان سے صوبہ الہ آباد کی سرحد سہ پور تک تھیں۔ مشرق میں ہمارے شمال میں کوہستان، جنوب میں مالک پور اور مغرب میں شہر قنوج واقع تھا۔ یہاں کے دو دریا سر داؤد گھاگھرا ہیں۔ اودھ شہر کا نام بھی تھا۔ یہاں ہندو زمانہ قدیم میں ابودھیاء آباد تھا، جو راجہ رام چندر جی کا مولد اور مسکن ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کا مقدس تیرتھ رہا ہے۔  
 (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پڑے)

۸۱ء میں سلطان فیروز شاہ نے سامانہ کا رخ کیا اور ابنائے سے آگے بڑھ کر سنتور کے سامانہ اور سنتور کی مہم کو ہستان پر لشکر کشی کی۔ وہاں کے راجاؤں سے قیمتی نذرانے لے کر دارالسلطنت واپس آگیا۔ بادشاہ نے نصیر خاں کو کٹرے اور موہنے کے ضلع سے واپس بلا کر مغلوں کی سرکوبی کے لیے ملتان کی طرف متعین کیا اور موہنے کا ضلع اس کے بیٹے سلیمان کے سپرد کر دیا۔ یہ نصیر خاں وہی شخص ہے جس نے سلطان علی الدین بدایونی کے دادا سید خضر خاں کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔

۸۲ء میں سلطان نے کیتھل کی مہم ہاتھ میں لی کیتھل کا مقدمہ رائے لکھو کر تھا، اس نے بدایوں کے حاکم سید محمد اور سید علی الدین کو جو حقیقی بھائی تھے دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ ان بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے ہی سلطان نے فوج کشی کی تھی۔ بادشاہ کے پہنچنے کی خبر پا کر لکھو کر کمایوں کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے کیتھل کو تاخت و تاراج کر کے تباہ کر دیا اور لکھو کر کی بغاوت فرو کرنے کے لیے ملک افغان کو سنبھل میں متعین کر دیا۔ ملک قبول کو بدایوں کی عملداری پر روانہ کیا۔ بدایوں میں محلہ قبول پوری اسی کی یادگار ہے۔ ہر سال وہ شکار کے لیے کیتھل آکر سے لوٹ لیتا تھا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ دہلی واپس آگیا۔

۸۷ء میں سلطان فیروز شاہ نے بدایوں سے سات کوس کے فاصلہ پر موضع بسولی میں قلعہ فیروز پور کی تعمیر کرائی جسے موہنا بھی کہتے ہیں ایک قلعہ تیار کر کے اس کا نام فیروز پور رکھا۔ یہ فیروز شاہ کی سب سے آخری تعمیر ہے اس لیے اسے آخری پور بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس قلعہ کی عمارت باقی نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک میلہ بطور نشانی رہ گیا ہے۔

۸۸ء میں اس وقت بادشاہ کی عمر نوے سال کی ہو چکی تھی۔ عمر کے تقاضا سے عقل ورہائے میں صنعت پیدا ہو چلا تھا۔ وزیر خان جہاں حاسد مزاج تھا، وہ کسی دوسرے

بقیہ اودھ صفحہ گذشتہ) شہر سے ایک کوس پر دستی ندی، دریائے گھاگھرا، دریائے سرو (سٹی) سے مل گئی ہے اور قلعہ کے نیچے سے گزرتی ہے۔ شہر سے قریب دو قبریں ہیں جو چھ سات گز لمبی ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ حضرت شیدائے اویس یوسف پیغمبروں کے مزار ہیں۔ قریب ہی رتن پور میں کیر داس موجد کی قبر بتائی جاتی ہے۔ کیر داس سکندر پوری کے زمانہ میں گزرا ہے۔ اس کے دو بے مشہور زبان زد عام ہیں، اس نے فقیرانہ زندگی بسر کی، اس کے اشعار سے حق شناسی اور فقر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس صوبہ میں بھڑاچ، مکھنوی، سورج کنڈ، بگرام شامل تھے اور ان پانچ مرکزوں تحت ۱۳۸۰ گائے تھے۔ موجودہ شہر فیض آباد سے چند کوس پر چھوٹا سا گاؤں ہے۔ گھاٹ کے کنارے عمارتوں کی قطار بڑا اچھا منظر پیش کرتی ہے۔ بادشاہی زمانہ میں چھوٹا سا شہر تھا اور صوبہ دہلی کے ماتحت سرکار سرہند سے متعلق تھا۔ یہاں بارہ قبیلہ اور جاٹ زیادہ آباد تھے۔ آئین اکبری میں اس کا نام دو یاد ہے، یہاں ایک سنگین قلعہ ہے اس کی عمارت دو رنگ کے پتھروں سے بنائی گئی۔ ایک بڑا پہاڑ بھی ہے۔ کیتھل آئین اکبری میں یہ سرکار سرہند صوبہ دہلی کے تحت درج ہے۔ یہاں راجپوتوں کی قوم آباد تھی۔ ابوالفضل نے صرف اتنا لکھا ہے "یہاں ایک خشکی قلعہ ہے اور ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ ہے۔"

۸۹ء بحوالہ آئین اکبری۔ سنبھل "صوبہ دہلی کی سرکار تھا یہاں ایک خشکی قلعہ بھی ہے" یہ قلعہ جس موضع میں تعمیر ہوا اسے بسولی لکھا گیا ہے۔ فیروز شاہ نے ندیوں بدایوں کے جہر بند ہونے۔ کئی ایک محلے اور بے شمار باغ اس کی دگار ہیں۔ شہروں میں فیروزہ حصار، فیروز آباد، جو پور اس کے بسنے ہوئے ہیں۔

امیر کی ترقی اور وقعت دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو بہکا کر کچھ بے قصور امیروں کو دربار سے نکلوا دیا اور بعض کو قتل کر وا دیا، بعض امیروں کے خلاف یہ بہتان باندھا کہ وہ شہزادہ محمد خاں سے مل گئے ہیں اور اسے تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی باتوں کا یقین کر کے ان کے قتل کا تہیہ کر لیا اور شاہزادہ بھی ڈر کے مارے منہ چھپاتا رہا۔ آخر ایک دن شہزادہ نے خلوت میں باپ سے گفتگو کی اور خان جہاں کے سارے فریب کھول کر رکھ دیئے۔

**خان جہاں کی شکست** | جب سلطان کو اس کی فتنہ پر دانیوں کی حقیقت معلوم ہوئی تو اس نے شاہزادہ محمد خاں کو اس کی گوشمالی کے لیے گوڑے کی طرف روانہ کیا۔ شاہزادہ نے حسب الحکم بہت سے

امیروں اور لشکر کو اپنے ساتھ لیا اور ماہ رجب ۸۹ھ میں خان جہاں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ خان جہاں نے شاہی لشکر سے مقابلہ کیا لیکن زخمی ہو کر میوات کی طرف بھاگ گیا اور وہاں کے ایک زمیندار کو کانامی کے گھر میں پناہ لی۔ شاہزادہ نے اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور جو امیر خان جہاں کے شریک و مشیر تھے انہیں مناسب سزا دی۔

**فیروز شاہ کی گوشہ نشینی** | اس واقعہ کے بعد شاہزادہ کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے اور وہ عملاً مطلق العنان ہو گیا۔ بادشاہ نے بھی شاہی لوازمات ہاتھی، گھوڑے اور سلطنت کے اعزازات اسے عطا کر کے ماہ شعبان ۸۹ھ میں اسے تخت حکومت پر بٹھا دیا اور خود عبادت الہی کے لیے گوشہ نشین ہو گیا۔ اس دن جمعہ کے خطبہ میں دونوں بادشاہوں کا نام لیا جاتا تھا۔

**خان جہاں کا قتل** | محمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد از سر نو امیروں کو عہدے اور جاگیریں تقسیم کیں۔ ملک یعقوب کو سکندر خاں کا خطاب دے کر خان جہاں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ میوات کے زمیندار کو کا جوہان نے خان جہاں کو پکڑ کر سکندر خاں کے حوالہ کر دیا۔ سکندر نے اسے قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ اور خود گجرات چلا گیا۔

**امیران صدرہ کا فساد** | ۹۰ھ میں محمد شاہ شکار کے لیے کوہ سرمودہ کی طرف گیا ہوا تھا، ادھر گجرات میں ملک مفرج نے امیران صدرہ کی مدد سے سکندر خاں کو مار ڈالا اور اس کا ٹاپٹا لشکر سپہ سالار کی سرکردگی میں بڑے حالوں لوٹ کر دہلی آیا۔ جب بادشاہ سرمودہ سے لوٹ کر اپنے تخت پہنچا تو اس نے جوانی کی تہنگ میں بڑی لاٹنی بستی، سکندر خاں کے انتقام کی فکر نہیں کی اور عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔

**لشکریوں کی بغاوت** | محمد شاہ کی اس غفلت اور کمزوری کی وجہ سے شریپندوں کی جرأتیں بڑھ گئیں اور ملک میں نئے نئے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد شاہ کے حضور میں سماء الدین اور کمال الدین نام دو امیر نہایت مقرب اور نظم مملکت میں دخیل ہو گئے تھے، ان کے عمل دخل کو دیکھ کر فیروز شاہ کے قدیم لشکر اور امیر سخت برہم تھے چنانچہ یہ سب بغاوت کے ارادہ سے ایک میدان میں اکٹھا ہو گئے۔ محمد شاہ نے ان کو سمجھانے

لے دوسری تاریخوں میں یہ نام بہاؤ الدین اور کمال الدین ہیں۔ یہ دونوں ناصر الدین محمد شاہ کے عم زاد بھائی تھے۔



کے لیے ملک ظہیر الدین لاہوری کو روانہ کیا۔ باغیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے پتھر مار مار کر زخمی کر دیا۔ ظہیر الدین اسی حالت میں لہولہان محمد شاہ کے پاس آیا اور اس سے فریاد کی۔ شاہزادہ نے اپنی خاص جمیعت کو اکٹھا کر کے سرکش لشکریوں پر حملہ کر کے انہیں منتشر کر دیا، یہ بھاگ کر سلطان فیروز کی پناہ میں چلے گئے اور دوبارہ تیاری کے مقابلہ پیر آمادہ ہو گئے۔ دو دن تک فریقین میں سخت لڑائی ہوتی رہی۔

**فیروز شاہ میدان جنگ میں** | جب باغیوں نے دیکھا کہ مقابلہ میں ان کا پہلو دبتا جا رہا ہے تو انہوں نے بوڑھے فیروز شاہ کو بہر کا کر بیٹے کے مقابلہ کے لیے آمادہ کر لیا اور لاغر و کمزور بادشاہ کو اپنے ساتھ میدان میں لے آئے۔ باغیوں کی یہ چال بڑی کارگر ہوئی جیسے ہی محمد شاہ کے لشکریوں اور فیل بانوں نے میدان میں مقابلہ پر بوڑھے بادشاہ کو دیکھا، فوراً لڑائی بند کر دی اور باغی شکر سے مل گئے۔ محمد شاہ کے ساتھ گنتی کے چند آدمی رہ گئے۔ وہ بچاوا انہیں ساتھ لے کر سرحد کے پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔ فیروز شاہ کی رکاب میں اس وقت ایک لاکھ کا لشکر تھا۔ سوانا و پیارے اس کامیابی کے بعد محمد شاہ کے محلات میں گھس گئے اور اس کے تمام مقریوں اور حواریوں کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ فیروز شاہ نے بھی اہل غرض کے بہکانے سے محمد شاہ کی ولی عہدی کی مسوخی کا اعلان کر دیا اور اس کے بجائے فتح خاں کے بیٹے تغلق خاں کو تغلق شاہ کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنا لیا۔ تغلق شاہ نے اختیار پاتے ہی بادشاہ کے داماد میر حسن کو جو محمد شاہ کا دوست اور حامی تھا قتل کر دیا اور غالب خاں حاکم سامانہ کو جلا وطن کر کے سامانہ بھیج دیا۔

**فیروز شاہ کی وفات** | ۱۸ رمضان ۷۹۷ھ میں فیروز شاہ کا انتقال ہوا۔ اسے حوض خاص کے کنارے دفن کیا گیا اور اس کے مرقد پر ایک بڑا گنبد تعمیر کرا دیا گیا۔ اس کی وفات کی تاریخیں ہیں "وفات فیروز" و "نقل فیروز شاہ" اس دوسری تاریخ میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

**عہد فیروز شاہی کے شاعر** | فیروز شاہ نے ۳۸ سال چند ماہ حکومت کی۔ اس کے عہد کے بڑے شاعروں میں سے امیر خسرو کا بیٹا ملک احمد تھا، یہ بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ اس کا کوئی دیوان مشہور نہیں لیکن یہ بڑا قاصد الکلام نقاد تھا۔ اس نے متقدمین کے کلام پر جو جرح اور گرفت کی ہے اسے اکثر کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔

**ملک احمد کی اصلاحیں** | مشہور شاعر ظہیر کے شعر میں اس نے جو تصرف کیا وہ کچھ اس طرح ہے۔ ظہیر کا شعر تھا کہ  
کلاہ گوشہ حکم تو از طریق نفاذ  
بلوہ از سرگردوں کلاہ جباری  
ملک احمد نے کہا پہلا مصرع اس طرح ہونا چاہیے: ع  
زہے طبا نچہ قہر تو از طریق نفاذ

۵۰ عیسوی سن ۲۳ اکتوبر ۱۳۸۸ء ہوتا ہے۔

۵۰ واضح رہے فیروز شاہ نے جس وقت ۲۳ محرم ۷۵۲ھ بم ۲۳ مارچ ۱۳۵۱ء میں تخت پر جلوس کیا تو اس کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی۔

اور مصرعہ ثانی میں ”ربودہ“ کی جگہ ”فگندہ“ ہوتا چاہیے  
 (واقعی اس اصلاح کے بعد شعر کی شان دو بالا ہو جاتی ہے (م)  
 حسب ذیل شعر میں بھی اس کی اصلاح قابل تعریف ہے۔ اصل شعر ہے  
 ایں سہل سہل بود کہ گو کہ دسرخ خواست  
 گر نان خواجہ خواستی آں را چہ کہ دی  
 ملک احمد نے اسے اس طرح تبدیل کر دیا۔ ع

ایں سہل سہل بود کہ آب حیات خواست  
 ایک شعر اور اس کی تصحیح کا نمونہ ہے۔ اصل شعر تھا

گر مشک خواند خاک درت را فلک مرغ  
 نرغ گر طعن خریدار شکست

ملک احمد نے اس کے پہلے مصرع کو تبدیل کر دیا۔ ع  
 گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرغ  
 (نرغ گر بہ طعن خریدار شکست)

مشتری اور خریدار کی لفظی مناسبت کتنی عمدہ ہے (م)

میری (بدادؤنی مصنف ہذا) کی نظر سے اس کی اصلاح کے اور بھی شعر گزرے تھے لیکن یاد نہیں رہے۔ ملک احمد  
 امیر خسرو کے فرزند تھے اس لیے متقدمین کے کلام میں ان کے تصرف و تبدل کو بادشاہ اور اس زمانہ کے امیر اور اہل علم  
 پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے یہ

اس عہد کے دوسرے شاعر مولینا مظہر کٹرہ تھے۔ ان کی اولاد میرے اس عہد تک لکھنؤ کی موجود ہے اور اپنے  
 بزرگوں کے وقت سے برابر عزت و مراتب پر قائم ہے۔ مولینا مظہر کا ایک دیوان بھی ہے جس میں پندرہ سولہ ہزار شعر ہیں۔  
 ان کے کلام پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا اور مقصدیت کے تناسب سے شعریت دب کر رہ گئی تھی اس لیے ان کی نفیلت  
 کا جتنا چرچا تھا اتنا ان کے شعر رواج نہ پاسکے۔ بہر حال بنظر غور دیکھنے پر ان کے کلام کی ندرت واضح ہوتی ہے۔  
 فیروز شاہ عادل کے زمانہ میں تیسرے شاعر قاضی عابد گزرے ہیں جن کا یہ قطعہ مشہور ہے۔

۱۔ امیر خسرو کے فرزند نہ بھی ہوتے تو ان کی اصلاحیں اس پایہ کی تھیں کہ انہیں بہر حال پسند کیا جاتا۔ اس زمانہ میں نہیں تو بعد میں۔  
 ۲۔ فیروز شاہ کی اصلاحات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ یہ اختصار خود فیروز شاہ کی تصنیف ”فتوحات فیروز شاہی“ سے ماخوذ ہے؛  
 ۱۔ میں نے وحشیانہ منزلیں جیسے مثلہ کرنا، اندھا کرنا، آگ میں جلاتا، کھال کھجواتا، ناخون میں کیلیں ٹھکوانا، بدن کے دو ٹکڑے کرنا، سب  
 موقوف کر دیں

۲۔ محمد تغلق کے زمانہ میں خطیب سے جہ نامور شاہان اسلام کے نام خارج ہو گئے تھے انہیں شامل کر دیا۔

۳۔ فیروز شاہ سے پہلے ظالمانہ اور ناجائز محمول علمد ہوتے تھے جیسے چرواہی، گل فروش، دندان، نیلگری، ماہی فروش، ریسان فروش،  
 بھونچ، بھنوا، دروہانوں کے کرلے، تہ بازی، داد بگی، کوتوالی (جس کا یہ سب محمول میں نے بند کر دیا اور حکم دیا ایسا ناجائز اور  
 رماقی حاکم رصفی آگندہ،

دوستاں گویند عابد باچنیں طبع لطیف      چیت اشعار و غزل از تو فراواں برنخاست  
باکر اشعار و غزل گویم سچوں در عہد ما      شاہدی موزوں و ممدوح زرافشاں برنخاست  
یہ قطعہ در اصل "مقامات حریری" کے ان عربی اشعار کا ترجمہ ہے:-

قالو ترکت الشعر قلت ضرورۃ      باب الدواعی والبواعث معلق  
خلت الدیار فلا کریم ید تھی      عزمہ النوائی ولا ملیح یعشق  
ومن العجائب انه لا یشتری      ومع الکساد یحان فیہ ویسرق

## سلطان تعلق شاہ

تعلق شاہ فتح خاں مرحوم شاہزادے کا لڑکا تھا۔ دادا کی وصیت کے مطابق سن ۹۷۰ھ میں وہ تخت نشین ہوا اور غیاث الدین تعلق اپنا خطاب رکھا محمد شاہ کے مقابلہ کے لیے اس نے فوج روانہ کی محمد شاہ نے تھوڑا بہت مقابلہ کیا۔

(بقیہ حاشیہ فیروز شاہ کی اصلاحات صفحہ گذشتہ) خلاف شرع روپیہ خزانہ میں داخل نہ ہو۔

۴۔ پہلے مال غنیمت میں سے خمس لشکر کو اور چار حصے بادشاہ کے حصے میں آتے تھے۔ فیروز شاہ خود لکھتا ہے: میں نے اس کے بالعکس کیا اور خود خمس لیتا اور چار حصے فوج کو دینا اختیار کیا۔

۵۔ مذہب اثنا عشریہ کی کتابوں، رسالوں اور ان کے مذہب کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ میں نے قطعاً اسے مسدود کر دیا۔

۶۔ میں نے محمد لا مشرب اور ید مشرب لوگوں کو ملک بدر کر دیا کہ وہ یوروں کو گمراہ نہ کریں۔

۷۔ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے تھے جو پارچہ ہائے ریشمی، زیور طلائی و نقری پہنتے تھے اور ظروف نقرہ میں کھانا کھاتے تھے، اسے خلاف شرع سمجھ کر اس کی مطلقاً ممانعت کر دی۔

۸۔ ایک شخص رکن الدین نامی نے دعویٰ مہدیت و عالم الغیب ہونے کا کیا تھا اس کو میں نے قتل کر کے اس کے گروہ کو منتشر کر دیا۔

۹۔ عین ماہرونی نے "افی انا شر" کہنا شروع کیا اس کو بھی قتل کر دیا۔

۱۰۔ مسلمانوں کی عورتوں نے خلاف شرع یہ شعار بنالیا تھا کہ بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کے بدلے میلوں میں جانتیں اور وہاں ناجائز فعل کرتی تھیں، اس کی ممانعت میں میں نے قطعی حکم صادر کیا۔

۱۱۔ ہندوؤں کو نئے مندر تعمیر کرنے کی ممانعت کر دی۔ کسی نے بتایا تو منہدم کر دیا۔

۱۲۔ صالح آباد میں ایک مندر تعمیر کرایا گیا تھا اسے گرا دیا۔

۱۳۔ ایک اور گاؤں میں نیا مندر تعمیر ہوا تھا اسے بھی گرا دیا۔

۱۴۔ پہلے کے بادشاہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے لگتے تھے اور تلواروں کے قبضے مرصع کرتے تھے ان سب کا استعمال میں نے موقوف کر دیا۔

۱۵۔ مکانوں میں زی روح کی تصاویر لوگ نقش کرتے تھے اس کو بند کر کے میں نے یہ حکم دیا کہ ان کے بجائے غیر ذی روح کی تصویریں گل برتن وغیرہ بنائیں۔

۱۶۔ میں نے قدیم عمارتوں کو جو پہلے بادشاہوں کے عہد میں منہدم ہو گئی تھیں ان کو مرمت کر کے آباد کیا اور ایسی جائدادیں ان کے لیے وقف کیں کہ وہ ہمیشہ آباد رہیں۔

۱۷۔ جو محصول رعایا پہ گراں اور ناگوار تھا۔ موقوف کر دیا۔

۱۸۔ میں نے فنان بازاری کا جو علانیہ خس کرتی تھیں نکاح کرانے کا حکم دیا لیکن اراکین سلطنت نے عرض کیا کہ اگر ان کا نکاح کر دیا گیا تو اکثر لشکر شادی شدہ عورتوں کے دناور ہائے محض میں مبتلا ہو جائیں گے۔ لہذا میں نے سکوت اختیار کر لیا۔

پھر نگر کوٹ کی طرف بھاگ گیا۔ نگر کوٹ دشوار گزار راستہ پر ہے اس لیے شاہی فوج اس کا تعاقب نہ کر سکی  
 اسی اثنا میں بادشاہ کے بھتیجے ابوبکر خاں نے ملک رکن الدین اور دوسرے امراء کی سازش سے بغاوت کی اور تغلق شاہ  
 کی جدت سکونت فیروز آباد میں داخل ہو گیا اور اس کے محل خاص کے دروازہ پر ملک مبارک کبیر کو قتل کر دیا۔ تملانا  
 اور خان جہاں وزیر دوسرے دروازہ سے فرار ہو گئے۔ ابوبکر نے ان کا تعاقب کر کے قتل کر دیا اور ان کے سر شیش  
 کے دروازہ پر لٹکا دیئے۔ یہ سانحہ ۹۱ھ میں پیش آیا۔ اس طرح تغلق شاہ کی حکومت صرف پانچ ماہ ۱۸ دھ  
 رہی۔

## سلطان ابوبکر شاہ بن ظفر خاں

تغلق شاہ کے قتل کے بعد احمق امیروں کے اتفاق سے ابوبکر تخت نشین ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے  
 امیروں اور سرداروں کو مناصب اور عہدے تقسیم کر دیئے اور رکن الدین چندہ کو اپنا وزیر بنایا لیکن کچھ ہی دن بعد معلوم  
 ہوا کہ رکن الدین کی نیت بھلی نہیں۔ وہ بعض امیروں سے اپنی بادشاہی جملے کی سازش کر رہا ہے۔ یہ سنتے ہی  
 ابوبکر شاہ نے رکن الدین اور اس کے مشیروں کو قتل کر دیا اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اس پہلی ہی سخت کارروائی  
 کی وجہ سے اس کی حکومت مستحکم ہو گئی۔

اسی دوران میں سامانہ کے امیران صدہ نے امیر سامانہ ملک سلطان شہ خوش حال  
 کو جو محمد شاہ کے مقابلہ پر مامور کیا گیا تھا۔ سامانہ کے تالاب کے کنارے قتل کر دیا  
 اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اس کا گھر بار لوٹ لیا، اس کا سر نگر کوٹ میں شاہزادہ محمد شاہ کے پاس  
 بھجوا دیا اور اسے نگر کوٹ سے سامانہ آنے کی دعوت دی۔

دہلی پر محمد شاہ کی چڑھائی | امیران صدہ کے پیغام اور مطالبہ پر محمد شاہ نگر کوٹ سے کوچ کر رہے تھے  
 جالندھر کے راستہ سے سامانہ پہنچ گیا اور شاہانہ اسباب حیا کر کے دوبارہ ۵  
 ربیع الاول ۹۱ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔

ماہ ربیع الآخر ۹۱ھ میں محمد شاہ نے پچاس ہزار کاشکے کر دہلی کی طرف اقدام کیا اور قصر جہاں نما میں آکر  
 ٹھہر گیا۔ امراء کو منصب اور اعزاز عطا کیے۔ ملک سرود کو خواجہ جہاں اور ملک الشرق نصیر الدین حاکم ملتان کو خضر خاں  
 کا خطاب دیا۔

محمد شاہ اور ابوبکر شاہ کا مقابلہ | محمد شاہ کے مقابلہ پر ابوبکر شاہ نے بھی بہادر تاجہر میواتی کی مدد سے صف آرائی  
 کی۔ ماہ جمادی الاول سن مذکور میں فیروز آباد کے میدان میں فریقین نے ایک  
 گھمسان کی جنگ کی۔ محمد شاہ کی بد نصیبی اس کے ساتھ تھی اسے شکست ہوئی اور وہ دو ہزار سواروں کی حفاظت میں  
 جہنا پور کے دو تہ کے علاقہ میں چلا گیا، پھر وہاں سے اس نے اپنے منجھلے بیٹے ہمایوں خاں کو سامانہ ملک لانے کے لیے



بیجا، وہ وہاں سے تیاری کے ساتھ بیچاس ہزار سواروں کا لشکر لے کر آیا۔ اس لشکر کو لے کر محمد شاہ نے دوبارہ دہلی پر حملہ کیا لیکن اس مرتبہ بھی اسے ابو بکر شاہ کے مقابلہ میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ابو بکر شاہ نے کچھ دیر تک اس کا تعاقب کیا۔ محمد شاہ کا سارا ساز و سامان اور لشکر تباہ ہو گیا اور وہ برے حالوں گنگا کے کنارے ایک قصبہ چنیوے میں پناہ گزین ہو گیا۔

**ہمایوں خاں کا حملہ اور شکست** ۹۲ھ میں شہزادہ ہمایوں خاں نے سامانہ کے بہت سے امراء کی مدد سے دہلی پر ایک بار پھر حملہ کیا اور شہر کے مضافات کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ اس کے سدباب کے لیے ابو بکر شاہ نے عماد الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ پانی پت کے میدان میں دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ ہمایوں خاں شکست کھا کر سامانہ بھاگ گیا۔

**ایک شہر، دو بادشاہ** ۹۲ھ میں ابو بکر شاہ ایک بھاری لشکر لے کر محمد شاہ کے فتنہ کو یکسر ختم کر دینے کے خیال سے پتر کی طرف روانہ ہوا اور دہلی سے بیس کوس فاصلہ طے کر کے پڑاؤ ڈالا۔

اس موقع پر محمد شاہ نے ایک گہری چال چلی۔ وہ ابو بکر شاہ کے لشکر کو دھوکا دے کر ایک دوسرے راستہ سے دہلی میں داخل ہو گیا اور قصر ہمایوں میں جا کر قیام کیا شہر کے سب خواص و عوام اس سے مل گئے۔ ابو بکر شاہ کو جب غنیم کی اس کارروائی کا علم ہوا تو اسے پاؤں دہلی لوٹا اور ملک بہاؤ الدین جنگی کو جو محمد شاہ کی طرف سے دروازہ کا محافظ تھا قتل کر کے شہر میں داخل ہو گیا اور سیدھا قصر ہمایوں کا رخ کیا۔ محمد شاہ اس حملہ سے غافل تھا۔ مقابلہ کی تاب نہ پا کر گھبرا گیا۔ جو امیر اس سے مل گئے تھے وہ اس حملہ میں مارے گئے۔ اب محمد شاہ میں ابو بکر شاہ کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ مسلسل ناکامیوں نے اس کا دل توڑ دیا تھا لیکن رعایا اور لشکر والوں کی ہمدردیاں اسی کے ساتھ تھیں اور یہ سب ابو بکر شاہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔

**دہلی پر محمد شاہ کا قبضہ** اس سال کے ماہ رمضان میں بیشتر چپ اور فیروز شاہ کے عہد کے بعض امراء نے جو مختلف وجوہ سے ابو بکر شاہ سے ناراض تھے محمد شاہ کے پاس خفیہ خطوط روانہ کیے اور اس سے حملہ کرنے کی استدعا کی۔ جب ابو بکر شاہ کو امراء کی اس کارروائی کا علم ہوا تو وہ نہایت پریشان ہوا اور بہاولپور سے مدد لینے کے لیے کوٹلہ میوات کی طرف روانہ ہو گیا۔ دہلی میں ملک شاہین، عماد الملک، ملک بھری اور سفدر خاں کو چھوڑ گیا۔

اس موقع پر محمد شاہ امراء کے بلانے پر تیسری بار بڑی شان و شوکت کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور قصر فیروز آباد میں تخت شاہی پر باقاعدہ جاوس کیا۔ بیشتر چپ کو اسلام خاں کا خطاب دے کر وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ کچھ دنوں بعد قصر فیروز آباد سے قصر جہاں نما میں منتقل ہو گیا اور ان فیروز شاہی غلاموں کو جو پہلے فتنہ و فساد کے بانی تھے قتل کر دینے کا حکم دیا۔ غلاموں کے اس قتل عام میں پورے بکے اکثر آزاد لوگ بھی جن کی زبانیں کچی تھیں غلاموں کے دھوکے میں قتل ہو گئے۔

اس انقلاب سے ابوبکر شاہ بے دست و پا ہو گیا۔ محمد شاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے کوئٹہ میوات کی طرف فوج کشی کی۔ ناچار ابوبکر شاہ اور بہادر شاہ مان طلب کرتے ہوئے خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بہادر شاہ کو تو خلعت و انعام ملا اور ابوبکر شاہ کو قلعہ میرٹھ کی قید زندگی بھر وہ اس قید میں رہا۔ اس کی وفات ۱۷۹۳ء میں ہوئی۔ صرف ڈیڑھ سال حکومت کی۔

## سلطان محمد بن فیروز شاہ

اس فتح اور اپنے بھتیجے ابوبکر کی وفات کے بعد ۱۷۹۳ء میں سلطان محمد نے تخت دہلی پر قدم رکھا۔ اب کوئی دوسرا سلطنت کا دعوے دار نہیں رہا تھا۔ محمد شاہ مستقل اور کامل الاختیار بادشاہ ہو گیا۔ اسی سال حاکم گجرات ملک مفرح ساطانی کی سرکشی کی خبریں ملیں، بادشاہ نے ظفر خاں ولد وجیبہ الملک کو **بغاوتیں** اس کی سرکوبی کے لیے مقرر کر دیا۔

۱۷۹۴ء میں میوا س کے زمینداروں نے دوا بے کے علاقہ میں فتنہ انگیزی کی اور قصبہ بلارام کو لوٹ لیا۔ اسلام خاں نے وہاں کے باغی سرغنہ ہر سنگھ راتے پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔ بادشاہ نے قنوج اور اٹاوے کی طرف توجہ کی اور وہاں کے سرکشوں کی اچھی طرح گوشمالی کر کے اور اٹاوے کو تاخت و تاراج کر کے قصبہ چیتربھاس کا قدیم پسندیدہ مقام تھا لوٹ آیا۔ شہر محمد آباد کی تعمیر شروع کرائی۔ اسی سال بغاوت کے الزام میں اسلام خاں کا قتل ہوا۔ ۱۷۹۵ء میں بادشاہ نے اٹاوے کے باغیوں کی طرف ملک مقرب الملک کو روانہ کیا۔ اس نے قول و اقرار کر کے سب باغیوں کو لشکر میں بلایا، پھر انہیں قنوج لے جا کر قتل کر ڈالا اور محمد آباد واپس آ گیا۔

ماہ شوال ۱۷۹۵ء میں بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اس درمیان میں بہادر شاہ نے کئی ایک مواضع **محمد شاہ کی علالت** لوٹ لیے۔ بادشاہ نے اسی بیماری کی حالت میں کوئٹہ کی طرف کوچ کیا۔ بہادر شاہ تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے بعد بھاگ گیا اور بادشاہ محمد آباد واپس آ گیا۔

محمد آباد واپس ہونے کے بعد بادشاہ نے کسی عمارت کی تعمیر شروع کرائی۔ اس مصروفیت میں اس کا مرض شدید ہو گیا حالت مرض میں لاہور سے خبر ملی کہ وہاں سریشیا کھوکھر نے بغاوت کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ بادشاہ نے لاہور کی مہم پر شہزادہ ہمایوں کو متعین کیا۔ ابھی شہزادہ اس مہم پر روانہ نہیں ہوا تھا کہ بادشاہ عالم آخر کو سدھار گیا اور اپنے باپ کے روضہ میں حوض خاص کے کنارے سپرد خاک کیا گیا۔ سلطان محمد شاہ کی حکومت چھ سال سات ماہ رہی۔

۱۷۹۲ء مطابق ماہ نومبر ۱۷۸۹ء لے اس کی اسارت کی تاریخ ۲۰ ذی الحج ۱۲۹۲ء اس شخص کا پورا نام "آزادی مین ناہر سنگھ" تھا۔ رائٹھور قوم کا سردار تھا۔

## سلطان علاؤ الدین بن سکندر شاہ

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں خاں سلطان علاؤ الدین سکندر شاہ کے لقب سے ۱۹ ربیع الاول ۷۹۵ھ میں تخت نشین ہوا لیکن اس کی مدت حکومت صرف ایک ماہ سولہ دن رہی۔ عین عالم شباب میں وفات پائی۔

تاجہاں بود چنیں بود و چنیں خواہد بود

ہمہ را عاقبت کار ہمیں خواہد بود

اس بادشاہ کے عہد شاہزادگی میں ایک صاحب علم نے مقامات حریری کے مقابلہ میں ایک کتاب اس کے نام پر تصنیف کی تھی۔ اس کا ایک مضمون میری (مصنف کتاب کی) نظر سے بھی گزر رہا ہے۔

## سلطان محمود شاہ بن محمد شاہ

علاؤ الدین کی رحلت کے بعد محمد شاہ مرحوم کا چھوٹا لڑکا محمود شاہ تمام امیروں کے اتفاق و تائید سے ۲۰ جمادی الاول ۷۹۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ سلطان ناصر الدین محمود شاہ اس کا خطاب مقرر ہوا۔

اس نے مقرب الملک کو مقرب خاں کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنایا اور دوسرے تمام امراء کو منصب ہجاگیر اور خطاب عطا کیے۔ گزشتہ چند سال کے پرانگندہ حالات نے سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھ کھول دیئے تھے اور سارے ملک میں فتنہ و فساد پھیل گیا تھا۔ سلطان نے ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے خواجہ جہاں کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر قنوج سے بہار تک کا سارا علاقہ سوالے کر دیا اور اسے فوج کشی کے لیے مقرر کیا۔

خواجہ جہاں نے حاج نگر تک فوجی کارروائیاں کر کے قبضہ کر لیا اور اس علاقہ سے کافی مال غنیمت اور بہت سے ہاتھی حاصل کر کے بادشاہ کے پاس بھجوائے۔ لکھنوتی کے بادشاہ نے بھی ہر سال دہلی کو ہاتھی بطور پیشکش روانہ کرنے شروع کر دیئے۔ اسی دوران میں کٹرہ، اودھ، بلو تالیہ بھڑاچھ اور نرہٹ کے قلعے جنہیں کافروں نے تباہ کر دیا تھا از سر نو تعمیر کیے گئے۔ سندیلہ کے قلعہ کی بھی تعمیر ہوئی۔

سے بار۔ یہ شہر چٹنہ سے ۴۴ میل ہے۔ صوبہ بہار اسی شہر سے منسوب تھا۔ اس وقت یہ ضلع پٹنہ کا ایک معمولی قصبہ ہے جس کی آبادی پچاس ہزار ہوگی۔ یہاں محمد شرف الدین احمد خاں نے شیخ شرف الدین غنی منیری کے نام سے شہر میں ساتویں صدی کے ہنگ ہیں۔ ایک پرانے قلعہ کے کھنڈر ہیں جن میں بدھوں برہمنوں کی عالی شان عمارتوں کے آثار ہیں۔ یہاں بدھوں کی قدیم مشہور درس گاہ کے طویل دالان بھی نظر آتے ہیں۔ اس درس گاہ کو ”دھار“ کہا جاتا اور یہ بگڑ کر ”بہار“ بن گیا۔ دھار کے معنی دارالعلوم کے ہیں۔

۱۷۵۷ء بھڑاچھ۔ گوئدہ سے ۳۴ میل پہ دریلے گھاگھر کے کنارے ایک قدیم قصبہ ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے ”بھڑاچھ اودھ کا بہت بڑا شہر ہے اور دیلے شہر کے کنارے آباد ہے“ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے ”یہ ایک خوبصورت شہر دریائے سر جو کے کنارے ہے۔ ہر چو ایک بڑا دریا ہے جو اکثر اپنے کنارے گنا تار ہوتا ہے۔ جب بادشاہ (محمد تغلق) شیخ سالار مسعود غازی کی قبر کی زیارت کے لیے گیا تو ایک بڑی کشتی اس دریا میں ڈوب گئی جن میں تین سو آدمی سوار تھے۔ شیخ سالار کا مزار ایک برج میں ہے اسی نواح میں ہم نے بالنس کے جنگل میں گینڈا دیکھا“ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

مشرقی علاقہ کے باغیوں کا تو کچھ انتظام ہو گیا لیکن لاہور اور دیپال پور کی طرف شیخی کھوکھر سازنگ خاں کا حملہ کی بغاوت اسی طرح موجود تھی۔ بادشاہ نے اس فتنہ کو رفع کرنے کے لیے سازنگ خاں کو

(بقیلہ حاشیہ بھڑاچ صفحہ گزشتہ)

سر جو نام و قدیم تاریخوں میں درج ہے گھاگھرا کو ہی کہا گیا ہے لیکن آج کل یہ گھاگھرا کے ایک معادن دریا کا نام ہے جو نیپال کے پہاڑوں سے نکل کر ۷۰ میل بہہ کر کٹائی گھاٹ کے قریب دریا کے گھاگھرا میں گرتا ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے یہ دریا گونڈہ ضلع میں بہتا ہوا کہیں آگے جا کر گھاگھرا میں گرتا تھا۔ ایک انگریز سوداگر نے جو پہاڑ سے لکڑی کاٹ کر لایا کرتا تھا جلدی پہنچانے کے لیے اس دریا کا رخ بدل کر اس سمت پر نکال دیا۔

معادن کے دور میں یہ عالم نشین جگہ تھی۔ اب اس کی آبادی ۳۰ ہزار ہو گئی۔ یہاں بڑے عمارتی لکڑی اور تبا کو برآمد ہوتا ہے۔ اس مقام کو فیروز شاہ کے باپ رجب سالار نے آراستہ اور بارونق بنا دیا۔ (آئین اکبری) بھڑاچ کے قریب موضع دو کوئی ہے (جو اکبر کے عہد تک) "تانوں کے سکوں کی ٹکسال ہے" (ابوالفضل) اس نواح میں چرامتی ایک مقام ہے جہاں ہولی کے موقع پر شعلے خود بخود اٹھتے ہیں (ابوالفضل) نیمکسار ایک قلعہ ہے جو دریا کے گودی (گومتی) کے کنارے ہے۔ یہاں ایک حوض برہما دت کند ہے۔ اس کا پانی اس طرح جوش کھاتا ہے کہ اس میں جو چیز بھی پھینکی جاتی ہے پانی کے زور سے اوپر آ جاتی ہے انسان اس میں ڈوب نہیں سکتا۔ (آئین اکبری) ایک مقام انار کلی مزار سے قریب ہے جو سالار شہید کی سیرگاہ تھی، نہایت پر فضا مقام ہے، سالار شہید کی جہاں نشست گاہ تھی وہاں ایک چوٹی چھتری بنی ہوئی ہے۔ انار کلی کے نیچے ایک جھیل ہے جس کا رقبہ چھ کوس ہے یہ نہایت گہری جھیل ہے اس میں سے ایک ندی بھڑاچ کے نیچے سے بہہ کر نکل جاتی ہے۔ (آئین اکبری)

سالار شہید - ابن بطوطہ نے جو شیخ سالار مسعود لکھا ہے اس سے سلطان مسعود سالار غازی ہی مراد ہیں۔ مرآت مسعودی (واقع ہے کہ یہ کتاب جہانگیر کے عہد میں عبدالرحیم چشتی نامی نے لکھی تھی۔ اس کا ترجمہ غالباً شیخ عبدالرحمن ابن مٹھوی کے نام سے بعد میں بھی شائع ہوا) میں سالار غازی کے باپ کا نام ملک ساہو، ماں کا ستر معلیٰ، سال ولادت ۹۵۷ھ جلے پیدائش اجیر، سال وفات ۹۷۲ھ درج ہے۔ جو عیسوی ۱۵۳۲ء کے مطابق ہے۔ یہ کتاب تاریخی معیار پر پوری نہیں اترتی۔ قلعہ کمانیوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے اس لیے قابل اعتبار نہیں۔ ابوالفضل نے ان بزرگ کے متعلق لکھا ہے "خویشاندہ سلطان محمود غزنوی است" مرآت مسعودی میں ان کو سلطان محمود غزنوی کا بھانجہ بتایا گیا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے "انرا قارب سلطان محمود غزنوی بودہ کہ در عہد سلطان محمود غزنوی در ۵۵۵ھ بدست کفار مقتول کردید" دارا شکوہ نے اپنی کتاب سفینہ الاولیاء میں شیخ عبدالحق کے حوالہ سے سالار مسعود کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"از سرداران و غازیان لشکر سلطان محمود غزنوی اندر افاضل اسلام در ہندوستان فتوحات بسیار نمودہ اند و بدجہ شہادت رسیدہ شہادت ایشان در چہار صد و نو ذہ ہجری ۹۷۲ھ بودہ" خود شیخ عبدالحق کی کتاب "اخبار الاخبار" میں جو دارا شکوہ کی مانند ہے۔ سالار مسعودی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ فرشتہ کا یہ کہنا کہ "وہ سلطان محمود کی اولاد میں سے کسی عہد میں ہندوستان آئے تھے" درست معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا دیا ہوا سن غلط ہے کیونکہ ۵۵۵ھ میں سلاطین غزنوی اتنے طاقتور نہیں رہے تھے کہ اتنی دور ہندوستان میں لشکر بھیجتے۔ سالار شہید کی درگاہ پر ہر سال ہندو مسلمانوں کا ایک لاکھ کے قریب مجمع ہوتا ہے۔ اس میلہ سے درگاہ کو ۲۰ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی ہے جب فیروز شاہ زیارت کے لیے آیا تھا تو اس نے سید ابو جعفر امیر ماہ بھڑاچ سے جو بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے مسعود سالار غازی کے مراتب دریافت کیے انھوں نے فرمایا "ان کا بلند درجہ یہ ہے کہ تم جیسا سلطان اور مجھ جیسا فقیران کی خدمت میں حاضر ہیں" انہی بزرگ ابو جعفر امیر ماہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بھڑاچ میں انگلیوں کے بل چلتے تھے، بادشاہ نے وجہ پوچھی تو کہا یہاں اس قدر شہید دفن ہیں کہ مجھے چلنے کو جگہ نہیں ملتی۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں سالار صاحب کے چھٹے اٹھائے جاتے ہیں، ان چھٹوں اور چھتریوں کا ذکر اکبر نے بھی کیا ہے۔ طبقات اکبری کے مصنف نے لکھا ہے "شہنشاہ اکبر ذکر کرتے ہوئے اسی حاشیہ صفحہ آئندہ پر



روانہ کیا۔ جب سارنگ خاں وہاں پہنچا تو اسی سال ماہ ذی قعدہ کے آخر میں لاہور سے بیس کوس کے فاصلہ پر موضع سامبور تھلہ میں شیخا کھوکھر نے سارنگ خاں سے ایک سخت لڑائی لڑی لیکن شکست کھا کر جموں کے پہاڑ پر بھاگ گیا۔ سارنگ خاں نے لاہور اپنے چھوٹے بھائی عادل خاں کے سپرد کر دیا اور خود دیپال پور لوٹ گیا۔

**مقرب خاں اور سعادت خاں** | ماہ شعبان ۱۰۹۵ھ میں سلطان محمود نے مقرب خاں کو شہر میں اپنا نائب بنا کر سعادت خاں کو جو عبدالرشید سلطان کے نام سے مشہور تھا۔ اپنے ہمراہ لیا اور بیانہ

رقبہ حاشیہ بھڑاچ صفحہ گذشتہ اٹھے کہ ایک دن میں اکبر آباد میں شاہ سالار غازی کی پھترباں دیکھنے گیا، ایک شخص نے مجھے پہچان کر دوسرے سے کہا بادشاہ جاتے ہیں نے فوراً اپنی آنکھوں کے کولے باہر نکال لیے اور کچھ بُرا سامنہ بنا لیا، جب دوسرا شخص مجھے دیکھ کر گیا تو کہنے لگا کہ بادشاہ کی ایسی آنکھیں نہیں ہیں۔ مصباح التاریخ میں مرآۃ سعودی کے حوالہ سے سالار غازی کو محمد بن حنیفہ بن علی کی اولاد بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ محمد بن حنیفہ کے دو بیٹے تھے عبدالفتاح اور عبدالمتان، خواجہ احمد سیوی پیر ترکستان تو عبدالفتاح کی اولاد ہیں اور سالار سعود غازی عبدالمتان کی، لیکن ابن عتیہ نے محمد بن حنیفہ کے بیٹوں کے نام لکھے ہیں: حسن، عبداللہ، ابوالشتم، جعفر، حمزہ، اصغر، عیون، مصنف حمدۃ المطالب نے لکھا ہے سولے جعفر بن محمد اور علی بن محمد کے محمد بن حنیفہ کے کسی بیٹے کی اولاد موجود نہیں ہے، ممکن ہے سالار شہید علوی نسب ہوں لیکن محمد بن حنیفہ کے دو بیٹوں کے مذکورہ نام مرآت سعودی کے مصنف کی محض اختراع ہیں۔ مزار کے قریب ایک اور قبر رجب شہید کی ہے ملک رجب سالار شہید کے لشکر کے ہراول تھے لیکن یہ قبر فرضی معلوم ہوئی ہے۔ مرآت سعودی میں لکھا ہے۔ ملک رجب اور سالار شہید کو ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا تھا۔ موضع گکوا پر گنہ۔ حمادیو ضلع گونڈہ میں فیض آباد کی سڑک پر بھی ایک روضہ رجب شہید کے ہے۔ کہتے ہیں اس جگہ ان کی انگلی کٹ کر گری تھی، یہ سب غلط ہے۔ کسی فقیر نے اپنے نفع کے لیے یہ افسانہ گھڑ کر روضہ بنا لیا۔

۱۰۹۵ھ حاشیہ سندیلہ (سندیلہ۔ یہ شہر ضلع ہر دونی ملک اودھ میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ لکھنؤ سے ۳۲ میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں واقع ہے آبادی ۲۰ ہزار ہوگی۔ پان اور گھی برآمد ہوتا ہے۔ سندیلہ کے لڈ بھی مشہور ہیں۔

۱۰۹۵ھ بیانہ۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے: ”بیانہ بہت بڑا خوش نما شہر ہے“ بازار بہت خوبصورت جامع مسجد نادر بنی ہوئی ہے۔ ”بیانہ دہلی سے سو میل جنوب مغرب میں ہے، اکبر کے زمانہ میں بیانہ کی سرکار صوبہ آگرہ کے تحت تھی (اکین اکبری) ابوالفضل لکھتا ہے: ”بیانہ قدیم زمانہ میں شہر تھا۔ یہاں ایک قلعہ بھی ہے، پرانے محلات اور بت خانے بہت ہیں، ان کھنڈرات سے اب تک ہتھیار اور تانبہ کے برتن نکلتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا اینار بھی ہے، آم اچھا ہوتا ہے بعض آم وزن میں ایک سیر (موجودہ ڈھائی پاؤں) سے زیادہ ہوتا ہے شکر بھی بہت سفید ہوتی ہے۔ ایک کنواں اس شہر میں ایسا ہے کہ اس کے پانی کی تاثیر سے شکر کے لڈ وزن میں سیر سیر بھر سے زیادہ باندھ لیتے ہیں، ان لڈوں کو گنڈورہ کہتے ہیں۔ تیل اور چنا بہت ہوتا ہے تیل دس روپیہ اور بارہ روپیہ من کے حساب سے ملتے ہیں۔ ہند بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اس شہر میں قبرستان بھی بہت ہیں“ ابوالفضل نے جس کنویں کا ذکر کیا ہے اس کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے یہ کنویں ۸۲۲ھ میں محمد خاں اودھ کی صدیقی حاکم بیانہ نے تعمیر کرایا تھا۔ کتبہ کے اشعار یہ ہیں۔

بہ حمد دولت خان کبیر اودھ خاں  
ملک معظم تیمور خاں اندہ سرمد قی  
بنزاد و چیرزم صفت ز خالص مال  
ز ہجری نبوی سال بود ہمیں صد و بہت  
پناہ جملہ جہاں سرور زمین دزماں  
بنا کرد چنیں جائے طاعت رحماں  
قبول باد بدرگاہ خالق مناں  
دگر سہ سال بہ ماہ معظم رمضان

جنرل کننگھم نے اس کتبے کے پڑھنے میں غلطی کی ہے۔ اس کنویں پر ایک اور کتبہ فارسی اور ناگری میں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے ۱۰۵۳ھ میں ٹھاکر امر سنگھ نے کنویں کی مرمت محمد خاں اودھ کے زمانہ میں کرائی تھی کننگھم صاحب لکھتے ہیں: ”یہ کنواں اب (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)“

یعنی پھاگن کے عید میں تیسری تاریخ کو سمت ۱۱۷۳ میں ابو بکر قندھاری نے بیانہ کا قلعہ فتح کیا۔ یہ غالباً ۱۱۷۳ھ کا زمانہ ہے جو بہرام بن مسعود غزنوی کے جلوس کا سال ہے۔ اس بادشاہ کے آغاز جلوس میں بھی غزنوی لشکر ہندوستان آیا تھا۔ چنانچہ ”روقتہ الصفا“ میں بہرام کے متعلق تحریر ہے: ”و بعد از انکہ بر تخت مملکت متمکن گشت لشکر دیار ہند کشید و بسیار سے ازاں بلاد کہ اسلاف او ہاں موضع نرسید یو دند بکشاؤ“ سالار مسعود غازی غالباً اسی لشکر کے سپہ سالار تھے کیونکہ بیانہ کا قلعہ ان کے ہاتھ پر بھی فتح ہوا تھا۔ اس دو ماہ سے سالار مسعود غازی کے ہندوستان آنے کا صحیح سال معلوم ہوتا ہے۔ ابو الفضل نے جس منارہ کا ذکر کیا ہے وہ بھی موجود ہے۔ یہ اصل میں مسجد کا ماذنہ ہے اور قلعہ میں واقع ہے۔ دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اب دو منزلیں باقی ہیں پہلی منزل ۱/۴ فٹ اور دوسری ۳۲ فٹ۔ تیسری منزل کہتے ہیں میگنرین کی بارو میں آگ لگنے سے گر گئی تھی۔ منارہ پر کتبہ ہے: ”اشار بنامیدۃ المبارک المسند عالی والمہجی المعالی اعظم ہمالیوں داؤد خان بن مسعود عالی محمد خان بن مسعود عالی معین خاں صدیقی المعروف باوصی خلد اللہ و ملکہ فی سن احدى و ستين و ثمان مائتہ (۱۱۷۳ھ)“ سنگ سرخ کی بنی ہوئی ایک باغی بھی ہے جو سلطان قطب الدین خلجی کے عہد میں ۱۱۷۳ھ میں ملک کا فوراً تیار کرائی تھی یہ اب تک موجود ہے۔ اس کی تاریخ بنائے:

بیانہ کا موجودہ شہر آگرہ اور بمبئی کی سڑک پر بھرت پور ریاست میں واقع ہے، اس کی آبادی صرف چھ سات ہزار ہوگی۔  
 لہ گوالیار گوالیار کے مشہور قلعہ کا ذکر اس سے پہلے ایک حاشیہ میں آچکا ہے۔ شہر اور ریاست کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ گوالیار ویدے جمیل  
 کے دوسرے کنارے دھولپور سے چالیس میل پر ہے۔ ریاست گوالیار صوبہ مالوہ کی بڑی ریاست تھی اس کی بنیاد راجا جی سندھیانے جو  
 پونا کا ایک مرہٹہ سردار تھا رکھی تھی۔ یہ پہلے باجی رائے پیشوا کے باڈی گاڑ کا جرنیل تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں محمد شاہ کے عہد میں  
 مالوہ آریا واد جین پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس کا راجا جی سندھیانے اپنے بیٹے جی سندھیانے کی مدد سے  
 ہوئی تو راجا واد جی اس میں شریک تھا بعد میں اس نے مالوہ اور راجپوتانہ کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہ نے تمام عالم کاظمی بن کر  
 ملک کا نظم و نسق دیکھ میں لے لیا اور نوبت سے ایک تک اس کا عمل دخل ہو گیا۔ ۱۲۰۲ء میں سندھیانے دوبارہ شاہ عالم سے سزا  
 کر کے اس اندھے بادشاہ کو تخت نشین کیا اور خود وزیر مطلق بن گیا۔ مہاراجا جی سندھیانے کی طرح نے کیا خوب کہا ہے۔

جب قدرت قادر قدر  
اندھا بادشاہ لنگڑا ہونے پر  
پانی پت میں جب ابدالی فوج سے مرچے شکست کھا کر بھاگے تو مہاراجی سندھیا طلائی اور نقری ساز سے آہا بستہ گھوڑے پر سوار  
تھا ایک ابدالی سپاہی نے اس کا تعاقب کیا اور منہرا کے قریب اس کے پاؤں پر تیر مار کر اسے گھوڑے سے گرا دیا اس کے چلنے کا ایک متر  
رانی خاں سہیل پر سوار آ رہا تھا اس نے مہاراجی کو اٹھا کر سہیل پر سوار کر لیا اور اس میں لے آیا۔ مہاراجی نے اس رانی خاں کو اپنا بھائی بنا

ارادہ کیا لیکن سعادت خاں ان کی سازش سے واقف ہو گیا اور اس نے ملک علاؤ الدین اور مبارکت خاں کو گرفتار کر کے قتل کر دیا البتہ ملو خاں جان بچا کر نکل گیا اس نے دہلی جا کر مقرب خاں کی پناہ لے لی، بادشاہ بھی اسی وقت پائے تخت کو لوٹ آیا اور شہر کے مضافات میں سلطانی کیمپ لگا دیا گیا۔ مقرب خاں نے چونکہ سرکش ملو خاں کو پناہ دی تھی اس لیے خوفزدہ ہو کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ تین ماہ تک مقرب خاں اور سعادت خاں کے لشکر میں لڑائی ہوتی رہی۔

ماہ محرم ۷۹۷ھ میں سلطان محمود مقرب خاں کے طرف داروں کے بہکانے سے سعادت خاں کو چھوڑ کر قلعہ میں چلا گیا اور مقرب خاں کی سرپرستی قبول کر لی۔ بادشاہ کے آجانے سے مقرب خاں کی قوت بڑھ گئی اور اس نے دوسرے دن میدان میں آکر سعادت خاں پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر دوبارہ قلعہ میں پسیا ہونا پڑا۔

**نصرت شاہ** سعادت خاں یہاں سے فیروز آباد چلا گیا اور بعض امیروں کو اپنے ساتھ ملا کر فتح خاں کے بیٹے نصرت خاں کو میوات سے بلایا۔ ماہ ربیع الاول ۷۹۷ھ میں اس کو ناصر الدین نصرت شاہ کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔ نصرت شاہ بس نام کا بادشاہ تھا سارے درویشیت پر سعادت خاں کا تسلط تھا۔ نصرت شاہ اس بے بسی پر سخت نالاں رہتا تھا چنانچہ فیروز شاہ کے چند غلاموں اور فیل بانوں کے ساتھ اس نے ایک سفارش کی اور کسی بہانہ سے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک بڑی جمعیت کے ساتھ سعادت خاں پر حملہ کر دیا۔ سعادت خاں اس سازش سے بے خبر تھا وہ کچھ نہیں کر سکا اور وہاں سے بھاگ نکلا اور اپنے پرانے دشمن مقرب خاں کے پاس ہی فریاد لے کر دہلی پہنچا۔ اس نے سعادت خاں کو ملاقات کے لیے بلا کر دھوکہ سے قتل کر دیا۔

**شطرنج کے بادشاہ** اب ایک ہی تخت کے دو دعویدار تھے۔ دہلی میں سلطان محمود اور فیروز آباد میں نصرت شاہ۔ فیروز شاہ کے غلاموں محمد مظفر وزیر، شہاب ناہر، ملک فضل اللہ بلخی اور دوسرے چند امیروں نے نصرت شاہ سے از سر نو بیعت کی۔ اس نے ان میں مناصب اور اعزاز تقسیم کیے۔

مقرب خاں نے دہلی کا پرانا قلعہ بہادر ناہر میواتی کے تفویض کیا اور ملو خاں کو اقبال خاں کا خطاب ملا۔ عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں بادشاہوں میں ہر روز شطرنج کے بادشاہوں کی طرح لڑائی ہوتی رہتی تھی لیکن کوئی دوسرے کو مات نہیں دے سکتا تھا۔

ہذا بہ کا دمیانی علاقہ، سنہل، پانی پت، رجتک اور ہجر نصرت شاہ کے قبضہ میں آ گیا تھا اور چند پرانے

تھیں۔ دہلی سیرمی وغیرہ سلطان محمود کے تصرف میں تھے۔ مشہور مثل: ”حکم خداوند عالم از دہلی تا پالم“ اسی زمانہ سے

(بقیہ حاشیہ گرامر صفحہ گزشتہ) مرگیا، دولت ماؤ سندھیا اس کا جانشین ہوا ۱۲۳۳ھ میں یہ ریاست انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اس کا حالیہ اقتدار راجہ جیا جی ماؤ سندھیا کی بدولت تھا۔ اس شخص نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں کی بڑی مدد کی تھی۔

اس کے صلہ میں اضافہ کیا گیا اور ملا اس کے بعد اس کا لڑکا مادھوراؤ جانشین ہوا۔ ریاست کا رقبہ ۲۵ ہزار مربع میل آبادی ۳۰ لاکھ آدمی ۶۵ لاکھ تھی۔

لہ پالم۔ دہلی سے دس کوس پر مسعود آباد کے آگے یہ قصبہ ہے۔ ابن بطوطہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ اسے سید شریف ناصر الدین جو محمد تغلق کے مصاحب تھے کی جاگیر بتاتا ہے۔ دہلی سے ریواڑی ریلوے لائن پر واقع ہے۔

چلی ہے، کیونکہ دہلی اور مضافات کو چھوڑ کر سارے ہندوستان میں جہاں جس کا بس چلا علاقہ و باکرہ خود مختار ہو گیا تھا۔ اور پورے ملک میں طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔

**خضر خاں اور سارنگ خاں** | کافی عرصہ تک فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ کبھی فیروز آباد دہلی والوں پر غالب آگئے تو کبھی دہلی والوں نے فیروز آباد والوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تو یہ صورت حال تھی ہی کہ شمال کی طرف خضر خاں امیر ملتان اور سارنگ خاں حاکم دیپال پور میں بھی کھڑے ہو گئے اور ان دونوں کے درمیان ۱۵۹۸ء تک سخت لڑائی ہوئی۔ آخر کار ملک مروان کے غلاموں نے خضر خاں سے بے وفائی کی اور سارنگ خاں سے جا کر مل گئے۔ یہ ملک مروان خضر خاں کے باپ ملک سلیمان کا محسن اور مربی تھا۔ ان غلاموں کی غداری کی وجہ سے ملتان خضر خاں کے قبضہ سے جاتا رہا اور سارنگ خاں کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس کے لشکر میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔

**سارنگ خاں کی شکست** | ۱۵۹۹ء میں سارنگ خاں نے حاکم سامانہ غالب خاں اور والی پانی پت تارخاں کو بے دخل کر کے دہلی تک قبضہ کر لیا۔ نصرت خاں نے فیروز شاہ کے غلام ملک الماس کو ایک بڑا لشکر اور بہت سے ہاتھی دے کر تارخاں کی مدد کے لیے روانہ کیا تا کہ سامانہ سارنگ خاں سے پھین کر غالب خاں کے سپرد کر دیا جائے۔

محرم ۱۰۰۸ھ میں موضع کوٹلہ کے تواح میں ان دونوں فوجوں میں بڑا سخت معرکہ گرم ہوا۔ سارنگ خاں شکست کھا کر ملتان بھاگ گیا۔ تارخاں نے تلونڈی تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے کمال الدین حسین کو اس کے تعاقب پر مامور کر کے لوٹ آیا۔

**مغلوں کا حملہ** | اسی سال ماہ ربیع الاول میں میرزا پیر محمد نے جو امیر تیمور گورگان سلطان خراسان و ماوراء النہر کا پوتا تھا، ہندوستان پر حملہ کیا اور دریائے سندھ مجبور کر کے قلعہ اوچھ کا محاصرہ کر لیا۔ سارنگ خاں کا

لہ دریائے سندھ۔ سنسکرت میں دریا کو سندھو کہتے ہیں۔ آریا مغرب سے آئے تھے اس لیے انھوں نے پہلا جو سب سے بڑا دریا دیکھا اس کا نام سندھو رکھ دیا۔ دریا کے نام سے ملک کا نام بھی سندھ ہو گیا۔ فارسی اور سنسکرت کی لغت میں ”س“ اور ”س“ کی تبدیلی ہو جاتی ہے، اس لیے اہل فارس اس ملک کو ”ہند“ کہنے لگے بعد میں ملک کا نام ”ہند“ اور دریا کا ”سندھ“ پڑ گیا۔ صرف دریا کے کنارے کا ملک سندھ لکھ دیا۔ مورخوں نے افسانہ طرازی اور قافیہ بندی سے کام لے کر ہند اور سندھ کو حضرت نوح کے دو بیٹے لکھا ہے۔ دریائے سندھ میں پنجاب کے پانچوں دریا مل جاتے ہیں اس کو ”پنج ند“ یا ”پنجاب“ کہتے ہیں۔ سلاطین مغلیہ کے وقت سے پہلے صرف دریائے سندھ کا نام پنجاب تھا اور ملک کو پنجاب نہیں کہتے تھے۔ ناصر الدین قباچہ جب دریائے سندھ میں غرق ہو کر مر گیا تو بدوؤں نے لکھا ہے ”ناصر الدین در پنجاب غرق بحر فنا گشت“ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے ”بعض مورخ اس دریا کا سرچشمہ ایک ایسے مقام کو بتاتے ہیں جو کشمیر اور کاشغر کے درمیان ہے اور بعض اسے ملک خطا میں بتاتے ہیں“ ولیم ولکنس نے اپنی کتاب ”علم جغرافیہ“ میں لکھا ہے ”یہ دریا ملک اور جو پارہ سے گزرتا ہوا بلوچستان میں بہتا ہے“ ابن بطوطہ نے لکھا ہے ”ہم پہلی محرم ۸۰۳ھ درہ عجمی تھیں“ کو دریائے سندھ پر پہنچے اس دریا کو پنجاب بھی کہتے ہیں، یہ دنیا کے بڑے دریاؤں میں سے ہے۔ گرمی کے موسم میں طغیانی آتی ہے۔ نیل کی طرح اس ملک کے باشندوں کا مدار بھی سندھ کی طغیانی پر ہے“



قلعہ دار علی ملک ایک ہیمنہ تک قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرتا رہا۔ اس کی ملک کے لیے سازنگ خاں نے تاج الدین بختیار کو ایک ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ جب وہ اوچھ کے قلعہ پر پہنچا تو میرزا پیر محمد محاصرہ اٹھا کر لوٹے گیا لیکن یہ محض اس کا فریب تھا کیونکہ اس نے دشمن کو دھوکے میں رکھ کر بیاس کو عبور کیا اور ملک تاج الدین کی فوج پر حجب کہ وہ غافل سو رہی تھی حملہ کر دیا اور بہت سے سپاہی قتل کر دیے بعض دریا میں ڈوب کر مر گئے۔ ملک کی فوج کو تباہ کر کے میرزا پیر محمد نے دوبارہ ملتان کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سازنگ خاں برابر چھ ماہ تک پیر محمد سے لڑتا رہا۔ آخر اس نے طلب کر کے اس کی پناہ میں آگیا۔ پیر محمد نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور تیمور کے آنے تک ملتان ہی میں ٹھہرا رہا۔

**اقبال خاں کی حوصلہ افزائی** | ماہ شوال ۸۸۷ھ میں اقبال خاں جو ملو یا سلطان کے نام سے مشہور تھا بڑے عہد و پیمان کے ساتھ نصرت شاہ کا حامی اور شریک بن گیا اور اسے پورے لشکر اور ہاتھیوں کے ساتھ قصر جہاں نما میں لے کر گیا۔ مقرب خاں اور بہادر تاجر پانی دہلی کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ تیسرے دن اقبال خاں نے دھوکا دے کر نصرت شاہ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ وہ بے خبر تھا۔ بدحواس ہو کر فیروز آباد بھاگا، وہاں سے جہنا پار کر کے اپنے وزیر تاتار خاں کے پاس پانی پت چلا گیا۔ نصرت شاہ کا سارا ساز و سامان ہاتھی گھوڑے مکار اقبال خاں کے ہاتھ آ گئے۔ اقبال خاں اور مقرب خاں کے مابین دو ماہ تک برابر لڑائی ہوتی رہی چند دن بعد بعض امراء نے درمیان میں پڑ کر دونوں کی صلح کرادی لیکن ایک دن موقع پا کر اقبال خاں نے دغا کی اور اچانک مقرب خاں کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور جب وہ امن کا قول و قرار کر کے باہر نکلا تو اسے قتل کر ڈالا اور سلطان محمود کو تخت پر بٹھا کر برائے نام بادشاہ بنالیا اور ملک کا سارا بندوبست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ماہ ذی قعدہ ۸۸۷ھ میں اقبال خاں نے تاتار خاں سے پانی پت بھی چھین لیا اور وہاں کا سارا ساز و سامان اس کے

لے بیاس۔ بیاہ یا بیاس اس کا پرانا نام بیا شاہ ہے، اس کے سر چشمہ کو بیاہ کہتے ہیں۔ کوہ کلوسے نکلتا ہے۔ سلطان پور اسی کے کنارے آباد ہے اکبر نے سٹیج اور بیاس کے درمیان حصہ کو ”بیت جالندھر“ اور بیاس اور راوی کے درمیان علاقہ کو ”باری“ کا نام دیا تھا۔ سٹیج سے بیاس تک ۵۰ کوس اور بیاس سے راوی تک سترہ کوس کا علاقہ ہے۔ (ابو الفضل - آئین اکبری)

۱۷ میلے جہنا۔ کوہ ہندو کش سے نکل کر جنوب کی طرف بہتی ہے۔ پانی پت، دہلی، آگرہ، الہ آباد اس کے کنارے آباد ہیں گنگا کی نصف مسافت پر الہ آباد کے قریب گنگا سے آکر مل جاتی ہے۔ گنگا جہنا کے سنگم کو ترہینی کہتے ہیں، ہندوؤں کی مقدس زیارت گاہ ہے۔ جہنا کا طول ۵۰ میل ہے گنگا کا ۱۷۵ سندھ کا ۱۷۰۔ دنیا کا سب سے بڑا طولانی دریا میسیپی ہے، نیل ۳۶۰۰ میل لمبا ہے، دالگا ۲۴۰۰ میل، فرات ۲۸۰۰ برہم پتر ۱۶۸۰، آمو یعنی جیجوں ۱۲۰۰ میل، دجلہ ۱۱۳۰، سٹیج ۱۰۰۰، سیحون ۱۰۰۰ گوداوری دکن ۸۰۰ میل ہے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے: ”ہندوؤں کی قدیم کتابوں میں ہے کہ جہنا کا منبع کلند نامی پہاڑ میں ہے کہ وہاں سرودی کی شدت سے کوئی نہیں جاسکتا۔“

۱۷ پانی پت کا پورے ۲۵۲ میل اور دہلی سے ۵۴ میل پر ہے، راستہ میں کہ نال اور تراوڑی جیسے تاریخی مقامات پڑتے ہیں۔ پانی پت دریا جہنا کے پلنے ساحل پر ایک قدیم شہر ہے، اس کا ذکر کو روپا نڈو کی رٹائی مہابھارت سے پہلے بھی ملتے ہیں، اس میدان میں تین بڑی تاریخی ٹرائیاں ہوئیں جن کی وجہ سے ہندوستان کی قسمت ادلتی بدلتی رہی۔ پہلی ٹرائی ۹۲۷ھ میں ہوئی تھی جس میں بابر نے مختصر سی جمعیت سے ابراہیم لودی کے بڑے لشکر کو شکست دی تھی اور ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی دوسری ٹرائی ۹۲۷ھ میں اکبر اور عادل شاہ سوری کے درمیان ہوئی تھی۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

قبضہ میں آگیا۔ اس حملہ سے پہلے تاتار خاں نے دہلی پر یورش کی تھی لیکن وہ کچھ نہ کر سکا بلکہ الٹا ایک بڑا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لاچار ہو کر وہ دہلی سے اپنے باپ کے پاس گجرات چلا گیا۔ اقبال خاں نے دہلی آنے کے بعد تاتار خاں کے داماد نصیر الملک کو بالول خاں کا خطاب دے کر دو آبرو کا درمیان فی علاقہ اس کے لیے تفویض کر دیا۔

**ہندوستان پر امیر تیمور کا حملہ** | شہنشاہ میں امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا اور تلینہ کو غارت کر کے ملتان پہنچ گیا۔ میرزا پیر محمد نے سازگ خاں کے بہ شمار لشکریوں کو یہاں قید کر رکھا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ پانی پت) سپہ سالار ہیوں بقال کے درمیان ہوئی، اکبر نے ہیوں کو شکست دے کر مغل سلطنت کو مستحکم کر دیا۔ تیسری لڑائی ۱۵۵۶ء میں ابدالی اور مرہٹہ فوجوں کے درمیان ہوئی۔ ایک طرف افغانستان کا احمد شاہ درانی اور دوسری طرف شہنشاہ بہاؤ سندھیا اور لکھتین بٹے مرہٹہ سردار تھے۔ مرہٹوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور ابدالی فوج تقریباً ایک لاکھ تھی۔ احمد شاہ نے مرہٹوں کو اس بری طرح شکست دی کہ شمال سے دکن تک ان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور ہندوستان کی فرمانروائی کا خواب بس خواب بن کر رہ گیا۔ پانی پت کے شہر سے باہر بادشاہ کی ایک عالی شان مسجد ہے جو پہلی لڑائی کی یادگار ہے۔ شہر کی آبادی مختصر ہے مگر عمارتیں سب پختہ ہیں۔ وسط شہر میں شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ یہ بزرگ سلسلہ چشتیہ کے مشہور مجذوب ہیں۔ ادا تل عمر میں علوم مروجہ حاصل کیے اور جب حالت جذب و سکر کا غلبہ ہوا تو کتابیں دریا میں پھینک کر صوفیانے چشت کا دامن تمام لیا۔ معارج الہایت کا مصنف لکھتا ہے وہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کاکی کے خلیفہ میں بعض ان کو شیخ نظام الدین بدایونی۔ سلطان الاولیاء سے منسوب کرتے ہیں۔ عشق و محبت، عوارف و حقائق، توحید، ترک اور جذب کے بیان میں ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ایک مکتوبات کا مجموعہ بھی ہے جو اپنے مرید اختیار الدین کو لکھے تھے ان کی ایک کتاب ”جامع علوم توحید“ ہے۔ دوسرا رسالہ ”علم نامہ شیخ شرف الدین“ کے نام سے مشہور ہے ایک مثنوی ”مخزن نور“ ہے۔ اشعار اور غزلیات بھی بہت مشہور ہیں۔ پانی پت کے یہ قدیم باشندے ہیں ان کے والد کا نام سالار فخر الدین تھا۔ والدہ کا نام بی بی حافظہ حیاں۔ یہ علاؤ الدین اور جلال الدین خلجی کے عہد کے بزرگ ہیں۔ یہ دونوں بادشاہ ان کے حلقہ بگوش تھے صاحب ”سیر الاقطاب“ نے ان کا سلسلہ نسب امام اعظم ابو حنیفہ سے طریا ہے اور سلسلہ ارادت خواجہ بختیار کاکی سے۔ بوعلی شاہ قلندر حضرت شمس الدین کلیر کے ہم عصر تھے آپ نے کچھ عرصہ پانی پت کے مشرق میں بمقام باگھوٹی مقام کیا ہندی میں باگہ شیر کو کہتے ہیں چونکہ آپ شیر کی شکل میں شہر سے اس جنگل میں جلتے تھے اس لیے اس کا نام باگھوٹی پڑ گیا۔ یہ مقام بھی عمام کی زیارت گاہ ہے کچھ عرصہ بعد شیخ کرناں کے ایک موضع بٹھا کھٹڑہ میں جا کر رہے، صاحب ”سیر الاقطاب“ اور مصنف ”تذکرۃ العاشقین“ کے بیان کے مطابق ان کی وفات ۱۳۱۳ رمضان ۸۲۷ھ میں ہوئی مزار پانی پت اور کرناں کے نواح میں ہے، آپ کے مرقعہ کی عمارت بڑی نفیس ہے اس کی چھت سنگ کسوتی ہے آٹھ ستونوں پر قائم ہے۔ پانی پت علوم و فنون کا مرکز رہا ہے، فن تجوید (قرائت) میں تو کبھی اس کا بڑا شہرہ تھا، جس طرح ٹوٹک کے حلقہ مشہور ہیں اسی طرح پانی پت کے قاری مشہور تھے۔ شمس العلماء و خواجہ الطاف حسین حالی مصنف مستدس عالی بیباں کے متوطن تھے۔ قاضی شاہ شمس بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے ان کا نام قادیانیوں کے مباحثوں میں بڑا مشہور ہے۔ سید غوث علی شاہ فقیر بھی اسی جگہ کے باشندے ہیں۔

پانی پت میں ایک مزار امام بدر الدین کا ہے جن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ امام زین العابدین کے پوتے تھے اور یہاں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ”شہیدوں کا ٹیکرا“ ان کے مزار کی بلندی ہی کا نام ہے۔

۱۷۰۱ء میں تیمور کا حملہ مغلوں کی مختلف تاریخوں سے جو تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے۔ امیر تیمور نے اپنے وزیروں اور امیروں سے مشورہ کیا کہ ”میں یہیں پر چڑھا کروں یا ہندوستان پر؟“ لوگوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے سے روکا اور اس کے چار سبب بیان کیے۔ اول پنجاب کے دشوار گزار دریا، دوم جنگل کی کثرت، سوم محاربی باشندوں کی لوٹ مار چارم جنگی ہتھیاروں سے مقابلہ لیکن شاہزادہ شاہ رخ مرزا اس کے برخلاف ہندوستان پر حملہ کرنے کا حامی تھا۔ تیمور نے اپنے لشکریوں کو بہت آمادہ کیا لیکن وہ ہندوستان پر فوج کشی کے لیے دل سے راضی نہیں ہوتے تھے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

مور نے ان کو قتل کرادیا۔ تیمور ملتان سے آگے بڑھا اور مسلسل کوچ کرتے ہوئے بھت کے قلعہ کو فتح کر لیا۔ راجہ جلیجین بھتی کو قلعہ میں محصورا شخاص کو قتل کر ڈالا۔ تیموری لشکر نے ابیشیش قدمی کر کے سامانہ بھی فتح کر لیا۔ اس وقت دیپال پور،

میر جاشیہ امیر تیمور کا حملہ صفحہ گذشتہ) اسی اثنا میں ہندوستان سے پیر محمد کا عریضہ آیا کہ اس نے ملتان فتح کر لیا ہے اور تیمور کو اب ہندوستان پر حملہ کر دینا چاہیے۔ اس نے تفصیل سے ہندوستان کی اس وقت کی طوائف الملوکی کا بھی ذکر کیا۔ اس رپورٹ کے آنے پر تیمور نے ہندوستان پر چڑھائی کا عزم کر لیا اور سنہ ۱۳۹۸ھ کے آغاز بہار میں کوہ ہندوکش سے اتر کر پہلے کابل آیا، وہاں سے سرکنڈوں کا پہلی غزہ کر لیا اور جہلم کو عبور کیا اور تلمینان کو روندنا چڑھایا۔ یہ مقام ملتان سے آٹھ میل پر تھا، یہاں سے پاکپتن اور دھن سے گزر کر قلعہ بھٹنیر اور بانس کو فتح کرتا ہوا اسمانہ کے راستہ دہلی کا رخ کیا اور سلطان محمود کے فرار کے بعد ۸ ماہ ربيع الاول سنہ ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۱۳۹۸ء دہلی میں داخل ہوا، انہی دنوں دہلی کا قتل عام ہوا۔ بعض مورخوں نے اس کی ذمہ داری ہندوؤں پر ڈالی ہے۔ ان لوگوں نے تیمور کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے اس کے بعض سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس قتل عام میں لاکھوں آدمی راجل ہو گئے۔ آخر میں تیمور سوار ہو کر جامع مسجد میں آیا اور علماء و مشائخ کو جمع کر کے معذرت کی کہ میں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجبور ہو گیا۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔ وہ کہہ سکتے چپ ہو رہے۔ قتل عام کے بعد تیمور دہلی سے میرٹھ گیا۔ وہاں بھی قتل عام ہوا، پھر ہردوار اور جمبوسے ورتا ہوا کابل کے راستہ واپس ہو گیا۔ تیمور کی تاریخ ولادت سنہ ۱۳۷۰ھ اور وفات سنہ ۱۳۹۸ھ ہے۔ تیمور کے ابتدائی حالات میں مورخین کو بڑا اختلاف ہے۔ اس کی جائے پیدائش شوکس یا کس یا کیش نامی ایک مقام ہے جو ماورالنہر کا ایک سرسبز و شاداب شہر ہے، سمرقند سے حجر پر ب دو دن کا راستہ ہے۔ عربی کی "تاریخ تیموری" کا مصنف اسے چور اور ڈاکو بتاتا ہے، بعض اسے قصاب بعض چرواہا بعض سپاہی زادہ شخص مروجی بعض اسے چنگیز کی اولاد بتاتے ہیں صرف آخری بات صحیح ہے پہلی ساری باتیں "تاریخ تیموری" کے مصنف کی اختراع ہیں، تیمور اس مصنف کے لیے پھانسی کا حکم دیا تھا اس لیے وہ اس کا مخالف اور دشمن ہے چنانچہ قابل اعتبار نہیں، ان دنوں بلخ اور بلادخراسان سلطان حسین بادشاہ قندھار نے "تاریخ المنتخب" کے مصنف نے لکھا ہے کہ تیمور کا باپ سلطان حسین کی فوج میں تھا بعد میں تیمور خود اس بادشاہ کے مقرب و مددگار بن گیا۔ اس تاریخ منتخب سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں سے تیمور کا رشتہ ماں کی طرف سے تھا۔ تیمور ترک لفظ ہے جس کے معنی "نرلاد" کے ہیں، اس کا سلسلہ نسب تاریخوں میں صرف تیمور بن ترغائی بن ابنا و درج ہے یہ "ابناء" بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا اصل شہر کس کا ایک گاؤں "ایلغار" تھا جو تیمور کا مولد و مسکن تھا۔ عربی مورخوں نے اسی "ایلغار" کو اس کے دادا کا نام سمجھ لیا۔ تیمور نے مدیج سلطان حسین کے ہاں اتنا اثر بڑھایا کہ سلطان نے اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے دی، اس کے نام کے ساتھ "کورگان" اگر گان لکھا جاتا ہے اس ترک لفظ کے معنی "داماد" کے ہیں۔ شاہی داماد ہونے کی وجہ سے اس کا یہ لقب پڑ گیا۔ اس کے ابتدائی زمانہ کے قریب عباس شاہ جہاں، تماری، ہاکو، سیف الدین ایسے شاطر اور بہادر کل چالیس آدمی تھے۔ ان لوگوں نے جیون پار کر کے منتخب، نشان پر قبضہ کر لیا اور جیون کے کنارے سلطان حسین کے لشکر کو شکست دی، پھر بلخ پر حملہ کر کے سلطان حسین کو قتل کر دیا اور سمرقند دارالسلطنت بن کر تیمور کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ماورالنہر کے تمام شہر خوارزم، ہرات، بلادخراسان، عراق، عجم کے سارے علاقے ایک جگہ بہت ہی جلد تیموری پرچم کے تحت آ گئے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی طرف آیا۔ دوسری طرف ٹرسیر، زینا، تاتار، جارجیا، بوسنیہ، روس اور سائبیریا کے سارے علاقے فتح کر لیے آخر عمر میں چین کا عزم تھا لیکن موت نے مہلت نہیں دی۔ خطا پر فوج کشی کے ارادہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ مقام انزار میں اس کے لشکر کو سخت صدمہ لگ گیا۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے شراب نوشی شروع کر دی اور اس کثر سے پانی نہ پیا اور جگر ماؤٹ ہو گیا اور اسی مقام انزار میں بدھ کی شب کو ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۹۸ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کی سلطنت کے بچے بھرے ہوئے۔ سب سے بڑا جانشین امیر خلیل سلطان تھا۔ حمیدہ بانو بیگم تیمور کی چیتی بیگم تھی۔ تیمور کو لنگ کہتے ہیں۔ ونگہ اس کی محراب نشینی کے زمانہ میں کسی چہرہ نے تیر مار کلاس کی ٹانگ زخمی کر دی تھی۔ تیمور شب ۲۵ شعبان سنہ ۱۳۹۸ھ میں پیدا ہوا تھا۔

اجودھن اور سرستی کے سارے لوگ جان کے خوف سے ادھر ادھر بھاگ نکلے اور اس بلائے آسمانی سے بچنے کے لیے جہاں سینک سہائے چلے گئے۔ تیمور نے ان مفرونین میں سے جس کو بھی جہاں پایا قتل کر دیا اور بعض کو قید کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔

**تیموری لشکر دوا آبہ میں** | سامانہ سے تیمور نے آگے بڑھ کر جہنا کو عبور کیا اور دوا آبہ کے علاقہ میں تباہی مچا دی۔ سارا ملک اس کی لوٹ کھسوٹ سے ویرانہ بن گیا۔ جہنا کے کنارے قصبہ لونی میں جو دہلی کے قریب ہے اس نے منزل کی ادھیماں تقریباً پچاس ہزار قیدی جو گنگا کے کنارے تک پکڑے گئے تھے تر تیغ کرادیے۔ تیمور کے لشکر میں کچھ لوگ بڑے بڑے عملے باندھے مولویوں کی صورت بنائے ساتھ تھے۔ انھوں نے مسلمان قیدیوں کو بھی ہندوؤں کے ذیل میں شمار کیا اور جہاد کی نیت سے اپنے ہاتھ سے ان بے کسوں کو قتل کر دیا۔

۸۰۰ھ ماہ جمادی الاول میں تیمور نے جہنا کو عبور کیا اور فیروز آباد آکر ٹھہر گیا۔ دوسرے دن حوض خاص پر اس کے لیے شامیلے لگائے گئے۔

**سلطان محمود کا فرار** | اقبال خاں تیموری لشکر کے مقابلہ پر بہت سے ہاتھی اور بھاری لشکر لے کر آیا لیکن تیمور کا فوج نے ایک ہی زوردار حملہ میں اسے بری طرح شکست دی اور سارے ہاتھی تیمور کے ہاتھ آگے بھج گئے۔ رات ہوئی تو اقبال خاں اور سلطان محمود عزت و آبرو و شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے اہل و عیال کو اس مصیبت میں بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئے۔ سلطان محمود تو گجرات کی طرف بھاگا اور اقبال خاں جہنا پار کرنے کے قصبہ یرن میں جا چھپا۔

**تیمور دہلی میں** | دوسرے دن امیر تیمور دہلی میں داخل ہو گیا اور شہر والوں کو کافی مال و دولت کا اقرار لے کر امان عطا کی۔ حسب اقرار شہریوں سے مقررہ رقم اور مال وصول کر لیا اس کے علاوہ اسے بڑے نذرانے اور قیمتی پیش کش بھی حاصل ہو گئی۔ اس درمیان میں تیموری لشکر کے کئی ایک سپاہیوں کو شہر والوں نے قتل کر دیا۔ جب تیمور کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے تمام شہریوں کی عام گرفتاری کے احکام دے دیئے اور دہلی کے رہنے والے بے شمار لوگوں کو ماوراء النہر پہنچا دیا۔

**شیخ احمد کٹھو** | ان قید ہونے والوں میں شیخ احمد کٹھو بھی تھے جن کا مزار گجرات میں احمد آباد کے قریب ہے وہ بھی تیمور کے لشکر کے ساتھ گئے تھے تیمور سے ان کی ملاقات بھی ہوئی اور تیمور ان کے فضل و کمال کا بڑا

۱۰۰ شیخ احمد تقی نسر کے رہنے والے تھے اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے خلیفہ تھے۔ جب وہ امیر تیمور سے ملاقات کرنے وہاں گئے تو ان کے اور شیخ الاسلام نبیرہ مولانا بہان الدین مرغیانی مصنف ہدایہ کے درمیان نشست کی تقدیم و تاخیر پر جھڑپ ہو گئی۔ تیمور نے کہا "شیخ الاسلام کے دادا ہدایہ کے مصنف ہیں، اس لیے ان کو نشست میں اولیت اور تقدیم حاصل ہے۔" مولانا احمد نے فرمایا "صاحب ہدایہ نے خود ہدایہ میں غلطیاں کی ہیں اصل عزت علم کی ہے نہ کہ شخص کی۔" شیخ الاسلام نے غلطیاں بیان کیں۔ مولانا نے خود جواب دینے کی بجائے اپنے شاگردوں کو اشارہ کیا کہ وہ صاحب ہدایہ کی غلطیاں بیان کریں لیکن تیمور نے اس بحث کو روک دیا اور مجلس برخواست کر دی۔ جب مولانا احمد تیمور کی قید سے رہا ہوئے تو دہلی سے کالپی جا کر رہ گئے۔ اسی جگہ ۸۲۰ھ میں وفات پائی۔ ان کا مزار کالپی میں ہے۔



معتقد ہو گیا۔ انہوں نے ماوراء النہر کے تمام علماء کو مباحثہ میں لا جو اب کر دیا اور تیمور سے ان قیدیوں کی رہائی کی سفارش کی۔ تیمور نے ان کی خاطر سارے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ پلاشبہ شیخ کا اہل ہند پر بڑا احسان ہے۔ شیخ کے حالات میں یہ سارا قصہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

اس فتح کے کچھ دن بعد خضر خاں اور بہادر شاہ سوایاتی جو میوات کے پہاڑوں میں ڈر کر چھپ گئے تھے، امیر تیمور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تیمور نے خضر خاں کے سوا باقی سب کو قید کر لیا۔ خضر خاں کی غالباً امیر تیمور سے پہلے کی نھوڑی بہت شناسائی تھی اسی لیے وہ بچ گیا۔

تیموری لشکر نے دوبارہ ہندوستان کے سارے ملکوں کو لوٹ لیا اور کوہ سواک کے ملکوں کو فتح کر کے وہاں ایک قیامت برپا کر دی اس کے بعد تیمور لاہور آیا۔ اس فتح کی تاریخ لفظ "رخا" اور "خار" سے نکلتی ہے۔

شیخا کھوکھر پہلے تیمور کی خدمت میں چلا گیا تھا پھر وہ لوٹ کر آیا اور فریب سے لاہور کو سازنگ خاں سے چھین لیا تھا اور خود قابض بن کر بیٹھ گیا تھا۔ تیمور نے اس کو اہل و عیال سمیت گرفتار کر لیا اور لاہور کے تمام شہریوں کو لوٹ لینے اور گرفتار کر لینے کا حکم دیا۔

خضر خاں کو دیپال پور اور ملتان کا ملک تفویض کر کے اس سے کہا: تیمور کی واپسی مدہلی بھی ہم نے تجھے عطا کر دی۔ امیر تیمور لاہور سے کابل پہنچتا ہوا

کابل۔ اکبر کے زمانہ میں یہ صوبہ تھا اور کشمیر اس کے ماتحت تھا۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے اس کا طول ایک ہزار سے زائد میل ہے۔ ہندو کوہ تک سو کوس ہے اس کا عرض قریباً قندھار سے چغان آسرا تک سو کوس ہے۔ اس کے شمال میں ہندوستان شمال مغرب میں کوہستان اور ملک خوراند راب بدخشاں جنوب میں فرل اور نغز ہیں۔ یہ نہایت سرد علاقہ ہے، شدید برف باری ہوتی ہے، میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں لیکن خریدہ اچھا نہیں ہوتا، چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے زراعت اچھی نہیں ہوتی۔ گوہ ہندو کش کابل کو بدخشاں اور بلخ سے جدا کرتا ہے۔ ہندوستان سے کابل جانے کے پانچ راستے ہیں: (۱) کوہ پور۔ یہ راستہ درہ کوتل سے جلال آباد چلا گیا ہے، بابائے اس راستہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس وقت یہ درہ کھلا نہیں تھا۔ (۲) خیبر۔ یہ پہلے دشوار گزار راستہ تھا اکبر نے اس کو درست کر لیا۔ (۳) بکش۔ اس راستہ میں دریائے سندھ پڑتا ہے (۴) نغز (۵) فرل۔ صوبہ کابل (موجودہ افغانستان) میں گیلانہ زبانیں مروج رہی ہیں۔ ترکی، مغولی، فارسی، ہندی، افغانی، پشتو، پراچی، گجراتی، بدکی، لغمانی اور عربی۔ اس علاقہ کے دو بڑے قبیلے ہزارہ اور افغان ہیں۔ ہزارہ کے لوگ ان چغتائی لشکریوں کی اولاد میں سے ہیں جن کو منکوقاآن نے ہلاک کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ ہلاک کرنے اس فوج کو اپنے فرزند تگودارا وغلان کی ماتحتی میں کابل بھیج دیا۔ یہ قبیلہ غزنی سے قندھار میدان سے سرحد بلخ تک آباد ہے۔ اس کی تقریباً ایک لاکھ خاندان کی آبادی ہے، یہ لوگ باہم بڑے منافق اور ریاکار ہوتے ہیں۔ دوسرا بڑا قبیلہ افغانوں کا ہے جو اپنے آپ کو بنی اسرائیل کی اولاد بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کا نام افغان تھا، اس کے تین لڑکے ہوئے: سرین، غرغشت، بٹن، ان تینوں کی اولاد کئی خاندانوں میں پھیل گئی۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں کوئی چالیس خاندانوں کے نام لکھے ہیں۔ افغان متی نامی ایک خور قبیلہ کے آدمی نے بٹن قبیلہ کی ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات کے بعد نکاح کر لیا۔ اس سے تین بیٹے جو غلانی، لودھی اور سرکانی پیدا ہوئے ان کی اولاد افغان کہلائی (باقی بر صفحہ آئندہ)

براہ قندھار سمرقند چلا گیا۔

اس سال دہلی میں ایسی وبا پھیلی اور اتنا سخت قحط پڑا کہ اس کی بربادی اور ویرانی میں کوئی کسر باقی نہ رہی۔ شہر اور مضافات ایسا جڑے کہ انسان تو انسان کسی چرند پرند کا سایہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

بقیہ حاشیہ کا بل صفحہ گزشتہ : بعض مورخ افغانوں کو قبلی الاصل بتاتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل بیت المقدس سے مصر آئے تو یہ قبلی مصر سے بھاگ کر ہند آگئے اور افغان کہلائے۔

شہر کابل دنیا کے قدیم اور مشہور شہروں میں سے ہے۔ کہتے ہیں اس کی آبادی پشتنگ کے عہد میں یہاں بسی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں یہاں مٹی کے دو مضبوط قلعے تھے۔ قلعہ کابل کے مغربی شمالی جانب ایک پہاڑی ”شاہ کابل“ نامی ہے اس پر کسی بادشاہ کی بنائی ہوئی عالیشان عمارت تھی۔ دوسری سرسبز پہاڑی ”حقایں“ ہے، دو چشمے بھی ہیں ایک کا نام ”خطیبیاں“ ہے جو شہر میں سے گزرتا ہے۔ دوسرا چشمہ جوئے پل تال کہلاتا ہے۔ ایک نرند ماہم آنگہ“ بھی ہے، ایک تفریح گاہ گلگتہ بھی ہے، یہی گلگتہ اب گلگت کے نام سے اچھا خاصا شہر ہے کابل اور قندھار ہندوستان کے دروازے کہلاتے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں کابل کا ذکر سب سے پہلے سلسلہ میں ملتا ہے جبکہ عبدالملک بن مروان اموی خلیفہ نے اسد بن عبداللہ کو معزول کر کے حجاج بن یوسف ثقفی کو خراسان کا اور اس کے تحت عبداللہ بن ابی بکر کو سیستان کا حاکم بنایا۔ عبداللہ بن ابی بکر نے سیستان میں شکر جمع کر کے کابل کے راجہ ان تھیل پر حملہ کیا، وہ پہاڑوں میں جا چھپا۔ اس کے تعاقب میں عبداللہ بھی پہاڑوں میں جا کر راستہ بھول گیا۔ مقامی باشندوں نے واپسی کے دروں کو پتھروں سے چن دیا، جب اس کا لشکر عاجز آگیا تو اس نے سات لاکھ درہم جو تین لاکھ روپے کے مساوی ہوتے ہیں ادا کر کے حریف کے ملک سے نجات پائی۔ حجاج نے سلسلہ میں عبدالرحمن بن محمد اشعث کو کابل پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ اس نے بڑی کامیابی حاصل کی اور کافی مال غنیمت وصول کیا لیکن مقامی دشواریوں کی وجہ سے ملک پر قبضہ نہیں نہ سکے اور واپس چلا گیا۔ حجاج نے اسے دوبارہ کابل پر حملہ کرنے کے لیے مجبور کیا وہ حجاج کی سخت گیری سے تنگ آچکا تھا اس نے حاکم کابل سے مصالحت کر لی اور حجاج سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا اور فوج تہمتیں حجاج کو شکست دے دی۔ حجاج وہاں سے بصرہ چلا گیا۔ جب حجاج نے دوبارہ عبدالرحمن پر حملہ کیا تو وہ بہت کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ بہت کے قلعہ دار نے عبدالرحمن کو گرفتار کر کے حجاج کے پاس روانہ کر دینا چاہا لیکن حاکم کابل کو اس کی خبر ہو گئی، اس نے حملہ کر کے عبدالرحمن کو چھڑا دیا اور کابل سے کرچلا گیا۔ لیکن سلسلہ میں ان تھیل حاکم کابل نے حجاج کی باتوں میں آکر عبدالرحمن کو بصرہ بھیج دیا۔ اس نے حجاج کے سامنے جانے سے پہلے ہی ایک پہاڑی پر سے گر کر جان دے دی۔ سلسلہ میں ہشام بن عبدالملک کے عہد میں امین عبداللہ قشیری حاکم خراسان نے کابل کو فتح کر کے اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس کے بعد سے کابل بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں خراسان کے حاکم کا ماتحت رہا۔ سامانیوں کے عہد میں ایک غلام اپتگیں نے غزنی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سبکتگین بادشاہ ہوا، اس کے بعد محمود غزنوی نے غزنوی سلطنت قائم کی۔ غزنویوں کے بعد سلاطین غور کابل پر قابض رہے، ان کے بعد ان کے غلاموں کی حکمرانی رہی۔ محمد غلاماں کے بعد سلاطین خوارزم کا قبضہ رہا۔ ان کے بعد قاآن چنگیز خاں کے ہاتھ آگیا۔ اسی چنگیز خانی سلسلہ میں امیر تیمور نے کابل پر قبضہ کر لیا۔

قلعہ قندھار۔ کابل اس کے مشرق اور غزنی شمال میں ہے۔ گرمی سخت پڑتی ہے، سردی بہت کم ہوتی ہے لیکن برف باری منور ہوتی ہے۔ یہاں کا سفید گہوؤں بہت مشہور ہے۔ قندھار سے پانچ کوس پر اڑ در کوہ ایک پہاڑ ہے اس میں ایک غار ہے جس کا نام غار جمشید ہے۔ اس درہ میں ہوا گھٹنے کی وجہ سے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ قندھار کے انار مشہور ہیں بڑے بڑے ہریخ دانے ترشی مائل ہوتے ہیں۔ اسی طرح سیب بھی مشہور ہیں، نزدیکی مائل بڑے اور نہایت خوشبودار ہوتے ہیں۔ سب سے اچھا سیب سمرقند کا ہوتا ہے۔

**ہندوستان کی طوائف الملوکی** | نصرت شاہ جو اقبال خاں کے مقابلہ سے بھاگ کر دہلی میں چلا گیا تھا اس موقع کو غنیمت جان کر میرٹھ آیا، وہاں سے سیدھا دہلی پہنچ گیا۔ جو لوگ مغلوں کی دست برد سے جان بچا کر ادھر ادھر چھپے بیٹھے تھے وہ سب اور عادل خاں اس کے گرد جمع ہو گئے اور اچھا خاصا لشکر بن گیا۔

اب نصرت شاہ نے شہاب خاں کو اقبال خاں کے مقابلہ کے لیے برہن کی طرف روانہ کیا لیکن راستہ ہی میں اسے ہندوؤں نے شبخوں مار کر قتل کر ڈالا۔ اقبال خاں نے پیش قدمی کر کے اس کے مال و اسباب اور ہاتھیوں پر قبضہ کر لیا۔ اس کامیابی سے اقبال خاں کا اقبال چمک اٹھا اور روز بروز اس کی جمعیت میں ترقی ہوتی گئی اور نصرت شاہ کی رونق اٹھتی چلی گئی۔

اقبال خاں نے پوری تیاریوں کے بعد برہن سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ اس کی لشکر کشی کی خبر سنتے ہی نصرت شاہ فیروز آباد سے میوات کی طرف بھاگ گیا۔ اسی جگہ اس کا انتقال ہوا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کی طوائف الملوکی حد انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ جہاں جس نے قدم جمایا وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔

**۸۰۶ھ میں اقبال خاں نے حاکم بیانہ شمس خاں اودھ کی پر حملہ کیا، نوہ اور مپٹل کے جنگل میں ان کا مقابلہ ہوا جس میں اقبال خاں کو فتح نصیب ہوئی اور شمس خاں شکست کھا کر بیانہ کی طرف پھپھے ہٹ گیا۔**

بیانہ کے بعد اقبال خاں نے کینٹھ پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ رائے ہر سنگھ سے کافی مال بطور پیش کش لے کر واپس ہوا۔

۱۷۰۶ء میرٹھ کہتے ہیں یہ شہر قبل مسیح سے آباد ہے۔ میرٹھ کی جامع مسجد کے پاس بدھ مذہب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں سید سالار مسعودی غازی نے اسے فتح کیا تھا۔ مغلوں کے عہد میں یہاں عمدہ عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ دارالاحلافہ دہلی سے قریب تھا اس لیے اس کی بڑی اہمیت اور رونق تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے تباہ ہو گیا۔ انگریزوں کے زمانہ میں اس کی آبادی سو لاکھ تھی۔ شاہی زمانہ کی جامع مسجد اپنے ٹیکرے پر ہے۔ شہر سے باہر شاہ پیر کی درگاہ سنگ مسوخ کی بنی ہوئی ہے اس میں بچی کاری کا نفیس کام ہے مگر رونقہ کا گنبد اوپر سے ناکمل ہے، یہ شاہ صاحب جہانگیر بادشاہ کے پیر تھے۔ عمارت نور جہاں بیگم کی یادگار ہے۔ شہر سے باہر ایک میل پر نوچندی دیوی کا مندر ہے جہاں نئے چاند کی خوشی میں "نوچندی کا مید" لگتا ہے۔ میرٹھ کی چھاؤنی قدیم انگریزی گھپ ہے۔ ۱۷۵۸ء کی بغاوت اسی چھاؤنی سے شروع ہوئی تھی۔ میرٹھ کے کباب بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔

۱۷۰۶ء ابن بطوطہ نے اسے برہن لکھا ہے وہ کہتا ہے "یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، ہندوؤں کے درمیان یہ مسلمانوں کا شہر ہے اس کا حاکم محمد بن بیرم ترکی ہے، یہاں بکثرت درندے ہیں اس نے ایک مردم غور شیر کا قتلہ بھی بیان کیا ہے۔ اس نام کا آج کل کوئی شہر نہیں۔ آئین اکبری میں ایک محال اور قلعہ برہن نام کا سرکار زبور صوبہ آگرہ میں ملتا ہے۔ غالباً یہی شہر ہوگا۔ گوالیار سے جو سڑک مٹو کو جاتی ہے وہ بھی قلعہ کے علاقہ سے گزرتی ہے، ابن بطوطہ کا راستہ بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ نورنگا لیا میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔

اسی سال جون پور میں خواجہ جہاں کا انتقال ہو گیا۔ اس کی جگہ ملک مبارک قمر نفل مبارک شاہ کے خطاب سے قائم مقام بنا۔

۸۰۳ھ میں بیانیہ کے شمس خاں اور بہادر ناہر خاں کے لڑکے مبارک خاں نے اقبال خاں سے مصالحت کر لی اور اس نے ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر پٹیالہ کی حدود پر حملہ کیا۔ آپ سیاح کے کنارے جو کالے پانی کے نام سے مشہور ہے وہاں کے مقدم رائے سیر کو شکست دے کر بھگا دیا اور ان کا فروں کا اٹاؤ تک تعاقب کیا۔

اقبال خاں جب یلغار کرتے ہوئے قنوج پہنچے تو وہاں گنگا کے دوسرے کنارے پر مبارک شاہ جو پور سے کوچ کر کے پہنچ گیا تھا اور اس کی فوج مقابلہ کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اقبال خاں نے اس کنارے پر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ فریقین میں سے کسی کو بھی گنگا عبور کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور دونوں اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔

دریائے واپسی پر اقبال خاں نے شمس خاں اور مبارک خاں کو بد عہدی کر کے قتل کر ڈالا۔

اسی سال ایک بادشاہی غلام نے جو حاکم سامانہ کا داماد تھا کافی بڑی جمیعت اکٹھی کر لی اور ۹ رجب ۸۰۳ھ میں اجودھن کے نواح میں اس نے خضر خاں سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر قصبہ بھوہر میں جا چھپا۔ غالب خاں اور

لہ پٹیالہ پنجاب کی سکھ ریاستوں میں پٹیالہ سب سے بڑی ریاست تھی۔ سدھو جاٹ قوم کے ایک سرکردہ سردار آلاسنگھ نے جو چوہدری پھول کے بیٹے رام کا لڑکا تھا ۱۱۶۶ھ میں اس ریاست کو قائم کیا تھا۔ ریاست کا قیام عین اس زمانہ میں ہوا جبکہ ہندوستان میں احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ۱۱۸۶ھ میں انگریزوں کے تحت ہو گئی اور ریاست کے راجاؤں نے ۱۱۸۷ھ میں پٹیالہ کی مہم میں ۱۱۸۷ھ میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی میں ۱۱۸۷ھ میں غدر کے ہنگامہ میں ۱۱۸۷ھ میں کوکوں کی گرفتاری میں اپنی فوج سے انگریزوں کی مدد کی۔

پٹیالہ کا کچھ حصہ میدانی اور کچھ پہاڑی ہے۔ بڑا حصہ جو میدانی ہے ستلج کے جنوب میں واقع ہے، کو ہستانی علاقہ شملہ تک چلا گیا ہے۔ شملہ پہلے پٹیالہ کے تحت تھا انگریزوں نے ۱۱۸۳ھ میں بڑولی کے تین موانعات دے کر شملہ لے لیا۔ شاہی زمانہ کے مشہور شہر سٹاک، پنچور کا شالی مار باغ، سر ہند، ٹھنڈہ اور نارول پٹیالہ کے تحت تھے۔

ریاست کا رقبہ ۵ ہزار چار سو بارہ مربع میل، آبادی ۱۵ لاکھ ۸۶ ہزار تھی، آمدنی ۶۶ لاکھ روپیہ سالانہ

اکبری دور میں اس کو پٹالا کہتے تھے اور یہ صوبہ لاہور میں سرکار سندھیا ساگر کا ایک محال تھا جس کی آمدنی ۶۲۴۰۰۰ تھی۔

جانو بہ ذات کے لوگ رہتے تھے۔

۱۱۸۷ھ اجودھن۔ پاک پٹن کا قدیم نام اجودھن تھا۔ بابا فرید کی خانقاہ کی وجہ سے اکبر بادشاہ کے حکم سے اسے پاک پٹن کہنے لگے۔ پہلے پٹن فرید کہتے تھے۔ یہ شہر ستلج سے دس میل پر شمال میں ہے۔ پہلے دریا اس کے نیچے بہتا تھا۔ ملتان سے ہندوستان جانے والے ستلج کو اسی جگہ سے عبور کرتے تھے۔ اب ضلع ساہیوال میں تحصیل کا صدر مقام ہے ہر سال محرم کے مہینے میں بابا فرید الدین شکر گنج کے مزار پر بڑا بھاری میلہ ہوتا ہے، ساٹھ ستر ہزار آدمی جمع ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص ایک درجہ "بہشتی کھڑکی" میں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ قصبہ کی آبادی آٹھ ہزار ہوگی۔ آئین اکبری میں اس کو صرف پٹن لکھا ہے اور تاریخ فرشتہ میں پٹن بابا فرید۔

بابا فرید الدین شکر گنج یہ خواجہ جمال الدین سلیمان کے فرزند تھے۔ خواجہ صاحب کابل سے آکر کوٹ کروڑ میں ٹھہرے۔ وہاں مولانا جہا الدین خجندی عباسی کی دختر سے آپ کا نکاح ہوا۔ آپ نے قصبہ کو کٹوال میں جو اب تحصیل میلسی ضلع ملتان میں چائلی مشائخ کے نام سے مشہور ہے سکونت اختیار کی۔ خواجہ صاحب سلیمان فرخ شاہ کابل کی اولاد میں سے تھے اور نسب میں فاروقی تھے۔

رہا قی حاشیہ صفحہ آئندہ پر



دوسرے امیروں نے متفق ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔

**سلطان محمود دہلی میں** | ۸۰۴ھ میں محمد شاہ کا بیٹا سلطان محمود دہلی سے دہلی آیا۔ اقبال خاں دکھاو کے لیے اس کے استقبال کو آیا اور اُسے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ لے جا کر کوٹک شان نمایں ٹھہرایا، لیکن سلطنت کے سارے اختیارات اسی طرح اپنے ہاتھ میں رکھے۔ یہ بات سلطان محمود کو بڑی آگراں گزری تھی لیکن وہ بالکل ہی مجبور و بے بس تھا۔

اسی سال مبارک شاہ مر گیا۔ سلطان ابراہیم اس کا چھوٹا بھائی جانشین بنا۔ ابراہیم شکر تیار کر کے اقبال خاں اور سلطان محمود کے مقابلہ کے لیے آیا۔ سلطان محمود اقبال خاں سے کبیدہ خاطر تھا ہی وہ لڑائی ہونے سے پہلے شکر کے بہانے اقبال خاں کے شکر سے بھاگ نکلا اور سلطان ابراہیم کے پاس پہنچ گیا لیکن سلطان ابراہیم نے اس سے بڑی بے رخی اور لاپرواہی برتنی۔

اس اثنا میں سلطان محمود نے قنوج سے شاہزادہ فتح خاں ہروی کو جو مبارک شاہ کی طرف سے وہاں حاکم تھا، کال کر قلعہ قنوج پر قبضہ کر لیا۔ وہاں کی تمام رعایا اس کی حامی بن گئی۔

**سلطان ابراہیم جون پور کو اور اقبال خاں دہلی کی طرف بغیر لڑے لوٹ گئے اور سلطان محمود نے صرف قنوج پر ہی**

(بقیہ اجودھن صفحہ گزشتہ) جو ابراہیم فریدی کی تحریر کے مطابق فرخ شاہ کابل حضرت ابراہیم بن ادہم بادشاہ بلخ کی اولاد میں سے تھے ابراہیم بن ادہم (۱۱۱۴ھ) قبیلہ بکر بن وائل سے تھے اور قریشی نہیں تھے شیخ مجدد سرہندی اور دوسرے فاروقی خاندان کے لوگ جن کا تعلق فرخ شاہ کابل سے ہے اپنے نسب میں ابراہیم کو لکھتے ہیں ادہم نہیں لکھتے۔ بابا فرید الدین کو ابن بطوطہ نے غلطی سے بدلاؤنی لکھا ہے آپ کی پیدائش ۵۸۴ھ وفات ۶۷۴ھ میں ہوئی۔ مقام ولادت قصبہ کوٹوال مضافات ملتان ہے۔ خرقہ طریقت خواجہ قطب الدین بجنیا کا کی سے ملا تھا۔ بابا فرید نے ملتان سے قندھار جا کر تحصیل علم کیا، وہاں سے بغداد جا کر علماء کی صحبت میں رہے وہاں سے دہلی اور دہلی سے ہنسی پھر وہاں سے اجودھن آکر مقیم ہوئے۔ سفینۃ الاولیاء میں داراشکوہ نے تاریخ وفات: محرم روز سہ شنبہ ۶۶۲ھ لکھی ہے۔ فرشتہ ۶۶۲ھ لکھتا ہے شاہ جہاں نے ۶۶۲ھ لکھی ہے، حیدر آباد کا مشہور شمس الامرائی خاندان بابا صاحب کی اولاد میں سے ہے۔ ۱۱۱۴ھ دہلی دار۔ ابن بطوطہ نے اسے ظما لکھا ہے وہ لکھتا ہے یہ مالوہ کا سب سے بڑا شہر ہے زراعت بہت ہوتی ہے۔ خصوصاً گیہوں بہت ہوتا ہے۔ یہاں سے پان دہلی تک جاتے ہیں جو چوہ میں منزل ہے۔ سڑک پر ہر جگہ پتھر کے ستون اسگ میل، لگے ہوئے ہیں جن پر فاصلہ طے ہے مسافر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کتنا چلا ہے منزل کتنی دور ہے جس شہر کا فاصلہ چاہے ان ستونوں سے معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ شہر ابراہیم الدیسی کی جگہ ہے۔ آئین اکبری میں تحریر ہے: "دہلی را جہ بھوج کا پائے تخت تھا، انگوڑ و دودھ پھل دیتا ہے، پہلا پھل بہت شیریں ہوتا ہے، پیلے پھل را جاکس کا واما اختلافہ جہن تھا جہ بھوج نے دہلی کو پائے تخت بنایا۔ موجودہ راجہ خود کو بکرماجیت کی اولاد بتاتا ہے۔ ۱۱۱۴ھ میں پوراندہ کا خاندان کمزور ہو گیا اور دکن میں پونا چلا گیا تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں مالوہ کا دارالخلافہ یہی دہلی تھا بعد میں منڈو مقرر ہوا۔ دارانگریزی عہد میں چھوٹی سی ریاست تھی۔ آبادی سترہ ہزار ہو گئی۔ منڈو اور بڑودہ کی سڑک پر ۳۳ میل مغرب میں بڑودہ سے ۱۸۳ میل مشرق میں ہے مسلمانوں کے عہد میں کافی بڑا شہر تھا، اس وقت کی یادگار دو سنگ مندرج کی مسجدیں مرمت طلب حالت میں ہیں۔ گنگوڑ شاہ اس کو سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنے ہمارے زادہ نذر الدین جو تک کے نام پر بسایا تھا۔ سلطان محمود بن محمد بن فیروز شاہ نے اپنے وقت ملک سرود نامی ایک خواجہ سرکو جو اس کے اسلاف کے وقت خان جہاں کے عہدہ پر تھا، سلطان الشرقی کا خطاب دے کر

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

تقاعدت کر لی۔

۸۵۳ھ میں اقبال خاں نے گوالیار پر حملہ کیا۔ مغلوں کی پورش میں یہ قلعہ ہر سنگھ نے مسلمانوں سے چھین لیا تھا۔ اقبال خاں نے قلعہ کو ہر سنگھ کے بیٹے بیرم دیو کو شکست دے کر اپنے قبضہ میں لے لیا۔

۸۵۴ھ میں تاتار خاں ناخلف نے اپنے باپ ظفر خاں کو دھوکے سے قید کر کے اس وقت تک دبا۔ سلطان ناصر الدین محمد شاہ خطاب رکھ کر ایک بڑا لشکر جمع کیا اور دہلی کی طرف نکل پڑا۔ پیش قدمی کی۔ لیکن راستہ میں اس کے چچ شمس خاں نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا اور ظفر خاں کو قید سے رہائی دے دی۔ سارا لشکر اس کے ساتھ ہو گیا۔

۸۵۵ھ میں اقبال خاں نے گوالیار اور اٹارو کا رخ کیا۔ اس نواح کے جتنے بھی راجہ تھے وہ سب اٹارو کے

(بقیہ حاشیہ جون پور ۸۵۶ھ گزشتہ) اس علاقہ پر متعین کیا تھا۔ اس کے بعد مبارک قرقل نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے مقابلہ میں ملو سلطان آیا لیکن لڑائی کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ مبارک شاہ ۸۵۶ھ (م ۱۵۴۷ء) میں فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا بھائی سلطان ابراہیم جانشین بنا، یہ علم دوست بادشاہ تھا، ہندوستان کے مشہور فاضل قاضی شہاب الدین اسی عہد کے بزرگ ہیں۔ یہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ تیمور کے حملہ کے بعد جون پور آئے۔ یہ ابوالفضل کا بیان ہے لیکن آئینہ اودھ کے مصنف نے لکھا ہے ان کے بزرگ غزنی کے تھے اور ان کی نشوونما دولت آباد وکن میں ہوئی تھی، ان کی نوے تصانیف ہیں جیسے بدیع البیان، فتاویٰ ابراہیم شاہی، تفسیر بحر المواج، مناقب السادات، مصباح (نحو)۔ ابراہیم شاہ کے بعد اس کا بڑا لڑکا بھگن خاں محمود شاہ کے لقب سے ۸۵۷ھ (م ۱۵۴۸ء) میں سلطان بن گیا۔ اس کے زمانہ میں سلطان محمود غلی شاہ مالوہ نے کاپسی پر لشکر کشی کی ۸۵۶ھ (م ۱۵۴۷ء) میں سلطان بھول اور سلطان محمود میں لڑائی ہوئی جو چھ سال تک جاری رہی، آخر میں محمود کو کامیابی ہوئی اور وہ دہلی کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن بیماری نے ہمت نہ دی اور ۸۵۸ھ (م ۱۵۴۹ء) میں حکومت کر کے مر گیا۔ لیکن ابوالفضل نے لکھا ہے محمود شاہ کے افعال پسندیدہ نہیں تھے اس لیے وہ معزول کیا گیا اور اس کا بھائی حسین شاہ فرمانروا ہوا۔ ابوالفضل نے سلطان محمود اور محمد شاہ میں فرق نہیں کیا ہے ابوالفضل کی بات محمد شاہ پر صادق آتی ہے جو محمود شاہ کا لڑکا تھا اور اس کے بعد تخت نشین ہوا اور اسے حسین شاہ نے تخت سے علیحدہ کر کے بادشاہت لے لی۔ سلطان بھول نے اسے شکست دی۔ سلطان حسین نے سکندر شاہ کے زمانہ میں فوج جمع کر کے دہلی پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر بنگال بھاگ گیا اور اس پر سلاطین مشرقی کی حکومت ختم ہو گئی۔ ان چھ بادشاہوں نے ستانوے سال چھ ماہ حکومت کی۔

جونپور فیض آباد سے ۸۴ میل پر ہے، دریا گے گومتی شہر کے درمیان سے گزرتا ہے دریا کے کنارے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مندروں کے آثار ہیں اس کی آبادی ۵۰ ہزار ہوگی۔ گومتی پر جو پل ہے اسے ۱۵۶۱ھ میں نواب منٹم خاں خاٹاں نے ۳۰ لاکھ کے صرفے سے بنوایا تھا مادہ تاریخ "الصراط المستقیم" ہے۔ بڑی مسجد "مسجد جامع الشرق" ہے یہی نام مادہ تاریخ بھی ہے جس سے ۱۵۶۲ھ تکلت ہے۔ مسجد کے دائیں جانب سلاطین مشرقی کا قبرستان عبرت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ ایک اور عظیم الشان مسجد "مسجد النامہ" ہے یہ وسیع اور بڑی پر عظمت مسجد ہے۔ اس میں علوم دینی کا ایک بہت بڑا مدرسہ ہے۔ ایک اور شاندار مسجد لعل دہانہ ہے جس کا اصل نام "مسجد النامہ" تھا۔ جونپور کا خوشبودار ذیل اور قبا کو مشہور ہے۔

جونپور سے تین میل پر ایک موضع مظفر آباد ہے یہ بھی کسی وقت بڑا شہر تھا اور کاغذ سازی کے لیے مشہور تھا۔

قلعہ میں اکٹھے ہو گئے۔ چار ماہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار ان راجاؤں نے چار ہاتھی اور کچھ پیش کش دے کر صلح کر لی۔ اقبال خاں نے اٹا وہ سے لوٹ کر قنوج کے قلعہ پر سلطان محمود سے مقابلہ کے لیے حملہ کیا لیکن قلعہ کی مضبوطی سے لاچار ہو کر دہلی واپس ہو گیا۔

**اقبال خاں کا انجام** | محرم ۷۸۷ھ میں اقبال خاں سامانہ اور پھر وہاں سے روپڑ کی طرف گیا۔ اور بہرام خاں ترک بچہ کو جو سارنگ خاں کا مخالف ہو گیا تھا دھوکے سے گرفتار کر کے اس کی کھال کھنچوا دی۔

اور وہاں سے خضر خاں کے مقابلہ کے لیے ملتان کا رخ کیا۔ تلوندی سے وہاں کے زمینداروں رائے کمال الدین وغیرہ کو اپنے ہمراہ لے کر آگے بڑھا۔ اسی سال ۱۹ جمادی الاول کو ضلع اجودھن میں خضر خاں سے مقابلہ ہوا۔ اقبال خاں کا اقبال رو بہ زوال ہو گیا تھا۔ اس لیے پہلے ہی حملہ میں اُسے شکست ہوئی۔ اس کا گھوڑا زخمی ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ معرکہ گاہ سے جان بچا کر نکل نہ سکا۔ خضر خاں کے لشکریوں نے اس کا تعاقب کر کے پکڑ لیا اور اس کا سر کاٹ کر فتح پور ضلع ملتان میں بھیج دیا۔

**سلطان محمود کی دوبارہ تخت نشینی** | ۷۸۸ھ ماہ جمادی الآخر میں امرائے دہلی کے بلانے پر سلطان محمود قنوج سے دہلی آکر دوبارہ تخت نشین ہوا۔ سب امیروں کو مناسب تقسیم کیے مبارک خاں کے خاندان کو کول کی طرف روانہ کر دیا۔

۷۸۹ھ میں سلطان محمود قنوج کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ لیکن سلطان ابراہیم نے گنگا عبور کر کے راستہ روک دیا اور مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی لیکن دونوں فریق بغیر لڑے اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔ ابراہیم نے دوبارہ فوج کشی کر کے قنوج کا محاصرہ کر لیا۔ قنوج میں سلطان محمود کی طرف سے ملک محمود ترمینی ناظم تھا۔ اس نے چار مہینے تک حملہ آوروں کی مدافعت کی۔ لیکن جب کسی طرف سے بھی مدد نہ ملی تو مجبوراً امان لے کر قنوج ابراہیم کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم نے برسات قنوج میں گزاری۔ پھر اختیار خاں کو قنوج میں چھوڑ کر دہلی کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔

**دہلی پر سلطان ابراہیم کا حملہ** | ۷۹۰ھ میں سلطان محمود کے کچھ آدمی باغی ہو کر ابراہیم سے آکر مل گئے۔ ان باغیوں میں نصرت خاں گرگ انداز تاتار خاں ولد سارنگ خاں اقبال خاں کا غلام ملک مرجا وغیرہ شامل تھے۔ البتہ اسد خاں لودی سنبھل میں قلعہ بند ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی دن سلطان ابراہیم نے قلعہ سنبھل کو فتح کر لیا اور اسے تاتار خاں کے سپرد کر دیا اور گنگا عبور کر کے دہلی کی طرف یلغار کی۔ جب جٹنا کے کنارے پہنچا تو اسے خبر ملی کہ ظفر خاں نے دہلی کو تسخیر کر کے جوئی پور کی طرف فوج کشی کر دی ہے۔ یہ سن کر سلطان ابراہیم نے دہلی کا خیال چھوڑ دیا اور برن میں ملک مرجا کو متعین کر کے بڑی تیزی سے جوئی پور پہنچا۔ سلطان محمود نے اس کا پیچھا کر کے ملک مرجا کو قتل کر دیا۔ سنبھل کا قلعہ بھی بغیر لڑے اس کے ہاتھ آ گیا۔ اسے سلطان نے اسد خاں لودی کے حوالے کر دیا۔ تاتار خاں قنوج بھاگ کر چلا گیا۔ اس اقدام کے بعد سلطان محمود دہلی لوٹ آیا۔

**دہلی پر خضر خاں کا حملہ** | اسی سال خضر خاں نے بڑی تیاریوں کے ساتھ پیش قدمی کی۔ اور دولت خاں کو سامانہ سے

بے دخل کر دیا۔ وہاں کے سارے امیر خضر خاں کے ساتھ ہو گئے۔ بتدریج دہلی کے قریب تک کا سارا علاقہ خضر خاں کے ہاتھ آ گیا۔ صرف رتھک اور دو آبہ کا درمیانی ملک سلطان محمود کے پاس رہ گیا۔

۱۱۸۱ھ میں سلطان محمود نے حصار فیروز کا رخ کیا۔ وہاں خضر خاں کی طرف سے قوام خاں ناظم تھا۔ اسے بھگا کر سلطان محمود نے حصار فیروز پر قبضہ کر لیا اور علاقہ رتھک تک فوج کشی کر کے دہلی لوٹ آیا۔ خضر خاں نے بھی فتح آباد سے ایک بڑی جمیعت کے ساتھ رتھک کے راستے پیش قدمی کی۔ دہلی پر حملہ کر کے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت دہلی میں بڑا سخت فحط تھا اس لیے وہاں ٹھہرنہ سکا۔ اور دو آبہ کے علاقہ پر قبضہ کر کے فتح پور کو لوٹ گیا۔

۱۱۸۲ھ میں بیرم خاں ترک بچہ نے خضر خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ واضح رہے بیرم خاں نے بہرام خاں ترک بچہ کے بعد سامانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور دولت خاں سے شکست کھا کر خضر خاں کے پاس آ گیا تھا۔ پھر خضر خاں سے بغاوت کر کے دوبارہ دولت خاں سے جا کر مل گیا تھا۔ خضر خاں نے اسے سابقہ جاگیر عطا کر دی۔

۱۱۸۳ھ میں خضر خاں نے رتھک کا محاصرہ کر لیا اور چھ ماہ کی جدوجہد کے بعد اسے فتح کر کے فتح پور واپس چلا گیا۔ اسی سال سلطان محمود بھی کیتھر کی طرف گیا اور وہاں سے لوٹ کر دہلی آ گیا۔

۱۱۸۴ھ میں خضر خاں نے نارنول اور میوات پر حملہ کر کے بڑی لوٹ مار کی اور خضر خاں کا دہلی پر دوسرا حملہ دہلی پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود سیری کے قلعہ میں اور اختیار خاں فیروز آباد میں محصور ہو گئے۔ کئی دن تک لڑائی جاری رہی۔ آخر غلہ کی گرانی کی وجہ سے خضر خاں پانی پت کے راستہ فتح پور چلا گیا۔

۱۱۸۵ھ میں سلطان محمود کا انتقال ہو گیا۔ اور فیروز شاہ کے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی۔ سلطان محمود نے اس سارے انتشار اور طوائف الملوکی کے باوجود بیس سال دو ماہ حکومت کی۔

سلطان محمود کے عہد کا سب سے بڑا شاعر قاضی ظہیر دہلوی گزرا ہے۔ اس کا ایک دیوان **عہد محمودی کے شاعر** مدحیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دارث سلطنت قاہرہ سلطان محمود  
کہ جہاں خدمت جد و پدرش بگزیدہ

لے حصار فیروز۔ سلطان فیروز شاہ نے آباد کیا تھا۔ اور دریائے جمناسے ایک ترنگال کرشمہ میں پانی پہنچایا تھا۔ کہتے ہیں ایک عارف نے فیروز شاہ کو فرماں روائی کا مرثیہ سنایا۔ اور ان کی ہدایت پر ہی یہ نہرتیار کی گئی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نہر قصبہ سرسہ کے قریب ایک تالاب میں گر کر ناپید ہو جاتی ہے۔ اس تالاب کو بیدر کہتے ہیں۔ اس کے متعلق بڑی داستانیں مشہور ہیں۔ اس ضلع میں دریا کم ہیں اور کنوؤں میں بھی پانی بہت گہرائی پر ملتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں حصار فیروز صوبہ دہلی کی سرکار تھی جس میں ۲۷ محلات تھے۔



ایک دوسرا قصیدہ ہے ۔

قہر مانے کہ برو سجدہ بسویش افلاک  
بادشاہ ہے کہ کند فخر بدورش ایام

ایک اور قصیدے کا شعر ہے ۔

یار بیروں رفت بیروں رو تو اے جان نیزاں کہ  
گر بروں با یار تائی باشد از یاری بروں

ایک اور شعر ہے ۔

خسرو اگر زر کا پ تو بماندم محروم  
نیستم قارغ یک ساعتے از مدح و ثنا

ایک اور قصیدہ ہے ۔

بوئے گل جنبید سوئے گلستاں خیراے ندیم  
بادۂ کہنہ طلب یاد آراں یار قدیم

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں قاضی ظہیر کے بعد ایسا بڑا شاعر کوئی اور نہیں گزرا ۔

**دولت خاں اور خضر خاں کے مقابلے** | سلطان محمود کے انتقال کے بعد مبارز خاں والی رہتک ملک ادریس اور دوسرے امرار نے خضر خاں کے مقابلہ میں دولت خاں سے موافقت کر لی۔ خضر خاں اس سال فتح پورہ ہی میں بیٹھا رہا۔

سالانہ میں دولت خاں شکار کے لیے کیتھر گیا۔ اور وہاں کے تمام راجاؤں کو گرفتار کر کے بیتیالی کا رخ کیا۔ اس جگہ بدایوں کا حاکم مہابت خاں اس سے آکر مل گیا۔

اسی سال سلطان ابراہیم نے کاپلی میں قادر خاں ولد محمود خاں کو گھیر لیا۔ دولت خاں کے پاس لشکر زیادہ نہ تھا۔ اس لیے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور دونوں میں سے کسی کو مدد نہ دی۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں خضر خاں فیروز آباد آیا۔ وہاں کے تمام امیر اس سے آکر مل گئے۔ ملک ادریس رہتک میں قلعہ بند ہو گیا۔ خضر خاں وہاں سے میوات چلا گیا اور بہادر ناہر کے بھتیجے جلال خاں میواتی کو ہمراہ لے کر سنبھل پر حملہ کیا اور اسے خوب لوٹا۔

لے کاپلی۔ یہ قصبہ جتنا کہ کنارے بہت سے بزرگان دین کی خواب گاہ ہے۔ یہاں کی مصری مشہور ہے۔ سلطان شرقیہ کے زمانہ میں یہ شہر دہلی کا باج گزار تھا۔ قادر خاں والی کاپلی نے بغاوت کی اور خود مختار بن گیا۔ سلطان ہوشنگ حاکم مالوہ نے فوج کشی کر کے اس کو شکست دی۔ لیکن فتح کے بعد شہر اسی کے سپرد کر دیا۔ سلطان محمود شرقی نے نصیر خاں ولد قادر خاں کو شکست دے کر کاپلی پر قبضہ کر لیا۔ اگر بے زمانہ میں یہ صوبہ آگرہ کی سرکارت تھی جس میں ۱۵ محال تھے۔

دہلی پر خضر خاں کا تیسرا حملہ | سلسلہ ذی الحج کے مہینے میں خضر خاں نے دہلی پر یورش کی اور شہر سے باہر پڑاؤ ڈال دیا۔ دولت خاں قلعہ بند ہو گیا۔ لیکن خضر خاں کے طرفداروں ملک لونا وغیرہ کی بے رخی کی وجہ سے مقابلہ سے عاجز آ گیا اور بڑی عاجزی سے امن طلب کر کے خضر خاں کے پاس حاضر ہو گیا۔ خضر خاں نے اسے قید کر کے قوام خاں کے سپرد کر دیا۔ قوام خاں نے اسے حصار فیروز آباد لے جا کر قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ ۷۰۰ھ اول ستمبر کو پیش آیا۔

## سلطان خضر خاں بن ملک اشرف

خضر خاں نے پائے تخت ہند دہلی کو فتح کرنے کے بعد سلسلہ ۷۰۰ھ میں تخت شاہی پر جلوس کیا۔ فیروز شاہ کے زمانہ میں خضر خاں کے دادا ملک سلیمان کو ملک نصیر الملک مروان نے منہ بولا بیٹا بنایا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت مخدوم جہانیاں شیخ جلال الدین بخاری کسی کام سے ملک مروان کے گھر آئے۔ کھانے کے وقت ملک سلیمان حضرت کا ہاتھ دھلانے کے لیے آفتابہ اور طشت لے کر سامنے آیا۔ حضرت مخدوم نے اسے دیکھ کر فرمایا: "اس سید زادے سے ایسی خدمتیں لینا مناسب نہیں" اس دن سب کو علم ہوا کہ ملک سلیمان مخدوم سید ہے۔ ویسے بھی اس کے طور طریقے سیدوں جیسے ہی تھے۔

ملک مروان جس کا ذکر کیا گیا، فیروز شاہ کے زمانہ میں ملتان کا حاکم تھا۔ اس کے مرنے پر ملتان اس کے بیٹے ملک شیخ کو مل گیا۔ کچھ دن بعد جب اس نے بھی وفات پائی تو ملتان کا علاقہ ملک سلیمان کے سپرد ہو گیا۔ کچھ دن بعد جب ملک سلیمان نے انتقال کیا تو ملتان کا صوبہ اور اس کے ماتحت تمام علاقے فیروز شاہ نے اس کے پوتے خضر خاں کو تفویض کر دیئے۔

ملتان کی عملداری سے بتدریج ترقی کر کے خضر خاں بادشاہی کے بلند درجہ تک پہنچ گیا۔ لیکن اس نے بادشاہی خطاب اختیار نہ کیا صرف "رایات اعلیٰ" اپنا لقب مقرر کر کے انتظام سلطنت سنبھال لیا۔

لے مخدوم جہانیاں - اوچے کے سید جلال الدین سرخ بخاری کے پوتے تھے، سید صدر الدین راجو قتال انکے حقیقی بھائی تھے۔ دو سال تک مدینہ منورہ میں رہ کر شیخ عقیف الدین سے خرقہ طریقت حاصل کیا۔ مکہ میں شیخ امام عبداللہ یافعی سے بھی ارادت تھی۔ وہاں سے دہلی آ کر نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کی خدمت میں رہے اور سلسلہ چشتیہ کا خرقہ حاصل کیا۔ مشہور ہے جہاں چاہتے تھے، پلک جھپکنے میں پہنچ جاتے تھے۔ اس لیے جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے مشہور ہوئے۔ صاحب اخبار الاخیار نے سال وفات ۷۸۸ھ عمر ۸۰ سال لکھی ہے۔ آپ کی ولادت ۴۰ شعبان شب برات میں ہوئی تھی، اوچ مضافات ملتان میں مزار ہے۔ وفات ۱۰ ماہ ذی الحج عید الاضحیٰ کے دن ہوئی تھی۔ ایک مبارک رات میں پیدا ہوئے اور ایک مبارک دن میں وصال فرمایا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے: "میں نے اوچ میں سید جلال الدین حیدری علوی کی زیارت کی، انہوں نے مجھے اپنا خرقہ عطا کیا اس نام سے ابن بطوطہ کی مراد جہانیاں جہاں گشت سے ہی ہوگی۔ نصیر الدین برنی کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے فیروز شاہ اور جام بانہیہ حاکم سندھ کی صلح بھی سید جلال نے سلسلہ ۷۰۰ھ میں کرائی تھی۔ ان کے مزار پر یہ تاریخی شعر درج ہے: "تاریک گشت جملہ جہاں ہے جلال شاہ، تاریخ بود ہفت صد و ہشتاد و چھ"۔ مگر اصل میں تاریخ ولادت ہے: "ہفت صد ہفت سال ہجری بود، کال مہ برج دیں طلوع نمود"۔ ابن بطوطہ سلسلہ ۷۰۰ھ میں اوچ پہنچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔

## تاج الملک کی فوج کشی

سالہ ۷۸۵ء میں غضر خاں نے سلطان محمود کے قصر میں قیام کیا۔ اور خاص و عام ہر ایک کو انعامات دیئے۔ اپنے مقربوں کو مناصب و خطابات تقسیم کیے۔ جلوس کے پہلے سال ملک بنجو کو تاج الملک کا خطاب دے کر پورب کی طرف روانہ کیا۔ تاج الملک جب دریائے گنگا عبور کر کے کیتھر پہنچا تو وہاں کے سرکش رائے سنگھ وغیرہ آنولہ کے جنگل میں روپوش ہو گئے۔ تاج الملک نے کیتھر کولٹ کر پامال کر دیا۔ مہابت خاں حاکم بدایوں بھی ملاقات کے لیے اس کے پاس حاضر ہو گیا۔ رائے ہر سنگھ بھی آخر کار حاضر خدمت ہوا اور سالانہ خراج میں ایک بھاری رقم دینی منظور کی۔

کیتھر سے تاج الملک اور مہابت خاں نے ایک ندی کے کنارے کوچ کیا اور دونوں سرگرد واری پہنچے۔ وہاں گنگا عبور کر کے کھور کہ دیہ مقام اب شمس آباد کہلاتا ہے، کپیلہ اور بتیالی پر فوج کشی کی اور وہاں کے باغیوں کی اچھی طرح سرکوبی کر کے قصبہ سکینہ اور یادہم سے گزر کر راپری پہنچے۔ راپری پر حسن خاں اور اس کے بھائی ملک حمزہ کی حکومت تھی۔ یہ دونوں بھائی اور رائے سر حاکم چند وار گویا ر کے سرداروں کے ساتھ حاضر ہو گئے اور سالانہ خراج دینے کا اقرار کیا۔ تاج الملک نے وہاں سے قصبہ جلسیر کا رخ کیا اور اسے چند وار کے ہندوؤں کے قبضہ سے نکال کر اس جگہ ایک مسلمان گماشتہ کو مقرر کیا۔ یہاں سے فوج کشی کر کے آب سیاہ کے علاقہ کو فتح کر لیا اور اٹاواہ کے کافروں کا تلح قمع کر کے دہلی لوٹ آیا۔

## شہزادہ مبارک

سالہ ۷۸۵ء میں غضر خاں نے اپنے چھوٹے لڑکے مبارک کو جس کے بشرہ سے ہی بادشاہی آثار ظاہر تھے، فیروز پور، سہرنہ اور بیرم خاں ترک بچہ کا مقبوضہ سارا علاقہ تفویض کر دیا۔ اور ان اضلاع کے نظم و نسق پر اسے کامل اختیارات دے دیئے۔ اس شہزادہ کا نائب ملک سدھونا درہ کو مقرر کیا گیا۔ شہزادہ نے اسی سال سدھونا درہ، زیرک خاں امیر سامانہ اور دوسرے امرار کے ساتھ مغوضہ ضلع کا دورہ کیا اور وہاں کا قرار واقعی بندوبست کر کے دہلی لوٹ آیا۔

لے کینیل۔ سرکار قنوج میں ایک محال تھا (آئین اکبری) ابن بطوطہ نے سرگردوارہ کو اسی کے نواح میں بتایا ہے۔ کہتے ہیں پاٹڈوں کی رانی درپدیا یہاں کے راجہ کی بیٹی تھی۔ وہاں ایک ٹیکہ کو اب تک راجہ درپدیا کا قلعہ بتایا جاتا ہے۔ غیاث الدین بلبن کے وقت یہاں ڈاکوؤں کی پناہ گاہ تھی۔ اس نے ان کا تلح قمع کر کے ایک قلعہ تیار کرایا، جہاں شاہی فوج رہتی تھی۔ مغلوں کے زمانہ میں اس شہر کا نام بہت کم ملتا ہے۔ (دہنٹر) ایک اور مقام کپیلہ یا کپلی ریاست بیجا نگر کے پاس بلاری احاطہ مدراس کے ضلع میں بھی ہے۔ مورخ اس کپیلہ اور قنوج والے کینیل میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ابن بطوطہ نے دکن کے اس مقام کو کپیلہ لکھا ہے وہ لکھتا ہے:۔

”رائے کپیلہ کا ملک دشوار گزار پہاڑوں میں ہے۔“ اس نے یہ ذکر سلطان تغلق کے بھانجے ہاؤ الدین گشتاسب کی بغاوت کے بیان میں کیا ہے۔ یہ بغاوت دکن میں محمد شاہ تغلق کے عہد میں ہوئی تھی۔

۱۸۱ء میں خضر خاں نے ملک تاج الملک کو ایک برہا لشکر دے کر گویا اور بیانہ کی طرف گویا اور بیانہ پر حملہ | رخصت کیا۔ شمس خاں اور حدی کا بجائی ملک کریم الملک بھی اس کے ساتھ ہو گیا۔ تاج الملک اس پورے علاقہ کو کافروں سے پاک کر کے دہلی لوٹ آیا۔

۱۸۲ء میں خضر خاں نے ملک سادھو نادرہ کو جو شہزادہ کی طرف سے سہرند میں ناظم ترکوں کی سرکشی | اسی سال بیرم خاں کے ترکوں نے ملک سادھو نادرہ کو جو شہزادہ کی طرف سے سہرند میں ناظم تھا، دھوکے سے پکڑ کر قتل کر دیا اور سہرند پر قبضہ کر لیا۔ خضر خاں کے حکم سے زیرک خاں اُس طرف گیا اور وہاں کا انتظام کر کے واپس ہوا۔

۱۸۳ء میں خضر خاں نے ناگور کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جب خضر خاں کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔

۱۸۴ء میں خضر خاں نے جہاں پہنچ کر وہاں کے حاکم ایسا خاں کو مطیع کیا، پھر وہاں سے گویا اور بیانہ پر حملہ | گویا اور بیانہ پر حملہ کیا۔ لیکن خراج اور پیش کش میں کافی مال و دولت وصول ہو گئی۔ گویا اور بیانہ نے بادشاہ نے بیانہ کا رخ کیا۔ شمس خاں اور حدی حاکم بیانہ نے اطاعت قبول کر لی۔

۱۸۵ء میں طوغان روحی ترک سردار نے جس کے آدمیوں نے ملک سادھو کو قتل کیا تھا دوبارہ سرکشی کی۔ زیرک خاں نے دوبارہ جا کر ان کو منتشر کر دیا۔

۱۸۶ء میں خضر خاں کیسٹھ میں آیا۔ ہر سنگھ دیو اسی آنولہ کے جنگل میں جو چوہیں کوس کے شاہی لشکر کے اقدامات | رقبہ میں پھیلا ہوا تھا روپوش ہو گیا۔ وہاں سے کچھ دن تک مقابلہ کرتا رہا آخر شکست کھا کر کناؤں کی طرف بھاگ گیا۔ تاج الملک نے رہب ندی اتر کر پہاڑوں تک اس کا تعاقب کیا اور وہاں سے بدایوں آیا۔ حاکم بدایوں مہابت خاں کو ساتھ لے کر گنگا کو بجلانہ کے گھاٹ سے عبور کیا۔ وہاں سے مہابت خاں کو رخصت کر کے اٹاؤہ تک فوج کشی کی اور کافی مال غنیمت لے کر دہلی واپس آیا۔

۱۸۷ء میں خضر خاں نے دوبارہ کیسٹھ پر حملہ کیا اور کول کے راستے سے بٹالی پہنچ گیا۔ وہاں سے گنگا پار کر کے بدایوں کا عزم کیا۔ اس بار مہابت خاں خوف زدہ ہو کر قلعہ بند ہو گیا اور برابر چھ ماہ تک بادشاہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ خضر خاں قلعہ کو فتح کر لیا لیکن اسی دوران میں اسے اطلاع ملی کہ محمود شاہ کے قدیم امیر قوام خاں اور اختیار خاں جو دولت خاں کو چھوڑ کر خضر خاں سے آکر مل گئے تھے بغاوت کی سازش کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے سننے ہی وہ بدایوں کو چھوڑ کر دہلی واپس چلا گیا اور ۱۸۷۸ء میں گنگا کے کنارے ان باغی امیروں کو بھڑک کر سب کو قتل کر دیا۔

۱۸۸ء میں ایک غیر معروف شخص نے سارنگ خاں ہونے کا دعویٰ کیا۔ حالانکہ سارنگ خاں ایک نقلی سارنگ خاں | مدت پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ اس شخص نے بہت سے لوگوں کو جمع کر لیا۔ جب اس کا فتنہ بہت بڑھا تو خضر خاں نے سلطان شہ لودی کو اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ سہرند کے علاقہ میں بہت سخت لڑائی ہوئی۔ آخر فتنہ ختم ہو گیا۔



سارنگ خاں شکست کھا کر پہاڑوں میں بھاگ گیا۔

**تاج الملک کا انتقال** | اسی سال خضر خاں نے تاج الملک کو دوبارہ اٹاوہ کی طرف روانہ کیا۔ وہاں کا زمیندار رے سیر قلعہ بند ہو گیا۔ اس نے امان طلب کی اور اپنے ذمے کار وہیہ ادا کرنے کا عہد کیا۔

تاج الملک وہاں سے چند وار گیا اور خوب لوٹ مار کر کے کیسٹر آیا اور وہاں سے دہلی لوٹ گیا۔ اسی سال تاج الملک کا انتقال ہوا اور اس کا بڑا بیٹا ملک سکندر وزیر مقرر ہوا۔

طوغان ترک نے سہرند میں پھر خروج کیا۔ اس بار خیر الدین نے حملہ کر کے اس فتنہ کو ختم کیا۔

**میوات اور گوالیار پر حملہ** | ۸۲۷ھ میں خضر خاں نے میوات کی طرف توجہ کی اور کوئٹہ کے قلعہ کو فتح کر کے وہاں سے گوالیار پر فوج کشی کی اور گوالیار کے راجہ سے بہت سامان اور قیمتی پیش کش بیکر اٹاوہ چلا گیا۔ اور وہاں رائے سیر کو قتل کر دیا۔ اس کے بیٹے نے اطاعت قبول کر لی۔

**خضر خاں کی وفات** | خضر خاں اٹاوہ ہی سے بیمار ہو کر دہلی آیا، دہلی پہنچنے کے بعد، اجماد سی الثانی ۸۲۷ھ میں انتقال کیا۔ اس کی مدت سلطنت سات سال چند ماہ رہی ہے

جہاں اسے برادر نماںد بہ کس

دل اندر جہاں آفریں بندوبس

## سلطان مبارک شاہ بن خضر خاں

سلطان خضر خاں کے بعد اس کا بیٹا مبارک شاہ تمام امراء کے اتفاق سے ۸۲۷ھ میں تخت نشین ہوا۔

**جسرت کھوکھر کی بغاوت** | اسی سال شیخا کھوکھر کے بیٹے جسرت کھوکھر نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا محرک یہ تھا کہ سلطان علی کشمیر کے بادشاہ نے شہ کی تسخیر کے ارادہ سے فوج کشی کی تھی جسرت

لے کشمیر۔ ابو الفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے: "ایک بے حد دلفریب خطہ ملک ہے۔ خوشگوار چشمنے خوش آئند آبشاریں، پورا خطہ سدا بہار باغ ہے۔ ہر باریک میں ایران و توران، بارش میں ہندوستان کے مماثل ہے۔ یہاں کی ہمار اور خزاں دونوں موسم دلفریب ہیں۔ تمام مکانات کھڑی کے ہیں۔ مکان کی چھتوں پر گل لالہ لوتے ہیں۔ یہاں کے نشینے اور شمال دور دور تک جاتے ہیں۔ کشمیر کی بدترین شے یہاں کے انسان ہیں۔ باوجود اس کے کہ ملک بے حد آباد ہے۔ سرمایہ زندگی قلیل ہے۔ خریدہ، سیب، شفتالو، زرد آلو بے حد عمدہ ہیں۔ انگور ہر موسم میں لیکن انکی قسم اعلیٰ نہیں۔ توت کے پتوں پر ریشم کے کپڑے پائے جاتے ہیں۔ خوراک چاول، شراب، مچھلی اور ترکاریاں ہے۔ لباس پوستین کا ہوتا ہے۔ مرغابی، بارہ سنگا، بک، چیتوں کا شکار ہوتا ہے۔ برہمن بکثرت ہیں، تالابوں میں کشتی رانی ہوتی ہے۔ کشمیری لوز جو ایک درخت کی چھال ہے، لکھنے کے کاغذ کا کام دیتی ہے۔ اسکے ورقوں پر گہری سیاہی سے لکھا جاتا ہے۔ ہندو پورے کشمیر کو عبادت گاہ خیال کرتے ہیں۔ سری نگر کشمیر کا پایہ تخت ہے جو چار کوس لمبا ہے۔ یہاں کے دریا بہت مار اور بچھڑے ہیں۔ مہادیوی کی موتیں جگہ جگہ ہوتی ہیں۔ بہت سی عبادت گاہوں کے کھنڈرات بھی پائے جاتے ہیں۔ دو تین مقامات پر ریت سے سونا بھی نکلتا ہے۔

ابو الفضل نے کشمیر کے قدیم ۱۵۹۹ء راجاؤں کے نام لکھے ہیں جو نو خاندانوں پر مشتمل ہیں، انکی حکومت ۲۰۲۸ سال چھ ماہ آٹھ دن رہی۔ ان خاندانوں کا سلسلہ اوگند خانان سے شروع ہوتا ہے۔ اسکے بعد توہ اسکے بعد راجا گند اسکے بعد پرتاپاوت پھر میگہ دامن اسکے بعد در بھدر دھون (بقیہ حاشیہ بر صفر آئندہ)

نے پہاڑ کی گھاٹی میں دھوکے سے اسے شکست دے کر سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ اس کامیابی کا اسے ایسا گھمنڈ ہوا کہ سلطنت دہلی کے خواب دیکھنے لگا۔ اور ایک بڑی جمعیت اکٹھی کر کے بیاس اور ستلج عبور کر کے تلونڈی کے کنارے آیا۔ وہاں رائے فیروز اس کا مقابلہ کرنے سکا بھاگ گیا۔ اب جسرت کے لیے میدان کھلا ہوا تھا وہ کدراہند تک بروہ آیا۔ اور ستلج لے کے ساحلی علاقوں کو زور پرتک لوٹ کر تباہ کر دیا۔ پھر آگے بروہ کر جائنڈھر پہنچا۔ زیرک خاں جائنڈھر میں قلعہ بند ہو گیا۔ جسرت

(بقیہ حاشیہ سلسلہ کشمیر منظر گزشتہ) اسکے بعد اوت دریا پھر جسرت دیو بعد انراں سنگرام ولد ادیراج۔ ہندو عہد کے بعد اکبر کے عہد تک ۲۲ مسلمان بادشاہوں نے دوسویاسی سال پانچ ماہ اور ایک دن حکومت کی۔ جن کا سلسلہ سلطان شمس الدین (یہ شخص راجہ کشمیر سیندھو کا ملازم تھا) سے شروع ہو کر یعقوب خاں پر ختم ہوتا ہے۔ کشمیر کے کل ہندو مسلمان فرماں روا ۱۹۱ گزرے جن کی مدت حکومت چار ہزار ایک سو نو برس گیارہ مہینے نو دن رہی۔ کشمیر کے بادشاہوں کی قدیم تاریخ کا نام راج ترنگی ہے یہ ہندی زبان میں ہے۔ اکبر نے کشمیر فتح کیا تو یہ کتاب اس کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تھی۔ بادشاہ نے سنسکرت کے علماء کو اس کے ترجمہ پر مقرر کیا تھا اور بہت جلد فارسی میں ترجمہ ہو گئی۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ راجہ اشوک جو راجہ جک کا چچا زاد بھائی تھا حکمران ہوا اور اس نے برہمن مذہب کو منسوخ کر کے جین مت کو رواج دیا۔ راجہ سنہید دیو کے عہد میں ایک شخص شاہ میر نامی نے ترقی کی اور راجہ کا وزیر بن گیا اور اس نے راجہ اوت دیو کے مرنے پر راجہ کی زوجہ سے نکاح کر لیا اور ۳۳۲ھ میں سلطان شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے بیٹے سکندر کے وقت صاحبقران امیر تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ بدلاؤنی نے جس سلطان علی کا ذکر کیا ہے جسے جسرت کھوکھر نے شکست دی اسی سلطان سکندر کا فرزند معلوم ہوتا ہے۔ اس نے چھ سال نو ماہ حکومت کی۔ راج ترنگی سے پتہ چلتا ہے کہ علی شاہ نے زین العابدین کو جانشین بنا کر سفر حجاز پر جانا چاہا تھا۔ لیکن یہ ارادہ ترک کر کے اس نے دوبارہ تخت پر قبضہ کر لیا۔ زین العابدین نے بغاوت کی جسرت کھوکھر سے مدد لی۔ علی شاہ کو شکست ہوئی اور زین العابدین بادشاہ ہو گیا۔ زین العابدین نے بہت اور سندھ کو فتح کیا۔ یہ بڑا علم دوست خدا ترس بادشاہ تھا۔ اس نے ہشمار عربی فارسی کشمیری اور ہندی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ سلطان بلوں لودھی سلطان محمود گجراتی کا ہم عصر اور ان کا دوست تھا۔ سلطان حسین بعد کے ایک فرمانروا نے پنجاب پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ سلطان کشمیر جب تیسری مرتبہ تخت نشین ہوا تو ماہر نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ محمد شاہ نے جب چوتھی مرتبہ تخت کشمیر پر جلوس کیا تو ہمایوں ہندوستان میں بادشاہ تھا۔ مرزا کامران نے بھی کشمیر پر حملہ کیا تھا لیکن ناکام رہا۔ ۱۵۳۷ھ میں سلطان سعید جان کاشغری نے کشمیر پر حملہ کیا اور صلح کر کے واپس ہوئے۔ ۱۵۳۷ھ میں مرزا حیدر نے ہمایوں کے حکم سے کشمیر پر حملہ کیا اور تبت کلاں کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اکبر کے عہد میں کشمیر سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ بن گیا۔

کشمیر کی آبادی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ رہی ہے۔ انگریزی دور میں ریاست کشمیر کے سربراہ ڈوگرہ خاندان کے راجا تھے۔ مسلمان اکثریت میں ہیں۔ لیکن کشمیر کے ایک حصہ پر بھارت کی موجودہ ہندو حکومت نے زبردستی قبضہ کر رکھا ہے۔ ایک حصہ پاکستان میں شامل ہے۔ مقبوضہ کشمیر کا دار الخلافہ سری نگر راجہ پور سین کا بسایا ہوا ہے۔ یہ راجہ چھٹے حکمران خاندان کا پانچواں راجہ تھا۔ بکر ماجیت کے مرنے کے بعد کشمیر کا راجہ ماتر گیت بنارس جا کر گوشہ نشین ہو گیا تو پور سین کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانہ میں سری نگر میں چھ لاکھ گھرانے تھے۔ لے ستلج۔ اسے قدیم زمانہ میں شتہ کہتے تھے۔ اس کا منبع کابلور نامی پہاڑ میں ہے۔ روپر، ماجیواڑہ اور لدھیانہ کے شہر اس کے کنارے آباد ہیں۔ یہ دریا جوبہ سے ہوتا ہوا دریائے بیاس سے جا کر مل گیا ہے۔

جائنڈھر۔ لدھیانہ سے ۳۶ میل پر ہے۔ شہر کی عمارتیں نچتے ہیں۔ چند پرانی مسجدیں اور مقبرے بھی ہیں۔ امام ناصر کی ایک مشہور خانقاہ وسط شہر میں ہے۔ یہ آنکھوں مدی کے صاحب کمال بزرگ تھے۔ راجپوت اور پٹان آباد ہیں۔ لکڑی کا کام بہت اچھا ہوتا ہے۔ گودسارے پنجاب میں جہاں عمدہ ہوتا ہے۔

تھے سرستی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پہلے تو صلح کرنی پھر دھوکے سے زیرک خاں کو قید کر لیا۔

جب جسرت کی ان جہازوں کی مسلسل خبریں مبارک شاہ کو ملیں تو وہ خود جسرت کے مقابلہ کے لیے آیا جسرت کو شاہ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے زیرک خاں کو رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ سامانہ میں مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مبارک شاہ جب لدھیانہ پہنچا تو جسرت نے لدھیانہ کی ندی عبور کر کے مقابلہ پر صف آرائی کر لی۔ اس نواح کی ساری فوجیں جسرت نے اپنے اختیار میں کر لی تھیں اس لیے مبارک شاہ اس سے پہلے دریا کو عبور نہ کر سکا۔ جب کچھ دن بعد دریا پایاب ہوا تو شاہی لشکر نے دریا عبور کیا۔

شاہی لشکر کی پیش قدمی سے جسرت ڈر کر بھاگ گیا اور چناب پار کر کے پہاڑی مقام بلیھر کو چلا گیا۔ مبارک شاہ نے عاقبت کر کے اس کے بہت سے سوار اور پیادے قتل کر دیئے اور کافی مال و اسباب لوٹا۔

اس مقام پر جموں کا زمیندار رائے بہلم مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لشکر کے ساتھ لاہور کی آباد کاری شامل ہو گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور پہنچ کر ایک ماہ تک راڈھی کے کنارے قیام کیا اور شہر لاہور کو جو پچھلے تباہ کن ہنگاموں میں ویران ہو چکا تھا از سر نو آباد کرایا۔ قلعہ لاہور کی مرمت کرائی اور ملک محمود کو جس کا خطاب ملک الشرق تھا وہاں چھوڑ کر دہلی کو مراجعت کی۔ مبارک شاہ کے لاہور پہنچنے کا سن سناتا ہے۔

پانچ ماہ بعد جسرت نے دوبارہ ایک بڑا لشکر جمع کر کے لاہور پر چڑھائی کی اور حضرت لاہور پر جسرت کی یورش شیخ حسن زنجانی کے مزار کے قریب اپنا کپ لگایا۔ جسرت کی فوج ہر روز شہر پر حملہ کرتی تھی لیکن اسے شکست کھا کر پسا ہونا پڑتا تھا۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی تو مجبوراً کلانور کی طرف پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں اس کی خبر لینے کے لیے رائے بہلم کی جمعیت تیار تھی۔ فریقین میں لڑائی ہوئی لیکن جلد ہی صلح ہو گئی۔

مبارک شاہ نے ملک محمود حسن کی کمک کے لیے دہلی سے ملک سکندر تحفہ کو بھیجا۔ اس نے بیاس کو بوجھ کے گھاٹ

لدھیانہ۔ سرہند سے ۳۸ میل پر صلح کے کنارے واقع ہے اور لودی خاندان کی یادگار۔ اس کی بنیاد پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں رکھی گئی تھی۔ ۱۵۵۶ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کے تحت یہ انگریزوں کی نگرانی میں آ گیا۔ باخند سے زیادہ ترکشیری ہیں۔ اناج کی بھاری منڈی ہے۔ چار خانہ کپڑا، مشجر گل فرش کلاہ اچھی تیار ہوتی ہیں۔ یہاں سے ایک سکھ رہبان نے ایک نیا پتھ ”کوکا پتھ“ قائم کیا تھا۔ ایک صاحب مولوی محمد حسن زمانہ حال میں گزرے ہیں انہوں نے نیوٹن کے ”ضابطہ صعود“ کے برعکس ایک نیا نظریہ ”ضابطہ نزول“ پیش کیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے سنگھ کی شورش کے بعد جناب اسی جگہ کے رہنے والے تھے۔ لدھیانہ فیروز پور لائن پر ریلوے کا جکشن ہے۔

لاہور راوی۔ اس دریا کو قدیم زمانے میں ایراوتی کہتے تھے۔ اس دریا کا سرچشمہ کوہ بیدراں ہے۔ لاہور اسی کے کنارے آباد ہے۔ بیاس اور راوی دو آب اکبر کے صہ میں باری کھلتا تھا۔ (آئین اکبری)

شیخ زنجانی۔ شیخ سید حسین زنجانی اصل نام ہے۔ بدراؤنی نے ”حسن“ لکھا ہے۔ ”خزینۃ الصغیر“ میں سید حسین ہے۔ گفت عارف حسین زنجانی یہ ماہ نامہ درج ہے جس سے ان کی وفات کا سن متلاشہ نکلتا ہے۔ یہ معزالودہ بیرام شاہ غزنوی کا آخری دور ہے۔ شیخ زنجانی جنیدی سلسلہ کے بزرگ اور سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کے خلیفہ ہیں۔ انہی کے ساتھ زنجان سے لاہور تشریف لائے تھے۔

سے عبور کیا۔ جب جسرت کو خبر ملی کہ تختہ لاہور پہنچ چکا ہے تو وہ چناب پار کر کے تلوارہ پہاڑ کی طرف بھاگ گیا۔ شاہی لشکر اس فتنہ کا سدباب کر کے دہلی لوٹ آیا۔

**ششمس آباد پر یلغار** | ششمس میں مبارک شاہ کیٹھڑ گیا۔ یہاں مہابت خاں بدایونی نے جو خضر خاں کے عہد میں باغی ہو گیا تھا حاضر ہو کر باریابی حاصل کی۔ مبارک شاہ نے اس پر بڑے الطاف و اکرام کیے۔ کیٹھڑ سے کوچ کر کے بادشاہ نے گنگا کو عبور کیا اور کھور عرف شمس آباد کے نواح میں بنواروں کے علاقہ کو لوٹ کر تباہ کر دیا۔ یہاں کے سرکشوں کے بند و بست کے لیے ملک مبارک خاں، زیرک خاں اور کمال خاں کو بھاری لشکر دے کر کنپلہ کے قلعہ میں یہ متعین کر دیا اور خود دہلی واپس چلا گیا۔

**الپ خاں کی سرکشی** | ششمس میں دہار کے حاکم الپ خاں نے گوالیار پر حملہ کیا۔ جب مبارک شاہ کو یہ خبر ملی تو وہ گوالیار کی جانب روانہ ہوا۔ بیانہ کے قریب پہنچا تو اوجہ خاں اور مدی کا بیٹا حاکم بیانہ قلعہ بند ہو گیا۔ اس نے اپنے چچا مبارک خاں سے بغاوت کر کے اسے قتل کر دیا تھا۔ اسی قتل کے مواخذہ سے ڈر کر اس نے سرکشی اختیار کی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دن محصور نہیں رہ سکا اور بہت جلد اطاعت اختیار کر لی۔

بیانہ سے فارغ ہو کر مبارک شاہ نے گوالیار کی طرف کوچ کیا۔ الپ خاں نے شاہی لشکر کا راستہ روکنے کے لیے چنیل کے کنارے پر پوچھ بندی کر لی تھی۔ لیکن مبارک شاہ نے اسے غفلت میں رکھ کر ایک دوسرے گھاٹ سے چنیل کو عبور کیا۔ اور حملہ کر کے الپ خاں کے لشکر کو تھمس تھمس کر دیا۔ آخر الپ خاں نے بھاری پیش کش دے کر صلح کر لی اور اپنے علاقہ کو لوٹ گیا۔ بادشاہ بھی دہلی واپس آ گیا۔

**ہندوستان کا قحط** | ششمس میں مبارک شاہ نے دوبارہ کیٹھڑ اور کمالیوں کا رخ کیا۔ وہاں سے واپسی پر میوات کو بری طرح پامال کر دیا۔ اسی سال ہندوستان میں بہت بڑا قحط پڑا تھا۔ ششمس میں بادشاہ نے پھر میوات پر فوج کشی کی اور اندور و انور کے قلعے فتح کر لیے۔

لے چناب :- اس دریا کا پرانا نام چندر بھاتا ہے۔ کہ کھلوار کے دامن سے دو چٹے نکلے ہیں ایک کا نام چند ہے اور دوسرے کا بھاتا۔ یہ دونوں چٹے کھٹواڑ کے قریب مل جاتے ہیں اور دریا کی شکل میں بہتے ہیں۔ یہی چندر بھاتا ہے جسے اب چناب کہتے ہیں۔ یہ دریا بھلوں پور، سمدرہ اور ہزارہ کو سیراب کرتا ہے۔ چنیل - جنل کے بعد یہ اودھ کا دوسرا بڑا دریا ہے۔

لے اندور - احمد آباد سے ۲۷ میل پر مالوہ کی ایک ریاست ہے۔ سلج سندھ سے دو ہزار فٹ بلند ہے۔ ایک برساتی نالہ "کاپان ندی" جس کا نام ہے شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس پر نو محرابوں کا ایک پل ہے۔ پونے دو سو برس پہلے یہ ایک گنام گاؤں تھا۔ اسے ایلیا بائی بھوہ ماراج کھانڈے رائے نے آباد کیا یہ ان ریاستوں میں سے ہے جنہیں مرہٹوں نے مغل سلطنت کے عہد زوال میں قائم کیا تھا۔ اس ریاست کا مورث اعلیٰ ملہار راؤ پکرم بڑا سردار تھا جو پہلے ایک چرواہا تھا۔ اس نے ۱۷۳۵ء میں صوبہ مالوہ کے مغل صوبہ دار کو شکست دے کر خود مختار ریاست قائم کی۔ چالیس سال کی حکمرانی کے بعد ۱۷۷۵ء میں فوت ہوا۔ اس خاندان کی دو مشہور رانیوں ایلیا بائی زوجہ کھنڈے رائے نے ۳۰ سال حکومت کی، وفات ۱۷۹۵ء میں ہوئی۔ دوسری ہمارائی تلسی بائی تھی جو ۱۷۳۲ء میں قتل کی گئی۔ آخری راجہ ٹوکوجی راؤ تھا۔ ریاست کا رقبہ ۹۵۰۰ مربع میل آبادی ۸۵۰۰۰۰ کے اور بمبئی سے ۷۰ میل دہلی سے ۹۹ میل مغل دور میں صوبہ آگرہ کے تحت تھا باقی حاشیہ صفحہ آئندہ ہے



## گوالیار کے راجاؤں کی اطاعت

سنہ ۸۳۳ء میں اس نے بیانہ سے محمد خاں اوحدی کے عمل دخل کو ختم کر دیا اور اپنے ایک غلام ملک مقبل کو بیانہ کی حکومت دے دی۔ سیکری کو ملک خیر الدین تحفہ کو تفویض کیا۔ اوحدی کے سارے خاندان کو بیانہ سے ہٹا کر کوشک جہاں نمایں بٹھرا دیا۔ ان انتظامات کے بعد گوالیار پر فوج کشی کی۔ اس مرتبہ وہاں کے سارے راجاؤں نے اطاعت قبول کر لی۔

## ملک شرقی سے مقابلے

سنہ ۸۳۱ء میں حاکم کاپلی قادر خاں کے قاصدوں نے آکر اطلاع دی کہ ملک شرقی نے کاپلی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ مبارک شاہ قادر خاں کی کمک کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ ملک شرقی بھون گاؤں میں پہنچ چکا ہے۔ اور وہاں سے بدایوں کا ارادہ کر رہا ہے۔ بادشاہ نے تیزی سے کوچ کیا اور تونہ ٹیل کے گھاٹ سے جنا عبور کر کے موضع جرنولی اور پھر وہاں سے اترولی پہنچ گیا۔ یہاں مخدوم نے اطلاع دی کہ ملک شرقی کا بھائی مختص خاں ایک بڑا لشکر اور ہاتھی لے کر اٹاواہ کی سرحدوں پر پہنچ گیا ہے۔ مبارک شاہ نے ملک الشہ ق محمود حسن کو دس ہزار سواروں کے مختص خاں کی طرف روانہ کیا۔ جب اسے شاہی لشکر کی آمد کی خبر ملی تو اپنے بھائی ملک شرقی سے جا ملا۔ اس وقت ملک شرقی نے آب سیاہ سرف کاٹے پانی کو گھیر لیا تھا۔ اور قصبہ برہان آباد کے قریب جو اٹاواہ کے تحت ہے مقیم تھا۔

مبارک شاہ نے اترولی سے کوچ کیا اور کوٹہ میں آکر بٹھرا گیا۔ لیکن ملک شرقی مقابلہ کیے بغیر اپری چلا گیا۔ وہاں سے جنا پار کر کے بیانہ پہنچا اور کیٹھر کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔

## ملک شرقی کا فرار

مبارک شاہ اس کے تعاقب میں چند وار پہنچ گیا۔ اب دونوں لشکر چار کوس کے فاصلہ پر بالمقابل تھے۔ روزانہ فریقین میں صف آرائی اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ بیس دن تک لڑائی کا یہی رنگ رہا۔ آخر ملک شرقی نے ایک دن پوری تیاری سے حملہ کیا۔ دوپہر سے شام تک گھسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ دوسرے دن ملک شرقی میدان چھوڑ کر اپنے علاقہ کی طرف

دقیقہ حاشیہ سلسلہ اور صفحہ گزشتہ ۱۱۱۱ شیشوں سے باہر خوش نام مقبرہ فتح جنگ کی یادگار ہے اور سنہ ۱۱۵۲ھ کی تعمیر ہے۔ وسط شہر میں ایک گنبد ہے جو سنہ ۱۱۳۵ھ کی تعمیر اور فیروز شاہ کے بھائی سادنگ خاں کی قبر ہے۔ ایک بڑا مندر جگدیش جی کا ہے۔ دربار ہال کے کتب خانہ میں توڑک باری کا ایک قدیم نسخہ ہے جس پر اکبر کے وقت سے کتب خانہ میں داخلہ نام مغل ملاطین کی مہربانی ہوئی ہیں۔ ایک گلستان کا باغ دہرائی نسخہ ہے جسے ایک لاکھ روپیہ کے صرف سے ماراجہ بنے سنگھ نے سنہ ۱۱۶۹ھ میں شایع کیا تھا۔ اور کے حکمران کاراجگان ہے پورے تعلق ہے اور پورے دو سو برس سے یہ ریاست قائم تھی۔ اس کا رقبہ ۳ ہزار ایک سو اسی میل آبادی ۸ لاکھ ۸۸ ہزار ۵۰۰ تھی۔ سالانہ آمدنی ۳۰ لاکھ روپیہ تھی۔ ابوالفضل نے آئینی اکبری میں اور کے متعلق لکھا ہے ”یہاں شیشہ کا کام اچھا ہوتا ہے۔ اونی

قالی بھی تیار کیے جاتے ہیں۔ پیرا تھیں لوہے کی کان ہے۔ ایک من خاک سے ۴۵ سیر لوہا نکل آتا ہے۔ یہاں چاندی کی بھی ایک کان ہے۔

لہ آب سیاہ۔ غالباً کالی ندی مراد ہے۔ دو آب ہیں اس نام سے۔ دوندیاں مشہور ہیں۔ مغربی کالی ندی جو کوہ سواک سے نکل کر مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں بہتی ہوئی دریائے ہینڈن میں شامل ہو جاتی ہے۔ مشرقی کالی ندی ضلع مظفر نگر سے نکلتی ہے کچھ دور تک ”ناگن“ کہلاتی ہے۔ خواجہ کے قریب رخ بدل لیتی ہے

۱۴ میل کے بعد میرٹھ بندر شہر علی گڑھ ایٹھ اور فرخ آباد کے اضلاع سے گذرتی ہوئی قنوج سے چار میل آگے گھگھ میں مل جاتی ہے۔ ابن بطوطہ بھی اس کا ذکر کرتا ہے۔ ”بمصر پور سے چل کر ہم ایک دریا پر پہنچے کو آب سیاہ (کالی ندی) کہتے تھے پچھ پھر قنوج پہنچے۔

پسپا ہو گیا اور مبارک شاہ نے اس خیال سے کہ دونوں طرف مسلمان ہیں ناحق خون بہے گا اُس کا تعاقب نہ کیا۔

**حاکم بیانہ کی اطاعت** | ملک شرقی کو بھگا کر بادشاہ نے رستگالی پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے چیل کے ساحل پر قبضہ کرتے ہوئے بیانہ پہنچا۔ محمد خاں اوحدی ملک شرقی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اب جو شاہی لشکر آیا تو وہ خوف زدہ ہو کر قلعہ بند ہو گیا۔ پھر امن طلب کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس کے بعد مبارک شاہ دہلی چلا گیا۔

۸۳۲ھ میں ملک الشرق حسن محمود جو بیانہ میں رہ گیا تھا اس ضلع کا نظم و نسق درست کر کے اور ان لوگوں کو سزائیں دے کر جو محمد خاں اوحدی کے گرد جمع ہو گئے تھے دہلی لوٹ آیا۔ مبارک شاہ نے اس کی حسن کارکردگی پر خوش ہو کر حصار فیروزہ بطور جاگیر اسے عطا کیا۔

اسی سال ملک رجب نادرہ حاکم ملتان فوت ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ملک محمود حسن کا تقرر ہوا۔ بادشاہ نے اسے عماد الملک کا خطاب عطا کیا۔

**۸۳۳ھ میں ملک شاہ نے بیانہ کے راستہ کوچ کیا اور گویا رہنچا۔** | **فولاد کی فتنہ انگیزی** | کوہنا کر ملک حمزہ کو متعین کیا اور دہلی لوٹ گیا۔ راستہ میں سید سالم جو خضر خاں کی خدمت میں تیس سال رہا تھا اور تبرہ بندہ اس کی جاگیر میں تھا فوت ہو گیا۔ مبارک شاہ نے اس کے ایک بیٹے کو سید خاں دوسرے کو شجاع الملک کا خطاب عطا کیا۔ لیکن تبرہ بندہ میں سید سالم کے ایک ترک غلام فولاد نے بغاوت کر کے اس کے سارے مال و اسباب اور تبرہ بندہ کی عملداری پر قبضہ کر لیا۔ مبارک شاہ نے سید سالم کے مذکورہ بیٹوں کو قید کر لیا (غالباً یہ بغاوت ان کے اشارہ پر ہوئی تھی، اور ملک یوسف سرور اور رائے ہنسو بھٹی کو فولاد سے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ فولاد نے شب خون مار کر ان کے لشکر کو تباہ کر دیا، کافی مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔ اس قضیہ کو چکانے کے لیے مبارک شاہ نے خود فولاد پر لشکر کشی کی۔ فولاد قلعہ میں محصور ہو گیا۔ مبارک شاہ نے ملتان سے عماد الملک کو بلا کر اس کے پاس بھیجا۔ عماد الملک کی کوششوں سے وہ امان طلب کر کے قلعہ سے نکل کر عماد الملک کی پناہ میں آ گیا۔ لیکن اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اسی لیے دوبارہ بھاگ کر قلعہ میں چلا گیا اور لڑائی جاری رکھی۔ مبارک شاہ نے عماد الملک کو تو ملتان واپس کر دیا اور فولاد کے مقابلہ میں لشکر چھوڑ کر خود دہلی واپس ہو گیا۔

**۸۳۴ھ میں ملک شاہ نے بیانہ کے راستہ کوچ کیا اور گویا رہنچا۔** | **شیخ علی حاکم کابل کا حملہ** | فولاد چھ ماہ تک برابر بادشاہی لشکر سے برسرِ پیکار رہا پھر اس نے کابل کے حاکم شیخ علی مغل کے پاس کافی زر نقد بھیج کر اس سے اپنی کمک پر آنے کی درخواست کی۔

لے شیخ علی۔ سلطان خراسان و ماوراء النہر شاہ رخ مرزا کی طرف سے کابل کا حاکم تھا۔ خضر خاں شاہ رخ مرزا کے پاس تحائف اور نذرانہ روانہ کیا کرتا تھا۔ مبارک شاہ نے یہ سلسلہ بند کر دیا۔ مرزا نے شیخ علی کو ہندوستان پر حملہ کا حکم دیا۔ ہراؤنی نے یہ وجہ نہیں لکھی ہے بلکہ صرف فولاد کے اس کو بلانے کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی سبب رہا ہو۔

شیخ علی ایک بڑا لشکر لے کر فولاد کی مدد کے لیے آیا۔ پنجاب کے ہزاروں آدمی اس کے ساتھ ہو گئے۔ شیخ علی نے تبر بندہ سے فولاد اور اس کے قبیلہ کو اپنے ہمراہ لیا اور لاہور پر چڑھائی کر دی۔ ملک الشرق ملک اسکندر حاکم لاہور ہر سال شیخ علی کے پاس نذرانے روانہ کرتا رہتا تھا۔ اس بار بھی اس نے نذر نذرانے دے دلا کر شیخ علی سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ لاہور سے شیخ علی قصور پہنچا اور وہاں سے اس نے دیپال پور کا قصد کیا۔

ملتان سے عماد الملک اس کا راستہ روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ شیخ علی راوی کے کنارے کنارے طلبہ تک چلا گیا اور وہاں سے خوط پور کو لوٹ کر عماد الملک کے لشکر پر حملہ کیا اور اسے شکست دی۔ عماد الملک کا سردار ملک سلیمان شاہ لودی اس لڑائی میں مارا گیا۔ پھر شیخ علی خسرو آباد میں آکر ٹھہر گیا اور ایک طویل عرصہ تک ہر روز اس کی اور عماد الملک کی فوج میں لڑائی ہوتی رہی۔

۱۳۲۷ء میں مبارک شاہ نے فتح خاں بن سلطان مظفر خان گجراتی کی سرکردگی میں ایک بھاری لشکر عماد الملک کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ شیخ علی اس فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اور پیچھے ہٹ کر اس حصار میں جو اس نے اپنے لشکر کے اطراف میں بنالیا تھا محصور ہو گیا۔ جب عماد الملک نے اس حصار کو بھی گھیر لیا تو مجبور ہو کر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ دریائے جہلم میں اس کے بہت سے لشکر ڈوب گئے۔ عماد الملک کا لشکر برابر تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شیخ علی کی بہت بڑی جمعیت کو اس جگہ تہ تیغ کر دیا۔ اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔ شیخ علی اور امیر مظفر تھوڑے آدمیوں کے ساتھ قصبہ شیوڑ میں پہنچے۔ عماد الملک نے اسی قصبہ تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں امیر مظفر تو ایک قلعہ میں محصور ہو گیا اور شیخ علی جان بچا کر کابل بھاگ گیا۔ شاہی لشکر فتح کے جھنڈے اڑاتے ہوئے وہلی لوٹ آیا۔

مبارک شاہ نے کچھ عرصہ بعد ملتان سے عماد الملک کو ہٹا کر خیر الدین خانی کو متعین کر دیا۔ اس جسرت کی سرکشی کا رد وائی سے ملتان میں بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر جسرت نے بھی پہاڑی علاقہ میں شورش برپا کر دی۔

۱۳۲۸ء میں لاہور کا حاکم ملک سکندر جسرت کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوا۔ جسرت نے سکندر کو غفلت میں رکھ کر اچانک اُس کی فوج پر حملہ کر دیا اور جالندھر کے نواح میں سکندر کو گرفتار کر لیا۔ پھر اسے اپنے ساتھ ملا کر لاہور پر فوج کشی کر دی۔ سکندر کا نائب نجم الدین اور اس کا غلام ملک خوش خبر جسرت سے مقابلہ کرتے رہے۔

اسی اشار میں شیخ علی دوبارہ تیار ہوا کر کے ملتان کی حدود تک پہنچ گیا اور خوط پر یورش کر کے جہلم کے رہنے والے بہت سے باشندوں کو قید کر لیا۔ طلبہ کو بڑی طرح لوٹا۔ وہاں کئی آدمیوں کو

لے قصور آئین اکبری میں سرکار باری دوآبہ کے تحت ایک محال کا نام ہے۔ اب یہ مغربی پاکستان کا درمیانہ شہر ہے۔

۱۳۲۹ء۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں سرکار دوآبہ آدھنا و صوبہ لاہور کے تحت ایک محال شور کا ذکر کیا ہے۔ جہاں جٹ لنگاہ قوم آباد تھی۔ غالباً شیوڑ سے یہی قصبہ مراد ہے۔

قتل اور قید کر کے کابل چلا گیا۔

اسی دوران میں تبرہندہ سے فولاد ترک نے رائے فیروز کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ رائے فیروز اس مقابلہ میں مارا گیا۔ فولاد نے اس کا سر کاٹ کر تبرہندہ کو بھیج دیا۔

جسرت اور شیخ علی کافرار | اسی سال مبارک شاہ نے ان فتنوں کو رفع کرنے کے لیے دوبارہ لاہور اور ملتان کی طرف کوچ کیا۔ جب شاہی لشکر سامانہ کے قریب پہنچا تو جسرت لاہور کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف اور شیخ علی کابل کو واپس چلا گیا۔ مبارک شاہ نے لاہور اور جالندھر سے شمس الملک کو معزول کر کے یہ علاقہ نصرت خاں گرگ انداز کے سپرد کر دیا اور شمس الملک کے سارے خاندان کو لاہور سے دہلی روانہ کر دیا اور خود بھی دہلی لوٹ آیا۔

مخدومہ جہاں کی وفات | ۸۳۶ھ میں مبارک شاہ نے جسرت کی سرکوبی کے لیے دوبارہ سامانہ کی طرف کوچ کیا تھا لیکن وہ پانی پت پہنچا تھا کہ اسے اپنی والدہ مخدومہ جہاں کے انتقال کی خبر ملی۔ اس نے لشکر کو وہیں چھوڑا اور تہا دہلی لوٹ آیا۔ دس دن تک ماتم کی رسوم ادا ہوتی رہیں۔ اس کے بعد وہ لوٹ کر لشکر میں چلا گیا اور ملک یوسف سرور الملک کو تو فولاد کی گوشمالی کے لیے تبرہندہ کی طرف روانہ کیا۔ اور نصرت خاں کو لاہور اور جالندھر سے بٹا کر یہ شہر ملک الہ داد لودی کے سپرد کر دیئے۔

جسرت کی دوبارہ پسپائی | الہ داد نے لاہور سے جسرت پر فوج کشی کی اور جالندھر جا کر پڑاؤ ڈال دیا جسرت نے بیاس کو عبور کر کے بجوارہ میں الہ داد سے مقابلہ کیا اور اُسے شکست دے کر پہاڑوں کی طرف بھاگ دیا۔

اسی سال مبارک شاہ نے میوات میں جلال خاں پر حملہ کیا۔ وہاں سے گوالیار اور اٹاواہ کی طرف فوجیں روانہ کر کے دہلی لوٹ آیا۔

شیخ علی کا تیسرا حملہ | اس سال شیخ علی نے پھر پنجاب میں داخل ہو کر روڈائی چھیر دوی۔ مبارک شاہ نے اس علاقہ کے امراء کی مدد کے لیے عماد الملک کو روانہ کیا۔ شیخ علی نے شیور سے بیاس تک سارے علاقہ کو بری طرح پامال کر دیا اور سینکڑوں آدمیوں کو قید کر کے لاہور پہنچا۔ جہاں زیرک خاں اور دوسرے امراء قلعہ بند ہو گئے۔ اور کافی عرصہ تک حملہ آور غنیم کی مدافعت کرتے رہے۔ ایک رات غنیم کو قافلہ پا کر ملک یوسف سرور الملک اور زیرک خاں شب خون مارنے کے لیے قلعہ سے نکل کر آئے۔ لیکن شکست کھا کر لوٹ گئے۔ شیخ علی نے ان کا تعاقب کر کے اکثر کو قتل اور قید کر لیا۔

شیخ علی کا لاہور پر قبضہ | دوسرے دن شیخ علی لاہور شہر میں داخل ہو گیا اور لاہور کے بہت سے باشندوں کو قتل کر دیا۔ اکثر کو اسیر بنایا۔ کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد دیپال پور پہنچا۔ ملک یوسف سرور الملک دیپال پور پر مورچہ بندی کیے ہوئے تھا۔ اس نے دشمن کے دباؤ کو محسوس کر کے وہاں سے بھی نکل جانے کا ارادہ کیا تھا



لیکن عماد الملک نے بروقت دیپال پور کے قلعہ کی حفاظت کے لیے تبرہندہ سے اپنے بھائی ملک احمد کو بھیج دیا۔ جب شیخ علی کو اس ملک کی اطلاع ملی تو وہ وہیں سے لوٹ گیا۔

اس فتنہ کے سدباب کے لیے سلطان مبارک شاہ نے پھر لشکر کشی کی اور سامانہ سے تلونڈی پہنچا۔ وہاں سے کوچ کر کے بیاس کو پہنچ کر گھاٹ سے عبور کیا اور دیپال پور پہنچ کر راوی کے کنارے خیمے لگا دیئے۔ شیخ علی بادشاہ کی آمد سے گھبرا کر جہلم پار کر کے بھاگا۔ مبارک شاہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے قلعہ شیور تک چلا گیا اور راوی کو طلبہ کے قریب عبور کیا۔ یہاں ایک قلعہ میں شیخ علی کا بھتیجا مظفر محصور ہو گیا تھا۔ وہ ایک ماہ تک بادشاہی لشکر سے لڑتا رہا۔ آخر کار امان لے کر صلح کر لی اور اپنی لڑکی کو بھاری جہیز کے ساتھ شہزادہ کے عقد میں دیا۔ شیخ علی کے جو لشکر لاہور کے قلعہ میں محصور تھے شمس الملک سے امان لے کر ہر نکل آئے۔

مبارک شاہ جب شیور اور لاہور کی اس مہم سے فارغ ہوا تو لشکر چھوڑ کر اوپار اللہ کی زیارتوں کے لیے ملتان چلا گیا۔ اور جلد ہی وہاں سے لوٹ کر دیپال پور آگیا۔ کچھ دن وہاں ٹھہرا رہا اور شیخ علی کے سدباب کی خاطر لاہور اور دیپال پور حکومت عماد الملک کے تفویض کر دی۔ بیانہ پر عماد الملک کی بجائے شمس الملک کو متعین کر دیا۔ پھر وہاں سے تنہا تیزی سے کوچ کرتا ہوا عید الاضحیٰ کے دن دہلی واپس آگیا۔

دہلی پہنچنے کے بعد مبارک شاہ نے وزارت پر ملک سرور الملک کو فائز کیا اور نائب لشکر ملک کمال الملک کو اس کا مددگار بنایا لیکن ان دونوں میں نبھ نہ سکی۔ سرور الملک کو دیپال پور کی حکومت ملنے کا پہلے ہی رنج تھا۔ عماد الملک کی تقرری کے بعد تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ اس لیے مبارک شاہ سے ناراض ہو کر غدر برپا کرنے کی فکر میں لگ گیا اور مبارک شاہ کے قتل کی سازش میں کانگوی اور کنجوی کھڑیوں، میران صدر نائب عرض و جواب دادا کے وقت سے مبارک شاہ کے خاندان میں پرورش پاتا رہا تھا اور بڑے بڑے عہدے اور منصب حاصل کیے تھے ساتھ لیا اور کچھ دوسرے ملک حرام مسلمانوں کو بھی شریک کر لیا۔

شہر مبارک آباد | شہر مبارک آباد نے جتنا کہ کنارے ایک نیا شہر مبارک آباد بسایا۔ لیکن حقیقت میں یہ شہر اس کے لیے مبارک ثابت نہ ہوا۔ وہ اس کی عمارتوں کے بندوبست میں مصروف تھا کہ قلعہ تبرہندہ سے فتح کی خوشخبری اور فولاد کا بریدہ سرخسور میں پیش ہوا۔ بادشاہ نے شاداں و فرجاں تبرہندہ کا قصد کیا اور جلد ہی وہاں سے لوٹ کر مبارک آباد آگیا۔

اسی سال خبر پہنچی کہ سلطان ابراہیم شرقی اور کاپی کے حاکم الپ خاں المخاطب سلطان ہوشنگ کے مابین لڑائی ہو رہی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی بادشاہ نے ہر طرف فراہم بھیجے اور ہر جگہ سے لشکر کو اکٹھا کر کے کاپی پر یورش کی تیاریاں کرنے لگا۔

مبارک شاہ کی ہلاکت | ایک دن مبارک شاہ حسب معمول نئی عمارتوں کے معائنہ کے لیے دہلی سے مبارک آباد گیا۔ وہاں جمعہ

کی تیاری کر رہا تھا کہ نمک حرام میران صدر جو سرور الملک کے بھکانے سے گھات میں لگا ہوا تھا کسی بیانہ سے محل پر گھس آیا اور بادشاہ پر حملہ کر دیا۔

اور سدھ پال کجوی کھتری کے پوتے نے مبارک شاہ کو شہید کر دیا۔  
مبارک شاہ کی شہادت ۸۳۳ھ میں ہوئی۔ اس نے تیرہ سال تین ماہ سولہ دن تک حکومت کی۔

## سلطان محمد شاہ بن فرید خاں

مبارک شاہ کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا محمد شاہ جسے مبارک شاہ نے اپنا بیٹا بنالیا تھا ۸۳۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ سرور الملک نے مصلحتہ اس سے بیعت کر لی۔ محمد شاہ نے اس کی فتنہ پرداز یوں سے صرف نظر کر کے اسے خان جہاں خطاب اور خلعت عطا کی۔ میران صدر کو معین الملک کا خطاب ملا۔ سرور الملک کے شریک وزارت کمال الملک نے بھی سلطان محمد شاہ سے بیعت کر لی۔ لیکن اس نے اپنی سکونت شہر سے باہر رکھی۔

سرور الملک کا اقتدار | ملک حرام سرور الملک برابر فتنہ پرداز یوں میں لگا رہا۔ چنانچہ جلوس کے دوسرے ہی دن مبلغ شاہ مرحوم کے بعض غلاموں کو کسی حیلہ سے پکڑ کر قتل کر دیا اور لوگوں کو اپنے آپ جاگیریں تقسیم کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے مبارک شاہ کے قاتلوں سدھ پال اور سدھارن کو بیاتہ امر و بہز نارنول کھرام اور دو آبہ کے کئی ایک پر گئے عطا کر دیئے۔

سدھ پال کا غلام رانوں سپہ بیانہ پہنچ کر قلعہ میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن بروقت ہنڈون سے یوسف خاں اور حد فتنہ اپنی جمعیت لے کر پہنچ گیا اور رانوں پر حملہ کر کے اس کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا۔ اس کے اہل و عیال مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے اور رانوں کا سر کاٹ کر قلعہ کے دروازہ پر لٹکا دیا گیا۔

سرور الملک کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر خضر خاں اور مبارک شاہ کے وقت کے سارے امیروں کی بغاوت | امیر جہاں جہاں تھے باغی بن بیٹھے اور تمام ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ از سر نو طوائف الملوک کا دور دورہ ہو گیا۔ سنبھل کا حاکم ملک الہ داد کالا لودی، حاکم بدایوں ملک چیمین اور امیر علی گجراتی وغیرہ مبارک شاہ کے خون کا بدلہ لینے کے بہانے دہلی پر چڑھ آئے۔

کمال الملک کی بغاوت | بادشاہ نے ان کے مقابلہ کے لیے سید خاں ولد سید سام جس کا خطاب اعظم خاں تھا اور کمال الملک کو روانہ کیا۔ کمال الملک کے ساتھ ملک یوسف ولد سرور الملک، سدھارن اور کانکو بھی گئے۔ جب دہلی کا یہ لشکر کچھ کے گھاٹ کو عبور کر کے برن پہنچا تو الہ داد اور دوسرے امیروں نے جو قبضہ آباد

تک پہنچ چکے تھے محمد شاہ سے روائی کا خیال چھوڑ کر واپسی کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن اس اثنائے میں ان کو تنبیہ اطلاعات ملیں کہ خود کمال الملک سرور الملک سے مرحوم بادشاہ کے خون کا بدلہ لینے کی نگر میں ہے تو انہوں نے واپسی کا ارادہ ترک کر دیا۔ سرور الملک کو بھی کسی طرح کمال الملک کے ارادوں کی ہوا لگ گئی۔ اس نے کمال الملک کی مدد کے بہانے اپنے نائب

ملک ہشیار کو اپنے بیٹے کی حفاظت کے خیال سے بھیج دیا۔ یوسف خاں وغیرہ بھی کمال الملک کے رویہ سے کھٹک گئے تھے۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر یوسف خاں ملک ہشیار اور سدھارن لشکر سے نکل کر دہلی بھاگ گئے۔

سنبھل اور بدایوں وغیرہ کے امیروں کا لشکر کمال الملک کے لشکر سے جا ملا اور یہ سب دہلی کے باغی امیروں کا دہلی پر حملہ | کیچھ پہنچ گئے۔ دوسرے دن جہانپار کر کے ایک باغ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ سرور الملک نے قلعہ بند ہو کر لڑنے کی تیاریاں کر لیں۔ سرور الملک کے لشکریوں نے شہر سے نکل کر باغی امیروں کی فوج پر حملہ کیا لیکن جوابی حملہ کی تاب نہ لا کر پسا ہو گئے اور لوٹتے ہوئے ان کے بہت سے آدمی مارے گئے اور بہت سے قید ہو گئے۔

دوسرے دن مبارک شاہی امیروں نے سیری کے قلعہ کے سامنے کیمپ لگا دیا۔ شہر کے حصار سے بھی اکثر امیر نکل کر ان کے ساتھ ہو گئے۔ یہ لڑائی برابر تین ماہ تک رہی۔

اس سال کے آخر میں زیرک خاں حاکم سامانہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا علاقہ اس کے بیٹے محمد خاں کو مل گیا۔

سرور الملک کا قتل | خود سلطان محمد شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ مصلحتاً اور مجبوراً سرور الملک کے ساتھ تھا اور دل سے مبارک شاہی امیروں کا حامی تھا۔ بادشاہ کی اس دلی کیفیت سے سرور الملک غافل نہیں تھا۔ اور وہ اسے بھی ٹھکانے لگانے کی فکریں لگا ہوا تھا۔ سرور الملک نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی اور ۸ محرم ۸۳۸ھ سرور الملک میران صدر کے لڑکوں کو لے کر سراپردہ شاہی میں محمد شاہ کے قتل کے ارادہ سے گھس گیا۔ محمد شاہ نے اسی وقت کمال الملک کو بلانے کے لیے آدمی بھیجے لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی شاہی خادموں نے سرور الملک اور میران صدر کے لڑکوں کو گھیر کر قتل کر دیا۔ ان کے دوسرے ساتھی اپنے اپنے گھر بند کر کے بیٹھ رہے۔

مفسد کھتریوں کا انجام | سرور الملک کا قضیہ پاک ہونے کے بعد کمال الملک دوسرے امراء کے ساتھ بغدادی دروازہ سے شہر میں داخل ہوا۔ بد نعت سدھ پال ہندوانہ رسم کے مطابق اپنی عورتوں کو چٹاپیں جلا کر مارنے مرنے پر تیار ہو گیا اور مارا گیا۔ سدھارن کانگو اور اس کے کھتری رفیق بھی مبارک شاہ کے روضہ کے پاس قتل کر دیے گئے۔ ان کے ساتھ ہی ملک ہوشیار اور مبارک کو تو ال کی گردن مار دی گئی۔

محمد شاہ کی مستقل حکمرانی | دوسرے دن کمال الملک اور دوسرے تمام امیروں نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ وزارت کا منصب کمال الملک کے تفویض ہوا۔ ملک چین بدایونی کو غازی الملک کا خطاب عنایت ہوا۔ اور اسے بدایوں کی قدیم عمارت کے علاوہ امر وہ بھی جاگیر میں دیا گیا۔ ملک الہ داد نے خود کو کوئی خطاب قبول نہ کیا۔ لیکن اپنے بھائی کو دریا خاں کا خطاب دلوا دیا۔ اب کہیں جا کر محمد شاہ کامل الاختیار بادشاہ بن سکا اور اس کی حکمرانی کے لیے کوئی خطرہ اور خدشہ نہ رہا۔

ملتان کا سفر | ۸۳۸ھ میں محمد شاہ نے ملتان کا عزم کیا اور کچھ دن مبارک پور میں ٹھہرا رہا۔ جب ہر طرف کے امیر اور سردار مبارک پور میں جمع ہو گئے تو انہیں بے کرم ملتان گیا اور وہاں بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کر کے دہلی لوٹ گیا۔

ملتان نہایت قدیم شہر ہے۔ سکندر بن فیلقوس کے وقت میں یہ شہر قوم مالی کا دار الخلافہ تھا۔ جنرل کننگھم کی رائے میں اسکی وجہ تسمیہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

اسی سال اس نے سامانہ پر فوج کشی کی اور اس علاقے کو غارت کر کے ایک فوج شیخا کھوکھر کے مقابلہ پر متعین کر دی اور دہلی لوٹ گیا۔

**۱۵۸۷ء میں ملتان میں لنگاہ پٹھانوں کی شورش انگیزی کی خبر ملی اور اسی دوران میں سلطان ابراہیم شہر قی نے فتنوں کا آغاز دہلی کے بعض پرگنوں پر یلغار کر کے قبضہ کر لیا۔ گویا ر کے زمینداروں نے بھی مالگزاری بند کر دی۔ ضرورت تھی کہ مختلف سمت سے اٹھنے والے فتنوں کی طرف بادشاہ فوری متوجہ ہوتا لیکن محمد شاہ نے انکے سد باب میں سستی برتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باغیوں کے حوصلے بڑھ گئے اور سارے ملک میں پھر سے فتنہ و فساد کا دور دورہ ہو گیا۔**

**محمود خلجی کا دہلی پر حملہ** میوات کے خان زادوں نے جو حسن خاں میواتی کے بزرگ تھے مالوہ کے محمود خلجی کو دہلی پر حملہ کی دعوت دی اور ۱۵۸۷ء میں محمود خلجی نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ نے بھی

(بقیہ حاشیہ ملتان صفحہ گزشتہ) سورج دیوتا کا مندر ہے۔ ۱۵۸۷ء میں ہونٹھسنگ ایک چینی سیاح ہندوستان آیا تھا اس نے بھی ملتان کے اس مندر اور سورج کے بت کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت ملتان کا رقبہ ۵ میل تھا۔ چاچ نامہ سے معلوم ہوتا ہے ۱۵۸۷ء میں جب محمد بن قاسم ثقفی نے ملتان کو فتح کیا۔ اس وقت دریائے بیاس اس کے جنوب مشرق میں بہتا تھا اور راوی قلعہ اور شہر کے درمیان سے گزرتا تھا۔ بلاذری نے (۷۵۷ء) بھی اس بت کا ذکر کیا ہے۔ (اصطخری ۷۵۷ء) نے لکھا ہے۔ اس مندر کی تعلیم کی وجہ سے ہندو حملہ آور اس شہر پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ اس نے اس مندر کو عین بازار کے چوک میں بتایا ہے۔ ابن حوقل (۹۰۷ء) کہتا ہے یہ بت آدمی کی شکل کا ہے جو چوڑے پر بیٹھا ہوا ہے، آنکھوں میں دو جواہر ہیں باقی جسم پر سرخ کھال منڈھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں جسم کس چیز سے تراشا گیا ہے۔ ابن حوقل کے تھوڑے دن بعد ہی قرامطیہ نے ملتان کو فتح کر لیا اور اس مندر کو ڈھا دیا اور اس کی جگہ مسجد بنوا دی۔ چنانچہ جب ابوریحان بیرونی ملتان آیا تو یہ بت نہیں تھا لیکن ادیبی نے (۱۰۸۷ء) اس کا ذکر کیا ہے۔ ادیبی کے وقت بھی راوی شہر کے نیچے سے بہتا تھا۔ موسیٰ حنفی نے نو فرانیسی سیاح ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب کے عہد میں آیا تھا وہ بھی اس سورج کی مورتی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا بیان ابن حوقل کے بیان کے مطابق ہے۔ کہتے ہیں اورنگ زیب نے اس مندر کو توڑ کر قلعہ میں وہ مسجد بنوا دی جو مول راج کے زمانہ میں محاصرہ ملتان کے وقت بطور بیگزین استعمال کی گئی تھی اور آگ لگنے سے اڑ گئی تھی۔ جنرل کشنم کہتے ہیں میں نے ۱۸۵۳ء میں اس کے کھنڈ دیکھے ہیں وہ قلعہ کے مین وسط میں تھی۔ اس سے عربی مؤرخوں کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ مندر مین بازار کے چوک میں تھا۔ تیمور کے وقت تک دریائے راوی شہر اور قلعہ دونوں طرف بہتا تھا۔ اور اس کی ایک شاخ دونوں کے درمیان سے لگتی تھی قلعہ میں اب جو پہلا دپوری کا مندر ہے اس کا سورج دیوتا مندر سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے سورج کنڈ کا جو مندر شہر سے پانچ میل پہلے ہے اس کا بقیہ ہو ملتان میں شاہ رکن عالم کا مقبرہ عجیب چیز ہے اس کی بلندی سو فٹ ہے پچاس فٹ کی بلندی سے اسے تعمیر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں یہ مقبرہ غیاث الدین تغلق نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا۔ لیکن محمد شاہ تغلق نے یہ شاہ رکن عالم کو دے دیا۔ یہ کہانی بے سرو پا ہے کہ شاہ رکن عالم کی قبر فوٹ صاحب کے قریب تھی۔ انہوں نے کسی کو خواب میں کہا کہ ہم اس بے ادبی کے متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے شاہ رکن عالم غیاث الدین کے مقبرہ میں چلے گئے۔ موجودہ شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔ ابن بطوطہ نے ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر راوی کو عبور کیا تھا۔ وہ اسے سندھ کا دارالخلافہ لکھتا ہے۔

لے سلاطین مالوہ۔ ہندو تارہ بچوں اور قدیم داستانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے ایک رشی مہاباہ نے آتش کدہ قائم کر کے پرستش کا آغاز کیا۔ بدھ مذہب کے پیروار نے اس عبادت کو جبراً بند کر دیا۔ کیونکہ یہ لوگ آگ میں انسانوں کو جلیا کرتے تھے۔ مہاباہ کی دماغ سے اس آتش کو میں سے ایک انسانی جسم نمودار ہوا۔ اس نے تخت حکومت پر بیٹھ کر دوبارہ برہمن مذہب کو رواج دیا۔ اس نے دکن سے آکر مالوہ کو پائے تخت بنایا۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)



اس کے مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ اور اپنے بیٹے سید علاؤ الدین کو حملہ کرنے کے لیے شہر سے باہر بھیجا۔ محمود خلجی نے اپنے بیٹوں غیاث الدین اور مدن خاں کو اس کے مقابلہ پر متعین کیا۔

(بقیہ حاشیہ سلاطین مالوہ صفحہ گزشتہ) اور دہلی نام سے حکومت کی۔ اس کی پانچویں پشت میں راجپوت راج لاولد مر گیا۔ اس کا جانشین آدت پنوار ہوا۔ اس شخص نے پنوار خاندان کی حکمرانی کا آغاز ہوتا ہے۔ پنوار کے بعد گندھرب راجہ بنا۔ اس کو ہندو اوتار اور دیوتا بھی سمجھتے ہیں۔ گندھرب کا فرزند بکرماجیت ہے جو مشہور فاتح گندھار ہے۔ اسی راجہ سے ہندوؤں کا سن بکرمی شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد مشہور راجہ چندر پال گوراسنہ بکرمی میں راجہ بھوج تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں علم و فضل کی بڑی ترقی ہوئی، پانچ سو اہل علم اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان میں ایک عالم برہمچاری دوسرا دھن پال گوراسنہ ہے۔ جس نے بے شمار دلچسپ کتابیں لکھی ہیں۔ بھوج کے بعد اس کا لڑکا جے چند حکمران ہوا۔ اس کے بعد پنوار خاندان سے حکومت تو نور خاندان کے مورث جتپال نے حاصل کرنی۔ اس خاندان کے آخری راجہ کنور پال کے بعد حکومت کی، باگ چولہاں خاندان کے ماتھے آگئی۔ مالدیو کے عہد میں شیخ شاہ نے غرنی سے آکر مالوہ فتح کیا۔ اس کا لڑکا علاؤ الدین اس کا جانشین بنا۔ پھر مانک دیو جو مان کی اولاد ہے، ایک شخص جیت پال نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ راجہ پترسین کے عہد میں جلال الدین افغان نے حکومت ہندوؤں سے چھین لی۔ پھر پترسین کا لڑکا کھروک سیر مالوہ پر قابض ہو گیا۔ سنت شگھ کے عہد میں دکن سے شہزادہ بہادر شاہ نے حملہ کر کے راجہ کو قتل کر دیا اور مالوہ فتح کر کے دہلی پہنچ گیا۔ لیکن سلطان شہاب الدین نے اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن نے فیروز شاہ تغل کو مالوہ دہلی کے ماتحت رہا، اس کے بعد سلطان محمود کا مالوہ کا صوبہ دار دلاور خاں غوری اس کے مرتے ہی خود مختار ہو گیا۔ اس وقت گجرات کا صوبہ دار ظفر خاں ملتان کا خضر خاں، جون پور کا خواجہ برور بھی باغی بن بیٹھے تھے۔ دلاور خاں کے بعد مالوہ پر اس کا لڑکا اب خاں سلطان ہوشنگ کے لقب سے حکمران ہوا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دوا دیا تھا۔ سلطان مظفر گجراتی نے ہوشنگ پر حملہ کر کے اسے گرفتار کر لیا۔ اور مالوہ پر اپنے بھائی ناصر خاں کو مقرر کر دیا۔ یہ شخص ظالم تھا اس لیے رعایا نے بغاوت کر کے ہوشنگ کے چچا زاد بھائی موسیٰ کو بادشاہ بنایا۔ سلطان مظفر نے ہوشنگ کو رہا کر کے اسے موسیٰ کے مقابلہ پر بھیجا۔ ہوشنگ نے موسیٰ کو شکست دی اور دوبارہ حکمران بنا۔ مظفر شاہ کے مرتے پر اس نے گجرات پر حملہ کر دیا۔ لیکن سلطان احمد گجراتی کے مقابلہ میں ہر مرتبہ شکست کھائی۔ ہوشنگ نے مبارک شاہ بن خضر خاں حاکم دہلی، ابراہیم شرقی جون پور، سلطان احمد دکن سے بھی لڑائیاں لڑیں۔ ہوشنگ کے بعد اس کا لڑکا نصیر خاں محمد شاہ کے خطاب سے تخت پر بیٹھا۔ ہوشنگ کے چھوٹے بھائی محمود خاں نے محمد شاہ کو زہر دوا دیا اور محمود شاہ کے لقب سے حکومت سنبھال لی۔ بدایونی نے اس کو محمود خلجی لکھا ہے۔ اس نے بھی سلطان احمد گجراتی، سلطان محمد بن مبارک شاہ دہلی، سلطان حسین شرقی جون پور اور رانا کو بنا سے لڑائیاں لڑیں۔ اس کے پاس خواجہ جلال الدین الہ آباد، سلطان ابوسعید مرزا حاکم خراسان کے سفیرین کرائے تھے۔ محمود شاہ ایک مرتبہ رانا سانگا کے ہاتھوں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ لیکن رانا نے اسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا۔ جب محمود نے بہادر شاہ گجراتی پر حملہ کیا تو شکست کھا کر قید ہو گیا، جا پانیر کے راستہ میں قتل کر دیا گیا اور مالوہ گجرات کے تخت آگیا۔ ہمایوں کے عہد تک یہ گجرات کے تخت تھا۔ ہمایوں جب آگرہ واپس ہوا تو مالوہ میں ایک شخص ملو نے قادر خاں کے لقب سے سلطان مالوہ ہونے کا دعویٰ کیا۔ شیر شاہ کے عہد میں مالوہ کا صوبہ دار شجاعت خاں تھا جو سلیم شاہ کے عہد میں خود مختار ہو گیا اور سارنگ خاں کے نام سے حکمران ہوا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا بابزید خاں بہادر کے نام سے حکمران ہوا۔ اس کے زمانہ میں اکبر نے مالوہ فتح کر لیا۔ نربدا، سپرا، کالی سندھ، بیتیا، کودی یہاں کے خاص دریا ہیں۔ نہایت سرسبز شاداب علاقہ ہے۔ جمیل اور چمکائی بکثرت ہیں۔ زراعت کے لحاظ سے بھی زرخیز ہے۔ گیہوں، خشکاش، گنا، آم، خربوزہ، انگور کی پیداوار ہوتی ہے۔ پانچویں مشہور تھے۔ اجین گروہ، بیجا گروہ، دھاراجیر اس صوبہ میں شامل رہے ہیں۔ مالوہ کے متعلق ایک مختصر نوٹ ہم پہلے بھی لکھ آئے ہیں۔

دونوں فوجوں میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ آخر محمود خلجی نے صلح کر لی اور لوگوں سے یہ بہانہ کر کے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مالوہ پر بڑی تباہی آگئی ہے۔ راتوں رات دہلی کا میدان چھوڑ کر مالوہ کی طرف کوچ کر گیا۔ بہلول لودھی نے اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کا کافی مال و اسباب لوٹ لیا۔ یہ کامیابی چونکہ بہلول لودھی کی کارگزاری سے حاصل ہوئی تھی۔ اس لیے محمد شاہ نے فتح کے انعام میں اسے لاہور اور دیپال پور جاگیر میں عطا کیے۔

۷۵۰ھ میں محمد شاہ نے دوبارہ سامانہ کا رخ کیا۔ اور بہلول لودھی کو جسرت کے مقابلہ پر نصرت بہلول لودھی کا دہلی پر حملہ کر کے دہلی لوٹ آیا۔

جسرت نے بہلول کے ساتھ ساز باز کر لی اور اسے سلطنت دہلی کے سبز باغ دکھا کر قسمت آزمائی پر آمادہ کر لیا۔ بہلول کے دل میں بھی بادشاہت کی امنگ لہر لینے لگی اور اس نے اپنی برادری کے تمام پٹھانوں کو ہر طرف سے اپنے پاس بلایا۔ کئی ایک پرگنوں پر قبضہ جمایا اور محمد شاہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے دہلی پر لشکر لے کر آیا۔ بہلول کافی عرصہ تک دہلی کا محاصرہ کیے وہاں پڑا رہا لیکن اس کی تگ و دو کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور دہلی میں داخل ہونے کی کوئی راہ پیدا نہ ہوئی اور اسے مجبوراً محاصرہ اٹھا کر لوٹ جانا پڑا۔

اسی دوران میں محمد شاہ بُری طرح بیمار ہو گیا۔ اس کی علالت کی وجہ سے موقع پا کر ہر طرف سلطان محمد شاہ کی وفات لوگ باغی ہو گئے۔ یہاں تک کہ دہلی سے بیس کوس تک کے امیروں نے بھی اس کے حلقہ اطاعت کو نکال پھینکا اور خود مختار بن بیٹھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر محمد شاہ نے اپنے بیٹے علاؤ الدین کو جس کی بدایوں میں جاگیر تھی اور جو اس وقت شکار کے لیے پہاڑوں پر گیا ہوا تھا دہلی بلا کر اپنا ولی عہد بنالیا۔ سلطان محمد شاہ اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکا۔ ۷۵۰ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت کی۔ اس کی سلطنت چودہ سال چار ماہ رہی۔

## علاؤ الدین بن محمد شاہ

محمد شاہ کی وصیت کے مطابق اسی سال علاؤ الدین نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ ملک بہلول اور دوسرے امیروں نے اس سے بیعت کر لی۔

علاؤ الدین اپنے باپ سے کہیں زیادہ غافل اور لاپرواہ تھا۔ اس کی سستی اور غفلت کو بہلول لودھی کے منصوبے دیکھ کر ملک بہلول کی نیت پھر بدلنے لگی۔ اور وہ جی جی میں اپنی بادشاہت کے منصوبے بنانے لگا۔

۷۵۰ھ میں سلطان علاؤ الدین بیانہ کے ارادہ سے روانہ ہوا لیکن کسی نے راستہ ہی میں یہ افواہ پھیلا دی کہ جو نپور کا بادشاہ دہلی پر حملہ کے لیے آرہا ہے۔ علاؤ الدین نے کوتاہ اندیشی کے باعث اس خبر کی تحقیق نہ کرائی اور اُسٹے پاؤں دہلی لوٹ آیا۔

۱۵۸۷ء میں بادشاہ نے بدایوں کا سفر کیا۔ اسے بدایوں کچھ ایسا پسند آیا کہ اسنی جگہ مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور ایک عمارت کی بنیاد رکھ کر وہی لوٹ آیا۔

۵۲ھ میں اپنے ایک سائے کو کوئوالی شہر اور دوسرے کو میرگو مقرر کر کے دوبارہ بدایوں گیا۔ اس کے پیچھے ان دونوں بھائیوں نے ایسے فتنے برپا کیے کہ شہر والے ان سے تنگ آ گئے اور ہجوم کر کے ان کو قتل کر دیا۔

بہلول لودی کا دہلی پر قبضہ | بادشاہی امرا نے بھی سرکشی اختیار کر لی۔ عمدۃ الملک حسام خاں نے جو بادشاہ کے سامنے بے جھجک کھڑی کھڑی کہنے کا عادی تھا اور اسی وجہ سے بادشاہ کی خفگی سے دوچار رہتا

تھا اور اسے اپنے عہدہ سے بھی معزول ہونا پڑا تھا۔ حمید خاں نے جو بادشاہ کی سزا سے ڈر کر دہلی بھاگ آیا تھا، متفق ہو کر  
ہلول لودی کو بادشاہ تسلیم کر لیا اور لودی نے سرہند میں شاہی خطاب تجویز کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور ایک بھاری  
شکر کے ساتھ آکر دہلی پر بے روک ٹوک قبضہ کر لیا۔

علاؤ الدین شاہ کی بے نیازی | بہلول لودھی نے دہلی میں اپنے ایک نائب کو متعین کر کے مزید لشکر فراہم کرنے کے لیے دیپال پور کا عزم کیا لیکن ساتھ ہی ایک منافقانہ عریضہ علاؤ الدین کے پاس روانہ کر دیا کہ ”میں آپ کا فرماں بردار غلام ہوں اور یہ ساری کارروائی مجھے آپ کی خیر خواہی میں کرنی پڑی ہے۔“

علاؤ الدین شاہ بھی کچھ نرا لے مزاج کا بادشاہ تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ”میں کونسا سلطان ابن سلطان ہوں۔ محمد شاہ مرحوم نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا تھا اس لیے بادشاہ بن گیا۔ اب میرے پاس بادشاہی کا ساز و سامان نہیں اس لیے میں بدایوں پر ہی صبر و قناعت کرتا ہوں۔ باقی سلطنت سے تیرے حق میں سکدوش ہو جاتا ہوں۔“

اس خط کے ملنے پر مزید تنگ و دو کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس لیے بہلول لودی دیپال پور سے لوٹ کر دہلی آیا اور بلا کسی مزاحمت اور جھگڑے کے تخت دہلی پر جلوس کر کے مفت میں ہندوستان کا بادشاہ بن گیا۔ سلطان علاؤ الدین بہلول لودی کی اجازت سے بدایوں میں گنگا کے کنارے تک اور دامن کوہ سے خیر آباد تک کے پرگنوں پر قابض رہا۔ اس علاقہ میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

۱۷ سرہند۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں صوبہ دہلی کے تحت اس کو ایک "سرکار" بتایا ہے۔ اور صرف یہ لکھا ہے :- ایک بڑا شہر ہے حافظ رخنہ کے باغات سے بڑا اچھا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اس سرکار کے تحت ۳۱ محال اور پرگنہ تھے۔ یہ شہر ریاست پٹیالہ میں لدھیانہ و انبالہ کے درمیان راجپورہ سے ۱۶ میل پر ہے۔ آبادی قدیم اور تاریخی واقعات کی درد انگیز یادگار ہے۔ آخری مغل عہد میں سکھوں نے اسے لوٹ کر تباہ کر دیا تھا۔ قدیم عمارتوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ "باغ عام خاص" گذشتہ عظمت کی روتی ہوئی یادگار ہے۔ قریب ہی شاہی زمانہ کا چھوٹا سا قلعہ بھی ہے۔ ایک چھوٹے موضع ڈیرہ میں دسویں گورد و گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کی "سمادھ" سکھوں کی زیارت گاہ ہے۔

سرمہند کی اہمیت مسلمانوں کے نزدیک حضرت شیخ مجدد الف ثانی کے مزار کی وجہ سے ہے۔ یہ مشہور نقشبندی بزرگ گزرے ہیں۔  
 تلمذ مورخوں کے ایک قول کے مطابق اس کا باپ محمد شاہ مبارک شاہ کالہ کا نہیں تھا۔ بلکہ فرید خاں بن خضر خاں کالہ کا تھا۔

سلطان علاؤ الدین کی وفات | سلطان علاؤ الدین اپنی اس مختصر سی سلطنت میں مگن کافی عرصہ زندہ رہا۔ یہاں تک کہ سات سال چند ماہ کی حکمرانی کے بعد ۵۵۵ھ میں وہ عالم بقا کی طرف سدھار گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی سلطنت ایک نئے خاندان میں منتقل ہو گئی۔



# خاندان لودی

## سلطان بہلول بن کالا لودی

محمد شاہ کے عہد میں سلطان بہلول کو خان خاناں کا خطاب ملا ہوا تھا۔ سلطان علاؤ الدین کی دست برداری کے بعد وہ حمید خاں کے تعاون سے ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔

اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ عہدۃ الملک حسام الدین اور حمید خاں نے بادشاہ کے خلاف دہلی میں سازش کی تھی۔ سلطان علاؤ الدین نے حسام الدین کو قتل کر دیا تھا لیکن حمید خاں بہلول لودی کو بادشاہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ حمید خاں نے حسام الدین کے قتل کے بعد دہلی میں علاؤ الدین کے گھرانہ پر قبضہ کر لیا تھا اور جب بہلول دہلی آیا تو قلعہ کی کنجی اس کے حوالہ کر دی۔ اس کی نمک حرامی بہت جلد اس کے سامنے آگئی اور بہلول نے اس کے احسان کا یہ بدلہ دیا کہ اسے قید میں ڈال دیا اور بے کھٹکے اپنی بادشاہی کا نقشہ جمایا۔ اور اسی سال ملتان کے بندوبست کے لیے روانہ ہو گیا (بہلول لودی کی تخت نشینی سے) ملک پر افغانوں کا تسلط ہو گیا۔

لہ بہلول لودی۔ یہ شخص سلطان شہ لودی کا بھتیجا اور شاہو نیل قبیلہ کا رکن تھا۔ سلطان شہ کا باپ قلوٹ سے ملتان آکر تجارت کرنے لگا۔ یہ سلطان محمود کا زمانہ تھا۔ سلطان شاہ نے خضر خاں کی ملازمت اختیار کی۔ سرہند جاگیر اور اسلام خاں خطاب ملا۔ سلطان شہ لودی کے بھتیجے کا فرزند بہلول تھا جو نہایت غربت کی حالت میں سرہند پہنچا۔ سلطان شہ نے اسے اپنا فرزند بنالیا۔ بہلول ملتان میں پیدا ہوا تھا اسکی ماں حاملہ تھی کہ مکان کا شہتیر گرنے سے مر گئی۔ مردہ ماں کا پیٹ چاک کر کے اسے نکالا گیا تھا۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں سے ایک درویش نے کہا کون شخص دہلی کا تخت اتنی رقم کے عوض خریدنے کو تیار ہے؟ سب ہنسنے لگے۔ لیکن بہلول نے خوشی سے اتنی رقم درویش کو دے دی۔ کہتے ہیں اسی فقیر کی دعا سے وہ اس مرتبہ پر پہنچا۔ لہ افغان۔ یہ قوم ہمیشہ سے وحشی اور ساجد رہی ہے۔ سلاطین غور اور غزنوی کے زمانہ میں یہ خوار و زبون حالت میں رہی۔ لودی قوم کے لوگ افغان ہونے سے منکر ہیں اور اپنا سلسلہ نسب شاہ غم خاک تاندی سے جوڑتے ہیں۔ لیکن لودی اور غزنوی دونوں قبیلے سماء جنوبی و دختر بیٹ افغانی کی نسل سے ہیں۔ اس سے قبل کابل کے حاشیہ میں ہم نے تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ افغانوں میں اسلام کس طرح داخل ہوا۔ وہ حاشیہ زیادہ تر ابو الفضل (آمین اکبر) کے حوالوں پر مشتمل ہے۔ محمد تاسم مصنف تاریخ فرشتہ نے جو تفصیل لکھی ہے اس کا اختصار یہاں بیان کیا جاتا ہے تاکہ لودیوں کے اصل نسب کی وضاحت ہو جائے۔

واقعہ یہ ہے ۸۳۵ھ میں حضرت عثمان کے زمانہ میں فارس کے مرتدوں کی سرکوبی کے لیے عبداللہ بن عامر نے فوج کشی کی۔ ۸۳۵ھ میں سعید بن العاص نے طبرستان، جرجان، استرآباد کو فتح کیا۔ ۸۳۵ھ میں عبداللہ بن عامر کے ہراول حنیف بن قیس نے سیستان، قزستان، نیشاپور فتح کیا اور طوس سے ۷۰ کر بلخ تک کا علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۸۳۵ھ میں بلخ کی مہم پر عبدالرحمن بن ربیعہ مامور ہوئے۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ۸۳۵ھ میں امیر معاویہ کے زمانہ میں فریاد بن امیہ وائی بصرہ کی نگرانی میں عبدالرحمن بن شمر نے کابل فتح کیا۔ اسی زمانہ میں ملہب بن ابی صفہ (ایک عرب سردار نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ ۸۳۵ھ یزید کے زمانہ میں یزید بن زیاد نے کابل کے باغیوں پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ اس کے بعد طلحہ بن عبداللہ بن حنیف (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

۱۵۶۷ء میں علاؤ الدین کے امیروں کی سازش سے سلطان محمود شرقی نے دہلی کا محاصرہ کر لیا۔  
**محمود شرقی کا دہلی پر حملہ** | اس مرتبہ بھی بڑی سخت جنگ ہوئی۔ مقابلہ میں محمود کا دست راست فتح خاں ہروی مارا گیا۔

اس کی ہلاکت سے محمود کے حوصلے پست ہو گئے اور مقابلہ کی تاب نہ لا کر وہ جون پور لوٹ گیا۔ دوسرے سال وہ تیاری کر کے پھر جون پور سے نکلا اور دہلی کے ارادہ سے اٹا وہ تک پہنچ گیا۔ اس مرتبہ فریقین میں اس شرط پر صلح ہو گئی کہ دہلی کے وہ پرگنے جو مبارک شاہ کے قبضہ میں تھے سلطان بہلول کے ہوں گے اور جن پرگنوں پر سلطان ابراہیم شرقی قابض تھا وہ محمود کے قبضہ میں رہیں گے۔ ایک اور شرط یہ تھی کہ شمس آباد بھی جہاں محمود کا نائب جو ناخاں رہتا تھا، موسم برسات کے بعد بہلول کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اس قرارداد پر دونوں فریق اپنے اپنے علاقہ کو لوٹ گئے۔

**شمس آباد پر قبضہ** | شرائط صلح کے بموجب برسات کے بعد بہلول نے شمس آباد پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں کی حکومت بھوگاؤں کے حاکم رائے کرن کے سپرد کر دی۔ محمود کو بہلول کی یہ کارروائی شاق گزری۔ اس نے شمس آباد کے نواح میں بہلول کے لشکر سے لڑائی پھیر دی۔ لیکن اسی دوران میں وہ فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد شاہ جونپور کا سلطان بن گیا اور وہ صلح کی سابقہ شرائط پر راضی ہو کر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

**بہلول کا جون پور پر حملہ** | جون پور کی اس لشکر کشی کے موقع پر بہلول کے چچا قطب خاں کو محمد شاہ کے لشکر نے قید کر لیا تھا۔ اپنے چچا کو قید سے چھڑانے کے لیے بہلول نے عہد شکنی کی۔ اور محمد شاہ کی سرحدوں

دقیقہ حاشیہ افغان صفحہ گذشتہ اخزاعی نے کابل پر کامیاب حملہ کیا، اس کے بعد کابل کے حاکم خالد بن عبداللہ مقرر ہوئے۔ ان کو حجاج بن یوسف نے معزول کر دیا اور یہ ملتان اور پشاور کے درمیان کوہ سلیمان پر جا کر بس گئے اور وہاں کے ایک پٹھان سردار کے نکاح میں اپنی لڑکی دے دی۔ اس سے دو لڑکے ہوئے ایک لودھی اور دوسرا سورا۔ لودھی اور سوری قوم انہی دو کی اولاد ہیں۔ مطلع الانوار کے مصنف نے ان کی نسل کا ایک اور سلسلہ بتایا ہے۔ جسے فرشتہ نے بھی نقل کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ جب نیل میں فرعون غرق ہوا تو قطبیوں کی ایک جماعت جلاوطن ہو کر کوہ سلیمان میں آکر بس گئی اور یہاں ان کا قبیلہ افغان کہلایا۔ افغان کوہ سلیمان سے محمد بن قاسم ثقفی کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے اور کرناچ پشاور شہر ان میں مقیم ہوئے۔ لہم پور کے راجہ نے ان پر دو تین بار حملہ کیا اور خلیج غور اور کابل کے مسلمانوں نے اس کے مقابلہ میں ان پٹھانوں کی مدد کی۔ ان لڑائیوں کے زمانہ میں جب کوئی ان پٹھانوں سے پوچھتا "کوہستان کے مسلمانوں کا کیا حال ہے؟" تو یہ کہتے "کوہستان نہ کوہ فغانستان" کہو کیونکہ بحر فغان و فریاد کے وہاں کچھ اور نہیں۔ اس وقت سے ان کے مقام کو افغانستان اور ان کو افغان کہا جانے لگا۔ ہندوستان والے ان کو پٹھان کہتے رہے۔ اس کی وجہ فرشتہ نے بیان کی ہے کہ جب یہ قوم ہندوستان میں پہنچنے کے بعد پٹنہ میں جا کر مقیم ہوئی تو ان کا نام پٹھان پڑ گیا۔ راجہ جے پال نے غزنویوں کے حملہ کو روکنے کے لیے پٹھانوں کی مدد لی اور شیخ حمید نامی سردار کو بلغان اور ملتان کا بندوبست سپرد کیا۔ اس وقت سے پٹھان اقتدار و حکمرانی کی طرف مائل ہوئے۔ فرشتہ کا ہم عصر مولف خواجہ نعمت اللہ بن خواجہ حبیب اللہ ہروی مصنف "تاریخ مخزن افغانی" جس نے سلسلہ جہانگیر کے عہد میں خان جہاں لودھی کی سفارش پر فرزند ہی کا خطاب پایا تھا وہ ان کو قبیلے کے بجائے بنی اسرائیل ثابت کرتا ہے کہ جس وقت نجات نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر دیا تو بنی اسرائیل کی ایک شاخ جلاوطن ہو کر کوہ سلیمان میں آکر بس گئی۔ انکی زبان سریانی تھی۔ کوہ و صحرا کے قیام کے اثر سے بدلتے بدلتے پشتون گئی۔ یہی مصنف ان کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ فتح مکہ کے دن قیس عبدالرشید کی بہادری پر خوش ہو کر حضور اکرم نے اسے "جہاز کی بنیادی لکڑی" کہا تھا۔ اس لکڑی کو جہازوں کی اصطلاح میں پٹھان کہتے ہیں۔ انہی قیس عبدالرشید کے بیٹوں سرنی، ثنی، غرضی اور کراں کے خاندان سے پٹھانوں کے مختلف قبیلوں کا تعلق ہے۔

پر حملہ کر دیا۔ محمد شاہ بھی جون پور سے نکل کر شمس آباد پہنچا اور اسے ہندو حاکم سے چھین لیا۔ راپری کی سرحد پر بہلول کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر قنوج کی طرف بھاگ گیا۔ بہلول بھی اس کے تعاقب میں لگا رہا۔

**سلطان حسین اور بہلول کی صلح** | ادھر محمد شاہ، بہلول سے اپنا پیچھا پھڑانے کی فکر میں تھا کہ جون پور میں اس کا بھائی حسین شاہ امرار سے سازش کر کے بادشاہ بن گیا۔ اور ایک بھاری لشکر بھیج کر اس نے گنگا کے کنارے راج گڑھ میں محمد شاہ کو قتل کرادیا۔ اس کے بعد سلطان حسین نے جون پور سے بہلول کے چچا قطب خاں کو بلایا اور اسے گھوڑا اور خلعت عطا کر کے سلطان بہلول کے پاس بھیج دیا۔ اور از سر نو بہلول سے صلح کر لی۔ پھر جون پور سے قنوج کی طرف کوچ کیا۔

بہلول نے بھی سلطان حسین کے بھائی جلال خاں کو جسے اس نے قطب خاں کے عوض گرفتار کر رکھا تھا، نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ سلطان حسین کے پاس بھیج دیا۔

**تین سالہ التوائے جنگ** | صلح کی یہ حالت کئی سال قائم رہی۔ پھر سلطان حسین اور بہلول کے مابین چند و در کی سرحد پر لڑائی ٹھن گئی۔ یہ لڑائی زیادہ طول نہیں پکڑی اور تین سال تک کے لیے دونوں کے درمیان التوائے جنگ کا معاہدہ ہو گیا کہ تین سال بعد دونوں مقابلہ کریں گے۔ اس لڑائی کے موقع پر حاکم بیانہ احمد خاں جلوانی سلطان حسین کا حامی بن گیا۔ اور اس نے اس کے نام کا خطبہ پڑھا۔

**سلطان حسین کا دہلی پر حملہ** | جب التوائے جنگ کی یہ تین سالہ مدت گزر گئی تو سلطان حسین ایک لاکھ سوار ایک ہزار ہاتھی اور بڑا ساز و سامان لے کر دہلی پر حملہ کرنے نکلا۔ بھتوارہ کے مقام پر بہلول کے لشکر سے مقابلہ ہوا۔ لیکن اس بار بھی مصالحت ہو گئی۔ اور سلطان بہلول دہلی کو، سلطان حسین اٹافے کو لوٹ گئے۔

دونوں بادشاہوں کے یہ دم خم تھے۔ اور مضحکہ انگیز بات یہ تھی کہ ان دونوں کی حدود سلطنت بس سات منزل کی مسافت تک ہی تھیں۔

**سلطان حسین کا بدایوں پر قبضہ** | اسی سال بدایوں میں سلطان علاؤ الدین انتقال کر گیا۔ اس کی بیٹی ملکہ جہاں سلطان حسین کے نکاح میں تھی۔ علاؤ الدین کے انتقال پر سلطان حسین بدایوں آیا اور اسے علاؤ الدین کے بیٹوں کے قبضہ سے نکال کر اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ پھر سنبھل پہنچ کر وہاں کے حاکم تاتار خاں کو قید کر کے سامن بھیج دیا۔

**دہلی پر دوسرا حملہ** | ذی الحجہ ۷۸۵ھ میں سلطان حسین نے ایک بھاری لشکر کے ساتھ دہلی کا قصد کیا۔ اور جہنا کے کنارے کچھ کے گھاٹ پر منزل کی۔

سلطان بہلول سہرند سے کوچ کر کے دہلی پہنچا۔ اور خان جہاں کے بیٹے حسین خاں کو میزبانی سے بلا کر سلطان حسین کے مقابلہ پر متعین کیا، لیکن جنگ نہیں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی قطب خاں نے بیچ بچاؤ کر کے اس شرط پر صلح کرادی کہ گنگا دونوں کے

درمیان حد رہے اور اس کنارے تک سلطان حسین اور اس کنارے تک سلطان بھول قابض رہے۔

**بھول کی عمدہ شکنی** | سلطان حسین صلح کر کے اپنے ملک کو لوٹ گیا۔ اور مصالحت کے بھروسہ پر اس منزل پر اپنا لہو بہت سا مال و اسباب چھوڑ گیا۔ سلطان بھول نے اس کے پیٹھ پھیرتے ہی دغا پر کمر باندھ لیا اور اس کا چھوڑا ہوا سارا سامان لوٹ لیا۔ ہاتھیوں گھوڑوں پر لدا ہوا اس کا کچھ خزانہ بھی مالی غنیمت میں بھول لے گیا۔

**نوید خرابی** | سلطان حسین کے چالیس امیر جن میں اس وقت کے مشہور عالم قاضی سماء الدین جن کا خطاب قتلغ خاں تھا شامل تھے بھول کے لشکر میں قید ہو گئے۔ بھول نے قتلغ خاں کو طوق و زنجیر پہنا کر قطب خاں کے سپرد کر دیا اور خود لشکر کے تعاقب میں دو آبہ میں شمس آباد تک گیا۔ اس وقت شمس آباد سلطان حسین کے قبضہ میں تھا۔ بھول نے وہاں قبضہ کر کے اپنا عامل مقرر کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۵۵۷ء میں پیش آیا اس کا مادہ تاریخ ہے "نوید خرابی"۔ سلطان حسین نے بھول کے تعاقب سے تنگ آکر راپری کی سرحد پر مقابلہ کا ارادہ کیا۔ لیکن فریقین میں از سر نو مصالحت ہو گئی اور طے پایا کہ دونوں اپنے اپنے قدیم علاقوں پر قابض رہیں۔

**سلطان حسین کی سپائی** | اس صلح کے بعد حسین نے نقص عمدہ کیا۔ اور شمس آباد میں لشکر جمع کر کے سلطان بھول کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ موضع سونہار کے قریب بڑے معرکہ کی لڑائی ہوئی۔ سلطان حسین کو بڑی طرح شکست ہوئی: اور اس کا خاصا مال و اسباب لودیوں کے ہاتھ لگا۔ اس کامیابی سے لودیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

دریں اثنا دہلی میں خان جہاں کا انتقال ہو گیا۔ تعزیت کے لیے سلطان بھول دھوپا منوسے دہلی میں آیا۔ اور اس کے بیٹے کو خان جہاں کا عہدہ دے کر واپس چلا گیا۔

**راپری کا معرکہ** | راپری میں سلطان حسین سے اس کی ایک اور لڑائی ہوئی۔ اس بار بھی سلطان حسین شکست کھا کر بھاگا۔ اس بھاگم بھاگ میں سلطان حسین کے گھرانہ کے کچھ لوگ جنہاں ڈوب گئے۔ قوم بھدرویہ کے شہنشاہ نے بھی اس کی بھاگتی ہوئی فوج کو خوب لوٹا۔

سلطان حسین بھاگ کر گوالیار گیا۔ حاکم گوالیار رائے کبیر سنگھ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اور بطور پیشکش بہت سا نقد روپیہ مال و جنس، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے دیئے۔ اور بہت سی فوج اس کے ہمراہ کر دی۔ خود بھی کاپی تک اس کے ساتھ گیا۔

**کاپی کا معرکہ** | سلطان بھول بھی اس کا تعاقب کرتا ہوا کاپی پہنچ گیا۔ کاپی کی حدود پر فریقین میں پھر لڑائی ہوئی اور یہ مقابلہ کاپی کا معرکہ کافی عرصہ تک ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں بکسر کے حاکم رائے تلوک چند نے سلطان حسین کی خدمت میں آکر اس کے لشکر کو ایک پایاب مقام سے گنگا عبور کرا دیا۔ سلطان حسین مزید مقابلہ کی ہمت نہ پا کر پٹنہ چلا گیا۔ وہاں کے راجہ بھی

(دعاشیہ برصغیر اکبر)



بڑھ کر استقبال کیا اور بہت سائنہ مال و جنس اور ہاتھی نندہ دیئے اور اسے جون پور پہنچا دیا۔  
**دیس بھول لودھی کا جون پور پر حملہ** سلطان بھول نے ان لڑائیوں کا قصہ یکسر ختم کرنے کے لیے جون پور کی  
 قوتوں پہنچا اور وہاں رہب کے کنارے سلطان بھول سے مقابلہ کیا۔ حسب سابق اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔  
 اور لودیوں نے اس کی بادشاہی کا سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔

سلطان حسین کی بیوی ملکہ جہاں بی بی خوترا جو علاؤ الدین کی بیٹی تھی لودیوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئی۔ بھول نے  
 اسے بڑی عزت و عفت کے ساتھ رکھا اور جب اس نے دوبارہ جون پور پر حملہ کیا تو وہ کسی تدبیر سے نکل کر اپنے  
 شوہر کے پاس پہنچ گئی۔

لے حاشیہ پٹنہ صنفہ گزشتہ لے پٹنہ (عظیم آباد) دریائے گنگا کے کنارے بدھوں کی مشہور زیارت گاہ ہے، ۵ میل پر ہے۔ قدیم ہندو دور  
 کا مشہور شہر پانلی پترا جو گدھ دیس کا پایہ تخت رہ چکا ہے اسی مقام پر آباد تھا۔ مغل دور میں یہ حاکم نشین جگہ تھی۔ اورنگ زیب کے  
 پوتے عظیم الشان نے اپنی منوبہ داری کے زمانہ میں اس کا نام عظیم آباد رکھا۔ شہر تین آبادیوں پر مشتمل ہے۔ پٹنہ، بانکی پور اور دانا پور۔  
 پٹنہ قدیم شہر ہے یہ تینوں مقام دو دو میل کے فاصلہ پر ہیں۔ اس وقت اس کی آبادی ڈیڑھ پونے دو لاکھ ہوگی۔ پٹنہ کا بازار وسیع ڈیڑھ  
 دو میل لمبا ہے۔ یہاں ”مدرسہ مسجد“ کے نام سے ایک مسجد ہے۔ دریا کے کنارے بڑی عمدہ عمارت ہے۔ نواب سیف خاں اور نواب ہیبت  
 جنگ کی تعمیر کردہ ہے۔ اس کا مادہ تاریخ ہے ”مجموعہ غیر دنیا“ سکھوں کے آخری گورو گوہند سنگھ صاحب متونی ۱۸۶۰ء کی جائے پیدائش ہے۔  
 ان کی مولد گاہ اب ”ہر مندر“ کہلاتی ہے اور سکھوں کی زیارت گاہ ہے۔ شہر سے باہر شیر شاہ کی مسجد پٹنہ کی تمام عمارتوں میں قدیم عمارت ہے۔ ایک  
 بزرگ شاہ ارزاں کی درگاہ بھی زیارت گاہ ہے۔ یہ بزرگ پشاور کے رہنے والے تھے۔ فرخ سیر کے زمانہ میں یہاں آکر بس گئے۔ ان کے علم و فضل کا  
 بڑا اچھا تھا۔ فرخ سیر نے ان کی درگاہ کے معارف کے لیے پچاس ہزار سالانہ کے اوقاف مقرر کیے تھے جو انگریزوں کے عہد تک بھی جاری رہے  
 اب نہیں معلوم کیا صورت ہے۔ ایک عجیب و غریب عمارت گودام غلہ ہے۔ گنبد نما عمارت ہے جس کی بلندی نوے فٹ اور اندرونی قطر ایک سو دس  
 فٹ ہے۔ ۱۸۹۹ء میں قحط کے زمانہ کے لیے غلہ جمع کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اس میں ۳۵ لاکھ من غلہ ذخیرہ ہو سکتا ہے۔ لیکن زمانہ تعمیر سے  
 اب تک اس میں غلہ جمع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے باہر کی طرف چکر دار زینہ ہے۔ اس چھت پر سے سارے پٹنہ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک  
 اور دلچسپ جگہ گلزار باغ ہے۔ جس میں انگریزی حکومت نے افیون کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ بانکی پور کا اصل نام باقی پور ہے۔ مشہور ”پٹنہ لائبریری“  
 اسی جگہ ہے۔ یہ کتب خانہ خان بہادر مولوی خدابخش صاحب کا قائم کردہ ہے جو مشائخہ میں فوت ہوئے۔ اس لائبریری میں عربی فارسی کی قدیم خوشخط  
 اور مٹلا کتابیں بکثرت ہیں۔ کئی ایک کتابیں نایاب اور نوادرات میں سے ہیں۔ بعض کتابوں پر بادشاہوں کی دستخطی یادداشتیں بھی درج ہیں۔  
 خان بہادر حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کے کتب خانہ کی فہرست اس زمانہ میں پانچ چھ سو صفحات پر طبع ہوئی تھی۔ ہندوستان  
 کے مشہور مدرسہ سید علی امام بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ مولوی قاری شاہ سلیمان صاحب پھلواڑی کے سجادہ نشین کے وعظ و تقریر  
 کی بھی بڑی شہرت رہی ہے۔ پھلواڑی پٹنہ سے ۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ شاہ صاحب کا ایک۔ نموں نے ندوۃ العلماء میں دیا تھا ۲۰ سالہ  
 تہذیب الاخلاق مسکنہ کے پرچہ میں نظر سے گزرا ہے۔

سلطان بھلول نے جون پور پہنچ کر قبضہ کر لیا اور وہاں مبارک خاں نوخانی کو متعین کر کے بدایوں آیا۔ لیکن جیسے ہی بھلول جونپور سے رخصت ہوا سلطان حسین موقع پا کر جونپور میں داخل ہو گیا اور بھلول کے امیر وہاں سے بھاگ کر قطب خاں کے پاس مہولی چلے گئے اور سلطان حسین سے مصالحت کی گفت و شنید کرتے رہے۔ اس اشار میں ان کی کمک کے لیے سلطان بھلول نے اپنے بیٹے بارک شاہ کو روانہ کیا اور خود بھی اس کے پیچھے جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔

بھلول کی آمد سے سلطان حسین گھبرا کر بہار چلا گیا۔ جب بھلول قصبہ بلہری میں پہنچا تو اسے قطب خاں | **جون پور پر قبضہ** | کے انتقال کر جانے کی اطلاع ملی۔ بھلول نے اپنے چچا کے مراسم تعزیت ادا کیے اور اس کے بعد جون پور میں خاتمانہ شان سے داخل ہوا۔

بھلول نے جون پور کے تخت پر اپنے بیٹے بارک کو بیٹھایا اور خود کالپی چلا گیا۔ یہ علاقہ اپنے بھتیجے اعظم بہایوں کو جس کا اصل نام خواجہ بایزید تھا تفویض کیا۔ وہاں سے دہلی پور پہنچا۔ وہاں کے راجہ سے کئی من سونا نذرانہ لے کر باری سے ہوتا ہوا رنٹھنبور کے علاقہ پالھن پور گیا اور اسے پامال و غارت کر کے دہلی لوٹ آیا۔ کچھ دن بعد بھلول نے حصار فیروزہ کا سفر کیا اور وہاں مختصر سے قیام کے بعد دہلی واپس آ گیا۔ دہلی سے سلطان نے گوالیار کی طرف بھی کوچ کیا۔ وہاں کے راجہ مان سے اس وقت کے مروجہ اسی لاکھ ٹکے پیش کش وصول کر کے اور گوالیار کی حکومت اسی کے نام بحال کر کے واپس ہوا۔

سلطان بھلول گوالیار سے اٹا وہ کی راہ دہلی واپس جانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے صحیح | **سلطان بھلول لودی کی وفات** | سلامت دہلی واپس جانا نصیب نہیں ہوا۔ جب وہ قصبہ سکیٹ میں پہنچا تو بیماری اس کے لیے سوبان روح بن گئی۔

سلطان بھلول نے ۸۹۴ھ میں اڑتیس سال آٹھ مہینے آٹھ دن حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔

لے سلطان بھلول کا نسب نامہ مختصراً ہم لکھ آئے ہیں، مزید تفصیل درج ذیل ہے۔  
بھلول بن کالا بن ملک موحی برادر ملک بہرام بن یاسین بن ملک شامو بن اسحاق بن عمر بن یرنگی بن سپان بن لودی بن مسماہ منوبی بن دختر شیخ پنٹ و زوجہ شاہ حسین بن شاہ معز الدین محمود بن جمال الدین حسین بن سلطان بہرام غور بن سلطان جلال الدین بن فریدوں بن بھتو بن سلطان اقبال بن طغرل بن سلطان بزرگ بن جمشید تگین بن بہمن بن افراسیاب بن طہماسپ بن فریدوں رشید بن اسفندیار بن طغرل تگین بن داراب بن فعال بن نور بن اسکندر بن تماسب بن خسرو بن مندر بن ایام بن کاؤس بن زہراب بن کامیاب بن گوردز بن فرامان بن سلامان بن جمشید بن ہرمز بن قیاد بن بہرام بن مناسب بن تورج بن زمرزد بن آذر دشت بن ارسلان بن ضحاک بن ماران بن اش بن ارم بن سام بن مہرنوح علیہ السلام۔

یہ نسب نامہ پٹانوں کے حاشیہ نشین مؤرخوں کی تاریخوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ چنداں قابل اعتبار نہیں۔ بھلول کا چوتھا نورث ملک شامو تاجر تھا۔ افغانستان سے ہندوستان اسباب تجارت لایا کرتا تھا۔ وہ مراٹو اس کا لڑکا یا سین یی کام کرتا رہا۔ اس کے تین لڑکے ملک بہرام۔ ملک محمود، ملک موحی یی کام کرتے رہے۔ ملک بہرام ان کا پیشوا کرتا تھا۔ ہندوستان کے امرا سے اس کی جان بچان ہو گئی۔ ایک بار اپنے بھائیوں سے ناراض ہو کر حاکم ملتان کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ اس کا بھائی بھی فیروز شاہ کے زمانہ میں جعدار کے عہدہ پر مامور ہوا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ ہے)

بہ ہشصد و نو دو چار رفت از عالم      خدیو ملک ستان و جہاں کشا بملول  
بہ تیغ ملک ستان بود یک دفع اجل      بود محال بہ شمشیر و خنجر معقول

## سلطان سکندر بن بہلول لودی

سلطان بہلول لودی کے انتقال کی خبر جب اس کے بیٹے نظام خاں کو ملی تو وہ اسی وقت دہلی سے کوچ کر کے قصبہ جلالی میں شکر سے آملا اور باپ کی نعش دہلی کو روانہ کی۔

**سکندر کی تخت نشینی** | نظام خاں نے جمعہ کے دن سلطان فیروز کے قصر میں جو کالی ندی کے کنارے ہے اپنا خطاب سلطان سکندر رکھ کر تخت سلطنت پر جلوں کیا۔ مشہور ہے کہ جب وہ دہلی سے چلنے لگا تو حضرت شیخ سمار الدین کنبو کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ حضرت شیخ جمالی کے پیر تھے۔ اور اس عہد کے بڑے عالم و بزرگ سمجھے جاتے تھے۔ شہزادہ نے ان سے ”اسعدک اللہ“ کے معنی پوچھے۔ انہوں نے فرمایا ”تجھ کو اللہ تعالیٰ نیک نجت کرے“ شہزادہ نے عرض کیا ”زبان مبارک سے تین مرتبہ یہی ارشاد فرمائیے“۔ شیخ نے تین بار اس کی تکرار کی تو شہزادہ نے اٹھ کر کہا ”میری مراد برآئی“ اور شیخ سے اپنے لیے دعا کر کے شکر کی طرف گیا۔

**باربک شاہ سے مقابلہ** | جب سلطان سکندر کی بادشاہت اچھی طرح جم گئی تو اس نے دہلی سے راپڑی اور اٹاواہ کی طرف کوچ کیا۔ اس علاقہ میں وہ سات ماہ تک ٹھہرا اور اس دوران میں اپنے بھائی باربک شاہ سلطان جونپور کے پاس اسماعیل خاں نوخانی کو مصالحت کا پیغام دے کر بھیجا۔ خود بتیالی کے حاکم عیسیٰ خاں پر حملہ کر دیا۔ مقابلہ میں عیسیٰ خاں نے زخمی ہو کر اطاعت کر لی لیکن وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور مر گیا۔ بتیالی کا راجہ رائے گنیش جو باربک شاہ کا حامی تھا سکندر سے مل گیا اور سکندر نے اسے بتیالی کی حکومت پر بحال رکھا۔

دقیقہ حاشیہ بہلول کا نسب نامہ صفحہ گذشتہ) جب خضر خاں اور ملو اقبال کی لڑائی ہوئی تو ملو اقبال خاں بہرام کے بھتیجے ملک شہ کے ہاتھ سے مارا گیا اور خضر خاں نے ملک شہ کو سرہند کی حکومت عطا کر دی۔ اس کے پاس افغان جوق درجوق آکر ملازم ہو گئے۔ اور اُس وقت سے ہندوستان کے امور سلطنت میں ان کا اثر و نفوذ شروع ہوا۔

سلطان بہلول پابند شریعت اور سادگی پسند تھا۔ علماء و مشائخ کا احترام کرتا تھا۔ سخت کوش اور منصف مزاج تھا۔ لیکن پٹھانوں کی دعا اور عمدہ شکنی کی صفت اس میں بھی تھی۔

لے شیخ سمار الدین سروردی سے مراد ہے۔ یہ مخدوم جہانیاں کے پوتے سید کبیر الدین اسماعیل کے خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری و باطنی دونوں پر عبور حاصل تھا۔ رانیور اور بیانہ میں عرصہ تک مقیم رہے پھر دہلی آکر متوطن ہوئے۔ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور بغیر علاج ہی بصارت لوٹ آئی۔ ”منہاج الاسرار“ ان کی تصنیف ہے۔ شیخ فخر الدین عراقی کے لمعات پر بڑے عمدہ حواشی لکھے ہیں۔ سلطان بہلول اور سلطان سکندر شیخ کے معتقد تھے۔ سکندر کے زمانہ میں، اجمادی الاول ۸۹۴ھ میں وصال فرمایا۔ ان کی کرامات بڑی مشہور ہیں۔

باربک شاہ مصالحت پر راضی نہیں ہوا اور شکرے کر جون پور سے قنوج آیا۔ اسی جگہ دونوں بھائیوں میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باربک کا طرف دار امیر مبارک خاں نوخانی گرفتار ہو گیا اور باربک بدایوں بھاگ گیا۔ سکندر نے پیش قدمی کر کے بدایوں کا محاصرہ کر لیا۔ باربک مجبور ہو کر اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سکندر نے باربک کا اچھی طرح سے خیر مقدم کیا اور اسے تسلی دلا سادے کراپے ساتھ جون پور لے گیا۔ حسب سابق اسے مملکت شرقی کا حکمران بنا دیا۔ لیکن جون پور کے سارے پرگنے اپنے امیروں میں تقسیم کر دیئے اور ہر جگہ اپنی فوج متعین کر دی۔ کاپی سے اعظم خاں ہمایوں کو معزول کر دیا۔

اس انتظام کے بعد سکندر چھترہ گیا اور وہاں سے گوالیار پہنچا۔ خواجہ محمد علی فرہلی کو خلعت خاص دے کر اپنا وکیل بنایا اور اسے راجہ مان کے پاس بھیجا۔ راجہ نے بھی اظہار اطاعت کے لیے اپنے بھتیجے کو بادشاہ کی خدمت میں بھیجا اور وہ بیان تک بادشاہ کے ساتھ رہا۔

جب سکندر شاہ بیان پہنچا تو سلطان شرق حاکم بیانہ جو سلطان احمد جلوانی کا بیٹا تھا حاضر خدمت ہوا۔ اس نے بیانہ کی تسخیر | قلعہ و بیانہ کی کنجی سکندر کے گماشتوں کے حوالہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور بیانہ واپس جا کر قلعہ بند ہو گیا۔

یہاں سے سلطان سکندر آگرہ گیا۔ جہاں سلطان الشرق کا عزیز بیت خاں جلوانی موجود تھا۔ وہ سکندر کی سرحد پر قلعہ آگرہ میں قلعہ بند ہو گیا۔ سکندر نے چند امیروں کو آگرہ پر متعین کیا اور خود بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ ۳۹۷ء میں جب سلطان الشرق بالکل ہی مجبور ہو گیا تو ہتھیار ڈال دیئے اور پناہ طلب کر کے قلعہ بیانہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ سکندر نے بیانہ کی حکومت خان جہاں فرہلی کے حوالے کر دی۔

اسی سال جون پور میں بچگوتی قوم نے بغاوت کی۔ اور تقریباً ایک لاکھ سوار اور پیادے بچگوتی قوم کی بغاوت | جمع کر کے فساد برپا کر دیا۔ ان کی سرکوبی کے لیے سکندر نے جون پور کا رخ کیا۔ باربک نے آگے بڑھ کر سلطان کا استقبال کیا۔ یہاں سے سکندر کچھ دن کے لیے سیر و شکار کی غرض سے اودھ چلا گیا۔ پھر لوٹ کر جون پور کا قصد کیا۔

جب سکندر جنجھار کے قلعہ پر پہنچا تو سلطان حسین شرقی کے امیروں نے اس سے مقابلہ کیا۔ سکندر نے ان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ وہ قلعہ بند ہو گئے۔ سکندر نے ان کے محاصرہ کی فکر نہ کی۔ بلکہ سیدھا الہ آباد کے قریب باریل چلا گیا۔ اور اس علاقہ کو بری طرح پامال کر کے کڑھ اور مانگ پور کے راستہ ولسو کا رخ کیا۔ وہاں سے شمس آباد آیا۔ وہاں وہ چھ ماہ تک ٹھہر رہا پھر سنبھل جا کر شمس آباد کو لوٹ آیا۔

۳۹۸ء میں برسات کے بعد سکندر شاہ نے پٹنہ پر لشکر کشی کی۔ اور وہاں کے سرکشوں کی گوشمالی پٹنہ اور بہار پر فوج کشی | کر کے جونپور واپس ہوا۔ اس سفر میں اتنے گھوڑے مرے کہ دس میں سے بس ایک زندہ رہا۔

اس کے لشکر کو اس مشکل میں گرفتار دیکھ کر پٹنہ کے زمینداروں نے سلطان حسین شرقی کو عرفیہ بھیج کر بلایا۔ سلطان حسین ایک



برہم دی جمیعت فراہم کر کے سکندر پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔

جب سکندر کو اس کی خبر ملی تو وہ گنگا عبور کر کے جنبھار پہنچا اور وہاں سے بنارس آیا۔ سلطان حسین نے بھی یلغار

ملکہ بنارس۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں صوبہ الہ آباد کے تحت اس کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے ”بارانسی جسے عام طور پر بنارس کہتے ہیں، دو دریاؤں یعنی برہم دی اور اس کے درمیان واقع ہے۔ اس لیے اسے بارانسی کہتے ہیں۔ قدیم کتابوں میں اس کا نام کاشی لکھا ہے۔ یہ شہر کمان کی شکل میں آباد ہے۔ جس میں سے دریائے گنگا چلے کے طور پر گزرتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں ایک بت خانہ تھا جس کا طواف کیا جاتا تھا۔ عرصہ دراز سے یہ شہر ہندوستان کا علمی مرکز ہے۔ طالب علموں کے گروہ کے گروہ دور دراز مقامات سے یہاں تحصیل علم کے لیے آتے ہیں اور بے حد خلوص و محنت کے ساتھ علم حاصل کرتے ہیں۔ شاہجہان نے سلطان محمود غزنوی نے اس شہر پر حملہ کیا۔ لاکھوں میں دوسرا حملہ کیا۔“

بنارس جو پورے ۲۵ میل پر ہے۔ ہندوؤں کے سات تیرہ مشہور ہیں (۱) اجودھیا، جہاں رام چندر جی پیدا ہوئے (۲) متھرا، جہاں سری کرشن نے جنم لیا۔ (۳) مایا یعنی ہردوار (۴) کاشی (۵) کانچی جو دکن میں ہے (۶) اونٹ کا پوری یعنی اجین (۷) دوارا یعنی دوار کا دھوالہ سفر نامہ رائے بہادر نے (۸) این چند، ان سات تیرہوں میں بنارس تیسرا اہم تیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں غالباً اس سے زیادہ قدیم شہر نہیں ہوگا۔ ہندو اسے سورگ کا دروازہ سمجھتے ہیں اور مرنے سے پہلے وہاں اشتنان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ بدھ بھی بنارس کو مقدس جانتے ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے گوتم بدھ نے اپنا سب سے بڑا وعظ اسی جگہ کیا تھا اور اس کو مرکز بنا کر یہاں سے لٹکا، جاپان، چین، برہما، تبت اور نیپال میں مبلغ بھیجے تھے۔ ابوالفضل نے بنارس پر محمود غزنوی کے حملہ کا ذکر کیا ہے۔ بدراؤنی مصنف ہذا نے بنارس پر حملہ کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسری تاریخوں میں سلطان محمد غوری کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے ۱۱۹۳ء میں بنارس پر حملہ کیا تھا اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ کیوں کہ محمود کا نجر سے ہی واپس چلا گیا تھا۔

بنارس کی آبادی تین لاکھ سے زیادہ ہی ہوگی۔ مکانات عالی شان، عمارتیں خوش وضع ہیں۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی اور رونق رہتی ہے۔ راتے بہت تنگ ہیں۔ بنارس کی چار چیزیں خطرناک ہیں۔ ایک حسین عورتیں، دوسرے مست سانڈ، تیسرے تنگ زینے، چوتھے مکار سنیا سی۔ چنانچہ

سور ہے ۷ رانڈ، سانڈ، سیرھی، سنیا سی ان سے بچے سو پیوے گا سی

بنارس مندروں کا شہر ہے، ہر جگہ ہادیو کے شوالے نظر آتے ہیں، وسط شہر میں ویشیترجی کا مشہور مندر ہے جو کاشی و شونایتھ یعنی کل دنیا کے مکملاتے ہیں۔ اس کا گنبد سونے کا ہے۔ اس کے آگے پرانے مندر سے ملی ہوئی اورنگ زیب کی بلند و عالی شان مسجد ہے۔ اس مندر کو اورنگ زیب یہاں کے پجاریوں کی دھاراشکوہ کے ساتھ سازش کی وجہ سے منہدم کر دیا تھا اور مسجد تعمیر کروائی تھی۔ مندروں کے اس شہر میں جو کُل کا کُل خانہ معلوم ہوتا ہے، اس مسجد کا بلند مینار انگشت شہادت کی طرح توحید کا اعلان کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مان مند میں راجہ جے سنگھ کے درختانہ منتر ہے۔ اب تک اس کے آلات درست حالت میں رکھے ہوئے ہیں۔ دریا کے کنارے سنگین سیرھویوں کے بیسیوں گھاٹ ہیں۔ پراشتان اور پوجا پاٹ ہوتا ہے۔ صبح اشٹان کا نظارہ بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی لیے ”صبح بنارس“ مشہور ہے۔ ساحل پر نیپالی مندروں کا ہر ایک مسجد قابل دید ہیں۔ مندر لکڑی کا ہے جس پر مرد عورت کی فحش تصویروں کی منبت کاری ہے۔ مسجد کے مینار ڈیڑھ سو فٹ اونچے ہیں۔ سنسکرت اور شاستروں کی تعلیم کا یہ مرکز رہا ہے۔ بنارس کے پنڈت ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ شیخ محمد علی ایرانی نے جن کا تخلص ”نقا“ بنارس اور وہاں کے برہمن زادوں کے متعلق کہا تھا ہے

از بنارس نروم معبد جام بہت این جا ہر برہمن پسر بچہن و رام است این جا

دباقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

کرتے ہوئے بنارس کا رخ کیا۔ لیکن ابھی بنارس سے ۸۰ کوس پر ہی تھا کہ سکندر برقی بے اماں کی طرح اس کے سر پر جاگرا۔ راستہ میں پٹنہ کا راجہ سالباہن بھی سلطان حسین سے کٹ کر سکندر کے پاس آگیا۔ یہ لڑائی بھی سلطان حسین ہار گیا۔ اور پٹنہ کی طرف سے پابروا شتہ بھاگ نکلا۔ سکندر نے ایک لاکھ سواروں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ سلطان حسین بہار کی طرف نکل گیا ہے۔ بغرض سکندر نویں دن اس کے تعاقب سے لوٹ کر لشکرگاہ میں آگیا اور بہار پر حملہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔

سلطان حسین کو جب بہار پر اس کی فوج کشی کی اطلاع ملی تو وہ بہار میں اپنے ایک نائب کو چھوڑ کر کھل گاؤں ضلع لکھنوتی چلا گیا۔ سکندر نے حملہ کر کے بہار پر قبضہ کر لیا۔ پھر وہاں سے آگے بڑھ کر تربت کو فتح کیا۔ پٹنہ میں خواجہ جہاں نے انتقال کیا۔ اور اس کے بڑے بیٹے احمد خاں کو اعظم خاں بہایوں کا خطاب ملا۔ تربت میں سلطان سکندر حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی زیارت کے لیے گیا۔ اُن کی زیارت سے فارغ ہو کر درویش پور میں آیا۔ وہاں سے شاہ بنگالہ علاؤ الدین پر فوج کشی کی۔ بہار کے نواح میں علاؤ الدین کا بیٹا دانیال اس کے مقابلہ پر آیا۔ آخر دونوں میں صلح ہو گئی۔ اور اپنے اپنے ملک کی طرف واپس ہو گئے۔

اس سال شاہی لشکر قحط و تنگ دستی میں بُری طرح مبتلا ہو گیا۔ اور بادشاہ نے ہر طرف فرمان بھیج دیا کہ غلہ کی زکوٰۃ بند رکھی جائے۔ سکندر حدو بنگالہ سے لوٹ کر سارن پہنچا۔ اور اس علاقہ کو

## قحط اور تنگ دستی

(بقیہ حاشیہ بنارس صفحہ گزشتہ) یہاں کے مشہور کالج کوئینز کالج اور ہندو کالج ہیں۔

شہر سے تین چار میل کے فاصلہ پر سارناتھ بدھ مذہب کی ایک عمارت ہے۔ جو کسی بدھ بھکشو کا مرقداً معبد تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ سارناتھ ہی وہ جگہ ہے جہاں ہاتما بدھ نے پہلا وعظ کیا تھا۔

لے تربت۔ ابوالفضل آئین اکبری میں صوبہ بہار کے تحت اسے ایک سرکار لکھتا ہے۔ لیکن اس نے اس کا تلفظ "تربت" کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ یہ مقام بے حد قدیم زمانہ سے ہندی علوم کا مرکز ہے۔ آب و ہوا عمدہ ہے۔ یہاں وہی ایک سال تک خراب نہیں ہوتا۔ امیر اگر دودھ میں پانی ملا تا کہ توغیب سے اُسے سزا ملتی ہے۔ یہاں کے بھینسے بڑے طاقتور ہوتے ہیں اور شیر پر حملہ کرتے ہیں۔ تالاب بکثرت ہیں۔ ایک تالاب کا پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔ اس کی گہرائی بے اندازہ ہے۔ بیس کوس تک نارنگی کے کھیت ہیں۔ بارش میں ہرن، بارہ شگھا اور شیر آبادی میں آجاتے ہیں۔ شہر والے ان کا شکار کر کے ہاتھ پر توڑ کر ایک چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ بعد میں حسب ضرورت ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ساتویں صدی کے بزرگ ہیں۔ شہر بہار سے جو اس وقت ضلع پٹنہ میں معمولی قصبہ ہے، ساٹھ میل مغرب کی طرف منیر ایک قدیم بستی ہے۔ اس کا صحیح تلفظ پریش نہیں بلکہ زبر سے ہے۔ آپ اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ قصبہ بہار میں آپ کا مزار ہے۔ آپ کا اصل نام مخدوم شرف الدین احمد تھا۔ آپ کے مزار پر ہر سال عرس میں ہزاروں معتقدین جمع ہوتے ہیں۔ ان کے علم و فضل کا بڑا شہرہ تھا۔ صاحب قلم بزرگ تھے۔ مکتوبات و ملفوظات کے مجموعہ کا نام "معدن المعانی" ہے۔ اس کے علاوہ "ارشاد اسالکین" شرح ادب المریدین، انکی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ وہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید تھے۔ دہلی نظام الدین اولیاء کی ملاقات کے لیے گئے تھے۔ لیکن اُن کا وصال ہو چکا تھا۔ جب وطن واپس ہوئے تو بہار میں کوہ راج گیر پر عرصہ تک ریاضت کی۔ صاحب معارج الولاہ کی ایک روایت کے مطابق ان کی وفات پٹنہ میں فیروز شاہ کے عہد میں ہوئی۔

لے سارن۔ اکبر کے زمانہ میں یہ صوبہ بہار کی سرکار تھا۔ جس کے تحت، اپر گئے تھے۔ (ابوالفضل آئین اکبری)

تقسیم کر کے اپنے امیروں کے حوالے کر دیا۔ شاہی لشکر سارن سے براہ ہلی گڑھ جون پور پہنچ گیا۔ جہاں چھ ماہ تک ٹھہرا رہا۔ جون پور سے سکندر نے دوبارہ پٹنہ پر لشکر کشی کی اور سنہ ۳۰۹ء میں پٹنہ سے باندھو گڑھ کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر ڈالا۔ البتہ وہاں کے مستحکم قلعوں کو ناقابل تسخیر سمجھ کر فتح کیے بغیر ہی جون پور واپس چلا گیا۔

**امیروں کی سازش** | جون پور کے امیروں میں کسی کھیل کے دوران اختلاف ہو گیا اور قتل و خون تک نوبت پہنچ گئی۔ سکندر اپنے ان جھگڑالو امیروں سے بدگمان ہو گیا۔ اور اپنی حفاظت کے لیے خاص خاص بھروسہ کے لوگوں کو متعین کر دیا۔ یہ محافظ دستہ ہتھیار باندھے رات بھر بادشاہ کی حفاظت کرتا تھا۔

سکندر نے ناراض ہو کر جن امیروں کو معزول کر دیا تھا انہوں نے ایکار کے سلطان بھول کے بیٹے فتح خاں کو سلطنت کے لیے اکسایا۔ فتح خاں سادہ لوح آدمی تھا۔ اس نے اپنی ماں شیخ طاہر اور بادشاہ کے معتمد امرار سے اس سازش کا ذکر کر دیا۔ اور ترغیب دینے والے امیروں کے نام بھی ظاہر کر دیئے۔ ان سب نے فتح خاں کو اس خام خیالی سے منع کیا اور اسے اچھی طرح سمجھا بجا کر ایسے کسی اقدام سے روک دیا اور خود کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے سلطان سکندر سے بھی اس کا تذکرہ کر دیا۔ سکندر نے بروہی حکمت عملی سے کام لے کر ان مفسد امیروں کو منتشر کر دیا۔

**حاکم دہلی کی سرکشی** | سنہ ۳۰۹ء میں سکندر سنبھل آکر ٹھہرا۔ پورے چار سال یہاں سیر و شکار، تفریح اور عیش و عشرت میں گزار دیئے۔

سکندر کو عیش و عشرت میں مشغول دیکھ کر سنہ ۳۰۵ء میں دہلی کے حاکم اصغر نے بغاوت کر دی۔ سکندر نے سنبھل سے ماچھی وارہ کے حاکم خواص خاں کے نام فرمان بھیجا کہ ”اصغر کو گرفتار کر کے ہمارے حضور میں بھیج دو۔“ خواص خاں فرمان شاہی کی تعمیل میں روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اصغر نے خود ہی سنبھل پہنچ کر اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ اس کی جگہ سلطان نے خواص خاں کو دہلی کا حاکم مقرر کر دیا۔

اسی سال حاکم بیانہ خان خاناں فرملی فوت ہو گیا۔ کچھ دنوں تک بیانہ پر اس کے بیٹے عماد اور سلطان متعین رہے پھر ان دونوں کو خدمت شاہی میں طلب کر لیا گیا اور بیانہ کا قلعہ خواص خاں کے سپرد ہو گیا۔ اگرہ صفر خاں کو تفویض کیا گیا۔

**دھول پور کی مہم** | خواص خاں نے حاکم میوات عالم خاں نوخانی اور خان خاناں نوخانی کو اپنی کمک پر ساتھ لے کر دھول پور پر فوج کشی کی۔ دھول پور کے راجہ نے جم کر مقابلہ کیا۔ اس رڑائی میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد

لے دھول پور۔ اگرہ سے ۳۴ میل پر یہ ایک ریاست کا صدر مقام ہے۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں سرکاراگرہ کے تحت اسے ایک محال لکھا ہے اور صرف اتنا لکھا ہے کہ ”یہ ایک قلعہ دریائے چنبل کے کنارے ہے۔“ دریائے چنبل کے کنارے اس کی آبادی دراصل راجہ دھولن کی یادگار ہے۔ چنبل حاصل پور مالوہ سے نکل کر کاپی کے قریب جنائیں مل جاتی ہے۔ دھولن نے اس شہر کو گیارہویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ سلطان سکندر لودی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ سوٹھویں صدی عیسوی میں ہمایوں نے چنبل کے سیلاب سے حفاظت کی خاطر آبادی کو شمال کی طرف منتقل کر دیا۔ اس کی موجودہ حیثیت ایک قصبہ کی ہے۔ آبادی تقریباً بیس ہزار ہوگی۔ ہندی اور (باقی صفحہ آئندہ پر)

شہید ہوئی۔ جب سکندر کو خبر ملی تو وہ لشکر لے کر ان کی کمک پر دھول پور آیا۔ شاہی لشکر کی آمد پر دھول پور کا راجہ مانک دیو قلعہ چھوڑ کر گوالیار بھاگ گیا اور اس علاقہ میں لوٹ مار غارت گری شروع کر دی۔

سکندر ایک ماہ تک دھول پور میں رہا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے گوالیار پہنچا اور وہاں آدم لودی کو متعین کر کے چنیل ندی کو عبور کیا اور میندی کے کنارے لشکر گاہ قائم کی۔ وہاں آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے لشکر میں وبا پھیل گئی۔ اس انتشار میں گوالیار کے راجہ نے صلح کر لی اور بادشاہ کے لشکر سے بھاگے ہوئے امیروں سعید خاں، بابو خاں اور رائے گنیش وغیرہ کو جو گوالیار میں پناہ لیے بیٹھے تھے اپنے قلعہ سے باہر کر دیا اور اپنے بڑے بیٹے کو بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلطان نے اسے گھوڑا اور خلعت عطا کر کے واپس کر دیا۔ وہ وہاں سے آگرہ چلا گیا۔ اور دھول پور کی حکومت مانک دیو کے نام دوبارہ بحال کر دی۔ سکندر نے پورا موسم برسات آگرہ ہی میں بسر کیا۔

سنت ۹۱۰ھ میں آگرہ سے کوچ کر کے قلعہ مندرائیل پر لشکر کشی کی۔ وہاں کے رائے نے امان لے کر قلعہ چھوڑ دیا۔ سکندر نے قلعہ میں داخل ہو کر وہاں کے سارے بت خانے توڑ دیے۔ وہاں سے لوٹ کر دھول پور کے قلعہ کو از سر نو تعمیر کرایا اور وہاں سے آگرہ چلا گیا۔

آگرہ پہنچ کر سلطان سکندر نے اپنے تمام امیروں کو لشکر سے چھٹی دے کر ان کو متعلقہ جاگیروں پر رخصت کر دیا۔ اسی سال (سنت ۹۱۰ھ) میں سید محمد جون پوری نے انتقال فرمایا۔ یہ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی کامل تھے۔ انہوں نے امام مہدی ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ جب وہ حج سے لوٹ رہے تھے تو شہر فرہ میں خالق

(بقیہ حاشیہ دھول پور صفحہ گزشتہ) اردو عام طور پر بولی جاتی ہے۔ ریاست کے دفتر اور راجہ کے محل نئی آبادی میں ہیں۔ شہر سے باہر مسجدوں، مساجد اور مقبروں کے آثار ہیں۔ صادق محمد خاں کا مقبرہ قدیم صناعی کا نمونہ ہے۔ یہ اکبر کا جرنیل تھا اور پلٹنیر میں فوت ہوا۔ دو میل کے فاصلہ پر جیل چکنڈ ہے۔ جس کے گرد چند عمدہ مندر ہیں۔ مویشیوں اور گھوڑوں کی تجارت کا مرکز ہے۔ دھولپور کا حکمران خاندان بروڈیا کوت کے جاٹ ہیں جو پٹے گوہر کے رانا کہلاتے تھے۔ گوالیر بھی ان کے ماتحت تھا۔ مرہٹوں نے اس ریاست کو ختم کر دیا تھا۔ انگریزوں کے عہد میں رانا کیرت سنگھ نے دوبارہ یہ ریاست قائم کی۔ اس کے بیٹے بھگوت سنگھ نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ اس کا پوتا رانا ناہاں سنگھ ۱۸۵۷ء میں انگریزی رسالہ کامیجر تھا۔ آخری فرماں روا رانا رام سنگھ ایک علم دوست آدمی گورا ہے۔

ریاست کا رقبہ ۱۱۹ میل ہے۔ آبادی تین لاکھ کے قریب ہے۔ جس میں مسلمان صرف ۷ فی صد ہیں۔ آمدنی نو لاکھ روپیہ سالانہ تھی یہاں کاسنگ پور مشہور ہے۔

اے سید محمد جون پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام یوسف تھا۔ ایک مجتہد شیخ دانیال کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ سید محمد کے متعلق مشہور ہے کہ حالت سکر میں "انامدی" کا نعرہ لگایا تھا۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد دعویٰ مہدیت سے توبہ کر لی اور مہدی موعود کے آنے کا اقرار کیا۔ لیکن حملہ کرنے ان کو مہدی موعود نہ ملا اور ایک نیا فرقہ مہدی کے نام سے پیدا ہو گیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ انہوں نے جو اپنے آپ کو مہدی کہا تھا اس سے مہدی موعود مراد نہیں تھا بلکہ صرف ہادی اور رہنما کہنا چاہتے تھے۔ حضرت نے اپنے پیروؤں کو بہت سمجھایا اور مہدی کہنے سے منع کیا لیکن وہ اس عقیدہ پر اسی طرح قائم رہے۔ سید محمد نے اصلاحی تحریک بھی شروع کی تھی اور اس سلسلہ میں اربابِ اقتدار سے انکی مکر بھی ہوئی۔ ایک قول کے مطابق انکی وفات ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ بدلاؤ کا سنہ ۱۸۵۷ء میں معلوم ہوتا ہے۔



حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تاریخ وفات قاضی حسین زرگر قندھاری نے لکھی ہے۔  
 گفتا کہ بروز شیخ کن استفسار  
 شیخ مبارک نے مادہ تاریخ نکالا۔ ”مضامہ ہدی“

**تباہ کن زلزلہ** | ۱۱۹۷ھ ۳ صفر کو سارے ہندوستان میں ایسا سخت زلزلہ آیا کہ پہاڑ تک دہل گئے اور بڑی بڑی عمارتیں  
 زمین دوز ہو گئیں۔ جا بجا زمین شق ہو گئی اور درخت اکھڑ کر دور دور تک جا گرے۔ لوگ یہ دیکھ کر سمجھے  
 کہ بس قیامت آگئی۔ بابر کی تاریخ اور دوسری تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دن یہ زلزلہ صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ  
 دوسرے ملکوں میں بھی آیا تھا۔ اس زلزلہ کی تاریخ لفظ ”قاضی“ سے نکلتی ہے۔  
 قطعہ :-  
 در نہ صد و احدی عشر از زلزلہ ہا  
 گردید سوادِ آگرہ چوں مرحلہا  
 با آنکہ بنا باش بسے عالی بود  
 از زلزلہ شد عالیہا سا فلہا

کہتے ہیں از آدم تا این دم ایسا زلزلہ کبھی نہیں آیا۔

**اونت گردہ اور زور کی فتح** | ۱۱۲۷ھ میں سلطان سکندر نے اونت گردہ کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس  
 محاصرہ میں سلطانی فوج کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ لیکن فتح سلطان کو حاصل ہوئی۔  
 وہاں کے محصور ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا۔ چونچے وہ اپنے اہل و عیال سمیت خود جل کر مر گئے۔ سلطان نے وہاں کے بت خانے  
 توڑ کر مسجدیں تعمیر کرائیں۔

**۱۱۳۷ھ میں زور کے قلعہ پر چڑھائی کی۔** راستہ میں جلال خاں لودی نے اپنے سواروں اور پیادوں کی ایک بڑی  
 جمعیت بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی۔ سکندر کو اس کی یہ کارگزاری کہ اتنی بڑی جمعیت اس نے اپنے گرد اکٹھی کر لی تھی۔  
 کچھ پسند نہ آئی اور اس نے اس جمعیت کو منتشر کر کے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ اوسکر میں بھیج دیا۔ زور کے محصورین نے  
 امان مانگ کر مصالحت کر لی۔

**نعمت خاتون** | ۱۱۳۷ھ میں زور کے اطراف ایک اور حصہ تعمیر کرایا تاکہ قلعہ اور زیادہ مستحکم ہو جائے۔ اسی دوران میں  
 قطب خاں کی بیوی نعمت خاتون سکندر سے ملنے کے لیے آئی۔ سلطان نے شہزادہ جلال خاں کو دو سو گھوڑے  
 اور پندرہ ہاتھی دیئے۔ نعمت خاتون کے ساتھ اسے کاپی کو روانہ کیا اور وہ علاقہ شہزادہ کی جاگیر میں دے دیا۔

**۱۱۵۷ھ میں سلطان لہار سے کوچ کر کے ہنکات اور وہاں سے آگرہ روانہ ہوا۔** راستہ میں جگہ جگہ تھانے  
 مقرر کیے۔ اس کے آگرہ پہنچنے کا مادہ تاریخ ہے۔

”وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ“

اسی سال مالوہ کے سلطان ناصر الدین کا نواسہ اپنے نانا کے خوف سے بھاگ کر سکندر کے پاس پناہ لینے آیا۔ بادشاہ نے

چندیری اس کی جاگیر میں عطا کیا اور شہزادہ جلال خاں کو اس کی مدد اور تعاون کی تاکید کی۔  
 ۱۵۰۰ء میں سکندر نے آگرہ سے دھول پور تک جگہ جگہ عمارتیں بنوائیں اور باغات لگوائے تاکہ اس نواح میں سیر و  
 شکار اور آرام کرنے کی سہولتیں موجود رہیں۔

**محمد خاں ناگوری کی اطاعت** | اسی سال محمد خاں ناگوری نے بھی اطاعت قبول کر لی۔ اس کی ساری قوم پہلے ہی سے  
 سکندر سے مل گئی تھی۔ اور اب اس کے لیے اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا  
 اس نے اپنے ملک میں سلطان سکندر کے نام کا خطبہ بھی شروع کر دیا۔ اور بغیر کسی جنگ کے یہ علاقہ سکندر کی سلطنت میں  
 شامل ہو گیا۔

جس وقت سکندر اونت گردھ کی مہم پر گیا تھا اس نے خان خاناں فرہلی کے بیٹے سلیمان کو نوپری کی طرف روانہ کیا تھا۔  
 لیکن یہ تعیناتی اس نے قبول نہیں کی تھی اور ٹال مٹول کرتا رہا تھا۔ اس سال سکندر نے اس حکم عدولی کے جرم میں اسے  
 معزول کر دیا۔ البتہ اندری کرناں کا پرگنہ اس کی معاش کے لیے دے دیا۔ وہ اسی جگہ جا کر مقیم ہو گیا۔  
**چندیری کا الحاق** | مالوہ کے سلطان محمود کی سلطنت روبہ زوال ہو چکی تھی۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بھت خان  
 مالوی نے چندیری کو سلطان سکندر کے حوالہ کر دیا۔ اور وہاں سکندر کے نام کا خطبہ شروع کر دیا۔  
 اس خوش خبری کے فرمان اور فتح نامے ہر طرف بھیجے گئے۔ سلطان سکندر نے سلطان ناصر الدین کے پوتے محمود خاں کو پہلے  
 شہر چندیری میں نظر بند کر دیا تھا بعد میں چندیری اس کو تفویض کر کے اسے بحال کر دیا۔ البتہ احتیاط کے لیے اس پر اپنے  
 گماشتوں کو متعین کر دیا۔

**سید نعمت اللہ حسینی** | چندیری کے انتظام کے بعد بادشاہ نے بیانہ کا سفر کیا۔ اور وہاں کے علماء و فضلا کی خدمت  
 میں حاضری دی۔ بیانہ میں سید نعمت اللہ حسینی سے جو بڑے مانے ہوئے بزرگ اور صاحب  
 کشف و کرامات تھے سلطان سکندر کو بڑی عقیدت تھی، اکثر وہ ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔

**دولت خاں کی اطاعت** | قلعہ رنقبور کے حاکم شاہزادہ دولت خاں نے بھی جو سلطان محمود مالوی کے ماتحت تھا  
 علی خاں ناگوری کے ذریعہ سلطان کی ملازمت اختیار کر لی اور قلعہ کی کنجی حوالے کر دینے  
 کا عہد کیا۔ لیکن علی خاں ناگوری کی نیت کچھ بدل گئی اور اس نے اسے کنجی دینے سے روک دیا۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع  
 مل چکی تھی لیکن اس نے علی خاں کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا اور دولت خاں سے بیٹوں کی طرح شفقت و مہربانی کا سلوک  
 کیا۔ خاص خلعت کئی گھوڑے اور ہاتھی اسے عطا کیے۔

۱۵۰۰ء فرشتہ نے شاہ نعمت اللہ ولی کا ذکر کیا ہے کہ ان کی دعا و برکت سے دکن کے فیروز شاہ بہمنی کے خان خانان احمد کو فیروز شاہ کی سلطنت نصیب  
 ہوئی۔ اس نے ان کی تاریخ وفات ۸۰۰ھ بمقام کوہ پگلی و دستور لکھی ہے۔ لیکن بدایونی نے جن بزرگ کا نام لکھا ہے وہ سید نعمت اللہ حسینی ہے  
 اور ۸۰۰ھ میں سلطان سکندر کی ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ یا تو ناموں اور تاریخوں میں اشتباہ ہے یا یہ دونوں مختلف بزرگ ہیں۔ نعمت اللہ  
 ولی قادر یہ سلسلہ کے بزرگ تھے اور حضرت غوث اعظم کے خاندان سے تھے۔

سلطان سکندر لودی کی وفات | سلطان نے قلعہ تھکر پینچ کر کچھ دن قیام کیا۔ وہاں سے سیر کرتے ہوئے قصبہ باری میں آیا۔ پھر آگرہ واپس ہو گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد سکندر بیمار ہو گیا۔ اور اسی بیماری میں اتوار کے دن ۷ اذی قعدہ ۹۲۲ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کی تاریخ وفات کا مادہ ہے:-

وَجَنَاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا

سلطان سکندر شاہ نے ۲۸ سال پانچ ماہ بڑی شان و شوکت سے سلطنت کی۔

سلطان سکندر لودی کی شعر گوئی | سلطان سکندر بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ شعر و سخن کا بھی اسے ذوق تھا۔ شاعروں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ اکثر شعرا اس کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔

سکندر خود بھی قدیم ہندی طرز میں شعر کہا کرتا تھا اور اپنا تخلص گل رخ رکھا تھا۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

سروی کہ سمن پیر ہن و گل بدستش	روحی ست مجسم کہ دراں پیر ہنستش
مشک ختن چسیت کہ صدر مملکت چین	در حلقہ آن زلف شکن در شکنستش
گلرخ چہ کند جو ہر دندان ترا وصف	ہم چوں در سیراب سخن در دہنستش
در سوزن مرثاں بکشم رشتہ جاں را	تا چاک بدرم کہ دراں پیر ہنستش

سلطان سکندر کے عہد میں ایک نامور شاعر برہن بھی تھا جو باوجود کفر کے مروجہ علوم کی کتابوں کا درس دیا کرتا تھا۔ حسب ذیل مطلع اسی کا کہا ہوا ہے، جسے اس نے مسعودیگ کی زمین میں کہا ہے:-

دل خوں نشدی چشم تو خنجر نشدی گر  
رہ گم نشدی زلف تو ابر نشدی گر

عہد سکندری کے علماء | سلطان سکندر کے زمانہ کے علماء میں دہلی میں شیخ عبد اللہ طلبی اور شیخ عزیز اللہ طلبی سنبھل میں تھے۔ یہ دونوں بزرگ ملتان کی بربادی کے وقت ہندوستان آئے تھے۔

ہندوستان میں علوم معقولات کی ترویج میں ان بزرگوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس سے پہلے علم منطق اور کلام میں شرح شمسہ اور شرح صحائف بس یہ دو رسالے ہندوستان میں رائج تھے۔

شیخ عبد اللہ | استادوں سے سننے میں آیا ہے کہ شیخ عبد اللہ کے حلقہ درس سے چالیس سے زیادہ بڑے بڑے متبحر عالم جیسے میاں لادن۔ جمال خاں دہلوی، میاں شیخ گویا رسی، میراں سید جلال بدافونی وغیرہ فارغ ہو کر نکلے۔

کہتے ہیں سلطان سکندر بھی شیخ عبد اللہ کے درس میں حاضر ہوا کرتا تھا اور بے پاؤں آکر ادب سے ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ طلباء کے سبق میں خلل نہ پڑے۔ درس کے بعد سلام علیک کہہ کر دیر تک ان کی صحبت میں بیٹھا رہتا تھا۔

دوسرے عالم شیخ عزیز اللہ طلبی بھی بڑے رشد و ہدایت والے عالم تھے۔ لیکن کا حافظہ  
 شیخ عزیز اللہ طلبی | بلا کا تیز اور ذہن خوب رہا تھا۔ مشکل سے مشکل منتہی کتابوں کو بغیر مطالعہ کے آسانی  
 پڑھا دیتے تھے۔

اکثر لوگوں نے امتحان کے طور پر ان کے سامنے اُچھے ہوئے پیچیدہ سوالات رکھے۔ لیکن انہوں نے ان سوالوں  
 کو چٹکیوں میں حل کر کے دکھا دیا۔  
 ان کے تلامذہ میں میاں حاتم سنبھلی تھے۔ کہتے ہیں انہوں نے اپنی عمر میں شرح مفتاح کا تیس سے زیادہ اور مطول  
 کا چالیس سے زیادہ مرتبہ بسم اللہ سے آخر تک درس دیا۔

شیخ الہدایہ | ایک دوسرے صاحب تصانیف عالم جو پورے شیخ الہدایہ تھے۔ انہوں نے فقہ کی ہدایہ پر چند جلدوں  
 پر مشتمل شرح لکھی ہے۔ انہوں نے کافیہ کی جو شرح لکھی ہے اس کی تعریف تو زبان سے ادا نہیں ہو  
 سکتی۔ علاوہ ازیں انہوں نے تفسیر مدارک وغیرہ پر حاشیے لکھے ہیں جو اس زمانہ تک پڑھائے جاتے ہیں۔  
 سکندر نے ایک مرتبہ اپنے ملک کے تمام علماء کو جمع کیا۔ ایک جانب سے شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ اور دوسری  
 جانب سے شیخ الہدایہ اور ان کے لڑکے بھکاری نے علمی مباحثہ کیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے دو بزرگ تقریریں اور دوسرے  
 دو تحریریں سب سے فائق و ممتاز ہیں۔

شیخ عبد اللہ کا انتقال ۱۲۲۰ھ میں ہوا۔ ان کا مادہ تاریخ ہے۔

أُولَئِكَ لَهُمْ دَرَجَاتُ الْعُلَىٰ

عبد سکندری کے شعراء | اس زمانہ کے شاعروں میں ایک شیخ جمال کنبودہ لوی تھے۔ سلطان سکندر ان کو اکثر اپنے شعر سنایا  
 کرتا تھا۔ شیخ جمال بڑے رنگارنگ شاعر تھے۔ سیرو سیاحت بھی بہت کی تھی۔ مولانا جامی  
 کی خدمت میں بھی عرصہ تک رہے تھے۔ اور شعر و سخن میں ان سے اصلاح لی تھی۔ ان کا نمونہ کلام ہے۔

مارا از خاکِ گویت پیراہنی ست برتن  
 و آں ہم ز آبِ دیدہ صد چاک تابدا من

عشق را طلی لسانی ست کہ صد سالہ سخن  
 دوست باد دست بیک چشم زدن میگوید  
 ان کی یہ غزل جو ہندی طرز میں کہی ہے بڑی وجد آور اور بہت مشہور ہے۔

لے مولانا جامی۔ ان کے لقب عماد الدین اور نور الدین ہیں۔ نام عبد الرحمن۔ احمد جام زندہ پیل کی نسبت سے جامی تخلص کیا۔ والد کا نام نظام الدین  
 جدداد اکاشمس الدین تھا۔ سلسلہ نسب امام اعظم ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد سیستانی سے ملتا ہے۔ آپ کی ۹۹ تصانیف ہیں۔



طال شوقی الے مناز لکم ایہا الغائبون عن نظری  
روز و شب ہونسم خیال شامت فاسلوا عن خیال لکم خبری

**تذکرہ سیر العارفین** | شیخ جمالی نے سیر العارفین کے نام سے ہندوستان کے بزرگوں کے حالات پر ایک تذکرہ بھی لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ہے تو خوب لیکن استقام و اغلاط سے پاک نہیں۔ تذکرہ کی ابتداء حضرت خواجہ بزرگوار معین الحق والدین الاجیری سے اور اس کا اختتام ان کے اپنے پیر شیخ سہار الدین کنہوی دہلوی پر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نظم و نثر میں ان کی اور بھی چیزیں ہیں۔ ان کا دیوان آٹھ نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

## سلطان ابراہیم بن سکندر لودی

سلطان سکندر کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم امرار کے اتفاق سے تخت نشین ہوا۔ سلطان سکندر نے شہزادہ جلال خاں کو جون پور کی حکومت عطا کی تھی۔ امرار نے اسے بھی شریک سلطنت قرار دے دیا۔ اسی دوران میں خاں جہاں خاں نوخانی راپری کا حاکم آگرہ آیا اور جلال خاں کو شریک سلطنت بنانے پر امیروں کو لعنت ملامت کی۔ پورب کے تمام امرار کے نام فراہم جاری کرائے کہ جلال خاں کو گرفتار کر کے دار الخلافہ کو روانہ کر دیں۔

**جلال خاں کا دعویٰ بادشاہت** | جلال خاں جون پور سے کالپی پہنچا۔ وہاں ایک بہت بڑا لشکر اکٹھا کر کے اپنے نام کا سکھ اور خطبہ جاری کرایا اور اپنا خطاب سلطان جلال الدین رکھا۔ اعظم ہمایوں سروانی کچھ عرصہ تک تو جلال خاں کا معاون بنا رہا۔ لیکن بعد میں سلطان ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سلطان ابراہیم نے اسماعیل خاں، حسین خاں اور دوسرے شہزادوں کو جو چلے سے قید میں تھے، ہانسی کے قلعہ میں بھجوا دیا۔ ان کے لباس اور کھانے کا انتظام کرا کے دود و خدمت گار ہر ایک کے لیے مقرر کر دیئے۔

**ابراہیم لودی کی لشکر کشی** | سلطان ابراہیم نے پورب کی طرف لشکر کشی کی اور بھون گاؤں پہنچا اور اس علاقہ کو پامال کرتا ہوا قنوج آیا۔ وہاں سے کئی ایک امیروں کی سرکردگی میں جلال خاں کے مقابلہ پر لشکر روانہ کیا۔

جلال خاں نے بھی تیس ہزار سواروں اور کثیر ہاتھیوں کے ساتھ آگرہ کا رخ کیا۔ سلطان ابراہیم کی طرف سے آگرہ کی حفاظت پر ملک آدم کا مرتعین تھا۔ اس کی مدد کے لیے اور بھی کئی ایک امیر بھیج گئے۔

**جلال خاں کا اظہار اطاعت** | امیروں نے جلال خاں سے تفصیلی گفت و شنید کر کے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ سلطان ابراہیم کے حق میں بادشاہت سے دست بردار ہو جائے۔ اور کالپی اس کی جاگیر میں رہے۔ اس شرط پر امرار نے اس کے قصور معاف کر دینے کی حامی بھری۔ جلال خاں اس بات پر راضی ہو گیا اور شاہی امتیاز، چتر، آفتاب گیر اور نقارہ وغیرہ ملک آدم کو دے دیا۔ ملک آدم نے اٹاواہ کے قریب یہ چیزیں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں

اور جلال خاں کی سفارش کی۔

**جلال خاں کا فرار** | سلطان ابراہیم نے اس بات کو قبول نہیں کیا اور جلال خاں کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کر دی۔ جلال خاں پریشان ہو کر گوالیار بھاگ گیا اور سلطان سکندر کے تمام امیروں نے جنہوں نے یہ رخنہ پیدا کیے تھے سلطان ابراہیم کی اطاعت قبول کر لی۔ صرف ایک امیر میاں بھوہ ایسا تھا جسے بادشاہ نے معاف نہ کیا۔ یہ سکندر کا بڑا نامی وزیر اور مشیر رہ چکا تھا۔ ابراہیم نے دلی عداوت کی وجہ سے اسے پابہ زنجیر ملک آدم کے حوالہ کر دیا۔ وہ اسی قید میں انتقال کر گیا۔ بادشاہ نے اس کے بیٹے کو باپ کا منصب اور عمدہ تفویض کر دیا تھا۔

سلطان نے حاکم کڑہ اعظم ہمایوں سروانی کی کمان میں تیس ہزار سوار اور ایک سو ہاتھی گوالیار کی تسخیر کے لیے روانہ کیے جب جلال خاں کو شاہی لشکر کے آنے کی خبر ہوئی تو وہ گوالیار سے سلطان محمود مالوی کے پاس مالوہ چلا گیا۔

**گوالیار کی تسخیر** | شاہی فوج نے گوالیار کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت وہاں کا حاکم رائے مان سنگھ تھا جس نے اپنے باپ رائے بکراجیت کو قتل کر کے حکومت حاصل کی تھی۔ وہ مسلمانوں کے حملہ کی مدافعت نہیں کر سکا۔ اور قلعہ گوالیار کا زیریں حصار بادل گردہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ وہاں ایک کانسی کا بت تھا جس کی ہندو پوجا کرتے تھے۔ ہمایوں نے وہ بت سلطان کے پاس آگرہ روانہ کر دیا۔ بادشاہ کے حکم سے اس بت کو شہر دہلی کے دروازہ پر ڈال دیا گیا تھا۔ یہ بت اس کتاب (منتخب التواریخ) کی تصنیف سے دس سال پہلے فتح پور لایا گیا تھا۔ میں نے دلا عہد القادر بدراؤنی مصنف، اس بت کو دیکھا ہے۔ اس کے سامنے ناقوس اور گھنٹہ بجایا جاتا تھا۔

اسی زمانہ میں سلطان ابراہیم اپنے اکثر امیروں سے بدظن ہو گیا۔ مختلف مقامات پر تباہی کر کے اُن کو منتشر کر دیا۔

**جلال خاں کا قتل** | مالوہ میں جلال خاں اور محمود مالوی کے درمیان زیادہ دن بھر نہ سکی۔ اور جلال خاں مالوہ سے بھاگ کر کڑہ کنک کی طرف نکل گیا۔ اس جگہ گوند قبیلہ کے لوگوں نے اسے پکڑ کر سلطان ابراہیم کے پاس روانہ کر دیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو بھی دوسرے شہزادوں کے ساتھ قلعہ بانسی میں قید رکھا جائے۔ لیکن کسی دشمن نے اسے راستہ ہی میں قتل کر دیا۔

**اعظم ہمایوں کی گرفتاری** | گوالیار پر اعظم ہمایوں برابر محاصرہ کیے ہوئے پڑا تھا۔ قریب تھا کہ اس کی کوششوں سے یہ مستحکم قلعہ فتح ہو جائے کہ عین وقت پر بادشاہ کی طلبی کا فرمان آ گیا۔ اور وہ محاصرہ اٹھا کر آگرہ لوٹ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی بادشاہ نے اسے اور اس کے بیٹے فتح خاں کو قید کر لیا۔

**اسلام خاں کی بغاوت** | اعظم ہمایوں کا دوسرا بیٹا اسلام خاں کڑہ میں تھا۔ اسے باپ کی ساری دولت اور ساز و سامان مل گیا۔ اس نے اس مال سے کڑہ میں ایک بڑی جمعیت منظم کر لی۔ اور اس نواح کے امراء کو اپنا معاون بنالیا اور حاکم کڑہ احمد خاں پر حملہ کر کے اسے شکست دی۔

اعظم ہمایوں لودھی کا بھائی احمد خاں ایک بڑے جتھے کا سربراہ تھا۔ سلطان نے اسے اور خان خانان فرہلی جیسے بڑے بڑے امراء کو اسلام خاں اور اس کے شریک باغی امیروں کے مقابلہ پر بھیجا۔ جب یہ شاہی لشکر قنوج کے قریب بانگر پور کے

مقتضیٰ میں پہنچا تو اعظم خاں ہمایوں کے دستِ راست اقبال خاں نے گھات سے نکل کر اچانک ایسا بھروسہ پر حملہ کیا کہ شاہی لشکر پر اگندہ ہو گیا۔

بادشاہ نے احمد خاں کی کمک پر مزید فوج روانہ کی۔ باغی امیر بھی چالیس ہزار سوار اور پانچ سو ہاتھی لے کر مقابلہ کر آئے۔ بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ عین لڑائی کے وقت بہار کی جانب سے نصیر خاں لودی نے آکر باغیوں پر حملہ کر دیا۔ باغی امیر دو سمتوں سے گھر گئے۔ دونوں طرف سے ان پر حملے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ آخر بڑی جاں فشانی اور جدوجہد کے بعد شاہی لشکر ان کو شکست دے سکا۔ اس مقابلہ میں اسلام خاں مارا گیا اور سعید خاں قید ہو گیا۔

**امیروں سے بدگمانی** | امرائے شاہی نے اس بغاوت کو رفع کرنے کے لیے بڑی دیانت داری اور جان نثاری کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن ابراہیم کادل اپنے امیروں کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا اور وہ ان سے اسی طرح بدظن رہنے لگا۔ سلطان کے اس رویہ سے امیر بھی برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہر طرف سے بادشاہ کی مخالفت شروع ہو گئی۔ اعظم ہمایوں سروانی اور سکندر کا وزیر میاں بھوہ بڑے کار کردار اور پایہ کے امیر تھے۔ سلطان ابراہیم نے ان دونوں کو قید کر لیا اور وہ اسی قید میں مر گئے۔ میاں حسن فرلی ایک اور امیر تھا جسے سلطان ابراہیم کے اشارہ پر چندریا میں اوباش شیخ زادوں نے قتل کر دیا۔ دریا خاں لوحانی بہار کا حاکم اور خان جہاں لودی بھی بادشاہ کی دست درازیوں سے ڈر کر باغی بن بیٹھے۔ دریا خاں چند دن بعد مر گیا۔ اس کا بیٹا بہادر خاں جانشین ہوا اور وہاں کے تمام پرگنوں کے امیر اس کے ساتھ ہو گئے۔

**بہادر خاں کی خود مختاری** | بہادر خاں نے بہار میں ایک لاکھ سوار جمع کر کے سارے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور اپنا خطاب سلطان محمد رکھ کر بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سکھ اور خطبہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ اس نے سنبھل تک فوج کشی کی اور مدت تک بہار اور اس کے نواح میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

**سلطنت مغلیہ کا محرک** | اسی دوران میں لاہور سے دولت خاں لودی کا بیٹا خان خاناں آگرہ آکر خدمتِ شاہی میں باریاب ہوا۔ لیکن وہ بھی بادشاہ کے رویہ سے خوف زدہ ہو کر اپنے باپ کے پاس بھاگ گیا۔ دولت خاں نے جب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بادشاہ کے چنگل سے کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتا تو اس نے اُسے کابل بھیج دیا۔ یہی خان خاناں وہ شخص ہے جو ہندوستان میں مغل سلطنت کے قیام کا محرک بنا۔ اس نے کابل جانے کے بعد ظہیر الدین بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا اور اسے لے کر ہندوستان آیا تھا۔ بعد میں اسی خان خاناں نے بابر سے اپنے باپ کی شکایتیں کر کے اس کا دل دولت خاں سے پھیر دیا تھا۔ اس قصہ کی تفصیل انشاء آگے بیان ہوگی۔ واضح رہے خان خاناں شیر شاہ کے عہد تک زندہ تھا اور اسی کی قید میں اس کا انتقال ہوا تھا۔

**بابر سے امیروں کی مراسلت** | بہار میں سلطان محمد خاں کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اس وقت تک تمام امیر سلطان بابر سے امیروں کی مراسلت | ابراہیم لودی سے بری طرح بگڑ گئے تھے۔ اور اس کے خلاف سازشوں میں

لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان امیروں نے جن میں دولت خاں اور اس کے بیٹے غازی خاں اور دوسرے بڑے بڑے امیر شامل تھے۔ عالم خاں لودھی کے ذریعہ ظہیر الدین بابر کے پاس کابل میں عرضیاں لکھ کر بھیجیں اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔

**بابری لشکر کی یلغار** | بابر نے پہلے اپنے چند امیروں کو عالم خاں کے ساتھ ہندوستان کے سرحدی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے بہت ہی جلد لاہور اور سیالکوٹ وغیرہ فتح کر لیا۔ اور تفصیلی حالات بابر کے پاس لکھ کر روانہ کیے۔ اس کی فتح کی تاریخ ہے۔

ظہیر الدین محمد شاہ بابر سکندر دولت و بہرام صولت  
یہ دولت کو فتح کشور بہند کہ تاریخ آندش فتح بدولت

**بابر کا ہندوستان پر حملہ** | جب بابر کو ان فتوحات کی امید افزا روداد وصول ہوئی تو وہ بھی متواتر کوچ کرتا ہوا دریائے سندھ کے کنارے آکر آگیا۔ اس پڑاؤ پر اس کا لشکر دس ہزار تھا۔

بابر کے حملہ کی خبر پاتے ہی دولت خاں اور غازی خاں اپنے عہد و پیمان سے منحرف ہو گئے۔ اور تیس ہزار پٹھان سواروں کو بے کرب قبضہ کلانور پر قبضہ کر لیا اور بابر کے امیروں پر حملہ کرنے کے لیے لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ جب غازی خاں سیالکوٹ پہنچا تو بابر کا امیر خسر و قلعہ چھوڑ کر بابر کے لشکر سے جا کر مل گیا۔

**سیالکوٹ کی تباہی** | کچھ دن بعد بابر سیالکوٹ آیا اور اسے بری طرح تاخت و تاراج کر دیا۔ پوری طرح ویران کر کے اس کے بجائے وصول پور کو آباد کرایا۔ یہاں سے بابر نے عالم خاں کو دہلی پر حملہ کے لیے آگے بڑھایا۔ اس نے سلطان ابراہیم کے لشکر پر شب خون مارا۔ اس رات ابراہیم کے چند امیر جلال خاں وغیرہ عالم خاں سے جا کر مل گئے۔

**عالم خاں کی شکست** | سلطان ابراہیم نے اس شب خون کے جواب میں صبح تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ عالم خاں کا لشکر غنیم کی خاموشی پر اپنی فتح کے گمان میں ادھر ادھر منتشر ہو گیا۔ اس وقت صبح ہو چکی تھی اور عالم خاں کے ساتھ تھوڑے سے آدمی رہ گئے تھے۔ سلطان ابراہیم نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور ایک ہاتھی کو آگے بڑھا کر حملہ آور غنیم پر حملہ کر دیا۔ اس کا یہ حملہ ایسا سخت اور غیر متوقع تھا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے عالم خاں میدان سے جان بچا کر بھاگا۔ اور دو آبہ سے گزر کر سہرند پہنچا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر قلعہ گنگوٹہ میں جو ملوت کے توابعات میں پہاڑ پر واقع ہے پناہ لی۔

دلاور خاں لودھانی یہاں سے عالم خاں کے لشکر سے جدا ہو کر بابر کے لشکر میں چلا گیا۔ جب وہ بابر کے پاس گیا تو وہ اس کا تعظیم میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی بڑی عزت و توقیر کی اور اسے خلعت عطا کی۔

**بابر کی پیش قدمی** | اب بابر نے خود پیش قدمی کی اور ضلع کلانور جا کر پڑاؤ کیا۔ یہاں لاہور سے اس کے امیر محمد سلطان فرما وغیرہ بھی آکر مل گئے۔ قلعہ ملوت کے نواح میں جہاں سے غازی خاں بھاگ گیا تھا بابری لشکر



پہنچا تو دولت خاں جو بابر سے منحرف ہو چکا تھا شکر میں حاضر ہو گیا۔ لوگوں نے اس کو باندھ کر اس کی گردن میں دو تلواریں ڈال دیں۔ اس ہیئت میں اسے بابر کے دربار عام میں پیش کیا گیا۔ بابر نے جب یہ دیکھا تو لوگوں کو اس سلوک سے منع کیا اور دولت خاں کو نہایت تعظیم سے بلایا اور اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ دی۔ لیکن اس کا سارا مال و اسباب لشکر والوں میں تقسیم کر دیا۔ موت پر بابر نے شکر نے قبضہ کر لیا اور دولت خاں چند دن بعد بابر کی قید میں ہی انتقال کر گیا۔

دولت خاں کا قصہ پاک ہونے کے بعد بابر نے غازی خاں کے تعاقب میں کوہ سواک کا رخ کیا اور مقام نادوں میں خیمہ گاہ لگائی۔ جب وہاں غازی خاں لشکر والوں کے ہاتھ نہ آیا تو بابر وہاں سے لوٹ کر منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے ضلع سہرند میں پہنچا اور کھکر کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ پھر وہاں سے سامانہ اور سنام کا رخ کیا۔

سلطان ابراہیم نے عالم خاں کو شکست دینے کے بعد سرحدوں کی فکر نہیں کی اور دہلی میں پڑا رہا۔ بابر نے ابراہیم کے لشکر اور جنگی تیاریوں کے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے بعد امیر کتبہ بیگ کو نامزد کر کے رخصت کیا۔ اسی مقام پر بابر کا امیر بن افغان باغی ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی شاہی لشکر سے آکر مل گیا۔

بابر کو اطلاع ملی کہ سلطان ابراہیم کا خاص رسالہ رحیمید خاں حصار فیروزہ سے شکر فراہم کر کے لڑنے کے لیے آرہا ہے۔ بابر نے اس کے مقابلہ پر شہزادہ محمد ہایوں کے ساتھ میرزا خواجہ ملاں اور دوسرے امرار کو متعین کیا۔ ہایوں اور رحیمید خاں کی فوجوں میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ سخت جدوجہد کے بعد رحیمید خاں کو ہایوں نے شکست دی۔ اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے اور کچھ گرفتار ہو گئے۔ اس فتح کی خوشی میں بابر نے حصار فیروزہ ہایوں کو جاگیر میں دے دیا۔

یہاں سے آگے بڑھ کر بابر نے شکر نے جتنا کہے کنارے شاہ آباد سے دو منزل پر منزل کی۔ سلطان ابراہیم کے امیر داؤد خاں وغیرہ پانچ چھ ہزار سوار لے کر جتنا عبور کر گئے تھے۔ داؤد خاں کے مقابلہ پر بابر نے سید محمد مہدی، خواجہ محمد سلطان میرزا اور سلطان جنید برلاس کو آگے بڑھایا۔ ان لوگوں نے پٹھانوں کی اچھی طرح سرکوبی کی اور بہتوں کو قتل و قید کر لیا۔ جو جان بچا کر نکل گئے، وہ ابراہیم کے لشکر سے جا ملے۔

بابر نے شاہ آباد سے کوچ کر کے لڑائی کا ساز و سامان درست کیا۔ اسی ایک دن میں آٹھ سو گاڑیاں تیار ہو گئیں۔ بابر کے ماہر آتش باز استاد علی قلی نے حسب الحکم توپ خانہ کو روم کے توپ خانہ کی طرح مستحکم کر دیا۔ اس نے تمام گاڑیوں کو زنجیروں اور تسموں سے باہم جکڑ دیا۔ اور جابجا دو دو گاڑیوں کے درمیان چھ سات مٹی سے بھرے گئے پورے رکھوا دیئے تاکہ ان مورچوں کی حفاظت میں رہ کر سپاہی بند و قیں چلا سکیں۔

طے یہ پایا کہ یہاں سے کوچ کر کے پانی پت کو شکر کے عقب میں رکھ کر منزل کی جائے اور میدان میں ان گاڑیوں کی قطار ادا دی جائے۔ سارے سوار اور پیادے ان کے پیچھے رہیں۔ حملہ کے وقت ادھر ادھر سے نکل کر دشمن پر یلغار کریں اور حسب صورت اس مورچہ بندی کی حفاظت میں آجائیں۔

برپانی پت میں | ۳۰ جمادی الآخر بروز جمعرات بابر نے پانی پت کے قریب کیمپ لگایا۔ وہاں سے سلطان

ابراہیم کا لشکر چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ اس وقت بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ابراہیم لودی کے پاس ایک لاکھ سوار ہزار ہاتھی تھے۔

بابر کے لشکر کی روزانہ پٹھانوں پر چھاپے مار کر سپاہیوں کے سر کاٹ لے جاتے تھے۔ لشکر لڑنے کے لیے بے چین تھا لیکن ابراہیم اپنی جگہ چپ چاپ ٹھہرا رہا اور کوئی حرکت نہ کی۔

ایک رات بابر کے امیر محمدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا وغیرہ نے پانچ ہزار کی جمعیت لے کر ابراہیم کے لشکر پر شب خوں مارا اور بہت سے سپاہیوں کو قتل کر کے صبح سلامت لوٹ گئے۔

سن مذکور ۸ رجب کو بروز جمعہ خدا خدا کر کے سلطان ابراہیم کی سواری حرکت میں آئی پانی پت کی پہلی خون ریز لڑائی اور اس نے فوج کی تنظیم و ترتیب کر کے میدان میں صف بندی کر لی۔

بابر نے بھی بڑی آن بان کے ساتھ اپنی فوج کو منظم کیا۔ نقشہ جنگ اس طرح تجویز کیا کہ داہنی جانب سے امیر قراقرچ اور امیر شیخ علی وغیرہ اور بائیں جانب سے دلی قزلباش اور بابا قشقاہ تمام مغل جمعیت کو ساتھ لے کر دو جانب سے غنیم کے عقب پر حملہ کریں اور بقبہ مینہ اور بیسروہ والی فوج اور امیر محمدی کو کلتاش، امیر یونس علی اور امیر شاہ منصور برلاس کا لشکر سامنے سے دشمن پر یورش کرے۔

جب لڑائی چھڑی تو داہنی طرف پٹھانوں کا زیادہ دباؤ تھا۔ اسی لیے بابر نے امیر عبدالعزیز کو بھی اس سمت پر روانہ کر دیا۔ اس نے جاتے ہی یکبارگی دشمن پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ فریقین نے خوب جم کر مقابلہ کیا۔ دونوں طرف کے بہادروں نے جی کھول کر داد شجاعت دی اور ایسا گھمسان کارن پڑا کہ میدان میں کشتوں کے پستے لگ گئے اور خون کی ندیاں بہنے لگیں۔

اس لڑائی کو دو قرن کی مدت (دو صدی) گندہ چلی ہے۔ لیکن آج تک راتوں میں اس میدان سے "مار مار" کی آواز آتی رہتی ہے۔ ایک مرتبہ سلسلہ میں میں ربدائونی مصنف ہذا، لاہور سے فتح پور جا رہا تھا۔ اسی میدان سے میرا گزر ہوا چاروں طرف سے "بکش، بزن" کی آوازیں آنے لگیں۔ جو لوگ ہمراہ تھے ان کو شبہ ہوا شاید کوئی دشمن حملہ کرنے پہنچ گیا ہے۔

مختصر یہ کہ اس خون ریز جنگ کے نتیجہ میں بابر کی فوج کو فتح ہوئی، پٹھان شکست کھا کر بھاگے۔ ابراہیم لودی کا قتل سلطان ابراہیم کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے پیش کیا گیا۔

جس جگہ سلطان ابراہیم قتل ہوا تھا وہاں پانچ چھ ہزار مقتولین کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

بابر دہلی میں اس فتح کے بعد بابر بادشاہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بابر نے شہزادہ محمد میرزا کو بہت سے امرار کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ کیا اور سلطان ابراہیم کا سارا خزانہ جو عدد و شمار سے باہر تھا، مغل لشکریوں میں تقسیم کر دیا۔

یہ واقعہ ۱۵۵۶ء میں پیش آیا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے۔

”شہید شدنِ ابراہیم“

سلطان ابراہیم نے نو سال حکومت کی۔ وہ لودی سلطنت کا آخری پٹھان فرمان روا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کی بادشاہت تیموری خاندان کے ہاتھ آگئی۔



# ترک اور افغان سلاطین

کا

## تین سو سالہ دورِ حکمرانی

یہاں تک ملا عبدالقادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ نے ترک اور افغان سلاطین کے تقریباً ساڑھے تین سو سالہ دورِ حکومت کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اس کے بعد مصنف مغل خاندان کا تذکرہ ظہیر الدین بابر سے شروع کرتا ہے۔ خاندان مغلیہ کی تاریخ کا ترجمہ پیش کرنے سے پہلے ہم پچھلے صفحات پر ایک نظر بازگشت ڈال لینا چاہتے ہیں تاکہ آگے پڑھنے سے پہلے مذکورہ تین صدیوں کا خلاصہ سامنے آجائے، (مترجم)

چوتھی صدی عیسوی سے دسویں صدی عیسوی تک ہندوستان کی سرزمین ترک اور افغان قبائل کی ترکنازیوں کا تختہ مشق بنی رہی۔ یہ فتوحات سلطان محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملہ سے شروع ہوتی ہیں۔ محمود نے ۳۹۲ھ میں ہندوستان کا رخ کیا اور بہت جلد پنجاب کو وادیِ ستلج تک فتح کر لیا۔ ملتان اور سندھ کے صوبے بھی غزنی اقتدار کے تحت ہو گئے۔ ہندو ریاستیں وسطی مشرقی اور جنوبی ہند میں بکھری پڑی تھیں۔ یہ چھوٹی بڑی متعدد ریاستیں تھیں جن پر راجپوت اور دوسرے ہندو خاندان حکمران تھے۔ اس ہندو دنیا کا بیشتر حصہ برہمن مت کا پیرو تھا۔ ہندوستان کے ان راجاؤں میں باہمی رقابت کا جذبہ بہت شدید تھا۔ اشوک اور چندر گپت کے بعد کوئی مرکزیت باقی نہیں رہی تھی اور نہ ایسی طاقت ور اور با اثر شخصیت کا ہندوؤں میں ظہور ہوا جو ان منتشر طاقتوں کو یک جا کر سکتی۔ برہمن، پانڈے، راجے، سپاہی، ساہوکار، کسان، تاجر، صنایع غرض سب کے سب کسی سیاسی مرکزیت اور نظریاتی وحدت کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک انتشار کے عالم میں مبتلا تھے۔ عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ محنت و جفاکشی باقی نہیں رہی تھی اور معاشرتی حالت نہایت تباہ ہو چکی تھی۔ اُتم جاتی اور نیچ جاتی کے امتیازات نے پورے سماج کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

ان حالات میں ہندوستان پر ترک مسلمانوں نے حملے کیے۔ ستلہ سے پنجاب اور سندھ، غزنی کے ترک سلاطین کے زیر اقتدار تھے ہی ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری نے اجمیر کے راجا پریمتھوی راج کو شکست دے کر اس کی ملکیت پر قبضہ کر لیا اور بنگالہ تک اس کی فتوحات کا سلسلہ پہنچ گیا۔ اس کے بعد ۱۱۹۵ء سے ۱۲۰۶ء تک شمالی ہند غزنی اور غور کی ترکی اور اسلامی سلطنت کا ایک حصہ بنا رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی کو مرکز بنا کر ہندوستان میں ایک مستقل اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ قطب الدین کے عہد تک حکمرانوں کی مدت حسب ذیل ہے۔



الف۔ سلاطینِ غزنوی۔ محمود غزنوی سے خسرو ملک بن خسرو شاہ تک ۱۲ بادشاہوں نے جن میں غزنوی خاندان کے ۵ اور ساداتِ غزنوی کے ۷ بادشاہ شامل ہیں۔ ۳۹۳ھ سے ۵۸۳ھ تک تقریباً دو سو سال حکومت کی۔  
ب۔ غزنویوں کے بعد معز الدین بن سام شہاب الدین غوری کی حکمرانی ۵۶۹ھ سے ۵۹۳ھ تک تقریباً ۲۵ سال رہی۔

قطب الدین ایبک نے خاندانِ غلاماں کی بادشاہت کا آغاز کیا۔ اور ۶۰۲ھ تک حکمران رہا۔ اس کے بعد دس بادشاہوں نے جن میں شمس الدین التمش جیسا عظیم المرتبت بادشاہ، سلطانہ رضیہ جیسی جنگجو ملکہ اور ناصر الدین محمود جیسا خدا ترس، دیانت دار فرماں روا اور غیاث الدین بلبن جیسا منتظم اور اولوالعزم سلطان شامل ہیں۔ ۶۰۹ھ تک تقریباً پون صدی حکمرانی کی اور خاندانِ غلاماں کا کیتباد ناصر الدین اور شمس الدین کی کاؤس پر خاتمہ ہو گیا۔

خاندانِ غلاماں کے سلاطین سب کے سب زر خرید غلام اور غلام زادے تھے۔ ترقی کر کے سرداری اور بادشاہی کے رتبے تک پہنچتے رہے۔ ان کے عہد میں مملکت کی وسعت کا دائرہ مشرق میں بنگال تک اور جنوب مشرق میں گجرات کا ٹھیا واڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وسطی ہند کے اکثر راجاؤں کے باج گزار بن گئے تھے۔ اس خاندان کے سب سے بڑے دو کارنامے ہیں۔

اول:- ہندوستان میں مستقل اسلامی مملکت کا قیام۔

دوم:- وسط ایشیا سے آنے والے چنگیز خانی سیلاب کی روک تھام۔

واقع رہے ۱۲۱۹ھ سے ۱۲۳۶ھ تک چنگیز خاں کے وحشی لشکروں نے وسطی ایشیا، ترکستان، ایران، افغانستان کے لوگوں کو تاخت و تاراج کر کے بے چراغ کر دیا تھا۔ اسلامی دنیا میں ہندوستان کی مسلمان مملکت ہی واحد مملکت تھی جس نے چنگیز خاں کے لشکر کو شکست دی۔ سلطان التمش نے دریائے اٹک کے پار چنگیز خاں کے مغل سردار کو اس بُری طرح شکست دیکر مگایا تھا کہ عرصہ تک ان کافر مغلوں کو ہندوستان کا رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

غلاموں کے بعد تمام اقتدار خلیجوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ خاندانِ خلجی کا آغاز جلال الدین بن یغرش خلجی سے ہوتا ہے جس نے ۶۹۹ھ میں خلجی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان میں چار بادشاہ گزے۔ قطب الدین مبارک شاہ آخری خلجی بادشاہ ہے جس پر ۷۲۶ھ میں اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ خلیجوں نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔

خلیجوں کا سب سے بڑا کارنامہ جنوبی ہند کی ہندو ریاستوں کی فتح ہے۔ سلطان علاؤ الدین نے راس کماری اور رایشوٹا ساراٹک فتح کر لیا۔ علاؤ الدین ہندوستان کا وہ پہلا مہم پسند بادشاہ ہے جس کے زیر نگیں تقریباً سارا ہندوستان ایک ہی کڑی اقتدار کے تحت آ گیا تھا۔ ایسی مرکزیت اور وسعت علاؤ الدین کے عرصہ دراز بعد اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں ہی ہوئی ہے جو کابل سے راس کماری اور برہما کی سرحدوں سے سورت تک کا واحد مطلق العنان بادشاہ تھا۔

مغلوں نے سلطان علاؤ الدین کے عہد میں بھی ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۱۶ھ تک ہندوستان میں گھسنے کی کوشش کی۔ لیکن سلطان کے لشکر نے ان کو ہمیشہ شکست دے کر بھگا دیا۔

خلیجوں کے علاوہ خاندان کے ترک سلاطین حکمران رہے۔ ان کا آغاز غیاث الدین تغلق شاہ سے شروع ہوتا ہے جس نے

ناصر الدین خسرو خاں ایک منافق اور غاصب بادشاہ کو شکست دے کر سلطنت پر جلوس کیا۔ اس کے بعد سات اور تغلق ہندوستان کے تخت پر متمکن ہوئے جن میں سے محمد شاہ تغلق جیسا کہ میں لیکن خونی بادشاہ اور فیروز شاہ تغلق جیسا کہ علم دوست درویش منش عادل اور باہمت سلطان گزرا ہے۔ محمد شاہ تغلق نے کوہستان ہمالیہ کے راستہ چین پر حملے کا منصوبہ بنایا تھا۔ دہلی کے بجائے دولت آباد دکن کو پائے تخت بنایا۔ جس سے دہلی کا شہر ویران ہو گیا تھا۔ تانجے کا سفر جاری کیا۔ اس کے وسیع اور دور رس منصوبے ناکام رہے اور وہ تاریخ میں سر پھر سلطان کہلایا۔ فیروز شاہ تغلق نے نہریں بنوائیں، زراعت اور تجارت کو ترقی دی۔ اس کے زمانہ میں رعایا خوش حال ہو گئی اور ملک آباد اس نے سرکار بنوائیں اور راستوں کی حفاظت کا انتظام کیا۔

سلسلہ (۱۳۹۸ء) میں تیمور کی یلغار نے آخری تغلق بادشاہ محمود شاہ بن محمد شاہ کو تخت سے بے دخل کر دیا اور تغلقوں کی جگہ خضر خاں سادات نے لے لی۔

تغلق خاندان تک ہم ترک فاتحین کو فتوحات کرتے زیادہ سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کرتے ان علاقوں سے بھاری خراج وصول کرتے یا آپس میں تخت شاہی کے لیے لڑتے جھگڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تغلق خاندان کے صد سالہ دور میں ہندوستان معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہیں اور پھیلی فتوحات کی بار آور فصیلیں کاٹی جا رہی ہیں۔ اور جس کھیمہ سے یہ فصل مل رہی ہے اس کو روندنا ہی مقصود نہیں ہے بلکہ اسکی زمین کو کھاد دے کر سیراب کرنا بھی پیش نظر ہے۔

سید بادشاہوں کا آغاز تیمور کی واپسی کے بعد خضر خاں سے شروع ہوتا ہے جس نے ۱۴۶۰ء میں ہندوستان کی اقتدار سنبھال لیا۔ اس کے سلسلہ میں مزید تین بادشاہ گزرے۔ اور آخری بادشاہ علاؤ الدین بن محمد شاہ پر اس خاندان کا ۱۵۵۵ء میں خاتمہ ہو گیا۔

ان چار بادشاہوں کا سلسلہ مسلسل انتشار اور افراق فری میں گزرا۔ تیموری مغلوں نے سارے ملک کے نظم و نسق کو درہم برہم کر دیا تھا۔ شمال مشرق میں محمود پور کے مشرقی بادشاہ، مغرب میں شاہان گجرات، دکن میں ہمئی حکمران، مشرق میں شاہان بنگال اور جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے خود مختار ہندو اور مسلمان سرداروں یا راجاؤں کی حکمرانی تھی اور سارا ملک ایک عظیم خلفشار اور طوائف الملوکی میں مبتلا تھا۔ ابتداء میں مذکورہ بادشاہوں کی حیثیت تیمور کے نائبوں کی تھی۔ تیمور کے بعد جب کوئی پرسان حال نہ رہا تو یہ خود مختار بن بیٹھے۔ ان کی مدت حکومت صرف ۲۰ سال ہے۔

سادات خاندان سے لودی خیل کے پٹھانوں نے حکومت چھین لی۔ لودی خاندان میں صرف تین بادشاہ گزرے۔ ایک سلطان بھلول جس نے اس سلسلہ کی بادشاہت ۱۵۵۵ء میں قائم کی۔ دوسرا سلطان سکندر جس نے بڑی پیدار مغزی اور دلیری سے فرماں روائی کی۔ اور ملک کو اس بڑے انتشار سے جس میں وہ مبتلا تھا بچایا۔ آخری ابراہیم لودی جو ایک باہمت باپ کا بزدل بیٹا تھا۔ ابراہیم لودی پر ۱۵۵۵ء میں لودی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس خاندان نے بھی پون صدی سے زیادہ حکومت کی۔

سلاطین تغلق کے بعد سے ہندوستان میں مسلمان مملکت اندر سے مسلسل کھوکھل ہو چکی تھی۔ باہمی عداوتوں اور رقابتوں

کی وجہ سے اس میں اتنا دم خم نہیں رہا تھا کہ کسی بیرونی حملہ یا اندرونی انقلاب کو سہار سکے۔ چنانچہ تیموری یلغار نے ہندوستان کی بادشاہت کو دیکھتے ہی دیکھتے سرنگوں کر دیا۔ اب یہ خوش قسمتی تھی کہ تیمور مسلمان تھا اور ہندوستان کو کسی کافر حملہ آور سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ بظاہر دیکھا جائے تو تیمور کا حملہ ایک وحشیانہ یلغار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس حملہ کا جو سب سے بڑا فائدہ مسلمانوں کو ملا۔ اس پر بہت کم لوگوں کی نظر جاتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک سوال کا واقعاتی جواب حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور وہ سوال ہے۔

”اگر تیمور نہ آتا تو ہندوستان میں کیا صورت حال پیدا ہوتی؟“

تفصیل اور شواہد کا موقع نہیں، مختصر اُصرف اتنا اشارہ کافی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن کو چھوڑ کر وسطی اور شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی بعینہ وہی حالت تھی جو ان ترک فاتحین کی آمد کے وقت یہاں کے ہندوؤں کی تھی۔ جس کا ذکر ہم اس تبصرہ کے آغاز میں کر آئے ہیں۔

اب آپ اس واقعاتی پس منظر میں سوچیے کہ باہر سے اگر تیمور یا کوئی اور مسلمان فاتح نہ آتا تو ہندوستان کے وسطی اور شمالی علاقوں میں کیا ہوتا۔ اس وقت کے حالات ہم کو بجز اس کے دوسرا کوئی جواب نہیں دیتے کہ پنجاب، ملتان اور دہلی تک تو پنجاب کے کھوکھروں کا اقتدار قائم ہو جاتا۔ جوت پرست جاٹ تھے اور جن کے ایک سرغنہ جسرت نے دہلی کے بادشاہوں کو تیمور کی واپسی کے بعد بھی مسلسل تنگ کیا۔ اور دواہ سے دکن تک گوالیار، قنوج، بجنور اور راجپوتانہ کے ہندو راجاؤں کا اقتدار قائم ہو جاتا، جو اندر ہی اندر مسلمان حکومت کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ دکن میں البتہ مسلمانوں کا اقتدار سلاطین بھٹی اور ان کے جانشین خاندانوں کی وجہ سے ضرور قائم رہتا جو اس وقت شمال کی نسبت زیادہ طاقت ور اور مستحکم سلطنت کے مالک تھے۔

اس ہندو گردی سے روکنے والی کوئی مسلمان طاقت نہیں تھی اور ڈھائی سو سال بعد ہی یہاں کے فاتح مسلمانوں کی غلامی کے اسباب پیدا ہو چکے تھے۔ اس رسوا کن انجام سے ان کو صرف تیمور کے حملہ نے بچایا۔

تیموری یلغار سے گھات میں لگی ہوئی ہندو طاقت ایک مرتبہ اور مسلمانوں کی ترکانہ یوں سے مرعوب ہو گئی۔ اب اس کے سامنے صرف دہلی کے کمزور جگدالو بادشاہ نہ رہے بلکہ بھراہر کے کناروں سے جتنا کہ کنارہ تک وسیع علاقوں کو فتح کرنے والی ایک عظیم الشان شخصیت ابھر کر سامنے آگئی جس نے اس کی اٹھتی ہوئی گردن کو اٹھنے سے پہلے ہی نیچے جھکا دیا۔

اس لیے یہ کہنا بجا ہو گا کہ تیمور کا حملہ دراصل مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ ہندو اقتدار کے دوسرے جنم کے خلاف تھا۔ تیمور کی واپسی کے بعد جو افراتفری مچی اگر وہ اسی طرح برقرار رہتی اور لودی خاندان برسر اقتدار نہ آتا تو ہندو گردی کا خطرہ جسے تیموری یلغار نے سر سے ٹال دیا تھا دوبارہ رونما ہو جاتا، چنانچہ بھولوں کے منظر پر آنے سے پہلے ہم کو شمال میں جبر کھوکھر کی بدھتی ہوئی جہالتوں قنوج اور گوالیار کے قلعوں میں ہندوستان کے راجاؤں کی پراسرار آمد و رفت اور خفیہ ملاقاتوں کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ لودی خاندان بلکہ صحیح معنوں میں صرف سکندر بن بھول لودی نے اسلامی عظمت و اقتدار کی اس گرتی ہوئی عمارت کو اپنے عملے شاہی پرروک لیا۔

بلاشبہ یہ یورپی خاندان کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مسلمانوں کی ڈھلتی ہوئی عظمت کو سلاطین مغلیہ کی آمد تک حفاظت سے سنبھال کر رکھا۔ اور یہ امانت کسی اندرونی ہندو اور انقلاب میں لٹنے سے بچ گئی۔

مجموعی طور پر ان ترک اور پٹھان سلاطین کے تین سو سالہ دور حکومت میں ہندوستان کے رہنے والے پہلے کی نسبت زیادہ امن و آرام اور خوش حالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ان سلاطین میں سے اکثر صحیح العقیدہ خداترس اور نیک بادشاہ تھے۔ انہوں نے اپنی ہندو رعایا کے ساتھ بھی بڑی رواداری اور انصاف کا سلوک کیا اور ہندوؤں کے مذہب و تمدن، معاشرت اور رواج سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ان کے دور میں ہندوستان کے مذہب و تمدن میں ایک نئی قوت پیدا ہو گئی۔ اور جامد برہمنیت اور الجھے ہوئے ویدانتی فلسفوں کی جگہ وحدانی تصورات اور نئے نئے تحرکی نظریوں کے علوم و فنون کی ترقی کے بند دروازوں کو کھول دیا۔

(محمود فاروقی مترجم کتاب ہندا)



# خاندان مغلیہ

## ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی

پانی پت کی فتح کے بعد مقابل میں کوئی طاقت نہیں رہی تھی۔ بابر نے دہلی پہنچ کر تخت سلطنت کو اپنے جلوس سے زینت بخشی اور جی کھول کر فیاضی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ اس فتح کے شکرانہ میں سمرقند، کاشغر، عراق اور خراسان کے لے بابر تاتاری مغلوں نے اپنے وطن سے نکل کر دہلی، ماوراء النہر ایران اور خراسان اور ایشیا کے تقریباً پون حصہ پر قبضہ کر لیا۔ چنگیز خاں اور بلاکو کی تلوار نے عرب و عجم کے بیشتر ملکوں کو فتح کر لیا (۱۵۱۹ء) ان کے بعد امیر تیمور نے والگاسے گنگا کے کنارے تک مغل فتوحات کی دھاک بٹھادی (۱۵۱۹ء) تیمور کے مرنے کے بعد اس عظیم الشان سلطنت کے تمام اجزاء پریشان ہو گئے۔ اور جگہ جگہ خود مختار مغل حکمرانوں نے اپنی اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ ان میں ہمیشہ جنگ و جدال رہنے لگی۔ بابر کی پیدائش کے وقت سمرقند پر بابر کا ایک چچا سلطان احمد مرزا حاکم تھا۔ بدخشاں، قندھار، ترمذ اور حصار پر سلطان محمود مرزا کی حکومت تھی۔ کابل اور غزنی پر الٹ بیک مرزا قابض تھا۔ تاشقند اور شاہ رخ پر بابر کا ماموں سلطان محمود خاں حکمران تھا اور خراسان پر سلطان حسین مرزا کی فرماں روائی تھی۔ ولایت فرغانہ پر بابر کا باپ عمر شیخ مرزا حاکم تھا۔ عمر شیخ مرزا سلطان ابو سعید مرزا کا بیٹا تھا۔ ابو سعید امیر تیمور کے بیٹے میراں شاہ کا لہجہ تھا۔ عمر شیخ مرزا کی اپنے بھائیوں اور سسرال والوں سے ہمیشہ لڑائی رہی۔ اس کی وفات ۹۹۹ھ کو قلعہ اخسی میں ہوئی۔ بابر کی ماں قتلچ نگار خانم یونس خاں مغل کی بیٹی تھی۔ یونس خاں چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا۔ اس طرح بابر کی رگوں میں تیمور اور چنگیز دو اولوالعزم ناتحوں کا خون جوش ترن تھا۔ بابر نے اپنی ماں کے متعلق لکھا ہے: اکثر معرکوں اور لڑائیوں میں میری ماں ساتھ دیتی تھی (ترک بابر)، اس کا انتقال ۹۹۹ھ میں کابل میں ہوا۔ بابر کا وطن فرغانہ تھا جو ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ سیر ریاست دریائے سیحون کے دوہان پر دونوں کناروں پر واقع تھی۔ اس کے مشرق میں کاشغر، مغرب میں سمرقند، جنوب میں کوستان بدخشاں، شمال میں غیر آباد علاقہ تھا۔ اس کے قصبوں میں اوش جہاں کے قطب الدین بختیار کاکی تھے، مرغیناں جو صاحب ہدایہ کا وطن تھا اور خجند جہاں کے بزرگ خواجہ کمال خجندی گورے ہیں، بڑے قصبے تھے۔ اخسی دار الخلافہ تھا۔ اس کا قلعہ سیحون کے کنارے اونچے پہاڑوں پر بنایا تھا۔ بابر ۹۹۹ھ میں پیدا ہوا۔ شاعر جامی کا شعر ہے:

اندیشش محرم ناد آں شہ مکرم      تاریخ مولدش ہم آندیشش محرم

بابر ۵ برس کی عمر میں اپنے چچا سلطان احمد مرزا کے پاس سمرقند چلا گیا اور اس کی نسبت چچا کی رڈ کی عائشہ سلطان بیگم سے ہو گئی۔ سمرقند اندجان سے ۵۰ میل پہلے ہے۔ بابر کی تعلیم و تربیت قاضی عبداللہ خواجہ مولانا کے سپرد ہوئی۔ یہ بزرگ شیخ الاسلام برہان الدین کی اولاد میں سے تھے اور خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید تھے۔ فرغانہ کے مذہبی مقتدا تھے۔ بارہ سال کی عمر میں بابر شیخ فرید بیگ کی اتالیقی میں اندجان گیا۔ اسی سال سلطان احمد مرزا اور بابر کے ماموں سلطان محمود خاں نے مل کر فرغانہ پر حملہ کیا اور عمر شیخ مرزا کا بھی اسی (شاد میں انتقال ہو گیا۔ بارہ رمضان ۱۰۰۰ھ میں بارہ سال کی عمر میں قلعہ فرغانہ میں تخت نشین ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے شوال ۱۰۰۰ھ میں سمرقند پر حملہ کیا لیکن برف باری کی وجہ سے لوٹ آیا۔ ۱۰۰۱ھ کی فصل بہار میں دوبارہ سمرقند پر حملہ کیا۔ بابر نے سمرقند پر حملہ کیا اور شیبانی خاں کو شکست دے کر سمرقند پر قبضہ کر لیا پھر سمرقند پر سلطان علی مرزا نے قبضہ کر لیا اور بابر صحرانوردی میں یہاں سے وہاں دوڑتا رہا پھر وہ ترمذ پہنچا اور (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لوگوں کو انعامات روانہ کیے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اور اکثر بزرگوں کے مزاروں پر نذرین بھیجیں اور ہندوستان کے خزانوں سے بدخشاں اور کابل کے باشندوں کے لیے بھی کافی زر نقد روانہ کیا۔ اس کے نطف و کرم سے سارے ہندوستان میں خوشی اور اطمینان کی لہریں دوڑ گئی۔ بابر نے ہندوستان کے امراء کی بھی بڑی دلہری کی۔ لیکن وہ دل و جان سے اس کے مطیع نہیں ہوئے اور قلعوں میں پناہ گزیں رہے۔ چنانچہ سنہ ۹۷۱ھ میں قاسم سنبھلی، بیانہ میں نظام خاں، اکور میں حسن خاں میواتی اور گویار میں تانار خاں، سارنگ خاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہے۔ اٹا وہ قطب خاں اور کاپی عالم خاں کے قبضہ میں تھے۔ قنوج اور شمال مشرق کے سارے علاقے پٹھانوں کے قبضہ میں تھے۔ انہوں نے بہار خاں کے بیٹے کو سلطان محمد کا لقب دے کر بادشاہ بنالیا تھا اور بہار تک کے علاقہ پر اسی کا قبضہ تھا۔ نصیر خاں لوحانی اور معروف فرہلی جیسے امراء نے بھی اس کی اطاعت اختیار کر لی تھی۔ مہابن کے قصبہ پر سلطان ابراہیم کے ایک غلام مرغوب نامی نے قبضہ کر رکھا تھا۔

جب یہ امیر سیدھی راہ پر نہیں آئے تو بابر نے ان پر لشکر روانہ کیا۔ اس فوج کشی سے کچھ پٹھان مطیع ہو گئے۔ فیروز خاں، سارنگ خاں اور مصطفیٰ فرہلی کے بھائی شیخ بایزید نے حاضر ہو کر جاگیر پائی۔ شیخ کھورن بھی دو آبہ کی جمعیت کو لے کر بادشاہ کے حضور میں آگیا۔ یہ شخص ہندوستان کا معزز امیر تھا۔ ظرافت اور موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ بابر نے سنبھلی شاہزادہ ہمایوں کی جاگیر میں عطا کیا۔ ہمایوں نے سنبھلی پر حملہ کر کے قاسم سنبھلی کو گرفتار کر لیا اور بابر کے حضور میں بھیج دیا۔ ایک دوسرے لشکر نے بیانہ پر حملہ کر کے نظام خاں کا محاصرہ کر لیا۔

اسی سال رانا سانگا نے رنٹھبور کے ایک نواحی قلعہ کھنڈ پار پر حملہ کر کے اسے حسن ولد لکھن سے چھین لیا۔ ادھر لوحانی پٹھان پچاس ہزار کی تعداد میں قنوج سے آگے بڑھ کر پیش قدمی کرنے لگے۔ بابر نے ہمایوں کو ان امراء کے ساتھ جو دھولپور پر متعین کیے گئے تھے پٹھانوں کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ ہمایوں چلا تو سید مہدی خواجہ اور محمد سلطان مرزا بھی جو اٹا وہ کی مہم پر گئے ہوئے تھے اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ہمایوں نے اس یلغار میں تمام شمالی علاقہ کو جو نوڑ تک فتح کر لیا۔

رانا سانگا کی جدوجہد | اسی اثناء میں رانا سانگا اور حسن خاں میواتی نے باہمی اتفاق سے سلطان محمود کو جو

(بقیہ حاشیہ بابر صفحہ گزشتہ) دو تین سو آدمی ساتھ لے کر کابل پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کابل پر سلطان حسین مرزا کے حاکم ارغون خاں کی حکومت تھی۔ بابر نے اس کے بھائی مقیم خاں کو شکست دے کر کابل پر قبضہ کر لیا اور شیبانی خاں کے قتل کے بعد بابر نے تیسری مرتبہ ہر قند و بخارا کو فتح کیا۔ لیکن آٹھ ماہ بعد ہی اوزبکوں نے اسے شکست دے کر وہاں سے نکال دیا۔ بابر نے افغانستان پر قناعت کر لی اور بادشاہ کا لقب اختیار کر کے مستقل سلطان بن گیا۔ واضح رہے تیموری خاندان میں بادشاہ کا لقب پہلی مرتبہ بابر نے ہی رکھا۔ اب تک تیمور کی اولاد مرزا کہلاتی تھی۔ بابر نے اسلام دہلی سے پہلے ہی چار حملے پنجاب پر کیے۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت لودی خاندان کی حکومت پنجاب سے بہار تک تھی۔ دکن میں بھی سلطنت مستحکم بن چکی تھی۔ گجرات کی بادشاہت ۷۵ برس کے اقتدار کے بعد نزع کے عالم میں تھی۔ مالوہ کی خود مختار حکومت جس کا دار الخلافہ مندو اندور تھا۔ رانا سانگا کے حملوں سے دم توڑ رہی تھی۔ بنگال میں ایک خاندان الگ خود مختار بادشاہی کر رہا تھا۔ ہندوؤں میں چوڑا راجہ رانا سانگا اور بھنگر کا راجہ مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے تنگ و دوڑ کر رہے تھے۔ ان حالات میں اگر بابر نہ آتا تو ہندوستان کے مسلمانوں کو انہی تنگ و دوڑ ہونا پڑتا جن کا تیمور کے حملہ کے وقت امکان تھا۔ جن کی تفصیل ہم اس سے پہلے بیان کر آئے ہیں۔

سکندر لودی کی اولاد میں سے تھا، بادشاہ بنالیا۔ اور ایک بڑا لشکر جمع کر کے یساور کی طرف سے پیش قدمی کی اور فتح پور سیکری پہنچ گئے۔

بیانہ کے حاکم نظام خاں نے مصالحت و اطاعت کے لیے بابر کے حضور میں بہت سے عریضے روانہ کیے۔ اور مسعود رفیع الدین صفوی کے توسط سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ سید صفوی بلخ کے سادات عظام میں سے تھے۔ اور علم حدیث کے بڑے ماہر عالم تھے۔ سکندر لودی کے عہد میں یہ ہندوستان آئے تھے۔ ان کو حضرت مقدس کا خطاب ملا ہوا تھا۔

جب رانا سانگانے کھنڈ پار پر قبضہ کیا تھا تو اس طرف کے علاقوں میں ہندوؤں کو بڑی طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کی شورہ پستی دیکھ کر تاتار خاں، سارنگ خاں نے بھی متعدد عریضے بادشاہ کے پاس بھیجے تھے اور قلعہ گوالیار سپرد کر دینے پر رضامند ہو گیا تھا۔ لیکن جب خواجہ رحیم دار اور شیخ کھورن قلعہ کو تحویل میں لینے وہاں پہنچے تو اس کی نیت بدل گئی۔ شاہی امیر شیخ محمد غوث گوالیاری عامل کے ذریعہ قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اور تاتار خاں سے جبراً قلعہ چھین لیا۔ تاتار خاں کو بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا گیا۔

دھول پور کے قلعہ پر محمد زیتون افغان قابض تھا۔ اس نے بھی قلعہ امرائے بابر کے حوالے کر دیا اور خدمت میں حاضر ہو گیا۔

رانا سانگانے بیانہ پر یورش کی اور وہاں کچھ دن ٹھہر کر فتح پور میں آیا۔ رانا کے مقابلہ کے لیے بابر نے بھی تیاری کی اور آگرہ میں جتنی بھی فوج تھی ہمراہ لے کر باہر نکلا۔ ہمایوں کو لکھ بھیا کہ جوہنپور پر کسی امیر کو متعین کر کے جلد رانا سے مقابلہ کے لیے آگرہ آجائے۔ اس اثناء میں ہمایوں حرنند اور بہار بھی نصیر خاں لوحانی سے چھین چکا تھا۔ اس نے جوہنپور کی حکومت امیر شاہ حسن اور امیر جنید برلاس کو تفویض کی اور وہاں سے کاپی پہنچ کر عالم خاں کو صلح سے یا لڑائی کے ذریعہ مطیع بنالیا۔ اور وہاں سے تیزی کے ساتھ کوچ کرتے ہوئے باپ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

اس زمانہ میں خواجہ خاوند نقشبندی جو ایک باکمال بزرگ تھے، کابل سے ہندوستان آئے۔

لے بابر نے اس امیر کو فی البدیہہ یہ شعر لکھ کر بھیجے تھے۔

باترک ستیز کن لے میر بیانہ چالاک و مردانگی ترک عیان ست

درد و دنیا و نصیحت نکتی گوش ہر جا کہ عیان ست چہ حاجت بہ بیان ست

یہ بزرگ میر معین الدین مصنف "تفسیر معنی" کی اولاد میں سے تھے۔ سالہا سال مدینہ منورہ میں مجاوری کی۔ اور مولانا جلال الدین دوانی سے علم حدیث و تفسیر حاصل کیا۔ یہ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے سلیم شاہ کے عہد میں شیخ علاؤ الدین لودی سے ۹۵۰ھ میں مناظرہ کیا تھا۔ بعض کہتے ہیں ۹۵۰ھ میں انتقال ہوا اور بعض ۹۵۰ھ بتاتے ہیں۔ یہ سلیم شاہ پسر شیر شاہ کا عہد تھا۔ ان کا مزار اکبر آباد میں آصف جاہ کی حویلی میں ہے۔ (بحوالہ معجز الواصلین)

خواجہ خاوند نقشبندی۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بڑے مشہور بزرگ ہیں۔ والد کی طرف سے خواجہ علاؤ الدین عطار سے ان کا نسب ملتا ہے۔ بیس سال کی عمر میں سلسلہ طریقت اختیار کیا اور بخارا سے سیاحت کے لیے نکلے اور کابل پہنچے۔ وہاں سے کشمیر گئے۔ ایک عرصہ تک وہاں مقیم رہے۔ کشمیر سے ہندوستان آکر لاہور دہلی اور اکبر آباد میں قیام کیا۔ آپ شاہ جان کے عہد تک زندہ تھے آپ کی وفات بروز منگل ۱۲ ماہ شعبان ۹۵۰ھ میں لاہور میں ہوئی۔ مزار شاہیہار باغ کے قریب ہے۔ مقبرہ شاہ جانی امیر نواب سعید خاں نے تعمیر کرایا۔ بدلاؤنی نے جس کا ذکر کیا ہے وہ کوئی دوسرے بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ نام بالکل ملتا جلتا ہے۔ کیونکہ یہ ۱۵۰ سال سے زائد عمر پانا بظاہر قابل قیاس نہیں۔

**رانا سانگا کی شکست** | رانا سانگا ایک ٹڈی دل لشکر کو لے کر میدان میں آیا تھا۔ بابر کے پاس اس کے مقابلہ میں بہت مختصر فوج تھی۔ اس کے امیروں نے رائے دی کہ اگرہ کے قلعہ میں کچھ فوج چھوڑ کر بادشاہ پنجاب چلا جائے اور دیکھے غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ بابر نے اس بزدلانہ مشورہ کو قبول نہ کیا اور جان لڑا دینے کا عزم کر لیا۔ اس کے حوصلہ کو دیکھ کر امرا نے بھی قرآن پاک پڑھتے رکھ کر جنگ میں لڑ کر جان دے دینے یا دشمن پر فتح حاصل کرنے کا حلف اٹھایا۔ جب رانا کی فوج سے مقابلہ ہوا تو امراء نے بہادری کے خوب ہی جوہر دکھائے۔ آخر ایک گھسائی کی لڑائی کے بعد رائے نے بابر کو فتح دی۔ حسن خاں میواتی پیشانی پر تیر لگنے سے گر کر مر گیا۔ اس کی لاش لوگوں نے ایک کنویں میں ڈال دی۔ اس کے گرتے ہی باقی ساری فوج بھاگ نکلی۔

**نقلی حسن خاں** | سلیم شاہ کی وفات کے بعد ۹۶۶ھ میں ایک میواتی نے جو بڑا قد آور اور جسم تھا۔ حسن خاں ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور میواتیوں کو خاص علامتیں بتائی تھیں اور بہتوں کو اس پر یقین آ گیا تھا۔ ۹۶۵ھ میں میں نے بھی مصنف ہذا، اس کو آگرہ میں دیکھا ہے۔ اس کے چہرہ سے تو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی سردار ہے بلکہ وہ بد شکل گنوار معلوم ہوتا تھا۔ خان خاناں بیرم خاں کہا کرتے تھے کہ حسن خاں بڑے رعب و اب کا آدمی تھا اور شاعر بھی تھا۔ اس کے شعر بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ یہ شخص بہر حال کسی صورت بھی حسن خاں نہیں تھا۔ اس کو چند دن بعد میواتی خان زادوں نے غیرت کے مارے قتل کر دیا۔

**بابر کی وفات** | رانا سانگا پر فتح پانے کے بعد بابر بیمار ہو گیا۔ اور بیماری کچھ اس طرح اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی کہ جان بے کرمی ملی۔

لے رانا سانگا میواڑ کے راجاؤں میں کیا دن و اں راجہ تھا جو ۱۵۰۹ء میں چتوڑ کے تخت پر بیٹھا۔ چتوڑ کے راجہ خود کو سورج بنی خاندان سے بتاتے ہیں۔ آخر سورج بنی راجہ چھٹی صدی عیسوی میں کاٹھیاواڑ میں اپنے دار الخلافہ بلبی میں سارے خاندان سمیت قتل کر دیا گیا تھا۔ صرف ایک حاملہ رانی بچ گئی جس سے کیشور دت پیدا ہوا اس کی چوتھی پشت میں بابر راول نے چتوڑ فتح کر کے آٹھویں صدی میں اس ریاست کی بنیاد رکھی۔ تیسویں راجہ تیسویں اول کے عہد میں ۱۳۵۰ء میں سلطان علاؤ الدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر کے رانی پدمنی کو اسیر کر لیا تھا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ راجہ کی نسل میں صرف کرن سنگھ پکا جو پھاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ تینتالیسویں راجہ اسی دوم کے وقت غیاث الدین تغلق نے حملہ کر کے چتوڑ فتح کیا تھا۔ پنتالیسویں راجہ جیہڑ سے رانا سانگا کے عہد تک دو سو سال چتوڑ پر مالوہ اور گجرات کے مسلمان بادشاہ حملہ کرتے رہے۔ جب رانا سانگا برسر اقتدار آیا تو ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ سکندر شاہ لودی کے بعد کوئی مرکزیت باقی نہیں تھی۔ سانگانے راجپوت ریاستوں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کر لیا۔ اور مارواڑ، اجیر، گوالیار اور رائیس کے تمام راجاؤں نے اس کو اپنا بیڑا مان لیا اور ان سب کی مشترکہ فوج دو لاکھ پر مشتمل تھی۔ اس کی خود فوج ایک لاکھ تھی۔ رائے سین کے راجہ سعیدی کی ۳۰ ہزار ڈونگر پور کے راول اور ۵۰ لاکھ اول کی ۱۲ ہزار میمنی رائے کی ۱۲ ہزار میوات کے حسن خاں کی ۱۲ ہزار اور محمود خاں لودی کی ۱۰ ہزار بوندی کے راول زریٹ پاٹا کی ۷ ہزار سردی کھنچی کی ۶ ہزار ایڈر کے رافہا راول کی ۴ ہزار بیرم دیویر تہ کی ۴ ہزار۔ یہ دو لاکھ فوج لے کر سانگانے بیانہ کے نواح بمقام خوانہ میں بابر سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ اگر باہر بار جاتا تو ہندوستان پر بے مسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا۔ اور راجپوتوں کا راج قائم ہو جاتا۔ رانا سانگا کا اصل نام سنگھرام تھا۔ وہ اس شکست کے سال یعنی ۱۵۳۹ء میں میواڑ کے پھاڑوں میں فوت ہوا۔ اس نے ۱۹ سال حکومت کی۔ پہلے بابر کس مرض میں گرفتار ہوا نہ تو فرشتہ نے لکھا ہے نہ کسی اور مورخ کے ہاں نظر سے گزرا۔ بابر آگرہ میں ۱۵۴۰ء میں بیمار ہوا۔



بابر نے سنہ ۹۳۰ھ میں اس عالم فانی سے کوچ کیا۔ اس کی عمر ۵ سال تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ تخت نشین ہوا تھا اور ماوراءالنہر، بدخشاں، کابل، کاشغر اور ہندوستان میں اس کی سلطنت کی کل مدت ۳۸ سال ہے۔  
بابر کی تاریخ وفات ہے ۷

تاریخ وفات شاہ بابر

در نہ صدوسی و ہفت بودہ

لفظ ”شش شوال“ بھی اس کی وفات کا مادہ تاریخ ہے۔

تاریخ ولادت ۷

چوں در شش محرم زاد آں شہ مکرم

تاریخ مولدش آمد شش محرم

خواجہ کلال بیگ نے بابر کے مرثیہ میں یہ شعر کہا ہے ۷

بے تو زمانہ و فلک بے مدار حیف

باشد زمانہ و تو نباشی ہزار حیف

بابر کے وقت کے ممتاز عالم شیخ زین خاں تھے۔ جنہوں نے تاریخ واقعات بابر کی کا جو خود  
عہد بابر کے عالم | بابر بادشاہ نے لکھی ہے، بڑی عمدہ عبارت میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ شعر ان کے ہی طبع زاد

ہیں ۷

ماچہ کر دیم وچہ دیدی وچہ شنیدی ازما

می سپردیم اگر سے طلبیدی ازما

آرمیدی بہ رقیباں و رمیدی ازما

بہر دل بردن ما حاجت بیداد نبود

تنگ شد بر جان من اہ بروں رفتن ز تن

جامع المعقول و المنقول مولانا حسن

بس کہ گشتم تنگ دل در آرزوئے آں دہن

ہست شعر من ز عقل و نقل خواہم شنود

ایک دوسرے فاضل مولانا بقائی تھے۔ انہوں نے مخزن کی بحر میں ایک شنوی لکھی تھی۔

ایک اور عالم مولانا شہاب الدین معنائی تھے۔ متعلک کے فن میں ان کو ایسی مہارت تھی کہ ان کے سامنے ان کے دوسرے

لے بابر کی وفات بروز ہیرہ جادی الاول سنہ ۹۳۰ھ میں ہوئی۔ اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی لاش کابل میں دفن کی جائے۔ اس لیے چند دن میت

”نور انشاں باغ“ جسے اب آگرہ میں آرام باغ کہتے ہیں میں امانت رہی، پھر کابل لے جا کر ”قدم گاہ رسول“ میں دفن کیا گیا۔ شاہ جہان نے قبر پر سنگ مرمر کا

مقبورہ تیار کرایا۔

لے ان کا پورا نام شیخ زین الدین خاں خوانی تھا اور تخلص وفانی، آگرہ میں جنہا کے دوسری طرف ان کی یادگار ایک مدرسہ اور مسجد ہے۔ فن معنائی تاریخ گوئی اور بیہ گوئی،

نظم و نثر کی تمام اصناف میں بے مثل عالم تھے۔ ان کا انتقال چار گروہ کے حدود میں سنہ ۹۳۰ھ میں ہوا۔ آگرہ میں اپنے ہی مدرسہ میں دفن ہوئے۔

اور صاف و کمال لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

جس زمانہ میں اسماعیل صفوی کی طرف سے خراسان پر درمیشی خاں حاکم ہو کر آیا تھا۔ ایک محدث میر جمال الدین نے ایک دن اپنے وعظ میں آیت

”إِنَّ دَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ“

اور یہ صحیح حدیث کہ ”دنیا کی پیدائش سات دن میں ہوئی“ پڑھی۔ اور ان دونوں کے مضمون میں جو اختلاف معلوم ہوتا ہے آیت میں آسمان و زمین کے چھ دن میں پیدا ہونے اور حدیث میں دنیا کے سات دن میں پیدا ہونے کا ذکر ہے، اس کو رفع کیا تھا۔ مولانا شہاب الدین نے ان کی تقریر کو رد کر کے حدیث اور آیت کی مطابقت میں کئی ایک عمدہ وجہیں لکھی تھیں۔ اس رسالہ پر اکثر علماء نے تقریظیں لکھی تھیں۔ میں نے (مصنف بد اوئی) بھی نظم و نثر میں تھوڑا بہت لکھا تھا۔ ایک رباعی یہ ہے

ایں نسخہ کہ آمدہ است چوں سحر حلال  
نظم و نثرش پاک تر از آب زلال  
نورے ست ز انوار شہاب ثاقب  
کز منقبتش زبان فکرت شدہ لال  
مولانا شہاب الدین نے ”اسم کاشف“ کا معنی ان اشعار میں پیش کیا ہے

از ہر فریب دل ما خستہ دلاں  
ہر لحظہ ز ناز آں صنم غنچہ دباں  
بر صفحہ و گل کرد رقم آں سر زلف  
وانگہ رخ مہ کرد ز یک گوشہ عیاں

بہایوں بادشاہ نے ۱۰۲۰ھ میں جب سفر گجرات سے مراجعت کی تھی۔ اس وقت مولانا شہاب الدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی وفات کا مادہ تاریخ میرا خوند مؤرخ نے کہا تھا:-

”شہاب ثاقب“

بابر کی علم دوستی | خود بابر بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کی خاص ایجاد ”خط بابر“ ہے۔ اس خط میں قرآن لکھ کر

لے ارد بیل کے صفوی شیخ زادوں میں سلطان جید رکاو کا تھا۔ ۱۰۲۰ھ میں ارد بیل میں پیدا ہوا۔ تیرہ سال کی عمر میں چار ہزار کی جمعیت فراہم کر کے شیروان شاہ کو شکست دی اور تبریز، آذربائیجان اور ارد بیل کے علاقہ پر خود مختار بادشاہ بن گیا۔ تبریز کو پائے تخت بنایا اور شیعہ صفوی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اصفہان و شیراز پر سلطان مراد ترکمان کو شکست دے کر قبضہ کر لیا۔ بغداد بھی اس کے تسلط میں آ گیا تھا۔

صفوی خاندان کے اس پہلے بادشاہ نے ایران کے بڑے حصہ پر ۲۴ سال حکومت کی اور ۳۷ سال کی عمر میں شہر سراب میں بیمار ہو کر انتقال کیا۔ مشہور صفوی بادشاہ طہماسپ اسی کا بیٹا اور جانشین تھا جس سے مدد لے کر بہایوں دوبارہ ہندوستان آیا تھا۔  
اسے معما گوئی کے فن میں ان کا ایک رسالہ ”تبیین و توضیح علم معما“ مشہور رہا ہے۔

اس نے مکہ معظمہ روانہ کیا تھا۔ اس کی ترکی اور فارسی اشعار کا ایک دیوان بھی مشہور ہے۔  
 بابر نے ایک کتاب ”فتح مبین“ (دب اور سی پر زبر) فقہ حنفی میں لکھی تھی، اس کی شرح شیخ زین نے ”شرح مبین“  
 دب زبر کے ساتھ کے نام سے لکھی ہے۔  
 فن عروض میں بھی بابر کے رسالے مشہور ہیں۔

## نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ

باپ کے مرنے کی خبر ملتے ہی ہمایوں سنبھل سے کوچ کر کے دار الخلافہ آگرہ پہنچا۔ اور وکیل سلطنت و وزیر مطلق امیر  
 حنیفہ کے مشورہ و حمایت سے ۱۵۵۳ء میں تخت نشین ہوا۔  
 شاعروں نے اس کے جلوس کی تاریخ لکھی ہے ۵  
 محمد ہمایوں شاہ نیک بخت کہ خیر الملوک است اندر سلوک  
 چو بر مسند بادشاہی نشست شدش سال تاریخ ”خیر الملوک“  
 اس نے جلوس کے موقع پر سونے سے بھری ہوئی کشتیاں تقسیم کرائی تھیں۔ اس لیے کسی نے اس کی تاریخ جلوس  
 ”کشتی نر“ بھی نکالی۔

لے فتح مبین، فرشتہ نے بابر کی اس کتاب کا نام ”مثنوی مبین“ لکھا ہے۔ ممکن ہے پورا نام ”مثنوی فتح مبین“ ہو۔ کیونکہ یہ کتاب ترکی نظم میں تھی اور  
 فقہ کے موضوع پر۔ بابر کی فقہ حنفی میں مہارت کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے ”وہ مجتہدانہ قوت رکھتا تھا“ اس مثنوی کے چند شعر ”واقعات بابر“ میں  
 بھی درج ہیں۔ اس نے اپنے حالات پر جو ترک لکھی ہے وہ بھی ترکی میں ہے۔ اکبر کی فرمائش پر عبدالرحیم خان خاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اسی کا  
 نام ”واقعات بابر“ ہے۔ محمد قاسم فرشتہ نے بابر کی ترک کے متعلق لکھا ہے: ”بنوعی نوشتہ کہ فصحا قبول دارند“ بابر علم موسیقی، شعر انشا اور ملا  
 میں بھی ماہر تھا ”فرشتہ، فرشتہ نے بابر کے نام سے ایک شعر نقل کیا ہے ۵

باز آئے آئے ہمائے کہ بے طوطی خطت نزدیک شد کہ زاغ برداستخواں من

لیکن یہ فرشتہ کی غلطی ہے۔ کیونکہ بابر نے اپنی ترک میں یہ شعر خود حسن یعقوب کا بتایا ہے۔ بابر بڑا اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔ خواجہ آصفی کے  
 کلام کی نسبت اس نے بڑی موزوں رائے دی ہے۔ ”شعر او از رنگ و معنی خالی نیست اگرچہ از عشق و حال بے بہرہ است“ فن عروض میں بھی  
 بابر بڑی مہارت تھی۔ اس نے خود ترکی میں ایک شعر کہا ہے جو ۵۰ اور ان میں تقطیع ہو سکتا ہے۔ عروض پر بھی اس کا ایک رسالہ ہے۔ موسیقی میں  
 بھی بڑی اچھی دسترس تھی۔ معاصر موسیقاروں کے حسن و قبح پر بڑا اچھا تبصرو کیا ہے۔ مشہور مصور ہزاد بابر کا ہم عصر تھا۔ اس نے ہزاد کی ایک  
 تصویر کے نقائص بھی ظاہر کیے ہیں۔ بابر حقیقت پسند انسان تھا۔ چنانچہ اس کے راست باز قلم نے نہ خود اپنے باپ کے عیوب چھپائے اور نہ اپنے جانی  
 دشمنوں کے ہنروں پر پردہ ڈالا۔ تاتاری مغل چنگیز خاں کے لائحہ عمل ”تورہ چنگیز خانی“ کو بڑا مقدس سمجھتے تھے۔ بابر نے لکھا ”تورہ چنگیز خانی کوئی آیت  
 نہیں کہ خواہ خواہ اس پر عمل کیا جائے۔ جس کسی نے اچھی بات نکالی ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر باپ نے کوئی بد روش جاری کی ہو تو اس کو ٹھکی سے بدل دینا  
 چاہیے۔“ غرض بابر دربار میں بادشاہ، جنگ میں سپہ سالار، بزم میں یار باش رند اہل علم کی صحبت میں محقق اور نقاد تھا۔

## ہمایوں کی لشکر کشی

سلطنت کے نظم و نسق سے فراغت پا کر ہمایوں نے کالنجریہ فوج کشی کر کے اُسے فتح کر لیا جو نیپور میں  
 میں سکندر لودی کے بیٹے سلطان عالم نے بغاوت کر دی تھی اس پر بھی حملہ کر کے اس فتنہ کو ختم کیا  
 ان فتوحات کے بعد آگرہ واپس آکر بادشاہ نے ایک بھاری جشن منعقد کیا۔ اس جشن میں بارہ ہزار آدمیوں کو خلعتیں  
 عطا کی گئی تھیں۔

اسی زمانہ میں محمد زمان میرزا جو کچھ عرصہ سے باغی ہو گیا تھا گرفتار ہو کر آیا۔ ہمایوں نے اسے بیانہ کے قلعہ میں بھیج کر  
 اندھا کر دینے کا حکم دیا تھا۔ لیکن حسن اتفاق سے اس کی بینائی سلامت رہی۔ اور کچھ دن بعد وہ قید سے بھاگ کر گجرات  
 کے بادشاہ سلطان بہادر گجراتی کے پاس پناہ گزین ہو گیا۔

سلطان بہادر گجراتی جس وقت محمد زمان مرزا سلطان بہادر گجراتی کے ہاں گیا وہ چتوڑ کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ موسم  
 نہایت گرم تھا۔ گرمی سے محمد زمان کو اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ طبیبوں نے صرف گلقد علاج  
 میں تجویز کیا۔ مرزا نے سلطان بہادر کے پاس سے تھوڑا سا گلقد منگوایا۔ سلطان نے اپنے شربت دار کو بلا کر پوچھا "شکر  
 کے ساتھ کتنا گلقد ہے؟" اُس نے عرض کیا "بیس سے زیادہ چھکڑے گلقد سے بھرے ہوئے موجود ہیں۔" سلطان نے وہ  
 سارے چھکڑے محمد زمان کے پاس بھجوا دیئے اور معذرت بھی کی کہ "ازراہ کرم معاف فرمائیں۔ حالت سفر میں شکر کے ساتھ  
 فقط اتنا ہی گلقد موجود تھا۔" بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان بہادر کے لیے گلقد کا عرق کشید کیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے

لے شاہان گجرات۔ ابوالفضل کی فہرست کے مطابق گجرات پر سراج چاورہ سے سامت تک سات راجاؤں نے ۱۹۶ سال اور مولاج سونگی سے  
 لکھنول تک دس راجاؤں نے ۲۲۲ سال پھر ہردمول باگھیلہ سے کرن تک چھ راجاؤں نے ۲۶ سال حکومت کی۔ اس کے بعد سے مسلمان بادشاہوں کا سلسلہ  
 ہے جو سلطان مظفر نانک سے شروع ہو کر سلطان مظفر نام کے ہی آخری بادشاہ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ ۱۲ بادشاہ ہیں جنہوں نے اکبر کے عہد تک ۱۶۰ سال  
 حکومت کی۔ ہندی مؤرخوں کا کہنا ہے کہ سلسلہ بکرمی مطابق سلسلہ میں ایک راجہ جس کا نام سراج، پتراج، منراج، بنراج لکھا جاتا ہے۔ یہاں  
 خود مختار حکومت قائم کی تھی۔ یہ زمانہ غالباً راجہ سری بھور دیو والی قنوج کا تھا۔ سلسلہ بکرمی مطابق سلسلہ میں محمود غزنوی نے گجرات کو فتح کیا لیکن یہاں  
 ایک ہندو راجہ کو ہی حکومت سپرد کر دی تھی۔ پھر سلطان معز الدین سام اور قطب الدین ایبک نے بھی گجرات کو فتح کیا۔ لیکن اس کی خود مختاری باقی رہی۔  
 آخری باگھیلہ راجہ کرن یا کارن کو سلطان علاؤ الدین خلجی نے شکست دے کر دکن کی طرف بھاگ دیا اور گجرات دہلی کے تحت صوبہ بن گیا۔ محمد بن فیروز شاہ تغلق  
 کے عہد میں گجرات کے امراء صده نے بغاوت کی اور سلطان محمود تغلق کے زمانہ تک طوائف الملوک کا دور دورہ رہا۔ سلطان محمود کے عہد میں ظفر خاں  
 نامی سردار نے خود مختاری اختیار کر کے اپنا خطاب سلطان مظفر رکھا۔ یہ ظفر خاں وجہہ الملک کا بیٹا تھا جو نو مسلم برہمن تھا اس کا قبیلہ نانک کہلاتا ہے۔  
 مظفر خاں کے بعد اس کا پوتا احمد سلطان ہوا۔ احمد آباد اسی بادشاہ نے بسایا تھا۔ اس کے بعد محمد شاہ پھر قطب الدین احمد شاہ اس کے بعد داؤد شاہ  
 حکمران ہوئے۔ اس کے بعد محمود شاہ نے گجرات کو بروہی رونق بخشی۔ اس کے بعد سلطان مظفر حکمران ہوا۔ اس کے پاس شاہ اسماعیل صفوی شاہ ایران نے  
 سفارت اور تحفے روانہ کیے تھے۔ اس کے بعد سلطان سکندر تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد نصیر خاں تخت نشین ہوا۔ اسی نے اپنے امراء کی سازش کے خلاف  
 باہر سے مدد طلب کی تھی۔ اس کے بعد سلطان سکندر کا بیٹا سلطان بہادر شاہ تخت نشین ہوا اس بادشاہ کو ہمایوں نے شکست دی تھی۔ پھر خاندیس کے  
 کے شہزادہ میران محمد کو گجرات کے امیروں نے بادشاہ بنایا اس کے بعد سلطان مظفر کا پوتا سلطان محمود تخت پر بیٹھا۔ اس کے بعد ایک مقتدر امیر احمد خاں نے  
 سلطان احمد ثانی اور سلطان مظفر دو دروہ کوں کو یکے بعد دیگرے برائے نام بادشاہ بنا کر حکومت سنبھال لی۔ پھر اکبر نے اس ملک کو فتح کر کے دہلی کے ماتحت کر دیا۔



اس قدر گلقد ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

اس دوران میں محمد زمان میرزا نے اپنے دونوں بیٹوں الخ مرزا اور شاہ مرزا کے ساتھ حملہ کر کے قنوج میں فساد برپا کر دیا  
ہمایوں نے کئی بار محمد زمان میرزا کو بروادہ کرانہ کے لیے سلطان بہادر کو خط لکھے۔ لیکن اس نے ہمیشہ دو ٹوک جواب بھیج دیا۔ اس کی  
اس گستاخی پر ہمایوں نے گجرات کی تسخیر کا ارادہ کر لیا۔

اس زمانہ میں سلطان بہادر نے رانا سانگا کے خلاف لشکر کشی کر کے چتوڑ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس کی طرف سے تاتار خاں  
لودی نے حملہ کر کے بیانہ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور آگرہ تک چھاپے مارنے شروع کر دیئے۔ تاتار خاں نے تین ہزار کی جمعیت  
کے ساتھ میرزا بہندال پر بھی یورش کی۔ اسی لڑائی میں تاتار خاں مارا گیا۔

جس زمانہ میں سلطان بہادر نے چتوڑ کا دوسری مرتبہ محاصرہ کیا تھا اسی وقت ہمایوں نے آگرہ سے گجرات کا عزم کیا۔  
اسی زمانہ میں لاہور سے میرزا کامران نے قندھار پر حملہ کر کے شاہ طہماسپ کے بھائی سام مرزا کو جس بنے ان دنوں خواجہ  
کلاں بیگ کا محاصرہ کر رکھا تھا شکست دی۔ اس فتح کی تاریخ ہے :-

”زدہ بادشہ کامران سام را“

مولانا بیکیس نے تاریخ لکھی ہے

آں دم کہ تاج و کاسہ زرد و نظر نو در بزم و رزم شکل صراحی و نقش جام  
پرسیدم از خرد کہ چہ تاج زلفشاں افگندہ ہچو لالہ حمرا دریں مقام  
گفتا سپہرا ز پئے تاریخ این مصاف افگندہ تاج ز رز شکست سپاہ سام

ہمایوں نے گجرات پر حملہ کا ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر سارنگ پور میں ٹھہر گیا کہ ”ایسے  
سلطان بہادر سے مقابلہ وقت میں جب کہ غنیم چتوڑ کے محاصرہ میں لگا ہوا ہے اس پر فوج کشی کر کے اس محاصرہ سے  
بھاگ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لینا شیوہ مردانگی نہیں بلکہ باعث رسوائی ہے۔“

سلطان بہادر نے بھی جلد از جلد قلعہ چتوڑ کو فتح کر لیا۔ اور اس ہم سے فارغ ہو کر ہمایوں کے مقابلہ کی تیاری کی۔ مندسور  
کے نواح میں فریقین کے درمیان دو ماہ تک حالت جنگ رہی۔ اس دوران میں سلطان بہادر کے لشکر میں غلہ کی رسد بند ہو گئی  
اس کے سپاہی اور مویشی بھوکوں مرنے لگے۔ مجبور ہو کر سلطان بہادر اپنے پانچ معتمد ساتھیوں کے ساتھ خیمہ گاہ کے عقبے  
نکل کر مندسور بھاگ گیا۔ اس فتح کی تاریخ کا قطعہ ہے :-

لے بدافونی تے یہاں فطی کی ہے۔ رانا سانگا نے یابر سے ۱۵۲۸ء میں شکست کھائی تھی اور میواڑ کے پہاڑوں میں بھاگ گیا تھا جہاں اسی سال  
۱۵۲۹ء میں اس شکستہ کے صدمہ سے مر گیا۔ اس صورت میں وہ ۱۵۳۰ء میں کس طرح سلطان بہادر سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ عہد ہمایوں میں بہر حال  
مانگا زندہ نہیں تھا۔ رانا سانگا کے بعد ۱۵۲۸ء میں رتن سی جی جانشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۵۳۰ء میں بکر مات چتوڑ کا راجہ بنا اور  
۱۵۳۱ء میں سلطان بہادر نے حملہ کیا تھا۔ دوبارہ ۱۵۳۲ء میں حملہ کر کے چتوڑ فتح کر لیا اور بکر مات بھاگ گیا۔ اس نے  
۱۵۳۳ء میں پھر چتوڑ پر قبضہ کر لیا تھا

ہمایوں شاہ غازی آنکھ دلاست  
 ہزاراں بندہ چوں جمشید درخورد  
 بغیر وزی چو آمد سونے گجرات  
 منظر گشت فخر آل تیمور  
 بہادر چوں ذیل و خوار گردید  
 شدہ تاریخ آل "ذلی بہادر"

ہمایوں نے بہادر کا تعاقب کیا۔ ایک دن تو مغل لشکریوں نے اسے موتے ہوئے گھیر لیا۔ لیکن وہ جاگ کر نہایت تپ پھرتی کے ساتھ ان کے زرعہ سے نکل آیا اور چھ سات سواروں کے ساتھ گجرات بھاگ گیا۔ البتہ سلطان عالم لودی پکڑا گیا اور اس کے پاؤں کے جوڑ کاٹ دیئے گئے۔

ہمایوں سلطان بہادر کے تعاقب میں احمد آباد پہنچ گیا اور اس شہر کو خوب تاخت و تاراج کیا۔ سلطان بہادر احمد آباد سے بھاگ کر کھنیاہیت اور وہاں سے بندر دیپ کی طرف نکل گیا۔ اس یلغار میں قلعہ جاپانیر پر بھی ہمایوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس قلعہ سے بادشاہ کو بڑا خزانہ غنیمت میں ملا۔ اس مہم کی تاریخ ہے ۹۷۰ھ

تاریخ ظفر یافتن شاہ ہمایوں  
 می جست خرد یافت نہ شہر صفربود

**مرزا عسکری کی سرکشی**  
 سلطان بہادر گجراتی نے دوبارہ سورت کے زمینداروں کو اپنے ساتھ لے کر احمد آباد پر قبضہ کا ارادہ کیا تھا۔ ہمایوں احمد آباد مرزا عسکری کے حوالہ کر کے برہان پور چلا گیا تھا۔ ہمایوں کے جاتے ہی میرزا عسکری نے امیر ہندو بیگ قوچین کی تائید و حمایت سے چاہا تھا کہ اپنے نام کا خطبہ پڑھوا کر بادشاہت کا اعلان کر دے لیکن بہادر خاں کی سرکشی کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوا اور وہ بہادر خاں سے کچھ مقابلہ کر کے جاپانیر کی طرف چلا گیا۔ جاپانیر کے حاکم زدی بیگ کو جب میرزا عسکری کے ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے قلعہ بند کر لیا اور عسکری کو داخل نہ ہونے دیا۔ اور ایک عریضہ بھیج کر ہمایوں کو عسکری کے باغیانہ خیالات کی اطلاع دی۔ جس وقت ہمایوں سندھ سے آگرہ کی طرف جا رہا تھا، میرزا عسکری ہر طرف سے مایوس ہو کر خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا اور سلطان بہادر نے زدی بیگ سے صلح کر کے جاپانیر پر قبضہ کر لیا۔

اسی سال جمالی کنبو کی وفات ہوئی، ان کا مادہ تاریخ ہے: "خسرو ہند بودہ"

قلعہ جاپانیر ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام "جاپانیر" لکھا ہے۔ وہ کتبہ "نہایت عمدہ اور خوش نظر قلعہ ہے جو بے حد عمدہ پھاڑ پر ہے۔ قلعہ پر چلنے میں ڈھانی کوس کا بے حد طویل اور دشوار گزار راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس راہ میں جگہ جگہ دروازے نصب ہیں۔ ایک جگہ ساتھ گڑ کی چٹان پر تختہ بندی کی گئی ہے جو لڑائی میں مورچہ کا کام دیتی ہے۔ یہاں میوے عمدہ ہوتے ہیں۔ پھاڑ پر بالائی قلعہ کو "پادا" کہتے ہیں۔ دوسرا قلعہ پھاڑ کے نیچے ہے۔ اکبر کے وقت یہ صوبہ گجرات کی سرکار تھا جس میں نو محال تھے ملہ جمالی کنبو۔ آزاد حسین واسطی نے "خزانہ عامرہ" میں لکھا ہے یہ ایک باکمال سخن ور شاعر تھے، نام فضل اللہ تھا۔ قوم کنبو تھی، قوم کنبو کے دہلی میں قاضی اور مفتی تھے۔ حربین کی زیارت کے لیے گئے اور سلطان حسین مرزا کے عہد میں خراسان کا سفر کیا اور مولانا جامی اور جلال الدین دوانی سے فیض حاصل کیا۔ وفات ماہ ذی قعدہ ۹۷۰ھ میں ہوئی۔ حضور اکرم کی نعت میں ان کا یہ شعر مشہور ہے:۔  
 موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پر تو صفات  
 تو میں ذات می نگری در تبسمی

اسی سال سام میرزا کا بدلہ لینے کے لیے عراق سے شاہ طہماسپ قندھار پہنچا۔ خواجہ کلاں بیگ شہر خالی  
طہماسپ کا حملہ کر دیا اور اس حال میں وہاں سے نکلا کہ دیوان خانہ جو عمدہ فرش اور مجلسی ساز و سامان سے آراستہ تھا اسی طرح

لے شاہ طہماسپ۔ ایران کے صفوی سلسلہ کا دوسرا بادشاہ ہے۔ اپنے باپ شاہ اسماعیل صفوی کا سلسلہ میں سہا نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ بابر نے کابل سے  
پنجاب پر حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے عثمانیوں اور رازکوں کو شکست دی، ۵۴ سال حکومت کے بعد ۱۵۸۷ء میں وفات پائی۔ اس نے خود اپنا ایک  
”تذکرہ“ لکھا ہے۔ اس میں اپنی تخت نشینی کی تاریخ لکھی ہے ”بتاریخ نہ صد و سی از ہجرت در محل چاشت روز دوشنبہ نوزدہم شہر جب موافق بیجی ٹیل  
ترکی جلوس بر سریر جہانبانی واقع شدہ در سن دہ سالگی“ اور تاریخ پیدائش ”و مولود در بیت و ششم شہر ذی حجہ سنہ ۹۲۰ ہجری بموافق  
ہیت ٹیل ترکی“ و تاریخ جلوس ”ظن است۔“

یہاں ہم صفوی سلسلہ کی وضاحت کے لیے شاہان ایران کا ایک جمل خاکہ تحریر کر دیتے ہیں۔

۱۔ ایران کی قدیم تاریخ پیشدادیوں سے شروع ہوتی ہے۔ جس میں پہلا بادشاہ کیومرث ہے۔ اس کے بعد ہوشنگ، طہمورث، دیوبند، جمشید  
جس کا جام مشہور ہے، ضحاک، فریدیوں، منوچہر، نوذر، ذاب، کرشاسپ۔

۲۔ شاہان قدیم کا دوسرا سلسلہ کیانی سلاطین کا ہے۔ جس کا بانی کیقباد ہے۔ اس کے بعد کیکاؤس، کیخسرو، لہراسپ، کشتاسپ، بہمن،  
دارائی اول، دارائی ثانی۔

۳۔ یہ دو سلسلے مشرق کے مورخین بیان کرتے ہیں مغربی مورخین ایران کی قدیم تاریخ کو ہخامنش بادشاہوں سے شروع کرتے ہیں۔ یہ دور ۵۵۹  
قبل مسیح سے ۲۲۷ عیسوی تک کا ہے۔ اس دور میں پہلے ایرانی مکران ہیں پھر مدیہ ہی اس کے بعد کو اس کی سلطنت شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس کا  
بیٹا کامبیز پھر کو مائاتی، داریوش، خشایارشا، اردشیر، داریوش ثانی، اردشیر دوم، اردشیر سوم، داریوش سوم (جسے سکندر اعظم نے شکست دی)،  
اسکندریوں کے بعد ۲۵۴ قبل مسیح سے اشکانی سلاطین کا سلسلہ ہے۔ جس کا بانی اشک اول اس کے بعد اشک دوم، اردوان اول، مہرداد اول، فرہاد  
دوم، ارد، فرہاد چہارم، اس کے آخری عہد میں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے، بلاشبہ اول، اردوان چہارم۔ ان بادشاہوں کے بعد ۲۲۷ عیسوی سے  
ساسانیوں کا ظہور ہوتا ہے۔ جن کا بانی اردشیر بابکان ہے۔ اس کے بعد شاپور اول، بہرام دوم، نرسی، شاپور ثانی، یزدگرد اول، بہرام پنجم، فیروز،  
قباد، نوشیروان عادل (۴۵۹ء)، اس کے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، ہرمز چہارم، خسرو پرویز، آخر ساسانی بادشاہ یزدگرد سوم  
جو ساسانیوں کو تخت پر بیٹھا اور جنگ تہاوند میں شکست کھاتا مارا گیا اور ساسانی حکومت ختم ہو گئی۔

۴۔ مسلمانوں کی ایران پر مکرانی حضرت عمر کے زمانہ ۶۳۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ ۷۵۰ء سے ۷۵۰ء تک اور بنو عباس  
۷۵۰ء سے ۱۵۱۷ء تک حکمران رہے۔ ان کے بعد صفاریوں نے ۱۵۱۷ء سے ۱۵۹۳ء تک حکومت کی۔

۵۔ صفاریوں کا بانی یعقوب بن لیث تھا۔ اس کے بعد عمرو بن لیث پھر ایک شخص خلف بن احمد حکمران ہوا۔  
۶۔ صفاریوں کے علاوہ ایران کے سلاطین کا دوسرا سلسلہ سامانی بادشاہوں کا ہے جس کے بانی نصر اور اسماعیل ہیں۔ جنہوں نے معتد خلیفہ عباسی  
کے عہد میں ۸۶۹ء میں خود مختاری اختیار کی۔ ان کے بعد اس سلسلہ کے بادشاہ اسماعیل، احمد، نوح، عبدالملک گزرے ہیں۔

۷۔ عبدالملک سامانی کے عہد سے غزنوی سلاطین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جن کے افراد اہلکین، بکٹین، سلطان محمود، سلطان مسعود۔  
صفاریوں نے چالیس سال حکومت کی ان کا پایہ تخت سیستان تھا۔ سامانیوں نے سو سال حکومت کی ان کا پایہ تخت بخارا تھا غزنویوں نے  
۵۷۰ء سے ۱۱۸۷ء تک تقریباً سو سال حکومت کی۔ پایہ تخت غزنی تھا۔ (۸) ایران کے مسلمان بادشاہوں کا ایک اور سلسلہ آل بویہ کا ہے جنہوں نے  
(باقی صفحہ آئندہ پر)

مقتل پڑا ہوا تھا۔ شاہ طہماسپ نے اسی دیوان خانہ میں اپنی نشست رکھی اور خواجہ بیگ کی بڑی تعریف کی کہ کامران میرزا نے نوکر تو بے جا  
اچھا رکھا ہے۔ پھر وہ اپنے ایک امیر بدرغ خاں کو قندھار پر متعین کر کے عراق واپس چلا گیا۔ اس کی واپسی کے بعد کامران میرزا نے  
قندھار پر حملہ کر کے دوبارہ اسے فتح کر لیا۔

سلطان بہادر چینی ہوئی حکومت واپس لینے کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس نے محمد زمان میرزا کو فتنہ و فساد برپا کرنے  
کرنے کے لیے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ جس وقت میرزا کامران لاہور سے رخصت ہوا تو اس نے لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن جب  
بادشاہ کے نوٹنے کی خبر ملی تو محاصرہ اٹھا کر گجرات کی طرف بھاگ گیا۔

بادجود اسکے کہ اطراف و اکناف سے کئی ایک فتنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، ہمایوں نے آگرہ سے حرکت نہ کی۔ ہمایوں کا  
شیر خاں کا فتنہ | اس پر وائی سے شیر خاں قلعان پوری نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور گور بہار، جو پورا اور قلعہ چنار پر قبضہ کر لیا اور  
اس کی طاقت کافی بڑھ گئی۔

شیر خاں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے گھبرا کر آخر کار ہمایوں نے آگرہ سے کوچ کیا اور ۴ صفر ۱۵۴۳ء کو قلعہ چنار سے باہر  
کھپ لگا دیا۔ یہاں شاہی لشکر سے شیر شاہ کے بیٹے جلال خاں نے جو اسلام شاہ کے خطاب سے شیر شاہ کا جانشین بنا تھا مقابلہ کیا  
لیکن مغل لشکر کے ماہر فن آتش باز رومی خاں کی تدبیروں سے چنار کا قلعہ جلد ہی فتح ہو گیا۔

یہ رومی خاں وہی شخص ہے جس کے نام کو سلطان بہادر نے ایک معمر میں اس طرح بیان کیا ہے۔

حیف باشد نام آں سنگ زبان / مینخ در جانش نہ و نامش بخوان

بقیہ حاشیہ شاہ طہماسپ صفوی گزشتہ ۱۵۳۲ء سے ۱۵۴۶ء تک سوا سو سال حکومت کی۔ ان کا بانی علی بویہ تھا۔ اس کے بعد عماد الدولہ، حفص الدولہ،  
مورید الدولہ اور فخر الدولہ ان کا پایہ تخت مازندران تھا۔

۹۔ آل بویہ کے بعد سلاطین سلجوق کا دور شروع ہوتا ہے جو ۱۵۵۶ء تک حکمران رہے۔ ان کا بانی طغرل بیگ اول تھا۔ اس کے بعد اپ ارسلان -  
جلال الدین ملک شاہ، سلطان سخر طغرل سوم، سلجوقی تقریباً ۱۶ سو سال حکمران رہے۔ اسماعیل فرقہ کا ظہور اسی دور میں ہوا۔ پہلی صلیبی جنگ  
سلطان ملک شاہ کے لڑکے برکیارق کے عہد میں ہوئی۔ خواجہ نظام الملک اپ ارسلان اور ملک شاہ دونوں کا وزیر تھا۔

۱۰۔ خوارزم شاہی بادشاہوں نے ۱۵۲۱ء سے خود مختاری اختیار کی۔ ان کا بانی قطب الدین محمد خوارزم شاہ ہے۔ اس کے بعد علاؤ الدین گکش  
سلطان محمد اسی کے زمانہ میں چنگیزی حملے شروع ہوئے، سلطان جلال الدین یہ سلسلہ ۱۵۲۵ء تک رہا۔

۱۱۔ خوارزم شاہیوں کے بعد چنگیزی مغلوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے بعد ہلاکو خاں اس کے بعد غازان خاں حکمران رہے یہ پہلا  
چنگیزی مغل بادشاہ ہے جس نے اسلام قبول کیا، سلطان محمد خدابندہ۔

۱۲۔ تقریباً ۱۶ سو سال بعد تیموری سلاطین برسر اقتدار ہوئے جن کا بانی تیمور خاں تھا۔ اس کے بعد مرزا شاہ رخ، الہ بیگ نے حکومت کی۔  
تیموری خاندان ۱۵۲۶ء کے لگ بھگ تک حکمران رہا۔

۱۳۔ تیموریوں کے بعد صفویوں نے حکومت سنبھالی، ان کا بانی سلطان اسماعیل صفوی تھا۔ اس کے بعد شاہ طہماسپ، شاہ عباس بزرگ، شاہ صفی  
شاہ عباس ثانی، شاہ سلیمان، شاہ سلطان حسین، شاہ طہماسپ دوم صفوی ۱۵۷۸ء تک حکمران رہے۔

۱۴۔ صفویوں سے نادر شاہ افشار نے ۱۷۰۷ء میں حکومت چھین لی۔ اس کے بعد ایک شخص کریم خاں زند نے ۱۷۲۲ء میں حکومت کی۔

۱۵۔ قاجاری سلطنت ۱۷۹۵ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا بانی آقا محمد خاں قاجار تھا۔ جس نے طہران کو پایہ تخت بنایا۔ آقا محمد کے بعد فتح  
علی شاہ، پھر عباس مرزا محمد شاہ، ناصر الدین شاہ آخری بادشاہ ہوا۔ مظفر الدین شاہ اور محمد علی شاہ کے بعد رضا شاہ پہلوی نے پارسیان بادشاہت  
قائم کر دی اور اب محمد رضا شاہ پہلوی حکمران ہے۔



چنار سے شکست کھا کر جلال خاں وریا کے راستہ بھاگ گیا۔ اور شیر خاں کے لشکر سے جوآن دنوں حاکم بنگالہ نصیب شاہ سے لڑ رہا تھا جا کر مل گیا۔ نصیب خاں کو شیر خاں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ اور وہ زخمی ہو کر بہایوں کے پاس چلا آیا۔

**بنگال پر فوج کشی** | اسی زمانہ میں بہایوں نے بندوبست کو امیرالامرار کا عہدہ دے کر جون پور کی حکومت پر مامور کیا اور اسے ایک زریں کرسی بھی عطا کی۔ خود لشکر لے کر بنگال کی طرف کوچ کیا۔ یہاں بہایوں نے بہار اور بنگال کے درمیان گڑھی کی تنگ وادی کو عبور کیا۔ اس گھاٹی پر شیر خاں کے لشکر نے بڑی مستحکم ناکہ بندی کر رکھی تھی۔

بہایوں کی پیش قدمی کی خبر ملتے ہی شیر خاں نے جھاڑ کھنڈ کے راستہ سے یلغار کی۔ اور قلعہ رہتاس پر پہنچ کر وہاں کے راجہ کو پیغام بھیجا۔ ”میں اپنی عورتوں وغیرہ کو آپ کے اس مضبوط اور محفوظ قلعہ میں چھوڑ جانا چاہتا ہوں۔ رہتاس کے راجہ نے اس لالچ میں کہ شیر خاں کی عورتیں اور بہت سامان و اسباب مفت میں ہاتھ آرہا ہے رضامندی ظاہر کر دی۔ اور قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ شیر شاہ نے پردہ دار ڈولوں میں دو ہزار سپاہیوں کو بٹھا کر قلعہ میں بھیج دیا۔ جب ڈولے رکھے گئے تو بجائے عورتوں کے سفاک سپاہی تلواریں سونت کر نکل آئے اور تمام قلعہ والوں کو تلوار کی دھار پر رکھ لیا۔ اس تدبیر سے شیر شاہ نے رہتاس کے قلعہ پر باسانی قبضہ کر لیا۔

**جنت آباد میں قیام** | بہایوں کو بنگال کی آب و ہوا بہت پسند آئی۔ اس نے گور کا نام جنت آباد رکھ دیا۔ اور دو تین ماہ اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ اس کے بعد وہاں سے واپسی کے ارادہ سے کوچ کیا۔

۱۵۳۰ء میں شیر شاہ نے قلعہ رہتاس۔ یہ قلعہ بہار کے آثار قدیمہ میں سے ہے۔ یہ راجہ ہریش چندر کے بیٹے شہزادہ رہتاسوا سے منسوب ہے۔ ۱۵۳۰ء میں شیر شاہ نے جس راجہ سے یہ قلعہ چھینا تھا اس کا نام ہرکشن تھا۔ ۱۵۹۶ء میں راجہ مان سنگھ نے اپنی صوبیداری کا صدر مقام بنایا تھا۔ ۱۶۳۴ء میں شہزادہ غلام شاہ جہاں نے بغاوت کر کے اسی کو پناہ گاہ بنایا تھا۔ شجاع الدولہ کے زمانہ میں قاسم علی نے یہ قلعہ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ یہ قلعہ مشرق سے مغرب تک چار میل، شمال سے جنوب ۵ میل کل ۲۸ میل کے دائرہ میں ہے اور جزیرہ نما پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ قلعہ میں ایک محل ہے جس کے دروازہ پر یہ کتبہ ہے :-

دروازہ مقیم بنائے چو شد تمام      دروازہ سپہر زر شکش مقیم شد  
سال عمارتش چو نمودم بطبع گفت      اندر راجہ مان سنگھ بنائے مقیم شد

**بنگالہ**۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق۔ ”اس صوبہ کے مشرق میں سمندر شمال اور جنوب میں پہاڑ مغرب میں صوبہ بہار، مشرق میں بھائی۔ شمال میں ایک علاقہ کوچ اور کامروپ ہیں۔ یہاں کا حسن اور جادو مشہور ہے۔ بنگال میں ایک درخت ایسا ہے جس کی شاخوں کو کاٹنے سے میٹھا رس ٹپکتا ہے (یہ غالباً تازی کا ذکر ہے) یہاں ایک خاص قسم کا آم ہوتا ہے جو پیر پر نہیں بلکہ انگوڑ کی پیل کی طرح کے پودے پر لگتا ہے۔ ایک پھول ایسا ہے جو دو ماہ تک نہ خشک ہوتا ہے اس کی رنگ و بو میں فرق آتا ہے۔ اس سے ملا ہوا آسام کے راجہ کا ملک ہے تببت بھی اس سے ملحق ہے۔ جس کے جنوب میں نکلیا جاچین واقع ہے۔ جنوب مشرق میں ایک اور علاقہ ارخنگ ہے۔ چانگانو کی بندرگاہ اسی علاقہ میں ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس مہلت میں شیر خاں نے کافی جمعیت اکٹھی کر لی تھی۔ جب ہمایوں لوٹنے لگا تو شیر شاہ نے اُسے عرضی لکھی کہ تمام پٹھان آپ کے فرماں بردار اور غلام رہنا چاہتے ہیں اور جاگیروں کے طلب گار ہیں، اگر حضور سے ان کو جاگیریں مل جائیں تو امن و چین سے رہیں گے۔

(بقیہ حاشیہ بنگالہ صفحہ گزشتہ) اونٹ گھوڑے گائے بھینس کیا ہیں، ایک اہلق جانور ہوتا ہے۔ جس میں گائے اور بھینس دونوں کے خواص ملتے ہیں۔ اس کا دودھ پیتے ہیں۔ مقامی لوگ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان، بہن سے نکاح کرنے میں عار نہیں۔ درویشوں اور غلاموں کو راؤتی کہتے ہیں۔ باشندہ سیاح نام ہوتے ہیں۔ قریب ہی بنگو کا علاقہ ہے جسے چین کہتے ہیں۔ یہاں سفید ہاتھی بھی ملتے ہیں۔ ان کا ان میں محل، ہیرے سونا چاندی، تانبا، گندھک، تیل، لکڑی کی کانیں ہیں۔ بنگالہ کا اصل نام بنگ ہے۔ قدیم حکمرانوں نے بیس گز چوڑے دس گز اونچے ٹیلے تعمیر کرائے تھے۔ ٹیلے کو ملکی زبان میں ”آل“ کہتے ہیں۔ ”بنگ“ اور ”آل“ مل کر بنگالہ بن گیا۔ آل کے متعلق ڈاکٹر بزمیر نے اپنے ”وقائع“ میں لکھا ہے کہ بارش میں جب ہر طرف دلدل اور پانی سے راستے بند ہو جاتے تھے تو بنگال والے اونچی اور چوڑی دیواریں بناتے تھے۔ اس کو آل کہتے تھے۔ اور ان کے ذریعے ہی آمد و رفت ہوتی تھی۔ ان دیواروں کی راستوں میں جگہ جگہ چوڑے بھی ہوں گے جن کا ابو الفضل نے ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ ”آل“ چبوتروں سمیت انہی دیواریں راستوں کا نام تھا۔ بنگال میں گرمی معتدل، سردی کم، بارش بکثرت ہوتی ہے۔ بحوالہ آئین اکبری ”بنگال میں بے شمار دریا ہیں۔ سب سے بڑا پھلا اور یا گنگا جس کے منبع کالاشی کسی کو پتہ نہیں۔ ہندو کہتے ہیں یہ ہمدیو کے سر کی چوٹی سے نکلا ہے۔ یہ دریا بہر حال شمالی کوہستان سے پھوٹتا ہے۔ دہلی، آگرہ، الہ آباد، یہاں سے ہوتے ہوئے بنگال میں داخل ہوتا ہے۔ باربک آباد کے پرگنے قاضی بہتہ پراس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ مشرق کی سمت چانگانو سے سمندر میں گرتی ہے۔ دوسری جنوب کی طرف تین شہروں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلی نرسرتی، دوسری جون، تیسری گنگ کھلاتی ہے۔ ان تینوں کے مجموعہ کو ترینی کہتے ہیں۔ تیسری شاخ سات گاؤں جاتی ہے۔ اور ہزاروں شاخوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ بنگال کا دوسرا دریا برہم پتر ہے۔ یہ دریا تختہ سے کوچ وہاں سے بازو ہا کو سیراب کر کے سمندر میں گر پڑتا ہے۔ اور اس صوبہ کا سمندر بحر محیط کی خلیج ہے۔ خاص پیداوار چاول ہے۔ اپنی قسمیں چاول کی ہوتی ہیں کہ ہر ایک کا ایک ایک دانہ جمع کیا جائے تو ٹٹکا بھر جائے۔ چاول کی کاشت سال میں تین مرتبہ ہوتی ہے۔ چاول کا پودا ایک رات میں سات ہفتے تک بڑھ جاتا ہے۔ بنگالیوں کی مرغوب غذا چاول اور مچھلی ہے۔ مرد عورت برہمنیم برہمن رہتے ہیں۔ مکانات عموماً بانس کے ہوتے ہیں۔ عورتیں کاروبار کرتی ہیں سفر کشتیوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ خشکی پر سفر سکھاسن کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو ایک چھت دار آرام دہ سواری ہوتی ہے۔ حمیری بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ یہاں نمک کی بے حد مانگ ہے۔ پھل پھول بکثرت ہیں۔“

بنگال کے حکمران :- راجہ بھگدت کھتری سے ست سنگھ تک ۲۴ کھتری راجاؤں نے دو ہزار چار سو اٹھارہ سال حکومت کی۔ پھر راجہ مہوچ گوریاسے راجہ منو بھوج تک نو کاٹستھ راجاؤں نے پانسو بیس سال حکومت کی۔ راجہ رومور سے راجہ جیدھر تک گیارہ راجاؤں کے ایک دوسرے کاٹستھ خاندان نے سات سو چودہ سال حکومت کی، پھر راجہ بھوپال سے راجہ جگ پال تھرا تک دس دوسرے کاٹستھ راجاؤں نے حکومت کی۔ پھر سوکھ سین سے راجہ توجہ تک سات اشخاص حکمران رہے۔ ان کاٹستھ ہندو راجاؤں کی حکومت چار ہزار پانچ سو چالیس سال رہی۔ مسلمان بادشاہ :- ہم پہلے کسی حاشیہ میں شاہان بنگال کا حال لکھ چکے ہیں۔ بنگال پر اکبر کے عہد تک کل پچاس مسلمان بادشاہ تقریباً تین سو سال حکمران رہے جن کا سلسلہ سلطان شمس الدین بنگرہ سے شروع ہوتا ہے۔ نصیب شاہ کے بعد شیر شاہ بنگال پر حکمران رہا۔ اس کے بعد یہ ملک ہمایوں کے حکم زیر اقتدار رہا۔ شیر شاہ کے بیٹے سلیم شاہ نے محمد خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کے قتل کے بعد اس کا باقی حاشیہ صفحہ آئندہ ہے۔

رہیں گے ورنہ بھوک کے مارے ان کے سرکش ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اب تک میں حسن و تدبیر سے ان کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں، آئندہ حضور کی مرضی پر ہی سارا انحصار ہے۔“

ہمایوں اس عریضہ کو دیکھ کر اس کے اصل منشا سے واقف ہو گیا۔ لیکن اس وقت اس کی توجہ اور ہی معاملات پر لگی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے تو شکر کا ساز و سامان درست کرانا تھا کیونکہ ان مسلسل طویل سفروں میں سارا سامان خراب ہو چکا تھا اکثر گھوڑے اور اونٹ مر چکے تھے۔ دوسری طرف دہلی سے برابر محمد سلطان میرزا، الغ میرزا اور شاہ مرزا کی فتنہ انگیزیوں کی خبریں آ رہی تھیں۔ ان سرکشوں کی گوشمالی کے لیے بادشاہ نے مرزا ہندال کو جو مونگیر تک ہم رکاب تھا متعین کر کے رخصت کیا تھا۔ لیکن وہ اس مہم کے بہانے آگرہ جا کر بیٹھ گیا تھا۔

سلطان بہادر کو فرنگیوں نے دھوکے سے سمندر میں غرق کر دیا اور محمد زمان میرزا بے یار و مددگار رہ گیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو وہ ہمایوں کی پناہ میں آ گیا۔

مسئلہ میں میرزا ہندال نے شیخ محمد غوث گوالیاری کے بڑے بھائی شیخ بہلول کو قتل کر دیا۔ شیخ بہلول صاحب فضل اور مشہور عامل تھے، بادشاہ بھی ان سے بڑی عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی تاریخ شہادت ہے:-  
”فقد مات شہیدا“

اسی سال مرزا ہندال نے آگرہ میں خود مختاری اختیار کر کے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ ہمایوں نے جہانگیر بیگ مغل کو پانچ ہزار سپاہی دے کر بنگال کی حکومت عطا کی اور اسے حسب ضرورت اپنے نام کا خطبہ پڑھنے کی بھی اجازت دے دی۔ اس انتظام کے بعد ہمایوں نے آگرہ کا رخ کیا۔

دقیقہ حاشیہ بنگال صفحہ گزشتہ، فرزند خضر خاں بہادر شاہ کے لقب سے حکمران ہوا، پھر سلیم شاہ کا ایک امیر تاج خاں بادشاہ ہوا۔ پھر اسکے بھائی سلیمان نے حکومت کی۔ ان کے دو بیٹوں بایزید اور داؤد آخری حکمران ہیں، جن کے زمانہ میں اکبر نے بنگال کو دہلی کا ماتحت صوبہ بنایا۔

اب شیخ محمد غوث گوالیاری، غوث اعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کے سلسلہ طریقت میں شیخ حاجی حمید کے خلیفہ اور بڑے صاحب کمال بزرگ گزرے ہیں۔ ان کے دادا نیشاپور کے شیخ تھے۔ ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ شیخ غوث لاغر اندام شخص تھے۔ لیکن سیاحت بہت کی تھی۔ ابتدا میں قلعہ کچھتر میں وعظ و بیان کا مشغلہ تھا۔ بعد میں راہ سلوک اختیار کی۔ ہمایوں ان کا معتقد تھا۔ آپ نے ایک کتاب ”معراج نامہ“ لکھی تھی جس میں اپنی ”معراج“ کا تذکرہ تھا۔ شیر شاہ کے زمانہ میں اس کتاب پر بڑے اعتراض ہوئے۔ شیر شاہ ان کی فکر میں تھا کہ وہ گوالیار سے گجرات چلے گئے۔ گجرات کے علماء نے بھی ان کو گھیر لیا۔ آخر میں علماء کی مجلس میں جب انہوں نے یہ کہا کہ ”مجھے یہ معراج عالم ہے ہوشی میں ہوئی“ تب کہیں جا کر جان بچی۔ آپ کی تصانیف میں حواہر خسرہ اور ادغوثیہ اور بحر الحیات مشہور ہیں۔ وفات ۱۵ رمضان ۹۹۷ھ میں ہوئی۔ مزار گوالیار میں ہے۔ ہمایوں سے تعلقات کی وجہ سے ان کا بھائی شیخ بہلول عمدہ مناصب پر پہنچ گیا تھا۔ جس کی شہادت کا واقعہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔  
مخبر الاولیاء میں ان کی وفات کی تاریخ ہے:-

چوں محمد غوث عالی مرتبت      جانب جنت عنان عزم تافت  
گفت تاریخ وصالش با تغم      اصبح فردوس از محمد زب یافت

اس وقت شاہی لشکر کی حالت بہت خستہ و خراب تھی۔ ہمایوں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے اسی بے سرو سامانی کی حالت میں گنگا کے کنارے ایک قصبہ جو سہ نامی پر پہنچ گیا۔ اسی جگہ جون پور اور چنار کے امیر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

**شیر خاں کا حملہ** | شیر خاں کو شاہی لشکر کی بے سرو سامانی کی پوری اطلاع تھی اور وہ برابر تاک میں لگا ہوا تھا۔ جو سہ میں جب ہمایوں ٹھہر گیا تو اس نے آگے بڑھ کر شاہی فوج کا راستہ روک لیا۔ گنگا کی شاخ رہا ہی ندی برسات کے پانی سے لبریز چل رہی تھی۔ اسی ندی کے دونوں کناروں پر فریقین مورچے جمائے ہوئے تھے۔ تین ماہ تک برابر دونوں لشکروں میں لڑائی ہوتی رہی۔

**صلح کا پیغام** | کہتے ہیں ایک دن ہمایوں نے ملا محمد عزیز کو جس کی شیر خاں سے پہلے کی جان پہچان تھی اپنا مقاصد بنا کر اس کے پاس روانہ کیا۔ جس وقت وہ وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سخت گرمی میں شیر خاں آستینیں چڑھائے پھاؤڑہ ہاتھ میں لیے ہوئے خندق کھود رہا ہے۔ ملا محمد کو دیکھ کر اس نے ہاتھ دھوئے۔ ان کے لیے شامیانہ لگوا دیا اور خود بے تکلف وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ کا پیغام سن چکا تو اس نے کہا ”میری طرف سے صرف اتنا جا کر کہہ دیجئے کہ تم تو خود لڑنا چاہتے ہو لیکن تمہارا لشکر لڑنا نہیں چاہتا اور میں لڑنا نہیں چاہتا لیکن میرا لشکر لڑنے پر مصر ہے۔“

اس کے بعد خود شیر خاں نے شیخ خلیل کو جو حضرت شیخ فرید شکر گنج کی اولاد میں سے تھے اور شیر خاں کے پیر تھے صلح کا پیام دے کر بادشاہ کے پاس بھیجا اور کہلوا دیا کہ ”بنگالہ کے سوا میں کسی اور ملاقات سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ اور یہاں بھی میں خطبہ اور سکہ بادشاہ کے نام کا ہی برقرار رکھوں گا۔ اس عہد کے لیے کلام اللہ کی قسم بھی کھائی۔ ہمایوں نے اعتماد و یقین کر کے صلح پر رضامندی کا اظہار کیا اور پوری طرح مطمئن ہو کر ندی پر پل باندھنے کا حکم دیا۔

**ہمایوں کی شکست** | شیر خاں کی طرف سے صلح کا یہ پیام محض ایک دھوکا تھا۔ اس نے دوسرے دن صبح ہی اچانک شاہی لشکر پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی فوج بالکل ہی بے خبر تھی۔ پریشانی میں صف آرائی تک نہ ہوسکی۔ اور شیر خاں نے ایک ہی حملہ میں ہمایوں کو شکست دے دی۔ جو پل اس نے تیار کرایا تھا اسے پٹھانوں نے توڑ دیا۔ ان کے توپچیوں اور تیراندازوں نے کشتیوں میں بیٹھ کر ہمایوں پر گولوں اور تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔

اس معرکہ میں محمد زمان میرزا مارا گیا۔ ہمایوں نے اس عالم میں کہ کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا، گھبرا کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ جب ڈوبنے لگا تو ایک سقمہ نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کی اور دریا سے پار کرا دیا۔ اُس وقت شیر خاں نے یہ شعر کہا ہے

فرید حسن را تو شاہی دہی

سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

اس کے استاد نے اس کو اس طرح اصلاح دی ہے

یکے برابر آری و شاہی دہی سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی



یہ واقعہ ۱۷۹۶ء میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ ہے ۷  
 "سلامت بود بادشاہ کسے"

اس فتح کے بعد شیرخاں نے بنگالہ کے علاقوں پر لشکر کشی کی اور متعدد لڑائیوں کے بعد جہانگیر قلی بیگ کو اس کے  
 لشکر سمیت تباہ و تاراج کر دیا۔ اب سارا بنگال شیرخاں کے قبضہ میں تھا۔ وہ وہاں اپنے نام کا خطبہ پڑھ کر شیرشاہ کے  
 خطاب سے تخت نشین ہو گیا۔ دوسرے سال ہی شیرشاہ نے بڑی تیاریوں کے ساتھ آگرہ کا قصد کیا۔

**ہمایوں کے بھائی** | کامران میرزا کو جب جوسہ کی شکست، شیرخاں کے غلبہ اور میرزا ہندال کی سرکشی کی خبریں ملیں  
 تو وہ قندھار سے لاہور پہنچ گیا اور وہاں سے کوچ کر کے ۱۷۹۶ء میں آگرہ میں داخل ہوا۔  
 مرزا ہندال اس کے آنے سے پہلے ہی دہلی جا چکا تھا۔ وہاں اس نے میر فخر علی اور میرزا یادگار ناصر کا جو دہلی میں قلعہ بند  
 ہو گئے تھے محاصرہ کر لیا۔ لیکن جب کسی طرح کامیابی حاصل نہ ہوئی تو محاصرہ اٹھا کر آگرہ میں مرزا کامران سے آکر مل گیا۔ چند  
 دن بعد میر فخر علی بھی کامران کے پاس آ گیا، البتہ مرزا یادگار ناصر برابر دہلی کے قلعہ پر جا رہا۔ پھر مرزا ہندال کامران سے  
 ٹوٹ کر اور کی طرف چلا گیا۔

**ہمایوں کی پریشانی** | جوسہ کی شکست کا داغ تو تھا ہی، آگرہ میں بھائیوں کی ان حرکتوں کا حال سن سن کر ہمایوں سخت  
 پریشان اور مضطرب تھا۔ ایک دن کامران سراپردہ میں غافل بیٹھا تھا کہ اچانک ہمایوں اندر  
 داخل ہو گیا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کے مقابل ہو گئے۔ لیکن جیسے ہی ان کی نظریں ملیں۔ خون نے جوش مارا۔ محبت  
 اُمٹ آئی اور دونوں گلے مل کر رونے لگے۔ اس کے بعد ہندال مرزا، محمد سلطان مرزا، اس کے دونوں بیٹے جو عرصہ سے  
 مخالف و سرکش بنے ہوئے تھے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ ہمایوں نے سب کے قصور معاف کر دیے۔ اور شیرخاں  
 کی سرکشی کے لیے ان سب نے مشورہ کیا۔

نظارہ مرزا کامران نے یہ کہا کہ "میرے ساتھ پنجاب کا جو لشکر ہے وہ آراستہ اور تازہ دم ہے۔ اس لیے آپ  
 دار الخلافہ میں رہیں اور میں شیرخاں کے مقابلہ پر فوج کشی کرتا ہوں۔"

ہمایوں نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ چند دن بعد کامران نے پنجاب واپس ہو جانے کی اجازت مانگی۔ اور بادشاہ سے  
 بھاری بھاری مطالبے کرنے لگا۔ ہمایوں نے بجز پنجاب کی اجازت کے اس کے سارے مطالبے قبول کر لیے۔ خواجہ کلاں بیگ  
 بھی کامران کو پنجاب رخصت کر دینے کے لیے سعی کر رہا تھا۔ چھ ماہ بس اسی گفت و شنید میں نکل گئے اور کچھ طے نہ پاسکا۔  
 اسی دوران میں میرزا کامران کو مختلف بیماریوں نے گھیر لیا۔ طبیعوں نے تشخیص کیا کہ ان تمام بیماریوں کا اصل مادہ زہر ہے۔  
 جو کسی نے کھلا دیا ہے۔ لگائی بھائی کرنے والوں نے اس کو ہمایوں کی طرف سے بدگمان کر دیا اور وہ یہ سمجھ کر کہ ہمایوں نے ہی  
 زہر دلوایا ہے۔ اسی بیماری کی حالت میں پنجاب کی طرف کوچ کر گیا۔ پہلے تو اس نے یہاں تک حامی بھری تھی کہ میں اپنی ساری  
 فوج آگرہ میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ لیکن اب اس قول کو پس پشت ڈال کر سکندر نامی سردار کے صرف دو ہزار سپاہی آگرہ میں  
 چھوڑ دیے اور باقی سارا لشکر اپنے ساتھ ہی لے کر چلا گیا۔ میرزا حیدر مغل کشمیری بھی آگرہ میں رہ گیا۔ اس پر بادشاہ نے

بڑے لطف و کرم کا اظہار کیا۔

**بھائیوں کی نا اتفاقی** | شیر خاں کو بھائیوں کی اس نا اتفاقی کی بھی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ ان حالات میں اس کی جراتیں اور بڑھ گئیں اور وہ اسی سال کے آخر میں گنگا کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنے بیٹے قطب خاں کو ایک لشکر دے کر کالپی اور اٹاواہ کی طرف روانہ کیا۔ قاسم حسین سلطان اوزبک نے یادگار ناصر مرزا اور اسکندر سلطان کو ہمراہ لے کر کالپی کے نواح میں قطب خاں کا مقابلہ کیا اور اس کو شکست دے دی۔ اس کا اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے سر کاٹ کر ہالیوں کے پاس آگرہ کو روانہ کر دیئے۔

**خرابی ملک دلی** | ہمایوں ایک لاکھ سواروں کا لشکر لے کر شیر خاں کے مقابلے کے لیے آگرہ سے نکلا اور قنوج کا دریا عبور کر کے صف آرائی کی۔ شیر خاں کی فوج پانچ ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ مہینہ بھر تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر جمی رہیں، ممکن تھا کہ شاہی لشکر کامیاب ہو جاتا۔ لیکن اس نازک موقع پر محمد سلطان مرزا اور اس کے بیٹے لشکر سے فرار ہو گئے۔ اور کامران کی فوج کے جتنے لشکر تھے وہ بھی ہمایوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ سخت بارش شروع ہو گئی۔ شاہی فوج نشیب میں تھی۔ ہمایوں نے کسی اونچے مقام پر پڑاؤ ڈالنے کے لیے وہاں سے کوچ کرنا چاہا، اس حال میں شیر خاں نے بھرپور حملہ کر دیا۔ اکثر مغل بغیر لڑے ہی بھاگ گئے۔ بادشاہ نے تو اسی ارادہ سے باگ پھیری تھی کہ کسی اونچے ٹیلہ پر جا کر قیام کرے۔ لیکن لشکر والوں نے اسے فرار پر مجبور کر کے میدان جنگ سے پیٹھ پھیر لی اور جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ مجبوراً بادشاہ نے اپنا گھوڑا لنگا میں ڈال دیا۔ اور پانی کے بہاؤ میں پشت سے دریا میں گر پڑا۔ اس وقت شمس الدین محمد غزنوی نے مدد کی اور بادشاہ کو دریا سے عبور کرایا۔ وہاں سے ہمایوں آگرہ گیا مگر شیر خاں برابر تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ اس لیے وہ وہاں بھی ٹھہر نہ سکا اور فوراً پنجاب چلا گیا۔

یہ لڑائی شکستہ میں ہوئی تھی، اس کی تاریخ ہے۔  
”خرابی ملک دلی“

**لاہور میں مشورے** | ہمایوں نے لاہور پہنچ کر یکم ربیع الاول ۹۵۷ھ میں تمام اُمراء و سلاطین کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ لیکن ہمایوں کے بھائیوں اور دوسرے اُمراء کے درمیان بڑی پھوٹ پڑ چکی تھی اس لیے کسی تجویز پر اتفاق نہ ہو سکا۔ محمد سلطان اور اس کے بیٹے لاہور سے ملتان بھاگ گئے۔ مرزا ہندال اور مرزا یادگار ناصر ٹھٹھہ کی طرف چلے جانے کی رائے دے رہے تھے۔ مرزا کامران چاہتا تھا کہ سب لاہور سے مل جائیں تو وہ کابل چلا جائے۔

آخر بڑے صلاح و مشورہ کے بعد طے پایا کہ مرزا حیدر کو ایک لشکر دے کر کشمیر پر حملہ کیا جائے اور کشمیر فتح ہو جائے تو بادشاہ وہاں چلا جائے۔ ہمایوں نے مرزا حیدر کو اس مہم پر روانہ کر دیا۔ اس نے وہاں پہنچ کر اور بہت سے کشمیریوں کو اپنا موافق بنا کر کشمیر کو فتح کر لیا اور ۲۲ رجب ۹۵۷ھ میں اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔

**ہمایوں کا فرار** | خواجہ کلاں بیگ سیالکوٹ تک پہنچا تھا کہ بادشاہ کو خبر ملی، شیر خاں سلطان پور کی ندی عبور کر کے لاہور سے ۳۲ کوس کے فاصلہ پر آگیا ہے۔ یہ سن کر ہمایوں لاہور کی ندی عبور کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ مرزا کامران مصلحتاً کچھ دور تک تو ساتھ رہا۔ خواجہ کلاں بیگ بھی سیالکوٹ سے ہٹ کر لشکر سے آ ملا۔ لیکن جب یہ سب بہیرہ کے فواح میں پہنچے تو میرزا کامران اور مرزا عسکری عہد و پیمان سے منحرف ہو کر خواجہ کلاں بیگ کے ساتھ کابل کی طرف نکل گئے۔ ہمایوں نے سندھ کا رخ کیا۔ چند منزل بعد میرزا ہندال اور میرزا یادگار ناصر بھی ساتھ چھوڑ گئے لیکن امیر ابوبقار کے سمجھانے سے دوبارہ لوٹ آئے۔

دریائے سندھ کے کنارے شاہی لشکر ایسے قحط میں مبتلا ہوا کہ ایک سیرغلہ ایک اشرفی میں بھی ملنا محال ہو گیا۔ پانی بھی دور دور تک نہیں تھا۔ بھوک اور پیاس سے اکثر لشکری مر گئے۔

ہمایوں سخت مصیبتوں اور صعوبتوں کے بعد ایک مختصر سی جمیعت کے ساتھ جیسلمیر اور ماروال پہنچ سکا۔ وہاں بھی اسے کئی ایک حادثوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کی سرحد سے نکل کر عراق پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے شاہ طہاسپ سے مدد لے کر قندھار اور کابل پر آکر حملہ کیا۔ اور ان شہروں کو فتح کر کے وہاں لشکر منظم کر کے دوبارہ اس نے ہندوستان کو فتح کیا۔ جس کی تفصیل ہم انشا اللہ آگے بیان کریں گے۔

لے جیسلمیر۔ سندھ سے متصل یہ ایک ریگستانی ریاست ہے۔ تقریباً تین ہزار سال پہلے چندر گپتی راجاؤں کی اولاد میں سے شالیاہن کے پوتے راول بھائی کی اولاد "بھائی راجپوت" کہلانے لگی۔ یہ لوگ سندھ اور پنجاب سے سندھ میں راجپوتانہ کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے۔ ۸۵۳ء میں دیوراج نامی ایک بھائی نے اس علاقہ میں حکومت کی بنیاد رکھی اور راول کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سلسلہ میں پانچویں راول جیسلمیر نامی نے مسلمانوں کی مدد سے تخت پر قبضہ کیا اور ۱۱۵۶ء میں شہر جیسلمیر آباد کیا۔ جیسلمیر کے بعد شالیاہن، بھل، کیلن، چاچک دیو، تیج راول، کرن، لاکھن، پون پال، جیت سی، اس کے زمانہ میں ۱۱۷۹ء میں مسلمانوں نے جیسلمیر کا محاصرہ کر لیا اور ۱۱۹۶ء میں مولراج اول کے زمانہ میں اس پر قبضہ کر کے دو سال تک قابض رہے اور جیسلمیر پر باد ہو گیا۔ کئی سال بعد راجپوتوں نے اسے دوبارہ آباد کیا، پھر ان کو چوبیسویں راول دودو نے شکست دے کر دوبارہ بھائیوں کی حکومت قائم کر دی۔ ۱۲۱۶ء میں مسلمانوں نے راول دودو کو شکست دے دی۔ پھر ایک عرصہ بعد گرس نامی بھائی نے دوبارہ جیسلمیر کو آباد کیا اور ریاست تین چار سرداروں میں تقسیم کر دی۔ پھر ۱۲۶۶ء میں تیسویں راول برس نے مستقل ریاست کی بنیاد رکھی۔ تیسویں سن کن کے وقت ۱۳۵۶ء میں ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ کو جاتے ہوئے جیسلمیر سے گزرا۔ اس نے ہمایوں کی فوج پر راستہ میں پانی بند کر دیا تھا۔ مغل لشکر نے بھائی راجپوتوں سے لڑ کر پانی حاصل کیا اور اس علاقہ سے نکل گئے۔ بدایونی جن حادثوں کا ذکر کرتا ہے اس میں ہمایوں کو سب سے زیادہ مشکل اس پانی کے نہ ملنے سے پیش آئی تھی۔ راجہ نے راستہ کے تمام کنوؤں اور چشموں کو ریت بھرا کر پاٹ دیا تھا تاکہ مسلمان گائے بکری وغیرہ کا ذبیحہ کرنے نہ پائیں۔ ۱۳۵۶ء میں جب اکبر اجیر ہوتا ہوا ناگور پہنچا تو راول ہیر راج کی بیٹی شاہی حرم میں داخل ہوئی اور جیسلمیر کے راول مغل سلطنت کے مددگار اور باج گزار بن گئے۔ پنتیسویں راول کلیان سنگھ کی بیٹی جہانگیر کے عقد میں تھی۔ ۱۳۶۶ء میں شاہ جہان نے سب سنگھ کو راول بنایا تھا۔ ۱۳۵۹ء میں راول امر سنگھ مندر نشین ہوا۔ ۱۳۶۶ء میں داؤد خاں کا پوتا اور مبارک خاں کا بیٹا بھادل خاں نے حملہ کر کے دیوراول اور کوسال کا علاقہ اپنی خود مختار ریاست بھادل پور میں شامل کر لیا۔ ۱۳۸۶ء میں انگریزوں سے سرکاری عہد نامہ کے تحت ہمارا راول گج سنگھ تخت نشین ہوا جو انگریزوں کی ماتحت ریاست کا بانی تھا۔

# سوری خاندان

## شیرشاہ بن حسن سور

”خرابی ملک دلی“ نہ صرف ہمایوں کی شکست کی بلکہ شیرشاہ کی تخت نشینی کی بھی تاریخ ہے۔ کیوں کہ اس سال یعنی ۱۵۴۰ء میں شیرشاہ نے آگرہ میں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

شیرشاہ کے ابتدائی حالات | شیرشاہ کا اصل نام فرید خاں تھا۔ اس کا دادا ابراہیم سور افغانستان کے علاقہ درن سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں وہ سلطان ہلول کے لشکر میں ملازم ہو گیا اور کافی

عرصہ تک حصار فیروزہ اور نارنول میں کارپرداز رہا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے حسن نے سلطان سکندر کے ایک امیر جمال خاں نامی کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسے جمال خاں کی طرف سے سہسرام اور خواص پور قلعہ رہتاس کے ماتحت پرگنے جاگیر ملیں۔ اس کے زیر حکم پانچ سو سوار تھے۔ فرید خاں (شیرشاہ) کے سات بھائی اور تھے۔ اس نے باپ و بھائیوں سے لوہے

لے سور۔ افغانستان کے کوہستانی علاقہ وہ یارسن کے افغان قبیلوں میں سور قبیلہ آباد ہے۔ یہ لوگ خود کو سلاطین غور سے منسوب کرتے ہیں۔ اس قبیلہ کا مورث محمد سور تھا۔ ابراہیم سور کا اسی قبیلہ سے تعلق تھا۔ اس کے بیٹے حسن خاں سور نے نارنول میں انتقال کیا۔ اس کا مقبرہ اب بھی وہاں موجود ہے۔ اس کا بیٹا فرید خاں (شیرشاہ) رجب ۹۵۰ھ مطابق ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا۔ بدادونی نے شیرشاہ کا سن ولادت نہیں دیا ہے۔

۹۵۰ھ سہسرام۔ بنارس کے ریل کے راستے ۴۷ میل پر ہے۔ یہ شیرشاہ کا مولد اور وطن تھا۔ یہاں شیرشاہ کا مقبرہ قابل دید عمارت ہے۔ اس مقبرہ کی عمارت تالاب کے وسط میں ہے جس کا طول گیارہ سو فٹ اور عرض ایک ہزار فٹ ہے۔ مقبرہ کی کرسی رلیج، اوپر کی منزلیں ہشت پہلو عمارت سنگ خارا کی بنی ہوئی ہے۔ اس کا ہر پہلو ساٹھ فٹ لمبا ہے اور ہر پہلو میں ایک روازہ ہے۔ اندر شیرشاہ کا مزار اور ایک مسجد ہے۔ درود دیوار پر قرآنی آیات کندہ ہیں، درود شریف اور تاریخ بنا لکھی ہے۔ ۹۵۰ھ ۱۵۴۰ء میں یہ عمارت شیرشاہ کے بیٹے سلیم شاہ کی یادگار ہے۔ نہایت مستحکم عمارت ہے۔ کتے ہیں ہمایوں نے دوبارہ بادشاہ بن کر سہسرام کی ساری عمارتوں کو گرا دینے کا حکم دیا تھا۔ اسکی تعمیل کی گئی۔ لیکن جب مقبرہ گرانے کی نوبت آئی تو حاکم نے بادشاہ کو لکھا کہ اس کے ساتھ مسجد بھی ہے، مقبرہ گرایا گیا تو وہ بھی شہید ہو جائے گی۔ ہمایوں نے مسجد کی وجہ سے مقبرہ کو منہدم نہ کرایا۔

سہسرام پہلے بڑا آباد شہر ہوگا اب تو بہار کے ضلع شاہ آباد میں ایک معمولی قصبہ ہے کوئی ۲۵ ہزار کی آبادی ہوگی سہسرام کو بنانے والے کا نام سہانگ تھا۔ یہ بستی پہلے بوڑھن پھاڑ کے نیچے تھی۔ حسن خاں سور نے وہاں سے ہٹ کر نئی آبادی بسائی۔ ۹۵۰ھ میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کے جنرل بختیار خلجی فاتح بنگال کے ایک مجاہد بزرگ سید میر حسین نے مذکورہ سہسرام پر حملہ کیا۔ یہ بزرگ مدینہ کے متوطن تھے۔ پہلے انہوں نے اجیر میں جہاد کیا تھا۔ سہسرام سے آپکی دست بدست لڑائی ہوئی۔ آپ نے اسے زخمی کر دیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ سید میر حسین بنارس کے جہاد میں شہید ہوئے اور سہسرام میں ان کا لاشہ دفن ہوا۔ کتبہ میں ان کا سر بنارس میں دفن ہے۔ آپ کا مزار سہسرام کی مشرقی پھاڑی پر ہے آپ کے سر ہانے عبداللہ یعنی سہسرام کی بھی تربت ہے اور بھی آپ کے ساتھیوں کے یہاں مزار ہیں۔ اور یہ جگہ ”چند تین شہید پیر“ کے نام سے مشہور ہے۔



ملازمت ترک کر دی اور جو پور میں جا کر طالب علمی اختیار کر لی۔ اس زمانہ میں اس نے کافیہ مع حواشی اور چند مختصر دوسرے رسالے اور فارسی میں گلستاں بوستاں اور سکندر نامہ پڑھا۔ اس کے اکثر اوقات جو پور کے مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتے تھے جہاں وہ علماء اور صلحا کی صحبت سے استفادہ کرتا اور اپنے اخلاق کی تربیت و تہذیب میں مصروف رہتا تھا۔

چند دن بعد اس کی باپ سے صلح ہو گئی اور اس کے باپ حسن خاں نے جاگیروں کے انتظام کے لیے اسے مامور کر دیا۔ اپنی عملداری میں شیر خاں نے بڑے عدل و انصاف اور حسن انتظام سے کام لیا اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس نے تمام فتنہ پردازوں کا تلح قمع کر دیا۔

شیر خاں کا یہ دور بھی مختصر ہی رہا۔ چند معاملات میں اس کی باپ سے پھر مخالفت ہو گئی۔ اور وہ اپنے ایک بھائی کے ساتھ آگرہ کو چلا گیا۔ وہاں سلطان ابراہیم کے ایک سردار دولت خاں کے ہاں ملازمت کر لی۔ اور سلطان ابراہیم کے پاس اپنے باپ اور بھائیوں کی شکایت پہنچائی۔ سلطان اٹھا اس سے ناراض ہو گیا اور کہا کہ۔ ”یہ تو بہت بُرا آدمی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا باپ اس سے ناراض ہے اور یہ بھی باپ کی شکایت کرتا ہے۔“

حسن خاں کے مرنے کے بعد دولت خاں نے اس کی جاگیر کے پرگنہ شیر خاں کو دلوادینے۔ اور وہ ایک عرصہ تک اپنی جاگیروں ہی میں رہا۔ بھائیوں سے اس کی مخالفت پہلے کی طرح باقی تھی۔

جس زمانہ میں سلطان ابراہیم پانی پت میں مارا گیا تھا اور بابر نے فتح پائی تھی، دریا خاں کے بیٹے بہار خاں نے بہار میں سلطان محمد کے لقب سے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ فرید خاں بھی ان دنوں جاگیروں کو چھوڑ کر بہار چلا گیا اور سلطان محمد کے ہاں ملازم ہو گیا۔ اور ایک دن سلطان محمد کی رگاب میں اس نے ایک شیر کا شکار کیا۔ اس وقت سلطان محمد نے اسے ”شیر خاں“ کا خطاب عطا کیا۔ اور اپنے بیٹے جلال خاں کا اتالیق مقرر کر دیا۔

ولایت ”چند“ کے حاکم محمد خاں سور نے شیر خاں کے بھائیوں کی طرف داری میں سلطان محمد کو شیر خاں سے بد دل کر دیا اور جاگیر میں اس کے بھائیوں کو بھی شریک کر دیا۔ اور اس کے بھائی سلیمان کو اپنے ایک غلام شادی خاں کے ساتھ کر کے خواص پور کا قبضہ دلانے کے لیے بھیجا۔ وہاں ان کا مقابلہ شیر خاں کے ایک غلام بھکے نامی سے ہوا۔ اس شخص کے متعلق مشہور تھا کہ یہ خواص خاں کا باپ ہے۔ مقابلہ میں بھکے مارا گیا اور اس کے آدمی بھاگ کر شیر خاں کے پاس سہرام میں آ گئے۔

شیر خاں نے جب دیکھا کہ وہ محمد خاں سے مقابلہ نہیں کر سکتا تو جاگیروں سے دست بردار ہو کر سلطان جنید برلاس کے پاس چلا گیا جو بابر کی طرف سے کٹوہ اور مانک پور کا حاکم تھا۔ اور اس کو بہت سے تحائف نذر دے کر اپنا حامی بنایا۔ پھر اس سے مدد لے کر محمد خاں پر حملہ کر دیا اور اس سے پرگنہ چوندر بھی چھین لیا۔ محمد خاں نے قلعہ رہتاس میں بھاگ کر پناہ لے لی۔ شیر خاں نے اپنی جاگیروں پر قبضہ کر کے بھائیوں کی گوشمالی کی اور محمد خاں سے اس گستاخی کی معذرت کر کے اس کے پرگنہ اسے لوٹا دیئے اور جاگیر کے انتظام پر اپنے بھائی نظام کو مقرر کر کے سلطان جنید برلاس کے پاس واپس چلا گیا۔

**شیر خاں بابر کے حضور میں** | سلطان جنید عموماً بابر کے دربار میں جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شیر خاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اور بادشاہ سے سفارش کر کے اسے شاہی ملازموں میں شامل کرادیا چنانچہ چندیری کے سفر میں وہ بابر کے ہم رکاب تھا۔ اسی سفر میں اس کو اندازہ ہوا کہ مغل حکمران امور مملکت سے نہایت بے پروا ہے اور عملہ کے لوگ رشوتیں لے کر لوگوں کے معاملات کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر شیر خاں کو یقین سا آگیا کہ ان مغلوں سے بادشاہت چھین لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس وقت سے شیر خاں حصول اقتدار کی تدبیروں میں لگ گیا۔

ایک دن بابر نے کھانا کھاتے وقت دسترخوان پر شیر خاں کی کوئی گستاخانہ حرکت دیکھی۔ اس وقت اہل مجلس نے موقع پا کر شیر خاں کی خود سری اور اس کے باغیانہ خیالات بابر کے گوش گزار کیے۔ شیر خاں ان باتوں سے نہایت خائف ہوا اور شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور اپنے پرگنوں میں جا کر ٹھہر گیا۔ جنید برلاس کو یہ خبر لکھ کر بھیج دیا کہ ”مغلوں کی ملازمت اختیار کر لینے کی وجہ سے محمد خاں نے جس کو مجھ سے دلی عداوت ہے سلطان محمد کو میری جاگیر پر لشکر کشی کے لیے آمادہ کر دیا تھا۔ اس لیے جلدی اور اضطراب میں بادشاہ سے اجازت لینے کی مہلت نہ مل سکی اور میں بغیر پوچھے ہی اپنے پرگنوں میں چلا آیا۔ میں اسی طرح بادشاہ کا خیر خواہ اور مخلص ہوں۔“

اس کے بعد شیر خاں نے دوبارہ سلطان محمد کے ہاں اثر و رسوخ پیدا کر لیا اور اس کا مقرب بن کر ممتاز خدمات پر مامور رہا۔ پھر اس کے بیٹے جلال خاں کا وکیل مقرر ہوا اور اس کے سارے معاملات شیر خاں کے زیر انتظام ہو گئے اور جب سلطان محمد کا انتقال ہوا تو سرکار بہار کا سارا نظم و نسق اسی سے متعلق ہو گیا۔

**بنگال میں حوصلہ آزمائی** | اسی زمانہ میں وائی بنگالہ کے ایک امیر مخدوم عالم سے جو حاجی پور کا حاکم تھا شیر خاں کی بڑی دوستی ہو گئی۔ پھر بنگال میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ وہاں کے سلطان نے مخدوم عالم پر حملہ کرنے کے لیے اپنے ایک امیر قطب خاں کو روانہ کیا۔ شیر خاں نے حق دوستی ادا کر کے مخدوم عالم کی طرف سے قطب خاں کا مقابلہ کیا اور اسے قتل کر کے اس کا سارا خزانہ مال و اسباب اور ہاتھی لوٹ لیے۔

بعد میں اس کے معاون جلال خاں اور دوسرے لوہانیوں نے بہار کا علاقہ سلطان بنگال کے سپرد کر دیا اور شیر خاں کو مصیبت میں تنہا چھوڑ کر سلطان کی اطاعت اختیار کر لی۔ بنگال والوں نے مقتول قطب خاں کے لہجے کے ابراہیم خاں کو اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے شیر خاں کے خلاف روانہ کیا۔ شیر خاں نے قلعہ بند ہو کر کافی عرصہ تک ان کا مقابلہ کیا۔ اس اشار میں بنگالی فوج کی کمک پر مزید دستے وہاں پہنچ گئے اور شیر خاں کے پنج لکھنے کا راستہ بھی مسدود ہو گیا۔ اب شیر خاں چاروں طرف سے بڑی طرح گھیر گیا تھا۔ کوئی راہ نہ پا کر آخر اس نے ایک دلیرانہ حملہ کرنے کا عزم کر لیا۔ اور قلعہ سے باہر نکل کر جان توڑ کر غنیمت سے مقابلہ کیا۔ بڑی سخت جدوجہد کے بعد ان پر فتح پائی۔ اس لڑائی میں ابراہیم مارا گیا۔ اور اس کا سارا مال و اسباب فیل خانہ توپ خانہ شیر خاں کے ہاتھ آ گیا۔ اس فتح سے اس کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی۔ اور سارا بہار اس کے قبضہ اقتدار میں آ گیا۔

اس دوران میں سلطان محمود لودی جسے حسن خاں میواتی اور رانا سانگہ نے بادشاہ بنا کر بابر سے مقابلہ کیا تھا، منغل لشکر سے شکست کھا کر چنوڑ کے قلعہ میں محصور ہو گیا تھا۔ لودی امرار نے اسے چنوڑ سے بلا کر پٹنہ کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس نے لشکر کشی کر کے شیر خاں سے بہار کا علاقہ چھین لیا۔ اور شیر خاں نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔

کچھ عرصہ بعد شیر خاں سلطان محمود سے اجازت لے کر اپنے پرگنہ سہرام میں آ گیا۔ بعد میں جس وقت محمود کا سہرام سے گزر ہوا تو اس نے شیر خاں کو بہار کا عہد نامہ لکھ کر دے دیا اور وہاں سے جہن پور کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔ جونپور پر بہالیوں کے سرداروں کو شکست ہوئی اور یہ علاقہ لکھنؤ کی سرحدوں تک لودیوں کے قبضہ میں آ گیا۔ بہالیوں کے امیر شکست کھا کر نواح کالجہ میں بادشاہ کے لشکر میں حاضر ہو گئے۔

اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے خود بہالیوں نے سلطان محمود اور اس کے معاون بایزید کے مقابلہ کے لیے کوچ کیا۔ اس اشار میں شیر خاں سلطان محمود کے لشکر سے کچھ دن تو علیحدہ ہی رہا۔ بعد میں آکر اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو شیر خاں نے مغلوں کے امیر الامرار ہندو بیگ توچین کو خفیہ پیغام بھیجا کہ میں لڑائی کے وقت طرح دے کر علیحدہ ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ مجھے سلطان محمود اور بایزید کا اقتدار ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ چنانچہ جب لڑائی ہوئی تو شیر خاں اپنی جمعیت کو لے کر میدان سے ہٹ گیا۔ اور سلطان محمود شکست کھا کر پٹنہ کو چلا گیا۔ اس کا انتقال ۱۵۴۹ء میں اڑیسہ کی سرحد پر ہوا۔

لے اڑیسہ۔ آئین اکبری کے حوالہ سے۔" اور لے پہلے بنگال سے الگ ایک ملک تھا۔ یہاں ۱۶۹ پختہ قلعے ہیں۔ یہاں کے حکمران کوچ پتی کہتے ہیں۔ آٹھ ماہ بارش تین مہینے گرمی پڑتی ہے اور ایک مہینہ سردی کا ہوتا ہے۔ چاول بکثرت ہوتا ہے۔ لوگ چاول پھل ترکاریاں اور برنجل کھاتے ہیں۔ مرد مندل ملتے اور زیور پہنتے ہیں، عورتیں صرف پخلا حصہ ڈھانکتی ہیں، مکان سرکنڈوں کے ہوتے ہیں۔ بت خانے سنگین اور بلند ہوتے ہیں۔ ہاتھی بکثرت ملتے ہیں۔ انکی زبان بنگال کی زبان سے مختلف ہے۔ ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں۔ یہاں لوہے کے قلم سے کھجور کے پتوں پر کتابت ہوتی ہے۔ پھولوں میں گل نسریں خاص پھول ہے۔ گیوڑ سے جنگل کے جنگل ہوتے ہیں، پان متعدد اقسام کے ہوتے ہیں، کوڑیوں سے لین دین ہوتا ہے۔ چار گڈیوں کا گڈہ، چار گڈیوں کا بودی، چار بودیوں کا پٹن، سولہ یا بیس پن کا ایک کھاو، دس کھاو کا ایک روپیہ۔ یہاں کا منتر کٹک ہے۔ راجہ بکھریو کا نومنزہ محل مشہور ہے۔ پہلی منزل میں فیل خانہ اور اصطبل تھا، دوسری منزل میں توپ خانہ، تیسری میں دربان، چوتھی میں دفاتر، پانچویں میں باورچی خانہ، چھٹی میں ملاقات کا دیوان، ساتویں میں خلوت خانہ، آٹھویں میں شاہی محلات، نویں میں راجہ کی خواب گاہ تھی، شہر پر شوم میں بحر شور کے گاہے جگنا تھ کا مندر ہے جس کے قریب کشن اور اسکے بھائی بہنوں کی مورتیں ہیں۔" جگنا تھ کے متعلق ہندوؤں میں مشہور ہے کہ جب نیلگری کے راجہ اندرو من نے چار پانچ ہزار سال پہلے یہاں یہ شہر بسایا تو ایک خواب کی بشارت کے مطابق سمندر میں ایک لکڑی کا بادون انگل چوڑا ڈیرہ ہاتھ لبا لکھا اسے ملا۔ یہ لکڑی دیوتا کی مورت تھی۔ اس نے اس پر جواہرات جڑوا کر اس کا نام جگنا تھ رکھا۔ جگنا تھ کے پیلے میں اس مورت کا سولہ ہسیوں کے رتھ پر عروس نکلتا ہے جس کے نیچے دب کر مرنے کو مندر میں سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور مندر آفتاب کا مندر ہے جو نہایت بلند وسیع عظیم الشان عمارت ہے۔ اس میں سورج سیاروں کی اور پجاریوں کی مورتیں ہیں۔ اس مندر کی مورتیں سنگ تراش کا معجزہ معلوم ہوتی ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے راجہ زینگ دیونے اس مندر کی تعمیر مکمل کی تھی۔ جس کے خرچ میں ملک کے بارہ برس کا خراج لگ چکا تھا۔ اسکے قریب ۲۸ دوسرے بت خانے ہیں۔ کہتے ہیں کیرداس اسی جگہ دفن ہوا تھا۔

**ہمایوں اور شیر خاں کا اختلاف** | اس فتح کے بعد ہمایوں نے ہندو بیگ کو اپنا نمائندہ بنا کر شیر خاں کے پاس بھیج دیا اور اس سے قلعہ چنار سپرد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ شیر خاں نے جیلے بہانے کر کے بادشاہ کے مطالبہ کو ٹال دیا۔ ہمایوں نے اپنے چند امیروں کو قلعہ کے محاصرہ کے لیے رخصت کیا۔ وہ خود بھی اس محاصرہ پر جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ شیر خاں کی ایک عرضی اس کے نام آئی جس میں اس نے اپنے خلوص اور اطاعت کا ذکر کیا تھا اور بادشاہ کے وقت کی خدمات اور سابقہ حقوق کے حوالے تھے۔ خاص طور سے سلطان محمود سے میدان جنگ میں علیحدگی کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ شیر خاں نے یہ عریضہ اپنے بیٹے قطب خاں کے ذریعہ ایک بڑی جمعیت اس کے ہمراہ کر کے روانہ کیا تھا اور اپنے وکیل اور وزیر عبر خاں حجاب کو بھی اس کے ساتھ کر دیا تھا اس عرضی پر ہمایوں نے شیر خاں کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ قطب خاں شاہی لشکر کے ساتھ ہی رہا، گجرات میں قطب خاں ہمایوں کے لشکر سے فرار ہو کر اپنے چچا باپ کے پاس چلا گیا اور شیر خاں نے ہمایوں کی گجرات سے واپسی تک کے عرصہ میں اپنی قوت میں کافی اضافہ کر لیا۔ پھر ہمایوں سے مقابلہ کر کے اسے شکست دی جس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

**شیر گڑھ** | شیر شاہ نے تخت نشینی کے بعد قنوج کے قدیم شہر کو ویران کر دیا اور اسے گنگا کے کنارے آباد کرایا۔ یہ شہر اب شیر گڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شمس آباد کے قلعہ کو بھی اجازت سے دوسری جگہ اس نے تعمیر کرایا اور اس کا نام رسول پور رکھا۔ لیکن اب یہ قلعہ پھر اپنی اصلی جگہ پر آباد ہو گیا ہے۔ شیر خاں نے علاؤ الدین کی لمبائی پرانی دلی کو بھی ویران کر کے ایک شہر فیروز آباد تین کوس کی لمبائی میں بسایا۔ اس کے قلعہ کا دروازہ سنگ و گچ سے نہایت بلند بنوایا تھا۔

ضروری انتظامات کے بعد شیر شاہ کوچ پر کوچ کرتے ہوئے سلطان پور پہنچ گیا۔ یہاں ہمایوں کے بھائی آپس کے جھگڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ شیر شاہ کے آتے ہی یہ جھگڑا لو بھائی و ہاں سے بھی نکل بھاگے۔ پھر شیر شاہ نے ان کو ہندوستان کی حدود میں قدم جانے کا موقع نہیں دیا۔

**شیر شاہی سڑک** | اس سال شیر شاہ نے حکم دیا کہ بنگالہ سے ریت تک (پنجاب) تک جو چار ماہ کا راستہ ہے سڑک بنائی جائے۔ اس سڑک پر آگرہ سے ماندو تک ہر کوس پر ایک سرائے، مسجد اور پختہ کنواں تعمیر کرایا گیا۔ اور ہر مسجد میں ایک مؤذن ایک امام مقرر کیا گیا۔ ایک ہندو سقہ کو بھی مقرر کیا گیا۔ اس سڑک پر بادشاہ کے حکم سے دور و یہ درخت لگوائے گئے تاکہ مسافر ٹھنڈی چھاؤں میں سفر کریں۔ ان تعمیرات کے آثار میرے اپنے زمانہ تک کہ شیر شاہ کے عہد کو باون سال گزر چکے ہیں باقی ہیں۔

**عدل و انصاف** | شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا۔ اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک تھی کہ بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی ہوئی چلی جائے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔

خدا کا میں بڑا شکر گزار ہوں کہ میری پیدائش اس عادل بادشاہ کے زمانہ میں ماہ ربیع الثانی ۹۸۰ھ میں ہوئی۔



شیر شاہ نے مغلوں کے حملوں کو روکنے کے لیے کوہ بانات پر رہتاس کا قلعہ تعمیر کرایا اور خواص خاں کو بہایوں کے حاکم پر متعین کر کے دارالخلافہ کو لوٹا۔

**قاضی فضیلت** راستہ میں اطلاع ملی کہ بنگالہ میں خضر خاں سرگ نام ایک سردار نے سرکشی اختیار کی ہے اور اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے۔ شیر شاہ نے فوراً بنگال کا رخ کیا اور خضر خاں کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اس علاقہ کو اپنے امیروں میں تقسیم کر دیا۔ اپنے لشکر کے قاضی کو جس کا نام قاضی فضیلت تھا۔ رہتاس مشرقی کے قلعہ پر ناظم مقرر کیا۔ عوام اس قاضی فضیلت کو اس کے رویہ کی وجہ سے قاضی فضیلت کہتے تھے۔ شیر شاہ ان مہموں سے فارغ ہو کر ۹۴۸ھ میں آگرہ واپس آ گیا۔

**گوگیدی** ۹۴۹ھ میں شیر شاہ مالوہ کی فتح کے ارادہ سے گواپار گیا۔ قلعہ گواپار میں بہایوں کا ایک امیر ابوالقاسم بیگ متعین تھا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں قلعہ کی کنجی لے کر حاضر ہو گیا۔ اسی جگہ حاکم مالوہ ملو خاں بھی جو شاہانہی کا غلام اور اس علاقہ کا بااقتدار شخص تھا، بادشاہ کی قدم بوسی کے لیے باریاب ہوا۔ شیر شاہ نے اس پر بڑی عنایتیں کی اور بھاری انعام و اکرام سے نوازا۔ اور اپنے خیمہ کے نزدیک ہی اس کا خیمہ لگوا دیا۔ شیر شاہ اسے ایک سو ایک گھوڑے اور دوسرے اعزاز بھی عطا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ لیکن ملو خاں نہ معلوم کس وجہ سے خائف ہو کر غلاموں کی طرح خیمہ چاک کر کے راتوں رات لشکر سے بھاگ گیا۔ یہ شعر شیر شاہ نے اسی کے متعلق کہا تھا ہے

با ما چہ کرو دیدی ملو غلام گیدی  
قولیست مصطفیٰ را "لانیخیری عبیدی"

ملو خاں کی سرکوبی کے لیے شیر شاہ نے حاجی خاں سلطان کو تو مالوہ کی طرف اور سزاوہل خاں کو سرکار ستواس کی طرف روانہ کیا۔ ان دونوں کے مقابلہ میں ملو خاں کو شکست ہوئی اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ انہی دنوں خان خاناں شیر و ایل نے رنتمبور کا قلعہ شاہی لشکر کے حوالہ کر دیا۔ اور خود اپنے خاندان کو لے کر دور کے قصبہ میں چلا گیا۔ کہتے ہیں وہاں اس کو کسی نے زہر دے کر مار ڈالا۔ اس کی قبر پشاور سے باہر ایک نہایت ہی رفیع مقام پر ہے۔

**پورن مل کا قتل** اسی سال رائے سین کے مقدم پورن مل نے چندیری کو لوٹ لیا اور وہاں کے اکثر آدمیوں کو قتل کر دیا۔ اپنے حرم میں وہاں کی دو ہزار ہندو اور مسلمان عورتوں کو داخل کر لیا۔ جب شیر شاہ کو اس فساد اطلاع ملی تو وہ برق و باد کی طرح رائے سین کے قلعہ پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ کا مادہ تاریخ ہے

"قیام بارگہ باشد مبارک"

شیر شاہ قلعہ کو فتح نہ کر سکا اس لیے اس نے شہزادہ عادل خاں اور قطب خاں کے وسیلہ سے عہد و پیمان کر کے پورن مل کو مایا اور بڑی عزت کے ساتھ اسے لشکر میں بٹھرایا۔ سو گھوڑے کافی زر نقد اور خلعت انعام میں دیا۔ بعد میں شیر شاہ نے لشکر کی اور میر سید رفیع الدین صفوی سے فتویٰ لے کر پورن مل کو اس کے اہل و عیال اور بچوں سمیت ہاتھیوں کے پیروں

میں کچلوا دیا۔ اس سانحہ میں پورن مل کے دس ہزار ہندوؤں میں سے ایک کی بھی جان نہ بچی اور وہ سب بیوی بچوں سمیت قتل ہوئے۔ بعض خود آگ میں جل کر مر گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۹۵۵ھ میں پیش آیا تھا۔

**راجہ مالدیو پر حملہ** | کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے آگرہ سے راجہ مالدیو کے خلاف فوج کشی کی۔ مالدیو ناگور اور جودھ پور کے بڑا نامی گرامی راجہ تھا۔ اور مسلمانوں پر اس کے غلبہ اور زیادتی کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔

شیرشاہ کا قاعدہ تھا کہ خواہ دشمن زیادہ ہو یا کم اپنے لشکر کے اطراف وہ خندق ضرور بنالیتا تھا۔ اجیر کے نواح میں راجہ مالدیو پچاس ہزار سوار لے کر بڑی تیاریوں کے ساتھ مقابلہ پر آیا۔ وہاں میدان جنگ پورا ریتلا تھا۔ حصار اور خندق بنا کر کسی طرح ممکن نہ تھا۔ شیرشاہ نے اس بارے میں اپنے تجربہ کار امراء سے مشورہ کیا کسی کی سمجھ میں کوئی تدبیر نہ آئی اور سب عاجز و حیران ہو گئے۔ اس وقت شیرشاہ کا ایک خور دسالی پوتا جس کا نام شاہ عالم تھا بے ساختہ بول اٹھا۔ ”بنجاروں کو حکم دیجئے کہ وہ اپنے تھیلے ریت سے بھر کر لشکر کے گرد مورچہ بندی کر دیں۔“ بادشاہ اس کی بات سن کر پھر دک اٹھا۔ اسی وقت اپنی گہری اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا ولی عہد بنالیا۔ لیکن سلطنت شاہ عالم کی قسمت میں نہیں تھی۔ جب سلیم شاہ بادشاہ بنا اس نے سب سے پہلے اسی کو قتل کرایا تھا۔

**جنگی تدبیر** | شیرشاہ اپنے پٹھان لشکریوں کی جانوں کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے عموماً لڑائیوں کو مقابلہ کے بجائے حکمت عملی سے جیتنا چاہتا تھا۔ راجہ مالدیو کے مقابلہ میں بھی اس نے ایک چال چلی۔

راجہ مالدیو کے سرداروں کی طرف سے اس نے اپنے کام بہت سے جعلی خط لکھوائے۔ ان کا مضمون یہ تھا کہ لڑائی کے دن آپ کو مقابلہ کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، ہم خود راجہ مالدیو کو گرفتار کر کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دیں گے۔ بشرطیکہ فلاں فلاں علاقے آپ ہم کو جاگیر میں عطا کریں۔ پھر شیرشاہ نے کسی تدبیر سے وہ خطوط راجہ کے ہاتھوں تک پہنچا دیئے۔ شیرشاہ کی چال کامیاب ہوئی اور وہ اپنے تمام سرداروں سے بدگمان ہو گیا۔ راتوں رات میدان جنگ سے نکل کر بھاگ گیا۔ امیروں نے اس سے مل کر بہت کچھ یقین دلایا کہ ہم ہرگز دغا نہیں کریں گے۔ یہ سارا فریب شیرشاہ کا ہے۔ لیکن راجہ کو ان کے کئے کا کسی صورت میں بھی یقین نہ آیا۔ مالدیو کا ایک سردار گویا نامی تھا۔ اس کو بڑا خصم اور غیرت آئی۔ اور اس نے بگڑ کر مالدیو کو بڑی بڑی گالیاں دیں، اپنے چار ہزار آدمیوں کے ساتھ شیرشاہ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ یہ لوگ شب خون کے ارادہ سے نکلے۔ لیکن یہ بد قسمتی سے راستہ بھول کر رات بھر بھٹکتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور طرف

لے راجا مالدیو۔ ایک مالدیو تو وہ ہے جسے سلطان محمد تغلق جو نے چوڑا راجہ بنایا تھا۔ یہ چوہان تھا اور مالوم کا حاکم تھا۔ شیرشاہ نے جس مالدیو پر حملہ کیا تھا وہ مارواڑ کا راجہ تھا جس کا پایہ تخت اجیر تھا۔ سلطان معز الدین سام (شہاب الدین خوری) نے دہلی کے رائے پور کو شکست دینے کے بعد قنوج کے راجہ جے چند کو بھی شکست دی اور وہ گنگائی ڈوب کر مر گیا۔ اس کا بھتیجا سپہا گامی شمس آباد پر حاکم تھا۔ اسکے تین بیٹے تو تک، اشوتھی آج باپ کے قتل کے بعد گجرات بھاگ کر آئے۔ راستہ میں پانی میں ٹھہر گئے۔ یہاں برہمنوں نے ان کو سردار بنالیا۔ پھر تو مکہ نے گوہل اور فیہ قبیلوں کو شکست دے کر آئندہ پر اور اس کے بھائی آج نے بگلانہ پر قبضہ کر لیا۔ مارواڑ اشوتھی کے قبضہ میں رہا۔ اسی کی اولاد سے راجگان اجیر و مارواڑ میں۔ مالدیو اس سلسلہ سے ملے۔ مارواڑ کا علاقہ اکبری عہد میں اجیر جودھ پور، سروہی، ناگور اور دیکانیر پر مشتمل تھا۔

فی دور نکل آئے ہیں۔ ان لوگوں نے جان دے دینے کا قول و قرار کیا تھا اس لیے واپس نہ ہوئے۔ جب انہیں شیرشاہ کا لشکر نظر آیا تو گھوڑوں سے اتر کر سب نے از سر نو قسم کھائی اور ایک نے دوسرے کے کمر پٹے سے اپنے کمر پٹے کو باندھ لیا۔ برچھے تلوار لے کر شیرشاہ کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ شیرشاہ نے ان حملہ آوروں پر ہاتھی دوڑا دیئے جن میں سے اکثر ہاتھیوں کے پیروں میں پامال ہو گئے۔ جو بچے وہ توپوں اور تیروں کی بوچھاڑ کی تذرہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھی سلامت نہ رہا۔ اس لڑائی میں ایک مسلمان کو بھی چشم زخم نہ پہنچا۔ ایک پشاور شاعر نے جس کا تخلص فیضی تھا اس واقعہ پر یہ شعر کہا تھا ہے

ناگہاں کشت شہی بر سر ملدیور سید

مات بودار تشدی مہرہ گویا نفری

اس فتح کے بعد شیرشاہ اکثر کہا کرتا تھا: ”بڑی خیر ہو گئی میں نے تو تمام ہندوستان کی سلطنت مٹھی بھر جوار کے عوض بیچ دی تھی۔“

اس کے بعد شیرشاہ نے رنجبور کا قلعہ اپنے بیٹے عادل خاں کو دیا۔ اور اسے وہاں چند دن کے لیے رخصت کر دیا تاکہ اس کا انتظام کر کے لوٹ آئے۔

رفیع الدین محدث | میں نے معتبر آدمیوں سے سنا ہے کہ سید رفیع الدین محدث نے جن کا پہلے ہی ذکر آچکا ہے اس سفر میں شیرشاہ سے کہا: ”میرے باپ دادا سب اہل علم صاحب تصانیف تھے اور حرمین شریفین میں وعظ لگا کرتے تھے۔ سارے خاندان میں میں ہی ایک ایسا تالائق ہوں جو روپیہ کے لالچ میں ہندوستان میں آوارہ گردی کر رہا ہوں اور بالکل ہی جاہل رہ گیا ہوں۔ اب حضور مجھے معاف فرمائیں تاکہ وطن جا کر اپنے خاندان کا چراغ روشن کروں۔“

شیرشاہ نے ان سے کہا: ”مجھے آپ کو رخصت کرنے میں کوئی عذر نہیں۔ لیکن میں نے آپ کو ایک مصلحت کی خاطر ٹھہرا رکھا ہے۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ ہندوستان کے وہ قلعے جو ہندوؤں کے قبضہ میں رہ گئے ہیں فتح کر لوں اس کے بعد ان قزلباشوں کی خبر لوں جو حاجیوں کو راستوں میں لوٹ لیتے

ہیں۔ ان قزلباشوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کو سلطان روم دباتا ہے تو وہ اس طرف چلے آتے ہیں اور جب وہ لوٹ جاتا ہے تو یہ پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ میں نے جو تدبیر سوچی ہے۔ اس کے مطابق ادھر سے شاہ روم اور ادھر سے میں دونوں مل کر ان قزلباشوں کا ایسا قلعہ قمع کر دیں گے کہ پھر انہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اس مہم کے لیے اور حرمین شریفین میں کسی ایک مقام کی خدمت کا اجانت نامہ حاصل کرنے کے لیے میں آپ کو اپنا وکیل بنا کر شاہ روم کے پاس سفارت روانہ کر دوں گا۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے اس سفارت کے لیے آپ کے سوا دوسرا کوئی موزوں نظر نہیں آتا۔ کیا عجب کہ شیرشاہ کی یہ حسن نیت ہی اسکی مغفرت کا سبب بن جائے۔ عمرو بن لیث جو شاہان عراق میں ممتاز بادشاہ گزرا ہے اسی طرح حسرت ظاہر کیا کرتا تھا کہ میں

امرو بن لیث۔ ایران کے پہلے صفاری بادشاہ یعقوب لیث کا بھائی اور جانشین تھا۔ پائے تخت خراسان تھا۔ بغداد کے خلیفہ معتز نے اسے ہر گز کے شکست دی۔ جب وہ شیراز سے خراسان بھاگ کر آیا تو اسمعیل سامانی نے اسے گرفتار کر کے بغداد بھیج دیا۔ یہاں وہ قید خانہ میں رہا اور اسی قید میں مر گیا۔ ایک آنکھ سے نابینا تھا۔ تیروہ سال حکومت کی۔

اگر امام حسین کے ساتھ ہوتا تو یزیدیوں کے دماغ ٹھکانے لگا دیتا۔ لوگوں نے اُسے خواب میں دیکھا کہ وہ روضہ جنت میں سیر کر رہا ہے۔ بہر حال آدمی کوئی بھلا کام کر سکے یا نہ کر سکے اسکی نیت اور آرزو تو کر سکتا ہے۔ اس کا بھی اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔

۹۵۲ء میں شیر شاہ نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ہندوستان کے مضبوط قلعوں میں سے ایک ہے۔ بادشاہ کے حکم سے فصیل کے گرد سرنگیں کھودی گئیں۔ اور جب یہ سرنگیں قلعہ کے اندر

پہنچیں تو مسلمان بہادران سرنگوں کے ذریعے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ اور وہاں اپنی تلواروں سے ایک قیامت برپا کر دی۔ شیر شاہ اپنی نگرانی میں ایک مقام سے بارودی گولے قلعے میں پھینکوا رہا تھا۔ اتفاق سے ایک گولہ قلعہ کی دیوار سے ٹکرا کر شاہی لشکر ہی میں لوٹ آیا اور پھٹ گیا۔ اس کے اثر سے وہاں جتنے گولے تھے سب پھٹ پڑے اور ہر طرف آگ پھیل گئی۔ شعلوں میں شیر شاہ بھی گھر گیا اور اس کا سارا بدن جل کر سیاہ ہو گیا۔ شیخ خلیل پیر زادہ اور مولانا نظام الدین دانش مند کو بھی اس آگ سے صدمہ پہنچا۔

بارودی مورچہ کے قریب سی بادشاہ کے لیے ایک چھوٹا ڈیرا لگایا گیا تھا۔ شیر شاہ اسی نازک حالت میں دوڑتا ہوا اس خیمہ میں چلا گیا۔ فوج قلعہ پر یورش کر رہی تھی اور بادشاہ خیمہ میں بے ہوش پڑا تھا۔ جب بھی اسے کچھ ہوش آتا وہ چلا چلا کر لوگوں کو قلعہ فتح کرنے پر اکساتا رہتا اور جو کوئی اسے دیکھنے اندر آتا تو بادشاہ اسے محاذ پر جانے کا اشارہ کرتا۔ جاں بلب بادشاہ کے اس عزم کو دیکھ کر امرائے لشکر نے بھی بجائے ہراساں ہونے کے پورے جوش و خروش کے ساتھ قلعہ پر یورش کی اور خنجر و تلواروں سے دشمنوں کے حلق پھاڑ کر رکھ دیئے۔

غیبی انداز میں نے ایک معتبر آدمی سے سنا ہے۔ ”اسی روز ایک شخص سیاہ لباس پہنے اور سر پر عمامہ باندھے فوج کو رڈائی کے لیے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔ سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن کسی نے اسے نہ پہچانا کہ کون ہے۔ سب کے ساتھ وہ بھی قلعہ میں داخل ہوا تھا۔ فتح کے بعد لوگوں نے جب اُسے ڈھونڈا تو کہیں اُس کا پتہ نہ چل سکا۔ اسی طرح دونوں طرف کے مورچہ والوں نے بھی یہی بیان کیا کہ اسی لباس کے سوار لشکر کے آگے آگے جاتے ہوئے نظر آئے جب سب قلعہ میں داخل ہو گئے تو وہ غائب ہو گئے۔ بہر حال یہ بات کافی مشہور ہے کہ اس دن مسلمانوں کی مدد کے لیے غیب سے کمک آئی تھی۔

لے کالنجر۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ ”یہ سنگی قلعہ ہے جو سر بہ فلک پہاڑی پر واقع ہے۔ اس میں بہت سے بت خانے ہیں۔ ایک بت کا نام ”کالی بھیروں“ ہے۔ یہ بت اٹھارہ ہاتھ لیا ہے۔ قلعہ میں متعدد چشمے اور بے شمار تالاب ہیں۔ قلعہ کے اطراف گھنا جھنگل ہے۔ جس میں آنوس کے درخت ہیں۔ ہاتھی مار شکاری جانور ملتے ہیں۔ یہاں لوہے کی ایک کان بھی ہے۔ آٹھ کوس کے فاصلے پر ہیروں کے ڈڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں حاکم قلعہ راج کیرت سنگھ کے پاس چھ نادر تحفے تھے۔ ایک دانشمند اور پارسا برہمن ایک خوبصورت خوش کردار نوجوان۔ ایک طوطی جو ہر سوال کا جواب دیتی تھی اور جو کچھ سنتی یاد رکھتی ایک گویا بخشونامی دو حسین اور خوب رو گانے والی کنیزی۔ سلطان بہادر گجراتی نے راجہ سے ان میں سے کوئی ایک تحفہ طلب کیا۔ راجہ نے بخشو گویے کو اس کے حوالے کر دیا۔ بعد میں شیر خاں نے ان دونوں پر ہی جالی لٹائی۔ کوٹانگا۔ راجہ نے اس کا مطالبہ قبول نہ کیا اور شیر خاں نے کالنجر کا محاصرہ کر لیا۔ راجہ اپنی عورتوں سمیت چٹا میں جل کر مر گیا۔ اور شیر خاں بھی باقاعدہ خانہ میں آگ لگنے سے جل کر فوت ہوا۔“



شیرشاہ کا انتقال | شیرشاہ اسی بے قراری اور تڑپ کی حالت میں بار بار قلعہ کی فتح کے متعلق پوچھتا رہا۔ اُس دن گرمی بھی بہت تھی، لوگوں نے اس کے جسم پر صندل اور گلاب کا لپ لگایا۔ لیکن اس کی تکلیف برابر بڑھتی گئی۔

جیسے ہی شیرشاہ نے فتح کی خبر سنی۔ اُس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ اسکی وفات پر یہ قطعہ تاریخ کہا گیا۔

شیرشاہ آنکہ از مہابت او شیر و بزن آب را بہم مے خورد  
از جہاں رفت و گفت پیر خرد سال تاریخ او ز آتش مرد

شیرشاہ کا آبائی قبرستان سہرام میں تھا۔ اس لیے اس کی لاش وہی لے جا کر دفنائی گئی۔ شیرشاہ نے پندرہ برس تک تو سرداری اور حکومت کی اور پانچ سال خود مختار بادشاہت۔ آئینہ دیکھ کر وہ کہا کرتا تھا۔

”افسوس مجھے شام کے وقت بادشاہی ملی“

شیرشاہ کا نام فرید خاں تھا۔

باپ کا نام حسن خاں سور۔

شیرشاہ کی زندگی ایک نظر میں

سال ولادت :- کہ جب ۹۳۵ھ

سال جلوس :- ۹۴۷ھ

مقام جلوس :- آگرہ

دار الخلافہ :- دہلی

مدت سلطنت :- ۴ سال ۴ ماہ ۱۵ یوم

سال وفات :- ۱۲ ربیع الاول ۹۵۲ھ

مدفن :- سہرام (مرتبہ مترجم)

## سلیم شاہ بن شیرشاہ سوری

شیرشاہ کے انتقال کے بعد امرا نے اس کے بیٹے سلیم خاں (اصل نسخہ میں ”اسلم شاہ“ الف سے نام لکھا ہوا ہے) کو تخت نشینی کے لیے بلایا۔ وہ اس وقت پٹنہ کے نواح میں تھا۔ سلیم خاں کوچ پر کوچ کرتے ہوئے نہایت تیزی سے لشکر میں پہنچ گیا۔ عیسیٰ خاں حجاب اور دوسرے امرا کی تائید سے اس کی تخت نشینی ہوئی۔ اس نے اپنا خطاب سلیم شاہ رکھا۔

سلیم شاہ کا سن جلوس ملا احمد جنید نے اس آیت سے نکالا۔

”وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِمَّنْ بَعْدَ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ“

سلیم شاہ کا خط | تخت نشینی کے بعد سلیم شاہ نے اپنے بڑے بھائی عادل خاں کو جو رنٹھبور میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس مضمون کا

لے رنٹھبور۔ جہانگیر نے اپنی توڑک میں لکھا ہے ”یہ ہندوؤں کا بڑا قلعہ ہے۔ سلطان علاؤ الدین خلجی نے مدتوں محاصرہ کر کے یہاں کے راجہ ہتھردیو کو

خط لکھا۔ اگرچہ آپ ہی ولی عہد اور جانشین تھے لیکن آپ لشکر سے بہت دُور تھے، اور یہاں فتنوں کے پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس لیے میں کچھ دن کے لیے آپ کے نائب کی حیثیت میں لشکر کی حفاظت کر رہا ہوں۔ جب آپ تشریف لے آئیں گے تو مجھے ہر طرح اطاعت گزار اور فرماں بردار پائیں گے۔“

سلیم شاہ نے کالجبر سے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔ کورہ گھاتم کے قصبہ میں خواص خاں نے اپنی جاگیر سہرند سے حاضر ہو کر سلیم شاہ کی اطاعت قبول کی۔ لیکن درحقیقت وہ عادل خاں کا ہی دل سے طرف دار تھا۔

**تخت نشینی کا جشن** | سلیم شاہ نے آگرہ میں ایک بڑا جشن منعقد کیا اور باقاعدہ جلوس کی رسم ادا کی گئی۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں طویل مراسلت ہوتی رہی۔ آخر کار عادل خاں نے اپنی آمد کے معاملہ کو سلطنت

کے چار بڑے امیر قطب خاں نائب، عیسیٰ خاں نیازی، خواص خاں اور جلال خاں جلوانی کی رائے پر چھوڑ دیا۔ سلیم شاہ نے ان چاروں امیروں سے عہد کیا کہ وہ اسے پہلی ملاقات کے فوراً ہی بعد اس کی جاگیر پر رخصت ہو جانے دے گا۔ اور اسے اختیار ہو گا کہ ہندوستان میں جہاں چاہے اپنے لیے جاگیر حاصل کرے۔ چاروں امیر اس عہد و پیمان کے بعد عادل خاں کو لانے کے لیے گئے اور وہ ان کے ساتھ آگرہ اور وہاں سے سیکری آیا۔ سلیم شاہ نے شکار پور تک آکر اس کا استقبال کیا۔ یہاں دونوں بھائیوں میں ملاقات ہوئی اور انہوں نے باپ کی تعزیت کی رسم ادا کی پھر دونوں مل کر آگرہ کی طرف روانہ ہوئے۔

**سلیم شاہ کی مکاری** | سلیم شاہ بظاہر بڑی محبت و خلوص کا برتاؤ کر رہا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کھوٹ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ عادل خاں کے ساتھ قلعہ میں دو تین آدمیوں سے زیادہ داخل نہ ہونے پائیں۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور عادل خاں کافی جمعیت کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اب سلیم شاہ بھی مجبور ہو گیا اور کسی قسم کی بدگمانی پیدا نہ کرنے کے خیال سے عادل خاں کی خوشامد در آمد میں لگا رہا، اُس سے کہا "میں نے ان سرکش پٹھانوں کو آج تک

دبقیہ حاشیہ رنخبور صفحہ گزشتہ، شکست دی تھی۔ عرش آشیانی (اکبر) نے ایک ماہ بارہ دن میں یہاں کے راجہ رائے سرجن باوا کو شکست دے کر قبضہ کیا۔ رائے سرجن کے بعد اس کا بیٹا رائے بھوج باج گزار حاکم رہا، اب اس کا پوتا سر بلند رائے بھاری خدمت میں ہے۔ یہاں دو برابر پٹاڑ ہیں ایک کو "رن" دوسرے کو "نخبور" کہتے ہیں۔ نخبور کے اوپر قلعہ ہے۔ ان دونوں کو ملا کر "نخبور" نام رکھا گیا۔ قلعہ بہت مضبوط ہے۔ پانی بھی دافر ہے۔ ان پر مضبوط حصار ہے۔ قلعہ ہندوؤں کی عمارت کی طرح ہے ہوا اور کم فضا ہے۔"

لے تمکار پور۔ سیہوان سے ۱۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس جگہ حکام اور امرار شکار کھیلا کرتے تھے اس لیے اس کا نام تمکار پور پڑ گیا۔ خراسان کو جانے والے مسافر جو درہ بولان سے ہو کر جاتے تھے ان کی یہ گزرگاہ تھی۔ ۱۹۰۰ء میں اس کی آبادی پچاس ہزار تھی۔ اندرون شہر کی عمارتیں خام اور بازار تنگ تھے۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں ترقی اور تبدیلی شروع ہوئی۔ پہلے ایک چھت والا بازار تھا۔

آثار قدیمہ میں صرف حاجی فقیر اللہ صاحب کا روضہ ہے۔ جو قندھار سے آئے تھے۔ ان کی وفات ۱۹۵۰ء میں ہوئی تھی۔ انگریزی دور میں ہندوؤں کا شہر تسلط تھا۔ اور انہوں نے یہاں کی تجارت کو بڑی ترقی دی تھی۔ اب بھی تجارت و زراعت کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بڑی مشکل سے قابو میں رکھا ہے، اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے عادل خاں کو تخت پر بٹھایا اور خود فرماں برداروں کی طرح سامنے کھڑا رہا۔ دکھاوے کے لیے بڑی لمبے دار باتیں کرنے لگا۔

**عادل خاں کی دُوراندیشی** | عادل خاں باموش، تنومند، زور آور نوجوان تھا۔ اس کی طاقت اور زور آزمائی کے قصے لوگوں میں مشہور تھے۔ لیکن وہ سلیم شاہ کی چال بازیوں کو بھی خوب بھانپ چکا تھا۔ اس لیے اس نمایشی رویہ پر اس نے دھوکا نہ کھایا اور تخت سے اتر کر سلیم شاہ کو ہی تخت پر بٹھا دیا اور نیچے کھڑے ہو کر بادشاہ کی مبارک باد دی۔ اس دن بہت سا سونا چاندی لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ سلیم شاہ نے حسب وعدہ عادل خاں کو بیانیہ کی جائے عطا کی اور اسے عیسیٰ خاں اور خواص خاں کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

**سونے کی زنجیر** | دو ماہ بعد ہی سلیم شاہ نے اپنے محرم خاص غازی محلی کو عادل خاں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کیا۔ جب یہ خبر عادل خاں کو ملی تو وہ بیانیہ سے خواص خاں کے پاس میوات میں چلا گیا۔ خواص خاں نے غازی محلی کو بلا کر اس کو اسی سونے کی زنجیر میں بندھوا دیا جو وہ عادل خاں کو قید کرنے کے لیے لے کر آیا تھا۔

**عادل خاں کی بلیغار** | ان دونوں نے ایک بھاری شکر آراستہ کر کے آگرہ پر بلیغار کر دی۔ قطب خاں اور عیسیٰ خاں بھی جو تخت کے بلند پایہ امیر تھے اور انہی کے اعتماد پر عادل خاں اس قول و قرار پر راضی ہوا تھا، سلیم شاہ کی اس بد عمدی پر ناراض ہو گئے اور انہوں نے عادل خاں کے پاس خفیہ پیام بھیجا کہ ”آپ شب برات کی صبح کو اول وقت آگرہ میں داخل ہوں، ہم سب یہاں آپ سے بیعت کر لیں گے۔“

عادل خاں اور خواص خاں شب برات کو سیکری پہنچ گئے۔ وہاں حضرت شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں رات بھر عبادت کرتے اور نوافل پڑھتے رہے۔ اس شب گزار دی کی وجہ سے آگرہ پہنچنے میں دیر ہو گئی اور وہ مقررہ وقت پر شہر میں داخل نہ ہو سکے۔

ان کی آمد سے سلیم شاہ گھبرا گیا۔ وہ قطب خاں اور دوسرے امرا کو سمجھا بھجا کر عادل خاں کے پاس بھیجنا چاہتا تھا تاکہ مخالف امراء سے قلعہ خالی ہو جائے تو وہ چنار کے قلعہ میں جا کر ٹھہر جائے۔ اور وہاں کے خزانے اور دینی قبضہ میں کر کے سامان جنگ تیار کر کے عادل خاں کے مقابلہ پر آئے۔ اس کی اس تجویز سے عیسیٰ خاں حجاب نے اختلاف کیا۔ اور اس کے نقصان اور خطرے سمجھا کر اسے چنار جانے سے روک دیا۔

**بھائیوں میں مقابلہ** | سلیم شاہ اپنے قابل اعتماد دو تین ہزار قدیم ملازمین کو لے کر شہر سے باہر مقابلہ کے لیے نکلا۔ ان امیروں کو جنہیں اس نے عادل خاں کے پاس قاصد بنا کر بھیجا تھا یہ کہلو کر بلا لیا کہ ”مجھے عادل خاں کا کوئی اعتبار نہیں۔ خدا جانے وہ تم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم لوگ لوٹ آؤ۔ اب میرے اور اس کے درمیان زبان تیغ ہی سے بات چیت ہوگی۔“

آگرہ کے نواح میں دونوں فوجوں میں بڑی گھمسان کی جنگ ہوئی اور عادل خاں شکست کھا کر تنہا بھت کی طرف نکل گیا۔ خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی نے میوات کا راستہ لیا۔ کیوں کہ یہ دونوں دل و جان سے ایک دوسرے کے شریک تھے۔

سلیم شاہ کے ایک لشکر نے ان دونوں کا تعاقب کیا۔ قصبہ فیروزپور میں اس لشکر کو انہوں نے شکست دے کر بھگا دیا لیکن سلیم شاہ کا خوف ایسا تھا کہ وہ کوہستان کماؤں کے راجہ کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گئے۔ سلیم شاہ نے ان کی سرکوبی کے لیے قطب خاں کو نامزد کیا اور وہ عرصہ تک ان پہاڑوں میں لوٹ مار کرتا رہا۔

اس فتح کے بعد سلیم شاہ چنار گیا اور وہاں کے سارے خزانے اٹھوا کر گوالیار منتقل کر دیے۔

### جلال خاں کا قتل

چنار سے لوٹ کر جب وہ گھام پور کے قصبہ میں آیا تو اس نے جلال خاں جلوانی کو چوگان کھیلنے کے بہانے اپنے خیمہ میں بلایا۔ جلال خاں بڑی جمعیت والا پٹھان سردار تھا اور دل سے عادل خاں کا طرف دار تھا۔ اس لیے سلیم شاہ اس کو ٹھکانے لگانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ اندر آیا، سلیم شاہ نے اسے اور اس کے بھائی خداداد کو گرفتار کر کے ایک پٹھان کے حوالہ کر دیا۔ یہ پٹھان پہلے ہی جلال خاں سے کسی خون کا انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ اس طرح سلیم شاہ نے قصاص کا بہانہ کر کے جلال خاں کو قتل کر دیا اور وہاں سے آگرہ لوٹ آیا۔

کچھ عرصہ بعد سلیم شاہ نے آگرہ کے بجائے گوالیار کو پائے تخت بنالیا اور عادل خاں کے طرف داروں کو ختم کرنے کی تدبیروں میں لگا رہا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے بسا بڑ سلطنت پر سے ایک ایک کر کے مخالف ٹھروں کو اٹھا دیا۔ اس کی اس کارروائی سے قطب خاں بھی خوف زدہ ہو گیا اور کماؤں کی مہم چھوڑ کر لاہور میں ہیبت خاں نیازی کے پاس چلا گیا۔ یہ نیازی وہی امیر ہے جسے شیر شاہ نے اعظم ہایوں کا خطاب عطا کیا تھا۔

ہیبت خاں نے قطب خاں کو پناہ نہ دی۔ بلکہ سلیم شاہ کے مطالبہ پر اسے مقید کر کے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ سلیم شاہ نے قطب خاں، شہباز خاں اور دوسرے تیر چودہ نامی امیروں اور امیر زادوں کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ ان میں سے اکثر کو بارود کے ذریعہ اڑا دیا گیا۔

ان مظلومین میں عادل خاں کا بیٹا محمود خاں بھی تھا جس نے سات سال کی عمر میں شیر شاہ کو لشکر کے اطراف ریت کے بوروں کا حصار بنانے کی تدبیر بتلائی تھی اور شیر شاہ نے اس کو اپنا ولی عہد کہہ دیا تھا۔ جیسے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

اسی سال سلیم شاہ نے لاہور سے اعظم ہایوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ عذر کر کے خود نہ آیا بلکہ اپنے بھائی سعید خاں کو جو بڑا بہادر اور عقل مند آدمی تھا بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ سلیم شاہ نے ظاہر اس سے بھی بڑی مہربانی اور عنایت سے پیش آتا رہا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے بھی ٹھکانے لگانے کی فکر کرتا رہا۔

ایک دن وہ اسے تنہا اپنے محل میں لے گیا اور وہاں بعض امیروں کے سرد کھائے۔ جنہیں اس کے حکم سے زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: کیا تم انہیں پہچانتے ہو یہ کون کون ہیں؟ سعید خاں نے ان کے نام بتلا دیئے جنہیں وہ جانتا تھا۔ باہر آنے کے بعد سعید خاں نے جان بچا کر بھاگنے کی فکر کی اور لاہور کے راستہ میں ڈاک چوکی کا انتظام کرا کے تین راتوں میں آگرہ سے لاہور چلا گیا۔

کمال خاں کا قصہ | سلیم شاہ نے جن امیروں کو گوالیار کے قید خانہ میں بارود میں آگ لگا کر جلوا دیا تھا۔ ان میں سے صرف



کمال خاں کھکر زندہ بچ گیا تھا۔ اس کے بچ جانے کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ اس کی بہن سلیم شاہ کے نکاح میں تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ رات میں قیدیوں کو بارود لگا کر جلادیا جائے گا تو اس نے اس کی اطلاع اپنے بھائی کمال خاں کے پاس بھیجوا دی۔ اور ساتھ ہی روٹی سے بھرے ہوئے چار لحاف اور کئی مشک پانی بھی اس کے پاس بھیج دیا۔ کمال خاں نے غسل کے بہانہ سے ان لحافوں کو پانی میں اچھی طرح بھگو دیا اور ان کو اوڑھ کر سب سے الگ ایک کونے میں جا کر پڑ رہا۔ جب آگ لگائی گئی تو سارے قیدی جل کر رہ گئے۔ مگر کمال خاں ان لحافوں میں زندہ بچ گیا۔ صبح جب سلیم شاہ آتش زدگی کا تماشہ دیکھنے قید خانہ میں آیا تو اسے سلامت دیکھ کر کہا تو چونکہ میرے ساتھ سچا خلوص رکھتا تھا اس لیے تجھے آگ نے کوئی گزند نہیں پہنچایا۔ سلیم شاہ نے قسم کھا کر اسے اطمینان دلایا کہ ”میں اب کبھی بھی تجھے گزند نہیں پہنچاؤں گا“ چنانچہ اسے رہا کر کے حاکم پنجاب کے ہمراہ کھکروں کے ملک پر متعین کر دیا۔ وہاں اس نے بڑا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔

**اعظم ہمایوں کی بغاوت** | اعظم ہمایوں نے اپنے بھائی سعید خاں کے واپس آ جانے کے بعد خود مختاری اختیار کر لی۔ اور کافی قوت فراہم کر کے لاہور میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ سلیم شاہ نے اسکی سرکوبی کے لیے ہرجگہ کے لشکر بلا لیے اور ایک بڑی فوج لے کر آگرہ سے لاہور کی طرف یلغار کی۔ راستہ میں مالوہ کے حاکم یزاول خاں نے حاضر ہو کر باریابی حاصل کی۔ بادشاہ نے اس پر بڑی عنایتوں کا اظہار کیا۔ بعد میں یزاول خاں اپنی بعض مصروفیتوں کا عذر کر کے اجازت لے کر لشکر سے رخصت ہو گیا،

سلیم شاہ نے دہلی پہنچ کر چندے توقف کیا اور وہاں لشکر کو منظم کر کے لاہور کی طرف کوچ کر دیا۔ خواص خاں اور عیسیٰ خاں نیازی بھی کوہ کمالوں سے اعظم ہمایوں کے پاس آ گئے تھے۔ یہ سب باغی امیر اپنے اپنے لشکر لے کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے شہر سے روانہ ہوئے۔ سردیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ انبالہ کے قریب دونوں لشکروں میں مقابلہ ہوا۔

جس دن صبح لڑائی ہونے والی تھی اس رات کو ان امیروں کی مجلس مشاورت میں اعظم ہمایوں نے خواص خاں سے پوچھا ”فتح حاصل ہو جائے تو تخت پر کون بیٹھے گا؟“ خواص خاں نے جواب دیا ”شیر شاہ کا بڑا بیٹا عادل خاں ہی سلطنت کا حق دار ہے؟“ نیازیوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور کہنے لگے ”یہ بھی خوب جائیں تو ہم لڑائیں اور سلطنت دوسرے کے سپرد کر دیں۔ سلطنت کوئی میراث تو نہیں بلکہ قوت بازو سے حاصل ہوتی ہے۔“

خواص خاں کو نیازیوں کا یہ ادا پست نہ آیا۔ کیوں کہ وہ دل و جان سے شیر شاہ اور اس کی اولاد کا خیر خواہ تھا۔ جب صبح مقابلہ ہوا تو بڑی لڑائی کے بعد خواص خاں عیسیٰ خاں کو ساتھ لے کر میدان جنگ سے کنارہ کش ہو گیا اور کسی طرف کو نکل گیا۔

**نیازیوں کی شکست** | نیازیوں نے سلیم شاہ کے مقابلہ میں بڑی جرات دکھائی۔ لیکن تقدیر میں ناکامی لکھی تھی۔ اس لیے بری طرح شکست کھائی۔ اعظم ہمایوں کے بھائی سعید خاں نے اس وقت اپنا حلیہ تبدیل کر لیا اور چند سواروں کے ساتھ سلیم شاہ کے لشکر میں پہنچ گیا۔ وہاں پوچھتا پھر رہا تھا ”بادشاہ کہاں ہے میں اسے مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔“ وہ اس بہانہ سے سلیم شاہ تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا۔ اس وقت سلیم شاہ نے ہاتھیوں کے حلقہ میں اپنی نشست

رکھی تھی۔ اتفاقاً کسی فیل بان نے سعید خاں کی آواز پہچان لی اور اس پر نیزہ سے وار کیا اور وہاں ایک ہجوم سا لگ گیا۔ سعید خاں اس ہنگامہ سے کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا۔

نیازیوں کی فوج منتشر ہو کر روہ کے قریب قصبہ ہنکوٹ میں بھاگ گئی۔ جو بھاگ نہ سکے اُن کو جاگوں اور گنواروں نے ٹوٹ مار کے تباہ کر دیا۔ ان میں کچھ انبالہ کی ندی میں ڈوب کر مر گئے۔ سلیم شاہ نے نیازیوں کا رہنما س تک خود تعاقب کیا اور وہاں سے خواجہ ویس شیرواں کو ایک بھاری لشکر دے کر روانہ کیا اور خود آگرہ کو لوٹ آیا۔ وہاں سے گوالیار چلا گیا۔

عیسیٰ خاں اور خواص خاں جو نیازیوں کا ساتھ چھوڑ کر میدان جنگ سے نکل گئے تھے ان میں سے عیسیٰ خاں خواص خاں کا حملہ | تو پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ لیکن خواص خاں پانچ چھ سو سواروں کو لے کر لاہور لوٹ کر آیا۔ اس وقت

سلیم شاہ کی طرف سے لاہور کا حاکم شمس خاں لوحانی تھا۔ وہ کسی ضرورت کی وجہ سے لاہور سے باہر تیس کوں پر گیا ہوا تھا۔ خواص خاں نے اپنے سواروں کے ساتھ لاہور پر حملہ کرنے کے لیے مرزا کامران کے باغ میں پڑاؤ لگایا۔ شہر والے قلعہ بند ہو گئے اور شمس خاں کے آنے تک حملہ آوروں سے لاہور کی حفاظت کرتے رہے۔ اس اثنا میں خواص خاں نے باغ کے اونچے

اونچے پیر کاٹ کر زینہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اسی وقت اطلاع ملی کہ رائے حسین جلوانی اور دوسرے سلیم شاہی امیر تیس ہزار سواروں کے ساتھ بہت ہی قریب آ پہنچے ہیں (ایک دوسرے نسخہ میں ہے کہ خواص خاں لاہور میں داخل ہو گیا اور شہر میں لوگوں کو قتل کر دیا۔ بعد میں جب بادشاہ کی تعاقب کرنے والی فوج پہنچی تو اُسی دن راوی عبور کر کے موضع میانہ کے نواح میں پہنچ گیا۔ بچی جلوانی جو خواص خاں کے تعاقب پر ماہور تھا اس کے پیچھے ہی میانہ پہنچ گیا۔ خواص خاں زخمی ہو چکا تھا۔ لیکن چارپائی سے اٹھ کر گھوڑے پر سوار ہوا اور بچی سے مردانہ وار جنگ کر کے لڑکھوٹ کی طرف نکل گیا۔

خواص خاں کی بہادری | جس وقت رائے حسین وہاں پہنچا تو خواص خاں نے عیسیٰ خاں سے مشورہ کر کے لاہور کی

آنے والی فوج پر جا پڑا۔ ان کے اس ہلاکت خیز حملے کو دیکھ کر رائے حسین نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ "اس مصیبت کو یہاں سے ٹل جانے دو۔ اور ان کے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دو۔" خواص خاں کے سوار اس فوج کو چیر کر دوسری طرف نکل گئے پھر پیچھے سے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اس وقت خواص خاں کا زانو زخمی ہو گیا اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ لیکن غنیم کے آدمیوں کو آگے بڑھ کر اسے گرفتار کر لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کے آدمی اسے چارپائی پر ڈال کر سب کے سامنے لے کر نکل گئے۔ رائے حسین نے اپنے لشکر کو ان کے تعاقب سے روک دیا اور خواص خاں صحیح سلامت لڑکھوٹ پہنچ گیا۔ اور وہاں سے کماؤں کے پہاڑوں میں چلا گیا۔

اعظم ہمایوں کے نیازیوں نے بادشاہ سے شکست کھا کر کشمیر کا رخ کیا۔ وہاں پہاڑ کی گھاٹیوں میں کشمیریوں نے دھوکے سے ان سب کو نیست و نابود کر دیا۔

سزا اول خاں کی سرکشی | سزا اول خاں بھی بادشاہ سے سرکش ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے کسی وجہ سے عثمان نامی ایک پٹھان کا ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ وہ پٹھان انتقام کی فکر میں تھا۔ چنانچہ اس نے

۹۹۲ء میں موقع پاکر سزاویں خاں پر تلوار سے حملہ کر دیا اور وہ زخمی ہو گیا۔ اسے گمان ہوا کہ پٹھان نے یقیناً سلیم شاہ کے اشارہ ہی سے حملہ کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ سلیم شاہ سے کٹ کر مالوہ کی طرف چلا گیا۔ بادشاہ نے بانس والہ تک اس کا تعاقب کیا لیکن وہ سرود کے زمینداروں کے علاقہ میں ایسا گم ہو گیا کہ اس کا پتہ نہ چلا۔ سلیم شاہ نے عیسیٰ خاں سور کو بیس ہزار سوار دے کر اجین میں چھوڑ دیا اور خود گوالیار واپس ہو گیا۔

**سلیم شاہ کے انتظامات** | سلیم شاہ نے اپنی حکمرانی کے آغاز میں ہندوستان کی تمام بڑی بڑی سرکاروں میں پانچ پانچ ہزار سوار متعین کر دیئے تھے۔ ان سواروں میں نظام سوار کا بیٹا بازار خاں بھی شامل تھا۔ یہ سلیم شاہ کا چچا زاد بھائی اور سالا بھی تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا بعد میں سلطان محمد علی خطاب ہوا ہے۔ سلیم شاہ نے بازار خاں کو سنبھل کی سرکاری اجاوں کے علاقہ پر بیس ہزاری منصب دے کر روانہ کیا تاکہ خواص خاں یا کوئی اور باغی اس جانب سے فتنہ انگیزی نہ کرے۔ پایندہ خبر کہ کو بادشاہ نے بازار خاں کا نائب مقرر کیا تھا۔

اپنے ابتدائی عہد ہی میں سلیم شاہ نے شیر شاہ کی بنائی ہوئی سراؤں کے درمیان ہر جگہ ایک ایک اور سررائے بنانے کا حکم دیا تھا اس سررائے کے ساتھ مسجد خالقہ اور آبدار خانوں کا بھی انتظام رکھا گیا تھا۔ اس نے عام لنگر بھی جاری کرائے۔ جس میں مسلمانوں کو توپکا ہوا کھانا ملتا تھا اور ہندوؤں کو اناج۔ سلیم شاہ نے ایک حکم کے ذریعہ ان تمام لوگوں کے روزینے حسب سابق بحال رکھے جن کو شیر شاہ نے جاری کیا تھا۔ اس نے حکماء امراتہ کے گھروں سے پاتروں کے اکھاڑے برخاست کرا دیئے ان کا ہندوستان میں بڑا رواج تھا۔

امراتہ سے بادشاہ نے تمام ہاتھی بھی لے لیے۔ صرف کمزور اور لاغر ہتھکیاں جو بارکشی کے کام کی تھیں رہنے دیں۔

سلیم شاہ نے حکم دیا تھا کہ بادشاہ کے سوا ہر رخ سراپردہ اور کوئی نہ لگائے۔

اس نے تمام ملک کو اپنا خالصہ قرار دے دیا۔

فوجیوں کی تنخواہ اسی قاعدہ پر جاری رکھی جس پر شیر شاہ کے عہد میں تقسیم ہوتی تھی۔

سلیم شاہ نے ہر سرکاری حکم نامے جاری کیے۔ ان میں دینی دنیوی، جزئی کلی، مالی اور ملکی تمام معاملات کے متعلق قوانین

درج تھے اور ان طریقوں کی وضاحت تھی جن کے مطابق فوج، رعیت اور تاجروں کو معاملات کرنا چاہیے۔ حکام کے لیے بھی

تفصیلی لائحہ عمل درج تھا۔ جس میں تمام امور کے بارے میں قوانین لکھ دیئے گئے تھے۔ یہ لائحہ عمل اتنا مکمل تھا کہ اس کے بعد حکام کو بہت

کم ضرورت پڑتی تھی کہ وہ کسی معاملہ میں قاضی یا مفتی سے دریافت کریں۔

**سلیم شاہی لائحہ عمل** | سلیم شاہ نے اپنے ہر سردار کو ایک ایک جوتی اور ایک ایک ترکش دے رکھی تھی۔ ہر جمعہ کو بیس ہزاری دس ہزاری اور پانچ ہزاری تمام امیر آٹھ ہاتھ اونچا خیمہ لگا کر سلیم شاہ کی جوتی اور ترکش کو

ایک کہ سی پر رکھتے تھے۔ اور ان چیزوں کو سب سے پہلے شکر کے سردار پھر منصف یعنی امین پھر دوسرے افسر اور عمدہ دار

جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور بڑے ادب و ترتیب کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے تھے۔ پھر منشی مذکورہ حکم نامہ کو جوتی

صفحات پر مشتمل تھا لے کر داخل ہوتا تھا۔ اور اسے اقل سے آخر تک پڑھتا تھا۔ اس میں ہر مشکل مسئلہ کے شق وار حل تفصیل

سے درج تھے۔ اسی کے مطابق سارا نظم و نسق چلایا جاتا تھا۔ اگر کبھی کوئی امیر کسی بھی معاملہ میں اس لائحہ عمل کے خلاف کاروائی کرتا تو منشی اس کی خبر بادشاہ کو پہنچا دیتا تھا اور اس امیر کو مع اہل و عیال کے سزا دی جاتی تھی۔ سلیم شاہ کے آخری عہد تک یہی معمول اور طریقہ تھا۔ یعنی مصنف ۱۵۵۵ء میں کم عمر بادشاہ تھا۔ اس وقت میں فرید تارن پنج ہزاری کے لشکر کے ساتھ اپنے نانا کے ہمراہ بھوارہ گیا تھا۔ بھوارہ بیانہ کا ماتحت علاقہ ہے۔ وہاں میں نے یہ کیفیت (لائحہ عمل پڑھنے کی رسم) اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس سے پہلے ۱۵۵۴ء میں بھی ایک مرتبہ ایسی محفل کو دیکھ چکا تھا۔

**نیازیوں کی تحقیر** | خواجہ اویس شروانی کو سلیم شاہ نے اعظم ہایوں کی سرکوبی کے لیے متعین کیا تھا۔ اس نے دھن کوٹ کی سرحد پر نیازیوں کے مقابلہ میں شکست کھائی۔ اور اعظم ہایوں نے سہرند تک اس کا تعاقب کیا۔

بادشاہ نے ایک دوسرا بھاری لشکر اس کے مقابلہ پر روانہ کیا اور اس نے نیازیوں کو شکست دے دی۔ ان کی بعض عورتیں بھی شاہی لشکر کے ہاتھ آ گئیں، سلیم شاہ نے ان کو بے عزت کرا کے قلعہ گوالیار میں بھیج دیا۔ غنیمت میں نیازیوں کے علم سہرا پر وہ اور دوسرا سارا اسباب ملا تھا، وہ سب بادشاہ نے رنڈیوں کو بخش دیا۔ اور ان رنڈیوں میں سے کسی کو اعظم ہایوں، کسی کو سعید خاں اور کسی کو شہباز خاں کا خطاب دیا۔ ان رنڈیوں کے دروازوں پر نوبت کے وقت نقارے بجتے تھے۔ اس شاہانہ الطاف کی وجہ سے ان کے دماغ آسمان پر پہنچ گئے تھے۔ یہ رنڈیاں جمعہ کی شہ میں دربار کے دستور کے مطابق سلیم شاہ کے سلام کو جایا کرتی تھیں۔ اس وقت نقیب بلند آواز سے کہتا تھا "بادشاہ ہم نظردوت اعظم ہایوں خاں نیازی، سعید خاں نیازی، شہباز خاں نیازی دعا کے لیے حاضر ہے۔" سلیم شاہ کی یہ حرکت پٹھانوں کو بڑی ناگوار تھی۔ کیونکہ وہ سب آخر کار ایک ہی برادری اور قبیلہ کے تھے۔ بعض کہتے ہیں یہ خطاب علم اور نقارے پہلی فتح کے وقت ہی رنڈیوں کو دیئے گئے تھے۔

**پٹھانوں سے بدگمانی** | اس شکست فاش کے بعد اعظم ہایوں کا زور ٹوٹ گیا۔ نیازیوں کی جمعیت پر اگندہ ہو گئی اور انہیں پھر مقابلہ کی جرات نہ ہوئی۔ وہ رہتاس کے نواح میں کھڑوں کی پناہ میں تھا۔ پھر کشمیر کے پہاڑوں میں جا کر پناہ گزین ہو گیا تھا۔ سلیم شاہ نے ایک بڑا لشکر لے کر نیازیوں کے مکمل استیصال کے لیے کوچ کیا۔ پنجاب پہنچنے کے بعد اس نے

شمالی کوہستان میں موزوں مقامات پر پانچ قلعوں کو تھانہ کے لیے تعمیر کرایا۔ جیسے مانکوٹ، رشید کوٹ وغیرہ۔ سلیم شاہ پٹھانوں سے بڑا بدگمان ہو گیا تھا، اس لیے اس نے لشکر کے پٹھانوں کو ذلیل کرنے کے لیے قلعوں کی مرمت پر لگا دیا اور وہ دو سال تک چونا پھر ڈھوتے رہے۔ اس عرصہ میں اس نے ان کو ایک جہ بھی تنخواہ کا نہیں دیا۔ جو اس مصیبت سے بچ گئے تھے ان کو کھڑوں کے مقابلہ پر لگا دیا گیا۔ کھکر حسب عادت دن بھر ان پٹھانوں سے لڑتے تھے اور رات میں چوڑی چھپ چھاپ مار کر ان کے لشکر میں سے عورت، مرد، باندی غلام جو بھی ہاتھ لگ جاتا اڑا لے جاتے تھے۔ اور ان ایسروں کو کچھ عرصہ قید میں رکھ کر بیچ دیتے تھے۔

**فرہلی کا لطیفہ** | پٹھان ان مصیبتوں اور ذلتوں سے تنگ آ گئے۔ لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ سے کچھ کہتا۔ ایک دن شاہ محمد فرہلی نے جو ایک نامی امیر تھا اور نہایت خوش طبع ہزل گو اور گستاخ بھی تھا۔ سلیم شاہ سے کہا



میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے کہ آسمان سے تین تھیلیاں اتریں۔ ایک میں سونا ایک میں کاغذ اور ایک میں خاک بھری ہوئی تھی۔ سونا تو دفتر کے ہندوؤں کے گھر چلا گیا، کاغذ شاہی خزانے میں رہے اور خاک سپاہیوں کے سر پر پڑی سلیم شاہ کو یہ لطیفہ بہت پسند آیا اور اس نے خوش ہو کر حکم دیا کہ ”اب جو ہم گوالیار ٹوٹ کر جائیں تو سارا حساب کر کے سپاہیوں کی دو سال کی تنخواہ ادا کر دی جائے۔“ اس حکم کی تعمیل سے پہلے ہی سلیم شاہ کا انتقال ہو گیا۔

**نیازیوں کا حشر** | نیازیوں کو کشمیریوں نے جو بڑے مکار اور دغا باز ہوتے ہیں دھوکا دے کر اپنے ہاں بلایا اور راستہ سے بہا کر گھاٹیوں میں پھنسا دیا۔ پھر سلیم شاہ کے اشارہ سے ان کا راستہ بند کر کے ان پر حملہ کر دیا اس لڑائی میں نیازیوں کی عورتیں بھی اپنے تنگ و ناموس کو بچانے کے لیے رو کر مر گئیں۔ خود اعظم ہایوں کی ماں اور بیوی بھی مقابلہ کرتی ہوئی پتھروں کے نیچے دب کر مر گئیں۔ ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

مشہور ہے کہ شیر شاہ کے زمانہ میں ان نیازیوں نے سنبھل قبیلہ کے پٹھانوں کو عہد و پیمان کر کے بلایا تھا۔ اور پھر عہد شکنی کر کے شیر شاہ کے اشارہ سے اس قبیلہ کے دو ہزار آدمیوں کو عورتوں بچوں سمیت ہلاک کر دیا تھا۔ زمانہ کا پھیر دیکھو کہ ان کا کیا ان کے آگے آیا۔ کشمیریوں نے ان تینوں بھائیوں کے سر کاٹ کر سلیم شاہ کے پاس بھیج دیئے۔

**کامران مرزا کی توہین** | جس زمانہ میں سلیم شاہ نے کھکروں پر فوج کشی کی تھی اور مال گردھ کا قلعہ بنانے میں مصروف تھا کامران مرزا ہایوں سے شکست کھا کر کابل سے ہندوستان آیا تھا تاکہ سلیم شاہ سے مدد لے کر

ہایوں سے دوبارہ مقابلہ کرے۔ سلیم شاہ نے اس کے استقبال کے لیے اپنے لشکر میں سے سیموں بقال کو منتخب کیا اور اس کے ہمراہ پٹھانوں کی جمعیت کر دی۔ سیموں بقال پہلے بازار کانگران تھا، لوگوں کی چغلیاں کھا کر اور مخبری کر کے وہ سلیم شاہ کے ہاں قابل اعتبار بن گیا تھا۔ سلیم شاہ نے اسے کامران کے استقبال پر محض اس لیے بھیجا تھا کہ اسے پٹھانوں پر اعتماد نہیں تھا اور سیموں پر اعتماد تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مرزا بھی اسے قابل اعتبار سمجھے گا۔ لیکن مثل شہزادہ میرزا کامران اس کے آنے سے بہت خفیف ہوا اور ہندوستان کا رخ کرنے پر اسے پشیمانی سی ہوئی۔ علاوہ ازیں مرزا کو توقع تھی کہ سلیم شاہ ملاقات کے وقت تعظیم و تکریم سے پیش آئے گا۔ لیکن جب وہ ملنے گیا تو سلیم شاہ دربار میں بڑے تکبر اور غرور کے ساتھ تخت پر بیٹھا رہا۔ سر مست خا افغان داؤد زئی نے جو بارہی کے عہد پر تھا معمولی ملازمین کے درجہ کی تعظیمات ادا کیں اور نہایت بدتمیزی کے ساتھ مرزا کی گردن کو بادشاہ کے سامنے جھکا کر چلا چلا کر کئی مرتبہ کہا ”بادشاہ نظر دولت کامران مقدم زادہ کابل دعا کرتا ہے“ سلیم شاہ نے نہایت لا پرواہی کے ساتھ مرزا کو دیکھا اور کہا ”خوش آمدی“ اپنے سر پر پردہ کے قریب اس کے لیے ایک ڈیرہ اور شامیانہ لگوا دیا اور ایک خلعت ایک کنیز اور ایک خواجہ سرا اس کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے خدمت پر متعین کر دیئے۔ کبھی کبھی مرزا کو اپنے ہاں بلا کر شعرو سخن کی باتیں کر لیا کرتا تھا، لیکن یہ صحبتیں تلخ ہی رہتی تھیں۔ کامران مرزا ان تکلفات اور مراسم سے نہایت تنگ آچکا تھا۔ اپنی زندگی سے بیزار اور نکل بھاگنے کا موقع دیکھ رہا تھا۔ پٹھان ہندی زبان میں اسے چھیڑا کرتے تھے۔ جب وہ دربار میں آتا تو کہتے تھے ”مور“ آتا ہے۔

ایک مرتبہ مرزا نے سلیم شاہ کے حضور میں ایک امیر سے پوچھا ”مور“ کسے کہتے ہیں؟ اُس نے جواب دیا ”مرد عظیم الشان کو۔“

اس وقت سلیم شاہ نے حکم دے دیا آئندہ کوئی مرزا کے متعلق یہ لفظ نہ کہے اور نہ اس کی ہنسی اڑائے۔

ایک دن سلیم شاہ نے مرزا سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ مرزا نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

کامران مرزا کا قرار

گردش گردون گرداں گردناں را گرد کرد

بر سر اہل تمیزاں ناقصاں را مرد کرد

سلیم شاہ اس وقت تو اس کناہ کو سمجھ کر ٹال گیا۔ لیکن خفیہ احکام جاری کر دیئے کہ ”مرزا کی سخت نگرانی کی جائے تاکہ وہ کہیں نکل کر جانے سکے“ مرزا نے زمینداروں کے ذریعہ کسی پہاڑی راجہ کو بہت سے وعدوں کے ساتھ اس بات کے لیے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے بھاگنے میں مدد دے۔ چنانچہ راجہ نے چناب کے کنارے تک گھوڑوں کی ڈاک بٹھادی۔ اور کامران رات میں چادر اوڑھ کر ڈیرہ سے نکل گیا۔ محافظوں نے سمجھا مرزا کے سر پر وہ سے کوئی عورت نکل کر جا رہی ہے۔ اس کے بعد مرزا گھوڑے پر سوار ہو کر دریا عبور کر گیا اور اس راجہ کے ہاں پلا گیا۔ وہاں سے برقع اوڑھ کر ایک نگہبان کے ساتھ راجہ کے آدمیوں کے ہمراہ آگے روانہ ہو گیا۔ جب وہ موضع گھری میں دریا کے بھت کے کنارے پہنچا تو رات ہو چکی تھی اس لیے وہاں ٹھہر گیا۔ یہ موضع سلطان پور کے نواح میں قلعہ رہتاس سے تین کوس پر ہے۔ کسی نے سلطان پور کے حاکم سلطان آدم کو خبر پہنچادی کہ ایک مغل عورت جلودار کے ہمراہ تنہا فلاں جگہ ٹھہری ہوئی ہے اور وہ صبح وہاں سے چل جائے گی۔ سلطان آدم نے آدمی دوڑا کر تحقیق کرائی۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو وہ خود مرزا کی ملاقات کے لیے آیا۔ مرزا نے سلطان آدم کی بڑی خوشامد کر کے اس سے یہ قول لیا کہ وہ اسے اس کے مقام تک پہنچا دے گا۔ اس وقت ہمایوں بھی کہیں قریب پہنچا ہوا تھا۔ سلطان آدم نے سارا حال اس کے پاس لکھ بھیجا اور مرزا کی جان بخشی کی درخواست کی۔ ہمایوں نے اس کے حسب مرضی فرمان لکھ کر بھیج دیا اور دو سال بعد مرزا کو اپنے ہاں طلب کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر پھیر کر اسے مکہ معظمہ کو روانہ کر دیا۔

اس واقعہ کی تاریخ اسی لفظ ”نیشتر“ سے نکلتی ہے۔ یہ سارہ واقعہ تاریخ اکبر نامہ اور تاریخ نظامی میں تفصیل سے درج ہے۔

لے اکبر نامہ۔ سلسلہ تیموریہ کی تین جلدوں میں مکمل تاریخ ہے۔ بارہ اور ہمایوں کے عہد کا حال تفصیل سے ہے۔ پہلی جلد کے پہلے حصے میں اکبر کے آبا و اجداد کا ذکر ہے۔ یہ حصہ ہمایوں کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔ دوسری جلد میں اکبر کے سلسلہ جلوس سے شروع تک کے تفصیل حالات ہیں۔ شعبان ستائیس میں کتاب ختم ہوئی۔ لیکن اس میں سلسلہ تک کے حالات درج ہیں جو غالباً بعد میں اضافہ کیے گئے۔ تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جلد اکبر کے عہد حکومت کا مرقع ہے۔ سلطنت کے ہر شعبہ ہر صوبہ کے متعلق ہر طرح کے حالات احوال، مشاہیر علماء اہل کمال فقراء، عبادت گاہوں عقائد اہل ہنود، مانگناری کے قوانین اور فقہی مسائل شامل ہیں۔ یہ حصہ سلسلہ میں مرتب ہوا۔ اس کا موضوع دونوں جلدوں سے علیحدہ ہے۔ مصنف کا نام شیخ ابوالفضل ہے جو شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا تھا۔ اکبر آباد میں ۹۸۵ھ کو پیدا ہوا۔ اکبر نامہ کی دوسری جلد کے خاتمہ پر ابوالفضل کو بیچ ہزاری کا منصب اور پچاس ہزار روپیہ نقد انعام ملا۔ ابوالفضل چونکہ اکبر کی خلوت و جلوت کا رفیق اور راز دار تھا۔ اس لیے اس کی تاریخ معتبر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس نے اکبر کی کمزوریوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے واقعات کو مسخ کر کے بھی پیش کیا ہے۔ جن کا پول بدایونی کی منتخب التواریخ سے کھل جاتا ہے۔ ابوالفضل کو جہانگیر کے اشارہ سے یکم ربیع الاول سال ۱۰۰۰ھ بروز جمعہ اور چھلے کے راجہ زین سنگھ دیوتندیلے نے گھیر کر قتل کر دیا تھا اس کی قبر گوالیار سے دس میل پانتری میں ہے۔ ابوالفضل علم و فضل کے لحاظ سے بلاشبہ ابوالفضل تھا۔ اکبر نامہ میں آخری چار سال کے حالات درج ہونے سے رہ گئے تھے اس لیے ابوالفضل کے شاگرد عنایت اللہ عرف محمد صالح نے شاہی حکم سے سلسلہ جلوس سے سلسلہ جلوس تک کے باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر

شاہ محمد دہلوی کا قصہ | عہد سلیم شاہ کے واقعات میں شاہ محمد دہلوی کا واقعہ بھی مشہور ہے۔

شاہ محمد شیر شاہ کے زمانہ میں ولایت (ایران) سے ہندوستان آیا تھا اور اپنے آپ کو سید کہتا تھا لیکن لوگوں کو اس کے سید ہونے میں شکوک و شبہات تھے۔ اس نے اپنی وضع قطع مشائخوں کی بنا رکھی تھی۔ لیکن یہ سب مکر اور دھونگ تھا۔ شیر شاہ پر اس نے اپنے ولی ہونے کا سکہ جما دیا تھا۔ سلیم شاہ بھی شاہزادگی کے زمانہ میں اس کا بڑا معتقد تھا اور اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بادشاہت کی قال نکلوایا کرتا تھا۔ اسے اتنی عقیدت تھی کہ وہ سکی جوتیاں تک اٹھایا کرتا تھا۔

مشہور ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص شاہ محمد کے لیے خربوزوں سے بھرا ہوا ٹوکرا لے کر آیا۔ سلیم شاہ بھی اس وقت وہاں پہنچ گیا۔ شاہ محمد نے اس سے کہا ”اس ٹوکرے کو ہم چتر شاہی سمجھ کر تجھے دیتے ہیں، اٹھ! سر پر رکھ اور چل“ سلیم شاہ نے عقیدت میں بے تکلف اس بوجھ کو اٹھایا اور اسے اپنے لیے اچھا شگون سمجھا۔ لیکن بعد میں ایسی باتیں اس کو ناگوار گزرنے لگیں اور وہ شاہ محمد سے ناراض رہنے لگا۔

سلیم شاہ کے زمانہ میں دو عالی نسب سید بھی ہندوستان آئے تھے۔ یہ دونوں بڑے عابد، زاہد، خوش اخلاق اور وجہ تھے۔ ان میں سے جو خادم تھا اس کا نام امیر طالب تھا اور دوسرا اس کا بھتیجا میر شمس الدین اس کا مخدوم تھا۔ یہ دونوں عراق سے سفر کرتے ہوئے پنجاب میں سلیم شاہ کے لشکر میں وارد ہوئے۔ اور وہاں سے دہلی آ کر کسی محلہ میں ٹھہرے۔ بہت ہی جلد لوگ ان کی طرف رجوع کرنے لگے۔ میر طالب کو فن طب میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ اکثر مریض اس کے علاج سے شفا یاب ہونے لگے۔ اس طرح ان کو لوگوں کی طرف سے خاصی فتوحات و تدریاز ملنے لگیں۔ لوگوں میں یہ بھی مشہور ہو گیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی انگشتری کا نگینہ ان کے پاس ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے جس کے دل میں بھی کوئی شک ہو۔ اس نگینہ کے سامنے اس کی بنیائی دھندلی پڑ جاتی ہے۔

محمد شاہ کی ان لوگوں سے پہلے کی جان پہچان تھی، سابقہ تعارف کی بنا پر اس نے اپنی بیٹی کا میر ابو طالب سے نکاح کر دینا چاہا۔ لیکن ابو طالب نے یہ رشتہ پسند نہ کیا۔ اس وجہ سے بھی لوگ شاہ محمد کے سید ہونے کے بارے میں اور بھی زیادہ بدگمان ہو گئے۔ شاہ محمد نے ان دونوں سیدوں کو اپنی ہی حویلی میں ایک محفوظ جگہ ٹھہرایا اور انکی خدمت میں لگا رہا۔

وجہ اکر نامہ صغیر گذشتہ حالات مکمل کرنا تاریخ مکمل کر دی تھی۔ اکبر کی وفات ۱۲ جمادی الآخر ۱۵۵۶ء یوم بدھ بصر ۶۵ سال واقع ہوئی تھی۔ اس وقت اس تاریخ کا کام بند کر دیا گیا۔

اس نام اکبر نامہ سے ایک اور تاریخ ہے جسے شیخ اشرف داد پسر ملا علی شیر نے طبقات اکبری اور اکبر نامہ کی مدد سے مرتب کیا تھا۔ اس میں شیخ فرید بخاری کی فتوحات اور کاموں پر تفصیل ملاحظہ ہے۔ دونوں تاریخوں سے بس یہ حصہ ہی زائد ہے، مصنف بڑے اچھے عالم تھے اور طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین کے استاد تھے، ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ہاپوں نامہ کی تصنیف میں جو ہر آفتابی کو بھی مدد دی تھی۔ ۶۵ سال کی عمر میں انہوں نے یہ تاریخ لکھی۔ اور سلطنت میں اسے مکمل کیا۔

## قتل کی واردات

چند دن بعد ایک اندھیری رات میں چند مسلح آدمی شاہ محمد کے بالا خانے پر سے اتر کر آئے اور ان دونوں کو جو اس وقت تہجد میں مشغول تھے شہید کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ اور صبح حاکم شہر نے خود آکر شاہ محمد سے تفتیش کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا کہ میں قطعاً اس معاملہ سے واقف نہیں ہوں اور نہیں جانتا کہ ان کے قاتل کون ہیں۔ پھر اس نے اسی مضمون کا ایک محضر نامہ دہلی کے بڑے بڑے لوگوں کی مہربانی سے لکھا کر سلیم شاہ کے پاس بھی بھیج دیا۔

سلیم شاہ نے شیخ الاسلام اور صدر الصدور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کو واقعہ کی تحقیقات کے لیے دہلی روانہ کیا اور ہر طرف فرامین بھیج کر اکابر علماء جیسے میاں حاتم سنہلی اور میاں جلال خاں مفتی وغیرہ کو بلوایا۔ دو ماہ تک برابر اس واردات کی تحقیق و تفتیش ہوتی رہی۔ آخر بڑی تلاش و سعی کے بعد قرینہ ہی معلوم ہوا کہ شاہ محمد نے ہی قاتلوں کو ان کے قتل کے لیے لگایا تھا غرض ان علماء نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ بادشاہ کے پاس روانہ کر دی۔ شاہ محمد کو اتنے بلند مرتبہ سے اس ذلت تک پہنچنے کا بڑا صدمہ تھا اس لیے اس نے بادشاہ کا جواب آنے سے پہلے ہی قصہ کھلوائی اور اس حال میں دہلی پی لیا جس کے اثر سے اسکی موت واقع ہو گئی۔ بعض لوگ اس واقعہ کے متعلق کچھ اور تفصیل بھی بتاتے ہیں، بہر حال شاہ محمد کا بہرہ و سب پر کھل گیا کہ اس کی وضع قطع، عبادت و بیاضت سب مکر تھا اور بس۔ یہ واقعہ ۱۰۵۶ھ میں پیش آیا تھا۔

## شیخ علائی کا واقعہ

دور سلیم شاہی کا دوسرا واقعہ بیانہ کے شیخ علائی مہدوی سے متعلق ہے اور وہ سیدی مولا کے واقعہ سے ملتا جلتا ہے۔ جس کا ذکر ہم سلطان جلال الدین فیروز شاہ کے حالات میں کر آئے ہیں۔ شیخ علائی کے باپ کا نام حسن تھا اور وہ بنگالہ کے مشائخوں میں سے تھے۔ وہ اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ نصر اللہ جو بڑے

لے میاں حاتم علی سنہلی۔ شیخ عزیز اللہ طہینی کے شاگرد اور مرید تھے، علم کلام اصول و فقہ میں بڑی جامعیت حاصل تھی۔ نہایت صالح اور متقی عالم گزرے ہیں۔ کہتے ہیں ”شرح مفتاح“ اور ”مطول“ جیسی ضخیم کتابوں کا از ابتداء تا انتہا چالیس مرتبہ درس دیا تھا، ملا علاؤ الدین لاری کی کتاب ”حاشیہ عقائد نفی“ پر سخت تنقید کی کہ مصنف کو اس کا جواب بن نہ پڑا۔ ستر سال تک مسند درس پر متمکن رہے اور ۱۰۸۹ھ میں رحلت کی۔

۱۰۸۹ھ میں علائی خاں مفتی۔ ان کے والد کا نام شیخ نصیر الدین تھا۔ خاندان کنہوہ کے مشہور عالم میان لاوں کے بھائی تھے۔ علوم عقل و نقل دونوں میں بڑی بصیرت حاصل تھی۔ فقہ کلام اور تفسیر میں ان کی فصیلت مسلمہ تھی۔ مفتاح کی دونوں شرحوں میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ اور کتاب ”عضدی“ کا چالیس مرتبہ درس دیا۔ صاحب علم اور گوشہ نشین آدمی تھے۔ بادشاہوں اور امارات کی محفلوں سے دور رہتے تھے۔ نوے سال کی عمر میں ۱۰۸۹ھ میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف میں شرح عضدی، شرح مفتاح اور فقہ کی شرح انوار مشہور کتابیں ہیں۔

۱۰۸۹ھ میں شیخ حسن۔ ان کے والد شیخ طاہر نے طمان سے بہار آکر شیخ بدیع حقانی سے علم حاصل کیا۔ شیخ حسن بھی بہار میں پیدا ہوئے۔ اس وقت شہر بہار صوبہ بنگال کے ماتحت تھا۔ حصول علم کے بعد راجہ حیدر شاہ مانگ پوری کے مرید ہو گئے۔ سلوک اور توحید کے موضوع پر ان کے متعدد رسائل ہیں۔ ان میں سے ایک رسالہ کا نام ”مفتاح النقیض“ تھا۔ بہار سے جون پور جا کر مقیم ہو گئے تھے۔ سلطان سکندر نے ان کو دہلی بلایا تھا۔ دہلی میں ان کا قیام سلطان سکندر کے ”مجمع حصار“ میں جس کا نام ”کوشک بھی مشہور تھا“ رہا۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ میں اسی جگہ وفات پائی۔



صاحب علم شخص تھے زیارت کعبہ کے لیے گئے اور وہاں سے لوٹ کر بیان میں آکر مقیم ہو گئے۔ اس سال کی تاریخ ہے۔  
 ”و جاہ نصر اللہ والفتح“

بیانہ میں آکر بڑے بھائی پیری مریدی کے مشغلہ میں اور چھوٹے بھائی درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ شیخ حسن کی اولاد میں سے شیخ علانی سب سے زیادہ نیک سیرت تھے۔ تقویٰ اور سلیم الطبعی کے آثار بچپن ہی سے ان کے چہرہ سے جھلکتے تھے۔ ہونہار بروا کے چکنے پات دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے باپ سے تمام علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کر لی۔ جودت طبع اور سرعت فہم فطرت نے ودیعت کیا ہی تھا۔ بہت ہی جلد تدریس و افادہ میں نامور ہو گئے۔ باپ کے انتقال کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے سجادہ نشینی اختیار کر لی اور اپنے اوقات زہد و عبادت، ارشاد و تلقین میں گزارنے لگے۔ اس علم و کمال اور پارسائی کے باوجود نفس امارہ کی ڈنک ٹوٹی نہیں تھی۔ اس لیے وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کسی دوسرے شیخ کا رتبہ ان کے مرتبہ سے بڑھ جائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ریاکار صوفی کو پاکی سے اتار کر لوگوں میں خوب ذلیل کیا۔ اس وقت تک علانی کا دل منشاریہ تھا کہ ”صرف میں ہی خاص و عام میں مقبول و سربر آوردہ رہوں۔“ شیخ علانی کے دوسرے بھائی عمر میں گوان سے بڑے تھے لیکن ان کی فضیلت کی وجہ سے سب نے ان کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور ان کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے۔

عبداللہ نیازی کا مسلک | اسی دوران میں شیخ سلیم چشتی کے ایک خلیفہ میاں عبداللہ نیازی پٹھان اپنے شیخ سے اجازت لے کر سفر حج پر گئے۔ وہاں انہوں نے بڑی ریاضتیں کیں اور ہر قسم کے ذکر و اشغال پورے کیے۔ حرمین ہی میں وہ میر سید محمد جون پوری کے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے امام مہدی ہونے کا دعوے کیا تھا، معتقد ہو گئے اور مدوی مذہب اختیار کر کے ہندوستان واپس آئے۔ بیانہ ہی میں آبادی سے دور باغ کے ایک گوشہ میں حوض کے کنارے سکونت اختیار کی۔ ان کا معمول تھا کہ خود پانی کے گھڑے بھر کر اپنے سر پر اٹھا کر لے جاتے تھے اور اس طرف کام کرنے والے لوہاروں، کسانوں وغیرہ کو اکٹھا کر کے نماز پڑھایا کرتے تھے جو کوئی پس و پیش کرتا اسے وہ اپنے پاس سے کچھ نہ کچھ دے کر جماعت کی طرف راغب کرتے تھے۔

شیخ علانی نے ان کے طریقہ کو بہت پسند کیا اور اپنے معتقدوں سے کہا ”دیکھو دین اور ایمان اس کا نام ہے جو میاں عبداللہ نیازی کا سلوک ہے اور ہم لوگ جس روش پر ہیں وہ محض بت پرستی اور زنا ر داری ہے۔“ رباعی

تایک سروئی از تو ہستی باقی است اندیشہ کا ربت پرستی باقی است

گفتی بت و زنا ر شکستہ رستم ایں بت کہ ز پندار پرستی باقی است

غرض کچھ ہی دن میں علانی ان بزرگ کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ باپ دادا کے طریقہ کو ترک کر دیا۔ مشیخت اور پارسائی کی دکان پر عبادی۔ سارا غرور و تکبر بالائے طاق رکھ دیا اور ان تمام لوگوں سے جن کو انہوں نے ناراض کر رکھا تھا منت خوشامد کر کے معافی چاہی اور رضامند کر لیا۔ خانقاہ اور ٹکڑ کی ہا ہی چھوڑ کر قلندرانہ روش اختیار کر لی اپنا سارا مال و اسباب یہاں تک کہ کتابیں بھی محتاج میں تقسیم کر دیں۔ بی بی سے کہا اگر تجھے فقر و فاقہ منظور ہے تو بسم اللہ میرے ساتھ رہ اگر نہیں تو اس مال میں سے اپنا حصہ

لے لے پھر تو مختار ہے جہاں چاہے گزر کرے۔ وہ نیک بی بی اسی فقر و فاقہ پر بخوشی رضا مند ہو گئی ہے۔

کار دیں بعضی زناں شاید بہ از مرداں کنند

مدد لیری شیر مادہ بہتر از شیر زر است

## شیخ علائی کی تحریک

اب کہیں جا کر نفس امارہ کا سر کچلا گیا۔ اور شیخ علائی طلب صادق کے ساتھ میاں عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا اور جس ذکر کا وہ شغل کرتے تھے خود بھی اس کا

کا ورد رکھا۔ اس ریاضت سے کلام پاک کے روز و معانی نکات و دقائق بہت جلد ان پر کھل گئے۔ ان کے مرید اور خادم جن میں بعض مجرد اور بعض گھر بار والے تھے؛ اللہ کے توکل پر ان کی خدمت میں لگے رہے اور ان سے ذکر و شغل کے طریقے سیکھنے لگے۔ ان کے مریدوں میں تین سو آدمی خانہ دار تھے۔ یہ لوگ کوئی پیشہ یا تجارت نہیں کرتے تھے کہیں سے کچھ مل جاتا تو آپس میں تقسیم کر لیتے۔ اگر ان میں سے کبھی کوئی کچھ کمائی کر بھی لیتا تو اس میں سے دسواں حصہ ضرور راہِ خدا میں دے دیتا۔ روزانہ دو وقت ایک تو فجر کے بعد اور ایک کسی اور نماز کے بعد سب چھوٹے بڑے ایک حلقہ میں بیٹھ جاتے۔ اور قرآن کے معانی و مطالب کا درس لیتے۔ شیخ علائی کا بیان ایسا اثر انگیز تھا کہ جو کوئی ایک مرتبہ بھی ان کو سن لیتا پھر وہ سارے گھو بار بال بچوں کو چھوڑ کر ان کا ہوجانا اور کسی مشغلہ کی طرف رخ نہ کرتا۔ یہ سب ایسے قانع اور متوکل تھے کہ اگر بھوک کے مارے ان کا دم بھی نکلتا ہو تو ان میں سے کوئی دم نہ مارتا تھا۔ جو بھی اجنبی ان کی محفل میں چلا جاتا تو کم سے کم وہ اپنے گناہوں سے ضرور تائب ہوجاتا تھا۔

ان میں سے اکثر کا تو یہ حال تھا کہ رات میں اپنے کھانے اور استعمال کے برتن اونڈھا کر رکھ دیتے تھے یہاں تک کہ نمک آٹا بلکہ پانی بھی ان کے پاس نہ ہوتا تھا۔ بس اس رزق دینے والے کی رزاقی پر توکل کر کے رات گزار دیتے تھے۔ صبح اللہ تعالیٰ بہر حال کہیں نہ کہیں سے ان کا رزق ان کے پاس پہنچا دیتا تھا۔

اسباب دنیاوی سے یہ بے نیازی تھی لیکن ہتھیار اور سامان جنگ دشمنوں کے مقابلہ کے لیے ہر شخص کے پاس لازماً ہوتا تھا۔ اس لیے جو بھی ان کو دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ یہ مالدار اور صاحب حیثیت لوگ ہیں محتاج نہیں۔

ان سب کا دھیرہ تھا کہ شہر اور بازار میں جو بھی بات شریعت کے خلاف نظر آتی اسے وہ جبراً روک دیتے تھے اور اس معاملہ میں سرکاری حکام سے ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہ ہوتے تھے اور ان کے مقابلہ میں اکثر غائب ہی رہتے تھے۔ چنانچہ شہر کے جو حاکم ان کے معتقد تھے وہ تو ان کی ہر طرح مدد کرتے تھے اور جوان کو نہیں مانتے تھے وہ بھی ان کے ڈر سے دم نہیں مارتے تھے۔ شیخ علائی کی تحریک اس تیزی سے پھیلی کہ باپ بیٹے کو، بھائی بھائی کو، شوہر بی بی کو چھوڑ کر ہمدی دائرہ میں شامل ہو گیا۔

شیخ علائی کی اس تحریکی جدوجہد اور لوگوں کے جہوم کی وجہ سے میاں عبد اللہ کے اوقات میں خلل پڑنے لگا اور وہ اس ہنگامہ آرائی کے متحمل نہ ہو سکے۔ آخر کار ایک دن انہوں نے شیخ کو بلا کر نہایت نرمی کے ساتھ نصیحت کی کہ یہ رونق ہمیشہ نہیں رہتی۔ اور اس زمانہ کے لوگوں کو حق بات کو وہی معلوم ہوتی ہے۔

تمہیں لوگوں کی روک ٹوک سے کیا غرض یا تو خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کر دیا حج کا ارادہ کر لو۔ شیخ علائی نے اپنے مربی کے حسب منشاء اسی وضع اور حالت میں چھ سات سو آدمی ہمراہ لے کر گجرات کا اس ارادہ سے قصد کیا کہ وہاں طریق مہدویہ کے کسی پیشوا کی صحبت سے فیض حاصل کریں۔

جب وہ بیانہ سے نکل کر قصبہ بیادری میں پہنچے تو میرے والد مرحوم ان کی خدمت میں مجھے بھی لے کر گئے تھے۔ چونکہ میں اس وقت بہت کم سن تھا اس لیے مجھے ان کی صورت بس وہم و خیال کی طرح کچھ یاد ہے۔

اس سفر میں شیخ علائی جب جو دھ پور کے قریب خواص پور میں پہنچے تو خواص خاں جو اس جانب مامور تھا ان کے استقبال کے لیے آیا اور ان کا معتقد ہو گیا لیکن خواص خاں نہ صرف یہ کہ صوفیوں کی محفل سماع میں شرکت کرتا تھا بلکہ اپنے سپاہیوں کا حق بھی مار لیتا تھا۔ اور شیخ علائی کسی خلاف شرع بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ان کی اور خواص خاں کی نبھ نہ سکی اور کچھ دوسرے اسباب ایسے پیدا ہو گئے کہ شیخ علائی گجرات سے لوٹ کر پھر بیانہ آ گئے۔

**علائی دربار شاہی میں** | جب سلیم شاہ تخت نشین ہوا اور شیخ علائی کا شہرہ اس کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مخدوم الملک ملا سلطان پوری کے بہکاوے میں آکر میر رفیع الدین محدث اور ابوالفتح تھانیسری اور دوسرے بڑے بڑے علماء کو جمع کیا اور شیخ علائی کو بھی بیانہ سے بلوایا۔

شیخ علائی اپنے چند ہر دم ساتھ رہنے والے خاص خاص مریدوں کو لے کر جو ہمیشہ زرہ پہنے ہتھیار باندھے رہتے تھے۔ دربار میں آئے اور اس شان سے کہ انہوں نے شاہانہ آداب و مراسم کی کوئی پروا نہ کی اور مسنون طریقہ پر بادشاہ کو "اسلام علیکم" ہوا۔ سلیم شاہ نے ان کے سلام کا بڑی حقارت و بیزاری سے جواب دیا، شیخ کی یہ حرکت نہ صرف بادشاہ بلکہ دوسرے تمام امراء کو بھی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک نے بادشاہ کو پہلے ہی یہ باور کرا رکھا تھا کہ شیخ علائی مہدی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور امام مہدی چونکہ تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے اس لیے لازماً شیخ کا ارادہ بھی خروج و بغاوت کا ہوگا۔ اس لیے یہ شخص گردن زدنی ہے۔ علی حجاب نے جو بڑا مقرب امیر تھا شیخ علائی کو پھٹے کپڑوں ٹوٹی ہوئی جوتیوں کے ساتھ اس خستہ حالت میں دیکھا تو کہنے لگا۔

ابوالفتح۔ شیخ نصیر الدین محدث دہلوی کے مریدوں میں سے گویا ہیں۔ تیمور کے حملہ کے بعد مدلی سے کاپی میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اسی جگہ نکلتے پائی۔ ان کا مزار کاپی میں ہے۔ حضور اکرم کی نعت میں ان کا ایک فصیح و بلیغ قصیدہ ہے جس کے چند شعر شیخ المحدثین دہلوی نے اخبار لاخبر میں نقل کیے ہیں۔ ان کا پورا نام تھا شیخ ابوالفتح احمد تھانیسری۔

مخدوم الملک۔ اصل نام عبداللہ سلطان پوری ہے۔ مضافات لاہور میں سلطان پور کے انصاری خاندان سے تعلق تھا۔ اپنے وقت کا بہت عالم تھا۔ خاص طور پر علم فقہ میں بڑی مہارت تھی۔ عربی سانیات فقہ تاریخ اور دوسرے موضوعات پر کئی ایک کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں "میرزا الانبیاء" اور "شائخ الاسلام" مشہور کتابیں ہیں۔ ہمایوں نے ابتدائی دور میں مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کا خطاب عطا کیا تھا۔ اپنے عقائد میں نہایت متعصب تھا۔ اس علم و فضل کے ساتھ دنیا داری اور دولت کی محبت بھی بہت تھی۔ جتنا بڑا عالم تھا اتنا ہی دولت مند بھی تھا۔ اکبر کے سامنے دیوان خانہ شاہی کی وکالت کے عہدہ پر فائز تھا۔ جب مرثو اس کے گھر سے تین کروڑ کا تو نقد خزانہ نکلا۔ حج کے لیے مکہ گیا ہوا تھا۔ وہیں میں جس وقت گجرات پہنچا وہاں سلسلہ میں انتقال ہو گیا۔

”چہ خوب! ذرا اس کی ہیئت کذائی تو دیکھو، ان پٹے حالوں ہم سے باوثابت لینا چاہتا ہے، کیا ہم پٹھان مر گئے ہیں؟“  
**شیخ علائی کی تقریر** | شیخ علائی نے دربار کی ان چھتی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور گفتگو کے شروع ہونے سے پہلے اپنے معمول کے مطابق قرآن کی چند آیتیں تلاوت کیں۔ اور ان کی تشریح کرتے ہوئے دنیا داری کی مذمت احوال قیامت اور علمائے زمانہ کی دنیا طلبی اور بے عملی پر ایسی موثر اور درد انگیز تقریر کی کہ سلیم شاہ اور اس کے درباریوں پر سکتہ سا چھا گیا اور باوجود قساوت قلبی کے ان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

یہ بیان سن کر سلیم شاہ محفل سے اٹھ کر محل سرا میں چلا گیا اور شیخ علائی اور ان کے ساتھیوں کے لیے کھانا وغیرہ بھجوا دیا۔ لیکن شیخ علائی نے اس کا کھانا نہ کھایا اور اپنے رفیقوں سے کہا جس کا جی چاہے وہ ضرور کھائے۔ جب سلیم شاہ لوٹ کر باہر آیا تو شیخ نے اس کی تعظیم بھی نہ کی۔ بادشاہ نے جب ان سے پوچھا کہ ”تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ تو انہوں نے بلا جھجک جواب دیا ”تم نے جو اپنے حق سے زیادہ خزانہ کا روپیہ خلاف شریعت جمع کر رکھا ہے وہ تمہاری ملکیت نہیں بلکہ سب مسلمانوں کا حق ہے اور تمہارا کھانا بھی اسی قسم کا ہے۔“ سلیم شاہ کو یہ سن کر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ پی گیا۔

**مرد و بیت پر مباحثہ** | اب علماء نے شیخ علائی سے مسئلہ مہدویت پر گفتگو شروع کی۔ لیکن شیخ کا یہ زور بیان تھا کہ سب کے لب ہل گئے۔ میر سید رفیع الدین صفوی نے جن کا انتقال ۱۱۵۲ھ میں ہوا، ان احادیث کو بیان کیا جن میں امام مہدی کی علامتوں کا ذکر ہے۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ تم شافعی مذہب ہو اور ہم حنفی ہیں۔ ہمارے تمہارے اصولوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس لیے تمہاری تو جہیں اور تاویلیں ہم تسلیم نہیں کر سکتے۔ پھر ہم تمہارے استدلال کو کیسے مان لیں۔ ان کے مقابلہ میں ملا عبداللہ کا تو یہ حال تھا زبان سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ شیخ نے اُسے خوب آڑ سے ہاتھوں لیا اور اس سے کہا ”تو دنیا دار فاسق ہے، دائرہ عدل سے باہر ہے۔ علانیہ تیرے گھر سے گانے بجانے کی آوازیں آتی ہیں اور حدیث صحیح میں ہے۔“

”جو مکھی نجاستوں پر بیٹھتی ہے وہ اس عالم سے ہزار درجے بہتر ہے جو بادشاہوں اور ایروں کی خوشامدی میں لگا ہوا ہے۔“ اسی طرح انہوں نے دوسرے بے عمل عالموں کی خوب خبر لی اور اپنے سارے بیان کو آیتوں اور حدیثوں سے ثابت کیا۔ یہاں تک کہ ملا عبداللہ کو دم مارنے کی مجال نہ رہی اور وہ چپکا ہو کر بیٹھ گیا۔

**ملا جلال کا لطیفہ** | مباحثہ کے دوران ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہوا کہ ایک دن اسی بحث کے سلسلہ میں آگہ کے ملا جلال بہیم دانشمند نے وہ حدیث جس میں امام مہدی کے حلیہ کا ذکر ہے پڑھی اور اس میں ملا جلال نے

لے ملا جلال۔ قابلاً قاضی جلال الدین ملتانی سے مراد ہے۔ یہ پہلے تاجرتھے بعد میں اکبر آباد آگرہ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ آگرہ کے زمانہ میں قاضی یعقوب کی معزولی پر عہدہ قضاوت پر مامور رہے۔ کہتے ہیں بلحاظ عدل و دیانت بہترین قاضی گذرے ہیں۔ اپنے عہد کی نازیبا حرکتوں کے خیانہ میں ان کو دکن کی طرف جلا وطن ہونا پڑا۔ دکن میں ان کی بڑی تعلیم و تکریم ہوئی۔ دکن سے بیت اطر کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔



”الو“ اجل“ درج پر زبر لام پر تشدید پڑھا۔ ”اجل“ ”جلال“ سے مشتق اور ”جلیل“ کی تفصیل ہے۔ شیخ علائی سن کر مسکرائے اور کہا عوام میں تو اپنے آپ کو بردا عالم مشہور کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ عربی کی عبارت بھی صحیح طور پر نہیں پڑھ سکتا۔ پھر اس حدیث کے رموز و نکات اشارہ کنایہ کو کیا خاک سمجھے گا۔ یہ لفظ اصل میں ”اجل“ الجہتہ ہے اور ”اجل“ ”جلی“ کی تفصیل ہے نہ کہ تیرے نام ”جلال“ کی۔ وہ اس گرفت پر ایسا خفیف ہوا کہ پھر اس نے آخر تک دم نہ مارا۔

مشہور ہے شیخ مبارک بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اس کو بھی مہدوی کہا جانے لگا۔

سلیم شاہ سے گفتگو | سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ وہ شیخ کی تقریر پر عیش غش کرنے لگا اور کچھ ایسا فریفتہ ہوا کہ ان سے کہا تم مجھ کو ہمیشہ قرآن کا وعظ سنایا کرو مگر مہدوی مذہب کو ترک کر دو اور میرے کان میں چپکے سے انکار کے متعلق کہہ دو۔ اگر تم کو یہ قبول ہو تو میں تمہیں اپنی سلطنت کا محتسب مقرر کر دوں گا۔ اور آج تک یہ جو امر معروف اور نہی منکر میری اجازت کے بغیر کرتے رہے ہو اب یہ سب میری اجازت سے کیا کرو گے۔ علماء نے ہمارے قتل کا فتوے دے دیا ہے۔ لیکن میں تمہارا لحاظ کرتا ہوں اور تمہارا خون بہانا نہیں چاہتا۔

شیخ علائی کی جلا وطنی | شیخ اس بیکار سے اعداد دعویٰ مہدویت پر جو ضروریات دین میں بھی شامل نہیں ایسے متعصب تھے کہ انہوں نے کسی صورت بھی بادشاہ کا کہنا نہ مانا اور اُسے بے باکانہ جواب دیا کہ

مہدویت۔ سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا یا نہیں؟ یہ سوال کافی موضوع بحث رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں انہوں نے صرف مہدیؑ کی رہبریا نہ ہونا دعویٰ کیا تھا نہ کہ ”المہدی“ کا یعنی وہ خاص شخصیت جس کے متعلق مسلمہ اعتقاد ہے کہ قرب قیامت پر اس کا ظہور ہوگا۔ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے پیروؤں نے مہدویت کے عقیدہ پر الگ سے ایک نیا مذہب اختراع کر لیا۔ دین میں چل کر بعض اصول و عقائد پر مہدویت کو ماننے والوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک ”تسویت“ کا قائل نہیں تھا دوسرا اس کو لازمی قرار دیتا۔ تسویت سے مراد ختم نبوت میں سید محمد مہدی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مساوی ہوتا ہے۔ دوسرا اختلاف سید محمد مہدی کا انکار نہ کرنے والوں کے ایمان و کفر سے متعلق تھا۔ ایک گروہ منکرین کو کافر کہنے سے استہزاز کرتا تھا اور دوسرا مہدویت کا دار و مدار ہی منکرین مہدی افر قرار دینے پر رکھتا تھا۔ حیدر آباد کن کے پٹھان مہدویوں نے جن کی وہاں کثرت تھی ۱۲۹۹ھ ۱۸۵۵ء رجب کو حملہ چنچل گوڑہ میں ایک اجاع قدر کے تسویت کی تصدیق کی تھی۔ مسلمان ممالک میں سیاسی نزاعات جب بھی پیدا ہوئے ہر فریق نے مہدی موعود کے اعتقاد سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں ایسی ایسی موضوع حدیثیں بیان کی جانے لگیں کہ مہدی موعود کی پہچان کچھ آسان بات نہ رہی۔ ہر فریق نے اپنے پیشوا کو ثابت کرنے میں وہی علامات گھسولیں جو ان کے حسب حال تھیں۔ اس لیے ان علامتوں میں بڑا تضاد ہو گیا اور جس نے بھی کچھ تھوڑی بہت قوت مل کر لی اس نے اپنے مہدی آخر الزماں ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ ۱۳۰۹ھ ۱۸۶۵ء میں مغرب میں محمد بن توہرت مغربی نے عہد المومن کوئی کی حمایت سے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس شخص نے کچھ لوگوں کو قبروں میں چھپا کر بٹھا دیا تھا۔ اس نے حکم سے یہ نقل مردے قبروں سے نکلے اور اس کے مہدی ہونے کی تصدیق کی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد میں محمد بن عبد اللہ میمون نے شام میں ہی دعویٰ کیا تھا۔ اور ایک شہر ”مدیہ“ بھی بسایا تھا۔ اس کا ایک گھیراؤ جو زری اور خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ کردستان میں بھی ازبک نامی ایک شخص نے شہر زور سے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اسے ایک سردار امیر احمد خان نے قتل کر دیا۔ سات سو ہجری میں بلاد مغرب ہی سے ایک کیمیاگر سید محمد نامی بھی یہی دعویٰ لے کر اٹھا تھا باقی صفحہ آئندہ پر۔

”تمہاری باتوں میں آکر میں اپنا اعتقاد نہیں بدل سکتا۔“

سلامت چو خواہی ملامت روا است

سلامت چو گم شد ملامت خطا است

اسی دوران میں ہر روز سلیم شاہ کے سننے میں آنا کہ آج فلاں سردار شیخ کا مرید ہو گیا اور فلاں امیران کے معتقدوں میں شامل ہو گیا اور دنیا کے معاملات چھوڑ دیئے۔ ادھر ملا عبداللہ برابر بادشاہ کو شیخ کے قتل پر ترغیب دے رہا تھا۔ آخر سلیم شاہ نے شیخ کو حکم دیا کہ ”تم اس ملک سے نکل جاؤ اور دکن میں جا کر سکونت اختیار کرو۔“

**دکن میں مہدویت** | دکن میں مہدوی مذہب کافی پھیل چکا تھا۔ خود شیخ عرصہ سے وہاں جانے کے آرزو مند تھے۔ یہ حکم تو ان کے لیے خوش خبری سے کم نہ تھا۔ چنانچہ وہ بے تامل دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ دکن کی سرحد پر جب وہ ہند یہ پہنچے تو وہاں کا حاکم بہار خاں جس کا لقب اعظم ہمایوں شروانی تھا۔ ان کا معتقد ہو کر اس مسلک کا پیرو بن گیا۔ وہ ہر روز ان کا وعظ سنا کرتا تھا۔ اس کا ادھے سے بھی زیادہ لشکر شیخ کا معتقد ہو چکا تھا۔ محجروں نے یہ خبریں بادشاہ تک پہنچائیں۔ یہ بات اسے بڑی ناگوار گزری۔ مخدوم الملک تو شیخ علانی سے خار کھائے بیٹھا ہی تھا، اس نے جھوٹ سچ ملا کر بادشاہ کو اور بھڑکایا، یہاں تک کہ سلیم شاہ نے شیخ علانی کو واپس لانے کے لیے فرمان صادر کر دیا۔

بقیہ ماشیہ مہدویت صفحہ گزشتہ ۱۹۹ میں محمد بن عبداللہ نے مصر میں اسی دعویٰ پر بغاوت کی تھی۔ شیخ اویس رومی جو سلطان بایزید کے عہد کے نامور صوفی ہیں ان کے متعلق بھی مشہور ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو مہدی سمجھا تھا، لیکن اسکے ادعا سے پہلے ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ شخص شیطانی و سورہ تھا سید محمد جون پوری سے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ صاحب ”معارج الولاہ“ کی تحریر ہے: ”سید محمد نور بخش جون پوری کو ایک روز حال آیا دیکھتے کیا ہیں کہ کہ ایک شخص مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ”انت مہدی“ یعنی تو مہدی ہے۔ انہوں نے سمجھا میں مہدی موعود ہوں۔ ایک مدت تک اسی دعویٰ پر رہے۔ آخر جب حج کو چلے۔ اٹار راہ میں ان کو کشف ہوا کہ میں مہدی بایں معنی ہوں کہ ہدایت یافتہ ہوں۔ پس اس دعویٰ سے باز آکر مریدوں اور پیروں کو اس اعتقاد سے پھیر دیا اور کہا کہ جب اس سفر سے پلٹوں گا باقی مریدوں کو بھی اس اعتقاد سے باز رکھوں گا۔ آخر اٹلے راہ میں وفات پائی۔ ہمراہیوں نے یہ خبر دوسروں تک پہنچائی۔ ان میں سے بعض نے یہ عقیدہ ترک کر دیا اور بعض پہلے اعتقاد پر ہی قائم رہے۔

مہدویوں کے عقیدہ کے لحاظ سے فرائض کی تعداد تیس ہے۔ اس میں سے میں فرائض اعتقادی ہیں۔ جن کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان میں کمال کو اختلاف نہیں۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ ان اعتقادی فرائض میں بھی مہدویوں کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ دس فرائض علی ہیں جن میں کمال باہم اختلاف ہے۔ ان دس فرائض میں سے عشر نوبت، اجاع، تسویت اور محبت صادقین پر اختلافی رسالے لکھے جاتے رہے ہیں۔

کسی وقت مہدوی فرقہ ایک تبلیغی اور تحریکی فرقہ تھا۔ لیکن عرصہ دراز سے اسکی حیثیت ایک قبیلہ اور قوم کی رہ گئی ہے اور اس تاریخی شواہد ایسے ہیں جن سے قیاس ہوتا ہے کہ سید محمد جون پوری کی جدوجہد ایک صحیح اسلامی تحریک تھی۔ جو ہندوستان میں سیاسی قوت کے ذریعہ اسلامی نظام کے لیے میدان ہموار کر رہی تھی۔ بعد میں تحریکی روح ختم ہو گئی اور ان کے پیروں کو دراز کار عقائد کی الجھنوں میں گرفتار ہو کر رہ گیا اور اس طرح ایک نیا مذہب ”مہدویت“ پیدا ہو گیا۔

عبداللہ نیازی کا واقعہ | اسی دوران میں سلیم شاہ نیازی پٹھانوں کا فتنہ رفع کرنے کے لیے آگرہ سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا تھا۔ جب وہ اس سفر میں بیانہ کے قریب ہراور میں پہنچا تو مخدوم الملک نے بادشاہ سے عرض کیا "شیخ علانی کا تو معمولی فتنہ تھا جس سے نجات مل گئی۔ سب سے بڑا فتنہ شیخ عبداللہ نیازی ہے جو علانی کا مرشد اور سارے نیازیوں کا پیر ہے اور ہمیشہ وہ تین چار سو مسلح آدمیوں کو ملے کر بیانہ کے پہاڑوں میں دنگا فساد کرتا رہتا ہے۔"

یہ سن کر سلیم شاہ کو جو نیازیوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا بس آگ ہی لگ گئی۔ اسی وقت حاکم بیانہ میاں بہوہ کے پاس فرمان بھیجا کہ "شیخ نیازی کو فوراً حضور میں روانہ کر دو۔ میاں بہوہ شیخ کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اس نے خفیہ جا کر شیخ سے درخواست کی کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ آپ یہاں سے کسی طرف کو ٹل جائیں۔ پھر بادشاہ کو آپ کا خیال بھی نہ رہے گا۔ اور میں یہاں سے کوئی معقول عذر لکھ کر روانہ کر دوں گا۔" شیخ عبداللہ نے اس کی بات کو قبول نہ کیا اور اس سے کہا "بادشاہ کے دل سے میرا خیال نہیں جائے گا" ویسے بھی مخدوم الملک ہمیشہ تاک میں لگا رہتا ہے میں کہیں دور دراز چلا بھی جاؤں اور پھر بادشاہ مجھے وہاں سے طلب کرے تو مجھے لمبے سفر کی زحمت اٹھانی پڑے گی اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس وقت جبکہ بادشاہ صرف دس کوس پر ہے میں اس سے جا کر مل لوں۔ خدا کا جو حکم ہے بہر حال وہ پورا ہو کر ہی رہے گا۔

عنان کار نہ در دست مصلحت میں است

عنان بدست قضاہ کہ مصلحت میں است

شیخ نیازی لشکر شاہی میں | غرض یہ بزرگ راتوں رات چل کر شاہی لشکر میں پہنچ گئے۔ اور صبح جس وقت سلیم شاہ کوچ کے لیے سوار ہو رہا تھا شیخ نے "اسلام علیکم" کہا۔ میاں بہوہ نے زبردستی اُن کی گردن یہ لگے ہوئے جھکادی "اے شیخ بادشاہوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں۔" شیخ نے بہوہ کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "جو سلام سنت ہے اور جو رسول اللہ اپنے صحابہ کو کیا کرتے تھے اور صحابہ رسول اللہ کو وہ یہی طریقہ ہے جو میں نے کیا۔ اس کے سوا میں کسی اور سلام کو نہیں جانتا۔"

سلیم شاہ نے غضب ناک ہو کر پوچھا "علانی کا پیر ہی ہے؟ ملا عبداللہ نے جو گھات میں لگا ہوا تھا پھٹ سے کہا۔ "ہاں یہی ہے!"

بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے اس مرد حق کو لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا، لکڑیوں کوڑوں سے خوب پٹائی کی، شیخ کو جب تک ہوش رہا وہ یہ آیت پڑھتے رہے۔۔

"دینا اغضانا ذنوبنا و اسما افنا فی اصنامنا و ثبت اقدامنا و انصنا علی القوم الکافرین"

سلیم شاہ نے پوچھا "کیا کہتا ہے؟"

ملا عبداللہ نے کہا "مجھ کو اور آپ کو کافر کہہ رہا ہے۔"

سلیم شاہ کا پارا اور چڑھ گیا اور اُن کو اور زیادہ اذیت پہنچائی۔ غرض بادشاہ برابر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں سوار

کھڑا رہا۔ اور اس مظلوم کو بے گناہی کے گناہ میں سزا دیتا رہا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا دم نکل گیا ہے تب چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

شیخ میں جان باقی تھی اُسی وقت لوگوں نے اُن کو چمڑے میں پیٹ کر ایک رات ایک دن برابر آگ کی گرمی میں کھا اور اُن کے حواس کچھ ٹھکانے ہوئے۔ یہ حادثہ ۱۵۵۵ء میں پیش آیا تھا۔

شیخ نیازی کی ہمدویت سے توبہ | کچھ عرصہ بعد شیخ نے بیان چھوڑ کر سیاحت اختیار کی اور افغانستان رودہ میں جا کر کافی مدت ٹھہرے۔ پھر عرصہ تک پٹن میں بجوارہ کی سرحد پر انبیرا اور انبر سر کے درمیان مقیم رہے۔ شیخ کہا کرتے تھے ”اہل قبل و قال کی صحبت کا یہ خیازہ بھگتنا پڑا۔“

آخر میں جب شیخ سہرند میں آکر رہے تو انہوں نے ہمدوی مسلک سے توبہ کر لی۔ اور اس عقیدہ سے تمام ہمدویوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے اُنک کا سفر کیا تھا تو اس نے شیخ موصوف کو سہرند میں بلا کر ان کے اور ان کے بیٹوں کے نام بطور معاش کچھ اراضی مقرر کر دی تھی۔ شیخ عبد اللہ نیازی نے نوے برس کی عمر میں ستلہ میں انتقال کیا۔

مخدوم الملک کی فتنہ پروری | جب سلیم شاہ نیازیوں کا قلع قمع کر کے آگرہ واپس آیا تو مخدوم الملک ملا عبد اللہ نے بادشاہ کو شیخ علانی کے خلاف پھر بھڑکانا شروع کیا اور کہا۔ ”شیخ علانی کو

تو اس ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن وہ ہندوستان میں بدستور موجود ہے۔ بہار خاں اس کا مرید اور معتقد بن گیا ہے اور اس کا سارا لشکر شیخ کا مطیع ہو گیا ہے، اندیشہ ہے کہ وہ کوئی فتنہ برپا کر دے گا۔“

سلیم شاہ نے دوبارہ شیخ علانی کو بلایا اور اس قضیہ کو یکسر نمٹا دینے کا ارادہ کر لیا۔ سلیم شاہ بخوبی جانتا تھا کہ شیخ عبد اللہ صاحب غرض ہے اور آگرہ اور دہلی میں کوئی عالم علانی سے بحث کرنے کے قابل نہیں، اس لیے اس نے حکم دیا کہ شیخ علانی کو بہار میں شیخ بدہ طیب دانش مند کے پاس لے جاؤ اور وہ جو بھی حکم دیں اس کے مطابق عمل کرو۔ شیخ بدہ بڑے نامی گرامی عالم تھے ”ارشاد قاضی پران کی شرح بڑی معتبر اور مشہور ہے۔ شیر شاہ تو ان کا ایسا معتقد تھا کہ انکی جوتیاں سیدھی کر کے اُن کے آگے رکھا کرتا تھا۔“

علانی شیخ بدہ کی خدمت میں | شیخ علانی جب وہاں پہنچے تو بدہ طیب کے گھر میں سے گانے بجانے کی آوازیں آرہی تھیں انہوں نے شیخ بدہ کی مجلس میں اور بھی خلاف شرع باتیں دیکھیں۔ جن کا ذکر مناسب

نہیں۔ ان سے بھلا کہاں رہا جاسکتا تھا۔ بے محابا وہ شیخ بدہ کو ان حرکتوں پر ملامت کرنے لگے۔ شیخ بدہ اس وقت کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان میں بات کرنے کی بھی قوت نہ تھی۔ ان کے بیٹوں نے جواب میں کہا۔ ”ہندوستان میں بعض رسمیں ایسی مروج

ہو گئی ہیں اگر ان سے منع کیا جائے، اور اتفاق سے اس اثنا میں جان و مال کا کوئی نقصان ہو جائے تو ہندوستان کی بے وقوف عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ نقصان اس رسم کے روکنے کی وجہ سے ہوا۔ اور اس صورت میں اُن کے باطن میں مکر اور

لے یہ فتنہ کے موضوع پر قاضی شہاب الدین جون پوری کی تصنیف ہے۔



کافر ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کافر ہو جانے سے ان کا فاسق رہنا ہی غنیمت ہے۔ شیخ علائی نے کہا ”یہ ایک ناسد خیال ہے۔ کیوں کہ جب پہلے ہی سے یہ عقیدہ ہو کہ گناہ کے چھوڑنے سے جان یا مال کا نقصان ہوتا ہے اور سنت کے موافق عمل کرنے سے آدمی مرجاتا ہے تو وہ پہلے ہی سے کافر ہے۔ پھر ان کے اسلام کا لحاظ کرنا کوئی ضروری نہیں۔ بلکہ اس صورت میں تو نکاح کی صحت بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔“

اس تقریب سے شیخ بدھ کے بیٹے اور ہم نشین قائل ہو گئے۔ اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگے۔ اور ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ شیخ بدھ طبیب نے بھی منصف مزاجی سے کام لیا۔ ان کے اعتراض کو مان کر ان تمام باتوں سے توبہ و استغفار کی۔

## شیخ بدھ کا خط

شیخ بدھ نے ان کے متعلق بادشاہ کے نام پہلے جو خط لکھا تھا اس کا مضمون یہی تھا۔ کہ ”مسئلہ مہدویت پر ایمان کا انحصار نہیں۔ اور امام مہدی علیہ السلام کی علامات میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ اس لیے قطعی طور پر شیخ علائی کے کفر یا فسق کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کو اس مسئلہ میں جو اشتباہ ہے وہ دور کر دیا جائے۔ یہاں کتابیں کیاب ہیں۔ وہاں کے علماء کے کتب خانوں میں بے شمار کتابیں ہوں گی۔ اس لیے اس مسئلہ کی اسی جگہ بہتر طور پر تحقیق ہو سکتی ہے۔“

دیشیخ بدھ نے اس خط میں اپنے طور پر شیخ علائی کے بچاؤ کے پہلو رکھے تھے، لیکن ان کے بیٹوں نے انہیں سمجھایا کہ ”ملا محمد دم صدر الصدور ہے آپ اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس صورت میں لازماً بادشاہ آپ کو طلب کرے گا۔ اس ضعیفی میں یہ طویل سفر بہت دشوار ہو گا۔“

بیٹوں کی اس فحاشی پر شیخ بدھ نے وہ خطر روانہ نہ کیا اور نہ انہوں نے دوسرا خط لکھا، لیکن ان کے بیٹوں نے باپ سے چھپا کر بالابالا سلیم شاہ کو خط لکھا۔ جس میں انہوں نے ملا عبداللہ کی بڑی خوشامد کی۔ لکھا: ”آج اگر کوئی بڑا محقق ہے تو وہ ملا عبداللہ محمد دم الملک ہی ہے وہ جو بھی فتوے دے درست ہے۔“

## شیخ علائی کی شہادت

یہ خط سلیم شاہ کو پنجاب میں ملا اور اس کے ساتھ ہی شیخ علائی بھی پہنچے۔ ان کی بادشاہ سے ملا یا اور کہا۔ ”تم میرے کان میں دعویٰ مہدویت سے توبہ کہہ دو پھر تمہاں چاہو رہو۔“ شیخ علائی نے اس مرتبہ بھی بادشاہ کے لئے کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے ملا عبداللہ سے کہا ”اب تم کو اختیار ہے۔“ پھر اس نے اپنے سامنے شیخ کو دوسے گمانے کا حکم دیا۔ اتفاق سے شیخ علائی کی گردن میں طاعون کی گلٹی نکل آئی تھی اور دوا کے لیے اس پھوڑے میں ایک بتی لپی جاتی تھی۔ ان دنوں طاعون کی دبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس پھوڑے کی تکلیف کے علاوہ سبفر کی صعوبتوں سے بھی شیخ بہت خکے ہوئے تھے۔ اس لیے تیسرے کوٹے ہی میں ان کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

بادشاہ کو اس پر بھی چین نہ آیا۔ اس کے حکم سے اس مظلوم کی لاش کو ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر پاؤں کیا گیا اور ان کو دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ خدا کی عجیب شان ہے اسی وقت

بردی بھیانک آندھی اُٹھی۔ یہ ایسی خوفناک آندھی تھی کہ لوگ سمجھے بس اب قیامت آگئی۔ سارے لشکر میں اُن کا ماتم ہونے لگا اور سب کو یقین آگیا کہ بس اب سلیم شاہ کی حکومت کی خیر نہیں۔ لوگوں نے ان کے جنازہ پر اتنے پھول ڈالے کہ ان کا بدن پھولوں میں چھپ گیا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا پھولوں کی قبر ہے۔

جلال الدین فیروز شاہ خلجی نے سیدی مولہ کو شہید کر دیا تھا۔ اور بہت ہی جلد اس کو اس کی سزا مل گئی تھی۔ یہ قصہ بھی اسی طرح کا ہے۔ سلیم شاہ کو تو اتنی بھی مہلت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس واقعہ کے بعد دو برس بھی حکومت نہیں کر سکا۔ یہ سارا ہفتہ صرف ملا عبداللہ کا برپا کیا ہوا تھا۔ اس کو تو اہل اندھ سے بس دلی عداوت تھی۔

شیخ علائی کی شہادت ۸۵۹ھ میں ہوئی۔ میری (مصنف ہذا کی) عمر اس وقت دس سال تھی۔ اسی عمر میں میں نے ان کی شہادت پر یہ دو تاریخیں نکالی تھیں :-  
ایک :- ”ذاکر اللہ“

دوسری :- ”سقاہم رہم شراباً“

**خواص خاں کا قتل** | سلیم شاہ کے عہد کا ایک اور واقعہ خواص خاں کے قتل کا ہے۔ جب خواص خاں شکست کھا کر نیاز یوں کے ساتھ پہاڑوں کی طرف چلا گیا تو سلیم شاہ نے اس کے پیچھے تاج خاں کرانی کو متعین کیا۔ یہ تاج خاں سلیمان کرانی کا بھائی تھا۔ اور علم و فضل کی وجہ سے پٹھانوں میں نہایت ممتاز تھا۔ بادشاہ نے بن کی شکر گاہ سے تاج خاں کو لکھ بھیجا۔ ”اگر کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو عہد و پیمان کر کے خواص خاں کو بلاؤ اور دھوکہ سے قتل کر دو۔“

حسب الحکم تاج خاں نے جب کسی اور طرح اس علاقہ کا بندوبست ممکن نہیں رہا تو، بادشاہ کی طرف سے خواص خاں کے پاس قول نامہ بھیج دیا۔ خواص خاں سیدھا سادا مسلمان سپاہی تھا۔ اس قول و قرار پر بھروسہ کر کے تاج خاں کے پاس آگیا۔ تاج خاں نے اسی وقت اسے قتل کر کے اس کا سر سلیم شاہ کے پاس قصبہ بن میں بھیج دیا۔ اس کا لاشہ پہلے تو سرستی میں جو سنہیل کے توابعات میں سے ہے دفن کیا گیا تھا، بعد میں اسے دہلی لاکر دفنایا گیا۔

خواص خاں کے قتل کا واقعہ ۸۵۹ھ میں ہوا۔ اس کی تاریخ ہے ”مصیبت بعالم شدہ“

خواص خاں نہایت بہادر کشادہ دل آدمی تھا۔ اس کا قصہ مشہور ہے کہ جس وقت وہ شیر شاہ کے ساتھ لاپی پہنچا تھا۔ تو اس نے وہاں کے حلوائیوں کو دو لاکھ روپے پیشگی دیئے تھے کہ وہ رخصت ہو کر ہمیشہ مصری بھیجتے رہیں۔ اسی طرح بیان میں آم کے جتنے باغ تھے ان سب کے دام اُس نے مالکوں کو اپنے پاس سے ادا کر کے انہیں حکم دیا کہ وہ ہمیشہ امپروں اور غریبوں کو آم بطور تحفہ دیتے رہیں۔ اسی اشار میں شیر شاہ کا انتقال ہو گیا اور سلیم شاہ نے اسی حساب کے چوبیس ہزار روپے بقایا خواص خاں سے وصول کر کے اپنے خزانہ میں جمع کرا لیے تھے۔

اسی سال ۸۵۹ھ میں سلیم شاہ کے خاص مصاحب شیخ عبدالحی کا انتقال ہوا۔ عبدالحی شیخ جمال کتبہ کے بیٹے تھے۔ خود بھی پڑھنے عالم اور شاعر تھے۔ ان کی وفات پر آگرہ کے شاہ میر نے یہ تاریخ لکھی تھی۔

گفت نامم ہی شود تاریخ

بندہ وقتیکہ درمیاں نبود

سلیم شاہ پر قاتلانہ حملہ | سلیم شاہ کا ایک اور مشہور واقعہ یہ ہے۔ سلیم شاہ قصبہ بن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن حسب عادت وہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی سواری پر تنہا قلعہ مان گڑھ کی سیر کے لیے جا رہا تھا، یہ قلعہ وہاں سے پانچ چھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ راستہ میں کوئی شخص فریاد کرتا ہوا سامنے آیا اور بادشاہ کا راستہ روک کر بغل سے تلوار کھینچی اور حملہ کر دیا۔ سلیم شاہ نے نہایت پھرتی سے اس وار کو اپنے کوڑے پر روک لیا کوڑے کا دستہ کٹ گیا اور بادشاہ کو بھی کچھ زخم آگیا۔ وہ شخص دوسرا وار کرنا چاہتا تھا کہ سلیم شاہ پہلو بچا کر اس سے لپٹ گیا اور اس سے تلوار چھیننے لگا۔ اسی وقت سزاوول خاں کا بنیادولت خاں جسے سلیم شاہ نے اپنا چہیتا معشوق بنا رکھا تھا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے حملہ آور پر تلوار کا وار کیا اور بھی لوگ جمع ہو گئے اور اس کو پکڑ لیا۔ لوگ اس سے پوچھنے لگے کہ تو نے یہ حرکت کس کے اشارہ سے کی؟ سلیم شاہ نے لوگوں کو پوچھنے سے روک دیا اور کہا کہ ”نہ معلوم! یہ بدمعاش (جھوٹ سچ لگا کر) کتنے گھروں کو برباد کر دے“ یہ کہہ کر بادشاہ نے اسے فوراً قتل کر دینے کا حکم دیا۔ اس کی تلوار دیکھنے پر پتہ چلا یہ وہی تلوار ہے جو سلیم شاہ نے اقبال خاں کو دی تھی۔

اقبال خاں ایک کمینہ فطرت آدمی تھا۔ عرصہ تک وہ شیر شاہ کی خدمت میں رہا تھا۔ نہایت بد صورت اور انتہائی احمق اور نالایق تھا۔ اسی لیے لوگ اسے ”رحمۃ اللہ“ کہہ کر چھیڑتے تھے۔ یہ کنایہ بخولابوں کے لیے بولا جاتا تھا۔ سلیم شاہ نے خدمتگاری کے درجہ سے اٹھا کر اسے اپنا مقرب بنایا تھا۔ اس کے اس تقرب پر نامی گرامی امرا تک حسد کرتے تھے۔ اس کی تلوار کو پہچاننے کے بعد سلیم شاہ نے اس کے مرتبہ کو گھٹا دیا۔ لوگوں نے اسے قتل کر دینے کی ترغیب بھی دی۔ لیکن بادشاہ نے کہا ”اپنے پروردہ کو مارنے سے مجھے شرم آتی ہے۔“ سلیم شاہ پٹھانوں سے بدگمان تھا ہی۔ اس واقعہ کے بعد وہ ان کا اور بھی دشمن ہو گیا۔ اور انہیں ختم کر دینے کا عزم کر لیا۔

ہمایوں کے خلاف شکر کشی | ان واقعات کے بعد سلیم شاہ اپنے دار الخلافہ گوالیار واپس ہوا۔ جب دہلی پہنچا تو اپنے گلے پر جو کین لگوائی تھیں، اس خبر کے سنتے ہی جو نکوں کو نکلوا دیا اور جلدی میں نہایا بھی نہیں گلے پر کپڑا باندھ کر سو گیا۔

لہ انگ۔ حسن ابدال اور پشاور کے درمیان واقع ہے۔ کسی زمانہ میں یہ شہر جنگی اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۸۵۹ء میں اکبر نے اس جگہ ایک مستحکم قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ قلعہ کے کھنڈر اس کی گزشتہ رونق و آبادی کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں کے پناہ سوداگر مشہور ہیں۔ جن کی تجارت کابل اور قندھار تک تھی۔ انگ کی قابل دید چیز دریائے سندھ کا پل ہے۔ یہاں دریائے سندھ کو دریائے انگ کہتے ہیں۔ یہ دریا ہمالیہ سے نکل کر سترو سو میل طے کرنے کے بعد کراچی کے قریب بحر عرب میں گرتا ہے۔ انگ کے قریب دریائے کابل اس میں آکر مل جاتا ہے۔ دونوں کے سنگم پر کماہیہ اور جہاہیہ نام کی دو چٹانیں ہیں، جو دریا کے بیچ میں اٹھی ہوئی ہیں۔ ان کی تلہی میں خوفناک بھنور رہتا ہے جس میں کشتی پھنس جائے تو نکل نہیں سکتی۔ انہی دونوں چٹانوں پر پیل پائے قائم کر کے یہ عظیم الشان پل باندھا گیا ہے۔ اس پر سے ریل کی پٹری گزرتی ہے۔

پھر وہ ہمایوں کے مقابلہ کے لیے دہلی سے لوٹ کر شہر سے کوئی تین کوس کے فاصلہ پر جا کر ٹھہرا۔ اس وقت مسلسل سفر سے لشکر کی نہایت خستہ اور آشفتمند حال ہو چکے تھے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات کیا کرتے اسی بُرے حال میں وہ اس کے پیچھے لگے رہے۔ خیر خواہوں نے بادشاہ سے عرض کیا "طاقت و دشمن سے مقابلہ ہے۔ یہاں لشکر کے سپاہی نہایت تباہ حال ہیں۔ اگر ان کی کچھلی تنخواہیں دے دی جائیں تو مناسب ہوگا۔" سلیم شاہ نے جواب دیا "اگر میں اس وقت تنخواہیں دے دوں تو میری غرض سمجھی جائے گی اس لیے میں فتح کے بعد دو سال کی تنخواہ ادا کر دوں گا۔" بچارے پریشان حال لشکریوں نے یہ سن کر ایک آہ سرد کھینچی اور اسی بے سروسامانی میں روانہ ہو گئے۔ امیروں نے پھر عرض کیا "توہیں تو لشکریوں کے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کو کھینچنے والے بیل گویا ریل میں چھوڑ دیئے گئے ہیں اب کیا کیا جائے؟" بادشاہ نے کہا "اتنے ہزار سپاہی آخر کس مرض کی دوا ہیں جو مفت تنخواہیں پاتے ہیں۔" مجبور ہو کر افسروں نے پیادوں سے ہی بیل اور گدھوں کی طرح توہیں کھینچوائیں۔ بعض توہیں تو اتنی بھاری تھیں کہ ایک ایک کو ہزار ہزار بلکہ دو دو ہزار سپاہی کھینچتے تھے۔ اس مصیبت کے باوجود اتنی جلدی کوچ پر کوچ ہوئے کہ شکر سات دن میں پنجاب پہنچ گیا۔ خیر یہ ہوئی کہ ہمایوں کسی مصلحت کی وجہ سے خود ہی کشمیر کی سرحد ہاتھ تک آکر کابل لوٹ گیا۔ اس کا ذکر آئندہ تفصیل سے کیا جائے گا۔

**گوالیار کو واپسی** | ہمایوں کی واپسی کی خبر سن کر سلیم شاہ بھی گوالیار لوٹ آیا۔ اسی اثناء میں وہ شکار کے لیے قصبہ انبیری گیا ہوا تھا۔ وہاں بعض امیروں کے اشارہ پر کچھ مفسدوں اور اداہاتوں نے بادشاہ کا راستہ روک لیا۔ جب بادشاہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اس راستہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستہ سے شہر میں داخل ہوا۔ پھر اس سازش کے سرغنوں بہاؤ الدین محمود اور امداد کو قتل کر دیا۔ جن جن سے بادشاہ کو بدگمانی تھی ان میں سے بھی بعض قتل کیے گئے اور بعض قید خانہ میں ڈال دیئے گئے۔ اس مرحلہ کے بعد اس نے خزانہ کھلوا کر سپاہیوں کو دو سال کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے احکام جاری کر دیئے اور اس حکم کو ہندوستان تمام پنج ہزاری اور وہ ہزار امیروں تک پہنچا دیا گیا۔ ابھی لشکر کے کچھ آدمیوں ہی کو تنخواہ ملی تھی کہ بادشاہ سخت مرض میں مبتلا ہو گیا اور اکثر لوگ تنخواہ سے محروم رہ گئے۔

**سلیم شاہ کی بیماری** | کہتے ہیں سلیم شاہ کو متعدد جگہ ذہل نکلا تھا۔ بعض کہتے ہیں سرطان کا عارضہ تھا۔ اس درد سے بادشاہ تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ اس کی فصد بھی کھولی گئی لیکن کوئی ٹھکانہ نہ ہوا۔ اس بے قراری میں اس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکل جاتا تھا۔ "میں خدا کو اتنا غالب نہیں جانتا تھا۔" (لعوذ باللہ) اس مرض کی بے قراری میں بھی یہ حال تھا کہ جب تک اس کے حواس ٹھکانے رہے اپنے معشوق دولت خان کو سامنے بٹھائے رکھتا تھا اور اس کی صورت دیکھتا جاتا تھا۔ جس وقت بھی غش سے چوٹکتا ہی کہتا "دولت خان کہاں ہے؟" ضعف کی وجہ سے کروٹ لینا مشکل تھا لیکن اپنے محبوب کی یہ دلہن تھی کہ اگر دولت خان دوسری طرف آ بیٹھتا تھا تو اسے یہ گوارا نہ تھا کہ اسے اپنے سامنے آنے کی رحمت دے۔ بلکہ لوگوں سے کہتا تھا میرا منہ اس کی طرف پھیر دو۔ ایک دن وہ بیمار ہو کر موجود نہ تھا پوچھا "وہ کہاں ہے؟" لوگوں نے کہا "کسی سے ملنے گیا ہے۔" سلیم شاہ سمجھا اس نے مجھے مرتا ہوا دیکھ کر اور بھی



پلو جوڑ لیا ہے۔ اتنے میں دولت خاں حاضر ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر جان میں جان آئی اور سلیم شاہ نے یہ شعر پڑھا:

قدرِ من سے شناسی کہ چنانچہ بونا

باش تا صحبتِ یاران و گر دریابی

میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا ہے کہ سلیم شاہ نے اپنے خزانچی کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر روز بغیر پوچھے دولت خاں کو ایک لاکھ تنگہ تک ادا کر دیا کرو۔ اگر وہ اس سے زیادہ طلب کرے تو پوچھ لیا کرو۔

**سلیم شاہ کی وفات** | سلیم شاہ کا مرض کم نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ معالج اور طبیب عاجز رہ گئے۔ اور وہ اسی طرح تر پتے ہوئے سدھا گیا۔

سلیم شاہ کی وفات ۹۶۱ھ میں ہوئی۔ اس نے نو سال حکومت کی۔ اس کی میت بھی سسران لے جا کر شیر شاہ کے پلو میں دفن کی گئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال گجرات کے خدا ترس عادل بادشاہ سلطان محمود گجراتی کو برہان نامی خدمت گار نے شہید کر دیا۔

اور تو اور اسی سال دکن کے بادشاہ نظام الملک نے بھی انتقال کیا۔ یہ سال گویا بادشاہوں کی وفات کا سال تھا۔ میر سید نعمت اللہ اشوئی نے جو سلیم شاہ کا ایک مشہور صاحب علم مصاحب تھا، ان تینوں بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے۔

سہ خسرو از دال آمد بہ یک بار کہ ہند از عدل شاہ دارالامان بود

یکے محمود شاہ شاہنشہ گجرات کہ ہم چوں دولت خود نوجواں بود

دوم سلیم شاہ آں کا احسان کہ فرزند عزیز شیر خاں بود

سوم آمد نظام الملک بحری کہ در ملک دکن خسرو نشان بود

زمن تاریخ فوتِ این سہ خسرو

چہ می پرسی ز دال خسرواں بود

**سلیم شاہ کی لطیفہ گوئی** | سلیم شاہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ لیکن اسے شعر شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ ہر طرح کے بکثرت اشعار یاد تھے۔ اکثر میر نعمت اللہ اشوئی سے شعر و سخن پر مباحثہ کیا کرتا تھا۔ سمجھ بوجھ کے لحاظ سے نہایت ذہنی تھا اگر لطیفہ کہا کرتا تھا اور دوسروں سے لطیفے سن کر بہت خوش ہوتا تھا، علماء و صلحا کا بھی عقیدت مند تھا۔

کچھ میں پنجاب جاتے ہوئے جب وہ الود میں ٹھہرا تو ایک دن دور سے مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کو آتے ہوئے دیکھا۔

دیکھا۔ صاحبوں سے کہنے لگا "تم جانتے ہو یہ کون آ رہا ہے؟" سب نے کہا "حضور ہی بتلا دیں" سلیم شاہ نے کہا "بابر بادشاہ کے پانچ بیٹے تھے جن میں سے چار تو ہندوستان سے نکل گئے مگر پانچواں یہ باقی رہ گیا۔" سرمست خاں نے کہا "اس فتنہ کی جڑ کو آپ نے کیوں روک دیا؟" سلیم شاہ نے کہا "کیا کروں اس سے بہتر آدمی مجھے دوسرا نظر نہیں آتا۔"

جب ملا عبداللہ محفل میں پہنچے تو بادشاہ نے انہیں تخت پر بٹھایا اور ایک مروارید کی تسبیح جو تیس ہزار کی تھی۔ اور

اسی وقت کہیں سے پیش کش میں آئی تھی، ان کے حوالہ کر دی۔  
سلیم شاہ کو کسی نشہ کی عادت نہ تھی۔ نماز کا ایسا پابند تھا کہ اس کی کبھی جماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔

## فیروز شاہ بن سلیم شاہ

سلیم شاہ کے بعد اس کا بیٹا فیروز خاں دس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنا خطاب فیروز شاہ رکھا۔ لیکن اسے زیادہ عرصہ سلطنت کا موقع نہ ملا۔

سلیم شاہ کے سائے مبارز خاں ولد نظام خاں نے تیسرے ہی دن بھانجہ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب اس کی بہن اور بادشاہ کی ماں بی بی بانی کو پتہ چلا تو وہ بھائی کے قدموں پر گر پڑی اور بھنت کئے لگی "بھیا خدا کے لیے اس معصوم کی جان کے پیچھے نہ پڑ۔ بادشاہی تجھے مبارک میں اسے لے کر کہیں چلی جاؤں گی کہ اس کا پتہ تک نہ چلے گا۔" لیکن ظالم مانوں نے ایک نہ سنی اور محل سرا میں گھس کر ماں کے سامنے اس کم سن بچہ کا سر کاٹ دیا۔ اس کا کیا اس کے سامنے آیا۔ اس کی نسل بھی آگے چل نہ سکی۔

کہتے ہیں سلیم شاہ نے کئی بار مبارز خاں کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور اپنی بی بی سے کہا تھا "اگر تو اپنے بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو بھائی کا خیال چھوڑ دے۔ اور اگر بھائی پیارا ہے تو اس بچہ سے ہاتھ دھو لے" اس نے ہمیشہ بھائی کی سفارش کر کے یہی جواب دیا کہ میرا بھائی عیش و عشرت میں لگا ہوا ہے۔ بادشاہی سے اس کا کیا سروکار اس کا تو عدم وجود برابر ہے۔" سلیم شاہ کا یہ حال تھا کہ جس وقت بھی وہ مبارز خاں کو دیکھتا تھا بی بی سے کہتا تھا "دیکھ تو پچھتائے گی اور اس وقت کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

سلیم شاہ کا اندیشہ درست تھا وہی ہوا جو اس نے کہا۔

## سلطان محمد عادل عرف علی

سلیم شاہ کا سالامبارز خاں سلطان محمد عادل کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ تمام امرا اس کی بادشاہت پر بیٹھا ہونگے اس کا خطاب تو عادل تھا لیکن لوگوں میں علی مشہور ہو گیا۔ بلکہ اس کو بھی بگاڑ کر لوگ "اندلی" کہنے لگے۔

مبارز خاں سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ کے حالات سے بہت متاثر تھا۔ اسی لیے اس نے ہریات میں اسی کے نقش قدم پر چلنا ضروری جانا، چنانچہ اپنے ابتدائی عہد میں خزانہ کھول کر اشرافی روپے خوب لٹائے اور اس عارضی سخاوت سے تمام خاندان سب کو اپنا ہمنا بنایا۔ لیکن یہ بہار صرف چند روز کی ہی تھی۔

اس نے وزارت کا منصب اپنے ایک غلام شمشیر خاں کے تفویض کر دیا۔ یہ خواص خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ وکالت کا محکمہ دولت خاں نو مسلم کو ملا جس کی لوحانیوں نے پرورش کی تھی۔ ان کے ساتھ ہی بوقال بھی ان مناصب میں شریک تھا۔

ہیمو میوات کے قصبہ ریواڑی کا رہنے والا تھا اور سلیم شاہ کے عہد میں بازار کی کوتوالی سے اونچے مراتب پر فائز ہو گیا تھا۔ محمد عادل نے اس بقال کو اس قدر مطلق العنان بنا دیا تھا کہ وہ سلطنت کے تمام ملکی اور مالی معاملات میں دخل تھا۔ خود سلطان عادل عیش پسند آدمی تھا اس لیے راگ رنگ میں زیادہ گزرتی تھی۔ سپہ گری ہم پسندی سے اس کو کوئی مناسبت نہ تھی اس کی ان عادتوں، شہزادہ فیروز خاں کے

## بغاوتوں کا آغاز

ظالمانہ قتل اور سہیو کی سرپرستی کی وجہ سے لوگ اس سے سخت ناراض تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے پٹھان امیر اور سردار اپنی اپنی جگہ خود مختار ہونے لگے۔ اور ابھی اس کی تخت نشینی کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ہر طرف بغاوتیں شروع ہو گئیں اور ملک کا سارا نظم و نسق جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں کافی منظم اور مستحکم تھا درہم برہم ہو گیا۔

ایک دن محمد عادل گواہیار کے قلعہ میں امرار کو جاگیریں تقسیم کر رہا تھا اس موقع پر اس نے قنوج کی سرکار شاہ محمد فرہلی سے لے کر سرمست کے حوالہ کر دی۔ شاہ محمد کا بیٹا سکندر جو

## دربار شاہی میں ہنگامہ

ایک خوب رو اور بہادر نوجوان تھا اس تبدیلی پر ناراض ہو کر سخت لہجہ میں گفتگو کرنے لگا۔ شاہ محمد اس کا باپ اسے نرمی اور ملائمت کی نصیحت کرنے لگا اور اس گفتگو سے منع کرنے لگا۔ سکندر نے باپ پر بھی بگڑ کر کہا "تم کو بھی شیر شاہ نے لوہے کے پتھرے میں قید کر دیا تھا" سلیم شاہ نے تم پر احسان کیا اور سفارش کر کے تم کو رہائی دلائی تھی اب یہ شور پٹھان ہیں نکالنے پر تل گئے ہیں۔ تم اس خطرہ کو محسوس نہیں کر رہے ہو؟ اسی طرح اس نے سرمست خاں کو بھی سخت گالیاں دیں اور کہا "یہ سگ فروش ہماری جاگیر پر قبضہ کرتا چاہتا ہے" سرمست خاں قوی اور تند آدمی تھا اس نے سکندر کو گرفتار کرنا چاہا۔ اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "اے فرزند اتنی تیزی کیوں دکھا رہا ہے؟" سکندر اس کی نیت بھانپ گیا۔ اور خنجر سے اس کے شانہ پر ایسا کاری دار کیا کہ سرمست خاں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد سکندر نے جوش غضب میں اسی مجلس میں کئی ایک امیروں کو قتل کر دیا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ جب سے ہندوستان میں خنجر کا رواج ہوا ہے اس سے کسی نے اس طرح کام نہیں لیا جیسا کہ اس وقت سکندر نے لیا۔ اس ہنگامہ کی وجہ سے بڑا شور و غل ہونے لگا اور عدلی شاہ بھاگ کر محل سرا میں گھس گیا۔ سکندر کچھ امیروں کو قتل اور کچھ کو زخمی کر کے بادشاہ کے پیچھے بھی پک کر گیا اور اس پر تلوار سے وار کیا۔ لیکن عدلی نے جلدی سے محل سرا کے کواٹر بند کر لیے اور تلوار اس کے سر کی بجائے دروازہ پر پڑی۔ اس کے سب امیر پہلے تو بدحواس ہو کر تلواریں پھینک کر بھاگ گئے۔ پھر سب نے ہجوم کر کے دونوں باپ بیٹوں کو زمرغہ میں لے لیا۔ دو تین گھنٹوں تک دست بدست جنگ ہوتی رہی۔ آخر سکندر ابراہیم خاں سورا اور شاہ محمد دولت خاں لومانی کے ہاتھ سے مارا گیا۔

اسی دن اس ہنگامہ سے پہلے عماد اور سلیمان کا بھائی تاج خاں کرانی عدلی کے دیوان خانہ سے ناراض ہو کر قلعہ سے باہر آ گیا۔ اور حضرت اعلیٰ اپنا خطاب رکھ کر بغاوت کے منصوبے باندھتے ہوئے جا رہا تھا کہ راستہ میں شاہ محمد سے جو دربار کو جا رہا تھا اس کی ملاقات ہو گئی۔ دونوں دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ تاج خاں نے کہا "آثار کچھ اچھے نہیں ہیں تو بغاوت کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر تم بھی میرے ساتھ شریک ہو جاؤ تو ہماری طاقت دگنی ہو جائے گی" شاہ محمد نے اس کی بات نہ مانی۔

اور اس کی موت اسے کشاں کشاں عدلی کے دربار میں لے آئی۔

**تاج خاں کی سرکشی** | تاج خاں دن کے وقت ہی غلانیہ گوالیار سے بنگالہ کی طرف کوچ کر گیا۔ بادشاہ نے اس کے

تعاقب میں ایک فوج روانہ کی خود بھی پیچھے روانہ ہوا۔ چھپراٹھوں میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ سخت لڑائی کے بعد تاج خاں کو شکست ہوئی اور وہ چٹارہ کی طرف بھاگ گیا۔ راستہ میں جہاں کہیں بھی عدلی کے خالصہ کے عامل ملتے اُن کو گرفتار کر لیتا تھا اور جو کچھ مال و دولت ہاتھ لگتی قبضہ میں لے لیتا۔ اسی لوٹ میں اسے سواہتھی بھی کہیں سے مل گئے۔ یہ سب غنیمت لے کر تاج خاں اپنے بھائیوں سلیمان عماد اور ایاس کے پاس جو گنگا کے ساحلی پرگنوں کے حاکم تھے چلا گیا۔ اس کے تعاقب میں عدلی بھی چٹارہ میں پہنچ گیا۔ کراچی اپنی جمعیت لے کر گنگا کے کنارے بادشاہی لشکر سے مقابلہ پر آئے۔ بادشاہ کی طرف سے ہیمنے ایک سواہتھیوں کو لے کر ان پر حملہ کیا۔ اور سخت لڑائی کے بعد انہیں پسپا کر دیا۔

**ابراہیم خاں کی بغاوت** | جب عدلی چٹارہ میں پہنچا تو اس کا ارادہ ہوا کہ نازی خاں کے بیٹے ابراہیم خاں کو جو شیر خاں کے بھائی بندوں میں سے تھا گرفتار کر لے۔ عدلی کی بہن ابراہیم خاں کے

نکاح میں تھی۔ اس نے شہر کو اس بات کی خبر کر دی۔ ابراہیم خاں بھیس بدل کر خفیہ طور پر قلعہ سے نکل گیا اور اپنے باپ کی جاگیروں بیانہ اور مہنڈون کا رخ کیا۔ عدلی نے عینی خاں نیازی کو اس کے تعاقب میں مامور کیا۔ کاپی کی سرحد پر فریقین میں مقابلہ ہوا۔ ابراہیم خاں نے نیازی کو شکست دے کر بھاگ دیا۔ اور ایک بڑی جمعیت فراہم کر کے اپنی موروثی جاگیروں پر خود مختار ہو کر بیٹھ گیا۔

عدلی جب کراچیوں کے فتنے سے فارغ ہوا تو اس نے ابراہیم خاں کے معاملہ پر توجہ دی۔ جب شاہی لشکر جتنا کے کنارے پہنچا تو ابراہیم خاں نے مصالحت کی خاطر پیغام بھیجا کہ ”اگر اے حسین جلوانی اور بہار خاں شروانی جسے سلیم شاہ نے اعظم ہمایوں کا خطاب دیا تھا اور دوسرے نامی امیر اگر مجھے مطمئن کر دیں تو ان کے قول پر بھروسہ کر کے میں آپ کی اطاعت میں آ جاؤں گا۔“ عدلی نے ان امیروں کو اس سے گفتگو کے لیے روانہ کیا۔ ان امیروں نے وہاں جا کر اچانک ایک اور فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے ابراہیم خاں کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور اس کو سلطان ابراہیم کا خطاب دے کر بادشاہ قرار دے دیا۔ اس دوران میں آگرہ اور دوسرے کئی ایک شہروں میں بھی سلطان ابراہیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ ابراہیم سے مقابلہ پر عاجز ہو کر عدلی شاہ گوالیار سے بھٹہ اور وہاں سے چٹارہ کی طرف پس پڑ گیا۔ اور اپنے ساتھ کافی خزانہ ہاتھی اور ایک بڑا لشکر لے کر گیا۔

**ابراہیم اور سکندر میں مقابلہ** | عدلی کی دوسری بہن کا نکاح احمد خاں سے ہوا تھا۔ وہ بھی شیر شاہ کے بھائیوں میں سے تھا۔ بڑا بہادر آدمی تھا۔ وہ بھی پنجاب میں وہاں کے امراء کو عدلی سے برگشتہ کر کے

تاتار خاں کاشی، حبیب خاں اور نصیب خاں طغرچی کی مدد سے خود مختار ہو گیا۔ اور سلطان سکندر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ پڑھوا دیا۔ پھر ایک بڑا لشکر لے کر دہلی اور آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف سے اس کے مقابلہ پر ابراہیم بھی ایک بھاری لشکر کے ساتھ آگرہ سے نکلا اور دس کوس کے فاصلہ پر فراہ کے مقام پر سکندر کے مقابلہ میں صف آرائی کی۔



مگر بڑے بڑے امیر جیسے حاکم اور خاں سلطانی جس کی شان و شوکت بادشاہوں جیسی تھی اور رائے حسین جلوانی،  
 'خود خاں' حسین خاں غلزنئی وغیرہ ابراہیم کے طرفدار تھے۔ ابراہیم نے دو سو امیروں کو تو سراپردہ علم طوق اور  
 عطا کیا تھا اور جو بھی امیر دس ہزار سوارہ ساتھ لے کر اس کے پاس چلا گیا، اسے بھی سرخ پھر پیرا لگا ہوا باش کا  
 ٹھٹھا مل گیا اور بادشاہ کی طرف سے منصب اور جاگیر کا فرمان بھی۔ اس تدبیر سے ابراہیم نے اسی ہزار کا لشکر جمع کر لیا۔  
 اس مرحلہ میں جس دن اور سے حاجی خاں اس کی ملازمت کے لیے حاضر ہوا۔ اس دن اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔  
 ابراہیم نے حاجی خاں کو ایک نہایت وسیع اور اونچا سراپردہ جو نیا نیا تیار ہوا تھا جس میں باہر کی طرف پرتگالی سقر لاط اور  
 در فرنگستانی مغل لگی ہوئی تھی، عمدہ فرش اور سونے چاندی کے برتنوں کے ساتھ عطا کیا۔ حاجی خاں نے فوراً ہی وہ  
 سراپردہ کھڑا کر کے اس میں قیام کیا۔ اس کی اس شان کو دیکھ کر پٹھان امیر رشک کرنے لگے۔ ابراہیم کے مقابلہ میں سکندر  
 پاس صرف دس بارہ ہزار آدمی تھے۔ جب اس نے غنیمت کا یہ رنگ دیکھا تو صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ آخر کار دونوں  
 اس مضمون کا عہد نامہ تحریر ہوا کہ۔ "دہلی سے شمال کا جتنا علاقہ قبضہ میں ہے یا آئندہ فتح ہوگا وہ ابراہیم خاں  
 ہوگا۔ اور ادرہ پنجاب، ملتان وغیرہ پر جہاں جہاں قبضہ ممکن ہو سکندرتا قبضہ رہے گا۔ اور مغلوں کی فوج کشی کی  
 تک تمام بھی اسی کے ذمہ ہوگی۔"

دونوں شکروں میں جو پٹھان تھے وہ آپس میں رشتہ دار بھی تھے۔ اس صلح پر سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ صلح کے معاہدے  
 سکندر کے بھائی کالا پٹار اور پنج بھیرہ امیروں نے جو پانچ ہزار بھائی تھے مزید یہ شرط بڑھائی کہ جب ابراہیم عدلی کو  
 دست دے کر اس کے خزانہ اور بھتہ کے علاقہ پر قبضہ کرے تو ان دونوں میں ہم کو بھی حصہ دار بنائے۔ ورنہ صلح فسخ ہو جائیگی  
 سکندر بھی اس شرط پر اصرار کرنے لگا۔ امیروں نے ابراہیم کو بھی یہ کہہ کر راضی کر لیا کہ "اس بلا کو ٹالیے۔ جب عدلی کا مالک  
 درخزانہ فتح ہوگا تو دیکھا جائے گا، سکندر کے گاتوں سے لے گا۔" امیروں کے اس مشورہ سے مسعود خاں اور حسین خاں  
 کوئی اختلاف کیا اور کہا "سکندر سے بھی آخر ایک دن لڑنا ہی پڑے گا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ ابھی اس قضیہ کو چکا دیں  
 اس وقت صلح کر لینے میں تو ہماری کمزوری ظاہر ہوتی ہے اور اس سے دشمنوں کے حوصلے بھی بڑھ جائیں گے۔ عدلی بھی مقابلہ  
 کے لیے چڑھ آئے گا۔ گفتگو نے جب یہ رخ بدلا تو صلح التواری میں پڑ گئی۔"

ابراہیم خاں نے حاکم سنبھل میاں یعنی تارن کے آنے تک لڑائی ملتوی رکھی۔ یحییٰ تارن بہت بہادر اور دانش مند سردار  
 تھا۔ اس نے عدلی کے بیس امیروں کو جو سنبھل پر فوج کشی کے ارادہ سے آئے تھے بدایوں کے میدان میں مقابلہ  
 کے بجلا دیا تھا۔ پھر اس نے راجہ متر سین کٹھریہ کو بھی جو پہلے کبھی سنبھل پر قابض تھا اور اب پھر قوت پیدا کر کے حملہ کا ارادہ  
 رکھتا تھا، کٹھریہ کے میدان میں لڑ کر بری طرح شکست دی تھی۔

یہ بدایوںی مصنف ہذا، اس وقت اپنے والد کے ساتھ سنبھل میں تحصیل علم کے لیے گیا ہوا تھا۔ میری عمر  
 تھوڑا سا فانی شد بارہ سال تھی۔ اس فتح پر میں نے تاریخ نگالی تھی۔  
 "چھ بیس خوب کردہ اند"

میرے سنبھل میں آنے سے پہلے میاں حاتم سنبھلی بھی اس لڑائی کا قصہ سن چکے تھے۔ جب میں ان کے پاس "کنز" کاؤں لائے گیا تو انہوں نے فرمایا "ہم نے فی البدیہہ تاریخ لکھی ہے۔"

"فتحہا آسمانی شد"

ذرا حساب کر کے تو بتاؤ اس میں کتنے عدد ہوتے ہیں؟ جب میں نے حساب کیا تو سو ساٹھ عدد نکلے۔ میں نے ان سے عرض کیا "اس میں ایک عدد کی کمی ہے۔" انہوں نے فرمایا "اضافت کا ہمزہ تدا کے امار کے مطابق بڑھا دو۔ اس طرح"

"فتحہا آسمانی شد" مکمل تاریخ ہو گئی؟

اس تاریخ گوئی کے بعد انہوں نے دعائے خیر کر کے میرا سبق شروع کرایا اور کتاب "ارشاد قاضی کے چند ورق جو خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے مجھے بطور یادگار عنایت فرمائے پھر انہوں نے مجھے میاں شیخ ابوالفتح الہدیہ خیر آبادی کے سپرد کر دیا۔ یہ بزرگ اس کتاب کی تصنیف کے وقت اپنے باپ کے سجادہ نشین ہیں۔ جس وقت میاں یحییٰ تارن نے کانٹ اور کولہ کے علاقے فتح کیے اور بدایوں سے گزر کر قصبہ آہار میں گنگا پل پہنچا تو اپنے والد کے ہمراہ ان کے لشکر میں امر وہہ تک گیا اور وہاں شکر سے جدا ہو کر میر سید محمد میر عدل کے ہاں جا کر پرہنے لگا۔

ابراہیم خاں نے میاں یحییٰ کے لشکر میں آنے کے بعد دوسری سب کو سی میدان میں لشکر کو ترتیب دیا۔ میاں یحییٰ مقابل میں تھا، حاجی خاں دایہی جانب، رائے حسین جلوانی غلزیوہ کے ساتھ بائیں جانب اور قلب میں خود ابراہیم خاں کا مقام تھا۔ دوسری طرف سکندر نے بھی صف آرائی کی۔ سکندر کے دائیں پہلے جو "پنج بھیہ امراء کی کمان میں تھا، ابراہیم کے بائیں پہلو پر حملہ کر کے ان کو اگرہ تک پساکر دیا۔ اور اگرہ میں داخل ہو کر شہر کو جی بھر کر لوٹا اور اگرہ میں سکندر کے نام کی منادی کرا دی۔

ان کے مقابلہ میں ابراہیم خاں کے دائیں پہلو نے جو حاجی خاں کے زیر کمان تھا سکندر کے بائیں پہلو کو وبار قصبہ موزا اور پول تک ان کا تعاقب کیا۔ اس لڑائی کے دوران میں حاجی خاں اپنے سر پر وہ کی طرف سے گزرا تو دیکھا کہ وہ شاندار سرپردہ نارت گروں کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ وہ اسی وقت میدان جنگ سے نکل کر لوٹ پلا گیا۔ یحییٰ تارن کی دیر تک لڑتارہا۔ اس کے ہاتھ میں زخم آگیا اور ایک دو انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ وہ بھی کچھ دیر بعد کھسک کر سنبھل کی طرف چلا گیا۔ ابراہیم خاں بس چار پانچ آدمیوں کے ساتھ نشیب میں سر جھکائے غنیم سے مقابلہ کر رہا تھا اور گوئے اس کے سر سے گزندہ رہے تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مقابل کی فوج میں بذات خود سکندر موجود ہے تو باگ پھیر کر اٹاؤہ کی طرف کوچ کر کے اس کا سارا اسباب شاہی چتر وغیرہ برباد ہو گیا۔

امیر سید محمد۔ سید رفیع الدین محدث کے شاگرد سید جلال سے بدایوں میں علوم کی تحصیل کی تھی۔ سوری بادشاہوں کے زمانہ سے ان کی ابتدائی خدمت وہ برابر دربار سے متعلق رہے اور میر عدل ان کا عمدہ اور خطاب تھا۔ انصاف کی کرسی پر نہایت عدل و دیانت سے کام کرتے رہے۔ جب تک وہ دربار اکبری میں رہے اس وقت تک ابوالفضل جیسے آدمیوں کو دین میں رخصت اندازی کرنے کی ہر امتداد دینے سے انکار کیا۔ حکومت پران کا تقرر ہوا اور اسی جگہ شہر میں فوت ہوئے۔

سکندر اس کے تعاقب میں اٹاؤ تک گیا۔ وہاں یہ اطلاع ملی کہ ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ حملہ کر دیا ہے۔ پنجاب میں داخل ہو چکا ہے۔ سکندر نے ابراہیم کا بیچا چھوڑا اور تیزی سے پنجاب کا رخ کیا۔ سہرند میں ہمایوں سے لڑائی ہوئی اور وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ابراہیم اٹاؤ سے منجھل چلا گیا۔ جہاں اس نے سلطان عدلی کے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے لیے ایک مریخ بھی تیار کر آیا۔ مہینہ بھر کی تیاریوں کے بعد وہ ایک ہزار سواروں کی جمعیت لے کر براہ کستی کا پٹی کی طرف روانہ ہوا۔ عدلی نے ابراہیم کے مقابلہ پر مہموں بقال کو جو اس کا وزیر اور وکیل مطلق بنا ہوا تھا، مامور کیا۔ مہموں بقال چنہار سے بہت سے عالی مرتبہ امیروں، پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ لے کر آگرہ اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ جب دونوں میں مقابلہ ہوا تو ابراہیم نے ایسی بہادری دکھائی کہ مفتحوان رستم کی یاد تازہ ہو گئی۔ لیکن تقدیر کے ساتھ نہ دیا اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ویسے ابراہیم بذات خود شاہانہ شخصیت کا مالک تھا۔ خوب صورت، خوش کلام، ملین، متواضع، سخی اور بہادر ساری خوبیاں اس کی ذات میں جمع تھیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑائی میں فتح اور کامیابی صرف عطیہ خداوندی ہے۔ انسان کی کوششوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ ابراہیم خاں نے دو برس میں سولہ ستر لڑائیاں لڑیں۔ ہر بار اول اول وہ غالب رہا، مگر آخر میں شکست کھا گیا۔

ابراہیم خاں مہموں کی فوج سے شکست کھا کر بیانہ کی طرف چلا گیا۔ مہموں بھی اس کے تعاقب میں بیانہ پہنچا۔ ابراہیم نے بیانہ کے پٹھانوں اور زمینداروں کو جمع کر کے دوبارہ مہموں سے مقابلہ کی تیاری کی اور شہنشاہ کے ارادہ سے کوچ کیا لیکن صبح ہو گئی۔ اس وقت اس کا لشکر بیانہ سے دس کوس پر قصبہ خانوہ میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں غنیم سے ایک سخت لڑائی ہوئی لیکن کوتاہی قسمت کا کیا علاج؟ مہموں نے چالاکی سے گھیر کر اسے شکست دے دی اور وہ مجبوراً بیانہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ یہ ایک نہایت بلند اور مستحکم قلعہ تھا، مہموں نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ میں آتش باری کا کافی سامان موجود تھا۔ ابراہیم خاں کا باپ غازی خاں ہندوؤں سے بیانہ کے مغربی کوہستان کے راستہ برابر قلعہ میں رسد پہنچا رہا تھا۔ مہموں کی فوج ہر روز حملہ کرتی تھی اور گھمسان کے مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ مہموں مہینہ تک قلعہ کا محاصرہ کیے رہا اور بیانہ کے سارے علاقہ کو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیا۔ اسی غارت گری میں میرے والد کی جمع کی ہوئی کتابیں جو بیاد میں تھیں بھرت ل گئیں اور ہندوستان کے سارے مشرقی علاقہ میں قحط پھیل گیا۔

خاص طور سے آگرہ، دہلی اور بیانہ میں تو ایسا سخت قحط پڑا کہ ڈھائی تنگہ میں ایک شیر خوار بچہ ملنے لگی۔ اس دام پر بھی ملنا محال ہو گیا تھا۔ اکثر لوگ گھروں کو بند کر کے بیٹھ گئے اور ایک ایک گھر میں دس دس

تنگہ فرشتہ نے تنگہ کی مراحت کرتے ہوئے لکھا ہے ”دہلی وقت تنگہ یک تودہ طلاء و نقرہ مسکوک رامی گفتند و ہر تنگہ نقرہ را پنجاہ پول مس کہ“۔  
 اس کا مطلب ہے ”دہلی میں داندہ مالدارن آن معلوم نیست کہ چہ مقدار بود بعضے بر آنند کہ یک تودہ مس و بعضے گویند کہ شل پول این زمان دو تودہ ربع کم“۔  
 اس کا مطلب ہے ”یہ علاقہ الدین خلجی کے عہد کے تنگہ کا حال لکھا ہے۔ جب اول اول مسلمان ہندوستان آئے تھے تو یہاں ایک سکہ بہت زیادہ لالچ تھا۔  
 چھہ دل وال کتے تھے وہ جیل کے برابر ہوتا تھا۔ تاج الماثر جو ایک کی تاریخ اور غالباً مسلمانوں کے عہد کی سب سے پہلی تاریخ ہے۔ اسی لفظ  
 ”دل وال“ کو استعمال کرتا ہے۔ طبقات ناصری کا مصنف قاضی صدر جہاں جو اکثر بعد کی تاریخوں کا ماخذ ہے جیل اور تنگہ (باقی حاشیہ تنگہ و سیر فتح آئندہ ہے)۔

بیس بیس بلکہ اس سے بھی زیادہ آدمی بھوک اور فاقہ سے مر گئے ان بے چاروں کو نہ کفن ملا نہ قبر۔ ہندوؤں کا بھی یہی حال تھا۔ لوگ کیکر کے بیج اور مولشیوں کے چمڑے جن کو امرار ذبح کر کے فروخت کر دیتے تھے، کھا کھا کر جان بچا رہے تھے۔ ایسی چیزوں پر بقیہ حاشیہ تکہ گذشتہ دونوں کو استعمال کرتا ہے۔ ششما میں سلطان محمود غزنوی کے سکوں پر عربی میں درہم کا لفظ ضرب ہے اور اس کے ساتھ سنسکرت میں ٹنکہ بھی ثبت ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ٹنکہ اصل میں سنسکرت کا لفظ ہوگا۔ بعض مورخوں کے خیال کے مطابق یہ ترکی کا لفظ ہے۔ نہیں معلوم ہوتا۔ اعتبار میں چاندی اور سونے دونوں کا ٹنکہ ۱۰ رتی یعنی ۵۰ اگرین کے وزن کا ہوا کرتا تھا۔ سلطان محمد تغلق کا ایک نقری ٹنکہ ۸۰ رتی یعنی ۴۰۰ اگرین کا بھی ملتا ہے۔ ابن بطوطہ اس ٹنکہ کو درہمی دینار اور عام مروجہ نقری ٹنکہ کو دینار لکھتا ہے۔ مسالک الابصار کے مصنف نے لکھا ہے ”طلائی ٹنکہ تین مثقال کا ہوتا تھا اور نقری ٹنکہ کی آٹھ ”ہشتگانیاں“ آتی تھیں۔ ایک ہشتگانی مصر اور شام کے درہم کے مساوی تھی۔ ایک ہشتگانی کی چار ”سلطانیاں“ ہوتی تھیں۔ ایک سلطانی یادوگانی کے دو جیتل ہوتے تھے اور ایک جیتل کے چار غلوس ملتے تھے۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے ”ٹنکہ کے پچاس پول آتے تھے“ اس کی پول سے جیتل مراد ہے اور وہ یہ حساب ”عدلی ٹنکہ“ کا بتاتا ہے۔ عدلی ٹنکہ کے پچاس جیتل ہوں گے۔ لیکن معمولی ٹنکہ نقری کے مسالک الابصار کے حساب سے چونسٹھ جیتل بنتے ہیں۔ اکبر کے وقت جو جیتل رائج تھا وہ اس سے مختلف تھا۔ وہ ایک روپیہ کا ہزارواں حصہ ہوتا تھا۔

طبقات اکبری کے مصنف نے ٹنکہ سفید (نقری)، ٹنکہ سرخ (طلائی)، کے علاوہ ٹنکہ سیاہ کا لفظ بھی لکھا ہے۔ چنانچہ وہ سلطان محمد تغلق کے ذکر میں لکھتا ہے ”واضح باشد کہ مراد ازین ٹنکہ نقرہ است کہ پارہ از مس ہم داشت دیہشت ٹنکہ سیاہ برابر است“ فرشتہ نے اس کی وضاحت کی ہے ”نظام الدین احمد بخش تحقیق کردہ مراد ازین ٹنکہ نقرہ است کہ پارہ مس ہم داشت و یکے از ان ٹنکہ را شانزہ پهل مس می دادند“۔ ٹنکہ سیاہ کا جو مطلب فرشتہ بتاتا ہے وہ زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ سلطان محمد تغلق کے سکوں میں بھی ایک سکے ایسا ملتا ہے جس میں چاندی اور تانیا ملا ہوا ہے۔ اس کا وزن ۳۲ رتی کا ہے وہ نہ تو عدلی کا پورا حصہ ہے اور نہ معمولی ٹنکہ کا، بلکہ ایک علیحدہ مستقل سکے معلوم ہوتا ہے۔ غالباً یہی اصل ٹنکہ کا وزن ہے یعنی ۳۲ رتی۔ اگر ہم ٹنکہ کو ٹانک سے مشتق سمجھیں تو ٹانک چار ماشہ کے برابر ہوتا ہے۔ اور یہی وزن سلطان محمد تغلق کے مذکورہ سکے کا بھی ہے۔ اس لیے ٹنکہ سیاہ سے یہی سکے مراد لیا گیا ہے۔

ابن بطوطہ کے وقت تین قسم کے ٹنکے تھے، ۱) ٹنکہ سفید۔ خالص چاندی کا جس کا وزن سو رتی اور اسی رتی کا تھا۔ اسی رتی والے ٹنکہ کو ”عدلی“ کہتے تھے۔ ۲) ٹنکہ سرخ۔ خالص ہونے کا یہ ۱۰۰ رتی کا بھی ہوتا تھا اور ۱۱۲ رتی کا بھی (۳) ٹنکہ سیاہ۔ چاندی اور تانے سے مخلوط ۳۲ رتی کا ہوتا تھا۔ ابن بطوطہ ٹنکہ کو دینار اور طلائی کو ٹنکہ لکھتا ہے۔ ٹنکہ سیاہ کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جہاں اس نے درہم لکھا ہے اس سے اسکی مراد ہشتگانی ہے۔ یہ درہم موجودہ روپیہ کی دوانی کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے مسالک الابصار کے مصنف نے مصر اور شام کے درہم کے برابر لکھا ہے۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامس نے نظام الدین احمد بخش مصنف تاریخ افغانی (جس کا حوالہ فرشتہ نے بھی دیا ہے)، کی عبارت سے نتیجہ نکالا ہے کہ ٹنکہ سیاہ ہشتگانی یعنی چھ جیتل کے مساوی ہوتا تھا۔

حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ، سیر اس زمانہ میں سیر کا وزن کیا تھا؟ ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں ”دہلی کا رطل“ لکھا ہے۔ رطل سے اس کی مراد پونہ ہے۔ وہ اس رطل کو مصر کے ۲۵ رطل کے مساوی لکھتا ہے۔ اس کے فرانسیسی مترجموں نے اس حساب سے من کا وزن ۱۰ پونڈ قائم کیا ہے۔ جو چودہ سیر بختہ کے مساوی ہے۔ مسالک الابصار میں دہلی کے سیر کو ستر مثقال کا لکھا گیا ہے۔ مثقال اگر ہم ماشہ کا ہو تو سیر کا وزن ۱۰ پونڈ اور من کا وزن ۱۳ سیر چھٹانک ہوا۔ باہر نے تزک میں مثقال کو ۵ ماشہ کا بتایا ہے۔ اس حساب سے من کا وزن ۱۲ سیر و چھٹانک ۱۰ پونڈ کا ہوتا ہے۔



کو کھا جانے کے سبب تھوڑے ہی دن میں ان کے ہاتھ پیرورم سے سوچ جاتے تھے اور وہ مر جاتے تھے۔ اس سال کی تاریخ ہے "خشم ایزد"۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آدمی آدمی تک کا گوشت کھا جاتے تھے۔ ان لوگوں کی تشکیلیں ایسی ڈراؤنی ہو گئی تھیں کہ ان کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا۔ یہ سارا علاقہ اس قحط اور دو سال کی ان لڑائیوں کی وجہ سے بالکل تباہ و تاراج ہو گیا، نہ کسان بچے نہ رعایا، ہندو و لٹیروں کی بن آئی اور وہ ادھر ادھر سے ہجوم کر کے مسلمانوں کو ٹوٹنے لگے۔

**قلعہ آگرہ کی آتش زدگی** | ۱۹۶۲ء میں قلعہ آگرہ کی آتش زدگی کا واقعہ پیش آیا تھا۔ سکندر اور ابراہیم کی لڑائی کے وقت قلعہ عدلی شاہ کے شکر سے خالی ہو گیا تھا۔ اس وقت غازی خاں سور کے امراء نے قلعہ میں غلہ اور سامان جنگ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس غرض سے وہ قلعہ میں کوٹھڑیوں کو دیکھتے بھالتے پھر رہے تھے۔ ایک دن صبح سویرے ایک کوٹھڑی میں جس میں بارود بھری ہوئی تھی چراغ کا گل جھرنے سے آگ لگ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے آسمان کی خبر لانے لگے اور ایسا زبردست دھماکہ ہوا کہ شہر میں زلزلہ سا آگیا لوگ تو سمجھے بس قیامت آگئی۔ قلعہ کے ستون اور پتھر دھماکے سے اڑ اڑ کر جہنا کے پار کئی کوس تک جا کر گرے۔ اور اس بلائے ناگہانی میں ہزاروں آدمی تلف ہو گئے۔ آدمیوں اور جانوروں کے اعضاء بھی پانچ چھ کوس تک اڑ کر گرے۔ لوگ سوتے سے اٹھ کر توبہ و استغفار کرنے لگے آگرہ کے قلعہ کا اصل نام بدل گڑھ تھا۔ اس لیے اس حادثہ کی تاریخ نکالی گئی۔

### "آتش بدل گڑھ"

**ہیمو کا دسترخوان** | جیسا کہ ذکر ہوا ان دنوں قحط اس درجہ پر تھا کہ لوگ ایک ایک روٹی پر جان دے رہے تھے۔ لیکن ہیمو کے شکر میں پانچ سو ہاتھیوں کو روزانہ چاول شکر اور گھی کا راتب ملا کرتا تھا۔ ہیمو تمام پٹھان امیروں کو روزانہ ایک وقت اپنے دسترخوان پر بلا کر کھانا کھلایا کرتا تھا اور کتنا کتنا بڑے بڑے لقمے کھاؤ اگر کسی کو (بقیہ حاشیہ سیر صفحہ گزشتہ) اکبری سیر ۵۷ تور ۲ ماشہ ۲ رتی کا ہوتا تھا۔ عالمگیری سیر ۷، تولہ کا تھا۔ محمد شاہ تغلق کے وقت کا سن ۱۲۱۴ سیر کا زمانہ زیر بحث میں بھی سیر ۲ تولہ دو ماشہ کا ہی ہوگا۔ بدلاؤنی نے جوار کی قیمت ۱۲ تنگہ لکھی ہے۔ غالباً یہاں فقری یا ملائی تنگہ سے مراد نہیں ہے بلکہ تنگہ سیاہ سے مراد ہوگی کیونکہ جوار ایک سستا غلہ ہے، فقری یا ملائی تنگہ کی صورت میں اس کے دام بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ کیوں کہ محمد تغلق کے قحط کے وقت بھی موجود روپیہ کی شرح میں، سیر چھٹا تنگہ قلعہ کے دام تین روپیہ چودہ آنہ سے بڑھ کر نہیں ہوئے تھے۔

لے قحط۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے قدیم ادوار میں بنگال کو چھوڑ کر عملاً پورا ہندوستان قحط سال اور اس کے نتائج سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ان قحطوں کے نتیجہ میں گزرت اموات بچوں کی فروخت، غلامی اور مردم خوری کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ بارہو سا دسویں صدی، نے ساحل کارو منڈل کے متعلق لکھا ہے "اگرچہ ملک میں ضروریات افراد کے ساتھ تھیں تاہم اگر بارش نہ ہو تو قحط کی بدولت سخت ہلاکت واقع ہوتی تھی اور بچے ایک ایک روپیہ سے کم دام پر بھی بکتے تھے" قحط سالی کے زمانہ میں ملا بار کے جہاز بھوکوں کے لیے خوراک لاتے تھے۔ اور بعد میں غلاموں کو بھر بھر کر لے جاتے تھے۔ بدایونی سے دس سال پہلے ایک سیاح کو ریانے بھی ساحلی علاقوں پر قحط سالی کی ہلاکت و تباہی کا نقشہ کھینچا ہے وہ بھی مردم خوری کا ذکر کرتا ہے۔ ۱۵۷۷ء کے قریب سیز فریڈرک گجرات میں بچوں کی فروخت کا ذکر کرتا ہے۔ لوگوں کی بسا اوقات کا انحصار موسم پر ہی تھا اور جب بارش نہیں ہوتی تھی قحط سالی اور معاشی تباہی اس کا لازمی نتیجہ تھی۔

کم کھاتے ہوئے دیکھتا تو اُسے گالیاں دے کر کہتا تھا "اے تُو آج اس سستی سے کھا رہا ہے کل اپنے منغل دامادوں سے کس طرح لڑے گا؟" افغانوں کا ستارہ بس ڈوبنے ہی والا تھا اس لیے ان کی غیرت و حمیت ایسی ماری گئی تھی کہ اس ناپاک کافر کی مغلظات پر کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ اپنی طبعی جہالت اور جنگ جوئی کو بالائے طاق رکھ کر اس کی گالیوں کو خوف یا لالچ کے مارے حلوہ کی طرح نگل لیتے تھے۔

بخدمت منہ دست بر پائے من

مرانان وہ و کفش بر سر برزن

**محمد خاں سور کی بغاوت** | ہیملو قلعہ بیانہ پر ابراہیم خاں کا محاصرہ کیے پڑا تھا کہ اسے خبر ملی کہ بنگالہ کے حاکم محمد خاں سور نے سلطان جلال الدین خطاب رکھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ

کر دیا ہے۔ اور جون پور تک کا علاقہ فتح کر کے اب آگرہ اور کالیسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ اسی اثناء میں عدلی کا فرمان بھی ہیملو کی طلبی کے لیے پہنچا کہ ایک طاقت ور دشمن سے مقابلہ آن پڑا ہے تم جلد آؤ۔ ہیملو نے قلعہ بیانہ سے محاصرہ اٹھایا اور فوراً ہی کوچ کر دیا۔ جب وہ آگرہ سے چھ کوس کے فاصلہ پر موضع منڈراگز میں پہنچا۔ ابراہیم نے قلعہ سے نکل کر ہیملو کی فوج پر حملہ کر دیا لیکن حسب معمول شکست کھا کر آلوہ کی طرف چلا گیا۔ وہ وہاں حاجی خاں سے مدد لے کر دوبارہ مقابلہ کی تیاری کرنا چاہتا تھا۔ ہیملو نے اس کے تعاقب پر اپنے بھتیجے تھریال کو کچھ فوج دے کر متعین کیا تھا۔ اس نے دو منزل تک اس کا تعاقب کیا اور پھر لوٹ کر اپنے لشکر میں آگیا۔ ابراہیم اور پہنچا تو حاجی خاں نہ تو اس کے آنے سے کچھ خوش ہوا اور نہ اس نے اسے کسی قسم کی مدد دی۔ وہاں سے مایوس ہو کر ابراہیم خاں لوٹ آیا اور اپنے باپ بھائیوں اور رشتہ داروں کو ہندوؤں میں چھوڑ کر ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ ٹھٹھہ چلے جانے کا ارادہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد حیدر خاں چٹنہ نے ابراہیم خاں کے باپ غازی خاں کو قول و قرار کر کے بیانہ میں بلایا۔ لیکن اس کے آنے پر عہد شکنی کی اور اسے اور اس کے خاندان کو قتل کر ڈالا۔ اس کے خاندان کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا۔

**ابراہیم خاں ٹھٹھہ میں** | ابراہیم خاں کو لوگوں میں ہر دل عزیز حاصل تھی۔ اس لیے بہت جلد اس کے پاس اچھا خاصا لشکر جمع ہو گیا۔ اس نے ٹھٹھہ کے حاکم رام چند پر حملہ کر دیا۔ لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار بھی ہو گیا۔ راجہ نے اس سے بڑا اچھا سلوک کیا اور زندہ داروں کے رواج کے مطابق اس کو گناہ نذرانے میں پیش کی اس کے لیے سرپردہ اور شاہی ساز و سامان مہیا کر دیا۔ وہ اس کو تخت پر بٹھا کر خود ملازموں کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ اس حال میں ابراہیم خاں کافی عرصہ تک ٹھٹھہ میں مقیم رہا۔

**حاکم مالوہ باز بہادر** | اسی دوران میں مالوہ کے حاکم باز بہادر کا پٹھانوں سے جھگڑا ہو گیا۔ پٹھانوں نے ابراہیم خاں کو اپنا سردار بنا کر باز بہادر سے مقابلہ کا ارادہ کیا۔ کرہ کنگتہ کی رانی درگاوتی بھی ابراہیم خاں

لے باز بہادر۔ یہ مانڈو کا بادشاہ تھا۔ مانڈو کی تاریخ دلاور خاں کے عہد حکومت سے شروع ہوتی ہے۔ اس نے تیمور کے حملہ کے بعد پٹھانوں سے خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ اس کا تعلق غور سے آئے ہوئے سرداروں سے تھا۔ اس نے دوبارہ کو اپنا پائے تخت بنایا تھا باقی حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

کی مدد کے لیے اپنی فوج لے کر آئی، باز بہادر نے رانی سے مصالحت کی بات چیت کر کے اسے ابراہیم کی مدد سے روک دیا اور وہ اپنے علاقہ کو واپس چلی گئی۔ ابراہیم بھی اس وقت مقابلہ کو خلاف مصلحت جان کر اوڑیسہ کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں کے زمینداروں کو اپنا حامی اور موافق بنالیا۔ اسی زمانہ میں سلیمان کرانی نے وہاں کے راجہ کو شکست دی تھی۔ اس نے بڑے قول و قرار کے بعد ابراہیم خاں کو اپنے پاس بلایا، پھر عمدہ شکنی کر کے اُسے قتل کر ڈالا۔

ابراہیم کا قتل ۱۵۵۷ء میں ہوا۔

جب ہیو شب و روز کوچ کرتا ہوا عدلی کے ہاں پہنچا تو اس وقت علی اور محمد خاں گور گوریوں سے لڑائی کا پی سے پندرہ کوس پر موضع چھپر کھٹہ میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے۔ دونوں فوجوں کے درمیان دریائے جنا حائل تھا۔ محمد خاں کافی ساز و سامان اور ایک بڑا لشکر لے کر آیا تھا۔ اس لیے

(بقیہ حاشیہ باز بہادر صفحہ گذشتہ) اس کے لڑکے اب خاں ہوٹنگ نے مانڈو کو دار الخلافہ بنا کر ایک شاندار شہر بنادیا۔ اس کے بعد محمود غوری تخت نشین ہوا۔ پھر محمود خلجی اس کا جانشین بنا، اس کے بعد غیاث الدین تخت پر بیٹھا۔ اس کی وفات پر غیاث الدین دوم نے حکومت کی۔ اس کے مرنے پر سلطان محمود دوم تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد ۱۵۳۲ء میں ہمایوں نے قلعہ مانڈو کو فتح کر لیا، ہمایوں کی شیر شام سے شکست پر بلو خاں ایک خلجی سردار نے قلا در شاہ کے لقب سے ۱۵۳۶ء میں حکومت کی اس کو شیر شاہ نے شکست دے کر اپنے ایک عزیز شجاع خاں کو مالوہ اور مانڈو کی حکومت دے دی۔ ۱۵۴۲ء تک وہ حکمران رہا۔ باز بہادر اسی شجاع خاں کا لڑکا تھا۔ اس کا اصل نام بایزید تھا۔ اس نے اپنے بھائی دولت خاں کو قتل کر کے سلطان باز بہادر اپنا خطاب رکھا اور ۱۵۶۳ء میں خود مختار حکومت قائم کی۔ یہ ایک دلاور بادشاہ تھا۔ پہلے پہل اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن آخر میں رانی درگاوتی کے ہاتھوں اسے ایسی شکست ہوئی کہ اس نے جنگ سے توبہ کر لی۔ اس زمانہ میں مالوہ موسیقی کا مرکز تھا۔ باز بہادر خود بھی اعلیٰ درجہ کا موسیقار تھا۔ اس کے اور روپ متی کے عشق کی داستانیں بڑی مشہور ہیں دسٹرائل ایم کروپ نے ایک فارسی نسخہ سے روپ متی کے حالات زندگی کا ترجمہ ”لیڈی آف دی لوٹس“ کے نام سے کیا ہے، کہتے ہیں باز بہادر ایک دن زبرد کے جنگل میں شکار کھیل رہا تھا وہاں برگد کے نیچے ایک ہندو دوشیزہ گامہ ہی تھی۔ اس کے حسن اور آواز نے بادشاہ کو مسحور کر لیا اور اس نے روپ متی کو اپنا بیٹا لینا چاہا۔ روپ متی نے اس کی التجا پر جواب دیا: ”جب زبرد مانڈو میں ہو کر رہے گی اس وقت میں تمہاری ہوجاؤں گی اس سے پہلے نہیں۔“ کہتے ہیں زبرد اور دیا کے دیوتا نے باز بہادر کی رہنمائی کی کہ مانڈو میں ہماری پاک ترس یعنی ایک چشمہ ہے اسی جگہ روپ کو رکھنا۔ بادشاہ نے وہ چشمہ تلاش کر لیا اور روپ متی سے شادی کر کے اس چشمہ پر تالاب بنوایا اور اس کے کنارے محل تعمیر کرایا۔ اسی تالاب کو ”ریوا کنڈ“ کہتے ہیں۔ لیکن جنوبی پہاڑ پر روپ متی کے نام کے جوشہ نشین ہیں ان پر لگے ہوئے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو پہلے بادشاہوں نے تعمیر کرایا تھا۔ باز بہادر نے ان میں اضافہ کیا ہے۔ ۱۵۶۵ء میں اکبر نے ابراہیم خاں کو مالوہ پر حملہ کرنے بھیجا۔ باز بہادر اس سے شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ روپ متی گرفتار ہو کر ابراہیم خاں کے پاس لائی گئی۔ مگر اس نے زبرد کھاکر خود کشی کر لی۔ ۱۵۷۱ء میں جب محمد خاں حاکم تھا باز بہادر نے خاندیس کے میراں مبارک خاں کی مدد سے پیر محمد کو شکست دی۔

۱۵۶۹ء میں عہدائے خاں نے حملہ کر کے باز بہادر کو گونڈ واٹھ کی پہاڑیوں میں بھگا دیا۔ اس نے میواڑ کے راجہ اودے سنگھ کے ہاں پناہ لی۔ وہاں سے گجرات چلا گیا۔ بعد میں اکبر نے اسے معاف کر کے دوبارہ اسی منصب عطا کیا۔

لڑائی میں اس کا پہلہ بھاری تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بس فتح ہونے ہی والی ہے۔ لیکن جیسے ہی ہیموڈم دار ستارہ کی طرح میدان جنگ میں وارد ہوا لڑائی کا پانسہ بدل گیا۔ ہیمو کے پہنچتے ہی لشکر نے خاصہ کے ہاتھیوں کے ذریعہ یاسانی جتنا کو عبور کر لیا اور گوریوں کے لشکر پر جو خواب غفلت میں تھے شب خون مارا۔ اس اچانک حملہ سے محمد خاں کے لشکر بدرجو اس ہو گئے۔ اور غنیم کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ اس معرکہ میں محمد خاں گور کے اکثر طرف دار امیر قتل ہو گئے، اور جو جان بچا کر بھاگ سکے بھاگ گئے۔ محمد خاں بھی وہاں سے بچ کر کسی طرف نکل گیا۔ اس کے بعد اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس کا سارا ساز و سامان ہیمو کو غنیمت میں مل گیا۔

اس فتح کے بعد عدلی نے چنہار میں جا کر قیام کیا۔ اور ہیمو کو بہت سا خزانہ بے شمار ہاتھی اور بڑی عدلی کی ہلاکت فوج دے کر مغلوں کے مقابلہ پر نامزد کیا جو آگرہ اور اناوہ تک پیش قدمی کر کے قبضہ کر چکے تھے۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے، اسی دوران میں محمد خاں گور کے بیٹے خضر خاں نے باپ کا جانشین بن کر اپنا خطاب سلطان محمد بہادر رکھا اور خطبہ و سکھ اپنے نام کا جاری کیا اور باپ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے ایک بھاری لشکر کو عدلی کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا۔ اس مقابلہ میں خلاف توقع عدلی نے بڑی بہادری دکھائی اور دایمردانگی دیتے ہوئے قتل ہو گیا عدلی کے قتل کا حادثہ ۹۶۲ھ میں ہوا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے :-

”گور یہ بکشت“

عدلی باعتبار حکمرانی کیسا ہی رہا ہو، فن موسیقی اور رقص میں بڑا ماہر تھا۔ چنانچہ تان سین عدلی بہ حیثیت موسیقار کلا نوت جو سارے ہندوستان میں اس فن کا استاد تھا اس کی شاگردی کا اقرار کیا کرتا تھا۔ سزاوول خاں کا لڑکا باز بہادر بھی اس فن میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا لیکن وہ بھی بڑے فخر سے کہا کرتا تھا۔ کہ میں نے یہ فن عدلی سے سیکھا ہے۔

ایک مرتبہ دکن کا ایک سازندہ ایک قد آدم بکھاوج لے کر آیا تھا، اس کی دونوں طرف کسی کے ہاتھ نہیں پہنچتے تھے اس لیے کوئی اس کو بجا نہیں سکتا تھا۔ یہ بکھاوج جب عدلی کی محفل میں آئی تو وہ اس کی ترکیب کو سمجھ گیا۔ اور تکیہ لگا کر ایک طرف ہاتھوں سے اور دوسری طرف پاؤں سے بجانے لگا۔ سب لوگ حیران رہ گئے اور اہل ہنر بے ساختہ داد دینے لگے۔

عدلی نے اپنے زمانہ امیری میں جب کہ وہ بیس ہزاری جاگیر دار تھا ایک بھگت لڑکے کو جو مجاہد خاں بھگت نہایت خوب صورت اور نازک اندام تھا اور اپنے فن میں بھی ماہر و کامل تھا، اپنے ہاں نوکر رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکا بدایوں کے کسی گاؤں سے عدلی کی محفل میں تماشہ دکھانے آیا تھا اور عدلی اس کی صورت اور سیرت پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ اس وقت اس نے اس بھگت کو مجاہد خاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد اس نے اس کو دس ہزار روپیہ کا منصب عطا کیا۔ یہ لڑکا اس قدر نازک مزاج تھا کہ ایک مرتبہ اجاؤن کے میدان میں چوگان کھیل کر لوٹا تو راستہ میں غازی خان سور کے ڈیرہ میں ٹھہر گیا اور کہا مجھے بھوک لگی ہے۔ غازی خان نے کہا آ جاؤ ماہر تیار ہے۔ لیکن جب



کھانا سامنے آیا تو قلبیہ کی جگہ سے ہی اسے غش آنے لگا۔ اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ اس کے طہارت خانہ میں اس قدر کافور ڈالا جاتا تھا کہ بھنگی روزانہ دو تین سیر کافور اٹھا کر لے جاتے تھے۔ حاجت سے فارغ ہونے کے بعد اس کا رنگ سرخ زرد اور سبز ہو جاتا تھا اور حالت غیر ہو جاتی تھی۔ اس نزاکت اور آرام طلبی کے باوجود وہ نماز کا بڑا پابند تھا۔ کبھی اس کی نماز اور روزہ قضا نہیں ہوا اور اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا۔

نیرنگی زمانہ کی کارستانیاں دیکھئے کہ جس وقت یہ نازک اندام رد کامرا اسے دو گز کفن تک نصیب نہ ہوا۔ اور اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ اس کی لاش کس خاک میں جا کر ملی۔

عدلی کے بعد ہی ہندوستان کی سلطنت پٹھانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغلوں کے خاندان میں منتقل ہو گئی۔

## ہمایوں کی ہندوستان کو واپسی

ہمایوں نے کابل کے راستہ دوسری بار ہندوستان پر حملہ کیا اور سکندر سے ایک سخت ردائی لڑ کر کامیابی حاصل کی۔ ان واقعات کو ہم مجملًا بیان کریں گے، جس وقت ہندوستان کی سلطنت ہمایوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس کے مجاہدوں میں باہمی اختلاف حد سے تجاوز کر گیا جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں تو ہمایوں نے پنجاب سے رخصت ہو جانا ہی مناسب جانا۔ ہندوستان سے نکل کر اس نے بکر کی تسخیر کا ارادہ کیا اور اس سے قریب قصبہ لوہری میں اپنی لشکرگاہ قائم کی۔ مرزا ہندال بھی سندھ سے نکل کر بکر سے پچاس کوس کے فاصلہ پر قصبہ پانتر میں غلہ کی ارزانی کے خیال سے جا ٹھہرا۔

یہاں پہنچنے کے بعد ہمایوں نے حاکم ٹھٹھہ میرزا شاہ حسین ارغون کے پاس خلعت اور گھوڑا روانہ کر کے یہ پیغام دیا کہ ”بعض ضرورتوں کی بنا پر یہاں آنا ہوا اور اب گجرات کی فتح کا مصمم ارادہ ہے۔ لیکن یہ ہم تمہارے مشورہ اور تعاون پر منحصر ہے۔“

میرزا شاہ حسین نے باتوں باتوں میں پانچ مہینے ٹال دیئے۔ اور جیلے بہانے کر کے خود بادشاہ کو بکر سے ٹھٹھہ آنے کی دعوت دی کہ بالمشافہ سارے معاملات پر گفتگو ہو سکے۔

حاکم ٹھٹھہ سے یہ مراسلت ۹۴۸ھ میں ہوئی تھی۔ اور اسی سال ہمایوں نے حمیدہ بانو بیگم سے نکاح کیا۔ **بکر کا معرکہ** اور وہاں سے پانتر چلا گیا اور پانتر سے سوہری پہنچا۔ مرزا ہندال قندھار کے حاکم قراچہ بیگ کے بلاوے پر اس کے پاس چلا گیا۔ یادگار ناصر مرزا نے بھی جو لشکر شاہی سے دس کوس پر ٹھہرا ہوا تھا۔ قندھار چلے جانے کی ٹھان لی۔ ہمایوں نے ایک بزرگ عالم مرزا ابوالبقار کو اس کے پاس بھیجا۔ اور اسے اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ جب ابوالبقار کشتی کے ذریعہ دریائے جہلم پر پہنچے، قلعہ بکر میں سے ایک گروہ نے باہر نکل کر ان کی کشتی پر تیر چلانے شروع کیے۔ ایک تیرا نہیں بھی لگا اور وہ جان بحق ہو گئے۔ ان کی شہادت کا واقعہ ۹۴۸ھ میں پیش آیا۔ جس کا مادہ تاریخ ”سرور کائنات“ ہے۔ مرزا یادگار ناصر نے نصیحت و مشورہ قبول نہ کیا اور بکر ہی میں ٹھہر گیا۔ اور بادشاہ نے ٹھٹھہ کا ارادہ کیا۔ لیکن شاہی لشکر کے بہت سے آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر مرزا یادگار کے پاس چلے گئے۔ اور مرزا کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ چوں کہ محاصل کی آمدنی بہت زیادہ تھی اس لیے یہ لوگ فارغ البالی سے بسر کر رہے تھے۔

لے ایک دوسرے نسخہ میں ہفصد و چل و ہشت ہے۔

ہمایوں نے دریا عبور کر کے قلعہ بکر کا محاصرہ کر لیا۔ محصورین کو مرزا حسین کی طرف سے برابر رسد پہنچ رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ خود بھی کشتیوں میں سوار ہو کر ہمایوں کے لشکر کی رسد کو روکنے لگا۔ شاہی فوج بلا برسات ماہ تک قلعہ کا محاصرہ کیے پڑی رہی لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ انہی دنوں شدت سے قحط بھی پڑ گیا اور اہل لشکر بھوکوں مرنے لگے۔ غلہ تو میسر نہیں ہوتا تھا، ناچار جانور ذبح کر کے کھاتے رہے۔ آخر جانور بھی ختم ہو گئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے بکر سے مرزا یادگار ناصر کو بلایا تاکہ اس سے مددے کروہ شاہ حسین کو پسپا کرے اور قلعہ کو فتح کرے۔ مرزا یادگار خود تو کمک کے لیے نہیں آیا البتہ تھوڑی سی مدد بھیج دی جس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔

مرزا یادگار کے اس رویہ کی وجہ یہ تھی کہ مرزا شاہ حسین نے اندر ہی اندر اس کو ورغلا یا تھا اور اس کو بادشاہ بنانے اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کر دینے کا بھی اقرار کیا تھا۔ مرزا اس کے جھانسون میں آگیا، علانیہ ہمایوں کا مخالف بن گیا اور شاہی لشکر کی تمام کشتیوں کو قبضہ میں لے لیا ان کارروائیوں سے ہمایوں محاصرہ اٹھالینے پر مجبور ہو گیا۔ واپسی کے لیے کافی دن تک کشتیاں نہیں ملیں۔ آخر دریا میں ان کی مدد سے ان کشتیوں کو جن کو مرزا یادگار نے غرق کر دیا تھا دریا سے نکلوا یا گیا اور وہ ان کے ذریعہ بکر پہنچا۔ یادگار ناصر اپنی حرکتوں کی وجہ سے بادشاہ سے ملتے ہوئے شرمسار ہوا تھا۔ اس نے اپنی شرمندگی کو مٹانے کے لیے شاہ حسین پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا اور بشرمندی ہمایوں کی خدمت میں شرمسار حاضر ہوا۔ غنیم کے بہت سے مقتولین کے سراپنی و ناداری دکھانے کے لیے پیش کیے۔ ہمایوں نے اس کے سابقہ قصور سب معاف کر دیئے۔ لیکن پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ یادگار ناصر نے شاہ حسین کے ورغلانے سے دوبارہ بادشاہ سے

لے قلعہ بکر۔ یہاں قلعہ بکر مراد ہے۔ ابن بطوطہ بھی اس جگہ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے ”یہ شہر بہت خوب صورت ہے۔ دریا کے سندھ کی ایک شاخ اس کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔ اس شاخ کے وسط میں ایک خانقاہ ہے۔ وہاں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔ اس خانقاہ کو کشلو خان (یہ حمد محمد تغلق) نے تیار کرایا تھا۔“ حال حال تک بھکر اس قلعہ کو کہا جاتا رہا ہے جو سکھر اور روڑی کے درمیان واقع ہے۔ روڑی اور قلعہ کے درمیان دریا کی شاخ چار سو گز چوڑی ہے۔ اور سکھر اور قلعہ کے درمیان اس کی چوڑائی دو سو گز ہے۔ ابن بطوطہ نے بھکر کے شہر کا جو ذکر کیا ہے وہ غالباً سکھر ہوگا۔ کیوں کہ روڑی کا شہر تو مشرق میں آباد ہوا۔ البتہ ایک قدیم شہر اور نام کا یہاں سے ۱۵ میل پر سندھ کے پرانے حکم پر واقع تھا۔ جہاں سے دریا بہت چکا ہے۔ ابن بطوطہ نے سکھر اور قلعہ دونوں کو ملا کر ایک شہر کہا ہے۔ کیونکہ سندھ کی شاخ انہی دونوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ کشلو خان کی خانقاہ خواجہ خضر کی خانقاہ کہلاتی ہے جو قلعہ کے شمال میں ایک علیحدہ جزیرہ پر ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے ”بھکر گزیں و زیست و آزاد رہن ناہا منصورہ نویند ہر شش دریا یکسانی گزیدہ ورتہ او گزرد و حصہ از جانب جنوب قلعہ و یک بخش از شمال باران کم شود و میوہ گزیں۔“ ابوالفضل نے بھکر کو ہی منصورہ لکھا ہے محمد بن قاسم کے وقت کا منصورہ جس کا ”فتوح البلدان“ میں ذکر ہے، حیدر آباد سندھ کے شہر سے قریب تھا جہاں اب قصبہ نصیر پور واقع ہے۔ بدایونی بھی بکر یا بھکر کے ساتھ دریا کا ذکر کرتا ہے۔ بہر حال قلعہ سے مراد یہی بھکر کا قلعہ ہے اور صرف ”بکر“ سے سکھر کا قدیم شہر یا سکھر کا نیا شہر ہاٹھی کے نیچے آباد ہوا ہے اور ضلع کا صدر مقام ہے۔

مخالفت کا ارادہ کیا۔ اس دوران میں منعم خاں بھی جسے بعد میں خان خاناں کا خطاب ملا تھا لشکر سے بھاگ نکلنے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن یہ دونوں اپنے ان ارادوں سے باز رہے۔

اس زمانہ میں مارواڑ کے راجہ مالدیو نے ہمایوں کے پاس متعدد عرفیہ لکھ کر اسے آنے کی دعوت دی۔ ہمایوں نے بھی ان حالات میں بکرا اور ٹھٹھہ کا قیام مناسب نہ جانا اور جیسلمیر کے راستہ مارواڑ چلا گیا۔ واپسی کے وقت راجہ جیسلمیر نے اس کا راستہ روکنا چاہا لیکن تھوڑی سی لڑائی کے بعد ہی وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گیا۔ جس جنگل سے لشکر گزر رہا تھا وہ ایسا بے آب و گیاہ صحرا تھا کہ پینے کے لیے سیلوں تک پانی کا قطرہ بھی نہیں ملا اور سارے لشکر والے بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی کنواں نظر آ جاتا تو سپاہی اس طرح ہجوم کرتے تھے کہ اچھا خاصا ذنگا فساد ہو جاتا تھا اور سپاہ کے مارے بہت سے تو کنویں میں کود پڑتے تھے۔ اور کنواں ان گرنے والوں سے پٹ جاتا تھا۔ ہمایوں نے اس حالت کو دیکھ کر یہ شعر کہا تھا

چناں زد چاک ہا گردوں لباس درد منداں را

کہ نے دست آستین می یابد و نہ سرگریاں را

بہ دقت تمام ہمایوں جیسلمیر کے صحرا کو عبور کر کے مارواڑ کے قریب پہنچا۔ اور اُنکے خاں کو راجہ مالدیو کے پاس بھیج کر اس کی واپسی کے انتظار میں جو دھپور میں ٹھہر گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ شیر شاہ نے ناگور پر قبضہ کر لیا تھا اور اس نے مالدیو کو ہمایوں کی مدد کرنے پر بہت ڈرایا دھمکایا تھا۔ اس لیے مالدیو ہمایوں کو بلا کر سخت پریشان اور ہشیمان تھا۔ اس نے اُنکے خاں کو عذر چیلے کر کے اپنے پاس کچھ عرصہ تک روک رکھا۔ آخر کار ایک فوج استقبال کے ہمارے ہمایوں کو گرفتار کر کے لانے کے لیے بھیج دی۔ اُنکے خاں راجہ کے ارادوں کو تاڑ گیا تھا۔ چنانچہ وہ اجازت لیے بغیری کوچ کر کے لشکر میں پہنچ گیا۔ اور ہمایوں کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا۔ ہمایوں نے فوراً ہی امر کوٹ کی طرف کوچ کر دیا۔ اسی منزل میں مالدیو کے دو جاسوس بھی لشکر گاہ میں داخل ہو گئے تھے۔ جب وہ پکڑے گئے تو بادشاہ نے ان دونوں کے قتل کا حکم دیا۔ ان دونوں میں سے ایک کے پاس چھری تھی اور ایک کے پاس خنجر۔ چونکہ دونوں جان سے مایوس ہو گئے تھے اس لیے نڈر ہو کر انہوں نے حملہ کر دیا۔ مرد عورت گھوڑا خنجر جو اُن کے سامنے آیا اسے قتل کرنا شروع کر دیا اس طرح ان کے ہاتھوں بہت سے آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس ہنگامہ میں ہمایوں کا گھوڑا بھی ہلاک ہو گیا۔ ہمایوں نے سواری کے لیے تری دی بیگ سے دو تین گھوڑے اور اونٹ مانگے۔ اس نے اس موقع پر بڑی کنجوسی دکھائی اور سواری کے لیے کوئی جانور نہ دیا۔ مجبوراً ہمایوں ایک اونٹ پر سوار ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ندیم کو کہ سے نہ رہا گیا۔ اور اس نے وہ گھوڑا جس پر اس کی ماں سوار تھی بادشاہ کو دے دیا۔ اور اپنی ماں کو ہمایوں کے اونٹ پر سوار کرا دیا۔ وہ خود اس تپتے

لے اس وقت جیسلمیر کا راجہ راول موہن کرن تھا۔ ۱۵۵۷ء میں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ راجہ نے کنوؤں میں ریت بھرادی تھی تاکہ شاہی لشکر پریشان ہو جب ہمایوں جیسلمیر کے تالاب پر پہنچا تو راجہ موتوں نے پانی لینے سے روکا۔ لشکر والوں نے حملہ کر کے انہیں بھگا دیا۔



ہوئے ریگستان میں جو آگ کا تور بنا ہوا تھا پیدل ہی سفر کرتا رہا۔ اس سفر کی یہ منزل بڑی کٹھن گزری۔ کیونکہ مالدیو کی آمد کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ اس پریشان حال قافلہ نے ایک محفوظ جگہ دیکھ کر رات بسر کی۔

**ہمایوں کی صحرا نوردی** | پوری رات مالدیو کے سپاہی ان کی تلاش میں جنگل میں بھٹکتے رہے۔ جب صبح ہوئی اور کوچ کیا گیا تو اتفاق سے ہمایوں اپنے بائیس آدمیوں کے ساتھ جن میں منعم خاں اور روشن بیگ کو کہ بھی شامل تھا شکر سے کٹ کر جدا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں مالدیو کی فوج کا ایک دستہ ان کے سر پر آپہنچا۔ ان بائیس آدمیوں نے بڑی ہمت کے ساتھ مقابلہ کا عزم کر لیا۔ پہلے ہی حملہ میں ہندو سردار کو ایسا تیر لگا کہ وہ اسی وقت گر کر ختم ہو گیا۔ اس کی ہلاکت سے بھگدڑ سی مچ گئی اور بہت سے ہندو مارے گئے۔ اس فتح سے ہمایوں کو کسی قدر اطمینان حاصل ہوا۔ غنیمت میں بہت سے اونٹ بھی ہاتھ آ گئے تھے۔ یہاں سے ہمایوں نے بہت سا پانی لشکر میں ذخیرہ کرایا اور آگے بڑھا۔

تیسرے دن ایک مقام پر پہنچے۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ لیکن پانی بہت زیادہ گہرائی میں تھا۔ لشکریوں کو تین منزل تک پانی نہیں ملا تھا۔ پیاس کے مارے ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اب جو پانی ملا تو حرص کے مارے سب نے اتنا پی لیا کہ بہت سے آدمی گھوڑے اور اونٹ مر گئے۔ بیابان ایسا لوق و دق تھا کہ اس کی انتہا حد خیال سے بھی پرے معلوم ہو رہی تھی۔ مجبوراً ہمایوں نے امرکوٹ چلے جانے کا فیصلہ کیا جو ٹھٹھ سے سو کو س کے فاصلہ پر ہے۔

**امرکوٹ میں قیام** | امرکوٹ کا راجہ رانا نامی اپنے بیٹوں کے ساتھ استقبال کے لیے آیا اور ہمایوں کی بڑی خاطر تواضع کی۔ یہاں پہنچ کر ہمایوں کو قدرے سکون نصیب ہوا۔ اس نے خزانہ کا منہ کھول دیا اور جو کچھ روپیہ اور مال تھا وہ سب لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ جن کو نہ مل سکا انہیں ہمایوں نے تردی بیگ وغیرہ سے قرض لے کر دیا۔ کافی زر نقد کمرٹپے اور خیر رانا کے بیٹوں کو انعام میں عطا کیے۔ رانا کے باپ کو مرزا شاہ حسین ارغون نے قتل کر دیا تھا۔ اس انتقام کے لیے رانا نے ایک بڑی جمعیت فراہم کی اور ہمایوں کو اس پر فوج کشی کی ترغیب دی۔ ہمایوں نے اپنا سارا ساز و سامان بیگم بادشاہ کے بھائی خواجہ معظم کی تحویل میں دے کر امرکوٹ میں چھوڑ دیا اور خود بکری کی طرف کوچ کر گیا۔

**اکبر کی ولادت** | امرکوٹ میں بروز اتوار ۵ رجب ۹۷۹ھ کو شاہزادہ اکبر پیدا ہوا۔ تردی بیگ نے اسی منزل میں ہمایوں کو فرزند کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ ہمایوں نے بچہ کا نام اکبر رکھا اور جب وہ مقام چول میں پہنچا تو بیٹے کو بلو کر اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کیں۔ اس سفر میں ہمایوں کے لشکر میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ ایک ایک کر کے لوگ لشکر سے کھٹکتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ منعم خاں بھی ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ انہی دنوں گجرات سے بیرم خاں آ کر لشکر ہمایوں میں شامل ہو گیا۔

ان پریشان کن حالات میں ہمایوں نے ہندوستان میں مزید قیام مناسب نہ جانا اور قندھار جانے کا مصمم ارادہ کر لیا

اور مرزا شاہ حسین سے اس سفر کے لیے کچھ کشتیاں اور اونٹ مانگے۔ اس نے بھی ہمایوں کے ٹل جانے کو غنیمت جانا اور فوراً تیس کشتیوں اور تین سو اونٹوں کا انتظام کر دیا اور ہمایوں سندھ عبور کر کے ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔

**بھائیوں کی سازش** | اس زمانہ میں مرزا کامران نے قندھار مرزا ہندال سے چھین کر مرزا عسکری کے حوالہ کر دیا تھا اور اس کے بجائے مرزا ہندال کو غزنی کی حکومت دے دی تھی۔ چند روز بعد مرزا ہندال کو بھی قندھار سے علیحدہ کر دیا تھا اور مرزا ہندال نے امور سلطنت سے دست بردار ہو کر کابل میں درویشی اختیار کر لی تھی جس وقت ہمایوں قندھار کی طرف چلا، مرزا کامران نے شاہ حسین کے بہکانے سے مرزا عسکری کو لکھا کہ ”ہمایوں قندھار کی طرف آ رہا ہے جس طرح ممکن ہو اسے گرفتار کرو۔“ جب ہمایوں مقام شال مشانگ میں پہنچا تو مرزا عسکری نے اس کا راستہ روکنے کے لیے کوچ کیا۔ اور ہمایوں کے لشکر کی مخبری کے لیے ایک اوزبک چوٹی بہادر نامی کو متعین کیا۔ چوٹی بہادر نے آدھی رات کے وقت بادشاہ کے لشکر میں آکر بیرم خاں کو سارے حالات سے مطلع کر دیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت شاہی سراپردہ کے پیچھے پہنچ کر ہمایوں کو تمام کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ بھائیوں کی اس سازش کی وجہ سے ہمایوں نے کابل اور قندھار کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور صرف بائیس آدمیوں کو ساتھ لے کر جن میں بیرم خاں اور خواجہ معظم بھی شامل تھے عراق کا ارادہ کیا۔ بیرم خاں اور خواجہ معظم دونوں کو ہمایوں نے بیگم بادشاہ اور شاہزادہ اکبر کو لانے کے لیے رخصت کر دیا۔ اس وقت ہمایوں نے تردی بیگ سے چند گھوڑے طلب کیے۔ بیگ نے بخل سے کام لے کر نہ صرف یہ کہ گھوڑے نہیں دیئے بلکہ ہمایوں کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔

**اکبر کی گرفتاری** | شہزادہ اکبر کی عمر اس وقت صرف ایک سال کی تھی۔ ان دنوں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اور راستہ میں پانی نہ ملنے کا بھی خطرہ تھا۔ اس لیے ہمایوں نے شہزادہ کو آنکھ خاں کے سپرد کر کے لشکر گاہ میں ہی چھوڑ دیا۔ اور بادشاہ بیگم کو اپنے ہمراہ لے کر رخصت ہو گیا۔ ہمایوں کے جاتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس کے لشکر کو لوٹ لیا اور تردی بیگ کو گرفتار کر لیا۔ شہزادہ اکبر کو بھی اپنے ساتھ قندھار لے جا کر اپنی بیوی سلطان بیگم کے سپرد کر دیا۔ یہ واقعات مشہور ہوئے۔

**ہمایوں طہماسپ کی پناہ میں** | اس سفر میں بھی ہمایوں کو عجیب و غریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور وہ بہ ہزار وقت سیستان سے نکل کر خراسان پہنچا۔ جہاں شاہ طہماسپ کے بڑے بیٹے سلطان محمد مرزا سے ملاقات کی اور وہاں بادشاہی ساز و سامان اور اسباب سفر مہیا کر کے مشہد مقدس روانہ ہوا۔ شاہ طہماسپ کے حکم سے ہر منزل میں مقامی حکام ہمایوں کے استقبال کے لیے آتے تھے۔ اور اس کی دعوت و خاطر دار کا انتظام کرتے تھے۔

ہمایوں نے پہلے ہی شاہ طہماسپ کی خدمت میں بیرم خاں کو روانہ کر دیا تھا۔ اس کے ذریعہ طہماسپ نے ہمایوں کے نام خوش آمدید کا ایک خط ارسال کیا تھا۔ غرض بمقام شلاق سورتنی ان دونوں بادشاہوں کی ملاقات ہوئی۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ دوران گفتگو طہماسپ نے ہمایوں سے شکست کا سبب دریافت کیا۔ تو اس نے بتایا کہ

اصل وجہ بھائیوں کی مخالفت ہے۔ اس وقت طہماسپ کا بھائی بہرام میرزا بھی موجود تھا۔ ہمایوں کی یہ بات اُسے بُری لگی اور وہ اس وقت سے ہمایوں کا دشمن بن گیا۔ اس نے طہماسپ سے کہا کہ ”یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے اوزبکوں کے مقابلہ میں کئی ہزار قزلباشوں کو اپنے ہمراہ لے جا کر ہلاک کر دیا تھا۔“

اس کا اشارہ اصل میں اس واقعہ کی طرف تھا۔ جب کہ بابر نے شاہ اسمعیل نجم اول سے سترہ ہزار قزلباش سوار اوزبکوں کے خلاف رونے کے لیے حاصل کیے تھے۔ اس مہم میں جب اس نے قلعہ خشک عرف کش کا محاصرہ کیا تھا تو ایک تیر پر یہ شعر لکھ کر قلعہ میں بھیجا تھا۔

صرف راہ از بکاں کر دیم نجم شاہ را

گر گنا ہے کردہ بودم پاک کردم راہ را

دوسرے دن جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو اوزبکوں کے مقابلہ پر قزلباشوں کو چھوڑ کر بابر علیحدہ ہو گیا تھا۔ قزلباشوں کا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔

طہماسپ کے بھائی نے ہمایوں کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ لیکن خوش قسمتی سے طہماسپ کی بہن نے جس کو امام ہمدی کی تدریس میں پیش کرنے کی غرض سے ابھی تک بیاہا نہیں گیا تھا جو نہایت مدبر اور دانش مند خاتون تھی اور تمام امور سلطنت اس کی رائے سے سرانجام پاتے تھے ہمایوں کی بڑی حمایت اور سفارش کی۔ ہمایوں نے طہماسپ کے پاس ایک رباعی لکھ کر بھیجی جس کا آخری شعر تھا

شاہان ہمہ سایہ ہماے خواہند

بنگر کہ ہما آمدہ در سایہ تو

سلمان کے ایک قطعہ پر تضمین بھی لکھ کر بھیجی

از خدا امید دارم شاہ باما آں کند

آنچہ با سلمان علی در دشت رزن کردہ است

یہ اشعار طہماسپ کو بہت پسند آئے۔ اس پر بہن کی حمایت اور سفارش کہ اس نے بڑے معقول دلائل سے بادشاہ کو ہمایوں کی حمایت اور اعانت پر آمادہ کر دیا تھا۔ غرض طہماسپ نے خوش ہو کر بڑے جشن منعقد کرائے اور ہمایوں کے لیے شاہانہ ساز و سامان تیار کر دیا اور اسے شیعہ مذہب قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس مسئلہ پر ہمایوں سے بڑے مباحثے ہوتے رہے۔ آخر ہمایوں نے کہا ”اپنے سارے عقائد ایک کاغذ پر لکھ کر لاؤ۔“ جب بادشاہ کے آدمی وہ لکھ لائے تو ہمایوں نے اس کاغذ کے مضمون کو پڑھ کر سنا دیا، اور خطبہ میں شیعہوں کے مسلک کے مطابق بارہ اماموں کے نام بھی دہرائیے۔

ان تکلفات کے بعد طہماسپ نے دس ہزار سواروں کو اپنے بیٹے شاہ مراد کی سرکردگی میں ہمایوں کی ہمایوں کی مدد کے لیے متعین کر دیا۔ شاہ مراد چونکہ شیر خوار لڑکا تھا اس لیے بدراغ خاں قزلباش کو اس کا

اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ قزلباش اور ہمایوں جدا جدا راستوں سے جا کر قندھار پر حملہ کریں اور جب قندھار فتح ہو جائے تو اسے شاہ مراد کے قبضہ میں دے دیا جائے۔

غرض ہمایوں طہاسپ سے رخصت ہو کر اردبیل اور تبریز کی سیر کرتے ہوئے تنہا مشہد پہنچا۔ ایک مرتبہ کے وقت اکیلا وہ روضہ مبارک میں گھوم رہا تھا کہ اسے دیکھ کر ایک زائر نے دوسرے سے چپکے سے پوچھا "کیا ہمایوں بادشاہ یہی ہے؟ دوسرے نے کہا "ہاں" پہلے زائر نے ہمایوں کے قریب ہو کر اس کے کان میں کہا "اب بھی خدائی کا دعوے کرے گا؟" اس کا اشارہ اس طرز عمل کی طرف تھا جو ہمایوں نے بنگال میں اختیار کیا تھا۔ وہاں وہ چہرہ پر نقاب ڈالا کرتا تھا۔ جب نقاب اٹھاتا تھا تو لوگ کہتے تھے "تجلی ہو گئی"۔ جب کسی معرکہ کے بعد تلوار کو دریا میں دھونتا تھا تو فخر یہ کہا کرتا تھا "اب ہماری تلوار کا کون مقابل بن سکتا ہے"۔ وہاں سے آگرہ پہنچنے کے بعد اپنی تعظیم کے لیے زمین بوسی کی رسم شروع کرادی تھی۔ آخر امیر ابوالبقار اور دوسرے امیروں اور وزیروں نے تعظیم و تسلیم کے عام طریقہ کو بحال کرادیا۔

**قزلباشوں کی بلغار** | حسب قرار داد قزلباش سرداروں نے تمام گرم سیر علاقوں پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا۔ جب وہ قندھار کے سامنے پڑاؤ ڈالے پڑے تھے تو ہمایوں بھی پانچ دن بعد وہاں پہنچ گیا۔ مرزا عسکری محصور ہو گیا تھا۔ قزلباشوں سے اس کی برابر تین ماہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ دونوں طرف کے بہت سے آدمی ان مقابلوں میں مارے گئے۔ اسی اثنا میں ہمایوں نے بیرم خاں کو ایچی بنا کر کابل کی طرف مرزا سلمان بدخشی اور مرزا یادگار ناصر کے پاس بھیجا۔ یادگار ناصر بکر سے پریشان ہو کھوہاں پہنچ گیا تھا۔

**قندھار کی فتح** | قزلباشوں کو پہلے یہ خوش گمانی تھی کہ ہمارے جاتے ہی چغتائی امیر ڈر جائیں گے اور اطاعت قبول کر لیں گے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ محاصرہ برابر طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس دوران میں کافی آدمی ہلاک ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں عسکری کی مدد کے لیے مرزا کامران کے آنے کی خبر بھی اڑ رہی ہے تو وہ بد دل سے ہو گئے اور واپس ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ قزلباش چلے جاتے لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ بعض امیر جیسے محمد سلطان مرزا الغ مرزا اور میرزا حسین خاں وغیرہ کامران سے ناراض ہو کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ موید بیگ بھی جو قلعہ قندھار میں قید تھا کسی طرح چھوٹ کر بادشاہ کے پاس آگیا۔ ہمایوں نے اس پر خاص طور سے بری عنایت کی۔ مرزا عسکری نے جب لوگوں کو اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ہمایوں کے پاس جاتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا اور خود بھی امان طلب کر کے حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کے قصور معاف کر دیئے کہ وہ

در عفو لذتی ست کہ در انتقام نیست

صورت حال کی اس تبدیلی کے بعد ہمایوں نے قزلباشوں سے کہا کہ چغتائی لشکر کے اہل و عیال اور شہر کے باشندے سب تین دن تک کوئی تعرض نہ کرو تا کہ وہ سب شہر سے نکل جائیں۔ اس وقت ہمایوں کے قبضہ میں کوئی ملک نہیں تھا۔ لیکن مذکورہ معاہدہ کے مطابق وہ بد اخ خاں اور مرزا مراد کو قلعہ قندھار میں بے کر گیا۔ اور وہ سارا علاقہ ان کے



الہ کر دیا۔ فتح قندھار کے بعد اکثر قزلباش امیر عراق لوٹ گئے۔ مرزا مراد کے ساتھ بدراغ خاں کے علاوہ چار اور امیر رہ گئے۔

جب سردیوں کا موسم شروع ہوا تو ہمایوں نے اپنے لشکر کے امراء کے لیے بدراغ خاں سے کسی محفوظ مقام کے لیے کامطالبہ کیا۔ اس نامعقول شخص نے اس کے جواب میں نامناسب باتیں کہیں۔ اس اختلاف کی جب خبر پھیلی، چغتائی امیر ڈر کر ہمایوں کے لشکر سے نکل بھاگے۔ ان میں مرزا عسکری بھی شامل تھا۔ لیکن اسے راستہ ہی میں گرفتار کیا گیا اور ہمایوں نے اسے قید میں ڈال دیا۔

ہمایوں سے قزلباشوں کے اس اختلاف کے بعد متعدد ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ قندھار قزلباشوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اول تو یہ کہ چغتائی امراء نے ہمایوں کو مشورہ دیا کہ سردیاں گزارنے کے لیے فی الحال قزلباشوں سے قندھار ہٹ لیا جائے اور جب کابل و بدخشاں فتح ہو جائیں تو ان کو اس سے زیادہ علاقہ بطور تلافی عطا کر دیا جائے۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہوا کہ قزلباشوں کے شیرخوار شہزادہ میرزا مراد کا اسی اشار میں انتقال ہو گیا۔ تیسرا سبب قزلباشوں سے لوگوں کی وہ عام ناراضی تھی جو انہوں نے شہر والوں پر مظالم ڈھا کر اور چغتائی ار پر قلعہ میں داخلہ بند کر کے مول لی تھی۔

چوتھا سبب وہ ہنگامہ تھا جو اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ واقعہ اس طرح رونما ہوا کہ ایک مرتبہ ایک رافضی یادگار ناصر مرزا کے سامنے جو ہندال مرزا قزلباشوں پر حملہ کو ساتھ لے کر کامران کے پاس سے یہاں بھاگ آیا تھا، اپنی عادت کے مطابق صحابہ پر تبر کرنے لگا۔ یادگار ناصر یہ گستاخی برداشت نہ کر سکا اور اس نے رافضی کو ایسا تیر مارا کہ وہ اس کا سینہ توڑ کر نکل گیا اور وہ اسی وقت مر گیا۔ اس وقت حاجی محمد خاں کو کی اپنے دونوں کروں کے ہمراہ بار برداری کے اونٹ لے کر سدینے کے ہانے قلعہ داخل ہوا۔ اور دروازہ کے محافظوں پر حملہ کر کے انہیں قتل کرنے لگا۔ اس کی مدد کے لیے دوسرے بہت سے چغتائی امیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان حملہ آوروں میں بالغ بگ اور بیرم خاں بھی شامل تھا۔ اس اچانک حملہ سے قزلباشوں کو اس ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور قلعہ میں چغتائی لشکر سی داخل ہو گئے۔ قزلباشوں کی ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ جب ہمایوں بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا تو بدراغ خاں کو سخت مضطرب اور پریشان دیکھا۔ اسے جلد ہی عراق کی طرف رخصت کر دیا۔ قندھار کے شہریوں نے بہت سے قزلباشوں کو گلی کوچوں میں گھیر گھیر کر قتل کر دیا۔

قندھار پر قبضہ کے بعد ہمایوں نے وہاں کی حکومت بیرم خاں کے حوالہ کر کے کابل کی طرف کوچ کر دیا۔ ہمایوں کے مقابلہ میں مرزا کامران بھی آگے بڑھ کر مقابل ہوا۔ لیکن یہ حال تھا کہ اس کے لشکر میں سے

روزی ایک دو نامی گرامی امیر بھاگ کر ہمایوں کے سایہ میں آ جاتے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مرزا کامران کے ہاتھ پر ہول گئے۔ اور اس نے بہت سے علماء اور مشائخین کو واسطہ بنا کر بجائی سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی۔ ہمایوں نے

اس شرط پر کہ وہ لشکر شاہی میں حاضر ہو جائے اس کے سارے قصور معاف کر دیئے۔ مگر کامران کے دل میں چور تھا۔ اس لیے وہ ہمایوں کے سامنے آتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ چنانچہ بجائے حاضر ہونے کے وہ کابل کے قلعہ میں محصور ہو گیا اور وہاں سے راتوں رات غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی ساری فوج لشکر شاہی میں ضم کر لی گئی۔ بادشاہ نے کامران کے تعاقب میں تو مرزا ہندال کو روانہ کیا اور خود شہر کابل میں داخل ہوا۔ اور ایک مدت بعد اپنے چیتے شہزادے اکبر کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں۔

کابل کی فتح ۱۰ رمضان ۹۵۲ھ کو ہوئی۔ اس کا مادہ تاریخ ہے۔

”بے جنگ گرفت ملک کابل از دے“

ہمایوں کی یلغار کے سامنے کامران کے قدم غزنی میں بھی ٹک نہ سکے۔ اور وہ جلد ہی بھکر کی طرف بھاگ گیا۔ مرزا شاہ حسین نے جس کی بیٹی کامران کے نکاح میں تھی اس کی مدد کی۔ اس موقع پر مرزا یادگار ناصر بھی فرار ہو جانے کی فکر میں تھا۔ ہمایوں کو جب اس کے ازادوں کی خبر ہوئی تو اس نے اسے قتل کرادیا۔

ہمایوں نے کابل سے بدخشاں کی تسخیر کے ارادہ سے کوچ کیا۔ وہاں سلیمان مرزا سے مقابلہ ہوا۔ وہ کچھ عرصہ تک لڑتا رہا۔ آخر شکست کھا کر پسا ہو گیا۔ اس دوران میں کابل کو خالی پا کر کامران نے فوج کشی کی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ اور ہمایوں کی بیگمات اور شاہزادہ اکبر کو قید کر لیا۔

ہمایوں نے بدخشاں کی حکومت مرزا ہندال کو دی تھی۔ بعد میں اس سے لے کر کامران سے آخری جنگ دوبارہ مرزا سلیمان کے حوالہ کر دی۔ اور خود نہایت تیزی سے کابل کی طرف

لوٹ گیا۔ کابل سے باہر کامران کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ پسا ہو کر قلعہ میں محصور ہو گیا۔ سخت محاصرہ کی وجہ سے اس کے حالات نہایت اتر ہو گئے۔ اس دوران میں اس نے انتہائی سنگ دلی سے کام لے کر چند بار شہزادہ اکبر کو قلعہ کے اُس کنگرہ پر جو بندو قوں اور توپوں کا نشانہ تھا بٹھا دیا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ اکبر کی جان ہر بار سلامت ہی رہی۔

دونوں بھائیوں کی اس لڑائی میں منافق امیروں اور سرداروں کی سرگرمیاں بس دیکھنے کے لائق تھیں۔ وہ کبھی اس طرف ہو جاتے تو کبھی دوسرے کے جھنڈے تلے پہنچ جاتے تھے۔ اس معرکہ میں دونوں طرف سے بہت سارے آدمی ہلاک ہوئے۔ جب کامران ہر طرح مجبور ہو گیا تو بھیس بدل کر قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس کے تعاقب پر حاجی محمد خاں ایک جمعیت کے ساتھ نامزد کیا گیا تھا۔ جب وہ تعاقب کرتے ہوئے مرزا کے قریب پہنچا تو کامران نے اس سے کہا ”تیرے باپ بابا قشقہ کو کیا میں نے ہی قتل کیا تھا؟“ حاجی محمد خاں کہیں سال تجربہ کار سپاہی تھا۔ یہ فقرہ سن کر اس نے کامران کو نکل جانے دیا اور واپس ہو گیا۔ کامران کے فرار کے بعد شہزادہ اکبر صحیح سلامت باپ کو مل گیا۔

کامران مرزا نے یہاں سے بھاگ کر حاکم بلخ پیر محمد کے پاس پناہ لی اور اس سے مدد لے کر بغیر لڑے بھڑے سلیمان مرزا اور اس کے بیٹے ابراہیم مرزا سے بدخشاں کے بعض علاقے چھین لیے۔ اسی زمانہ میں قراچہ بیگ نے جو ان خاص

ت میں نمایاں کارنامے انجام دے چکا تھا، بعض احمق امیروں کے ساتھ مل کر بادشاہ سے نامناسب مطالبے کرنے لگا۔ جب ان امیروں کی غرض پوری نہ ہوئی تو یہ بدخشاں کو چلے گئے۔  
ان چند برسوں میں کابل شورشوں اور انقلابات کا مرکز بنا رہا۔ چنانچہ ایک طرف نے اس سلسلہ میں یہ شعر کہہ کر  
حق اُڑایا ہے۔

قلعہ کابل کہ در رفعت نہ کیوان برتر است  
چوں غیو ازی کہ شش ماہ مادہ و شش ماہ زہت

اس دوران میں ایک سے زیادہ مرتبہ مرزا کامران نے مخالفت اختیار کی اور ہر مرتبہ حاضر ہو کر  
مران کی عمد شکنی | معافی چاہی۔ ہمایوں نہایت بامروت شخص تھا۔ اس نے ہر مرتبہ بھائی کے قصور کو معاف  
دیا۔ اور اپنا دل اس کی طرف سے صاف کر لیا۔ آخر میں کامران نے خود حاضر ہو کر مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت  
ب کی۔ لیکن ہمایوں نے اس کی درخواست قبول نہ کی اور اسے بدخشاں کی حکومت پر مامور کر کے خود بلخ کی طرف  
لے کر گیا۔ وہاں پیر محمد اور شاہ اوزبک عبداللہ خاں کے روئے کے عبدالعزیز خاں کو شکست دی۔ اس کے اپنے  
بروں میں اس وقت بڑی محاسنت پیدا ہو گئی تھی اور کامران کی طرف سے بھی دل مطمئن نہیں تھا۔ اس لیے ہمایوں  
ان سے جلد ہی کابل لوٹ آیا۔

کامران نے حسب عادت پھر عمد شکنی کی لیکن شکست کھا کر ہندوستان میں سلیم شاہ کے پاس  
مران کی وفات | مدد لینے کے لیے بھاگ گیا۔ یہاں سے بھی اسے مایوس ہو کر واپس ہونا پڑا۔ واپسی کے وقت  
آدم کھڑکے ذریعہ گرفتار ہو کر ہمایوں کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ ہمایوں نے اس کی جان بخشی تو کردی لیکن اسے  
رہا کر دیا۔ اس قصہ کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ کچھ عرصہ بعد کامران ہجرت کر کے مکہ کو چلا گیا۔ وہاں اس نے چار  
کیے اور اسی جگہ فوت ہوا۔ مولانا قاسم کاہنی نے اس کی تاریخ وفات لکھی ہے۔

کامران آنکہ بادشاہ ہے را کس ندیدست بچو اور در خود  
شد نہ کابل بہ کعبہ و آنجا جاں بحق داد تن بجاک سپرد  
گفت تاریخ او چہیں کاہی بادشہ کامران بہ کعبہ مرد

اسی کے متعلق ویسی شاعر کی تاریخ ہے۔

قاسم کاہنی۔ عرف کالے میاں تھا۔ ہمایوں کے عہد میں کابل سے ہند آئے تھے۔ تفسیر کلام، تصوف، ہنیت، موسیقی اور شاعری میں کمال حاصل تھا  
شاعری میں سادگی اور موسیقیت تھی۔ ہمایوں کی وفات پر ایک قطعہ بڑا مشہور ہے یہ ان کاہنی ہے جس کا مشہور شعر ہے۔

پے تاریخ اود کاہی رقم دو ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

کابلی نے بوستان کے جواب میں ایک مثنوی گل افشاں بھی لکھی ہے۔

ہمایوں کا درباری امیر اور سخن سنج شاعر تھا۔ اس کے گھر پر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں جہاں نامور شعرا جمع ہوا کرتے تھے۔

شہ کا مران خسرو نامدار کہ در سلطنت سر بکھیاں رساند  
مجاور شد اندر حرم چار سال بکل دل از قید عالم رہا نہ  
ز بعد وقوف حج چار میں با حرام حج جاں بجاناں فشانہ  
چو در خواب ویسی در آمد شبے عنایت نمود و سوے خوش خواند  
بگفت او پر سنت از قوت ما بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند

مرزا کا مران نہایت باہمت، بہادر، سخی، خوش مزاج اور خوش اعتقاد تھا۔ ہمیشہ اس کی صحبتوں میں علماء اور فضلاء حاضر رہتے تھے۔ خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کے شعر کافی مشہور ہیں۔ ایک زمانہ میں ایسا پرہیزگار ہو گیا تھا کہ اپنے ملک میں انگور کی کاشت تک کی ممانعت کرا دی تھی۔ اگرچہ بعد میں خود بھی بکثرت سے نوشی کرنے لگا تھا۔ آخر میں تمام باتوں سے توبہ کر کے نہایت پارسائی کی حالت میں انتقال کیا۔ اس کی وفات ۱۲۹۲ھ میں ہوئی۔

کابل کی آخری لڑائی میں قراچہ خاں مارا گیا اور مرزا عسکری گرفتار ہو گیا۔ خواجہ جلال محمود دیوان نے اسے بدخشاں لے جا کر زاسلیمان کے والہ کر دیا۔ وہاں چند روز قید میں رہنے کے بعد اسے رہائی ملی۔ مرزا سلیمان نے بعد میں اسے بلخ بھیج دیا تھا۔ وہاں سے وہ مکہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ لیکن شام اور مکہ کے درمیانی جنگل میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وفات کا مادہ تاریخ ہے۔

”عسکری بادشاہ دریادل“

مرزا ہندال کا انجام یہ ہوا کہ جب کا مران نے آخری بار شکست کھائی اور ہندوستان میں جا کر ہندال کا قتل پٹھانوں کے پاس پناہ لی۔ اسی دوران میں کسی موقع پر کا مران نے ہندال کے لشکر پر شب خون مارا تھا اور وہ اسی معرکہ میں قتل ہو گیا۔

یہ واقعہ ۱۲۹۸ھ میں پیش آیا۔ اس کی تاریخ لفظ ”شب خون“ سے ہی نکلتی ہے۔

خرد تاریخ فو تش جست گفتند

در یغ مرد شمع از شب خون

مرزا امان نے اس کی تاریخ کہی تھی

شاہ ہندال سرو گلشن ناز چوں ازیں بوستان محنت رفت

گفت تاریخ قمری نالال سروے از بوستان ولت رفت

”لے“ تذکرہ روز روشن میں ایک امان اللہ قستانی کا شعر درج ہے یہ امان اللہ ہرات میں رہتے تھے وہ شعر ہے۔

روز در نکریم کہ شب بے تو خون خواہد شدن

شب دریں اندیشہ ام تار و نہ چوں خواہد شدن

ایک اور بزرگ شیخ امان اللہ پانی پتی بھی ہیں جو صوفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ یہاں غالباً انہی بزرگ سے مراد ہے۔



مولانا حسن علی فراس نے یہ تاریخ لکھی ہے

ہندال محدثہ فرخندہ لقب      ناگہ زرقضا شہید شد و دل شب  
شہنوں بہ شہادتش چو گردید سبب      تاریخ شہادتش ز شہنوں بہ طلب

ہمایوں نے مرزا ہندال کا سارا مال و اسباب شاہزادہ اکبر کو عطا کیا۔ اور غزنی اور اس کے توابعات بھی اس کو جاگیر میں دے دیئے۔

اسی دوران میں سلیم شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں اسکی وفات کے بعد بڑی طوائف الملوکی پھیل گئی تھی۔ جب ہمایوں کو ان حالات کا علم ہوا تو اس نے دوبارہ ہندوستان کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر لیا۔ انہی دنوں لوگوں نے چغلیاں کھا کر ہمایوں کو بیرم خاں کی طرف سے ناراض کر دیا۔ چنانچہ ہمایوں نے بجائے ہندوستان کے قندھار کی طرف پہلے یورش کی۔ وہاں بیرم خاں خود بادشاہ کے استقبال کے لیے حاضر ہو گیا۔ اس کی خیر خواہی بخوبی ظاہر ہو گئی اور معلوم ہوا کہ اہل غرض نے اس کے خلاف جو کچھ کہا تھا سب جھوٹ تھا۔

اس مرتبہ ہمایوں جو قندھار گیا تو بیرم خاں کی معرفت اس نے مولانا زین الدین محمود | مولانا زین الدین محمود | کمان گر بہرائی سے ملاقات کی۔ مولانا مدوح خراسان کے ایک موضع بہرائی کے رہنے والے تھے۔ اکثر بزرگوں اور عالموں کی صحبت میں رہ چکے تھے۔ چنانچہ وہ مولانا جامی اور مولانا عبدالغفور سے بھی ملاقات کر چکے تھے۔ مولانا فن نقاشی میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اس کمال کو لوگوں سے چھپائے رکھتے تھے۔ بیرم خاں ان کا شاگرد تھا اور ہمیشہ ان کے درس میں حاضر ہا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یوسف زلیخا کے درس میں بیرم خاں مداخلت کرنے لگتا تھا تو مولانا فرماتے تھے ”بیرم خاں کیا تو نے دنیا میں اپنے لیے کوئی اور یوسف زلیخا بنالی ہے۔“

ایک مرتبہ ہمایوں نے حضور اکرم کے نام پر کھانا پکوا یا اور مولانا کی دعوت کی۔ ہاتھ دھلانے کے وقت ہمایوں نے خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ اٹھالیا اور طشت بیرم خاں نے سنبھالا۔ اس وقت مولانا نے سید جمال الدین محدث کے پوتے میر حبیب اللہ کی طرف اشارہ کر کے ہمایوں سے کہا ”اس کو بھی جانتے ہو یہ کون ہے؟“ ہمایوں کو ان کے سامنے بھی آفتابہ لے جانا پڑا۔ میر صاحب گھبرا گئے اور تھوڑا سا پانی جلد جلد اپنے ہاتھوں پر ڈال لیا۔ مولانا نے نہایت اطمینان کے ساتھ اچھی طرح اپنے ہاتھ دھوئے۔ اس موقع پر ہمایوں نے مولانا سے پوچھا ”کتنے پانی سے ہاتھ دھونا سنو؟“ مولانا نے فرمایا ”جس قدر پانی سے ہاتھ اچھی طرح دھل جائیں۔“ اس مجلس کے باقی لوگوں میں سے کچھ کے ہاتھ بیرم خاں نے اور بعض کے قاسم خاں کے داماد حسین خاں نے دھلوائے اور سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ہمایوں مولانا کی صحبت سے بہت خوش ہوا اور ان سے بہت کچھ استفادہ کرتا رہا، بعد میں اس نے کچھ نقدی بیرم خاں کے ذریعہ روانہ کی۔ مولانا کو کسی سے تحفہ لینے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے بہت انکار کیا۔ لیکن بیرم خاں نے بھی بڑے خلوص کے ساتھ اس قدر اصرار کیا کہ انہوں نے وہ رقم کراہت کے ساتھ قبول کر لی۔ لیکن اس کے عوض انہوں نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بہت سی کمائیں جو اس رقم سے زیادہ قیمت کی تھیں بادشاہ کے پاس بھجوا دیں کہ ہدیہ یک طرفہ نہیں دونوں جانب سے

ہوا کرتا ہے

ایک دن بیرم خاں ایک نہایت نفیس کشمیری شال ان کو تحفہ دینے کے لیے لے کر حاضر ہوا۔ انہوں نے یہ شال ہاتھ میں لی اور فرمایا ”کتنی اچھی چیز ہے! بیرم خاں نے کہا ”یہ صوفیانہ شال ہے۔ اس لیے آپ کی تندر کے لیے لے کر آیا ہوں۔“ آپ نے اپنی دو انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ”میرے لیے تو اپنی دوسری بہت کافی ہے۔ ہاں اسے تم مجھ سے زیادہ کسی اور مستحق کو دے دو۔“

مولانا کی کرامتیں بھی بہت مشہور ہیں۔ کہتے ہیں جس وقت ہمایوں کے لشکر کی تیراندازی کی مشق کیا کرتے تھے تو وہ بھی خلاف عادت وہاں پہنچ جاتے تھے اور تیراندازی کا فن سیکھنے سکھانے کے لیے لوگوں کو ترغیب دیا کرتے تھے۔ کہتے تھے ”ایک دن یہ تیراندازی کام آئے گی۔“ ماجھی واڑہ کی لڑائی میں جو پہلے ہی حملہ میں پٹھانوں کو شکست ہوئی تو وہ صرف ہمایوںی لشکر کی تیراندازی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ غالباً مولانا کا اشارہ اسی معرکہ کی طرف تھا۔

جس وقت بیرم خاں قندھار کی حکومت علی قلی خاں سیستانی کے بھائی بہادر خاں کے سپرد کر کے کابل آیا تھا تو اس نے اپنی طرف سے ایک ظالم ترکمان کو گماشتہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی خبریں روزانہ مولانا کے پاس پہنچتی تھیں۔ اتفاقاً وہ ترکمان بیمار ہو گیا تو لوگوں کو کچھ دن کے لیے اس کی زیادتوں سے نجات ملی۔ ایک دن کسی شخص نے مولانا کی مجلس میں کہا کہ ”اب وہ تندرست ہو کر پھر اٹھ رہا ہے۔“ مولانا نے اس شخص کو تیز لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے ہندی سے فرمایا۔

”شاید قیامت کے دن ہی اٹھے گا۔“ چنانچہ دو چار دن بعد ہی وہ ظالم مر گیا۔

ہمایوں جب لوٹنے لگا تو اس نے قندھار کو بیرم خاں کے بجائے منعم خاں کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن منعم خاں نے کہا ”اس وقت جب کہ آپ ہندوستان پر حملہ کا عزم کیے ہوئے ہیں، کسی قسم کا تغیر و تبدل لشکر کی بے دلی کا باعث ہو گا۔ ہندوستان کی فتح کے بعد جس طرح چاہے کیجئے۔“ ہمایوں نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور قندھار بیرم خاں کے پاس اور داور بہادر خاں کے پاس ہی رہا۔

ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے سامان جنگ تیار کیا اور ماہ ذی الحجہ ۹۶۱ھ میں ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔

خسرو غازی نصیر الدین ہمایوں شاہ آنکھ گودے سبقت برواز شاہان پیش پیشگی

بہر فتح ہند از کابل عزیمت کرد و شد سال تارینج توجہ نہ صد و شصت و یکے

اس قطعہ میں لفظی اور معنوی دونوں تاریخیں موجود ہیں۔

جب شاہی لشکر نے پرشاور پر منزل کی تو قندھار سے بیرم خاں بھی آکر شامل ہو گیا۔ یہاں سے لشکر نے روزانہ مسلسل کوچ کیا اور دریائے سندھ کو عبور کر لیا۔ ہمایوں کی ہراول فوج پر بیرم خاں، خضر خواجہ خاں، تروی بیگ خاں اور سلطان سکندراز بیگ مامور تھے۔ ہمایوں کی آمد آمد سن کر حاکم بہتاس تاتار خاں کا سی قلعہ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس مرتبہ آدم کھرنے بھی لشکر میں حاضری نہ دی۔ اور جب ہمایوں لاہور پہنچا تو وہاں کے پٹھان مقابلہ کی طاقت نہ پا کر بھاگ گئے۔

ہراول کے امیر لاہور تھانیر جاندھر اور سرہند کی طرف بے روک ٹوک بڑھتے چلے گئے۔ دیپال پور کے قریب شہباز خاں اور نصیر افغان مقابلہ کے لیے آئے۔ لیکن شاہ ابوالمعالی اور علی قلی شیبانی سے شکست کھا کر بھاگ گئے۔ اس وقت مغلوں کا ایسا ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ ہزار ہزار پٹھان بڑے پگڑ باندھے ہوئے دس سواروں کو بھی دیکھ لیتے تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاتے تھے، چاہے وہ سوار لاہوری ہی کیوں نہ ہوں۔

جب ہمایوں سندھ کے اس پار ہی تھا۔ سکندر سور نے ابراہیم سور کو شکست دینے کے بعد اٹاواہ سے عدلی شاہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کی تھیں، اس موقع پر اُسے خبر ملی کہ ہمایوں نے سندھ کو عبور کر لیا ہے۔ سکندر سخت پریشان تھا۔ کیوں کہ پٹھانوں کا یہ حال تھا کہ ہر شخص ہمت ہار کر اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان بچانے کی فکر میں لگا ہوا تھا اور سب یہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ یہ صرف سلیم شاہ کا ہی دم تھا کہ وہ مغلوں کے دانت کھٹے کر دیتا تھا۔ اب ان سے مقابلہ کرنے والا کون رہ گیا ہے؟ اس عام پست ہمتی کے باوجود سکندر نے دوسرے تمام کام چھوڑ کر مغلوں سے مقابلہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

**سکندر سور سے مقابلہ**  
ہمایوں کی کچھ فوج جاندھر میں پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ سکندر نے سب سے پہلے اس محاذ پر حبیب خان، نصیب خان، طغوجی اور تاتار خاں کا سی کوروا نہ کیا اور خود بھی ان کے پیچھے کوچ کروا دیا۔ سکندر کی پیش قدمی کی وجہ سے چغتائی امیر ستلج کے اس پار چلے گئے۔ پٹھانوں نے ان کا تعاقب کیا۔ شام ہوتے ہوتے دونوں فوجوں میں ایک سخت لڑائی ہوئی۔ مغلوں نے قدم جاکر تیر اندازی شروع کر دی۔ پٹھان اپنے ناکارہ سامان جنگ کی وجہ سے اس تیر اندازی کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔ اور انہوں نے ایک ویران گاؤں میں جا کر پناہ لی اس کے بعد پٹھانوں نے ایک حماقت یہ کی کہ مغلوں کے لشکر کو بخوبی دیکھنے کے لیے بہت سی آگ جلائی۔ قدرتی طور پر معاملہ اٹل ہی ہوا پٹھان تو خود روشنی میں آگئے اور مغل لشکر اندھیرے میں محفوظ رہا۔ اس روشنی سے فائدہ اٹھا کر مغلوں نے تاک تاک تیر انداز شروع کر دیے۔ جو تیر بھی اُن کی کمان سے نکلتا تھا کسی نہ کسی پٹھان کی جان لے کر ہی جاتا تھا۔ آخر پٹھان شکست کھا کر بھاگے اور مغلوں نے باسانی یہ معرکہ جیت لیا۔ ان کا بہت کم جانی نقصان ہوا۔ اور غنیمت میں کافی سازو سامان ہاتھی اور گھوڑے ہاتھ آئے۔ اس فتح کی خبر ہمایوں کو لاہور میں ملی۔

بہت جلد یہاں پنجاب، سرہند اور حصار فیروزہ تک کا علاقہ مغل فوج کے قبضہ میں آگیا۔ اور ہمایوں فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی کے قریب آپہنچا۔ اسی دوران میں سکندر نے بھاگے ہوئے پٹھانوں کو چاروں طرف سے جمع کر کے اسی ہزار سواروں بہت سے ہاتھیوں اور توپ خانہ لے کر سرہند پر حملہ کیا۔ اور شیر شاہ کے طریقہ پر اپنے لشکر کے اطراف خندق اور حصار کھینچ دیا۔ مغل سرہند کے دروازے بند کر کے اندر سے رہنے لگے اور ہمایوں کو کمک کے لیے لکھا۔ ان کی مدد کے لیے ہمایوں نہایت تیزی سے یلغار کرتے ہوئے سرہند پہنچ گیا۔ یہاں کافی عرصہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ ہر روز خون ریز مقابلہ ہوتا تھا۔

**پٹھانوں کی شکست** جس دن شہزادہ اکبر لشکر کی کمان کر رہا تھا اس دن بڑی سخت خون ریز لڑائی ہوئی۔ ایک طرف

سے اکبر دوسری طرف سے بیرم خاں، سکندر خاں، عبداللہ خاں، اوزبک شاہ ابوالمعالی، علی قلی خاں، بہادر خاں آگے بڑھے اور بڑی مردانگی کے ساتھ پٹھانوں پر حملہ کیا۔ پٹھانوں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، اپنے حوصلہ سے بڑھ کر انہوں نے بہادر سی دکھائی۔ نوشتہ تقدیر میں فتح مغلوں کے لیے لکھی جا چکی تھی۔ پٹھان مغلوں کی یلغار کی تاب نہ لا سکے اور شکست کھا کر میدان سے بھاگ گئے۔ مغلوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اس دن سارے راستہ میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ غنیمت میں مغل فوج کو ہر طرح کا بے انتہا مال و اسباب، بے شمار ہاتھی اور گھوڑے ملے۔ مقتول پٹھانوں کے سر اس کثرت سے ڈھیر تھے کہ ان کے مینارہ بن گئے۔ اسی مناسبت سے بیرم خاں نے اس مقام کا نام ”سرمنزل“ رکھا تھا۔ یہی نام آج تک چلا آ رہا ہے۔ اس فتح کی تاریخ ہے:-

”شمشیر بہایوں“

منشی خردطالع میمون طلبید انشائے سخن ز طبع موزوں طلبید

تحریر جو کرد فتح ہندوستان را تاریخ ز ”شمشیر بہایوں“ طلبید

جب سکندر لڑائی ہار گیا تو مایوس ہو کر کوہ سواک کی طرف بھاگ گیا۔ اور سکندر خاں اوزبک ایک بڑا لشکر لے کر سامانہ کے راستہ دہلی جا پہنچا۔ جو پٹھان دہلی میں رہ گئے تھے وہ سب منتشر ہو گئے۔ بہایوں نے سکندر کے تعاقب کے لیے شاہ ابوالمعالی کو روانہ کیا اور خود ۹۶۲ھ ماہ رمضان میں دہلی میں داخل ہوا۔ اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقہ میں اس کے نام کا خطبہ اور سکھ جاری ہو گیا۔

ہندوستان کے بادشاہوں میں بہت کم کو یہ نصیب ہوا کہ ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد دوبارہ ان کو سلطنت مل جائے۔

اس سال بہایوں نے بہت سے علاقے اپنے امرار کو جاگیر میں عطا کیے۔ اور مصطفیٰ آباد کا پرگنہ جس کا محصول سالانہ تیس چالیس تنکے ہوتا تھا، حضور اکرم کے نام پر وقف کر دیا۔ حصار فیروزہ اکبر کو جاگیر میں ملا۔ بابر نے بھی اپنی پہلی فتح کے وقت میں ہی مقام بہایوں کو جاگیر میں دیا تھا۔ پنجاب کا صوبہ شاہ ابوالمعالی کے سپرد کر کے اسے سکندر کے مقابلہ پر مامور کیا گیا۔

سکندر نے بھاگ کر شمالی کوہستان میں پناہ لی تھی۔ ابوالمعالی کی مدد کے لیے جو دوسرے امیر مامور کیے گئے تھے سکندر نے انکی جاگیروں پر چھاپے مارنے شروع کیے۔ اس کی دست برد سے سرکاری خزانہ اور خالصہ کے پرگنے بھی محفوظ نہیں تھے۔ اس کے مسلسل حملوں سے مذکورہ امیر بے دل ہو چلے تھے اور سکندر کی قوت روزانہ بڑھتی جا رہی تھی۔

جب سکندر کی دست درازیاں بہت بڑھ گئیں تو بہایوں نے شہزادہ اکبر کو بیرم خاں کی اتالیقی میں سکندر کے مقابلہ پر بھیجا اور شاہ ابوالمعالی کو حصار فیروزہ پر تبدیل کر دیا۔ اکبر کے رخصت ہونے سے پہلے ہی بادشاہ نے اگرچہ قبا خاں گنگ کو میرٹھ اور سنبھل پر علی قلی خاں کو بدایوں پر قنبر دیوانہ کو اور بیانہ پر محمد خاں آخستہ بیگی کو مامور کر کے رخصت کر دیا تھا۔



**غازی محمد خاں کا قتل** | حیدر محمد خاں نے بیان پر حملہ کیا تو ابراہیم سور کا باپ غازی محمد خاں قلعہ بیانیہ میں محصور ہو گیا۔ اس محاصرہ سے پہلے بھی اور بعد میں بھی لوگوں نے غازی محمد خاں کو بہت سمجھایا کہ وہ نہ مقبور اور نہ پھروہاں سے گجرات چلا جائے۔ لیکن اس نے کسی کا مشورہ قبول نہ کیا۔ اور قلعہ میں اس طرح گھر کر رہ گیا جیسے مچھلی جال میں۔ بیان کے تمام زمیندار امن طلب کرتے ہوئے مغل لشکر میں حاضر ہو گئے۔ حیدر محمد خاں نے عہد و پیمان کے ذریعہ غازی خاں کو معہ اہل و عیال قلعہ سے باہر آ جانے پر راضی کر لیا۔ اور اس کی رہائش کے لیے ایک محفوظ مقام کا انتظام کر دیا۔ دوسرے دن جب اس نے بیانیہ کے خزانوں اور دفینوں کے متعلق بخوبی تحقیقات کر لی تو اپنے کیے ہوئے عہد سے پھر گیا اور غازی خاں کو اس کے اہل و عیال بلکہ شیرخوار بچوں سمیت قتل کر دیا۔ ان کے سر بادشاہ کے پاس بھیجوا دیئے۔ ہمایوں کو اس کی یہ عہد شکنی ناگوار گزری اور اس نے میر شہاب الدین نیشاپوری کو جس کا شہاب الدین احمد خاں خطاب تھا غازی خاں کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے بیانیہ کی طرف روانہ کیا۔ حیدر محمد خاں نے نفیس اسباب جو اہرات وغیرہ کو تو چھپایا اور کم قیمت والا سامان معائنہ میں پیش کر دیا۔

**قنبر دیوانہ** | قنبر دیوانہ نے سنبھل پہنچنے کے بعد کافی بڑی جمعیت فراہم کر لی تھی۔ بعد میں جب سنبھل علی قلی خاں کے حوالہ ہوا تو وہ کہا کرتا تھا "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ پیر کسی کے اور گاؤں کسی کا" علی قلی خاں کے سنبھل آنے سے پہلے ہی قنبر بدایوں چلا گیا۔ وہاں اس نے کاٹ اور کولہ کی طرف یلغار کر کے برکن خاں پٹھان سردار سے مقابلہ کیا۔ اسے شکست دے کر ملا نوہ تک کا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیا، لیکن کچھ ہی عرصہ بعد پٹھانوں کے مقابلہ میں شکست کھا کر اور وہاں کے قلعہ میں بڑا کشت و خون کر کے بدایوں لوٹ آیا۔ بدایوں میں بھی اس نے ظلم و ستم پر کمر باندھ لی۔ علی قلی خاں نے اسے اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ گیا اور کہلوا یا "میں بادشاہ کے پاس تجھ سے زیادہ مقرب ہوں۔ اور میرا سر شاہی تاج سے وابستہ ہے۔" اس کی ان باتوں سے بگڑ کر علی قلی خاں نے اس پر فوج کشی کی اور بدایوں کا محاصرہ کر لیا۔ قنبر دیوانہ اس محاصرہ کے دوران میں بھی شہر والوں پر ظلم ڈھانے سے باز نہیں رہتا تھا۔ آج کسی کی بیوی کو اڑا لیا تو کل کسی کی بیٹی کا اغوا کیا، کسی کا مال و اسباب زبردستی چھین لیا۔ اس کو اپنے کسی آدمی پر بھروسہ نہ تھا۔ اس لیے راتوں میں بذات خود دروازوں کی گشت کیا کرتا تھا۔ اپنی دیوانگی کے باوجود روانی کی چالوں میں بڑا ہوشیار تھا۔

ایک دن قلعہ کے ایک خالی مقام پر آدمی رات کے وقت پہنچ گیا۔ ایک جگہ چلتے چلتے رُک گیا۔ پھر دو چار قدم آگے بڑھ کر سوچنے لگا پھر چانگ پلٹ کر اسی پہلی جگہ آ گیا اور اسی وقت بیلداروں کو بلا کر زمین کو کھودنے کا حکم دیا اور کہا "میں جگہ میرے کان میں کچھ آواز سی آ رہی ہے۔" جب وہ جگہ کھودی گئی تو معلوم ہوا علی قلی خاں نے قلعہ کے باہر سے سڑگ لگا رکھی تھی۔ جن لوگوں نے یہ سڑگ دیکھی تھی ان کا بیان ہے کہ جب سڑگ کھودی جانے لگی تو معلوم ہوا قلعہ کی بنیاد کچھ اندر تک چلی گئی ہے۔ اور اس میں لوہے کے پشتے اور سال لکڑی کے شہتیر مضبوطی کے ساتھ جھے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد ایک جگہ خالی مل گئی تھی۔ اس مقام سے سڑگ کھودی گئی تھی۔ جس کا سراغ اس دیوانہ کی ہوشیاری سے مل گیا۔ علی قلی خاں بھی قنبر کی اس دانائی پر حیران رہ گیا۔

محاصرہ جاری تھا کہ بدایوں کے تمام شہریوں نے ایسا کر کے علی قلی خاں کے پاس کہلا بھیجا کہ ”فلاں رات کو فلاں برج پر حملہ کرنا ہم قلعہ کے اوپر سے کمندیں اور سیڑھیاں لٹکا دیں گے۔“ اسی منصوبہ کے مطابق علی قلی خاں نے حملہ کیا اور اس کے سپاہیوں کو شیخ حبیب بدایونی نے اس برج کی طرف سے جو شیخ سلیم حسینی کے رشتہ دار شیخ زادوں کا تھا اور پر پڑھایا اور ان لشکریوں نے شہر میں داخل ہو کر آگ لگا دی۔ قنبر دیوانہ سے جب کچھ نہ بن پڑا تو وہ ایک کالا کبیل اوڑھ کر شہر سے نکل گیا۔ لیکن لوگ پکڑ کر اسے علی قلی کے پاس لے آئے۔

علی قلی خاں بڑی نرمی اور ملامت سے پیش آیا اور کہا کہ ”اگر تو اطاعت قبول کر لے تو میں تیری جان بخش دوں گا۔“ لیکن دیوانہ نہایت تلخ و ترش باتیں کرتا رہا اور کسی طرح قلابوں میں نہیں آیا۔ مجبور ہو کر علی قلی خاں نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی قبر بدایوں میں اب تک مشہور ہے۔ قنبر کی عادت تھی کہ بہت سا کھانا پکوا کر لوگوں کی دعوت کرتا تھا اور کتنا تھا ”کھاؤ مال خدا کا ہے، جان خدا کی اور قنبر دیوانہ بکا دل خدا ہے۔“

جب علی قلی خاں کا عریضہ قنبر کے سر کے ساتھ بارگاہ سلطانی میں پہنچا تو علی قلی خاں کی یہ حرکت ہمایوں کو سخت ناپسند ہوئی۔

انہی دنوں تاریخ ۷۔۔۔ ربيع الاول ۹۶۳ھ کو ہمایوں بادشاہ کتب خانہ کی چھت پر گیا۔ جو **ہمایوں کی وفات** دہلی کے قلعہ دین پناہ میں بنایا گیا تھا۔ جس وقت وہ وہاں سے اتر رہا تھا اذان کی آواز آنے لگی۔ اذان کے احترام میں وہ اسی جگہ بیٹھ گیا، جب وہاں سے اٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا اور ہمایوں کا پیر پھسل گیا اور وہ چند سیر دھیموں پر سے پھسلے ہوئے زمین پر آگیا جب کچھ افاقہ ہوا تو شیخ جولی کو پنجاب میں شاہزادہ اکبر کے پاس روانہ کیا اور اس کو اپنے حالات سے مطلع کیا۔

اس صدمہ سے ہمایوں جانبر نہ ہو سکا۔ آخر کار اس حادثہ کے آٹھویں دن ۱۵ ماہ ربيع الاول ۹۶۳ھ کو اس نے اس عالم فنا سے آنکھیں پھیر لیں۔

ہمایوں کے انتقال کی تاریخ اس شعر سے نکلتی ہے۔

چو گشت از رحمت حق ساکن اندر روضہ رضواں  
ہشت آمد مقام پاک او تاریخ ازاں باشد

مولانا قاسم کاہی نے تاریخ کہی ہے

لے ہمایوں علم دوست بادشاہ تھا۔ چنانچہ اس نے دہلی کے شیر شاہی قلعہ میں شیر منڈل کی سہ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں اپنا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ اسے چونکہ نجوم میں بڑی دست گاہ حاصل تھی اس لیے یہ اس کی رصد گاہ بھی تھی۔ اس شاہی کتب خانہ کے مہتمم کا نام تاریخوں میں نظام المعروف ہازہاد رہتا ہے۔ ہمایوں کا شوق کتب بینی اس درجہ پر تھا کہ میدان جنگ میں بھی چھوٹا سفری کتب خانہ لے جاتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے کھیت کا محاصرہ کیا تھا تو اور کتابوں کے ساتھ تاریخ تیمور کا وہ نسخہ بھی تھا جس کو ہزاد نے مصور کیا تھا۔ ایک جنگلی قبیلہ نے شاہی کتب پر چلپ مارا تو نسخہ جاتا رہا لیکن جلد ہی مل گیا۔ (نزدک جہانگیری۔ اکبر نامہ)

ہمایوں بادشاہ ملک معنی ندر اور کس چو او شاہنشی یا  
 نہ بام قصر خود افتاد ناگہ وراں عمر عز بزش رفت برباد

پئے تاریخ او کا ہی رقم زد

ہمایوں پادشاہ از بام افتاد

ہمایوں کی تاریخ وفات کا ایک اور مادہ ہے

مشو غافل از سال فوتش ببین

ہمایوں کجا رفت و اقبال او

اس کی ایک اور تاریخ ہے

اے آہ پادشاہ من از بام افتاد

**ہمایوں کی ذاتی خوبیاں** | ہمایوں کی عمر کیا دن سال کی تھی۔ اس نے ۲۵ سال سے کچھ زائد حکمرانی کے فرائض انجام دیئے۔ امور سلطنت میں بڑی گہری نظر تھی۔ ظاہری اور باطنی بہت سے ہنر و کمال اسے حاصل تھے۔ وہ نجوم و ہئیت کے علاوہ دوسرے مروجہ علوم میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتا تھا۔ علماء اور فضلا بزرگوں اور شاعروں کی دل سے قدر کرتا تھا۔ خود بھی بڑے اچھے شعر کہا کرتا تھا۔

لے نجوم و ہئیت کا فوق اس حادثہ کا باعث بنا اس شام ستارہ زہرہ کے طلوع ہونے کا گمان کیا جا رہا تھا بادشاہ شیرمنڈلی کی برجی میں ریاضی دانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مباحث میں مشغول تھا۔ افغان کی آواز سن کر اٹھا تو پھسل کر گر پڑا۔ اور اس صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا (اکبر نامہ ص ۳۶۳)۔

لے ہمایوں کی ہئیت ذاتی کے متعلق اکبر نامہ (ص ۲۲۰) میں یہ جملہ درج ہے: ”توجہ اقدس باصطلاب و کرہ و سائر آلات رصدی درجہ کمال داشت“ طبقات اکبری (جلد دوم ص ۱۸۴) کا حوالہ ہے: ”در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود“ ہمایوں نے علم ہئیت علامہ ایسا س اردبیلی سے سیکھا تھا جو اپنے وقت کے ماہر رصد تھے۔ ان علوم میں ہاسکی مہارت کا یہ درجہ تھا کہ ریاضی نجوم اور ہئیت کے ممتاز عالم نور الدین ترخان نوری سفیدونی نے ہمایوں سے ہی ان علوم کو سیکھا تھا (ماثر الامرا ج ص ۷۸) کہہ اور اصطلاب کو ہمایوں نے ہی سب سے پہلے یہاں رواج دیا۔ ایک خاص قسم کا اصطلاب بھی ایجاد کیا تھا جس کا نام ”اصطلاب ہمایوں“ ہے (بحوالہ مضمون لاہور کا ایک فلکی آلات ساز از سلیمان ندوی) ہمایوں نامہ میں گلبدن بیگم نے لکھا ہے ”ہمایوں نامہ ص ۱۲“ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بانو سے قرار پائی تو ہمایوں نے خود اصطلاب اٹھا کر ستاروں کی گردش کے ذریعہ تاریخ مقرر کی۔ اس سلسلہ میں ”خرگاہ ہمایونی“ کا تذکرہ بھی دلچسپ ہے۔ اس نے دو خرگاہ بنائے تھے جن کی ساخت ہئیت کے اصولوں پر تھی۔ ایک خرگاہ آسمان کے بارہ برجوں میں تقسیم تھی ہر برج میں ایک قفس تھا جس سے ”کواکب دولت“ جھلکتے تھے۔ دوسرا خرگاہ یونانی ہئیت کے نو آسمانوں کی نقل تھی اس میں بھی ہر آسمان کے ستارے جڑے تھے۔ ہمایوں کی ایک اور ایجاد ”باطل نشاط“ تھی۔ اس بطل میں فلکی دائرے کرے اور عناصر کی اشکال تھیں۔ کرہ خاک میں ہفت اقالیم کے نقشے تھے (قانون ہمایونی ص ۱۲) اس کے علم ریاضی کے متعلق اکبر نامہ میں ہے: ”در اقسام خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر نہ داشتند“ فرشتہ لکھتا ہے (جلد اول مقالہ دوم ص ۲۴۳) ”در علم ریاضی علم مہارت سے افراشت“

ہمایوں ہمیشہ باوقور رہتا تھا۔ خدا اور رسول اکرم کا نام کبھی بغیر وضو کے نہیں لیتا تھا۔ اگر کسی ایسے نام کو دہرانے کی ضرورت پڑتی جو عہدِ اور اللہ سے مرکب ہو تو وہ صرف عہد کہا کرتا تھا۔ مثلاً عہدِ الحی کو فقط عہدِ ل کہتا تھا۔ اپنے رقعات کے سرنامہ پر بجائے لفظ ”ہو“ کے اس لفظ کا ہندسہ گیارہ لکھا کرتا تھا۔ غرض اس طرح کے تمام مذہبی آداب کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔

اس کی محفلیں رات رات بھر جی رہتی تھیں۔ کبھی اس کی طرف سے تکان اور سستی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ دل کا بڑا سخی تھا۔ اس کی فیاضی کے لیے سارے ہندوستان کا خراج بھی کافی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے محکمہ مالیات کے کارکن اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لاتے تھے۔

اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آتی۔ جب بہت غصہ میں آجاتا زبان سے ”ہے نادان“ کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ مجلس میں جب آتا تو بھوسے سے بھی بایاں پر پہلے نہ رکھتا تھا۔ اس کی مجلس میں کسی اور شخص کی بھی مجال نہ تھی کہ کبھی بایاں پاؤں پہلے رکھے۔ اگر کبھی کسی سے یہ چوک ہو جاتی تو وہ اسے دوبارہ پیچھے لوٹ کر آنے کے لیے کہتا تھا۔ اس کی حیا کا یہ یہ عالم تھا کہ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا اور کسی کی طرف گھور کر نہیں دیکھا۔

اس کا یہ قصہ کافی مشہور ہے کہ جب اس نے ہندوستان کی تسخیر کا دوسری بار ارادہ کیا تو کابل کے مفسرِ قرآن شیخ حمید سنبھلی تک اس کے استقبال کے لیے گئے۔ ہمایوں ان کا بڑا معتقد تھا۔ ایک دن شیخ نے ہمایوں سے کہا ”تمہارا پورا لشکر رافضی معلوم ہوتا ہے۔“ ہمایوں نے پوچھا ”کیسے؟“ انہوں نے کہا ”اب کی بار تمہارے تمام سپاہیوں کے نام یار علی کفش علی اور حیدر علی وغیرہ ہیں۔ دوسرے کسی خلیفہ کے نام پر کسی کا نام نہیں۔ یہ بات سن کر ہمایوں کو بڑا طیش آگیا اور ہاتھ میں جو تلوار تھا وہ فرش پر پھینک کر کہا ”میرے دادا کا نام عمر شیخ تھا۔ اتنا کہہ کر محلِ سرا میں چلا گیا لیکن کچھ دیر بعد ہی باہر آ کر نہایت ملالت کے ساتھ اس نے شیخ کو اپنے صبح عقائد سے آگاہ کیا۔

ہمایوں کی ذاتی خوبیاں اتنی ہیں کہ ان کو لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ہمایوں علم و دست اور نہایت قدر دان بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں صاحبِ کلام شاعریت سے گزرے ہیں۔

۱۔ شیخ نے دراصل یہ اشارہ اس بات کی طرف کیا تھا کہ ہمایوں نے شاہِ طہما سب صفوی سے مدد لیتے وقت شیعہ عقائد کو قبول کرنے سے صاف صاف انکار نہیں کیا تھا اور صفویوں کا لشکر لے کر بدخشاں پر حملہ کیا تھا اس شبہ میں کہ وہ شیعہ ہو گیا ہے شیخ کو صوفیہ تہذیب اور ہمایوں نے بنے دادا ”عمر شیخ“ کے نام کا حوالہ دے کر شیعیت سے برأت ظاہر کی۔



## عہد ہمایوں کے شعراء

**جنوبی** | عہد ہمایونی کے شاعروں میں سے بدخشاں کے ایک شاعر مولانا جنوبی بدخشی معنائی نامی تھا۔ اس نے ہمایوں کی شہزادگی کے زمانہ میں اس کا قصیدہ اڑتیس اشعار پر مشتمل کہا تھا۔ اس قصیدہ کا کمال یہ ہے کہ وہ مشکل صنائع جو خواجہ رشید قدر کے قصیدہ میں ذوالفقار شروانی اور خواجہ غیاث کے قصیدے میں، سلمان ساوجی جیسے بڑے شاعروں نے چھوڑ دی تھیں، جنوبی نے اس قصیدہ میں ساری ختم کر دیں۔ جیسے معما اظہار مضمر اور تاریخ وغیرہ حقیقت میں جنوبی نے یہ قصیدہ لاجواب لکھا ہے۔

شہنشاہ رخ تولالہ و نسریں لب تو جاں  
ہمی بنیم لب تو غنچہ رنگیں شدہ خنداں  
نمی گویم خط تو سبزہ و ریحاں خد تو گل  
شود ظاہر قد تو فتنہ دوراں دم جولان  
اس قصیدہ کی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کے ہر مصرع کے شروع کا ایک ایک حرف لیا جائے تو یہ حروف مل کر یہ مطلع بناتے ہیں۔

شہنشاہ دیں بادشاہ زماں  
ز بخت ہمایوں شدہ کامراں  
اگر پہلے دو شعروں کے درمیان لفظوں کو سرخی سے لکھیں تو یہ مطلع نکلتا ہے جسے تین بحروں میں پڑھ سکتے ہیں۔

رخ تولالہ و نسریں خط تو سبزہ و ریحاں  
لب تو غنچہ رنگیں قد تو فتنہ دوراں

اگر اس کو ٹوٹ کر پڑھیں تو یہ مطلع تین بحروں میں دوسری ردیف اور قافیہ سے اس طرح بن جاتا ہے۔

خط تو سبزہ و ریحاں رخ تولالہ و نسریں  
قد تو فتنہ دوراں لب تو غنچہ رنگیں

درمیان میں سرخی سے خط کشیدہ الفاظ کے علاوہ جو لفظ رہ جاتے ہیں وہ خود اپنی جگہ مل کر ایک اور مطلع بن جاتے ہیں۔ اس مطلع میں اور بھی خوبیاں رکھی ہیں۔ جو اس کے حاشیوں سے واضح ہو سکتی ہیں۔ اس قصیدہ کے دوسرے چار شعر ایسے ہیں کہ اگر ان اشعار کے بعض حصے سرخی سے الگ کر لیے جائیں تو یہ مل کر بدخشاں کی فتح کا قطعہ تاریخ بن جاتے ہیں۔

توئی شاہ شاہاں دوراں کہ شد  
ہمیشہ ترا کار فتح و ظفر

بگرفتہ وقتی بدخشاں و تاریخ شد  
محسود ہمایوں شہ بحر و بر

یہ قطعہ "مضمر" بھی بن جاتا ہے۔ اور اس کا "اظہار مضمر" اس رباعی سے ملتا ہے جو اس قصیدہ کے آگے کے اشعار

سے نکلتی ہے۔ رباعی

تا خاک درش گشت تن زار گدا      دل از غم و غصہ خود افتاد جدا

جان من زار از غم یار برفت      غم شد ز جدا یں دم دہد آن شاہ ندا

اس کا گوشوالہ ہے :-

”گوید خبر فتح شدہ دین ما“

یہ قصیدہ ان تمام قصائد کے ساتھ میری خاص بیاض میں اُس وقت کا لکھا ہوا ہے جب کہ میں عالم شباب میں تھا۔ اگر مجھے موت نے کچھ اور ہمت دی تو میں اس قصیدہ کے کمالات ”نجات الرشید“ کے دوسرے دفتر میں جس کی تکمیل میرے دل سے لگی ہوئی ہے انشاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا۔

**وفائی** | عہد ہایوں کے دوسرے شاعر شیخ زین الدین خاں تھے جن کا تخلص وفائی تھا۔ بابر نے اپنے عہد میں ان کو پورے ہندوستان کا مستقل صدر الصدور بنادیا تھا۔ آگرہ میں جہان کے پار ایک مسجد اور ایک مدرسہ ان کی یادگار ہے۔ نظم و نثر کے تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی، خاص طور سے فن معما گوئی، تاریخ اور بدیہ گوئی میں ان کی مثال نہیں تھی۔ جب وہ پہلی مرتبہ بابر کے پاس آئے تو بادشاہ نے پوچھا ”تمہاری عمر کیا ہے؟“ فی البدیہہ جواب دیا ”بس پانچ برس پہلے“ چل سالہ“ تھا اور اب ”چل سالہ“ ہوں اور دو برس بعد ”چل“ پورے ہوں گے۔“

میری بھی کسی نے عمر پوچھی تو میں نے جواب دیا تھا ”میں ایک سال پہلے“ پنچہ سالہ“ تھا اور اب ”پنجاہ سالہ“ ہوں اور دس برس بعد ”پنچہ سال“ پورے ہوں گے۔

مشہور ہے کہ شیخ زین ایک مرتبہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے اور وہاں شیخ کی یہ حکایت سنی کہ ”الہدایا مشترک و تنہا خوشترک“۔ اس پر انہوں نے یہ قطعہ لکھا ہے

شیخنا باد اتر از حق ہدایا بردوام      آن کد امم من کہ گویم الہدایا مشترک

گوئی تنہا مشترک ز انسان کہ گفتی پیش ازین      مشترک ساز از نیگوئی کہ تنہا خوشترک

یہ قطعہ بھی انہیں کا لکھا ہوا ہے۔

غم گریباں گیر شد سرد گریباں چوں کشم      شوق دامگیر آمد پادماں چوں کشم

لے گریبانم ز شوق پارہ دامن چاک چاک      بے تو پادرد امن و سرد گریباں چوں کشم

شیخ زین نے ہندوستان کی فتوحات اور اس سلسلہ کے عجیب و غریب حالات پر مشتمل ایک تاریخ بھی لکھی ہے جس سے ان کی سخن وری کا کمال جھلکتا ہے۔ ان کی وفات چنبار کے علاقہ میں ۹۹۸ھ میں ہوئی۔ اور اپنے ہی بنائے ہوئے مدرسہ میں دفن ہوئے۔

**نادری** | ہمایونی دور کے ایک اور شاعر مولانا نادری سمرقندی گزرے ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے بڑے فاضل اور جامع کمالات شخص تھے۔ ایک خوبصورت جوان نظام نامی پر ان کا دل آگیا تھا۔ اسی کے لیے انہوں نے یہ ”اظہارِ محبت“

لغات جو بہت مشہور ہے

من دل شکستہ گویم صفت نظام نامی  
کہ نداشت بے وصالش دل ناتواں نظامی

اس مضمرا کا اظہار اس رباعی میں ہے

رنجورم و در دل از تو دارم صد غم  
زین عمر ملوم من مسکین غریب  
بے عمل نیت حریف در دم ہم  
خواہم شود آرام گم کوی عدم

اس کا گوشوارہ ہے۔

”صفت سنبل شاہد گویم“

ان کے دوسرے اشعار کا نمونہ:-

وہ چہ خرام است قدیار را  
یار سوئے ما بہ ترحم ندید  
بندہ شوم آن قدر رفتار را  
داشت مگر جانب اغیار را  
سوئے خرابات گذر نادری  
در سری کن سر و دستار را

ایضاً

سرکویت کہ عمری بودم آنجا  
بقصد سجدہ ہر جا سر نہادم  
بہر خود کنجا آسودم آنجا  
تو بودی کعبہ مقصودم آنجا  
جہانی محرم و من ماندہ محروم  
چہ پرسی نادری چون دریاں کوئی  
گہ ناخوش گہ خوش بودم آنجا

ہمایوں کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا

المنقہ اللہ کہ بہ جمیعیت خاطر  
در حضرت گل بلبل غائب خدہ حاضر  
باعیش فشتہ حریفان معاصر  
عرباں زخزاں بود مگر شاہد ربتاں  
مبنی است کہ شرح کتب فنی ریاضی است  
تصنیف متین تو ز ایجاز و دایر

”اسم کیا“ کا یہ مہمہ بھی ان کا ہی لکھا ہوا ہے

معروف است آنرو و آن طأت جوہ و جفاست

عارض آن دستاں بے بہرہ از خالی و دلاست

مولانا نادری کا انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ ان کی تالیف و ناث میرآمانی کابلی نے لکھی ہے

واجہر تاکہ نادری نکتہ داں برفت  
جسم برسم تعصیہ تاریخ فوت او  
آن نادری کہ داد سخن داد و جہاں  
گفتا خرد کہ رفت یکے از سخن وراں

فارغی | اسی زمانہ کے ایک اور شاعر شیخ ابوالواحد فارغی تھے۔ بڑے درویش مزاج اور نہایت مشہور۔  
کلام شاعر تھے۔  
نمونہ کلام ۵

از بس کہ آن جفا جو آزار می نماید

اندک ترحم او بسیار می نماید

ان کا ایک ”واسوخت“ بھی مشہور ہے ۵

محمد اللہ کہ دار ستم ز عشق مست بد خوئی کہ می افتاد چوں چشم خود از مستی بہر کوئی  
چو ساغر از برای جرعه لب برب ہر کس صراحی دار بہر ساغرے مائل بہر سوئی

اغیار دوش پیش تو بودند و فارغی

انہ دور ہا بر آتش حرماں سپند بود

تہ تیر خود کشتی اند سینہ ام بگزارہ پیکاں را

مراد دل وہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

ان کی وفات سنہ ۹۴۰ھ میں ہوئی۔ اگرہ میں شیخ زین کی خانقاہ میں ان کے مقابل دفن ہوئے۔

یہ دونوں بڑے گہرے دوست تھے اور اتفاق دیکھو ایک ہی سال میں آگے پیچھے فوت ہوئے۔ کہتے ہیں جب دونوں ہندوستان کے ارادہ سے سفر کر رہے تھے تو ایسے تلاش تھے کہ ان کے پاس سوائے پرانی پوستیں کے کچھ نہیں تھا۔ شیخ زین نے شیخ ابوالواحد سے کہا کہ میں کابل کے بازار میں یہ فروخت کرنے لے جاتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم وہاں آکر مسخرہ پن نہ کرو۔ انہوں نے قبول کر لیا۔ بازار میں خریدار قیمت کے لیے الجھنے لگا۔ وہ صرف پانچ اشرفی دے رہا تھا۔ شیخ زین زیادہ مانگ رہے تھے۔ شیخ ابوالواحد سے نہ رہا گیا۔ وہ اجنبی کی طرح وہاں پہنچے اور دونوں کے درمیان دلائی کرنے لگے۔ بڑی رد و کد کے بعد خریدار سے بولے ”اے بے انصاف اس پارہ پارہ پوستیں میں پانچ اشرفی کے تو فقط پسو اور جوئیں ہیں۔ ظاہر ہے معاملہ چوٹ ہو گیا۔ شیخ زین نے بگڑ کر کہا ”ہم تو ایک روٹی تک کے محتاج ہیں اور تم اس حالت میں بھی مسخرہ پن سے باز نہیں آتے۔“

جاہی | ایک اور شاعر جاہی تیمانی تھے۔ تیمان بخارا کے تعلقات میں سے ہے اس جگہ کی مناسبت سے تیمانی کہلاتے تھے۔ جس زمانہ میں ہمایوں کابل میں ہندوستان پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا وہ دربار شاہی میں پہنچے اور الطاف شاہانہ سے معزز ہوئے۔ جس وقت ہمایوں نے کابل میں شاہ محمد خاں شاپور کو بطور نگران حاکم بنایا تھا۔ اس نے لوگوں کو بڑی ایندائیں دی تھیں۔ اس کے معنوب افراد میں جاہی بھی تھے۔ ملا جاہی نے شاپور کی ہجو میں ایک ترکیب بند لکھا تھا اس میں شاپور کی بیٹی کو چھوڑ کر جو ہمایوں کے نکاح میں تھی۔ اس کے خاندان کے تمام مردوں اور عورتوں پر بڑی فحش بھستیاں ہیں۔ بادشاہ بھی چونکہ شاپور سے ناراض ہو گیا تھا اس لیے اس نے بھرے دربار میں شاپور کے سامنے ہجاء کی زبان سے

بہ جوشنی اور اس پر بہت ہنسا۔ ملا کو شاپور سے معقول صلہ بھی دلوا یا۔ فحش اشعار کو چھوڑ کر صرف ایک بند  
ہاں درج کیا جاتا ہے۔

شاعر شاہ ہمایونم و خاک درگہ      میر زند کو کبہ شاعریم طعنے بہ  
خسرو شرم و ابیات خوشم خیل و سپہ      دیدم از قہجہ زنی ظلم نہ جرم و نہ گنہ  
پارہ کاغذ از ہدیایان گشتہ سبہ      سوئی بجوش اگر اندیشہ شود روئی برہ  
غرض آنست کہ این خسرو صفتان بلہ      عزت و حرمت این طائفہ دانند نگہ  
وائی آنکس کہ بہ خیل شعر البستیزد      ہر کہ بامابہ ستیزد بہ بلا بہ ستیزد

اس مصرع کی ہمایوں نے اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کیوں نہیں کہتے۔  
”ہر کہ بامابہ ستیزد یا خدا بہ ستیزد“

جاہی کے اور شعر ہیں ۷

تا بودہ ایم عاشق و بدنام بودہ ایم  
اما نہ عاشقان باند نام بودہ ایم

خوبرویاں ہمہ بے مہر و وفا نید شما      با اسیراں نہ پئے جور و جفا نید شما  
وعدہ کر دید و فاطور دروغی گفتید      راست گو نید کہ این طور چرا نید شما  
مادریں شہر نہ از ہر شہر سوایم      ہمہ جا باعث رسوائی مائید شما  
چند پر سید کہ مقصود تو در عالم حیت      راست گویم کہ شما نید شما نید شما  
جاہی از دست شما جاں نتواند یروں      کہ بلائے نہ بلا ہائے خدا نید شما  
دوش ماہ عید شد ہر شکل مصقل آشکار      کز بخار نہ روزہ بود آئینہ دل را غبار  
خویش را در سلک خدام قومی خواہد فلک      نہاں کمان حلقہ آورده است بہر زہ گزار

و انج رہے جاہی نے دوسرا شعر ”خویش را در سلک الخ نظام استر آبادی کے اس قصیدہ میں سے لیا ہے ۷  
شب نجوم از مجمع مردم نشان آورده اند      وز مہ نو تازہ حنفی در میان آورده اند  
بر سر یہ سلطنت بہ نشہ شاہ زنگبار      از برائے پیشکش انجم کسان آورده اند

ان کی ایک رباعی ہے ۷

خط گرد رخت باعث حیرانی ماست      نہ لغت سبب بے سرو سامانی ماست  
آن کاہل مشکیں پے ویرانی ماست      اینہا ہمہ اسباب پریشانی ماست

بیا کہ ہر قبق بازئی تو ساخت فلک  
نہ آفتاب کہ دوی نہ از ہلال کجک



اسی تانیہ میں ایک دوسری بحر میں بیرم خاں کا مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے ۔

عقد کبک ز بود خدنگ تو از کجک

کرد از ہلال صورت پر وین شہاب چک

مذکورہ دونوں مطلعوں کا ماخذ نثاری تونی کے مشہور قصیدہ کا مطلع ہے ۔ جاہی کو ایک غلام نے ۱۵۶۷ء میں پیالہ میں زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا ۔

دور ہمایونی کا ایک شاعر حیدر تونیائی بھی تھا ۔ یہ بڑا صاحب علم و فضل اور فن موسیقی میں ماہر تھا ۔ حیدر تونی | اس کی زیادہ تر زندگی ہندوستان ہی میں بسر ہوئی ۔ اس کا یہ مطلع جو اس نے امام شہید کی تعزیت میں کہا تھا " عاشورہ کے دنوں میں اکثر مجالس میں پڑھا جاتا ہے ۔

ماہ محرم آمد و شد گریہ فرض عین

گریم خون بیا و لب تشنہ حسین

ہمایوں کے عہد کے ملک المنجین سے متعلق اس کی ایک ہجو بھی بروی مشہور اور نوادرات کلام میں سے ہے ۔ حیدر کے چند شعر ہیں ۔

دلا چوں غمش مہربانی نداری

بجز دردش آرام جانی نداری

رباعی :- آنی کہ ز رشک مہر و ماہیت گویند مہر ویاں راخیل و سپاہیت گویند

تو لائق آنی کہ بدیں حسن و جمال شاہان زمانہ پاوشاہیت گویند

ہر لحظہ نازنین مرا نازد گیر است نازش بجاں کشم چکم ناز پرور است

باغچہ نسبت دہن یار چوں کنم تنگ است غنچہ یک سخن جانی دیگر است

حیدر تونی کا ایک لڑکا نہایت بزدل تھا ۔ وہ قصیدہ میں اکبر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا ۔ ایک دن وہ اپنی کشتی

میں بیٹھنے اور خوف زدہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا ۔ اس وقت بھی خوف اور دہشت کے آثار اس کی حرکتوں سے ظاہر ہو رہے

تھے ۔ میں نے اس سے کہا " تم کوچ پر جانے سے پشیمانی ہوئی ہوگی ؟ " اس کے ساتھ میں نے وہ شعر پڑھا جو قدسی شاعر کے لیے

اس کے حریفوں نے کہا تھا ۔

از رنج رہ بادیہ و خار مغیلاں

از آمدن کعبہ پشیمان شدہ باش

اس نے چھوٹے ہی جواب دیا " ہاں " ۔ یہ سن کر بادشاہ نے فرمایا " کعبہ کو جانے سے نہیں بلکہ کشتی میں بیٹھنے پر پشیمان ہوا

ہوگا " ۔ اس وقت بادشاہ کے اشارہ سے متین خاں نقال نے ایسی صورت بنائی جیسے اسے باؤ لے کتے نے کاٹا ہے ۔

اور گتے کی طرح بھونکتا ہوا حیدر تونی کے لڑکے پر لپکا ۔ وہ جو ہر اسان ہو کر بھاگا تو اس کی دستار ایک طرف اور جوتے

ایک طرف اور خود بہشت سے لڑکھڑا کر لوٹ پوٹ۔ بس ساری مجلس کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑا شرمندہ ہوا۔ بادشاہ نے اسے بڑی تسلی دی۔ بعد میں وہ ہندوستان میں نہ رہ سکا اور یہاں سے چلا گیا۔

ایک اور شاعر طاہر خواندی دکنی بھی تھا۔ یہ شاہ جعفر کا چھوٹا بھائی تھا۔ عراق کے علمائے سلف نے خواندینوں کے نسب کے متعلق بڑی جرح و تنقید کی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک محضر بھی مرتب کیا گیا تھا۔ اس پر مخالفت و موافقت میں رائیں لکھی گئی تھیں۔ اس کا تذکرہ ابن اثیر جزیری کی کامل التواریخ اور قاضی یحییٰ قزوینی کی "لب التاریخ" میں موجود ہے۔ طاہر اپنے آپ کو شاہ طہاسب کا رشتہ دار بتایا کرتا تھا۔ اس تعلق کی وجہ سے رافضی مشہور تھا۔ اسی بنا پر اسے میر جمال الدین صدر استر آبادی نے بڑی اذیت دی تھی اور وہ تنگ آکر دکن کو جو بھلوڑوں کا ٹھکانا تھا چلا گیا۔ وہاں دکن کے حاکم نظام شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور جلد ہی وہ اچھے مراتب پر ترقی کر گیا۔ آخر میں حملۃ الملک کے عہدہ پر مامور ہوا۔ دکن میں اس کی وجہ سے شیعہ مذہب کا رواج ہوا۔

اتفاق سے نظام شاہ سخت بیمار ہو گیا۔ طاہر کے بھائی شاہ جعفر نے کوئی عمل پڑھ کر اسے صحت یاب کر دیا اور یہ اس کی بڑی کرامت سمجھی گئی۔ اسی شاہ جعفر کے بہکانے سے نظام شاہ نے سنی مذہب اور مہدوی مسلک کو چھوڑ کر شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ ان دونوں رافضی بھائیوں کی وجہ سے دکن کے اکثر بزرگوں کو بڑی ایذا میں برداشت کرنی پڑی۔ تنگ آکر سنی دکن سے نکلتے چلے گئے اور وہاں شیعوں کی کثرت ہو گئی۔

شاہ طاہر نے انوری کے قصیدہ پر ایک قصیدہ ہمایوں کی طرف میں کہا تھا۔ جس کے دو شعر یہ ہیں۔

محل مہر چو آید بہ شبستانِ محل      لالہ فالوس برا فرزد و زر گس مشعل

کوہ از در در سر بہمن رست کنوں      شوید از ناصیہ اش ابر بہاری صندل

۱۔ نے منقبت میں ایک قصیدہ بھی کہا تھا، اس میں "گریز" اور قصیدہ کا عام اسلوب حضرت امیر کے مناسب حال نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا مطلع ہے۔

باز وقتست کہ بر طبق تقاضای فلک

انگند بر سر اچوان چمن گل تو شک

اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے۔

در غم آباد جہاں عیش از دل ناشاد رفت

خوبہ غم کر دیم چندانی کہ عیش از یاد رفت

ما بجرم عشق بدنامیم و ز ابد باز ریا      ہر دو بدنامیم اما کجا و او کجا

بیرون میا کہ شمرہ ایام مے شوی      ماکشتہ می شویم و تو بدنام می شوی

اس کا ایک بڑا اچھا قصیدہ ہے۔

ہر آنکس کہ بر کام گیتی نہر دل  
بنزدیک اہل خرد نیست عاقل  
شاہ طاہر سلسلہ میں دکن ہی میں فوت ہوا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے۔  
”تابع اہل بیت“

**خواجہ ایوب** | اسی دور ہمایونی کا ایک شاعر خواجہ ایوب ابن خواجہ ابوالبرکات ہے۔ یہ ماوراء النہری بزرگوں کی اولاد میں سے تھا۔ وہ اور اس کا باپ دونوں علم و فضل کے لحاظ سے بھی بڑے عالی مرتبہ تھے۔ لیکن باپ عراق و خراسان میں اور بیٹا کابل و ہندوستان میں دونوں بے قیدی اور رند مشربی میں مشہور تھے۔ اس منتخب میں ان کے تفصیلی حالات کی گنجائش نہیں۔

ایک مرتبہ خواجہ ابوالبرکات نے اپنے ہم عصروں کو یہ مطلع سنایا ہے  
خشک شد کشت امید و تانہ شد قحط و نا  
ز آتش دل یا و را بر چشم ما باران نمائد  
لوگوں نے اعتراض کیا کہ دوسرے مصرع میں لفظ ”یا“ بے معنی ہے۔ یہاں ”کا“ محل ہے۔ اس نے فی البدیہہ جواب میں یہ قطعہ کہا ہے

ہر چہ آید بہ پیش اہل نظر      بگمان خطاش خط نکتند  
نقطہا گرفتند زیر و زبر      عاتلاں پرو نقطہ نکتند  
یا بخوانند و نیک فکر کنند      یا نخوانند تا غلط نکتند

خواجہ ایوب نے سلمان ساوجی کی زمین میں ایک قطعہ کہا ہے

تب غم دارم و درد سر بھراں بر سر      آمدہ جانم بلب و نامدہ جاناں بر سر  
تا گرفت آتش دل در تن من چوں فانوس      دامنم چاک شد و چاک گریباں بر سر

قاضی نیشاپور کی ہجو میں کیے ہوئے قصیدہ کے تین شعر یہ ہیں

خلاف شرع ہمیر نوشت فقہ دیگر      کہ بیچ زراں نبود در کتاب ہا مسطور  
عسل حرام نوشت و شراب کرد حلال      کہ اس عصاۃ تا کست و آن تھے ز ثبور  
زنی کہ شکوہ شو بہرہ پیش قاضی برد      کہ خط نفس من از روی نمی رسد بظہور  
جواب داد کہ گراؤ قوی ضعیف شد است      رو ابود کہ در آرد بجائے خود مردود

خواجہ اپنے اشعار میں کبھی ایوب اور کبھی فراقی تخلص کرتا ہے۔ یہ غزل اسی کی ہے

لے شاخ گل کہ مجھ پہی تد کشیدہ      برگرد لب خطی ز زمرد کشیدہ  
قدرت بر آمدہ چو الفیضہ ظہ      و نہا برواں فراند الف مد کشیدہ

برحرف دیگران زود قرعہ قبول  
تسویں میکشی کش اے نقشبند چین  
برحرف عاشقان قلم روکشیدہ  
ناید چو چشم وز نقش اگر صد کشیدہ  
از دولت وصال فراقی طبع مبر  
جور و جفاے یار چو بید کشیدہ

خواجہ ایوب کی چال ڈھال وضع قطع ناپسندیدہ تھی۔ لیکن ہمایوں اس کے حال پر بڑا مہربان رہتا تھا اور اکثر اس کی ہم نشینی کا طالب رہتا تھا۔ اپنے خاندان کی کسی بیگم کے ساتھ اس کا نکاح بھی کر دیا تھا۔ لیکن خواجہ کی حالت نہ سدھرنا تھی نہ سدھری، بلکہ اس کا نتیجہ کچھ خراب ہی نکلا۔ ایک بار بادشاہ کی محفل میں خواجہ نے ایک ایسی ناشائستہ حرکت کی کہ اسے بیان ہی میں کیا جاسکتا۔ ہمایوں نے اغماض ہی برتا صرف اتنا کہا "اے خواجہ یہ کیا حرکت تھی۔"

خواجہ ایوب نے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ کیا اور سامان سفر درست کر کے سب سے رخصت ہو کر کشتی میں سوار ہو گیا۔ رفیقوں سے پوچھا کہ جانے سے بھلا کیا فائدہ ہے؟ انہوں نے کہا "گناہوں سے آدمی پاک ہو جاتا ہے۔ سن کر اس نے کہا "اکٹھے ہی گناہ کر کے حج کریں گے تاکہ سارے گناہوں سے پاک ہو جائیں۔" یہ کہہ کر کشتی سے اتر گیا۔ حج کا ارادہ چھوڑ دیا اور کھلم کھلا فسق و فجور میں مبتلا ہو گیا۔

سلطان بہادر گجراتی نے اس کی خوش طبعی کی وجہ سے ایک اشرافیہ روزانہ اس کے خرچ کے لیے مقرر کر دی تھی۔ ایک دن سلطان احمد آباد کے بازار سے گزر رہا تھا۔ خواجہ کو ترپولیہ کی مسجد میں دیکھ کر رک گیا۔ اور اسے مخاطب کر کے چھا۔ "اب تو آپ کی گزر بسر اچھی طرح ہو رہی ہے۔" خواجہ نے جواب دیا "کیا پوچھتے ہو۔ تم نے جو کچھ میرا روزینہ فرمایا ہے وہ تو میرے ایک (عضو) کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا۔" اس گستاخانہ اور سخت جواب کے باوجود سلطان بہادر اس کا روزینہ ٹگنا کر دیا۔

اسی زمانہ میں شاہ طاہر دکنی نظام شاہ کا سفیر بن کر بڑے ساز و سامان اور شاندار جلوس کے ساتھ گجرات آیا تھا۔ اس نے خواجہ کی بڑی تعریف سنی تھی۔ اس لیے خود اس کے گھر ملنے گیا۔ خواجہ کے گھر کا یہ حال کہ ٹوٹا آب خورہ رہ پھٹا یوریا تک نہ تھا۔ شاہ طاہر خواجہ کی صحبت سے نہایت خوش ہوا۔ اسے اپنے شعر بھی سنائے۔ دوسرے دن اس نے اپنے مقام پر خواجہ کی دعوت کی اور اسے دینے کے لیے خلعت گھوڑا اور کچھ زر نقد بھی اکٹھا رکھا۔ اس دن باتوں باتوں میں مذہبی مسائل بھی چھڑ گئے۔

خواجہ نے شاہ طاہر سے پوچھا "شیعہ لوگ صحابہ کی شان میں گستاخیاں کیوں کرتے ہیں؟" شاہ طاہر نے جواب دیا "ہمارے مجتہدوں نے صحابہ پر تبرک کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے۔" خواجہ سے کہاں رہا جاتا پھٹ سے کہا "جن ایمان کا جزو لعن ہو اس ایمان پر لعنت؟" شاہ طاہر کو خواجہ کی بات ناگوار گزری اور وہ مجلس اسی افراتفری میں ختم ہو گئی۔ اور اس نے خواجہ کو جو کچھ دینا تھا نہ دیا۔

کچھ عرصہ بعد خواجہ بھی دکن چلا گیا تھا، وہاں نظام شاہ سے ملاقات کی۔ نظام شاہ نے اس کی بڑی خاطر کی اور اس کیلئے

ضروری ساز و سامان بھی مہیا کر کے بھیجا۔ لیکن خواجہ کی بد خلقی ایسی تھی کہ وہ کہیں ٹک نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ وہ دکن میں بھی زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔  
کچھ عرصہ بعد ہی خواجہ کا انتقال ہو گیا۔

ضمیمہ:- بدایونی نے عمدہ ہایوں کے ایک فاضل شخص غیاث الدین خواندہ امیر کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ روضۃ الصفا کے مصنف میرخواند کا نواسہ تھا۔ اس کا باپ بدخشاں کے والی سلطان محمود کا وزیر تھا۔ اس کا نام خواجہ ہمام الدین احمد ہے۔ خواندہ امیر ہرات میں پیدا ہوا۔ علمی لیاقت و صلاحیت کی وجہ سے جلد ہی میر علی شیر ہرات کے وزیر کی بارگاہ میں باریاب ہوا۔ طب اور فن انشا پر اس کی کتابیں مشہور ہیں۔



جلد دوم

عہد اکبری

## سبب تصنیف منتخب التواریخ

**فن تاریخ کی اہمیت** | حد و نعت کے بعد اس بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ایک با وقعت علم اور لطیف فن کا نام ہے جو صاحبان علم و خبر کے لیے سرمایہ عبرت اور وارثانِ خرد و ہوش کے لیے ایک درس تجربہ کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ اباب قلم نے ابتدائے آفرینش سے زمانہ حال تک اس فن کے لیے زحماتیں برداشت کی ہیں۔ اور معتبر تصانیف اور مبسوط کتابیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ یہ علمی ذخیرہ فن تاریخ کی اہمیت اور فضیلت پر معقول دلائل فراہم کرتا ہے۔ مطالعہ تاریخ کے سلسلہ میں ہم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے جو عقیدہ کے کمزور اور شکوک و اوہام کے شکار ہیں۔ اور جن کے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعہ سے کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً بے دینی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ تاریخ ہی کیا خود کلام الہی کا مطالعہ بھی ان کو ابدی شقاوت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حالانکہ کلام پاک شقا اور رحمت ہے۔

وَإِنَّهُ لَحَدِيثُ اللَّهِ إِيَّاكَ لَافْكٌ قَدِيمٌ

ہمارا خطاب تو ان لوگوں سے ہے جو سلامتی طبع جو دت ذہن اور شیوہ انصاف سے مالا مال ہیں۔ جو لوگ منکر شرع ہیں ہماری نگاہ میں وہ نہ تو قابل اعتبار ہیں نہ اہل بصیرت۔

امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر اب تک کے اکثر علمائے حدیث و تفسیر اس علم کی تحریر و تدوین سے برابر دلچسپی رکھتے آئے ہیں اور ان کے قول و عمل کو مشرق سے مغرب تک امت کے تمام گروہوں میں مستند تسلیم کیا گیا ہے۔ البتہ ایک مختصر سا گروہ ان بدعت پسند اشخاص کا ضرور رہا ہے جس نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے حقائق و واقعات میں تحریف و تخیل سے کام لیا اور واقعات کی صحیح توجیہ و تاویل کی بجائے اس کی نظر ہمیشہ صحابہ کرام کی ہم عصرانہ چشمک زنی پر رہی اور وہ صحابہ کے اس اختلاف کو بھی اپنے اختلافات پر محمول کر کے سادہ لوح اشخاص کے بہکانے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگا رہا۔ مثل مشہور ہے۔

”اگر کوئی قوم کی رہبری کرنے لگے تو اس قوم کا ہلاک ہو جانا یقینی ہے۔“

وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے گور یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیق الہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اس عالم کون و فساد میں روتا ہونے والے ہر سانحہ اور حادثہ کو صانع قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نظر تحقیق سے کام لیں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذات خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز و انجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افراد انسانی پر گزرنے والے احوال و حوادث کا مرقع اور ان لوگوں کے کارناموں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوق خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔

## منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی

علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم سطور داعی اسلام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی نے کشمیر کی تاریخ کے انتخاب سے فارغ ہونے کے بعد شاہانِ دہلی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ واضح رہے کشمیر کی تاریخ کو اکبر بادشاہ کے حکم پر ہندوستان کے ایک فاضل شخص نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا مجھے ایک زمانہ سے خیال تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس زمانہ تک کے حالات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ بن جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو جو صاحبانِ علم کے لیے ایک اشاریہ کا کام دے سکیں۔ میری آرزو تو بس یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے عبرت حاصل کریں اور ان کی نگاہیں اس سرائے فانی کے آئینہ میں عالم ملکوت کی جھلک کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

لیکن بد قسمتی سے میں اپنی مالی الجھنوں اور احباب و اقارب سے جدائی کے باعث ایسا پریشان خاطر رہا کہ یہ کام برابر ملتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ ایک مخیر دولت مند نے جسے میرے ساتھ تعلق خاطر تھا اور مجھے بھی اس سے وابستگی تھی۔ تاریخ نگار کی کی تصنیف سے جو ایک ضخیم کتاب ہے دلچسپی لی۔ افسوس کہ اس مخلص دوست کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔ اسی زمانہ میں مجھے کچھ محسوس ہوئی اور مذکورہ ارادہ از سر نو تازہ ہو گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم کام کو شروع کر دیا۔

سہ تاریخ کشمیر۔ جس تاریخ کا بدایونی ذکر کر رہا ہے۔ وہ سنسکرت کی ایک منظوم تاریخ ہے اس کا نام ”راج ترنگی“ اور مصنف کا نام پنڈت کلہانا اس کو ابو الفضل نے غالباً پنڈت کلیان برہمن لکھا ہے۔ کلیان کے باپ کا نام چنپک اور سکونت پرہاسپور (کشمیر) تھی۔ سب سے پہلے یہ تاریخ سنہ ۱۱۲۳ میں سلطان زین العابدین والی کشمیر کے حکم سے شائع ہوئی۔ اکبر کے حکم سے ملا شاہ محمد شاہ آبادی (کشمیر) نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۱۹۹ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے اس ترجمہ کی نظر ثانی اور ترتیب کا کام کیا۔ یہ ترجمہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ایک ہندو اہل قلم مٹا کر اچیر چند نے بھی ”راج ترنگی“ کا ترجمہ کیا تھا جسے سیوک مٹھی پریس لاہور نے سنہ ۱۹۱۲ میں شائع کیا تھا۔ انہوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے ”کلمن ذات کا برہمن تھا۔ شیوجی کا پجاری ہونے کے باوجود بدھ مت سے بھی عقیدت رکھتا تھا۔ راج ترنگی سنہ ۱۱۹۹ میں مرتب کی گئی مصنف کی ولادت غالباً بارہویں صدی کے آغاز ہی میں ہوئی مصنف کا باپ راجہ پرش کمار دربار میں سنہ ۱۱۹۹ سے سنہ ۱۲۰۰ تک ایک معزز عہدہ پر مامور رہا اور سنہ ۱۲۰۰ تک زندہ رہا۔ مصنف بارہویں صدی کے آخر تک زندہ رہا۔ راج ترنگی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے کشمیر کے حالات کا مرقع۔ قدیم فرماں رواؤں کے عروج و زوال کا آئینہ ہے۔ کشمیر پر جو قدیم تاریخیں ملتی ہیں ان میں ایک ”واقعات کشمیر“ اس میں شروع سے سنہ ۱۱۶۶ تک کے حالات ہیں۔ یہ بھی غالباً راج ترنگی سے ہی ماخوذ ہے۔ جسے سنسکرت سے قاری حسین نے فارسی میں مرتب کیا۔ اس میں کشمیر کے شاعروں اور مشاہیر کا تذکرہ ایک مستقل اضافہ ہے۔ اس کو ”واقعات کشمیر“ کے نام سے محمد اعظمی ولد خیر الزمان خاں نے مرتب کیا تھا۔ مذکورہ اضافہ محمد اعظمی کا ہے۔ ایک اور تاریخ نرائن کول عاجز کشمیری کی ہے۔ اس کا نام ”تاریخ کشمیر“ ہے۔ اس کا قدیم نسخہ جہانگیری امیر ملک حیدر نے جو سنہ ۱۲۰۵ سفر کشمیر کے موقع پر جہانگیر کے ساتھ تھا۔ دیوان کشمیر عارف خاں کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ سنسکرت اور فارسی کی تاریخوں سے مواد جمع کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس کی تکمیل نہیں کر سکا۔ کول کا دعویٰ ہے کہ یہ ادھورا مواد اس کے ہاتھ آگیا۔ اور اس نے اسی سے یہ تاریخ مرتب کی ہے۔ کول کے حالات نہیں ملتے۔

**مصنف کے مآخذ** | پیش نظر تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے میں نے شاہان ہند کے کچھ حالات تو تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی سے لیے ہیں اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر اضافہ کیے ہیں۔ ان حالات کو لکھتے ہوئے میں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے۔ اور عبارتیں تکلفات اور استعارہ بازی میں اپنے قلم کو الجھنے نہیں دیا۔ اس مجموعہ کا نام منتخب التواریخ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تالیف جو صرف شاہان اسلام کے بقائے نام اور دنیا میں اپنی ایک باوگار چھوڑ جانے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے، مولف کی مغفرت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

میری تمام تربیت تو راست بیانی پر مرکوز ہے۔ پھر بھی اگر مجھ سے کوئی سہوہہ گیا ہو تو میں اللہ تعالیٰ سے عفو کا امیدوار ہوں۔

بہ بد گفتن زبان من مگرداں - من زبان من زیاں من مگرداں

تاریخ مبارک شاہی میں سلطان معز الدین محمد بن سام کی فتوحات سے ۵۳۵ھ تک ۲۶ بادشاہوں کا سن وارد تذکرہ ہے۔ مبارک شاہی کا مصنف علی بن احمد بن عبد اللہ سرہندی ہے۔ اس تاریخ کا ابتدائی حصہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے جلوس تک مختلف تاریخوں سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد تالیف کتاب کے زمانہ تک پچاسی سال کے واقعات مصنف نے عینی مشاہدات اور معتبر روایات پر مرتب کیے ہیں۔ تاریخ نظامی منتخب التواریخ مرشتہ اور دوسرے مورخین نے اسی کتاب سے بیشتر واقعات اخذ کیے ہیں۔

مبارک شاہی کو ایٹیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شمس العلماء مولانا محمد ہدایت حسین کے زیر اہتمام ۱۳۱۹ء میں شائع کیا تھا۔

## جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

**تخت نشینی** | جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بیرم خاں خانخانان کے مشورہ اور تائید سے دوسری ماہ ربیع الاول ۹۶۳ھ میں باغ کلانور میں تخت نشین ہوئے۔ اور سرحد کے امراء کو اس نے تسلی آمیز فرامین بھیجے۔ دہلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اکبر کی تاریخ جلوس "ازہمہ شہزادہ اشرف" سے نکلتی ہے۔ ایک اور تاریخ ہے۔

جلال الدین محمد اکبر آل شہزادہ دوران بتاریخ پدر می گفت شاہشاہ دورانم  
"کام بخش" بھی اس کے جلوس کا مادہ تاریخ ہے۔

تخت نشینی سے پہلے ہی بیرم خاں نے پیر محمد خاں شروانی کو جو ایک لشکر لے کر سکندر کا تعاقب کرتا ہوا کوہ سواک میں موضع دہمیری تک پہنچ گیا تھا، کسی نہ کسی طرح جیلے بہلنے کر کے واپس بلایا۔ بغرض یہ تھی کہ ہمایوں کے مرنے کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

**ابوالمعالی کی سرکشی** | تخت نشینی کے موقع پر امراء نے ابوالمعالی کو بھی شرکت کے لیے بلایا۔ اس نے کہلوادیا کہ مجھے اس وقت کچھ عذر ہے۔ اس لیے میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ دوبارہ کہلوادیا گیا کہ ایک خاص مشورہ درپیش ہے۔ اور

اس میں تمہاری رائے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے عذر مغذرت کی اور کچھ ایسے مطالبات کیے جن کا پورا کرنا محال تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بیرم خاں نے اس کے تمام مطالبے قبول کر لیے۔ لیکن جب وہ دربار میں آیا تو بیرم خاں کے اشارہ سے تو کٹ خاں قورچی نے جو ایک طاقت ور پہلوان تھا اب تو وہ ایسا ضعیف ہو گیا ہے کہ تار عنکبوت نظر آتا ہے، اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا لیکن اکبر نے یہ کہہ کر کہ "پہلے ہی دن کسی بے گناہ کا خون مناسب نہیں" اس کی جان بچائی۔ البتہ اسے قید کر کے لاہور بھیج دیا۔

اسے جلوس اکبر۔ جاکیر نے اپنی توڑک میں لکھا ہے۔ "میرے باپ نے چودہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس فرمایا تھا۔ بیرم خاں نے اس سو بے کے امیروں کو جمع کر کے نیک ساعت میں مضافات لاہور پر گنہ کلانور میں تخت سلطنت پر بٹھایا۔"

تاریخ جلوس ۱۔ یا تو کاتب کی غلطی ہے یا مصنف سے سو ہوا ہے۔ کیوں کہ ہمایوں ۲ ربیع الاول کو بالا خانہ سے گرا تھا۔ اور ۱۵ ربیع الاول کو اس کی وفات ہوئی۔ اس صورت میں دوسری ربیع الاول کو اکبر کس طرح تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ غلطی طبقات اکبری (مطبوعہ نو کشور ۱۹۴۹ء) میں بھی ہے۔ اس میں دوم ربیع الاول لکھا ہوا ہے۔ لیکن نظام الدین احمد بردی نے دوسری جگہ تخت نشینی کے جشن کی تاریخ ۲ ربیع الثانی لکھی ہے۔ اس لیے ایک خیال یہ ہے کہ یہی تاریخ صحیح ہوگی۔ "ماثر رحیمی" کے مصنف نے "دو پہاڑ" وقت جمعہ کا دن ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ لکھا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۶۷) دوسرے بیانات سے ماثرحیمی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس لیے اکبر کی تاریخ جلوس ۲ ربیع الاول کے بجائے ربیع الثانی یا زیادہ سے زیادہ دوسری ربیع الثانی ہو سکتی ہے۔

ابوالمعالی کی گرفتاری ۱۱ اقبال نامہ میں معتد خاں نے لکھا ہے کہ مرزا عزیز کو کہ کو خاندان شاہی کے تمام اسرار سے آگاہی تھی مرزا نے محلہ سے رہائی مانگی۔



**بیرم خاں کا قصیدہ** | ابوالمعالی کا شعر کارہنے والا اور سیدزادہ تھا۔ نہایت بہادر اور خوب صورت شخص تھا۔ اس سے ہمایوں کو بڑی محبت تھی چنانچہ اسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔ بیرم خاں نے صنعتِ توشیح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ عظیم اور قدیم تھا۔ اس قصیدہ میں چوبیس شعر تھے خوبی یہ تھی کہ ہر شعر کے اول مصرع کا ایک ایک حرف لیا جائے تو اس سے حضرت محمد ہمایوں بادشاہ بن جاتا تھا۔ اور اگر ہر شعر کے دوسرے مصرع کا ایک ایک حرف لیں تو ”شاہزادہ جلال الدین محمد اکبر“ نکلتا تھا ہر شعر کے اول مصرع کا آخری حرف جمع کریں تو ”میرزا شاہ ابوالمعالی“ کا نام بن جاتا ہے۔ اگر اس کے قافیہ کے سارے ”میم“ جمع کر لے جائیں۔ ۹۶۷ھ قصیدہ کے نظم کرنے کی تاریخ نکل آتی ہے۔

**ابوالمعالی کی جان بخشی** | ابوالمعالی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جس زمانے میں ہمایوں دوسری مرتبہ قندھار آیا ہوا تھا، ابوالمعالی نے لشکر کی حالت میں ایک تبر اکرنے والے رافضی کو حالت غضب میں قتل کر دیا تھا۔ مقتول کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس دعویٰ کیا۔ ہمایوں نے ابوالمعالی کو طلب کیا۔ ابوالمعالی اس کو وفر کے ساتھ کہ سیاہ نخل کی پوشاک زیب تن تھی جس کا ستر سرخ تھا۔ اور وہی تلوار دامن میں چھپی ہوئی تھی جس سے اس نے یہ خون کیا تھا۔ مستی سے جھومتا ہوا دربار میں حاضر ہوا۔ اور اس جرم سے صاف انکار کر دیا۔ بیرم خاں نے اسی وقت یہ شعر پڑھا

نشانِ شبِ رواں دارِ دس زلف پریشان

دیل روشن ست اینک چراغِ زیرِ دامن

ہمایوں کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ جرم چونکہ نجوبی ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ابوالمعالی کی جان بچ گئی۔ اور بیچارے مقتول کا خون رائیگاں گیا۔ ابوالمعالی لاہور کے قید خانہ سے بھاگ کر کمال خاں کھکڑ کے پاس چلا گیا۔ وہ علاقہ اس زمانہ میں کمال خاں کے چچا آدم کھکڑ کے قبضہ میں تھا۔ اس نے ابوالمعالی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک بڑی فوج تیار کر کے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

**ابوالمعالی کا فرار** | ۹۶۵ھ میں کشمیر کے حاکم غازی خاں چک سے اس کا مقابلہ ہوا۔ جس میں ابوالمعالی بھیس بدل کر دیپال پور چلا گیا اور وہاں بہادر خاں کے ایک افسر تولک نامی کے پاس پناہ لی۔ تولک نے اسے اپنے گھر میں چھپایا۔ ایک دن تولک کا اس کی بیوی سے جھگڑا ہو گیا۔ اس کی بیوی نے غصہ میں بہادر خاں کو جا کر بتا دیا کہ ”تولک نے ابوالمعالی کو گھر میں چھپا رکھا ہے۔ اور دونوں بغاوت کی سازش کر رہے ہیں۔“ بہادر خاں اسی وقت سوار ہو کر آیا۔ تولک کو قتل کر دیا اور ابوالمعالی کو گرفتار کر کے بیرم خاں کے پاس بھیج دیا۔ بیرم خاں نے ابوالمعالی کو ولی بیگ ترکمان کی تحویل میں بھکر روانہ کر دیا۔ ولی بیگ راستہ بھر اس کو اپنا ویتار ہا اور وہاں سے

دبقیہ صفحہ سابقہ، شاہ کی گرفتاری کا جو حال بیان کیا وہ یہ ہے۔ شاہ ابوالمعالی اپنے ایک حسین خدمت گار پر بڑے فریفتہ تھے۔ جب شاہ دربار میں

نہ آئے تو بیرم خاں نے جو بڑی چلتی رقم تھا اس خادم کو غائب کر دیا۔ دو تین دن بعد شاہ کو کھلوایا کہ تمہارے خادم کو ہم نے ڈھونڈ نکالا ہے۔ بلائے اسے خود تمہارے حوالہ کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ جدائی میں بے قرار تھے بے سوچے چلے گئے۔ اکبر نے اس سپاہی زادہ کو بلا کر سپرد کر دیا اور کہا تمہاری تلوار جس طرح اس کے ہاتھ میں رہتی تھی اب بھی اس کو دے دو۔ شاہ نے اپنے محافظ سے تلوار لے کر اسے دے دی۔ اس عرصہ میں دستر بچھا شاہ نے ہاتھ دھونے کے لیے سیلابی پر ہاتھ بڑھائے تھے کہ تولک خاں نے جو توپ خانہ کا افسر تھا پیچھے سے آکر شاہ کی مشکیں باندھ لیں۔

گجرات روانہ کر دیا اور علی قلی خاں کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ بیرم خاں نے علی قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ ابوالمعالی کو قید کر کے آگرہ روانہ کر دیا جائے۔ جب ابوالمعالی آگرہ پہنچ گیا تو خود بیرم خاں کے بعض قصبے پیدا ہو گئے اور اکبر اس سے بدگمان ہو گیا۔ بیرم خاں نے بادشاہ کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے ابوالمعالی کو چند روز بیانہ کے قلعہ میں قید کر دیا اور جب خود حج کے ارادہ سے روانہ ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مگر کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر کے پاس لوٹ آیا۔ لیکن غرور و تکبر کی وجہ سے اس نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بات اکبر کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے ابوالمعالی کو دوبارہ قید کر دیا۔ ابوالمعالی کا باقی حال آئندہ بیان کیا جائے گا۔ جس وقت وہ لاہور کے قید خانہ سے نکل بھاگا تھا اس کے محافظ پہلوان گل گزنے بادشاہ کے خوف سے خودکشی کر لی تھی۔

**سکندر سے مقابلہ** | تخت نشینی کے بعد جب حکومت کا نظام بخوبی ترتیب پا گیا تو اکبر نے سکندر کے مقابلہ پر پہاڑوں پر ایک فوج روانہ کی۔ سکندر اس فوج سے تین ماہ تک برابر لڑتا رہا۔ آخر شکست کھا کر مغلوب ہو گیا۔ انہی دنوں لکھنوت سے راجہ رام چندر بادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔

اکبر نے برسات کا موسم بسر کرنے کے لیے جالندھر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پانچ ماہ تک مقیم رہا۔ جس وقت دہلی کے حاکم تردی بیگ خاں کو بہائیوں کی وفات اور اکبر کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے کامران کے بیٹے میرزا ابوالقاسم کو شاہی اسباب و لوازمات اور بہترین ہاتھی دے کر خواجہ سلطان علی وزیر خاں اور اشرف خاں میرنشی کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دیا تھا۔

اسی سال مرزا سلیمان نے ابراہیم مرزا کے ساتھ کابل کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ قلعہ کابل میں منعم خاں محصور ہو گیا۔ اس نے اس حملہ کی اطلاع کے لیے اکبر کے پاس متعدد عرضیاں بھیجیں۔ اکبر نے محمد قلی خاں برلاس، آٹکہ خاں اور خضر خاں ہزارہ کو بادشاہ بیگم اور دوسری بیگمات کو لانے کے لیے کابل روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے نہ تھے کہ مرزا سلیمان نے قاضی نظام بدخشی کو جو ایک بڑے عالم تھے اور بعد میں انہیں قاضی کا خطاب ملا تھا اپنا سفیر بنا کر منعم خاں کے پاس بھیجا اور صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ منعم خاں صرف ایک بار خطبہ میں اس کا نام پڑے۔ منعم خاں نے مصلحتاً اس شرط کو قبول کر لیا اور مرزا سلیمان بھی اتنی بات پر خوش ہو کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

**پٹھانوں سے مقابلہ** | جلوس کے پہلے سال ہی علی قلی خاں کو خان زمان کا خطاب مرحمت کیا گیا۔ اور اس نے سنبھل پر فوج کشی کر کے عدلی کے ایک امیر شادی خاں پٹھان سے مقابلہ کیا۔ دونوں میں رہب ندی کے کنارے بڑی سخت لڑائی ہوئی جس میں خان زمان کو شکست ہوئی۔ وہ از سر نو جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ دہلی اٹا وہ اور آگرہ سے اس کے نام خطوط آئے کہ عدلی کی طرف سے ہیوں بقال ایک بڑی فوج لے کر یلغار کر رہا ہے۔ اور اکثر علاقے فتح کر کے وہ دہلی کے قریب پہنچ چکا ہے۔

پہونے حملہ کی خبر سنتے ہی آگرہ سے سکندر خاں ازبک، اٹا وہ سے قبا خاں گنگ، کاپی سے عبداللہ خاں ازبک، بیانہ سے حیدر محمد خاں اور بقیہ تمام امیر بھی اپنے اپنے علاقوں سے کوچ کر کے دہلی میں تردی بیگ خاں کے پاس پہنچ ہو گئے۔ خان زمان کو جتنا کہ دوسرے کنارے پر ہی رک جانا پڑا۔ وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔

## ہیمو تپال کا دہلی پر قبضہ

ہیمو سے مغل لشکر کا یہ مقابلہ تعلق آباد کے قریب ہوا۔ مغلوں کے میسرہ کی عبداللہ خاں ازبک اور لعل خاں نے کر رہے تھے۔ انہوں نے تیزی کے ساتھ ہیمو کی فوج پر حملہ کیا۔ اسے سپا کر کے ہودوں اور بلوں کے قصبوں تک اس کا تعاقب کیا اور کافی مال غنیمت غنیم سے چھین لیا۔

اس موقع پر ہیمو بہت سے ہاتھیوں سمیت اپنے لشکر سے کٹ گیا تھا۔ اس نازک وقت میں اسے دُور کی سوچی۔ اس نے مغلوں کو سنا۔ ان کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ اس کی کمک کے لیے اور سے حاجی خاں بڑی فوج لے کر آپہنچا ہے۔ اور اسی وقت اچانک تردی بیگ خاں پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تردی بیگ خاں کے پاس تھوڑی سی جمعیت تھی اس لیے ایک ہی حملہ میں ہیمو نے تردی بیگ خاں کو شکست دے کر بھاگا۔ لیکن اس دُور سے ان کا تعاقب نہیں کیا کہ کہیں مغل دھوکہ دے کر دوبارہ پلٹ پڑیں۔

مغلوں کے وہ امیر جو ہیمو کے مہم کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے جب شام کے وقت لوٹ کر آئے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کیوں کہ ان کے چھوڑے ہوئے مورچوں پر ہیمو کی فوج قبضہ کیے ہوئے نظر آرہی تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ دہلی سے نکل کر بھاگ گئے۔ خان زماں بھی میرٹھ کے راستہ کوچ کر کے ان لوگوں سے سرہند میں آکر مل گیا۔

جب اکبر کو دہلی کی شکست کا۔ ان معلوم ہوا تو اس نے سکندر کے مقابلہ کے لیے خضر خاں خواجہ کو متعین کر دیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبند بیگم اسی خضر خاں کے نکاح میں تھی اور خود ہیمو کی سرکوبی کے لیے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جس وقت اس نے سرہند میں منزل کی تو ہیمو سے شکست کھا کر آنے والے امیر شاہی لشکر سے آکر مل گئے۔

لے گلبند بیگم۔ یہ شہزادی بابر کی بیٹی ہے۔ کابل کے مضافات میں ۱۵۲۳ء کو اس کی ولادت ہوئی تھی۔ جس وقت بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا اس وقت گلبند بیگم کی عمر ڈھائی سال تھی۔ گلبند بابر کی پانچویں بیوی دلدار بیگم سے ہوئی تھی اس بیگم سے تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے بڑا لڑکا ہندال ہے جو ۱۵۱۹ء میں پیدا ہوا۔ گلبند بیگم اس سے چھوٹی ہے اسکی بڑی دو بہنوں کا نام گل رخ اور گل چہرہ تھا۔ اس نے اپنے چچا کا یہ ذکر لکھا ہے۔ میں نے شکر کو جاتے دیکھا اور دل میں یہ خیال کیا تھا کہ پل کے پل میں یہ منظر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گا چنانچہ فوج کے چلے جانے کے بعد مہینوں اور برسوں میری نظروں میں کابل کی مشرقی سرحد کا یہ منظر چتراروں پر اشارہ باری فوج کے ہندوستان پر روانگی کی طرف ہے۔ گلبند کی تربیت ہایوں کی ماں ماہم بیگم نے کی تھی۔ جس روز آگرہ میں گلبند نے اپنے باپ کو بادشاہ بننے دیکھا تو (وہ لکھتی ہے) بابر کی شخصیت کا رعب مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ میں اس سے بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی اس لیے میں اس محفل کے واقعات کو یاد نہ رکھ سکی۔ بابر کا انتقال ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو ہوا۔ گلبند لکھتی ہے: شاہ بابا کی وفات سے دن تیرہ و تار ہو گیا اور ہم سب نے اس قیامت کے دن کو گوشوں میں جھپٹ کر رخ و الم میں گزارا۔ جب ہایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر آگرہ میں داخل ہوا تو گلبند سترہ سال کی تھی اور اسکی شادی ایک چھوٹے لڑکے خضر خواجہ خاں سے ہو چکی تھی۔ خضر کے باپ کا نام امین خواجہ تھا اس نے اس وقت جب کہ سب بھائی ہایوں کو چھوڑ کر جا رہے تھے ہایوں کے ساتھ رہتا ہی گوارا کیا اور کامران مرزا کے اصرار پر بھی وہ اس کے ساتھ نہ گئی۔ شیر شاہ کی بیٹا اور ہایوں کے فرار کے متعلق وہ لکھتی ہے: ہمارے لیے یہ دن کسی طرح قیامت سے کم نہ تھا۔ ہم اس قدر پریشان تھے کہ میں اپنی سراسیمگی کو کسی چیز سے تشبیہ نہیں دے سکتی۔ گلبند کا حقیقی بھائی ہندال ۲۰ نومبر ۱۵۵۱ء میں مارا گیا تھا۔ اس نے اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے: یہ تو تار میرے لڑکے اور شوہر کو اس شب خون میں کیوں نقصان نہیں پہنچا اور یہ بجلی صرف میرے بھائی پر ہی کیوں گری۔ اکبر کے زمانہ میں ۱۵۵۵ء کو گلبند بیگم شاہی خواتین کے قافلہ کے ساتھ دہلی آگئی ۱۵۵۵ء سے ۱۵۵۷ء تک اس کے حالات کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ہر حال وہ ایک بادشاہ کی بہن ایک بادشاہ کی پھوپھی کی حیثیت سے یہ زمانہ گزار گئی۔ عہد اکبری میں اس کے ایک سفر کا حال ملتا ہے جس میں اس کا خیمہ اکبر کے خیمے سے متصل نصب تھا اور اس نے اس سفر میں راجپوت عہد قلات کے طرز زندگی کا مشاہدہ کیا تھا۔ ۱۵۵۷ء میں گلبند اکبر کی مرضی کے خلاف حج کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس قافلہ کا سردار سلطان خواجہ تھا اس وقت اسکی عمر بائیس سال تھی۔

**روی بیگ کا قتل** | خانخانان بیرم خاں کو تردی بیگ خاں سے سابقہ رنجش تھی لیکن وہ اسے دکھاوے کے لیے ”طوقان“ دہڑا بھائی، کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اب اسے موقع ملا تو اس نے اکبر کو یہ باور کرایا کہ اس شکست کا ذمہ وار

روی بیگ خاں ہے۔ تصدیق کے لیے خان زمان اور دوسرے امیروں سے شہادت بھی دلوادی اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس کے قتل کی اجازت لے لی پھر سیر کے بہانے تردی بیگ خاں کے کیمپ میں جا کر اس کو اپنے خیمہ میں بلالایا۔ جب مغرب کا وقت ہوا تو طہارت بہانہ کر کے وہاں سے ٹلی گیا اور اپنے آدمیوں کو جنہیں اس نے اس غرض سے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا اشارہ کر دیا۔ ان لوگوں نے خیمہ میں داخل ہو کر تردی بیگ خاں کو قتل کر دیا۔ قتل کے دوسرے دن خانخانان دربار میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے اسی الزام میں تردی بیگ کے داماد خنجر بیگ اور خواجہ سلطان علی میرنشی کو بھی گرفتار کر لیا تھا لیکن یہ لوگ کچھ دن بعد رہا ہو گئے تھے۔

**پانی پت میں فوجوں کی آمد** | اس عرصہ میں ہیمو نے دہلی میں بڑی قوت پیدا کر لی اور اپنا خطاب راجہ بکر ماجیت رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ جب اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی تو ایک ہزار پانسو جنگی فوجیں کافی مال و دولت اور بکثرت لشکر لے کر پانی پت پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں آچکا تھا۔ ادھر اکبر بھی چند امیر خان زمان، اسکندر خاں وغیرہ بھی لشکر سے آگے نکل کر پانی پت پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے پہل کر کے ہیمو کے ہراول پر حملہ کر دیا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد اس کا توپ خانہ چھین لیا۔

ہیمو نے اپنے لشکر کے پٹھانوں کو جن کا سردار شادی خاں میواتی تھا مناصب اور جاگیروں میں اضافہ کا لالچ دے کر اور ان کو نفی روپیہ اور انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، لیکن یہ پٹھان ہیمو کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے اور دل سے اس کی شکست و بربادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال ہیمو اپنی اس کثیر فوج کو لے کر ہوائی نامی ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور راتوں رات کوچ کرتے ہوئے پانی پت پہنچے چھوڑ کر موضع کھر سندھ میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

**پانی پت کی دوسری لڑائی** | دس محرم ۹۶۳ھ جمعہ کے دن صبح خان زمان اور اسکندر خاں ہراول کے امیروں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اکبر بھی شاہی لشکر کے ساتھ معرکہ گاہ سے تین کوس کے فاصلہ پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے امرائے لشکر کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ ہیمو کے ساتھ جو امیر تھے وہ سب کے سب اس سے برہم اور بیدل تھے۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے

اکبر نے قندک میں معرکہ پانی پت کی تاریخ ۲ محرم ۹۶۳ھ لکھی ہے۔

اس کے بعد پچاس سال سے زیادہ ہو چکی تھی اس نے اپنے سفر کا حال نہیں لکھا۔ یہ سفر سورت کی بندرگاہ سے کیا گیا تھا۔ یہاں تقریباً ایک سال کی تاخیر ہو گئی آخر ۱۱ اکتوبر ۱۵۵۸ء کو گلبند کا قافلہ جہازوں پر روانہ ہوا۔ سارے تین سال بعد یہ قافلہ مارچ ۱۵۵۹ء میں فتح پور سیکری واپس آگیا۔ گلبند نے اسی سال عمر پائی۔ ۱۵۶۰ء میں بخار کے سفر میں اس کا انتقال ہوا۔ اکبر کے عہد میں اس کے حالات کا ذکر تاریخوں میں بہت کم ملتا ہے۔ تاریخوں میں ایک جگہ وہ سلیم کے ساتھ شہزادہ سلیم کا قصور معاف کرانے کے لیے اکبر کے دربار میں نظر آتی ہے۔ ایک جگہ وہ حمیدہ بانو بیگم کے ساتھ شاہی رقم کا تدارانہ اور جواہرات قبول کرتی ہوئی ملتی ہے۔ اور اس کا کچھ ذکر اس کے نواسے محمد یار کے حوالے سے ملتا ہے۔ محمد یار کو دربار سے نکال دیا گیا تھا اس وقت اس کی عمر ستر (۷۰) سال تھی۔

گلبند کی یادگار اس کا ”ہایوں نامہ“ ہے۔ یہ اس عہد کی ایک مختصر سی دستاویز اور راہم ماخذ ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گلبند نہ صرف یہ کہ ایک اچھی شاعر تھا بلکہ مورخ بھی اچھی تھی نہایت سادہ لیکن موثر طرز بیان میں اس نے اپنے چشم دید واقعات قلمبند کر دیے ہیں وہ شاعر بھی تھی۔ میر صمدی شیرازی نے اپنی کتاب تذکرۃ الخواص میں اس کا یہ شعر درج کیا ہے۔

بربری کی او یہ عاشق خود یار نیست

تو یقین میدان کہ بیج از عمر بخوردار نیست

ہیمو صرف ہاتھیوں کی لڑائی پر بھروسہ کیے ہوا تھا چنانچہ اس نے پہلی یلغار ہی میں ہاتھیوں کا ایک بڑا غول لے کر کبری فوج پر حملہ کر دیا یہ حملہ بڑا سخت اور ہولناک تھا شاہی لشکر میں افراتفری سی پھیل گئی، لیکن جلد ہی اکبر کے امیروں نے اپنی اپنی صفوں کو سمجھال کر ان کا منظم طریقہ سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی اور ہیمو کے ہاتھی بوکھلا گئے۔ اس محاذ پر جب ہیمو فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے اپنے رُخ بدل دیا اور ہاتھیوں کو دوسرے محاذ پر جہاں خان زماں کمان دار تھا پہنچا دیا۔ خان زماں نے بھی اس کی فیل سوار فوج کو تیروں کی بارش زد پر رکھ لیا۔ اس موقع پر ہیمو باؤلے کتے کی طرح ادھر ادھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا کبھی کچھ منتر پڑھنے لگتا اور کبھی مار مارو کا غل غل مچانے لگ جاتا تھا۔ اسی دوران میں ایک تیرا یا آکر لگا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اس کی فوج بدحواس ہو کر منتشر ہو گئی۔ شادی خانا نے میواتی بھی اسی معرکہ میں مارا گیا۔

ہیمو کی فوج کے سپاہیوں نے ہی شاہ قلی خاں محرم یلغار کرنا ہوا ہیمو کے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔ فیل بان نے کہا کہ مغل فوج کی کامیابی مجھے مار کر کیا لوگے، تمہارا دشمن ہیمو اسی ہاتھی پر عماری میں پڑا ہوا ہے۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں ہیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس پیش کیا گیا۔ شیخ گدائی کبوا اور دوسرے امراء نے عرض کیا ”چونکہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے اس لیے آپ بھی اس کا فریاد اپنی تلوار آزمائیں“ انہوں نے ان کو جہاد دیا ”یہ مردہ پڑا ہوا ہے“ اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو میں تیغ آزماتا“ آخر خان خاناں نے سب سے پہلے ہیمو پر تلوار چلائی۔ اس کے بعد شیخ گدائی نے پھر دوسروں نے بھی اس فرض کو ادا کیا اور اس بد بخت کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔

اس فتح کی تاریخ ان اشعار سے نکلتی ہے۔

زروئے مکر و تزویر و دغا گر حضرت دہلی  
بدست افتاد ناگہ از قضا ہیمو ہندورا  
جلال الدین محمد اکبر آں شاہ فلک رفعت !  
بعون لطف حق بگرفت ہندوئے سیرور  
دیر صناع بر لوج بقا با خسامہ قدرت  
رقم زوہر سال فتح آں بگرفت ہیمورا

اکبری فوج کو پانی پت کی اس فتح کے نتیجے میں ایک ہزار پانسو ہاتھی بے شمار خزانہ اور کافی مال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیمو کی شکست خوردہ فوج کے تعاقب میں پیر محمد خاں اور مہدی قاسم خاں کا داماد حسین خاں روانہ ہوئے۔ ہیمو کی بیوی ایک بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی نکل بھاگی تھی۔ تعاقب کرنے والے دستوں نے اس کو اور کے آگے جا کر گھیر لیا۔ اور وہ خزانہ چھوڑ کر بجواوا لے توڑک جہانگیری میں ہیمو کے سواروں کی تعداد ۴۰ ہزار اور اکبر کے لشکر کی تعداد چار پانچ ہزار درج ہے۔

یہ توڑک جہانگیری میں اس واقعہ کی تفصیل اس طرح ہے: پیرم خاں نے عرض کیا مناسب یہ ہے کہ حضور اپنے دست مبارک سے اس کافر کا سر الگ کر دیں تاکہ جہاد کا مرتبہ حاصل ہو اور فرامین میں آپ کے نام کے ساتھ غازی کا لفظ بڑھایا جائے۔ میرے والد نے کہا میں نے پہلے ہی اسے پانہ پارہ کیا ہے، میں ایک بار کابل میں خواجہ عبدالصمد شیرازی قلم سے تصویر سازی کی مشق کر رہا تھا بے خیال میں میرے قلم سے ایک ایسی تصویر بنی جس کے اعضاء الگ الگ تھے میرے ایک مصاحب نے پوچھا یہ کس کی تصویر ہے میری نماں نکلا، ہیمو کی۔ عرض میرے والد نے اس کے خون سے ہاتھ آلودہ نہیں کیا اور ان کے حکم سے ایک خادم نے اس کی گردن اڑادی۔ ہیمو کے لشکر کے پانچ ہزار آدمی لے کر



کو اے کوہستان میں جان بچا کر بھاگ گئی۔ اس کا خزانہ کچھ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل لشکریوں کے ہاتھ آیا، پھر بھی وہ اتنا تھا کہ سپاہیوں نے ڈالوں میں بھر بھر کر اسے بانٹ لیا جس راستہ سے بیہو کی بیوی گزری تھی اس پر اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں اتنی گری تھیں کہ ایک عرصہ تک وہ راہ گروں کو ملتی رہیں۔ یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ کے زمانہ سے عدلی کے عہد تک جمع ہوتا رہا تھا۔ زمانہ کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا اور وہاں فتح کی خوشی میں پھولوں کا ایک مینار لگوا دیا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے بڑے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا۔ منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بادشاہ ایک مہینہ تک دہلی میں مقیم رہا اور وہاں سے اس نے آگرہ اور سنبھل کی طرف امرار کو روانہ کیا۔

دہلی کے قیام ہی میں یہ خبر ملی کہ لاہور سے بیس کوس پر موضع چیماری میں اکبری امیر خضر خاں کو سکندر نے حملہ کر کے شکست دے دی اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا ہے۔ اس پر اکبر نے دوبارہ پنجاب کا رخ کیا۔ جب جالندھر پہنچا تو سکندر پھر کوہ سواک کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے دیسوڑہ اور دہمیری تک اس کا تعاقب کیا۔

یہ واقعات ابتدائے جلوس سے متعلق تھے۔ اب میں جزئیات کو چھوڑ کر بڑے بڑے واقعات کو جو اکبری عہد کے چالیس سال میں رونما ہوئے اجمالاً تحریر کروں گا۔

**سکندر افغان کی اطاعت** | سکندر برابر اکبر کی فوج سے برسرِ پیکار تھا۔ اسی سال وہ قلعہ مانکوٹ میں محصور ہو گیا۔ مغل لشکر و زمانہ اس پر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں سے اس کی جان عذاب میں آگئی تھی۔

اکبری فوج میں سے ہمدی قاسم خاں کے داماد محمد حسین خاں نے ان معرکوں میں بڑی جانشاری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کا بھائی حسن بیگ بھی اسی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اکبر نے حسین خاں کے دیرانہ کارناموں کی بڑی قدر کی اس کو روز بہ روز اونچے درجوں پر ترقی ملتی رہی اور ابھی سے اچھی جاگیریں بھی اسے مرحمت کی گئیں۔ آخر میں لاہور کی حکومت پر اسے فائز کیا گیا۔

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور قلعہ بند فوج غلہ کی کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگی تو سکندر کے رفیق کھسکنے لگے۔ چنانچہ سید محمود بادہ وغیرہ سکندر سے ٹوٹ کر اکبر سے آکر مل گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر نے صلح کی سلسلہ جنابانی کی اور اپنے بیٹے عبدالرحمن کو خاں خاں خور کے ہمراہ آنکھ خاں اور پیر محمد خاں کو وسیلہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سفارت ۲۷ رمضان ۹۶۲ھ کو بارگاہ شاہی میں دریا بام ہوئی۔ اس نے بہت سے ہاتھی نذر گزارنے اور قلعہ بھی سپرد کر دیا۔

اکبر نے شرائط صلح کے متعلق جو فرمان لکھوایا تھا اس کی رو سے جو پور عارضی طور پر سکندر کی جاگیر میں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ دوسرے اور علاقوں کو فتح کرے تو جو پور پر خاں زماں اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس فرمان کے بموجب سکندر پہاڑوں کے راستہ سے کوچ کرتے ہوئے جو پور پہنچ گیا۔ بعد میں جب خاں زماں نے جو پور پر قبضہ کر لیا تو حسب فرمان سکندر نے گور پر ہنگامہ کشی کی۔ لیکن وہاں اسے ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا کہ گور تو اس کے ہاتھ کیا آتا چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ وہ وہ گور کی آغوش میں چلا گیا۔

اکبر نے جس زمانہ میں قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا، محمد قلی خاں برلاس، آنکھ خاں اور دوسرے چند امرا کا بل جا کر بادشاہ بیگم

اور خانوادہ شاہی کے دوسرے افراد و مستورات کو اپنے ساتھ لشکر میں لے آئے تھے۔

**اکبر کی لاہور کو روانگی** | بادشاہ نے دوسری شوال ۹۶۴ھ کو لاہور کا رخ کیا۔ اسی سفر کے دوران خانخاناں اور آنکھ خاں میں بدگمانی اور شکر رنجی پیدا ہو گئی۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی منزل میں شاہی ہاتھی دوڑتے ہوئے خانخانان کے

سراپردہ پر سے گزر گیا۔ خانخانان کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت آنکھ خاں نے قصداً کی ہے۔ جب لشکر لاہور پہنچا تو آنکھ خاں اپنے تمام بیٹوں کو لے کر خانخانان کے پاس آیا اور کلام پاک کی قسم کھا کر اس نے اپنی بریت ظاہر کی اور خانخانان کی بدگمانی رفع ہو گئی۔

اسی سال ملا عبداللہ سلطان پوری کے توسط سے سلطان آدم کھکھ لاہور آکر اکبر کے حضور میں باریاب ہوا۔ لاہور میں خانخانان کے ساتھ اس کا بڑا ایار نہ ہو گیا اور اکبر نے اس قضیہ کا فیصلہ کر دیا جو سلطان آدم اور اس کے بھتیجے کمال خاں کے مابین جاری تھا۔ اس طرح سلطان آدم بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا۔

**دہلی میں داخلہ** | موسم باراں کے ختم ہونے پر اکبر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ جالندھر میں جب منزل ہوئی تو ہالیوں کی بھانجی اور میرزا نور الدین محمد کی بیوی کی سلیمہ سلطان بیگم کا نکاح خان خانان بیرم خاں کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اور

ایک بڑا جشن شادی کی تقریب میں منعقد کیا گیا۔ دونوں طرف سے دل کھول کر روپے لٹائے گئے۔

۲۵ جمادی الثانی ۹۶۵ھ کو اکبر دہلی میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں خان خانان ہر ہفتہ دو مرتبہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر دوسرے اور امرار کے مشورہ و تعاون سے انتظامی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

**خان زماں اور شاہم بیگ کا معاشقہ** | اس زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ان میں شاہم بیگ کے ساتھ خان زماں کی عشق بازی کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہالیوں بادشاہ کے

کے قورچیوں کے عمل میں دو خوبصورت اور خوش مزاج لڑکے شامل تھے ایک کا نام خوش حال بیگ اور دوسرے کا نام شاہم بیگ تھا۔ شاہم بیگ طہاسپ کے ساربان کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف خوش خلق و پسندیدہ اطوار تھے بلکہ دلیری اور بہادری میں بھی ہم چشموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب کہ خان زماں کا سنبھل پر تقرر نہیں ہوا تھا اسے شاہم بیگ سے بڑا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حال شاعر کے اس مفہوم سے مختلف نہ تھا۔

لے سلطان سلیم بیگم یہ شادی ایک سیاسی مصلحت ہی تھی کیوں کہ شادی کے وقت سلیمہ کی عمر پانچ سال تھی اس کی پیدائش ۹۶۱ھ میں ہوئی شادی ۹۶۴ھ میں ہوئی۔ اکبر اس رشتہ کے ذریعہ بیرم خاں کا اعزاز اور سلطنت سے اس کے تعلق کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ بابر کی بیوی گلرخ بیگم سلیمہ کی والدہ تھی اس طرح یہ ہالیوں کی حقیقی بھانجی تھی۔ سلیمہ کے والد مرزا نور الدین محمد نقشبندی خواجہ زادوں میں سے تھے۔ سلیمہ سلطان نہایت نیک سیرت شیریں کلام حاضر جواب صاحب علم و سلیقہ خاتون تھی۔ مطالعہ کا بڑا ذوق تھا، ارہاب سخن کی قدردان تھیں، خود بھی شعر کہتی تھیں۔ جہانگیر اپنی توڑک میں لکھتا ہے:-

”یہ جمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند در زناں این مقدار ہمز و تالیبت کم جمع مے شود۔“ (توڑک جہانگیری ص ۱۱۴)

معنی تخلص تھا، اس کا مشہور شعر ہے:- کاکلت را من زمستی رشتہ جاں گفتم ام

مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتم ام

دجہانگیر نامہ کشوری ص ۶۶۱ مآثر الامرا ص ۴۳

۹۶۵ھ میں جب اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم حج کو گئیں تو یہ بھی ہمراہ تھیں چار حج کیے ۹۶۵ھ میں ہند واپس آئیں۔ بیرم خاں کی وفات کے بعد اکبر نے سلیمہ سلطان سے عقد کر لیا تھا (مآثر الامرا ص ۴۳) ۹۶۵ھ کے واقعات میں جہانگیر نے توڑک میں لکھا ہے (ص ۱۱۴) جس وقت نور جہاں بیگم کی والدہ نے عطر گلاب پہنا تو ہمیں اس کی خوشبو بہت پسند آئی۔ ہم نے ان کو ایک مقدمہ وارید عطا کیا، سلیمہ سلطان بیگم تشریف رکھتی تھیں انہوں نے عطر جہانگیری اس کا نام رکھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عطر گلاب نور جہاں کی نہیں جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ اس کی والدہ جہانگیر کی تھیں۔

نشان بر تختہ رستی نبود از عالم و آدم  
کہ جان در مکتب شوق از تمنائی تو میزدوم  
کہ دارد این چنین عیشی کہ در عشق تو من دارم  
شرابم خون کسبالم ذل ندیم در و تقلم غم

ہالیوں کے انتقال کے بعد جب خان زماں اکبر بادشاہ کی خدمت سے وابستہ ہوا تو اس نے شاہم بیگ سے اس بات کا  
مطلوبہ قرار دیا کہ وہ شاہی ملازمت ترک کر کے اس کے پاس آجائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھنؤ سے اپنے چند آدمی دہلی بھیجے کہ وہ شاہم بیگ  
کو بھگا کر لے آئیں۔

ماوراء النہر کے دوسرے عیاش امیروں کی طرح جو جوانوں کو شاہی مراتب کا لالچ دے کر بہار کا موسم عیش و نشاط میں گزارا کرتے  
ہے۔ خان زماں بھی شاہم بیگ کی خاطر داری اور خوشامدی میں لگا رہتا تھا اور اسے بادشاہ کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اس کے عشق میں اپنے  
پ کو بھول گیا تھا اور اکثر اوقات اس کی رکاب پکڑ کر خدمت گاروں کی طرح اس کی خدمت میں کھڑا رہتا تھا۔

میں نے ابوالغیث بخاری دہلوی کی زبان سے جن کے ساتھ شاہم بیگ کو بڑی عقیدت تھی۔ یہ بھی سنا ہے کہ جس زمانہ میں شاہم بیگ  
لکھنؤ سے جون پور گیا تھا، باجماعت نماز درود خوانی اور تلاوت کلام پاک کا بڑا پابند تھا۔ ہمیشہ طہارت و پاکی کا خیال رکھتا تھا  
اور برائیوں کی طرف اس کا میلان نہ تھا۔ شاہم بیگ کی خاطر خان زماں بھی بڑا متقی اور پرہیزگار بن گیا تھا۔ اپنے لشکر میں بھی اس  
کے غیر شرعی باتوں کی روک تھام کے لیے محتسبوں کا تقرر کر دیا تھا۔ اور شاہم بیگ کی تعلیم کے لیے میر سید محمد علی کو جو سات قرائوں  
کے قاری تھے مقرر کیا تھا۔ راقم نے بھی سلیم شاہ کے عہد میں سنبھل میں مکی صاحب کے سامنے اپنی قرأت کی اصلاح کی تھی۔ غرض  
خان زماں اس خوب روٹ کے کی ہر طرح خاطر داری کرتا رہتا تھا۔ روٹوں کی پاک بازی کم سنی تک ہی رہتی ہے۔ شاہم بیگ کے  
ل چلن بھی بہت جلد بگڑ گئے۔

**رام جان** | آرام جان نامی ایک حسین اور دل بہا طوائف تھی۔ شاہم بیگ کا اس پر دل آگیا۔ اور وہ بھی دل و جان سے اس  
نوجوان پر فریفتہ ہو گئی۔ یہ طوائف پہلے سے خان زماں کے نکاح میں تھی۔ اس نے شاہم بیگ کو جب اس کی طرف  
دیا یا تو اس طوائف کو اس کے حوالہ کر دیا۔ شاہم بیگ نے چند دن اس کے ساتھ خوب رنگ ریاں منائیں۔ جب جی بھر گیا تو اسے  
نے ایک جانی دوست عبدالرحمن بن مؤید بیگ کو بخش دیا۔

عشق بازی کے یہ قہرے جب بادشاہ سلامت کے سننے میں آئے۔ سلطانی غیرت جوش میں آگئی۔ اور شاہم بیگ کی حاضری کے  
ان آگہ اور دہلی سے جون پور پہنچے۔ اس علاقہ کے جاگیرداروں کے نام بھی فرمان صادر ہوا کہ اگر خان زماں تعمیل حکم میں پس و پیش  
کے تو سب مل کر اس کی گواہی کریں۔

خان زماں نے اپنے ایک معتمد آدمی برج علی کو اپنے قصوروں کی تلافی کے خیال سے دہلی روانہ کیا۔ برج علی سب سے پہلے  
ن خانوں کے نائب پیر محمد خاں کے مکان پر گیا۔ برج علی پہنچا تو وہ ایک برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ برج علی نے خان زماں کے پیغام سے  
مطلع کیا۔ غالباً باتوں باتوں میں کوئی ناگواری پیدا ہو گئی اور پیر محمد خاں نے برج علی کی سخت بات پر اسے برج پر سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔

اس صدمہ سے وہ بے چارہ مٹی کا ڈھیر بن گیا اور اس ظالم نے سنگ دلی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہا "یہ کمینہ اب اسم بہ مسمیٰ بنا ہے۔"

خان زماں کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے جدائی کا پتھر اپنے سینہ پر رکھ کر شاہم بیگ کو سر ہر پور کے پرگنہ میں بھیج دیا۔ یہ پرگنہ جون پور سے اٹھارہ کوس پر اس کے دوست عبدالرحمن بیگ کی جاگیر میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہم بیگ کچھ عرصہ تک وہاں سیر و شکار میں مصروف رہے۔ جب بادشاہ سلامت کا غصہ ٹھنڈا پڑے تو لوٹ آئے۔

**شاہم بیگ کا انجام** | سر ہر پور میں شاہم بیگ کی عبدالرحمن بیگ کے ساتھ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ آرام وہ خوب صورت مکان تھا جس کے ساتھ ایک سرسبز و شاداب باغ ایک خوش منظر تالاب کے کنارے تھا۔ دونوں دوست عیش و نشاط کے جلے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی۔

نشاط کے جلے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی۔

سرود و عاشقی و مے پرستی

سبب شد ہر سرچیز ہر مستی

عالم مستی میں شاہم بیگ نے عبدالرحمن بیگ سے آرام جان کو بلانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے نکاح کا عذر کر کے اس کی فرمائش ٹال دیا۔ اس بات سے شاہم بیگ کو بڑا رنج ہوا اور دونوں کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ اور شاہم بیگ نے غرور و مستی کی وجہ سے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ عبدالرحمن کو گرفتار کر لیں۔ پھر اس نے اس گھمنڈ میں کہ آرام جان پہلے اسی کی تھی عبدالرحمن کے مکان میں سے اپنے پاس بلوایا اور اس کے ساتھ خوش وقتی میں مشغول ہو گیا۔

عبدالرحمن کے چھوٹے بھائی موید بیگ کو اس کی حرکت پر بڑی غیرت آئی اور وہ ایک جمعیت لے کر اس بالا خانہ کی طرف گیا جس میں شاہم بیگ آرام جان کو بیٹے پڑا تھا۔ شاہم بیگ بھی مقابلہ پر آ آیا۔ دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ شاہم بیگ کو اس نشہ کی حالت میں ایک تیرا یا آ کر لگا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے فوت ہونے کی تاریخ اس مصرع سے نکلتی ہے۔

برداشت آہ و گفت کہ شاہم شہید شد

عبدالرحمن بیگ قید سے چھوٹ کر دربار شاہی کے ارادہ سے رخصت ہو گیا۔ خان زماں نے اپنے محبوب کے غم میں ماتی لباس پہن لیا اور عبدالرحمن بیگ کا گنگا تک تعاقب کیا۔ وہاں سے باچشم گریاں مایوس و ناکام لوٹ آیا۔

در ماتم شمس از شفق خوں چکید

مہ روئی بر کند و زہرہ گیسو بہ بید

شب جامہ سیاہ کردانیں ماتم و صبح

برز و نفسے مرد و گریباں درید

**خان زماں کی معرکہ آرائی** | ان چند سالوں میں خان زماں نے باوجود مختصر جمعیت کے افغانوں کی ایک بھاری فوج سے دیر انداز جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اس سلسلہ کی اس نے جتنی روایتیاں روئیں وہ بلاشبہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

لے "آہ" کے عدد خارج کر دیئے جائیں تو ۹۶۲ھ تاریخ نکل آتی ہے۔ اس مادہ تاریخ کے باوجود قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ اسی سال پیش آیا تھا۔ ایک سال پہلے۔ سال گزشتہ ہی زیادہ قریب قیاس ہے۔

ہے۔ انہی لڑائیوں میں سے لکھنؤ کی جنگ بھی ہے جس میں حسن خاں بچکوتی بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ خان مال کے پاس تین چار ہزار سے زیادہ کی جمعیت نہیں تھی۔

جب غنیم نے کروی ندی کو عبور کر کے بہادر خاں کی فوج پر حملہ کر دیا تو خان زماں کھانے کے لیے دستر پر بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے آکر کہا کہ غنیم سر پر آپہنچا ہے تو اس نے شطرنج لانے کا حکم دیا اور بڑے اطمینان سے شطرنج کھیلنا رہا۔ پھر لوگ دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ دشمن نے آدمیوں کو پسپا کر دیا ہے تو اس نے ہتھیار منگائے۔ جس وقت دشمن کے سپاہی سر پرندوں کو لوٹتے پھر رہے تھے اور اس کا سارا لشکر منتشر ہو چکا تھا خان زماں نے بہادر خاں کو رخصت کر دیا اور خود تھوڑے سے آدمیوں کو ساتھ لیکر نغارہ بجاتے ہوئے دشمن کے مقابلہ پر آیا اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ غنیم کے پیر اکھڑ گئے اور پٹھان بھاگ نکلے۔ خان زماں نے سات آٹھ کوں تک ان کا تعاقب کیا اور بہت سارے پٹھانوں کو تہ تیغ کر دیا۔

لکھنؤ کی جنگ کی طرح جون پور کی لڑائی بھی اس کی بہادری کا ایک کارنامہ ہے۔ بنگالہ میں کوریہ نے سلطان بہادر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ پھر وہ بنگال سے تیس چالیس ہزار سوار لے کر جون پور پر حملہ آور ہوا۔ مقابلہ میں خان زماں کا سارا لشکر تباہ و برباد ہو گیا۔ جس وقت غنیم پہنچا ہے خان زماں دستر سے اٹھ کر بس گیا ہی تھا۔ حملہ آوروں نے دستر کو اسی طرح جما ہوا پایا تو بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر خان زماں ایک مختصر سی جمعیت اکٹھی کر کے پٹھانوں پر بلائے ناگمانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور انہیں شکست دے کر بھاگ دیا۔ بہت سے پٹھان قتل اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اس قدر مال غنیمت مغل لشکریوں کے ہاتھ لگا کہ انہیں اور کسی چیز کی آرزو نہ رہی۔

پنج تو یہ ہے کہ بادشاہ کے اقبال سے اس نے اور اس کے بھائی نے اپنی فوج کے ساتھ مشرقی ہندوستان میں جیسی فتوحات حاصل کیں وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوتی۔ اگر ان کا دامن معصیت سے داغدار نہ ہوتا تو کیا عجب کہ شاہی اعزاز سے نوازے جاتے۔ اپنی سرکشی کی وجہ سے انہوں نے اپنے یہ سارے کارنامے خاک میں ملا دیئے۔ ان کا باقی حال مناسب موقع پر بیان کیا جائے گا۔

اسی سال خانتخاں نے خواجہ کلاں بیگ کے رد کے مصاحب بیگ کو جو نہایت شرسپند اور ظالم آدمی تھا قتل کر دیا۔

۱۷۶۵ء محرم ۱۱۷۵ھ کو جلوس کے تیسرے سال اکبر کی شاہانہ سواری آگرہ میں داخل ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جس میں پیر محمد خاں کو عروج بھی نصیب ہوا اور سال بھر کے اندر اندر زوال بھی آگیا۔

## اکبر کا آگرہ میں داخلہ

لے آگے۔ آگرہ کو سلطان سکندر لودھی نے دریائے جمن کے کنارے آباد کیا تھا۔ موجودہ شہر اکبر کی یادگار ہے اس نے ۱۵۶۵ء میں اسے اکبر آباد کا نام دیا۔ دہلی سے پہلے یہ ہندوستان کا پایہ تخت رہا۔ احمد اکبری میں صوبہ اکبر آباد کے تخت اکبر آباد، بیان، سیکری، گوالیار، کاپی، مستھرا، کن پور، بھرت پور، اور کے شہر تھے۔ جہانگیر نے اپنی فوج میں آگرہ کا محل کھلا ہے۔ آگرہ ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ہے۔ جمن کے کنارے اس میں ایک پرانا قلعہ تھا۔ میرے باپ نے میری ولادت سے پہلے اسے گرا کر نیا قلعہ سرخ پتھر کا بنوایا یہ قلعہ پندرہ سو سال میں تیار ہوا۔ اس پر ۳۵ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ جمن کے دونوں کناروں پر شہر آگرہ کی آبادی ہے۔ وسعت اتنی ہے کہ عراق خراسان اور اورام النہر جیسے چند شہر اس میں آباد ہو سکتے ہیں۔ مکانات اکثر سہ منزلہ چار منزلہ ہیں۔ لوگوں کا ہجوم اس قدر رہتا ہے کہ راستہ چلنا مشکل۔ شاہ جہاں آباد دہلی کے آباد ہونے تک آگرہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب سلطنت مغلیہ کو زوال ہوا تو جاٹ اور مرہٹے آگرہ پر قابض ہو گئے۔ ۱۷۸۵ء میں یہ انگریزی قبضہ میں آیا۔ یہاں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔ تاریخی عمارتوں کی وجہ سے آگرہ ایک یادگار شہر ہے۔ شاہجہان کی بنائی ہوئی موزیہ جامع مسجد سکندر، فتح پور سیکری تاج محل، قلعہ موتی مسجد وغیرہ اس کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔ ابو الفضل اور فیضی آگرہ ہی کے متوطن تھے۔



پیر محمد خاں پہلے صرف ملتا تھا۔ ملاگیری سے وہ امارت کے اس درجہ پر پہنچا کہ تمام امور مملکت میں وہ خانخاناں کی نیابت کرنے دگا تمام امراء اس کے دروازہ پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور بہت کم لوگوں کو باریابی کا موقع ملتا تھا۔

اس کے جاہ و حشم کا یہ حال تھا کہ جس وقت لشکر دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں خانخاناں پیر محمد خاں کے ساتھ شکار کے لیے نکل گیا۔ خانخاناں کو جب بھوک لگی تو اس نے

## پیر محمد خاں کا عروج و زوال

اپنے رکاب والوں سے پوچھا کہ ”ہمارے ہمراہ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی ہے؟“ پیر محمد خاں نے اسی وقت عرض کیا ”اگر آپ یہاں ٹھہر جائیں تو جو کچھ میرے ساتھ ہے خدمت میں پیش کیا جائے گا۔“ خانخاناں اپنی جمعیت کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پیر محمد خاں کے رکاب خانہ سے اس وقت تین موثریت کے پیالے اور سات سو کھانے کی رکابیاں و ستر پر چنی گئیں۔ اس کے ٹھاٹھاٹ کو دیکھ کر خان خانان حیران رہ گیا۔ بہ ظاہر تو کچھ نہ کہا لیکن دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اسی وقت سے خان خانان کا دل اس سے پھر گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد پیر محمد خاں کچھ دن تک بیماری میں مبتلا رہا۔ ایک دن خانخاناں اس کی عیادت کے لیے گیا تو اس کے ایک غلام نے اسے داخل ہونے سے روک دیا۔ کیوں کہ پیر محمد خاں نے امراء وغیرہ کے داخلہ پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اور خان خانان سے کہا جب تک اجازت آجائے آپ توقف فرمائیں۔ خان خانان کے لیے یہ بات جلتی پرتی سے کم نہ تھی۔ جب پیر محمد خاں کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مرض کی نقابت کے باوجود دوڑا ہوا آیا اور خان خانان سے معافی چاہی کہ ”دربان نے آپ کو پہچانا نہیں۔“ خان خانان نے اس کے جواب میں صرف ایک معنی خیز جملہ کہا ”اور تم نے بھی نہیں۔“ اس واقعہ کے باوجود پیر محمد خاں کے دربانوں نے خان کے ملازموں میں سے کسی اور کو اندر جانے نہیں دیا۔ صرف طاہر محمد سلطان، میر فراغت بڑی کوشش کے بعد اندر مجلس میں پہنچ سکا تھا۔ خان خانان کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا اور پیر محمد خاں کے ہوش درست کرنے کا نہیہ کر لیا۔

دو تین دن بعد خان خانان نے خواجہ انبیا جو بعد میں خواجہ جہاں بہا ہے۔ اور میر عبد اللہ بخشی کو خدمت گاروں کی ایک جماعت کے ساتھ پیر محمد خاں کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ ان دنوں کو تو بھول گیا ہے جب تو طالب علمی کے لباس میں نہایت خستہ حال قندھار پہنچا تھا۔ ہم نے اس وقت تجھ میں قابلیت اور خلوص کے جذبہ کو دیکھ کر اور چند عمدہ خدمات کے بجالانے کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ اور تجھے ملاگیری سے امارت کے اعزاز پر پہنچنا نصیب ہوا۔ پھر ہم نے ترقی دے کر تجھے امیر الامرائی کا عمدہ عطا کیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا ظرف دولت و مرتبہ کی سمائی کے لائق نہیں۔ اور تیری طرف سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو چلا ہے۔ اسی لیے ہم چند دن کے لیے وہ ساز و سامان تجھ سے چھیننے لیتے ہیں جو تیرے اس غرور کا باعث ہے تاکہ تیرا دماغ ٹھکانے آجائے۔ تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تو فوراً ہی علم و تقارہ اور ساز و سامان سرکاری آدمیوں کے سپرد کر دے۔“

پیر محمد خاں نے خانخانان کے حکم کی تعمیل کی۔ اور ساز و سامان اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ امیر الامراء کے درجہ سے گر کر وہی ملا پیر محمد بن گیا۔ بلکہ اس کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ بُرا ہو گیا۔

خان خانان نے چند دن بعد ہی اسے قلعہ بیانہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ اسی قید کے زمانہ میں اس نے ”برہان تمانع“ کی بحث پر جو ”قَدْ كَانَ فِيْهِمَا الْاِٰمَةُ اِلَّا اِنَّهُ لَفَسَدَتَا“ کی آیت پر مبنی ہے اور یہ متکلمین کے درمیان ایک مشہور بحث ہے، ایک رسالہ

اور چند دوسرے رسالے لکھ کر خان خانان کے نام سے موسوم کیے تاکہ اس وسیلہ سے اسے رہائی مل جائے۔ لیکن ایسی باتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔

دل شیشہ ایست چوں شکنی کے شود درست  
ظرف کلال نیست کہ سازی و بشکنی

چند دن بعد خان خانان کے حکم سے اسے مکہ معظمہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ تقدیر اچھی تھی۔ جب وہ گجرات پہنچا یا گیا تو خانخانان خود سازشوں کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر جب پیر محمد خاں کو ملی تو وہ گجرات سے لوٹ آیا اور اکبر کے ہاں باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب عطا کر کے خانخانان کے تعاقب کے لیے مامور کر دیا۔ یہ تفصیل بھی ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

ان واقعات کے بعد خان خانان کی نیابت کا عہدہ پیر محمد خاں کے بجائے خان خانان کے ہی ایک ملازم حاجی محمد خاں بیتانی کو دیا گیا تھا۔

**شیخ گدائی کا اقتدار** | ایک اور شخص شیخ گدائی کنبہ تھا۔ یہ دہلی کے شاعر جمال کنبوی کا لڑکا تھا۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو حالت سفر میں شیخ گدائی گجرات کے مقام پر خان خانان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس کی راہ و رسم اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ انہی سابقہ روابط کی بنا پر خان خانان نے اس کی سرپرستی کی اور اسے صدر الصدور کا عہدہ دے کر تمام ہندوستانی اور خراسانی امیروں میں اس کا مرتبہ بڑھا دیا۔ یہ شخص نہایت مکار اور ریاکار تھا۔ اس نے صوفیانہ وضع اختیار کر رکھی تھی۔ اور اپنے گھر پر سماع کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا۔ ان محفلوں میں خان خانان بلکہ خود بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اسلام کا آغاز ہی تھا۔ اس لیے ایسے مکار لوگ جو غلامانہ ذہنیت اور پست فطرت رکھتے تھے۔ اور ان کے نفاق و ریاکارانہ زہد کی وجہ سے درویشی ان پر بھیتی نہیں تھی مگر وزیر سے بآسانی اپنا رنگ جالینے لگے۔ شیخ گدائی بھی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ لوگوں کو تو اس کے عالی نسب ہونے میں بھی شبہ تھا۔ غرض اس کے اس بڑھتے ہوئے اعزاز و مرتبہ کی وجہ سے اہل علم اور امراء کی محفلوں میں ماتم سا برپا ہو گیا۔

در تنگنائے حیرتم از نخوت رقیب  
یارب مباد آنکہ گدا معتبر شود

شیخ گدائی نے قدیم امیرزادوں اور پیرزادوں کی جاگیریں ضبط کرا دیں۔ وہ صرف انہی کو جاگیر عطا کرتا تھا جو اس کے دربار میں جانے کی ذلت گوارا کر لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک گز زمین جاگیر میں حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرتے ہوں ان میں ولایت (ایران) سے آنے والے معزز لوگ بھی شامل تھے۔ ایسے لوگ شاید یہ شعر پڑھ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہوں۔

گر فروز نشست خاقانی  
نے اور اعیبتے ترا ادب است  
مے نہ بینی کہ سورۃ اخلاص  
زیر تبت یل اکی نھب است

میر سید نعمت رسولی نے جس کا ذکر آچکا ہے۔ اس کی ہجو میں ایک قطعہ کہا تھا جو محفلوں اور خانقاہوں میں کافی مشہور ہو گیا تھا۔ شریہ لوگوں نے شیخ گدائی کے دیوان خانہ اور مسجد میں بھی یہ شعر لکھ دیا تھا تاکہ وہ اسے پڑھ لے۔ اس نے اسے مٹوا دیا۔ اس قطعہ کا ایک شعر یہ ہے

نام گدائی مہذب نان گدائی مخور  
رانکہ گدائی بدست روی گدائی سیاہ

بعد میں چل کر اس کی بعض ایسی حرکتوں کا انکشاف ہوا جو اس کی بد اعمالی، حماقت اور بدنیتی کو ظاہر کرتی تھیں۔ اس کا ذکر بھی مناسب موقع پر آجائے گا۔

انہی دنوں عراق سے میر عبداللطیف جو قزوین کے معزز خاندان سادات سیفی کے سربراہ آوردہ آدمی تھے۔ ۹۶۳ھ میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے سان النیب حافظ شیرازی کا دیوان ان سے سبقاً سبقاً پڑھنا شروع کیا۔

ان کے لڑکے کا نام غیاث الدین ہے جس کو نقیب خاں کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور جامع العلوم ہے۔ چنانچہ علم سیر تاریخ اور اسرار الرجال اور دوسرے تمام مروجہ علوم میں اس کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ بلاشبہ اس دور میں باعث برکت بلکہ صحیح معنوں میں "ثانی لوج محفوظ" ہے۔ راقم الحروف کو بھی اس کے ساتھ ہم جماعتی، ہم عصری اور دینی اخوت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ان دنوں بادشاہ سلامت کی خدمت میں تاریخ، نظم و نثر اور دوسرے علوم کی کتابوں کے پڑھنے پر مامور ہے۔

۹۶۶ھ میں گوالیار کا قلعہ فتح ہوا۔ گوالیار کے قلعہ میں عدلی کا ایک غلام بھبل خاں نامی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے امان حاصل کر کے قلعہ کی کبھی شاہی کارندوں کے حوالہ کر دی۔ فتح باب قلعہ گوالیار پر قبضہ

۹۶۶ھ میں گوالیار پر قبضہ  
اسی سال عدلی کے ایک اور غلام سکرام خاں نے رنجبور کا قلعہ رائے سرجن ہار کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے۔ اکبر بادشاہ نے آگرہ میں آنے سے پہلے امیروں کی ایک جماعت کو جن میں ہندو اور دوسرے مغل امیر شامل تھے قلعہ رنجبور کی تسخیر کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان امیروں نے سکرام خاں پر حملہ کر کے قلعہ کے مضامات کو بری طرح لوٹا، لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی اور قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ جب بیانہ کی جاگیر خانخاناں کے ایک غلام حبیب خاں کو دی گئی۔ اور سیادر و تودہ ترک علی جو تودہ بھون کے نام سے مشہور ہے چغتائی خاں کے حوالہ ہوا تو حبیب خاں کو میر شکرینا کر رنجبور کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ اس نے قلعہ کو ایک سال تک محاصرہ میں رکھا۔ اس طویل محاصرہ سے قلعہ والے تنگ آ گئے اور صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ منگرام خاں نے حبیب خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک قاصد ہمارے پاس روانہ کریں تاکہ ہم اپنی شرائط اسے بتا دیں۔

۹۶۶ھ میں میر عبداللطیف قزوینی۔ یہ عالم سادات حسینی سیفی میں سے تھے۔ والد کا نام قاضی میر بھی تھا۔ میر علاؤ الدولہ صاحب تذکرہ ان کا بھائی ہے۔ قزوین کے معنی شاہ طہاسپ مغوی کے مخالف تھے۔ اس لیے بادشاہ نے ان پر سختی کی اور وہ بھاگ کر گیلانات کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب بہاؤوں ایران پہنچا تو ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ۹۶۳ھ میں ہندوستان آکر اکبر سے مستقر رہے۔ ۵ رجب ۱۰۰۰ھ کو فتح پور سیکری میں انتقال کیا۔ قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ سلا کی درگاہ میں ان کی قبر ہے۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ وفات "فخر آل یاسین" نکال ہے۔

مغل سرداروں نے میرے والد کو حاجی بھیکن یا وری کے ساتھ اس سفارت کے لیے منتخب کر کے روانہ کیا۔ بڑی رد و کد کے بعد سکرام خاں چند شرطوں پر قلعہ سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اسے نقد روپیہ اور مال و اسباب دیا جائے۔ دوسری یہ کہ شاہی ملازمت میں اس کے معاش کی بھی کوئی سبیل نکالی جائے۔ امیروں نے اس کے ان مطالبوں کی پابجائی میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ ان کے پاس روپیہ بھی نہیں تھا جو اسے دیتے۔ اسی لیے وہ قلعہ پر تردد و دستی ہی قبضہ کر لینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ امراء کے اس رویہ کو دیکھ کر اس نے رنجور کا قلعہ رائے سرحن کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لینے کی ہر طرح کوشش کر لی۔ لیکن ان کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قلعہ کو حوالہ کر دینے کے بعد سکرام خاں تو حاجی خاں وری کے ساتھ گجرات کی طرف نکل گیا۔ اور رائے سرحن نے قلعہ میں کافی رسد اور سامان جنگ پہنچا کر اسے اچھی طرح مستحکم کر لیا اور رسد و محصول کی وصولیاتی کے بہانے قلعہ سے متعلقہ بعض پرگنوں پر بھی قابض ہو گیا۔ غنیم کے اس تسلط کے بعد حبیب علی خاں اور دوسرے امیر کافی نقصان اٹھا کر اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

اسی سال عدلی کے غلام جمال خاں نے جو چنار پر قابض تھا ایک قاصد دربار میں بھیجا اور درخواست کی کہ اگر بادشاہ کسی تجربہ کار لائق آدمی کو روانہ کریں تو میں قلعہ اس کے حوالے کر دوں گا۔ اس کے عرض پر خان خاناں نے مہر علی بیگ سلاوڑ کو جس نے بعد میں خانی کا اعزاز پایا تھا اور قلعہ چتوڑ کا حاکم مقرر ہوا تھا، جمال خاں کے قاصد کے ساتھ روانہ کیا اور جمال خاں کے نام ایک تسلی آمیز فرمان بھی بھیج دیا۔

اس زمانہ میں میں پڑھنے کے ارادہ سے وطن سے یساور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا۔ اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے اس سفر میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوری اور والد مرحوم شیخ لوک شاہ سے بھی سفارش کرائی۔ یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ دونوں بزرگوں نے مروت و آشنائی کی وجہ سے مجھے اس سفر کی اجازت دے دی۔ میں بھی مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم لوگ قنوج، لکھنؤ، جون پور اور بنارس کی سیر کرتے جاگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ ۹۶۶ھ میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا عبور کر کے چنار پہنچے۔

جمال خاں نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ مہر علی کو قلعہ کے اندر لے گئے۔ اور وہاں اسے شیر شاہی و سلیم شاہی دور کی عمارتیں دکھائیں اور قلعہ کے ساز و سامان کا معائنہ کرایا۔ قلعہ والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ کی۔ جس وقت جمال خاں کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جون پور کے پانچ پرگنے دیئے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خاں نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعہ میں روک لے۔ جب تک کہ دربار سے اس کے حریف کا جواب آجائے۔

اس اثناء میں اس نے خان زماں سے علیحدہ گفت و شنید شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خاں افغان پٹیا سے بھی جو اپنی محبت کے ساتھ رہتا اس کے قلعہ پر قابض تھا۔ قلعہ سپرد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ جب مہر علی کو اس کے اس مکر و فریب کا علم ہوا۔ تو

اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خاں اور جمال خاں مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں۔ اس ڈر کے مارے وہ ہمیں اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعہ سے نکلا اور گنگا عبور کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعہ میں رہ گئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خاں سے چالپوسی کی باتیں کیں اور اسے یہ یقین دلایا کہ میں کسی طرح مہر علی کو واپس لاتا ہوں تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا کو عبور کرنے لگا۔ اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی۔ یہ بھنور قلعہ کی دیوار کے قریب ہی تھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈالوا ڈول ہونے لگی۔ اگر اس وقت اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلاشبہ کشتی اس بھنور میں چکراتی ہوئی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرچے اڑ جاتے۔

رسیدم من بہ دریا ئے کہ موجبش آدمی خوار است  
نہ کشتی اندراں دریا نہ ملائے عجب کار است

غرض بڑی مشکلوں سے کشتی ساحل سے جا کر لگی۔ اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے۔ شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر پہنچے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحبِ دعوت بزرگ تھے۔ اور اس ویرانہ میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گزربہر جنگل کے پھلوں اور درختوں کے پتوں پر تھی۔ دعوتِ دین کی برکت کی وجہ سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ عالی مرتبت بادشاہ خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کے آستانہ پر سر جھکاتے تھے۔

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعہ پر عدلی کے غلام فتونے قبضہ کر لیا۔ ۹۶۶ھ میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا۔ کیوں کہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے اس کی مشیخت کی دکان پھسکی پڑ رہی تھی۔

بہ نزدِ خرد ایں سخن روشن است  
کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن است

خان خانان کے مزاج میں شیخ گدائی کا بڑا دخل تھا۔ اس لیے خان خانان بھی شیخ محمد غوث سے کھل کر نہیں ملا۔ بلکہ اس نے کئی ایک مجلسیں منعقد کیں۔ وہ ان مجلسوں میں شیخ کا ایک رسالہ پڑھ کر سنا تا تھا جس میں شیخ نے اپنی معراج کا حال لکھا ہے کہ حالتِ بیداری میں مجھ سے خدا نے گفتگو کی اور حضور اکرم پر مجھے ترجیح دی۔ ان مجلسوں میں یہ اور ایسی دوسری خرافات کا تذکرہ کر کے شیخ کی ذات پر کھیڑ اچھالا جاتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ اور وہاں ہدایت و رشد کی مہم میں مشغول رہے ایک کروڑ کی جاگیر پر جو انہیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی قناعت کر لی۔

اسی سال خان زمان کا بھائی بہادر خان، سزاوول خاں کے رٹ کے باز بہادر کے مقابلہ پر گجرات کی طرف مامور کیا گیا۔ وہ سیرا کے قصبہ تک پہنچا تھا کہ خان خانان کے قصبے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ وہ دربار میں واپس آگیا۔

اسی سال اندری سے حسین خاں آگرہ آیا اور چند سربراہ اور وہ امرار کو اپنے ساتھ لے کر رنٹھبور کی طرف گیا اور سو پر پہنچ کر



اس نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اور پھر وہاں سے اس نے قلعہ رنجبور پر حملہ کیا اور رائے سرحن کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ قلعہ میں لے کر گیا اور اس سے قلعہ داری کا جائزہ لے لیا۔ لیکن وہ بھی خانخاناں کے جھگڑے کی وجہ سے اس مہم کو اذھورا چھوڑ کر گواہیاں آگیا۔ اور وہاں سے مالوہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ خان خاناں نے اسے آگرہ میں طلب کر لیا۔

## اکبر دہلی میں

۹۶ھ میں اکبر نے شکار کے ارادہ سے جہنا کو عبور کیا۔ اس موقع پر مطلب پرستوں نے جن میں ادھم خاں جو ماہم تکہ کی فرزند کی وجہ سے سب سے زیادہ مقرب تھا اور صادق محمد خاں پیش پیش تھے، خانخاناں کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔ کیوں کہ ان تمام امیروں کو خان خاناں سے اس کی مستقل وکالت کی وجہ سے بڑا حسد تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خان خاناں سلطنت کے دروبست پر اس طرح قابض تھا کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ آچکا تھا۔ اس کی بادشاہت تو بس برائے نام تھی، سب کچھ خان خاناں کے ہاتھ میں تھا۔ بعض وقت تو ضروری اخراجات کے لیے بھی بادشاہ کو خود بڑی تنگی ہو جاتی تھی۔ خزانہ بالکل ہی خالی تھا۔ بادشاہ کے عملہ کے جتنے لوگ تھے وہ سخت پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انہیں جاگیریں بھی بڑی خراب دی گئی تھیں، اس کے برعکس خان خاناں کے جتنے ملازم تھے وہ بڑے خوش حال رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی امرا خان خاناں کے زوال کے آرزو مند رہتے تھے۔

جب شہنشاہ کی سواری دہلی سے نصف مسافت پر سکندرہ راویں پہنچی تو وہاں ماہم تکہ نے اطلاع دی کہ دہلی میں بیگم بادشاہ سخت بیمار ہیں۔ اور بادشاہ سلامت کو بار بار

## بیرم خاں کے خلاف سازشیں

بار یاد کرتی ہیں۔ یہ سن کر اکبر نے دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر دہلی پہنچا تو دہلی کے حاکم شہاب الدین احمد خاں نے استقبال کیا۔ دہلی میں تمام امیروں نے مل کر خان خاناں کے خلاف بڑی لگائی بھجائی کی اور رائی کا پہاڑ بنا کر بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا۔

خال و خط و زلف و ابرویت یک جاشدند

از برائے کشتن مسعود محض رہے شود

ان لوگوں نے خان خاناں کے مقابلہ میں اپنی بے بسی اور مظلومی دکھلانے کے لیے ایسا ڈھونگ رچایا کہ کہنے لگے حضور کی دہلی میں تشریف آوری پر خان خاناں یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ ہی آپ کو یہاں لے کر آئے ہیں اور وہ یقیناً ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔ ہم چونکہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے مناسب یہی ہے کہ حضور ہمیں مکہ معظمہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔

اکبر کو ماہم تکہ کی جدائی گوارا نہیں تھی اس لیے اس نے تمام امیروں کی دلہی کی اور خانخاناں کو پیغام بھیجا کہ ”ہم تمہاری اجازت کے بغیر دہلی چلے آئے اور اب ہمارے تمام ملازم تمہاری طرف سے خوف زدہ ہیں۔ تمہیں چاہیے کہ تم ان سب کی تسلی کرو تاکہ یہ سب مطمئن ہو جائیں۔“

خانخاناں نے خواجہ امینا حاجی محمد خاں سیستانی اور ترسون محمد خاں کو شہنشاہ کے دربار میں بھیج کر اپنی طرف سے بڑی عذرخواہی کی اور اپنی خیر خواہی اور خلوص کو جتلاتا چاہا لیکن اکبر نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان لوگوں کو بھی واپسی سے روک دیا۔ اور یہاں تمام

امور سلطنت شہاب الدین احمد خاں اور ماہم تکہ کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ ان لوگوں نے اس بات کا خوب پروپیگنڈہ کیا کہ بادشاہ سلامت خانخاناں سے ناراض ہو چکے ہیں۔ آگرہ میں جتنے امیر تھے سب ایک ایک کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے قیام خاں گنگ آگرہ چھوڑ کر آیا۔ وہاں سے خواجہ امینا حاجی شہاب الدین احمد خاں وغیرہ اس کی جاگیر اور منصب میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان امیروں نے دہلی کی اندیشی

سے کام لیا اور قلعہ کی مضبوطی کا بھی بخوبی انتظام کر لیا۔

**بیرم خاں کی مکہ کو روانگی** | خانخانان نے جب بساط الشتی ہوئی دیکھی تو اپنے مصاحبوں وغیرہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی

خان خانان نے یہ تجویز پسند نہ کی اور کہا کہ اکبر کا مزاج میری طرف سے پھر گیا ہے۔ اس لیے اب میرا اور اس کا نبھاؤ مشکل ہے۔ اس سے قطع نظر میری ساری عمر خیر خواہی میں گزری ہے۔ اب بڑھاپے میں نمک حرامی کا داغ لگا کر میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔

خان خانان نے ہر طرف سے مایوس ہو کر حج کا ارادہ کیا اور بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ آگرہ کے تمام سرداروں اور امراء کو اپنے اس ارادہ سے مطلع کر کے دہلی رخصت کر دیا۔ مالوہ سے بہادر خاں کو بھی بلا کر ان لوگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بیانہ کے قید خانہ سے محمد امین دیوانہ کو بھی رہا کر دیا۔

دہلی میں امراء نے اکبر کو سمجھایا کہ خانخانان پنجاب کا عزم کیے ہوئے ہے اور اسکی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ اکبر نے میر عبد اللطیف قزوینی کے ذریعہ خانخانان کو پیغام بھیجا کہ اب ہم نے سلطنت کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ تم عرصہ سے حج پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے تم کوئی علاقہ اپنی جاگیر کے لیے تجویز کرو۔ تمہارا گماشتہ اس کی آمدنی مکہ میں تمہارے پاس بھیجتا رہے گا۔

خانخانان پہلے ہی سے یہ عزم کیے ہوئے تھا۔ یہ فرمان قبول کر کے وہ میوات سے ناگور کی طرف چلا گیا۔ سرداروں میں سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ ولی بیگ ذوالقدر حسن قلی خاں جو بعد میں خان جہاں بنا، اسمعیل قلی خاں اور اس کے بھائی شاہ قلی خاں اور حسین خاں خویش مہدی قاسم خاں اس کے ہمراہ ناگور تک آئے۔ ناگور پہنچ کر خانخانان نے سارا سامان جلوس نقارہ اور علم وغیرہ حسن قلی خاں کے ہاتھ دربار میں بھیج دیا۔ جب وہ حدود بیکانیر میں پہنچا تو شیخ گدائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔

**ابوالمعالی کی گرفتاری** | اکبر نے دہلی سے پنجاب جانے کا ارادہ کیا۔ جس دن اس نے قصبہ جھجھر میں منزل کی حسن قلی خاں مع ساز و سامان کے حاضر ہوا۔ اسی منزل میں شاہ ابوالمعالی بھی خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ لیکن اس نے یہ گستاخی کی کہ سواری کی حالت ہی میں بادشاہ کو تسلیات کی۔ اکبر کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ اور اسے گرفتار کر کے شہاب الدین احمد خاں کے سپرد کر دیا۔

**بیرم خاں کا تعاقب** | اسی منزل میں پیر محمد خاں شیروانی بھی جو خانخانان کا حال سن کر گجرات سے لوٹ آیا تھا، باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب اور سرداری کا سامان دے کر خانخانان کے تعاقب میں روانہ کیا۔ تاکہ وہ جا کر خانخانان کو جلد از جلد مکہ روانہ کر دے اور ہندوستان ٹھہرنے کی مہلت نہ دے۔ پیر محمد خاں فوراً ہی شاہی لشکر کا ہ سے رخصت ہو گیا اور ناگور کے قریب پہنچ کر قیام کیا۔ اور ایک دو منزل کی مسافت پر یہ شعر ایک رقعہ میں لکھ کر خان خانان کے پاس بھیج دیا۔

آدم در دل اساس عشق محکم ہم چناں  
باغمت جان بلا فرمودہ ہمدم ہم چناں

خان خانان نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا۔

لے بیرم خاں کے زوال میں ماہم آنکہ شہاب الدین احمد خاں کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

آمدن مروانہ امانزدیک رسیدہ توقف کردن نامردانہ

(تم آئے یہ تمہاری بہادری تھی لیکن قریب اگر ٹھٹک گئے یہ تمہاری نامردی)

خانخاناں کو پیر محمد خاں کے تعاقب سے بہت رنج ہوا اور وہ ناگور سے کوچ کر گیا۔ چونکہ جو دھ پور کے راجہ مال دیپ نے بڑی جمعیت کے ساتھ گجرات کا راستہ روک رکھا تھا اسی لیے وہ بیکانیر کی طرف چلا گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اسے بہکایا اور اس نے گجرات کے بجائے سیلاب کا رخ کیا۔ اپنے تمام اہل و عیال کو اپنے تین برس کے لڑکے مرزا عبدالرحیم سمیت جو اس وقت خانخانانی اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز تھے شیر محمد خاں دیوانہ کی جاگیر میں تبر بندہ کو روانہ کر دیا۔ خانخاناں نے شیر محمد خاں کو اپنا فرزند بنالیا تھا اسی بھروسے پر اس نے اس کی پناہ اپنے خاندان کو بھیج دیا تھا۔ لیکن شیر محمد خاں نے اس کی سابقہ مہربانیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور اس کے خاندان کی ہر طرح توہین کی۔ خان خانان دیپال پور پہنچا تھا کہ اسے یہ حال معلوم ہوا۔ اس نے شیر محمد خاں کی فہمائش کے لیے خواجہ لفر علی دیوانہ اور درویش محمد اوزبک کو روانہ کیا تاکہ یہ لوگ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیں۔ شیر محمد خاں نے ان کی کچھ نہ سنی۔ بلکہ اس نے راجہ مظفر علی کو قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ خانخاناں کو سب سے زیادہ صدمہ شیر محمد خاں کی اس طوطا چٹھی سے ہوا۔

**بیرم خاں کی شکست** | خانخاناں نے اب جالندھر کا رخ کیا۔ یہاں اکبر کے اشارہ سے پنجاب کے امیروں شمس الدین خاں آنکے اس کے بیٹے یوسف محمد خاں اور شہاب خاں کے داماد حسین خاں وغیرہ نے اس کا راستہ روک دیا، موضع نور پھلور پر گنہ دو کھداریں سخت مقابلہ ہوا۔ خانخاناں کی طرف سے مہدی قاسم خاں کے داماد حسین خاں نے بڑی مردانگی دکھائی۔ لیکن بھی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اسے ولی بیگ اور اس کے بیٹے اسماعیل علی خاں کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا گیا۔ خانخاناں یہاں سے لست کھا کر بھاگ گیا۔ اس لڑائی میں اس کا جو کچھ مال و اسباب تقاسب کا سب لٹ گیا۔ لوٹ کے اس مال میں ایک مرصع علم بھی تھا جس پر رتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے اسے خانخاناں نے ایک کروڑ کے مرفہ سے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کے مزار پر چڑھا دیا۔ یہ مشہد مقدس روانہ کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ اس علم کی تاریخ قاسم ارسلان نے لکھی تھی:

”علم ہشتم“

آنکے خاں نے مال غنیمت کے ساتھ یہ علم بھی بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔

اکبر نے پنجاب سے دہلی واپس ہونے کے بعد کابل سے منعم خاں کو وکالت کا عہدہ دینے کے لیے بلوا بھیجا۔

**بیرم خاں کی فیاضی** | اسی سال خان خانان نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے مشہور کر دی تھی۔ اور اس کے عوض اس نے شاعر کے پاس ساٹھ ہزار تنگہ روانہ کر کے اس سے پوچھا تھا ”یہ رقم کم تو نہیں؟ اس نے فی البدیہہ

پیر محمد خاں ”منتخب اللباب“ جلد سوم ص ۱۱۷ میں پیر محمد خاں کو دکن کا رہنے والا بتایا گیا ہے۔ کہ وہ وہاں تین چار سال کسی جرم میں قید کاٹ کر بیرم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔

اسے اپنے کتب خانہ کا دار و فہ مقرر کیا تھا۔

بیرم خاں کی شکست۔ اس جنگ کے نتیجے کے متعلق مؤرخوں میں اختلاف ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفوں نے بیرم کی شکست ہی لکھی ہے۔ لیکن خاں خاں نے ”ان مؤرخوں نے محض بادشاہ کی رعایت سے اصل واقعہ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں شکست خان اعظم شمس الدین خاں آنکے کو ہوئی تھی اور بیرم خاں مظفر پور ہوا تھا (منتخب اللباب ص ۱۱۷ مطبوعہ کلکتہ)۔

فرشتہ نے بھی شکست کی تائید کی ہے۔ اس نے اس جنگ کا مقام باجی واٹھ لکھا ہے جو اس کی غلطی ہے۔ بیرم خاں کافج کے باوجود پیچھے ہٹ جانا محض اس کی بادشاہ سے محال تھی نہ کہ کمزوری۔

بطور لطیفہ لکھا "ساٹھ کم ہیں"۔ خان نے چالیس ہزار تک مزید روانہ کر کے ایک لاکھ پورے کر دیئے۔ وہ غزل یہ ہے:-

من کیستم عنانِ دل از دست دادہ  
وز دست دل بہ راہ غم از پافتادہ  
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتہ  
بے اختیار سر بہ بیاباں نہادہ  
گا ہے چو شمع ز آتش دل در گرفتہ  
گہ چو قتیلہ بادل آتش فتادہ  
پریم ز فکر اندک و بیار فساد غم  
ہرگز نگفتہ ایم کمی یا زیادہ

اسی شاعر ہاشمی کا ایک اور مطلع ہے :-

بہت خنداں بود از چشم گر یانی کہ من دارم  
دلت جمعت از حال پریشانی کہ من دارم

خانخاناں نے اسی طرح باوجود خزانہ خالی ہونے کے رام داس لکھنوی کو ایک مجلس میں ایک لاکھ تنکہ نقد و جنس کی صورت میں انعام دیا تھا۔ رام داس سلیم شاہ کے گویوں میں سے تھا۔ موسیقی میں اسے تان سین ثانی کہا جاسکتا ہے، یہ گویا خلوت و جلوت میں خانخاناں کا ہمدم تھا اور وہ اس کی خوب صورتی سے اپنی آنکھیں سینکا کرتا تھا۔

اسی طرح حجاز خاں بدایونی کو خانخاناں کے نام پر ایک قصیدہ لکھنے کے صلہ میں ایک لاکھ تنکہ نقد خانخاناں کے خزانہ سے دیئے گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے سرہند کی پوری سرکار کا امین بنا دیا گیا تھا۔ حجاز خاں کو علم نقارہ کا امیرانہ اعزاز حاصل تھا اور وہ پہلے افغانی امرار کے زمرہ میں شامل تھا۔ آخر عمر میں اس نے سپاہ گری ترک کر کے معمولی معاش پر قناعت کر لی۔ اور زہد و عبادت کی روش اختیار کر لی تھی۔ جس قصیدہ پر خانخاناں نے اسے یہ گراں بہا صلہ دیا تھا اس کا مطلع ہے:-

چوں مرہ نگین سماشد فرو بہ آب  
پر کار خاتمش بہ ز میں واد لعل تاب

یہاں خواجہ کلاں بیگ کی یہ بات پوری صادق آتی ہے کہ عالم بالا کی شعر شناسی کا حال بھی کھل گیا۔ بہر حال خان کی ہمت بلند

لے جواب نہایت معنی خیز ہے "کم" کے عدد نکلے جائیں تو ساٹھ ہوتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ کہ انعام ساٹھ ملا ہے کافی سمجھ لیجئے، دوسرا یہ کہ معاوضہ کم ہے کچھ اور عنایت ہوگی۔ یہ واقعہ جس رنگ میں تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اس سے پریم کے خلاف اچھی رائے قائم نہیں ہوتی۔ سوچنے کی بات ہے خود فقر گو شاعر تھا۔ وہ خود بھی ایسی غزل کہہ سکتا تھا اسے زہدستی دوسرے کی غزل پر قبضہ کرنے پر اس کا معاوضہ دینے کی آخر کیا ضرورت تھی جب کہ وہ خود مستعار اشعار لینے کی مذمت کرتا ہے:-

امروز شاعراں و گراز کمال جہد  
از شعر مستعار نندار نندنگ و عار

اشعار بندہ چوں دگراں مستعار نیست  
دارم ہزار نادرہ اشعار مستعار

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہاشم قندھاری کو جو اس کے دامن دولت سے وابستہ تھا معقول صلہ دینے کے لیے یہ بہانہ پیدا کیا ہو۔

کے سامنے ایک لاکھ بس ایک کے برابر تھے۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں پنجاب پر آنکھ خاں کے تقرر کے بعد دربار شاہی سے خواجہ عبد المجید ہروی کو آصف خاں کا خطاب ملا اور وہ دہلی کی حکومت پر فائز ہوا۔ حسین تلی خاں کو اس بنا پر کہ اس کا باپ ولی بیگ اور اس کا بھائی اسماعیل تلی خاں خانخانان کے ہمراہ تھے، آصف خاں کے سپرد کر دیا گیا اور بادشاہ کی سواری پنجاب کی طرف روانہ ہوئی۔

**منعم خاں کی وزارت** | اسی سفر کے دوران حسب الحکم منعم خاں کابل سے تردی بیگ خاں کے بھانجے مقیم خاں کے ساتھ جس کو بعد میں شجاعت خاں کا خطاب ملا تھا، آکر لودھیانہ کی منزل میں بار یاب ہوا۔ اسے خانخانان کا خطاب اور قلم دان وزارت تفویض کر دیا گیا۔

آنکھ خاں کے فتح پانے اور خانخانان کے کوہ سواک کی طرف فرار کی خبر بھی اسی منزل میں پہنچی تھی اور بادشاہ نے اسیران جنگ کا معائنہ کر کے ان کو قید خانہ میں بھجوا دیا، ولی بیگ جو بری طرح زخمی ہو گیا تھا قید خانہ ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور اس کا سرکاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا۔ حسین خاں کو اس کے سارے ملک محمد خاں ولد ملاں قاسم خاں کے حوالہ کر دیا گیا، آخر میں بادشاہ کی نظر عنایت اس پر ہوئی اور اسے بتیالی کا قصبہ جاگیر میں مرحمت ہوا۔ بتیالی دریائے گنگا کے کنارے ہے۔ اور امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔

**بیرم خاں کی اطاعت** | شکست کے بعد خانخانان بیرم خاں تلوارہ میں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔ تلوارہ شمالی کوہستان میں ایک بلند اور مستحکم مقام ہے اور راجہ گوہند چند کی عمل داری میں ہے۔ شاہی فوجوں نے بھی تلوارہ پر بلیغ کر کے جنگ چھیڑ دی۔ بادشاہی لشکر میں سے سلطان حسین جلائر جو نہایت خوش قامت اور بہادر نوجوان تھا ہلاک ہو گیا۔ لوگ جب مبارک باد دیتے ہوئے اس کا سر خانخانان کے پاس لے گئے تو اس نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ اور اس کی حسن خدمات کو یاد کر کے ہائے کر کے رونے لگا اور کہا "میری زندگی پر ہزار لعنت کہ میرے نفس کی خاطر ایسے ایسے جوانوں کی زندگی خاک میں مل رہی ہے۔ اس علاقہ کے ہندوؤں نے خانخانان کو بڑا حوصلہ دلایا، لیکن مسلمانوں کا غم اس کے دل کو ایسا لگا تھا کہ سارے ارادے ترک کر کے اپنی عاقبت کے ڈر سے اپنے قصوروں کا معافی نامہ ایک غلام جال خاں نامی کے ہاتھ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا۔ اور خدمت شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ ملا عبداللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو اس کو لانے اور دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ دونوں طرف سے قاصد آ جا رہے تھے اور ساتھ ہی معرکہ کارزار بھی گرم تھا۔ منعم خاں چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دیرانہ خانخانان کے مقام پر جا پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔

جب خانخانان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بادشاہ کے حکم سے تمام امیر اس کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ حسب سابق کورنشس بجلا کر اس کی تعظیم کی گئی۔ شہنشاہ نے اس کے قصور معاف کر دیے اور خاص خلعت اور گھوڑا مرحمت فرمایا۔ منعم خاں اسے اپنے ٹھکانہ پر لے گیا اور اس کے لیے تمام ساز و سامان کے ساتھ سراپردہ وغیرہ کا انتظام کر دیا۔ دو دن بعد شایان شان سفر خرچ اسے دے کر مکہ معظمہ کو رخصت کر دیا گیا۔ چھوٹے بڑے تمام امیروں اور مصاحبوں نے اس کی مدد کے لیے نقد اور جنس کا چندہ کر کے جسے ترک "چندوغ" کہتے ہیں۔ اس کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی محمد خاں سیستانی کو اس کی رہبری کے لیے نامزد کر کے دہلی کی طرف روانہ کیا گیا۔ اور بادشاہ سلامت

۱۔ اکبر نے بڑے سے بیرم خاں کے سامنے تین صورتیں رکھی تھیں (۱) حکومت کی تناہو تو چندیری اور کالپی عطا کر دیا جاتا ہے (۲) مصاحبت منظور ہو مابقہ اعزاز و احترام کے ساتھ ہمارے ہمراہ رہو (۳) حج کا ارادہ ہو تو سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔ بیرم خاں نے تیسری صورت قبول کی۔



وہاں سے سیر و شکار کے ارادہ سے حصار فیروزہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چار ربیع الاول ۹۶۸ھ کو سواری شاہانہ دہلی پہنچی۔ وہاں سے بذریعہ کشتی ۲ ربیع الثانی کو دارالخلافہ آگرہ میں نزول اجلال ہوا۔

**خار مغیلاں** | کتے ہیں خانخاناں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناگور کے راستہ سے گجرات کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جنگل میں بولوں کے جھنڈ میں سے گزرنا پڑا وہاں اس کی دستار کانٹوں میں الجھ کر سر سے گر پڑی۔ یہ ایک براشگون تھا۔ اس لیے خان خانان کے چہرہ کارنگ فق ہو گیا۔ حاجی محمد خاں نے اس وقت فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

در بیا باں چوں ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم  
سرگز نشہاگر کند خارِ مغیلاں غم مخور

شعر سن کر خان خانان کا تکرر جاتا رہا۔

**بیرم خاں کی شہادت** | جس وقت خان خانان تین سے گجرات پہنچا تو تین کے حاکم موسیٰ خاں فولادی اور حاجی خاں الوری نے اس کی تعظیم و تکریم کی اور اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ دوران قیام ایک دن خانخاناں سہنسنگ

نامی ایک تالاب کی سیر کے لیے گیا۔ مغرب کی نماز کے لیے جب وہ کشتی سے اترتا تو ایک پٹھان مبارک خاں نامی کہ خانخاناں نے ہندوستان کی فتح کے زمانہ میں اس کے باپ کے قتل کا حکم دیا تھا۔ او باشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آیا۔ یہاں ملاقات کا تھا اور نیت قتل کی۔ چنانچہ اس نے اچانک خنجر سے بھرپور وار کیا اور بوڑھا خان اسی جگہ شہید ہو گیا۔ اس کی تاریخ شہادت یہ ہے۔

بیرم بہ طوافِ کعبہ چوں بست احرام  
در راہ شہید گشت نایافتہ کام  
تاریخ شہادتش ز دل پر سیدم  
گفت کہ شہید شد محمد بیرم

میں نے بھی یہ لحاظ تعمیر یہ تاریخ نکالی ہے:

گفت گل گلشن خوبی نمائند

خانخاناں بزرگوار قلب انسان تھا۔ بزرگوں اور مشائخوں کا نہایت معتقد تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ اللہ رسول کا ذکر رہتا تھا۔

ایک دن سیکری میں وہ ایک گوشہ نشین درویش کی ملاقات کے لیے گیا۔ اور ان سے آیت تُعَبِّدُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کا مطلب

پوچھا۔ چونکہ اس درویش نے تفسیر نہیں پڑھی تھی اس لیے اس کا جواب نہ دیا۔ خانخاناں نے خود آیت کی وضاحت کی۔

”تُعَبِّدُ مَنْ تَشَاءُ بِالْقَنَاعَةِ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِالسُّوَالِ“

دعوت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے قناعت کے ذریعہ اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے سوال کے ذریعہ،

بیرم خاں بڑا پابند اوقات تھا۔ کبھی جماعت اور جمعہ کی نماز قضا نہ ہوتی، لیکن عہد میں تفصیل کی طرف میلان رکھتا تھا۔ حافظ محمد امین

لے یہ تاریخ قاسم ارسلان کی کہی ہوئی ہے۔ ماثلاً مراد کے مصنف نے لکھا ہے میں نے خواب میں یہی تاریخ نکالی تھی کہ محمد بیرم خاں ترکمان۔ بیرم خاں کے آباد اجداد کا تعلق ایمان کے قراقرم نامی ایک ترکمان قبیلہ سے تھا۔ اس قبیلہ کا ایک سردار علی شکریہ ترکمان تیموری خاندان سے وابستہ تھا۔ علی شکر کی اولاد میں شیر علی ایک ترکمان گزرا ہے۔ یہ مرزا سلطان علی حاکم ہرات سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کا بڑا لڑکا یار علی بیگ فندری کی فتح کے بعد باریک ملازمت میں آگیا۔ بابر نے اسے غزنی کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا باقی لکے ہوئے

خطیب سے کہا کرتا تھا دوسرے صحابہ کی نسبت حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں تعظیم کے چند کلموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔  
اسی سال میاں حاتم سنبھلی کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ہے :-  
”عَنْدَ مَلِيكَ مُقْتَدِرٍ“

دقیقہ حاشیہ صفحہ سابقہ سیف علی بیگ حاکم ہوا۔ یہی سیف علی بیگ خاں کا باپ تھا۔ بیرم خاں بدخشاں میں پیدا ہوا۔ باپ کے مرنے پر بلخ میں جا کر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جب ۶۰ سال کا ہوا تو ہالیوں کی ملازمت اختیار کی۔ تیموری خاندان سے اس کا تعلق رشتہ بھی تھا اکبر نامہ جلد دوم ص ۱۸۱ بیرم کا رنگ گورا، قد متوسط، چہرہ پر دائرہ قوسی۔ بیرم علم کا قدردان فن موسیقی کا ریا، خلیق، منسا اور منکر المزاج تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور تھا۔ دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ نہایت صاحب ذوق اور سخن شناس تھا۔ اکثر اساتذہ کے کلام پر اس نے تنقید و اصلاح کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع بھی تھا۔ میدان جنگ میں ایک ماہر حربی بہادر سپاہی تھا تو مسند وزارت پر مدبر سیاست دان اور منظم حاکم تھا۔ اس کی سخاوت اور نیازی کا بھی دور دور تک شہرہ تھا۔ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر بیرم نہ ہوتا تو ہالیوں دوبارہ ہندوستان پر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ اکبر ہی تخت سلطنت پر بیٹھ سکتا تھا۔ بیرم خاں کو ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بیرم خاں کے فارسی اور ترکی کلام کا دیوان بنگال ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔ یہ دیوان ۹۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ فارسی کلام ۵ صفحات پر ہے۔ بعد میں ترکی کلام ہے۔ آخر میں اس دیوان کے کاتب نے تکرار کی تاریخ، شوال ۱۰۱۵ھ اور مقام کتابت جالندہ پور لکھی ہے۔ کاتب کے نام کا پتہ نہیں چل سکا۔ جالندہ نام کا ایک تعلقہ حیدر آباد دکن کے ضلع اورنگ آباد میں ہے۔ شاید یہی مقام ہو۔ اس میں جو غزلیں ہیں وہ نہایت شگفتہ پر لطف اور موثر ہیں۔ ایک غزل کے اشعار ہیں :-

حرفے نہ نوشتی دلِ مآشاد نہ کردی  
مارا بہ زبانِ قلمے یاد نہ کردی  
بر یاد تو صد بار کتم نالہ و فریاد  
فسر یاد کہ یک بار مرا یاد نہ کردی  
اے کردہ فراموش زغم تھاری بیرم  
حرفے نہ نوشتی دلِ مآشاد نہ کردی  
ہالیوں اور بیرم خاں میں بڑی محبت تھی۔ چنانچہ ہالیوں نے کابل سے قندھار میں بیرم کے پاس یہ رباعی لکھ کر بھیجی :

اے آنکہ انیس خاطر محرونی  
چوں طبع لطیف خویش موزونی  
بے یاد تو نیستم زمانے ہرگز  
آیا تو سیاد من محضوں چونی

بیرم نے جواب میں لکھ بھیجا :

اے آنکہ بذات سایہ بے چونی  
از ہر چہ ترا وصف کم افزونی  
چوں بے دانی کہ بے تو چوں بے گز  
چوں بے پرسی کہ در فرا تم چونی

(ماثر الامراء ص ۳۳)

وہ سلطنت کا وزیر مطلق اور نو عمر بادشاہ کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ میں ہندوستان کا جو حال تھا اس کا ذکر ہدایونی نے ان الفاظ میں کیا ہے  
”در حمد بیرم خاں کہ بہترین حمد با بود ہند حکم عروس داشت“ (منتخب ص ۲۸۹) اکبر نے ۹۶۵ھ بمقام جالندہ سلیمہ سلطان بیگم کو بیرم خاں کے عقد میں دیا تھا۔ سلیمہ ہالیوں کی بھانجی تھی۔ اس خاتون کے متعلق جہانگیر نے توڑک میں یہ فقرہ لکھا ہے :- ”بر جمیع صفات حسنہ آراستگی داشتند در زناں اس مقدار ہنر و قابلیت کم جمیع مے شود“ (توڑک جہانگیری ص ۱۱۳) یہ شاعر بھی تھی، تخلص مخفی تھا۔ اس کا ایک شعر (جہانگیر نامہ کشوری ص ۶۷) مآثر الامراء ص ۳۳، ہے :-

لاکلت را من زمستی رشتہ جان گفتہ ام  
مست بودم زین سبب حرف پریشان گفتہ ام

بیرم کی وفات پر اکبر نے اس سے شادی کر لی تھی (مآثر الامراء ص ۳۳) منتخب الباب جلد دوم ص ۱۸۱، جہانگیر نامہ ص ۶۷، سلیمہ کی وفات ۱۰ ذی قعدہ ۱۰۱۵ھ بمقام لاہور پیدا ہوا تھا۔  
محمد الرحیم خاں کی اس بیوی کے بطن سے ہے جو خاندان میوات کی تھی۔ اکبر بیرم خاں کو خان بابا اور عبدالرحیم کو مرزا خان کہا کرتا تھا۔ بیرم خاں نے اساتذہ کے کلام پر جو تنقید اور اصلاح کی ہے۔ اس کے مجموعہ کا نام ”ذخیرہ“ ہے۔ بیرم آخر میں سازشیوں کا شکار ہو گیا۔ اس پر نمک حرامی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔  
خان خاناں نے کھل کر لکھا ہے :- ”بیرم پر حاسدوں کی سازش سے اگرچہ بغاوت کا الزام لگا دیا گیا۔ لیکن عقلمندوں پر ظاہر ہے کہ ترکوں سے نمک حرامی بہت کم وقوع میں آتی ہے۔ جو لوگ بیرم کو باغی سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں وہ اس تہمت سے پاک اور بری تھا۔ بادشاہ نے بھی اس پر کوئی زیادتی نہیں کی۔ البتہ مخالفین نے سازش کا وسیع جال پھیلا رکھا تھا۔ لیکن وہ بھی اپنے کیے کی سزا پا کر رہے“ (منتخب الباب ص ۱۸۱) فرشتہ نے بیرم خاں کی شہادت جمادی الاول ۱۰۱۶ھ لکھی ہے۔  
اور وقت صبح کا بتایا ہے۔ بدلاؤنی نماز مغرب کا وقت تھاتا ہے (مآثر رحیمی ص ۶۷) میں جمعہ کا دن ۱۴ جمادی الاول ۱۰۱۶ھ درج ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

## مالوہ کی فتح

اسی سال ۱۲ رجب کو حاکم مالوہ باز بہادر ولد سزا اول خاں بڈالاؤ و لشکر اور ہاتھی لے کر ادھم خاں اور پیر محمد خاں کے مقابلہ پر سارنگ پور سے سات کوس کے فاصلہ پر آیا۔ یہاں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باز بہادر کو شکست ہوئی۔ اس کا سارا ساز و سامان غنیمت میں آیا اور اس کے حرم کی عورتیں بھی گرفتار ہو گئیں۔

جس دن یہ فتح ہوئی مذکورہ دونوں سردار اپنے ڈیرہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے پیش کر کے قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت پیر محمد خاں طنز سے فقرے چیت کر رہا تھا۔ اس مقتول کی گردن کتنی موٹی تھی۔ ”اوہ اس لاشہ میں سے تو ڈھیروں خون نکلا۔“ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خلقت الہی کی اساس ہے۔ اس سنگ دل کی نظر میں اس دن انسان کھیرے لکڑی نظر آ رہے تھے کہ انسانی جان کا اس طرح مذاق اڑا رہا تھا۔ مالوہ کے سید اور مشائخ قرآن اٹھائے ہوئے امان مانگتے ہوئے آئے۔ ظالم نے ان بے قصوروں کو بھی قتل کر دیا۔ ادھم خاں نے فتح کی ساری روداد شہنشاہ کے پاس لکھ کر روانہ کی۔ اور غنیمت میں ملنے والے چند ساتھی صادق محمد خاں کے ذریعہ حضور میں روانہ کر دیئے۔ جتنے عمدہ عمدہ ہاتھی تھے اپنے لیے لکھ لیے اور باز بہادر کی حرم کی عورتوں کاٹنوں اور طوائفوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہ نفس نفیس ۲۱ شعبان ۹۶۸ھ کو آگرہ سے سارنگ پور پہنچا اور ادھم خاں سے سارا مال وصول کر کے ۲۹ رمضان کو آگرہ واپس آگیا۔

## خان زماں سے بدگمانی

اسی سال عدلی کے بیٹے شیر خاں نے جو باپ کے مرنے پر چنہار میں اس کا قائم مقام بنا ہوا تھا، ایک بڑی فوج لے کر جون پور پر حملہ کر دیا۔ خان زماں نے ابراہیم خاں اوزبک، جنہوں نے خاں قاتال اور شاہم خاں جلائیر کی مدد سے اسے شکست دی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس واقعہ کے بعد ہی اکبر کو خان زماں کے متعلق بدگمانی ہو گئی اور وہ خود جونپور کے ارادہ سے عازم سفر ہوا۔ جب کالپی پہنچا تو وہاں کے حاکم عبداللہ اوزبک نے بادشاہ کی مہمانی کا شرف حاصل کیا۔ یہاں سے سواری کٹڑہ کی طرف گئی۔ کٹڑہ میں خان زماں اور بہادر خاں بھی جونپور سے آکر حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے میں عمدہ ہاتھی اور نفیس تحائف گزرنے۔ بادشاہ نے ان دونوں کو خلعتیں اور گھوڑے دے کر ان کی جاگیروں پر رخصت کر دیا۔ اس طرح خان زماں کا یہ قضیہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔ اور اس کی تاریخ ہوئی۔

”الصلوٰۃ خیر“

لے کشت و خون۔ دوسرے بیانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان ظالموں نے انتہائی بربریت کا ثبوت دیا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم نے جو کچھ کیا ہے کہاں تک انصاف پر عمل ہے تو انہوں نے جواب دیا ”آخر اتنے قیدیوں کے ساتھ اور کیا کیا جاسکتا تھا“

لے حرم۔ ان عورتوں میں جو باز بہادر کے حرم میں تھیں روپ متی بھی شامل تھی۔ روپ متی پر اس سے پہلے ہم ایک حاشیہ لکھ چکے ہیں۔ اکبر جب خود تحقیقات کے لیے پہنچا تو اسے دو قیدی عورتوں کی فریاد پہنچی۔ کہ ادھم خاں نے ان کی آبروریزی کی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو کیمپ میں بلایا۔ لیکن ماہم آنکھ نے اپنے بیٹے کے جرم کو چھپانے کے لیے ان مظلوم عورتوں کو قتل کر دیا۔ تب جب اکبر ادھم خاں کی تحقیقات کے لیے چلا تو ماہم آنکھ نے ایک قاصد کو اس کی خبر دینے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن اکبر اس سے پہلے ساں لکھ پہنچ گیا۔ ماہم آنکھ بھی دوسرے دن وہاں پہنچ گئی اور مال غنیمت پر قبضہ کر کے ادھم خاں کے معاملہ کو دبا دیا۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) ماثرا لامر (صلت) میں لکھا۔ اس کی لاش سے کپڑے تک اتار لیے تھے۔ بعد میں بیرم خاں کو شیخ حامد الدین کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ پھر وہ وہاں لایا گیا۔ ۹۸۵ھ میں بیرم خاں کے بھانجہ حسین تل خاں نے حسب وصیت بڈالوں کو مشہد مقدس میں دفن کر دیا۔

لیکن اس تاریخ میں ایک عدد زائد ہے۔

منی اقبال دریں کہنہ دیر

غلغلہ انداخت کہ اَلصَّلَامُ خَیْرُ

اسی سال، اذی الحجہ کو بادشاہ سلامت آگرہ واپس تشریف لے آئے۔

**اجمیر کی زیارت** | ۱۹۶۹ء میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا۔ اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات عطا کیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانجھ کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم خواجہ پناٹا مل اور اس کا بیٹا رائے بھگوان داس حاضر خدمت ہوئے۔ راجہ نے اپنی ایک لڑکی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔

اکبر نے مرزا شرف الدین حسن کو جس کی جاگیر اجمیر کے مضافات میں تھی قلعہ میرٹھ پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا یہ قلعہ اجمیر سے بیس کوس پر جمیل راجپوت کے قبضہ میں تھا۔ اس مہم کے انتظام کے بعد اکبر دارالخلافہ کو واپس ہو گیا۔

**قلعہ میرٹھ کی تسخیر** | مرزا شرف الدین نے مذکورہ قلعہ پر چڑھائی کر کے محصورین کو اس شرط پر امان دی کہ وہ سب قلعہ خالی کر کے نکل جائیں اور مال و اسباب قلعہ ہی میں چھوڑ دیں۔ جمیل شرائط صلح کے مطابق قلعہ کو چھوڑ کر چلا گیا۔

لیکن اس کے ایک سپاہی دیو داس نامی نے قلعہ سے نکلنے وقت کچھ لوگوں کی مدد سے سارے مال و اسباب میں لگا دی اور شرف الدین کے لشکر پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ آخر خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کے ساتھ جو دو سو آدمی تھے وہ بھی ہلاک ہو گئے۔ قلعہ شاہ بدایہ خاں اور اس کے بیٹے عبدالمطلب خاں اور دوسرے امیروں کی کوشش سے فتح ہو گیا۔

**باز بہادر کا انجام** | جب ادھم خاں دربار میں چلا گیا تو مالوہ میں پیر محمد خاں بلا شرکت غیرے حاکم ہو گیا۔ اور وہاں اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر کے برہان پور اور بیجا گڑھ کے قلعوں کو فتح کیا۔ زبردستی کے دوسرے ساحل تک راج کشی کر کے اس طرح قتل عام کیا کہ وہ سارا علاقہ بے چراغ ہو گیا۔

باز بہادر شکست کھانے کے بعد اس علاقہ کے کئی اور حاکموں کے ساتھ یہاں سے وہاں قراولی کرتا پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پیر محمد خاں اپنے لشکر سے جدا ہو گیا۔ باز بہادر نے موقع پا کر اس پر حملہ کر دیا۔ پیر محمد خاں گھبرا کر مندو کی طرف بھاگا۔ اور غنیمت کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے زریلا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ اس وقت کچھ اونٹ بھی دریا پار کر رہے تھے۔ ایک اونٹ بدحواس ہو کر اس کے گھوڑے پر آگرا اور وہ اس کے ساتھ ہی دب کر مر گیا۔ پیر محمد خاں کی وفات کے بعد مالوہ پر متعینہ سردار وہاں ٹھہرنے لگے اور دربار میں واپس چلے آئے۔ حسب الحکم انہیں قید کر دیا گیا چند روز بعد ان کو رہائی ملی۔

مغل سرداروں کی واپسی کے بعد باز بہادر نے اپنے ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ بعد میں عبداللہ خاں اوزبک نے معین الدین خاں فرخودی کی کمک سے دوبارہ حملہ کر کے اسے پھر مالوہ سے بے دخل کر دیا۔ باز بہادر چند روز تو رانا اودے سنگھ کی پناہ میں چوڑا اودے پور میں رہا۔ چند دن اس نے گجرات میں گزارے۔ آخر مجبور ہو کر ویرا شاہی میں حاضر ہو گیا۔ اور اکبر کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ چند دن اسے قید میں رکھا گیا تھا بعد میں رہا کر دیا گیا لیکن موت سے چھٹکارا کہاں۔ رہائی سے چند دن بعد ہی اس کی وفات ہو گئی۔ مالوہ کی مہم کے بعد عبداللہ خاں اوزبک ہانڈیہ کو اور اس کے معاون امیر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے اور

معین الدین احمد خاں دربار میں حاضر ہو گیا۔

اسی سال خواجہ عبداللہ مروارید جو ایک مشہور وزیر گزرا ہے، کا پوتا خواجہ محمد صالح صدارت کے عہدہ پر نائز ہوا۔ لیکن اس کو فرنگی دیوان کے اختیارات حاصل تھے۔ انعامات اراضی کے عطیات اور انداد و وظائف دینے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

اسی سال شاہ طہاسپ کی طرف سے ایک سفیر سید بیگ ولد معصوم بیگ بہایوں بادشاہ کی تعزیت کے سلسلہ میں شاہی مکتوب لے کر آیا یہ خط ہم آگے نقل کریں گے، دربار میں اس سفیر کی تعظیم و تکریم کی گئی اور بادشاہ نے اسے سات لاکھ تنکے انعام دیا اور خلعت اور گھوڑا مرحمت فرمایا۔ امرار نے بھی اس کی ضیافت کی اور تحفے دیئے۔ وہ ہندوستان سے بے شمار تحائف لے کر لوٹا۔

بادشاہ نے آنکھ خاں کو جس کا لقب اعظم خاں تھا، پنجاب سے بلا کر مملکت کا وزیر مطلق بنا دیا تھا۔ ادھم خاں کو بادشاہ کے تقرب پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ اس بات سے سخت ناراض بھی تھا کہ ماہم آنکھ سے وکالت کا عہدہ چھین کر آنکھ خاں کو دے دیا گیا۔ اس پر چند حاسد میروں خاص طور سے منعم خاں اور شہاب الدین احمد خاں نے اسے آنکھ خاں کے خلاف اس قدر ورغلا یا کہ اس نے غضب ناک ہو کر عینی دربار میں آنکھ خاں پر حملہ کر کے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسی طرح شمشیر بدست اگرتے ہوئے حرم شاہی کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ شہنشاہ بھی تلوار کھینچے ہوئے باہر نکلے اور اس سے پوچھا ”یہ آخر تو نے کیا کیا؟“ اس نے بے باکی سے جواب دیا ”ایک غدار کو میں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔“ شہنشاہ کے حکم سے ادھم خاں کے ہاتھ پیر باندھ کر محل کی چھت پر سے نیچے گرا دیا گیا۔ اس کے جسم میں چونکہ جان باقی رہ گئی تھی اس لیے شہنشاہ نے حکم دیا ”اسے دوبارہ گراؤ۔“ اس واقعہ کی تاریخ ”دو خون شد“ سے نکالی گئی۔ اور دوسری تاریخ ہے ”رفت از ظلم سرا عظم خاں۔“

واضح رہے پہلی تاریخ میں ایک عدد زیادہ ہے۔

اعظم خاں کی شہادت پر ایک اور شخص نے تاریخ کھی ہے۔

خان اعظم سپاہ اعظم خان  
کہ چوں او کس دریں زمانہ ندید  
بشہادت رسیدہ ماہ صیام  
شریت موت روزہ دار حشید  
کاش سال دگر شهید شدی  
کہ شدی سال فوت خان شهید

ادھم خاں کے چالیسویں کا کھانا کھلانے کے بعد اس کی ماں ماتیم آنکھ بھی بیٹے کے غم میں فوت ہو گئی۔

ادھم خاں کی ہلاکت اور دوسری تاریخوں میں ہے کہ ادھم خاں کو خود اکبر نے گھونسا مار کر نیچے گرا دیا تھا۔ اور خود ہی جا کر ماہم آنکھ کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ ماہم نے تیرے لڑکے کو قتل کر دیا ہے۔ جب وہ مری ہے تو اکبر نے اپنی داہیہ کے جنازہ کو کندھا دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے اکبر آباد میں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔

ماہم آنکھ اور دوسری تاریخوں میں ماہم اناغہ بھی تھا یہ بہایوں کے ایک وفادار ملازم ندیم خاں کی بیوی تھی۔ یہی وہ عورت ہے جس نے اکبر کی تربیت اور پرورش کی تھی۔ اکبر کے ساتھ بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ ادھم خاں اسی کا لڑکا تھا۔ ماہم اناغہ کا تھا۔ اس کی فطرت میں کوئی خوبی نہیں تھی نہ عقل نہ اور پویشیا رتھی رہا تھا اگلے سطر پر،



اسی سال میرے والد شیخ ملوک شاہ بھی ۲۷ رجب کو آگرہ میں انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کی میت یساور میں لے جا کر دفن کی۔ ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

سرد فتر افضلِ دوراں ملوک شاہ  
اں بحرِ علم و معدنِ احسان و کانِ فضل  
چوں بود در زمانہ جہانی ز فضل ازاں  
تاریخ سال فوت و لے آمد جہانِ فضل

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبل جن کے ساتھ مرحوم کو بڑی عقیدت و ارادت تھی اسی سال محبوبِ تحقیقی سے جا ملے۔ ان کا بیان بھی انشاء اللہ آجے آئے گا۔ شیخ مرحوم کی تاریخ نکالی گئی ہے۔

کمال الحق والدین شیخ پنجو  
کہ آمد جنت فردوس جائش  
ز روئے تہمیدہ تاریخ فوتش  
شود حاصل ز نام دل کشائش

ان کی دوسری تاریخ ہے:

درویش دانشمند رحمۃ اللہ علیہ

**منعم خاں کافر اور گرفتاری**  
منعم خاں خانتاناں اور محمد قاسم خاں میر بھرا اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ادھم خاں کو بہکانے کے الزام میں پکڑے نہ جائیں اور دوسری بعض وجوہات کی بنا پر بھی سیر کے بہانہ سے کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئے۔ اور وہاں کے بعض زمینداروں کی مدد سے دو تین سوار ساتھ لے کر روپہ اور بجوارہ کے راستہ پہاڑ کے دامن کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ کابل چلے جانے کا تھا۔ کیونکہ وہاں منعم خاں کا لڑکا غنی خاں حاکم تھا۔ لیکن جب وہ دو آبہ میں سمرت کے پرگنہ پر جو میر محمد خشی کی جاگیر میں تھا پہنچے تو قاسم علی خاں سیستانی نے جو پرگنہ کا شہنشاہ تھا جنگل میں ان کو دیکھ لیا اور ان کے انداز کو دیکھ کر بھانپ گیا کہ یہ بھاگے ہوئے ہیں اس نے وہاں کے اوباشوں کی ایک جمعیت لے کر انہیں گھیر لیا۔ اور دونوں کو باندھ کر سید محمود بابہ کے آدمیوں کو جو اس علاقہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مطلع کیا۔ سید محمود نے اپنے عزیزوں اور لڑکوں کو ان دونوں کے ہمراہ کر کے ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ آگرہ بھیج دیا۔ جب ان کے واپس آنے کی خبر ملی تو شہنشاہ نے افسروں کی ایک جماعت کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور دوبارہ وکالت کا عہدہ پہلے سے کہیں زیادہ اعزاز کے ساتھ منعم خاں کے تفویض کر دیا تاکہ وہ اس

دقیقہ منہ گزشتہ) اکبر کی دایہ ہونے کی وجہ سے اس کو اقتدار مل گیا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ابتدائی عہد میں ماہم آنکھ صحیح معنوں میں سلطنت کی فدیہ اعظم بنی ہوئی تھی اس کے اشارہ پر بیرم خاں کے مقابل میں منعم خاں کو آگے لایا گیا تھا۔ اکبر نے عرصہ تک ماہم کے اثر و اقتدار میں سربکے جب اس کی عمر ۱۹ سال کی ہوئی تو اس نے ماہم اور اس کے بیٹوں کو بے دست و پا کر دیا۔ ماہم پر یہ بھی الزام ہے کہ اس نے اکبر کو بے دخل کرنے اور اپنے بیٹوں کو حکومت دلانے کی بھی سازش کی تھی۔ اسی سلسلہ میں منعم خاں نے اکبر نے جہازت کا عہدہ بھی لیا تھا۔ ایرانی خود غور نے ماہم آنکھ کا ذکر اچھے انداز میں نہیں کیا ہے۔ انہی کے بیان پر پروفیسر ملوک نے بھی اسے حرام اولاد اور حرام کار لکھا ہے ان کے برخلاف ابو الفضل اسے "پاکبازی کا گنبد" کہتا ہے۔

ذمہ داری کو شہاب خاں اور خواجہ جہان کی مدد سے سرانجام دیئے۔

## کھکروں کی شکست

اسی سال خاں کلاں میر محمد خاں آنکھ نے کماں خاں کھکر کی کمک کے لیے ایک بڑی فوج لے کر کھکروں کے ملک پر چڑھائی کی اور سخت جنگ کر کے کماں خاں کے چچا سلطان آدم کو اسیر کر لیا۔ اس کا لڑکا لشکر کی نامی کشمیری طرف بھاگ گیا۔ لیکن بعد میں گرفتار ہو گیا اور دونوں باپ بیٹے اپنی موت آپ مر گئے۔ خاں کلاں وہ سارا علاقہ کماں خاں کھکر کے سپرد کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

ایک روز شہنشاہ نے ایک بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ اس محفل میں خاں کلاں میر محمد خاں آنکھ نے ایک قصیدہ جسے وہ اپنے خیال میں بڑا کارنامہ سمجھ رہا تھا پڑھنا چاہا۔ محفل میں تمام امراء سردار اہل علم اور بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ جب خاں کلاں نے اپنے قصیدہ کا مطلع اٹھایا اور یہ مصرع پڑھا:

بھدا اللہ کہ دیگر آدم فتح کھکر کردہ

اچانک اس کا رشتہ دار عبدالملک خاں اٹھ کر آگے آیا۔ اس وقت شاہنشاہ پوری توجہ سے اس کا قصیدہ سن رہے تھے۔ بلکہ یہ مجلس اسی قصیدہ کے لیے منعقد کی گئی تھی۔ اور خاں کلاں کو بادشاہ سے بھاری صلہ کی امید تھی۔ عبدالملک خاں نے سامنے آ کر بلند آواز سے کہا:-

”میرے خاں دیگر آدم نہیں بلکہ دیگر آدمیم کہو کیوں کہ دوسرے بہت سے بد نصیب بھی تو تمہارے ساتھ تھے۔ عبدالملک کی اس بھبتی پر ساری مجلس زعفران نہار ہو گئی۔ خاں کلاں نے اپنی پگڑی زمین پر رکھ دی اور فریاد کی۔

”اس بد تمیز مسخرے سے حضور ہی میرا انصاف کریں گے۔ اس نے تو میری ساری محنت خاک میں ملا دی۔“

عبدالملک بڑا پرنداق آدمی تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے نام کا بیج بھی بڑا مضحکہ خیز بنایا تھا۔

عبدالملک افزوں کنی

پس الف لائے درواندروں کنی

ملاشیری ہندی شاعر نے اپنا مشہور قصیدہ ”مدح و قدح“ اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

اگر گوار بیا بد مقابل تو گرین

کہ صاف و مقابل نے شوی گوار

اسی سال مولانا علاؤ الدین لاری جنہوں نے شرح عقاید نسفی پر حاشیے لکھے ہیں، خان زماں کے پاس دہلی پہنچے۔ اس سے آگرہ تشریف لائے تھے۔ یہاں انہوں نے ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بنا رہے ہیں۔

”مدرسہ خن“

بعد میں وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔ رحمتہ اللہ علیہ۔

کابل کے ہنگامے | اسی سال کابل کے حالات بھی بڑے دگرگوں ہو گئے۔ اور ایک مختصر سی مدت میں کابل پر کئی ایک

حاکموں کا تقرر و تبادلہ ہو گیا۔ منعم خاں جب کابل سے ہندوستان آیا تھا تو اس نے حیدر خاں آختہ بیگ کو وہاں اپنا نائب بنا دیا تھا۔ لیکن اس کی بدسلوکی کی وجہ سے اسکی جگہ اپنے بیٹے غنی خاں کو قائم مقام بنا دیا، وہ بھی بالآخر غنی خاں سے کچھ کم نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے کابل کے ایک صاحب اقتدار امیر تولک خاں کو چین کو بے سبب ہی قید کر دیا۔ بعد میں تولک خاں نے قابو پا کر غنی خاں کو قید میں ڈال دیا۔ غنی خاں نے بڑے عمدہ و پیمان کے بعد اس قید سے رہائی پائی۔ پھر اس نے تولک خاں سے بدعہدی کی اور اس پر حملہ کر دیا۔ تولک خاں نے اس سے مقابلہ نہ کیا اور اپنی جاگیر چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں بادشاہ کی بیوی جو جگ بیگم نے جو ہمایوں کے دس سالہ لڑکے مرزا حکیم بیگ کی والدہ تھی، شاہ ولی بیگ آتک اور منعم خاں کے بھائی فضائل بیگ کو درمزا کامران نے اسے اندھا کر دیا تھا اس لیے اس کو کور کتے تھے، اور اسکے لڑکے ابوالفتح بیگ کی مدد سے قلعہ کابل کے دروازے بند کر لیے اور غنی خاں کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ غنی خاں بھی مجبور ہو کر ہندوستان آ گیا۔ چونکہ باپ منعم خاں اس سے ناراض تھا اسی لیے یہاں اسکی سرخروئی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا اور وہ جونپور میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسی حال میں وہ اپنے دن پورے کر گیا۔

فضائل بیگ مذکور تو بیگم کی جانب سے اور ابوالفتح بیگ باپ کی جانب سے کابل کے نائب بن کر گئے۔ اور وہاں انہوں نے اپنے لیے اچھی اچھی جاگیریں مخصوص کر لیں اور مرزا کی عمل داری میں بڑی جاگیریں چھوڑ دیں۔ شاہ ولی آتک کو ان کی یہ کارروائی بڑی ناگوار گزری۔ اس نے علی محمد اسپ (یہ شخص اب دربار شاہی سے متعلق ہے) کی مدد سے بیگم کے اشارہ پر ایک رات ابوالفتح بیگ کو جب کہ وہ نشہ سے چور تھا قتل کر دیا۔ اس کا باپ اپنا سارا مال متاع لے کر ہزارہ کی طرف کوچ کر گیا۔ لیکن میرزا کے آدمیوں نے تعاقب کر کے اس کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

**جو جگ بیگم کا اقتدار** | شاہ ولی بیگ نے بیگم کی تائید و مدد سے کابل کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنا خطاب عادل شاہ رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اس کی سرکوبی کے لیے شہنشاہ نے منعم خاں کو کابل کی حکومت اور میرزا حکیم بیگ کی اتالیقی پر مامور کر کے چند امراء کے ساتھ روانہ کیا۔ منعم خاں کے مقابلہ پر جو جگ بیگم میرزا کو ہمراہ لے کر کابل کے پورے شکر کے ساتھ جلال آباد پہنچ گئی۔ بیگم کے مقابلہ میں منعم خاں اور اس کے تمام مددگار امیروں محمد قلی خاں برلاس، شہاب خاں کے بھائی حسن خاں وغیرہ کو پہلے ہی حملہ میں بری طرح شکست کھانی پڑی۔ یہ لوگ سارا لاؤ لشکر تباہ کر کے بڑی بری حالت میں بادشاہ کی خدمت میں واپس آئے۔ اس فتح کے بعد بیگم نے شاہ ولی کو غدار سی کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔

**شاہ ابوالمعالی کی بغاوت** | اسی سال شاہ ابوالمعالی مکہ سے واپس آیا۔ اسی زمانہ میں میرزا اشرف الدین حسین آگرہ سے بھاگ گیا تھا۔ اس کے تعاقب میں بادشاہ نے حسین قلی خاں اور صادق محمد خاں وغیرہ کو مقرر کیا تھا۔ جب شاہ ابوالمعالی اٹانے راہ میں وہاں پہنچا تو میرزا اشرف الدین کے بھکانے سے اس نے بھی سرکشی اختیار کی۔ اور فتنہ و فساد مچاتے ہوئے ہر جگہ لوٹ مار کرنے لگا۔ حسین قلی خاں کے رشتہ دار اسماعیل قلی خاں احمد بیگ اور اسکندر بیگ اس کا تعاقب کرنے لگے اس تاخوت و تاراج میں شاہ ابوالمعالی نے قلعہ نارنول کے سرکاری خزانہ کو لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

شاہ جو جگ بیگم۔ پورا نام ماہ جو جگ بیگم تھا۔ کہتے ہیں یہ کوئی خاندانی عورت نہ تھی۔ جب ملتان میں حیدرہ بانو بیگم قندھار سے کابل چلی گئی۔ ہمایوں نے اس سے نکلا کر دیا تھا۔ جب اس کے بطن سے ہمایوں کا دوسرا لڑکا مرزا محمد حکیم پیدا ہوا تو اسے ہمایوں نے بیگم کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی۔ اس نے جس طرح کابل پر قبضہ رکھا اور بڑے بڑے امیروں پر قابو پایا یہ اس کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

محمد صادق خاں اور اسماعیل قلی خاں نے حملہ کر کے نارنول کے نواح میں ابوالمعالی کے بھائی خان زادہ کو جسے شاہ سوندان بھی کہتے تھے گرفتار کر لیا۔ بھائی کی گرفتاری سے ابوالمعالی بے دست و پا ہو گیا اور مجبوراً اس نے ہندوستان کو چھوڑ کر کابل کی راہ لی۔ پنجاب میں اس نے اسکندریہ اور احمد بیگ کو جو اپنے ساتھی امیروں سے جدا ہو گئے تھے ان کے ملازموں سے سازش کر کے گھیر لیا اور قتل کر دیا۔ اور ماہ جو جگ بیگ والدہ میرزا محمد حکیم کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے مرحوم بہاول بادشاہ کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اس کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا تھا

مابدیں در نہ پئے شمت و جہا آمدہ ایم  
از بد حسا و ثا این جہا بہ پناہ آمدہ ایم  
جو جگ بیگ نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا :-

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانہ تست

ابوالمعالی کا کابل پر قبضہ | جب شاہ ابوالمعالی وہاں پہنچا تو بیگم نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح بھی کر دیا۔ اور کابل کا سارا نظم و نسق ابوالمعالی کے ہاتھ میں آ گیا۔ کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی نے بعض شہسپو جیسے شوکون ولد قراچہ خاں وغیرہ کے بھگانے سے بیچاری بیگم کو قتل کر دیا حیدر قاسم کوہ بر کو بھی جو شاہ ولی بیگ کے بعد کچھ عرصہ تک کابل کا وزیر مطلق رہا تھا شہید کر دیا اور اس کے بھائی محمد قاسم کوہ بر کو قید میں ڈال دیا۔

شاہ ابوالمعالی کے اس خون خرابہ پر لوگ بگڑ گئے۔ اور ایک بڑی جماعت بیگم کے انتقام کے لیے مقابلہ پر آ گئی۔ کابل کے قلعہ میں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان لوگوں نے محمد قاسم کو قید خانہ سے نکال لیا۔ محمد قاسم یہاں سے نکل کر بدخشاں چلا گیا۔ اور وہاں مرزا سلیمان کو شاہ ابوالمعالی کی سرکوبی کے لیے آمادہ کیا۔ میرزا محمد حکیم نے بھی اپنا قاصد بھیج کر اس کو کابل آنے کی دعوت دی۔ اس واقعہ کی تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت | میرزا شرف الدین حسین مذکور نے بادشاہ کا بخوبی اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اور ناگور سے دارالخلافہ آگرہ میں آ گیا تھا۔ میرزا کا خاندانی تعلق چار واسطوں سے

خواجہ احرار عبید اللہ سے ملتا ہے۔ شرف الدین حسین ولد خواجہ معین الدین ولد خواجہ خاوند ولد خواجہ محی ولد خواجہ احرار۔ آگرہ میں رہتے ہوئے ان دنوں جبکہ اسکے والد مکہ معظمہ کی زیارت سے واپس آچکے تھے۔ شرف الدین حاسدوں کے ہلاوے میں آ کر بغیر کسی ظاہری وجہ کے بادشاہ کی طرف سے بدگمان ہو گیا اور ناگور واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں صادق محمد خاں و دیگر حکیمت کو حسین قلی خاں کے ہمراہ کر کے روانہ کیا اور انہیں ہدایت کی کہ پہلے تو اسے قلی و لاسہ دیکر سیدی راہ پر لائیں اگر دمانے تو اس کا معقولی سد باب کریں۔ مرزا شرف الدین ناگور جاتے ہوئے اجمیر کا قلعہ تبر خاں دیوانہ کے حوالہ کرتا گیا۔ لیکن دیوانہ بھی قلعہ خالی کر کے اس کے پیچھے چلا گیا جالور کے مقام پر مرزا شرف الدین حسین کی شاہ ابوالمعالی سے ملاقات ہوئی تھی جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ ان دونوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہ ابوالمعالی تو حسین قلی خاں کی فوج پر جو حاجی پور میں ٹھہری ہوئی تھی حملہ کر کے اسی راستہ سے کابل کو چلا جائے گا اور وہاں سے شاہزادہ میرزا محمد حکیم کو لے کر ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ اسکے آنے تک مرزا شرف الدین اسی جگہ شاہی فوج کو پریشان کرتا

رہے گا۔ اس منصوبہ پر پوری طرح عمل نہ ہو سکا کیوں کہ جب شاہ ابوالمعالی کو خبر ملی کہ صادق محمد خاں اور دوسرے امیر اس کے مقابلہ پر بڑی فوج لے کر آ رہے ہیں تو وہ اس قرار داد کو چھوڑ کر پہلے نارنول گیا اور وہاں کے حاکم میر گیسو شقدار کو گرفتار کر کے اس سے کچھ روپیہ وصول کر لیا۔ پھر سیدھا کابل کی طرف نکل گیا۔ شاہی لشکر سے احمد بیگ اسکندر بیگ صادق محمد خاں اور اسماعیل قلی خاں علیحدہ ہو کر اس کا تعاقب کرنے لگے۔

احمد بیگ اور اسکندر بیگ نے مرزا شرف الدین کے چند آدمیوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا اور ان پر کافی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ان ملازموں نے ایک مفسد شخص زمانہ قلی نامی کے ذریعہ شاہ ابوالمعالی کو یہ پیغام بھیجا کہ تم فلاں جگہ ٹھہرے رہو جس وقت یہ دونوں سردار وہاں پہنچیں گے ہم ان کا کام تمام کر دیں گے۔ اس سازش کے مطابق جب وہ دونوں مقررہ مقام سے گزرے تو شاہ ابوالمعالی نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا اور ان مفسد مخبروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مقتول سرداروں کے ساتھی منتشر ہو کر بھاگ گئے۔

**دہلی میں پھیل** جب اس واقعہ کی تفصیلات اکبر کو معلوم ہوئیں تو وہ اس بغاوت کو رفع کرنے کے خیال سے خود دہلی آیا۔ بادشاہ کی آمد کے بعد دہلی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد بادشاہ کے دل میں آیا کہ وہ دہلی کے امرار اور شرفار کی بیٹیوں سے نکاح کرے۔ چنانچہ بادشاہی خواجہ سرا اور مشاطہ عورتیں لڑکیوں کے انتخاب کے لیے دہلی کے گھرانوں میں آنے جانے لگیں اور دہلی والوں میں بڑی پھیل سی مچ گئی۔ اکبر کو اس بات پر شیخ بدہ اور آگرہ کے امرائے بہرہ نے آمادہ کیا تھا۔ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر بری طرح آگیا تھا۔ وہ عورت عبدالواسع کی زوجہ تھی۔ بادشاہ کی خواہش اور مطالبہ پر عبدالواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ اسے شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا گیا اور بیچارہ عبدالواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر جا کر بس گیا۔

**قاتلانہ حملہ** دہلی کے اس قیام کے دوران میں ایک دن بادشاہ سیر کرتے ہوئے بیگم کے مدرسہ کی طرف جانکلا۔ مدرسہ کی چھت پر سے فولاد نامی ایک لڑکے نے جو مرزا شرف الدین حسین کا غلام تھا، بادشاہ کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑ دیا، نشانہ اچٹ گیا۔ اور تیر بادشاہ کے جسم کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ خوبی قسمت سے بادشاہ کی جان بچ گئی۔ امرار نے مجرم کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کرنے اور مقدمہ چلانے کی رائے دی تاکہ ان سب لوگوں کا پتہ چل جائے جو اس قاتلانہ حملہ کی سازش میں شریک ہیں۔ لیکن بادشاہ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ اور اس لڑکے کو اسی وقت قتل کر دیا۔ وہاں سے سوار ہو کر قلعہ دین پناہ میں آکر ٹھہر گیا۔ طبیبوں کے علاج سے چند دن میں ہی وہ زخم اچھا ہو گیا۔ صحت پانے کے بعد بادشاہ دہلی سے لوٹ کر آگرہ میں آگرہ واپس آ گیا۔

**مرزا سلیمان کی کابل پر فوج کشی** اسی سال شاہ ابوالمعالی کا قضیہ بھی ختم ہو گیا۔ محمد قاسم کوہ برکی تحریک پر مرزا سلیمان نے بدخشاں سے کابل پر فوج کشی کی۔ ابوالمعالی میرزا حکیم کو ساتھ لے کر مقابلہ پر آیا۔ دونوں میں یہ لڑائی خوب بند کے کنارے پر ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد شاہ ابوالمعالی کی فوج کا ایک پہلو پسا ہونے لگا۔ اس محاذ کو سنبھالنے کے لیے ابوالمعالی خود اس طرف روانہ ہوا اور سلیمان مرزا کے مقابلہ پر مرزا محمد حکیم کو چھوڑ گیا۔ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی مرزا محمد حکیم نے اپنے خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر دریا عبور کیا اور سلیمان مرزا سے جا کر مل گیا۔ اس صورت حال کی تبدیلی کی وجہ سے ابوالمعالی کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ لیکن سلیمان مرزا کے آدمیوں نے اس کا تعاقب کر کے جاریکاروں کے قصبہ میں اسے گرفتار کر لیا۔ کابل میں



سلیمان مرزا کے سامنے اسے پابجولاں لایا گیا۔ سلیمان مرزا نے اسے اسی طرح مرزا محمد حکیم کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ نے اسی وقت اسے پھانسی پر چڑھا کر اپنی ماں کے قتل کا انتقام لے لیا۔ یہ واقعہ ۱۰ ماہ رمضان ۱۰۹۷ھ میں پیش آیا۔  
ان واقعات کے بعد سلیمان مرزا نے اپنی بیٹی کو مرزا محمد حکیم سے بیاہ دیا اور اپنے ایک معتمد ملازم امید علی کو اس کا وکیل مقرر کر کے بدخشاں واپس چلا گیا۔

**قلعہ چنہار پر قبضہ** | اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خاں نے چنہار کا قلعہ ایک دوسرے غلام فتو نامی کے سپرد کر دیا تھا۔ فتو نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بادشاہ کے دربار میں عریضہ روانہ کیا جس کے جواب میں بادشاہ نے فتو کے پیر شیخ محمد غوث اور آصف خاں خواجہ عبدالحمید ہروی کو فتو کے پاس روانہ کیا۔ ان لوگوں نے شرائط صلح طے کر کے فتو سے قلعہ کا قبضہ لے لیا اور قلعہ داری حسن خاں ترکمان کو تفویض کر دی۔ فتو کو اپنے ہمراہ دربار شاہی میں لے آئے۔ یہاں اس نے راضی عزت اور مرتبہ پایا اسی دوران میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ملا اسماعیل عطائی معنائی نے نکالی ہے،  
”بندہ خدا شد“

اسی سال میرے نانا محمد دوم اشرف نے ۲۰ رمضان کو رحلت کی ان کی تاریخ وفات ”فاضل جہاں“ ہے۔  
**خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک** | ۱۰۹۷ھ میں خواجہ مظفر علی تربتی کو خان کا خطاب اور وزارت کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ اس کے تقرر کا مادہ تاریخ ”ظالم“ ہے۔ خواجہ کی راجہ ٹوڈر مل سے نہ بھی۔ ان دونوں کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہر روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ کسی طرف نے ان دونوں کے متعلق اس ضرب المثل کو لے  
سگ کاشی بہ از صفا ہانی      گرچہ صد بار سگ ز کاشی بہ  
اس طرح بدل کر کہا ہے۔

سگ راجہ بہ از مظفر خاں      گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ  
امرائے دربار نے راجہ ٹوڈر مل کے خلاف محاذ سبنا لیا اور انہوں نے بادشاہ سے اس کی شکایتیں کیں۔ اکبر نے جواب دیا تم سب اپنی اپنی جاگیروں میں ہندوؤں کو ملازم رکھتے ہو یہ ہماری سرکار کا ہندو ہے۔ پھر کیوں ناراض ہوتے ہو؟  
ایک شخص نے راجہ کی مہر کے لیے یہ بھیج تجویز کیا تھا۔

آنکہ شد کار ہندو از وختل

راجہ راجہ ست ٹوڈر مل

اسی سال بادشاہ نے قاضی لال کو جو بڑا ظریف آدمی تھا کسی جرم میں برن سے طلب کر کے قتل کر دیا تھا۔ اس کی تاریخ نکالی گئی،  
”قاضی لال“

**رانی درگاوتی** | اسی سال عدلی کے ایک بڑے امیر غازی خاں سور نے بغاوت کی۔ یہ شخص کئی بار بادشاہی دربار میں حاضر ہوا۔ اور ہر مرتبہ سرکش ہو کر بھاگ گیا۔ اس مرتبہ اس نے کٹڑہ کے نواح میں اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی۔ اور آصف خاں پر حملہ کر دیا۔ آصف خاں نے اسے شکست دی وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح سے آصف خاں کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا اور اس نے

قوت حاصل کر کے کڑھ کشتہ کے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ اس علاقہ میں اس وقت ستر ہزار گاؤں آباد تھے اور اس کا صدر مقام قلعہ چوڑا گڑھ تھا۔ وہاں کی رانی بڑی خوبصورت اور حسین عورت تھی اس کا نام درگاوتی تھا۔ آصف خاں کے مقابلہ پر رانی بیس ہزار سوار پیادے اور سات سو جنگی ہاتھی لے کر آئی، فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی، آخر ایک محاذ پر رانی تیر لگنے سے بری طرح زخمی ہو گئی۔ اپنی ناموس کے خیال سے اس نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ اسے قتل کر دے۔ فیل بان نے ایک خنجر مار کر اس کا کام تمام کر دیا، لیکن حملہ آوروں میں سے ایک اوباش سپاہی نے رانی کے لاشہ ہی سے اپنی ہوس نکال لی دپاہ بچھا، رانی کو شکست دینے کے بعد آصف خاں نے چوڑا گڑھ پر یلغار کر دی۔ وہاں رانی کے لڑکے سے کچھ مقابلہ ہوا لیکن وہ بھی مارا گیا۔ آصف خاں کو مال غنیمت میں اتنا خزانہ ملا جو شمار سے باہر تھا اسی مال کا غرور تھا کہ آصف خاں میں بڑی نخوت پیدا ہو گئی۔ لیکن جلد ہی اس کا وہ غرور خاک میں مل گیا۔

اسی سال ۱۲ اذی قعدہ کو عین موسم باراں میں بادشاہ نے ہاتھیوں کے شکار کے ارادہ سے نرور کی طرف کوچ کیا اور اس شکار میں اس نے ہاتھیوں کو گرانے اور پکڑنے کے لیے چند نئے طریقے ایجاد کیے۔ نرور سے شاہی

## ہاتھیوں کا شکار

سواری سارنگ پور ہوتی ہوئی مندو کے علاقہ میں پہنچی۔ عبداللہ خاں اوزبک اپنے بعض جرائم کی وجہ سے خوف زدہ تھا۔ اس لیے وہ مندو سے بھاگ کر گجرات چلا گیا۔ مقیم خاں نے جس کو اس مہم میں شجاعت خاں کا خطاب ملا تھا اوزبک کو جا کر بہت کچھ سمجھایا اور اسے تسلی دلاسا دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ بادشاہی ہراول سے اس نے کچھ مقابلہ بھی کیا۔ جب اکبر قریب پہنچ گیا تو وہ اپنے اہل و عیال اور مال و اسباب کو چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ گجرات میں جنگیز خاں کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ کے آدمی گجرات کی حدود تک عبداللہ خاں کا تعاقب کرتے رہے اور اس کے حرم اور ہاتھیوں وغیرہ کو پکڑ لائے۔ جو بیچ گئے انہیں جانوں نے دھریا۔

جنگیز خاں سلطان محمود گجراتی کا غلام تھا۔ سلطان کے مرنے کے بعد گجرات کا حاکم بن گیا تھا۔ عام طور پر

## جنگیز خاں حاکم گجرات

مشہور ہے کہ اسکے عہد میں گجرات ایسا آباد تھا کہ پہلے اسکی مثال نہیں ملتی۔ علم و فضل کا وہاں بڑا دور دورہ تھا۔ جو بے سہارا بھی خان کا سپاہی بن جاتا تھا وہ ہر طرح سے خوش حال ہو جاتا تھا۔ جنگیز خاں بڑا فیاض شخص تھا۔ وہ ہر روز اپنے پینے کے پانچ چھوڑے لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اور اس کا ہر چوڑا پچاس ستر یا اسی اشرفی سے کم دام کا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی سخاوت کا ایک معمولی واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اپنے ملازموں کے ساتھ سیر کر رہا تھا۔ عبداللہ خاں اوزبک بھی اس کے ساتھ تھا۔ اتفاق سے اسی وقت نقدی اور اسباب سے بھری ہوئی دو تین کشتیاں اس کے نذرانے میں پیش کی گئیں۔ اس نے اسی وقت وہ کشتیاں عبداللہ خاں کو بخش دیں۔

شاہ عارف جنوں ایک عامل جنوں کی تسخیر کے عمل میں بہت مشہور تھا۔ میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں میں خزانہ کے خزانہ ٹایا کرتا تھا۔ یہ ساری دولت اسے گجرات ہی سے ملی تھی کیوں کہ اس کی اشرفیوں پر بھی جنگیز خاں کا ہی سکہ کندہ تھا۔

اسی سفر کے دوران میں برہان پور کے میراں مبارک شاہ نے قاصد بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اپنے خواجہ سرا اعتماد خاں کو ان قاصدوں کے ہمراہ بھیجا اور وہ جا کر میراں شاہ کے بیٹے کو بڑے تحفوں اور نذرانوں سمیت اپنے ساتھ لیتا آیا۔

اسی سال دکن کے ایک نامی امیر مقرب خاں نے بھی آکر اطاعت قبول کی۔

محرم سکنہ ۹۷۷ھ میں بادشاہ نے مندو سے قصبہ ناہجہ کا رخ کیا اور اس علاقہ کی حکومت قراہادر خاں کو عطا کی۔ یہاں سے شکار

کھیلے ہوئے اجین، سارنگ پور اور گوالیار کے راستے سے بادشاہ ۳۔ ربیع الاول کو آگرہ واپس آگیا۔

اسی سال محل شاہی میں کسی حرم کے بطن سے حسن اور حسین نامی دو توام لڑکے پیدا ہوئے۔ لیکن ایک مہینہ زندہ رہ کر دونوں مر گئے۔

**شہر نگر چین کی تعمیر** اکبر بادشاہ نے شہر نگر چین کو اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی۔ ابوالفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ سے لکھوائیں تھیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

”چوں مهندس کارخانہ ابداع اندیغہ بلند شہر یار کا مگار را کہ معمار معمورہ گیتی خصوصاً بنائے مقصورہ ہند ست از آغاز فطرت اختراع آئین ایجاد فرمودہ بمقتضائے ۷

جہاں دارد اند جہاں داشت

یکے را بریدن و گر کا شتن

ہر منزل و ہر گل زمینی را کہ ہوائے آن معتدل و فضائے آن صبیح و آبلش گوارا و سوادش مسطح باشد تعمیر بخشیدہ محل نزول اجلال موکب اقبال سازد چہ اختیار اماکن منزہ و مساکن طیبہ و منازل مروجہ و میاہ عذب بہر ابقائے نعمت و صحت بدنی و احتمال اعتدال مزاج انسانی کہ وسیلہ معرفت و طاعت یزدانی بہاں تواند بود از جملہ ستر ضروریہ است۔

خصوصاً وقتیکہ بعضے از مصالح علی نیز مثل سیر و شکار وغیرہ بآں متفہن گرد و بنابر ارا و داعی دریں سال نجستہ فال بعد از معاودت از سفر مالوہ کہ اویائے دولت منصور و اعدائے ملک مقصور شدہ بودند پیش روید۔ ہمت و الانہت و اقتضائے رائے جہاں آرائے چاں افتاد کہ موضع گھر آولی را کہ بہ یک فرستے آگرہ واقع شدہ و باعتبار لطافت آب و نظافت ہوا بر نیلے اکنہ رجحانے و مریتے تام داشتہ معسر چشم ہایوں و فہیم دولت ابد پیوند گردانیدہ و از مضائق مداخل و مخارج شہر خاطر قدس تاثر را فراغتے حاصل گشتہ اوقات فرخندہ سات را گاہے بچوگان بازی و گاہے بدوانیدن سگانی تازی و پر ایدن جانوران گوناگون مصروف سازند و بنائے آن معمورہ بلند اساس را بہ شگون استحکام مبانی قصر سلطنت بے زوال و تفاؤل از دیا و جاہ و جلال گرفتہ و بناؤں فرماں ناقد براں گوہر اصدار یافت کہ بار یافتگان قریب منزلت و منظورانی نظر ماطفہ ہر کلام از برائے خود در اں مکان مرفہ عمارات عالی و مناظر رفیع بنیاد نہند و راندک مدت سواداں بقعہ لطیف از پر تو توجہ حضرت ظل الہی خال رخ نو عروس عالم شد و نگر چین کہ عبارت است از امن آباد نام یافت ۷

لله الحمد ہر آن چیز کہ خاطر می خواست

آمد آخر ز پس پردہ تقدیر پدید

اب اس شہر اور اس کی عمارتوں کا کوئی نشان تک نہیں رہا۔

**صید دریا صید دریا کا عہدہ** | اسی سال یا گزشتہ سال بادشاہ نے قصبہ اندری کرناں سے شیخ عبدالقدوس لنگوہی کے پوتے

شیخ عبدالقدوس لنگوہی، یہ شیخ محمد بن عارف چشتی کے مرید تھے۔ انکی ایک کتاب ”الہدایہ“ ہے۔ صاحب معارج الہی نے انکو اول مادر زاد لکھا ہے۔

شیخ عبدالنبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انہیں یہ اجازت دی کہ مظفر خاں کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں چند دن بعد ہی وہ مستقل صدر الصدور ہو گئے۔ اولیٰ ولی انہوں نے لوگوں کو اس قدر انعامات اور روزینے عطا کیے کہ اگر سابقہ بادشاہوں کے تمام عطیوں کو بھی جمع کیا جائے تو اس کے برابر نہ ہوں بعد میں ان کا طرز عمل بالکل ہی برعکس ہو گیا، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

اسی سال خواجہ معظم سے جو رشتہ میں بادشاہ کا خالو ہوتا تھا بعض نامناسب حرکتیں ہوئیں۔ اکبر اسے نصیحت کرنے اور ان باتوں سے منع کرنے کے لیے اس کے گھر گیا۔ لیکن اس نے بادشاہ کی آمد کی خبر پا کر بدگمانی اور خبط کی وجہ سے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ اکبر نے اسے گرفتار کر کے سزا دی۔ پانی میں غوطے دلائے اور قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ اسی قید میں وہ قید حیات سے چھوٹ گیا۔

اسی سال تیسری مرتبہ مرزا سلیمان نے کابل کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ شاہ کابل پر تیسرا حملہ | ابوالمعالی کے سد باب اور میرزا محمد حکیم کو حاکم بنانے کے بعد واپس ہو رہا تھا تو اس نے کابل کے اکثر علاقے اپنے لشکریوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیئے تھے۔ اس کے آدمیوں اور مرزا کے درمیان ان بن ہو گئی اور مرزا نے بدخشاںی امیروں کو کابل سے بے دخل کر دیا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے مرزا سلیمان نے ایک بھاری لشکر لے کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ مرزا محمد حکیم میں اس سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ اس لیے وہ باقی قاتقال اور چند معتمد سرداروں کو کابل میں چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا۔

جب مرزا سلیمان نے اس کا تعاقب کیا تو وہ جلال آباد میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ اور وہاں سے دریائے نیلاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اکبر بادشاہ کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا۔ مرزا سلیمان نے جلال آباد میں اپنے ایک سردار قنبر نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر ٹھہرا دیا اور خود پشاور سے کابل واپس چلا گیا۔ اکبر کے حکم کے بموجب پنجاب کے تمام امیر جیسے محمد قلی خاں برلاس، انکہ خاں اپنی تمام جمعیت سمیت اور ملاں قاسم خاں، کمال خاں، کھرو وغیرہ مرزا محمد حکیم کی کمک پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جلال آباد پر حملہ کر کے قنبر کو تین سو آدمیوں سمیت نہ تیغ کر دیا اور قنبر کا سر فتح کی خوش خبری کے ساتھ کابل میں باقی قاتقال کے پاس بھیج دیا۔ اب مرزا سلیمان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ باگیں پھیر کر بدخشاں کی طرف بھاگ گیا اور مرزا حکیم فاتحہ کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی آمالیتی کے لیے خان کلاں کو متعین کیا۔ وہ تو وہاں رہ گیا اور دوسرے امرائے لشکر اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

کچھ عرصہ بعد مرزا محمد حکیم نے اپنی بیوہ بن کو جو شاہ ابوالمعالی کے نکاح میں تھی خان کلاں سے مشورہ کیے | خواجہ حسن نقشبندی | بغیر خواجہ نقشبندی کی اولاد میں سے خواجہ حسن نقشبندی کے نکاح میں دے دیا۔ خواجہ حسن کا مرتبہ اس رشتہ کی وجہ سے بڑھ گیا اور وہ کابل کا وکیل مطلق بن گیا۔ تمام امور سلطنت اس کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ اس کے دور حکومت پر ظریفوں نے یہ کہتی کسی ہے۔

گر خواجہ ما خواجہ حسن خواہد بود

ما را نہ جوال و نہ رسن خواہد بود

و بقیہ حاشیہ منہ سابقہ ان کے پوتے عبدالنبی نے اپنے باپ کے رسالہ "اباحت سماع" سے اختلاف کر کے سماع کے خلاف بڑا مدلل رسالہ لکھا تھا۔ یہ وہی عبدالنبی ہیں جن کو اکبر نے صدر الصدور بنایا تھا۔ عبدالنبی کو آخر میں اکبر نے ناراض ہو کر قید کر دیا۔ جس میں وہ ۱۹۲۷ء میں فوت ہو گئے۔ شیخ عبدالقدوس کی وفات ۱۰۸۰ھ میں ہوئی تھی۔ دہلی کے توابعات میں تمام نگارہ آپ کا مواد مرجع خلافت ہے۔

خواجہ حسن کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خان کلاں کے ہاتھ بندھ گئے اور وہ معطل ہو کر رہ گیا۔ یہ صورت حال جب ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ لاہور چلا آیا اور کابل کے سارے حالات بارگاہ شاہی میں لکھ کر روانہ کر دیئے۔

**شیخ الاسلام فتح پوری** | اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو سلسلہ میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے۔ ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اسکی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو۔ ان کی آمد پر میں نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور ان کے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ پہلی تاریخ یہ ہے :-

شیخ اسلام مقتدائے انام  
رفع اللہ قدرہ السامی  
از مدینہ چوموئے ہند آمد  
آن ہدایت پنا ہے نامی  
ہند از مقدم ہمایونش  
یافت از سر محبتہ فرجامی  
گیر حرفے و ترک کن حرفے  
بہر سانش ز شیخ اسلامی

دوسری تاریخ یہ ہے :-

شیخ اسلام ولی کامل  
لامع از جہنہ او سرانبل  
از مدینہ چوموئے ہند و سنات  
بشمر حرفے و مشمر حرفے  
آن میحان نفس و خضر قدم  
طالع از چہرہ او نور قدم  
بہر تلخیص ز خیر المقدم

جس خانقاہ کا ذکر کیا گیا، وہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

انہی دنوں آگرہ میں بنگالی محل اس کے علاوہ ایک اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر کے سلسلہ میں قاسم الاسلامی نے یہ تاریخ لکھی ہے :-

چوں از پے عشرت شہ زیبا منظر  
تاریخ یکے از عشرت آمدیروں  
فرمود بنادر خانہ فیض اثر  
شد خانہ بادشاہ تاریخ دگر

بادشاہ سلامت نے سلسلہ میں پہلی رجب کو ہاتھیوں کے شکار کے لیے زور اور کبرہ کا ارادہ کیا۔ اور وہاں شکاریوں کو ہاتھی پکڑنے کے لیے مقرر کر کے شاہانہ سواری گواہیا پہنچ گئی۔ گواہیا میں گرمی کی وجہ سے بادشاہ کو بخار آگیا۔ جب صحت ہوئی تو وہ وہاں سے لوٹ آیا۔ ہاتھی کا شکار :- ہاتھی کے شکار کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ "کیدا" کہلاتا تھا اس میں سوار اور پیادہ ہو کر شکار کھیلتے تھے۔ یہ شکار جو ماگرمی کے موسم میں کیا جاتا تھا۔ ڈھول اور نظیریاں بجا کر ہاتھی کو بدحواس کر دیا جاتا تھا اور اسے اس قدر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ تھک جاتا تھا اور کسی درخت کے سایہ میں سستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ شکاری موٹے زبے اسکی گردن اور پاؤں میں ڈال دیتے اور اسی درخت سے جکڑ دیتے پھر ہاتھی ہاتھی کے ذریعہ اسے مانوس کیا جاتا۔ ایک اور طریقہ "چور کیدا" کہلاتا تھا ہاتھی کے جنگل ہاتھیوں کی چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور ہاتھی اس طرح بیٹھ جاتا تھا کہ کھانا نہ دے۔ جب ہاتھیوں کے غول میں داخل ہوتا باقی اگلے طریقہ



**آگرہ کی تعمیر** | اکبر نے اسی سال آگرہ کے قلعہ کی تعمیر کا ارادہ کیا اور وہاں کے خشتی قلعہ کو ڈھا کر سنگین قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ کی تعمیر کے اخراجات کے لیے بادشاہ کے حکم سے فی جریب تین سیر غلہ کا محصول لگایا گیا۔ یہ

محل سارے ملک میں امراء اور جاگیرداروں سے تحصیل کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہو گیا۔ اس کی دیوار کا عرض دس گز اور بلندی چالیس گز ہے۔ فصیل کے گرد جو گہری خندق ہے اس کے دونوں طرف پتھر اور سچ کا پستہ بنا ہوا ہے۔ اس خندق کا عرض بیس گز اور پانی کی سطح تک گہرائی دس گز ہے۔ خندق میں دریائے جمناسے پانی لایا گیا ہے۔ قلعہ ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ دنیا میں کاشانی نہ ہوگا۔ اس کے دروازہ کی تاریخ شیخ فیضی نے ”بنائے در بہشت“ کہی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ قلعہ مکمل ہو گیا تو اس میں ہندوستان کی تمام مالیات کا صدر خزانہ قائم کیا گیا۔ اسی مناسبت سے یہ تاریخ لکالی گئی ہے

”شدینائے قلعہ بہر زہر“

جو روپیہ اس قلعہ میں پڑا ہوا ہے نہ معلوم کب اپنی بربادی کی داستان سنائے۔ زبان حال سے تو وہ اُخْرَجَتْ اِلٰی سَحْلِ اَٹھما کا ورد کرتا نظر آتا ہے۔

زہر از بہر خوردن بوداے پسر

زہر نہ سادن چہ سنگ و چہ زہر

**وزبک سرداروں کی بغاوت** | اسی سال خان زمان ابراہیم خاں اور اسکندر خاں وزبک نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا قصہ یہ ہے کہ عبداللہ خاں وزبک کی سرکشی کی وجہ سے اکبر تمام وزبکوں سے بدگمان ہو گیا تھا۔ اسکندر خاں وزبک دودھ کا جاگیردار تھا۔ اکبر نے زور سے اشرف خاں میرنشی کو بلا کر اسکندر خاں کو لانے کے لیے روانہ کیا۔ ابراہیم خاں وزبک تمام وزبکوں کا سردار تھا۔ جاگیردار اور حاکم بھی تھا۔ اودھ پہنچنے کے بعد تمام وزبک سرداروں نے مل کر مشورہ کیا۔ اور سب نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر کے اشرف خاں کو قید کر لیا اور خود جو پور میں خان زمان کے پاس چلے گئے۔ وزبکوں نے دو مقامات سے بغاوت شروع کی۔ لکھنؤ میں بغاوت کی ابتدا اسکندر خاں اور ابراہیم خاں کی سرکردگی میں ہوئی اور بانک پور میں بغاوت کے سرگروہ خان زمان اور بہادر خاں تھے۔ کمرہ پر باغیوں نے شاہم خاں جلائیہ اور شاہ بدایع خاں پر حملہ کر کے

قلعہ آگرہ، قلعہ کی عمارت سنگ مرمر کی ہے جس کے چاروں طرف خندق ہے، فصیل، فٹ بلند ہے، قلعہ کا دور دو میل ہوگا، قلعہ میں شاہی محل سرا، دیوان خانہ، خاص، مشن برج، انگودی باغ، حوض، شیش محل مشہور عمارتیں ہیں۔ ان میں شاہ جہان کی بنائی ہوئی مسجد، موتی مسجد، نہایت خوب صورت ہے۔ یہ مسجد شیش محل میں بنائی تھی۔ منظر نے لکھا ہے: ”یہ مسجد دنیا کے تمام معبدوں میں سب سے زیادہ نفیس ہے“۔ جہانگیر نے توڑک میں لکھا ہے: ”ایک پانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری پیدائش کے پہلے اس کو گرا کر قلعہ سرخ پتھر کا بنوایا کہ سیاح اس جیسا قلعہ اور نہیں ملتے۔ پندرہ سو سال میں مکمل ہوا۔ اس میں چار دروازے اور دو کمرہ کیاں ہیں“۔ تعمیر میں ۲۵ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا۔ مروجہ ایک سو پندرہ طومان اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ ”خانی“ کے مساوی ہے خرچ ہوا۔

غیر صفحہ سابقہ، توہمات کسی ہاتھی پر کند چینگ کراسے بے بس کر دیا اور اپنے ہاتھی سمیت اسے نکال لانا۔ ہاتھی کو پکڑنے کی ایک اور شکل ”گاڈ“ تھی۔ ایک گہرا خانکھود کراسے لٹا اس اور گردوں سے پاٹ دیتے تھے۔ یہ گردہا ہاتھیوں کی مام گرد گاہ پر کھودا جاتا تھا جب ہاتھی اس گڑھے کے قریب پہنچتا تو اطراف سے گھات میں بھرتے شکاری شور مچاتے ہاتھی بھڑک کر تیزی سے بھاگتا اور جلدی میں اس گڑھے کو دیکھ دھپاتا اور اس میں گر جاتا تھا جب بھوک پیاس سے بت بیناب ہونے لگتا تو اسے وہ ادھیان دے کر آہستہ آہستہ مانوس کر لیتے۔ ایک اور صورت ”بار کھلاقی“ تھی ایک وسیع خطہ زمین کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی تھی اس کا صرف ایک راستہ کھلا رکھ کر باہر دروازہ لگا دیا جاتا تھا۔ چارہ کے لالچ میں ہاتھی بے محابا داخل ہو جاتا تھا۔ شکاری دروازہ بند کر دیتے تھے اور راستہ کاٹ دیتے تھے۔ ہاتھی غضب ناک کر نکلنے کے لیے بڑا زور لگاتا تھا لیکن مدد نہ جاتا اس طرف آگ جاتا تھا کہ اسے ڈرایا جاتا تھا کہ اگر وہاں پر کھڑا ہو جائے تو ہاتھیوں کے ذریعہ اسے مانوس کر لیا جاتا تھا (آئین اکبری ص ۱۱۱)

شکست دے دی اور یہ دونوں نیم کھار کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ محمد امین دیوانہ اسی معرکہ میں باغیوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ مجنوں خاں نے قاتل بھی باغیوں کے سامنے بٹھرنے سکا اور وہ مانگ پور میں قلعہ بند ہو گیا۔ اور آصف خاں کٹرہ اور کتنکہ کا علاقہ ایک جمعیت کی حفاظت میں دے کر کافی بڑے خزانہ اور بھاری لشکر کے ساتھ مجنوں خاں کی کمک کے لیے پہنچ گیا اور خزانہ کا منہ کھول کر اس نے لشکریوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے لشکر میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے خان زماں کے مقابلہ میں ایک مضبوط محاذ بنایا اور بارگاہ شاہی میں عریضہ روانہ کیے۔ ثانی خاں نے اپنے عریضہ میں یہ شعر لکھا تھا ہے

اے شہسوار معرکہ آراے روزِ رزم  
از دست رفت معرکہ پادِ درکاب گن

**باغیوں پر اکبر کی فوج کشتی** | جس وقت بادشاہ سلامت مالوہ کے سفر سے لوٹے تو انہیں اس بغاوت کی اطلاع ملی۔ بادشاہ نے اسی وقت منعم خان خانناں کو آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ دریائے گنگا کو قنوج کے گھاٹ سے عبور کر کے باغیوں کے مقابلہ میں صف آرائی کرے۔ اسکی روانگی کے بعد اکبر ماہ شوال ۹۷۷ھ میں میدان جنگ کے لیے ہوا۔ جب سواری قنوج پہنچی تو باغیوں کے ساتھ ہو گیا تھا خانناں کی سفارش پر باریاب ہوا، بادشاہ نے اس کے جرم معاف کر دیئے۔ وہاں سے شاہی لشکر لیٹا کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ سکندر خاں کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ لڑے بغیر پناہ ہو گیا اور خاں زماں اور بہادر خاں سے جا کر مل گیا۔ یہ سب لوگ آصف خاں اور مجنوں خاں کے مقابلہ کو ترک کر کے جو پور کی طرف فرار ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ نہر ہن ندی کو عبور کر کے کیمپ لگا دیا۔

**جون پور میں چھاؤنی** | ان کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر سے یوسف محمد خاں ولد اتکہ خاں کو نامزد کیا گیا۔ اسکے چھپے بادشاہ نے بھی کوچ کیا اور جو پور کے سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ اسی منزل میں آصف خاں مجنوں خاں کے ہمراہ پانچ ہزار تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ لشکر میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ بروز جمعہ ۱۲ ذی الحجہ ۹۷۷ھ میں اکبر نے قلعہ جو پور میں نزول اجلال فرمایا۔ آصف خاں کو لشکر کی کمان دے کر باغیوں کے مقابلہ پر رخصت کیا۔ اس نے نہر ہن کے راستہ پر خان زماں کے مقابل اپنا کیمپ لگا دیا۔ بادشاہ نے اس دوران میں حاجی محمد خاں سیستانی کو بنگالہ کے حاکم سلیمان کرانی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ سلیمان کی خان زماں سے بڑی دوستی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ باغی خان کی مدد کرے گا۔ اس سفارت کی غرض یہ تھی کہ اسے خان زماں کی مدد سے روک دیا جائے۔ لیکن جب حاجی محمد خاں رہتاس کے قلعہ پر پہنچا تو وہاں کے پٹھانوں نے جو خان زماں سے ملے ہوئے تھے اسے گرفتار کر کے خان زماں کے پاس بھیج دیا۔ خان زماں نے قدیم روابط اور آشنائی کی وجہ سے حاجی محمد خاں کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی والدہ کو اس کے ہمراہ کر کے بادشاہ کے پاس اپنے قصور معاف کرانے کے لیے روانہ کیا۔

جون پور کے قیام کے دوران میں اکبر نے حسن خاں خزانچی اور مہا پاتر بھاٹ کو جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے دربار کارکن تھا۔ اور ہندی شاعری و موسیقی میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا۔ اوڈیسیہ کے راجہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نہ تو خان زماں کی مدد کرے اور نہ اسے اپنے ہاں پناہ دے۔ بلکہ اپنے اثر سے کام لے کر سلیمان کو بھی مخالفانہ حرکتوں سے روک دے۔ سلیمان نے طوعاً و کرہاً اس بات کو مان لیا اور بادشاہ کے لیے نفیس تحفے اور عمدہ ہاتھی روانہ کر کے اطاعت اختیار کر لی۔ یہ دونوں سفیر لوٹ کر آگرہ میں باریاب ہوئے۔

انہی دنوں مظفر خاں اور دوسرے چند بااثر سردار آصف خاں کے مخالف ہو گئے۔ ان کو آصف خاں سے

## آصف خاں کا فرار

بھاری انعام اور تحائف کی توقع تھی اور وہ مارے حرص کے ان مطالبات کو صراحتاً اور کنایتاً ظاہر کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے صاف صاف چور اگر دھ کے مال غنیمت کا مطالبہ کر دیا۔ آصف خاں نہہن کی سڑک پر خان زماں کے مقابلہ میں محاذ بنائے ہوئے تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں کے مطالبوں اور مخالفتوں سے وہ سخت پریشان ہو گیا اور آدھی رات کے وقت اپنے چھوٹے بھائی وزیر خاں کو لے کر اپنی خاص جمعیت کے ہمراہ کرہ کنتک کے راستہ کٹڑہ کو چلا گیا۔ جب اس کے محاذ چھوڑ کر چلے جانے کی اطلاع بارگاہ شاہی میں پہنچی تو لشکر کی کمان منعم خاں خاتخاناں کو دے دی گئی اور شجاعت خاں کو آصف خاں کے تعاقب پر مامور کیا گیا۔

شجاعت خاں مانک پور سے کشتیوں پر سوار ہو کر آگے بڑھا تھا کہ اس کی آمد کی اطلاع آصف خاں کو ہو گئی اور وہ قلعہ رہتاس لوٹ کر دریا کے کنارے مقابلہ پر آ گیا۔ اور ایک سخت جنگ کر کے شجاعت خاں کی کشتیوں کو گنگا عبور کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً شجاعت خاں رات کے وقت پیچھے ہٹ کر گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گیا۔ اور آصف خاں نے فوج کشی کر کے اس طرف کے سارے علاقہ کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ شجاعت خاں دوسرے راستہ سے کٹڑہ چلا گیا۔ وہاں سے غنیمت کا تعاقب شروع کیا۔ لیکن آصف خاں کافی دور نکل گیا تھا۔ اس لیے وہ جون پور آ کر باریاب ہو گیا۔

انہی دنوں قلعہ رہتاس کے حاکم فتح خاں افغان تبتی نے اپنے بھائی حسن خاں کو بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ ۱۷۹۲ء میں سلیمان کرانی نے اس کے قلعہ پر حملہ کیا تھا۔ لیکن جب اس نے شہنشاہ کی آمد آمد سنی تو محاصرہ اٹھالیا تھا۔ غرض حسن خاں نے حاضر ہو کر مناسب تدبیراں گزرانے اور درخواست کی کہ کسی سردار کو مقرر کر دیا جائے تاکہ ہم قلعہ اس کے سپرد کر دیں۔ بادشاہ نے جونپور سے خلیج خاں کو اس کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بعد میں فتح خاں اپنے بھائی کو اس سفارت پر بھیجنے سے پشیمان ہوا اور قلعہ میں کافی سامان رسد جمع کر کے اپنے بھائی کو لکھ بھیجا کہ تم جلد از جلد لوٹ آؤ کیوں کہ اب قلعہ میں رسد وغیرہ کا کافی ذخیرہ ہو چکا ہے۔ اور قلعہ سپرد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حسن خاں نے اس خط کے ملنے پر خلیج خاں کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی، بظاہر وہ اس کی بڑی اطاعت کرتا رہتا تھا لیکن خلیج خاں جلد ہی اس کی منافقت سے آگاہ ہو گیا اور قلعہ کا خیال چھوڑ کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

رہتاس کا یہ قلعہ ہمارے توابعات میں چودہ کوس کے طول اور تین کوس کے عرض میں واقع ہے۔ اس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعہ کے اندر زراعت ہوتی ہے۔ پانی اتنا وافر ہے کہ جہاں میخ گاڑ دو وہیں پانی نکل آتا ہے۔ جب سے شیر شاہ نے یہ قلعہ فتح کیا تھا۔ پٹانوں کے قبضہ ہی میں چلا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ فتح خاں اس کا حاکم بنا اور اس نے سلیمان کے سامنے ہار نہ مانی۔ آخر کار فتح خاں سے شاہی لشکر نے یہ قلعہ چھین لیا جس کا ذکر حسب موقع آئندہ کیا جائے گا۔

صلح کی گفت و شنید | جون پور میں بادشاہ چھاؤنی ڈالے ہوئے مقیم تھے۔ اور انہوں نے منعم خاں کو مقدمۃ البیش کا سردار بنا کر

۱۷۹۲ء میں شیر شاہ کے وقت سے پٹانوں کی حکمرانی چلی آرہی تھی یہ بادشاہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھے۔ عدلی شاہ کے زمانہ میں کرانی افغانوں میں سے چند امیر اور سردار دربار سے ناراض ہو کر بنگال چلے گئے۔ اور وہاں خود مختار حکومت بنالی ان کا سردار تاج خاں تھا۔ سلیمان کرانی اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے کنگ بنارس جتنا تھکا مروت اور اذیت تک کے ملنے فتح کیے۔ اس کی زندگی تک اکبر نے بنگال کا رخ نہیں کیا۔ یہ نہایت بہادر و منظم اور دیندار حکمران تھا۔ ڈیڑھ سو عالم اہل مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ تفسیر حدیث نماز روزہ کا شائق تھا اس کے اوقات نہایت باقاعدہ تھے۔ اس کے بعد پٹانوں میں خانہ جنگی اور سازشیں شروع ہو گئیں اور بنگال میں مغلوں کا اثر و سوج بڑھ گیا۔

خان زماں کے مقابلہ میں بھیجا تھا اور خود امور سلطنت کی انجام دہی میں مشغول رہے جب منعم خان نہین گھاٹ پر اس کے مقابلہ میں پہنچا۔ خان زماں نے بہادر خاں کو سردار بنا کر سردار کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ میں شورش برپا کر کے جہاں تک ممکن ہے قبضہ کرے۔ باغیوں کی امان کارروائی کو روکنے کے لیے بادشاہ نے معز الملک مشہدی کو جو قطعاً سرداری کی اہلیت نہیں رکھتا تھا مامور کیا۔ اس کے ساتھ لشکر کے بڑے امرا جیسے شاہ بدراغ خاں اس کا رد کا عبدالمطلب خاں، قبا خاں، سعید خاں اور محمد معصوم خاں فرخودی وغیرہ کو بھی نامزد کیا گیا۔

اسی دوران میں منعم خاں نے خان زماں سے سابقہ روابط کی بنا پر سفارت و مراسلت جاری رکھی اور اسی میں اس نے چار پانچ ماہ گزار دیئے اور باغیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ آخر بادشاہ نے صلح یا جنگ کے قطعی فیصلہ کی خاطر خواجہ جہاں اور دربار خاں کو جو پورے نہین روانہ کیا۔ ان لوگوں کے آنے پر صلح کی باتا مقررہ گفتگو ہوئی باغیوں کی طرف سے خان زماں دو تین آدمیوں کے ساتھ اور لشکر شاہی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی۔ اس شرط پر طے پائی کہ خان زماں اپنی والدہ کو اپنے چچا ابراہیم خاں اوزبک کے محل دربار میں بھیج دے۔ اور جتنے مشہور اور عمدہ ہاتھی اس کے پاس ہیں وہ شاہی کارندوں کے سپرد کر دے۔ جب اسے معافی مل جائے تو سکندر اور بہادر بھی دربار میں حاضر ہو جائیں۔ جب صلح طے پاگئی تو دربار خاں واپس چلا گیا اور بادشاہ کو اس کی اطلاع دی۔

دوسرے دن ناناخان اور خواجہ جہاں خان زماں کی والدہ اور ابراہیم خاں کو ہمراہ لے کر مع ہاتھیوں کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور دونوں نے خان زماں کے قصور معاف کر دینے کی سفارش کی۔ شاید اسے معافی مل جاتی، لیکن اسی وقت سردار سے میر معز الملک کی شکست اور فرار کی اطلاع پہنچی جسے سنتے ہی شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ صلح ادھوری رہ گئی۔

**معز الملک کی فوج کشی** | معز الملک کی شکست کا قصہ یہ ہوا کہ جب سکندر اور بہادر کے مقابلہ پر بادشاہی فوج پہنچی تو یہ دونوں اس جگہ ٹھہر گئے جہاں تک کہ وہ پیش قدمی کر چکے تھے اور معز الملک کو پیغام دیا کہ تم ہمارا واسطہ بن کر دربار سے ہمارے جرم معاف کرادو تاکہ جو کچھ ہاتھی اور مال غنیمت ہم نے جمع کر رکھا ہے وہ سب ہم دربار میں روانہ کر دیں۔ جب ہماری خطائیں معاف ہو جائیں گی تو ہم خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میر معز الملک ایک فرعون صفت آدمی تھا۔ اور یہ غرور تو مشہدی بیدوں کو معلوم ہوتا ہے وراثت ہی میں ملا ہے اسی لیے مشہور ہے۔

اہل مشہد بجز امام شمس

لعنة الله بر تمام شمس

ان کی شان میں ایک شعر یہ بھی ہے۔

روئے زمین گرچہ ز مردم خوش است

مشہدی از روئے زمین گم خوش است

چنانچہ اس نے بڑے تکبر اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور ان کے اظہار اطاعت پر کہلا بھیجا کہ اب صرف تلوار ہی تمہارا فیصلہ چکائے گی ابھی معاملہ اسی نوبت پر تھا کہ بادشاہ کی طرف سے لشکر خاں میر بخش اور میر نوڈر مل پہنچے تاکہ صلح یا جنگ کوئی ایک بات جلدانہ جلد طے پا جائے اگر مناسب ہو تو جنگ کریں ورنہ سکندر اور بہادر کو تسلی دلا سادے کر اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

**المقوائے جنگ کی پیشکش** | بہادر خاں خود شاہی لشکر کی چھاؤنی کے قریب آیا اور اس نے میر معز الملک کو چند میروں کے ساتھ

بلا کر صلح کی گفتگو چھیڑی اور کہا کہ ”خان زمان اپنی والدہ اور ابراہیم خاں کو صلح کے لیے دربار میں بھیج رہا ہے بلکہ اب تک وہ بھیج بھی چکا ہوگا اس لیے ہم کو اپنے قصوروں کی معافی کی امید اور توقع ہے۔ ہم اس سفارت کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ لکھنؤ نہیں ہو جاتا ہم رڈائی چھیرنا نہیں چاہتے۔ تم بھی دربار سے جواب آنے تک کچھ دن تک رڈائی کو ملتوی رکھو تو بہتر ہے۔“

التوائے جنگ کے لیے بہادر خاں کا یہ مطالبہ نہایت معقول تھا لیکن میر معز الملک کو اتنی سمجھ کہاں وہ تو بس آگ بنا ہوا تھا اور راجہ ٹوڈر مل تیل سے کم نہیں تھے۔ وہ برابر اس آگ کو بھڑکاتے

## معز الملک کی شکست

رہے۔ چنانچہ انہوں نے بہادر خاں کو منہ توڑ جواب دیا اُنکے اس رویہ سے بہادر خاں اور اسکندر خاں مایوس ہو گئے اور مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی۔ میر معز الملک نے اُنکے مقابلہ پر محمد امین دیوانہ کو مقدمہ لشکر پر مقرر کر کے بڑھایا اور خود طلب لشکر میں ٹھہرا رہا۔ اپنے ساتھ تجربہ کار سپاہیوں اور عبدالمطلب خاں، سلیم خاں، کاکر علی خاں، بیگ نورین خاں سرداروں کو متعین کر کے دوسرے امیروں کو مینہ اور میرہ پر لگا دیا۔ دوسری طرف باغیوں کے ہراول پر تو سکندر خاں اور اس کا داماد محمد یار تھا، قول پر بہادر خاں خود کمان کر رہا تھا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جلد ہی محمد یار قتل ہو گیا اور اسکندر خاں گھبرا کر کالی ندی میں کود پڑا اور تیر کر نکل گیا۔ اس کے اکثر ہمراہی ندی میں غرق ہو گئے جو بچے وہ دشمن کی تلوار کا نشانہ بن گئے، ساری فوج لوٹ مار میں منتشر ہو گئی۔ میدان میں میر معز الملک اپنے چند سرداروں کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ بہادر خاں ابھی تک اپنے مورچے پر جا ہوا تھا، اس نے جب میر کو تنہا پایا تو اچانک اس پر حملہ کر دیا اور ایک ہی حملہ میں اس کے قدم اکھاڑ دیئے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے جنگجو جوانوں نے خاص طور سے حسین خاں خویش، حمدی قاسم خاں اور باقی محمد خاں وغیرہ نے جو میر معز الملک کی سرداری اور راجہ ٹوڈر مل کے حکم چلانے سے رنجیدہ تھے جس قدر جدوجہد کرنی چاہیے تھی نہیں کی۔ البتہ شاہ بدایغ خاں نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ روتے روتے وہ گھوڑے سے گر پڑا، اس کے بیٹے عبدالمطلب خاں نے اس کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا آخر اپنی جان بچا کر نکل گیا اور اس کا باپ اوزبکوں کے ہاتھ قید ہو گیا۔ راجہ ٹوڈر مل اور خاں کاکر علی سپاہی ہو گیا۔ رات میں ان لوگوں نے ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لیے باغیوں پر حملہ کیا لیکن کچھ نہ کر سکے۔ باغیوں نے ان کو منتشر کر کے بھاگ دیا۔ دوسرے دن یہ سب اکٹھا ہو کر شیر گڑھ کی طرف ہٹ گئے۔ اور ساری روٹا دربار میں لکھ بھیجی۔

اب ہم اصل قصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب خانخاناں، خان زمان کی والدہ ابراہیم خاں اور خان زمان کے معتمد آدمیوں میر ہادی صدر اور نظام آغا کو دربار میں لے کر آیا اور

## باغیوں کی اطاعت اور معافی

جنگی ہاتھی بھی ملاحظہ میں پیش کیے تو ابراہیم خاں سر پہ نہ گردن میں تلوار دکھائے اور بجائے چادر کے کفن پیٹے ہوئے زبان حال و حال سے کہہ رہا تھا۔

”خدا ہی ہمارے خواہی بکشی رڈائی رائے تست“

خان خاناں بھی ان لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کر رہا تھا، بادشاہ نے ان سب کے جرم معاف کر دیئے ان کی جائیری بحال کر دی اور حکم دیا کہ جب تک لشکر یہاں ہے یہ لوگ دریا عبور نہ کریں اور ان کے نمائندے آگرہ میں آکر فرامین حاصل کر کے حسب فرمان اپنی جاگیروں کو سنبھال لیں۔ خان زمان کی والدہ نے یہ خوش خبری اپنے بیٹوں کے پاس بھیج دی اور بہادر و سکندر نے گوہ پابہ اور صف شکن ہاتھیوں کو جن کی وجہ سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا تھا۔ تذرانوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ عین اسی مرحلہ پر راجہ ٹوڈر مل اور لشکر خاں کا عریضہ جس میں رڈائی اور شکست اور امراء کی منافقت کا ذکر تھا پہنچا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا



”ہم نے خانخانان کی خاطر سے خان زماں اور دوسروں کو معافی دے دی ہے اب تمام امیر دربار میں لوٹ آئیں۔“ اسی سلسلہ میں میر معز الملک اور راجہ ٹوڈر مل پر شاہی عتاب بھی نازل ہوا۔ جن لوگوں نے مناققت سے کام لیا تھا وہ عرصہ تک کورنش و تسلیات سے محروم کر دیئے گئے۔ بعد میں پھر ان کو اپنے اپنے اعزاز و بارہ مل گئے۔

**خان زماں کی عہد شکنی** | اسی زمانہ میں بادشاہ نے کوچ کیا۔ قلعہ چنار کی سیر کی اور اس قلعہ کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کیا۔ کرنے کے بعد لشکر میں لوٹ آیا۔ جس زمانہ میں قلعہ چنار میں چھاؤنی تھی خان زماں نے عجلت کر کے

دریائے گنگا کو عبور کیا اور معاہدہ صلح کے خلاف قصبہ منو کے ملحقہ دیہات محمد آباد میں آگیا اور اپنے گماشتوں کو جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرنے بھیج دیا۔ شہنشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ انہوں نے اشرف خاں میرنشی کو جونپور بھیجا تاکہ خان زماں کی والدہ کو قلعہ میں نظر بند کر کے تمام باغیوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ پھر بادشاہ نے لشکر کو خواجہ جہاں اور مظفر خاں کی تحویل میں چھوڑا اور خود خان زماں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب بادشاہ سردار ندی کے کنارے پہنچے تو غنیم کی مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں بادشاہی آدمیوں کے ہاتھ آگئیں۔ بادشاہ نے ندی کے کناروں پر چوکیاں قائم کر کے گھنے جنگلوں کو طے کیا۔ جب معلوم ہوا کہ خان زماں کوہ سوانک کی طرف بھاگ گیا ہے تو اس کا تعاقب چھوڑ کر لوٹ آئے۔

اسی اثناء میں بہادر خاں چند بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کے ساتھ جونپور پہنچا اور کمندوں کے ذریعہ قلعہ پر چڑھ کر اپنی والدہ کو چھڑا لایا اور اشرف خاں کو قید کر لیا۔ لیکن جب اس کو بادشاہ کے لوٹ کر آنے کی خبر ملی تو وہ سکندر خاں کے ہمراہ زہن گھاٹ کے ذریعہ گنگا کو عبور کر کے بھاگ گیا۔

**بادشاہ کی سالگرہ کا جشن** | پانچ رجب ۱۰۳۹ء کو جون پور کے ملحقہ پرگنہ نظام آباد میں اکبر کی سالگرہ ہوئی۔ معمول یہ تھا کہ سالگرہ پر بادشاہ کو تولیے کا جشن منعقد ہوتا تھا۔ جس میں شمسی اور قمری تاریخوں کے حساب سے سال میں دو بار سونے چاندی اور ہر قسم کے اجناس سے بادشاہ کو تولا جاتا تھا پھر یہ تول برتنوں اور دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس رسم کے موقع پر شاعروں نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں۔

**آگرہ کو اکبر کی واپسی** | جشن سالگرہ کے بعد بادشاہ جونپور کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ جب خان زماں کو بادشاہ کے قیام کی اطلاع ملی تو اس نے میرزا میرک کو جسے بعد میں رضوی خاں کا خطاب ملا تھا خان خانان کے پاس سفارش کروانے بھیجا۔ وہ خان زماں کی والدہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا۔ خان زماں کا پیغام اطاعت پیش کیا۔ خان خانان نے میر عبد اللطیف قزوینی ملا عبد اللہ مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی صدر کے ساتھ دوبارہ خان زماں کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہاں التماس قبول کر لی۔ خواجہ جہاں میر مرتضیٰ شریفی دہو علامہ میر سید شریف جرجان کے خاندان سے تھا اور مخدوم الملک کو خان زماں کو توبہ دلانے اور معافی کی خوش خبری سننے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خان زماں نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور قسمیں کھا کر اطاعت کا عہد کیا اور اپنے عزیزوں کو کورنش بجالانے کے لیے دربار میں کہا۔ خان زماں کے قصبہ کی یکسوئی کے بعد بادشاہ نے ۱۰۳۹ء کے اواخر میں مراجعت فرمائی اور بروز جمعہ ۱۰ ماہ رمضان سن مذکور کو دار الخلافہ آگرہ میں پہنچ کر آرام کیا۔ پھر وہاں سے نئے شہر نگر چین میں جا کر چوگان بازی کتوں کی دوڑ اور جانوروں کے شکار میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر بادشاہ نے ایک آتش گولہ بجا دیا جسے اندھیری رات میں چھوڑا جاتا تھا۔ انہی دنوں

محمد یوسف خاں ولد آنکھ خاں کثرت شراب نوشی سے فوت ہو گیا۔

اسی سال بادشاہ نے آصف خاں کی سرکوبی کے لیے مہدی قاسم خاں اس کے داماد حسین خاں اور خالدی خاں کو چند اور امرار کے ساتھ تین چار ہزار کی جمعیت دے کر کہہ کٹنگہ کی طرف روانہ کیا۔ آصف خاں نے جو راگڑھ کے قلعہ کو خالی کر دیا اور دربار میں معافی کے لیے عریضہ روانہ کیا۔ لیکن اس کی درخواست قبول نہ کی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے خان زماں کو ایک خط لکھا اور خود بھی اپنے بھائی وزیر خاں کو لے کر جو پور میں خان زماں کے پاس آ گیا۔ لیکن خان زماں نے پہلی ملاقات ہی میں اس سے ایسی لاپرواہی برتی کہ وہ یہاں آنے پر سخت پشیمان ہو گیا۔ اس کی مثال ایسی ہو گئی۔

آہ از چاہ بروں آمد و در دام افتاد

اس عرصہ میں مہدی قاسم خاں نے کڑھ کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر جاگیر داروں میں تقسیم کر دیا اور آصف خاں کے تعاقب کو چھوڑ کر ہنڈیہ کے راستہ سے مکہ معظمہ کے ارادہ سے چلا گیا۔ حسین خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کو چھوڑنے کے لیے دکن کے قریب قلعہ ستواس تک گیا تھا۔

اسی زمانہ میں اچانک سلطان محمد مرزا کے بیٹوں ابراہیم حسین مرزا، شاہ مرزا اور محمد حسین مرزا نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ سلطان محمد مرزا کا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے تو امیر تیمور صاحبقران اور ماں کی جانب سے

## مرزاؤں کی بغاوت

سلطان حسین مرزا سے ملتا ہے اور اب وہ کافی بوڑھا اور معمر ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے اعظم پور کا پرگنہ اس کو جاگیر میں دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے سنبل کے علاقہ میں سرکشی اختیار کی۔ اس وقت بادشاہ خان زماں کے قصہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد حکیم مرزا کی شورش کو دفع کرنے کے لیے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ منعم خاں نے ان بھائیوں کی مدافعت کی۔ وہ منعم خاں کے مقابلہ سے بھاگ کر دو آبہ میں چلے گئے۔ اور دہلی سے گزر کر مالوہ جا پہنچے۔ وہاں سے دو بھائی شاہ میرزا اور محمد حسین مرزا تو ہنڈیہ چلے گئے اور ابراہیم حسین میرزا نے ستواس کا رخ کیا۔ جو دس دو گوس کے فاصلہ پر تھا۔ حسین خاں دکن کے ایک امیر مقرب خاں کی مدد سے قلعہ ستواس میں قلعہ بند ہو گیا۔ قلعہ میں کافی ذخیرہ نہ تھا اس کے فکری گھوڑے اونٹ اور بیل تک کاٹ کر کھائے۔ خاقانہ اور بھوک سے ان کا بُرا حال تھا اور کسی طرف سے کوئی کمک نہیں پہنچ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے میرزا ابراہیم حسین کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور قلعہ بند فوج نے لڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا ابراہیم حسین نے ہنڈیہ میں مقرب خاں کے بھائی برق دم خاں کو قتل کر دیا تھا اور اس کے اہل و عیال کو بھی قید کر لیا تھا۔ جب مقرب خاں اور حسین خاں صلح پر راضی نہیں ہوئے۔ تو اس نے برق دم خاں کا سر نیزہ پر بلند کر کے مقرب خاں کو دکھایا اور اس کی ماں کو بھی اس کے سامنے لا کر کہا کہ ہنڈیہ فتح ہو چکا ہے۔ تمہارے عزیز و رشتہ دار اور وہاں کے سارے لوگ گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب تم کس کے بھروسہ لڑائی پر کر باندھے ہوئے ہو۔ یہ دیکھ کر اور یہ سن کر مقرب خاں کے ہوش اڑ گئے۔ اور وہ اطاعت قبول کر کے مرزاؤں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ حسین خاں کو بھی قول و قرار دے کر قلعہ سے باہر بلوایا گیا اور اسے بھی مرزاؤں نے ملازمت کی پیش کش کی۔ لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ انہوں نے اسے سلامتی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ جب شہر میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خاں دربار میں حاضر ہوا تھا۔ اس موقع پر اس کی جاگیر میں پتیالی کے ساتھ شمس آباد کا پرگنہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

حسین خاں کی مصاحبت | میں اس سے ایک سال پہلے پتیالی گیا تھا۔ وہاں حسین خاں سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے

نہایت با اخلاق منکسر مزاج درویش صفت بہادر سخی خوش اوقات پکاسنی علم پرور اور علم دوست پایا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت میں گزار دیئے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا۔ ہمارا آپس میں کچھ ایسی رنجش ہو گئی کہ ہدائی کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خٹکی کو دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی۔ یہاں تک کہ بدایوں جا کر والدہ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا۔ لیکن میرا دل ایسا پھرتا تھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا۔ اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا ہے

دل کہ رنجیدہ از کسے خورسند کردن مشکل است  
شیشہ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

**آصف خاں کا فرار** | خان نساں نے آصف خاں اور بہادر خاں کو پٹھانوں کے علاقوں پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا اور وزیر خاں کو کسی بہانے سے اپنے پاس روک کر نظر بند کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں خط و کتابت کر کے فرار ہو جانے کی ٹھانی۔ چنانچہ ایک مقررہ رات کو وزیر خاں تو خان زماں کے پاس سے بھاگ گیا اور اس کا بھائی آصف خاں بہادر خاں کے پاس سے بھاگ کر آگرہ اور مانگ پور کے راستہ پر تین کوں تک چلا گیا۔ بہادر خاں نے آصف خاں کا تعاقب کر کے راستہ روک دیا اور دونوں میں جون پور اور مانگ پور کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں آصف خاں کو شکست ہوئی۔ وہ گرفتار ہو گیا۔ بہادر خاں اسے ہاتھی پر غماری میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ اسی اثناء میں وزیر خاں جون پور سے بھائی کو پھرتانے کے لیے وہاں پہنچ گیا اس وقت بہادر خاں کی جمعیت مال غنیمت لوٹنے کے لیے منتشر ہو گئی تھی اس لیے وزیر خاں کے اچانک حملہ کی بہادر خاں مدافعت نہ کر سکا۔ اور اسی حال میں اس نے حکم دیا کہ آصف خاں کو غماری میں ہی قتل کر دیں۔ لوگوں نے آصف خاں پر حملہ کر دیا۔ تلوار کا ایک زخم اس کی ناک پر آیا اور اس کی دو تین انگلیاں بھی کٹ گئیں۔ عین اس موقع پر وزیر خاں نے تیزی سے بڑھ کر آصف خاں کو قاتلوں کے زمرہ سے چھڑا دیا اور دونوں بھائی وہاں سے بھاگ کر کمرہ کی طرف چلے گئے۔ اور بہادر خاں کو خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا۔

جس زمانہ میں کہ اکبر بادشاہ مرزا محمد حکیم کا تعاقب کرتے ہوئے لاہور کے نواح میں پہنچے تھے اور وہاں شکاریں معروف تھے۔ وزیر خاں خدمت سلطانی میں حاضر ہو گیا۔ مظفر خاں کے وسیلہ سے اسے باریابی نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے آصف خاں کے نام معافی اور مہربانی کا فرمان لکھ دیا۔

**کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ** | اسی سال مرزا محمد حکیم بھی لاہور پہنچا تھا۔ اس کے لاہور آنے کا سبب یہ تھا کہ جب تیسری مرتبہ مرزا سلیمان کابل سے واپس ہو گیا اور کابل پر مرزا حکیم کا پوری طرح قبضہ ہو گیا تو

اس نے بادشاہی امیروں کو ہندوستان واپس کر دیا اور خواجہ حسن نقشبندی کو اپنی وکالت کے عمدہ پرستقل کر دیا۔ اس کی اس کارروائی سے رنجیدہ ہو کر خان کلال کابل چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ مرزا سلیمان بچے کے لیے اس سے اچھا کیا موقع ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے میدان کو صاف دیکھ کر چوتھی بار اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کی مدد و تائید سے کابل پر چڑھائی کر دی اور قلعہ کا محاصرہ کر دیا۔ اس موقع پر مرزا حکیم نے کابل محمد معصوم کو کہہ کر حوالہ کر دیا اور خود خواجہ حسن نقشبندی کے ساتھ غور بند کی طرف چلا گیا۔ یہ محمد معصوم وہی شخص ہے جس نے بعد میں ہندوستان چھوڑ کر

بڑے فتنے اور بغاوتیں برپا کیں، ویسے یہ نہایت بہادر اور دلیر شخص تھا۔

جب مرزا سلیمان کابل پر ہندو شمشیر قبضہ نہ کر سکا تو اس نے اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کے ذریعہ مکر و فریب سے کام لینا چاہا۔ چنانچہ بیگم وہاں سے قرا باغ پہنچی جو کابل سے دس کوس پر غور بند کی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں اس نے مرزا سے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور بڑی سخت قسمیں کھائیں اور اسے صلح کی گفتگو کے لیے بلایا۔ میرزا چند آدمیوں کے ساتھ اس گفت و شنید کے لیے روانہ ہو گیا۔ خواجہ حسن بھی مصالحت پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن باقی قاتل صلح کی تجویز پر راضی نہیں ہوا تھا۔ اور اس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یہ عورت نہایت مکار اور چال باز ہے اس کے بھڑے میں نہیں آنا چاہیے۔ اس کا خیال صحیح تھا کیوں کہ ابھی مرزا محمد حکیم قرا باغ پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا سلیمان ایک بھاری جمعیت لے کر یلغار کرتا ہوا کابل سے وہاں پہنچ گیا اور گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات کہ مرزا محمد حکیم کے چند آدمیوں کی مرزا سلیمان کے لشکریوں سے ٹکبھیر ہو گئی، انہوں نے فوراً اس کی اطلاع مرزا حکیم کو پہنچادی اور وہ وہاں سے اُلٹے پاؤں غور بند بھاگ گیا۔ حملہ آوروں کے ڈر سے وہاں بھی اس کے قدم نہیں رُکے اور وہ کوہ ہندو کش کے راستہ پر چلا گیا۔ خواجہ حسن تو چاہتا تھا کہ اسے حاکم پنج پیر محمد خاں کے پاس کمک حاصل کرنے کے لیے لے جائے۔ لیکن باقی قاتل نے اس ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور مرزا کو اکبر بادشاہ کے حضور میں لے جانے کے لیے پنجر کے راستہ جلال آباد پہنچا۔ وہاں سے یہ لوگ دریائے نیلاب کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور دریائے سندھ کو عبور کر کے بارگاہ شاہی میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ تو ادھر آئے اور خواجہ حسن اپنی جمعیت کو لے کر پنج چلا گیا کچھ مدت بعد وہاں وہ ایسی پریشانیوں میں گھر کر رہ گیا کہ زندگی اس پر عذاب بن گئی۔

مرزا حکیم فراہ ہوا تو مرزا سلیمان نے کوتل کے مسجد درہ تک اس کا تعاقب اور اس کے لشکر کے عقبی حصہ کو اسیر کر لیا۔ اس کا سارا مال و اسباب لوٹ کر اسی جگہ اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

**مرزا سلیمان کی واپسی** | جب مرزا سلیمان مرزا حکیم کی فکر میں کابل سے ہٹا تو محمد معصوم کابلی نے قلعہ سے نکل کر اس کے لشکر پر حملہ کر دیا اور اس کے سردار محمد قلی شغالی کو شکست دے کر چار باغ میں محصور کر دیا۔ جب سلیمان کو یہ اطلاع ملی تو اس نے قاضی خاں بدخشی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ محمد معصوم پہلے تو صلح پر بالکل راضی نہ ہوا۔ قاضی خاں چونکہ اس کا استاد تھا اس لیے بعد میں وہ اس کا کہا ماننے پر راضی ہو گیا اور مرزا اس سے تھوڑی بہت پیش کش لے کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

**خوش خبر خاں کی فتنہ پر داری** | اب یہاں کا حال سنیے اس سے پہلے کہ مرزا محمد حکیم کا ایلچی دربار میں پہنچے اکبر نے کابل کے اس نئے ہنگامہ کا حال سن کر خوش خبر خاں سلول کے ذریعہ مرزا حکیم کے لیے مرصع زین

اور حکام والا ٹھوڑا ہندوستان کے نفیس تحائف کافی رقم اور امراء پنجاب کی امدادی فوجیں ایک فرمان کے ہمراہ روانہ کر دی تھیں۔ مرزا محمد حکیم نے فرمان شاہی کا بڑھ کر استقبال کیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا۔ اسی اشارے میں وہاں فریدیوں خاں دجو مرزا حکیم کا مومن تھا، پہنچ گیا جسے بادشاہ نے کابل کے معاملات کو سنبھالتے کے لیے نگرچین سے روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر مرزا کو الٹی پٹی پہنائی اور سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی رخ پر ڈال دیا۔ مرزا کو بہانے میں شہاب خاں کے بھائی حسن خاں کا جو اس زمانہ میں کابل ہی میں تھا اور سلطان علی نامی خبر نویس کا جو ہندوستان سے بھاگ کر ایسے ہی کسی واقعہ کا انتظار کر رہا تھا بڑا ہاتھ ہے۔ ان دونوں نے فریدیوں خاں کی ہاں میں ہاں ملا کر مرزا حکیم کو باور کرا دیا کہ لاہور پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن خوش خبر خاں کے حامیوں نے اسکی مخالفت کی۔

آخر کار سب نے خوش خبریاں کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا۔ مرزا حکیم طبعاً بڑا بامروت آدمی تھا۔ اس نے خوش خبریاں کو علیحدہ بلا کر اسے وہاں سے رخصت کر دیا۔ یہ خوش خبریاں اس زمانہ میں جب کہ بادشاہ لاہور کے نواح میں شکار میں مصروف تھے دریا کے ماویں میں ڈوب کر مر گیا۔ اس واقعہ کے متعلق ایک عربی نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

خوش خبر خاں بد خبر کہ نبود  
در جہاں بد قیافتی ہوں وی  
مرد در آب گرچہ مے گویند  
وَمِنْ الْمَاءِ كُلِّ شَيْءٍ حَيٌّ

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ | مرزا محمد حکیم نے بہر حال بغاوت پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار کرتا ہوا بہیرہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے غارتگری کرتے ہوئے لاہور کا رخ کیا اور مسلسل کوچ کر کے لاہور کے سامنے دریا

راوی کے کنارے ہمدی قاسم خاں کے باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا۔ اس کی مدافعت کے لیے میر محمد خاں اور تمام امرائے آنکھ نے پوری تیاری کر لی اور قلعہ بند ہو گئے۔ مرزا حکیم نے فحشیل پر حملہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان امیروں نے اس کو حصار کے قریب تک پھٹکنے نہ دیا۔ جب ان امیروں کے عریضے بارگاہ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے اگرہ کو خان خانان اور مظفر خاں کی حفاظت میں دے کر ۳ جلدی الاول سنہ ۱۰۹۷ھ میں خود کوچ کیا اور دہلی و سرہند کے راستہ سے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ مرزا محمد حکیم کو جیسے ہی بادشاہ کی یلغار کی اطلاع ملی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے کابل واپس چلا گیا۔

لاہور سے مرزا کے تعاقب میں قطب الدین محمد خاں اور کمال خاں کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ کچھ دور تک جا کر بہیرہ سے واپس چلے آئے۔ انہی دنوں سندھ کے حاکم محمد باقی ترخان و لد مرزا محمد عینی کا عریضہ دربار میں پہنچا جس میں اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا تھا۔ اور بھیکر کے حاکم سلطان محمود کی شکایت کی تھی کہ اس نے سندھ اور لاہور کے علاقہ میں مداخلت کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ نے اس کے حسب مدعا سلطان محمود کے نام فرمان لکھ دیا۔

لاہور میں قیام کے دوران خان خانان کا عریضہ پہنچا کہ المعز مرزا اور شاہ مرزا نے جن کو سنبل اور اعظم پور کے توابعات میں منتقل کیا جاگیر دی گئی تھی اپنے چچاؤں ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے بھکانے سے بغاوت کر دی ہے۔ خاتمہ کے بعض پرگنوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جب ان کا تعاقب کیا گیا تو یہ مالوہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

لے ہم اس سے قبل قلعہ بھکر کا حال ایک حاشیہ میں درج کر چکے ہیں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ قدیم زمانہ میں قلعہ بھکر کا نام منصورہ تھا۔ ابوالفضل کی تائید مشہور مورخ ابوالفدا بھی کرتا ہے وہ لکھتا ہے "منصورہ وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرہ کی مانند گھرا ہوا ہے۔ یہ اشارہ غالباً اسی مقام کی طرف ہے جہاں پنج ند دریا نے سندھ سے مل کر بہتی تھی۔ اس زمانہ میں ملتان سے منصورہ کا فاصلہ بارہ پڑاؤ کا سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت ملتان سے روہڑی تک ۷۰ میل کی مسافت ہے۔ اگر ایک پڑاؤ کی مسافت تقریباً ۲۰ میل سمجھی جائے تو منصورہ اور بھکر کے ایک ہی ہونے کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں شہر بھکر کو ایک مال دار عرب عروج خاص نے بسایا تھا اور خلیفہ وقت ابو جعفر منصور عباسی کے نام پر منصورہ نام رکھا تھا۔ مذکورہ قلعہ میں ایک مقام پر مقیاس المار بنا ہوا ہے۔ یہ بھی غالباً عرب تاجیکوں کا نصب کردہ ہے۔ اس سے دیکھ لیں کہ

منصورہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ واضح رہے دریا نے نیل میں بھی فراز کے وقت سے اس طرح کا "مقیاس المار" یا پیمانہ آب لگا ہوا ہے جس کا ذکر ناصر خروج تہ قس صدی ہجری، اور انہی خطوط رسالوں میں بھی لکھا ہے۔



**سیر و شکار** | انہی دنوں بادشاہ نے ہانکے کا شکار کھیلا۔ اس شکار کے لیے تقریباً چالیس کوس سے جانوروں کو ہانکا ہانکا کر گھیرے میں لایا گیا اور بتدریج اس گھیرے کو تنگ کر دیا گیا۔ اس گھیرے میں ہر قسم کے تقریباً پندرہ ہزار جانور آ گئے تھے۔ بادشاہ نے خاص و عام کو درجہ بدرجہ شکار کرنے کا حکم دیا۔ شکار سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا۔ سوائے ایک دو آدمیوں کے جن میں خوشل خیر خاں بھی تھا باقی سارے ہمراہی سلامتی کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

اسی شکار کے دنوں میں مظفر خاں وزیر خاں کو اپنے ہمراہ لایا تھا اور بادشاہ نے آصف خاں اور منجنوں خاں کے نام فرمان جاری کر دیا تھا کہ دونوں مل کر کڑھ اور مانگ پور کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

**خان زماں کی دوبارہ بغاوت** | اسی اثناء میں خبر پہنچی کہ خان زماں بہادر خاں اور سکندر خاں نے عہد شکنی کر کے بغاوت کر دی ہے۔ اور اپنے کچھ آدمی مرزا محمد حکیم کے پاس اس کو حملہ کرنے کی دعوت دینے بھیجے ہیں۔ جو پور میں میرزا حکیم کے نام کا خطبہ و سکھ بھی جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملا غزالی مشہدی نے مرزا حکیم کے متعلق یہ سچ نکالا تھا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم وارث ملک است محمد حکیم

**مہا بھارت کی یادگار** | بادشاہ کو جب اس بغاوت کی خبر ملی تو انہوں نے خان زماں کے نمائندہ میرزا مبارک رضوی کو خان باقی خاں کی حراست میں دے دیا اور پنجاب کے تمام معاملات خاں کلال اور امرائے آنکھ کے سپرد کر کے ۱۲ ماہ رمضان

۱۷۷۷ء کو آگرہ کا قصد کیا۔ راستہ میں قصبہ تھانیسیر کی سیر کی جو دور قدیم کا بہت بڑا دار الکفر تھا۔ تھانیسیر میں کرکھیت کا تالاب ہے۔ جس میں آج سے چار ہزار سال پہلے کوروں اور پانڈوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے قول کے مطابق اس لڑائی میں ستر اسی کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس جگہ ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس زیارت گاہ میں ہندو سونا چاندی جو اہرات قیمتی کپڑے اور نفیس چیزیں چڑھاتے اور خیرات کرتے ہیں۔ اور ”تگونی کن و در آب انداز“ کے مطابق پوشیدہ طور پر روپے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس تیرتھ میں سنیا سی اور جوگی کورو پانڈو کی لڑائی کی یادگار میں ایک دوسرے سے جنگ بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی جنگ کا تماشا بھی دیکھا اور بادشاہ کے اشارہ پر کچھ سپاہیوں نے اپنے بدن پر راکھ مل کر سنیا سیوں کا بھیس بنالیا۔ اور سنیا سیوں کی طرف سے لڑنے لگے۔ کیوں کہ سنیا سی بیچارے صرف تین سو تھے۔ اور ان کے مقابلے میں جوگی پانسو سے زیادہ تھے۔ لڑائی بڑی دلچسپ تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لوگ مارے گئے آخر کار سنیا سیوں کو فتح ہوئی۔

جب اکبر نے دہلی میں نزول فرمایا تو میرزا میرک رضوی خاں باقی خاں کے قید سے چھوٹ کر اپنے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔ خان باقی خاں بھی مزا کے خوف سے باغیوں سے جا کر مل گیا۔

دہلی کے قیام میں حاکم دہلی تھار خاں کی سعی سے پرگنہ بھوجپور کا جاگیردار شاہ فخر الدین مشہدی شہاب خاں ترکان گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا اور اسے اس جرم میں کہ محمد امین دیوانہ جب لاہور سے بھاگ کر اس کے پرگنہ میں گیا تھا تو اس نے پناہ دی تھی اور اسے گھوڑا اور سفر خرچ دے کر باغیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے سزا دینے کا حکم نافذ کیا۔

**باغیوں کے خلاف اکبر کی فوج کشی** | جب سواری آگرہ میں پہنچی تو خبر ملی کہ خان زماں نے شیر گردہ عرف قنوج پر حملہ کر کے یوسف خاں مشہدی کا محاصرہ کر لیا ہے۔ اکبر نے لگو کو خاں خاں لگی نگرانی میں چھوڑا اور

۴ سوال مسئلہ میں جو پور کی طرف کوچ کر دیا اس وقت اتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ ہڈیوں میں گودا تک حدت کے مارے جلا جا رہا تھا۔

جب سکتیہ کے قصبہ میں چھاؤنی قائم ہوئی تو معلوم ہوا خان زماں مانگ پور کی طرف جہاں اس کا بھائی بہادر خاں تھا بھاگ گیا ہے بادشاہ نے قصبہ بھوجپور پہنچ کر چھ ہزار تجربہ کار سواروں کی جمعیت کو محمد قلی خاں برلاس، مظفر خاں، راجہ ٹوڈر مل، شاہ بدراغ خاں اور اس کے لڑکے عبدالملک خاں اور حسین خاں کی رجواہی میں ستواس سے آیا ہوا تھا، سرداری میں اسکندر خاں پر حملہ کرنے کے لیے اودھ کی جانب متعین کر دیا۔

لشکر کے ہراول کی کمان داری پر پہلے حسین خاں کو مقرر کیا گیا تھا، لیکن وہ قلعہ بندی کی مصیبتیں اٹھا کر پریشان حال اور تلاش ہو کر آیا تھا اور اپنے لشکر کے اخراجات کی وصولی کے لیے پرگنہ شمس آباد کی طرف جو اسے ابھی ابھی جاگیر میں ملا تھا گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے واپس آکر لشکر کے ساتھ ہم رکاب ہونے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اس لیے بادشاہ نے اس کی جگہ ہراولی پر قبا خاں کو مقرر کر دیا۔ ان دنوں میں حسین خاں مذکور کے ساتھ تھا وہ میرے پٹنے سے پہلے ہی کوچ کر گیا تھا اس لیے میں اسی قصبہ میں ٹھہر گیا۔ وہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا تھا جس کی شہر کے معتبر لوگوں نے شہادت دی تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ایک دھوبی کا خور و سال بچہ گنگا کے کنارے گھاٹ پر سو گیا تھا۔ اچانک وہ دریا میں گر پڑا اور تیز و تند موجوں نے اسے وہاں سے بہا کر دس کوس کے فاصلہ پر قصبہ بھوجپور کے کنارے ڈال دیا۔ وہاں اس کے رشتہ دار دھوبیوں نے بچہ کو پہچان لیا اور صبح ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

**باغیوں پر اکبر کا حملہ** جب رائے ٹریلی میں شاہی کیمپ لگا تو خبر آئی کہ خان زماں اور بہادر خاں گنگا عبور کر کے کالپی کی طرف جا رہے ہیں اس لیے بادشاہ نے لشکر کو خان جہاں کی سرکردگی میں گڑھ کی طرف روانہ کر دیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ مانگ پور پہنچ کر ہاتھی پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ پندرہ سو لکھ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے۔ مجنوں خاں اور آصف خاں جو ہراول پر متعین تھے ہر ساعت باغیوں کی خبریں پہنچا رہے تھے، انہوں نے خبر دی کہ خان زماں اور بہادر خاں جن کے سروں پر قضا منڈ لا رہی تھی رات بھر شراب پیئے اور زندگیوں کا ناچ دیکھنے میں مشغول رہے ہیں اور اب ان کی سرکشی کا پیمانہ بس لبریز ہو چلا ہے۔ خان زماں وغیرہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خود ان کے سر پر آپہنچا ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ میدان جنگ کی ہر آنے والی خبر کے متعلق یہی خیال کیے ہوئے تھے کہ یہ صرف مجنوں خاں کی پیش قدمی سے متعلق ہے۔ چونکہ وہ مجنوں خاں کو گھاس کے تنکے کے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اس لیے ان کو اس کی یلغار کی کوئی پروا نہیں تھی۔

**خان زماں کی ہلاکت** بادشاہ اس دن سدرنامی ہاتھی پر سوار تھے اور اپنے ساتھ عاری میں انہوں نے مرزا کو کہ اعظم خاں کو بٹھار کھا تھا شاہی سواری تو لشکر کے قلب میں تھی۔ آصف خاں اور مہاراجے الگ مہینے پر تھے۔ مجنوں خاں کچھ اور لوگوں کے ساتھ میسرہ پر متعین تھا۔ ادھر خان زماں خاں صبح کے وقت اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے کر سو گیا تھا کہ

لے بریلی رام پور سے ۳۹ میل پر ہے پہلے چھوٹا شہر تھا مغل سلطنت کمزور ہوئی تو روسیوں نے یہاں قبضہ کر لیا۔ اٹھارویں صدی میں روہیل کھنڈ کا حاکم حافظ رحمت خاں تھا اس نے بریلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی تھی اس روایت میں رحمت خاں نے ابدالی کی مدد کی تھی ۱۱۶۴ھ میں اودھ کے نواب نے انگریزوں کے اشارہ پر حملہ کر کے اس شہر کو تباہ کر دیا تھا۔ اسی معرکہ میں رحمت کی شہادت ہوئی۔ حافظ رحمت خاں کا مقبرہ پٹنہ شاہ نیاز احمد کامنز ۱۱ قدیم یادگار ہے۔ شہر سے باہر بدھ دور کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہاں کڑی کا کام اچھا ہوتا ہے۔ سرمد بھی مشہور ہے۔

اچانک موت کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو لشکر کی سچ دھج دیکھ کر اسے یقین آگیا کہ خود شہشاہ لشکر میں موجود ہیں چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً ہی بلالیا اور صف آرائی کر لی۔ ایک بہادر جمعیت کو شاہی ہراول کے مقابلہ پر آگے بڑھا یا۔ جب یہ دستہ آگے آیا تو بابا خاں قاتل اور فوجیوں کے سردار نے اس کو تیروں کی زد پر لے لیا اور پیچھے دھکیل کر خان زماں کی لشکر گاہ تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر بھاگنے والوں میں سے کسی کا گھوڑا پوری قوت سے جا کر خان زماں کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اس صدمہ سے خان کی پگڑی اس کے سر سے اتر کر کند کی طرح اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ بہادر خاں نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بہادری کے ساتھ اس نے بابا خاں پر حملہ کر دیا اور اسے دھکیلتے ہوئے مجنوں خاں کی صفوں تک پہنچا دیا۔ اس بھگدڑ میں مجنوں خاں اور بہادر خاں ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہایت دلیری اور بہادری کے ساتھ لڑائی کی۔ عین اس وقت ایک تیر بہادر خاں کے گھوڑے کو لگا اور وہ بدک کر زمین پر گر پڑا بہادر خاں کو لوگوں نے گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اس وقت بادشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حسب الحکم کوہ پیکر ہاتھیوں کے حلقہ کو خان زماں کے لشکر پر دوڑا دیا گیا۔ ہیرا نند نامی بادشاہی ہاتھی باغیوں کے ہاتھی اور دیا سے جا کر بھڑ گیا اور اسے اس زور کی ٹکر ماری کہ وہ میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ اس ہنگامہ میں ایک تیر خان زماں کے گھوڑے کو بھی لگا وہ اسے نکلنے لگا تھا کہ گھوڑے کو ایک اوتیر آ کر لگا اور گھوڑے کے بھر دک جانے سے خان زماں نیچے گر پڑا۔ اسی وقت زرنگھ نامی ہاتھی کے فیل بان نے خان زماں کی طرف رخ کیا۔ خان زماں نے اس سے بہت کچھ کہا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں اگر تو زندہ بادشاہ کے پاس پکڑے جائے تو تجھے بڑا انعام ملے گا۔ لیکن اجڈ فیل بان نے مان کر نہیں دیا اور اس پر ہاتھی کو دوڑا دیا۔ خان زماں ہاتھی کے پیروں کے نیچے اس طرح پامال ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔

**بہادر خاں کا قتل** جب میدان جنگ ٹھنڈا پڑا تو نظر بہادر بہادر خاں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے پوچھا کہ ”بہادر“ کہو کیا حال ہے؟ اس نے جواب

میں کہا ”الحمد للہ علی کل حال“ جب اس نے پانی مانگا تو بادشاہ نے اپنے خاصہ میں سے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ امر اس کے زندہ رہنے کو خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اصرار کر کے اس کو قتل کر دیا۔ کچھ دیر بعد خان زماں کا سر بھی ملاحظہ میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ کو ترود تھا کہ یہ خان زماں کا سر ہے یا نہیں؟ اسی وقت خان زماں کا وکیل رائے ارزانی جو اسیروں کی صف میں کھڑا تھا آگے آیا اور مقتول کے سر کو اٹھا کر اپنے سر سے لگایا اور دھڑائی مار مار کر رونے لگا۔ اس کے علاوہ خواجہ دولت خواجہ سرانے جو خان زماں کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت میں آگیا تھا اور اسے دولت خاں کا خطاب ملا تھا کہا ”خان زماں کے سر کی علامت میں بتاتا ہوں۔ وہ چونکہ ہمیشہ پان سیدھے گلے میں لٹکا کرتا تھا اس لیے اس کی سیدھی جانب کے دانت سیاہ ہو گئے تھے۔“ دیکھا گیا تو ایسا ہی تھا۔ یہ لڑائی بروز پیر یکم ذی الحجہ ۱۰۰۰ھ کو پیراک عرف الہا باس کے مضافات میں منکر وال کے قصبہ میں جلوس کے بارھویں سال ہوئی تھی۔ اس واقعہ کی تاریخ نکالی گئی ہے۔

چوں خان زماں انہیں جہاں رفت بباد  
بنیادِ فلک سر امر از پائے افتاد  
تاریخ و فاقش ز خرد جستم گفت  
فریاد ز دست فلک بے بنیاد

اس تاریخ میں خان زماں کی سابقہ خدمات کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایک اور تاریخ اس کی بغاوت کے پیش نظر نکالی گئی:

”قتل دو نمک حرام بے دین“

یہ قاسم ارسلان کی کہی ہوئی تاریخ ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

ایک اور تاریخ ہے۔

قتل علی قلی و بہادر زردور چرخ

جانا پیرس از من بیدل کہ چوں شدہ

جسم زیر عقل چو سال وفات شان

آہ ز دل کشیدہ و گفادہ و خوں شدہ

اس معرکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان میں ایک مرزا خوش حال بیگ بھی ہے۔ میں نے مرزا کو مالوہ کے لشکر میں ادھم خاں اور پیر محمد خاں کے ساتھ ایک محفل میں دیکھا تھا۔ بلاشبہ وہ حسن صورت و حسن سیرت کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت دل سے بھلائی نہیں جاسکتی تھی۔ اس کی یہ تاریخ نکالی گئی ہے

خوش حال کہ بود دیدہ اہل خسرو

برگشت ز پادشاہ از طالع بد

مقتول چو شد بہ صحبت خان زماں

تاریخ آمد کہ گل رخ زیبا قد

اسی سال علامہ عصر میر تقی شریف شیرازی اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو سدا جا گئے۔ ان کو پہلے دہلی میں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا تھا، بعد میں جب صدر الصدور قاضی اور شیخ الاسلام نے عرض کیا کہ میر خسرو ہندوستانی اور سنی تھے اور میر تقی عراقی اور رافضی ہے۔ اس لیے امیر خسرو کو اس کی قربت سے اذیت ہوئی بے شک ہے

روح را صحبت نا جنس غذابی است الیم

اس غرضداشت پر بادشاہ نے دوسری جگہ دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ بات دونوں مرحومین کے بارے میں بہر حال افسوسناک تھی۔ ایک شخص نے مرزا کی تاریخ وفات نکالی ہے: ”علم از علما رفتہ“

دوسرے نے اسی مادہ تاریخ کو اس طرح بدلی کر کہا

”علامہ ز عالم رفتہ“

اسی سال میرے ایک شناسا شیخ ابوالفتح جو شیخ سعد اللہ ولد شیخ بدر کے بھائی ہوئے تھے اور بیانہ کے معزین میں سے تھے انتقال کر گئے ان کی تاریخ وفات ہے

ابوالفتح آن دیدہ اہل بنیش

کہ درد و گرد و نظیرش نیابی

چو رفت از جہاں سال تاریخ قوتش

طلب از حروف فضائل نیابی

**آگرہ میں افواہیں** | میرزا نظام الدین سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انہوں نے خود مجھ سے بالمشافہ یہ بیان کیا اور اس واقعہ کو اپنی تصنیف تاریخ نظامی میں بھی درج کیا ہے کہ خان زماں کی جنگ کے موقع پر افواہ باز خاص طور سے پوستی افونی طرح طرح کی وحشت ناک خبریں پھیلاتے رہتے تھے۔ ایک دن دو چار احباب بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ ناگہان ہم نے بھی سوچا کہ بڑا مزہ آئے گا اگر ہم یہ افواہ پھیلا دیں کہ بادشاہی فوج خان زماں اور بہادر خاں کا سر لے کر آ رہی ہے چنانچہ یہ خبر ہم نے چند لوگوں کو سنائی اور یہ سارے شہر میں پھیل گئی۔ اتفاق دیکھو کہ جس دن آگرہ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی اسی دن خان زماں اور بہادر خاں قتل کیے گئے تھے اور تیسرے دن مراد بیگ کا باپ عبداللہ ان دونوں کے سر لے کر آگرہ میں آیا۔ اور وہاں سے پہلی لاہور اور کابل لے کر گیا۔

اس فتح کے بعد جس کا باغیوں کو شان گمان بھی نہیں تھا اکبر الہ آباد گیا اور ان لوگوں کو جو بارگاہ سے بھاگ گئے تھے یا باغیوں ساتھ دے رہے تھے گرفتار کر کے سرکاری افسروں کے سپرد کر دیا۔ میرزا میرک رضوی کو جو دہلی سے فرار ہو گیا تھا ہاتھی کے نیچے سے دیا گیا۔ مگر ابھی ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ سے رگیدنا شروع ہی کیا تھا کہ بادشاہ نے اس کے سید ہونے کا خیال کر کے معافی عطا کر دی۔ دوسرے باغی بھی اپنی سزا کو پہنچے۔ اس واقعہ کی تاریخ ہوئی — ”چہ خونہ شد“ — خان زماں کے کچھ آدمیوں کی جنہوں نے طاعت اختیار کر لی تھی جان بخشی کر دی گئی۔

دو دن بعد بادشاہ وہاں سے بنارس اور وہاں سے جو پور پہنچے اور اس شہر میں تین دن تک قیام کیا اس کے بعد تین چار دن میں یلغار کرتے ہوئے چار پانچ اشخاص کے ہمراہ کٹروہ اور مانک پور کی سڑک پر گنگا کے کنارے پہنچے۔ شاہی لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کٹروہ کے قلعہ میں سواری پہنچی۔

**قاضی طوائسی کی حق گوئی** | جس وقت خان زماں کے آدمیوں کو قتل کیا جا رہا تھا قاضی طوائسی لشکر کے قاضی نے ہونہایت دیانت دار حق گو آدمی تھا عرض کیا کہ ان لوگوں کو شکست دینے اور ان کے حوالے پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ بادشاہ کو اسکی یہ بات بری لگی اس لیے اس کو قضاوت سے معزول کر کے کٹروہ کے قاضی یعقوب کو جو علم فقہ میں بڑی شہرت رکھتا تھا اور شیر شاہ کے قاضی فہرست کا جسے لوگ قاضی فضیلت کہا کرتے تھے راہ دیا تھا منتخب کر کے طوائسی کی جگہ قاضی بنا دیا۔ یہ شخص علم و فضیلت کے باوجود مسخرہ پن اور ہزل گوئی کا عادی تھا۔ دس سال بعد اسے بھی معزول کر دیا گیا اور اس عہدہ پر قاضی جلال الدین ملتانی کا تقرر ہوا جس کا ذکر آگے تفصیل سے کیا جائے گا۔

اکبر نے خانخاناں کی طلبی کے لیے فرمان روانہ کر دیا تھا۔ چنانچہ خانخاناں اسی منزل میں آگرہ سے آکر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے بہادر خاں اور خان زماں کی ساری جاگیر جو پور اور بنارس سے غازی پور اور قلعہ چنار تک اور ادھر نہ مانہ سے لے کر جوہندی کی گزرگاہ تک اس کو عطا کر دی اور گھوڑا و خلعت مرحمت فرمایا اور اس عملداری پر رخصت کر دیا۔ اس انتظام کے بعد اکبر نے ماہ ذی الحجہ ۹۷۵ھ میں مین بادش کے موسم میں کوچ کیا اور محرم ۹۷۶ھ میں پائے تخت پہنچ گیا۔

**سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی** | محمد قلی خان برلاس اور مظفر خاں کی جمعیت کو اودھ میں سکندر اوزبک کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان لوگوں نے سکندر کو اودھ کے قلعہ میں محصور کر دیا جب اس کو خان زماں



اور بہادر خاں کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بھی بدحواس ہو گیا اور امیروں سے صلح کے مذاکرات کرتا رہا۔ مصالحت کا تو بہانہ تھا امرا شاہی کو ہائی دھوکہ میں رکھ کر وہ کشتی میں سوار ہو گیا اور سر وندی کے دوسرے کنارے جا پہنچا۔ پھر وہاں سے اس نے مصالحت کی دوبارہ بات چیر کر چنانچہ شاہی لشکر کے چند امیر اس سے گفتگو کے لیے گئے۔ وہ بھی اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر آیا اور دونوں فریقوں نے صلح کا عہد و پیمان کر لیا۔ طے یہ پایا تھا کہ امرا نے مذکورہ سے بارگاہ شاہی میں بے جا نہیں گئے اور سفارش کریں گے، مگر اسے کچھ ایسا ہول تھا کہ اس عہد پر قائم نہیں رہ سکا۔ اور پٹھانوں کے علاقہ میں چلا گیا۔ امیروں نے گورکھ پور تک اس کا تعاقب کیا اور سارا ماجرا دربار میں لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے بذریعہ فرمان امرا کو طلب کر لیا تھا اس لیے اودھ میں محمد قلی خاں برلاس کو متعین کر کے یہ لشکر دار الحکومت کو چلا گیا۔

**چتوڑ کے قلعہ پر حملہ** | شہنشاہ میں قلعہ چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا اور بادشاہ نے بیانہ کو حاجی محمد خاں سیستانی سے کر آصف خاں کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کے علاوہ اسے یساور وزیر پور اور راندل گردھ کی جاگیریں بھی عطا کی گئیں تاکہ وہ پہلے جا کر لشکر کا ساز و سامان تیار کرے۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے کوچ کیا اور باری کے راستہ سے شکار کھیلتے ہوئے میو میدا نہ اور پھر وہاں سے سوپس کی طرف گیا۔ لشکر شاہی کی آمد پر رائے سرحن کے آدمیوں نے سوپس کے قلعہ کو خالی کر دیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ پر نظر ہادر کو اور کوتہ ہلایہ کے قلعہ پر شاہ محمد خاں قندھاری کو متعین فرمایا۔ یہاں سے لشکر قلعہ کا کروں پہنچا۔ اور شہاب الدین احمد خاں اور شاہ بدراغ خاں کو مالوہ کا علاقہ جاگیر میں دے کر ان کو بادشاہ نے محمد سلطان کے بیٹوں میرزا انخ اور شاہ میرزا کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا یہ دونوں باغی ہو کر سنبل سے بھاگ گئے تھے۔ جب سواری اجین پہنچی تو مذکورہ دونوں بھائی فوج کشی کی اطلاع پانے ہی اس علاقہ کو چھوڑ کر گجرات میں سلطان محمود کے غلام چنگیز خاں حاکم گجرات کے پاس چلے گئے اور مالوہ کا سارا علاقہ بلا کسی جنگ کے مالک محروسہ میں شامل ہو گیا۔

اکبر کی فوج کشی پر رانا اودے سنگھ نے چتوڑ کے قلعہ پر اپنے ایک بہادر اور دلیر سردار رائے جیل کو جو قلعہ مرٹھ میں میرزا شرف الدین حسین سے جنگ کر کے بھاگ نکلا تھا مقرر کر دیا اور خود اودی پور کی طرف کوہنلیز کے گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں لے کر رانا اودے سنگھ کا تعلق راجگان میواڑ سے ہے۔ یہ راجہ اپنا سلسلہ نو شیرواں سے ملاتے ہیں۔ میواڑ کے راجاؤں کا ہندو عمان میں بڑا بھرم تھا۔ جاگیر نے توڑ کی مشہور جلوس کے حالات میں رانا امر سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ رانا ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے۔ اس ملک کے تمام رائے راجاؤں کے آباؤ اجداد کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔ مدت دراز سے سلطنت اس خاندان میں چلی آ رہی ہے۔ پہلے یہ مرستنگ مشرقی علاقہ کے حکمران رہے پھر دکن کی طرف رخ کیا اور وہاں کی اکثر ریاستیں فتح کیں اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کیا، پھر کوہستان میوات میں آئے اور چتوڑ کے قلعہ کو فتح کیا۔ اس وقت سے آج تک کے میرے جلوس کا آٹھواں برس ہے ۱۶۷۱ برس ہوتے ہیں۔ ۱۰۱۰ برس کے عرصہ میں اس خاندان کے ۲۶ فرماں روا راول کے لقب سے مشہور ہوئے اور راول سے رانا امر سنگھ تک کا یہ سلسلہ ہے۔ ۲۰ برس میں ۱۰۱۰ رانا فرماں روا ہوئے۔ اس خاندان کا مشہور راجہ سنگھ رام رانا سانگا تھا۔ مارواڑ جو وہ پورہ امیر سے لے کر رام پورہ اور تنگ کے راجہ ایکے ہاچ گزرتے تھے۔ اس کا راجہ بیانہ سے دیراس کے سندھ مالوہ سے میواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر بارہ ہندوستان پر حملہ کر کے سیکری کے قریب اس کو شکست دے دی ہوتی تو بلاشبہ وہ پورے ہندوستان کا چکر اتر راجاؤں چاتا اور دوسرا وکرا جیت کلاتا۔ بارہ نے توڑک میں کھلے جب میں کابن میں تھا تو رانے دوستی کے خطوط لکھے اور یہ کہوایا کہ آپ دلی پر حملہ کریں میں آگہ پر حملہ کروں گا۔ لیکن جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور آگرہ بھی فتح کر لیا تو اس نے میری بات تک نہ پوچھی بلکہ کچھ ہی دن بعد کند بار کا محاصرہ کر لیا۔ رانا سانگا کے بعد اس کے جانشین کوہنلیز کے چنگیز خاں نے اکبر نے اودے سنگھ کو شکست دے کر بھاگ دیا۔ اودے سنگھ نے جیل قیل میں پناہ لی اور دشوار گھاٹیوں میں ایک شہر اودے سے پور آباد کیا وہاں گھلٹھوں میں بند رہا۔ چاندھ کر ایک جمیل بی بی جو اب بھی اودے ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۶۷۰ برس کے بعد جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پر تاپ جانشین ہوا۔ یہ نسبتاً آپ کے زیادہ بڑی اور ختم راجہ تھا۔

جا کر چھپ گیا۔

آصف خاں نے بہرام پور پر جو اس علاقہ کا آباد و بارونق شہر ہے حملہ کیا اور بڑو شمشیر قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ راجہ کا سارا علاقہ پامال ہو گیا۔ حسین قلی خاں نے اوڑے پور کو غلیز پر فوج کشی کی اور بڑی تباہی مچائی۔ رانا مجبور ہو کر وہاں سے دوسرے محفوظ مقام پر منتقل ہو گیا۔

**قیامت خیز محاصرہ** | بادشاہ قلعہ چتوڑ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے حکم شاہی کے بموجب قلعہ پر چڑھائی کے لیے سرنگیں کھدوائی گئیں۔ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ دس سوار اس میں اچھی طرح سے آ جا سکتے تھے اور بلند اتنی تھی کہ باقی سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے باسانی گزر سکتا تھا۔ قلعہ والوں کی آتش باری اور سنگ اندازی سے لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہو رہے تھے۔ ان کی لاشیں سرنگ میں پتھر اور اینٹ کی جگہ لگادی جاتی تھیں کافی عرصہ میں جا کر سرنگ اور نقب قلعہ کی بنیادوں تک پہنچی۔ قلعہ کے دو متصل برجوں کو نیچے سے کھوکھلا کر کے بارود سے بھر دیا گیا اور بہادر مسلح سواروں کی ایک جمعیت ان برجوں کے قریب پہنچ کر سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی یہ بم بج گریں وہ اس راستہ سے قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں نقبوں میں جب آگ لگائی گئی تو ایک نقب جس کا فیلہ نسبتاً چھوٹا تھا جلد پھٹ گئی دوسری نقب کا فیلہ کچھ لانا تھا اس لیے اس کے پھٹنے میں دیر لگی۔ پہلی نقب کے پھٹنے ہی ایک برج بنیاد سے اکھڑ کر فضا میں کبھر گیا اور حصار میں ایک بہت بڑا اشکاف پیدا ہو گیا۔ منتظر سواروں نے جن کو دوسرے فیلہ کا خیال نہیں رہا تھا بے محابا حملہ کر دیا اور قریب پہنچ کر اندر جانے کا راستہ کھوجنے لگے۔ عین اسی وقت دوسرا فیلہ سلگ اٹھا اور دوسرے برج کو بھی جہاں غیر بھی تھے اور اپنے بھی تھے ہوا میں اڑا دیا۔ چنانچہ لشکر کے اکثر غازی سوسو دو دوسو من وزنی پتھروں کے نیچے دب کر رہ گئے اور سنگ دل کافروں کا بھی یہی کچھ حشر ہوا۔ اس آگ کے سیلاب میں لوگ پر دانوں کی طرح جل کر راکھ ہو گئے۔ حصار کے پتھر تین تین چار چار کوس تک جا کر گرے اور مسلمان کیا کافر کیا ہر طرف ایک ہنگامہ مچا ہو گیا۔

ایں بہ جنت داد آب و آن بد و نرغ بردجوں

گرچہ خون گبر و مومن ہر دو یک جا سے دوید

انسانی لاشوں پر کوسے اور گدھ دنوں تک جشن مناتے رہے۔ ایسے پانچ سو سپاہی جن میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اس حادثہ کی تندر ہو گئے۔ ہندوؤں کے مقتولین تو شمار سے باہر تھے۔ محصورین نے راتوں رات زور لگا کر ان برجوں کی درمیانی دیوار کو دوبارہ تعمیر کر لیا اور محاصروں کی کم و بیش تقریباً چھ مہینے لگ گئے۔

لے لکھے ہیں ساتویں صدی مسیوی میں چترانگ نامی ایک راجہ نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر چترانگ کوٹ کہلایا آخر بڑا کر چتوڑ ہو گیا۔ راجپوتوں کی مشہور ریاست اوڑے پور کا یہ سولہویں صدی مسیوی تک پایہ تخت رہا۔ اس کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے بڑی بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ لڑی تھیں۔ سلاطین اسلام میں سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے ۱۲۹۹ء میں اس کو فتح کیا علاؤ الدین کے دوسرے حملہ کی سرگزشت بہت دردناک ہے۔ جب راجا شاہی محاصرہ سے جاں بلب ہو گیا تو اس کی رانی پدمنی دوسری رانیوں کے ساتھ چٹامی جل کر مر گئی۔ خلجی کے بعد سلطان محمد تغلق نے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ والی گجرات نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔ آخر میں اکبر نے اس پر قبضہ کر کے راجپوتوں کی کڑوئی۔ قلعہ کی عمارت ایک پاڑی پر ہے جو سطح زمیں سے پانصوٹ بلند ہے۔ طول سو اتین میل عرض نصف میل قلعہ میں جانے کے لیے چکر اسڑک بنی ہوئی ہے۔ ایک مستحکم خیل ہے جس میں سات دروازے ہیں۔ قلعہ میں کئی ایک چشے اور باؤیاں ہیں۔ جس وقت اکبر نے حملہ کیا تھا قلعہ میں آٹھ ہزار فوج اور چالیس ہزار باشندے تھے۔ مائٹلا مراد میں لکھا ہے اس پاڑ کا دور چھ کوس ہے۔ قلعہ کی فصیل زمیں سے تین کوس بلند ہے۔ تالابوں اور سنگین حوضوں کے علاوہ قدرتی چشمہ بھی جاری ہے۔ قلعہ میں بہت سے محل اور مندر تھے جن کے کھنڈ موجود ہیں۔ ایک شاہی محل اچھی حالت میں ہے۔ یہاں ایک مینار ہے۔ قلعہ میں شاہان مالوہ کو اور ۱۵۵۳ء میں گجرات والوہ کی متحدہ فوجوں کو شکست دینے کی یادگاریں بنوایا تھا۔ یہ ۱۶۰۲ء میں اکبر کے حملہ کے وقت رانا اوڑے سنگھ حکمران تھا۔

**قلعہ چتوڑ کی فتح** | ۲۵ ماہ شعبان ۱۰۷۵ء منگل کی رات کو شاہی لشکر نے ہر طرف سے حملہ کر کے قلعہ کی دیوار میں شکاف ڈال دیئے اس موقع پر مسلمان حملہ آوروں کی توپوں اور بندوقوں کے شراروں سے جو روشنی پھیلی تو جیل کی شکل اس روشنی میں دکھائی دی اور ایک بندوچی نے تاک کراسی پیشانی کو نشانہ بنایا اور وہ اسی جگہ سرد ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی یہ عالم تھا جیسے چڑیوں کی ٹکڑی میں پتھر آن گرا ہو۔ قلعہ بند فوج اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئی اور لوگ اپنے اہل و عیال سمیت آگ میں کود گئے۔ اس طرح آگ میں جل مرنے کو ہندوستان میں جو بڑا کہا جاتا ہے۔ جو پنج لگے وہ اکبری تلوار کی نذر ہوئے۔ اور چتوڑی سی تعداد اسیر کر لی گئی۔ اس ہوناک رات میں ساری رات جنگجوؤں کی تلوار نیام سے باہر ہی رہی۔ دوسرے دن قیلوہ کے وقت تک مقتول راجپوتوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس خونی واقعہ کی تاریخ ہے ۷۔

دل گفت کہ بکشاد بزدلی چیتور

دوپہر کے بعد قتال و جدال کا یہ سلسلہ بند ہوا اور سپاہی اپنے ٹھکانے پر لوٹ کر آئے۔ بادشاہ تین دن تک چتوڑ میں ٹھہرے رہے اور ہر طرف فتح تارے روانہ کیے اور آصف خاں کو دہلی کی حکومت سپرد کر کے بروز منگل ۲۵ ماہ شعبان کو سواری شاہانہ نے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

**اجمیر کا پیدل سفر** | جیسا کہ بادشاہ نے منت مانی تھی۔ اجمیر کو پیدل جانے کا ارادہ کیا اور بروز اتوار، ۷ ماہ رمضان کو اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کی اور وہاں صدقہ خیرات اور نذر گزار کر دس دن بعد واپسی کے لیے سوار ہوئے۔ اس سفر کی تاریخ میر علاؤ الدولہ قزوینی مصنف تذکرہ شعرا نے لکھی ہے۔

شاہ دیں پرورد و جمشید برید  
خسرو محمد اکبر  
ساخت بے شبہ پے فتح چیتور  
دیگ روئیں تن اوردیکر

بہر تاریخ ولی از عالم غیب

دیگ چیتور کا شادیک سر

اجمیر سے بادشاہ نے اوسکارخ کیا اور وہاں شیر کا شکار کیا۔ اس شکار میں شاہ محمد خاں قندھاری کے لڑکے عادل محمد خاں نے جو

لے جیل اور خانہ چوتوں میں مشہور بہادر سردار گز رہے ہیں۔ انہوں نے ایک کو بچانے کے لیے جو گارناے دکھائے ان کے گیت اور بکت لوگوں کی زبان پر عرصہ تک رہے۔ مشہور ہے کہ قلعہ آگرہ کے ہتھیاروں و دروازے پر جو دو ہاتھی ترشوا کر کے لگے تھے ان پر انہی دونوں کی موتیں تھیں۔ یہ دونوں ہاتھی سوئٹا کرکھڑے ہیں لوگ بچے سے آتے جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ جیل خود اکبر کی گولی سے مارا گیا تھا۔ ایک دن اکبر دھرم پر کھڑا ہندو قتلہ ہاتھ اس وقت اس کے ہاتھ میں سنگرام نامی ہندو تھی۔ ایک شخص سر چلتے پتے قلعہ کے برج پر نظر آیا۔ نشانوں سے وہ سردار معلوم ہوتا تھا۔ اکبر نے نشانہ لے کر بندوق چھوڑی۔ دور سے معلوم ہوا کہ راجہ بھگوان داس مان سنگھ کا باپ پاس کھڑا تھا اکبر نے اس سے کہا جب گولی نشانہ پر لگتی ہے تو ہاتھ کو ایک طرح سے پک دیتی اور دل کو سرد رہتا ہے اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا ضرور اس چلتے پتے کو گولی لگی ہے کچھ دیر بعد ہی جبریل کہ مذکورہ برج خالی پڑا ہے اور قلعہ کے محلات سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں راجہ بھگوان داس نے مرض کی فتح مبارک وہ شخص خود جیل سنگھ تھا۔ لے میر علاؤ الدولہ قزوینی میر عبد اللطیف قزوینی کا پھوٹا بھائی تھا۔ میر عبد اللطیف کا حال ہم اس سے پہلے ایک حاشیہ میں لکھ آئے ہیں۔ میر علاؤ الدولہ اپنے تذکرہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ تذکرہ شعرا کی مشاعروں کے حالات کا ایک اچھا مجموعہ اور ماخذ ہے۔

تے شیر کا شکار۔ عام طریقہ تو یہ تھا کہ لوہے کے بڑے خبرسوس میں کا دروانہ لٹکے سے لگاتا تھا جنگل میں لکھ دیتے تھے۔ اور اس کے ایک ٹھونڈا حصہ میں بکری کو باندھ دیتے تھے۔ شیر بکری کے لیے اندر داخل ہوتا اور پھنس جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ درخت کی شاخ سے ایک کان میں زہر آلود تیر جوڑ کر لٹکادیتے تھے رہائی والے منظر پر،

ہمدردی میں ایک دوسرا شیر تھا شیر سے تنہا مقابلہ کیا۔ نتیجہ میں دونوں شیر مارے گئے۔  
بادشاہ یہاں پر لشکر سے علیحدہ ہو گئے اور نارنول پہنچے۔ نارنول میں شیخ نظام نارنول بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ اکبر نے ان کی  
زیادت کی اور اپنے لیے ان سے دعا کرائی پھر مسلسل کوچ کرتے ہوئے دارالخلافہ لوٹ آیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی اور ”لاخذۃ خیلک من الاولیٰ“ کا ثبوت مل گیا۔ اس نکاح کی تاریخ ملتی ہے۔

چوں مرا از عنایت ازلی

اتصالے بہ ماہ چہرے شد

عقل تاریخ کدخدائی را

گفت ماہی قرین مہری شد

اسی سال برگذیدہ اویار و مشائخ شیخ عبدالعزیز دہلوی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کی تاریخ وفات ہے۔

عزیز جہاں شیخ عبدالعزیز

کہ عالم ہمہ قطب و ہلیش خواند

سوئے عرصہ آخرت یافت رخ

وزیں تنگنا سپہمت جہاند

طلب کردم از دل چو تاریخ او

بلغنا کہ قطب طریقت نہاند

چونکہ شیخ ہمیشہ اپنے دستخط کے ساتھ لکھا کرتے تھے ”ذریۃ ناچیز عبدالعزیز“ اس لیے ایک اہل علم نے ان کی تاریخ اسی  
”ذریۃ ناچیز“ سے نکالی ہے۔

لے پورا نام عبدالعزیز ابن حسین طاہر جو نپوری مشہور چشتی بزرگ تھے۔ ان کا ایک مشہور رسالہ ”غیرہ“ کے جواب  
میں لکھا تھا۔ یہ رسالہ فلسفہ و حدیث الوجود پر بڑی مدلل چیز ہے۔ طاہر ایونی نے ان بزرگ سے تصوف اور دوسری کتابیں پڑھی تھیں۔ پیدائش جون پور میں مشہور ہیں  
ہوئی۔ ڈیڑھ سال کی عمر ہی کو والد دہلی لے کر آئے تھے۔ وفات ہجادی ۱۰۰۸ء میں ہوئی۔

دقیقہ صفحہ گزشتہ، جیسے ہی شیر اس کے قریب سے گزرتا ذرا سی حرکت پر وہ تیرکان سے چھوٹ کر اسے گھائل کر دیتا۔ شیر کے راستے میں بکری کو ہاندھ دیتے ہیں اور اس کے  
اُھراف زمین پر کافی مقدار میں گوند بھگڑا کر پھیلا دیتے ہیں جب شیر حملہ کرتا ہے تو اس کے پیچھے گوند میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ جس قدر پیچھے جھاڑتا ہے گوند چپکنا چلا جاتا ہے۔  
اور شیر سراسیمہ ہو جاتا ہے اس وقت اسے یا تو زندہ بکڑھتے ہیں یا ہلاک کر دیتے ہیں۔ ایک خطرناک طریقہ یہ ہے کہ ماہر شکاری بھینے پر سوار کھڑا رہتا ہے اور اسے  
شیر سے لڑاتا ہے وہ سینگوں پر شاہکار شیر کو پھینک دیتا ہے جس سے وہ مر جاتا ہے۔ اکبر نے کئی ایک شیروں کو مار گرایا تھا۔ باری کے جنگل میں ناہر خاں کے ہاتھ پر  
بادشاہ سوار تھے۔ شیر نے ہاتھ پر حملہ کر دیا۔ ہاتھ کا سر زمین تک جھک گیا۔ بادشاہ نے اس موقع پر ایک ہی وار میں شیر کا خاتمہ کر دیا۔ ٹوڈہ کی شکار گاہ میں ایک شخص کو  
شیر نے دبوچ لیا۔ اکبر نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ شیر گر پڑا اور اس غریب کی جان بچ گئی۔ قمر شاہ میں ایک بڑا شیر بادشاہ کے سامنے آگیا۔ اکبر نے اس کی پیشانی پر تیر  
چلا یا کہ وہ گر پڑا۔ ایک بار ایک پایہ کو شیر نے بکڑ دیا تھا۔ اکبر نے بدوق سے اس پر ناز کیا اور شیر ختم ہو گیا پایہ کی جان بچ گئی۔ متھرا کے جنگل میں اکبر اور شجاعت خاں کے  
سامنے شیر لگی تھا، شجاعت خاں تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن اکبر اسی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا اور نہایت غضب سے شیر کو گھورنے لگا۔ شیر ٹھٹھک کر لوٹ گیا اور تھوڑی دیر  
بعد ہی وہ بادشاہ کے تیر سے زمین پر تر پتا ہوا نظر آیا۔

۱۷۹۷ء میں بادشاہ نے پنجاب سے تمام امراء آٹک خیل اور کمال خاں کھڑکودر بار میں بلایا اور ان کی جاگیریں حسین قلی خاں اور اس کے بھائی اسماعیل قلی خاں کے سپرد کر کے انہیں اس صوبہ پر نامزد کر دیا۔ حسین قلی خاں اور اس کا بھائی ناگور سے آئے اور منتھنپور کی فتح کے بعد آگرہ سے پنجاب کی صوبہ داری کے لیے رخصت ہوئے۔ سنبل اور بریلی کی سرکار خان کلاں کو تفویض کی گئی۔

**باغی مرزاؤں کا تعاقب** | محمد سلطان مرزا کے لڑکے گجرات میں جنگیہ خاں کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ حاکم گجرات سے بھی ان کی

نہجہ نہ سکی اور وہ یہاں کی جاگیروں میں دست درازی کر کے بھاگ کر مالوہ آ گئے۔ ان کے مقابلہ میں محمد مراد خاں اور مرزا عزیز اللہ مشہدی اجین کے قلعہ میں محصور ہو گئے۔ اشرف خاں میرنشی اور صادق محمد خاں ایک بھاری لشکر کے ساتھ منتھنپور کی ہم پر بھیجے گئے ان کو جب مرزاؤں کی یلغار کی خبر ملی تو انہوں نے بادشاہ سے اجازت لے کر خلیج خاں کے ساتھ جسے ان کے بعد اس قلعہ کی تسخیر پر مقرر کیا گیا تھا مرزاؤں کی سرکوبی کے لیے اجین کا رخ کیا۔ سرونج میں شہاب الدین احمد خاں اور سازنگ پور میں شاہ بدایہ خاں بھی ان امیروں سے آکر مل گئے۔ اس طرح ایک بڑی فوج منظم ہو گئی۔ مرزاؤں کو جیسے ہی اس لشکر کشی کی اطلاع ملی وہ اجین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہی امیروں نے ان کا تعاقب کیا۔ جب مرزاؤں نے نربدان دی کو عبور کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ جھار خاں حبشی نے ترپولہ کے میدان میں جنگیہ خاں کو غافل پار قتل کر دیا ہے اور گجرات ترک تازیوں کے لیے خالی پڑا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ان لوگوں نے گجرات کا رخ کیا اور پہلے ہی حملہ میں چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ وہاں سے بڑھ کر بہروج کے قلعہ کو گھیر لیا اور کچھ عرصہ بعد محصور قلعہ دار رستم خاں رومی کو سازش اور جیل سے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور اس قلعہ پر بھی قبضہ کر لیا۔ قلیج خاں اور صادق محمد خاں دوسرے شاہی امیروں کے ساتھ نربدا کے کنارے سے لوٹ کر دربار میں آ گئے اور مندو کے جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔

**قلعہ منتھنپور کی فتح** | اسی سال ۱۷۹۷ء کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے اور چند دن پالم کے پرگنے میں بانکے کا شکار کھیلتے رہے۔ یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ منتھنپور پہنچا۔ تھوڑی سی مدت میں سرننگ قلعہ کی دیواروں تک کھود لی گئی۔ قلعہ کے مقابل رن کی نہایت دشوار گزار پہاڑی تھی۔ حکم شاہی پر سات آٹھ سو کھاروں نے مل کر پندرہ بڑی بڑی توپیں جو پانچ پانچ سات سات من کا گولہ پھینکتی تھیں اس پہاڑی پر پہنچا دیں۔ ان توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی دن قلعہ کے اندر کی عمارتیں پیوند خاک ہو گئیں۔ حاکم قلعہ رائے سرجن قلعہ چیتوڑ کی بربادی اور وہاں والوں کی تباہی و ذلت کو دیکھ چکا تھا جان کے خوف سے اس نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے لڑکوں دودا اور بھوج کو بعض زمینداروں کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور ان کی انتہائی حسین قلی خاں جہاں اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا اور وہ رائے سرجن کو دربار میں لے آیا۔ اس نے قلعہ کی کبھی سپرد کر دی۔ اس طرح بروز چار شنبہ شمال کو یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

”فتح منشی“

اس فتح کی تاریخ ہے :

اکبر نے دوسرے دن چند آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کی اور قلعہ متر خاں سلطانی کے سپرد کر دیا۔ اور لشکر کو خراجہ جہاں خواجہ امینا اور مظفر خاں کی سرکردگی میں آگرہ روانہ کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجیمیری کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجیمیر سے بادشاہ کی سواری بہت جلد ۲۴ ذی قعدہ ۱۷۹۷ء کو آگرہ واپس ہو گئی۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کے بھائی میر فارغی نے قلعہ منتھنپور کی فتح پر حسب ذیل تاریخ لکھی ہے۔



چوں گل نصرت شگفت درچمن فتح شاہ  
منہی تاریخ گفت قلعه گرفتہ زود

مولانا شیر کی کہی ہوئی تاریخ ہے ۷

قلعہ کفر چو از دولت شاہ یافت شکست  
شہ کفار شکن یافتہ شیر سانش  
اسی سال آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ بتیا پول بن کر مکمل ہو گیا اس کی تاریخ ہے ۷  
کلک شیر پئے تاریخ نوشت  
بے مثال آمدہ دروازہ فیل!

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک رد کے ہوئے تھے۔ لیکن وہ کمسنی میں ہی اس دنیا سے گزر گئے  
اس سال بادشاہ کی ایک بیوی حاملہ ہوئی۔ بادشاہ نے شیخ اسلام چشتی سیکری سے دعائے  
رانی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بھجوا دیا۔ شیخ نے اس سے پہلے ہی شاہزادہ کی ولادت کی خوش خبری دی تھی اور شاہنشاہ کو اس سے  
بسی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ بار بار شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ سے اس تعلق و ربط و ضبط کی وجہ سے بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت کا سنگ بنیاد  
لگا ایک نئی خانقاہ بنوائی اور ایک وسیع اور بلند سنگین مسجد تعمیر کرائی جو سنگینی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں ایسی مسجد  
ہی ہوگی یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی۔ اس بستی کا فتح پور نام رکھا گیا۔ اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔  
یہ حرم راجہ بھاڑاں کی بیٹی تھی جو راجہ مان سنگھ کی بیوی تھی یہی جاگیر کی ماں ہے۔

اس وقت اکبر کی عمر ۷-۸ سال کی تھی۔ شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک کے کہنے پر اکبر شیخ سلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کرائی۔  
اس عمارت کا نام رنگ محل تھا۔ اسے اکبر نے شیخ سلیم کے مکان کے متصل مستورات کی قیام گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی محل میں شاہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ بدایونی نے اس کی  
ایشی شیخ کے اصل مکان میں بتائی ہے۔ لیکن اکبر نامہ اور اشرار امراء میں وضاحت سے اس محل کا ذکر کیا گیا ہے۔  
شہر فتح پور آگرہ سے ۱۲ میل مغرب میں واقع ہے۔ اور موضع سیکری سے ۵-۶ فرلانگ پہلے سیکری کے پہاڑ کا نام کوہ اربلی ہے۔ اسی کی ایک شاخ کے دامن میں  
پورا آباد ہے۔ سیکری کی آبادی شیخ سلیم اور ان کے مریدوں کے مکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ جس غار میں ریاضت کرتے تھے وہ مسجد سنگتراش میں اب بھی موجود ہے۔  
اس کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا۔ اسی جگہ مانا سا گاؤں کا بابر نے شکست دی تھی اسی فتح کی یادگار میں یہ نام تجویز ہوا تھا۔ بعد میں یہ شہر فتح پور کے نام سے مشہور ہو گیا۔  
لیرنے توڑک میں لکھا ہے کہ شہر ۱۲-۱۵ برس کی مدت میں آباد ہو گیا لیکن وہ اس نام کی وجہ تسمیہ گجرات کی فتح لکھتا ہے۔ ابو الفضل لکھتا ہے: "جاں پناہ نے اس کا نام فتح آباد  
رکھا تھا۔ لیکن رعیت نے درخواست کی کہ ہم اپنے شہر کا نام فتح پور رکھنا چاہتے ہیں۔ بادشاہ نے درخواست منظور کر لی۔" اکبر کا قیام فتح پور میں ۱۲ برس رہا۔ آخر میں وہ اکبر آباد  
من ہو گیا تھا۔ لیکن ۱۵۷۱ء میں بھی وہاں اکبر کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ جاگیر نے آگرہ کو دار الخلافہ بنایا۔ ۱۵۷۱ء میں آگرہ میں طاعون کے پھیل جانے کی وجہ سے وہ فتح پور  
میں ہجرت کیا۔ اس جگہ ۴۰۰۰ مسلمانوں کو جاگیر نے جن نوروں میں بنایا تھا۔ شاہ جہان اور جاگیر بھی فتح پور آکر ٹھہرتے رہے۔ محمد شاہ کے عہد تک فتح پور کی رونق قائم رہی  
لی کی لوٹ مار کے زمانہ میں چوراسن اور سورج مل جاٹ نے آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ انہوں نے آگرہ اور فتح پور کے شاہی محلات کو بری طرح لوٹ لیا اور دھنیوں کے لالچ  
لڑائیوں کو ڈھانپا۔ اس کے بعد فتح پور پر نجف خان، افراسیاب خان، ہمدانی خان، اسماعیل خان، امیروں کا دور دورہ رہا۔ پھر مہاراجہ سیندھیا نے یہاں قبضہ کر لیا۔  
۱۷۷۱ء میں یہ انگریزوں کی عملداری میں آ گیا۔ اس عرصہ میں فتح پور بہت کچھ تباہ و تاراج ہو چکا تھا۔ ۱۷۷۵ء کے غدر میں تو بالکل ہی تباہ ہو گیا۔ اس وقت وہاں کی موجودہ آبادی ۸  
ہزار کے اندر اندر ہے۔ اکبری اور جاگیر عہد میں ایسی گھنی آبادی تھی کہ راستہ چلنا مشکل ہوتا تھا۔ درگاہ شریف کے علاوہ شاہی محلات امراء کے قصر میں کی یادگار ہیں۔ اور  
شہر محل عظمت کا جبروت کدہ معلوم ہوتا ہے۔

امیروں نے بھی وہاں محل باغات اور عمارتیں تیار کرائیں۔

میں نے ان عمارتوں مسجد اور خانقاہ کی تاریخ نکالی ہے۔

هَذِهِ الْمَقْعَةُ قُبَّةُ الْإِسْلَامِ  
رَافِعَ اللَّهُ قَدْرَ بَانِيهَا  
قَالَ سَوْحُ الْأَمِينِ تَارِيخُهَا  
لَا يَرَى فِي الْبِلَادِ ثَانِيَهَا

دوسری تاریخ ہے :

بیت معمور آمدہ از آسماں

اشرف خاں کی نکالی ہوئی تاریخ ہے :

ثانی المسجد الحرام آمد!

شیخ چشتی نے! پنہ گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کر دیا تھا ان کے عزیزوں اور رٹکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے تو ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کر دیا ہے۔ شیخ نے جواب دیا تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے۔ دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے دوسری بیبیاں کر لو آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

یاکن باقیل باتان دوستی

یا بنا کن خانہ درخور ذیل

ایک لگداز داستان عشق | اس سال کا دلچسپ و عجیب واقعہ سید مکرمی گرم سیری کے روکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات کے گھرانے کا فوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرہ میں ایک سار کی روکی موہنی پر عاشق ہو گیا۔ اور دونوں میں عشق و محبت کا رشتہ قائم ہو گیا جس وقت رشتہ پر لشکر کشی ہوئی تھی۔ وہ شکر کے ساتھ نہیں گیا اور قلعہ آگرہ میں جہان کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک جا پہنچا تھا چنانچہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دوبار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا۔ لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ پاہیوں نے یا ساروں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اس طرح کوئی دو سال چار مہینے بیت گئے۔ اس عرصہ میں یہ عاشق و معشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے تھے اور بس، لیکن رد و محوری آخر تک۔ ایک ات

لے شیخ سلیم چشتی بابا فرید گنج شکر کی اولاد سے ہیں والد کا نام شیخ باوا الدین تھا۔ آپ کے پردادا شیخ سلیمان پاک پٹن سے لدھیانہ آکر رہے۔ آپ کے والد لدھیانہ سے دہلی آگئے تھے۔ دہلی کے محلہ نند پیر میں سلطان جلال لودھی کے عہد میں شیخ کو تولد ہوئے۔ آپ نو سال کے تھے کہ والدین سیکری میں آکر رہنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۲ برس کی عمر میں آپ اپنے بھائی شیخ موسیٰ سے اجازت لے کر سرہند گئے اور وہاں شیخ مجدد الدین سے علم حاصل کیا۔ وہاں سے عالم اسلام کی سیاحت اور حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ تین سال تک عرب ایران اور مصر کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ اس عرصہ میں ۴۲ حج کیے۔ بصرہ میں خواجہ ابوالہیثم عرب سے غرقہ حاصل کیا۔ اور شیخ الحداد کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان آنے کے بعد سرہند کے قریب بیدالی میں ڈھائی سال ٹھہرے۔ پھر ۱۰۹۹ھ میں سیکری تشریف لائے۔ ۱۱۰۰ھ میں بھری ماسٹر سے دوسرا حج کیا۔ ۱۱۰۱ھ میں حرمین میں مقیم رہے۔ ۱۱۰۲ھ کو ہندوستان واپس آئے۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں بھی آپ کا بڑا اعزاز تھا۔ سلطنت میں آپ نے فتح پور میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہ خانقاہ شرفیچ پور کی آبادی کا باعث ہوئی۔ آپ کا انتقال شب پنجشنبہ ۱۱۰۳ھ میں ہوا۔

مومنی کے اشارہ پر وہ کندہ لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا اور وہ رات و دنوں نے ایک دوسرے کی ہم آنکوشی میں گزاری۔ لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔ اس بات کو سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے اپنی ثنوی ”ثنوی دلفریب“ میں اس طرح بیان کیا ہے :

ہر چند چھوٹے دل زدوی جوش  
سے کر دیا انداکہ خاموش  
(دل تو بہت جوش مار رہا تھا لیکن حیا برابر اس کو تھامے ہوئے تھی)  
در پیش نظر زلال حیواں  
یک دم و بحال خوردن آں  
د نظروں کے سامنے آب حیات رکھا تھا لیکن اس کو پینے کی مجال نہ تھی  
دلہ ساز کمال تشنگی گرم  
بہا شدہ مہر بستہ از شرم  
دل مارے پیاس کے بے قرار تھے لیکن لبوں پر شرم نے مہر لگا رکھی تھی  
یک خانہ خلوت و دو مشتاق  
دل ہا شدہ جفت ماندہ تن طاق  
د اکیلا گھر اور دو چاہنے والے لیکن دل ان کے تو ملے ہوئے تھے اور جسم جدا تھے  
مانند دو خستہ دل افروز  
در بازی طاق و جفت تاروز  
دوہ دونوں خستہ دل جفت و طاق کی یہ بازی صبح تک کھیلتے رہے  
این ست یہ نزد ما محبت  
کز دل برد خیال شہوت  
دہمارے نزدیک تو محبت وہی ہے جو دل سے شہوت کا خیال نکال دے  
چوں دل زہوائے نفس میرد  
کے عشق در اں قرار گیرد  
جب دل خواہشات نفسانی کے ہاتھوں مرجاتا ہے تو عشق بھلا اس میں کیسے ٹھہر سکتا  
نبود بہ جہاں بے سرو پائے  
جز در دل پاک عشق راجائے  
اس جہاں بے سرو پائیں عشق بجز پاک دل کے اور کہیں نہیں رہ سکتا  
عشق است انیس جان پا کاں  
عشق است رفیق درد نا کاں

(عشق پاک روحوں کا ساتھی اور غم زدوں کا دوست ہے)

القصد بصد لطافت و ناز

بکشادہ ہزار دفتر راز

(مختصر یہ کہ بڑی لطافت کے ساتھ وہ رات ناز و نیاز میں بسر ہوئی،

دیدند قریب چوں سحر را

کردند وداع یک دگر را

(جب سپیدہ سحر نمودار ہوا تو انہوں نے ایک دوسرے کو رخصت کیا،

رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کر کے اور ننگ و ناموس کا خیال چھوڑ کر

اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے جیسا کہ اس مثنوی کے شعر ہیں۔

کاسے عاشق صادق وفا کیش

من باتو موافقم میندیش

(اے با وفا عاشق صادق فکر نہ کر۔ میں تیرے ہمراہ ہوں،

عہدے کہ نخت باتو بستم

آن عہدیکے است تاکہ ہستم

(جو عہد میں نے تجھ سے کیا ہے جیتے جی وہ عہد قائم رہے گا،

بر خیز کہ فکر خود نسیا یم

وز بام دگر فردا یم

(اٹھ کہ ہم اپنی راہ لیں اور اب اس کوٹھے سے اتر جائیں،

تا آنکہ نگشتہ است آگاہ

وز دیدہ رویم تا سحر گاہ

(جب تک کہ کوئی آگاہ ہو ہم صبح ہونے سے پہلے چھپ کر دور نکل جائیں،

غرض وہ دونوں اس محلہ سے نکل کر بھاگ بھاگ موہنی کے ایک دوست کے گھر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔

موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کر کے ایک فتنہ مچا دیا۔ سید موسیٰ کے بھائی سید شاہی نے جس نے مذکورہ بالا مثنوی میں

یہ سارا واقعہ لکھا ہے۔ میرے ساتھ اس کا بڑا یار نہ تھا۔ سناؤں کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر رخصت کر دیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامہ کی

اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر پڑ گئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعہ اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے

اپنے چاہنے والے کو بادل ناخواستہ رخصت کر دیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ

گئی۔ گھر جا کر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا کہ اس رات میں بے خبر سو رہی تھی کہ ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ

میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا۔ اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات کا جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس کے دونوں رانی پر تھے۔ اس نے میرے چہرے پر کوئی افسوں پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اس نے اپنے پروں میں چھپالیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جا کر اس نے مجھے ایک نہایت خوب صورت اور شاندار محل میں رکھا۔ مثنوی کے شعر ہیں:

ہر چند کہ آں مقام دل خواہ  
بودہ بخدا بے طرب گاہ  
واں جملہ تباہ حور زادہ  
بودند بخدا متم ستادہ  
لیکن نہ فراق دوستانم  
آرام نے گرفت جانم  
مے مردم از اشتیاق مادر  
مے سو ختم از غم برادر  
ہر لحظہ دریں تن بلاکش  
بہر پدرم ہے زد آتش  
باگریہ زار و آہ جاں سوز  
چوں رفت در اں مقام سوز  
دیدند ہمہ کہ بس خرابم  
بسیار نہ غم در اضطرابم  
آگاہ شدند از مسلم  
کردند ترجمے بہ حسالم  
ز انساں کہ مرا خانہ بردند  
برودہ بچپناں غمے سپردند  
آورده بخانہ ام رساندند  
ز ان محنت و درد وار باندند

ترجمہ:- وہ مقام بلاشبہ نہایت خوش منظر اور دلکش تھا۔ میری خدمت کے لیے حوریں مقرر تھیں۔ لیکن میں اپنی ماں بھائی اور باپ کی جدائی سے تڑپ رہی تھی۔ روتے دھوتے وہاں تین دن گزر گئے۔ ان لوگوں نے جب مجھے غم سے بے قرار پایا تو میرے حال پر رحم کیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر گھر تک پہنچا گئے،



جاہل ہندوؤں نے اس افسانہ کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ اس واقعہ کو چھپاتے، لیکن غصہ کے مارے انہوں نے چند دن تک موہنی کو بالا خانہ میں قید کر دیا۔ سید موسیٰ بے چارہ درد فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہو گیا۔ ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی پھر جس کے منہ جو بات چڑھتی کوٹھوں پہنچ جاتی۔ آخر کار موہنی نے ایک مشاطہ کے ذریعہ موسیٰ کے پاس کھلوا بھیجا اور اسے تسلی دی کہ میں نے بڑی مشکل اور جلد گری سے کام لے کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نجات حاصل کر لی ہے اور اب ہر طرح مطمئن ہوں۔

از طعنہ اہل عصر رستم      فارغ ز چنناں بلا شستم  
در کوئے جنوں قدم نہادی      و آں رنج مرا بیاد دادی  
اکنوں ہم اگر علاج یابی      امید کہ رواں اناں نتابی  
نوعے بکنی کہ ایں فسانہ      شہرت نکند دریں زمانہ  
یعنی کہ نہ شہر من بر آئی      وز منزل ما کنی جدائی  
لیکن ز گمان دوستداری      یک محرم راز خود گذاری  
تا حال مرا چنانچہ داند  
ہر روز بتو خبر رساند

(ترجمہ)۔ میں دنیا والوں کی ملامت و انگشت نمائی سے نجات پا چکی ہوں۔ لیکن تم نے دیوانگی اختیار کر کے میری ساری محنت اکارت کر دی اب ذرا ہوش مندی سے کام لو اور ایسا رویہ اختیار کرو کہ زمانہ میں ہماری داستان کا چرچا ہونے نہ پائے۔ ایک ہی راہ ہے کہ تم اس شہر سے چلے جاؤ اور یہاں اپنا ایک قابل اعتماد رازدار چھوڑ جاؤ تاکہ وہ میرے حالات سے تم کو ہر روز نہ باخبر رکھے۔  
سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کئے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ دونوں نے رودھو کر ایک دوسرے کو وداع کیا۔ ایک رازدار کو وہاں چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر منتخب ہو چلا گیا۔  
موہنی نے موسیٰ کو اپنے سے دور بھیج تو دیا۔ لیکن اس کے چلے جانے پر دن گزارنا اور رات کاٹنا اس کے لیے دو بھر ہو گیا۔ جب فراق کے صدمے سے نہ جاسکے تو چند دن بعد اس نے اس رازدار سے مل کر کمالات کے وقت تم ہمارے گھر آ کر فقیروں کی طرح صدا لگانا اور میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤں گی پھر تم مجھے اس شہر سے نکال لے جانا۔ چنانچہ مقررہ وقت پر وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل آئی۔ اس خادمہ کو جو اس کی نگرانی پر مقرر تھی کسی کام کے بہانے بھیج دیا اور اس رازدار کے ساتھ بھاگ گئی۔  
ان لوگوں نے سفر کی تیاری پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں پھیر رہے تھے جب ہر طرح اطمینان کر لیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستہ پر آ نکلا اور اس نے موہنی کو پہچان کر پکڑ لیا۔  
اس زمانہ میں اگرہ کا کوتوال پلوان جمال تھا۔ اس کے سپاہی موقع پر آ پہنچے۔ انہوں نے موہنی کو تو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا اور بھگائے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ وہ بچارا کافی عرصہ تک قید و بند کی مصیبت میں مبتلا رہا۔ آخر بڑی مشکل سے

رہائی نصیب ہوئی۔

جب بچارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو وہ پہلے ہی درد فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ بس مرنے کے قریب ہو گیا۔ وحشت و جنوں کے عالم میں آگرہ جانا چاہتا تھا لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بھجھا کر ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دار الخلافہ کو لوٹ کر آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہو گیا۔ چونکہ موسیٰ کو ایک محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا اس لیے باوجود ہزار کوشش کے وہ غریب اپنی محبوبہ کی جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالی کے نواح میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی، جرات سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اس مکان پر جا پہنچا جہاں موسیٰ نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز رفتار گھوڑے پر بٹھالیا اور دریائے جمن کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگادیا موسیٰ کے رشتہ دار اس کا تعاقب کرنے لگے اور سامنے سے شہر کے لوگ بھی دوڑتے ہوئے پہنچ گئے۔ گھوڑا تیز تھا لیکن راستہ میں بہت سے نالے اور گڑھے تھے اس لیے وہ بچ کر نکل نہ سکا۔ جب موسیٰ نے یہ حال دیکھا تو اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے کو پہنچا دینا اور کہنا ہے

من جہد ہی کنم قضائے گوید  
بیرون ز کفایت تو کار دگر است

تقدیر کے آگے مجبور و بے بس ہوں۔

جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ قلعہ آگرہ میں اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہا اور اس صدمے کے مارے جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا ہے

اندیاد دلم ہزار جاں یافت

یاری بہ اندونے تو اں یافت

”میرادل میرے محبوب کے سہاے جتنا رہا ہے میں اس سے بہتر محبوب کہیں نہیں پاسکتا،

پھر اس نے کہا اے اللہ اس درد کو مجھ پر نصیب کی روح کے ساتھ وابستہ رکھنا ہے

بلق بر سینہ ام خنجر جدا نگوں سراز تن ہم

دریں خانہ تاریک را بکشائے دروزن ہم

جب وہ مر گیا تو اس کی میت کو دفنانے کے لیے اٹھایا گیا۔ لوگ اس جوان مرگ کی موت پر ماتم کرنے لگے اس کا جنازہ موسیٰ کے گھر کی طرف سے نکالا گیا۔ موسیٰ کو اس کے گھر والوں نے پایہ زنجیر کر کے قید کر رکھا تھا۔ اس نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا تو جس حال میں تھی اسی حال میں مہوت و متحیر رہ گئی۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کوٹھے پر کھڑی ہوئی سر و ننگا ہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازہ کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ آخر کار اس کی یہ بے حسی ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک پیچ مار کر اپنے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور بیرون کی زنجیر توڑ ننگے سر ننگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے

بد نصیب عاشق کے محلہ میں جا پہنچی۔ اس کی حالت برابر بگڑتی چلی گئی۔ کبھی تو بے حس و حرکت مدہوش رہتی اور کبھی خاموش و حیرت زدہ نظر آتی۔ ماں باپ نے جب اس کا یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔  
 ”کس نہ سستا زردہ ویراں خراج“

جلد ہی اس بے چاری کا برا حال ہو گیا۔ دیوانوں کی طرح اپنے آپ میں الجھتی رہتی۔ سینہ کو بی کرتی اور سید موسیٰ کے نام کا ورد کرتی رہتی۔ اسی حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانہ پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قدم سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔  
 سید شاہی نے مثنوی میں اس منظر کو اس طرح نظم کیا ہے :-

ایں واقعہ چوں شنید آں ماہ	آمد سوئے ماد ویدہ ناگاہ
چوں یافت شرف زوین اسلام	بر بست بطوف خلہ احرام
باخوبے او چو عشق شد جمع	پروانہ صفت بسوخت آں شمع
کرد از سر شوق و جذبہ فریاد	موسى بزباں گرفت و جان داد
در یک نفس آں دوسر و عشق	گشتند شہید خنجر عشق
تا آں کہ میان باغ رضواں	باشند ہم ز خلق پنہاں
آں ہر دو مصاحبان جانی	رفتند ازین جہان فانی
از درد و غم و فراق رستند	پنہاں نہ ہمہ ہم نشستند
اے سیدی ایں چہ نالہ داری	دل نہ اچہ بغم حوالہ داری

ایں واقعہ را بکن فراموش

در صبر بکوش و باش خاموش

ترجمہ :- جب موسیٰ نے یہ واقعہ سنا تو وہ ہمارے پاس دوڑتی ہوئی چلی آئی اور اسلام قبول کر لینے کے بعد اس نے جنت کے ارادہ سے احرام باندھ لیا۔ عشق اسکے حسن کا لاگو تھا اس لیے وہ شمع حسن پروانہ کی طرح جل گئی۔ انتہائے شوق میں اس نے موسیٰ کا نام دہرایا اور اپنی جان دے دی۔ وہ دونوں وفا شعار دیکھتے ہی دیکھتے خنجر عشق سے شہید ہو گئے۔ تاکہ دنیا کی آنکھوں سے چھپ کر جنت کے باغ میں ایک ساتھ رہیں۔ وہ دونوں دل دوست اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جدائی کے صدموں سے چھوٹ کر سب کی آنکھوں سے اوجھل ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ اے سیدی اب نالہ و فریاد سے کیا حاصل تو نے اپنے دل کو غم کے حوالہ کیوں کر دیا ہے اب تو اس واقعہ کو بھول جا، صبر کر اور خاموش رہ،

قاریین مجھے معاف کریں میں نے اختصار کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا کروں عشق کی اس دل گداز داستان نے میرے قلم کو بے قابو کر دیا اور مضمون کچھ طویل ہو گیا۔

بشنو اے گوش برفانہ عشق از صبر قلم ترانہ عشق

کار من عشق دیار من عشق است حاصل روزگار من عشق است  
چہ کنم در سرشت من این است و ز ازل سر نوشت من این است

بہر این آفریدہ اند مرا

جانب این کشیدہ اند مرا

**شیخ زادہ دام محبت میں** | عشق و محبت کا ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا جو پاک بازی اور راست روی میں مشہور تھا۔ آگرہ میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہو گیا۔ یہ خبر شہنشاہ کو ملی تو انہوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خاں کے حوالہ کر دیا۔ اس شیخ زادہ نے جان بھیلی پرے کر اس محل پر کمند لگائی جس میں اس کی محبوبہ کو چوکی پرہ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے اسے نکال لے گیا۔ بادشاہ نے شیخ محمد غوث کے لڑکے شیخ ضیاء الدین کو جو اس وقت اپنے باپ کے گدی نشین ہیں ان دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے سمجھا بھاکر ان دونوں کو بادشاہ کے دربار لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کا نکاح کر دینا چاہا لیکن شیخ ضیاء الدین اور کچھ دوسرے لوگوں نے بادشاہ کو اس ارادہ سے روک دیا۔ نوجوان شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لاسکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کر لیا۔ اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین کا کہنا تھا کہ حدیث شریف **مَنْ عَشَقَ وَ عَفَّ وَ كَتَمَ ثَمَّ مَاتَ شَهِيدًا** جس نے عشق کیا اور پاک رہا اور اسے چھپایا پھر مر گیا پس وہ شہید مرا، کے مطابق وہ شہید عشق ہے اس لیے اس کو شہید کی شان سے دفنانا چاہیے۔

شہید خنجر عشقم بخوں دیدہ آلودہ

بہ خاکم بچناں پر خوں سپارید و شہید مرا

ان کے علی الرغم شیخ عبدالنبی صدر اور دوسرے عالم اور قاضی کہتے تھے وہ ناپاک مرا ہے آلودہ فسق ہے نہ کہ آسودہ عشق واللہ اعلم۔

اپنے عاشق کے پیچھے اس مطربہ کا برا حال ہو گیا۔ چنانچہ اس نے سب کچھ چھوڑ ایک کفنی گلے میں ڈال لی اور عاشق کے مزار پر مجاور بن کر جا بیٹھی۔ چند ہی دن بعد اپنے چاہنے والے سے جا ملی۔

خو پرویاں چوں پردہ برگسند

عاشقاں پیش شاں چنیں میرند

اسی سال شیخ گدائی کنبوہ دہلوی جو معزول کو توال کی طرح بے آبرو جی رہا تھا اور جو زمانہ کی ڈھیل کی وجہ سے نہایت متکبر و مغرور رہ چکا تھا فوت ہو گیا۔ لوگوں نے اس کی تاریخ وفات نکالی "مردہ شوک کلاں"

**قلعہ کا لخر پقبضہ** | ۱۸۵۷ء میں جب چیتوڑ اور رنتھنبور کے قلعوں کی فتح کی خبریں ملک میں ہر جگہ پہنچیں اور ہندوستان کے سارے قلعے یلغار شاہی کے سامنے زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئے تو بھٹہ کے حاکم چند نے بڑی

عاقبت اندیشی سے کام لیا اس سے پہلے کہ ذلیل و خوار ہونا پڑے اس نے قلعہ کالنجر جسے اس نے خواندہ بہادر خاں شروانی کے لڑکے بجلی خاں سے بھاری قیمت دے کر خریدا تھا بادشاہ کے سپرد کر دینے کا فیصلہ کیا اور قلعہ کی کبھی نفیس تحائف کے ساتھ دربار میں بھجوا دی۔ بادشاہ نے کالنجر کی کبھی محبتوں خاں قاقشال کو جس کی جاگیر قلعہ سے قریب تھی عطا کر دی اور راجہ رام چند کے نام تسلی آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے جہوسی اور پیاک (الہ آباد) کے قریب پرگنہ اربل بشمول تمام عمارتوں کے جاگیر میں مرحمت فرمایا۔

شہزادہ سلیمان کی پیدائش | شہزادہ کی، امہ ربیع الاول دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتی کے مکان پر شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی ہے

گوئی بزمیں ستارہ آمد

یوسف بجاں دوبارہ آمد

بالائے سرش زہوشمندی

می تافت ستارہ بلندی

شہنشاہ آگرہ سے نہایت تیزی کے ساتھ فتح پور پہنچے اور انتہائی خوشی کے عالم میں انہوں نے تمام قیدیوں کو رہا کر دینے کا حکم دیا۔ شہزادہ کی ولادت کی مسرت میں سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے کہے۔ خواجہ حسین مروہ نے جو قصیدہ سنایا تھا اس کے ہر مصرع سے بادشاہ کی تاریخ جلوس اور مصرع ثانی سے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ اس قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے اسے دو لاکھ تنکے کا انعام دیا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

بند الحمد از پئے جاہ جلال شہریار

گو ہر محب از محیط عدل آمد بر کنار

آخری شعر ہے ۷

شاہ ما پائیدہ باد و باقی آں شہزادہ ہم

روز بائے بے حساب و سالہائے بشمار

آخر میں تاریخ کے متعلق مروی نے کہا ہے :-

پادشاہ سلک لولوی نفیس آوردہ ام      ہدیہ کان آمد باز جوی گوشدار  
کس ندارد بدیدہ زیر بہ اگر دارد کسے      ہر کہ دارد گویا چیزے کہ دارد گوہار  
یک بہ یک شعار مروی بسکہ بے عیب آمدہ      ہر یکے جوئی زدے مقصود در پائے دربار

مصرع اول زدے سال جلوس بادشاہ

از دوم مولود نور دیدہ عالم بر آرد

لے شیخ کے مکان میں شمالی دالان کا نام مجلسی دالان تھا یہ ان کی نشستگاہ تھی اسی دالان کی چیت پر ایک چھوٹا کوہ مشرق نام کا ہے یہ شیخ کی چلا گاہ تھی۔ کتبہ میں اس میں سلیم بن علی کا نام ہے دوسرا بیان ہے کہ مکان سے قریب اکبر نے ایک محل تعمیر کرایا تھا اس میں سلیم اور دنیاں دونوں پیدا ہوئے (ماثر الامار جلد دوم صفحہ ۷۷۷)۔ اکبر نامہ صفحہ ۷۷۷



شیخ یعقوب صیرنی کشمیری نے بھی اسی اسلوب پر ایک قصیدہ کہا تھا لیکن کیا فائدہ جس کو صلہ ملنا تھا مل چکا۔  
ایک شاعر نے یہ تاریخ نکالی :-

”ورشاہ دارلحجہ اکبر“

ایک اور تاریخ ہے :-

”نورے نمودار مطلع اقبال شاہ کامیاب“

جمعہ ۱۲ شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادہ کی ولادت کے شکرانہ میں آگرہ سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات سو سٹے کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کرنے کے بعد رمضان مبارک میں وہاں سے واپس آئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ ہندون دہلی کے اولیاء اللہ کی زیارت کی پھر جنا کے دوسرے کنارے پر شکار کھیلا اور وہاں سے دارالخلافہ لوٹ آئے۔  
اسی سال بادشاہ نے مرزا مقیم اصفہانی اور ایک شخص میر یعقوب کشمیری کو رافضی ہونے کے جرم میں فتح پور میں قتل کرا دیا۔

رافضیوں کو قتل کی سزا

مرزا مقیم لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک حسین خاں کی ملازمت میں رہا تھا۔ حسین خاں سیدوں کا بڑا معتقد تھا اس لیے وہ مرزا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا اس نے مرزا کو اپنی سرکار کا وکیل بھی بنا دیا تھا۔ حسین خاں کے عزیزوں اور بھائیوں نے خان کو بتلایا کہ یہ مرزا مرزا رافضی ہے اس لیے خان اس سے کبیدہ خاطر ہو گیا۔ مرزا بھی حسین خاں کی ملازمت چھوڑ کر بارگاہ شاہی میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اسے کشمیر کے حاکم حسین خاں کے پاس شاہی وکیل بنا کر بھیج دیا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں چند متعصب رافضیوں نے قاضی حبیب کو جو پکے سنی تھے مذہبی تعصب میں حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ قاضی ابھی زندہ ہی تھا کہ کشمیر کے حاکم حسین خاں نے مفتیوں کے فتوے کے مطابق قاتل کو سزائے موت دے دی۔ مرزا مقیم نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور اپنے اثر سے کام لے کر ان مفتیوں کو اس جرم میں کہ انہوں نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا۔ ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کر دیا۔ اس نے بن چار مفتیوں کو قتل کر دیا۔ اس قضیہ کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا مقیم اور حسین خاں کا وکیل میر یعقوب حسین خاں کی لڑائی کو بادشاہ کے پاس پیش کش کی رسم کے لیے لے کر آئے۔ اس موقع پر یہ واقعہ بادشاہ کے علم میں لایا گیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو شیخ عبدالبنی اور اس کے رشتہ دار دوسرے چند علماء کے فتوے پر فتح پور کے میدان میں قتل کرا دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کشمیر کی تاریخ میں بھی جسے میں نے مرتب کیا ہے درج کیا گیا ہے۔

گوہ سوا لک کے بت خانے | ہمدی قاسم خاں ج سے واپس آکر قلعہ رتھنپور میں حاضر خدمت ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس

لے ابو الفضل نے آجہاں گہری میں لکھا ”یہ حسینی حسنی سادات میں سے ہیں باپ کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر میں ہرون میں جو نیشاپور کے نواح میں ہے خواجہ عثمان چشتی کی خدمت میں پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی فیض اٹھایا جس سال معز الدین سام نے دہلی کو فتح کیا تھا وہ ہند آئے اور گوشہ نشینی کی خاطر اجمیر پہنچے اور وہاں دین کا چراغ جلا دیا۔ مہفتہ کے دن چھ ماہ رجب سنہ ۸۷۵ میں وصال ہوا۔ اجمیر کے پٹا کے دامن میں ان کا مزار زیارت گاہ عام و خاص ہے۔“ جہانگیر نے اپنی توذک میں لکھا ہے ”وآپ کا بولد شریف بیتان ہے پلے بنارائے اور علوم ظاہری کی تحصیل کی۔ پھر خراسان آئے پھر قصبہ ہارون میں شیخ عثمان ہمدانی کے مرید ہوئے اور ان کے حکم سے ہمیشہ وہ سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم ادہم سے ملتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اند جالی آپ کے مرید تھے۔ ان کے مرید شیخ فرید شکر گنج ہیں اور ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیاء ہیں۔“

سال لکھنوکا پر گنہ حسین خاں سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کا دروائی سے حسین خاں کو بہت رنج ہوا۔ مہدی قاسم خاں کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی۔ اس سے خان کو محبت بھی تھی۔ لیکن محض انتقام کے مارے اس نے اپنے چچا غصنفربگ کی لڑکی سے نکاح کر لیا اور مہدی قاسم خاں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے مہدی قاسم خاں کی لڑکی کو خیر آباد میں اس کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا اور جہاد کا ارادہ کر کے لکھنؤ سے اودھ کے راستے کوہ سوا لک کا رخ کیا۔ کوہ سوا لک کے بت خانوں کے متعلق یہ جھوٹی شہرت تھی کہ وہاں بت کدوں کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں اور بڑے بڑے خزانے جمع ہیں۔ سوا لک کی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں اس نے یہ مہم اختیار کی۔

پہاڑیوں کا طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی ان کے علاقہ پر حملہ کرتا ہے تو وہ تھوڑا بہت مقابلہ کر کے پہاڑوں کے اندر پسا ہو جاتے اور وہاں اونچی اونچی خطرناک پہاڑیوں پر مضبوط مورچہ بند کر لیتے ہیں۔ حسین خاں کا سوا لک حملہ

کر لیتے ہیں۔ حسین خاں بھی ان کو پسا کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں پیر محمد خاں کا بھانجہ سلطان محمود شہید ہوا تھا۔ اس جگہ شہیدوں کی بہت سی قبریں تھیں۔ حسین خاں نے شہدار کے لیے فاتحہ پڑھی اور ان کی شکستہ قبروں پر چوترا تعمیر کرایا اور پھر وہاں پہاڑوں کے اندر اور آگے تک پیش قدمی کی اور وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار راجہ رنگا کے علاقہ پر حملہ کر کے قصبہ و جرائیل تک کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر دیا۔ وہاں سے اجمیر تک جو راجہ رنگا کا پائے تخت تھا اور بت کے مال و اسباب مشکہ رشیم اور سونے چاندی کی بہت بڑی منڈی تھی، صرف دو دن کا راستہ رہ گیا تھا، لیکن جیسا کہ ان پہاڑوں کی خصوصیت ہے کہ گھوڑوں کے منہ تانے نقارہ کی آواز اور آدمیوں کے شور کی وجہ سے سخت بارش ہونے لگی اور جلد ہی غلہ اور گھاس کا کال پڑ گیا، لشکر بھوکے مرنے لگے حسین خاں نے اپنے لشکر کو اس شہر کے فتح کرنے کی بہت ترغیب دی اور وہاں کے زرو جواہر اور خزانوں کا بڑا لالچ دلایا۔ لیکن لشکر ایسے بدحواس ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اقدام کرنے اور لڑنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ واپسی کے وقت کافروں نے حسب معمول راستے روک دیئے اور لشکریوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کے تیروں میں زہر آلود بڑیوں کے پھل لگے ہوتے ہیں وہ لشکر کو جگہ جگہ گھیر گھیر کر بنگ باری کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین خاں کے اکثر تجربہ کار اور جنگ آزمودہ بہادران پہاڑوں میں شہید ہو گئے اور جو لوگ زخمی ہو کر واپس آئے وہ بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ زہر سکے۔ زہر کے اثر سے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اس واقعہ کی تاریخ ”تلخ بے مزہ نکالی گئی۔“

حسین خاں کوہ سوا لک سے ناکام و نامراد دربار میں لوٹ کر آیا۔ اس نے پہاڑیوں سے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے کانت و کولہ کی جاگیر کے لیے جو اس پہاڑ کے دامن میں

واقع ہے درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔ اس نے وہاں جا کر کئی بار پہاڑ کے دامن کے علاقوں پر حملہ کیا اور ان کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن پہاڑ کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہو سکا۔ اس کے لشکر کے بہت سے آدمی جو پہلی مرتبہ موت کے پنجے سے بچ کر نکل آئے تھے اس مرتبہ وہاں کے زہریلے پانی کے اثر سے بغیر جنگ کے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے چند سال بعد حسین خاں نے جان ہتھیلی پر لے کر کوہستان پر شد و مد سے حملہ کیا اور دور تک اندر چلا گیا۔ لیکن اسے ان خونی پہاڑوں میں سے واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ یہ تفصیل ہم انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

بھائی اور بیٹے کا انتقال | اسی سفر کے موقع پر میں حسین خاں سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آگیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا ایک اچھے گھرانے میں بیاہ دیا۔ یہ شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیونکہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میر ارد کا عبداللطیف بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون میں نے مرثیہ میں میں نے یہ ترکیب بند کہا تھا

یارب این روز چہ روزیست کہ افتاد مرا      وین چہ جانگاہ بلائیت کہ روداد مرا

حال دل بیچ ندانم بلکہ گویم چہ کنم  
چارہ درود دل خود ز کہ جویم چہ کنم

تقبرہ ہمایوں کی تعمیر | اسی سال دہلی میں جہانگیر کے کنارے میرک مرزا غیاث کے زیر نگرانی ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ آٹھ نو سال بعد مکمل ہو گیا۔ یہ عمارت واقعی نہایت حیرت انگیز اور پرفضا ہے۔

شاہزادہ مراد کی ولادت | جمعرات کے دن تیرہ ماہ محرم ۹۷۹ھ کو شیخ سلیم کے مکان میں شاہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ نے سابقہ جشن کی طرح ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔ اس موقع پر قاسم ارسلان نے ایک قطعہ پڑھا جس کے ہر مصرع سے ان دونوں شاہزادوں کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ پہلے مصرع سے شاہزادہ سلیم کی اور دوسرے سے مراد کی قطعہ

اولین شاہزادہ آن تابندہ ماہ  
ماہ وار از اوج عزت شریاں  
آن دوم فرزند اکبر پادشاہ  
آیتے نازل شدہ از آسماں

ایک دوسری تاریخ بھی اسی اسلوب پر ہے

ز نور پاک چوں سلطان شد نازل  
لوائے شاہ مراد ابن اکبر عادل

خواجہ حسن مروسی نے بھی سات شعر کا ایک قطعہ کہا جس کے پہلے مصرع سے بڑے شاہزادہ کی اور دوسرے مصرع سے چھوٹے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ قطعہ

داد و شاہزادہ بہ شاہ این سپر	چہرہ آن ہر دو بہ ز آفتاب
اول از ثانی شاہ جہاں	ثانی از و دبیر عالی جناب
و آن یکے از یمن بہ شاہ سریر	مرشدہ رساں بود بہ صد فتح باب
آن دگرے باعث امن و آماں	مہر ز مہ دادہ با و ہمد خواب
مرشدہ کہ مولودش از اول است	گفتہ از و مصرع اولی جواب

ازدو میں مصرع ابیات ہم مولد شہزادہ ثانی بیاب  
باد مدام آں شہ و شہزادہ را  
جاہ سکندر فراق را سیاب

**قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد** | فتح پور میں بادشاہ نے بارہ دن قیام کیا، اس کے بعد نذر گزارنے کے لیے اجمیر تشریف لائے۔ اس مرتبہ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور امرار کو عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ جمعہ کے دن چار جمادی الآخر کو وہاں سے کوچ ہوا اور بادشاہ ناگور پہنچے۔ اس شہر کے بڑے تالاب کو کھدوانے کے لیے امیروں کو مامور کیا گیا اور اس کا نام ”شکر تلاء“ رکھا گیا۔

اسی زمانہ میں حاکم مارواڑ مالدیو کا لڑکا چندر سین دربار میں حاضر ہوا۔ بیکانیر کا راجہ رائے کلیان مل بھی اپنے روتے کے رائے سنگھ کے ساتھ آیا، کلیان مل اپنی روتے کو پیش کش کے لیے لایا تھا چنانچہ وہ حرم میں داخل کر لی گئی۔ باپ کو تو بیکانیر واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن بیٹے کو خدمت شاہی میں ہمراہ رہنے کا حکم ہوا۔ راستہ میں بادشاہ نے گورخر کا شکار کیا۔ یہ شکار اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بادشاہ شیخ فرید گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن کی طرف جو پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے گئے۔ وہاں مرزا علی کو کہ اعظم خاں جاگیردار تھا، اس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑا پرتکلف جشن منعقد کیا اور بادشاہ کے تدرانے میں نفیس اور قیمتی تحفے دیئے۔ ایسی ضیافت کم ہی دیکھنے میں آئے گی۔

پٹن سے بادشاہ لاہور تشریف لائے اور حسین قلی خاں کے مہمان رہے، پھر حصار فیروزہ کے راستے دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے مسلسل کوچ کر کے فتح پور لوٹ آئے۔

**بکھر کی فتح** | میر خلیفہ کا لڑکا محب علی خاں پیشہ سپاہ گری ترک کر کے عرصہ سے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی بیوی ناہید بیگم کی سفارش پر جس کی ماں مرزا علی بی خاں حاکم ٹھٹھہ کے عقد میں تھی، بادشاہ نے اسے علم و تقارہ عطا کیا اور ملتان میں جاگیر مرحمت فرمائی۔

حاکم ملتان سعید خاں مغل کو اس کی مدد کے لیے فرمان لکھا اور اسے اس کے پوتے مجاہد خاں کے ساتھ جو ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے مقرر کر دیا۔ وہ دار الخلافہ سے ملتان آیا اور اپنی جاگیر کے انتظام کے لیے چار سو سوار مقرر کر کے بکھر کے حاکم محمد سلطان (سلطان محمود) کے پاس پیام بھیجا کہ تم نے خود بارہا یہ بات کہی تھی کہ اگر تم یہاں آجاؤ تو پھر کسی کی مدد کی ضرورت نہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ ٹھٹھہ کو فتح کر کے تمہارے سپرد کر دوں گا۔ یہ بات بادشاہ کے علم میں آئی تو انہوں نے تمہارے بھروسہ پر مجھے اس مہم کے لیے مقرر کر دیا ہے، اب مدد کا وقت آگیا ہے۔ اس نے جواب میں لکھا کہ اگر تم جیسلمیر کے راستے سندھ کی فتح کا ارادہ کرو تو میں تمہارے لیے کمک روانہ کروں گا ورنہ میں بکھر سے اس فوج کشی کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیوں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس کے اس انکار پر محب علی خاں اور مجاہد خاں نے ایک دوسرے سے راستہ سے بکھر پر حملہ کر دیا۔ سلطان محمود نے اپنے سارے لشکر کو ان کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ محب علی خاں کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور بکھر کی فوج شکست کھا کر مانیلہ کے قلعہ میں محصور ہو گئی۔ آخر وہ قلعہ بھی صلح اور امان کی شرط پر محب علی خاں کو مل گیا۔ سلطان محمود نے بکھر کے قلعہ سے اپنے بقیہ لشکر کو توپچیوں اور تیراندازوں کے ساتھ مقابلہ پر بھیجا۔ وہ بھی شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ بند ہو گئے۔ اس حملہ کے وقت قلعہ میں لوگوں کا ایک

اڑوہام سا ہو گیا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے قلعہ کی ہوا خراب ہو گئی اور قلعہ والوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا ایسی سخت تھی کہ روزانہ کم و بیش ہزار آدمی جان سے جا رہے تھے۔ ۹۸۳ھ میں اسی معرکہ کے دوران سلطان محمود جو کافی بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا فوت ہو گیا اور بکھر کا قلعہ بادشاہی فوج کے قبضہ میں آ گیا۔ بادشاہ نے قلعہ کے ذخیروں اور مال و اسباب کی تحقیق کے لیے میر گیسو کو فوج پور سے روانہ کیا تھا۔

**اسکندر خاں اوزبک کی طاعت اور وفات** | اسکندر خاں اوزبک پٹھانوں کو چھوڑ کر منعم خاں خاتماناں کے پاس مان طلب کرتے ہوئے آ گیا۔ چنانچہ منعم خاں جو پور سے اس کو لیکر اسی سال دوبارہ میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دونوں کو مرصع تلوار چار پارچہ خلعت سنہری زین والا گھوڑا انعام دیا اور اسکندر خاں کو لکھنؤ کی جاگیر مرحمت فرمائی۔ اسے خاتماناں کی کمک پر متعین کر کے جو پور کو رخصت کر دیا۔ اسکندر خاں نے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی ۱۰ جمادی الاول ۹۸۳ھ میں وفات پائی۔ میرا ایک دوست جلال ولد شیخ منگن بدراؤنی جو نہایت حسین و جمیل شخص تھا۔ سنبل میں عید قربان کے دن تیر اندازی کر رہا تھا۔ اسے ایک اجنبی شخص نے پان کا بیڑا دیا۔ جیسے ہی اس نے یہ پان کھایا اس پر ضعف طاری ہو گیا اور فوراً ہی مر گیا۔ اسکی تاریخ وفات ہے۔

صد آہ از جوان وزیب جلال خاں

شیخ رحم شیخ یعقوب صوفی کشمیری نے تاریخ کہی :-

سپردہ جاں بروز عید قربان

۹۸۳ھ میں آگرہ میں ایک شاندار محل اور اس طرح فتح پور کے نئے شہر میں دوسرا محل بن کر تیار ہو گیا۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ کہی ہے :-

تمام شد و عمارت مثل خلد بریں بدور دولت صاحب قرآن ہفت اقلیم  
یکے بہ بلدہ دار الخلافت آگرہ دگر بہ خطہ سکری مقام شیخ سلیم

سپہراڑ پئے تاریخ ایں دو عالی قصر  
رقم زدہ دو بہشت بریں بہ ملک قدیم

**شیخ سلیم چشتی کی وفات** | اسی سال ماہ رمضان مبارک کے آخر میں شیخ سلیم چشتی فتح پوری نے جو ہندوستان کے برگزیدہ شیخ اور بلند مرتبہ بزرگ تھے رحلت فرمائی۔ ان کا کچھ تذکرہ اسی منتخب کے آخر میں کیا جائے گا۔

ان کی ایک تاریخ وفات تو ہے شیخ ہندی اور دوسری ہے :-

تاریخ وفات شیخ اسلام  
شیخ حکمار و شیخ حکام

**حمیارۃ عشق** | اس سال مجھے ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہوا کہ جس وقت محمد حسین خاں کو کانت و کولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصہ تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبہ کی صدارت اور فقراء کی خدمت سے بھی کئی کئی تھیں۔ قوج کے مضافات میں بہت مقام کن پور حضرت شاہ نادر کا مزار ہے۔ میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔ انسان کی

دعا شیعہ الگ مندرجہ



سرشت میں غفلت و جبل ابوالبشر آدم سے وراثت چلا آرہا ہے۔ میں نے بھی انسان ہی کا کچا دودھ پیا ہے۔ خطا و نسیان سے بالاتر نہیں رہیں۔ ہوں۔ میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور یہاں ایک خوب رو کے کرشمہ وادانے مجھے دام ہوس میں پھنسا دیا۔ میں اس حوص و ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری گزری، اس درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہو گئی تو اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس دنیا ہی میں مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا۔ چنانچہ میرے سرباٹھ اور کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم آئے۔ دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار بڑی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ گئی اور انگلی ٹٹکنے لگی تھی۔ بس جان جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثہ کو جھیل گیا۔ قصبہ ہانگر منو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں گا تو چ کر دوں گا، لیکن افسوس ایفائے عہد کی اب تک نوبت نہ آئی۔ غرض کچھ صحت پلنے کے بعد میں وہاں سے کانت و کولہ چلا گیا۔ غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خان نے خدا سے بہشت جاوداں عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز کا مرہم اور کھانے کے لیے گز کا حلوا تیار کر دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منہ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں باقاعدہ کچری لگی ہوئی ہے۔ جس میں دیوانی کے کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں اور چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھریاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مؤدب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا ”یہ وہ شخص نہیں ہے۔“ اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی اور میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے بچپن میں جو افواہ سن رکھی تھی اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔

**بدایوں کی آتش زدگی** | اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے چھپانہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی۔ چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے۔ بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے، آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور بلند ہو جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے اس آتش زدگی کو خود

لے ایک درخت کا نام ہے جو ہندی کے کنارے ہوتا ہے۔ اسے عربی میں طرزا اور ہندی میں جھاؤ کہتے ہیں۔

علامہ مصنف نے ”افواہ عام“ کا لفظ لکھا ہے وضاحت نہیں کی جاہل لوگ کہا کرتے ہیں ”فرشتوں نے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔“ غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

دعاشیہ صفحہ سابقہ، لے شاہ مدار:۔ ان کا لقب ہدیج الدین تقیہ شیخ محمد طیفوری بسطامی کے مرید تھے، ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ہر پیر کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تو وہ کوئی نہ کوئی داستان سناتے۔ اس داستان میں ہر شخص کو اپنی مراد اور سوال کا جواب مل جاتا۔ انہی سے ”سلسلہ مدار“ کے لوگ منسوب رہے ہیں۔ مزار مکن پور میں ہے۔ ان بزرگ کا زمانہ شیر شاہ کے بعد کا ہے۔ سلطان ابراہیم شرقی (جون پور) کے زمانہ میں تاجی شہاب الدین نے ان سے مباحثہ و مجاہدہ کیا تھا۔ اور نتیجہ میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ (ابوالفضل آئین اکبری دفتر سوم ص ۱۱۱)

پہنچی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بلکہ اس کی پسین میرے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثہ سے پہلے کا قصہ ہے کہ دو آبہ کا ایک مجذوب  
بہادریوں آیا تھا میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا ”اس شہر سے نکل جاؤ۔“ میں نے پوچھا  
”کیوں؟“ مجذوب نے جواب دیا: ”یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے۔“ وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا اس لیے مجھے اس کی  
بیانات کا یقین نہ آیا۔ لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔

چہ پر سی از بد احوال و ز احوال پریشانش کہ آیات عذاب النار نازل گشتہ در شانش  
شہد میں گجرات فتح ہوا۔ گجرات میں بڑا انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے گجرات پر  
گجرات پر فوج کشی حملہ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور فوج کو حاضر ہو جانے کے لیے فرمان جاری کر دیے۔ گجرات کی مہم  
کے لیے ۲۰ صفر کو پائے تخت سے روانگی عمل میں آئی۔ ۱۵ ربیع الاول کو اجیر میں شکر نے چھاؤنی قائم کی۔ اجیر میں بادشاہ نے پہلے تو  
حضرت معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کی پھر دوسرے دن وہ میر سید حسین خٹک سوار کی زیارت کے لیے پہاڑ کے اوپر تشریف  
لے گئے۔ میر موصوف کی شان میں یہ شعر مشہور ہے۔

شکر اللہ بدل تافتہ انوار جل از حسین ابن علی ابن حسین ابن علی  
ان زیارتوں سے فارغ ہو کر بادشاہی ہراول میر محمد خاں کلاں کی سرکردگی میں آگے روانہ کر دیا اور شاہی سواری مسلسل کوچ  
کر کے نویں جمادی الاول کو ناگور پہنچی۔

شہزادہ دانیال کی ولادت | اجیر کے قیام کے دوران میں چہار شنبہ کی رات کو دوسری ماہ جمادی الاول کو ایک مجاور  
شیخ دانیال کے گھر میں شہزادہ دانیال کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ کو یہ خوش خبری ناگور  
کی دوسری منزل میں پہنچائی گئی۔ شیخ دانیال کی نسبت سے شہزادہ کا نام دانیال تجویز کیا گیا۔ تاریخ ولادت ہے:  
”بگفتا ناصر شرع نبی باد“

یہ تاریخ لفظ شریعت سے بھی نکلتی ہے۔

سروہی کی جنگ | جب شکر شاہی میرٹھ پہنچا تو خبر ملی کہ سروہی کے مقام پر ایک راجپوت نے ایچی گری کے بہانہ خان کلاں  
پر جہد و بندوبست کا ایک مشہور ہتھیار سے حملہ کر دیا۔ جہدھر خان کے سینہ میں اندر تک کھب گیا۔ اور  
اس کی نوک شاد کی پشت پر نکل آئی۔ لوگوں نے حملہ آور کو اسی وقت جہنم رسید کر دیا۔ خان کلاں کو گہرا زخم آیا تھا، لیکن خیریت ہوئی  
کہ وہ زخم دس پندرہ دن میں بھر گیا۔ جب شکر سروہی پہنچا تو سوڈیوہ سوراجپوتوں نے اپنی رسم کے مطابق کچھ نے توت خانہ میں اور کچھ نے  
راجہ سروہی کے محل میں جان دے دینے کا اقرار کیا اور مقابلہ پر نکل آئے۔ سب کے سب مارے گئے۔ حاکم دہلی مرحوم تاتار خاں کا لڑکا  
دوست محمد جسے ”تاتارچہ“ کہا جاتا تھا اسی جنگ میں شہید ہو گیا۔

اسی منزل میں بادشاہ نے بیکانیر کے رائے سنگھ کو جو دھ پور پر متعین کیا تاکہ گجرات کا راستہ محفوظ رہے اور کوکنڈہ و کوہلیز کے  
حاکم رانا کیلا کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ راجہ بھگوان داس کے لڑکے مان سنگھ کو ایک آراستہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف  
مقرر کیا گیا تاکہ وہ شیر خاں فولادی کے لڑکوں کا تعاقب کرے جو اپنے اہل و عیال سمیت اس جانب جا رہے تھے۔

احمد آباد کی فتح | پہلی رجب کو شہر تپن کے سامنے شاہی لشکر نے کیمپ لگا دیا۔ تپن سید محمود کے بھائی سید احمد خاں بارہہ کو جاگیر

افغان سلطان محمود گجراتی کے غلام اور وزیر مطلق اعتماد خاں کے ساتھ تقریباً چھ ماہ سے احمد آباد کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اصل میں اعتماد خاں نے سلطان محمود گجراتی کے رٹے مظفر کو مقید کر رکھا تھا اور اس کے نام سے خود حکمرانی کر رہا تھا۔ جب اسے اکبر کی فوج کشی کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھالیا اور پٹھانوں کی جمعیت پر آگندہ ہو گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بروز اتوار نو ماہ رجب کو سلطان مظفر بارگاہ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے شاہ منصور وزیر کے جس کا حال ہم آگے بیان کریں گے سپرد کر دیا اور اس کے خرچ کے لیے ماہانہ تیس روپیہ کی رقم منظور کی۔ بعد میں وہ شاہی قید سے بھاگ گیا، لیکن راجا سورت کے ہاتھوں قید ہو گیا۔ جن وقت راجہ نے اس کو گرفتار کر کے جونا گڑھ میں اعظم خاں کے پاس روانہ کیا تو اس نے راستہ میں استرہ سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس سلسلہ کے بقیہ حالات بعد میں بیان کیے جائیں گے۔

دوسرے دن اعتماد خاں شاہ ابوتراب سید حامد بخاری اختیار الملک حبشی ملک الشرق وجیہ الملک الخ خاں حبشی، جھپھا خاں حبشی اور گجرات کے دوسرے تمام امرار بارگاہ سلطانی میں باریاب ہوئے۔ اعتماد خاں شہر احمد آباد کی کنجی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ بادشاہ نے اپنی ایک رزم کا محاذ کر کے حبشیوں کو معتمد امرار کے سپرد کر دیا۔

جمعہ کے دن ۱۴ رجب کو احمد آباد کے ساحل پر خیمہ گاہ لگائی گئی اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ کو سید محمود خاں بارہہ اور شیخ محمود بخاری نے شاہی بیگمات کو لشکر میں پہنچایا۔ بروز سیر و سری شعبان کو لشکر نے احمد آباد سے کھمبات کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوج کشی ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے خلاف کی گئی تھی ان لوگوں نے عرصہ سے بڑوچ بڑوودہ اور سورت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی موقع پر اختیار الملک حبشی جو گجرات کا نامی گرامی سردار تھا احمد آباد سے احمد نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے بے اعتباری کی وجہ سے اعتماد خاں کو شہباز خاں کنبہ کے حوالے کر دیا۔ شعبان کی چھٹی تاریخ کو کھمبات کی بندرگاہ پر قیام ہوا اور چودہ تاریخ کو لشکر بڑوودہ کے قصبہ میں پہنچا۔ بادشاہ نے گجرات کا سارا نظم و نسق میرزا عزیز کو کہہ کے سپرد کر کے اس کو احمد آباد رخصت کر دیا۔

۱۴ ماہ شعبان کو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین میرزا نے قلعہ بھڑوچ میں رستم خاں رومی کو قتل کرایا ہے اور اب وہ اس راستہ سے بھاگنا چاہتا ہے جو لشکر گاہ سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ بادشاہ

لے احمد آباد۔ یہ شہر بڑوودہ سے ساٹھ میل پر دریائے ساہتی کے کنارے واقع ہے۔ شہر میں احمد شاہ والی گجرات نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کا اردو نام "خیر ہے"۔ احمد شاہ اور محمود شاہ بیگمڑا کے دور میں شہر نے بڑی ترقی کی گجرات کا دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے یہ دہلی کے بعد دوسرے درجہ کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور مقبرے تھے۔ اکبر کے عہد تک احمد آباد صنعت اور تجارت میں بڑی رونق پر تھا محمد شاہ کے عہد میں مرہٹوں نے اسے تباہ و تالاب کر دیا۔ ۱۷۸۳ء سے یہ انگریزی حکومت کے قبضہ میں رہا۔ انگریزی عہد میں اس کی آبادی تقریباً دو لاکھ تک پہنچ گئی۔ شہر کے وسط میں احمد شاہ کی جامع مسجد بڑی عظیم الشان ہے۔ اس کا طول ۷۰ گز عرض ۳۲ گز ہے۔ چھت کے ستون ۳۵۲ ہیں ۱۵ انگنہ ہیں۔ محمود شاہ بیگمڑا کی بیوہ رانی پیری نے شہر میں مسجد تعمیر کرائی تھی۔ یہ مسجد ہندو اور مسلم طرز تعمیر کا مشترک نمونہ ہے۔ اور احمد آباد کی سب سے زیادہ خوب صورت مسجد ہے۔ شہر کے مشرقی جانب "کاٹریا" نام کا ایک بڑا تالاب ہے جو بڑی عمدہ سیرگاہ ہے۔ یہ تالاب سلطان قطب الدین بن محمد شاہ گجراتی کی یادگار ہے۔ احمد آباد میں سوتی ریشمی طلائ اور نفرتی تار کا نہایت عمدہ پیداوار ہوتا ہے۔ چنانچہ شہر مشہور ہے احمد آباد میں تاروں پر ٹکٹا ہے۔ بیرون شہر دادہری کا کنواں "شاہ عالم" "سرخیز" تار بنی یادگاری ہیں۔ سرخیز شاہی سیرگاہ تھی۔ تالاب کے کنارے سلطان محمود بیگمڑا اور اس کے بیٹے سلطان مظفر کا عالی شان مقبرہ ہے۔

نے شہزادہ سلیم کی کمان میں لشکر کو اسی جگہ ٹھہرایا۔ خواجہ جہاں شجاعت خاں اور دوسرے امرا کو بھی لشکر کی نگہداشت کے لیے مامور کر دیا۔ شبانہ خاں کو سورت پر متعینہ امیروں سید محمود ہارہہ اور شاہ قلی خاں محرم کو بلانے کے لیے روانہ کر دیا اور ملک الشرق گجراتی کو بدرقہ پر مقرر کر کے میرزا ابراہیم حسین کی سرکوبی کے لیے بادشاہ نے یلغار کی۔ جب وہ ہندری ندی کے کنارے پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ چالیس سواروں نے ندی عبور کی اور دوسری طرف کی خبر لے کر آئے کہ میرزا ابراہیم حسین دوسرے کنارے پر قصبہ سرنال میں ٹھہرا ہوا ہے۔ امراء شاہی نے ہتھیار سجالیے۔ سورت پر متعینہ امیر بھی اسی رات اگر لشکر سے مل گئے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کو ہراول پر متعین کیا اور ایک سو سپاہیوں نے ندی عبور کر لی۔

مرزا ابراہیم حسین کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ اسے شاہی لشکر کی یلغار کی خبر مل گئی اور وہ سرنال کے قصبہ سے ایک دوسرے راستے سے نکل گیا اور ایک جنگل میں پہنچ کر مقابلہ کی تیاری کرنے لگے۔ ہندری ندی کے کٹاؤ اور راستہ کی خرابی کی وجہ سے مان سنگھ ایک طرف نکل گیا اور بادشاہ کسی اور راستہ پر جا پڑے۔ آخر کار غنیم سے مدد بھیڑ ہوئی اور ابراہیم حسین مرزا نے بابا خاں قاقشال پر حملہ کر کے اس کے اوقچی دستہ کو کافی دوزخک پسا کر دیا۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے گئے۔ اسی موقع پر راجا بھگوت داس کا لڑکا بھوپت بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے بادشاہ کی جمعیت پر حملہ کر دیا۔ اس وقت بادشاہ ایک ناہموار تنگ مقام پر جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا ٹھہرے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے تین شخص آگے بڑھے۔ ایک نے راجہ بھگوت داس کا سر کاٹ لیا۔ راجہ نے جھاڑی کے پیچھے سے اس پر نیزہ پھینک کر مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ بادشاہ سب آگے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ان پر حملہ کر دیا۔ لیکن وہ بادشاہ کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور بھاگ گیا۔ مقبول خاں غلام سرخ بدخشی ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ پھر چاروں طرف سے بادشاہی لشکر نے میرزا ابراہیم حسین کی جمعیت کو گھیر لیا اور وہ مغلوب ہو کر میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ اس معرکہ میں اس کے بے شمار آدمی مارے گئے اور چونکہ رات ہو چکی تھی اسی لیے بادشاہ نے لوگوں کو تعاقب سے روک دیا۔ اور میرزا ابراہیم حسین چند گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر کے راستے سر دہی کی طرف چلا گیا اور وہاں سے وہ ناگور پہنچا۔ جب امراء شاہی نے اسے شکست دے کر وہاں سے بھگایا تو دہلی کے راستے سنبل کے فوارح میں چلا گیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے۔

**قلعہ سورت کی فتح** | بادشاہ اس معرکہ سے ۸ شعبان کو رخصت ہو کر بڑودہ میں لشکر سے آکر مل گئے اور وہاں سے قلعہ سورت کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قلعہ کو گجرات کے وزیر خداوند خاں نے فرنگیوں کی وک تھا

لے سورت۔ یہ گجرات کا تجارتی شہر رہا ہے جس کا نام ۱۱۵۳ھ میں شاہان گجرات نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ بحری تجارت کا یہ قدیم دروازہ تھا۔ اس کا مادہ تاریخ ہے۔

”بادآباد بندر سورت“ یہاں ایران عرب شام اور روم کے باشندے آکر آباد ہوئے شہر کے محلوں کے نام بھی انہی سے منسوب رہے ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں پرتگیزیوں نے چول اور یورپ کی مدد سے سورت کو فتح کیا۔ انگریزوں کے سپہ سالار ۱۶۱۵ء میں شہنشاہ دہلی سے یہاں تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت لی یہی انگریزوں کی سب سے پہلی کوٹھی تھی اس کی آبادی دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ بعد میں مرہٹوں کی تاخت و تاراج نے سورت کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ۱۷۳۵ء میں یہاں خونخاک آتش زدگی ہوئی تھی۔ بعد میں بحری تجارت بھی منتقل ہو گئی تو سورت کی رونق ختم ہو گئی۔ انگریزی عہد میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ آبادی نہیں رہی۔

سورت کا قلعہ تاریخی چیز ہے۔ اس کو سلطان مظفر نے پرتگیزیوں کی روک تھام کے لئے تیار کرایا تھا یہ اس دریا پر ہے جو سمندر سے جا کر مل جاتا ہے۔ سمندر سے یہ ۴ میل پر واقع ہے۔ بدایونی نے سن ۱۱۵۳ھ لکھا ہے۔ صحیح تاریخ ۱۱۵۳ھ ہے اس کا مادہ تاریخ ہے

”شہ دور سندھ جادہ فرنگ اترنا“

کے لیے سمندر کے کنارے شکار میں تعمیر کرایا تھا۔ چنگیز خاں کے مرنے کے بعد باغی مرزاؤں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا جب گجرات فتح ہو گیا تو مرزاؤں نے اپنے اہل و عیال کو اس قلعہ میں ٹھہرایا اور وہاں کا نظم و نسق ہمایوں بادشاہ کے قورچی ہم زبان نامی کے سپرد کر دیا۔ یہ شخص شاہی ملازمت میں تھا اور غدار کی کر کے مرزاؤں سے جا ملا تھا۔ اس انتظام کے بعد وہ سارے ملک میں فساد مچاتے پھر رہے تھے۔ جب میرزا ابراہیم حسین کی شکست کی خبر قلعہ والوں کو ملی تو کامران مرزا کی لڑائی گل رخ بگیم جو ابراہیم حسین مرزا کی بیوی تھی اپنے لڑکے کے ساتھ لے کر دکن کی طرف رخصت ہو گئی۔ میرزا مظفر حسین کو اس وقت بادشاہ کی دامادی کا شرف حاصل ہے۔ شاہ قلی خاں محرم اور صادق محمد خاں نے میرزا کے خاندان کا تعاقب کیا اور تھوڑا بہت مال غنیمت چھین کر لوٹ آئے۔

بادشاہ نے اپنے پیچھے سے پہلے راجہ ٹوڈر مل کو قلعہ میں آمد و رفت کے راستوں اور دوسرے حالات کی تحقیق کے لیے روانہ کر دیا تھا اس نے تمام حالات کا جائزہ لے کر بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ قلعہ تھوڑے سے وقت میں باسانی فتح ہو جائے گا۔ اس رپورٹ پر شاہی لشکر۔ ماہ رمضان کو قلعہ پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مورچے لگا دیئے گئے اور حملہ کر کے قلعہ والوں کو بری طرح تنگ کر دیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں اونچے اونچے پستے بنا کر توپچی اور بند توپچی اس غضب کی آتش باری کرنے لگے کہ قلعہ والوں میں سے کسی کو سہراٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ بادشاہ نے دوسری جانب ایک تالاب کے کنارے قیام کیا اور مورچے آگے بڑھا کر پانی کا راستہ بند کر دیا۔ اب قلعہ والے ہر طرح مجبور ہو گئے۔ ہم زبان اور دوسرے محصور امیروں نے ایک طالب علم مولانا نظام الدین کو جو اچھا مقرر تھا امان طلب کرنے کے لیے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ اسے امرار کی سفارش پر باریابی کی اجازت ملی اور بادشاہ نے قلعہ والوں کی درخواست قبول کر لی اور اسے امان کی خوش خبری دے کر رخصت کر دیا۔ قاسم علی خاں بقال اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ وہ قلعہ والوں کو تسلی دلا سادے کہ حضور میں بے آئین دیانت دار محرم بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کے نام لکھ لیں اور قلعہ کے مال و اسباب کو ضبط کر لیں۔ ہم زبان اور اس کے ساتھی جب حاضر کیے گئے تو بادشاہ نے ہم زبان اور اس کے چند ساتھیوں کو جنہوں نے محاصرہ کے دوران نہایت گستاخانہ کلمے کہے تھے تنبیہ و تادیب کی اور ان کو سرکاری کارندوں کے حوالہ کر دیا۔ بقیہ دوسرے اسیروں کو معاف کر دیا۔

یہ فتح ۲۳ ماہ شوال سنہ ۹۸۵ھ کو حاصل ہوئی۔ اس کی تاریخ میں اشرف خاں میر منشی نے یہ قطعہ کہا ہے۔

کشور کشائے اکبر غازی کہ بے سخی جز تیغ و قلاع جاں را کیند نیست

تسخیر کرد قلعہ سورت بہ جملہ این فتح جز باز و بی نیت سعادت

تاریخ فتح شد کہ عجب قلعہ گرفت

ایہا بدولت شہ عالم بعید نیست !

دوسرے دن بادشاہ قلعہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔ اس معائنہ کے دوران چند بڑی بڑی دیگیں اور توپیں ملاحظہ سے گزریں۔ جس وقت سلیمان سلطان خواندگار روم نے گجرات کی بندرگاہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا تو اس نے یہ سامان سمندر کے راستہ روانہ کیا تھا۔ چند وجوہ کی بنا پر اس کی فوج واپس چلی گئی تھی۔



اور اس وقت سے وہ دیگیں سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ جب خداوند خاں نے سورت کا قلعہ نبوایا تو وہ ان میں سے چند دیگیوں کو قلعہ میں اٹھوا لایا تھا۔ جو باہر رہ گئی تھیں۔ انہیں بعد میں جونا گڑھ کے حاکم نے قلعہ میں پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ اس قلعہ میں جب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آگرہ کے قلعہ میں پہنچا دی جائیں چنانچہ وہ وہاں پہنچا دی گئیں۔

**قلعہ سورت کی تعمیر کا سبب** کہتے ہیں خداوند خاں نے یہ قلعہ فرنگیوں کی سرکوبی کے لیے تعمیر کرایا تھا کیوں کہ یہ فرنگی مسلمانوں کو بہت ستانے لگے تھے اور مسلمانوں کے شہروں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ جس وقت قلعہ بننے لگا تھا تو انہوں نے جہازوں پر سے آتش باری کر کے تعمیر کے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ ماہر انجینیروں نے سمندر کے اندر تک قلعہ کی دیواریں پہنچا دیں اور قلعہ کے اطراف میں گہری خندق کھود کر خشکی کے دونوں جانب پتھر چونا اور پکی اینٹوں کی مستحکم دیوار بنادی۔ اس فصیل کے ہر دو پتھروں کے درمیان لوہے کے قلابے لگائے گئے ہیں اور درازوں میں سیسہ بکھلا کر کنکر پتھر جمادیتے ہیں اس دیوار کی بلندی خندق کی چوڑائی کے برابر ہیں گڑھے اور طول ۳۵ گڑھے۔ چاروں دیواروں کا عرض پندرہ گڑھے۔ قلعہ اس قدر بلند اور خوش منظر ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے۔ سمندر کی جانب قلعہ کے جو برج ہیں ان میں فرنگیوں کا خاص طور سے پرتگالیوں کے طرز تعمیر کی طرح جھروکے بنائے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے اس قلعہ کی تعمیر کے وقت بڑی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جنگ پر آمادہ ہو گئے تھے۔ آخر کار وہ مصالحت پر مجبور ہو گئے اور یہ شرط پیش کی کہ سمندر کی جانب جو احاطہ ہے اسے ڈھا دیا جائے تو ہم ایک کثیر رقم دینے کو تیار ہیں۔ خداوند خاں نے اسلامی حیت کی بنا پر انکی پیش کش کو قبول نہ کیا اور ان کی ضد میں اس نے اس حصہ کو بہت جلد مکمل کرادیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کی حکومت قلعج خاں کے لڑکے کو سپرد کی اور اذی قعدہ کو وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس محاصرہ کے دوران چند قابل ذکر واقعات پیش آئے تھے پہلا یہ کہ میرزا شرف الدین حسین جو دس سال سے برابر باغی ہو کر مارا پھرتا تھا ولایت یکلانہ کے راجہ بہار جیو کے ہاتھوں گرفتار ہو کر حضور میں پیش کیا گیا۔ حاضر ہونے میں اس نے بے ادبی اور خود سری کا مظاہرہ کیا اس لیے اسے تنبیہ کر کے شاہی کارندوں کے حوالے کر دیا گیا۔

بہارچ کی منزل میں چنگیز خاں کی والدہ نے بھجار خاں حبشی کے خلاف چنگیز خاں کو ناحق قتل کرنے کے الزام میں استغاثہ کیا

قلعہ بندہ میں مدی صیوی میں پرتگیزیوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ سمندروں پر بڑا اقتدار قائم کر کے بحری تجارت پر قابو رکھا جائے اور ساحلوں پر مقبوضات قائم کیے جائیں۔ سمندر پر انہوں نے کسی حریف کے نہ ہونے کی وجہ سے آسانی اقتدار قائم کر لیا اور بڑے مضبوط بحری بیڑے بنالیے۔ ان کے ابتدائی مرکز ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوا مشرق اقصیٰ میں ملاکلیج فارس پر ہر مرقے۔ ترکوں کے تسلط کی وجہ سے عدن ان کے ہاتھ نہ آ سکا۔ خلیج کبے (کھبایت) میں بھی ان کا جلد ہی عمل دخل ہو گیا۔ کوچین لیبار اور کولمبو بھی ان کی دسترس میں تھے۔ اپنے اس وسیع بحری منصوبہ کے مطابق ضروری تھا کہ ہندوستان کے مغربی ساحل پر ان کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اسی لیے قلعہ سورت کی تعمیر کے خلاف تھے۔ سورت کے قلعہ نے پرتگیزیوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اقتدار کو جہازوں سے ساحل پر اترنے کا موقع نہیں دیا، لیکن یہ قلعہ بندیاں پورب کی اس جہگیر بحری یلغار کا صحیح جواب نہیں تھیں۔ ضرورت تھی کہ شاہان ہند بھی بحری قوت کے فراہم کرنے پر توجہ دیتے۔ لیکن مدت دراز تک کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا۔ اکبر کے عہد میں سمندر پر مامولہ پرتگال کے حق فرماں روائی کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ بھی بحر قزح کو جانے والے جہازوں کے لیے پرتگیزیوں سے اجازت نامہ دیتا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۵۰۵ء میں بیجا پور اور دوسری اسلامی ریاستوں نے گوا کے خلاف مشترکہ کارروائی کی تھی جو دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ہندوستانی سمندریں پرتگیزیوں کا حریف ایک حریف تھا جو لیبار کے بحری قوتوں کا بادشاہ کینل تھا۔ مصلوہیں مدی کے آخر میں اس نے "امیر بحور ہندوستان" کا لقب اختیار کیا اور مدتوں تک پرتگیزیوں کو پریشان رکھا۔

اور قصاص کا مطالبہ کیا۔ اس معاملہ کی تحقیقات کرائی گئی۔ چوں کہ قاتل نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا اس لیے اس کو ہاتھ کے پیر کے نیچے ڈال دیا گیا۔

باغیوں کے مشورے | اسی محاصرہ سورت کے دنوں میں ابراہیم حسین میرزا شکست کھا کر سرنال سے تپن گیا اور وہاں محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا سے جا کر مل گیا اور قلعہ سورت کو بادشاہی فوج سے چھین لینے کے لیے

ان مرزاؤں نے مشورہ کیا۔ طے پایا کہ ابراہیم حسین مرزا ہندوستان جا کر وہاں فتنہ برپا کرے اور محمد حسین مرزا اور شاہ میرزا شیرخان فولادی کے ساتھ مل کر تپن کا محاصرہ کر لیں تاکہ بادشاہ ان کے مقابلہ کے لیے سورت چھوڑ کر احمد آباد آجائیں۔

شیرخان فولادی کی بہادری | حسب قرار داد جب مرزاؤں نے حملہ کیا تو سید احمد خاں بارہ پتن میں محصور ہو گیا اور بڑی دیر سے روٹا رہا۔ اس کی مدد کے لیے قطب الدین محمد خاں مالوہ اور چندیری کے

جاگیرداروں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ رستم خان، عبدالمطلب خان، شیخ محمود بخاری دہلوی وغیرہ بھی احمد آباد سے اعظم خاں کے ساتھ تپن پہنچ گئے۔ مدد پر آنے والی فوج سے مقابلہ کے لیے محمد حسین مرزا، شاہ مرزا اور شیرخان فولادی نے محاصرہ اٹھالیا اور تپن سے

پانچ کوس کے فاصلہ پر پیش قدمی کر کے بادشاہی فوج پر حملہ کر دیا اور ایسی سخت لڑائی کی کہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ انہوں نے بادشاہی ہراول کو اعظم خاں کے سینہ پر دھکیل دیا اور میسرہ کو بھی منتشر کر دیا۔ شاہی امراء نے بھی بڑی ثابت قدمی سے ان کی مدافعت

کی آخر کار میدان بادشاہی لشکر کے ہاتھ رہا اور مخالف فوج منتشر ہو گئی۔ اس وقت لشکر غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ اور خان اعظم چند ہراہیوں کے ساتھ میدان میں ٹھہر گیا۔ شیرخان فولادی ایفون کھاتا تھا، ایفونیوں کو ہمیشہ قبض رہتا ہے۔ جس وقت

جنگ ہو رہی تھی وہ طہارت خانہ چلا گیا تھا اس لیے ایفون کی پنگ اور قبض کی وجہ سے وہ اپنے دو تین ہزار آدمیوں کو لے کر اس وقت پنجاہ کے اس کے ساتھی بھاگ چکے تھے اور میدان خالی پڑا تھا۔ اس نے آتے ہی شیخ محمد بخاری کے دستہ پر حملہ کر دیا۔ شیخ محمد بخاری

نے آخر تک جم کر اس کا مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اعظم خاں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ آوروں کو گھیر لیا اور شیرخان فولادی بھی مجبور ہو کر بھاگ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر مل گیا۔ جب اس سے

پوچھا گیا کہ تم نے اپنے ہی پیرزادہ (شیخ محمد بخاری) کو کیوں شہید کر دیا تو اس نے جواب دیا، ہم نے یہ سنا تھا کہ تمام مغل سرداروں میں شاہ بدراغ خاں اور ایک دوسرا سردار نہایت جم کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ انہیں کے گمان میں ہم نے شیخ محمد پر حملہ کیا اگر ہم کو اس کا یقین

ہوتا کہ وہاں شیخ محمد ہے تو ہرگز اس کے قتل کا ارادہ نہ کرتے۔ اس شکست کے بعد محمد حسین میرزا دکن کی طرف چلا گیا اور شیرخان قلعہ جونا گڑھ میں وہاں کے حاکم امین خاں غوری کی

پناہ میں چلا گیا۔ یہ فتح ۱۸ ماہ رمضان سنہ ۱۰۸۵ء میں حاصل ہوئی۔ اعظم خاں نے سید احمد خاں بارہ پتن کو بدستور سابق قلعہ تپن پر ہی مائل رکھا اور خود سورت میں جا کر باریاب ہوا۔

اختیار الملک حبشی سرکاری محافظوں کی قید سے احمد آباد میں بھاگ گیا تھا اس کی گرفتاری کے لیے قطب الدین محمد خاں اور دوسرے چند امیر مقرر کیے گئے تھے۔ اختیار الملک بھاگ کر باغیوں سے جا ملا اور لڑ بھڑ کر بعض مقامات پر اس نے قبضہ کر لیا۔

امراء شاہی نے اس پر حملہ کر کے اسے وہاں کے قلعوں اور جنگلوں سے بھگادیا اور سارے علاقہ میں بھگانے قائم کر کے محافظ دستے مقرر کر دیے۔

اس انتظام کے بعد یہ لوگ اس وقت جب کہ لشکر سورت سے لوٹ کر محمود آباد پہنچا تھا دربار میں حاضر ہو گئے۔

**گجرات سے واپسی** | آخر ماہ ذی قعدہ میں بادشاہ احمد آباد پہنچے۔ دس دن تک وہاں قیام رہا۔ احمد آباد کی حکومت

کی جاگیر مرحمت ہوئی اور اسے مالوہ کا سارا علاقہ اجیت اور سانگ پور کی حکومت بھی تفویض کی گئی۔ اس انتظام کے بعد بادشاہ عید قربان کے دن احمد آباد سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے محرم ۹۸۱ھ کو اجیر واپس آئے۔ اس اثنا میں سعید خاں کا بیٹا آیا کہ مرزا ابراہیم گرفتار ہوا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اسی سال کی دوسری صفر کو سواری شاہانہ دارالخلافہ پہنچی۔

**ابراہیم حسین مرزا کی شورش** | ابراہیم حسین مرزا کا قصہ یہ ہوا کہ وہ گجرات سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لیے

ب سے پہلے میرٹھ گیا۔ وہاں ایک قافلہ کو جو آگرہ جا رہا تھا لوٹ لیا اور ناکہ باندھا۔ یہاں خان کلاں کا لڑکا فرخ خاں محصور ہو گیا۔ مرزا نے شہر کے باہر بستیوں کو لوٹ لیا اور ایک دن وہاں ٹھہر کر مارا بھول چلا۔

ابھی وہ مارا بھولے میں کوس کے فاصلے پر تھا کہ اتفاق سے رام رائے اور رائے سنگھ جو گجرات کے راستہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیے

گئے تھے تقابلاً ایک ہزار سواروں کے ساتھ جو وہ پور سے یلغار کرتے ہوئے ناگور پہنچے اور فرخ خاں نے ان کے ساتھ میرزا کا تعاقب

کیا اور موضع کنتولی کے نواح میں جا کر کیمپ لگا دیا۔ ان کی آمد پر مرزا وہاں سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس طرف

کو نکل گیا ہے اور کہاں ہے؛ فوج میں جو مسلمان تھے روزہ دار تھے وہ افطار کے ارادہ سے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ میرزا

کچھ دور تک جلنے کے بعد لوٹ آیا اور دوسری ماہ رمضان ۹۸۱ھ کو ان پر شب خون مارا اور طرف سے ان پر تیر بربانے شروع

کر دیئے۔ ان لوگوں نے بھی ڈھالیں سنبھال لیں اور جہم کر مقابلہ کیا۔ مرزا کے ساتھ سات سو سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ جب بادشاہی

دستہ نے دلیری سے حملہ کیا تو یہ مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہو گئے۔ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اندھیری رات میں اس کی فوج

قربوں اور دیہاتوں میں منتشر ہو گئی اور اس کے سپاہی جگہ جگہ گرفتار اور مقتول ہو گئے۔ ان میں سے ایک سو سپاہی فرخ خاں کے

ہاتھوں گرفتار ہوئے اور تہ تیغ کر دیئے گئے۔ بعض زخمی ہو کر بہ مشکل مرزا سے جا کر مل گئے۔ مرزا نے تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ مار کرتے

ہوئے گنگا اور جہنا کو عبور کیا اور اپنی سابقہ جاگیر پر گئے اعظم پور پہنچ گیا۔ اب اس نے سوچا اگر میں سنبھل کے قلعہ میں جس کے عقب میں

کماؤں کا پھاڑ ہے اور آگے گنگا جیسی خندق ہے چلا جاؤں اور وہاں ایک فوج فراہم کر لوں تو بہت سے لوگ میرے جھنڈے کے

لے آجیں۔ سپراندی کے کنارے یہ شہر قبل مسیح سے آباد چلا آرہا ہے۔ پہلے یہ مالوہ کے راجاؤں کا پایہ تخت تھا راجا بکرماجیت کا یہی دارالخلافہ تھا اس کا

قدیم نام اوت کا پوری ہے۔ اس کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے اور ہندوؤں کے سات مشہور تیرتھوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ شمس الدین التمش نے ۱۱۹۲ء

میں اسے پہلی بار فتح کیا تھا۔ یہاں کے حکمرانوں نے شہر مانڈو کو پایہ تخت بنالیا۔ اکبر کے زمانہ میں یہ دہلی کا صوبہ بن گیا۔ تیرھویں صدی میں یہ مہاداجی سندھیا

دولت راؤ سندھیا مرہٹوں کے قبضہ میں رہا۔ اب یہ ایک معمولی قصبہ ہے جس کی آبادی انگریزی صدی میں ۳۵ ہزار سے زیادہ نہیں رہی۔ ایک دروازہ

”چوہن کھنیا“ نام کا ہے مشہور ہے کہ اسے راجہ بکرماجیت نے بنایا تھا۔ برہمنوں کی روایت ہے کہ اس عمارت میں ۶۴ جوگی رہتے تھے۔ جو ہر روز ایک شخص کو

راجہ بنا کر شام میں اس کا خون پی پیتے تھے بکرماجیت نے ان جوگیوں کو قتل کرادیا۔ اس کی یادگار میں اس جگہ دسہرا اور اشٹمی کے دن بھگوت کا بڑا میلہ لگتا ہے

ایک قدیم مندر مہاکال مہادیو کا مندر ہے۔ یہ بھی بکرماجیت کی یادگار ہے۔ اسے التمش نے گرا دیا تھا موجودہ مندر بعد کی تعمیر ہے۔ اس کے علاوہ سپراندی کے گھاٹ

سانی کا باغ، بھرتری کا گنجا، کالیادہ کا محل، بے نیوکی مسجد جامع مسجد مشہور مقامات ہیں۔

نیچے جمع ہو جائیں گے لیکن اس کا یہ خیال بس خیال ہی رہا کیوں کہ بادشاہی امیروں نے ہر طرف سے اس کے راستے روک دیئے تھے۔

**راجہ اولیسر سے لڑائی** | امدادی قاسم خان ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خاں اپنی جاگیر کانت وکولہ میں بدایوں اور پیتالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبد اللہ سلطان پوری اور راجہ ہارمل نے جو دکیل اور وزیر مطلق تھے فتح پور سے اسکے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دو جگہ شکست کھا کر دہلی کے نواح میں آیا ہوا ہے اور پائے تخت بالکل خالی پڑا ہے۔ اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب طلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ موضع اودھ سے کوچ کر رہا تھا پر گنہ جلیبیہ سے اسکے پاس خبر آئی کہ راجہ اولیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر تک آگرہ کے نواح میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے۔ بادشاہی امراء کے خلاف فوج کشی کر دی ہے اور مردانہ وار حملہ کر کے بعض بھادریہ تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر دیا ہے اور اب وہ پر گنہ جلیبیہ میں موضع نور اہی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔

**خونناک حملہ** | ماہ رمضان کی پندرہویں دوپہر کو جبکہ اکثر لوگ روزہ سے متفرق ہو کر راستے طے کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ اولیسر نے گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھوا کر چائیں بنالی تمقیں، وہاں سے اس نے شاہی رسالہ پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کر دی۔ اس اچانک حملہ سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے۔ ایک گولی حسین خاں کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زمین پر سے جھک کر گھوڑے کی گردن پر ضعف کے مارے بے ہوش ہو گیا۔ وہ گر پڑا لیکن بڑے حوصلہ سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ اس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم تک نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزہ کی وجہ سے غشی ہو گئی ہے۔ میں نے اسکے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھاڑ سے پناہ مل جائے۔ اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ جھٹکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑوں سے اتر آنے کا حکم دیا۔ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہو گئے۔ اسکے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ انکی گنتی مجال تھی آخر کار اسلام کی برکت سے ان مٹھی بھر غازیوں کو شام ہوتے دشمن پر فتح حاصل ہو گئی اور کافر گروہ در گروہ مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے روتے روتے سپاہیوں کے بازو ایسے شل ہو گئے تھے کہ تلوار مارنے اور تیر چھوڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس گھنے جنگل میں کچھ اس طرح اتر دام ہو گیا تھا کہ دونوں فریق بھڑ گئے تھے اور دوست و دشمن میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ کمزوری اور ضعف کے مارے سپاہیوں میں شناخت و تمیز کا یارا نہ رہا تھا۔ بعض خدا کے ایسے بندے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزہ کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ میں اتنی برداشت نہیں تھی۔ چنانچہ جب میں بالکل ہی بے طاقت ہو گیا تو میں نے ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کر لیا۔ بعض تو پانی نہ ملنے کے سبب پیاس سے مر گئے۔

**حسین خاں کی فوج کشی** | اس فتح کے بعد حسین خاں نے کانت وکولہ کا رخ کیا اور ان مقامات پر جنگی استحکامات میں لائے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبلی سے پندرہ کوس پر کھنڈ کے پرگنہ میں پہنچا ہوا تھا حسین خاں باوجود زخمی ہونے کے پاکی میں سوار ہو کر میرزا کے مقابلہ پر بانس بریل پہنچ گیا۔ مرزا حسین خاں کی بھادری سے بخوبی واقف تھا



اور جانتا تھا کہ اس سے لڑکر وہ کسی حال بھی سرخرو نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ امر وہہ کے راستہ لوٹ گیا۔ لکھنؤ کے نواح میں ہمارے اور اس کے لشکر کے درمیان سات کوس کا فاصلہ تھا۔ اگر اس وقت مقابلہ ہو جاتا تو اس صورت میں جب کہ حسین خاں زخمی تھا نہ معلوم کیا نتیجہ برآمد ہوتا۔ مرزا سے اس موقع پر بڑی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اس حال میں کہ حسین خاں کے لشکر کا نظام درہم برہم تھا اس پر حملہ نہ کیا۔

**امرائے سنبل سے مشورے** | سنبل کے قلعہ میں وہاں کا حاکم معین الدین خاں فرخودی اور دوسرے جاگیردار امرا ایک بڑی فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گئے تھے۔ جب آدمی رات کو انہوں نے حسین خاں

کے تقارہ کی آواز سنی تو یہ سمجھ کر کہ مرزا ابراہیم حسین نے حملہ کر دیا ہے بدحواس ہو گئے۔ جب لوگوں نے قلعہ کے نیچے جا کر آواز دی کہ حسین خاں مدد کے لیے آہنچا ہے تو اس وقت کہیں جا کر دم میں دم آیا۔ اور لوگ استقبال کے لیے دوڑے۔ دوسرے دن سب امیر شیخ الاسلام فتح پوری کے خلیفہ شیخ فتح اللہ ترین کے مکان پر جمع ہوئے اور طے پایا کہ سب لوگ گنگا کے کنارے تو لک خاں قوچن بگ نو دین خاں، رحمان قلی خاں، کاکر علی خاں اور دہلی کے ان تمام امیروں سے جا کر ملیں جو مرزا سے مقابلہ کے لیے گنگا کے کنارے آہار کے پرگنہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے پائے اس پر عمل کیا جائے۔ اس موقع پر حسین خاں نے کہا خدا کی شان یہاں مرزا چند گنتی کے سواروں کے ساتھ پہنچا ہے اور سنبل کے قلعہ میں تمہاری تعداد اس کے مقابلے میں دگنی تگنی ہے پھر تم میں میں تمہیں کے قریب قدیم تجربہ کار امیر اور سردار موجود ہیں اور تم لوگ مرزا سے ڈر کر آہار کے قلعہ میں جو ایک چوہے دان کی طرح ہے جا کر چھپنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مرزا دیر ہو کر سارے حدود سرکار میں افراتفری پھیلا دے گا۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں یا تو تم لوگ گنگا کو عبور کر کے ان چند پرانے قلعوں پر جو مرزا کے راستہ میں ہیں قبضہ کر لو اور اسے گنگا عبور کرنے نہ دو اور میں اس کے عقب سے پیش قدمی کرتا ہوں پھر جو بھی ہو گا سامنے آجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے پہلے گنگا پار کر کے اس کا راستہ روک دیتا ہوں اور تم پیچھے سے حملہ کرو۔ میں وفاداری کا یہی تقاضا ہے۔ حسین خاں کے اس دیرانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا۔ مجبوراً حسین خاں ان سواروں کو لے کر جو اس کے ساتھ تھے آہار کے امیروں کے پاس چلا گیا اور ان کو بھی اس نے اس چھوٹے سے قلعہ میں آکر بند ہو جانے پر سخت لعنت ملامت کی اور ان کے سامنے بھی اپنی وہی تجویز رکھی اور کہا کہ اس وقت غنیم حدود سرکار کے وسط میں اس طرح آگیا ہے جس طرح کوئی خرگوش لشکر کے درمیان گھر جائے۔ اگر ہم تیزی سے نقل و حرکت کریں تو اس ہم کو سر کر سکتے ہیں۔ اور اس کو زندہ گرفتار کر سکتے ہیں اور اس فتح کا سہرا لارنا ہمارے ہی سر پہے گا۔ شکاریوں نے جواب دیا کہ ہم مخدوم الملک اور راجہ بہارل کے حکم کے مطابق مرزا کو دہلی کے نواح سے بھاگ کر سنبل تک لے آئے ہیں اب یہاں سے ساری ذمہ داری سنبل کے صوبہ دار معین الدین احمد خاں اور اس علاقہ کے جاگیرداروں کی ہے ہمیں تو صرف دہلی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے مرزا سے جنگ کرنے کا نہیں۔

**مرزا کا لگاتار تعاقب** | اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امر وہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کر دیا اور اب وہ گنگا عبور کر کے لاہور کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ حسین خاں نے جب امیروں کو اس طرح ٹال مٹول کرتے دیکھا تو فوراً

ہی ان سے الگ ہو گیا اور یلغار کرتے ہوئے گڑھ مکتیسر پہنچ گیا تاکہ مرزا کو بغیر مقابلہ کیے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ بادشاہی امیروں میں ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ ہی ایسے امیر تھے جنہوں نے حسین خاں کا ساتھ دیا تھا لیکن جب وہ اس منزل پر پہنچا تو آہار کے امیروں نے



نخط بھیجا کہ تم جلد سی نہ کرو ہم بھی تمہارے ساتھ آرہے ہیں چنانچہ وہ سب طوعاً و کرہاً وہاں آکر حسین خاں سے مل گئے۔ لیکن ان کا یہ حال تھا کہ دیکھنے میں تو اچھی خاصی جمعیت تھی لیکن ان کے دل اندر ہی اندر پھٹے ہوئے تھے۔ ادھر مرزا بساط خالی پا کر بڑی بے خوں سے اپنا مہرہ آگے بڑھائے جا رہا تھا اور راستہ میں جو بھی شہر پر تانتا تھا اسے برسی طرح لوٹ لیتا تھا۔ چنانچہ سننے میں آیا کہ اس نے پائل کے قصبہ میں مسلمان گھرانوں کو برسی طرح تاخت و تاراج کر دیا اور اس قصبہ میں بارہ کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی دوسرے شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ حسین خاں مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ یہ سب آگے پیچھے سر ہند جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر تو دوسرے تمام امیروں نے اپنے خیمے لگا دیئے اور ٹھہر گئے لیکن حسین خاں بھلا کہاں رکنے والا تھا وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جو پورے سو بھی نہیں تھے مذکورہ دو امراء کے ساتھ سر ہند سے یلغار کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں خبر ملی کہ مرزا لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہاں کے لوگ قلعہ بند ہو گئے ہیں۔

مرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ و جہنی تک جا پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خاں نگر کوٹ اور قلعہ کانگرہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا۔ جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے مصالحت کر لی اور نگر کوٹ والوں سے پانچ من سوتا اور بادشاہی خطبہ پڑھنے کی شرط پر صلح کر لی اور وہاں سے میرزا یوسف خاں عدلی کے غلام فتو مسند عالی اسماعیل قلی خاں راجہ بیربر اور دوسرے امیروں کے ہمراہ مرزا کے تعاقب میں یلغار کرتے ہوئے سکرہ پہنچ گیا۔

**شیخ داؤد قادری جہنی وال** | حسین خاں دیوانہ سہی لیکن وہ ان تمام احمقوں سے زیادہ عقل مند تھا۔ اس کو جب حسین قلی خاں کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے قسم کھالی کہ جب تک میں حسین قلی خاں سے جا کر مل نہ لوں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا چنانچہ اس نے وہاں سے کوچ کیا تلونڈی کے راستہ میں دریائے بیابہ (بیاس) کو عبور کیا اور یلغار کرتے ہوئے شیر گڑھ میں جہنی کے قریب پہنچا۔ وہاں اس نے حضرت غوث قطب الاقطاب شیخ داؤد قادری جہنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب محفل میں دستر بچھایا گیا تو حسین خاں نے اپنی قسم کا حوالہ دے کر کھانے سے معذرت چاہی حضرت نے فرمایا ”قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دکھانا بڑی نادانی ہے۔“ خان نے اسی وقت ایک غلام کو آزاد کر کے کفارہ دیا اور کھانا تناول کیا اور حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ وہ رات اس نے اسی جگہ بسر کی اس وقت اس کے سارے لشکر کی معافی حضرت کے لشکر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھانس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خاں نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے اور سنے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا میں نے اس سلسلہ میں فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:۔

اے منزہ نسبت ایجاد تو از ماروین      ذات پاک چوں پیر رحمتہ للعالمین  
ہست اسم اعظم داؤد از تاثیر آن      چوں سلیمان جن و انس مدد ترا زیر نگین

ثمَّ وَجَّهَ اللّٰهُ یٰقِیْنِ مِنْ نَحْنِ شِدِّ سَالِہَا  
رَوْنِے تُو دِیْدِم عِیَاں شِدِّ نَکْتِہٖ عِیْنِ یٰقِیْنِ

میرا تو ارادہ ہو گیا تھا کہ میں ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ کی جاوے کشتی اختیار کر لوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا "بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ" مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا۔ خانقاہ سے ملنے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چٹخیں نکل گئیں۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے باوجود اس معمول کے کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی۔

میرزا ابراہیم کا فرار

میرزا ابراہیم کا فرار

حسین خاں ازبک جب طلبہ کی منزل پر پہنچا تو اس نے حسین قلی خاں کے نام خط بھیجا کہ چونکہ میں چار سو کوس سے یلغار کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں اگر آپ مجھے بھی اس فتح میں شامل کریں۔ اور ایک دن رات میں توقف کریں تو یہ آپ کی محبت سے بعید نہیں ہے۔ حسین قلی خاں نے خوش آمدید کہا اور اس کے جلودار کو رخصت کر دیا۔ لیکن وہ اسی دن تیزی سے طلبہ کے قصبہ کے باہر ملتان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت میرزا اس کے حملہ سے بے خبر تھا اور شکار پر گیا ہوا تھا۔ مرزا کے کچھ آدمی تو کوچ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور بعض ادھر ادھر منتشر تھے۔ اس حال میں حسین قلی خاں نے ان پر حملہ کر دیا اور مرزا کے آدمی صف بندی نہ کر سکے۔ میرزا کے چھوٹے بھائی مسعود حسین مرزا نے آگے بڑھ کر حسین قلی خاں کی فوج پر حملہ کیا لیکن ناہموار زمین پر اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اسے اسی وقت گرفتار کر لیا گیا۔ جب مرزا ابراہیم حسین شکار سے لوٹ کر آیا تو سارا معاملہ چوٹ ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور دیرانہ حملے کیے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً باگ پھیر کر فرار ہو گیا۔ فتح کے دوسرے دن طلبہ سے حسین خاں اپنے اسی نوے سواروں کو دیے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے پہنچا۔ حسین قلی خاں نے جنگ کی ساری تفصیل اسے بتائی اور جس نے جو کچھ کارنامے انجام دیئے ایک ایک کر کے سنائے۔ حسین خاں نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن دشمن زندہ بچ کر نکل گیا تم کو اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو ہم ادھوری ہی رہے گی۔ حسین قلی خاں نے جواب دیا ہم نگر کوٹ سے مسلسل یلغار کرتے ہوئے آئے ہیں۔ اور لوہستان پر ہمارے لشکریوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے۔ اور اب ساری فوج تھکی ہوئی ہے۔ چونکہ یہ فتح ہر حیثیت سے مکمل فتح تھی اس لیے ہم نے مزید اقدام نہ کیا۔ اب دوسرے حوصلہ آزمائی کریں ان کی باری ہے۔

میرزا ابراہیم کی گرفتاری

حسین خاں نے اس امید میں کہ اس کی پانسو کوس کی مسلسل دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ جائے اور کامیابی کا سہرا سر بند ہے۔ حسین قلی خاں سے رخصت ہو کر آگے کوچ کر دیا۔ جو لوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے ان کو اس نے ہاتھی اور نقارہ کے ساتھ لاہور واپس بھیج دیا اور اپنے ساتھ ایک مختصر سی جمعیت لے کر مرزا کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کے اور مرزا کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ایک رات مرزا نے اپنے چار سو سواروں کے ساتھ بیاس اور ستلج کے سنگم پر قیام کیا۔ اس وقت چہل قوم کے آدمیوں نے جو ملتان کی پس ماندہ رعیت ہیں ان پر شیخون مارا اور تیر برسوں کے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ جن میں سے بعض زخمی اور پانچ ہو چکے تھے اور بڑی طرح تھکے ہوئے تھے اس قوم سے مقابلہ کیا۔ لیکن چہل اس پر غالب آ گئے۔ اسی دوران میں ایک تیر مرزا کی گدی میں لگا اور منہ کو پھاڑتا ہوا نکل گیا۔ جب معاملہ اُلٹ گیا تو اس کے آدمی مرزا کو

چھوڑ کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ لیکن وہ جہاں بھی گئے موت سایہ کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی۔ میرزا کو ا کے دو قدیم غلاموں نے فوراً ہی ہی قلندروں کا لباس پہنا دیا اور ایک طرف کو لے کر چلے گئے۔ مرزا نہایت کمزور ہو گیا تھا، اس لیے وہ اسے لے کر ایک گوشہ نشین درویش شیخ زکریا کے ٹھکانے پر رات گزارنے کے لیے پہنچے۔ شیخ نے بہ ظاہر بڑی مہربانی کا سلوک کیا۔ لیکن خفیہ طور پر ملتان میں سعید خاں کے پاس اس کی اطلاع بھیج دی۔ ع

ہر کجا گوشہ نشینی است رو مکرے بہت

سعید خاں نے اپنے غلام دولت خاں نامی کو اسے گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اور بادشاہ کے پاس اس گرفتاری کی اطلاع ایک عریضہ کے ذریعہ بھیجی جو بادشاہ کو گجرات سے اجیر کو واپسی کے وقت ملی۔

حسین خاں کو جب مرزا کی گرفتاری کی خبر ملی تو وہ ملتان پہنچا اور سعید خاں سے ملاقات کی۔ اس نے مرزا سے ملنے کے لیے کہا تو حسین خاں نے کہا اگر ملاقات کے وقت میں تسلیات بجا لاؤں تو بادشاہ کی وفاداری کے خلاف ہو گا اگر ایسا نہ کروں تو مروت کے خلاف کہ مرزا دل میں کہے گا اس قلعی کو دیکھو کہ ستو اس کے محاصرہ میں امان پانے پر تو اس نے جھک جھک کے سلام کیے تھے اور اب جب کہ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بے نیازی دکھا رہا ہے۔ جب مرزا کو اس کی بے تکلفانہ گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا ”وہ آئے اور بغیر تسلیات کے کلام کرے اس کو سب کچھ معاف ہے۔“ غرض حسین خاں ملنے کے لیے گیا اور باوجود اجازت کے وہ تسلیات بجا لایا۔ مرزا نے اس سے افسوس کرتے ہوئے کہا ”ہم بغاوت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب جان پر ہی گئی تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لیکر ایک غیر ملک میں چلے گئے وہاں بھی ہمیں چلی سے رہنے نہ دیا گیا، تقدیر میں بہر حال یہ شکست لکھی تھی، لیکن کاش ہم تیرے ہاتھوں شکست کھاتے کہ تو بہر حال انہوں میں سے ہے لیکن یہ ذلت حسین قلی خاں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی جو دین و مذہب کے اعتبار سے غیر ہے۔“ حسین خاں اس ملاقات کے بعد اپنی جاگیر کانت و کولہ کو واپس چلا گیا اور مرزا اسی قید میں کچھ عرصہ بعد زندگی کے بندھنوں سے رہا ہو گیا۔ کانت و کولہ سے حسین خاں دربار شاہی میں حاضر ہوا اور پنجاب سے حسین قلی خاں، مسعود حسین مرزا کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے اسیران جنگ کے ساتھ فتح پور میں لایا۔ یہ اسیر تین سو کی تعداد میں تھے، انکے منہ پر گدھے سو را اور کتوں کی کھال کی پٹیاں باندھ کر حضور میں لایا گیا تھا۔ ان میں سے چند کو طرح طرح کی عتوبتوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ میرزا کے تقریباً ایک سو سرداروں نے جن کو خان کا خطاب حاصل تھا، شکست کے بعد ملتان کے راستہ میں حسین خاں کے پاس مان کی درخواست کی تھی۔ حسین خاں ان سب کو اپنے پرگنوں پر لے کر چلا گیا تھا، پھر اس نے ان کو اپنے گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ حسین قلی خاں نے ان لوگوں کا بادشاہ کے سامنے ذکر چھیر دیا۔ حسین خاں نے فوراً کہا چونکہ اسیروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اس لیے میں نے اس جماعت کو بادشاہ پر تصدق کر کے چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے اس بات کو درگزر کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ کی۔ انہی دنوں سعید خاں ملتان سے میرزا ابراہیم حسین کے سر کو جسے مرنے کے بعد جسم سے جدا کر دیا گیا تھا لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کا سر ملاحظہ میں پیش کیا۔

ہر آں خاکے کہ آرد تند بادی      فریدونی بود یا کی قبادی  
خوش آید ایں کشاورزی نمود      فریدوں کشتن و خاتان درود

شاہ میں حسین قلی خاں نے نگر کوٹ کا قلعہ فتح کر لیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے برہمنوں مسخروں  
**راجہ بیربر کی قدر و منزلت** | اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بڑی موانست اور ربط و ضبط تھا۔ چنانچہ تخت نشینی

کے آغاز میں ایک بھکاری برہمن برہمداس نامی جو مسخرا اور کبت گو تھا اور ہندوؤں کی مداحی کر کے زندگی بسر کیا کرتا تھا، کاپی سے بادشاہ  
 کی خدمت میں آیا۔ یہ شخص چونکہ کافی چالاک اور ہوشیار تھا بادشاہ کا مزاج بھی اس سے ملتا تھا اس لیے بہت جلد اچھے مناسب پر پہنچ گیا اور  
 بادشاہ کا ندیم خاص بن گیا۔ پہلے اسے کبائے یعنی ملک الشعراء کا خطاب ملا بعد میں راجہ بیربر یعنی نامور بہادر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

جب اکبر نگر کوٹ کے حاکم راجہ جے چند سے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ناراض ہوا اور اسے قید کر دیا تو اس نے نگر کوٹ  
 کا قلعہ راجہ بیربر کو جاگیر میں دے دیا اور لاہور کے حاکم حسین قلی خاں کو فرمان لکھا کہ نگر کوٹ پر قبضہ کر کے اسے راجہ بیربر کے حوالہ کر دیا  
 جائے۔ حسب فرمان حسین قلی خاں نے پنجاب کے تمام امیروں میرزا یوسف خاں قزاق خاں کے لڑکے جعفر خاں اور فتو مسند عالی وغیرہ  
 کو ساتھ لے کر نگر کوٹ کی طرف کوچ کیا اور پہلے دھیری گواپار اور کوتلہ کو جو نہایت بلند قلعہ ہے بزور شمشیر فتح کر لیا اور ملحقہ  
 سارے علاقہ پر قبضہ کر کے وہاں محافظ مقرر کر دیئے۔

**نگر کوٹ پر حملہ** | ان قلعوں کی فتح کے بعد حسین قلی خاں نے ایک دشوار گزار راستہ سے نگر کوٹ پر فوج کشی کی۔ اس راستہ کو  
 میں نے بھی مشاہدہ میں دیکھا ہے جب کہ میں نگر کوٹ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ بلاشبہ یہ راستہ اس قدر خراب اور

دشوار ہے کہ اگر کہا جائے کہ اس پر چڑھتے ہوئی چیونٹی کے پیر بھی پھسل جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خان نے اس راستہ سے ہاتھی  
 گھوڑے اونٹ، ساز و سامان، بڑی بڑی توپیں اور دیگیں اور چڑھائیں اور قلعہ کا نگردہ کا محاصرہ کر لیا۔

جے چند کا لڑکا بدھی چند یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ قید میں مر چکا ہے قلعہ بند ہو گیا۔ نگر کوٹ کا مندر شہر کے باہر واقع ہے۔ یہ  
 ہندوؤں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے۔ چنانچہ دور دراز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو تہوار کے دنوں میں وہاں جمع ہو جاتے  
 ہیں اور ڈھیروں سونار و پیسہ کپڑے اور دوسری قیمتی اور نفیس چیزیں وہاں چڑھانے کے لیے لاتے ہیں۔ حسین قلی خاں نے پہلے ہی

لے راجہ بیربر: اصل نام میش داس یا برہمداس اس کا باپ کالی داس مادھو رام چوہدرے کا برہمن تھا۔ بیربر کا ایک بھائی موہن رائے چھوٹی عمر میں گنگا میں ڈوب کر مر  
 گیا۔ دوسرا بھائی گنگا رائے سادھو بن کر نیپال کے جنگوں میں چلا گیا تھا۔ تیوبہر میں اس کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ بڑی عسرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حسن اتفاق سے راجہ  
 کا بھیر کے ایک درباری مہاراجہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی۔ ہمیں کافی مال و دولت ملا اور بیربر کے دن پھر گئے۔ اسی رشتہ کی بنا پر اس کی مہاراجہ کا بھیر کے دربار میں سائی  
 ہو گئی اور وہ اشوک ستانے کبت پڑھنے پر مامور ہو گیا۔ اکبر کے دربار میں پہنچنے کے بعد اس کو برادر عروج حاصل ہوا۔ بیربر کے لطیفے اور پسلیاں بہت مشہور ہیں۔ ایک پسلی

من نرم ہیا، کنور گلک جانک سنسار بیربر میں کھبت ہوں سمجھت نہیں گنوار

یہ پسلی بیربر کے دانے کے متعلق ہے۔ بیربر اکبر کے نوادہوں میں شامل تھا اور اس کا لقب مصاحب دانشور تھا۔ راگ راگنی میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جب  
 پٹنار کے مغرب میں عدم آباد کے پٹانوں پر ہم بھی گئی تو بیربر بھی اس ہم کے ساتھ گیا اور اپنی بے تدبیری کی وجہ سے ان گھائیوں میں مارا گیا۔ اکبر کو اس کی موت کا بڑا  
 رنج ہوا۔ بیربر کی وفات سن ۱۵۹۹ء میں ہوئی۔ اکبر نامہ اور اتہال نامہ جہانگیری میں اس کے دو لڑکوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک ہرمز رائے تھا جو خدمت شاہی میں رہتا تھا  
 مظاہر میں وہ شہزادہ دانیال کی خدمت میں آگیا۔ دانیال اسے بیربر ثانی کہا کرتا تھا۔

بڑے بچے کا نام لادہ تھا۔ سن ۱۵۹۹ء میں ملائیت چھوڑ کر گنگا کے کنارے وہ سادھو بن گیا۔ لوگوں میں بیربر اور ملا و پیازہ کے لطیفے بڑے مشہور ہیں۔ لیکن یہ سب فرضی ہیں۔  
 ان کی کوئی اصل نہیں۔

حملہ میں اس مندر کو فتح کر لیا اور بہت سے پہاڑیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مندر کے گنبد پر سونے کا ایک چتر چڑھا ہوا ہے۔ اسے لشکریوں نے تیر بار مار کر چیلنی کر دیا۔ اب تک وہ تیر اس چتر میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو کالی گائیں اس بت خانے کے نام پر چھوڑی ہوئی تھیں۔ ہندو گائے کی بڑی تعظیم کرتے اور پرستش کرتے ہیں۔ اس بت خانہ کو انہوں نے دارالامان سمجھ کر یہ گائیں وہاں چھوڑ رکھی تھیں۔ مسلمانوں نے ان گایوں کو ذبح کر دیا اور عین تیروں کی بارش میں ان گایوں کے خون کو اپنے موزوں میں بھر کر دینی حیت اور تعصب کی وجہ سے مندر کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ اس معرکہ میں مندر کے برہمن اور مجاور تو اتنے مارے گئے کہ شمار سے باہر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بابیگانے تمام ہندو سیر کو جو بزم خود ہندوؤں کا پیر بنا ہوا تھا بڑی لعنت و ملامت کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ آفت اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

شاہی لشکر نے بیرونی شہر قبضہ کر لیا اور اونچے اونچے محلے بنا کر بڑی توپوں سے راجہ بدھی چند کے محل پر گولے برسائے شروع کر دیئے۔ گولہ باری سے تقریباً اسی آدمی ہلاک ہو گئے۔ بدھی چند اس ہلاکت سے بمشکل بچ سکا۔ پھر اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ میرزا ابراہیم حسین کی بغاوت کی خبر ملی کہ وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ علاوہ ازیں حسین قلی خاں کے لشکری بہت تنگ دست ہو چکے تھے۔ انہی وجہ سے خان نے صلح کی پیش کش کو منظور کر لیا اور اکبری وزن کے مطابق پانچ من سونا جو اس مندر کی ایک سال کی آمدنی کے مساوی ہے اور بہت سے قیمتی کپڑے اور ہر جنس کی نفیس چیزیں نذرانہ میں وصول کر کے محاصرہ اٹھایا۔ اسی سال ماہ شوال میں اکبر کے نام کا خطبہ و سکہ اس علاقہ میں جاری ہوا اور راجہ جے چند کے دروازے پر ایک بلند مسجد کے محراب کو تعمیر کرایا گیا اس کے بعد ہی حسین قلی خاں میرزاؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

جب وہ چماری کے قصبہ میں پہنچا تو مشہور بزرگ خواجہ عبدالشہید بنیرہ خواجہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ نے اسے فتح کی بشارت دی اور اپنا خاص کپڑا بھی عنایت فرمایا یہ اسی دنیا کی تاثیر تھی کہ "یلغار کرتے ہوئے قصبہ ظنہ میں پہنچا اور باغی مرزا پر فتح پائی جس کی تفصیل ہم لکھ آئے ہیں۔"

سخت آزر وہ دلائیم اثر خواہد کرد در حق ہر کہ با خلاص مائے بکنیم  
حاکم بنگالہ کا انتقال  
سلیمان کرانی بنگالہ کا حاکم جس نے اپنا خطاب "حضرت اعلیٰ" رکھا تھا۔ کافروں کے مرکز کنگ اور بنارس کو فتح کیا تھا، جگنا تھ کو دارالاسلام بنا دیا تھا اور کامروے اڑیہ تک کا علاقہ اس کی عمارت میں تھا۔ اسی سال فوت ہو گیا۔ اس کا لڑکا بایزید اس کی جگہ تخت پر بیٹھا۔ لیکن پانچ چھ مہینے کے اندر ہی پٹھانوں نے اسے قتل کر دیا۔ اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد بن سلیمان اس علاقہ پر قابض ہو گیا۔

اسی سال مشہور بزرگ شیخ نظام الدین انبیشی نے وصال فرمایا۔ ان کا کچھ تذکرہ مشائخین کے سلسلہ میں ہم آگے کریں گے۔  
گجرات پر دوسرا حملہ  
سلسلہ میں بادشاہ نے گجرات کی شورشوں کو دبانے کے لیے دوبارہ سفر کیا۔ یہ سفر بادشاہ نے سائنڈی پر سوار ہو کر کیا۔ نو دن میں وہ یلغار کرتے ہوئے فتح پور سے احمد آباد پہنچ گئے اور اس گروہ سے جس نے اعظم خاں کو محصور کر رکھا تھا سخت لڑائی رد کرنا شروع و مظفر جلد ہی دارالخلافہ واپس تشریف لے آئے۔

گجرات جانے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے جب گجرات کو پہلی مرتبہ فتح کیا تھا تو احمد آباد خان اعظم کے سپرد کر دیا تھا۔ بادشاہی لشکر



کی واپسی کے بعد وہاں ہر مقام پر سرکشتوں نے فتنہ و فساد مچانا شروع کیا یہاں تک کہ اختیارالملک گجراتی نے حبشیوں کی جمعیت فراہم کر کے احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ محمد حسین مرزا بھی دکن سے لوٹ کر آگیا تھا اور سورت کو فتح ک لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ چونکہ تلچ خاں سورت میں قلعہ بند ہو گیا تھا اس لیے اس نے کھنڈیت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اعظم خاں نے اختیارالملک کے خلاف فوج کشی کی۔ دونوں فریقوں میں احمد نگر اور ایدر کے درمیان کئی ایک لڑائیاں ہوئیں۔ اعظم خاں نے قطب الدین محمد خاں کے لڑکے نورنگ خاں کو سید حامد کے ہمراہ محمد حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے کھنڈیت کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج سے محمد حسین مرزا کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اس نے پوری بہادری اور مردانگی سے غنیم پر حملے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آخر وہ شکست کھا کر اختیار خاں کے پاس چلا گیا۔ شیر خاں فولادی کے لڑکے جھجار خاں حبشی کا لڑکا بھی اس سے آکر مل گیا تھا۔ اس لیے اختیار خاں کی فوجی طاقت بڑھ گئی اور اعظم خاں کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ سب ایک دوسرے رات سے یلغار کر کے احمد آباد پہنچا چاہتے تھے لیکن اعظم خاں تیزی سے کوچ کر کے احمد آباد پہنچ گیا اور بھروچ سے قطب الدین احمد خاں کو بھی بلایا۔ چونکہ اس کو اپنے بعض آدمیوں پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لیے وہ احمد آباد میں قلعہ بند ہو گیا۔ گجرات کے تمام باغی بیس ہزار کا لشکر لے کر جس میں مغل، گجراتی، پٹھان، حبشی اور راجپوت شامل تھے احمد آباد پہنچے اور اس کا محاصرہ کر لیا ہر روز دونوں طرف سے سخت لڑائی ہو رہی تھی۔ خان کلاں کا لڑکا فاضل محمد خاں اسی معرکہ میں مارا گیا۔ خان اعظم ہر روز جنگی صورت حال لکھ کر دربار میں بھیج رہا تھا۔ اور اس نے متعدد عریضے بادشاہ کی تشریف آوری کے لیے لکھے۔

بادشاہ نے دیوانی کے عمال کو حکم دیا کہ ان امیروں کے لیے جو گجرات کی پہلی مہم میں شامل نہیں تھے اس مہم کا ساز و سامان فراہم کر دیں اور ان جنگجو سپاہیوں کو جنہوں نے گزشتہ پورا سال سفر کی زحمتوں میں گزارا تھا اور خستہ حال ہو رہے تھے نقد روپیہ ادا کریں۔ پھر بادشاہ نے حسین قلی خاں کو خان جہاں کا خطاب عطا کیا اور اسے پنجاب کے امیروں کے ساتھ اسی صوبہ پر اور سعید خاں کو ملتان پر متعین کر دیا اور شجاعت خاں کو پیش خیمہ کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دیا

**اونٹنیوں پر بادشاہی یلغار** | بادشاہ بتاريخ ۲۴ ربیع الثانی کو تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہو کر بیاور اور تودہ کے راستہ روانہ ہوئے۔ ایک سو کوس کی مسافت صرف دو دن میں طے کی۔ اسی مہینہ کی ۲۶ تاریخ کو

سواری اجیر پہنچ گئی۔ وہاں مزار کی زیارت کر کے اسی دن شام کو آگے کوچ کر دیا اور قصبہ بالیانہ میں پہنچ کر لشکر کا معائنہ کیا اور مختلف سمتوں پر فوجوں کو نامزد فرمایا۔ خان خاناں بیرم خاں مرحوم کے لڑکے میرزا خاں کو جواب خان خاناں بن چکا ہے اور دکن کی مہم پر مامور کیا گیا ہے قول لشکر پر متعین کیا اس کی مدد کے لیے سید محمود خاں بارہہ صادق محمد خاں اور امر کی ایک جماعت کو متعین کیا گیا۔ مہینہ کی سرداری میر محمد خاں کلاں کے سپرد ہوئی، میسرہ پر وزیر خاں کو مقرر کیا گیا۔ ہراول پر محمد قلی خاں اور ترخان دیوانہ متعین ہوئے۔ بادشاہ کے جلو میں تجربہ کار سو سوار تھے جنہیں ہزاروں سواروں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔

تیسری جمادی الاول کو بروز منگل بادشاہی لشکر احمد آباد سے بیس کوس کے فاصلہ پر کرتی کے قصبہ میں جا کر اترا۔ باغیوں کی ایک فوج قلعہ سے نکل کر راستہ روکنے کے لیے مقابلہ پر آئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہی فوج کی یلغار کی نذر ہو گئی۔ چونکہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا اس لیے لشکر وہاں سے پانچ کوس اور آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے اس جگہ سستانے کے لیے

نزل فرمایا۔ نویں دن اس منزل سے کوچ ہوا اور احمد آباد سے تین کوس کے فاصلے تک بغیر باگیں کھینچے لشکر یلغار کرتا رہا۔ اس جگہ بادشاہ نے اسلحہ خانہ خاص سے لوگوں کو ہتھیار تقسیم کیے اور سب لوگ پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ ہو گئے، بادشاہ نے اعظم خاں کو بلانے کے لیے پہلے ہی آصف خاں کو روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت مخالف غافل پڑے ہوئے تھے۔ جب انہوں نے کرنا بجاتا ہوا سنا تو پریشان ہو کر گھوڑوں کی طرف دوڑے اور محمد حسین مرزا دو تین سو اوروں کے ہمراہ تحقیق کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ اس طرف سے ترک سبحان قلی بھی دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کنارے پر آیا ہوا تھا، مرزا نے پوچھا ”بہادر یہ کس کی فوج ہے؟“ اس نے کہا ”شہنشاہ کی فوج ہے“ مرزا نے کہا ”میرے قاصدوں نے تو بلا شاہ کو چودہ دن پہلے فتح پور میں چھوڑا ہے، اگر یہی بادشاہی فوج ہے تو وہ ہاتھی جو ہمیشہ جلو میں رہتے ہیں کہاں ہیں؟“ اس کو جواب دیا گیا کہ نو دن کے اندر بھلا ہاتھی چار سو کوس کی یلغار کیسے کر سکتے ہیں۔

**باغیوں کا زبردست حملہ** | محمد حسین مرزا ایک آراستہ فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور اختیار الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر اس نے خان اعظم کے مقابلہ پر بھیجا تا کہ وہ اسے قلعہ پر چڑھائی کرنے سے روک دے۔ بادشاہی فوجوں نے دریا کو عبور کر لیا۔ محمد حسین مرزا نے سبقت کر کے ڈیڑھ ہزار جاں قار مغلوں کے ساتھ جن میں ہے ہر ایک کو خان کا خطاب حاصل تھا اور وہ بڑے بڑے مناصب اور جاگیروں کے امیدوار تھے، بادشاہ کے ہراول پر جس کی کمان محمد قلی خاں اور زرخاں دیوانہ کے ہاتھ میں تھی حملہ کر دیا اور اس کے قدم اکھاڑ دیئے۔ اسی وقت حبشیوں اور پٹھانوں نے یک نخت وزیر خاں کے میسرہ پر حملہ کر دیا۔ جولانگری کے مقام پر فریقین میں سخت خون ریز معرکہ ہوا۔

فروشد بہ ماہی و برد بہ ماہ  
بن نیندہ و قبہ بارگاہ  
بانگشت لشکر بہ ہاموں نمود  
سپاہی کہ آں را کرانہ نبود

کمان کیانی در آمد برزہ

یکی گفت بتاں یکی گفت وہ

**محمد حسین مرزا کی گرفتاری** | ان دنوں اکبر ہر وقت ”سورن یا معین“ کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس نے اپنے ہراول کو درہم برہم دیکھا تو وظیفہ چھوڑ کر خود ہراول کی کمک کے لیے آگے بڑھا۔ اور دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر کے منتشر کر دیا۔ اس حملہ میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ سیف خاں کو کہ بہادری سے بڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن پھر وہ جان بچا کر ان کے زرفہ سے نکل نہ سکا۔ محمد حسین مرزا نے پوری دلیری اور بہادری صرف کر ڈالی اور کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی لیکن جس کا نمک کھایا تھا وہ آخر پھوٹ کر نکلا، اس کا گھوڑا زخمی ہو گیا اور مجبوراً اسے میدان کا دراز سے منہ موڑنا پڑا۔ جب وہ فراہ ہو رہا تھا، تھوہر کی ایک جھاڑی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے ایڑ لگا کر پھلانگ جانا چاہا، لیکن موت نے اس کی باگیں تھام لی تھیں۔ چنانچہ زمین سے پھسل کر زمین پر آ رہا۔ ایک ترک سپاہی گدائی علی نامی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے پر سے اسی وقت جست لگائی اور اس کو دو بوج لیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ بادشاہ نے نرمی اور ملامت سے فہمائش کی اور اسے رائے سنگھ کے حوالہ کر دیا۔

وزیر خاں حبشیوں اور گجراتیوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا، لڑائی کا پہلے اس وقت ڈانوا ڈول ہی تھا کہ مخالفوں کو

محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا کی شکست کی خبر ملی۔ اس خبر کو سنتے ہی ان کے جوصلے گر گئے اور وہ میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ اسی طرح خان کلاں کی فوج نے شیر خاں فولادی کے لڑکے کو شکست دے کر بھاگادیا اور میدان دشمنوں کے وجود سے پاک ہو گیا۔

**اختیار الملک کا اکبر پر حملہ** فتح کے بعد میدان کے کنارے ایک ٹیکرے پر بادشاہ نے قیام فرمایا اور بہادروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے لگے۔ اس موقع پر خلاف توقع اختیار الملک گجراتی پانچ ہزار سواروں کو جو خان اعظم کا راستہ روکنے کے لیے متعین کیے گئے تھے شہر سے لے کر نکلا اور جنگل کا راستہ کاٹ کر اچانک سامنے آ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سخت بدحواس ہو گئے اور ایک بڑا سا چل گیا۔ اکبر نے ایک دستہ کو تیر اندازی کا حکم دیا اور "سورن یا معین" کے نعرے لگانے لگا۔ بہادروں نے غنیم کی پہلی صف کو جو سب سے آگے تھی تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جو لوگ بہادری کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے حسین خاں ان سب سے آگے نکلا۔ بادشاہ نے اپنی خاص ہلائی تلوار جو ایک مشہور تلوار تھی اسے مرحمت فرمائی۔ اختیار الملک ایک ہی حملہ میں پسپا ہو کر بھاگ نکلا۔ اس کا گھوڑا بھی تھوہر کی جھاڑیوں میں جا کر پھنس گیا۔ سہراب بیگ ترکمان اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے بڑھ کر اختیار الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر اختیار الملک نے سہراب بیگ سے کہا "اے نوجوان تو ترکمان معلوم ہوتا ہے اور ترکمان حضرت علی مرتضیٰ کے غلام اور ان کے فدائی ہوتے ہیں۔ میں بخاری سید ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دے۔ سہراب بیگ نے جواب دیا میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں تو اختیار الملک ہے اور میں نے تجھے پہچان کر ہی تیرے تعاقب میں خون پسینہ ایک کیا ہے۔ پھر وہ گھوڑے سے اتر آیا اور ایک ہی وار میں اس کا سرتن سے جدا کر دیا۔ اس کے گھوڑے کو کوئی دوسرا لے اڑا تھا۔ اس لیے وہ اس کے سر کو اپنے دامن میں چھپا کر حاضر ہوا۔ اور بادشاہ کے سامنے یہ سوغات رکھ دی۔ بادشاہ نے اسے کافی انعام و اکرام عطا کیا۔ اس لڑائی میں تقریباً ایک ہزار سوار مارے گئے۔ بادشاہ نے عبرت کے لیے ان سروں کو جمع کرا کے وہاں مینارہ لگوا دیا۔

**محمد حسین مرزا کا قتل** جس وقت اختیار الملک کا یہ ہنگامہ برپا تھا رائے سنگھ کے کارندوں نے محمد حسین مرزا کو ہاتھی سے اتار کر دستی نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کا اور اختیار الملک کا سراگرہ کو بھیج دیا گیا ہے

چہ کنی سرگزشت طراری      سرگزشت از اجل شنو باری  
تا بگوید بہ غافل کرو کور      بکہ وادم ز کہ ستیدم زور  
خسرواں را چگونہ بستم دست      قصر ہار را چگونہ کردم پست  
تا بگوید کہ گردناں را تن      چوں شکستم سرو تن و گردن  
تا چوبہ شنیدی از غور و ہی

دل بریں عمر بے وفا نہی

**اعظم خاں سے ملاقات** اسی دوران میں اعظم خاں قلعہ سے نکل کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہو گئے اور اس سے دوسرے امیروں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اعتماد خاں کے مکان میں بادشاہ نے پانچ دن فرمایا اور قطب الدین محمد خاں کو اس کے لڑکے نورنگ خاں کے ساتھ بھروچ اور چانپانیہ کی طرف شاہ میرزا کی سرکوبی کے لیے متعین کیا گیا۔

خان کلاں کوپتن کی حکومت دی گئی اور وزیر خاں کو دولقہ اور دندوقہ کے علاقہ پر نامزد فرمایا۔ شاہ قلی خاں محرم راجہ جگنوت داس اور خان بخش کے لشکر کو ایدر کے راستہ سے آگرہ اور فتح پور جانے کا حکم ملا کہ یہ لوگ اودے سنگھ کے علاقہ کو پامال کرتے ہوئے جاوے۔ اسی بلغار میں بدنگر کا شہر ان لوگوں کے ہاتھوں پر فتح ہوا۔

**گجرات کا نظم و نسق** | بادشاہ نے ۱۶ جمادی الاول کو احمد آباد سے کوچ فرمایا اور محمود آباد میں جا کر سلطان محمود گجراتی کے محل میں قیام فرمایا۔ دولقہ سے خان اعظم اور دوسرے تمام گجرات کے امراء کو اپنے مقام پر رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مرزا غیاث الدین علی قزوینی بخشی کو آصف خاں کا خطاب عطا کیا۔ گجرات کی دیوانی اور بخشی گری کا عہدہ

اس کے سپرد کیا گیا۔ تیسری جمادی الثانی کو بادشاہ اجیر پٹنچے سانگانیر کی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو جو آگرہ میں ایک ہزار جہازوں اور کشتیوں کی تیاری کے سلسلہ میں مٹھرا ہوا تھا گجرات کے مال قیمت اور حساب کتاب کے لیے مقرر فرمایا۔ سات جمادی الآخر کو سواری شاہانہ پائے تخت پہنچی۔ اس ساری مہم میں ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ نہ لگا۔

اسی ماہ کی ۵ تاریخ کو شہزادوں کی غنیمت کرائی گئی۔ رجب کی دوسری تاریخ کو شہزادہ سلطان سلیم کو مولانا میر کلاں محدث شہر ہروی کے پاس بسم اللہ کے لیے بٹھایا گیا۔ مولانا میر کلاں مشہور محدث میرک شاہ بن میر جمال الدین کے شاگرد تھے۔

اسی سال بادشاہ نے مظفر خاں کے سارنگ پور کی حکومت سے واپس بلا کر وزیر مطلق کے عہدہ پر مامور فرمایا۔ اس کے القاب میں جملۃ الملک کا خطاب کے بھی اضافہ ہو گیا۔ شیخ محمد بخاری جنگ پتن میں اور سیف خاں احمد آباد کی آخری روانی میں مارا گیا تھا۔ ان دونوں کے قرضے تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے تھے۔ بادشاہ نے یہ قرض شاہی خزانے سے ادا فرمادیئے۔

**اکبر کی اجیر کوروانگی** | اسی سال بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو جو گجرات کی مالی رپورٹ تیار کر کے لایا تھا تلوار مرحمت فرمائی اور اسے لشکر خاں بخشی کے ساتھ جسے ہندوستان میں اکثر لوگ "شرخاں" کہا کرتے تھے بنگالہ کی مہم کا

سازد سامان کرنے کے لیے منعم خاں خان خاناں کے پاس بھجوا دیا۔ شہر اللہ کنہوی لاہوری کو شہباز خاں کا خطاب عطا فرمایا اور اسے میر بخشی کے عہدہ پر مقرر کر دیا۔ اس کی ٹہر کے لیے حسب ذیل سچ نکالا گیا تھا۔

بہ یمن عنایات صاحب قرآنی

رسیدم ز خدمت بہ شہباز خانی

انہی دنوں میر محسن رضوی جو دکن کی سفارت پر گیا ہوا تھا وہاں کے فرماں رواؤں کے عہدہ عمدہ تحائف لے کر حاضر دربار ہوا۔ اکبر نے بنگال کی فتح کے لیے دعا مانگنے اجیر کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب وہ فتح پور سے چار کوس پر موضع دائر میں پہنچا تو خواجہ احمد کے پوتے خواجہ عبدالشہید میرزا شرف الدین کو رہائی دلانے کے لیے پہنچے اور اس کی سفارش کی، بادشاہ نے انکی سفارش کو قبول نہیں کیا۔ اگرچہ تعظیم و تکریم میں کوئی کوتاہی نہ برتی، خواجہ نے بھی فاتحہ پڑھ کر بادشاہ کو رخصت کیا، لیکن دل میں رنجش تھی اس لیے آزرہ خاطر واپس ہوئے۔ بادشاہ نے اجیر سے سات کوس ادھر ہی پایہ سفر شروع کیا اور ۱۲ ذی قعدہ کو مزار مقدس کی زیارت فرمائی۔

اسی مہینہ کی ۷ تاریخ کو آفتاب برج حمل میں داخل ہوا۔

جہرم خورد شہید چوار حوت در آید بہ حمل اشہب روز کند او ہم شب را راجل

**جشن شاہانہ**

جیسا کہ ہر سال اس خاص دن کی تعظیم میں عید منائی جاتی تھی بادشاہ نے اس بار بھی ایک بڑا جشن منعقد کیا اور حاضرین محفل میں سے ہر گروہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔ ۲۳ ماہ ذی قعدہ کو بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر پائے تخت پہنچے اور بنگالہ کے سفر کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کشتیاں تیار کرنے کا حکم صادر کیا گیا، ان میں سے ایک کشتی شیر کے سر اور ایک دوسری مگر مچھ کے سر کی وضع کی تھی۔ یہ دونوں سمندری جہازوں کی طرح بڑی اور بلند تھیں۔

**دربار اکبری میں رسائی** | اس سال ماہ ذی الحج کے آخر میں میں حسین خاں کی ملازمت ترک کر کے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خاں قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی، پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نشینوں میں داخل کر دیا گیا۔ بادشاہی محفل کے علماء کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے۔ اور بحث مباحثہ کر کے اس کو نیچا دکھانے اور خود سر بلند ہونے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا، اللہ کی عنایت سے قوت طبع و ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے میں جلد ہی ان میں سے اکثر پر چھا گیا۔

جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا، بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرمندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے۔ جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی، اس لیے وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی تھا۔ وہ اس مناظرہ کے وقت میرے فریق کی ہی طرف داری کر رہا تھا اور وہی مثل سامنے آگئی۔

سانپ کا کاٹنا فیون کھانے لگا

بعد میں عبدالنبی کے ساتھ یہ پر خاش ختم ہو گئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔ انہی دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم و عقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوا اور بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔

**ہرن مینار** | اسی سال اجمیر کے راستہ میں بڑی عمدہ اور بلند عمارتوں کی تعمیر انجام کو پہنچی۔ چونکہ اکبر درگاہ کا نہایت معتقد تھا۔ اور ہر سال لازماً اجمیر کو جاتا تھا۔ اس لیے اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک محل بنانے کا حکم دیا تھا۔ اور ہر کوس پر ایک ایک منارہ اور کنواں بھی بنوایا۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں جتنے ہرنوں کا شکار کیا تھا ان سب کے ہزاروں سینگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سینگ ہر منارہ پر یہ طور یادگار لگوا دیئے۔ ان میناروں کی تاریخ ”میل شاخ“ ہوتی ہے۔ کاش اس کے بجائے باغ یا سرا بنوائی جاتی۔

اسی سال شہباز خاں کنہو کی رائے پر ”داغ“ اور ”محلہ“ کی رسم کا آغاز ہوا۔ تمام ممالک محروسہ میں تحصیل کے ”گروڑیوں“ کا تقرر کیا گیا اور بادشاہ نے تمام ملک کے خالص ہونے کا حکم صادر فرمادیا۔ اس کا ذکر کچھ تفصیل سے آگے بیان کیا جائے گا۔ انشا اللہ۔

**بنگال پر فوج کشی** | ۱۵۸۲ء میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادہ سے کوچ کیا اور ”ننگ سر“ نامی کشتی میں سوار ہوا۔ بنگال میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اس سفر کا سبب بنے۔ وہاں سلیمان افغان کرمانی



جس نے سلیم شاہ کے عہد سے بنگالہ کے سارے علاقہ پر قبضہ کر کے خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی فوت ہو چکا تھا۔ اس کا لڑکا بایزید چند دن تک اس کا جانشین رہا، لیکن اپنی بدسلوکی کی وجہ سے اپنے بہنوئی ہنسوا اور دوسرے امیروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد سلیمان کا چھوٹا لڑکا داؤد جو اس کا ولی عہد تھا بادشاہ بن گیا۔ اس نے بادشاہ بننے کے بعد اطاعت کی وہ روش ترک کر دی جس پر سلیمان کا رہند تھا۔ دربار میں عریضے بھیجنے بھی بند کر دیئے۔

بادشاہ کو سلیمان کے انتقال کی خبر سورت کے قلعہ میں ملی تھی۔ بادشاہ نے اسی وقت خان خانان منعم خاں کو جو اس زمانہ میں جون پور میں تھا فرماں بھجوا دیا تھا کہ وہ داؤد کی گوثالی کرے اور بہار کے ملک کو فتح کرے۔ خان خانان نے ایک بھاری لشکر لے کر حملہ کر دیا اور دو لاکھ روپیہ نقد اور قسم قسم کے نفیس تحفے پیش کش میں وصول کر کے مصالحت کر لی اور واپس آ گیا۔ اس وقت داؤد حاجی پور میں تھا۔ اس کا ایک سردار لودھی جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اور اڑیسہ کی حکومت اس کو تفویض کی گئی تھی باغی ہو گیا تھا اور قلعہ رہتا اس پر قبضہ

### امیر الامراء لودھی کا قتل

کر کے خود مختاری کا دعویٰ کر رہا تھا۔ جگناتھ کے حاکم قلو خاں کی مدد سے داؤد نے دو ہاتھی عطا کرنے کا اسے لالچ دیا اور بڑی تدبیر سے اس پر قابو پا کر قید کر دیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ داؤد چند ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس وقت لودھی نے سلیمان کے ملازمین میں سے دس ہزار سوار اپنے ساتھ لیے اور داؤد کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ داؤد اسی وقت شہر میں لوٹ آیا اور فوج کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اور لودھی کو حسن تدبیر سے گرفتار کر کے اس کے سارے مال و اسباب کو ضبط کر لیا۔ لودھی کو اپنے قتل کا کامل یقین ہو گیا تھا لیکن آخر وقت میں بھی اس نے داؤد کو خیر خواہی کے طور پر نصیحت کی اور کہا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کو میرے قتل کے بعد بڑی پشیمانی ہوگی اور اس وقت پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں ایک تدبیر سمجھتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو گے تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے دو لاکھ روپیہ دے کر مغلوں سے میں نے صلح کرادی ہے اس صلح کے بحرو سے پراطمینان سے بیٹھے نہ رہو کیوں کہ مغل اس تھوڑی سی رقم پر تمہارا بچپان نہیں چھوڑیں گے اس لیے خود پہل کر کے مغلوں کے خلاف دیرانہ فوج کشی کر دو۔ یاد رکھو جو بھی پہل کر جائے گا وہی کامیاب رہے گا۔

داؤد نے اس کی باتوں کو غرض آمیز سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور خانتاناں کی اس گرگ آشتی پر جو فقط دکھاوا تھا بحرو سا کر کے اس نے اپنے خیر خواہ لودھی کو قتل کرادیا۔ اس کو قتل کر کے اس نے اپنے پیر پر آپ کھاڑا چلایا۔ اس کی حکمرانی پر بس اسی وقت سے زوال آ گیا۔ خانتاناں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے پٹنہ اور حاجی پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت داؤد کو لودھی کی قدر ہوئی اور وہ اس کے قتل پر بڑا نادام ہوا، لیکن اب اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

بادشاہی فوجوں کے مقابلہ پر داؤد نے پٹنہ کے قلعہ کی مرمت کرائی اور لڑائی چھڑانے سے پہلے ہی اس میں قلعہ بند ہو گیا۔ لیکن اس کی بدستنی اور بے تدبیری کی وجہ سے اس کے اکثر امیر اس سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔

بادشاہ نے مذکورہ تاریخ پر میرزا یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مامور کر کے خشکی کے راستہ روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خاں کو آگرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود دیہات کے راستہ روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر میں نے یہ رباعی بھی کہی تھی۔

شاہنشاہ داد گستر دین پرور جمشید جہاں ستاں محمد اکبر  
بنشست بروئے بحر چون سکندر ہم بجز بہ فرمان سے آمد ہم بر

اس مہم میں بڑے شاہزادہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھے۔ اس وقت دریا پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر سے آدھی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے، ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے آتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا۔ اور رات میں جب نگر ڈال دیئے جاتے تو علمی مباحثے اور شعر گوئی کی محفلیں جمتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

۲۳۔ ماہ صفر کو پیاک عرف الہ آباد میں جہاں گنگا اور جمنکا سنگم ہوتا ہے منزل کی گئی۔ یہاں کے مندر میں ہندو حصولِ ثواب اور مشاہدہِ تاریخ کے لیے طرح طرح کی سخت ریاضتیں کرتے ہیں بعض تو اپنے سر آہ کے نیچے دے دیتے ہیں بعض اپنی زبان کٹوا لیتے ہیں اور بعض کسی اونچے درخت سے دریا میں گر کر جان دے دیتے ہیں۔ یہاں پہنچنے پر بادشاہ نے ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا حکم دیا اور شہر کا نام الہ آباد رکھا۔ بنارس پہنچنے کے بعد شیر بگ قورچی کو ایک تیز رفتار کشتی میں بٹھا کر خان خانان کے پاس بھجوایا۔

دوسری ماہ ربیع الثانی کو یحییٰ پور کے موضع سے جو جون پور کے مضافات میں ہے اور جہاں کو دی نندی گنگا میں آکر ملتی ہے۔ شہزادہ 'حرم شاہی' صدر الصدور اور قاضیوں کی کشتیاں کو دی کے چرچاؤ پر جون پور کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بادشاہ بھی دو تین منزل تک ان کے ساتھ جا کر لوٹ آئے۔ اسی منزل میں سلطان محمود بکری کے فوت ہونے اور اس کے علاقہ پر محب علی خاں کے قابض ہو جانے کی اطلاع ملی۔ پھر خان خانان کے حسب التماس بادشاہ نے گنگا میں تیزی سے سفر شروع کیا۔

ماہ مذکور کی چھ تاریخ کو لشکر خشکی کے راستہ سے چل کر غازی پور کے شہر میں شاہی قافلہ سے آملا۔ اسی منزل میں خان خانان کے پاس سے اعتماد خاں خواجہ ہر حاضر ہوا اور خان خانان کے لشکر کے تمام حالات تفصیل سے گوش گزار کیے اور عجلت سے روانگی کی اسناد عاکی۔

سید میر متجم کی پیشین گوئی | اس ماہ کی ساتویں تاریخ کو سید میر کی اصفہانی منجم نے جو خان زماں کی شکست کے بعد سے جون پور لے الہ آباد۔ دریائے جمن کے کنارے آباد ہے۔ ہندوؤں کا مشہور تیرتھ ہے پہلے اسے پرگاہ کہتے تھے پھر الہ آباد نام پڑا۔ اکبر نے الہ آباد رکھا۔ اس جگہ گنگا اور جمنکا سنگم ہے۔ ہندو سرسوتی جو پنجاب کے ریگستان میں غائب ہو گیا ہے کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ بھی اسی جگہ نمودار ہو کر مل گیا ہے۔ ان تین دریاؤں کے ملاپ کی وجہ سے اس سنگم کو 'ترہینی' کہا جاتا ہے۔ راجہ رام چندر جی نے پرگاہ میں پناہ لی تھی۔ اشوک نے بدھ مذہب کے احکام لکھا کہ اس جگہ لاٹھ نصب کی تھی۔ جوا تک قلعہ میں ہے۔ مسلمانوں کے عہد میں عرصہ تک یہ کڑوا کا ماتحت شہر رہا۔ اکبر نے ۱۵۵۳ء میں جمن کے کنارے شاندار قلعہ بنوایا اور اسے صوبہ کا دار الحکومت قرار دیا۔ مغل سلطنت کے زوال پر بندھیلے مرہٹے اور نوابانِ اودھ نوبت بنوبت اس پر قابض رہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ ان کے زمانہ میں تقریباً دو لاکھ تک آبادی رہی۔ یہاں صوفیائے کرام کے متعدد دائرے ہیں۔ ایک دائرہ میں مشہور شاعر ناسخ کا بھی گھر تھا وہ کہتے ہیں ۷

پھر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم آئی کہاں سے گردش پر کا میرے پاؤں میں

قدیم حالتوں میں خسرو باغ اور قلعہ میں ہر سال دھڑاکے کنارے کنبہ کا بھاری میلہ لگتا ہے۔ جس میں لاکھوں زائرین جمع ہوتے ہیں۔ بادشاہی زمانہ میں الہ آباد سے متعلق حسب ذیل شہر تھے غازی پور، بنارس، جمن پور، قلعہ چاند، قلعہ کالج، گڑھا، مانگ پور، الہ آباد کے امروہ مشہور ہوتے ہیں۔ اردو کے شاعر اکبر اور نرو خاندان اس شہر کا رہنے والا ہے۔

ہی میں مقیم تھا۔ نقیب خاں کی فرمائش پر نجوم کی کتاب اعظم کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالا تو یہ شعر برآمد ہوا۔

بزدوسی اکبر از نخت ہمایوں      برد ملک از کف داؤد بیروں

حسن اتفاق کہ جو کچھ پیش آیا اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جون پور میں بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تھا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا۔ پھر نجوم سے فال نکالی۔ اس وقت یہ شعر برآمد ہوا۔

مژدہ فتح بنا گاہ رسد      سر داؤد بدر گاہ رسد

میری اس ماہر نجوم سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی میں نے اس علم کے سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کر لیا اور کہا: یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال برآمد کر سکتا ہے۔ اس کا مجھے مشاہدہ بھی ہوا، بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقہ کو سیکھ لیا۔ نجومیوں کے متعلق عارف جامی نے کیا خوب کہا ہے۔

جغرداں زمانہ مست و جنب      پیش یہ نہادہ زیریں مقولہ کتب  
نہ از احوال عاقبت ترساں      نہ از اسباب عاقبت پرساں  
چند حرفے نوشتہ پہلوئے ہم      وز عدد زیر شاں نہادہ رقم  
بستہ با خود تنخیلے باطل      یک سر از حلیہ خرد عیال  
مرد رادقت اہل دل رادق      چسیت این جفر جعفر صادق

جعفر صادق از تو بیزار است

صادق فال راز کا ذباں عار است

۲۰ ماہ ربیع الثانی کو جوہرہ میں منزل کی گئی، یہاں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ پٹھانوں کے سربراہ آورہ امیر عیسیٰ خاں نیازی نے جو بہادری اور شجاعت میں کافی مشہور ہے، پٹنہ کے قلعہ سے جنگی ہاتھی اور ایک بھاری جمعیت لے کر شاہی فوج پر حملہ کر دیا تھا، لیکن بادشاہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دنوں شہاب الدین احمد خاں کا بھائی محمد معصوم بن ہاشم خاں خان خاناں کے لشکر میں تھا اور اس کا لڑکا بادشاہ کی خدمت میں کشتی پر رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس سے روزانہ لشکر کے حالات معلوم کر کے بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی خدمت میں بڑا تقرب حاصل کر لیا تھا یہاں تک کہ اس کو نیابت خاں کا خطاب مل گیا، لیکن بعد میں چل کر کون سی ایسی بغاوت تھی جو اس نے نہیں کی اور بغاوت کا کون سا ایسا پھل تھا جو اسے چکھنا نہ پڑا۔ اس کی تفصیل ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

قلعہ حاجی پور کی فتح      اس مہینہ کی سولہ تاریخ کو پنج پہاڑی کے مقام پر جو کہ پٹنہ سے دو تین کوس پر واقع ہے، قافلہ پہنچا۔ یہاں پنج بلند گنبد میں جن کو پہلے زمانہ میں کافروں نے پکی اینٹوں سے بنوایا تھا، بادشاہ نے اسے جگہ

خان خاناں کے مکان میں قیام فرمایا۔ خان خاناں نے اس موقع پر مرو اور ایدر سے بھرے ہوئے تھال بچھا کر رکھے اور بے شمار نفیس تحائف قیمتی کپڑے تدریں گزرائے۔ یہاں سے بادشاہ نے تین ہزار بہادر سوار عین طغیانی کے وقت کشتیوں میں بٹھا کر حاجی پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔ اسی قلعہ سے ٹپنہ والوں کو مدد پہنچائی جاتی تھی۔ یہ جنگی کشتیاں تمام سامان جنگ سے لیس تھیں اور قلعہ شکنی کے سارے آلات ان میں رکھے گئے تھے۔ دیکھنے میں اتنی پر شکوہ اور شاندار تھیں کہ بس آدمی دیکھتا ہی رو بہائے۔ یہ جمعیت خان عالم کی سرکردگی میں روانہ ہوئی۔ راجہ کچیتی کو خان عالم کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ راجہ کچیتی اس علاقہ کا بڑا بااثر آدمی تھا اس کی قوت اور جمعیت ایسی تھی کہ اس نے خان زماں جیسے بہادر سردار کو دو سال تک ان جنگلوں میں سرگرداں رکھا تھا۔ ابھی تک وہاں کے جنگل جیسا کہ چاہیے پاک و صاف نہیں ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بکثرت حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ ان دونوں نے حملہ کر کے خفگی اور ترسی دونوں طرف سے حاجی پور کو گھیر لیا۔ بادشاہ بھی محاذ پر پہنچے اور دریا کے اس طرف ایک بلند مقام پر بٹھ کر جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے دوری اور دھندلکے کی وجہ سے جنگ کی صورت حال واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس لیے تجربہ کار جوانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر عصر کے وقت حاجی پور کی طرف روانہ کیا گیا تاکہ وہ صحیح خبر لے کر آئیں۔ قلعہ والوں نے جب ان کو آتے دیکھا تو اٹھارہ کشتیوں میں سپاہی بھر کر انکے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ جب مقابلہ ہوا تو اس مختصر سی جماعت نے اس بڑے گروہ پر نمایاں کامیابی حاصل کی اور ان کو راستہ سے ہٹا کر خان عالم کے بیڑے سے جا ملے۔ غنیم کی طرف سے فتح خاں بارہہ بہت سارے پھاتوں کے ساتھ بڑی سخت لڑائی کے بعد مارا گیا اور قلعہ بڑور شمشیر فتح ہو گیا۔ مقتول سرداروں کے سر ایک کشتی میں رکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس کشتی کو بادشاہ نے حفاظت سے داؤد کے پاس بھجوا دیا تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ میں نے اس وقت یہ تاریخ کہہ کر ملاحظہ میں پیش کی:

چترشہ دین بہر کشاد پٹنہ      انداخت چوسایہ بر سواد پٹنہ  
فی الحال رقم زد از پئے تاریخش      منشی خرد "فتح بلاد پٹنہ"

دوسرے دن بادشاہ پنج پھاڑی کے اوپر تشریف لے گئے اور قلعہ پٹنہ کا سرسری معائنہ کر کے اس کے اطراف و اکناف کے علاقہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس وقت پٹھان بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے کہ ان کے گولے تین کوس کے فاصلے سے لشکر میں آکر پھٹتے تھے۔ میں بیادہ اور بجونہ کے حاکم سید عبداللہ خاں جو کان بگی کے خیمہ میں رہتا تھا۔ ایک گولہ میرے سر پر سے دھڑکتا ہوا گزر گیا، اللہ نے بچا لیا اور زندگی کی یہ مہلت مل گئی ورنہ نامعلوم میں کہاں پہنچ گیا ہوتا۔

**داؤد کا فرار اور پٹنہ کی فتح** | حاجی پور کے فتح ہو جانے سے قییم کی کمر ٹوٹ گئی۔ داؤد کے پاس بیس ہزار سوار اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے اور ایک بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا لیکن اس سارے خدم و حشم کے باوجود وہ شاہی حملہ سے ڈر کر اس مہینہ کی ۲۱ تاریخ کو ایک کشتی میں بیٹھ کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ سرسہند سی بنگالی جس کا خطاب بکرماجیت تھا اور جس نے قلعہ کے قتل پر داؤد کو آمادہ کیا تھا۔ ایک کشتی میں خزانہ رکھ کر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ گوہر خاں کرانی جس کا خطاب رکن الدولہ تھا قلعہ کے قتل پر بھاگ کر جنگل میں نکل گیا۔ بہت سارے لوگ تو مارے خوف کے دریا میں غرق ہو کر مر گئے۔ بعض سراپیمہ ہو کر قلعہ کے برج اور گولہ خانوں پر سے نیچے کود پڑے اور خندق ان کی لاشوں سے پٹ گئی۔ کچھ لوگ گلی کوچوں میں ہاتھیوں کی پیٹ میں آکر ہلاک ہوئے۔ قلعہ کی

بھاگی ہوئی فوج جب پن پن ندی پہنچی تو گوجر خاں ہاتھیوں کو اس پل پر سے جسے ندی پر باندھا گیا تھا گزار کر نکل گیا اس کے پیچھے لوگوں کا پل پر اس قدر ہجوم ہوا کہ پل بوجھ سہار نہ سکا اور ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر بہت سے پٹھان سردار مال و اسباب چھوڑ کر ندی میں کود پڑے اور اس میں غرق ہو کر رہ گئے۔ بادشاہ کورات کے آخری حصہ میں داؤد کے فرار ہو جانے کی خبر ملی اور وہ شہر پٹنہ میں داخل ہوئے۔ شہر میں ۵۶ ہاتھی لشکر کے ہاتھ آئے اس فتح کی تاریخ ہوئی ۷۷۰

### ملک سلیمان زداؤد رفت

بادشاہ نے پٹنہ کی حفاظت اور انتظام پر خانخاناں کو مقرر کیا اور خود گوجر خاں کے تعاقب میں جو داؤد کے تمام ہاتھیوں کو لیے جا رہا تھا روانہ ہو گیا اور گھوڑے پر سوار ہی پن پن ندی کو عبور کیا اور دریا پور تک جو پٹنہ سے ۳۶ کوس پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے بلغار کر کے تقریباً چار سو مشہور ہاتھیوں کو پکڑ لیا۔ گوجر خاں البتہ اپنی جان سلامت لے کر نکل گیا۔ شہباز خاں، میر بخشی اور مجنوں خاں نے دریا پور سے آگے بڑھ کر سات کوس تک اس کا تعاقب کیا اور وہاں سے لوٹ آئے۔ انہوں نے اگر بادشاہ کو اطلاع دی کہ گوجر خاں بل بھوند ندی پار کر کے نکل گیا ہے۔ لیکن اس کے بہت سے آدمی پانی میں غرق ہو کر ہلاک ہو چکے ہیں۔ اسی مہینہ کی ۲۱ تاریخ کو خان خانان بھی دریا کے راستہ سے دریا پور میں آیا، وہ اپنے ساتھ کشتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے چھ دن وہاں قیام کیا اور خانخانان کی کمک کے لیے اپنے ساتھ کے امراء کو دس ہزار سواروں کے ساتھ متعین کیا اور اس پورے لشکر کی تنخواہ اور راتب میں دس سے تیس تک اور دس سے چالیس تک کا اضافہ فرما دیا اور خانخانان کو بنگالہ کا پورا ٹنک اور کشتیوں کا سارا بیڑا تفویض کر کے وہاں سے غیاث پور کی طرف جو گنگا کے کنارے ہے بادشاہ نے مراجعت کی۔

اسی سال دوسری جمادی الاول کو یوسف خاں کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے مظفر خاں کو فرحت خاں کے ہمراہ رہتاس کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ فرمایا تاکہ وہ فتح کے بعد رہتاس کی حکومت فرحت خاں کے سپرد کر کے دربار میں چلا آئے۔ اسی مہینہ کی تیسری تاریخ کو بادشاہ کی سواری پٹنہ میں داخل ہوئی۔ وہاں بادشاہ نے سارے معاملات کا مناسب انتظام کیا اور داؤد کی عمارتوں کا سرسری معائنہ کیا۔ پٹنہ میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں بعض چھپرے مکان تیس تیس، چالیس چالیس ہزار میں تیار ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ تمام کے تمام لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

چھٹی تاریخ کو بادشاہ جون پور پہنچے اور ایک مہینہ تک وہاں قیام فرمایا۔ جون پور اور بنارس کو **بنگال سے واپسی** خالصہ میں شامل کر لیا اور اس کا نظم و نسق میرزا میرک رفوی اور شیخ ابراہیم سیکری وال کے سپرد کر کے نویں جمادی الثانی کو جون پور سے دہلی کے لیے کوچ فرمایا۔ جب موضع خان پور میں کپ لگایا گیا تو قاضی نظام بخش فیروزہ کابلی کے ساتھ خدمت شاہی میں پہنچے۔ قاضی نظام کا کچھ ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں یہ بدخشاں اور ماوراء النہر کے بہت بڑے عالم تھے تصوف و طریقت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا۔ فیروزہ کابلی مرزا محمد حکیم کے گھرانہ کا لڑکا تھا۔ یہ نہایت ذہین طالب علم تھا۔ خطاطی اور موسیقی کے فن میں بھی اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔ ان کی آمد کی تاریخ ہوئی —————

بادشاہ نے قاضی نظام کو ایک مرصع شمشیر اور پانچ سو روپیہ نقد مرحمت فرمایا۔ انہوں نے بتدریج اپنی استعداد و عالی ظرفی کی وجہ سے قاضی خاں کا خطاب اور بعد میں "غازی خاں" کا خطاب حاصل کر لیا اور سہ ہزاری کے عہدہ تک ترقی کی۔ البتہ فیروزہ کابلی



کچھ اس کے برعکس ہی ہوا، وہ اپنے مقام سے برابر تنزل ہی کرتا رہا۔

اسی منزل میں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ داؤد پٹنہ سے نکل کر کہہ ہی چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے قلعہ کو مستحکم کر کے اپنے معتمد سرداروں کے سپرد کر دیا اور وہاں سے ٹانڈہ کی طرف چلا گیا ہے۔ جب شاہی فوجوں نے کہہ ہی کی طرف پیش قدمی کی تو قلعہ والے مرعوب ہو کر جنگ کیے بغیر ہی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

**سنگھاسن تبتیسی کا ترجمہ** | جمادی الآخر میں جب شیر گردہ عرف قنوج میں منزل ہوئی تو بادشاہ نے مجھے مخاطبت سے نوازا اور ازراہ مہربانی حکم دیا کہ میں طوطی نامہ کی طرح سنگھاسن تبتیسی کا ترجمہ کر کے اسکی نظم و نثر کو مرتب کروں۔ اس کتاب میں تبتیس حکایتیں ہیں جو مالوہ کے حاکم راجا بکر ماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔ بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کروں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھا دوں۔ ایک صاحب علم برہمن کو اس کی ترجمانی کے لیے مقرر فرما دیا، اسی دن میں نے جب

لے طوطا کہانی، اس کے سنسکرت ماخذ کا نام شک ستپتی یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہیں۔ اس کے دو نسخے ہیں ایک "ٹیکس اور میٹر" مرصع زبان میں ہے۔ اس کا مؤلف ایک برہمن جتامنی بھٹ ہے۔ جس نے پورن بھدر کے پنج منتر سے عورتوں کی بد چلنی کی کہانیاں لے کر کسی پرانی شک ستپتی کی مدد سے یہ کتاب لکھی۔ دوسرا نسخہ "ٹیکس سوپ لی کیر" سادہ زبان میں ہے، یہ پہلے کے بعد کا ہے۔ اس کا مؤلف سوتیا برہمن ہے یہ کسی نظم سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے، غالباً پر اکرت کی کسی نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔ دونوں نسخوں کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ ایک مرہٹی نسخہ بھی ہے جسے مشرقی راجستان میں پرشوتم داس دیو کے لڑکے دیودت نے ترجمہ کیا تھا اس کا نام شک شک تبری رکھا۔ بارہویں صدی میں ہم چند نے اپنی کتاب "یوگ شاستر" میں شک ستپتی کے قصہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے یہ قدیم داستان ہے۔ سنسکرت سے برج بھاشا میں بھیروں پرشاد نے ترجمہ کیا تھا جو نوکشور سے چھپا تھا، اس کا نام بھی شک تبری تھا۔ فارسی میں ایک قدیم نسخہ ملتا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ نہایت بھدا تھا اسی لیے ۱۲۳۳ء میں ضیاء بخشی بدایونی نے "طوطی نامہ" کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا لیکن اس میں صرف ۵۲ کہانیاں ہیں۔ بخشی نے کچھ حکایات فارسی کے بختیار نامے کی بھی شامل کر لی ہیں۔ بخشی سے ابوالفضل نے اپنی زبان میں اس کا خلاصہ کیا، اسی سے انتخاب کر کے ۲۵ کہانیوں کا دکنی ترجمہ ۱۶۱۱ء میں کیا گیا، دکن کے مشہور شاعر خواص نے ۱۶۳۹ء میں ۲۵ کہانیاں دکنی مثنوی طوطی نامہ نظم کی۔ غالباً ان نشاطی نے بھی ۱۶۴۱ء میں اس داستان کو دکنی میں نظم کیا تھا۔ قادری کے طوطی نامہ سے حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں لفظی ترجمہ ۱۸۸۰ء میں کیا جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں انبار پرشاورن داستان گو نے قادری کے طوطی نامہ کو حکایات سخن سخن کے نام سے اردو نثر میں منتقل کیا۔ اس قصہ کا ہیرو ہر دت کار کا مدین سین ہے۔ جو ایک جوہری ہے۔ پہلی دوسری آخری کہانی میں مرکزی قصہ ہے، یہ سب ۳۸ داستانیں اور ۳۵ کہانیاں ہیں، جن میں سے بیشتر عورتوں کی بد چلنی کے متعلق ہیں۔ ان داستانوں اور کہانیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شک ستپتی میں پنج منتر بتویدیش اور تیتال پھپھی کی کافی کہانیاں شامل ہو گئی ہیں۔

گجراتی میں طوطا کہانی سائن بھٹ کی منظوم اور سمیت کی نثر میں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ترجمے میں ہندی میں بھیروی پرشاد نے اشک ہتری کے نام ۱۸۷۲ء لکھنؤ میں سنسکرت سے کیا۔ فارسی کا ایک نسخہ کتب خاں شاہی رام پوری ہے ۱۸۵۷ء کا ہے خطوط ۱۸۵۷ء۔ سری انگ پٹم کی کتابوں میں ۸ کہانیوں کا مجموعہ شامل ہے جو ۱۸۵۷ء کا مکتوبہ ہے۔ ایک طوطی نامہ نرکا ۱۸۵۷ء میں حاجی خلیفہ کا ہے اور عباد اللہ کا ۱۸۵۷ء کا ہے۔ ترکی میں شیخ عبداللہ صابری نے بخشی سے آزاد ترجمہ طوطی کے نام سے کیا یہ سلیمان اعظم کے عہد ۱۸۵۷ء کا ہے۔ اردو کے ترجموں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ انگریزی میں گیرون نے ۱۸۵۷ء میں بخشی سے 'گلیدون نے قادری سے ۱۸۵۷ء (ملکت) جان ہیڈن نے ۱۸۵۷ء میں 'جارج اسمال نے ۱۸۵۷ء میں لندن میں اردو سے ترجمہ کیا۔ جرمنی میں اگن نے ۱۸۵۷ء فارسی سے اور ترکی سے جارج رس نے ۱۸۵۷ء لندن میں کیا۔ فرینچ میں مارنے نے ۱۸۵۷ء یونانی میں 'شیک گوریز' کے نام سے ۱۸۵۷ء بنگالی میں تو تارہاس کے نام سے چنڈی چرن نے ۱۸۵۷ء میں کیا۔

یہ سنگھاسن تبتیسی، سنسکرت کی قدیم داستان ہے اس کا ہیرو راجا بکر ماجیت ہے جس کے نام سے ہندوؤں کا بکری سن منسوب ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں بکر ماجیت کے تحت پر راجہ بھوج نے فرماں روا کی۔ جب بھوج نے بکر ماجیت کا سنگھاسن جو ۲۲ تیلیوں کے سروں پر کھرا ہوا تھا ایک کھنڈر سے نکالا اور اس پر جلوس کرنا چاہا تو ایک تیلی کھلا کر منس پڑی اور اس نے ایک داستان سنا، اس طرح پوری ۲۲ تیلیاں ۲۲ داستانیں سناں ہیں۔ جو سب کی سب راجہ بکر ماجیت سے متعلق ہیں۔ انہی داستانوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے اس کا سنسکرت میں نام 'وکر مچتر' اور سنہاسن ورتہتتی ہے۔ اس کے مصنف کے متعلق کافی اختلاف ہے، کہتے ہیں اسے ایک بدھ بھکشو نے لکھا تھا اس کے قدیم جینی نسخے کا مصنف سندھ میں دیو کر ہے جینی میں ایک اور نسخہ شانکر کا ہے۔ جو چودہویں صدی کے آغاز میں گزرا ہے۔ بعض نسخے کالی داس، رام چندر اور شو سے بھی منسوب ہیں۔ یہ کتاب 'کھارنو' کے دوسرے حصے میں بھی شامل ہے 'خردوی نہیں کہ یہ بھوج کے عہد گیارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہو۔ یہ برہماں تیرہویں صدی کے پہلے کی (باقی لکھ سرفہ)

نوابہ عبدالشہید کی بددعا | اسی دوران میں جب کراولی کی منزل پر شاہی قافلہ پہنچا تو خواجہ عبدالشہید سمرقند واپس جانے کا ارادہ کر کے رخصت ہونے کے لیے آئے اور اکبر سے کہا "میں اپنی ہڈیوں کو اسی سرزمین (سمرقند) میں پہنچانا چاہتا ہوں۔ پھر انہوں نے بادشاہ کی کمر سے ایک تلوار باندھی اور دوبارہ میرزا شرف الدین حسین کی رہائی کے لیے درخواست کی۔ اس بار بھی جب بادشاہ نے قبول نہ کیا تو انہوں نے نہایت رنجیدہ ہو کر فرمایا "اب میں مزید کیا کہوں" یہ بات امن و امان کے لیے بہر حال مضر ہے، بس اپنے خدا سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ (تمہارے) ایمان کو سلب کرے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا تھا وہ سمرقند پہنچتے ہی اپنے بزرگوں سے جا ملے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

۲۰، جمادی الثانی کو اسکندر پور کے قصبہ میں منزل ہوئی تو یہ خبر پہنچی کہ داؤد نے ٹانڈہ کو بھی جو گنگا کے اس طرف گور کے مقابل واقع ہے بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا ہے اور صحرا نور دی کرتے ہوئے اڑیہ کو چلا گیا ہے اور ٹانڈہ پر خانخاناں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اگرہ تین منزل پر تھا لیکن بادشاہ نے اگرہ کے بجائے دارالملک دہلی کا رخ کیا اور پہلی ماہ رجب کو دہلی میں ورودِ شاہانہ ہوا۔ چند دن مقدس مزاروں کی زیارت کی۔ انہی دنوں حسین خاں پشیالی بھوگاؤں کے قریب حاضری کے لیے آیا، لیکن اسے باریابی کی اجازت نہ ملی بلکہ بادشاہ نے شہباز خاں میرنجشی کو حکم دیا کہ اسے دولت خانہ کے

دبقیہ حاشیہ فہم سابقہ تصنیف نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ اس کی داستان "بتیال پچی" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ بتیال پچی وکرم سین گوڈاوری کے راجہ سے متعلق ہے جسے شیمندر باشو داس نے لکھا تھا۔ بتیال پچی کا زمانہ بارہویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس لیے سنگھاسن تپسی اس کے بعد کی ہی تصنیف ہو سکتی ہے۔ سنسکرت میں اسکے جو نسخے کالی داس، رام چندر اور شوکے ملتے ہیں وہ تیرہویں صدی کے ہیں۔ سده سین دیوا کرینی اور شیبان کرچن کے نسخے چودھویں صدی کے ہیں۔ دکنی زبانوں میں بھی یہ داستان ہے۔ مرہٹی میں بھی اس کا نسخہ ہے۔ سنسکرت سے سند داس کوئی نے مسلمانوں میں ہندی میں ترجمہ کیا۔ مسلمانوں میں کاظم علی جوان اور لولال راج بھاشا سے ہندی میں کیا۔ بنگالی میں اور روسی نے شیبا کر سے "وزن سنگھاسن" کے نام سے خلاصہ میں سیرام پور میں کیا۔ فارسی میں جتراج داس بن مرچند کا نسخہ ساکن سوئی پت نے اکبر کے عہد میں شاہنامہ کے نام سے ترجمہ کیا میں نے مترجم، انجمن ترقی اردو میں جو نقلی نسخہ دیکھا ہے۔ اس میں مصنف کا نام بھوچند داس ابن سروچکر اس نسخے کو ۷۲ رمضان ۱۰۸۵ھ میں پیر خاں کاتب نے لکھا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے حکم سے غالباً اسی چیز پر بھی داس کے ساتھ مل کر نسخہ میں ترجمہ کیا اور اس پر ملا صاحب نے ۱۰۹۳ھ میں نظر ثانی کی۔ ۱۱۱۰ھ میں جہانگیر کے حکم سے بھائرا مل بن راج مل کھتری نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ ۱۱۱۰ھ میں مرچند داس نے ملائے ابن ہرکن داس کا نسخہ قنوجی نے جتراج اور بھائرا مل کے نسخوں کو ملا کر مرتب کیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں کشی بلاس ابن کشی داس نے اس کا نسخہ لکھا۔ ترجمہ کیا۔ کوپن ہیگن میں ایک فارسی نسخہ چاند ولد مادھو رام کا لکھا ہوا ہے۔ فارسی نسخے برٹش میوزیم اٹھایا آفس کیمریج یونیورسٹی میں بھی ہیں۔ یہ داستان کی خلاصہ التواریخ میں بھی شامل ہے۔ ۱۱۵۰ھ میں ای سی بیلی کے حکم سے سید عداد علی اور شوہر سائے کا نسخہ گلا وطنی بلند شہر نے بھی ترجمہ کیا تھا۔ اردو میں فقیر نامی ایک شخص کی نقلی نظم ویر بکرم کے نام سے صاف دکنی زبان میں ہے۔ یہ نسخہ شاہ عالم کے عہد کا ہے اس پر ایک مرتبہ ۱۱۵۰ھ کی نقلی ہے۔ کاظم علی جوان اور لولال نے ۱۱۵۰ھ میں سند داس سے اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کا لٹری ایڈیشن راجہ درگا پرشاد کا ۱۸۹۲ء کا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں کانپور کے رنگ مال جی کا بھی ترجمہ ہے۔ منشی مکھن لال کا منظوم ترجمہ ۱۸۸۶ء سے کچھ پہلے کا ہے۔ منگولی زبان میں سنگھاسن تپسی کا "ارجی پوری خاں" کے نام سے ترجمہ ہوا تھا۔ اسی منگولی سے ۱۸۸۶ء میں جگدیش جرمین زبان میں ترجمہ کیا اس کے ایک صدی بتیال پچی ہے اور دوسرے میں سنگھاسن تپسی ہے۔ انگریزوں میں ہرک نے جنگ کے جرمین نسخے سے *from the first part* کے نام سے اور بیسویں صدی میں ایڈرٹن نے *Advent* کے نام سے ترجمہ کیا۔ فرنگی میں ہرک نے ترجمہ کیا یہ ترجمہ بھائرا مل کے فارسی نسخہ نیویارک سے کیا گیا۔

اطلاع سے باہر نکال دیا جائے۔ حسین خاں کو اس توہین کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ہاتھی اونٹ، گھوڑے اور سارا سامان سپاہ گری بیوں بادشاہ کے مقبرہ کے جالب علموں، مستحقوں اور مجاوروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو مرحمت فرمادیا اور سب کچھ ترک کر کے الف وار قلندری اختیار کر لی۔

ایں ہمہ طمطراق کن فیکوں

شمہ نیست پیش اہل جنوں

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس نے اس پر عنایت مبذول کی اور اپنی شاہ اتار کر اسے اوڑھائی۔ اپنے ترکش میں سے تیر نکال کر بطور پروانگی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ کانت کولہ اور پشیالی اور دوسرے علاقے جو ایک کروڑ بیس لاکھ کی جاگیر تھی۔ سب سابق ایک فصل تک اس کے سپرد کی جائے اور سرکار کا کروڑی اس جاگیر میں مداخلت نہ کرے۔ جب وہ سواروں کا اغ و محلہ کرا لے تو اسے مناسب تنخواہ پر جاگیر عطا کر دی جائے گی۔ حسین خاں اپنی فیاضی اور کشادہ دستی کی وجہ سے اس قدر شہر ہو چکا تھا کہ دس سوار رکھنے کی بھی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اس قصہ کو رفع دفع کرنے کے لیے وہ مجبوراً اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ شمالی کوہستان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس مرتبہ وہ دربار سے ایسا گیا کہ پھر اسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا۔

زردہ مرد سپاہی راتا سر بد بد

وگرش زرد ندی سر بند در عالم

جمیر کی زیارت کے لیے روانگی | اوائل شعبان میں بادشاہ نے دہلی سے اجیر کا قصد کیا۔ نارنول کی منزل میں حسین قلی خاں جہاں مبارک باد کے لیے حاضر ہوا اور خان اعظم یلغار کرتے ہوئے احمد آباد سے حاضر خدمت ہوا۔ رمضان المبارک کے آغاز میں حسب سابق اجیر سے سات کوس کے فاصلہ پر بادشاہ پیدل زیارت کے لیے چلے۔ درگاہ پر پہنچ کر واؤد کے لشکر کے نقاروں کی ایک جوڑی جس کو درگاہ پر پیش کرنے کی بادشاہ نے منت مانی تھی نذرانہ پیش دی۔ سب معمول ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی مغل جہتی اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں جن میں بادشاہ اور حاضر ہوتے۔ موسیقار اور قوال جو اپنے فن میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے، دل سوز نغمے گا کر سناتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر روپے پیسے کی بارش ہونے لگتی۔

ار الخلافہ کو واپسی | اجیر سے بادشاہ نے راجہ مالہ پو کے رٹ کے چندر سین کی سرکوبی کے لیے ایک تجربہ کار فوج کو متعین کیا اس فوج کی سرداری محمد طاہر خاں میر فراغت حاکم دہلی کے رٹ کے طیب خاں کے سپرد کی گئی۔ اس فوج کی سرکشی کا سبب یہ تھا کہ چندر سین کے بارے میں بادشاہ کو مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ جو دھ پور اور سیوانہ کے علاقہ میں سرکشی اختیار کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ جب یہ فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے پہنچی تو وہ گھنے جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا اور فوج کی روانگی کے بعد ماہ رمضان کے وسط میں خان اعظم کو گجرات پر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی اور بادشاہ مسلسل فوج کر کے رمضان کی آخری تاریخ تک فتح پور واپس تشریف لے آئے۔

قلعہ سیوانہ کی تسخیر | بادشاہ نے اسی سال شاہ قلی خان محرم جلال خاں قورچی اور چند دوسرے امیروں کو سیوانہ کے قلعہ کی

تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ یہ قلعہ مالدیو کے پوتوں کے قبضہ میں تھا۔ جلال خاں قورچی بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ نہایت ظریف اور خوش طبع آدمی تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں میں بادشاہ کے مزاج میں کسی کو اتنی دسترس نہ تھی جتنی جلال خاں کو حاصل تھی۔ اس معرکہ میں اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ بہر حال اسے دنیا بھی ملی اور عاقبت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ اس کے بعد اس مہم پر شہباز خاں کنبہ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی سال بادشاہ نے میر گیسو بکاؤل کو سلطان محمود بکری کے مال و دولت کی تحقیقات اور قلعہ بکر کے انتظامات کے لیے مقرر فرمایا۔

اسی سال گجرات میں بڑی سخت و باپھیلی غلہ اس قدر ہنگامہ ہو گیا کہ ایک من جوار کے دام ایک سو بیس تنکہ سیاہ تک چڑھ گئے۔ دبا اور قحط کی وجہ سے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔

اسی سال خواجہ امینا خواجہ جہاں کا لکھنوی میں اس وقت انتقال ہو گیا جبکہ بادشاہی لشکر اپنے سے لوٹ کر وہاں پہنچا تھا۔ صبوحی شاعر نے اس کی شان میں یہ رباعی کہی تھی۔

براہل ہنر سد سکندر در تست یا جوج کہ گویند صفِ شکر تست

در دور تو آثارِ قیامت پیدا ست و جال توئی خواجہ امینا خست

واضح رہے صبوحی نے یہ رباعی اس زمانہ میں کہی تھی جب خواجہ امینا کا ستارہ پورے عروج پر تھا۔

خواجہ امینا کی کنجو سی ضربِ مثل بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ رات کا بچا ہوا کھانا کھاتا تھا لیکن یہ کفایت اور جزر سی صرف اس کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ کیوں کہ وہ حاجت مندوں کی امداد و اعانت بھی بہت کیا کرتا تھا۔ بلکہ اس معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آ سکے۔

اس کا معمول تھا کہ ملازمت دلانے کے لیے ایک مقررہ رقم بطور رشوت لیا کرتا تھا اور بادشاہ کے پاس سفارش کر کے جاگیردار، نقارہ خان یا سلطان کا خطاب دلایا کرتا تھا۔ جو لوگ ماوراء النہر خراسان عراق سے ہندوستان آتے تھے وہ ان کو شاہی خزانہ سے معقول رقمیں دلایا کرتا تھا اور کوشش کر کے دوسرے امیروں سے بھی خامار و پیہ فراہم کر دیتا تھا اور دوسروں کی طرح خود بھی اپنے شایانِ شان ان کی مدد کرتا رہتا تھا۔

ملاعصام الدین ابراہیم اسفر کے ایک شاگرد حافظ تاشکندی تھے جو عربی کے مشہور عالم ہیں۔ انہوں نے سورۃ محمد پر ایک تفسیر لکھی ہے۔ ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس تفسیر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ وہ جب ہندوستان آئے تو خواجہ امینا نے بادشاہ سے اور دوسرے امیروں سے تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کر کے ان کو دلایا۔ وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ منعم خان کے پاس گئے اور وہاں سے بھی مالا مال ہو کر مکہ معظمہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ شہر میں اپنے وطن پہنچ کر انتقال فرمایا۔

خواجہ امینا:۔ پورا نام خواجہ امین الدین تربتی تھا۔ تربت علاقہ خراسان کے رہنے والے تھے۔ ایران کے سفر میں ہمایوں کی خدمت میں باریاب ہوئے۔ بیرم خاں کے معتمد خاص تھے۔ خواجہ جہاں کا خطاب اکبر نے عطا کیا۔ ابوالفضل نے انکے متعلق لکھا ہے۔ قلم و حساب کا شہسوار تھا، خط و کتب نہایت درست اور خوب لکھتا تھا۔ مایات کے بندوبست اور حساب کتاب میں ماہر تھا۔ کہتے ہیں کسی مست ہاتھی نے ان پر حملہ کر دیا وہ جان بچا کر بھاگے غیمہ کی دھند سے بچ کر گریے اور خوف و سدمہ سے شہرہ میں انتقال ہو گیا۔



**ایک دلچسپ لطیفہ** | انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبر کی مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی تھا جو ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا اور اپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔ جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھوڑنے کیلئے پوچھ لیا کہ موصیٰ کون صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے۔ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا کہ دینا چاہیے نہ دے سکے اور عوام نے باور کر لیا کہ حاجی ابراہیم بلحاظ علم سب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ بڑی نا انصافی کی بات تھی۔ کچھ لوگوں نے قاضی زادہ شکر سے جسے بادشاہ نے مقرر کیا تھا کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو اس نے بے ساختہ جواب دیا "اگر حاجی ابراہیم مجھ سے" مینی "کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب دے سکوں گا؟ بلاشبہ یہ اس نے بڑی عمدہ بات کہی تھی۔

**یاد رفتگاں** | اس تاریخ سے اب تک کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو سو سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل تھی محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اوڑھا چکی ہے۔ بے شک کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ہے

زخیل درد کشاں غیر مانماند کے بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بے  
وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں سو گوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غم زدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون آنسو روتی ہیں اور دل نالہ و فریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہر حال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں اب کس سے بات کریں تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔ اب مجھ کا کارہ و افتادہ کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ ان کی جدائی کے داغ سے جلتا اور چپکے چپکے آہ و فریاد کرتا رہوں۔

افسوس کہ یاراں ہمہ زد دست شدند در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند  
بودند تنگ شراب در مجلس عمر یک لحظہ نہ مایشترک مست شدند

**پیمائش اور کروڑیوں کا تقرر** | اس سال اکبر نے ملک کی خوش حالی اور زرعی ترقی کی طرف توجہ فرمائی اور ملک کے سارے زرخیز و خیر رنگوں کی پیمائش کرائی۔ شہری، پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں، جنگلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تفصیلات جمع و مرتب کی گئیں اور جگہ جگہ کروڑیوں کو مقرر کر کے ہر ایک کروڑی کی تحویل میں اتنی اراضی دے دی کہ زراعت کے بعد اس سے ایک کروڑ تک کا محصول وصول ہو سکے۔ وہی ملازم کروڑی بنائے گئے جن پر پورا بھروسہ تھا اور جو محنتی تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تین سال کے عرصہ میں غیر مزدورہ خطوں کو قابل کاشت بنادیں تاکہ سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ ہر کروڑی سے اس رقم پر ضامن لیے گئے۔

اس پیمائش کی ابتداء فتح پور سے کی گئی۔ اس کے پہلے کروڑ کو آدم پور دوسرے کو شیت پور اسی طرح ایوب پور وغیرہ کے

لے اکبر کے زمانہ میں سب سے پہلے کل مالک محروسہ کی پیمائش کرائی گئی۔ البتہ علاؤ الدین خلجی کے زمانہ میں ہندوستان اور مالگنداری کا ایک ضابطہ حاصل ضرور مرتب ہوا تھا۔ ناپے کے لیے جو جریب استعمال ہوتی تھی وہ پہلے رسی کی تھی اس سے خشکی اور تری کی حالت میں ناپ میں فرق ہو جاتا تھا۔ اس لیے ہانس میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریب بنائی گئی، پہلے طول، ۵ گز کا تھا اس کے بعد ۱۰ گز کا طول مقرر کیا گیا۔ کروڑیوں کی بد اعمالیوں کی وجہ سے مالگنداری کا یہ ہندوستان ناکام رہا، لوگ اس قدر تنگ تھے کہ گھر گھر اس پیمائش اور کروڑیوں کا رونا تھا کسی شنوی کا ایک شعر

اسی جریب کے شعلہ ہے ۵ در نظر عبرت مرد بسبب ماد و سر بہ کہ ملنا ب جریب



نام دیئے گئے اور ہر خطہ پر سرکاری عامل تعینات کیے گئے، لیکن بندوبست کا یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا اور ممالک محروسہ کے اکثر علاقے ان کروڑیوں کے مظالم کی وجہ سے بجائے آباد ہونے کے ویران ہو گئے، یہاں تک کہ لوگ اپنے بال بچوں کو بیچ بیچ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور آمدنی کا تناسب بہت زیادہ گر گیا۔ ان کروڑیوں کے احتساب کے لیے راجہ ٹوڈرل کو مقرر کیا گیا۔ اس نے ان سب کو اس طرح شکوہ میں کسا کہ اکثر سخت سزاؤں کی وجہ سے مر گئے اور بیشتر کچہری کے قید خانہ میں کسی سزا کے بغیر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے بے گور و کفن رخصت ہوئے۔ ان گرفتارانِ بلا کا حال بعینہ ان ہندو فدائیوں کی طرح ہو گیا تھا جو کامروپ کے ملک میں خود کو ایک بت کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ایک سال تک جو من میں آتا ہے کرتے رہتے ہیں، وہ چاہے کتنا ہی بڑا گناہ اور جرم کریں، ان کے لیے سب کچھ معاف ہوتا ہے۔ لیکن سال کے گزرتے ہی ان میں سے ہر ایک کو پکڑ کر اس بت خانہ میں اکٹھا کر لیا جاتا ہے اور اس بت کے آستانہ پر ان کے سر قلم کر دیئے جاتے ہیں۔

**داغ و محلہ کا ضابطہ** | کروڑیوں کی یہ حالت تھی اور امرائے شاہی کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ خالصہ کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک ان کی جاگیروں میں تقسیم تھا اور یہ لوگ رات دن عیش و عشرت میں مبتلا رہتے تھے ان کے ٹھرانوں کے خرچ اتنے تھے کہ ان کو روپے بٹورنے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا۔ عیش پسندی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ سپاہیوں کی نگہداشت اور رعایا پروری کی طرف توجہ کر سکیں۔ جب کسی رڈائی پر جانا پڑتا تو بجائے مقررہ فوج کے چند غلاموں اور اپنے شاگرد پیشہ کے مغل سپاہیوں کے ساتھ میدان میں حاضر ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی کارآمد مضبوط فوج تیار نہ تھی۔

شہباز خاں میر بخشی نے ”داغ و محلہ“ کا طریقہ جو سلطان علاؤ الدین خلجی اور بعد میں شیر شاہ کے ضابطوں میں شامل تھا، از سر نو مرتب کر کے پیش کیا۔ اس قاعدہ کی رو سے طے پایا کہ پہلے امیروں کو بیسی کا عہدہ دیا جائے اور جب وہ اپنے عہدہ کے شایان شان بیس سوار بھرتی کر کے ان کا معائنہ کرادے اور اس کے حسب استعداد بادشاہ مزید ترقی دینا پسند فرمائیں تو اسے ”صدی“ کا عہدہ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے لازم ہوگا کہ سپاہیوں کے علاوہ گھوڑے، اونٹ، ماتھی اور دوسرے لوازمات فراہم لے آئیں داغ:- یہ ترکوں کی قدیم رسم ہے۔ پہلے صرف بادشاہ کی ملکیت کے اظہار کے لیے گھوڑوں پر نشان لگایا جاتا تھا۔ ہمارے موسم میں داغ کا جشن منگوا جاتا تھا بعد میں یہ فوج میں بھرتی کا قانون بن گیا۔ ہندوستان میں علاؤ الدین خلجی نے گھوڑوں کی حاضری اور شمار کے لیے داغ کا قانون سب سے پہلے رائج کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جاگیرداری کا طریقہ اختیار کیا اور داغ موقوف ہو گیا۔ شیر شاہ نے دوبارہ آئین داغ کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اکبر نے ہی اس کو تادم کیا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے پہلے گھوڑے کی گردن پر سیدھی جانب حرف سین کا سرا (۲) لوہے سے داغ لگتے تھے۔ پھر چلیپہ کا نشان جس کے چاروں سرے بوٹے تھے لگایا جانے لگا۔ یہ نشان سیدھی جانب پر ہوتا تھا۔ پھر دت تک چلہ انری ہوئی کمان کی شکل رہی۔ پھر وہ کے ہند سے داغ جانے لگے یہ گھوڑے کے سیدھے پٹھے پر ہوتے تھے پہلی دفعہ پٹھے پر دوسری دفعہ پٹھے پر بعد میں اس غرض کے لیے خاص طور سے ہند سے تیار کرائے گئے۔ انہی سے داغ لگایا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ قانون نافذ کیا تو امراء میں بڑی پھل چلی۔ مظفر خاں مرزا جو بیکو کو کلتاش سپہ سالار تھے بڑی ضد اور جھگڑا کیا اس کو مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔ بعض کو بنگال میں تبدیل کر دیا۔ موجودات اور حاضری کے وقت سوار کو اپنا حلیہ، عمامہ اور گھوڑے کا حلیہ وغیرہ لکھانا پڑتا تھا۔ سپاہیوں کا وزن بھی لکھا جاتا تھا۔

پچانے کی زیادہ سے زیادہ تخواہ بارہ روپے آٹھ آنے اور سوار کی زیادہ سے زیادہ تیس روپیہ ہوتی تھی۔ جانور کا نصف خرچ سرکار سے ملتا تھا۔ ہلال اکبری فوج کی تعداد ۴۴ لاکھ تھی۔ منصب دار ۶۶ تھے۔

علاء الدین خلجی کا افسر ”شرف ناں“ تھا۔ یہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے مالگداری کے جدول اور رجسٹر بنائے اور پچائش و محاصل کے ضابطہ طرز کے آثار و خیر و شر

کر کے ملاحظہ میں پیش کرے۔ اس تیاری کے بعد وہ ہزاری پھر دو ہزاری اور پانچ ہزاری تک اس طرح ترقی کرتا چلا جائے۔ پانچ ہزاری سے اونچا کوئی عہدہ نہیں تھا اور اگر کوئی امیر اس ضابطہ پر پورا نہ اترے تو اس کا تنزل کر دیا جائے۔

**امرائے فوج کی چالبازیاں** | داغ و محلہ کا یہ ضابطہ اسی لیے نافذ کیا گیا تھا کہ امیر مقررہ تعداد میں فوج رکھنے کے پابند ہو جائیں، لیکن امیروں نے اس ذمہ داری سے بچنے کی تدبیر نکال لی۔ چنانچہ وہ حاضری اور معائنہ کے وقت اپنے آدمیوں اور بارگیروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے تھے اور اپنے عہدہ کی مقررہ تعداد کو پوری کر لیتے تھے۔ جب ترقی مل جاتی تو ان کرایہ کے سپاہیوں کو رخصت کر دیتے تھے۔ لڑائی کے موقع پر حسب ضرورت نئی فوج بھرتی کر کے پہنچ جاتے تھے اور جنگ کے ختم ہونے پر خدا کی پناہ مانگتے ہوئے اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کا خزانہ روپیہ پیسہ بہر حال محفوظ ہی رہتا تھا۔ اور ساری خاک بے چارے سپاہیوں کے سر پر پڑتی تھی کہ انہیں دوبارہ کمر باندھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ان امیروں کے پاس پیشہ ور لوگ جو لاپے، ڈھنیے، بڑھئی، بقال، ہندو اور مسلمان گھوڑا اور ساز کرایہ پر لیکر اونچی بنے داغ کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ملازمت حاصل کر کے ان میں سے کوئی ”احدی“ کوئی ”داخلی“ بن جاتا تھا۔ خدمت ملنے کے چند دن بعد ہی ان کے پاس نہ وہ گھوڑا نظر آتا تھا اور نہ سامان سپاہ گری، ہم آں پڑی تو انہیں پیادہ ہی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

معائنہ کے وقت اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے سپاہیوں کو دیوان خانہ خاص میں بلا کر اسی طرح وردیوں اور ہتھیاروں سے ایس باٹھ پاؤں بندھوا کر ترازو میں تولوایا تو ان کا وزن کم و بیش ڈھائی من اور تین من تک نکلا۔ جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ سارا ساز و سامان اور ہتھیار عاریتاً لیے ہوئے تھے۔

بادشاہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو دیدہ دانستہ یہ رعایتیں دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔

کچھ عرصہ بعد دو اسپہ، یک اسپہ، نیم اسپہ احمدیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیم اسپہ کا مطلب یہ تھا کہ دو سوار مل کر ایک گھوڑے پر درش کریں اور مل گھوڑا جو چھ روپیہ ماہوار ملتا تھا اس میں دونوں تین تین روپے لے لیں۔

ایک در روز گارمن میں دمپرس

یہ رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں تھے۔ باوجود اس بدانتظامی کے یہ اکبر کی اقبال مندی ہی تھی کہ اس کے تمام دشمنوں کا صفایا گیا۔ بعد میں اتنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور امیروں کو بھی شاہی کارندوں کی ناز برداریوں سے چھٹکارا مل گیا۔

**داؤد کا تعاقب** | اسی سال بادشاہ سلامت نے داؤد کے تعاقب کے لیے منعم خاں خانخاناں اور راجہ ٹوڈرل کو اڑیسہ کی طرف روانہ کیا اور مجنوں خاں قاتل کو گھواگھات دگھوڑاگھاٹ، کی جانب متعین کیا۔ داؤد ٹانڈہ سے

گنگا ننگ بنارس میں قلعہ بند ہو گیا تھا اور جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گھوڑاگھاٹ میں مجنوں قاتل کا وہاں کے جاگیردار سلیمان سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان کے پاس بڑا لاڈلے شکر جمع تھا اور وہ شان و شوکت اور بہادری میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس مقابلہ میں

سلیمان ہلاک ہو گیا اور قاتل کی فوج کے ہاتھ اتنا مال غنیمت آیا کہ وہ اسے اٹھانے سے عاجز تھی۔ اس معرکہ میں بہت سے

پٹھان اسیر ہو کر آئے۔ مجنوں خاں نے سلیمان کی لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے جباری سے کر دیا۔ جباری ان دنوں بادشاہی امیروں میں شامل ہے۔ سلیمان کی شکست کے بعد مجنوں خاں قاتشال کی لڑائی جلال الدین سور کے لڑکے سے ہوئی۔ جلال الدین کسی زمانہ میں اس علاقہ کا خود مختار حکمران تھا۔ یہ لڑائی گھوڑا گھاٹ کے حدود میں ہوئی۔ قاتشال نے اس علاقہ کے زمینداروں کی مدد سے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور ٹانڈہ تک اس کا تعاقب کیا۔ اسی یلغار میں اس نے گور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مجنوں خاں اور معین الدین فرخودی نے ٹانڈہ کی ناکہ بندی کر دی اور خانخاناں کی کامیابی کی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جب داؤد کو شکست ہوئی اور خانخاناں کی واپسی کی خبر اڑی تو سارے پٹھان جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اکٹھا ہو کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل داؤد کے تعاقب پر لگا ہوا تھا۔ وہ محمد قلی خاں برلاس، محمد قلی خاں توقیائی اور مظفر مغوہ کو ساتھ لے کر متواتر کوچ کرتے ہوئے بنگال کے علاقہ گواپاٹہ تک پہنچ گیا۔ داؤد وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر رین کساری نامی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک بھاری فوج جمع کر کے وہ دہر پور میں قلعہ بند ہو گیا۔ داؤد کا ایک چچرا بھائی جنید بھادری اور دلیری میں مشہور تھا، وہ پہلے شہنشاہ کی ملازمت میں تھا، ملازمت چھوڑ کر وہ آگرہ سے گجرات پھر وہاں سے بنگالہ چلا گیا تھا۔ اسی دوران میں وہ داؤد سے ملنے کے لیے رین کساری کے نواح میں پہنچا۔ راجہ ٹوڈرمل نے میرزا ابوالقاسم گوسالہ کو جس کا لقب نمکین ہے، نظر بند کر کے ساتھ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ یہ دونوں جنید سے شکست کھا کر راجہ کے پاس لوٹ آئے۔ راجہ خود اس کے مقابلہ پر گیا۔ جنید مقابلہ پر ٹھہرنے لگا اور جنگل میں جا کر پناہ لے لی۔ یہاں سے راجہ کی فوج مدد پر جا کر کچھ فاصلے پر پہنچ گئی اسی جگہ محمد قلی خاں برلاس بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ بادشاہی فوج میں اس کی وفات سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ اس لیے لشکر میدانی پور سے پیچھے ہٹ کر مدارن میں آ گیا۔ اس جگہ قبا خاں گنگ امرائے لشکر سے ناراض ہو کر کسی جنگل میں چلا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ ساری صورت حال خان خانان کو لکھ بھیجی۔ خان خانان نے راجہ کی مدد کے لیے شاہم خاں جلائیر اور لشکر خاں بخشی کو جسے عسکر خاں اور استر خاں بھی کہا جاتا تھا کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ بروان میں پناہ سے جا کر ملے۔ راجہ نے اس جگہ تمام امراء کو چھوڑا اور خود قبا خاں کے پاس تنہا جا کر اسے پرچا منا کر واپس لے آیا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے مدارن کے راستہ سے جھورہ پہنچا۔ جب لشکر برہنہ میں پہنچا تو خبر آئی کہ داؤد نے اپنے اہل و عیال کو تو گنگ بنارس میں چھوڑ دیا ہے اور لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی ہیں۔ جب خان خانان کو یہ خبر ملی تو اس نے تیز رفتاری سے کوچ کیا اور راجہ کی فوج سے جا کر مل گیا۔

پٹھانوں نے اپنی لشکر گاہ کے اطراف خندق کھود کر اچھی خاصی قلعہ بندی کر لی تھی۔ ۲۰ ذی قعدہ ۸۲ھ کو بھتجورہ کے نواح میں دونوں فوجوں کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف مشکو سی کے ہاتھی پر باندھے کھڑے تھے۔ داؤد کے ہاتھی چارہ گھاس کھا کر تروتازہ اور مستعد تھے۔

ہاتھیوں کو بادشاہی لشکر پر دوڑا دیا۔ خانخانان نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ ہندوتیں اور توپیں جو گاڑیوں پر رکھی ہوئی تھیں وہ ہاتھیوں کی صف پر چھوڑی جائیں۔ توپوں کے سرموتے ہی ہاتھی گھبرا کر ہلٹ پڑے۔ اس موقع پر ہندوتوں کی ضرب سے بہت سے پٹھان ہلاک ہوئے۔ داؤد کے مقدمہ الجیش پر گوجر خاں کمان دار تھا۔ اس نے بادشاہی ہراول پر حملہ کر دیا، ہراول کی کمان خان عالم خواجہ پر تھی۔

کنجک خواجہ سید عبداللہ چوگان بیگی اور میرزا علی عالم شاہی کر رہے تھے۔ گوجر خاں کا یہ حملہ اس غضب کا تھا کہ ان امیروں کے قدم اکھڑ گئے اور غنیم نے انہیں دھکیل کر التمش کی فوج تک جس کی سرداری قباخان کتک کر رہا تھا پہنچا دیا۔ ہراول کے کماندار خان عالم نے جم کر مقابلہ کیا اور روتے ہوئے مارا گیا۔ التمش کی فوج منتشر ہو گئی اور اس نے خان خاناں کی جمعیت میں آکر پناہ لی۔ اس بھگدڑ کی وجہ سے خان خاناں کی جمعیت کا شیرازہ بھی پراگندہ ہو گیا۔ خان خاناں نے نظم قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن ایک مرتبہ منتشر ہونے کے بعد اس کی فوج جم نہ سکی۔ عین اسی حالت میں گوجر خاں سر پہ آہنچا۔ خان خاناں کے مقابل آکر اس نے پے درپے تلوار کے کئی ایک وار کیے۔ خان خاناں نے بڑے حوصلہ سے کام لیا اور گوجر خاں کے ہر حملہ کو اس نے اپنے تازیانہ پر روک لیا۔ اس نازک موقع پر ہاتھیوں سے گھبرا کر خان خاناں کا گھوڑا بھڑک گیا اور سنبھلے نہ سنبھلا۔ مجبور ہو کر خان خاناں نے معرکہ سے باگ پھیر لی۔ اور بھاگی ہوئی فوج کو جمع کرنے کے بہانے سے تین چار کوس تک پسپا ہوتا چلا گیا۔ پٹھانوں نے کافی دوزخ اس کا تعاقب کیا۔ اس موقع پر قباخان گنگ اور دوسرے چند سرداروں نے پٹھانوں کے لشکر پر دونوں جانب سے تیر چلانے شروع کیے اور تیرباری سے ان کے لشکر کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ یہ مقابلہ اتنا سخت اور بھاری تھا کہ دونوں فریق لڑتے لڑتے تھک گئے۔ دونوں میں مزید نقل و حرکت کی طاقت نہ رہی۔ حسن اتفاق سے اسی وقت ایک تیر گوجر خاں کو ایسا لگا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے گرتے ہی پٹھان میدان چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگ نکلے۔ بہت سے مارے گئے۔ اسی وقت خان اعظم کا علم دار اس کا جھنڈا لے کر جو نہی خان خاناں کے پاس پہنچا اسے گوجر خاں کے قتل کی خبر بھی مل گئی۔ اس اطلاع پر خان خاناں نے اپنی باگیں پھیر لیں اور چند ساتھیوں کے ساتھ معرکہ گاہ میں لوٹ کر آ گیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی پٹھانوں پر تیر چلانے شروع کر دیے۔

راجہ ٹوڈر مل اور لشکر خاں شاہی مینہ پر متعین تھے۔ انہوں نے بھی پیش قدمی کر کے غنیم کے میسرہ پر جس کا سردار اسماعیل خاں آہدار تھا اور اسے داؤد نے خان خاناں کا خطاب دے رکھا تھا، حملہ کر دیا۔ اسی طرح شاہم خاں جلائر اور پائندہ محمد خاں مغل اور دوسرے سرداروں نے جو شاہی میسرہ پر تھے پٹھانوں کے مینہ پر جس کا سردار حاکم اڑیسہ خان جہاں تھا حملہ کر دیا۔ دونوں پہلوؤں سے غنیم کی فوج کو دہاتے ہوئے یہ لوگ داؤد کی خاص جمعیت تک پہنچے اور اس کے نامی گرامی ہاتھیوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں پراگندہ کر دیا۔ اس حملہ سے داؤد کی جمعیت میں افراتفری مچ گئی۔ اسی وقت خان خاناں فتح کے پھر سے لہرانا ہوا اور اسے نمودار ہوا۔ گوجر خاں کے مارے جانے کی خبر داؤد کو ملی۔ اس غیر متوقع صورت حال سے داؤد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ میدان چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس کے وہ سارے ہاتھی برباد ہو گئے۔

فتح کے بعد خان خاناں نے اسی منزل میں زخموں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے کچھ دن تک توقف کیا۔ اسے صلح کی گفت و شنید

میں کافی زخم آئے تھے جن کا علاج کیا گیا۔ لشکر خاں بری طرح زخمی ہو چکا تھا اس لیے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس زخم میں داؤد بھاگ کر کنگ بنارس جا پہنچا تھا۔ خان خاناں نے اسی منزل سے راجہ کو شاہم خاں جلائر قباخان سید عبداللہ خاں، محمد قلی خاں توقیائی اور سید خاں بدخشی کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود بھی زخموں کے ٹھیک ہو جانے کے بعد

لے گوجر خاں سے دست بردستی لادائی میں خان خاناں کے سرگردن اور بازو پر زخم آئے تھے۔ زخم بڑے گہرے تھے۔ اچھے ہو جانے کے بعد بھی کما کرتے تھے۔ سر کا زخم اچھا ہو گیا ہے مگر جیانی بڑھ گئی، گردن کا گھاؤ بھر گیا ہے مگر موکر نہیں دیکھ سکتا۔ کندھے کے زخم نے ہاتھ نکما کر دیا مترنگ اچھی طرح نہیں جاتا۔



ان کے ساتھ آکر شامل ہو جائے گا۔

یہ فوج وہاں سے رخصت ہو کر کل کل گھاٹی پہنچ گئی اور ادھر داؤد اور تمام پٹھانوں نے کنگ بنارس کے قلعہ کو مقابلہ کے لیے مستحکم کر لیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنیم کی تیاریوں کا حال سن کر خان خاناں بھی کنگ بنارس آ پہنچا اور دریائے سندھ کے کنارے کیمپ لگا دیا۔ خان خاناں کے پہنچنے کے بعد صلح کی گفت و شنید شروع ہوئی اور بڑی رد و کد کے بعد امرار کے مشورہ سے طے پایا کہ داؤد خان خاناں سے دے آکر ملے اور حلف اٹھا کر مصالحت کا عہد کرے۔ بنگال کا ایک وسیع علاقہ اسے تفویض کر دیا جائے۔

## داؤد اور خان خاناں کی ملاقات

مقررہ دن شاہانہ انداز میں مجلس کو سجا یا گیا۔ تمام امرار بہ لحاظ مراتب اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ سرپردہ اور بارگاہ کے سامنے فوج کے دستے داؤد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ بنگالہ کا حکمران نہایت شان و شوکت کے ساتھ افغان سرداروں کے جلو میں بنارس کے قلعہ سے باہر نکلا۔ اور خان خاناں انتہائی تواضع کے ساتھ اس کی تعظیم بجالایا اور ادب کے ساتھ پیشوائی کرتے ہوئے اسے سرپردہ میں لے کر آیا۔ ملاقات کے وقت داؤد نے اپنی تلوار میاں والا سے باہر نکال کر خان خاناں کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ جب سے کہ تم جیسا عزیز دوست زخمی ہوا ہے میں ایسی سپاہ گری سے ہی بیزار ہوں۔ خان خاناں نے وہ تلوار لے کر ایک محافظ کے سپرد کر دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بیٹھایا۔ باپ کی طرح مشفقانہ انداز میں مزاج پرسی کی۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھانے، سلوے اور شربت تیار کیے گئے تھے۔ خان خاناں نے اپنے معزز مہمان کو نہایت اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اہم امور پر گفتگو شروع ہوئی اور عہد نامہ کی تکمیل کی گئی۔ اس سے فارغ ہونے پر خان خاناں نے ایک تلوار اپنے خاص اسلحہ خانہ سے منگائی۔ اس تلوار کا دستہ اور بندھن قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ تلوار اس نے داؤد کی کمر سے باندھتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ آپ بادشاہ کے دولت خواہ بن چکے ہیں۔ یہ تلوار شہنشاہ کی طرف سے باندھ لیجئے۔ بنگال کے علاقہ کے متعلق میں بادشاہ سے درخواست کروں گا۔ حسب منشا اس سلسلہ میں فرمان پہنچ جائے گا۔ غرض طرح طرح کے تکلفات کے بعد قیمتی تحائف دے کر خان خاناں نے داؤد کو رخصت کیا۔ اور یہ شگفتہ اور بارونق محل درخواست ہو گئی۔

خان خاناں اس مہم سے دس ماہ صفر ۱۱۸۳ھ کو ٹانڈہ کے صدر مقام پر لوٹ آیا اور وہاں سے اس نے سارے حالات کے متعلق عریضہ لکھ کر بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق فرمان بجاری خلعتیں، جو داؤد تلوار اور مع ساز کے ایک عربی گھوڑا روانہ کر دیا۔ بنگالہ کے معاملات خان خاناں کو تفویض کر کے اسے وہاں کا مطلق الخان حاکم بنا دیا۔ ۱۶ جمادی الثانی (اول، میاں شیخ داؤد جہنی وال نے وصال فرمایا۔ ان کی تاریخ وفات یا شیخ داؤد ولی ہے۔ میں نے کالات دستگاہ" لے اثرا لامرار میں کنگ اڑبہ لکھا ہے۔ یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ملہ داؤد کے ساتھ صلح کے لیے جب مغل امیروں میں مشورے ہو رہے تھے تو راجہ ٹوڈر مل ہی صرف ایسا آدمی تھا جو صلح کا مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ غنیم کی جڑ اکھڑ چکی ہے۔ خرگوش کی طرح چاروں طرف بھاگا پھرتا ہے۔ اب اس کا پیچھا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ لیکن اکثر امیر جلد صلح کر لینا چاہتے تھے۔ کیوں کہ وہ عرصہ سے بنگال کی ناہواقی آب و ہوا میں مسلسل دوڑ دھوپ کرتے رہے تھے اور کافی تھک چکے تھے، چاہتے تھے جلد فیصلہ ہو اور صبح سلامت گھروں کو لوٹ جائیں۔ کثرت راستے سے ٹوڈر مل کی بات پیچھے رہ گئی۔ اور صلح کا جی منقطع کیا گیا۔ ٹوڈر مل بھی اپنی بات کا پورا پورا وہ نہ تو اس جی میں شامل ہوا اور نہ صلح نامہ پر اپنی مہر لگائی۔



تاریخ لکھی تھی۔

جب بادشاہ اجیر سے لوٹ کر آئے تو ماہ ذی قعدہ ۹۸۲ھ میں فتح پور میں نئی خانقاہ کے پاس ایک عبادت خانہ کی بنیاد رکھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔

**شیخ ابوالفضل کی باریابی** | انہی دنوں شیخ ابوالفضل ولد شیخ مبارک ناگوری جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے اور اس نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے

”آیۃ الکرسی“ کی تفسیر پیش کی جس میں بت سے قرآنی رموز و نکات درج تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسند فرمایا اس کی تاریخ ”تفسیر اکبری“ نکالی گئی۔ بادشاہ نے مغرور اور متکبر ملاؤں کی سرکوبی کی توقع مجھ سے لگا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے اب انہیں موزوں آدمی مل گیا؛ ابوالفضل کو پہلے ہی سے علماء کے ساتھ بڑی پرغاش تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں اہل بدعت کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور میر جیش جیسے لوگ قتل کیے گئے تھے، شیخ عبدالنبی مخدوم الملک اور دوسرے تمام علماء نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ شیخ مبارک مہدی بھی بدعتی اور سخت گمراہ ہے۔ ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر شیخ کو حاضر کرنے کے لیے محتسبوں کو روانہ کر دیا تھا۔ شیخ مبارک اپنے بیٹوں کو لے کر کہیں چھپ گیا اور لوگوں نے اس کی مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔ شیخ سلیم کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اسی لیے شیخ مبارک نے ان کے ذریعہ سفارش کرانی چاہی۔ شیخ سلیم نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کچھ رقم سفر خرچ کے لیے اس کے پاس بھیج دی اور کہلوا یا تھارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم اس ملک سے بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ جب شیخ مبارک کو ان کی طرف سے ناامیدی ہوئی تو انہوں نے میرزا عزیز کو کہہ کر وسیلہ بنایا۔ اس نے بادشاہ سے شیخ مبارک کی علمیت اور درویشی کی بڑی تعریف کی اور اس کے رد کوں کے علم و فضیلت کو بھی سراہا اور کہا کہ اس کے پاس سرکاری انعام کی کوئی زمین نہیں ہے۔ اور وہ ایک متوکل شخص ہے۔ ایسے درویش صفت آدمی کو آزار پہنچانا کچھ مناسب نہیں۔ کوکہ کی سفارش پر بادشاہ نے ان باپ بیٹوں کو سزا دینے کا خیال ترک کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کے دن ایسے پھرے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات زمانہ سازی بددیانتی، منہاج شناسی اور خوشامد کے ذریعہ بادشاہ کا بہت زیادہ تقرب حاصل کر لیا۔ اور جیسے ہی موقع ملا اس نے بادشاہ کی پشت پناہی سے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے اس کے خاندان کے خلاف چغلیاں کھائی تھیں اور ایذا رسانی کی ناکام کوشش کی تھی طرح طرح سے دھوکا دیا اور بدعتوں پہلے گزری ہوئی باتوں کا ایک ایک کر کے انتقام لیا۔ اس کے انتقام کی لپیٹ میں صرف اس کے مخالف ہی نہ آئے بلکہ وہ عام و خاص ہر ایک کی ایذا رسانی پر آ رہا، چنانچہ اس کی وجہ سے کتنے ہی مشائخ، صالحین اور صاحب احتیاج اشخاص کی معاش اور ذلیفے بند ہو گئے۔ ان لوگوں کو وہ طرح طرح سے ایذا میں دیتا تھا اور زبان حال و قال سے مزے لے لے کر کہا کرتا تھا۔

یارب بہ جہانیاں دیلی بفرست      نمروداں را چو پشہ فیلی بہ فرست

فرعون و شاں دست برادر و ستند      موسیٰ و عصا و رود نیلی بہ فرست

اس کی کارگزار یوں سے جب لوگ ہائے کرنے لگے تو وہ ان پر طنز کرتے ہوئے اکثر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا۔

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش  
چوں خود زودہ ام چہ نالم از دشمن خویش  
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش  
اسے وائے من دوست من و دامن خویش

بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا تھا فلاں علوائی، فلاں موچی اور فلاں  
چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علماء کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

**بادشاہی عبادت خانہ** | ۸۳۰ھ میں تین عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب گزشتہ چند  
سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں اور روز بروز مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا  
گیا۔ ملک کا سارا نظم و نسق حسب منشا قائم ہو گیا اور دنیا میں کوئی مخالف اور دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان زیادہ تر عبادت اور ریاضت  
کی طرف ہو گیا، چنانچہ اجمیر کی درگاہ معینہ کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ صحبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر  
اوقات اللہ رسول کے تذکرے میں گزرنے لگے۔ ان محفلوں میں وہ اکثر تصوف کی باتوں، فقہی مسئلوں اور علمی مباحثوں میں  
مصروف نظر آنے لگا۔ راتیں بھی اللہ کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ کسی نے ”یا ہو“ اور ”یا بادی“ کا وظیفہ بتا دیا تھا۔ وہ عموماً راتوں  
میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا۔ چنانچہ ان نعمتوں کے شکرانہ میں جو خدا تعالیٰ  
نے اپنے فضل سے عطا کی تھیں تقریباً ہر روز وہ ایک پرانے حجرہ میں جو آبادی سے دور شاہی محلات کے قریب واقع تھا  
سنگی فرش پر مراقبہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کرانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پھلی رات کو اٹھ کر  
ڈیڑھ سو مشائخین اور علماء کے ساتھ تہجد کی نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ اور فجر کی نماز تک ان عالموں کی مجلس میں تفسیر  
و تذکیر میں مصروف رہتا تھا، فجر پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے  
اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔ اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں میرزا سلیمان کے آنے کی بھی  
خبر تھی۔ میرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا، لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا  
کرتے تھے۔ لہذا اکبر نے کچھ تو شوق عبادت میں اور کچھ آنے والے اس معزز مہمان کی خاطر شیخ عبد اللہ نیازی کے حجرہ پر ایک  
بڑی عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ عبد اللہ نیازی کے حالات ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ پہلے شیخ الاسلام چشتی کے مرید تھے۔ بعد میں مدوی  
سلسلہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایوان اور نواب تلاء نامی حوض تیار کرایا گیا۔ اور  
اس حجرہ کو ”عبادت خانہ“ کا نام دیا گیا جو بعد میں ”عبادت خانہ“ ہو گیا۔ ملا شیر نے اس کے بارے میں ایک قصیدہ کہا تھا۔ جس کا  
ایک شعر ہے۔

دریں ایام دیدم جمع ہا اموال قارونی  
عبادت ہائے فرعونی عمارت ہائے شدادی

**عبادت خانہ کی محفلیں** | اکبر کا معمول تھا کہ ہر حجرہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجلس

منعقد کرتا تھا۔ اس محفل میں نامی گرامی علماء مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسروں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

اسی محفل میں ایک دن جلال خاں قوپچی نے جو میرا محسن اور کرم فرما تھا، اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث سے ملنے آگرہ گیا تھا، ان کا افلاس کے مارے ایسا برا حال ہے کہ ایک دن انہوں نے چند سیر چنے منگائے جس میں سے کچھ تو خود کھائے کچھ مجھے دے دیئے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے بھیج دیا۔ یہ سن کر اکبر بہت متاثر ہوا اور شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ سے بلوا کر اسی عبادت خانہ میں ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔

مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو بھی محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علماء اور امرار بھی حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشیمن لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور لوگ آپس میں بڑی بدتمیزی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے، اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا کہ امرار تو مشرقی جانب بیٹھیں، سادات مغربی جانب، علماء کی نشست جنوبی حصہ میں اور مشائخین شمال میں بیٹھا کریں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جا کر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر طرح طرح کی خوشبوؤں سے پوری مجلس ملک اٹھتی تھی اور بادشاہ مستحق لوگوں کی جو مقربان دربار کے وسیلہ سے وہاں پہنچ جاتے تھے، حسب مدارج مالی امداد بھی کیا کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خاں گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری نفیس اور قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علماء میں تقسیم کیا۔ مجھے بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک کتاب ”انوار المشکوٰۃ“ تھی، جس میں ”مشکوٰۃ الانوار“ کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا۔ جو کتابیں پنج گینے وہ امرار کو دوسرے تحفوں اور اشیاء کے عوض عطا کیں۔ مال غنیمت کو اکبر ”ارہاس“ یعنی زوال دشمن کہا کرتا تھا۔

ایک رات اسی محفل میں علماء کی مجلس میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا اور وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور و غل سے بادشاہ نے برہم ہو کر مجھ سے کہا ”اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا۔ میں اس کو مجلس سے اٹھا دوں گا میں نے اس وقت چپکے سے آصف خاں کو کہا۔ اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا، اکبر نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پوچھا کیا کہہ رہے ہو؟“ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ دہرا دیا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری | اس محفل میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو چھیرنے اور تنگ کرنے کے لیے اکثر بلایا جاتا تھا۔ اس کم سن عالم کو شیخ ابوالفضل جو اب ایک

فقیہ دین کا مجتہد بنا بیٹھا تھا اور اس جیسے دوسرے نئے نئے باریافتہ لوگ بحث و مباحثہ میں الجھا کر کھلونا بنا لیتے اور اس کی ہر بات کو کھٹ ملٹ کر دیا کرتے تھے۔ ان مباحثوں کے دوران میں اکبر کا اشارہ پا کر بعض مصاحب اور امیر بھی الٹی سیدھی فرضی باتیں بتاتا کر اس پر فقرے چست کیا کرتے تھے۔ اس کا بڑھا پان سب کے ہاتھوں میں اچھا خاصا کھیل بن گیا تھا۔

ایک مرتبہ اسی شبینہ محفل میں خان جہاں نے کہا مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں۔ بلکہ ایک طرح سے

طرح سے گناہ ہے جب لوگوں نے بوجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قریب باشوں کی لوٹ مار سے پر خطر ہے اور اگر سمندر کے راستہ جائیں تو فرنگیوں سے پر وادہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے ان کے پر وادہ راہداری پر حضرت عیسیٰؑ اور نبی بنی مریمؑ کی تصویر چسپاں رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے، اس لیے یہ دونوں راستے حج کے لیے بند ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق خان زماں نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ حیلہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر سارا مال متاع اپنی بیوی کے نام کر دیتا ہے اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام پر واپس لے لیتا ہے۔ غرض خان زماں نے مخدوم الملک کی کنجوسی، زوالت احتیاجات، مکاری اور دنیا داری کے بہت سے قصے سنائے اور اس نے علماء، مشائخین خاص طور سے پنجاب کے مستحق لوگوں پر جو جو زیادتیاں کی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے بتائیں۔ پس پھر کیا تھا بہت سے لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور لوگ اس کی امانت اور ندامت کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر قصے سنانے لگے آخر میں یہ طے پایا کہ اسے حج کے لیے زبردستی کہ معظّمہ روانہ کر دیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تم پر حج فرض ہے؟ تو اس نے جواب دیا نہیں۔

ان دنوں مخدوم الملک کا ستارہ زوال میں آچکا تھا اور دربار سرکاری میں شیخ عبدالنبی کا سورج چمکنے لگا تھا چنانچہ **شیخ عبدالنبی** بادشاہ تعلیم و احترام کی وجہ سے بھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود اس کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو اکبر نے اس کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعلیم کے لیے اس کے حجرہ میں بٹایا گیا تھا۔ وہ عموماً ملامتاً عبدالرحمن دہلوی کی ”چہل حدیث“ کا درس دیا کرتا تھا۔

شیخ عبدالنبی کو محدثی، ماضی اور راجی کا بڑا دعویٰ تھا، لیکن علمیت کا یہ حال تھا ”الحزم سوء ظن“ کی حدیث جب بھی سناتا تو ہمیشہ ”الحرم“ کو ”الحزم“ ”ح“ کے بجائے ”خ“ اور ”ز“ کے بجائے ”ر“ پڑھا کرتا تھا۔ مذہبوں تک اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہ ہوا جس وقت بادشاہ اس سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور ملاؤں کا گردہ دربار سے نکل گیا تھا، مرزا عزیز کو کہ نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ علم حدیث میں اس کی یہ قابلیت ہے جس پر وہ نازیکیا کرتا ہے، آپ نے اس کو سر پڑھا رکھا تھا، اس لیے اس کا مزاج عیش پر جاپتھا۔

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ ”جب تک کہ مہاکمہ محرمہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف پر نہ آئیں“ **شیخ عبدالنبی کا غرور و تکبر** اتفاق اور معاش کے فرامین پر صدر ریشہ شیخ عبدالنبی کی مہر نہ گواہیں ”کر وڑی“ ان کی زمینیں اجراء نہ کریں۔ اس فرمان کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر کبھرتک کے اہل غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی سفارش کسی امیر اور مقرب نے کر دی تو اس کا کام حسب منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کا وسیلہ نہیں ملا وہ بچا سے سید عبدالرسول اور شیخ کے دوسرے کا زندہ دل کے پاس دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ شیخ کے فراموش دربانوں، ماسکینوں اور حلال خوروں تک کہ بیماری بھاری رشتہ میں دے کر ان غریبوں نے اپنا کام بنایا اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ بہت سے بد نصیب اس مجرم میں گرمی کی تاب نہ لا کر وہیں جہاں بحق ہو گئے۔ اس کی بادشاہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔

لیکن وہ اس صدرِ عالی قدر کی تعظیم کے منافی کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس لیے بادشاہ نے اس کے منہ پر کوئی بات نہ کہی۔ جس وقت وہ اپنی مسندِ جاہ و جلال پر متمکن رہتا تھا اور عالی مرتبہ امیرِ اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کے پاس جاتے تھے تو اس کے تیور بس دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ تعظیم و تکریم کا کیا سوال وہ ہر ایک کو برا بھلا کہنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے پر اتر آتا تھا اور جب بچا بڑی عاجزی اور خوشامد کرتا تو ان عالموں کے لیے جو ہدایہ اور دوسری منتهی کتابیں پڑھا سکتے تھے سو بگیمہ کے لگ بھگ کی اراضی منظور کر کے باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت دراز سے قابض تھے قلمزد کر دیتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ ہندوؤں تک کو اچھی اچھی زمینیں از خود عطا کر دیتا تھا۔ اس طرح اس کے ہاتھوں علم کی بھی اور عالموں کی بھی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اپنے اجلاس پر دوپہر کے بعد جب وہ نہایت غرور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا ہوا وضو بنا رہا تھا تو اس کے مستعملہ پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گر رہے تھے اور اس کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقہاء کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے اور خوشامد چا پلوسی اور اس کی دلجوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھا رہے تھے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور بدیہ نہیں رہا۔ جتنا کہ شیخ عبد النبی کو حاصل ہو گیا تھا ہے

دوستائی اگر شود قاضی حکمائے کند کہ بکشندش

انہی دنوں بادشاہ نے مجھے امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا بیستی عہدہ منصب امامت پر تقرر کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ کراؤ۔ اسی زمانہ میں شیخ ابوالفضل بھی دربار میں نیا نیا پہنچا تھا اور جیسا کہ شبلی نے جنید کے متعلق کہا تھا کہ ”ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں“ میرا اور ابوالفضل کا معاملہ یکساں ہی تھا، لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی جب بادشاہ نے ”بیستی“ کے عہدہ کے لیے گھوڑے داغ کرانے کے متعلق فرمایا تو اس نے فوراً ہی ”داغ اور محلہ“ کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کر لی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے نا تجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے ملازمت کی اس پیش کش کو قبول نہ کیا۔ اس وقت مجھے یہ مضحکہ انگیز شعریاد آگیا تھا جو کسی سید نے اپنے بارے میں کہا تھا ہے

مراد اخلی سازی و بیستی

ہینا و مادر بایں بیستی

میں بس اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد و معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی اراضی وغیرہ عنایت فرما دیں تو ایک گوشہ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف رہوں گا۔ کیوں کہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہو سکتی ہے

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذر

جاہ دین بس بود دولت اسلام ترا



لیکن میری بد نصیبی دیکھو مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا۔ آخر ماہ شوال ۸۳ھ میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا اور مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بگیا اراضی عطا فرمائی جو اس زمانہ میں بیس گھوڑوں کے مقررہ راتب کے لیے کافی ہو جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے صیغہ میں رکھا گیا تھا۔ میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر اراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا، لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی۔ بادشاہ نے صرف یہ فرمایا، لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمہیں دیا جاتا رہے گا۔ اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔ جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ اب تک کہ بائیس سال ہو چکے ہیں بجز ایک دو بار کے پورا نہیں کیا گیا۔ وہ وعدہ تو بس ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض میں خواہ مخواہ ان بیہودہ بندشوں اور لا حاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات لے

یا وفا یا خبر وصال تو یا مرگ رقیب !

باز بے چرخ ازیں یک دوسہ کارے بکند

بہ ہر حال جس طرح بھی گزری اور گزر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہیے۔

بہ ہمہ حال شکر باید کرد

کہ مبادا ازیں بتر گرد

جن فضول مشغلوں میں یہ عمر کٹی ان کے حسب حال فضول بغدادی کا یہ قطعہ ہے جو اس نے حیرتی سمرقندی پر شاہ طہماسپ کے التفات و توجہ کے بارے میں کہا تھا:

من ز خاک عرب حیرتی از ملک عجم ہر دو گشتیم با ظہار سخن کام طلب

یا فتم از دو کرم پیشہ مراد دل خویش از شاہ عجم و من نظر از شاہ عرب

**مسئلہ تعدد ازدواج** | اس زمانہ میں اکبر نے علماء سے سب سے پہلے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کو نکاح میں رکھنا درست ہے؟ علماء نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھنا

منع ہے۔ اکبر نے کہا ”ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وہ آزاد ہوں یا غلام اب اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟“ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا ”ہم نے شیخ عبدالنبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے“ علماء نے کہا ”ہاں ایک مجتہد ابن ابی یعلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک: ”ناکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلاث ورباع“ کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں ان پر عمل درست نہیں ہوگا۔“ بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کرایا ”اس نے جواب دیا“ میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا۔“ عبدالنبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے کہا ”اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منہ بستی کہ اس وقت تو کچھ کہا تھا اور اب وہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔“ بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل کشک گیا۔

بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علماء نے بڑے رد و بدل اور اختلافی روایتوں کو جمع کر کے آخریہ فتویٰ دے دیا کہ ”متعہ کے طریقہ پر جتنی عورتیں چاہیں نکاح میں رکھنا مباح ہے۔“ اور یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔ شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو دوسرے بچوں زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حالانکہ اہل سنت کا یہ رویہ نہیں ہے۔ غرض اس معاملہ میں بڑی بحثیں اٹھیں۔ ان کا خلاصہ نجات الرشید میں بیان کیا گیا ہے۔ نقیب خاں نے امام مالک کی ”موطا“ دکھائی کہ اس میں تو ایک حدیث سے صراحتاً متعہ کی ممانعت نکلتی ہے۔

ایک رات ”انوپ تلاء“ کے حجرہ میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب شیخ ابوالفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت شیخ ابوالفضل نے علماء کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا ”تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے عرض کیا ”ان تمام مختلف روایتوں اور طرح طرح کے مسلکوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک باتفاق مباح ہے اور امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے۔ اور جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی باتفاق مباح ہو جاتا ہے۔ بس یہی ایک کانٹے کی بات ہے۔ اس کے علاوہ قبل و قال اور جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں۔“ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے اس وقت مجھ سے بہت بحث کی۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ”جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے۔“ اپنے اس دعویٰ پر امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو میں نے بطور دلیل پیش کیا، نیز میں نے شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے تو انہوں نے شافعی مذہب کے طریقہ پر سورۃ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل پر علماء نے بڑے طعنے دیئے تھے۔ لیکن دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز بلکہ مستحسن ہونے تک کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ کہیں تو قاضی یعقوب کو قائل ہونا پڑا اور اس نے عاجز ہو کر کہا ”میں کیا کموں متعہ کا مباح ہونا مبارک ہو۔“ بادشاہ نے فرمایا ”اس مسئلہ میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔“ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بوڑھے عالموں صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہو گیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے اور ان کی معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر سارے مالک محروسہ کا قاضی بنا دیا اور قاضی یعقوب کو گورد (بنگال) کی قضاوت پر بھیج دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا۔ یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آ گئی۔

اسی زمانہ میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ پوری طرح تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ لگائیں۔ اس سلسلہ میں سب جگہ فرامین بھی جاری کر دیئے گئے لیکن جلد ہی یہ حکم اٹھایا گیا۔ اسی

”جزیہ اور اللہ اکبر“

لے جزیہ ۱۔ اکبر سے پہلے بھی غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا قاعدہ تھا جو کبھی کبھی موقوف بھی ہو جاتا تھا۔ جزیہ کی معافی کا سن ۹۸۷ھ میں دیا ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے وہ معاملہ نہیں تھا جو پہلے سلاطین کا رہا تھا وہ انہیں اپنا بنائے رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا، چنانچہ جلوس کے پہلے سال ہی اس نے جزیہ معاف کر دینا چاہا تھا سترہ جلوس میں دوبارہ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو علماء کی مخالفت کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جاسکا۔ لیکن عملاً اکثر مقامات پر جزیہ موقوف ہو گیا سترہ میں اکبر نے دوبارہ جزیہ لگانے کا حکم دیا لیکن جلد ہی منسوخ کر دیا گیا۔ آخر ۲ جلوس ۹۸۸ھ میں اکبر نے مستقلاً معافی جزیہ کا حکم جاری کر دیا۔

زمانہ میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم اپنے سکے اور قمر میں اللہ اکبر درج کروائیں تو کوئی ہرج تو نہیں؟ اکثر نے تو جواب دیا کہ یہ بہت بہتر اور اچھا ہے۔ لیکن حاجی ابراہیم نے مخالفت کی کہ ”اس سے تو کچھ اور باتوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اگر آیت ”وللہ اللہ اکبر“ کو نقش کرایا جائے تو یہ احتمال رفع ہو جائے گا۔“ اکبر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور کہا ”یہ تو قطعی بات ہے کہ بندہ سے اس عاجزی کے باوجود خدائی کا دعویٰ سرزد نہیں ہو سکتا، ہمارا مقصد تو صرف لفظی مناسبت ہے۔ اس بات کو دوسری طرف لے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟“

اسی سال بادشاہ نے مسئلہ متعہ کی تحقیق سے پہلے ہی سید محمد میر عدل کو جس کا بادشاہ بڑا لحاظ کیا کرتے تھے، بکر کی طرف نامزد کر دیا تھا۔ ان کو شمشیر خاصہ گھوڑا اور پوشاک مرحمت کی گئی۔ ان کا وہاں جانے کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ”میر عدل“ کے اہم منصب پر ان جیسا کوئی شخص مامور نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں ایک دن حاجی ابراہیم سرہندی نے سرخ اور زعفرانی لباس کے جوار کا فتوے دے دیا تھا اور ایک حدیث بھی پیش کی۔ میر عدل (مرحوم) نے بھرے دربار میں اس کو بد نعت اور ملعون کہا اور گایاں دیتے ہوئے اس کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

**حکیم ابوالفتح گیلانی اور ملا محمد یزدی** | اسی سال حکیم ابوالفتح گیلانی اور حکیم ہایوں جس کا نام بدل کر پہلے ہایوں تھا پھر حکیم ہام رکھا گیا تھا اور نور الدین قراری تینوں بھائی گیلان سے دربار میں حاضر ہوئے۔ بڑے بھائی نے آتے ہی ہاتھ پیر نکالے اور خوشامد اور جی حضوری کر کے وہ بادشاہ کے مزاج پر حاوی ہو گیا۔ دین و مذہب میں اختراعات کر کے بہت جلد اس نے بڑا تقرب حاصل کر لیا۔

کچھ عرصہ بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر یزدی کہا جاتا تھا ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا، چنانچہ وہ صحابہ پر زبان طعن دراز کرتا تھا اور بادشاہ سے مہمل اور جھوٹے قصے بیان کرتا رہتا تھا۔ بیربر حرام زادہ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس یزدی سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کر دیا اور روحی نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے۔ میں ان لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا ان بد نعتوں کا جو انجام ہوا وہ حسب موقع انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

ان دنوں بادشاہ کے حکم سے علماء قرآن مجید کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں ان کے درمیان بڑے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ دیپ چند راجہ منجمولا مسخر اکا کرتا تھا اگر حق تعالیٰ کے پاس گائے معزز نہ ہوتی تو پھر قرآن کے پہلے سورہ میں اس کا کیوں ذکر آتا۔ جب کبھی شاہی محفل میں تاریخ کے مباحث چھڑ جاتے تو صحابہ کے متعلق اکبر کا اعتقاد اور بھی گھٹ جاتا۔

بے دینی کے یہ سارے اسباب جب جمع ہو گئے تو اکبر ناز و زور اور دوسرے مسائل سے منحرف ہو گیا اور ان کا نام اس نے ”نقلداریات“ رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں۔ پھر ”نقل“ کے بجائے ”عقل“ پر دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فرنگیوں کی آمدورفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کر لیا۔

لے اہل فرنگ سب سے پہلے اکبر کے دربار میں مشہور ہوئے تھے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے سورت پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکبر نے جب اس کا محاصرہ کر لیا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اہل فرنگ کو بلایا تھا۔ یہ اس کی مدد کو آئے تھے اندر ہی اندر قلعہ پر قبضہ کر لینے کے منصوبے تھے۔ لیکن جب شاہی فوجوں کو فتح چلائی (باقی حاشہ لگے صوفیہ)

ہر خیالے کہ عقل شاں جدد

چرخ بر عقل اہل آں خندد

**شیخ بدرالدین کی عزیمت** | اسی سال شیخ الاسلام چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین نے جو صاحب سجادہ تھے، شاہی ملازمت سے توبہ کی اور اپنے باپ کی طرح گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت، ذکر و فکر اور تلاوت و تلقین کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ ایک رات بادشاہ نے ان کو عبادت خانہ میں بلایا، وہ آئے تو پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے۔ بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے ان کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ قصہ اور کچھ اور اسباب ایسے ہوئے کہ وہ تین چار سال بعد ہی غیرت کے مارے بلا اطلاع اجیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے، پھر تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصالی روزہ رکھا کرتے تھے اور پتی دھوپ میں نشے پیرطواف کرتے رہتے تھے۔ اسی حال میں وہ اپنے رب سے جا ملے۔

کمال از کعبہ رفتی بردیار

ہزاراں آفریں مردانہ رفتی

**چوتھے وید کا ترجمہ** | اسی سال شیخ بہاؤن جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہو کر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ "بیداترین" کا جو ہندوؤں کی چوتھی مشہور وید ہے اور اس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں، ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔ اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اسکی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا۔ اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میں نے جب یہ مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کر دیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کر سکا۔ اس بید کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک کہ ایسی عبارت جس میں "لام" بہت آتے ہیں جیسے کلمہ طیبہ لا اللہ الا اللہ پڑھی نہ جائے نجات نہیں ہوگی۔ ایک اور حکم ہے چند شرائط پر گائے کا گوشت کھانا مباح ہے۔ دوسرے یہ کہ میت کو دفن کیا جائے جلایا نہ جائے۔ اسی بید کے احکام کو پیش کر کے شیخ بہاؤن نے ہندوستان کے اکثر برہمنوں کو بحث میں لاجواب کر دیا اور اسی کی وجہ سے اس نے اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

لے بلوک میں نے آنکھ اکبری کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ اس وید کا ترجمہ ہو چکا تھا۔

دقیقہ حاشیہ مغربی سابقہ، تو یہ مکار تھے مخالف لے کر سفیروں کے ہمیں میں بادشاہ کے پاس ماریا ہوئے اور خلعت و انعام لے کر رخصت ہو گئے۔ پھر اکبر نے کئی سال بعد خود حاجی حبیب اللہ کاشی کو گوا بھیجا تاکہ وہ یورپ کے تحفہ فرنگیوں سے لے کر آئے۔ کاشی شکوہ میں یورپ کا ساز و سامان اور اہل ہندو کمال کی ایک جماعت کو لے کر دربار میں واپس آیا۔ ان مخالفین سب سے پہلے آرگن دارنوں، ہاجا بھی ہندوستان میں آیا تھا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ۱۵۷۷ء کے ذیل میں لکھا ہے کہ کوچ ہمارے راجہ کا جس وقت اطاعت نامہ آیا تھا تو اس قافلہ کے ساتھ ناب بار سو ایک فرنگی تاجر بھی حاضر ہوا تھا۔ ایک اور یورپین ہاسو بارن کا نام بھی ملتا ہے جو اس نساد میں دربار میں حاضر ہوا تھا۔ ابوالفضل نے جلوس کے مشاعرے میں گوا کے ایک پادری فریبتوں کا حال بھی لکھا ہے کہ وہ بڑا عالم تھا۔ شہزادوں کو پڑھانے اور یونانی کتب کے ترجمہ کا کام اس کے سپرد ہوا۔ اقبالی نامہ میں سندنہ چالیسویں جلوس میں بھی پادریوں کے ایک وفد کی حاضری کا حال لکھا ہے۔ ہلایونی نے لکھا ہے کہ یہ عیسائی اپنے ساتھ انجیل اور تثلیث کا عقیدہ لے کر آئے۔ اکبر نہایت سے متاثر ہو گیا تھا۔ ان کی بڑی خاطر کرتا تھا تو ریت اور انجیل کے ترجمہ کا بھی حکم دیا تھا۔ ان کی عبادت کے موقع پر بادشاہ ناقوس اور باجے سنا کرتا تھا۔

**گلبدن بگم کی جج پر روانگی** | اسی سال ماہ شعبان میں بابر بادشاہ کی صاحبزادی گلبدن بگم جو بادشاہ کی چھوٹی بیٹی تھی، ہوتی ہیں، نور الدین محمد مرزا کی بیٹی سلیمہ سلطان بگم کے ساتھ جو پہلے بیرم خان خاں خانہ کے عقد میں تھیں، بعد میں بادشاہ کے نکاح میں آگئی تھیں، جج کے لیے روانہ ہوئیں۔ انہیں ایک سال تک گجرات میں ٹھہرنا پڑا، پھر انہوں نے حجاز پہنچ کر چار جج کیے۔ واپسی کے وقت ان کا جہاز ٹوٹ گیا۔ اس لیے عدن میں ایک سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ دونوں ہندوستان کو ۹۹ھ میں لوٹ کر آئیں۔ اس وقت سے پانچ چھ سال تک بادشاہ کا یہ معمول رہا کہ وہ دربار کے کسی امیر کو "امیر الحاج" بنا کر لوگوں کو جج پر جانے کی عام اجازت دیتے تھے۔ اور حاجیوں کو سفر خرچ نقد روپیہ اور بھاری تحائف دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ درخواست کر دیا گیا۔

**مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد** | مرزا سلیمان بابر کے زمانہ سے بدخشاں کا مستقل حاکم تھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا، آخر میں جب اس کا مقابلہ پیر محمد خاں اوزبک اور اس کی بیوی ولی نعمت بگم کی فوجوں سے ہوا تو اس کا لڑکا ابراہیم مرزا مارا گیا اور مرزا سلیمان سخت مشکلات میں پھنس گیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم مرزا کا لڑکا شاہرخ مرزا باغی بن بیٹھا اور اس نے خروج کر کے سارے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ مرزا سلیمان کے لیے بدخشاں میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پہلے تو کابل میں مرزا محمد حکیم کے پاس مدد لینے آیا، لیکن جب دیکھا کہ مرزا حکیم مدد دینے پر راضی نہیں تو اس نے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ ایک رہنما فوج کر دی جائے تاکہ وہ اسے نیلاب (انگ) کے کنارے تک خطرناک مقامات سے بچاؤں۔ مرزا نے بڑے ناز و تحروں کے بعد اس کے ساتھ ایسے آدمیوں کو کر دیا جو پہلی ہی منزل پر اسے تنہا چھوڑ کر کابل کو بھاگ گئے۔

مرزا سلیمان تنہا بے سروسامان اپنی ایک لڑکی کو لیے ہوئے ہندوستان کے راستے پر سفر کرتا رہا۔ بعض مقامات پر پٹھانوں نے اس کا راستہ بھی روکا۔ مرزا سلیمان بہادری کے ساتھ لڑتا بھر داتاں سے بچ کر نکل آیا۔ اسی مقابلہ میں اسے ایک تیرکا زخم بھی لگا۔ غرض وہ نہایت پریشانی کی حالت میں نیلاب (انگ) کے کنارے پہنچے، یہاں کامیاب ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے دو تین ذاتی گھوڑے عرضی کے ساتھ اکبر کے دربار میں روانہ کیے۔ بادشاہ نے آغا خان خزانچی کے فدیہ بچاس ہزار روپیہ قیمت تھے اور چند عراقی گھوڑے مرزا کے استقبال کے لیے روانہ فرمائے۔ اس سے پہلے ہی راجہ بھگوان داس حاکم لاہور حسب فرمان پیشوائی کے لیے پہنچ چکا تھا اور ہر روز شاہی مہانوں کی ضیافت و خاطر داری کر رہا تھا۔ راستے میں بھی جتنے حکام اور اراکے تھے وہ بھی مہانداری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ غرض مرزا سلیمان کو پورے اعزاز و احترام کے ساتھ دارالخلافہ لایا گیا۔ اسی دوران میں اکبر نے گجرات سے خان اعظم کو بھی بلا لیا۔ اس جشن میں شرکت کے لیے وہ نہایت تیزی سے یلغار کرتے ہوئے ۴ رجب ۹۸۸ھ کو فتح پور پہنچ کر باریاب ہوا۔ ایک دن خان اعظم نے موقع پا کر داغ کے قانون اور کروڑیوں کے مظالم، فوج کے مالی معاملات، رعایا کی عام بد حالی اور بادشاہ کی بدعتوں کے متعلق کھری کھری باتیں سنائیں اور ان امور کے متعلق بڑی جرأت کے ساتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکبر کو اسکی باتیں بڑی تلخ معلوم ہوئیں اور وہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اس حق بات کو برداشت نہ کر سکا اور اسے حکماً کورنش سے روک دیا اور اس پر بادشاہی محافظ بھیجا۔



مقرر کر دیئے کہ دوسرے امیر بھی اس سے ملنے نہ پائیں۔ چند دن بعد اکبر نے خان اعظم کو آگرہ بھیج دیا وہاں سے اسکے باغ میں نظر بند کر دیا گیا۔  
**مرزا سلیمان کا شہانہ استقبال** | مرزا سلیمان جب متواتر کوچ کرتے ہوئے لاہور سے متھرا پہنچا، تو بڑے بڑے  
 امراء اور قاضی نظام بدخشی جس کو مرزا سلیمان نے قاضی خاں کا خطاب دیا  
 تھا اور اکبر کے دربار سے اسے غازی خاں کا خطاب مرحمت ہوا تھا، استقبال کے لیے گئے۔ مرزا سلیمان اس سال ۵ ارجب  
 ۱۵۵۷ء پور کے قریب پہنچا۔ اس کی پیشوائی کے لیے دربار کے مصاحبین اور معزز لوگ بھیجے گئے۔ پھر خود بادشاہ تمام امرا  
 کے ساتھ پانچ کوس تک اس کو لانے کے لیے تشریف لے گئے۔

مرزا سلیمان کا استقبال بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا۔ چنانچہ اس دن راستہ کے دونوں طرف پانچ ہزار ہاتھی  
 لکڑے تھے جن میں سے بعض پر تو فرنگی نخل کی اور بعض پر روحی زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سونے اور چاندی کی  
 بنجیروں سے آراستہ تھے۔ انکے سروں پر اور انکی گردنوں میں سیاہ اور سفید جھاریں لٹک رہی تھیں ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ سنہری  
 رین والے عربی گھوڑے بھی صف بستہ تھے۔ دو دو ہاتھیوں کے درمیان ایک ایک گاڑی تھی جس میں چھتے بند تھے۔ انکے گلے میں  
 نخل اور قاش کے سنہری پٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان گاڑیوں کے جوہل تھے ان میں سے ہر ایک کے سر پر ردوزی کے تاج رکھے  
 ہوئے تھے۔ اس ساز و سامان کی سنہری روپلی جھلمل سے جنگل میں بس آگ سی لگ گئی اور دشت و کسار لالہ زار بن گئے۔

مرزا سلیمان: تین واسطوں سے امیر تیمور کا پوتا تھا۔ مرزا سلیمان بن خان مرزا بن سلطان محمود مرزا بن سلطان ابوسعید مرزا بن امیر تیمور گورگان۔ بدخشاں  
 میں قدیم سے ایک خود مختار خاندان حکمران تھا جو خود کو سکندر کی اولاد بتاتا تھا۔ سلطان ابوسعید مرزا نے وہاں کے آخری بادشاہ سلطان محمد سے بدخشاں چھین  
 لیا۔ جب سلطان محمود مرزا کا انتقال ہوا تو ۱۵۵۵ء میں اس کے ایک سردار خسرو نے خسرو شاہ کے نام سے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ شاہ میں بابر نے خسرو کو یہاں سے  
 لیے دخل کر دیا اور ۱۵۵۷ء میں خان مرزا کو بدخشاں پر حاکم بنادیا۔ مرزا سلیمان کو بابر نے اپنے ساتھ رکھا۔ جس وقت سلطان سعید نے بدخشاں پر حملہ کیا تھا بابر  
 نے ہندوستان سے مرزا سلیمان کو بھیجا۔ سلطان سعید پہلے ہی ہندوستان کے مقابلہ سے بچ کر بدخشاں سے لوٹ گیا تھا۔ ہندوستان کو بابر نے وہاں سے بلا لیا تھا۔ اس لیے  
 مرزا سلیمان آسانی سے بدخشاں کا حاکم بن گیا۔ مرزا سلیمان نے چار بار کابل پر حملہ کیا لیکن کبھی اسے مستقل کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مرزا کامران نے ایک مرتبہ اس پر حملہ  
 کر کے اسے قید کر دیا تھا۔ ہمایوں نے بھی اس پر حملہ کر کے بدخشاں پر قبضہ کر لیا تھا بعد میں ہمایوں نے اسے دوبارہ بدخشاں کا حاکم بنادیا۔ حج سے واپسی کے بعد  
 ۱۵۵۷ء میں مرزا حکیم کے ساتھ بدخشاں پر حملہ کر کے اس نے اپنے پوتے مرزا شاہ رخ سے بدخشاں چھین لیا، پھر شاہ رخ نے اس کو ایبٹنگ کیا کہ وہ بخارا چلا گیا۔ وہاں  
 نے حاکم عبداللہ خان ہندک نے گرفتار کر لیا چاہا تو بھاگ کر حصار آیا۔ اس اثناء میں عبداللہ خان نے بدخشاں پر قبضہ کر لیا اور مرزا سلیمان اور ان کا پوتا شاہ رخ دونوں  
 بھاگ کر کابل آ گئے اور مرزا حکیم سے مدد لے کر ہندکوں سے عرصہ تک مقابلہ کرتے رہے۔ پھر ہمایوں ہو کر کابل آ گئے۔ اس وقت مرزا حکیم مرجا تھا اور مان سنگھ  
 نے اس کا صوبہ سنبھالا۔ اس نے دربار اکبری میں مجبوراً دیا۔ مرزا سلیمان نے ۷۷ برس کی عمر میں ۱۵۵۷ء بمقام لاہور انتقال کیا۔

مرزا سلیمان کا شوق: اکبر کو بارہ سال کی عمر سے ہی چیتوں کا شوق تھا۔ جب ہمایوں دوبارہ ہندوستان آیا تو سرہند کے مقام پر سکندر خاں افغان کو شکست  
 ہوئی اور مال قیمت میں اس کا ایک پالتو چیتا فتح باز نامی بھی پیش ہوا۔ چیتے بان کا نام دوندو تھا۔ جب دوندو نے اپنے کرتب اور چیتے کے ہزار یک تماشے میں  
 شہنشاہ کو اکبر کو یہ کھیل بت پسند آیا تھا۔ اس نے سینکڑوں چیتے جمع کر رکھے تھے۔ ان کو باقاعدہ سدھایا جاتا تھا۔ پنجاب میں شکار کے موقع پر ایک  
 ہرن پر شاہی چیتا چھوڑا گیا۔ ہرن نے ایک گڑھے پر سے چھلانگ لگائی۔ چیتے نے بھی اس کے پیچھے جست کی اور ہوا میں اس کو جادو بوجا۔ حیرت کی بات  
 یہ تھی کہ کبھی چیتوں کی تعداد ہزار تک نہ پہنچی۔ جب ایک دو کی کسر رہ جاتی تو کچھ نہ کچھ ایسا عارضہ ہوتا تھا کہ چند چیتے مرجاتے تھے۔ بادشاہ کو اور سب کو  
 اس مسلسل اتفاق پر بڑی حیرت رہتی تھی۔

جب مرزا سلیمان کی نظر دُور سے بادشاہ کی سواری پر پڑی تو وہ بے تکلف گھوڑے سے اتر کر دوڑنے لگا اور قریب پہنچ کر تسلیات بجالایا۔ شہنشاہ بھی ادباً گھوڑے سے اتر آئے اور اسے ان رسمی تکلفات کو ادا کرنے سے روک دیا۔ تپاک سے بغل گیر ہو گئے۔ ملاقات کے بعد دونوں سواری ہو کر باتیں کرتے ہوئے چلے۔ مرزا سلیمان کی مہمانی کا انتظام انوپ تلاؤ کے دولت کدہ میں کیا گیا تھا۔ اس وقت انوپ تلاؤ کے درو دیوار اور صحن کو منقش اور زرین سائبانوں سے سجایا گیا تھا۔ زرکار فرش بچھا ہوا تھا اور ہر قسم کا شاہانہ ساز و سامان سلیقہ سے جمایا گیا تھا۔ تخت سلطنت پر اکبر نے مرزا سلیمان کو اپنے پاس بیٹھایا اور شہزادہ کو بلا کر مرزا سے ملا دیا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے بدخشاں کی تسخیر کے لیے روپیہ اور فوج سے مدد دینے کا وعدہ کیا۔ مرزا کے ٹھہرنے کے لیے ہتیا پول کے برج میں جہاں نقار خانہ تھا ایک مکان کا انتظام کر دیا گیا۔

**فاتحہ خوانی کی بحث** | مرزا سلیمان کبھی کبھی راتوں میں عبادت خانہ میں آتا تھا اور علماء و مشائخین کی محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ اکثر اس پر وجد و حال طاری رہتا تھا اور بڑی اونچی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی اسکی ناز باجائے فوت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی میرزا نے اعتراض کیا کہ تم نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی۔ میں نے کہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے بعد فاتحہ پڑھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نے کہا ”ولایت ایران میں علم نہیں ہے علماء نہیں ہیں؛ وہاں تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے“ میں نے کہا ”ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے تقلید سے ہم کو کیا سروکار“ بادشاہ نے فرمایا ”بحث چھوڑو آئندہ پڑھ لیا کرو“ میں نے بادشاہ کے ارشاد کو قبول کر لیا، لیکن میں نے فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں جو روایت تھی وہ ان کے سامنے بیان ضروری کر دی۔ انہی دنوں اکبر نے ”تورہ چغتائی“ کی قدیم رسم کو جو متروک ہو چکی تھی، محض مرزا سلیمان کو دکھانے کے لیے دوبارہ رواج دیا۔ دیوان خانہ میں ایک بڑا دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور شکریوں کو رسما اس دست پر کھانے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جب مرزا چلا گیا تو یہ رسم بھی بند ہو گئی۔ اکبر نے مرزا سلیمان کی مدد کے لیے حاکم پنجاب خان جہاں کو فرمان لکھ دیا کہ وہ پانچ ہزار مسلح سوار لے کر میرزا کے ساتھ بدخشاں کو جائے اور میرزا شاہ رخ سے بدخشاں چھین کر میرزا سلیمان کے سپرد کر دے پھر لاہور کو لوٹ آئے۔ لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ چنانچہ معاملات نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کر لی۔

**منعم خاں خانان کی وفات** | منعم خاں خانان بنگال پر متعین تھا۔ جب داؤد سے صلح ہو گئی تو وہ ٹانڈہ سے جہاں کی آب و ہوا سے روکنا بھی چاہا لیکن موت ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آئی تھی اس لیے وہ باز نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی غراب آب و ہوا سے لشکر میں طرح طرح کی بیماریاں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا پھیل گئیں۔ روزانہ بے شمار آدمی ان بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے لگے۔ اس علاقہ میں ہزار ہا آدمی متعین تھے ان میں سے بہ مشکل چند سو اپنے اپنے وطن کو لوٹ کر آ سکے باقی سب وہیں پھونڈ خاک ہو گئے۔ ”چہرہ دامن گیر یارب منزلی بود“

لے مرنے والوں میں حاجی محمد خاں سیستانی بھی تھے جو میرم خاں کے زمانہ کے قدیم نبرد آزما سردار تھے۔ اشرف خاں میرٹھی بھی اسی وہاں میں فوت ہوئے۔

کثرتِ اموات کا یہ حال تھا کہ مردوں کو دفن کرنا ممکن نہ رہا تھا، مجبوراً ان کو پانی میں بہا دیا جاتا تھا اور ہر گھڑی کسی نہ کسی چرکے قوت ہو جانے کی خبر خانخانان کو مل رہی تھی۔ لیکن نہ معلوم اس کے کانوں میں کس غفلت کی روٹی بھری تھی کہ وہ اپنی ہمت سے نہ آیا اور اس کی نازک مزاجی سے ڈر کر امراء کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس سے سختی کئے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں۔ غرور نے ہی آکر اسے چونکایا، لیکن اب مہلت کہاں رہی تھی، خانخانان بھی ان وباؤں کا شکار ہو کر بسترِ مرگ پر اس طرح گرا کہ پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا انتقال دس رجب ۱۰۹۷ء میں ہوا۔

خان خانان نے اپنے پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا تھا۔ اس لیے اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا مال و متاع اور سرمایہ بقیہ سرکار بٹ کر یا گیا۔

چہ خوش گفت این نکته را نکته سنج  
کہ زرد کشد عاقبت گنج گنج

اس کے مرنے پر بنگال میں متعینہ امرار نے شاہم خاں جلائیر کو اپنا سردار بنالیا۔ جب خان خانان کی موت کی خبر پہنچی تو دوباراً سے خان جہاں کو خانخانان کا قائم مقام بنایا گیا۔ بادشاہ نے اسے زردوزی کی قبا اور چار سنہری تھال، مرصع شمشیر، سنہری زین، الا موڑ، امرحمت فرما کر بنگالہ کی حکومت پر متعین کر دیا۔

خانخانان کی وفات سے جو نئی صورت حال پیدا ہو گئی اس کے سبب میرزا سلیمان کی کمک کا ارادہ دگرگوں ہو گیا اور اکبر نے خود سلیمان کی درخواست پر سیاسی مصالح کی بنا پر مرزا کو سمندر کے راستہ حجاز روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے خزانہ سرکار سے پاس ہزار روپیہ اور گجرات کے خالصہ سے مزید بیس ہزار روپیہ دلو کر قلعہ خاں کے بدرقہ میں حج کے لیے رخصت کر دیا کہ وہ سے صورت کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھ کر لوٹ آئے۔ مرزا سلیمان نے اسی سال حج کی سعادت حاصل کی۔ پھر وہ وہاں سے اراق کے راستہ واپس ہوا اور دوبارہ بدخشاں کی حکومت حاصل کر لی۔

تو راہ نرفته از انا نمودند ورنہ کہ زداں در کہ پروکشوند

جب تک گوریں رہے صرف خانخانان ہی ایسا شخص تھا جو بیچارہ ہوا، لیکن جب وہ ٹانڈہ لوٹ کر آیا تو وہ بھی بیمار ہو گیا اور گیارہویں دن فوت ہو گیا۔

دربار اکبری کے اس نامور سپہ سالار اور پنج ہزاری امیر کا تعلق امرار کے کسی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ ایک ترک قبیلہ کا فرد تھا جن کا پیشہ سپاہ گری تھا اصل نام نعم بیگ تھا۔ باپ کا نام بیرم بیگ تھا۔ چالیوں کے لشکر میں معمولی درجہ سے ترقی کی، شہر شاہی معرکوں میں ساتھ رہا۔ ہالیوں کے دوران بار میں منعم خاں نے بڑے رک و قوتوں میں ساتھ دیا۔ چالیوں کی بانگاہ میں منعم خاں اور بیرم خاں دو ہی بہادر جاں قنار تھے جو بادشاہ کے دائیں بائیں سرفروشی کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

برک تھت نشینی کے وقت منعم خاں کی عمر ۶۵ برس تھی۔ جب بیرم خاں اکبر سے ناراض ہو کر مارا مارا پھر رہا تھا تو منعم خاں کو اکبر نے کابل سے بلا کر خانخانان بنایا۔

دو ترقی کر کے پنج ہزاری منصب اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز ہوا۔ منعم خاں ہمہ پند جو شہلا سپاہی نہیں تھا بلکہ مدبر ٹھنڈے مزاج کا سپہ سالار تھا۔

بدان میں مقابلہ کرنے سے پہلے وہ غلیم میں پھوٹ ڈال کر حکمت عملی سے ہی آدھا معرکہ پہلے ہی سر کر لیتا تھا۔ عام ترکوں کی طرح وہ بھی نجوم اور شگون کا بڑا مائل تھا۔ ہمدردی، اعلیٰ ظرفی، رفاقت، تدبیر و استقلال اس کے قابل تعریف اوصاف ہیں۔ مشرقی اضلاع میں منعم خاں کی پناہی ہوئی مسجدیں اور عمارتیں اور

دون پور کی تعمیریں اس کی یادگار ہیں دریائے گومتی کا پل بھی منعم خاں کا بنایا ہوا ہے جو شہرہ میں تعمیر ہوا اس کے خواب پر جو شعر ہیں ان میں سے دو شعر یہ ہیں :-

خانخانان خان منعم اقتدارہ بستہ این پل را بہ توفیق کریم، رہ بہ تاریخش بری گراگنی، لفظ بدرا از صراط مستقیم۔ خان مرحوم کے بیٹے کا نام غنی خاں تھا جو نالائق و ناخلف نکلا۔ کابل کے فساد کے بعد دکن چلا گیا تھا اور وہاں اہماہیم عادل شاہ کے پاس ملازم ہو گیا تھا (ماثر الامراء)

مرزا سلیمان نے ہندوستان سے لوٹتے وقت اپنی ایک لڑکی کا نکاح قندھار کے حاکم مظفر حسین مرزا سے جو اسی زمانہ میں لاہور آیا ہوا تھا کر دیا تھا اور دوسری لڑکی کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا تھا۔

**حسین خاں کا کوہستان پر حملہ** حسین خاں مرحوم جس سے میرے قدیم مراسم بلکہ دلی لگاؤ تھا۔ داغ محلہ کے قانون سے سخت عاجز ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں اسے بڑی پریشانیاں لاحق رہیں۔ جب وہ بہت تنگ آگیا تو اس نے اپنے خاص ساتھیوں کی جمعیت کے کرکانت و کولہ سے کوچ کیا اور بدراؤں اور سنبل سے گزر کر گنگا کو عبور کیا اور دو آبہ میں پہنچ گیا۔ اس علاقہ کے سرکش زہیندار عرصہ سے مالگزاروں کو روک رہے تھے، کروڑی بے چارہ کا کیا ذکر وہ سرکاری مطالبوں پر جاگیر و ازتک کو جواب نہیں دیتے تھے۔ حسین خاں نے ان کی سرکوبی کے لیے ہی یہ فوج کشی کی تھی۔ چنانچہ وہ ان سرکشوں کے خلاف فوجی کارروائی کرتے ہوئے شمالی کوہستان کے دامن تک جا پہنچا۔

جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں حسین خاں پر ایک مدت سے اس کوہستان کو فتح کرنے کی دُھن سوار تھی۔ اس کے تصور میں ہمیشہ یہاں کے بت خانوں کی سونے چاندی کی اینٹیں ہی جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اسی مفروضہ دولت کے لالچ میں کسی بھاری لشکر کو لیے بغیر ہی اس نے بسنت پور کا جاگیر محاصرہ کر لیا۔ بسنت پور کوہستان میں نہایت دشوار گزار بلندی پر واقع ہے۔ اسے اس مہم میں مصروف دیکھ کر کروڑوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ تھانیر کے کروڑی ملک الشرق گجراتی اور دوسرے کروڑی اپنے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔ اور حسین خاں کے متعلق یہ جھوٹی خبر اڑادی کہ وہ باغی ہو چکا ہے۔ دربار شاہی میں بھی عریضے بھیج کر اس کی اطلاع کرا دی۔

سعید خاں مغل کی حسین خاں کے ساتھ بڑی گہری اور دیرینہ دوستی تھی۔ وہ انہی دنوں ملتان سے دربار میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس سے حسین خاں کے حالات اور اس کی بغاوت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے اس کی تردید کر دی۔ بادشاہ نے اس سے رعایا کے تلف شدہ موشیوں اور مالی نقصانات کے سلسلہ میں حسین خاں کی طرف سے ضمانتی تحریر بھی مانگی تھی اور اس نے حسین خاں کی طرف سے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کی وجہ سے ان کی آپس میں جو دوستی اور محبت تھی وہ جاتی رہی۔

ایں دغل دوستاں کہ بے مہی  
مگسانند گرد شیرینی

پیش تو از نور موافق تر اند  
در عقب از سایہ منافق تر اند

حسین خاں کو قابو میں لانے کے لیے بادشاہ نے سید ہاشم ولد محمود بارہر اور میر سید محمد میر عدل کے لوگوں کو امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ بکر کی جانب بخصت کیا اور روانگی سے پہلے ہی حسین خاں کے لڑکے کو ان کی نگرانی میں دے دیا۔

**حسین خاں کا انتقال** حسین خاں بسنت پور کے کوہستان میں رہتے ہوئے زخمی ہو گیا۔ ایک گولی اسکے شانہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس مہم میں اس کے بہت سے تجربہ کار آدمی بھی ضائع ہوئے۔ جب وہ برطرف سے

مجبور ہو گیا تو ناکام و نامراد کوہستان سے لوٹ آیا اور کشتی میں سوار ہو کر دریائے گنگا کے راستہ پٹیالی کی طرف جہاں اسکے اہل و عیال مقیم تھے روانہ ہوا۔ لیکن جب گردھ مکتیسر پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کر لیا اور آگہ بے جا کہ حسب الحکم صادق محمد خاں کی حویلی میں نظر بند کر دیا۔ صادق محمد خاں سے ہندوستان کی فتح بلکہ قندھار کے زمانہ سے ہی دینی تعصب کے سبب اس کی



یہ بن رہتی تھی اور آج اسی کے گھر رہنے کی ذلت اسے برداشت کرنی پڑی۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بنیاطیب اس کے علاج کے لیے علاج پور سے آگرہ آیا۔ اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ حسین خاں کا زخم نہایت خطرناک ہے۔ بادشاہ نے معالجہ کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر ام المملکت کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد میری اس سے ملاقات ہوئی اور دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں کو سنبھالے نہایت رفت و حسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔

ہر جامن و معشوق ہم باز رسیدیم از ہم بد اندیش لب خویش گزیدیم  
بے واسطہ گوش و لب از راہ دل و چشم بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہے تھے کہ بادشاہی جراح آگئے اور انہوں نے ایک بالشت لبانشتر زخم میں ڈال کر اسے پیر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس بہادر نے اس نشتر زنی پر آف نہ کی نہ اسکی پیشانی پر کوئی بل آیا بلکہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا ہی رہا۔ وہ منظر قیامت کے نظارہ سے کچھ کم نہ تھا۔ جب میں اس سے مل کر رخصت ہوا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بس آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ فتح پور پہنچنے کے تین چار دن بعد ہی ہم کو اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے۔ سی عارضہ میں آخر کار وہ گھل گھل کر مر گیا۔ بلاشبہ وہ شہید تھا کیوں کہ کافروں کے لگائے ہوئے زخم ہی کی وجہ سے فوت ہوا۔

نیامد کسے درجہاں کو بماند

مگر آن کز و نام نیکو بماند

حسین خاں نہایت فیاض تھا۔ مستحقوں اور محتاجوں کے لیے مٹھی بھر بھر کر روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس کی یہ سخاوت اور دردمندی خراسان کے کام آئی اور اس کا کفن دفن خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی جیسے پایہ کے بزرگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہاں سے اسکی میت وٹھیلی کے گورستان میں جو اس کا خاندانی مقبرہ تھا لے جا کر سپرد خاک کیا گیا۔ اس کی تاریخ ”گنج بخش“ نکالی گئی۔ جس وقت میں بمبے کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس تو نگرد دل درویش دست کی وفات کی خبر میر عدل کو سنائی۔ وہ اس خبر کو سن کر زار و زار رونے لگے اور اس کی پاک دلی و دیرپا اور چستی کی بڑی تعریف کرتے رہے اور فرمایا جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے تو اسے اسی طرح زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہونا چاہیے جیسا کہ حسین خاں نے کیا اور جس طرح وہ دنیا سے رخصت ہوا۔ اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی بس آخری ہی تھی۔ انہوں نے بھی اس موقع پر خود فرمایا تھا کہ ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں؟ ان کی بات سچ نکلی اور وہ بھی جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حسین خاں کے اوصاف | میں تقریباً نو سال تک اس یگانہ روزگار حسین خاں کی خدمت میں رہا۔ سپاہگری اور دنیا داری کی ظاہر اوضاع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانہ کے بیشتر پیشواؤں و مرشدوں

میں ان کا عشر مشیر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ نہایت درست عقیدہ سنی تھا۔ بہت اور شجاعت میں بھی اسکی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ مزاج جیسا کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ یکساں ہوتا کرتا تھا۔ دنیا سے بے نیازی میں اس جیسا کسی کو نہ پایا۔ لوگوں کی خدمت میں ہر دم کوشاں



رہتا تھا تو کل اور زہد میں اس کے پایہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو دین اور مذہب کی یہ بے قدری دیکھتی نہ پڑتی جسے دیکھتے پر زمانہ نے مجبور کر دیا ہے۔

**سادگی اور انکسار** | جس زمانہ میں وہ لاہور کی حکومت پر مستقلاً فائز تھا میں نے معتبر آدمیوں کی زبانیں سنا کہ اس کی غذا محض  
اکرم کی متابعت میں صرف بخو کی روٹی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے وہاں کی ہزار ہا پرانی مسجدوں اور  
مقبروں کی مرمت اور تعمیر کرائی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی ہندو مسلمانوں کے بھیس میں اس کی مجلس میں آکر بیٹھ گیا وہ اسے مسلمان سمجھ کر  
بڑی تواضع اور انکسار کے ساتھ ملاقات کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے  
عام حکم دے دیا کہ آج سے تمام ہندو اپنی آستینوں کے کناروں پر کسی نہ کسی رنگ کی پٹی سی لیا کریں تاکہ ہندو مسلمان میں تمیز ہو سکے۔  
اسی حکم کی وجہ سے لوگوں میں اس کا نام ”تکریہ“ پڑ گیا۔ تکری پیوند کو کہتے ہیں جسے عربی میں غیار (بروزن دیار) کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد  
اس نے یہ حکم بھی نافذ کیا تھا کہ حکم شرعی کے مطابق کافرین کی سواری نہ کریں بلکہ جانوروں پر پالان باندھا کریں علاؤ الدین خلجی نے  
بھی ہندوؤں کو گھوڑے کی سواری سے منع کر دیا تھا بجوالہ فیروز شاہی برنی مترجم،

اس کی ہمراہی میں ہمیشہ سید اور اہل علم رہا کرتے تھے۔ ان کا ادب و لحاظ اس کو اس قدر تھا کہ محض اسی خیال سے کوئی  
بے ادبی نہ ہو جائے، سفر میں وہ کبھی سواری کی حالت میں نہیں سویا۔ مسجد کی نماز اس کی کبھی فوت ہوئی نہ جماعت۔ اور باوجود  
لاکھوں کروڑوں کی جاگیر کے اس کے طویلہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ کبھی نہ رہا۔ وہ بھی بعض اوقات چلے سفر میں ہو کہ  
حضر میں کسی نہ کسی مستحق کو بخش دیتا تھا اور خود پیدل ہو جاتا تھا۔ اس کے آدمیوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس دودو  
گھوڑے کوتل میں لگے رہتے تھے۔

”خان مغلس غلام باساں“

**دنیا سے بے نیازی** | اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کبھی مال جمع نہیں کرے گا۔ جب بھی اس کے سامنے سونا روپیہ لایا جاتا تو کہتا  
تھا کہ یہ تیر یا نیزہ ہے جو میرے پلو میں چمکا جا رہا ہے۔ جب تک وہ مال بخش نہیں دیتا اس کو چین نہیں  
پڑتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ پندرہ ہزار سے تیس چالیس ہزار روپیہ تک لوگوں نے پرگنوں کے حساب میں دہالیا اور اس نے کوئی  
دھیان دیئے بغیر فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کی اجرائی پر دستخط کر دیئے اور اس کے پاس صرف رسد کا حصہ رہ گیا۔  
اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ جو بھی غلام اس کے ہاتھ آئے گا وہ بس اسی دن سے آزاد ہو جائے گا۔ کبھی تین سے زیادہ عورتوں  
کو نکاح میں نہیں رکھا۔ اخروٹ کو وہ مسکرات میں سمجھتا تھا۔ اسی لیے اس کی حرمت پر اس کو اعتقاد تھا۔

ایک دن شیخ الہدیہ نے جو اس وقت کے بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے حسین خاں کے اس بے ہنگام اخراجات اور آڑے  
وقتوں کے لیے پونجی نہ رکھنے پر اعتراض کیا اور اس کو اس عادت کو چھوڑنے کی نصیحت کی۔ ان کی یہ بات بڑی ناگوار گزری  
امید پیش میں آکر کہا کہ اگر مال کو جمع کرنا جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو سنت رسول ہے تو سرتابی کی مجال نہیں اور اگر ایسا نہیں تو ہم لوگ تو  
تم جیسے رہبران دین سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ اگر ہم میں دنیا کی حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی رہ گیا ہے تو اسے تم دور کرنے کی  
کوشش کرو۔ نہ یہ کہ تم اس جہان فانی کی متاع حقیر و بے مایہ کو ہماری نگاہوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرو۔ اور اس طرح ہم کو اس کا

لاچی بادو کہ ہم نخل وخت کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں

قرار برکف آزادگان نگیرد مال

نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

میں اس کے ساتھ کسی میدانِ معرکہ میں شریک نہیں رہا۔ لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ان لڑائیوں میں میں نے ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی

**بہادری اور سخاوت**

ہے جس کا ذکر بس داستانوں کے معرکہ آراؤں کے متعلق ہی سننے میں آتا ہے۔ وہ نہایت قوی ہیکل اور انتہائی دلیر تھا۔ جنگ کے دن بس ایک ہی کلمہ وردِ زبان رہتا تھا "یا شہادت یا فتح" لوگ بہت کہتے تھے کہ حضور دعا میں فتح کو مقدم رکھیے۔ لیکن وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے زندہ لوگوں کی نسبت گزرے ہوئے لوگوں کے دیدار کا زیادہ اشتیاق ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو وہ پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہو جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چالیس پچاس عراقی اور ترکی گھوڑے کسی سوداگر کو اس کی بتائی ہوئی مجموعی رقم پر یہ کہہ کر اکٹھے خرید لیے کہ تو جانے اور تیرا خدا اور پھر وہ سب ایک ہی نشست میں اپنے رفیقوں کو بخش بھی دیئے۔ جن کو نہیں ملے ان سے عذر خواہی کرتا رہا۔

اس سے پہلی بار میں اس وقت ملا تھا جب کہ کرہہ کتنک پر لشکر کو متعین کیا گیا تھا۔ اس نے آگرہ میں ایک عراقی گھوڑا پانسو روپیہ میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمہ قرض تھی۔ قرض خواہوں کے ساتھ اس کی ایسی خوش معاملگی تھی کہ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے قرضہ کے دستاویز پھاڑ دیئے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور اس کے ورثہ سے قرضوں کا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہ کیا۔

میں اپنی اس کوتاہ زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ اب جب کہ میں پیری کی فلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی عنفوانِ شباب کا زمانہ اسی کی خدمت میں گزرا اور یہ اسی کی ہی توجہات کے طفیل ہے کہ میری نشوونما نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی کہ آج دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کر دیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کر دے۔

انہی دنوں خواجہ امین الدین محمود کا جو خواجہ امینا کے نام سے مشہور ہے انتقال ہو گیا اور اس کا چھوٹا **جلوس کا بائیسواں سال** ہوا کافی بڑا سرمایہ خزانہ عامرہ میں داخل کر دیا گیا۔ اسی سال کی ۱۷ ذی قعدہ کو بادشاہ نے اجیر

کا سفر کیا۔ بدستور سابق ایک منزل سے پیادہ جا کر مزار مبارک کی زیارت کی۔ اسی مہینہ کی نویں تاریخ کو سورج برج حمل میں داخل ہوا

۱۷ حسین خاں۔ ۱۸ اثر الامرا میں ہے کہ حسین خاں بیرم خاں کی خدمت میں تھا، ہائیوں کے ساتھ کئی معرکوں میں اس نے بہادری دکھائی اور ترقی پائی بعد ہی قاسم خاں ایک معرکہ ہائیوں میں اس کا نام تھا اپنی لڑائی میں اس کے عقید میں دسویں تھی۔ ابو الفضل نے اسے تین ہزاری کی فرست میں لکھا ہے۔ اس کا بیٹا یوسف خاں جاگیر کے دربار میں ایجنٹ۔ اس نے مرزا عزیز کو کہہ کے ساتھ دکن میں بڑی شجاعت دکھائی۔ ۱۹ جلوس جاگیر میں وہ شہزادہ پرویز کی مدد پر گیا تھا۔ یوسف خاں کا بیٹا عزت خاں شاہ جہان کے دربار میں ایجنٹ۔

اور جلوس شاہی کے بائیسویں سال کا آغاز ہوا۔

**خان جہاں کے نام فرمان** | اس موقع پر یہ خبر ملی کہ منعم خاں خاٹھاناں کے انتقال کے بعد بادشاہی امیر داؤد کے مقابلہ پر ٹھہرے۔ سکے گور اور ٹانڈہ سے سپاہ ہو کر حاجی پور اور پٹنہ آگئے ہیں۔ اور خان جہاں کا لشکر چونکہ ابھی تک لاہور میں رکھا ہوا ہے اس لیے وہ تیزی سے کوچ نہیں کر رہا۔ اکبر نے ترک سجان قلی کے ہاتھ خان جہاں کو تیزی سے روانہ ہونے کے لیے فرمان روانہ کیا۔ چنانچہ خان جہاں نے بائیس دن میں ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی بادشاہ اجیر ہی میں تھے کہ دوسری اطلاع ملی کہ خان جہاں نے کہہ ہی پہنچ کر داؤد کی پٹھان فوج سے ایک سخت جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار پٹھانوں کو قتل اور اسیر کر کے اب وہ آگے بڑھ چکا ہے۔

**رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر** | اوائل محرم ۸۴۷ھ میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتی کے روضہ میں ساتھ لے کر گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کوئٹہ اور کوئٹہل میر کے دارالحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا فوج کشی کے لیے مامور کیا۔ اس کی کمک کے لیے خاصہ کے اور دوسرے صیغوں کے پانچ ہزار سواروں کو امرار کی سرکردگی میں متعین فرمایا۔ اس مہم پر مان سنگھ کے ساتھ آصف خاں میرنجشی، غازی خاں بدخشی، شاہ غازی خاں تبریزی، مجاہد خاں، سید احمد خاں، سید ہاشم بارہ، ہنتر خاں خاصہ خیل اور دوسرے امرا بھی مقرر کیے گئے تھے۔

**جہاد کا شوق** | لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی تافضی خاں اور آصف خاں کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ہمراہ دو تین کوس تک جہاں ان امیروں کی چھاؤنی تھی گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ الاسلام شیخ عبدالنبی صدر کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انہوں نے حامی تو بھری لیکن میرے معروضہ کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمہ کر دیا۔ یہ صورت بالکل بے کار تھی۔ اور معاملہ میں تاخیر کا اندیشہ تھا۔ نقیب خاں کے ساتھ میرا اچھا خاصا یار اند تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا، پہلے تو اس نے مجھے روکنا چاہا اور کہا اگر ہندو اس لشکر کا سردار نہ ہوتا تو سب سے پہلے میں تم کو اجازت دے دیتا۔ میں نے خان کو بخوبی سمجھایا کہ ہم تو بادشاہ سلامت کو اپنا سردار مانتے ہیں، مان سنگھ وغیرہ سے ہم کو کیا غرض اور یہ معاملہ تو نیت کی درستی پر منحصر ہے۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جب کہ بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انہوں نے فرمایا اس کے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں وہ کس طرح جاسکتا ہے؟ نقیب خاں نے عرض کیا اس نے جہاد کی نیت کر لی ہے۔ بادشاہ نے مجھے بلا کر پوچھا، مصمم ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا "ہاں"۔ فرمایا "کیوں؟" میں نے کہا "میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جان تھاری کے ذریعہ دور کرتا چاہتا ہوں۔" اس پر فرمایا "ان شاء اللہ تعالیٰ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔" اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبہ میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے اور جب میں نے چبوترہ پر ہاتھ بڑھا کر پابوسی کا ارادہ کیا تو انہوں نے اپنے پیر کی پیچھے بے جس وقت میں دیوان خانہ سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایا اور دونوں ہاتھوں سے بھر کر ۵۰ اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ اس زمانہ میں شیخ عبدالنبی سے سابقہ رنجشیں دور ہو گئی تھیں اور وہ نجم پرہیزبان ہو گیا تھا اسی لیے میں اس سے بھی رخصت ہونے کے لیے گیا۔ اس نے مجھ سے کہا

یاد رکھنا جس وقت دشمن سے ٹھیکہ ہو تو چونکہ حدیث نبوی کے بموجب یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے تم مجھے دعائے خیر سے یاد کرنا اور بھونا نہیں۔ میں نے وعدہ کیا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر میں گھوڑا تیار کر کے اس لشکر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوشگوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخر کار ہم فتح نامہ اور اس ہاتھی کو لے کر جو رانا کیلک سے اس جنگ و جدال کا باعث ہوا تھا، فتح پور لوٹ آئے۔

**داؤد کی دوبارہ سرکشی** | اسی سال ۲۰ محرم کو کوکنڈہ کے لشکر کا انتظام کرنے کے بعد بادشاہ نے فتح پور کو مراجعت فرمائی اور وہاں پہلی ماہ صفر کو پہنچ گئے۔ انہی دنوں مخدوموں نے خبر پہنچائی کہ کربھی سے خان جہاں کے

آگے بڑھنے کے بعد داؤد ٹانڈہ سے نکل کر آک محل کے موضع میں جس کے ایک طرف تو دریا گنگا اور دوسری طرف پہاڑ ہے، آگیا ہے اور وہاں قلعہ اور خندق بنا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبداللہ اس خندق کی لڑائی میں مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف پٹھانوں کا سردار خان خانان بھی قتل ہو گیا ہے۔ اس اطلاع پر بادشاہ نے پٹنہ و بہار کے حاکم ظفر خاں کو لکھا کہ وہ ساری فوجیں اکٹھی کر کے خان جہاں کی کمک پر چلا جائے۔

**چوگان کی بازی** | ربیع الاول کے مہینہ میں بادشاہ میرزا محمد شریف کے ساتھ فتح پور میں چوگان کھیل رہے تھے۔ مرزا شریف نہایت ذہین، خوش مزاج اور خوش آواز نوجوان تھا۔ وہ کھیل کے دوران گھوڑے سے گر پڑا اور اسی وقت مر گیا۔ شہنشاہ اس ناگہانی حادثہ پر ششدر رہ گئے، ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا کریں قطب الدین آنکھ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا خداوند آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں یہاں سے تشریف لے چلیے، تب وہ چونکے اور محل کو واپس آ گئے۔ اس حادثہ کے متعلق شہر بلکہ سارے ملک میں کچھ اور ہی افواہ اڑ گئی۔ اس لیے بادشاہ نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق فرامین ہر جگہ روانہ کیے اور اس خبر سے جو شور و شریک اٹھنے لگی تھی دب گئی۔ یہ فرمان کوکنڈہ میں مان سنگھ اور آصف خاں کے نام بھی گیا اور لشکر میں جو رنج و ملال پھیل گیا تھا مسرت و خوشی میں تبدیل ہو گیا۔

**کوکنڈہ پر لشکر کشی** | کوکنڈہ اوائل ماہ ربیع الاول ۸۹۷ھ میں فتح ہوا، جس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ مان سنگھ اور آصف خاں اجمیر کی فوج کے ساتھ ماندل گڑھ کے راستہ متواتر کوچ کرتے ہوئے بلدہ تک جا پہنچے۔

یہ مقام رانا کیلک کے صدر مقام کوکنڈہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ رانا بھی مقابلہ کے لیے نکل کر آیا۔ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور ایک کے ساتھ بادشاہی امرا جیسے خواجہ محمد رفیع بدخشی، شہاب الدین کروہ، پایندہ قزاق، علی مراد اور بک، راجہ لون کرن حاکم سانجھ اور دوسرے راجپوت قزاق، قزاق، شکر پرستیں تھے اور بہادر نوجوانوں کی ایک جمعیت ہراول پر لگائی گئی تھی۔ انہی میں سے اسی سے

لے چوگان بازی۔۔۔ دس آدمیوں سے زیادہ حصہ نہیں لیتے۔ کھلاڑیوں کی دو دو کی جوڑی ہوتی ہے۔ اس کے کھیلنے کا طریقہ ”رول“ کہلاتا ہے جس میں گیند کو چوگان دبلہ کے خم میں لے کر سب کے درمیان سے نکال لے جاتا ہے اور میدان کے کنارے پہنچا دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تیزی سے گیند کو چوگان سے ضرب لگائی جاتی ہے۔ اور پھر کھلاڑی سب سے تیز آگے بڑھ کر دوبارہ گیند کو آگے بڑھاتا ہے۔ اسے ”بیلہ“ کہتے ہیں۔ اکبر عموماً بیلہ کے طریقہ پر چوگان کھیلتا تھا۔ جب گیند کو کھلاڑی ”حال“ یعنی مقررہ کنارہ پر پہنچا دیتا تو نقارہ بجا کر اس کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اکبر نے اندھیری راتوں میں بھی چوگان کھیلنے کا طریقہ نکالا تھا۔ گیند پلاس کی لکڑی کی بنائی جاتی تھی جس کی آگ دیر تک قائم رہتی ہے۔ اسی گیند سے اندھیرے میں چوگان کھیلا جاتا تھا۔ شاہی گیند پر سونے چاندی کے حلقے لگے ہوتے تھے۔ جب گیند ٹوٹ جاتی تھی تو جس کے ہاتھ آتے وہ ان حلقوں کو پالتا تھا (آئین اکبری)

زائد لشکریوں کو منتخب کر کے سید ہاشم بارہہ کی کمان میں ہراول سے آگے روانہ کیا گیا۔ اس قسم کے دستہ کو ”جوزہ ہراول“ کہتے ہیں۔  
مہمنہ پر سید احمد خاں بارہہ اور دوسرے امیر تھے اور میسرہ پرت قاضی خاں اور اس کے ساتھ سیکری کے شیخ زادے جو شیخ ابراہیم چشتی کے عزیز رشتہ دار تھے مامور تھے۔ چنداول (عقب) پر مہتر خاں سردار تھا۔

### راناکیکا کا زبردست حملہ

جب راناکیکا درہ کے پیچھے سے نکل کر آیا تو اس کا لشکر دھوڑوں میں بٹ گیا۔ اس کی ایک فوج جس پر حکیم سورا افغان سردار تھا ہراول کے مقابلہ میں پہاڑ کی مغربی سمت سے آگے بڑھی۔ اس وقت پہچ دار راستہ کے کٹاؤنا سمہواری اور جھاڑ جھنکار کی وجہ سے ”جوزہ ہراول“ اور ”ہراول“ ایک ہی راستہ میں خلط ملط ہو گئے اور غنیم کے مقابلہ میں مدافعت نہ جنگ کرتے ہوئے پسپا ہوئے۔ لشکر میں جو راجپوت تھے اور ان کی کمان راجہ لون کرن سانہری کر رہا تھا۔ وہ بھیدروں کی طرح بائیں جانب بھاگ نکلے اور ہراول سے گزر کر انہوں نے مہمنہ میں جا کر پناہ لی۔ اس وقت میں بھی ہراول کے سربراہ اور وہ سرداروں کے ساتھ تھا۔ میں نے آصف خاں سے کہا ”اس وقت ہم راجپوتوں میں اپنوں اور غیروں کی بھلا کس طرح تمیز کر سکتے ہیں۔“ اس نے حکم دیا برابر تیر اندازی کرتے رہو۔ یہ نہ سوچو کون زد میں آتا ہے۔ چنانچہ ہم برابر تیروں کی بوچھاڑ کرتے رہے اور اس پہاڑ جیسے انبوہ اور ہجوم میں ہمارا کوئی نشانہ خطانہ ہوا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ تیر صیغہ نشانہ پر لگ رہے ہیں اور مجھے یقین سا آ گیا کہ مقصود حاصل ہو گیا اور جہاد کا ثواب لازم مل گیا۔ سادات بارہہ اور بعض غیور جوانوں نے اس موقع پر ایسی اد شجاعت دی جو رستم کے کارناموں کی یاد دلادے۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی اس محاذ پر کام آگئے۔

غنیم کی دوسری فوج جس کی کمان خود راناکیکا کر رہا تھا گھاٹی میں سے نکل کر آئی اور قاضی خاں کو جو گھاٹی کے دہانہ پر پورا رہا تھا آگے سے ہٹا کر اسے پسپا کرتی ہوئی سیدھی قلب لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ سیکری کے شیخ زادے ایک ہی حملہ میں بھاگ کھڑے ہوئے فرار کے وقت شیخ ابراہیم کے داماد شیخ منصور کے سرین پر جو اس دستہ کی کمان کر رہا تھا ایک تیر آ کر لگا۔ اس زخم سے وہ کافی عرصہ تک تکلیف اٹھاتا رہا۔ اس کے مقابلہ میں قاضی خاں باوجود ملاگیری کے دشمن کے سامنے دلیری سے جہاد کیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک تلوار لگی جس سے اس کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ جب مقابلہ کی تاب نہ رہی تو وہ بھاگ کر قول میں آ گیا۔ وہ جمعیت جو غنیم کے پہلے حملہ ہی میں لشکر سے نکل بھاگی تھی دریا پار کر کے پانچ چھ گھوس تک برابر بھاگتی چلی گئی اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

### مہتر خاں کی ہوشیاری

اس نازک صورت حال میں مہتر خاں نے بروقت کام کیا۔ وہ اپنے چنداول کو یکبارگی لے کر نفاذ بجائے ہوئے آگے بڑھا اور اعلان کر دیا کہ خود بادشاہ سلامت یلغار کرتے ہوئے آ پہنچے ہیں۔ اس کی یہ چال کام کر گئی اور بھاگتی فوج کے قدم میدان میں جم گئے۔ مشہور راجہ مان کا پوتا راجہ رام ساگو ایاری جو راناکیکا کے آگے بڑھا چلا آ رہا تھا اس نے راجہ مان سنگھ کے راجپوت دستہ کے مقابلہ میں ایسی بہادری دکھائی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ مان سنگھ ہی وہ راجپوت تھے جو ہراول کے بائیں بازو سے بھاگ کر آصف خاں کی پسپائی کا باعث بنے تھے اور مہمنہ کے سیدزادوں کے پاس جا کر پناہ لے لی تھی۔ اگر اس وقت سادات ثابت قدمی سے جھے نہ رہتے تو سب کو رسوائی اٹھانی پڑتی۔

### ہاتھیوں کی خوفناک لڑائی

رانانے بادشاہی ہاتھیوں کے مقابلہ پر اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایا۔ اور دو مشہور دست ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ہاتھیوں کا فوجدار حسین خاں جو مان سنگھ کے پیچھے ایک دوسرے



ہاتھی پر سوار تھا اس ریل پیل میں گر پڑا اور مان سنگھ اپنے ہاتھی پر مہادت کی جگہ پر آگیا۔ اس نے حیرت انگیز ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ جو دو ہاتھی لڑ رہے تھے ان میں سے ایک تو بادشاہ کے خاصہ کا ہاتھی تھا اور دوسرا رانا کا ہاتھی ”رام پرشاد“ نامی تھا جو نہایت قوی ہیکل تھا۔ دونوں میں بڑے غضب کا مقابلہ ہوا اور دونوں پوری قوت سے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اتفاق سے رانا کے ہاتھی کے مہادت کو ایک تیرنگا اور وہ ہاتھیوں کی ٹکڑ کے صدمہ سے زمین پر گر پڑا۔ عین اس وقت بادشاہی ہاتھی کا مہادت نہایت تیزی کے ساتھ کود کر رانا کے ہاتھی کے سر پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ دکھایا تھا کہ کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

**رانا کیلکا کا فرار** | جب رانا نے میدان کا اس طرح رنگ بدلتا ہوا دیکھا تو مقابلہ چھوڑ کر نکل گیا اور رانا کے لشکر میں بڑی افراتفری مچ گئی۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں نے جو مان سنگھ کی محافظت کر رہے تھے، اس موقع پر آگے بڑھ کر ایسی لڑائی کی جو یادگار رہے گی۔ مان سنگھ نے بھی اس دن جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیئے۔ اس سے ملاشیری کے اس مصرع کی تصدیق ہو گئی ہے۔

”کہ ہندوئے زند شمشیر اسلام“

اس معرکہ میں جیل چٹوڑی کا لڑکا اور گویا راجہ رام ساہ اپنے بیٹے سالباس کے ساتھ جو نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا، جنم رسید ہو گیا۔ گویا راجہ کے راجاؤں کے خاندان میں کوئی دوسرا قابل جانشین نہ رہا۔ ”خس کم جہاں پاک“ رانا کیلکا بھی جو بادھو سنگھ کے مقابل تھا تیرکھا کر زخمی ہو گیا۔ حکیم سورا سادات کے مقابلہ سے بھاگ کر رانا کے پاس آگیا اور دونوں کی فوجیں یک جا ہو گئیں۔ رانا میدان میں ٹھہر نہ سکا اور مقابلہ ترک کر کے اونچے پہاڑوں پر جہاں وہ چٹوڑ کی فتح کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا، محصور ہو گیا۔

یہ لڑائی سخت گرمی کے موسم میں ہوئی تھی، گرمی کے مارے دماغ لگھلا جا رہا تھا۔ ہم صبح سے دوپہر تک برابر لڑتے رہے اور تقریباً پانسو آدمی اس معرکہ میں ہلاک ہوئے۔ ان میں سے مسلمان شہید تو ایک سو بیس تھے اور باقی لاشے ہندوؤں کے تھے۔ زخمیوں کی تعداد تین سو سے زائد تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے میدان جنگ تنور کی طرح دھبک رہا تھا اور گرمی کی وجہ سے سپاہیوں میں نقل و حرکت کی قوت نہ رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ رانا پہاڑ کے پیچھے گھات میں چھپا ہو گا اسی لیے لشکر نے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گیا، جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی، اس فتح کی تاریخ ہے۔

”ذَیْبُ حَافِیْنِ اللّٰہُ فَتَحَ قَسْرِبَ“

**شاہی فوج کو کندہ میں** | دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے ہم میدان کارزار میں گئے۔ لاشوں کی دیکھ بھال اور سب کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے بعد درہ میں داخل ہوئے اور کو کندہ پہنچ گئے۔ وہاں رانا کے چند فداکار رہ گئے تھے جو

اس کے عمل کی حفاظت کر رہے تھے۔ چند معذور اور ضعیف لوگ بھی تھے اور یہ سب مل کر نکل بین آدمی تھے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق کہ وہ شہر خالی کرتے وقت اپنی آبرو اور ناموس کی خاطر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ بھی گھروں اور بت خانوں میں جمع ہوئے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کے بعد انہوں نے تلواروں سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا اور سیدھے دوزخ میں چلے گئے۔

اندیشہ تھا کہ رانا شیخون مارے گا، اس لیے امرائے شاہی نے شہر کی کوچ بندی کر دی اور خندق کھدوا کر اتنی اونچی دیوار بنوا دی

کہ سوار بھی اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب لشکر شہر میں ٹھہر گیا تو مقتولین جنگ کی اور ہلاک ہونے والے گھوڑوں کی تفصیلی فہرست تیار کی گئی تاکہ وہ عریضہ کے ساتھ منسلک کر دی جائے۔ اس وقت سید احمد خاں بارہہ نے کہا "ہمارا نہ تو کوئی آدمی مارا گیا نہ کوئی گھوڑا ضائع ہوا۔ ان کے نام بادشاہی دفتر میں پہنچانے سے کیا حاصل یہ لکھت پڑھت چھوڑو اور سب سے پہلے غلہ کی فکر کرو۔ وہ کوہستان نہایت بختیارتا چنانچہ لشکر میں اناج کی قلت ہو گئی۔ کوئی بجا رہ بھی غلہ لے کر نہ آیا اور فوج بڑی تنگی میں مبتلا ہو گئی۔ امرا نے مجلس شاور منعقد کی اور امرا میں سے باری باری ایک ایک کو سردار بنا کر غلہ لانے کے لیے مواصلات کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے بلند ٹیکروں اور چوٹیوں پر پہنچ کر جہاں جہاں شکست خوردہ فوج کی کڑیاں جمع تھیں سب کو اسیر بنا لیا اور ان کے مویشی پکڑ کر لے آئے انہی مویشیوں کے گوشت پر گزر اوقات ہوتی رہی، البتہ پہاڑیوں میں آم اتنی کثرت سے تھے کہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں کے غریب لوگ عموماً صبح کے وقت کھانے کے بجائے ہی آم کھایا کرتے تھے اور رطوبت کی وجہ سے اکثر بیمار ہو جاتے تھے وہاں کے آم کا وزن تقریباً اکبری سیر کے برابر تھا اس کا پوست بھی تپلا ہوتا تھا لیکن سیٹھا اور مزیدار نہیں تھا۔

اسی اثنائ میں دربار سے محمود خاں خواص حسب الحکم بلغار کرتے ہوئے کوکندہ آیا اور جنگ کی روداد معلوم کر کے دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ ہر ایک کی کارگزاری بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے فوج کی کارکردگی کی تعریف کی لیکن یہ بات کہ رانا کا تعاقب نہیں کیا گیا اور اسے زندہ بچ کر جانے دیا بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

امرا فتح نامہ کے ساتھ "رام پرشاد" ہاتھی کو جو قیمت میں ہاتھ آیا تھا بادشاہ کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ **رام پرشاد ہاتھی** | اس ہاتھی کو بادشاہ نے متعدد بار رانا سے مانگا تھا اور وہ اپنی بد بختی سے اسے دینے پر کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ آصف خاں نے میرا نام لے کر کہا کہ یہ محض دوستی اور ہمراہی کی خاطر اس لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فتح نامہ اور ہاتھی اسی کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔ مان سنگھ نے جواب دیا "ابھی بست سے کام کرنے ہیں ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکہ کے وقت صفوں کی امامت کرنا چاہیے۔" میں نے کہا "یہاں امامت کا اب کیا کام ہے اس وقت تو مجھے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔" میری بات پر وہ مسکرا دیا اور میرے ساتھ تین سو سواروں کی حفاظت میں مذکور ہاتھی کو روانہ کر دیا۔ خود مان سنگھ بھی سیر و شکار اور بھانے قائم کرنے کے ارادہ سے ہمارے ساتھ قصبہ موہن تک جو کوکندہ سے بیس کوس کے فاصلہ پر ہے آیا اور سفارش نامہ لکھ کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

میں باکھورا اور ماندل گڑھ کے راستہ سے مان سنگھ کے وطن قصبہ انبیر پہنچا۔ ہمارا جہاں بھی گزر ہوتا تھا لوگ مان سنگھ کی جنگ اور کامیابی کا حال سننے کے لیے جمع ہو جاتے تھے اور لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلہ پر ہم پہنچے تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اسی قدر اندر دھنستا جا رہا تھا۔ میرے ذمہ اس قسم کی یہ پہلی ہی خدمت تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا۔ آخر وہاں کے رہنے والے بچے انہوں نے بتایا کہ گزشتہ سال بھی اسی جگہ سرکاری ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اب ہاتھی کے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں کنجال اور پتلا کچرہ کافی مقدار میں پھیلے ہوئے تاکہ دلدل کچھ نرم ہو جائے اور ہاتھی آسانی سے نکل آئے۔ ستھاؤں نے اسی طرح کیا، جب انہوں نے بت سا پانی لاکر ڈالا تو ہاتھی آسانی سے نکل آیا اور ہم انبیر میں داخل ہوئے۔ انبیر والے تو اس فتح کی وجہ سے بڑا فخر کرنے لگے۔

## بارگاہ شاہی میں حاضری

ہم انہیں میں تین چار دن رہے اور قصبہ تودہ کے راستہ سے جو میری جائے پیدائش ہے ۔  
 یا اور جہاں میرا خاندان مقیم ہے گئے اور وہاں سے اوائل ماہ ربیع الاول میں فتح پور پہنچ گئے۔ میں مان سنگھ کے باپ راجہ بھگوان داس کے وسیلہ سے فتح پور کے بادشاہی دیوان خانہ میں باریاب ہوا اور کورنش بجالا کر امراء کے عریضہ اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ”رام پرشاد“ فرمایا چونکہ یہ سب پر کے طفیل میں حاصل ہوا ہے اس لیے اس کا نام اب ”پریشاد“ ہوگا۔ پھر مخاطب کیا کہ ”امراء نے تیری تو بہت تعریف لکھی ہے سچ بتانا کہ تو کونسی فوج میں تھا اور کیا کارنامہ تو نے انجام دیا؟“ میں نے کہا ”یہ ناچیز بادشاہوں کے سامنے لرزاں و ترساں سچ ہی بیان کرنے کا عادی ہے بھلا جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے اور جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نیتے تھے یا مسلح میں نے کہا ایک زرہ اور تلوار میرے پاس تھی۔ فرمایا یہ سامان تم کو کہاں سے مل گیا؟ عرض کیا سید عبداللہ شاہ خاں سے میں نے لیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ ان دنوں ہمیشہ بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا۔ چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل ۹۶ تھیں مجھے انعام دیا۔ پھر پوچھا شیخ عبدالنبی سے ملاقات کی ہے؟ میں نے کہا راستہ کی گرد جھاڑتے ہوئے سیدھے خدمت میں حاضر ہوا ہوں اس سے کیسے مل سکتا؟ پھر بادشاہ نے ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دو شالہ اٹھا کر مجھے دیا کہ یہ لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور اس سے کہنا کہ یہ دو شالہ ہم نے تمہارے لیے ایک خاص کارخانہ میں تیار کرایا ہے اسے اوڑھ لو۔ میں وہ دو شالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گیا اور اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ شیخ بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا مقابلہ کے وقت مجھے دعائیں یاد رکھنا۔ میں نے کہا اس وقت تو میں نے یہ دعا اللہم اغفر للمؤمنین والمؤمنات والنصار من فسادین محمد واخل من خذل دین محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑھی تھی۔ شیخ نے کہا یہ بھی کافی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر جائے عبرت ہے کہ وہ شیخ عبدالنبی ہے کہ وہ جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایسے برے حال میں کہ خدا کسی کو نہ دکھائے نہ سنوائے اور سب کو اس سے عبرت ہو۔

بہر گرا پروردگیتی عاقبت خوش برنخت

حال آں فرزند چوں باشد کہ خصمش ماوراست

اسی سال بادشاہ نے سید عبداللہ شاہ خاں کے ذریعہ خان جہاں کے پاس فرمان بھیجا اور اسے بہ نفس نفیس خود وہاں پہنچنے کی خوش خبری دی۔ اس وقت خان جہاں کھل گاؤں کے قریب داؤد کے مقابلہ میں مورچے جائے منظر خاں اور بہادر حاجی پور کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے لشکر کی مدد کے لیے ڈاک چوکی کے ذریعہ پانچ لاکھ روپیہ بھیجا اور غلہ سے بھری ہوئی بہت ساری کشتیاں آگرہ سے روانہ کرنے کا حکم دیا۔

## بادشاہ کا عزم بنگال

اسی دوران میں خبر پہنچی کہ نواح حاجی پور کے زمیندار کبیتی نے جو باغی ہو گیا تھا فوج اکٹھی کر کے تھانہ آرہ پر جہاں فرحت خاں اور اس کا لڑکا میرک لدائی مامور تھے حملہ کر دیا اور ان دونوں کو شہید کر دیا ہے۔ اور اس کی فوج کشتی کی وجہ سے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ اس اطلاع پر بادشاہ سن مذکورہ ۲۵ ربیع الآخر کو فتح پور سے مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ کوس طے کر کے منزل کی۔ اس منزل میں سید عبداللہ شاہ خاں داؤد کا سر

بیکر حاضر ہوا اور سید میر کی کے فال جفر کا وہ شعر جو اس نے پٹنہ سے واپسی کے وقت جو پور میں نکالا تھا سچ ثابت ہوا۔ وہ شعر تھا۔

مژدہ فتح بہ ناگاہ رسد

سرداؤد بدرگاہ رسد

**داؤد کی شکست اور قتل** | اس معرکہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ جس دن سید عبداللہ خاں کھل گاؤں کے قریب خجماں کے لشکر میں پہنچا تو حملہ کی تیاری کی گئی اور دوسرے دن کہ ربیع الآخر کی پندرہ تاریخ تھی،

خان جہاں اور مظفر خاں نے صف آرائی کی اور تمام امراء کو انکی ڈیوٹیاں سپرد کیں۔ اس وقت داؤد بڑے نخوت و غرور کے ساتھ اپنے چچا جنید کرانی اور دوسرے سرداروں کو لیکر قلعہ سے باہر آیا اور جنگ چھیڑ دی۔ پہلے ہی حملہ میں توپ کا ایک گولہ جنید کو آکر لگاؤ اس کے چیتھڑے اڑ گئے جب دونوں فوجوں کی مڈبھیر ہوئی تو پٹھان شکست کھا کر بھاگ نکلے اور داؤد کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا۔ حسین بیگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ داؤد کی مشکلیں کس کر اسے خان جہاں کے پاس لے آیا۔ داؤد سخت پیاسا ہو رہا تھا، اس نے پانی مانگا۔ لوگوں نے اسی کے جوتے میں پانی بھر کر اسے پیش کیا۔ جب اس نے نہ پیا اور منہ پھیر لیا تو خان جہاں نے اپنے خاص پیالہ سے اسے پانی پلایا۔ داؤد نہایت خوبصورت اور حسین تھا اس لیے خان جہاں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر امراء نے کہا کہ اس کو زندہ چھوڑنے میں فتنہ و فساد کا اندیشہ ہے۔ خانبخماں نے مجبور ہو کر اسکی گردن مارنے کا حکم دے دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر گھاس سے بھر کر خوشبو میں بسا یا گیا اور عبداللہ خاں کے حوالہ کر کے روانہ کر دیا۔ اس فتح میں شاہی لشکر کو بہت سے ہاتھی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔

**اکبر کی اجمیر کو روانگی** | بادشاہ اس فتح کے شکرانہ میں اسی سال ۲۳ جمادی الثانی کو دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور چھٹی ماہ رجب کو جس دن کہ خواجہ صاحب کا عرس تھا وہاں پہنچے۔ خواجہ خاوند محمود کے لڑکے سلطان خواجہ کو

”امیر الحجاج“ بنا کر پچھلاکھ روپیہ نقد اور دوسرا سامان حرمین شریفین کے مستحق لوگوں کے لیے اور حرم مبارک میں ایک عمارت بنوانے کے لیے روانہ کیا۔ جس وقت سلطان خواجہ رخصت ہونے لگا، بادشاہ بھی زائروں کی طرح ننگے سر ننگے پیرا حرام باندھے حاجیوں کا لباس پہن کر اور تھوڑے تھوڑے بال ترشوا کر کچھ دور تک اس قافلہ کے ہمراہ گئے۔ بادشاہ کو اس حال میں دیکھ کر لوگوں کو بڑی رقت ہوئی۔ اور لوگ چنچیں مار کر نالہ و فریاد کرنے لگے۔ سلطان خواجہ کے بدرقہ کے لیے قطب الدین محمد خاں قلیج خاں اور آصف خاں کو مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ امراء اس قافلہ کو کوئٹہ سے بخیر و خوبی آگے پہنچا کر رانا کے سارے علاقہ کو پامال کر دیں اور اس کا جہاں بھی تہ چلے گھیر کر زندہ نہ چھوڑیں۔

**شاہ طہماسپ کا انتقال** | اس موقع پر خبر آئی کہ ایران میں شاہ طہماسپ فوت ہو گیا ہے۔ اور شاہ اسماعیل ثانی اس کا جانشین ہوا ہے۔ اس قافلہ کی روانگی پر تاریخ نکالی گئی۔

”اول دولت و فتح و ظفر است“

اس وقت بادشاہ نے عام منادی کرا دی کہ جو شخص چاہے قافلہ کے ساتھ جج پر جاسکتا ہے۔ اس کا سفر خرچ سرکار سے ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ بے شمار لوگ اس سال جج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک زمانہ یہ تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص جج کا نام بھی نہیں لے سکتا۔ اور جج کی اجازت کی درخواست پر ہی لوگ واجب القتل مجرم بن جاتے ہیں۔

بَلَّكَ الْآيَاتُ نَدَاؤَ لَهَا بَيْنَ النَّاسِ

ان دنوں جب کوکندہ کے لشکر کی عسرت و غلی کی شکایتیں پہنچنے لگیں تو بادشاہ نے مان سنگھ آصف خاں اور قاضی خاں کو وہاں سے طلب کر لیا۔ یہ لوگ آپس میں روتے جھگڑتے رہتے تھے۔

ان کو بعض تصوروں پر چند دن کے لیے کورنش سے محروم کر دیا گیا اور غازی خاں بدخشی، مہتر خاں، علی مراد اور بک خجری ترک اور دوسرے ایک دو افسروں کو جن میں میں بھی شامل تھا ان سے مستثنیٰ کر کے شاہانہ عنایات سے نوازا گیا اور ان کے مناصب میں ترقی ہو گئی، باقی تمام لوگوں کو تنزل ہو گیا، اگرچہ بعد میں ان کو بھی بادشاہ نے معاف کر دیا۔

**خواجہ شاہ منصور کی باریابی** | رانا کی شگست کھانے کے بعد اودھے پور اور خان پور وغیرہ کے کوہستان میں قزاقی کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی سرکوبی کے لیے اسی مہینے کی ۹ تاریخ کو رانا کے علاقہ کی جانب کوچ فرمایا۔

اس زمانہ میں خواجہ شاہ منصور شیرازی خدمت میں آیا۔ بہت پہلے وہ کچھ عرصہ تک بادشاہی خوشبو خانہ کا مہتمم رہا تھا۔ لیکن مظفر خاں سے دشمنی ہو جانے کی وجہ سے شاہی خدمت سے بھاگ کر جون پور میں منعم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ منعم خاں نے اسکی بڑی قدر و منزلت کی اور خواجہ منصور ترقی کر کے دیوانی کے عہدہ پر مامور ہو گیا۔ جب منعم خاں کا انتقال ہو گیا تو بادشاہ نے فرمان بھیج کر اسے دربار میں بلا لیا۔ خواجہ منصور چونکہ نہایت تجربہ کار کارداران اور سنجیدہ آدمی تھا اس لیے بادشاہ نے اسے تمام ممالک محروسہ کا دیوان بنادیا اور وہ امور ملکی میں راجہ ٹوڈرل کا بااختیار شریک ہو گیا۔

مشہور ہے اول حق بعد میں ظلم آدمی اقتدار پانے کے بعد ظلم و ستم پر اتر آتا ہے۔ اور خواجہ کے ساتھ تو یہ بھی اتفاق پیش آیا کہ اسی سال دمدار ستارہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوا۔ چونکہ خواجہ منصور دنیا لہ دار پگڑی باندھا کرتا تھا اس لیے لوگوں نے اس کا نام ستارہ دنبالہ دار یعنی ”جھاڑو تارا“ رکھ دیا۔ خواجہ فوج کا حساب کتاب نہایت سختی کے ساتھ کرنے لگا۔ اور اسکی جا بیجا پکڑ و حکمر سے لوگ ایسے تنگ آئے کہ وہ راجہ اور مظفر خاں کی سختیاں بھول گئے اور اس پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

**شاہ اسمعیل کا قتل** | اسی سال خبر پہنچی کہ عراق کے بادشاہ شاہ اسمعیل ولد شاہ طہاسب کو اس کی بہن پرسی خانم نے امراء کے ساتھ ساز باز کر کے قتل کر دیا ہے۔ میر حیدر معنائی نے اس کی تاریخ جلوس ”شہنشاہ روئے زمین“ اور اس کی تاریخ وفات ”شہنشاہ زیر زمین“ نکالی۔ جو دمدار ستارہ طلوع ہوا تھا اس کا اثر عراق میں ظاہر ہوا۔ اور وہاں اس واقعہ سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ تبریز، شروان اور مازندران پر رومیوں نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خدا بندہ بھوشا طہاسب کی دوسری بیوی سے تھا تخت پر بیٹھا۔ اس نئے بادشاہ کے دور میں وہاں ایک بڑی اچھی تبدیلی ہوئی۔ مدت دراز سے وہاں کی حکومت کے زیر سایہ جو صحابہ کے خلاف تبرا ہوتا تھا اور خلفائے بنو امیہ پر لعنت کی جاتی تھی وہ ختم ہو گئی۔ لیکن وہاں کی بے دینی ہمارے ملک ہندوستان میں سرایت کر گئی ہے۔

نفاق آمدہ در ہند از بلاد عراق

عراق قافیہ میدان بر بگزار نفاق



جس وقت قصبہ موہنی میں سربراہ شاہی نصب ہوا تو قطب الدین محمد خاں اور راجہ بھگوان داس کے قلعہ ایدر پر حملہ نام فرمان جاری کیا گیا کہ دونوں سردار کو کندہ میں ٹھہرے رہیں اور قلعہ خاں دوسرے امراء کے ساتھ حاجیوں کے قافلہ کو لے کر ایدر تک جو احمد آباد سے چالیس کوس پر ہے جائے اور وہاں کے زائرین کو بھی قافلہ کے ساتھ احمد آباد روانہ کرنے کا انتظام کرے۔ قافلہ کو رخصت کر کے ایدر کے قلعہ کا محاصرہ کرے اور راجہ زائن داس کی پوری طرح سرکوبی کر کے لوٹے۔ قلعہ خاں نے حکم کی تعمیل کی اور حاجیوں کے قافلہ کو تیمور خاں بدخشی کے ہمراہ پانسو سواروں کی حفاظت میں منزل تک پہنچا دیا۔ ایک فوج کشی سے ایدر کا راجہ بھی رانا کیکا کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔

بادشاہ کی مالوہ کو روانگی اسی منزل میں شہاب خاں اور شاہ بدراغ خاں اپنے لڑکے کے عبدالمطلب خاں کے ساتھ اور شاہ فخر الدین خاں اور مالوہ کے دوسرے جاگیردار دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے غازی خاں بدخشی کو ہزاری کا منصب عطا کر کے شریف محمد خاں آٹک، مجاہد خاں اور ترک سبحان قلی اور تین ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ قصبہ موہنی میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ مدار یہ کی پہاڑیوں میں عبد الرحمن ولد نوید بگ کو پانچ سو آدمیوں کی چوکی پر مقرر فرمایا قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کو بھی کو کندہ سے لشکر میں طلب کر لیا گیا اور اوڑے پور پر شاہ فخر الدین اور جگناتھ کو مامور کیا۔ سید عبداللہ خاں اور راجہ بھگوان داس کو اوڑے پور کے درہ پر متعین فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کوچ کر کے بانس والہ اور ڈوگر پور پہنچے۔ اسی مقام پر پنگالہ سے راجہ ٹوڈر مل وہاں کا مال غنیمت اور پانسو ہاتھی لاکر باریاب ہوا۔ اسی منزل سے قلعہ خاں کو ایدر سے بلا کر اس کی جگہ آصف خاں کو لشکر کا سردار بنادیا اور قلعہ خاں کو کھنڈیت کے کلیان رائے بقال کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پر بھیج دیا۔ تاکہ وہ فرنگیوں سے پروانہ رہا داری لے کر سلطان خواجہ کے جہاز کو جو اس پروانہ کے نہ ملنے کی وجہ سے وہاں ٹکڑا لے ہوئے پڑا تھا پروانہ کراوے اور مالوہ میں شاہی لشکر سے آکر مل جائے۔

جلوس کا تیسواں سال اسی سال ماہ ذی الحجہ میں نوروز ہوا اور جلوس کا تیسواں سال شروع ہوا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب دیبا پور کے قصبہ میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہو گیا تھا اور یہاں ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن میں شرکت کے لیے بانس والہ کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ہندوؤں میں سید عبداللہ خاں سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے اس راستہ کو خطرناک بتایا اور مجھے لوٹا کر مجبورہ ملی لے آیا۔ چند دن شاہی امانت کی ذمہ داری کا خیال کر کے رضوی خاں کے ساتھ گواپار سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے بارہ ذی الحجہ کو میں دیپال پور مالوہ پہنچا اور وہاں میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں صنایع بدائع سے مراد حمایت عدل و شہادت لے

جشن نوروزی۔ یہ ترک چنگیزوں کا قدیم تہوار ہے جو ہمارے آغاز میں منایا جاتا ہے۔ ایران میں بھی قدیم سے اس کا رواج تھا۔ نوروز کے روزے اپنا تہوار منایا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس دن کا احترام ہندوؤں کے پاس کیا جاتا ہے۔ اکبر اس کو بڑے اہتمام اور عقیدہ سے منایا کرتا تھا اس دن پورا جشن منعقد ہوتا تھا۔ دولت خانہ خاص اور سبھا منڈل میں نوروز کی شاہانہ محفل منعقد ہوا کرتی تھی اور ۸ دن تک امرائے شاہی کے ایوانوں میں طبیبان محفل ہوتے تھے۔ اس خاص تہوار کے اشنان کر کے راجپوت وضع کا رنگین جوڑا پہنا کرتا تھا۔ برہمن پشائی پر میکے لگاتے تھے۔ نوروز کے دن سونے کے تاروں میں بادشاہ کو ۱۲ چیزوں میں سونا، چاندی، برہمن، تانبا، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول، خوشبو، ست خجاسے تو لایا جاتا تھا اور یہ چیزیں برہمن دان میں بے لیتے تھے۔

تھے پیش کیے۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین قندھاری کی تھیں۔ حافظ جیسا خوش آواز شخص اس زمانہ میں میں نے کسی اور کو نہیں پایا۔ جس وقت لیا اور کے محل کروہہ میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چور اڑائے گئے تھے۔ بعد میں عبداللہ خاں نے تفتیش کر کے ان کو حاصل کیا تھا اور انہیں میرے سپرد کر دیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو یہ نذرانہ میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر مذاقاً فرمایا ایک حائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفہ میں آئی ہے میں وہ تمہیں عطا کرتا ہوں۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو جھک جھک کر تسلیات بجالایا اور شکرانہ کا سجدہ ادا کر کے عرض کیا حضرت نے اسی دن عبداللہ خاں کو فرمایا تھا کہ اسے انشاء اللہ تو ہی تلاش کر کے لائے گا۔ آپ کی وہ بات پوری ہو کر رہی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت لیا اور کے قصبوں میں حوض اور کنوؤں کے کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی کرتی رہتی ہے۔ انہی مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑ کر سید عبداللہ خاں کے پاس مخبری کر دی۔ خان نے سب کو پکڑ لیا اور انہوں نے اپنی چوریوں کا اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے حافظ کو مخاطب کر کے کہا مطمئن رہو انشاء اللہ تمہارا دوسرا سامان بھی نکل آئے گا۔ اس نے عرض کیا میں تو صرف اس مصحف اور بیاض کے لیے نکر مند تھا، یہ آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں اور ان کے بغیر میں خطبے مرتب کرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ بقیہ سامان کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس سفر سے واپسی میں جیسا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا اس کا وہ سارا سامان جوں کا توں انہیں بلیداروں کے پاس سے برآمد ہو گیا۔ عبداللہ خاں نے یہ سامان فتح پور میں لاکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسی منزل میں بادشاہ نے از سر نو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتہ میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کر دیا کرے۔ معاملہ اسی قسم کا تھا کہ ننھا مکتب کو نہیں جاتا بلکہ اسے لے جایا جاتا ہے۔

اس علاقہ کے انتظامات کے لیے چند دن تک دیا پور میں قیام کیا گیا۔ اور بعض بڑے امرا کو جیسے شہاب الدین احمد خاں وغیرہ کو مالوہ کے جاگیرداروں کے ساتھ راجہ علی خاں پر حملہ کرنے اور اس کے ملک کو فتح کرنے کے لیے برہان پور کی طرف روانہ کیا اور اس منکر کے دغ و حملہ کا کام شہباز خاں بخشی کے سپرد کیا گیا۔ اسی منزل سے راجہ ٹوڈر مل کو اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ گجرات کی جمع بندی کی تحقیقات اور وہاں کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا۔

اسی اثناء میں خبر آئی کہ آصف خاں نے ایدر کو فتح کر لیا ہے اور راجہ نارائن داس کو شکست ہوئی ہے۔ جب تلچ خاں کو علی مراد اوزبک کے ساتھ ایدر سے واپس بلا

ایک گیا تھا اور آصف خاں کو لشکر کی سرداری پر نامزد کیا گیا تھا تو راجہ ایدر رانا کیکا اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے فوج اٹھائی کہ ایدر سے دس کوس کے فاصلہ پر تہانہ پر حملہ آور ہوا اور شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو آصف خاں میرزا محمد تقیم تیمور بدخشی میرابو النعیم بخاری اور میر محمد معصوم بکری وغیرہ نے مشورہ دیا کہ تقریباً پانسو سواروں کو تہانہ کی حفاظت پر چھوڑ کر پیش قدمی کی جائے اور راجہ پر حملہ کر دیا جائے، چنانچہ ہمدانی الحجز شدہ کی صبح کو یہ لوگ سات کوس کا فاصلہ طے

کر چکے تھے کہ دوسری طرف سے راجہ نارائن داس پوری تیاریوں کے ساتھ بڑھ کر آیا اور دونوں فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ میرزا محمد نے جوہراول پر متعین تھا سب سے آگے بڑھ کر معرکہ آرائی کی اور شہید ہو گیا۔ لیکن اس کے زبردست حملہ نے کافروں کے یہ میدان سے اکھاڑ دیئے اور وہ بری طرح شکست کھا کر بھاگے۔ اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ جب آصف خان کا عریفہ بارگاہ لا پہنچا تو اس لشکر کے سرداروں کے نام عنایت آمیز فرمان روانہ کیا گیا۔

اسی سال میر سید محمد میر عدل نے جو بکر کی حکومت پر نامزد ہوئے تھے۔ میر سید ابوالفضل اور اپنے دوسرے بیٹوں کی پر حملہ کرنے بھیجا۔ ان لوگوں نے تھوڑی سی مدت میں اس قلعہ کو فتح کر لیا۔ میر سید ابوالقاسم ولد میر سید صفائی جو بکر کے سربراہ اور آدمی ہیں دربار میں حاضر ہوئے ان کو اہدیہ کا منصب سپرد کیا گیا۔ اس فتح کی تاریخ ہوئی ع۔  
”فتح سبومی شد باولادہ نبی“

انہی دنوں میر عدل کا انتقال ہوا تھا۔ ان کی تاریخ وفات ہے ”سید فاضل۔ عالمہ اللہ یا افضل۔“

شہر شریف آملی کی آمد | انہی دنوں شریف آملی دیپال پور کی منزل میں آکر باریاب ہوا۔ یہ مردود اور نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تھا۔ بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا۔ انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کر کے الحاد و بے دینی کو اپنا شعار بنالیا۔ کچھ عرصہ تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزرتا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا تھا۔ نفاق۔ تنگ آکر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا۔ مولانا نے چند شعر اس کی شان میں کہے تھے۔ ان میں کا ایک شعر ہے۔

ہست یک ملحدے شریف بنام

نام نامی بطور خویش تمام

بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا۔ وہاں کے لوگ بھی جب اس کی خیانتوں سے واقف ہوئے تو انہوں نے اس کا قصہ ہی پاک کر دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کہ گدھے پر سوار کر کے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کو شہر کراچی۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں، ہر شخص جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اس لیے وہ بھی دکن سے نکل کر آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا اسی زمانہ میں مالوہ پہنچ گیا۔ اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا۔ اس کی مجلس میں جاہل عوام حاضر ہوتے تھے، خاص طور سے عراقیوں کا اس کے پاس مجمع لگا رہتا تھا یہ عراقی تو ایچان سے ایسے نکلے ہوئے ہیں جیسے مکھن سے بال نکل آتا ہے۔ وہاں نکلے گا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرنے والے بس یہی عراقی ہوں گے۔ اس بد بخت نے ان عراقیوں کے ذریعہ یہ شہرت دی کہ وہ دسویں صدی کا مجدد ہے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اس کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے ایک رات اسے اپنی مجلس میں بلا بھیجا۔ اور قتالوں کی بنی ہوئی اس طویل مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی اکبر نے اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل، ناگوار بنیت کڈائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے ہوئے

کئی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے جو حضور اکرم کی دشمنی کی نشانی ہے، کھڑا رہا اس کے سراپا سے جھوٹ، ریاکاری اور منافقت کی طور پر جھلک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کر کے اونٹ کی طرح دوڑا نو بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اسے کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میں نے بس "علم" کا لفظ سنا۔ غرض اس نے بڑی خرافات کہیں اور انہیں حقائق اور اصل الاصول بتاتا رہا۔

قوس نہ ز ظاہر نہ باطن آگاہ      انگ نہ جہالت نہ لطافت آگاہ  
مستغرق کفرند و حقیقت گویند      لا حول ولا قوۃ الا باللہ

شریف آملی کا مسلک محمود لسخوانی کے مسلک کی نقل تھا۔ اس محمود نے امیر تمیور صاحبقران کے زمانہ میں گیلان کے ایک گاؤں خوان میں طور کیا تھا۔ اس نے تیرہ منحوس رسالے لکھے تھے جو ہر طرح کے زندقہ سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک رسالہ کا نام "نیٹال" ہے جسے اس نے "علم لفظ و حال" کا نام دیا ہوا تھا۔ اس بد بخت کی تمام تصانیف کا خلاصہ "بحر و کوزہ" نامی ایک کتاب تھی جو غلات کتاب میں اس نے جمع کی ہے اس کو سن کر ہی تے ہونے لگتی ہے۔ اگر شیطان اس کو سن لے تو مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس شریف کشف نے بھی ایک کمالات کا مجموعہ بنا رکھا تھا۔ جسے "ترشح ظہور" کا نام دیے ہوئے تھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس نے محمد الاول کے مجموعہ کی طرح رکھی تھی کہ اس کے ہر نامربوط عام فریب فقرہ کا عنوان اس لفظ کو رکھا گیا ہے جس سے وہ فقرہ شروع ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت مضحکہ خیز چیز تھی۔

خدا کی شان دیکھو کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکھ جایا کہ اب وہ ہزاری منصب الہ میٹھا ہے اور بنگالہ میں مذہب حق کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے۔ مریدوں اور معتقدوں کے لئے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ ان مراتب کا ذکر انشا اللہ آئندہ بیان کیا جائے گا۔

یار بودم قطبک امسال قطب الدین شدم  
گر بمانم سال دیگر قطب دین حیدر شدم

پور کو واپسی | جب اس علاقہ کے سارے انتظامات حسب منشا تکمیل پا گئے تو بادشاہ وہاں سے مسلسل کوچ کر کے

سابقہ محلہ کوہ نش۔ بادشاہوں کے دربار میں سلام کے مختلف طریقے تھے کہیں سینہ پر ہاتھ باندھنے کہیں سر جھکانے کہیں دوزانو ہو کر جھکنے کا رواج تھا۔ بادشاہ میں سلام کا طریقہ تھا کہ حاضرین نے والا ادب سے آکر سامنے بیٹھ۔ سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے پشت درت کو زمین پر ٹیکے اور پھر آہستہ سے سر اٹھا کر اٹھ جائے اور سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر اتنا جھکے کہ دوسرا ہو جائے پھر دہائی طرف کو جھوک دیتا ہوا سیدھا ہو جائے۔ اسی کو کورنش اور تسلیم کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خود اپنے ایک واقعہ سے اخذ کیا تھا۔ بچپن میں ہایوں نے ایک مرتبہ اس کے سر پر تلج رکھ دیا۔ اما لبقوں کے اشارے پر اکبر نے سلام کرنا چاہا تو اس نے اسے سمجھاتے ہوئے جھک کر اور سیدھا ہو کر آداب بجالایا۔ اس وقت سہارے کے لیے مٹھی زمین پر بھی ٹکائی۔ ہایوں کو اس کی یہ اداریہ دیکھ کر اس نے حکم دیا کہ کورنش و تسلیم اسی طرح ہوا کرے۔ اکبر نے اس طرح کورنش کا باقاعدہ آئین مقرر کر دیا۔ بعد میں "سجدہ تعظیم" کا حکم دے دیا گیا۔ جاگیر دار بھی سجدہ ہوتا رہا۔ جاگیر دار نے محمد الف ثانی کو سجدہ اور کورنش نہ کرنے پر ہی قلعہ میں قید کر دیا تھا۔ شاہ جاں نے سب سے پہلا حکم اسی سجدہ کی طرف دیا۔ حکم اس کے بعد شاہ جانی میں کورنش بھی بند ہو گئی۔ صرف شرعی سلام و دربار کا سلام مقرر کیا گیا۔

سیر و شکار کرتے ہوئے نہ تھکے اور نہ بھوکے راستہ سے ۲۳ صفر ۹۸۵ھ کو فتح پور پہنچے۔ اسی موقع پر شیخ فیضی نے جن کو اب ملک الشعراء خطاب مل چکا ہے، ایک غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے ۷

نسیم خوش دے از فستج پورے آید  
کہ پادشاہ من از راہ دورے آید

مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ | دو تین ماہ بعد گجرات میں غدر کی اطلاع ملی۔ اس مرتبہ جب راجہ ٹوڈرل گجرات پر پورے ہو کر گیا تو مظفر حسین و لدرا براہیم حسین مرزا جو مرزا کا مران کا نواسا تھا۔

اور اس کو اسکی ماں گمرخ بیگم سورت کے محاصرہ کے وقت دکن لے کر چلی گئی تھی، چنداواہشوں کی جمعیت لے کر گجرات میں فتنہ و فساد مچانے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی۔ اسے بہکانے والا اصل میں مہر علی نامی ایک شخص تھا جس نے میرزا براہیم کے پاس پرورش پائی تھی۔

مرزا مظفر حسین نے گجرات پہنچ کر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اس کے مقابلہ پر شریف محمد خاں آنکھ کا لڑکا بار بہادر اور گجرات کا دیوانا بابا بیگ پرگنہ پٹلا دیں پہنچے۔ مرزانے ان کو شکست دی اور کھنایت تک جا پہنچا۔ اب اس کے پاس دو تین ہزار سواروں کی جمعیت ہو گئی تھوڑے وزیران حاکم گجرات کے پاس بھی تین ہزار سوار تھے۔ لیکن اسے اپنے سپاہیوں پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ اس لیے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے وہ قلعہ بند ہو گیا۔ اور راجہ ٹوڈرل کے پاس جو اس وقت پٹن میں ٹھہرا ہوا تھا، ساری کیفیت لکھ بھیجی۔ راجہ نے احمد آباد کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کی آمد پر میرزا احمد آباد سے ہٹ کر دو لقیہ کی طرف چلا گیا۔ وزیر خاں اور راجہ نے اس کا تعاقب کیا۔ اس مقام پر فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ باغی شکست کھا کر جونا گڑھ کی طرف نکل گئے۔ اسی زمانہ میں راجہ فتح پور واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر مرزا مظفر حسین نے دوبارہ جونا گڑھ سے نکل کر احمد آباد پر حملہ کیا اور وزیر خاں پہلے کی طرح قلعہ میں محصور ہو گیا۔ میرزانے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس کی فوج قلعہ کی دیوار پر سیر دھبیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ قلعہ کو فتح کر لیتے۔ لیکن عین اس وقت ایک گولی مہر علی کے سینہ میں آکر لگی۔ مہر علی میرزا کا وکیل مطلق اور روح رواں تھا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی میرزا بدحواس ہو کر میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان پور اور نندرا آباد کی طرف چلا گیا۔

راجہ علی خاں سے مصالحت | بادشاہی فوج کے ان امیروں نے جو شہاب الدین احمد خاں کی سرداری میں برہان پور پر فوج کشی کے لیے بھیجے گئے تھے حملہ کر کے راجہ علی خاں کو قلعہ میں محصور کر دیا تھا اور اسکی ساری ملکیت کو تباہ و تاراج کر دیا تھا قلعہ کے فتح ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن محاصرہ کے دوران میں قطب الدین محمد خاں کا امرار سے اختلاف ہو گیا اور وہ ناراض ہو کر اپنی جاگیر بھڑوچ اور بڑوہ کی طرف چلا گیا۔ جہاں مرزا مظفر نے غارتگری کر کے بڑا لشکار پھیلا دیا تھا۔ اس کے اس طرح محاذ سے چلے جانے کی وجہ سے برہان پور کی مہم میں بڑی دقتیں پیدا ہو گئیں۔ امرار نے شہابی نے مصلحت یہ سمجھی کہ راجہ علی خاں سے معقول نذرانے وصول کر کے دوبارہ میں بھیج دیں اور اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ جائیں۔

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی | انہی دنوں حکیم عین الملک شیرازی جو حیدرآباد میں حاکم وکن عادل خاں کے وکیل کے ہمراہ



سفارت پر گیا تھا' واپس آگیا اور عادل خاں کے دیئے ہوئے عمدہ ہاتھی اور قیمتی تحائف نذر میں پیش کیے۔ جب بانس بریلی کی موجودگی سے دیپ چند راجہ منجھوہ کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنایا گیا۔ اس نے وہاں سے ایک طویل مریضہ لکھا۔ منجھوہ اور باتوں کے اس میں یہ بھی فقرہ تھا کہ "جب سے میں دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس جنگل بیابان میں میرے ساتھ کوئی ہم خیال دوست نہیں ہے، اگر جناب والا فلاں شخص کو دیاں اس نے میرا نام لکھا تھا، جو اس علاقہ کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس پر بھروسہ و اعتماد بھی ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمہ کوئی اہم خدمت نہیں ہے میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا۔" بادشاہ کے حکم سے خواجہ شاہ منصور اس خط کے ایک ایک فقرہ کو پڑھتا جاتا تھا اور حسب تجویز اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ فقرہ پڑھتا تو بادشاہ نے "ہاں" لکھا یا نہ "نہیں۔"

حج کے لیے قافلہ کی روانگی | ۱۰۸۸ھ ماہ رجب میں جو خواجہ صاحب کے عرس کا زمانہ ہے بادشاہ نے اجیر کا عزم کیا۔ جب سواری تودہ پر پہنچی تو شاہ ابوتراب جو شیراز کے بڑے بزرگ اور سلاطین گجرات کے پیر تھے ملنے کے لیے آئے اور راجہ ٹوڈرمل بھی جو مرزا مظفر حسین کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ میرٹھ کے قریب بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرادی کہ جو بھی چاہے اس قافلہ کے ساتھ حج کے لیے جاسکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی صدر سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی آپ بادشاہ سے اجازت لے لیجئے تو اس نے پوچھا "کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟ میں نے کہا "ہاں"۔ اس نے کہا "تمہارا کوئی بھائی بندا لیا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے؟ میں نے کہا "نہیں" صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ شیخ نے فرمایا "اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔ غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں۔"

نہ کرد لطف تو کارے و وقت کار گزشت

نہ شد وصال تو روزے و روزگار گزشت

منوہر پور کی تعمیر | انبیر کے موضع مولتان میں جو ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت بالکل کھنڈر بنا ہوا تھا بادشاہ کی سواری پہنچی تو اس نے وہاں شہر کی اور ایک بلند قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ قلعہ کے دروازوں اور دیواروں کی تعمیر کی ذمہ داریاں امراء کے سپرد کی گئیں۔ بادشاہ نے اس کی تعمیر میں اس توجہ سے اہتمام کیا کہ آٹھ دن میں اچھا خاصا شہر بن کر ہو گیا اور رعایا کو وہاں آباد کر دیا گیا۔ سانجھ کے حاکم رائے منوہر ولد رائے لون کرن کے نام پر اس کا نام منوہر پور تجویز کیا گیا۔ رائے منوہر کو مرزا منوہر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے شہزادوں کے ساتھ تربیت پاتا رہا تھا ایسا ہنرمند اور باکمال نکلا کہ اب بڑے اچھے شہر کہلاتا ہے اس کا تخلص توسنی ہے۔ اس کا ذکر شعراء کے بیان میں کیا جائے گا۔

یہاں سے بادشاہ سلامت نے نارنولی کے راستہ دہلی کا ارادہ کیا اور شیخ نظام نارنولی سے جو مشائخ عظام میں سے ہیں دہلی کی دہلی میں پہلے تو بادشاہ نے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی پھر پالم میں شکار کھیلتے رہے۔

میری بیساور کو روانگی | اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں میرے پاس بیادری سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد ایک بڑا تولد ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرافی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا تیرے باپ اور دادا کا نام کیا ہے؟ عرض کیا ملوک شاہ ولد حامد۔ بادشاہ نے فرمایا اپنے اس بچہ کا نام عبدالہادی رکھو۔ "ہادی" کا کلمہ اس زمانہ میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے انہوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑو اور حافظہ کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچہ کی درازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کراؤ۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخر کار وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس منزل سے پانچ مہینہ کی رخصت لی اور بیادری چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جاسکا اور بیادری میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بادشاہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے۔ اور اب جب کہ اس واقعہ کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں اسی عہد کی خدمت سے چٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگتے۔

نہ بختے نہ کہ بادوست در آمیزم من  
صبر نہ کہ از عشق بہ پر میزدم من  
دست نہ کہ با قضا در آمیزم من  
پائے نہ کہ از میانہ بگریزم من

جس وقت بادشاہ پنجاب کی طرف متوجہ تھے ہانسی کی منزل میں شیرمگ تو اچی کا عریفیہ پہنچا کہ مظفر حسین مرزا انجرات سے بھاگ کر دکن چلا گیا ہے۔ وہاں اسے راجہ علی خاں نے گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ بادشاہ نے یکم ذی الحج ۱۰۸۵ھ کو مقصود جوہری کے ہاتھ راجہ علی خاں کے نام ایک فرمان بھیجا کہ وہ میرزا کو دربار میں روانہ کر دے۔

جلوس کا چوبیسواں سال | پہلی محرم ۱۰۸۶ھ کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہو گیا۔

اکبر پر ایک خاص کہ بغیت کا ظہور | بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور تندہ کے نواح میں قرغہ کے شکار دانگے کا شکار کیا اور وہاں چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا۔ جس وقت دونوں طرف سے ہانکے کے جانور شکار گاہ میں آکر جمع ہو گئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غریب مولیٰ حالت طاری ہو گئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہو گئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کر دینے کا حکم دے دیا ہے

ہش دار کہ فیض حق بنا گاہ رسد

ناگاہ رسد بدول آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ سر کے بال ترشوائے۔ بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی

بڑے چودہ کر تصدیق و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرق ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی پھل سی پیدا ہو گئی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حالات اعتدال پر آ گئے۔

**مردِ معاش کا نیا قانون** | بہرو کی منزل میں دار الخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب کی حکومت سعید خاں مغول کے تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبذی کے پوتے قاضی علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ اراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلہ کے دوسرے کاموں پر متعین کیا گیا کہ قدیم محالات کو منسوخ کر کے باقاعدہ پیمائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی اراضیات میں حصہ دار بنادیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبدالنبی کی ضد میں ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بددیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

**بادشاہ کی فتح پور کو واپسی** | یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور تیسری جمادی الثانی کو خضر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہو گئے۔ امرار اور عمدہ دار بھی انکے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستہ کوچ کیا۔ اسی مہینہ کی ۲۹ تاریخ کو سواری شاہانہ کا دہلی میں ورود ہوا اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینہ کی ۶ تاریخ کو اجیر پور کے عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دار الخلافہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھوا مار تے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آکر قیام فرمایا۔ میں یساور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں جا کر حاضر ہوا۔ اور ایک کتاب ”چل حدیث“ جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں۔ اور اس کا نام تاریخی نام ہے خدمتِ عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانہ میں داخل کرادی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

**عبادت خانہ میں علماء کے منگامے** | فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانہ میں علماء کی محفل میں گزرتے تھے۔ خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ ان مجلسوں میں علماء کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں تلواروں کی طرح خوب ہی اپنے جوہر دکھاتی تھیں۔ مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہو گئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر و دھڑلے سے کی جانے لگی۔ سنی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہ و حکیم کے موازنہ و مقابلہ سے گزر کر اصول و مہمات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بیاہکی سے چلنے لگیں۔

**ملاؤں کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی** | انہی دنوں محمد دوم الملک نے شیخ عبدالنبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ مارا کہ اس نے خضر خاں سروانی کو جس پر حضور اکرم کے خلاف بدزبانی کا الزام لگایا تھا اور میر حبیب کو جس پر رفس کا الزام تھا، ناحق قتل کرادیا۔ لہذا انکے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بھی کہ اس کو اس کے باپ نے

یہ کتاب الاحادیث یہ طاعن اور بدایونی کی مرتب کردہ ہے۔ انہوں نے یہ کتاب شاہی ملازمت سے پہلے ۱۰۰۰ میں اپنے شوق سے لکھی تھی۔

عاق کر دیا تھا اور وہ خود بخود بوا سیر کے عارضہ میں مبتلا ہے۔ شیخ عبدالنبی نے بھی اس کی جہالت اور گمراہی ثابت کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اس طرف اور کچھ اس طرف ہو گئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور خطی بنانے لگے۔ علماء کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ انہوں نے حقائق کو مسخ کر کے بادشاہ کو جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علماء کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین و شریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ان پانچ چھ سالوں میں اسلام کا نام تک نہیں رہا اور وہ ساری بساط چوہٹ ہو کر رہ گئی۔

ابریا کہ بیان کیا جا چکا ہے علماء کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی دراندازی کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علماء اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی افتاد طبع اور کچھ

حالات کا تقاضا، بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلمہ اعتقادات سے منکر ہو کر اتحاد و بے دینی کی راہ اختیار کر لی۔ بچپن سے عمدہ جوانی اور جوانی سے اس نچتہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈالواں ڈول روش تھی وہ کبھی ایک نظریہ اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق و تجسس کا جذبہ تھا جسے بد عقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیر دیا۔ اول اول تو صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقع پر علماء نے ایسی ناسمجھی کا ثبوت دیا کہ بجائے اس کے کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے اپنے اعزاز و مرتبہ کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تدلیل کرنے لگے۔ ایک ہی مسئلہ کو جب علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران اور ان کی بحثوں سے دل برداشتہ ہو گیا۔ دربار میں مختلف مذاہب و مذاہب کے جو گمراہ کن عناصر جمع ہو گئے تھے انہوں نے اس سے خوب ہی فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کر کے اس کے ذہن کو انکار و انحراف کی طرف مائل کر دیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں، میں مختصر چند باتوں کا یہاں ذکر کروں گا جس سے بادشاہ کی بد اعتقادی کے اسباب کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اس زمانہ میں دربار شاہی میں تقریباً ہر ملک کے اہل علم اور مفکر موجود تھے۔ اور مختلف مذاہب بے دینی کے اسباب و محرکات کے عالم اور راہنما بھی جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات دن مختلف علوم و نظریات پر تبادلہ خیالات

اور طرح طرح کی نکتہ سنجیوں میں مصروف رہتے تھے۔ بادشاہ کو بھی فتوحات و مہمات کی طرف سے پوری فرست تھی، اس لیے وہ بھی انہی مشغلوں میں اپنے اوقات صرف کیا کرتا تھا اور جو اصول و کلیات اسے پسند آ جاتے خواہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کے موافق ہوتے یا مخالف، انہیں وہ بدل و جان قبول کر لیتا تھا اور جو باتیں اس کی نگاہ میں نہ جیتی تھیں ان کو وہ ترک کر دیتا تھا اس طرح اس نے ترک و اختیار رد و قبول کے ایک خاص شعور اور جداگانہ معرفت کو اپنا معیار بنالیا اور عجیب طرح کے ہولانی اعتقادات نے اس کے ذہن پر غلبہ پایا۔

مجموعی طور پر ایک خیال اس کے ذہن پر پتھر کی گیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود وحدت و بیان کا تصور ہیں اور ہر قوم و ملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کمی نہیں رہی ہے۔ اس لیے حق ہر

ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور تو پیدا شدہ ہے اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع نچتہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بہ لحاظ علم و دانش علوم رسمی اور انسانی احوال و نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کر کے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور ”نظریات“ کو اس طرح ”بدیہیات“ بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نکتہ نظر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حشر و نشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے، معتبر اور قابل قبول نہ رہیں۔ دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین میں جو شدید اختلافات ہیں اور علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارف اور مجادلے درج ہیں، حریفوں نے جن جن کو ایک خاص زاویہ سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی ہے

میداد رقیب آں سہی قدر اپند      کاندرا رخ ہر کس چو گل از باد مخند

از حد چو بشد نصیحت آں شوخ گرہ      برگوشہ ابر و زرد و سر پیش افگند

سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم نامی برہمن کو جو ”نامہ خرد وافر“ کی ترجمانی پر مقرر تھا، خلوت میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں باریاب

**عقیدہ تنازع کا قرار**

ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کوریوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے کے برابر لگادیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیو مالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان ترجمانوں میں ملازم تھا جو ”مہا بھارت“ پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی

لے علم کلام دو جدا گانہ قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو اسلامی فرقوں کے باہمی جھگڑوں سے پیدا ہوا اور ایک مدت تک پھیلتا رہا اور بڑے بڑے علمی اور سیاسی جھگڑے اسکی بدولت رونما ہوئے۔ دوسرا علم کلام وہ ہے جو غیر اسلامی فلسفہ خاص طور سے یونانی فلسفہ کے رد و مقابلہ کے لیے ایجاد ہوئے۔ علم کلام کو کلام کہنے کی وجہ سمجانی نے یہ بیان کی ہے کہ سب سے پہلا اختلاف جو عقائد کے متعلق پیدا ہوا وہ کلام الہی کے بارے میں تھا اس لیے اس کا نام علم کلام پڑ گیا۔ علامہ شریانی نے طل و نمل میں لکھا ہے یہ علم فلسفہ کے مقابلہ میں ایجاد ہوا تھا اس لیے فلسفہ کی ایک شاخ (منطق) کے نام سے یہ فن بھی موسوم ہوا۔ کیونکہ منطق اور کلام ہم معنی الفاظ ہیں یہی وجہ صحیح ہے۔ اس کا آغاز شدہ خلیفہ ہمدی کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ ماموں رشید کے زمانہ میں معتزلہ گروہ کے فلسفیوں نے اس کو باضابطہ مدون کیا اور اسی وقت سے یہ ایک علیحدہ فن اور علم بن گیا۔ امام غزالی، امام رازی، ابن رشد، ابن تیمیہ شاہ ولی اللہ اس فن کے مشہور اکابر ہیں۔ علم کلام کے بانی اور موجد کا نام ”ابو المنذیل“ محمد بن المنذیل بن عبد اللہ بن مکحول، ہے جو سلاطین میں پیدا ہوا۔ شکستہ میں فوت ہوا۔ اس نے اس فن میں ساٹھ کتابیں لکھی تھیں۔ مجوسیوں اور ملحدوں سے اس کے مناظرے بہت مشہور ہیں۔ جن کو ابن خلکان نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اشاعرہ اور معتزلہ ان دو بڑے فرقوں کے علمی مباحث اور مناظروں نے علم کلام کے نوک پلک درست کیے اور وہ ایک باضابطہ فن اور جامع فلسفہ بن گیا۔



کے طریقے آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی دجن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں، ان کی عظمت و احترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اپدیش بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدہ تناسخ پر عقیدہ لے آیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات و صحت پر رسائی لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں دوڑ لگانے لگے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک بیشمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور اسکے باوجود یہ بد بخت اہل کتاب نہیں ہیں بہت زیادہ قائل ہو گیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

**وحدة الوجود کا اثر** | انہی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجود صنی دہلوی بھی جس کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے ہیں، خلوت گاہ میں باریاب ہوا وہ شیخ زمان پانی پتی کا شاگرد تھا جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح لوائح" کافی مشہور ہے۔ کتاب "نہایت الارواح" پر بھی انہوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی شیخ ابن عربی سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چار پائی پر اور چار رات رات بھر اہل تصوف کے شطیحات اور

لے برہما، ہندو معنونات کی آفرینش کا مبداء برہما کو بتاتے ہیں کہ جب دنیا پر اکثر کلپ گزر گئے ایک کلپ چار جگ کا اور ایک جگ ۴۳ لاکھ بیس ہزار سال کا ہوتا ہے، تو ایک "من" پیدا ہوا جو برہما کی خواہش تخلیق کا منظر تھا اس سے دنیا کی تخلیق ہوئی۔ ہندو دیو مالایں برہما خالق کے مترادف ہے جو پیدا کرنے والا دیوتا ہے۔

مہادیو:- فنا کرنے والا دیوتا ہے جسے اور بھی کہتے ہیں۔

بشن:- پرورش کرنے والا اور آفرینش کو قائم رکھنے والا دیوتا ہے۔

کچھ لوگ ہندوؤں کو علیحدہ علیحدہ خدا مانتے ہیں کچھ کا خیال ہے کہ خدا ایک ہے۔ لیکن ان تین پکیروں میں جلوہ گر ہے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ خدا ان سے بالاتر ہے۔ انسان عبادت و ریاضت کے ذریعہ ان تین اونچے خدائی مرتبوں پر ترقی کر سکتا ہے۔

کشن اور رام:- دیوتا نہیں بلکہ خدا کے اوتار سمجھے جاتے ہیں، خدا اوتار کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ چار جگ کی مدت میں خدا دس مرتبہ اوتار کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے سب تک نوا اوتار ظہور کر چکے ہیں جن کے نام ہیں چھ اوتار: کورم اوتار، نرسنگھ اوتار، یام اوتار، پرشرام اوتار، مام اوتار، کشن اوتار، بودھ اوتار، کلکی اوتار۔ رام اوتار راجہ جہرت سے کوشلیا کے بطن سے اجودھی اودھ میں پیدا ہوئے بارہ سال اپنی بیوی سیتا اور بھائی لچھمن کے ساتھ بن باس لیا۔ راوٹ کو ہنومان کی مدد سے ختم کر کے اکثر علاقے فتح کیے اور گیارہ ہزار سال تک حکومت کی۔ کشن اوتار مقرر کے راجہ تھے اپنے ماموں کسن کو جو ریڈا ظالم تھا قتل کر کے حکومت حاصل کی، مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کا ساتھ دیا اور اپنا مشہور اپدیش جسے بھگوت گیتا کہتے ہیں دیا ایک سو ۲۵ سال تک زندہ رہے۔ کشن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے توحید کی تعلیم دی تھی۔

مہامائی:- دیو مالاکا ایک عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے ایک عورت مہا لچھمین کی شکل میں تجلی کی جس کے تین روپ ہیں: "ست" "سج" اور "تم"۔ جب دنیا کو پیدا کرنا چاہا تو خدا نے تم کے روپ سے ایک نئی شکل میں ظہور کیا۔ خدا کے اس ظہور کو مہاکالی یا مہامایا مہامائی، کہتے ہیں۔

لہ تناسخ الارواح:- یہ فلسفہ جبر کا لازمی عقیدہ ہے جو مذاہب جبر کو تسلیم کہتے ہیں وہ کسی نہ کسی صورت میں تناسخ الارواح کو تسلیم کرتے آئے ہیں۔ ہندو فلاسفہ کی تو یہ ایک اہم بنیاد ہے۔ تصوف میں تناسخ کا مطلب ایک ہی ذات کا مختلف حالتوں اور جلوؤں میں ظہور کرنا ہے۔ "ویدانت" میں خواہش تناسخ کا باعث ہے۔ ذات اپنے کمال پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے لیکن خواہشوں کی تکمیل نہیں ہوتی ان کی تکمیل کے لیے ذات دوسرے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

تھے شیخ زمان:- بدایونی نے شیخ زمان لکھا ہے اصل نام عبداللہ القلیبان اللہ تھا شیخ امان پانی پتی کے نام سے مشہور تھے۔ شیخ محمد حسن اور شیخ محمد ودودی کے مرید و شاگرد تھے۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے سلسلہ قلندریہ اور سلسلہ چشت سے تعلق تھا۔ تصوف اور علم توحید میں شیخ محی الدین ابن عربی کے معتقد تھے۔ ان کا ایک رسالہ اثبات لائحہ ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی کی کتاب "لوائح" پر مفصل شرح لکھی ہے۔ شیخ تاج الدین زکریا اجود صنی لکھنے والے شیخ امان کی وفات ۱۲ ربیع الثانی ۸۵۰ھ میں ہوئی۔

تھے شیخ ابن عربی:- اصل نام محمد باپ کا نام علی بن محمد مغربی محی الدین ابن عربی کے نام سے مشہور ہیں انکی تصانیف کی تعداد پانچ سو بتائی جاتی ہے۔ فتوحات مکیہ مشہور تصنیف ہے۔ ۱۱ھ کی ولادت بلاد اندلس کے شہر مرسیہ میں شہد و شنبہ ۱۲ رمضان ۵۴۰ھ میں ہوئی۔ وفات شب جمعہ ۲۲ ربیع الآخر ۶۱۸ھ میں بمقام دمشق ہوئی۔ مرزا جبل قاسم میں صالحیہ کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ ابن عربی نے فلسفہ جبر کو وحدت الوجود کی صورت میں مرتب کیا اس سلسلہ میں ان کی کتاب "فصوص الحکم" بڑی شہرت رکھتی ہے۔

مرعومات سیاکرتا تھا۔ وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ بجز الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریہ اور ”قصص الحکم“ کے دوسرے مسائل مثلاً ترجیح رجا بر خوف، ”ایمان فرعون“ وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کر دیئے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ کافر و نیک آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہو گا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں خوب تاویل کر کے بخوبی باور کرا دیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کی ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کر دیا تو اس نے اپنی تعلیم و تلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

**انسانِ کامل کا تصور** | شیخ نے اکبر کے سامنے ”انسانِ کامل“ کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسانِ کامل کو خلیفہ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ انسانِ کامل کے بعد درجہ تو صرف عین واجب و ذاتِ خداوندی کا ہی ہے۔ اس لیے شیخ کی گمنام انسانِ کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی تو ناچتے کو بچانے والے تھے۔ انہوں نے بھی باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب خوب ٹنگوٹے چھوڑے بس کیا تھا طرح طرح کی خرافات و اختراعات شروع ہو گئیں۔ چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ”زمین بوس“ رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھا دیا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو ”کعبہ مرادات“ و ”قبلہ حاجات“ قرار دے دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کر کے اس کا منہ بند کر دیا گیا۔

**خیر و شر کی اضافیت** | ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہم نوا بھی اس تنگ و تنار میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا و پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے قاضی ہمدانی کی ”تمہیدات“ سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اسم ”الہادی“ کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم ”المضل“ کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انہی دو اسماء کا جلوہ ہے، اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں (مطلب یہ کہ خیر و شر چونکہ منجانب خداوندی ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق و امتیاز نہیں،

**شیعیت کی چھاپ** | مذکورہ بالا ”خلوت معلق“ کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا۔ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طعن و طعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف

لے وحدت الوجود۔ جبر و تقدیر کا مسئلہ ہر مذہب میں نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ مسئلہ جبر کی مکمل توضیح وحدت وجود کے فلسفہ میں ملتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا ارادہ اور خیال اس کے انحال و اعمال اس کے اپنے نہیں بلکہ کسی خاص قوت اور خاص نظام کائنات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اسی لیے انسان اور دوسری مخلوقات بذاتہ خود کار و خود اختیار ہستی نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک واجب وجود ہستی یعنی خدا کے مظاہر و صورت ہیں۔ مادہ روح اور خدا تینوں ایک ہی وجود کے مختلف حالتوں کے نام۔ وحدت وجود کا یہ تصور زردشت کے فلسفہ میں بھی شامل رہا ہے۔ اور ہندوستان کی ویدانت فلاسفی میں بھی کافی وضاحت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ ویدانت کا فلسفہ اس مقولہ پر مبنی ہے۔ ”ادہم برہم دوہتے ناستے“ برہم برہم ہی ہے دوسری چیز نہیں، یونانی فلسفہ میں بھی یہ خیال کام کرتا رہا ہے۔ تصوف میں وحدت وجود کے فلسفہ کی مکمل شکل ابن عربی کی تصنیفات میں ملتی ہے۔

سب کو کافر بناتا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھا دیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔  
اس صورت حال سے پہلے اکبر کے دل پر علمبر کا بڑا اثر تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان کو بطحاظر تہ و عظمت امام غزالی اور رازی سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا۔ لیکن جب ان عالموں کی رکیک حرکتیں اس کی نظر میں آئیں اور ان کے تحریم و تکفیر کے مناقشوں سے وہ سخت متنفر ہوا تو اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ ان جھگڑالو عالموں اور قاضیوں کی عظمت ہی گر گئی بلکہ ان پر قیاس کر کے وہ بزرگان سلف کا بھی منکر ہو گیا۔

اسی زمانہ میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو پاپا کہتے ہیں، جسے مصلحت و وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی نظر انتفات سے نوازے گئے تو انہوں نے انجیل پیش کی اور عقیدہ ثلاثہ (عقیدہ تثلیث) کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گرامیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کا بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا۔ ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابوالفضل کو انجیل کے ترجمہ کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا:

”اے نامی وی تھرو کرستو“

(یعنی اے وہ ذات کہ تو بڑا مہربان اور بخشنده ہے، شیخ فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرع کہا:-  
”سبحانک لا سواک یا ہو“

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا دیا اللہ معاف کر یا اللہ پناہ دے،

امام غزالی:۔ محمد نام، حجت الاسلام لقب غزالی عرف۔ ان کی پیدائش سنہ ۴۵۰ھ ضلع طوس کے شہر طہران میں ہوئی، نیشاپور میں امام الحرمین سے تعلیم حاصل کی۔ امام غزالی کے وقت مشہور سلجوقی فرماں روا ملک شاہ حکمران تھا اس کے مشہور وزیر نظام الملک نے ان کی بڑی قدر کی اور مشہور تاریخی درس گاہ نظامیہ کے مدرس اعلیٰ کے عمدہ پران کو مامور کیا۔ آپ نے حجاز و بلاد شام کا سفر بھی کیا تھا۔ ان کی وفات ۵۰۵ھ جمادی الثانی سنہ ۵۰۵ھ میں بمقام طہران ہوئی اور وہیں دفن ہوئے۔ آپ نے تلامذہ اور تصانیف کی ایک بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی ان کی کل عمر ۵۰ سال تھی۔ جس میں دس بارہ سال سفر میں گذارے۔ اس کے باوجود فقہ اصول، فقہ منطق، فلسفہ کلام تصوف و اخلاق پر ۷۰ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ جو ہر موضوع پر نہایت اہم کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔

امام رازی:۔ علم کلام کے مشہور عالم اور فلسفی گذرے ہیں۔ پورا نام محمد بن عمر ہے۔ سنہ ۴۴۰ھ میں بمقام رے پیدا ہوئے۔ نہایت دولت مند عالم گذرے ہیں۔ چنانچہ شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کے لیے ان سے ایک کثیر رقم قرض لی تھی، محمد بن نکش خوارزم شاہ جو خراسان و عراق کا مشہور حاکم گذرا ہے۔ ان کا معتقد تھا۔ ان کا زیادہ تر قیام بہرات میں رہا۔ یکم شوال سنہ ۵۰۵ھ بروز اتوار بہرات میں انتقال کیا۔ تفسیر اصول فقہ، فلسفہ اور عقلیات تمام علوم پر وہ یکساں تدریس رکھتے تھے۔ ہر موضوع پر ان کی بہت سی کتابیں مشہور ہیں اور درسیات میں شامل رہی ہیں۔

## آفتاب پرستی کا آغاز

بیربطوں میں ایک بس کی گانٹھ تھا اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کہ۔۔۔ آفتاب ہی منظر کامل اور سرچشمہ سعادت ہے۔ اسی کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے کھیتیاں

سہماتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزہ میں تراوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ و متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہیے۔ پرستش کے لیے اسی کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے۔ آفتاب پرستی کے ذیل میں اس نے آگ، پانی، پتھر و رخت اور تمام مظاہر عالم بیان تک کہ گائے اس کے گوبر، قشقہ اور زرنار کے تقدس کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آئے تو دربار کے بد بخت حکما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب "نیر اعظم" ہے۔ "عطیہ بخش ہمہ عالم" ہے۔ "مرئی بادشاہان" ہے۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نور و جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی۔ چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارہ کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہمنوں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتا دیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ گائے کا ذبیحہ بند کر دیا۔ اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہو گیا۔ گاؤ کشی کی سزائیں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کر دیا گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤ کشی کے خلاف نسخہ آرائی کے جوہر دکھائے اور گاؤ زبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمہ کو خراب کرتا ہے۔

## آتش کدہ کا قیام

دربار میں گجرات کے شہر نو ساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ انہوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کر کے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا، چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدہ کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتے تھے ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہے۔ کیوں کہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا ایک پرت ہے۔ اس آتش کدہ کا انتظام شیخ ابو الفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانہ ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں موم دہون، کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

## آفتاب اور آگ کی پرستش

پچیسویں جلوس کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کا سجدہ علانیہ کیا۔ مصائبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ منبد کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ لگا کر دولت خانہ میں برآمد ہوا اور جواہرات پروٹی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوائی اور امرا نے حسب مذاہج مروارید اور جواہرات اس دن تدریگ زرانے اور اس توہم پرستی کی عملاً و قولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کر دی۔ غرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے، اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے، جن کو عرب کے سر پہروں اور ہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو گئے تھے۔ کیا کہا جائے مختصر یہ کہ۔۔۔

”يُرِيدُ أَنْ يُلْطِفُوا لَكُمْ وَاللَّهُ بِأَعْيُنِنَا هُمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَكَوْكَرِهِ الْكَافِرُونَ“

وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اللہ نے اپنے نور کی تکمیل کر دی ہے اگرچہ کافروں کو یہ بات بڑی ناگوار ہے،

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تہنیت کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو علانیہ ترک کر دیا جاتا۔

**ابوالفضل کی بے دینی** | مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابوالفضل سے

میری گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا کتنا تھا کہ مجھے تمام مصنفوں سے ایک شکایت ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات تو نہایت تفصیل سے سن وار لکھے ہیں اور پچھلے پیغمبروں کا حال اس تفصیل سے نہیں لکھا۔ میں نے جواب دیا، نبیوں کے تذکرے میں متعدد ”قصص الانبیاء“ لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا ”نہیں وہ بہت مختصر ہیں تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی میں نے کہا اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء کے زمانہ کو کافی طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لیے مفسرین ارباب تاریخ و سیر و ہی باتیں لکھیں جو ان کے نزدیک تحقیق شدہ تھیں جن کا ثبوت ان کو نہیں ملا اسے چھوڑ دیا ہوگا۔“ اس نے کہا ”یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔ پھر اس نے ایک بات چھیڑ دی کہ ”تذکرۃ الاولیاء اور نفحات الانس“ اور ان جیسی دوسری کتابوں میں ہر پیشہ اور گروہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن معلوم نہیں اہل بیت سے کیا قصور ہوا تھا کہ ان کتابوں میں ان کا ہی تذکرہ نہیں ہے۔ کیا یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے؟ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ مناسب تھا کہا لیکن مان کر کون دیتا؟ آخر میں میں نے اس سے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟ اس نے کہا ”میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔“ میں نے مذاقاً چھیڑتے ہوئے کہا ”نیک ارادے ہیں بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔“ جیسا کہ مشہور ہے۔

برداشت غل شرع بتائید ایزدی

از گردن زمانہ علی ذکرہ السلام

میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

**ابوالفضل کی دریدہ دہنی** | ابوالفضل کو درپردہ چشم شاہی کی اشارت تھی۔

اس لیے وہ ان بد اعتقادیوں کے بارے میں شیخ صدر قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے دیرینہ بوڑھوں کو بڑی جسارت سے چھیڑ چھیڑ کر بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور ان کی بے عزتی کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں ہچککتا تھا۔ بادشاہ اس کی سن ترانیوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔

لوڑھے علماء نے عاجز آکر ایک مرتبہ آصف خاں میر بخشی کے ذریعہ خفیہ طور پر ابوالفضل کو کہلوا یا کہ ”تم آخر کس وجہ سے ہمارے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑے رہتے ہو؟“ اس نے جواب دیا ”بس یہ سمجھو میں جگن کانہیں بادشاہ کا نوکر ہوں۔“ غرض اس نے خفیہ ہی عرصہ میں ان عالموں کو اپنی ذہانت باپ کی معاونت اور بادشاہ کی پشت پناہی اور بخت کی یاوری سے ایک ایک کر کے ذلیل و خوار کر دیا اور کوئی مسلمان عالم بجز حکیم ابوالفتح اور ملا محمد یزدی کے جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے اسے سامنے



غروب نہ پاسکا اور اہل علم کی وہ ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

عربا سے پہلو تھی | جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشہ عزت اختیار کر لیا اور دربار داری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں اور غیریت کا پردہ درمیان میں آگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس حال ہی میں خوش رہا ہوں۔

دل درنگ و پونہ شد نیکو شد کہ نہ شد جز در تو فرو نہ شد نیکو شد کہ نہ شد  
گفتی کہ برنج از نیکو شد کارت دیدی کہ نیکو نہ شد نیکو شد کہ نہ شد

میں اپنے آپ کو کسی رعایت کے قابل سمجھتا تھا نہ ان کی خدمت کے لائق۔

بیاتا تکلف بہ یک سو نہیم

نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی دوسری سے آستانہ پر کورنش بجالاتا تھا اور اہل محفل کا تماشا دیکھتا رہتا تھا۔

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است

صحبت گذاشتم نہ تماشا یاں شدم

میں نے اوپر جتنے حالات بیان کیے ہیں ان جزئیات اور تفصیلات کو سن واد ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں اس لیے اتنے ہی پر یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ ہر حالت میں بندہ کا نگہبان اور محافظ ہے۔ حزم و احتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا۔ لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحومہ اسلام کی دسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آ گئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن و طنز کرنا ہے نہ اس کے پیچھے حسد و تعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ مبارک سے "حرف ہوائی" کا عمل سیکھنا شروع کیا۔ شیخ مبارک سے ملاقات سے پہلے ایک دن شیخ فیضی نے اکبر سے کہا "ہمارے شیخ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے۔" بادشاہ نے فوراً جواب دیا "ہاں انہوں نے اپنے سارے تکلفات تمہارے سپرد کر دیئے ہیں۔"

اکبر نے شیخ بھبھو، میاں تان سین اور دوسرے تمام موسیقاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تا کہ وہ ان میں ایک دوسرے پر

لے تان سین :- اصلی نام ٹانسانیا یا ٹوناسٹان تھا۔ کہتے ہیں اس کی پیدائش اٹلی کی تھی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی پرورش کشمیر میں ہوئی، شاید کشمیر ہی میں پیدا ہوا

ہو۔ ۱۵۹۵ء کو وہ کشمیر سے لاہور میں آیا۔ وہاں سے ۱۸ سال کی عمر میں دہلی چلا گیا، یہاں ایک بزرگ ملاسلطنت کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا اور ان کے ساتھ وہ یکم رمضان ۹۷۷ھ

۹۷۷ھ کو لاہور سے دہلی آگیا لیکن سرکاری آدمی دونوں کو دہلی پہنچانے تان سین کے گانے کی دہلی میں بڑی شہرت تھی اس کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ملاسلطنت کے مرنے کے بعد

وہ دہلی سے آگرہ چلا گیا۔ یہاں چھ ماہ ٹھہر کر وہ بہار اور بنگالہ کی طرف چلا گیا اور بادشاہ کے دربار میں ملازم ہو گیا۔ داؤد کی شکست کے بعد وہ آگرہ کو لوٹ آیا اور چند ہی دن میں

دربار اکبری میں باریاب ہوا۔ اس کے چار بیٹے مختلف بیویوں سے ہوئے تین بیٹے تو مولوی بن گئے ایک بیٹا حشمت نامی تھا جس نے باپ کے فن کو زندہ رکھا۔ تان سین کا انتقال

۹۹۵ھ میں ہوا اس کی قبر آگرہ ہی میں تھی جو غدر سٹیشن میں تباہ کر دی گئی۔ فرخ محقق اسٹوارٹ ہلی نے لکھا ہے کہ دنیا میں دو بڑے موسیقار ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ایک ہندوستان

میں تان سین دوسرا روم میں انگلیلا۔ ایک مؤرخ نے اسے "پیغمبر موسیقاراں" لکھا ہے۔ غرض تان سین اپنے دور کا سب سے بڑا موسیقار تھا۔ اس نے کئی ایک راجاں کو راجے بنایا دیکھے۔

د باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ترجیح دیں۔ شیخ مبارک نے میاں تان سین سے اس موقع پر کہا تھا۔ ہم نے سب سے تم بھی کچھ گالیتے ہو۔ اور جب اس نے ٹاکرنا پالیا  
شیخ نے اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

آبی محل کی تعمیر | اسی سال فتح پور میں ایک حکیم آیا ہوا تھا۔ اس نے ایک ایسے گھر کی تجویز پیش کی جس کے چاروں طرف  
پانی ہو اور غوطہ لگائے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہ ہو، خوبی یہ کہ پانی گھر میں کسی طرح بھی سرایت نہ کرے۔

بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور دولت خانہ کے صحن میں بیس گز چوڑا بیس گز لمبا اور تین گز گہرا ایک حوض بنایا گیا۔ اس کے  
اندر ایک سنگین کمرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر ایک بلند مینارہ تھا۔ اس کمرہ کے چاروں طرف پل بنائے گئے۔ لیکن حکیم کا دعویٰ  
قربادین کی طرح غلط ہی ثابت ہوا اور وہ چھپ کر کہیں بھاگ گیا۔ ایسا ہی ایک حوض سترہ سال بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور  
میں بنایا تھا۔ اس حوض کی تاریخ ”حوض حکیم علی گیلانی“ نکالی گئی تھی۔

بادشاہ نے اس نامکمل حوض کو زرہ سیاہ سے جس کی قیمت بیس کروڑ روپیہ ہوتی تھی بھروایا۔ اور وہاں موسیقی کی ایک  
محفل منعقد کی۔ شیخ بھجو ایک خوش آواز قوال تھا صوفیانہ وضع قطع میں رہتا تھا اور شیخ ادھن جو نپوری کامرید تھا۔ اس کی تاریخ  
ونات اس کے نام ہی سے نکلتی ہے۔ اس محفل میں شیخ بھجوتے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ بادشاہ نے اس کو بہت داد دی اور بڑے  
خوش ہوئے محفل میں میاں تان سین اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے بن سرے گویے بھی بلائے گئے تھے بادشاہ نے شیخ بھجو  
کو ان سب پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ اس حوض کا سارا سونا شیخ بھجو اٹھا لے جائے۔ وہ بچارا اس کو بھلا کس طرح اٹھا سکتا تھا  
اس لیے اس نے تھوڑے سے سونے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کے عوض ایک ہزار روپیہ اسے مرحمت فرما دیا اور وہ  
بقیہ سونا تین سال کی مدت میں جاوے جا اخراجات میں صرف ہوتا رہا۔

معصوم خاں کی باریابی | اسی سال میرزا محمد حکیم کا کوکہ معصوم خاں جو نہایت بہادر نوجوان تھا اور بڑے بڑے کارنامے  
انجام دے چکا تھا۔ میرزا سے ناراض ہو کر بادشاہ کے پاس آگیا تھا۔ اکبر نے اسے پانصد روپیہ  
کا عہدہ دے کر بہار پر روانہ کر دیا۔ معصوم خاں نے وہاں مشہور پٹھان سردار کالا پٹا سے جنگ کر کے فتح پائی۔ بادشاہ نے  
اس کا رنامہ پر فتح پور سے ہزاری کا فرما، گھوڑا اور خاصہ کا گھوڑا اس کے لیے روانہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب  
میں حضرت علی کو دیکھا تھا کہ انہوں نے اس کی پیٹھ پر اپنا پنجہ مبارک رکھا تھا۔ اسی کی برکت سے اس نے کسی جنگ میں بھی پیٹھ نہیں  
دکھائی اور اس پنجہ کا نشان اس کی پیٹھ پر نظر آتا ہے۔

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیاں

اسی سال ماہ شوال ... میں ایک نہایت کمینہ اور ذلیل آدمی ملاطیب کو کیتھل سے بلا کر دربار میں نواز گیا۔ بادشاہ کی  
اکثر نوازشیں بس کچھ اسی قسم کی رہتی تھیں، ملاطیب کو صوبہ بہار اور حاجی پور کا دیوان مقرر کیا گیا اور رائے پر کھوتم کو جو اسی قبیلے کا  
آدمی تھا بخشی کا عہدہ ملا اور ملا مجدی سرمنڈی کو جو پہلے اسلم شاہ کے عہد میں پرچہ نویس تھا امین بنایا گیا اور شمشیر خاں خواجہ ہرا کو خالصہ کا

دبقیہ ماشیہ (مکمل) پرانے ”دیک راک“ وغیرہ کو زندہ کیا۔ اس کی شہرت کا کوئی اور وسیع مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب بھی گویہ اور قوال تان سین کے  
نام کی فاتحہ دیتے ہیں۔ تان سین نے فن موسیقی پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

مقرر کیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کمینہ لوگوں نے خوب ہاتھ پیرنگا لے۔ ان کو نہ خدا کا خوف تھا نہ بادشاہ کا لحاظ، من مانی کرتے تھے اور اس وقت اور موقع کو غنیمت جان کر ایسی ایسی کارروائیاں کیں کہ سارے لشکر ہی ان کے ہاتھوں تنگ۔ اور زبردستی معصوم خاں کو باغی بنا دیا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اسی مہینہ مقصود جوہری مرزا مظفر حسین کو اور راجہ علی خاں کے نذرانوں کو خاندیس سے لا کر حاضر خدمت ہوا۔ اکبر نے کچھ بعد میرزا کے قصور معاف کر دیئے اور انہی دنوں اس کو اپنا داماد بنا کر اسے عزت و مرتبہ عطا فرمایا۔

اسی سال بادشاہ نے شہباز خاں بخشی کو غازی خاں بدخشی اور شریف خاں آٹک کے ساتھ رانا کیکا پر فوج کشی کے لیے متعین کیا۔ رانا کیکا کو نبل میر کے مستحکم قلعہ میں محصور ہو گیا تھا۔ بادشاہی فوجوں نے حملہ کر کے قلعہ کو فتح کر لیا اور اس کے سارے ملک و بالا کر دیا اور رانا راتوں رات قلعہ سے بھاگ کر دوسرے کوہستان میں چلا گیا۔

اسی سال سلطان خواجہ مکہ معظمہ سے لوٹ کر آیا اور وہاں سے بادشاہ کے لیے عربی نسل کے گھوڑے، حبشی غلام اور سرے انیس تحفے لا کر پیش کیے، اسے صدارت کا عمدہ تفویض کیا گیا۔

**قلعہ حجاج کی روانگی** ۹۸۶ھ میں امیر حجاج کا اعزاز حضرت خواجہ احرار کے پوتے خواجہ محمد یحییٰ کو ملا۔ اکبر نے چار لاکھ روپیہ دیا۔ اور اسی سال شوال کے مہینہ میں حاجیوں کے قافلے کو اجمیر سے روانہ کیا گیا۔  
فتح عبدالبنی اور مخدوم الملک کو بھی جن کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اکبر اسلاف سے متنفر اور احکام دین سے منحرف ہو چکا تھا، اسی قافلہ کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال حج کا فریضہ ادا کیا۔ ان کے سفر کی تاریخ ہو عن یزید مذکور نکالی گئی تھی۔

**نجماں کا انتقال** ۹۸۳ھ کے آغاز میں حاکم بنگالہ خان جہاں کے انتقال کی خبر ملی، اس کے بھائی اسماعیل قلی خاں کے نام عنایت آمیز فرمان صادر کیا گیا، مظفر خاں جو اس وقت دیوان کے عمدہ پرفائز تھا بنگالہ کا حاکم مقرر ہوا۔ رضوی خاں بنایا گیا اور فتح پور سے حکیم ابوالفتح کو صدر اور رائے پتر داس کو میر آدمی کی شرکت میں دیوان بنا کر روانہ کیا گیا۔  
۱۹ ماہ صفر کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔ اس کا نام میں نے محی الدین رکھا۔ یہ لڑکا ماہ میں پیدا ہوا تھا۔

**خائف و نذرانے** بادشاہ نے ملا عشقی کو جسے خان کا خطاب حاصل تھا اور شاعری میں اس کا ایک دیوان اور مزاحیہ مثنوی بھی ہے کشمیر میں وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ اسی سال وہ قاضی صدر الدین لاہوری کے ساتھ دربار میں آئے۔ اس کے ہمراہ حاکم کشمیر کا ایلچی محمد قاسم نامی بھی آیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے بہت سارے عفران، مشک، عود، شال اور کشمیر و تبت کے عفران کشمیر کی خاص پیداوار ہے، جہاں گہیر نے اپنی توڑک میں لکھا ہے کہ "کشمیر کا عفران دریا کے پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہر سال پانچ سو من عفران برابرتی ہے۔ میں اپنے والد کے ساتھ عفران کی بہار میں وہاں گیا ہوں پھولوں کے تمام درخت پہلے شاخ اور پتے پیدا کرتے ہیں بعد میں پھول، لیکن ان کے برعکس عفران ڈنٹھل جب چار انگشت زمین سے نکل آتی ہے تو اس میں سوسنی رنگ کا چار ٹکڑوں والا پھول نکلتا ہے۔ اس میں نارنجی رنگ کے ریشے ریشی دھاگوں کی طرح ہوتے ہیں اور ریشے عفران میں۔ عفران کا تختہ نصف کوں، ایک کوں کا ہوتا ہے نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے لیکن خوشبو اتنی تیز ہوتی ہے کہ دور ہی سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔" (باقی اگلے صفحہ پر)

کے دوسرے تحائف بطور پیش کش لے کر آئے۔

اس زمانہ میں حکیم الملک گیلانی کے داماد حکیم علی کو جو حکمت اور طب اور دوسرے علوم میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔۔۔ عادل خاں دکنی کے قاصدوں کے ہمراہ بیجا نگر روانہ کیا گیا۔

اسی زمانہ میں میرزا شاہ رخ کا بہنوئی میر نظام بدخشاں سے سفیر بن کر آیا اور بدخشی گھوڑے قیمتی نعل اور بہت سے اونٹ نذر پیش کیے۔

اس زمانہ میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور **اکبر کی خطبہ خوانی** اسے کسی دوسرے کی پیروی و متابعت گراں گزرنے لگی تھی۔ اس نے یہ بھی سن رکھا تھا حضور اکرم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور بعض دوسرے سلاطین جیسے امیر تیمور صاحبقران، میرزا الخ بیگ گورگانی وغیرہ خود خطبہ پڑھا کرتے تھے اکبر نے بھی بظاہر اسلاف کی پیروی میں لیکن درحقیقت اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنے کی خاطر حکیم جمادی الاول ۹۷۵ء کو فتح پور کی جامع مسجد میں جو بادشاہی محل کے قریب تھی، جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنا چاہا، لیکن جب وہ منبر پر چڑھا تو گھبرا گیا اور رزنے لگا بڑی مشکل سے شیخ فیضی کے یہ تین شعروہ بھی ادھورے پڑھ کر اتر آیا۔ یہ شعر بھی اس صورت میں ادا ہوئے کہ دوسرے برابر اسے بتاتے جاتے تھے۔ اس خطبہ کے بعد حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے جو شعر پڑھنا چاہے تھے وہ یہ ہیں:-

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ، لگتا ہے۔ مجھے نشہ کی عادت ہے لیکن اس کے باوجود میرے سر میں درد ہو گیا۔ میں نے کشمیریوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ انکو درد سر کیا ہوتا ہے، معلوم ہی نہیں حالانکہ وہ اس کے پھول چنتے ہیں۔ یہ کشمیری بس جوان صفت ہیں۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے۔ زعفران کا بیج ماہ اردی بہشت میں بویا جاتا ہے۔ بارش کے پانی سے پرورش پاتا ہے اس کا رنگ پیازی ہوتا ہے ماہ آبان کے وسط میں پھول نکلتا ہے اسکی شاخ پاؤ گز اونچی ہوتی ہے۔ اس ڈنٹھل پر پھول لگ جاتا ہے۔ پھول میں چھ نیکھریاں اور چھ ریشے ہوتے ہیں جن میں سے تین زرد اور تین سرخ ہوتے ہیں۔ یہ سرخ ریشے ہی زعفران ہیں۔ ایک مرتبہ بیج کو پراس کا درخت چھ سال تک برابر پھول دیتا رہتا ہے۔ لیکن ہر سال زمین کو نرم کر دیتے ہیں۔ چھ سال بعد زعفران کے گڈے کو زمین میں سے نکال کر دوسری جگہ بومیٹے ہیں۔ اور اس زمین پر پانچ سال تک کاشت نہیں کرتے۔ زیادہ تر زعفران موضع نیپور مضافات میراج میں ہوتی ہے۔ یہاں بارہ کوس مربع زمین میں زعفران نما رہے۔ پوس پور کے پرگنہ میں اندر کول کے قریب کراج کی جانب ایک کوس میں زعفران نما رہے۔

لے مشک:- سیاہ خوشبودار مادہ ہے جو ہرن کے نافہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہرن کے پیٹ میں ایک رسول نکل آتی ہے۔ جس میں گندہ خورم جاتا ہے۔ جب وہ پک جاتی ہے تو ہرن اسے ریت سے رگڑ کر چھڑا دیتا ہے اس رسول کو نافہ کہتے ہیں نافہ کو چیرا جائے تو سیاہ رنگ کا جا ہوا مادہ نکلتا ہے۔ یہ چیز مشک ہے جو نہایت خوشبودار ہوتی ہے۔ مشک زیادہ تر ترکستان اور تاتار کے علاقہ سے دستیاب ہوتی ہے۔ سیاہی اور خوشبو کی وجہ سے شاعری میں زلف محبوب کو اس سے تشبیہ دی جاتی ہے (قرابادین عجم لے عود:- ہندی میں اسے اگر کہتے ہیں یہ ایک پودے کی جڑ کا نام ہے اس کو اکھاڑ کر زمین میں دبا دیتے ہیں۔ رومی صہ خاک بوجاتا ہے اور جو بچتا ہے وہ خالص عود ہوتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا سارا پودا زمین میں دبا دیا جاتا ہے۔ اسی سے عود نکل آتا ہے۔ عود کے متعلق قدیم داستانوں میں ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک خفیہ پراسرار مقام سے نکال جاتی ہے۔ یہ محض افسانہ ہے سب سے عمدہ عود "سندلی عود" ہوتا ہے۔ اسکی خوشبو سے سر میں جوا پیدا نہیں ہوتی۔ "سندری عود" بھی ایک اچھی قسم ہے جو گیل اور شیریں ہوتی ہے "سندلی عود" سندری سے زیادہ سخت و بیزکبودی رنگ کا جس میں سفیدی نہیں پائی جاتی آگ پر زیادہ دیر تک جلتا ہے سب سے بہتر عود سیاہ رنگ کا ہوتا ہے۔ اچھے عود کی پہچان یہ ہے کہ اسے پانی میں ڈالو تو تین بیٹھ جاتا ہے۔ خراب عود پرا جاتا ہے۔ اچھے عود میں ریشے نہیں ہوتے آسانی سے کوٹا جاتا ہے۔ پے گجرات سے لایا جاتا تھا بعد میں چانپا نیر میں پیدا ہونے لگا۔ اجین اور دہنا سری سے بھی ہوتا ہے۔ کھانے کی چیزوں میں ملا یا جائے تو نشاط آور ہوتا ہے اس کی دھون پھیلی جاتی ہے اور اس کو بدن پاؤں کیروں پر بھی مل لیتے ہیں۔

خداوند سے کہ مارا خستہی داد  
دل دانا و بازوئے قوی داد  
بعدل و داد مارا نہمیں کرد  
بجز عدل از خیال مابروں کرد  
بود و صفش ز حد فہم برتر  
تعالیٰ شانہ، اللہ اکبر

**دشاهی عقائد پر عوام کی بے چینی** | بادشاہ کی بد اعتقادی کو دیکھ کر لوگوں کی جراتیں بڑھ گئیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا علانیہ منہمکہ اڑنے لگا۔ بد نعت ہندو اور ہندو مزاج مسلمانوں کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے۔ علمائے سورن نے اپنی کتابوں میں نعت کے بجائے تبرائے شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے لئے وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔ انہیں ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مقتدر دروغ بانوں کے مقابلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی لیں۔ ان باتوں پر عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگوں میں بادشاہ اور بادشاہ پرستوں بدنامی اور رسوائی عام ہو گئی۔ ملک میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ عوام و خواص میں جو لوگ سفلہ طبیعت اور پست فطرت تھے، ان بے ادبیوں کے باوجود خود کو بادشاہ کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور لاپچ یا خوف سے بادشاہ کے مرید ہو جاتے۔ کسی کا یا راتہ تھا کہ حق بات زبان پر لائے۔

اسی زمانہ میں حاکم بنگالہ مظفر خاں نے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف، ہاتھی اور کپڑے وغیرہ کافی تعداد میں نذرانے کے لیے دربار میں بھیجے۔ محمد معصوم کابلی کے بھیجے ہوئے ۳۹ ہاتھی بھی ملاحظہ شاہی میں پیش کیے گئے۔

**میرات کا مظاہرہ** | اسی مہینہ کے دوسرے جمعہ کو چوگان بازی کے میدان میں فقیروں اور مستحقوں کو جمع کیا گیا۔ اور بادشاہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت احاطہ میں تقریباً ایک لاکھ مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ سلطان اجمہ صدر اور قلیچ خاں نے ایک ایک کو روپیہ تقسیم کیا۔ وہ دن بھی محشر سے کچھ کم نہ تھا۔ ہجوم کی ریل پیل میں اتنی عورتیں اور بچے مل ہو گئے۔ بعض عورتوں کے پاس سے جن کے شوہر بنگال میں مر چکے تھے، اشرفیوں، روپیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی برآمد ہوئیں۔ انکشاف سے بادشاہ کا دل فخر کی طرف سے بھی بیزار ہو گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے بعد تھوڑے سے لوگ حاضر کیے جائیں۔ کچھ عرصہ بعد میرات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

**شہزادہ سلیم کی اتالیقی** | بڑے شہزادہ کی اتالیقی پر قطب الدین محمد خاں آنکھ کو مقرر کیا گیا۔ اس تقریب میں ایک بڑی محفل منعقد ہوئی اور قطب الدین نے عمدہ ہاتھی اور اپنے عمدہ کے شایان شان نذرانے پیش کیے۔ رسم و قاعدہ کے مطابق شہزادہ کو کاندھے پر بٹھا کر زرد و جواہر کے تھال بچھا دیے گئے۔

اسی سال ماوراء النہر سے عبداللہ خاں اور بیک کا ایلچی خیر سگالی کا خط لے کر آیا۔ اکبر نے میرزا فلولاد برلاس کو خواجہ خطیب کے راہ جو بخارا کا باشندہ تھا تحفے اور ہدیے دے کر اور بیک کے ایلچی کے ساتھ بھیجا۔ بادشاہ کے خط کے آخر میں یہ شعر درج کیا گیا تھا۔

چو ماد و مست با شیم با یک دگر

بود بحر و براہین از شور و شر

**بر کے حق اجتہاد کے لیے علماء کا محضر** | بادشاہ کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ان دنوں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں



مجتہد شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی اور امام عادل حکمران وقت کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل پر کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس محضر نامہ پر مخدوم الملک شیخ عبدالنبی صدر الصدور قاضی جلال الدین ملتانی جو قاضی القضاۃ تھے صدر جہاں مفتی اعظم اور مشہور عالم شیخ مبارک اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس محضر کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز و حکم دیں خواہ وہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کوئی شخص کو مجال نہ رہے۔ اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی ملزم بن جائے۔

اس محضر سے متعلق بڑی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مباحث کا موضوع یہ تھا کہ ”اجتہاد“ اور ”مجتہد“ کی اصطلاحوں کا آخر کس پر اطلاق ہوتا ہے؟ اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبیر ہو اور بلحاظ مراتب مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار حاصل ہے یا نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ یہ بحث و تمحیص تو ہوتی رہی لیکن عملیاتی ہو کہ اس محضر نامہ پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔ اس کے مضمون کو ہم یہاں بجنہ نقل کرتے ہیں۔

### محضر نامہ کا متن

”اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف تدبیر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے۔ اور ہر جگہ کے خواص و عوام خاص طور سے عرب و عجم کے علماء و فضلاء یہاں آکر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنابرین تمام علماء نے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیہ کریمہ کے پیش نظر کہ ”اطیعوا اللہ و اطیعوا السول و اولی الامر منکم“ اور اس حدیث صحیح کی روشنی میں کہ ”ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ امام عادل من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعصی الامیر فقد عصانی“ وغیر ذلک نیز عقلی اور نقلی دلائل و شواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا ہے کہ — سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبہ سے بڑھ کر ہے۔“

لہذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابوالفتح جلال الدین اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملک عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے ان مسائل میں جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجرا فرمائیں تو ان کی تجویز و حکم متفق علیہ متصور ہوگا اور اس کی اطاعت و پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔ ہر گاہ کہ سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہو اور نصوص شرع کے مغائر نہ ہو۔ اس پر عمل درآمد ہر شخص پر لازم و قطعی ہوگا۔ اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دنیاوی پر مستلزم ہوگی۔ یہ سطور حقوق اسلام کے اجرا کی خاطر حسبہ اللہ علمائے دین اور فقہائے متدین کے محضر سے ماہ رجب ۱۰۷۷ھ میں ضبط تحریر میں لائی گئیں۔

اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے مرتب کیا تھا۔ دوسرے علماء نے کراہتا اس کی نقلیں کیں۔ شیخ مبارک نے بڑے انشراح

قلب کے ساتھ محضر کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا کہ میں اس بات کا دل و جان سے خواہش مند تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا۔ اس محضر کی صورت میں بادشاہ کو افتاء کے کلی اختیارات مل گئے، بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مخالفت کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل و تحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلہ میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہو گئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔

شیخ ابوالفضل کا معاملہ سمرقند کے حیرتی شاعر کے مماثل تھا کہ جب اس نے ماوراء النہر کے سردمزاج لوگوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائیں تو محض ان کی ضد میں عراق کے جنادری مومنوں کے ساتھ اس نے یار نہ کر لیا اور ان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ ابوالفضل نے بھی اس بے دینی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور منہ دیکھے کی شرم میں آخرت کے انگارے سمیٹ لیے۔

اسی سال ۱۶ ماہ رجب بادشاہ اجمیر تشریف لے گئے۔ یہ بس اجمیر کا آخری سفر تھا اس کے بعد سے **اجمیر کا آخری سفر** آج تک کہ چودہ سال گزر گئے۔ عنان شاہی اس طرف پھیری نہیں گئی۔ حسب دستور اجمیر سے پانچ کوس پر پیادہ ہو کر سفر کیا اور مزار مبارک کی زیارت کی۔

ان دنوں لوگ بادشاہ پر بھیتی کتے تھے کہ ”کیا خوب خواجہ اجمیری کے ساتھ تو یہ عقیدت اور اس اصل اصول سے جس کے طفیل دنیا کے ہر گوشہ میں خواجہ صاحب جیسے ہزاروں کامل ولی پیدا ہوئے یہ انحراف و سرتابی“ بس یہ مضمون تھا۔

پری نہفتہ رخ و دیو در کشمہ ناز بسوخت عقل نہ حیرت کہیں چہ بوجہی است

دریں چمن گل بے خار کس نہ چید آری چراغ مصطوی با شرار بولہبی است

**بادشاہی کلمہ** مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی ہزار بے وقعت سہی لیکن ان کے ہوتے ہوئے دینی معاملات میں اکبر کی جہازتیں رک رکی اور سہمی سہمی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد گویا پاؤں کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کر دیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دے دیا وحی کو امر محال کہا نبوت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے جن فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی معجزوں اور کرامتوں کا انکار کر دیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الہی ہونے پر بھی اعتراضات وارد کیے مرنے کے بعد بقائے ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کر دیا اور اپنے ان خیالات کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کو مسند بنالیا۔

الحقیقت بدست گوری چند

مصحفی ماند و کہنہ گوری چند

گور با کس سخن نہ مے گوید

سر قرآن کس نہ مے جوید

عید آمد و کار ہانگو خواہد کرد چوں روئے عروس

ساقی مے ناب در سبو خواہد کرد چوں خون خروس

افار نماز و پوز بند روزہ یک بار دگر!

از گردن این خراں فرو خواہد کرد افسوس افسوس

بے دینی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کا خاص کلمہ "لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ" علاوہ پڑھا کریں، لیکن اسی خیال سے کہ یہ حکم عام ہو تو ملک میں شاید خلل برپا ہو جائے۔ اس کلمہ کے پڑھنے کا لزوم صرف اپنی حرم سرانگ ہی محدود کر دیا۔

اکبر کی اس بے دینی کی تاریخ "فتنہائے امت" سے نکلتی ہے۔

**غیرت مند حق گو امیر** | بادشاہ نے جب قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں اور اس پایہ کے دوسرے امیروں کو بھی اسلام کی تقلید چھوڑ کر اس نئے دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امیروں نے بڑی جرات سے

اس مطالبہ کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا "شاہانِ ولایت خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے۔ وہ سب بہر حال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ تقلید ہی ہو یا کچھ اور۔" اکبر نے اس پر چہرہ کر کہا "تو روم کے فرمانروا کی خاطر چارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے۔ تو اس طرح ان کے پاس اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کرے۔"

شہباز خاں نے بھی بڑی سختی سے مخالفت کی اور جہنمی کتے بیربر کو جو علانیہ اسلام پر طعن کرتا رہتا تھا سب کے سامنے گالی دے کر کہا "اے ملعون کافر اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا، ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔" غرض دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہو گئی اور اکبر نے غصہ میں آکر شہباز خاں اور دوسرے امراء کو کہا "چپ رہو ورنہ تم تمہارے منہ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے۔"

**علماء اور ائمہ کی بد حالی** | انہی دنوں تین کا حاکم ترسون محمد خاں گجرات سے آکر باریاب ہوا اور قاضی علی بغدادی کو شیخ عبدالنبی کی جگہ مددِ معاش اور اراضیات کی تحقیق و ضبطی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ ہزار پانصدی اور صدی مرتبہ رکھنے والے ائمہ کو بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کرتا تھا۔ ان کی اکثر زمینیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ کٹ کٹا کر بہت تھوڑی سی اراضی ان کے پاس رہ گئی۔ اس طرح بڑے بڑے علماء ائمہ اور مشاہیر کے خاندانی اعزاز و اعتبار کو گھٹا دیا گیا اور شریفوں کی اولاد مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہو گئی، مدرسے اور مسجدیں ویران ہونے لگیں۔ اور اکثر لوگ جلا وطن کر دیئے گئے۔

مدارس از علماء آں چناں بود خالی کہ ماہ روزہ زمیخوارہ خانہ خوار

برند تختہ لوح ادیب از پئے مرزد کنند مصحف قاری گرو بوجہ قمار

ان حالات میں حکیم الملک اور شیخ ابوالفضل میں بڑی مخالفت رہتی تھی۔ حکیم اس کا نام بگاڑ کر "فضلہ" کہا کرتا تھا۔ اکبر کو ابوالفضل کا بڑا پاس تھا۔ اس لیے حکیم الملک پر اس نے بڑی سختی کی آخر کار مکہ معظمہ کی طرف اس کے اخراج کا حکم صادر کر دیا۔

**خدمت شاہی پر دوبارہ تقرر** | اسی سال ماہ رمضان میں اجیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی کہ میں عرصہ سے ملازمت سے علیحدہ ہو کر گھر بیٹھ رہا تھا، بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری

مددِ معاش کے سلسلہ میں ہزار بیگمہ اراضی کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی خیال ہے کہ "اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی" قاضی علی نے کہا ہاں بشرط خدمت انکو زمین دی گئی تھی۔ اکبر نے کہا اس سے پوچھو "کیا کوئی ضعف عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کر دی۔ غازی خاں بدخش نے

فی البدیہہ کہا "قسمت کا ضعف" تھا۔ اس موقع پر تمام مقرّبوں نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کر دی گئی تھی میرے لیے سفارشیں کیں۔ بادشاہ نے جواب دیا "ہم کسی کو ملازم رہنے پر مجبور نہیں کرتے، اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی۔" میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کر لیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا کہ آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔ تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا "شیخ عبدالنبی جو اس وقت تک لشکر میں موجود تھا، سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر اراضی کا حقدار ہو سکتا ہے۔" شیخ نے مولانا اللہ داد امر وہی مرحوم کے ذریعہ کہلوا یا کہ "چونکہ دلا عبد القادر، عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمہ کافی اخراجات ہیں، میں حسب الحکم اس کے لیے آٹھ سو یا سات سو بیگہ اراضی تجویز کرتا ہوں۔" مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی عرضداشت مناسب نہ ہوگی اور وہ سب مجھے ملازمت اختیار کر لینے پر مجبور کرنے لگے، مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا جس سے بمشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے بھگتنا پڑا کہ میں نے بادشاہ کے بارہا حکم دینے کے باوجود پہلے ہی داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی اور زبان حال و قال سے یہ شعر پڑھ دیا کرتا تھا:

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ہم  
فارغ ز قید شاہم و از شاہزادہ ہم

جزیہ کی منسوخی | اسی سال بادشاہ نے تمغہ اور جزیہ کا قانون جس کے ذریعہ کروڑ ہا روپیہ کی آمدنی ہوتی تھی منسوخ کر دیا اور اس کے لیے تاکیداً فرامین صادر کیے گئے۔

اسی سال محمد معصوم خاں ولد معین الدین احمد خاں فرخودی جو جوہنپور کی حکومت پر فائز تھا دربار میں حاضر ہوا اور جوہنپور جانے کی رخصت پا کر لوٹ گیا۔ ملا محمد یزدی جوہنپور کا قاضی قضاۃ بنایا گیا۔ دہلی کی حکومت محب علی خاں ولد میر خلیفہ کو تفویض ہوئی۔ ملا محمد یزدی نے جوہنپور جانے کے بعد بادشاہ کے خلاف بغاوت و خروج کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اس کے فتویٰ پر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں فرخودی، میر معز الملک، نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے

ملا محمد یزدی کا فتویٰ

امیر تلواریں کھینچ کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انہوں نے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانہ میں ائمہ کہا کرتے تھے بادشاہ نے ہماری مدد معاش کی زمینوں پر ہاتھ ڈالا تو اللہ نے اس کے ملک کو تار بیا۔

علماء کا اخراج اور تباہی | جب ہتر سعادت جسے پہلے خاں کا خطاب حاصل تھا، معصوم خاں جوہنپوری کے پاس جا کر واپس آیا تو اس نے ملا محمد یزدی کے فتویٰ اور وہاں کی صورت حال سے متعلق تفصیلات

بادشاہ کو بتائیں۔ اکبر نے کسی بہانہ سے میر معز الملک اور محمد یزدی کو جوہنپور سے بلا بھیجا۔ جب یہ لوگ فیروز آباد ہوا گرہ سے دس کوس پر پہنچے تو حکم بھیجا کہ سواروں کو ان سے علیحدہ کر کے دونوں کو کشتی میں بٹھا کر جہان کے راستہ گواہ لے جائیں۔ اس کے پیچھے ہی دوسرا حکم آیا کہ دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ محافظ دوسری کشتی میں سوار ہو جائیں اور ان کو کسی پرانی کشتی میں بٹھا کر عین دریا میں پہنچنے پر ملاحوں کو حکم دیں کہ ان کی کشتی کو غرق کر دیا جائے۔ چند دن بعد ہی قاضی یعقوب وہاں بنگال سے آئے گا۔ اس کو بھی ان کی طرح ختم کر دیا جائے۔

اس طرح اکبر نے ان تمام علماء کو جن کے بارے میں اسے اندیشہ تھے ایک ایک کر کے راستہ سے ہٹا دیا۔ اور لاہور کے علماء کو

جلاوطن کر کے جگہ منتشر کر دیا۔ ان میں قاضی صدر الدین لاہوری کو جن کا علمی مرتبہ مخدوم الملک سے زیادہ تھا، بہر دو چ گجرات کی قضاوت پر بلا عبدالشکور گول دار کو جون پور کی اور ملا محمد معصوم کو بہار کی قضاوت پر مامور کر دیا۔ شیخ منور کو مالوہ کی طرف جلاوطن کر کے اس صوبہ کی صدارت اس کے تفویض کر دی۔ لاہوری میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین جو مشہور واعظ تھے رہ گئے بادشاہ نے ان کو کبر سنی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا۔ یہ بزرگ ۹۹۵ھ میں فوت ہوئے۔

**صاحبِ ماں کی پیشین گوئی** | حاجی ابراہیم سرہندی کا فقرہ گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لیکر کافی روپیہ اور ذخیرہ جمع کر لیا۔ اگر وہ بچارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ

ان کی مدد معاش کو روک دیتا تھا۔ اسکی حرکتیں بادشاہ کے بھی علم میں آئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دکھن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کر دیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کر دیا۔ شبانہ مجلسوں میں اس کو بھی بلایا جاتا تھا اس نے اسی زمانہ میں بزرگانِ دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا۔ لیکن اسی کا پول بہت جلد کھل گیا۔ اصل میں اس نے ایک پرانی کرم خورہ کتاب میں غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ ”صاحبِ زمانہ بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا۔ دارِ محمی منڈا ہوگا۔ اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کر دی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کر لیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق میاں امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پر انار سالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ ”ایک صحابی کا دل کا دارِ محمی منڈا کر جب حضور اکرم کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اہل جنت کی یہی وضع ہوگی۔ یہ حدیث بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم شاہ فتح اللہ شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کے ساتھ بڑی بے باکی کے ساتھ مباغثے کرتا تھا اور ان کو ترکِ بزرگی جواب دیتا تھا۔ اسی لیے اس کو اکبر نے رنجبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ وہ اسی جگہ فوت ہوا۔ اس کی لاش قلعہ کی فصیل سے نیچے پھینک دی گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپی ہوئی تھی۔ اس لیے یہی مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعہ سے نیچے گرا دیا۔ یہ حادثہ ۹۹۷ھ میں پیش آیا تھا۔

**وظائف و مدد معاش کی قطع و برید** | اہل علم کے لیے ان کا علم ہی وبال بن گیا تھا۔ آئے دن ان بچاروں کو طرح طرح کی

اور مشائخ کو فرمان بھیج کر دربار میں بلایا اور خود بہ نفس نفیس ان کی مدد معاش، انعام و وظائف کی تحقیق کی۔ سب علماء کو درباری آئین کے مطابق تعظیم و تسلیات بجالانا پڑتا تھا۔ بادشاہ ان عالموں سے خلوت و جلوت میں گفتگو کر کے اپنے حسبِ مرضی ہر ایک کے لیے مختصر سی اراضی مقرر کرتا تھا اور جس کسی کے متعلق یہ رپورٹ ہوتی کہ وہ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے یا مجلسِ سماع منعقد کرتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ اس کے مشغلوں کو دکانداری کا نام دے کر اسے یا تو کسی قلعہ میں قید کر دیا جاتا تھا یا بنگال اور بکر کی طرف جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔

علماء کے خلاف یہ کارروائیاں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ بوڑھے اور عمر پوروں اور شیوخ کا حال اور بھی برا تھا۔ صاحبِ علم



اہل ذوق صوفیوں کی معاش کے فرامین کی جانچ پڑتال ہندو کاہندوں کے ذمہ تھی اور ان کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک ان پر ہندوؤں کی مہر نہ لگ جاتی۔ اس معاشی بد حالی کی وجہ سے بچارے صوفی اپنے حال و حال کو فراموش کر بیٹھے۔ اور وطن چھوڑ کر کسی نہ کسی پناہ میں جا چھپے۔ ان کا سارا تصوف دھرا کا دھرا رہ گیا۔

چنان قحط سالی شد اندر دمشق  
کہ یاراں فراموش کردند عشق

۵

چناں آسماں بر زیریں شد نخیل  
کہ لب تر نہ کردند زرع و نخیل

کیوں نہ ہو ان ظاہر پرست صوفیوں کی بے روح مجلسیں ان کی بے حسی اور جمود، شرمناک اعمال اور بے جا تکلیفات کا یہی خمیانہ ہونا تھا۔ ان بے فیض صوفیوں میں اکثر اسی لائق تھے کہ اس انجام بد سے دوچار ہوتے:

آں نہ صوفی گری و آزادیت      بلکہ کیسری گری و قوادیت  
دزدی و راہ نہ فی بہتر ازین      کفن از مردہ کنی بہتر ازین

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن کیا کروں، قلم بے اختیار دوسری طرف بہک جاتا ہے۔ اور سلسلہ بیان کو چھوڑ کر زمانہ کی اس نئی چال، اس نئے مذہب اور اس نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا، لیکن آہ مجبوری۔

خطابی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی      شہان مجلس آرا می جواں مردان بر یک را  
ندام حل و عقد خود نہادی در کف قومی      کہ از روی کرم باشد برایشان شرف لگ را

یہاں در گوش جانم گفت فارغ باش خوش منزل  
کہ سبقت بر کند ایام ہرزہ روز یک یک را

**بنگال میں مظفر خاں کی سخت گیری** | اسی سال مظفر خاں بنگال کی عملداری پر گیا۔ اس نے وہاں کے معاملات میں برہمائی سخت گیری سے کام لیا اور بنگال میں متعینہ امر اور سرداروں کو سخت ایذائیں دیں۔ اکثر امیروں کی جاگیر ضبط کر کے دربار کے طریقہ پر داغ و محلہ اور محاسبہ کے پرانے طریقے نافذ کر دیئے۔

بابا خاں قاتال اور خالدی خاں نے جو ملکیت کے با اقتدار امیر اور نفس ناطقہ تھے، داغ کے قانون سے معافی اور جاگیروں کی بجالی کے لیے برہمائی کو شش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مظفر خاں نے خالدی خاں کو اس الزام میں قید کر دیا کہ اس نے داغ و محلہ کے بغیر ہی جاگیر کی رقمیں وصول کر لی تھیں اور اسے واپس نہیں کیا تھا۔

اتفاق سے اسی دنوں مظفر خاں کے پاس شاہی فرمان آیا کہ مرزا محمد حکیم کا ایک آدمی روشن بیگ نامی کابل سے بنگالہ گیا ہوا ہے اسے گرفتار کر کے مرادی ہائے مظفر خاں نے اسے تلاش کرایا تو وہ قاتالوں کے پاس سے پکڑا گیا اس نے برسر دربار بابا خاں سے

بشمول درشت لہجہ میں باز پرس کی اور شاہی فرمان دکھا کر روشن بیگ کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

**قاقتالوں کی بغاوت** | مظفر خاں کی ان سخت گیر یوں سے سپاہی بڑے خوف زدہ ہو گئے اور سب نے مل کر اپنے سر

جاتا تھا، مظفر خاں کے جمع کردہ مال و اسباب کو لوٹ لیا۔ اس نے باغی قاقتالوں کی سرکوبی کے لیے بہت سی کشتیاں تیار کرائیں اور حکیم ابوالفتح اور پترو اس کو گور کی طرف روانہ کیا۔

حکیم ابوالفتح بزم کا یکہ تازہ تھاریم کا شہسوار نہیں اور پترو اس ایک ہندو دفتری تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جنگی قاقتالوں کے مقابلہ میں کون سا تیر سیدھا کر سکتے تھے۔ جب قاقتال ان فوجی کارروائیوں سے دیتے نظر نہ آئے تو مظفر خاں نے ان کے نام مرحمت آمیز فرمان بھیج کر پیغام دیا کہ تمہاری جاگیریں بحال کر دی جائیں گی، تمہارے پاس رضوی خاں اور پترو اس کو اسی گفت و شنید کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ تاکہ وہ معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کر دیں، اس کے بعد ہی مذکورہ دونوں اشخاص کو میر سید رفیع الدین محدث کے رُہ کے میر ابوالاسحاق کے ساتھ قاقتالوں کے پاس بھیج دیا۔ قاقتالوں نے کسی قسم کی گفتگو سے انکار کر دیا اور ان لوگوں کو قید کر کے لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔

**امرائے بہار کی بغاوت** | اسی دوران میں ملاطیب اور رائے پر کھوتم بخشی نے معصوم خاں کا بیٹی عرب بہادر اور بہار کے تمام امیروں کی جاگیروں کو بہ یک تلم ضبط کر لیا۔ اس کارروائی نے ان امیروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر ان کی سرکوبی کے لیے یہ دونوں جو ساندی کو عبور کر کے معصوم خاں کے مقابلہ پر پہنچے۔ عرب بہادر نے ان کو غفلت میں رکھ کر اچانک حملہ کر دیا اور رائے پر کھوتم کو قتل کر کے شاہی لشکر کا بست سا مال لوٹ لیا۔

بہار کے ان باغیوں نے بابا خاں قاقتال سے مراسلت کی۔ اور قاقتالوں کا ساتھ دینے کے لیے کمری کی طرف پیش قدمی کر دی ان کا راستہ روکنے کے لیے مظفر خاں نے خواجہ شمس الدین محمد خوانی کو جواب دیوانہ گل کے عہدہ پر مامور ہے روانہ کیا۔ معصوم خاں نے اسے شکست دے کر بھاگادیا اور قاقتالوں کو ساتھ لے کر دریائے گنگا عبور کی اور مظفر خاں کے مقابلہ میں صف آرائی کر لی۔

**مظفر خاں کا قتل** | باغیوں کی مدافعت کے لیے مظفر خاں قلعہ ٹانڈہ میں جو اس وقت ایک پرانی چار دیواری سے بڑھ کر نہیں تھا محصور ہو گیا۔ اس وقت وزیر خاں جمیل بیگ نے جو ایک پرانا امیر تھا جان محمد خاں بیہودی کو ساتھ لے کر مظفر خاں پر حملہ کر دیا اور حکیم ابوالفتح اور خواجہ شمس الدین اور دوسرے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں اور پترو اس کسی نہ کسی طرح باغیوں کی قید سے نکل بھاگے اور مظفر خاں کی مدد کے لیے اپنے زمینداروں کو حاجی پور میں بھیج دیا۔ انہی سرکوبی میں حکیم نور الدین قراری بھی مارا گیا اور باغی قاقتالوں اور معصوم خاں نے مظفر خاں کو قتل کر دے کر ٹانڈہ کے قلعہ سے باہر آئے پر مجبور کر دیا پھر اسے گرفتار کر کے بڑے عذابوں سے مروا ڈالا۔

**بنگال کی خود مختاری** | اب باغیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے، مظفر خاں سے چھینا ہوا کافی مال و اسباب ان کے پاس تھا انہوں نے اچھی خاصی جمعیت فراہم کر لی اور پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی پیدل اور سوار فوج بنائی۔ میرزا شرف الدین حسین ان دنوں بنگال میں نظر بند تھا۔ اسے بادشاہ نے کاپی کے حاکم قاسم علی خاں بقال کے پاس بھیج دیا۔

بنگال میں بھجوا دیا تھا باغیوں نے میرزا کو قید خانہ سے نکال کر اپنا سردار بنالیا۔ بنگال میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو جانے سے سارے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

**راجہ ٹوڈرل کی فوج کشی** | اکبر نے بنگال کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے راجہ ٹوڈرل صادق محمد خاں، ترسون محمد خاں اور دوسرے تمام امراء کو فتح پور سے روانہ کیا۔ راجہ کی مدد کے لیے محمد معصوم خاں فرخودی حکام جو پور اور اس نواح کے دوسرے جاگیرداروں کو متعین کیا گیا۔

ابھی یہ لوگ راستہ ہی میں تھے کہ شاہم خاں جلائر نے سعید خاں بدخشی سے جنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ محمد معصوم جو پور سے تین ہزار مسلح اور تیار سواروں کو راجہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، لیکن اس کی حرکات و سکنات سے راجہ تاڑ گیا کہ وہ بھی بغاوت و خروج کی فکر میں ہے۔ بہ ظاہر اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا، لیکن ساری صورت حال دربار میں لکھ کر بھیج دی۔

شاہی لشکر سے مقابلہ کے لیے محمد معصوم خاں کابلی، میرزا شرف الدین حسین اور قاضیوں کی فوج تیس ہزار سوار پانسو ہاتھی بے شمار کشتیاں اور توپ خانہ لے کر منگیر کے قصبہ میں پہنچ گئی۔ راجہ کو اپنے لشکر پر پورا بھروسہ نہ تھا۔ وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ سب موقع کے منتظر ہیں، اس لیے اس نے عظیم سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مناسب نہ جانا اور منگیر کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ طرفین کی طرف سے ہر روز سخت لڑائی ہوتی تھی اور شاہی لشکر سرد کے نہ ملنے کی وجہ سے نہایت تنگ دست ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں شہیار خاں کے داماد زین الدین کنہو نے دریا کے راستہ ڈاک چوکی کے ذریعہ ایک لاکھ روپیہ راجہ کے پاس بھجوا دیا۔ جو کچھ دن تک صرف میں آتا رہا۔ بادشاہ اسی طرح وقفہ وقفہ سے کبھی تو دریا خاں آبدار کے ذریعہ کبھی سردی کے ہاتھ اور کبھی سیٹھ بھگوان داس خزانچی کے بیٹے کی معرفت رقیں بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاک چوکی پر جو لوگ مقرر تھے ان میں قاضی زادہ عبدالحی خواص ولد قاضی صدر الدین سنبل بھی تھا جو نہایت حسین اور خوب صورت نوجوان تھا، لیکن جتنا خوب صورت تھا اتنا احمق بھی تھا۔ وہ بھی ان خبیثوں میں شامل تھا جو مذہب و ملت کے بارے میں زبان درازیاں کرتے رہتے تھے۔ اس مہم کے دوران میں وہ بھی عین عالم جوانی میں مارا گیا۔

راجہ کی فوج کے ساتھ شاہ فرہلی کا لڑکا ہالیوں فرہلی بھی تھا، جسے ہالیوں نے قلی خاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ نئے بادشاہی دین کے ہنگاموں کو اور راجہ میں لوگوں کے ابتلا و آزمائش کے ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکا تھا اور سخت متنفر تھا۔ منگیر کے محاصرہ کے وقت موقع پا کر وہ اور ترخان دیوانہ شاہی لشکر سے بھاگ کر باغیوں سے جا مل گئے۔

**باغیوں کی پسپائی** | منگیر کا محاصرہ کافی طویل ہو گیا۔ اسی دوران میں بابا خاں قاضی سخت بیماری میں تقریباً جاں بلب ہو گیا۔ اس کے ضعف و بیماری کو دیکھ کر مجنوں خاں قاضی کا لڑکا جباری جو باغیوں کا سرگرو تھا اور اب وہ دربار شاہی میں خدمت پر مامور ہے محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ باغیوں کا لشکر منتشر ہو گیا۔ معصوم خاں کابلی بھی مجبور ہو کر بہار کی طرف بھاگ گیا اور عرب بہادر نے پٹنہ پر قبضہ کرنے اور بادشاہی خزانہ ٹوٹ لینے کے ارادہ سے یلغار کرتے ہوئے پٹنہ پر جا کر حملہ کر دیا۔ بہار خاں خاص خیل جو سید عارف کے نام سے مشہور تھا قلعہ پٹنہ میں محصور ہو گیا۔ راجہ ٹوڈرل نے معصوم خاں فرخودی کو بہار خاں کی کمک کے لیے روانہ کیا۔ عرب بہادر ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ مشہور زمیندار کچیتی کے پاس چلا گیا۔

راجہ ٹوڈرل صادق خاں اور دوسرے شاہی امیروں نے معصوم خاں کاہلی کی سرکوبی کے لیے بہار کی طرف کوچ کر دیا۔ معصوم خاں نے شاہی لشکر پر اچانک شبخون مارا اور صادق خاں کے کیمپ پر جا پڑا۔ اس اندھیری رات میں کیمپ کی نگرانی اور قراولی کے لیے ماہ بیگ جو ایک نامی سردار تھا اور الیخ خاں حبشی متعین تھے۔ ماہ بیگ مارا گیا اور الیخ خاں جان بچا کر نکل گیا۔ صادق خاں نے ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کیا۔ معصوم خاں نے بڑی بہادری دکھائی لیکن کچھ پیش نہ گئی اور پسپا ہو کر بھاگ گیا۔ اس وسیع علاقہ میں قزاقی کرتے ہوئے عرصہ تک سرگرداں رہا۔ آخر کار اڑیسہ کے زمیندار عیسیٰ خاں کے پاس جا کر پناہ لی جس نے اس زمانہ میں ڈھائی سو ہاتھی اور چار لاکھ روپیہ کے نفیس تحفے سونا، قیمتی آلات اگر پوشاکیں اور بے شمار کپڑے سعید خاں مغول کے ذریعہ دربار میں روانہ کیے تھے۔ معصوم خاں ابھی تک اڑیسہ ہی میں ہے۔ باغیوں کی شکست کے بعد صوبہ کرہی تک کا علاقہ دوبارہ شاہی قبضہ میں آ گیا۔

**حاکم مالوہ کا قتل** | انہی دنوں شجاعت خاں اور اس کے بیٹے قائم خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ قائم خاں بڑا اچھا موسیقار حسین و ظریف نوجوان تھا۔ بادشاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو سارنگ پور سے دربار میں بلایا تھا۔ یہ دونوں حسب طلب فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نوکروں نے ان کی بد معاملگی، بد عہدی بد سلوکی اور رذالت کی وجہ سے کہ آج کل کے سرداروں کا بس ایسا ہی کچھ وطیرہ ہے، دونوں کو راستہ میں قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔ کتنے ہی ایک دن ایک سائل نے شجاعت خاں اور دوسرے امراء سے جو دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ طلب کیا۔ اس نے اس سے کہا ”بابا کیا کریں تیری خیرات کی مدد ہماری بر آورد میں شامل نہیں کی گئی ہے۔“ شجاعت خاں کی جگہ بادشاہ نے مالوہ پر شریف خاں آٹک کو مقرر کیا۔ اس کے مکان پر خود بادشاہ کی سواری گئی۔ آٹک نے زبردست ضیافت و مہمانی کی اور بادشاہ نے اسے مالوہ پر رخصت کیا۔

**بنگال پر اعظم خاں کا تقرر** | اسی سال خان اعظم کو جو ایک عرصہ سے نظر بند تھا بادشاہ نے آگرہ سے بلا بھیجا اور اس کو نوازش شاہانہ سے سرفراز کر کے پانچ ہزاری کا عہدہ مرحمت فرمایا۔ پھر بنگالہ کی حکومت پر مامور کر دیا۔ شہباز خاں کورانا کے علاقہ سے بلا کر لشکر اور فوج دے کر خان اعظم کی کمک کے لیے مقرر کیا۔ اس نے حاجی پور کی سرحد پر فوج کشی کی اور کچیتی کا جنگل کٹوا کر عرب بہادر کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اسی سال بادشاہ نے حکیم الملک گیلانی کو اپنے نئے مذہب کا مخالف سمجھ کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اسے بادشاہ نے وہاں کے شریف اور محتاج لوگوں کی امداد کے لیے پانچ لاکھ روپیہ بطور انعام بھی عطا کیا تھا حکیم آخر عمر تک مکہ ہی میں مقیم رہے۔

از سر کوئے تو نے جنہم  
آسمان نیستم زینیم من

اس کو واپس بلانے کے لیے بادشاہ نے متعدد بار فرمان بھیجے تھے، لیکن وہ وہاں سے لوٹ کر نہ آیا اور اپنے رب سے جانا۔ اس سال اکبر نے تمام علاقوں کے بڑے بڑے مشائخین کو بلا کر فتح پور میں جمع کیا۔ اور ہر ایک کے ساتھ مجلس منعقد کر کے مختلف باتوں کی تحقیق کرتا رہا۔ ان مشائخین میں سے اکثر محض عشاہی اور چند مکیہ

زمین کے لاپچی تھے۔ بادشاہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان میں سے کسی کی کوئی خرق عادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے خرق عادت کے کرب ان کو کیا آتے وہ تو دشمنوں ہی کے حصہ میں لکھے گئے ہیں اور جہاں تک علو اخلاق کا معاملہ تھا کہ اس سے مطلب ترک دنیا، تجرد توکل، استغنا اور عالی حوصلگی ہے وہ سب ان اوصاف سے کورے تھے۔ بادشاہ نے جب ان میں بجز خوشامد اور چالپوسی کے کوئی اور جوہر نہیں پایا تو ان سے اور دین حق سے اس کی بدگمانی پہلے سے کہیں زیادہ دوچند ہو گئی۔

پوشیدہ مرقعند این خامی چند      بگرفتہ بطامات لفلامی چند  
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند      بدنام کنسندہ نگو نامی چند

ان مشائخ میں شیخ عبدالعزیز کے بڑے خلیفہ شیخ جانبلہ بھی تھے۔ جن کو اکبر نے عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا وہ دکھاؤ کے لیے نماز معکوس پڑھا کرتے تھے اور اپنے زہد و عبادت کا بڑا مظاہرہ کرتے تھے۔ اکبر کی کسی حرم کے متعلق یہ کہا کہ اس کو لڑکا ہوگا اس کو بجائے لڑکے کے لڑکی ہوئی۔ انکی اور بھی قابل اعتراض حرکتیں دیکھنے میں آئیں۔ اسی طرح سید ہاشم فیروز آبادی نے بڑے ٹھاٹھ سے اپنی مشیت کی دکا نداری شروع کر دی۔ ان لوگوں کی یہ حرکتیں بھی بادشاہ کی بد اعتقادی میں اضافہ کا سبب بن گئیں۔

شیخ مہدی افغان کا سی کو پنجاب سے بلایا گیا تھا۔ وہ حسب الحکم قاصدوں کے ساتھ خانقاہ سے پیدل ہی چلا اور اس کی پاکی اس کے پیچھے خالی ہی لائی گئی۔ وہ فتح پور میں شیخ جمال بختیار میں مکان میں آکر ٹھہرا اور پیغام بھجوایا کہ ”میری ملاقات کسی بھی بادشاہ کے لیے مبارک نہیں رہی ہے۔“ اکبر نے اس سے ملاقات نہیں کی اور جلد ہی اسے رخصت کر دیا۔

شیخ اندویدہ خیر آبادی بھی جو توکل و فقر میں بڑے نامور تھے اور انہوں نے بادشاہ سے کوئی اراضی قبول نہیں کی تھی دربار میں تشریف لائے۔ ان کا سلسلہ طریقت بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے شیخ ابوالفتح بھی آئے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے میں نے اسلم شاہ کے آخری عہد میں اپنے استاد علامہ میاں حاتم علی سنبل کے حسب الحکم ”ارشاد قاضی“ اور حاشیہ پڑھا تھا اور اب وہ اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔ اپنے علم احوال و معاملات میں نہایت کھرے اور بے لاگ ہیں۔

جب شیخ الہدیہ دربار میں آئے تو اکبر ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب بادشاہ نے حال احوال پوچھا تو انہوں نے اپنے کان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ بادشاہ نے ان کو مزید زحمت نہیں دی اور جلد ہی رخصت کر دیا۔

اسی سال دربار کے کینے اور ذیل علماء نے جو در حقیقت جاہل محض تھے من گھڑت دلیل دیکر **امامت و نبوت کا ادعا** بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اس عہد کے صاحب زماں ”خود حضور والا ہیں کہ آپ کا ظہور مسلمانوں

اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔ شریف نے محمود بسخوانی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ سنہ ۹۹۰ھ میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا“ پھر اس نے بتایا کہ ”صاحب دین حق“ کے کلمہ کے ”جمل“ کے حساب سے ۹۹۰ عدد ہوتے ہیں اور اس کے مصداق صرف حضور والا ہی ہیں۔

خواجہ مولانا شیرازی ملحد نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہو چکی ہے۔ اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آگیا ہے۔ اس خصوص میں خود اس بھی اپنا ایک رسالہ مرتب کر کے پیش کیا۔



ایسی ہی خرافات شیعوں نے بھی حضرت امیر المومنین حضرت علیؑ سے منسوب کر کے پیش کیں۔ بعض یہ رباعی پڑھ کر سناتے تھے جو حکیم ناصر خسرو وغیرہ سے منسوب ہے۔

در نہ صد و ششاد و نہ از حکم قضا      آیند کو اکب از جوانب یک جا  
در سال اسد ماہ اسد روز اسد      از پردہ بروں خرامداں شیر خدا

یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کا سبب بنیں اور اکبر نے صراحتاً و لفظاً انہیں مجہلاً و معناً نبوت کا دعویٰ کر دیا۔

**شاہ منصور کی معزولی** | اس زمانہ میں راجہ ٹوڈر مل کا عریضہ پہنچا کہ میں نے اب تک بڑے تدبیر و حسن سلوک سے معصوم خاں فرخودی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا ہے۔ لیکن خواجہ منصور دیوان اس سے اور ترسوں محمد خاں سے بقایا کا بڑی سختی سے تقاضا کرتا رہتا ہے اور ان کو بہت ڈراتا دھمکتا رہتا ہے۔ اس کے رویہ سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس نازک وقت میں ایسی باتیں لشکر میں تفرقہ کا باعث ہو جاتی ہیں۔

شاہ منصور کی سخت گیریوں کی اس سے پہلے بھی بالاباغیر میں مل چکی تھیں۔ اس لیے بادشاہ نے اس کو بے دخل کر کے مصلحتاً چند دن کے لیے اسے شاہ قلی خاں محرم کی نگرانی میں دے دیا اور اس کی جگہ آصف خاں ہروی کے بھائی وزیر خاں کو دیوان کل بنادیا۔ اس کا مددگار قاضی علی بغدادی جیسے مخوس دل آزار چند قسم کے آدمی کو مقرر فرمایا کہ یہ دونوں مل کر معاملات کو سرانجام دیں۔ اس تدبیر کے کیا کئے!

**بغیر کان کا آدمی** | اسی زمانہ میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو لایا گیا جس کے کان سرے سے تھے ہی نہیں اور نہ سماعت کے لیے کوئی سوراخ تھا۔ لیکن وہ جو کچھ کہا جائے بخوبی سن لیتا تھا۔ اس کے کانوں کی جگہ بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

**گنگ محل کا تجربہ** | اسی سال بادشاہ کو ایک اور ضبط ہوا کہ چند شیر خوار بچوں کو آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا جائے تاکہ وہ کسی آواز کو سن نہ سکیں اور ان کی نگہداشت کے لیے تربیت یافتہ دایہ مقرر کی جائیں اور ان کو کوئی بات نہ سکھائی جائے تاکہ اس حدیث ”کل مولود یولد علی الفطۃ“ کو ہر پید ہونے والا اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، کی حقیقت ہو جائے اور دیکھیں کہ یہ بچے کس دین اور مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے پہلے کون سا کلمہ ادا ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب تجربے کے لیے بیس شیر خوار مولود بچوں کو روپیہ پیسہ دے کر ان کے والدین سے جدا کیا گیا۔ لیکن حافی ویران محل میں ان کو رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس محل کا ”گنگ محل“ نام رکھا۔ تین چار سال بعد معلوم ہوا کہ وہ سب بچے گونگے ہو گئے ہیں۔ محل کی وجہ تسمیہ پوری اتری۔ اکثر معصوم بچے تو اسی گنگ محل سے آغوشِ محبت میں جا بیسے۔

مادر م خاک است و من طفلِ ضعیف      میل طفلان نیست بر مادرِ بدیع  
زود باشد کارِ میدہ ز اضطراب      در کنارِ مادر افتم مست خواب

اسی سال بادشاہ نے شہزادہ دانیال کو اس کے استاد شیخ فیضی شیخ جمالِ نختیار اور امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ اجیر روانہ کیا اور وہاں کے فقراء کے لیے پچیس ہزار روپیہ بھیجا۔

**معصوم خاں کا تبادلہ** | راجہ ٹوڈر مل اور دوسرے تمام بادشاہی امراء نے اس سال حاجی پور میں برسات کا موسم گزارا اور معصوم خاں فرخزادی جو لشکر سے سخت ناراض ہو گیا تھا امراء سے اجازت لیے سیر جون پور چلا گیا۔ وہاں جا کر یاغی بن بیٹھا۔ بادشاہ نے پیشرو خاں عرف مہتر سعادت داروغہ فراش خانہ کے ہاتھ اس کی ہلی دلا سے کے لیے ایک عنایت آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے اودھ کا علاقہ دے کر جون پور پر ترسون محمد خاں کو مقرر کر دیا۔ معصوم خاں نے اس تبادلہ پر الٹی سیدھی باتیں کیں۔ پھر اس خیال سے کہ اودھ ایک سرحدی علاقہ ہے جو اس کے لیے نسبتاً بہتر رہے گا ملاں چلا گیا اور جنگ و بغاوت کے منصوبے باندھتا رہا۔

مہتر سعادت نے دربار میں واپس آ کر جون پور وغیرہ کے حالات بہ تفصیل گوش گزار کیے اور اس فتوئی کا بھی تذکرہ کیا۔ ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف خروج و بغاوت کے متعلق دیا تھا۔ یہی سبب ملا محمد یزدی اور میر معز الملک کو دربار میں لانے کا ہوا تھا جس کا قصہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

**نیابت خاں کی بغاوت** | اسی زمانہ میں ہاشم خاں نیشاپوری کے رو کے نیابت خاں نے بغاوت کر دی جسے بادشاہ نے پٹنہ کے سفر کے وقت جو سی اور پیاک کی جاگیر عطا کی تھی۔ نیابت خاں نے کمرہ پر حملہ کر دیا۔ ملاں اس وقت اسماعیل قلی خاں کی جانب سے ایاس خاں نامی ایک پٹھان حاکم تھا۔ اس جنگ میں ایاس خاں مارا گیا اور نیابت خاں کمرہ کے قلعہ کا محاصرہ کر کے بڑی لوٹ مار مچائی۔ بادشاہ نے اس کے مقابلہ پر اسماعیل قلی خاں، وزیر خاں، مطلب خاں، شیخ جلال تنیار اور دوسرے امراء کو نامزد کیا اور مسخرے بیربر کو معصوم خاں فرخزادی کو اطمینان و دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا۔ وزیر خاں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ شاہ منصور کو قید سے رہائی دے کر دوبارہ دیوانی کے عہدہ پر مقرر کر دیا۔

جب نیابت خاں کو امرائے شاہی کی یلغار کا پتہ چلا تو وہ کمرہ کا محاصرہ چھوڑ کر قصبہ کو ہوتے ہوئے پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ شاہی کرنے بھی دریا عبور کر کے اس کا تعاقب کیا۔ ان کو قریب دیکھ کر نیابت خاں بھی پلٹ پڑا اور اس نے ان تمام امیروں کے ساتھ تنہا ایسی سخت لڑائی لڑی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بے درپے حملوں سے اس نے بادشاہی فوج کو زیر و زبر کر دیا اور معرکہ کارزار۔ شیخ جلال کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا۔ لیکن اسے جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ باوجود اس دلاوری کے اسے امراء نے شکست دے دی۔ روہ اودھ میں معصوم خاں کے پاس چلا گیا۔ عرب بہادر بھی اسی موقع پر شہباز خاں کے مقابلہ میں شکست کھا کر اودھ چلا گیا تھا۔ شہباز خاں عرب بہادر کا تعاقب کرتے ہوئے جون پور اس کے بعد اودھ پہنچا۔

**معصوم خاں کی بغاوت** | اودھ میں معصوم خاں نے کافی ساز و سامان مہیا کر لیا تھا۔ اس کی تیاریاں اتنی تھیں کہ اگر کچھ مبالغہ سے کام لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس وقت ایران و توران کے بادشاہوں سے بھی جنگ کر سکتا تھا۔ تیس چالیس جھنڈے نشانِ نقارے اور دوسرا سا سامانِ جنگ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اپنی آراستہ پیراستہ فوج کے ساتھ شہباز خاں پر حملہ کیا اور ایک ہی حملہ میں اسے شکست دے کر بھاگ دیا۔ شہباز خاں ایک دن میں چالیس کوس مسطے کے جو پور واپس چلا آیا۔ ترسون محمد خاں شہباز خاں کے مہینہ پرتعین تھا۔ وہ لڑائی کے وقت ایک جنگل میں چھپا ہوا تھا۔ جب شہباز خاں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور معصوم خاں کی فوج مالِ غنیمت لوٹنے میں منتشر ہو گئی اور میدان میں معصوم خاں کے ساتھ مختصر سی

جمعیت رہ گئی تو ترسون محمد خاں نے اچانک حملہ کر کے اس کو شکست دے دی۔ جب شہباز خاں کو یہ خبر ملی تو وہ اٹے پاؤں لوٹ آیا۔ دوسرے دن ترسون محمد خاں سے آکر مل گیا پھر دونوں نے مل کر معصوم خاں پر حملہ کر دیا۔

اودھ کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی اور معصوم خاں شکست کھا کر بے سرو سامانی کی حالت میں بھاگ گیا۔ اس کی ماں بہن بیوی بچے اور سارا مال و اسباب شاہی لشکر کے ہاتھ آ گیا۔ معصوم خاں نے کوہ سواک تک پلٹ کر نہیں دیکھا اور بادشاہی علاقہ سے نکل گیا۔ یہ واقعہ ۱۷۷۷ء میں ہوا۔

**ارغنون باجے کی نمائش** | ارغنون باجا جو ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لے کر آیا تھا۔ انہی دنوں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ باجا ایک قد آدم صندوق میں بنا ہوا ہے۔۔۔

ایک فرنگی اس میں بیٹھ کر اس کے تار چھیڑتا ہے۔ اس کے باہر مور کے پانچ پر اور دوسرے تار سر لگے ہوئے تھے۔ جن کو دو اور آدمی انگلیوں سے بجاتے تھے۔ دیکھنے والے نہایت لطف اندوز ہو رہے تھے اور بجانے والے فرنگیوں کا چہرہ ہر لمحہ سرخ و سپید ہوتا جاتا تھا اور وہ خوب مست ہو کر اسے بجاتے جاتے تھے۔ اس عجوبہ کو دیکھ کر اہل محفل حیران رہ گئے۔ اس کی تعریف و توصیف حد بیان سے باہر ہے۔

اکبر نے اس محفل میں لوگوں سے پوچھا "اچھا بتاؤ اس زمانہ میں سب سے عقل مند کون ہے؟ بادشاہوں کا نام نہ لیا جائے۔ کیوں کہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔" ہر شخص جس جس پر اعتقاد رکھتا تھا اس کا نام لینے لگا۔ حکیم ہام نے کہا "میں تو اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ عقل مند سمجھتا ہوں۔" شیخ ابوالفضل نے اپنے باپ کا نام لیا۔

**اخلاص کے چار درجے** | ان دنوں بادشاہ کے ساتھ اخلاص کے چار درجے قرار دیئے گئے تھے۔ ترک مال ترک جان ترک ناموس ترک دین۔ جو شخص بھی ان چاروں مدارج کو طے کر لیتا اس کا چار گانہ اعزاز ہوتا اور جو کسی ایک درجہ تک پہنچتا اس کا اعزاز اسی مناسبت سے متعین ہوتا، ویسے سب کے سب بادشاہ کے مرید سمجھے جاتے۔

**مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ** | ۱۷۸۹ء میں خبر پہنچی کہ مرزا محمد حکیم نے معصوم خاں فرخوادی کے حسب طلب اپنے ماموں فریدیوں خاں کے بھکانے سے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اسی کا ایک سردار شادمان نامی دریائے نیلاب (انک) کو عبور کر آیا۔ لیکن مان سنگھ ولد بھگوان داس نے اس پر فوج کشی کی۔ اور اسے قتل کر دیا۔ جب میرزا کو یہ خبر ملی تو وہ دریا عبور کر کے سید پور کے نواح میں آ گیا۔

مرزا حکیم سے مقابلہ کے لیے بادشاہ نے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں۔ شاہزادہ دانیال کو سلطان خواجہ صدر اور شیخ ابراہیم حشتی کے ساتھ اپنی نیابت کے لیے دارالخلافہ میں چھوڑا اور خود فتح پور سے پنجاب روانہ ہو گئے۔ فتح پور سے ہندو کوٹس پر سمرائے باد میں شہباز خاں کی فتح کی خبر پہنچی۔

مان سنگھ نے جب شادمان کے اسباب کی تلاشی لی تو اس کے جزدان سے میرزا محمد حکیم کے تین فرمان برآمد ہوئے۔ اس نے حکیم الملک گیلانی، شاہ منصور دیوان اور محمد تاسم خاں میر بجر کے نام لکھے تھے۔ اس کے وہ فرمان بادشاہ کے پاس بھیج دیئے۔ بادشاہ انہیں پڑھ لیا، لیکن ان کا افشاہ کیا۔

دہلی میں خبر ملی کہ میرزا لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں وہ مہدی قاسم خاں کے باغ میں ٹھہر گیا ہے۔ اور لاہور کے قلعہ میں راجہ لکھوان داس، مان سنگھ اور سعید خاں محصور ہو گئے ہیں۔

**شاہ منصور کے خلاف سازش** | پانی پت میں جب لشکر پہنچا تو میرزا محمد حکیم کا وزیر ملک ثانی کابل جس کا خطاب وزیر خاں تھا اس سے ناراض ہو کر لشکر شاہی میں آگیا اور شاہ منصور کے پاس اس نے قیام کیا اور ان کے ذریعہ خدمت شاہی میں حاضر ہونا چاہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی سابقہ ربط و ضبط نہ تھا۔ اس لیے اکبر کو خیال ہوا کہ بھی مرزا کی کوئی چال ہے کہ اس کا وزیر اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑ کر شاہ منصور کے پاس آکر ٹھہرا ہے۔ اس واقعہ سے شاہ منصور کے متعلق بادشاہ کی بدگمانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اسے قید کر کے فراہم جاری کر دیئے گئے۔ اس نے بہت کچھ قسمیں مانیں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیوں کہ یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ معاملات میں قسم کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

جب سواری شاہ آباد پہنچی تو قاضی علی کے بھائی ملک علی نے جواب لاہور کا کوٹوال ہے دو خط پیش کیے، ایک شاہ منصور کے نام تھا جسے شاہ منصور کے ملازم شرف بیگ نے لکھا تھا، دوسرا گننام تھا۔ ان خطوط میں پہلے فریدیوں خاں سے بعد میں میرزا سے ملاقات کا ذکر تھا اور یہ کہ میرزا نے پرگنہ کی معافی عطا کر دی ہے، پرگنہ کا نام شاید درج تھا یا نہیں تھا، دونوں خط ایک تھیلی میں رکھے گئے تھے۔ ان خطوط سے قیاس کیا گیا کہ شاہ منصور کا ملازم شرف بیگ پرگنہ فیروز پور کا جو لاہور سے تھیں کوس پر ہے شہدار تھا اس نے اپنے آقا کو اطلاع دی ہے کہ میں نے فریدیوں خاں کے توسط سے میرزا سے ملاقات کی۔ میرزا نے ہر جگہ اپنے عاملوں کو رو کر دیا ہے لیکن ہمارے پرگنہ کو معافی دے دی ہے۔

ان خطوط سے بادشاہ کی بدگمانی یقین میں بدل گئی۔ اس موقع پر اکثر بلکہ تمام امیروں نے جو شاہ منصور کے ہاتھوں بڑی سزائیں اٹھا چکے تھے اور اس کی تباہی کے دل و جان سے خواہاں تھے۔ اس کے قتل پر متفقہ طور سے اصرار کیا۔ چنانچہ بادشاہ دوسرے دن صبح خدمت لائے کو حکم دیا کہ اس کو کچھ کوٹ کی منزل میں گلا کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ شاہ منصور کے خلق خدا پر جو قسم ڈھائے تھے وہ خالی نہیں گئے مظلوموں کی فریاد اس کے گلے کا بار بن کر رہی۔

خوش باش کہ ظالم نبردہ بہ سلامت

**میرزا عبدالحکیم کا فرار** | بادشاہی لشکر سرہند کے راستہ سے کلانور اور رہتا تھا پانچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر ڈیرے ڈال دیئے۔ میرزا کو یہ خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو عبور کر کے فرار ہو گیا اور کابل تک اپنی باگٹ کھینچی اسی سال ماہ ربیع الثانی میں بادشاہ نے نیلاب کے کنارے جو سندھ ساگر کے نام سے مشہور ہے "کتک بنارس" کی طرح ایک "کتک بنارس" تعمیر کرایا۔ وہاں سے شاہزادہ سلطان مراد کو تلچ خاں اور دوسرے امراء کے ساتھ کابل پر حملہ کے لیے روانہ کیا۔ ان کے آگے مان سنگھ کو سرداروں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف بھیجا۔

انہی دنوں مرزا عبدالحکیم نے خواجہ ابوالفضل نقشبندی اور محمد علی دیوانہ کو اپنے قصور معاف کرنے کے لیے ایچی بنا کر بھیجا۔ شاہ نے ان لوگوں کے ساتھ حاجی حبیب اللہ کو بھیج کر پیغام دیا کہ اسے معافی اس شرط پر مل سکتی ہے کہ اپنے یکے پر ندامت ابر کر کے آئندہ مخوف نہ ہونے کی قسم کھائے اور اپنی بہن کو جو خواجہ حسن کے نکاح میں ہے بارگاہ میں روانہ کرے۔ میرزا نے حاجی سے

کہا کہ میں کو بھیجنے کے لیے خواجہ حسن رافضی نہیں ہے اور وہ اسے لے کر بدخشاں چلا گیا ہے۔ البتہ میں اپنے قصوروں پر پشیمان ہوں۔  
 کردہ ام تو بہ و از کردہ پشیمان شدہ ام  
 کافر م باز نگونی کہ مسلمان شدہ ام

۱۵۔ اجمادی الثانی کو بادشاہ نے نیلاب کو عبور کیا۔ خواجہ نظام الدین احمد کو یلغار کرتے ہوئے شہزادہ اکبر کا عزم کابل | انہوں نے جواب بھیجا کہ ”حضور کا یلغار کرتے ہوئے یہاں اتنا ہی مناسب ہے“ نظام الدین احمد اور حاجی حبیب اللہ ایک ساتھ پشاور پہنچے اور اپنے اپنے پیغام خدمت میں پیش کیے۔

نظام الدین احمد نے کہا اگرچہ امراء کہنے کو تو کہہ رہے ہیں کہ اس مہم کے لیے ہم لوگ کافی ہیں لیکن درحقیقت وہ سب فتح کو حضور کی تشریف آوری پر ہی منحصر سمجھتے ہیں۔ اب بادشاہ نے بھی پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا اور لشکر میں شاہزادہ سلطان سلیم کو راجہ بھگوان داس اور قاضی علی میر غنیشی کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنی جمعیت خاص کے ساتھ کوچ کیا اور روزانہ بیس بیس کوس کی مسافت طے کرتے ہوئے شہزادہ مراد کے لشکر سے پندرہ دن پر موضع سرخاب میں پہنچ گیا۔

مرزا عبدالحکیم کی شکست | مرزا محمد حکیم نے کابل سے سات کوس کے فاصلہ پر خورد کابل نامی موضع میں اپنے بھتیجے کے ساتھ شہزادہ مراد کے لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری سے جنگ کی۔ لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبد اللہ خاں اوزبک کے پاس بھاگ جائے کہ شہزادہ مراد کابل میں داخل ہو گیا۔

اس جنگ سے ایک دن پہلے فریدیوں خاں نے شہزادہ کے چند اول پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔ جس وقت یہ لوٹ مار ہو رہی تھی حاجی محمد نام ایک اجمادی بادشاہ کے پاس سے ڈاک چوکی کے سلسلہ میں وہاں پہنچا تھا اس نے یہ سارا حال دیکھا اور لوٹ کر سرخاب میں اس واقعہ کی بادشاہ کو خبر دی۔ اس خبر سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی۔ دوسرے دن جب وہاں سے کوچ ہونے لگا تھا کہ فتح کی خبر پہنچ گئی۔

کابل میں ورود شاہانہ | ۱۰ رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ نے اس شہر کے باغوں کی سیر و تفریح میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ بادشاہ نے کابل میں مرزا محمد حکیم کے معتمد آدمیوں سے شاہ منصور کے موصوفہ خطوط کے بارے میں بڑی تحقیق و تفتیش کی اور پتہ چلا کہ یہ سب اس کے خلاف ایک سازش تھی جو شہباز خاں کے بھائی کرم اللہ نے بعض امیروں کے ساتھ مل کر کی تھی اور وہ آخری خط بھی جو اس کے قتل کا سبب بنا امیروں کا بنایا ہوا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو بادشاہ کو شاہ منصور کے قتل پر بڑا رنج و افسوس ہوا۔ لیکن اب اس پشیمانی سے کیا حاصل ہوتا۔

بادشاہ نے میرزا کے پاس لطیف خواجہ میر شکار کو بھیج کر اس کو قصوروں کی معافی کی خوش خبری پہنچائی اور اسے اوزبکوں کی پناہ میں جانے سے منع کر دیا۔ مرزا حکیم نے اطاعت و وفاداری کا عہد و پیمان کیا اور علی محمد اسپ کے ساتھ وہ خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کابل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں لشکر کو متعین کر کے یلغار کرتے ہوئے جلال آباد واپس چلے آئے۔ جہاں تک برد اکیمپ تھا۔



**اکبر کی واپسی** | اسی موقع پر محمد قاسم خاں میر بکر کا بھائی خواجگی محمد حسین جو میرزا کا بڑا معتبر امیر تھا بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جلال آباد سے کافروں کے علاقہ کوہ فتور پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج کو متعین کیا اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے بارہ شعبان کو سند ساگر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک ہی دن میں دریا کے پل پر سے سارے لشکر کو عبور کرا کے مسلسل کوچ کرتے ہوئے رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور آ گئے۔ پنجاب کی حکومت دوبارہ سعید خاں راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ کے سپرد کر دی اور دوآبہ پنجاب کے اماموں کے معاملات کی تحقیق و تصفیہ کے لیے ملا امداد امروہہ ملا امداد سلطان پور کا پور ملا شاہ محمد شاہ بادی ملا شیریں شاعر کو صدارت کے عہدہ پر مقرر کیا، ان میں سے پہلے اور چوتھے صدر نے نیکی اور عدل میں شہرت کی، دوسرے اور تیسرے صدر اپنی بدعیتی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ ملا شاہ محمد نے توشیح اسحاق کاکول جیسے پاک باز متقی اور پرہیزگار عالم کو پروانہ میں یہ فقرہ لکھ بھیجا تھا: "یا قَوْمُنَا اجْنِبُوا اِذَاعِی اللہ"۔ دوآبہ میں شیخ فیضی کو صدر مقرر کیا گیا۔ گنگا پار کے علاقہ پر یلیم ابوالفتح کو صدارت ملی اور دار الخلافہ کا صدر میر فتح اللہ کو مقرر کیا گیا۔

جب سواری پانی پت میں پہنچی تو اس منزل میں شہباز خاں جس نے بادشاہ کے غائبانہ میں کرہی سے لے کر پنجاب تک سارے مالک محروسہ کو اپنے طور پر لوگوں کی جاگیروں میں تقسیم کر دیا تھا اور جس کو جی چاہے عہدے عطا کر دیئے تھے بڑے ترک و احتشام کے ساتھ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ جب بادشاہ نے اس خود اختیاری اور جرأت کے متعلق باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں درج کی اس قدر دل دہی نہ کرتا تو سب کے سب برگشتہ ہو جاتے، اب ملک تمہارا ہے، لشکر تمہارا ہے جسے چاہو دے دو اور جس سے بیا ہو منصب اور جاگیر واپس لے لو۔

زہر کہ خواہی بستاں بہر کہ خواہی بدہ

۲۵ شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے۔ چھوٹے شہزادوں اور بیگیوں نے بادشاہ کا استقبال کیا۔ یہاں سے بادشاہ نے کوچ کیا اور ۵ ذی قعدہ کو دار الخلافہ پہنچ گئے۔

**بند دن کیف و مستی میں** | اس سفر میں میں ساتھ نہ جاسکا تھا مجھے ایک بندہ خدا سے ایسا تعلق خاطر ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک یساوریں ہی رہا۔ اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب تجربے اور سخت مصائب و داشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا۔ اور اسی مہینہ کی چھ تاریخ کو بارگاہ میں حاضری دی۔ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں کیوں ساتھ نہیں تھا؟ اس نے کہا "یہ بھی تمام مفت خور سے معاش داروں میں شامل ہے۔" میری غیر حاضری کا قصہ میں اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو ساتھ نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین احمد مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے جن سے میری دوستی

خواجہ نظام الدین احمد دور اکبری کے مشہور مورخ ہیں، ان کے والد خواجہ مقیم ہرودی (ہرات) بابر بادشاہ کے دیوان تھے، ہمایوں کے عہد میں وزیر رہے اور رزا عسکری کے ساتھ گجرات پر متعین رہے۔ اکبر نے خواجہ نظام الدین احمد کو گجرات اور جونپور میں بخشی گری کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ان کا سن ولادت ۹۵۵ھ آصف خان کے ساتھ ایک ہم پر گئے ہوئے تھے کہ دریا کے کنارے تپ مرقہ میں مبتلا ہو کر ۴۴ سال کی عمر میں ۳۳ صفر سنہ ۱۰۲۷ھ کو فوت ہوئے۔ ان کی مشہور تاریخ (باقی اگلے صفحہ پر)

ایک سال سے قائم تھی اور بڑا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ مجھے مریض لکھوایا اور فہرست پیش کرادی۔ مرحوم خواجہ نظام الدین تمام احباب کے ساتھ عام طور سے دسوزی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے۔ مجھ پر تو ان کی خاص مہربانی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے مجھے پے درپے کئی خط بھی لکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ آ نہیں سکتے ہو اس لیے اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور دہلی یا مستحق جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش کرو، کیوں کہ یہ دنیاوی معاملات ہیں اور ان میں احتیاط برتنا ضروری ہے۔ اس بے چارے نے خیر خواہی سے یہ سب کچھ لکھا۔ لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع سے معلوم ہو رہا تھا۔ مصلحت اور نفع نقصان کی کسے فکر تھی۔

تو باخداے خود انداز کار و خوش دل باش

کہ رحم اگر نہ کند مدعی خدا بکند

اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب ہی میں کبھی کبھی میں شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات نیند میں میں نے یہ شعر کہا تھا اور بیدار ہونے کے بعد عرصہ تک اس کو یاد کر کے میں مضطرب و بے قرار رہا۔

آئینہ ماروئے ترا عکس پذیر است

گر تو نہ نمائی گنہ از جانب مانست

رب العزت کی قسم کہ اس واقعہ کو گزرے ہوئے تا دم تحریر سترہ سال بیت گئے ہیں۔ ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زاہد زار رونے لگ جاتا ہوں کاش کہ میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا۔

خوش آں کہ دید روئے ترا و سپرد جاں

آگہ نہ شد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھے سررشتہ معرفت ہاتھ آ گیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا رہوں اور شکر بجالاؤں تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

در گوش دلم بخواند یک مزمع عشق

حقا کہ بہ عہد ہانسایم بیرون

زناں زمزمہ ام ز پائی تا سر بزم عشق

از عہدہ حق گزارئی یک دم عشق

بادشاہ جس زمانہ میں کابل کی طرف متوجہ تھے تربہت کے علاقہ میں بہادر ولد سعید بدخشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اپنا خطاب بہادر شاہ رکھا تھا اور اپنی ٹہر کے لیے

تربہت میں بغاوت

یہ صحیح تجویز کیا تھا۔

دبقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ "طبقات اکبری" سے شروع ہو کر اکبر کے شہ جلوس تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اکبر کی لکھائی ہوئی تاریخ "تاریخ اسفی" میں بھی وہ ہدایونی حکیم ہمایوں شاہ فتح اللہ شیرازی ملا احمد اور آصف خاں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ ہدایونی "طبقات اکبری" کو ہی "تاریخ نظامی" کے نام سے لکھتا ہے۔

بہادر الدین سلطان است بن اسفید شہ سلطان

پدر سلطان و خود سلطان رہے سلطان بن سلطان

آخر کار وہ اعظم خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

**معصوم خاں کا قتل** | معصوم خاں فرخودی کوہ سوانک میں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اس نے اعظم خاں کو وسیلہ بنا کر اپنے قصوروں کی معافی کے لیے لکھا۔ بادشاہ نے اس کی دل جوئی کے لیے فرمان بھیج دیا اور وہ فتح پور آکر کورنش بجالایا۔ چند دن بعد آدھی رات کے وقت وہ دربار سے اپنے گھر سنگھاسن پر سوار ہو کر جا رہا تھا کہ شہر کے وارہ کے باہر ایک مسلح گروہ نے اس کو گھیر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

**نیابت خاں کا قتل** | جس دن معصوم ملازمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اسی دن نیابت خاں بھی بیگم بادشاہ کے توسط سے خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے چچا شہاب الدین احمد خاں حاکم مالوہ کی خاطر اس کی جان بخشی دی اور کچھ دن کے لیے قلعہ رنٹھنپور میں بھیج دیا۔ وہ اسی قلعہ میں قید تھا۔ اسی قید کی حالت میں اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جو ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس نے وہاں بھی دوسرے قیدیوں کو ہمار کر کے فتنہ و فساد مچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے شاہ نے ۹۹۷ھ میں فرمان بھیج کر اس کا جھگڑا بھی ہمیشہ کے لیے چکا دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم جو بڑی نیک خدہ رسیدہ اور فیاض خاتون تھی اور دہلی میں جنت آشیانی ہمایوں شاہ کے روضہ کی مجاورت اختیار کر رکھی تھی فوت ہو گئیں۔ ان کے انتقال سے روضہ کے مجاوروں اور وہاں کے باشندوں کے املاات میں بڑی خرابی اور انتشار پیدا ہو گیا۔

**بسانی راہبوں سے مناظرہ** | بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث و مناظرہ کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدست و جذبہ تھا شیخ جمال بختیار کے ذریعہ بلوایا اور اس مجلس میں اس عہد کے تقریباً تمام مشہوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھرپور مکتی ہوئی آگ جلائی جائے۔ اس آگ میں میں اور بے مقابل حریف داخل ہوں گے جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ”چلو آؤ بسم اللہ“ فرنگیوں کو اور کسی اور کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ بادشاہ تو ملیوں کو ناکام ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے مارے غیرت کے شیخ قطب کو چند دوسرے فقراء کے ساتھ بکر میں بھجوا دیا۔ وہ اپنے اپنے آخری وقت تک اسی جگہ رہے۔ اس طرح بہت سے فقراء کو مختلف مقامات پر جلا وطن کر دیا۔ اکثر کو تو قندھار بھیج کر ان کے حوض وہاں سے گھوڑے منگوا لیے۔

**قرار کی جلا وطنی** | اس زمانہ میں فقیروں کی ایک جماعت النیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ لوگ پیری مریدی کا سلسلہ چلائے ہوئے تھے اور طرح طرح کی بے ہودہ اور گمراہ کن باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان فقیروں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا تم ان بے ہودہ عقاید سے توبہ کرو۔ انہوں نے مہمل باتیں کر کے توبہ کرنے سے پہلو تہی کی۔ ان فقیروں نے اسلام پر ذبح وغیرہ کے نئے نئے نام اختراع کر رکھے تھے۔ بادشاہ نے ان فقیروں کو بھی بکر اور قندھار بھیج کر ترکہ کی نسل کے گھوڑے

ان کے عوض خرید کر منگوا لیے۔

شیخ ادھن کے پوتوں کو بھی جو جو پور کے بڑے مشائخ میں سے تھے اہل و عیال کے ساتھ دربار میں بلایا گیا اور ان کو اجازت بھیج کر وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان میں سے دو تین افراد تو انتقال کر گئے اور اس خاندان کے دوسرے لوگ نہایت تنگ دستی کے گزر بسر کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین کے پوتے شیخ حسین جنہوں نے حسب دستور تعظیم و تسلیات بجالانے سے انکار کر دیا تھا اور اخراج کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے تھے انہی دنوں مکہ سے فتح پور کو واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی انہوں نے پہلے کی طرح کورنش ادا نہیں کی۔ بادشاہ نے ان کو بھی سرکش جان کر بکر میں بھیجا دیا۔ مسئلہ میں نظام الدین احمد شیخ حسین اور شیخ کمال الدین بیابانی وغیرہ کو بکر سے دربار میں بلایا گیا۔ ان لوگوں نے زمین بوس کی رسم ادا کر دی اس لیے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کمال الدین بیابانی کو قلعہ رنٹھنپور میں بھیج دیا اور شیخ حسین کے لیے بکر ہی میں مدد معاش کا انتظام کر کے اس جگہ متعین کر دیا۔

۹ محرم ۹۹۰ء کو اعظم خاں بنگالہ سے آکر حاضر ہوا۔ ایک رات دوران گفتگو بادشاہ نے اس سے کہا ہم مضبوط دلیلوں کی بنا پر عقیدہ تاسخ کو ختم سمجھتے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تم کو بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھا دے گا۔ اعظم خاں نے یہ بات قبول کر لی۔ بادشاہ نے اسے ان ایروں کے ساتھ جو کابل کی محم پر نہ جاسکے تھے معصہ کابل کی سرکوبی کے لیے متعین کر دیا۔

اسی سال ۱۵ صفر کو نوروز واقع ہوا۔ اور جلوس شاہی کا اٹھائیسواں سال شروع ہوا۔

جشن نوروز کے لیے دیوان خانہ خاص اور عام کو بڑے مٹھاٹھ سے سجایا گیا۔ رنگ برنگے پردے لٹکائے گئے۔ طرح طرح کی قیمتی چیزیں سلیقہ سے رکھی گئیں، فرنگی پردے اور دیدہ زیب تصویریں آویزاں ہوئیں۔ اونچے اونچے سراپردے قائم کیے گئے۔ فتح پور اور آگرہ کے بازاروں میں بھی بڑی دھوم دھام سے آرائش کی گئی اور برابر اٹھارہ دن تک نوروز کا شادمانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جشن کا محفلوں میں بے شمار ہندی اور فارسی گوئیے موسیقار اور اہل طرب مرد اور عورتیں اپنے ہزاروں کمال دکھاتی تھیں۔ اور ایوان میں ہر ایک کوئی ایک بڑا اہیر حاضر ہوتا اور بادشاہ کے لیے قیمتی نذرانہ اور تحائف پیش کر کے ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرتا۔

ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے۔ مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ہجرت سے دس سو سال قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا نفاذ دین الہی کا نفاذ حضور اکرم کی بعثت سے تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں۔ اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لئے جوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے، اس لیے وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کر دیں۔ اس وقت ایسے کسی دعوے اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ علماء اور مشائخ کی تھی جن کے اثر و اقتدار کا پتہ کرنا پڑتا تھا۔ ان علماء کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا۔ اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوختی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلہ میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکہ پر لفظی تاریخ ہجرت ۱۰۰۰ ہجری قمریہ ثبت کیا جائے۔ اور یہ ہزار سن بعثت ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے۔

دین الہی کی بدعتیں | اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں۔ اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیئے گئے کہ انہیں دیکھ دیکھ کر عقل حیران و سر بہ گریبان ہو جاتی تھی۔

ایک حکم تو یہ تھا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے بھجوا کرنا جائز و لازم ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی لی جائے اور اس کے پینے سے خلل و فساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدمستی کرنے اور شور و غوغا مچانے لگے تو اسے سزا دی جائے گی۔ حسب الحکم دربار کے دروازہ پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی۔ جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ یہ عورت کسی شراب فروش کی بیٹی تھی۔ بادشاہ نے خود شراب کا رخ مقرر کیا۔ اس دکان سے ہم شخص علاج کے نام سے منشی کے پاس اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا۔ لوگ فرضی نام لکھوا لکھوا کر شہر مولے جاتے تھے انکی تحقیق کرنے والا کون تھا؟ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشہ بازوں اور متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکان کھل گئی۔ لوگوں کا بیان ہے اس شراب میں سور کے گوشت کا عرق بھی شامل کیا جاتا تھا اور اللہ اعلم، اس احتیاط و سختی کے باوجود لوگ پی پی کر وہاں شور و غوغا مچانے لگے اور ہر روز جھگڑا فساد ہونے لگا۔ سپاہی روزانہ بدمستوں کو پکڑ پکڑ کر سزائیں دیتے تھے۔ لیکن انکی مستی اتارے نہیں آتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس دکان کو بند بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان ہنگاموں سے عاجز بھی تھے۔

شیطان پورہ | اس زمانہ میں پائے تخت فتح پور میں سارے ملک سے کھینچ کھینچ کر بہت سی طوائفیں اور فاحشہ عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ان کی تعداد حساب و شمار سے باہر تھی۔ حکم شاہی ہے ان عورتوں کو شہر سے باہر لے جایا گیا۔ اور انکی بستی کا نام شیطان پورہ رکھا گیا اور وہاں بھی محافظ داروغہ اور منشی مقرر کیے گئے کہ جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جائے یا ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو وہ باضابطہ اپنا نام و نسب رجسٹر میں درج کرا دے۔ اس کارروائی کے بعد ہر شخص کو ان رنڈیوں کے ساتھ زنا کرنے کی اجازت رہتی تھی۔ اس دفتری اندراج کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جاسکتا تھا۔ ان میں سے کنواری لڑکیوں کے ساتھ پہلی شب باشی کی اجازت صرف نامی گرامی امر کو ہی حاصل تھی وہ بھی داروغہ باقاعدہ بادشاہ کو مطلع کر کے اور دربار سے اجازت حاصل کر کے اس امیر کو اس کا موقع دیتا تھا۔ بد معاشوں نے یہاں بھی فرضی ناموں سے اپنا حندا بے روک ٹوک شروع کر دیا لوگ بدمست ہو کر جھگڑے فساد کرنے لگے اور عورتوں کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ قصاص میں پکڑے بھی جاتے تھے اور سزا بھی پاتے تھے۔ لیکن ان کی جگہ دوسرے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ یہ جرائم کرنے کے لیے آ جاتے تھے۔

حسن بے پایاں او چمنہ ال کہ عاشق می کشد  
زمرہ دیگر بہ عشق از غیب سر بر می کند

ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور اور نامی گرامی عورتیں تھیں ان کو بادشاہ نے پوشیدہ طبع پر اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے کس شخص نے ان کے کنوارے پن کو توڑا تھا۔ ان عورتوں نے جن امرا کے نام لیے ان کو سخت سزائیں دیں اور کافی عرصہ تک قید میں بھیج دیا۔ انہی میں سے ایک نے راجہ بیر بر کا بی جو "مراتب چارگانہ" میں سب کا پیشرو اور مخلص ہرید تھا، نام لیا یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑا ہے وہ اس زمانہ میں اپنی جاگیر گورہ میں گیا ہوا تھا جب افشار نے راز کی



یہ خبر اس کو ملی تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کر لیا، پھر بادشاہ نے عنایت امیر فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلا لیا۔

**گاؤکشی کی ممانعت** | بادشاہ کو بچپن ہی سے رند مشرب ہندوؤں سے تعلق خاطر اور وابستگی تھی۔ انہی کی صحبت میں گائے کی تعظیم اس کے ذہن نشین ہو گئی تھی، اس لیے گائے کے ذبیحہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی رذکیاں حرم شاہی میں تھیں، وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ ان کے پاس خاطر سے اکبر گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز کھانے اور داڑھی رکھنے سے احتراز کرتا تھا اور اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسومات کی پابندی کیا کرتا تھا۔ غرض ان ہندو عورتوں اور ان کے خاندان والوں کی دل جوئی کی خاطر اکبر نے ان تمام باتوں کو ترک کر دیا جن سے ہندوؤں کو کراہیت ہوتی تھی۔

**داڑھی ترشوانے کا جواز** | جو لوگ داڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا اس وجہ سے داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہو گیا داڑھی منڈوانے کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیدا کی گئیں کہ داڑھی کا تعلق اصل میں مرد کے خصیوں سے ہے۔ چنانچہ خواجہ سراؤں کی داڑھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے خبیثے ناکارہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ پچھلے زمانہ میں ملا متی فرقہ کے عبادت گزار لوگ داڑھی رکھنے کو ایک طرح کی ریاضت سمجھ کر رکھا کرتے تھے، ان کی دیکھا دیکھی داڑھی رکھنے کا رواج ہو گیا۔ اب اس زمانہ میں ریاضت اور ملامت داڑھی رکھنے میں نہیں بلکہ منڈوانے میں ہے۔ کیونکہ اب اگر داڑھی منڈوائی جائے تو نادان فقیہ اور عالم ناراض ہو گئے اور ملامت کریں گے۔ شاہی مفتی بھی اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے اور فقہ کی کتابوں میں سے ایک مہول سی روایت نکال لائے جس میں یہ فقرہ تھا ”کما یفعلہ بعض القضاۃ“ (جیسا کہ بعض قاضیوں نے کیا، اس فقرہ میں ان بے دین مفتیوں نے تحریف سے کام لیا۔ اصل لفظ ”عصاف“ تھا اس کو ”قضاۃ“ سے بدل دیا۔ اب بجائے گناہ گاروں کے اس کا مطلب نکلا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈوانا تھا۔

زمانہ کی نیرنگی دیکھو کہ جب میں بنیاد دربار شاہی میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری داڑھی خد شرعی سے کسی قدر کم تھی۔ جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میرا ابو الغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی گھٹانا زیب نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا ”کہ یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں“ اس نے کہا ”آئندہ ہرگز ایسا نہ کرنا، یہ بات نہایت بدینا اور نازیبا ہے۔“ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدر سی جو لقی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کمین زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کر دیا اور نو عمر چھوڑوں کی طرح پھیل چھیل بن موڑا ششی کی تائید میں بڑھ چڑھ کر موشگافیاں کرنے لگا۔

**تشلیث پرستی** | ہندوؤں کی ان رسومات کے علاوہ دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی اور ان کے عین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی کی جانے لگی۔ طرح طرح کے لہو و لعب شروع ہو گئے۔ اس زمانہ کی تاریخ نکالی گئی۔

**دین الہی کے اقرار نامے** | دس بارہ سال کے اندر اندر یہ صورت ہو گئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے مرتد امراء نے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ ”میں غلام ابن فلاں“

اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں انکار کرتا ہوں اور اب میں دین النبی اکبر شاہی میں داخل ہو گیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں۔ یہ اقرار نامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کر دیئے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا کرتا تھا۔

**گتے اور سور کی پاکی** | احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور گتے کو پاک قرار دے دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو محل کر دیا تھا کہ سور ان دس مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ہے۔ گتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند تھا کہ گتے میں ایسی دس عمدہ صفات ہیں اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن جائے۔ دربار کے بعض مقرب اور ملک الشعراء فیضی تو اپنے دست پر چند کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھا کرتا تھا اور عراق و ہندوستان کے بعض مرد و شاعر اس کی پیروی کرتے تھے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتوں کی زبان اپنے منہ میں لے کر پیار کرتے تھے۔

**غسل جنابت کی تحریم** | نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کر دی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفہ سے ہے جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کر دیتا ہے۔ بلکہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔

**آتش حیات** | ایک اور بات پیدا کی گئی کہ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا نہایت لغو ہے۔ مردہ جہادات میں شامل ہو جاتا ہے اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کر کے کھانا پکوانا چاہیے۔ اکبر نے ولادت کے کھانے کا نام ”آتش حیات“ رکھا۔

شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کر دیا کہ اس سے آدمی میں بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ چچا، ماموں، قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کر دیا گیا۔ کیوں کہ ان لڑکیوں کی طرف مرد کی خواہش کمزور رہتی ہے۔ نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی کہ مرد کے لیے سولہ سال کی عمر سے اور عورتوں کے لیے چودہ سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں۔ کیوں کہ چھوٹی عمر کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔

**سونے اور ریشم کا حجاز** | سونا اور ریشم پہننا فرض میں قرار دیا گیا۔ ایک دن میں نے مفتی مالک محروسہ کو خالص ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، میں نے پوچھا ریشم پہننے کے لیے کوئی روایت نکل آئی کیا؟ اس نے کہا ہاں جس شہر میں ریشمی لباس عام ہو جائے وہاں ریشم پہننا جائز ہے۔ میں نے کہا بظاہر یہی روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا، نہیں اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے، واللہ اعلم!

نماز روزہ اور حج وغیرہ اس سے پہلے ہی متروک ہو چکا تھا، یعنی حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابو الفضل نے ان عبادتوں کی مذمت اور تمسخر میں کئی ایک رسالے بڑے دلائل کے ساتھ لکھے بادشاہ کو یہ رسالے بہت پسند آئے اور اس پر بڑی نوازش فرمائی۔

**سن الہی کا اجراء** | عربی کے سنِ ہجری کو اکبر نے موقوف کر دیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سن سے شروع کرایا۔ جو ۱۰۰۰ھ میں ہوا تھا۔ مہینوں کا تعین بھی بادشاہوں کے طریقہ پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں درج ہے۔

زردشتیوں کے مذہب کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کی گئیں۔ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق جاتی رہی۔ البتہ جمعہ کا التزام باقی رہا۔ وہ صرف اس خیال سے کہ جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں بھی بس بوڑھے لوگ ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الہی اور ماہ الہی کہا جانے لگا۔ تنک اور مہر پر تاریخ الف ثبت کرائی گئی۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دینِ محمدی کی مدت ختم ہو چکی ہے۔

**عربی زبان کی مخالفت** | عربی پر مہنا عیب ہو گیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانہ کی تحصیل فرض ہو گئی۔ عربی کے خاص حرف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ کو عبداللہ، احمدی کو اہدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

شاہنامہ کے دو شعر جسے فردوسی طوسی نے شاہنامہ میں نقل کیے ہیں بادشاہ سلامت کو بہت پسند تھے اور ان کو وہ سند بنائے ہوئے تھے۔ شعر یہ ہیں ۷

ز شیر شتر خوردن و سوسمار      عرب را بجائے رسیدہ است کار  
کہ ملک عجم را کشت آرزو      تلو باد بر چرخ گردوں تلو  
بادشاہ کو اساتذہ کا جو شعر بھی اپنے مسلک کے مطابق مل جاتا وہ اسے سند بنالیتا تھا۔

**مسائل دینی کا مسخر** | اس ابرے دین کے ہر مسئلہ اور ہر عقیدہ میں جیسے بتوت، کلام، رویت، تکلیف، تلویح، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فرد سے طرح طرح کے شبہات وارد کیے اور ہر ایک کا مسخر و استہزا کیا اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تھا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا تھا اور کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مناظرہ میں عموماً ثابت کرنے والے کے مقابلہ میں انکار کرنے والے کا پہلہ ہی بھاری رہتا ہے خصوصاً جب کہ مقابل کو کسی بات کے جبراً منوانے کے بھی پورے اختیارات حاصل ہوں، بحث میں تو دونوں فریقوں کے مساوی ہونے کی شرط لازمی ہے اور یہاں ذرہ و آفتاب کا معاملہ کون کس سے بحث کرتا اور بحث کا کس کو یار دیتا۔ چنانچہ اس مباحثہ کی قربان گاہ پر کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ تو مباحثہ نہیں بلکہ "مکابرہ" ہوتا تھا جس میں دین فروش علما خوشامد کے لیے طرح طرح کے مترکات و شبہات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر یہ طور تحفہ پیش کرتے تھے، جیسا کہ لطیف خواجہ نے ناوارد النہر کے بزرگ زادوں میں سے تھا شائل ترمذی کی اس حدیث "کاذا سجنید رقتہ" (حضور کی گردن تصویر کی گردن کی طرح تھی) کے بارے میں کلام کیا کہ رسول اللہ کی گردن کو بت سے تشبیہ دینا کہاں درست ہے۔ اسی طرح "ناآہ قصویٰ" کی حدیث کے بارے میں جو سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلہ کو لوٹ لینے کے متعلق، حضور کے چودہ نکاح کرنا اور آپ کی رحلت کے بعد دوسری پر آپ کی بیبیوں کے حرام ہونے کے

کے سلسلہ میں بھی بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور اس طرح کی لالچنی بحثیں نکالی گئیں، جن کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

**مجلس چہل گانہ** | بادشاہ نے اپنی شبانہ محفلوں میں چالیس مقریوں کو شرکت کے لیے مخصوص کر دیا۔ ان چالیس عقلمندوں کی محفل میں جس کی سمجھ میں جو بات آتی پیش کرتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی کسی علمی (مراد دینی) مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ ہمارے سامنے لائے جائیں۔ ان محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے، خاص طور سے خلقائے ثلاثہ کی خلافت، قضیہ فدک اور جنگ صفین کے سلسلہ میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انہیں بیان کرنے سے بھی غیرت آتی ہے۔ خدا ایسی باتیں کسی کو نہ سنوائے۔

شیعوں کو بڑا غلبہ و اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور سنی عاجز و مغلوب ہو گئے تھے۔ جتنے خدا کے نیک بندے تھے وہ خوف زدہ رہنے لگے تھے اور شرپسند عناصر کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا تھا، ہر روز کوئی نہ کوئی نیا حکم ایک نہ ایک نئی ممانعت نکلتی۔ طرح طرح کے اشکال و ادھام سامنے لائے جاتے، بادشاہ اور اس کے حواری اپنے معتقدات و نظریات کے حق ہونے کے لیے کوئی دلیل اور ثبوت تو کیا لاتے صرف دوسروں کی نفی اور تردید کرتے اور اپنی بات منوانے کی فکر میں رہتے تھے۔ بے دینوں کی بن آئی تھی۔ اچھے لوگ مردود ہو گئے تھے اور مردود مقبول بن گئے تھے۔ جو نزدیک تھے انہیں دھتکار دیا گیا اور جو دور تھے ان کو قریب کر لیا گیا تھا۔ دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر سارے ملک میں بڑا شور و غوغا مچا اور بادشاہ کی ان حرکتوں پر لوگ اللہ اکبر کہہ کر کان پکڑنے لگے۔ اس صورت حال کو ملاشیری کے اس قطعہ میں کس عمرگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس نے یہ قطعہ اسی پر آشوب زمانہ میں کہا تھا:

تا بزاید بر زمان کشور بر انداز آفتی	فتنہ در کوئے حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قریض خواہ تیغ در باب شرک	بار سر از دم گردن خدا خواہد شدن
فیلسوف کذب خواہد گریباں پارہ شد	خرقہ پوش زہد را تقویٰ روا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آمد جاہلی	کز خلایق ہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ سے آید مر ازین بیت جس کز طرنگی	نقل بزم منعم و در و گردا خواہد شدن

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است

گر خدا خواہ پس از سال خدا خواہد شدن

**جشن نوروز کی محفلیں** | جشن نوروز کے موقع پر اکثر علماء و اہل علم بلکہ قاضی اور مفتی تک جام لوتے بے مشغلی کر کے زیر مجبور ہو جاتے تھے

عشقیت خبر ز عالم بے ہوشی آمد و رد  
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد  
یاد تو اسے نگار چہ معجون حکمت است  
کز ہر چہ خواندہ ایم سراموشی آورد

نئے دین الہی کے مجتہد خاص طور سے ملک الشعراء فیضی تو یہ کہہ کر پتے کہ ہم یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں۔

نوروز کے آخری دن کا نام جو برج حمل کے انیسویں درجہ میں ہوتا تھا "شرف الشرف" رکھا گیا تھا۔ اس روز تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر جشن کا اہتمام ہوتا اور کورنش و تعظیم کے مراسم ادا کیے جاتے۔ امراء کے منصب و جاگیر میں اضافے ہوتے جسب مدارج گھوڑے اور خلعتیں عطا ہوتیں، شاندار ضیافتیں ہوتیں نذرانے اور تحفے گزرنے جاتے۔

اسی نوروز کے موقع پر بنگالہ سے شام خاں جلائر اور لاہور سے راجا بھگوان داس حاضر بارگاہ ہوئے۔ اعظم خاں اور دوسرے تمام امرا حاجی پور سے دارالخلافہ میں پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بہار میں باغیوں نے شورش برپا کر دی تھی۔ معصوم خاں کابل کے ایک ملازم خبیثہ بہادر نے ترخان دیوانہ سرخ بدخشی کو ہمراہ لے کر بادشاہی چوکیوں پر حملہ کر دیا۔ محمد صادق خاں نے محب علی خاں کے ہمراہ اس سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خبیثہ بھی مارا گیا۔

اسی سال گلبدن بگیم اور سلیم سلطان بگیم حج سے لوٹ کر آئیں۔ ان کے استقبال کے لیے شہزادہ سلطان سلیم اجمیر تک گیا اور خواجہ صاحب کے روضہ کی زیارت کی۔ لیکن پہلے کی طرح نذر نیاز کچھ نہیں ہوئی۔

انہی دنوں بہار سے محمد صادق خاں بھی حاضر بارگاہ ہوا۔ بادشاہ نے بہت جلد اسے اعظم خاں کے ہمراہ معصوم کابل کی سرکوبی کے لیے مامور کر کے رخصت کر دیا۔ صادق خاں کی کمک کے لیے شاہ قلی خاں محرم شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کو جو کابل کی مہم پر نہیں جاسکے تھے، متعین کیا گیا۔

اسی دوران میں شاہ ابوتراب اور اعتماد خاں جو حجاز کے سفر پر گئے ہوئے تھے واپس آئے

اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بھاری پتھر لے کر آئے۔ اس پتھر پر ایک نقش قدم بنا ہوا تھا۔

شاہ ابوتراب کا کہنا تھا کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش ہے جسہ

برلوح سر تربت خود نقش تو کن دیم

تا روز قیامت سر ما و قدم تست

یاد شاہ بھی اس کے استقبال کے لیے چار کوس تک تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ امراء باری باری سے پتھر کو اٹھا کر چند قدم تک لے جائیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اس متبرک پتھر کو شہر میں پہنچایا گیا۔

۱۹ ماہ شعبان کو بڑے شاہزادہ کی سالگرہ منائی گئی اور شہزادہ کا وزن کیا گیا۔ اسی سال یا آئندہ سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک جنہیں ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ مرزا محمد حکیم اور

دوسرے امراء کی بغاوتوں کی خبر سن کر مکہ سے گجرات واپس آگئے تھے اور اپنی سابقہ شان و شوکت کی آرزو میں وقت گزار رہے تھے۔

تھے۔ ۹۹۹ھ میں مخدوم الملک کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے فتح پور سے قاضی علی کو مقرر کیا گیا۔ اس نے لاہور آکر چچان میں کی تو مخدوم الملک کے اتنے خزانے اور دینیے برآمد ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ مخدوم الملک کے

ن ملایہ اللہ سلطان پوری مخدوم الملک کے خزانہ سلیم شاہ کے عہد میں کیے جا چکے ہیں (دیکھیں متعلقہ ماحیہ)



خاندانی قبرستان سے بھی سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے کئی ایک صندوق نکلے جو اس نے میت بنا کر دفن کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مال لوگوں کے پاس رکھا دیا تھا اسکی مقدار تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سونے کی ساری اینٹیں اور اس کی تمام کتابیں خزانہ عامرہ میں داخل کر لی گئیں۔ اس کی اولاد مصیبتوں میں گرفتار ہو کر روٹی روٹی کو محتاج ہو گئی۔

**شیخ عبدالنبی کا عبرت ناک انجام** | شیخ عبدالنبی بہر حال فتح پور پہنچ گیا اور اکبر کے رُودر رُو اس نے سخت باتیں کیں اور اسے خوب برا بھلا کہا۔ اکبر کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شیخ عبدالنبی کے منہ پر پوری قوت

سے ایک گھونٹہ مارا۔ اس نے چلا کر کہا ”ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام کیوں نہیں تمام کر دیتے؟“ اکبر نے اس کو راجہ ٹوڈ رمل کے حوالہ کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپیہ کا حساب لیا جائے جو کہ معظمہ جاتے وقت دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے اس کو کچھری کی حوالات میں طویل عرصہ تک مقید رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر اس کو زندگی کی قید سے رہائی دے دی گئی۔ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبدالنبی جیسا مقتدر آدمی اس کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن بنا روں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ ۹۹۲ھ میں رونما ہوا۔ اس کی تاریخ ”شیخ کنہی“ نکالی گئی۔

گرچہ ایشیخ کا لنبی گفتند

کا لنبی نیست ایشیخ ما کنہی است

اسی سال شیخ جلال تھانیسری کا بھی وصال ہوا۔ ان کی تاریخ ”شیخ الاولیاء“ نکالی گئی۔

اسی سال آصف خاں میر بخشی ثانی جس کا اصل نام میرزا غیاث الدین علی تھا فوت ہو گیا۔ اسکی تاریخ وفات ”خدا یا ورش باد“

لے شیخ عبدالنبی پورا نام شیخ عبدالنبی ولد شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس اصل وطن اندری علاقہ گنگوہ۔ شیخ کا تعلق ایک مشہور مشائخ خاندان سے تھا۔ مگر اور مدینہ جا کر علم حدیث کی تحصیل کی تھی۔ واپس آ کر تصوف کے مسلک کو ترک کر دیا اور علوم دین کی تدریس میں مصروف ہو گئے۔ ۹۸۲ھ میں جبکہ مظفر خاں وزیر کل تھا۔ شیخ دربار میں آئے اور مظفر خاں کی سفارش پر صدر الصدور بنائے گئے۔ شیخ عبدالنبی کو دراصل ملا محمد دوم الملک کا اثر گھٹانے کے لیے یہ اعزاز و ترقی عطا کی گئی تھی۔ اکبر ابتدا میں شیخ کا نہایت معتقد تھا ان کے گھر پر حاضری دیتا تھا۔ ان کی بوتیاں تک اس نے سیدھی کیں۔ شیخ کے اقتدار کا بد اثرانی نے جتنہ جتنہ وضاحت سے تذکرہ کیا ہے۔ ۹۸۵ھ تک فیضی اور ابوالفضل بھی دربار میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے اکبر کو اس طرح قابو میں کیا کہ وہ الحاد و بے دینی کی طرف مائل ہو گیا۔ اور ظہار کی قید سے جاتی رہی۔ شیخ کے زوال اور عبرت ناک انجام کا باعث یہی دو بھائی تھے۔ معتمد خاں نے اقبال نامہ میں صاف صاف لکھا ہے کہ ابوالفضل نے بادشاہ کے اشارہ سے شیخ کو مرد و اڈالا۔ انکی تاریخ وفات کا جو شعر درج ہے اسکے دوسرے مصرع میں ”کنہی“ کا لفظ ”کنب“ سے لیا گیا ہے جس کے معنی بھنگ کے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہارا شیخ بھنگ نوش ہے۔ پچارے کو مرنے کے بعد بھی لوگوں نے نہیں بخشا اور طنز و طعن سے نہیں چو کے۔ شیخ عبدالنبی کی ایک تصنیف ”لطائف النبی“ کے نام سے تھی جس کا قلمی نسخہ دارالمصنفین و اعظم کتب میں موجود ہے۔ انکار سماع یہ بھی ایک رسالہ انہوں نے لکھا تھا۔

۹۸۵ھ شیخ جلال الدین تھانیسری کا بھی شیخ عبدالقدوس منٹوہی کے خاندان کے گیارہویں سے تھے۔ ماں باپ کی طرف سے فاروقی ہیں۔ ان کا وطن اصل یخ ہے۔ والدہ نام شیخ محمد تھا۔ شیخ جلال نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ ۱۰ سال میں علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے اور درسی اور فتویٰ دیتے تھے جب شیخ عبدالقدوس کے مرید ہوئے تو باطنی کمالات حاصل کیے۔ ان کے کتبوبات بھی ملتے ہیں جو احمد نے شیخ عبدالقدوس کے مکاتیب کے جواب میں لکھے ہیں۔ بیرون نے ان کی وفات ۹۹۱ھ کے حالات میں بیان کی ہے۔ ایک روایت کے بموجب ۱۰۱۱ھ کو پچانوے سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مزار تھانیسری میں ہے۔ دوسری تاریخ اس مصرع سے بھی نکلتی ہے ”در بہت کتاب عزت جلال“

تھے آصف خاں کا مال محمد پور میں نان نواں کی بغاوت کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ پھر تو اس نے خان نواں سے جنگ کر کے مجنوں خاں قاتل کی اس کی قید سے پھر آیا تھا بعد میں خود بھی باغی ہو گیا اور جزا گڑھ میں شہر شہر برپا کر دی۔ جب حسین خان نے حسب الحکم شاہی اس پر حملہ کیا تو وہ خان نواں کے پاس رہاں لگے سفر،

سے نکلتی ہے۔ اس کا قائم مقام اس کا بھتیجہ میرزا جعفر ہوا۔ جسے بعد میں آصف خاں کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

**حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل** | حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ پورے

جمع ہیں اور وہ سرکش ہو کر دکن کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصہ تک اسے عین الملک کی نگرانی میں دے دیا تھا۔ بعد میں قلعہ رنتھنبور بھیج کر قتل کر دیا گیا۔

**برہان قاطع کا اعلان** | اسی سال شیخ مبارک نے خلیفہ شاہی میں اکبر کے سامنے بیربر سے یہ کہا کہ جس طرح تمہاری مذہبی کتابوں میں تحریفیں ہوئی ہیں ہمارے دین میں بھی بہت سی تحریفات ہو چکی ہیں اور اب وہ قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔

آخرت فروش گمراہوں نے اسی سال اکبر کو یہ سمجھایا تھا کہ ہجرت پر ہزار سال ختم ہو چکے ہیں آپ بھی شاہ اسماعیل اول کی طرح ”برہان قاطع“ دین الہی کے اجراء کا اعلان فرما دیجئے۔ دربار میں مشورہ کے بعد طے پایا کہ اس مقصد کو تدریج پورا کیا جائے۔ اور بغیر کسی سختی کے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر کیا جائے۔ بادشاہ ان دنوں حکیم ناصر خسرو کی یہ رباعی بہت پڑھا کرتا تھا۔

ورنہ صدو تسعین و قرآن می بینم      وز مہدی و دجال نشان می بینم  
یا ملک بدل گرد یا گرد و دین      مترے کہ نہاں است عیاں می بینم

جس وقت ایک نئے دین کے اجراء کے متعلق دربار میں مشورے ہو رہے تھے اور اکبر پوری شدت سے اس کو جاری کرنے کا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ راجہ بھگونت داس نے کہا ”چلیے ہم یہ قبول کیے لیتے ہیں کہ ہندو بھی بُرے ہیں اور مسلمان بھی لیکن بجلا یہ تو بتائیے کہ ان دونوں سے بہتر اور اعلیٰ کون سا فرقہ اور گروہ ہے جس میں ہم شامل ہو جائیں؟“ بھگونت داس کی بات پر اکبر نے قائل ہو کر شدت برتنے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن اس کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تاریخ ”احداث بدعت“ نکالی گئی۔

**قاضی جلال ملتانی پر تہمت** | اسی زمانہ میں بادشاہ نے قاضی جلال ملتانی پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے جلی تمسک کے پانچ لاکھ تنگہ شاہی خزانہ سے وصول کر لیا ہے۔ یہ الزام رکھ کر ان کو خواجہ فتح اللہ بخش کے ساتھ دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ دکن کے حکام متعصب رافضی ہیں اس لیے وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر نہایت رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے، مگر معاملہ کچھ برعکس ہی ہوا۔ جب وہ دکن پہنچے تو وہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ وہ

(بقیہ ماضی صفحہ ۵۰۳ سے) جس کے قصور اس وقت معاف ہو چکے تھے پناہ لیا۔ نان زماں سناس کی طرف سے بے پردائی برقی اس کے اس رویے سے آصف خاں اس وقت مدفن بجا رہا، نے پھر سرکشی کردہ اختیار کی۔ نان زماں نے مدیر خاں کو نظر بند کرنا تھا وہ بہانہ کرنا لگا۔ آصف خاں نے بھی اس طرف کا رخ کیا۔ نان زماں کے بھائی بادشاہ نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس وقت مدیر خاں اپنے بھائی کو چھڑانے کے لیے اپنا اہل و عیال ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ ہندوستان نے آصف خاں کو ہاتھوں کی عاری می میں قتل کر دینے کا حکم دے دیا، لیکن اس سے پہلے کہ اس کا کام تمام وزیر خاں کے سر پر پہنچ گیا اور جہاں کو نکالنے لے گیا پھر بھی آصف خاں کی انگلیاں کٹ گئیں اور ناک پر زخم آیا۔ بعد میں اس کو قصور معاف ہو گیا تھا اور آخر وقت تک ملازمت خواہی سے منسلک رہا۔

ان سے پہلے ہی یہ خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں کہ قاضی نے اکبر کی بے دینی کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور کلمہ حق کہنے میں بزدلی نہیں دکھائی۔ دکن والوں نے ان کی آمد کو باعث برکت جانا اور علاوہ مدد معاش کی اراضیات کے ان کو اور بھی ذمہ دارانہ خدمات تفویض کر دیں اور وہ وہاں آخر تک نہایت عزت و احترام سے رہے۔ آخر میں حج پر جانے کی اجازت طلب کی۔ لیکن دکن کے حکام ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے عرصہ تک ان کو اجازت نہ ملی۔ آخر وہ اجازت حاصل کر کے زیارتِ حرمین کی سعادت سے فیض یاب ہوئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

**قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری** | قاضی جلال کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ قاضی عبدالسمیع ماوراء النہری میاں کالی کو قاضی بنایا گیا۔ اس شخص کے متعلق موجی شاعر نے یہ شعر کہا تھا

پیری ز قبیلہ معز نہ

ریشی چو گل سفید یک گز

یہ نہایت فاسق و ناجر شخص تھا۔ شطرنج پر جو ا کھیلتا تھا۔ علانیہ شراب پیتا تھا۔ اس کے مذہب میں رشوت نہ صرف جائز بلکہ فرض تھی۔ قرض کے قبائلوں پر حکماً سود وضع کر کے اس کے اندراجات کراتا تھا۔ دین اور مذہب کی بادشاہ کو کوئی پروا نہ تھی۔ محض بدنامی سے بچنے کے لیے قاضی کا تقرر کرنا تھا اور اس سے بہتر کوئی دوسرا قاضی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

**اذان اور نماز کی موقوفی** | محل میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی۔ لیکن انہی دنوں جماعت نماز اور اذان سب کچھ موقوف کر دی گئی۔ کافروں اور حرم کی کافر زادیوں کی خاطر اکبر کو اب تو احمد، محمد اور مصطفیٰ جیسے نام بھی گراں گذرتے تھے۔ چنانچہ کچھ دن بعد اپنے بعض مقربوں کے نام جو اس طرز کے تھے تبدیل کرادیئے۔ جیسے یار محمد اور محمد خاں کو بدل کر رحمت خاں وغیرہ کر دیا۔ اچھا ہی ہوا کیونکہ ان خبیثوں پر یہ باریکت نام جپتے بھی نہیں تھے۔ سور کی گردن میں قیمتی موتی کہاں زیب دے سکتے ہیں۔

بے دینی کی یہ ساری آگ آگرہ سے اٹھی اور اس نے چھوٹے بڑے ہر ایک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آخر اس کی لپٹوں سے آگ لگانے والے فساد ہی بھی نہ بچ سکے۔

**میر فتح اللہ شیرازی کی باریابی** | ماہ ربیع الثانی ۹۹۹ھ میں بادشاہ نے میر فتح اللہ شیرازی کو عادل خاں حاکم دکن کے پاس سے فرمان بھیج کر بلایا۔ جب وہ فتح پور پہنچا تو بادشاہ کے حکم سے خان خانان اور حکیم ابو الفتح اس کے استقبال کے لیے گئے۔ میر فتح اللہ انہیات، ریاضیات، طبعیات، طلسمات و نیروجات اور دوسرے تمام عقلی اور نقلی علوم میں اپنے عہد کا ماہر فن شخص تھا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جو ان دنوں سیاہ نویسی سے بڑھ کر کچھ نہیں رہا تھا اور صدر کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ فقرا کو کچھ دینے کے بجائے انکی اراضی ضبط کرتا رہے۔ اس کو یساوہ کا پرگنہ داغ و محلہ سے مستثنیٰ کر کے بطور جاگیر عطا کیا گیا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا شاگرد ہے۔ اور میر غیاث الدین نماز اور عبادات کا پابند اور قائل نہ تھا۔ اس لیے بادشاہ کو اس کے متعلق بھی یہ خوش گمانی تھی کہ شاید وہ مذہب اور دین کے معاملہ میں انکی تائید کریگا۔ لیکن یہ خوش گمانی باقی نہ رہی۔ کیونکہ میر فتح اللہ شیرازی نے باوجود

اپنی ساری دنیا داری امر پرستی کے مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھائی، چنانچہ وہ عین دیوان خانہ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک پر نماز پڑھا کرتا تھا۔ بادشاہ کے علم میں اس کی یہ تقلید پرستی تھی لیکن اس کے علم و حکمت، تدبیر و مصلحت کا خیال کر کے بادشاہ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی ترقی و خاطر داری میں کوئی کمی نہ کی یہاں تک کہ مظفر خاں کی چھوٹی رڈ کی سے اس کا نکاح بھی کرادیا اور اسے وزارت کے عہدہ پر راجہ ٹوڈرل کا شریک کار بنادیا۔ وہ نہایت جرأت کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے فرائض وزارت بجالاتا تھا۔ وزارت کے ساتھ ساتھ وہ امرار کے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابوالفتح کے رڈ کے کو پھر شیخ ابوالفضل کے رڈ کے کو پڑھایا، دوسرے امیروں کے بھی سات سات آٹھ آٹھ سال تک کے بچوں کو الف ب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کاندھے پر بندوق اور کمر میں بارود کی مٹی بندھی رہتی تھی۔ اور بادشاہ کے ساتھ جنگل میں قاصدوں کی طرح پیدل جایا کرتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع اور اچھی حرکتوں سے اس نے علم کے رہے سے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن اس کا کمال یہی تھا کہ وہ اس ذلت و رذالت اور خسیسی کے باوجود مذہب کے معاملہ میں بڑا سخت تھا اور کسی سے نہیں دبتا تھا اس کی آمد کی تاریخ ”شاہ فتح اللہ“ ام اولیاء سے نکلتی ہے۔

### معراج نبوی سے انکار

ایک رات اکبر نے شاہ فتح اللہ کی موجودگی میں بیربر سے کہا ”اس بات کو عقل باور نہیں کرتی کہ ایک شخص اپنے جسمانی بوجھ کو لیے پلک جھپکنے میں آسمان پر جائے اور اللہ تعالیٰ سے نو دہزار باتیں کر کے اتنی جلد لوٹ آئے کہ اس کا بستر واپسی تک گرم ہی رہے اور لوگ بھی اس دعویٰ کی تصدیق کرنے لگ جائیں۔ اسی طرح شق القمر اور دوسرے معجزے بھی خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں۔“ پھر اکبر نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا ”دوسرا پاؤں ٹکائے بغیر آخر ہمارا کھڑا رہنا کس طرح ممکن ہے۔“ آخر لوگوں نے یہ کیا داستان بنا رکھی ہے۔ بیربر بد بخت اور دوسرے گمراہوں نے بادشاہ کی خوب ہاں میں ہاں ملائی اور بردا سراہا۔ اکبر رہ رہ کر شاہ فتح اللہ کو دیکھتا جاتا تھا اور اس ساری گفتگو کی غرض بھی یہ تھی کہ وہ نیا آیا ہوا ہے۔ اس کے خیالات معلوم کریں۔ لیکن وہ بندہ خدا سر جھکائے کھڑا رہا، بولا کچھ نہیں۔

### ملا احمد کھٹہ کی آمد

انہی دنوں کھٹہ کا ملا احمد متعصب رافضی جو بڑی بے حیائی سے خود کو حکیم بھی کہا کرتا تھا دکن سے آکر باریاب ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد فاروقی سلسلہ کے حنفی تھے۔ وہ ناپاک ان بد نصیبوں پر بھی سخت کھینچتا تھا۔ مگر حضور کا قول ہے کہ جو اپنے باپ کو لعنت کرتا ہے اس کی لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ وہ شاہ طہاسپ کے عہد میں عراق میں تبرا کرنے والے شیعہ مومنوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا اسی لیے وہ انکی طرح ہو گیا۔ لیکن جب شاہ اسماعیل ثانی نے اپنے باپ کے رخصت سنی مسلک اختیار کر لیا اور رافضیوں کو تنگ کرنے لگا تو وہ میرزا محمد دوم کے ساتھ جو پکے سنی تھے اور انہوں نے انوار قضا فی ذمہ الروافض کے نام سے رافضیوں کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کتاب کی تاریخ تصنیف بھی درج ہے، مکہ کو چلا گیا وہاں سے بھٹکتا بھٹکتا دکن پہنچا، وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں سارا میدان خالی پڑا تھا۔ چنانچہ اسے سہل باتوں کو پھیلانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا کھلا موقع مل گیا، مگر کچھ ہی عرصہ بعد اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ بھی مل گیا۔

ان دنوں جب کہ وہ شیخ فیضی کی صحبت میں نہیں پہنچا تھا اور اتنا بے باک نہیں جوتا تھا۔ میری اس سے بازار میں ملاقات ہو گئی۔



عراقیوں نے اس کے سلسلے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا ”رفض کا نوران کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے۔“ میں نے فی البدیہہ جواب دیا ”ہاں جس طرح نور نسین تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے۔“ جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بڑے خوش ہوئے۔ اس کا مزید حال آگے بیان کیا جائے گا۔

**تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم** | اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں۔ اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں۔ اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے۔ جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں۔ یہ تاریخ دوسری تاریخوں کے غلط واقعات کی تردید و تنسیخ کرے۔ اس کا نام ”تاریخ الفی“ رکھا جائے۔ اس میں سنوں کے ساتھ بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ حضور اکرم کی وفات سے اس زمانہ تک کے حالات لکھنے کے لیے سات اشخاص مامور کیے گئے۔ پہلے سال کے واقعات کے لیے نقیب خاں کو دوسرے سال کے لیے شاہ فتح اللہ کو اور اسی ترتیب سے دوسروں کو متعین کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حکیم ہام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی جو انہی دنوں گجرات سے آیا ہوا تھا، مرزا نظام الدین احمد اور اس ناچیز (ملا عبد القادر بدایونی) کا نام بھی شامل تھا۔ پھر دوسرے ہفتہ اس طرح ۳۵ سال کے واقعات کی ترتیب و تقسیم کی گئی۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرہ میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے۔ ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظہ میں تھا جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر قصر الامارت کے انہدام حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قضیہ شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قدر و قامت کے بچھوڑوں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و قدح شرفع کر دی، مرزا جعفر آصف خاں ثالث نے اس موقع پر اکبر کی غلط تائید کی اور اسکی طرف سے بحث کرنے لگا۔ البتہ شیخ ابوالفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کی صحیح توجیہات بیان کیں۔ مجھ سے اکبر نے پوچھا ”تم نے یہ سب حالات کس طرح لکھ دیئے۔ میں نے عرض کیا ”میں نے کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کر دیا۔“ اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانہ سے روضۃ الاحباب اور سیرت کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ ”وہ تحقیق کر کے بتائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط۔“ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت و گیر سے چھٹکارا ملا۔

سن چھتیس تک کے حالات لکھے جا چکے تو اکبر نے حکم دیا کہ اب صرف ملا احمد قاضی تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھے گا۔ یہ تبدیلی حکیم ابوالفتح کی تجویز و سفارش کی وجہ سے عمل میں آئی۔ ملا احمد نہایت متعصب آدمی تھا اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جی میں جو کچھ آیا لکھ دیا جیسا کہ اس تاریخ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے دور تک اس نے اس تاریخ کی دو جلدیں پوری کر دیں۔

ملا احمد اپنے مذہب میں نہایت غلو اور تشدد برتا تھا۔ میرزا فولاد برلاس کو بھی اس کی وجہ سے نقصان پہنچا تھا۔ چنانچہ مرزا نے ایک رات اس بہانہ سے کہ اسے بادشاہ نے طلب کیا ہے گھر سے باہر بلایا اور لاہور کی ایک گلی میں اسے قتل کر دیا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو بھی سزائے موت دی گئی۔

تاریخ الفی کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمہ داری اب آصف خاں کے سپرد کی گئی۔ اس نے یہ واقعات ۹۹۷ھ تک پورے کر دیئے۔



مستند میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنوں میں جو تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے درست کر دوں۔ ایک سال تک میں یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کر دیا، تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالہ کر دیا۔

اس سال کا اہم واقعہ مہابھارت کے ترجمہ کی تکمیل ہے۔ مہابھارت ہندوستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے جس میں متعدد قصے نصیحتیں مصالح ملکی اخلاق و آداب علوم و اعتقادات ہندو مذہب اور

اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے۔ یہ تمام موضوعات ہندوستان کے قدیم فرمانروا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں۔ بعض کی رائے میں یہ واقعات کم از کم چار ہزار سال پہلے پیش آئے تھے۔ بعض کا قول ہے مہابھارت پرستی ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جو بظاہر آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے کفار اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مہابھارت کے ترجمہ کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہ نامہ اور امیر حمزہ کے قصہ کو سترہ جلدوں میں پندرہ سال کی مدت میں لکھوایا تھا۔ اس کا تصدیروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اسی طرح ابو مسلم کا قصہ اور جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ فرضی ہیں اور محض شاعری کی گئی ہے یہ کتابیں چونکہ اچھے وقت لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو عام شہرت نصیب ہو گئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنہیں عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ رب کی سب حقیقی اور نص قاطع ہیں ہندوؤں کی عبادتوں اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں ہندی سے فارسی میں ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کر لیا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمہ میں درج ہے ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقا، اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگی۔

چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطابق کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینہ کی مدت میں اس مجموعہ خرافات کے اٹھارہ فنون میں سے جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف دو فن لکھے جاسکے۔ نہ معلوم مجھ سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمہ سے پالا پڑا اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے بجز طعن و تعریف کے کچھ نہیں ملا بعد میں اس کے ایک حصہ کو ملاشیری اور نقیب خاں نے پورا کیا اور ایک حصہ کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ

لہ مہابھارت: ہندوؤں کی یہ مذہبی کتاب ہے جو آریوں کے دور شجاعت کی تصنیف ہے۔ اس کا صحیح سن تصنیف تو نہیں معلوم کب لکھی گئی۔ مصنف کا نام پنڈت ویاس جی ہے۔ یہ کتاب ہندو قدیم کے واقعات آریوں کے عقائد انکی حکمرانی معاشرت اور سماجی حالات کا مکمل مرقع ہے۔ کورو پانڈوؤں کی مشہور جنگ مہابھارت کا ہی ماخذ ہے۔ کرشن جی کا اپدیش جو ”بھگوت گیتا“ کے نام سے مشہور ہے اس کا ماخذ بھی مہابھارت ہے۔ یہ جنگ دہلی کے قریب کورونگیشیر کے مقام پر لڑی گئی تھی جس میں کرشن جی کی مدد سے ارجن نے کوروؤں کو شکست دی تھی۔ اس کا فارسی میں سب سے پہلے ترجمہ اکبر کے عہد ہی میں ہوا۔

فیضی نے اسکے دفنون کی نظم و نشر مرتب کی۔ پھر حاجی مذکور نے دو حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں انکی تصحیح کر دی۔ اس طرح اس کتاب کے سوجز و مکمل ہو گئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ کسی کا داغ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سلطان حاجی تھانیسری کو اس محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصہ بعد کسی بہانہ سے اس کو بکر کی طرف جلا وطن کر دیا گیا۔ اب وہ اپنے شہر میں مقیم ہے۔ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کرنے والے اکثر لوگ کو روپا نڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا انکو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس بارے میں معافی عطا فرمائے۔

اکبر نے اس ترجمہ کا نام ”رزم نامہ“ رکھا۔ تصویروں کے ساتھ اس کے دو نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئی تو امرا کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابوالفضل جس نے اس سے پہلے آیہ الکرسی کی تفسیر لکھی تھی اس کفر نامہ پر اس نے دوجز کا خطبہ لکھا۔

اس سال کے واقعات میں نے ایک خاص وجہ سے نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ لکھے ہیں۔ اس لیے اگر واقعات کی ترتیب اور سنوں کی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو قارئین اسے نظر انداز فرمادیں۔

۲۵ ماہ صفر ۹۹۹ھ کو نوروز ہوا اور جلوس اکبر شاہی کے اٹھائیسویں سال کا آغاز ہوا۔ حسب دستور سابق نمائشی دوکانوں کی آرائش امرار میں تقسیم کر دی گئی۔ اور جشن کی تقریبات منائی گئیں۔ شاہ فتح اللہ نے اپنی دکان کی بڑی اچھی آرائش کی تھی۔ اس میں جر ثقیل اور ایسے دوسرے آلات کی نمائش کی گئی تھی۔

اس سال بھی چند نئے احکام اختراع کیے گئے۔ اتوار کے دن نوروز کے اٹھارہ دن اور اکبر کی ولادت کے مہینہ ماہ آبان کے تمام دنوں میں تمام حدود و ممالک محروسہ میں جانوروں کے ذبیحے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ حکم بھی محض ہندوؤں کی خاطر نافذ کیا گیا تھا۔ جو شخص بھی ان دنوں ذبیحہ کرتا اسے جرمانہ کی سزا دی جاتی تھی اور اس کا گھر بار تباہ کر دیا جاتا تھا۔ خود اکبر نے گوشت خوری سے اتنا پرہیز کیا کہ سال بھر میں چھٹے مہینے بلکہ اس سے بھی کم گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ مطلقاً گوشت کھانا ترک کر دے۔

اکبر نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب کو آفتاب کی پرستش شروع کر دی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشوع و خضوع سے دوپہر میں پڑھا جاتا تھا۔ اس وظیفہ کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا تھا اور کانوں پر دونوں ہاتھ توبہ کی طرح مارتا تھا۔ اس طرح کی اور بہت سی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

نوبت نقارہ ایک مرتبہ تو نصف رات کو اور ایک بار طلوع کے وقت بجانے کا حکم دیا گیا۔ مسجدیں اور خانقاہیں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئیں۔ اور وہاں بجائے جماعت کے جماع ہونے لگا۔ اور ”سحی علی“ کی جگہ ”بللا تلالا“ ہونے لگی۔ جو قبرستان شہر میں تھے ان کو مسمار کر دینے کا حکم دیا گیا۔

اس جشن کے موقع پر اکبر نے اپنی والدہ کو ایک لاکھ روپیہ نقد، چند ہاتھی، پوشاکیں، سونے کے برتن، جڑاؤ زیور وغیرہ دیئے۔ اس طرح اپنی چچی گلبدن بیگم اور دوسری تمام بیگمات کو بھی انعامات دیئے گئے اور عام حکم دیا گیا کہ ہر خاص و عام نذرانے پیش کرے۔

اسی سال اعظم خاں اور دوسرے امرا نے ٹانڈہ پر قبضہ کر لیا۔ خالدی خاں جباری، میرزا بیگ قاتشال، معصوم خاں ٹانڈہ پر قبضہ | کا ساتھ چھوڑ کر اعظم خاں کے پاس چلے آئے اور معصوم خاں بعض زمینداروں کی پناہ میں چلا گیا۔ بنگالہ کا سارا علاقہ

سرکاری حدود میں آگیا۔

بادشاہ نے دکن کے حکام کی تالیفِ قلب کے لیے اس سال گجرات کی حکومت اعتماد خاں کے تفویض کر دی۔ شاہ ابوتراب کو وہاں کا امین خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی بادشاہ کے استاد مولانا عبدالقادر کے بھائی ابوالقاسم تبریزی کو دیوان کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔ گجرات کی جاگیروں پر امرا کی بڑی تعداد کو مقرر کیا گیا۔ جن میں محمد حسین میر ابوالمظفر ولد اشرف خاں، میر ہاشم، میر صالح داعی، سید ابوالسحاق وغیرہ شامل تھے۔

شہباز خاں کو بادشاہ نے اس کی چند گستاخیوں کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اس نے جو سرکاری رقم موقع بے موقع صرف کی تھی اس کے حساب کتاب کا کام راجہ نوڈرمل کے سپرد کر دیا تھا۔ اس سال ابوالفضل کی سفارش پر اسے معاف کر کے راجہ کے جنگل سے رہائی عطا کی اور، اربعہ الثانی کو اسے بنگالہ پر متعین کر کے رخصت کر دیا کہ وہاں جا کر تمام سرکار بنگالہ کو بادشاہی جاگیر داروں میں تقسیم کر دے اور عیسیٰ کے صوبہ سے معصوم کابل کو خارج کر دے۔

اسی اثناء میں خبر ملی کہ خان اعظم نے شیخ فرید بخاری کو مصالحت کے لیے اڈیسہ کے حاکم قتلوسی افغان لومانی کے پاس بھیجا تھا۔ قتلوس نے شیخ فرید کی بزرگی کا خیال کر کے ان کا استقبال کیا۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو بہادر کورفر نے جو بنگالہ کا زمیندار اور قتلوس کا بڑا فوجی افسر تھا، شیخ سے نہایت بے ادبی کے ساتھ ملاقات کی اور برابری سے بات کرنے لگا۔ شیخ نے اسے ایک زمیندار سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے اس رویہ پر شاہو ولد شیخ راجو بخاری سرہندی نے بھی جگر سخت طرز عمل اختیار کیا اور دوسرے بخاریوں نے بھی بڑی بے اعتدالی دکھائی۔ جس وقت شیخ فرید وہاں سے لوٹ رہے تھے اور قتلوس شیخ کی خدمت میں چل رہا تھا۔ بہادر نے لڑنے کا ارادہ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ اس جھڑپ میں شاہو اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ شیخ فرید سلامتی سے پنج کر نکل آئے۔

حاکم دکن مرتضیٰ نظام الملک کا بھائی برہان الملک وہاں سے بھاگ کر مالوہ میں قطب الدین خاں برہان الملک کی آمد کے پاس آگیا تھا۔ اس سال رجب کے مہینہ میں وہ حسبِ حکم دارالخلافہ آیا اور بار بار بھاگتا تھا۔ اس کی

لے نظام الملک اور برہان الملک، سلطنت بہمنی کا زوال ہوا تو دکن چار ریاستوں میں بٹ گیا تھا گوکنڈہ کی قطب شاہی، بیدری کی برید شاہی، احمد نگر کی نظام شاہی، بیجا پور کی عادل شاہی۔ مرتضیٰ نظام الملک نظام شاہ کا بیٹا اور احمد نگر کا دوسرا سلطان آخر عمر میں کچھ دماغ کا خلل کچھ بھڑکے کی گزوری، ملک میں بڑی ابتری پھیل گئی۔ اس لیے اسکی ماں نے عملاً سلطنت کا انتظام سنبھال لیا۔ اس کا چھوٹا بھائی برہان الملک تھا۔ نظام الملک نے بغاوت کی شہسواروں میں اور چھوٹے بھائی کو قید کر دیا۔ برہان الملک بعد میں قید سے بھاگ کر ابراہیم عادل شاہ کے پاس بیجا پور چلا گیا اور وہاں سے مدد لے کر احمد نگر پر چڑھائی کی۔ لیکن نظام الملک نے اسے شکست دے کر بھاگ دیا۔ برہان الملک بھاگ کر بیجا نگر کے راجہ کے پاس کچھ عرصہ رہا۔ وہاں سے کوکن پھر بنگالہ میں جی راجہ کے پاس چلا گیا۔ قطب الدین خاں کو کہ حاکم نندیار کے وسیلہ سے ۱۵۹۹ء میں دربار اکبری میں حاضر ہوا۔ ۱۶۰۰ء میں اسے خان اعظم کے ساتھ احمد نگر پر حملہ کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن یہ فوج ناکام واپس آئی۔ احمد نگر میں نظام الملک نے ۲۶ سال حکمرانی کے بعد ۱۶۰۰ء میں انتقال کیا اس کا ریکارڈ کا حسین نظام الملک دو باہ تین ماہ حکمران رہا۔ اس کو امیروں نے قتل کر دیا اور برہان الملک کے روئے اسنچل کو قید سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا۔ اکبر نے برہان الملک کو ۱۶۰۱ء کا منصب عطا کیا تھا اور انگلش میں جاگیر عطا کی۔ ۱۶۰۲ء میں اکبر نے خاندیس کے حاکم راجہ علی خاں کے ساتھ برہان الملک کو دوبارہ احمد نگر پر قبضہ کے لیے بھیجا۔ ان دونوں نے امداد پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۰۳ء میں برہان الملک نے احمد نگر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۰۴ء میں برہان الملک کا انتقال ہوا اس کے بعد میں نور الدین ظہوری مشہور شاعر نے "ساقی نامہ" اسی کے نام پر تصنیف کیا تھا۔ اس نے آخر عمر میں اپنے لڑکے ابراہیم کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ ابراہیم برہان الملک کی پوری کسب و کار کا بدلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے بعد احمد نگر میں بڑی افغانی پیدا ہو گئی۔ چاند بی بی برہان الملک کی حقیقی بہن تھیں وہاں اعلیٰ درجے کی

آمد سے قبل ایک آوارہ نامعلوم شخص دربار میں آیا تھا۔ اور اس نے خود کو برہان الملک ظاہر کیا تھا۔ اسے بادشاہ نے اودھ میں جاگیر عطا کر دی تھی۔ جب بھید کھل گیا تو وہ بھاگ کر جوگیوں کے پاس چھپ گیا تھا۔ لیکن ایک ہفتہ بعد ہی پکڑا گیا۔ اسے قید خانہ بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔

**جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت** | انہی دنوں بادشاہ نے شہر سے باہر ہندو اور مسلمان فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے دوسرائیں تعمیر کرائیں۔ ایک کا نام خیر پورہ، دوسرے کا دھرم پورہ رکھا گیا۔ ان کے انتظام پر شیخ ابوالفضل کے چند آدمی متعین تھے جو بادشاہی خرچ پر فقراء کو کھانا کھلاتے تھے۔ جوگیوں کی ٹولیاں بھی بہت آتی رہتی تھیں۔ ان کے لیے ایک الگ سرائے بنوا کر اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر راتوں میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ان جوگیوں کی صحبت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مختلف جاہلانہ معلومات، اعتقادات، مراقبے، مشغلے، آسن، کیمیا، ہیمیا اور ایما جیسے عجیب و غریب علوم سیکھا کرتا تھا۔ اس نے کیمیا کے ذریعہ خود سونا بھی بنایا اور اسے لوگوں کو دکھایا۔ جوگی ہر سال ایک مقررہ رات میں جے وہ شہر رات کتے تھے ہر طرف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ اس رات اکبر بڑے بڑے جوگیوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ اور ان سے گنتی جو گنتی عمر کی بشارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ان کی دعاؤں اور بعض دوسرے قرنیوں سے اکبر کو اپنی درازی عمر کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ بعض حکیموں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ عمر کی کمی کا تعلق دور قمری سے تھا۔ اب جبکہ دور زحل شروع ہو چکا ہے جس میں ساری باتیں برعکس ہونگی اور عمر میں بھی طویل ہو جائیں گی۔ چنانچہ پچھلے لوگ ہزار ہزار سال کی عمر کے ہوتے تھے اور ہندی کتابوں میں آدمیوں کی عمر دس دس ہزار سال کی لکھی گئی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں لامادوں کی عمر جو چینیوں کے پیشوا اور بڑے زراہد و عابد ہوتے ہیں دو سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس درازی عمر کی خاطر اکبر نے بھی ان جوگیوں کی طرح مباشرت اور کھانے پینے میں کمی کر دی۔ خاص طور سے گوشت ترک کر دیا اور اپنی تالو کے بال منڈوا ڈالے۔ صر اطراف کے بال رہنے دیئے۔ وہم یہ تھا کہ کالوں کی روح مرنے کے درمیان جو جسم کا دسواں منفذ نکلنے کی جگہ ہے نکلتی ہے۔ اور اس وقت گرج کی طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سعادت اور نجات کی علامت ہے۔ تناسخ کی رو سے یہ اس بات کی نشانی ہے کہ روح کسی صاحب شوکت مقتدر بادشاہ کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

**ہمالی اکبر کے درشن** | بادشاہ نے اپنے مسلک کا نام ”توحید الہی“ رکھا۔ اور اپنے خاص گروہ کے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں ”چلیہ“ کا نام دیا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر ذلیل اور رکار شامل تھے چونکہ بارگاہ شاہی میں نہیں جاسکتے تھے اس لیے وہ ہر جمع کو سورج پوجا کے وقت جھروکے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہیں کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفقہ رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو مسلمان عورتیں اور بزرگ تندرست اور بیمار اپنی حاجتیں پوری کرانے نیاز مندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کی عام اجازت

دفعیہ حاشیہ صفحہ سابقہ اس نے برہان نظام شاہ کے کنسن لڑکے کو بہادر شاہ کے نام سے تخت نشین کیا اس کا خطاب نادرة الزمان تھا۔ یہ بڑی حوصلہ مند بہادر خاتون تھی۔ علی عادل شاہ بیجا پور کی بیوہ تھی۔ جب تک وہ زندہ رہی احمد نگر پر اکبری فوج قبضہ نہ کر سکی۔ چاندنی بن سلطانی کے نام سے مشہور رہی ہے اس کی وفات کا سبب معلوم نہیں ہو سکا معلوم ہوتا ہے یہ امرار اور مغلوں کی سازش کا شکار ہو گئی۔

ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار نام کا ورد کر کے پڑ کے پیچھے سے نمودار ہوتا۔ یہ لوگ مسجد میں گر پڑتے۔

اکبر پریشور کا اوتار | مکار اور چالاک برہمنوں نے خود اکبر کے ایک ہزار ایک نام ترتیب دے دیئے کہ رام اور کشن کی طرح آپ بھی ایک اوتار ہیں اور پریشور نے آپ کی صورت میں حلول کیا ہے۔ اکبر نے یہ بھی باور کرایا۔

ہندوستان کے قدیم علماء کے ہندی دوسے نقل کر کے پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوگا جو برہمنوں کا محافظ ہوگا۔ گائے کی حفاظت کرے گا۔ اور ساری دنیا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے گا۔ یہ ساری خرافات پرانے کاغذوں پر لکھ لکھ پیش کی جاتی تھی۔ اکبر ان تمام باتوں پر اعتقاد لے آتا تھا۔ مختلف فرقوں میں سے جن کے سچے اعتقاد کا اکبر کو یقین ہو جاتا تھا ان کو وہ "احدی" کہا کرتا تھا اور یہ گمان تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو وقت پر آنے والے ہیں اور خون کے سمندر میں بے جھجک داخل ہو جائیں گے۔

اسی سال اکبر نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں حنفیوں کے مسئلہ کے مطابق "وہ دروہ" اور شافعیوں اور شیعوں کے "قلین" کے مطابق پانی بھرا کر وزن کرایا۔ حوض کا پانی ان دونوں سے زیادہ نکلا۔ بادشاہ نے سنیوں اور شیعوں کے دو علیحدہ گروپ بنانے کا حکم دیا۔ جنھیں ہندوستانی تھے وہ سنیوں کے کیمپ میں ہو گئے اور جنھیں عراقی تھے وہ شیعوں کی طرف چلے گئے۔ ایسے بہت سے جزوی واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔

گجرات کی بغاوت | جب اعتماد خاں اپنے حسب مدعا گجرات کی حکومت پر مامور ہو کر سر وہی پہنچا تو اس نے اس مقام کو سرنال سے علیحدہ کر کے رانا کے بھائی جکمال کے سپرد کر دیا اور متعینہ امراء کو ساتھ لیکر ۱۲ ماہ شعبان کو احمد آباد پہنچ گیا۔

شہاب الدین احمد خاں احمد آباد کا مستقل حاکم تھا اور گجرات کے سارے فتنہ و فساد کی اس نے بڑی خوبی سے روک تھام کر رکھی تھی وہ اپنے گھر سے نکل کر عثمان پورہ کے محلہ میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس کے ملازم سردار جو اس تبدیلی پر سخت ناراض تھے دوسرے ہم پسندوں کے ساتھ کاٹھیاوار کی طرف چلے گئے جہاں سلطان محمود گجراتی کا لڑکا مظفر شاہ دربار اکبری سے بھاگ کر اپنے نہیںال کے رشتہ داروں کی پناہ میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ بغاوت پسندوں نے وہاں جا کر اسے حصول بادشاہت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی جماعت کو دلا ساسل دے کر واپس بلا لے۔ لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا کہ یہ لوگ عرصہ دراز سے اس دن کے منتظر تھے اور میرے قتل کے دہے ہو گئے تھے۔ اب ان کا معاملہ میرے قابو سے باہر ہے اب تم یہاں کے حاکم ہو تم جانو اور یہاں کے لوگ۔ یہ کہہ کر وہ احمد آباد سے بیس کوں پر قصبہ کرمی میں چلا گیا۔

مظفر شاہ کی بلغار | اعتماد خاں اور نظام الدین احمد کے دو آدمی باغیوں کے پاس گئے اور انہیں بہت تسل و لا سا دیا۔ لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ ۲۷ شعبان کو مظفر کاٹھیاواڑیوں اور برگشتہ مغلوں کا لشکر لے کر احمد آباد سے باہر نکلا۔

پروہلقہ کے مقام پر پہنچا۔ اسی وقت اعتماد خاں اور نظام الدین احمد شہر چھوڑ کر شہاب الدین احمد خاں کو واپس لانے کے لیے کرمی کی طرف کوچ کر گئے۔ اور اس کو اطمینان دلایا کہ بدستور سابق پر گئے اس کی جاگیر میں رہیں گے۔ علاوہ انہیں اسے دولاکھ روپے



نقد بھی دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جانے سے پہلے احمد آباد کو شیر خاں ولد اعتماد خاں اور میر محمد معصوم بکری کی تحویل میں دے دیا تھا کہ ہم کرسی سے واپس آکر فوج کا ساز و سامان درست کریں گے۔

منظر شاہ نے دوسرے دن پیش قدمی کی۔ احمد آباد سے تین کوس پر سرکچ کے مجاوروں نے گجرات کے بادشاہوں کے مزاروں کا چتر تیار کر کے شگون کے لیے اس کے سر پر سایہ کیا اور اسے سلطنت کی مبارک باد دی۔ اس کے لیے تو یہ مژدہ غیب تھا غرض وہ اسی دن دھاوا مار کر شہر میں داخل ہو گیا۔

**امرائے شاہی کی پسپائی** | مذکورہ دونوں امیر کرسی سے راتوں رات یلغار کرتے ہوئے صبح کے وقت عثمان پورہ پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے مظفر اپنی فوج کو آراستہ کر کے آگے بڑھا اور احمد آباد کے یگستانی ساحل پر مقابلہ کے لیے صف آرائی کر لی۔ وہ تو میدان میں پہنچ کر دم خم دکھا رہا تھا اور یہاں یہ دو بوڑھے امیر باغیوں میں تفرقہ پیدا کرنے بھاگے ہوئے ملازموں کو تسلی دے کر واپس بلا لانے 'قرض لینے' دستاویز و تمسک لکھنے اور نامہ و پیام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ غرض ان کے رو کے بغاوت کا یہ سیلاب رک نہ سکا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو وہ دونوں بغیر لڑے ہی وہاں سے فرار ہو کر نہروالہ کے شہر تپن میں جو احمد آباد سے ۵۴ کوس پر ہے ایک ہی دن میں جا پہنچے۔ ان کے لشکر کا سارا ساز و سامان باغیوں نے لوٹ لیا اور شکریوں کے اہل و عیال اسیر ہو گئے۔ نظام الدین احمد کا لڑکا محمد شریف سارا مال و اسباب لٹوا کر محافظ سپاہیوں کے ہمراہ بہ مشکل باپ سے آکر ملا۔

**شیر خاں فولادی کی واپسی** | ان بھاگے ہوئے امیروں نے فتح پور سے کمک پر آنے والے امرار کے ساتھ تپن کے قلعہ کی مرمت کی اور اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مظفر نے اپنے معمولی معمولی سپاہیوں کو بھی بڑے بڑے خطاب عطا کیے اور جاگیروں کا امیدوار بنا کر ان کے عہدے بڑھا دیئے 'خدا کی قدرت کہ ملازمت شاہی میں اسے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا' اب وہ تیس ہزار سپاہیوں کا مالک بن گیا۔ اس نے شیر خاں فولادی کو جو پہلے تپن کا حاکم تھا، اور اب سورت میں نہایت تنگ دستی سے گزند بسر کر رہا تھا بلا بھیجا اور چار ہزار سوار دے کر اسے تپن پر حملہ کے لیے رخصت کیا۔

تپن کے سواروں نے شہباز خاں کے بھائی زمین الدین کنہو کو قطب الدین محمد خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اس طرف سے اور تپن والے اس طرف سے احمد آباد پر حملہ کریں اور مظفر کو گھیر لیں۔ مظفر نے اس کا ردوائی سے پہلے ہی آگے بڑھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بڑودہ میں قطب الدین محمد خاں پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کر کے اسے شکست دی۔ قطب الدین محمد خاں بھاگ کر بڑودہ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اس کے لشکر کے سوار اور ملازم سارے کے سارے مظفر سے جا کر مل گئے۔

اس واقعہ سے پہلے ہی شیر خاں پانچ ہزار سوار لے کر تپن سے پندرہ کوس پر قصبہ میانہ کے نواح میں پہنچ گیا۔ اور شہاب الدین احمد خاں بڑے تذبذب کے بعد جالور کی طرف بھاگ گئے۔ تپن میں صرف نظام الدین احمد رہ گئے۔ ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کی جمعیت دو ہزار سواروں سے زائد نہیں تھی۔ فریقین میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ آخر نظام الدین احمد کو فتح نصیب ہوئی اور شیر خاں شکست کھا کر احمد آباد بھاگ گیا۔ نظام الدین احمد نے بڑے اصرار سے کہا کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس وقت احمد آباد پر

اس وقت احمد آباد پر حملہ کر دینا چاہیے لیکن امراء نے قبول نہ کیا، حالانکہ ان کا مشورہ بالکل درست تھا۔ کیوں کہ شکاریوں کو اس وقت تک قطب الدین محمد خاں کی شکست کی خبر نہیں لگی تھی۔ اس جنگ میں امراء کے ہاتھ کافی مال غنیمت آیا۔ یہ لوگ کرسی جا کر ٹھہر گئے اور بارہ دن تک وہاں لشکر کا انتظار کرتے رہے جو مال غنیمت لے کر تین گیا ہوا تھا۔

**بڑوہہ پر باغیوں کا قبضہ** | اسی اثناء میں خبر ملی کہ مظفر نے قلعہ بڑوہہ کی پرانی دیوار کو توپ اندازی کر کے گرا دیا ہے۔ اور قطب الدین محمد خاں نے زین الدین کو پناہ کا قول نامہ لینے کے لیے مظفر کے پاس بھیج دیا ہے۔ مظفر نے زین الدین کو تو اس وقت قتل کر دیا اور خواجہ محمد صالح سابقہ صدر کو جو اعتماد خاں کے ساتھ متعین ہو کر آئے تھے ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے جج پر جانے کی اجازت دے دی۔ قطب الدین محمد خاں امان پا کر جب قلعہ سے باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ تسلیات بجالایا۔ مظفر نے ملاقات کے وقت اس کی بڑی تعظیم کی اور استقبال کر کے اسے مسند پر بٹھالیا۔ وہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتا تھا، لیکن راج پسیلہ کے زمیندار نواری کے بہکانے سے آخر کار اسے قتل کر دیا۔

پروار سے مظفر نے بھر دھوچ پر فوج کشی کی اور اس قلعہ کو بھی قطب الدین محمد خاں کی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں سے صلح کر کے چھین لیا۔ وہاں مظفر کو کھمبات کا چودہ لاکھ روپیہ جو عماد الدین کوڑی لے آیا تھا اور دوسرا بہت سا ساز و سامان مل گیا۔ قطب الدین خاں کا دس کروڑ سے زائد روپیہ بھی اس کے قبضہ میں آگیا اور اس نے ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب الدین خاں کا راجہ کا نورنگ خاں اور دوسرے تمام مالوہ کے امیر قریب ہی ندر بار اور سلطان پور میں تھے۔ نوننگ خاں نے آگے بڑھ کر اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس فتح سے مظفر کی دھماک بیٹھ گئی۔ اور مغل پٹھان گجراتی بے شمار اس کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔

**مرزا خاں کی لشکر کشی** | جب نظام الدین احمد کو اس کی خبر ملی تو وہ تمام سرداروں کو لے کر تین میں مذکورہ دونوں امیروں سے آکر ملے۔ یہ سب لوگ تین میں مرزا خاں ولد بیرم خاں خانخاناں کا انتظار کرنے لگے۔ جو دربار سے دوسرے امراء کے ساتھ جاتور کے راستہ تین آ رہا تھا۔ مرزا خاں نے آنے کے بعد تین میں ایک دن پڑاؤ کیا اور آگے بڑھ کر سرگنج میں کیمپ لگا دیا۔

مظفر بھی بڑوہہ سے لوٹ کر آیا اور بھر دھوچ پر اپنے سارے نصیر کو اور چرکس رومی کو جو پہلے شاہی لشکر میں تھا متعین کر دیا اور شاہ بھیکن کے مزار کے نواح میں پہنچ کر اپنی چھاؤنی قائم کر دی۔ دوسرے دن دونوں فوجوں میں بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ مظفر شکست کھا کر محمود آباد چلا گیا اور یہ رہائی سید ہاشم بارہہ خضر آتا وکیل اور مرزا خاں نے جیت لی۔ اس جنگ میں بہت سے لے بڑوہہ :- سورت سے ۸ میل پر ہے۔ ہندوؤں کے چند قدیم مشہور اور ایک جامع مسجد تاریخی یادگار ہے۔ یہ مسجد شیخ کی تعمیر ہے۔ اس مسجد میں ایک قرآن شریف ہے جس کا طول ۶ فٹ اور عرض ۳ فٹ۔ تین میں فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر تفسیر لکھی ہوئی ہے اس کا وزن کئی من بنتے ہے۔ اس کی محل بھی گالی بسی چوڑی نادر چیز ہے۔ یہ قرآن اب بمقام محمود باڑی رکھا ہوا ہے۔ ریاست کے شاہی محل میں سونے اور چاندی کی یا نگار تو یہی رکھی ہوئی ہیں جو نوادرات ہیں۔ یہ شہر سورت سے پہلے کا آباد کیا ہوا ہے۔ جب مغل سلطنت کا زوال ہوا ایک شخص پلاچی کا ٹیکوٹا نے محمد شاہ سلطانی کے عہد میں یہاں ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس عہد میں پلاچی مرا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست آگئی۔ آخری فرمانروا صاحبزادہ سیاجی راؤ کا ٹیکوٹا تھا۔ اس ریاست کا رقبہ آٹھ ہزار چالیس مربع میل ہے۔ مردم شماری ۲۲-۲۵ لاکھ رہی ہے۔ شہر آبادی سوالا کہ رہی ہے۔

لوگ زخمی ہوئے۔ غنیمت کے جو لوگ ہلاک ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں۔ یہ واقعہ تیرہ محرم ۱۱۹۱ھ کو پیش آیا۔

میرزا خاں نے فتح پور سے پہلے منت مانی تھی کہ اگر فتح نصیب ہو جائے تو میں اپنا سارا مال و متاع اس کے شکرانہ میں خیرات کر دوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ملازمین کو ہاتھی، گھوڑے، پوشاکیں اور سارے مال و اسباب کی قیمت مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رقم فقرا و مساکین کو تقسیم کر دی جائے۔ بددیانت ملازمین نے ہر چیز کی اس طرح گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی کہ محتاجوں کو چوتھائی بلکہ دسواں حصہ تک نہ مل سکا۔ بلکہ اچھی خاصی رقم ان بد بختوں نے اپنی عیاشیوں میں اڑا دی۔

میرزا خاں کے اکثر ملازم تلقی تھے، جیسے دولت خاں افغان لودی، ملا محمودی اور دوسرے امراء ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے ملازم بنے ہیں کوئی قصور تو نہیں کیا پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بادشاہی ملازمین کے سامنے اس طرح دبے دبے اور حقیر رہیں۔ اور وہ مجلسوں میں ہم پر ہمیشہ اپنی برتری جتلاتے رہیں، تسلیم و تعظیم اور دوسرے درباری مراسم میں ان کو بھی ہمارے مساوی درجہ دیا جانا چاہیے۔ یہ بے سرو پا باتیں مرزا خاں کو بڑی بھلی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے امراء اور سرداروں میں سے ہر ایک کے لیے بھاری پوشاکیں اور گھوڑے تیار کرائے اور تمام امراء کی فہرست تیار کر کے ایک بڑا جشن منعقد کیا اور لباس خانہ میں بیٹھ کر اجلاس کی تیاریاں کرنے لگا۔ نظام الدین احمد کی بہن کسی وقت بیرم خاں خانخاناں کے نکاح میں رہی تھی اس سابقہ رشتہ کی بنا پر اس نے نظام الدین احمد کو بلا کر اس بارے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے نصیحت کی کہ یہ کوتاہ اندیشی تم کو بہکا رہے ہیں۔ اگر بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے۔ جہاں تک تسلیات و کورنش کا معاملہ ہے، بھلا سوچو تو کہ شہاب الدین خاں مرتبہ کے لحاظ سے پنج ہزاری منصب رکھتا ہے اور تم سے عمر میں بھی بڑا ہے۔ اس سے تسلیات کرنا کمان تک زیبا ہے۔ اس طرح اعتماد خاں گجراتی جو کسی وقت میں ہزار سواروں کا منصب دار تھا تمہاری تسلیات بجالائے تو کیا زیب دے گا۔ خود پایندہ خاں مغول بھی اس بات سے صاف انکار کر دے گا اور ممکن ہے وہ کسی جہالت کا ثبوت دے اور خواہ مخواہ بد مزگی پیدا ہو جائے۔ میرزا خاں کو یہ سارے پسند آ گئی اور اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

اس فتح کے تین دن بعد تلچ خاں اور مالوہ کے دوسرے امیر احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظفر معمر آباد و محمود آباد سے جو دریائے مندری کے کنارے ہے کھنیاٹ چلا

## مظفر شاہ کی شکست اور فرار

گیا ہے اور بھاگی ہوئی فوج کے دو ہزار سوار اسکے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ میرزا خاں امراء کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مظفر بڑا دودھ اور پھرواں سے راج پیلہ اور نادوت کی طرف نکل گیا۔ میرزا خاں نے بڑا دودھ پہنچ کر کھنیاٹ پر ایک فوج روانہ کی۔ جس نے مظفر کے سپہاؤں کو شکست دے کر کھنیاٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد میرزا خاں نے نادوت کی طرف پیش قدمی کی اور تلچ خاں اور دوسرے امیروں کو وسطی کوہستان پر جہاں مظفر پناہ گزیں تھا حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ ساری لڑائیاں نظام الدین احمد کی بدولت جیتے گئیں۔ شاہی فوج ساز و سامان سے لڑی پھندی رہتی تھی۔ اس کے لیے تیزی سے نقل و حرکت کرنا دشوار رہتا تھا۔ نظام الدین احمد نے امراء کے حوصلے بڑھائے اور خود بھی اپنے عہدہ سے بڑھ کر کارگزاری دکھائی۔ ان کی کوشش و استقامت تھی کہ مظفر کے ساتھ لشکر نے سرگنج کی پہلی سخت لڑائی جیت لی تھی اور اب مظفر ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔

میرزا خاں احمد آباد کو لوٹ آیا اور مالوہ کے لشکر کو اس نے قلعہ بھروچ کے محاصرہ پر متعین کر دیا۔ بھروچ پر مظفر کی طرف سے

چرکس رومی حاکم تھا سات ماہ بعد وہ مارا گیا اور منظر کا سالانہ نصیر فرار ہو گیا۔

**اکبر کی الہ آباد کو روانگی** | اسی سال مرزا خاں اور مالوہ کے لشکر کو گجرات پر متعین کرنے کے بعد بادشاہ نے بذریعہ کشتی الہ آباد کی سیر کا ارادہ کیا۔ الہ آباد قدیم شہر پانگ کی جگہ نیا آباد کیا گیا تھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی قدیم پرستش گاہ ہے۔ وہاں بادشاہ نے قلعہ کی بنیادیں بھی رکھوائی ہیں۔

جس دن بادشاہ رخصت ہونے والے تھے، مکہ معظمہ سے شیخ سلیم ہشتی کے صاحبزادہ شیخ بدر الدین کے انتقال کی خبر پہنچی کہ انہوں نے سات دن کا روزہ رکھا ہوا ہے اور جلتی دھوپ میں تنگے پر طواف کر رہے تھے۔ جس سے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اور عین عید قربان کے دن ۹۹ھ میں اللہ کے راستہ میں جان دے دی۔ بادشاہ نے شیخ کی خانقاہ کے خادم حاجی حسین کے ذریعہ ان کی وفات کی اطلاع بھجوائی۔ جس سے ان کے خاندان میں واویلا مچ گیا۔ اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے۔ ان پر رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

**راجہ رام چند کی طاعت** | الہ آباد پہنچنے کے بعد بادشاہ نے وہاں چار مہینے تک قیام فرمایا۔ یہاں سے زرین خاں کو کہ طاعت قبول کر لی اور زرین خاں کو برسی خاطر داری کے ساتھ روک لیا۔ پھر اس کے ہمراہ فتح پور میں آکر اس نے دربار شاہی میں باریابی حاصل کی۔ اور ایک سو بیس قیمتی نعل و جواہر جن کی قیمت پچاس ہزار روپیہ ہوتی تھی نذرانے میں دیئے۔ اپنے بیٹے بابو ہانی کو خدمت شاہی میں چھوڑ کر کچھ عرصہ بعد وطن لوٹنے کی اجازت حاصل کی۔ واپسی کے چند دن بعد ہی وہ فوت ہو گیا۔

رام چند نہایت خوش اخلاق اور فیاض راجہ تھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس کی بخششوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کروڑ کا سونا ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاؤنت کو عطا کر دیا۔ ہم ذکر کرتے ہیں کہ اس نے ابراہیم سوہر کو بادشاہی کا کتنا کچھ سازو سامان تیار کر کے دیا تھا۔ میاں تان سین تو اس کے پاس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر جلال خاں قوری بڑے وعدہ و وعید کر کے اسے اپنے ساتھ واپس لایا۔

انہی دنوں میں حاجی پور سے اعظم خاں یلغار کرتے ہوئے الہ آباد پہنچا۔ لیکن اپنے لشکر کو لانے کے لیے بہت جلد واپس چلا گیا۔ امرائے شاہی نے الہ آباد میں شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بندوبست کیا اور یہ طے پا گیا کہ آئندہ اس شہر کو پائے تخت بنایا جائے، نیا سکہ جاری کیا جائے۔ اور اس کے لیے شریف سرمدی چوکی نویس نے صحیح کا یہ شعر نکالا تھا ہے

ہمیشہ چوں زرخور شہید و ماہ رائج باد

بشرق و غرب جہاں سکے الہ آباد

کسی دل جلے نے شریف سرمدی کے متعلق یہ شعر کہا تھا ہے

دو چوکی نویسندہ ہر دو کشف

یکے نا نفیس و دگر نا شریف

انہی دنوں ملا المداد امر وہر اور ملا شیر می جو دو آب پنجاب کی صدارت کے عہدہ پر مامور تھے۔ الہ آباد آکر حاضری دیا ہوئے

ملاشیری نے بادشاہ کی خوشامد میں ہزار شعاع کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی۔ بادشاہ کو بہت پسند آئی۔

**بادشاہ کی فتح پور کو واپسی** | اسی سال ماہ ذی الحج میں گجرات کی بغاوت کے تدارک کے لیے الہ آباد سے فتح پور واپسی ہوئی۔ اٹاواہ کے نواح میں میرزا خاں کی فتح کی خبر پہنچ گئی۔

بادشاہ دارالخلافہ کو ماہ صفر ۱۱۹۷ھ میں لوٹ کر آئے اور گجرات کے امیروں کے نام خوشنودی کے فرمان جاری کیے گئے میرزا خاں کو خانخانان کا خطاب گھوڑا خلعت مرصع خنجر سرداری کے لوازمات اور سب سے بڑا پانچ ہزاری کا منصب عطا کیا گیا نظام الدین احمد نے بھی اس ہم میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اس لیے ان کو بھی گھوڑا خلعت اور منصب میں ترقی دی گئی۔ دوسرے اہلکار کے منصبوں میں بھی دس بیس اور دس تیس کا حسب مدارج اضافہ کیا گیا۔

**رامائن کے ترجمہ کا حکم** | اسی زمانہ میں بادشاہ نے مجھے ”رامائن“ کے ترجمہ کا حکم دیا جو بہ لحاظ تصنیف و عبارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں ۲۵ ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک ۶۵ حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔

رامائن میں اودھ کے راجہ رام چندر جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے کی داستان ہے۔ ہندوؤں کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اٹھ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لتکا کے جزیرہ پر راون نامی دس سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا۔ وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لتکے گیا۔ رام نے اپنے بھائی بھمن کے ساتھ اس جزیرہ کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور دیچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر چار کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض بندروں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلہ کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ غرض ایسی بہت سی خرافات اس میں درج ہیں۔ بہر حال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتہ تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل و عیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لتکا کو راون کے بھائی کے حوالہ کر کے اپنے شہر واپس آ گیا۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندوستان پر دس ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا قدیم ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور اس کی کوئی مدت انسانوں سے خالی نہیں گزری۔ عالم کے وجود میں آنے پر لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔ وہ آدم ابو البشر کے قائل نہیں ہیں۔ جن کو گندے سات ہزار سال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے رامائن کے یہ واقعات صحیح نہیں۔ محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنوں کے اقتدار کے زمانہ میں گزرا تھا۔

**تبدیلی جنس کا واقعہ** | ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانہ میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ رامائن کا ایک ترجمان بھی دفن کتابت سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آ کر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم سے چہرہ چھپا رکھا تھا اور بات نہیں کر رہی تھی۔ حکیموں نے اسکی تائید و تصدیق میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہے ہیں۔

لے رامائن: سنسکرت سے قدیم کتاب ہے۔ جو بامیک رشی کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اس کا بڑا درجہ ہے۔ آریوں کی تاریخ کا قدیم ماخذ ہے۔



اسی سال ملا عالم کابلی جو نہایت شیریں گفتار عالم خوش بیاں اور باغ و بہار آدمی تھے، وفات پا گئے۔ ان کی تصنیف ”فواج الولایۃ“ ہے۔ ان کی تاریخ وفات ”اشعث طباع“ نکالی گئی۔

**انتیسواں سن جلوس** | اس سال آٹھویں ماہ ربیع الاول ۱۰۹۲ھ میں آفتاب واقع ہوا۔ اور نوروز جلالی کے دن جلوس شاہی اور نوروز سلطانی کا انتیسواں سال شروع ہو گیا۔ جشن نوروز بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ دکانوں مکانوں کی آرائش کی گئی۔ طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوئیں، سامری کے گوسالہ کی طرح کانٹے کی گائے کا ایک ناقوس بنا کر بجا گیا۔ غبارے جو فرنگیوں کی ایجاد ہیں اور جو کپڑے سے گیند کی شکل کے بنائے جاتے ہیں پھونکے گئے۔ اس مرتبہ دس دس آدمیوں کی تکراری خدمت شاہی میں باریاب ہوتی تھی۔ یہ لوگ اکبر کی مریدی اختیار کر کے نئے دین میں داخل ہوتے تھے۔ شجرہ کے بجائے اکبر ان کو اپنی تصویر اخلاص اور رشد و ہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا۔ اکبر نے پگڑی پر جواہرات سے مرصع ایک سرپیچ باندھ رکھا تھا۔ فرامین کے سرنامے کے لیے ”اللہ اکبر“ کا کلمہ تجویز کیا گیا۔ اس سال مجوا اور سود حلال کر دیئے گئے۔ اسی طرح اور دوسری ممنوعات بھی جائز قرار دے دی گئیں۔ اکبر نے دربار میں ایک جواخانہ بھی بنوایا، جواہریوں کو شاہی خزانہ سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا تھا۔ اس طرح بادشاہ کی دولت میں اضافہ کی ایک سورت نکل آئی۔ چودہ سال سے کم عمری کی اور سولہ سال سے کم عمری کے کی شادی کی ممانعت کر دی گئی حضور اکرم اور حضرت عائشہ کے (جن کا کم عمری میں عقد ہوا تھا، زفاف کے قصہ سے اکبر نے صریحاً انکار کر دیا۔ پیغمبران کرام سے خدا کی جناب میں جو لغزشیں ہوئیں۔ مثلاً داؤد علیہ السلام اور ایساہ کا قصہ وغیرہ وہ سب اس مطلقاً انکار کے لیے اچھا خاصہ ہاتھ بن گئیں۔ اکبر جسے اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اسے لائق قتل مردود و نابکار سمجھتا تھا ایسے شخص کو فقیہ اور دشمن سلطنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ تاہرہ ہے ہر شخص کو وہی کا شمار ہوتا ہے جو کچھ اس نے بویا تھا۔ دوسرے مردود و نابکار کیا ہوتے۔ خود حضرت سلامت سائے زمانہ میں گمراہ اور اکفر مشہور ہو گئے۔ اور ان کے مرشد و مجتہد ابو الفضل، کو ”ابو جہل“ کا لقب ملا۔ غرض دنیاوی سلطنت اب دین الہی کے زیر تسلط آ گئی۔ اور اکبر اپنے دین کے معاملات کو امور سلطنت سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگا۔ عزت و ناموس کی بربادی کے لیے نوروزی کی دکانوں دینا بازار کو کبھی کبھی مردوں سے خالی کر دیا جاتا تھا۔ اور بیگیاں اہل حرم اور خاص و عام پردہ نشین عورتوں کو سیر و تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس میلہ میں بادشاہ لوگوں کو روپیہ پیسہ العام دیتے تھے۔ باہر سے آنے والی عورتوں کے قنبیے بھی طے کیے جاتے تھے اور رد کوں رد کیوں کے نکاح بھی کرائے جاتے تھے۔

لے ملا عالم کابلی۔ نہایت پر مذاق خوش کلام خوش ادا آدمی تھا۔ عبادت خانہ کے چار ایوان میں ان کے لطائف و ظرائف پر اہل جلسہ لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ تحریریں بھی بھی ظرافت تھی۔ ”فواج الولایۃ“ کے نام سے مشائخ اور ایسے ہند کے حالات میں ایک بڑا ذخیرہ مرتب کیا تھا اس میں مجاور خادم بھیک منگوں تک کا حال لکھ دیا مسوے بن سے یہاں بھی باز نہ آئے۔ کتاب کے نام پر ”دروہا کر لکھا“ و ”فواج الولایۃ“ لوگوں نے پوچھا صاحب یہ اور سے کیا مطلب اس کے پہلے کونسا علم ہے۔ جواب دیا بیان کیا ضرورت دوسرا نام اس میں چھپا ہوا ہے اور وہ ہے ”فواج الولایۃ“۔ ”مغل ہار“ کابل کا ایک موضع ان کا وطن تھا۔ اس تعلق سے پہلے بارہا تخلص کیا بعد میں درجی۔ اس کی کتاب ”سلسلۃ الذهب“ کے جواب میں مزاحیہ اشعار کہہ کر اس کے مجموعے کا نام ”سلسلۃ البحر“ رکھ دیا۔ ملا بدایونی یہ جو تاریخ ”اشعث طباع“ نکالی اسی میں بھی ایک بصرہ لکھ دیا۔ عرب میں ایک شخص اشعث نامی تھا وہ دعوتوں میں بن بلائے چلا جاتا تھا۔ اسے طفیل الاعراس کہتے تھے۔ اس چٹور پن کی وجہ سے ”اشعث“ طاع کے نام سے مشہور تھا۔ بدایونی نے وزن ملا کر ”اشعث طباع“ تاریخ نکالی اور ایک لطیف چوٹ کر گئے۔



رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو وداع کیا۔ غازی خاں سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اسی سال سلطان خواجہ بھی فوت ہو گیا۔ وہ اکبر کے مریدان خاص میں شامل تھا۔ اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کرایا گیا تھا جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی کیوں کہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے۔ کہتے ہیں اس کے منہ کو آگ سے جھلسایا بھی گیا تھا۔

ملا احمد ٹھٹھ بھی مر گیا۔ اس کی تاریخ ”سلطان الخوارج“ ہے۔ اس میں ایک عدد کی کمی ہے۔

**میرزا شاہ رخ کی آمد** | سنہ ۹۹۳ھ کے آغاز میں جب کہ تیسویں جلوس کا اختتام تھا، میرزا شاہ رخ اور راجہ بھگوان داس فتح پور کے قریب پہنچ گئے۔ اکبر نے شہزادہ دانیال کو شیخ ابراہیم ہشتی اور دوسرے امراء کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ اسے بارگاہ میں لے کر آئے۔ بادشاہ نے میرزا کو ایک لاکھ روپیہ نقد فراش خانہ کا سامان، تین عراقی گھوڑے، پانچ ہاتھی اور چند اونٹ اور خچر اور ملازم مرحمت فرمائے۔

**شہزادہ سلیم کی شادی** | انہی دنوں بادشاہ نے اپنے مقررہ طریقہ پر شہزادہ سلیم کو سولہ سال کی عمر میں راجہ بھگونت داس کی روٹی سے بیاہ دیا۔ خود بادشاہ سلامت کی سواری اس کے گھر پر گئی۔ اور عقد قاضیوں اور شہنشاہ کی محفل میں منعقد ہوا۔ دو کروڑ تک مہرباندھا گیا اور ہندوؤں کی تمام رسمیں جیسے آگ جلانا وغیرہ انجام دی گئیں۔ دہلی کے گھر سے دولت خانہ شاہی تک دہلی کی پالکی پر سے بادشاہ نے سونا نچھا اور کرایا۔

راجہ بھگونت داس نے چند گھوڑے اور قسم قسم کے جواؤ سونے کے زیور اور جواہرات سونے چاندی کے برتن طرح طرح کے بے حد و شمار کپڑے جہیز میں دیئے۔ امراء شاہی کو بھی اس نے ہر ایک کے حسب حال عراقی، ترکی اور عربی گھوڑے سنری زین کس کر بطور ہدیہ دیئے۔

**تیسواں سن جلوس** | بروز جمعرات ۱۹ ماہ ربیع الاول سنہ ۹۹۳ھ کو موسم بہار کا آغاز ہوا۔ نوروز سلطانی کے دن آگئے۔ میرزا نظام الدین احمد نے جو سن وار ترتیب سے تاریخ لکھی ہے۔ اس نوروز کے متعلق لکھا ہے کہ ”جلوس کا تیسواں سال شروع ہو گیا“ حالانکہ جلوس کے دوسرے قرن کا آغاز ۲۵ ربیع الاول سنہ ۹۹۳ھ میں بمقام انک بنارس ہوا تھا، جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس صورت میں یہ تیسواں جلوس کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہاں میرزا سے بھول ہو گئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایام کبیہہ کی وجہ سے قمری کے ہر تین سال پر ایک مہینہ کافرق پڑ جاتا ہے اور ہر قرن پر شمسی اور قمری سنوں میں ایک سال کافرق ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ تقویم نہیں ہے۔ اس لیے میں نے مجبوراً میرزا ہی کی پیروی کی ہے۔ اس کی ذمہ داری میرزا پر ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان برسوں میں میرزا گجرات میں تھے شاہی لشکر میں نہ تھے۔

مگر میں یہ کہ حسب سابق جشن نوروز کی آرائش و زیبائش کی گئی اور بڑا شاہانہ جشن منعقد ہوا۔ ہر روز بڑی بڑی ضیافتیں ہوئیں دینا بازار، نوروزی کی دکانوں سے جو امراء لگا پا کرتے تھے ہر دکاندار نے بھاری بھاری نذرانے گزرائے۔ سب کے کھانے، عطر اور اہل طرب کے انعامات کا خرچ شاہی خزانہ سے ادا کیا گیا۔ حسب الحکم پچ ہزاری سے لے کر امدی تک ہر چھوٹے بڑے نے پیش کش اور نذرانے خدمت میں گزارے۔ مجھ حقیر نے بھی کہ میری حیثیت ذرہ ناچیز سے بڑھ کر نہ تھی۔ لیکن ہزار بجگہ زمین کی وجہ سے ہزار ہا

سمجھا جاتا تھا یوسف علیہ السلام کو خریدنے والی بڑھیا کی طرح چالیس روپیہ کی تدریسی جسے بادشاہ نے قبول فرمایا۔ اس جشن میں بڑے شہزادہ کو بارہ ہزاری کا منصب ملا۔ ان سب کو فراش خانہ، علم و سراپردہ، نقارہ وغیرہ بھی مرحمت ہوئے۔ اس سال کے شروع میں دکن میں متعینہ امیر میر تقی اور خداوند خاں نے براہ کے علاقہ سے نظام الملک کے پائے تخت احمد نگر پر حملہ کیا تھا۔ انہیں نظام الملک کے وزیر صلابت خاں نے شکست دے دی تھی۔ وہ وہاں سے بھاگ کر برہان پور میں راجہ علی خاں کے پاس چلے گئے تھے۔ راجہ علی خاں نے ان کے سارے ہاتھی، گھوڑے چھین لیے تھے انہیں سے ڈیڑھ سو ہاتھی اس نے اپنے رو کے ابراہیم خاں کے ساتھ دربار میں بھجوا دیئے تھے۔ جشن نوروز کے موقع پر خود راجہ علی خاں بقیہ گھوڑے لے کر دربار میں آیا اور اکبر کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اسکی فرمائش پر بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو جسے بعد میں میر فتح اللہ کا نام دیا گیا تھا، عضد اللہ کا خطاب مرحمت فرمایا اور پانچ ہزار روپیہ گھوڑا اور خلعت عطا کی۔ ہندوستان کا صدر کل بنا کر دکن کی مہم پر مامور فرما دیا۔ اسکے ساتھ خان اعظم شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امرابھی متعین کیے گئے۔ اسکے غیاب میں اس کے ایک ملازم کمالائی شیرازی کو اماموں کے معاملات کو پیش کرنے کے لیے اس کا نائب مقرر کیا گیا۔ اس کے تقرر سے صدارت کا عہدہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا۔ آخریہ معاملہ اس حد پر پہنچا کہ شاہ فتح اللہ کو باوجود اس عزت و اقتدار کے کسی امام کو پانچ بیگہ زمین بھی دینے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ ساری کی ساری زمینیں واپس دے کر بحث ضرور کرتا رہتا تھا۔ مدد معاش کی جتنی زمینیں بازیافت کر لی گئی تھیں وہ ساری کی ساری تباہ ہو گئیں۔ نہ ائمہ اس سے مستفید ہو سکے نہ رعایا۔ امانوں اور معاش داروں پر جو مظالم ہوئے وہ ان تمام صدور کے نامہ اعمال میں باقی رہیں گے۔ جن کے اب نام تک باقی نہیں رہے ہیں۔

ماہ رجب ۹۹۳ء میں کابل سے خبر آئی کہ مرزا سلیمان اوزبکوں سے شکست کھا کر بدخشاں سے میرزا محمد حکیم کے پاس کابل آ گیا تھا اور اسلواتامی ایک موضع کی جاگیر پر مہر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا۔ پھر اس نے قبائل کو اکٹھا کر کے بدخشاں کی سرحد پر اوزبکوں سے مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی، بہت سے اوزبک اس لڑائی میں مارے گئے۔ جو اسیرین کر آئے ان کو میرزا نے خلعت و انعام دیکر رہا کر دیا۔

۱۰۰۰ء احمد نگر۔ احمد نظام شاہ بھری نے ۹۹۹ء میں اسکی بنیاد ڈالی تھی۔ ڈیڑھ سو برس تک نظام شاہی خاندان کا مرکز رہا۔ ۱۰۱۱ء میں شاہ جہان نے اس پر قبضہ کر کے شاہی عمارتوں کو منہدم کر دیا۔ اٹھارویں صدی میں حیدر آباد کے نظام الملک آصف جاہ کا قبضہ ہوا، بعد میں مرہٹے اس پر قابض ہو گئے، ۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اس کی آبادی ۴۰ ہزار تک پہنچ۔ باشندوں کی زبان مرٹی ہے۔ اس کو چاندنی کا ٹکڑی بھی کہتے ہیں۔ یہاں کی ایک مسجد میں ہندوؤں نے کتب خانہ قائم کر رکھا ہے۔ مشرقی جانب حسین نظام شاہ بھری کا بنایا ہوا قلعہ ہے جس میں چاندنی نے آخر وقت تک مغلوں کا مقابلہ کیا۔ شہر سے چار میل پر عالم گیر کی درگاہ ہے۔ کہتے ہیں باب عالم گیر ۱۱۱۱ء میں فوت ہوا تو اسے اسی جگہ فصل دیا گیا تھا۔ اس کی میت یہاں سے اورنگ آباد بھیجی گئی۔

۱۰۱۱ء برہان پور۔ دریائے تاپتی کے کنارے واقع ہے۔ خاندان کے فرمانروا نصیر خان فاروقی نے ۱۰۱۱ء میں اسکی بنیاد رکھی۔ دو سو برس تک یہ خاندان کی دار السلطنت رہا۔ ۱۸۱۹ء میں انگریزوں نے اسکی سلطنت مغلیہ کا ضمیمہ بن گیا۔ شاہجہان نگر میں مثل فوج کی بڑی چھاؤنی رہی۔ ۱۸۱۹ء میں مرہٹوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۱۹ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اب یہ تیس چالیس ہزار کی آبادی کا مختصر سا شہر ہے۔ جامع مسجد قدیم یادگار ہے جو عادل شاہ فاروقی نے ۱۸۱۹ء میں تعمیر کرائی تھی۔ اس پر انگریزوں نے کتب خانہ کا ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ برہان پور میں مثل مہد کا ایک دائرہ رکس ہے۔ جس کے ذریعہ تاپتی کا پانی شہر میں لوگوں کے ذریعہ پھایا جاتا تھا۔ اسی طرح ترک حمام کی عمارتیں بھی قابل دید ہیں۔ یہاں شیخ نظام الدین حسینی ۱۰۱۱ء کا مزار مرجع خاص و عام ہے۔ اسیر کا قدیم قلعہ جسے اسیر گڑھ بھی کہتے ہیں۔ برہان پور سے ۶ میل دور ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔

اور اپنا ملک دوبارہ حاصل کر لیا۔

**گجرات میں دوبارہ بغاوت** | ماہ شعبان میں حسب الحکم شاہی خان خاناں گجرات سے فتح پور آیا ہوا تھا۔ اس کے گجرات میں پہلے پھرتے ہی مظفر نے دوبارہ عظیم بغاوت بلند کر دیا۔ مظفر کو جونا گڑھ کے حاکم جام امین خاں نے قوری سے بڑی شکایات تھیں۔ اس نے باغیوں کو اس نے منہ کی کھا دی تھی اس لیے اس بار اس نے بڑھ کر قلعہ جونا گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ جونا گڑھ آباد میں حفاظت و ناکر بندی کے لیے صہرا۔ باؤر مظفر کی سرکوبی کے لیے نظام الدین احمد گجرات کے امیروں کو ساتھ لے کر مقابلہ پر پہنچے۔ مظفر شاہی لشکر سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر دریائے زن کو عبور کر کے کچھ میں چلا گیا۔ یہ دریا سمندر سے دس کوس اور تیس کوس کے فاصلہ پر ہے۔ جیسلمیر کے ریگستان میں داخل ہوتا ہے۔ اور اسی ریگ زار میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں نظام الدین احمد نے گجرات سے میرے نام خط بھیجا تھا کہ "خان خاناں نے یہاں سے جاتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ اس بار وہ بادشاہ سے اجازت لے کر تم کو اور ملا الداد کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم حسب مراتب خان خاناں سے مل لو اور وہاں سے رخصت لے کر یہاں آ جاؤ۔ گجرات کی سیر نہایت دلچسپ رہے گی۔"

اس خط کے بموجب میں خان خاناں سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا۔ صرف ایک بار جب کہ میں دولت خانہ شاہی سے متعلقہ کتب خانہ میں جہاں ترجمہ کے کام پر میں لگا ہوا تھا جا رہا تھا تو خان خاناں سے سربراہ ملاقات ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ ہمت جلد گجرات سے کوٹ گیا۔ پھر کابل کے قبیضہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے گجرات جانے کے لیے رخصت لینے کا موقع نہ ملا اور وہ ارادہ جسے میں نے اپنی نجات اور بہتری کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا پورا نہ ہو سکا۔

خان خاناں فتح پور سے رخصت ہو کر جب سروہی سے دس کوس پہنچا تو اس نے سروہی اور جالور پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ نظام الدین احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید قاسم بارہ بھی اپنی ساری جمیعت کو لے کر استقبال کے لیے آ گیا۔ خان خاناں کی فوج کشی کی خبر سن کر سروہی کا راجہ بھاری پیش کش لے کر حاضر خدمت ہو گیا۔ غزنین خاں جالور بھی اس مرتبہ ملاقات کے لیے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا۔ لیکن جس وقت خان خاناں دربار کے ارادہ سے کوچ کر رہا تھا تو اس سے کوئی ناپسندیدہ حرکت سرزد ہو گئی تھی۔ اور اب اس کے باغی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے خان خاناں نے اسے قید کر دیا اور اپنے ساتھ احمد آباد لے کر چلا گیا۔ جالور کی جاگیر اس سے لے کر اپنی فوج کو وہاں متعین کر دیا۔

**معاشقہ کا انجام** | سید محمود بارہ کے پوتے سید جمال الدین کو چند سال پہلے شاہی طرب خانہ کی ایک حسین لطائف سے جس کا نام بھی معاشقہ کا انجام تھا اور اب تو وہ چڑیل سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے عشق ہو گیا تھا، اس عشق بازی کا بھانڈا پھوٹا تو وہ لڑکھوایا سے کوہستان میں بھاگ گیا۔ وہاں اس نے اپنی ایک ٹول بنالی اور وہ سرکاری علاقہ میں ٹوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ کوہستان سے اپنے چچا سید قاسم کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ خان خاناں نے حسب فرمان اس کو سید قاسم کی جاگیر تین سے بلوا کر قید کر لیا۔ پھر اس کو غزنین خاں کو لاہور بھیج دیا گیا۔ غزنین خاں کی شادی میاں محمد و قاضی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس کے سالے میاں فتح علی شریقی کا لحاظ کر کے اسے معاف کر دیا اور وہ دوبارہ ملازمت شاہی سے وابستہ ہو گیا۔ لیکن سید جمال الدین غائب سے بچ نہ سکا۔ اسے پھانسی پر چڑھا کر تیروں سے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ عشق بازی کا روگ آخر اس کی جان لے کر ہی ملا۔



انک بنارس سے راجہ مان سنگھ اور خواجہ شمس الدین کا عریضہ پہنچا کہ کابل میں مرزا محمد حکیم سخت بیمار اور  
 فراس ہے۔ پشاور سے فریدوں ایک قافلہ لے کر کابل کی طرف گیا تھا۔ جب وہ کوتل خیبر پر پہنچا تو وہاں  
 اس کا مقابلہ روشن محلہ کے روکے سے ہو گیا۔ روشن محلہ اس علاقہ میں تھوڑا بہت عقل مند آدمی سمجھا جاتا ہے۔ اب تو وہ روشن نہیں  
 بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ فریدوں خیبر پر شکست کھا کر پشاور واپس چلا آیا۔ اتفاق سے جب وہ پشاور پہنچا تو وہاں کے قافلہ  
 میں آگ لگ گئی اور سوداگروں کا ایک ہزار اونٹوں کا لداؤ مال جل گیا۔

اسی اثنائے میں یہ خبر بھی ملی کہ عبداللہ خاں اوزبک نے دوبارہ ایک کثیر فوج بھیج کر بدخشاں پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور مرزا  
 سلیمان کو وہاں سے بے دخل کر کے اس کے سارے مال و اسباب پر قابض ہو گیا ہے۔ میرزا سلیمان اس کے مقابلہ کی تاب نہ لاکر  
 دوبارہ کابل لوٹ آیا ہے۔

اس کے ساتھ کابل سے ایک اور خبر آئی کہ میرزا محمد حکیم کثرت شراب نوشی سے طرح طرح کے امراض میں  
 گرفتار تھا۔ چنانچہ رشتہ کے عارضہ میں ۱۲ شعبان ۱۲۹۷ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر تیسری ماہ رمضان المبارک کو ملی تھی، بادشاہ کو کابل اور غزنی کی حفاظت  
 کی بڑی فکر پڑ گئی۔ پہلے خیال تھا کہ یہ علاقہ میرزا محمد حکیم کے لوگوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن امر  
 نے عرض کیا کہ مرزا کے روکے خود سال ہیں، وہ وہاں کا نظم و نسق سنبھال نہیں سکیں گے، اس لیے بادشاہ نے خود وہاں جانے کا عزم  
 کیا۔ خان خاناں کے نام گجرات جلد پہنچ جانے کا فرمان صادر کیا گیا۔ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں دکن کی ہم کے لیے نامزد کیے  
 باچکے تھے۔ عبداللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی ہم کے انتظام کے لیے مالوہ اور رائیسین میں ان امراء کے پاس چلا جائے۔ ان انتظامات  
 کے بعد بادشاہ نے پنجاب کی طرف کوچ کر دیا۔ شوال کا چاند دہلی میں دیکھا گیا۔ پانی پت پہنچے تو وہاں سے میرا بوالغیث بخاری کو  
 صحنو کے نواح میں جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔ اس ماہ کی انیس تاریخ کو تلچ کے کنارے کیمپ لگایا گیا۔

انہی دنوں شیخ جمال بختیار اور شیخ الاسلام کا پوتا خواجہ اسماعیل جو نہایت حسین و خوب روش شخص تھا اور کثرت عیاشی کی وجہ  
 سے بیمار تھا، ایک ہفتہ کے فرق سے یہ دونوں انتقال کر گئے۔ ایک کی وفات لدھیانہ میں ہوئی اور دوسرے کی تھانیس میں۔ خواجہ اسماعیل  
 تلچ کے نواح میں دفن ہوئے۔

سیالکوٹ سے تین کوس کی مسافت پر ملا الداد امر وہرہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سینہ پر ایک داغ پڑ گیا تھا اور اس کی پیش  
 آنکھ سے کچھ گئی تھی۔ اسے حکیم حسن نے ایک مسہل دیا تھا اسی دن وہ فوت ہو گیا۔ بڑا اچھا دوست تھا جو بچھڑ گیا۔

لاہور کے نواح میں جب منزل ہوئی تو صادق خاں کو بکر کی حکومت پر مامور کیا گیا۔ تیرہ ذی قعدہ کو لشکر پنجاب کے کناٹے پہنچ گیا  
 مرزا محمد حکیم اکبر کا سوتلا بھائی تھا چھ ماہ چوپک ٹیم کے بطن سے تھا جو شاہی خاندان کی عورت نہیں تھی، کینزوں کا درجہ تھا۔ بھائیوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔

حکیم کا ذکر اس سے پہلے ایک حاشیہ میں آچکا ہے۔ مرزا حکیم نے ۳۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔

سیالکوٹ:- یہ شہر راجہ ساہی کا بسایا ہوا ہے جو تین بیج کا ایک مشہور راجہ گزرا ہے۔ یہاں تلہ اور مندر کے قدیم کمندرات موجود ہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں  
 قمر کو اور مشہور شہر ہے۔ اب کھیلوں کے سامان اور کاغذ سازی کے لیے مشہور ہے۔ مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی مشہور مصنف گذرے ہیں ان کا انتقال ۱۲۹۷ھ  
 میں ہوا تھا۔

میر ابو الغیث اور شیخ محمد بخاری کا مصاحب شیخ عبدالرحیم لکھنوی خان زماں کے زوال کے بعد دربار میں آگیا تھا اور امارت کا منصب پر فائز تھا۔ اسے بادشاہ نے کوہستان میں پرگنہ چھان کی جاگیر عطا کی تھی۔ ان دنوں جنوں کے عارضہ میں مبتلا تھا چناب کی تہ میں اس نے حکیم ابوالفتح کے خیمہ میں اپنے آپ خنجر مار دیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے سیالکوٹ میں بہ حفاظت رکھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ صحت یاب ہو گیا، لیکن اس کی دیوانگی اسی طرح باقی رہی۔

اسی ماہ کی ۲۰ تاریخ کو دریائے بیت کو عبور کیا گیا۔ اسی منزل میں محمد علی خزانچی جو کابل میں متعین تھا حاضر خدمت ہوا اور اطلاع دی کہ میرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد اس کے رہ کے فریدیوں خاں، کیقباد اور افراسیاب جو کم عمری کے سبب سلطنت کی اہلی نہیں رکھتے تھے، امراء کے ساتھ مان سنگھ کے پاس پہنچا دیئے گئے تھے۔ مان سنگھ نے اپنے رہ کے کو خواجہ شمس الدین خوانی کے ہمراہ کابل میں چھوڑ دیا ہے۔ اور میرزا کے تمام آدمیوں کو تسلی و اطمینان دے کر اپنے ساتھ بارگاہ میں لے آیا ہے۔

پانچویں ماہ ذی الحج کو قصبہ پنڈی میں جو اٹک، بنارس اور رہتاس کے درمیان ہے منزل کی گئی۔ یہاں مان سنگھ میرزا کے رہ کوں اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہو گیا۔ بادشاہ ان سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور لائق حال ملال اور خرچ مرحمت کیا۔

اٹک بنارس کے نواح سے شاہ رخ میرزا راجہ بھگونت داس اور شاہ قلی خاں محرم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر فتح کرنے کے لیے رخصت کیا گیا۔ اسی دن اسماعیل قلی خاں اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں کی سرکوبی کے لیے اور زین خاں کو ایک آراستہ فوج دے کر سواد اور بھوڑ کے پٹھانوں پر فوج کشی کے لیے روانہ کیا گیا۔

**روشنائی قبیلہ پر فوج کشی** | یکم محرم ۱۰۹۵ کو اٹک بنارس میں چھاؤنی لگائی گئی۔ ۲۵ سال پہلے ایک ہندوستانی سپاہی پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا، اس نے وہاں پیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنالیا تھا۔ اور پٹھانوں میں اتحاد و بے دینی پھیلا رہا تھا۔ ایک کتاب بھی خیر البیان کے نام سے لکھی تھی۔ جس میں مفصل عقائد درج کر رکھے تھے۔ بعد میں انہی پٹھانوں میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کا ایک رہ کا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر میں جبکہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، خدمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ عنایت آمیز سلوک کیا تھا لیکن اپنی موروثی بدعت کی وجہ سے وہ شاہی لشکر سے بھاگ کر دوبارہ پٹھانوں کے قبیلہ میں چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک بڑا

مخلوق کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندوستان اور کابل کا راستہ بالکل مسرود ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقہ نے بڑا زور باندھ رکھا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی سرکوبی میں دے دیا تاکہ وہ ان سرکشوں کا بخوبی قلع قمع کر دے۔

اس سال کے ماہ صفر میں سعید خاں کھوکھر بیر بلتون، شیخ فیضی اور فتح احمد شریقی اور دوسرے چند امراء کو زین خاں کو ملکہ کے لیے روانہ کیا گیا۔ چند دن بعد ہی حکیم ابوالفتح اور امراء کی ایک اور جماعت کو پہلی ملکہ کے پیچھے ہی رخصت کیا گیا۔ یہ فوجیں پٹھانوں سے جا کر مل گئیں اور ان سبھوں نے مل کر پٹھانوں پر سخت حملے کیے۔ ان کے علاقے پامال کر کے مردوں، عورتوں، بچوں کی ایک بڑی

لے موجودہ راولپنڈی اسی جگہ آباد ہے۔

عبدالاد کو اسیر بنایا گیا۔

ایک رات کسی شخص نے بیربر کو آکر اطلاع دی کہ ”پٹھان آج رات شب خون مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر  
بیربر کی ہلاکت | تم اس تنگ گھاٹی کو جو تین چار کوس سے زیادہ مسافت کی نہیں ہے جلد طے کر کے نکل جاؤ تو خطرہ سے باہر  
جاؤ گے۔“ اس وقت شام سر پہ آچکی تھی، بیربر نے اپنی خود سری اور خود پسندی کی وجہ سے زمین خاں سے کوئی مشورہ نہ کیا۔  
بے وقت وہاں سے کوچ کر دیا۔ سارا لشکر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب شام کو وہ ایک گھاٹی میں داخل ہو رہے تھے۔ تو پٹھانوں نے  
اس پاس کی پہاڑیوں سے پتھروں اور تیروں کی بارش کر دی۔ اس اندھیری گھاٹی میں راستہ کی تنگی اور غاروں کی کثرت کی وجہ  
سے سارا لشکر پراگندہ ہو گیا۔ ایک کی ایک کو خبر نہ رہی اور پٹھانوں نے گھیر گھیر کر ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثہ میں آٹھ  
زار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ بیربر بھی جو جان کے خوف سے بھاگا بھاگا پھر ہاتھ قتل کر دیا گیا اور جہنمی کتوں سے  
ملا۔ اس ہولناک رات کو بہت سے بادشاہی امیر اور سردار جیسے حسن خاں پنی، خواجہ عرب بخش، خان جہاں اور ملا شیری شاعر  
مرے گئے۔ پٹھانوں نے جہنم قید کر لیا ان کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اس واقعہ کی تاریخ ”از خواجہ عرب حیف“  
سے نکلتی ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

اس شکست کے بعد حکیم ابوالفتح اور زین خاں پہنچے۔ ان لوگوں نے بیربر جیسے مصاحب کو مخالفت کی بنا پر ہلاک کروا دیا تھا  
اور ان کی یہ منافقت ثابت ہو چکی تھی اس لیے کچھ دن تک یہ لوگ عتاب میں رہے اور کورنش سے محروم کر دیئے گئے۔ بعد میں پھر  
ان کے منصب بحال ہو گئے۔ بلکہ اس سے بڑے مدارج تک ترقی پائی۔

ایک کو کسی امیر کے مرنے کا اتنا رنج نہیں تھا جتنا بیربر کی موت کا۔ نہایت حسرت سے کہتا تھا: افسوس اس کی لاش  
بیربر کا ماتم | اس گھاٹی سے نہیں لائی جاسکتی کہ اسے چتا تو نصیب ہو جاتی۔ پھر یہ کہہ کر خود تسلی دیتا کہ وہ تمام پابندیوں سے  
نرا دھند شخص تھا، اسے پاک کرنے کے لیے نیر اعظم کی تمازت کافی ویسے بھی اسے پاکی کی ضرورت نہ تھی۔“

پٹھانوں کے اٹک کی طرف پیش قدمی کی خبر گرم تھی۔ اس لیے بادشاہ نے دوسرے دن شہزادہ  
روشنائی قبیلہ کی شکست | سلطان مراد اور راجہ ٹوڈر مل کو دریائے سندھ عبور کر کے سرکش پٹھانوں کی سرکوبی کے لیے  
بھجوا دیا۔ بعد میں شہزادہ کو واپس بلایا۔ صرف راجہ کو یہ ہم سپرد کر دی گئی۔ اس نے اس کو مہستان میں کئی ایک قلعے بنوائے۔

مان سنگھ روشنائی قبیلہ پر مامور تھا۔ اس نے ان کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک و اسیر کر لیا۔ اس دوران میں عبداللہ خاں کا  
ایچی میر قریشی اس کا خط لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بلخ کا حاکم نظر اور بک بھی عبداللہ خاں سے بگڑ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔  
بادشاہ نے ان لوگوں کو لانے کے لیے شیخ فرید بخش کو احدیوں کے ایک دستہ کے ساتھ روانہ کیا۔ انہوں نے جا کر آنے والوں کو کوتل خیبر  
محمود کرایا۔ روشنائی قبیلہ کے آدمیوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

۲۵ ربیع الاول ۱۱۹۹ھ نوروز آ پینچا اور جلوس کا اکتیسواں سال (تاریخ نظامی کے حساب سے تیسواں،  
اکتیسواں سن جلوس | شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن اٹک کے بادشاہی دیوان خانہ میں منایا گیا۔ میر قریشی کو کورنش کی  
اجازت ملی۔ مان سنگھ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ شیخ فیضی نے مبارک ہادی کا قصیدہ کہا۔ جس کا مطلع ہے ے

فرخندہ باد یارب بر مملکت ستانی

از مبدۂ خلافت آغاز قسرن ثانی

واضح رہے کہ یہاں جلوس کے پہلے سال کے تعیین میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے اس کی طرف پہلے بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں میرزا کے صاحبزادے محمد شریف نے اپنے باپ کی وفات کے بعد تاریخ نظامی کے سنوں کی تیقح کی ہے۔ اختلاف سن کو رفع کرنے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

**حاکم کشمیر سے صلح** | میرزا شاہ رخ راجا بھگوان داس اور شاہ قلی خاں محرم کشمیر میں کوتل پھولباس تک پہنچ چکے تھے۔ جب انہیں زین خاں کی شکست کی خبر ملی تو انہوں نے حاکم کشمیر یوسف خاں سے اس شرط پر کہ کشمیر کے زعفران زار کی سالانہ پیداوار اور سکھ خالصہ اکبر شاہی سے منسوب رہے گا صلح کر لی اور وہاں اپنے کارندے مقرر کر کے سارا علاقہ حسب سابق یوسف خاں کو تفویض کر دیا۔ یوسف خاں دربار شاہی میں حاضری کا بہت زیادہ خواہش مند تھا۔ اس لیے یہ سب امیر اسے ہمراہ لے کر بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اس صلح کو پسند نہ فرمایا اس لیے ان امیروں کو بروہی پر شرمندگی بخشی اور وہ منہ چھپائے بیٹھے رہے۔ آخر شرف آفتاب (نوروز) کے دن سب کو بلا کر کورنش کی اجازت مرحمت فرمائی۔

انہی دنوں عبداللہ خاں اوزبک کا ایلچی اور مذکورہ سردار نظری اپنے بچوں کے ساتھ باریاب ہوا۔ نظری کو چار لاکھ تک جو عراق کے پانچ سو تومان کے مساوی ہے مرحمت کیا گیا۔

**اکبر کی لاہور کو واپسی** | ۲۴ ربیع الثانی ۱۰۹۷ھ کو بادشاہ نے انگ سے لاہور واپسی کا ارادہ کیا۔ دریائے بیت کے کنارے پٹھانوں کے مقابلہ پر مان سنگھ کے بجائے اسماعیل قلی خاں کو اور کابل پر مان سنگھ کو مامور کیا گیا۔ اسماعیل قلی خاں کی کمک کے لیے سید حامد بخاری کو راستہ کی حفاظت و انتظام کے لیے پشاور میں متعین کیا گیا۔

۱۷ ماہ جمادی الثانی کو لاہور میں نزول اجلال ہوا۔ اسی وقت عرب بہادر کا سر جو بھڑا پانچ میں حکیم ابوالفتح سے جنگ میں مارا گیا تھا ملاحظہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہادر طبعی موت مرا تھا۔ حکیم نے مردہ کا سر کٹھا کر بھیجا دیا۔

**شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگونت داس کی خودکشی** | ۱۹ ماہ ربیع کو رنے سنگھ بھتہ کی لڑکی سے شہزادہ سلطان سلیم کا عقد کیا گیا۔

شعبان کے اوائل میں محمد قاسم خاں میر بھر اور فتح خاں قلی بان فوجدار اور امرامی ایک جماعت کشمیر کو فتح کرنے کے لیے مامور کی گئی۔ اس سے پہلے یوسف خاں کشمیری کو جو راجہ بھگوان داس کے قول و قرار پر چلا آیا تھا۔ اکبر نے قید کر کے قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ کے یہ تیور دیکھ کر راجہ بھگوان داس نے اپنے قول و قرار کی حمیت و غیرت میں اپنے آپ کو جھڑپ مار لیا۔

**یعقوب کشمیری کی بغاوت** | یوسف خاں کا لڑکا یعقوب دربار شاہی کے مصاحبوں میں شامل تھا اور مظفر گجراتی کی طرح اس کا بھی اتنیس چالیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی طرح بھاگ کر کشمیر واپس چلا گیا۔ چونکہ متعصب رافضی تھا اس لیے اس نے وہاں کے سنی قاضی کو اپنے ہاتھ سے شہید کر دیا اور اپنے باپ کے امیروں اور افسروں کو بھڑا

کشمیر کی حکمرانی ہاتھ میں لے لی۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا باپ قتل کر دیا گیا ہے۔ جب بادشاہی فوج کو تل کتریل میں پہنچی تو یعقوب اس کے مقابلہ پر ایک بجاری شکرے کر آیا۔ پہاڑ کی گھاٹیوں کو اچھی طرح مستحکم کر کے لڑائی کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ یعقوب ایک وراثت بیعت آدمی تھا اور اپنے ہمراہیوں سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اس کے ملازموں کی ایک جماعت ساتھ چھوڑ کر محمد قاسم خاں سے فرار ہو گئی۔ اور کچھ لوگوں نے کشمیر کے حاکم نشین شہر سری نگر میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یعقوب نے پہلے گھر کے فتنہ کا سد باب ضروری سمجھا اور وہاں سے لوٹ کر شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے پیچھے شاہی فوجیں بغیر کسی رکاوٹ کے کشمیر میں داخل ہو گئیں۔ اور سارا کشمیر شاہی قبضہ میں آ گیا۔ یعقوب مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اور کوہستان میں جا کر پناہ لی۔

یعقوب نے دوبارہ لادو شکر جمع کر کے قاسم خاں سے جنگ کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے شب خون بھی مارا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس جنگ میں مرزا ادھ طے خاں مارا گیا۔ بادشاہی فوجوں نے یعقوب کو تنگ گھاٹیوں میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور نہایت عاجزی کے ساتھ قاسم خاں کے پاس حاضر ہو گیا۔ اور اس کے ہمراہ خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بعد بادشاہ نے اسے بہار میں مان سنگھ کے پاس جہاں اس کا باپ یوسف بھی قید تھا بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے عرصہ تک قید میں رہے۔ رانیوں کے عارضہ میں دونوں کا انتقال ہو گیا۔

۱۹ رمضان کو بادشاہ نے میر قوش ایچی کو حکیم ابوالفتح کے بھائی حکیم ہمام اور میر صدر جہاں مفتی ساکن بھاتی کے ہمراہ قنوج سے مدائن خاں کے باپ سکندر خاں کی عزا داری کے لیے ماوراء النہر کی طرف روانہ کیا۔ محمد علی خزانچی کے ہاتھ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دروستان کے تحائف وغیرہ بھی بھیجے۔

انہی دنوں روشنائی قبیلہ کے پٹھانوں نے بیس ہزار پیادہ فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری پر جو سلاطین گجرات کے عہد کا ایک بہت بڑا امیر تھا حملہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی تھوڑی بہت جمعیت کے ساتھ پشاور میں ان سے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اس حادثہ پر روشنائی قبیلہ کی سرکوبی کے لیے بارہ زین خاں کو کہ شاہ قلی خاں محرم اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا گیا۔ مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور درہ بر پٹھانوں سے سخت جنگ کر کے اس نے روشنائی قبیلہ کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس پشاور چلا گیا اور چھوٹے لڑائی لڑنے لگے۔ اس وقت مان سنگھ کا بھائی مادھو سنگھ جو اوہند کے تھانہ پراسمعیل قلی خاں کے تحت متعین تھا مدد کے لیے آ پہنچا۔ اس تازہ کمک کے آ جانے کی وجہ سے پٹھان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اور ان کے تقریباً ہزار آدمی مارے گئے۔

انہی دنوں بدخشاں میں میرزا سلیمان اوزبکوں سے ہمارا تار مارا کہیں ان کو شکست دی اور کہیں ان سے شکست کھائی۔ آخر عاجز ہو کر کابل اور وہاں سے خیبر میں آکر مان سنگھ سے ملا اور وہاں سے ہندوستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرزا سلیمان ماہ ربیع الاول ۱۱۹۹ھ کو لاہور میں بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔

مرزاں میرزا کا کارنامہ | شاہ رخ میرزا کا لڑکا محمد زماں میرزا بارہ سال کا تھا۔ جب اوزبکوں کے مقابلہ میں اس کے باپ کو



شکست ہوئی تو وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ جہدائے خاں نے اسے پروم شد خواجہ کلاں بیگ نقشبندی کے جو خواجہ احرار کے پوتے تھے سپرد کر دیا تھا تاکہ اسے بھی وہ دوسرے اسیروں کے ساتھ قتل کرادیں۔ خواجہ صاحب نے اس لڑکے کے عوض ایک دوسرے واجب القتل اسیروں کو قتل کرا کے اسے رہا کر دیا اور وہاں سے رخصت کر دیا۔ جس زمانہ میں سلیمان میرزا دربار میں پہنچا تھا وہ ماوراء النہر کے فقیروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے اسے ایک ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ پھر وہ ہندوستان سے حج کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے دوبارہ اس نے بدخشاں کا رخ کیا۔ اور ایک اچھی خاصی فوج فراہم کر کے اوزبکوں سے مردانہ وار کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور انہیں شکست دے کر وہاں کے سارے کوہستان پر قبضہ کر لیا۔ دشمنوں کو اپنے موروثی ملک سے نکال دیا۔ اس وقت بادشاہ نے لاہور سے دو ہزار اشرفی اور بہت سی بندوقیں تیر اور کمان سوغات میں میرٹو خان عہدی کے ذریعہ اس کے پاس بھیجوائی تھیں۔ چند سال تک وہ اوزبکوں سے برابر مقابلے کرتا رہا۔ آخر شکست کھا کر کابل چلا آیا۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم انشا اللہ آگے بیان کریں گے۔

جلوس شاہانہ کا بتیسواں سال | ۱۱ ماہ ربیع الثانی ۱۱۹۵ھ کو نوروز ہوا اور جلوس شاہی کا بتیسواں اور بقول میرزا نظام الدین تینتیسواں سال شروع ہو گیا۔

نوروز کی تقریبات حسب سابق منائی گئیں اور از سر نو ضابطہ ہندی عمل میں آئی۔ ایک قانون یہ نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں۔ بجز اس کے کہ عورت بائچہ نکلے۔ کیوں کہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہیے۔ جب عورت کی عمر کافی ہو جائے اور اس کو حیض آنا بند ہو جائے تو وہ شادی نہ کرے۔ اگر بیوہ عورتیں شادی کرنا چاہیں تو انہیں کوئی نہ روکے۔ کم عمر ہندو لڑکی کو جس نے نکاح کے باوجود شوہر کا لطف نہ دیکھا ہو سستی نہ کیا جائے۔ بلکہ کسی ایسے بندو سے جس کی عورت مر چکی ہو اس کا نکاح کر دیا جائے۔

جب بادشاہی مرید ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کے بجائے ایکٹائے اکبر کے اور دوسرا "جل جلالہ" کہہ کر جواب دے۔

ہندی مہینوں کا حساب ۲۸ تاریخ سے لگایا جائے نہ کہ تیرہ تاریخ سے جیسے راجا بکرماجیت نے رواج دیا تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار اسی حساب سے منائے جائیں لیکن یہ تاریخ رائج نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس سلسلہ میں فتح پور سے اور سندھ میں گجرات اور بنگالہ سے فراہم صادر کیے جاتے رہے تھے۔

کم حیثیت لوگوں کو شہروں میں تحصیل علم سے روکنے کا حکم بھی نافذ ہوا۔ کیوں کہ بادشاہ کے خیال میں یہی لوگ پردہ کھڑکے فتنہ و فساد مچا کرتے ہیں۔

ایک نیا ضابطہ بنا کہ ہندوؤں کے معاملات کا فیصلہ مسلمانوں کا قاضی نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ اس غرض کے لیے کسی دہاندہ زمین کے پاس رجوع کریں گے۔ اگر حلف اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو گرم گرم لوہا انکار کرنے والے کے ہاتھ پر رکھا جائے اگر ہاتھ جل جائے تو وہ جھوٹا ہوگا ورنہ سچا یا یہ کہ وہ جلتے ہوئے تیل میں اپنا ہاتھ ڈال دے یا یہ کہ تھیل دیر میں ایک تیر سپیکا جائے اور اسے اٹھا کر واپس لایا جائے تو وہ شخص پانی میں غوطہ کھائے اور اس عرصہ میں سر باہر نہ نکالے اگر وہ اس سے پہلے ہی سر نکال دے تو وہ مایہ کو مدعی کا حق دے دیا جائے۔

ایک اور حکم دیا گیا کہ مردہ کو دفنانے وقت اس کا سر مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں۔ سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسی سال بادشاہ نے جلال روستنائی کی سرکوبی کے لیے عبدالملک خاں کو ایک فوج دے کر ننگش کی طرف بھیجا۔ اس نے جلال کو دوسرے پٹھان سرداروں سمیت شکست دی اور بہت سے آدمیوں کو قتل کرادیا۔ زمین خاں کے لشکر کے جتنے آدمی پٹھانوں کی قید میں تھے ان کے عوض دو گئے چو گئے مرد اور عورتوں کو گرفتار کر لیا۔

۱۹۹۵ء میں شہزادہ سلطان سلیم کے ہاں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلطان خسرو کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں بڑا جشن منعقد کیا۔

اسی سال ہندوؤں نے بیربر کے زندہ ہونے کی خبر اڑادی۔ ان لوگوں نے جب بادشاہ کو بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ کو بیربر کی جدائی میں بہت زیادہ رنجیدہ اور مضطرب دیکھا تو یہ شہرت دے دی کہ لوگ اس کو شمالی کوہستان میں جوگیوں اور سنیاہوں کے ساتھ دیکھ کر آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے بھی باور کر لیا کہ وہ چونکہ دنیا سے مستغنی اور مجرد تھا کوئی تعجب نہیں کہ اس نے سنیاہوں سے لیا ہوا اور یوسف زئی پٹھانوں کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے یہاں نا نہ چاہتا ہو۔ لوگ لاہور میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ بعد میں بادشاہ نے ایک احادی کو تحقیق حال کے لیے نگر کوٹ بھیجا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ سب خبریں بے بنیاد ہیں۔

کچھ عرصہ بعد اس کی جاگیر کالنجر کے حکام نے دربار میں عریضہ بھجوا یا کہ وہ کالنجر پہنچا ہوا ہے۔ یہاں کے ایک حجام نے تیل لٹے وقت جسم کی علامتیں دیکھ کر پہچان لیا اور وہ اسی حجام کے پاس چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھجوانے کے لیے فرمان صادر کیا۔ وہاں کے کروڑی نے دراصل ایک مسافر کو بیربر کا دھوکا دینے کے لیے پکڑ رکھا تھا۔ راز کھل جانے کے اندیشہ سے اس نے اس غریب کو مروا ڈالا اور یہ لکھ بھیجا کہ خود بیربر آیا ہوا تھا لیکن وہ فوت ہو گیا۔ اس نے حجام کو بھی دربار میں نہیں بھجوا یا۔ اس خبر پر بادشاہ نے دوبارہ بیربر کا ماتم کیا۔ وہاں کے کروڑی اور دوسروں کو پکڑا بلوایا اور ان کو کچھ عرصہ کے لیے قید میں ڈال دیا کہ آخر تم لوگوں نے پہلے ہی ہم کو اس کی آمد سے کیوں مطلع نہ کیا۔ اس جرماء میں کروڑی سے بادشاہ نے کافی روپیہ بھی وصول کر لیا۔

اسی سال صادق خاں نے ٹھٹھہ پر فوج کشی کر کے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے حاکم میرزا جانی بیگ نے جو محمد باقی ترخان کا پوتا تھا اپنے بزرگوں کے دستور کے مطابق دربار شاہی میں ایلچیوں کے ساتھ بہت سے نفیس تحائف اور نذرانے بھجوائے۔ بادشاہ نے ۲۵ ذی قعدہ ۱۹۹۵ء کو ان ایلچیوں کے ہمراہ حکیم عین الملک کو میرزا جانی کے پاس روانہ کیا اور وہ علاقہ اس کے لیے بحال کر کے صادق کے نام فرمان صادر کیا کہ وہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اول اہل ریج الثانی میں زرین خاں کو کہ کو کابل کی حکومت پر متعین کر کے مان سنگھ کو وہاں سے طلب کر لیا گیا۔ اسی مہینہ کے آخر میں

ملہ سیوان:- کراچی سے ۱۹۵ میل پر واقع ہے کوڑی سے راستہ ہے محمد بن قاسم کے عہد میں بڑا مرکزی شہر تھا۔ ابن بطوطہ (آٹھویں صدی ہجری) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ تاریخی کتابوں میں سیوان لکھا جاتا ہے۔ پرانے قلعہ کے کھنڈر بھی ہیں۔ کہتے ہیں یہ سکندر اعظم کے عہد کے ہیں۔ یہاں ریگستان میں ایک بڑی جھیل ہے جس کا نام ”سجڑ“ ہے۔ لال شہانہ کے مزار پر سندھی زائرین کا مجمع رہتا ہے۔

بے زمین خان کو کہ:- کو کہ رضاعی بھائی کو کہتے ہیں۔ اکبر کا رضاعی بھائی اور شہزادہ سلیم کا خسر تھا۔ چارہزاری بقول صاحب طبقات اکبری پانچ ہزاری منصب دار تھا۔

خان خاناں مرزا خان، عقد اللہ علامت الزماں شاہ فتح اللہ شیرازی کو ہمراہ لے کر یلغار کرتے ہوئے گجرات سے لاہور آیا اور ۲۷ ماہ رجب کو بکر سے صادق خان حاضر ہوا۔

**گجرات کے حالات کا اعادہ** | گجرات میں مظفر اور خان خاناں کے درمیان جو حالات پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر کو ایک لاکھ محمودی سکے مرصع خنجر رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا، اسی قدر رقم اس نے جام کو بھی دی جو عرصہ سے احمد آباد کی فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امین خاں تجربہ کار آدمی تھا اس نے اسے یہ جھانسا دیا کہ تم ستر سال جام کے پاس چلو اور اسے لے کر آگے بڑھو میں بھی بس تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ جام نے بھی اس کے ساتھ چال چلی اور لشکر کی تیاری کا بہانہ کر کے پیچھے رہ گیا۔ مظفر احمد آباد سے ساٹھ کوس پر ایک موضع میں امین خاں غوری اور جام کا انتظار کرنے لگا۔

خان خاناں کو جب خبر ملی تو اس نے نہایت تیز رفتاری سے کوچ کیا اور اپنی فوجیں لے کر اس کے سر پر آپہنچا۔ مظفر جب امین خاں اور جام کی کمک سے بایوس ہو گیا تو ناچار حیران و سراسیمہ کو بہتان کی طرف بھاگ گیا اور سورت کے ایک شہر دو ارکامیں جا کر پناہ لی۔ جام نے اپنے وکیل کو اور امین خاں نے اپنے رٹ کے کو شاہ ابوتراب کے وسیلہ سے خان خاناں کے پاس بھیجا اور جام کے آدمی خان خاناں کو کوہستان میں لے کر گئے۔ وہاں اسے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔

مظفر ایک ہزار مغل اور کاٹھی سواروں کے ساتھ جو اس کے ننھیال کے رشتہ دار ہوتے ہیں گجرات جا کر آئینہ نامی ایک مقام میں پناہ گزین ہو گیا۔ یہ جگہ دریائے ساہتی کے کنارے ہے اور کٹے پٹے کارروں پر واقع ہے۔ سرکش کو لیوں کی جائے پناہ ہے۔ خان خاناں نے دوراندیشی سے کام لے کر پہلے ہی اس خطرناک مقام پر اپنے چند امراء کو متعین کر رکھا تھا۔ جب مظفر وہاں آیا تو ان امیروں نے سیدنا اسم بادشاہ کی سرداری میں اس پر حملہ کر دیا۔ ایک سخت جنگ کے بعد مظفر کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھی اور چتر آفتابی آفتاب پرستوں کے ہاتھ آگیا۔ اس کے رشتہ دار مارے گئے اور وہ بھاگ کر سورت کے علاقہ کاٹھیاواڑ کو بھاگ گیا۔

خان خاناں جب بڑودہ سے واپس ہوا تو اس نے جام پر فوج کشی کر دی، جام نے بھی آٹھ ہزار سوار جمع کر لیے۔ کتے ہیں جام کے

دبقیہ حاشیہ غفہ گزشتہ ہندی راگ سے بڑا شنف تھا۔ شعر کوئی سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کا ایک شعر ہے۔

آرام من نئے دہدایں چسرخ کج خسروی

تار مشتمہ مراد سوزن در آورم

اکثر معرکوں میں اکبر کے ساتھ رہا ہے۔ درباری معاملات میں اس کے مشورے بھی اہمیت رکھتے تھے۔ اکبر کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ عرفی اور سنسکرت پر برہمچاری تھا۔ پہلے اکبر کے ساتھ دکن کی مہم پر گیا تھا۔ تان سین اور زین خاں کی بڑی دوستی تھی۔ کتے ہیں دو تارہ اور ستارہ اسی کی ایجاد ہے اس کے ایجاد کیے ہوئے باجے لندن میوزیم میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی بعض تصنیفات کا فرخ میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ چوڑے قلعہ میں جو سزنگ لگاؤ تھی وہ زین خاں ہی کے ہاتھ میں تیار ہوئی تھی۔ وہی سبک پہلے حملہ کر کے قلعہ میں داخل ہوا تھا۔ اس نے موسیقی کے اصولوں پر ایک کتاب بھی نظم کی تھی۔ عزت کے قصیدہ کا شعر قلعہ جہاں گشتہ و درد بہ تیج شہ و دیارہ نیافتم کہ فروشدن بخت دربارہ جب عرفی نے یہ شعر پڑھا تو زین خاں نے فہم الہدیہ جواب میں کہا۔

جو مغل نہ است بدست یک دیارہ چہ شود از بفرودشدن بخت دربارہ

دو ہزار آدمیوں نے کھانا نہ کھانے کی قسم کھالی تھی اور جان دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ جب جام اپنی جمعیت کو لے کر مقابلہ پر آیا اور دونوں فوجوں میں آٹھ کوس کا فاصلہ رہ گیا تو جام نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور اپنے لڑکے کو تین باقی اٹھارہ کچھی گھوڑے جو عربی گھوڑے کے مشابہ ہوتے ہیں اور دوسرے تحائف دے کر خان خانان کی خدمت میں بھیجا۔ اس موقع پر خان خانان حسب فرمان پہلی مرتبہ گجرات سے فتح پور پہنچا تھا۔

اس کے غیاب میں مظفر نے کاٹھیوں اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے قلعہ جونا گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت تلچ خاں کے حسب ہدایت نظام الدین احمد اور سید قاسم بارہہ نے احمد آباد سے سورت کی طرف کوچ کیا۔ مظفران سے مقابلہ کی تاب نہ لا کر گجرات بھاگ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

**دکن پر فوج کشی اور پسپائی** | جب خان خانان سر وہی اور جالور کے راستہ احمد آباد پہنچ گیا تو بادشاہ نے دکن پر حملہ کے لیے عضد الدولہ کو میر مرتضیٰ اور خداوند خاں حاکم برار اعظم خاں اور شہاب الدین احمد خاں اور مالوہ کے تمام امراء کے ساتھ مامور کیا اور اس علاقہ کے تمام جاگیرداروں کے نام فرمان صادر ہوا کہ اعظم خاں کی سرکاری میں پہلے تو برار کا علاقہ دکنیوں کے ہاتھ سے چھین لیا جائے۔ بعد میں سب مل کر احمد نگر پر حملہ کر دیں، چنانچہ یہ فوجیں حسب الحکم روانہ ہوئیں اور دکن کی سرحد پر بمقام ہندیر انہوں نے اپنا کیمپ لگا دیا۔ لیکن یہاں ان امیروں میں بھٹ پڑ گئی۔ اعظم خاں کو شہاب الدین احمد خاں سے پرانی خصومت تھی۔ کیوں کہ اس کا باپ شہاب الدین احمد خاں کی فتنہ پر داندھی کی وجہ مارا گیا تھا۔ اس لیے وہ اس کو اور عضد الدولہ کو محفلوں اور نشستوں میں تنگ کرتا رہتا تھا اور حق استاد کی باوجود عضد الدولہ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے شہاب الدین خاں رنجیدہ ہو کر اپنی جاگیر رائے سین کو لوٹ گیا۔ اعظم خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خواجہ فتح اللہ بخشی اور دوسرے نو دولتیں سردار اس فتنہ کو خوب ہوادے رہے تھے۔ لیکن عضد الدولہ نے دھڑ دھوپ کر کے اس قصہ کو رفع دفع کر دیا۔

شاہی لشکر کے اس باہمی نفاق کی وجہ آسیر اور برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کو اچھا موقع مل گیا اور وہ دکنی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر مقابلہ پر آیا۔ شاہی لشکر مقابلہ کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے عضد الدولہ راجہ علی خاں کے پاس گیا اور برہمی کو شش کی کہ وہ مقابلہ کا ارادہ ترک کر دے۔ لیکن راجہ علی خاں واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ یہ صورت حال دیکھ کر عضد الدولہ وہاں سے نکل کر گجرات آیا اور خان خانان کو دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے لگا۔

راجہ علی خاں کے مقابلہ میں اعظم خاں تیار نہ کیا تھا۔ اس لیے وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر برار کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں بھی اس کے قدم ٹک نہ سکے۔ وہاں سے وہ شہرائیچ پور چلا گیا اور اس شہر کو برہمی طرح لوٹا۔ دکنی فوجیں ان کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ ایلیچ پور سے بندر ہار چلا گیا اور وہاں سے لشکر کے چند آدمیوں کے ہمراہ اپنے بنوئی خان خانان سے مدد لینے کے لیے احمد آباد پہنچا۔

لے جونا گڑھ۔ کاٹھیوں اور گجرات کا قدیم شہر ہے۔ مغلوں کے عہد میں حاکم نشین جگہ رہی ہے۔ یہاں عرصہ تک جام خاندان کے لوگ حکمران رہے۔ اکبر کے عہد میں یہ مغل سلطنت میں شامل ہو گیا۔ محمد شاہ رحیمیلے کے عہد میں ملاہت خاں نامی ایک امیر نے یہاں خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی۔ اٹھارویں صدی میں انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست قائم رہی تقسیم ہند کے وقت پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تھا لیکن بھارت نے زبردستی قبضہ کر لیا۔ اس کا رقبہ ۳ ہزار ۲ سو ۸۳ میل۔ آبادی ۴ لاکھ کے قریب رہی ہے۔ جونا گڑھ برہمن شکر کے شکار کے لیے مشہور رہا ہے۔ یہاں کا قلعہ مضبوطی میں مشہور ہے۔ نوربان جونا گڑھ کے مقبرے اور مسجد قابل دید ہے۔ کوہ گزنار جیلیوں کے پرانے مندر بھی تاریخی یادگار ہیں۔

خان خاناں نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ملاقات محمود آباد میں نظام الدین احمد کے گھر پر ہوئی۔ اعظم خاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے خان خاناں کے ساتھ احمد آباد چلا گیا۔ نظام الدین احمد کو اس علاقہ میں متعینہ امیروں کے ساتھ بڑا ودھ کی طرف بھیجا گیا۔ اور ان کے پیچھے یہ دونوں سردار بھی احمد آباد سے روانہ ہو گئے۔ اعظم خاں تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا بندر بارہ اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور خان خاناں بھڑوچ جا پہنچا۔ اس کے بعد اعظم خاں نے اس کو لکھا کہ بارہ کا موسم آچکا ہے۔ اس لیے دکن کی مہم کو اس سال ملتوی کر دینا چاہیے۔ چنانچہ خان خاناں بھڑوچ سے احمد آباد کو لوٹ گیا اور اعظم خاں ندر بارہ مالوہ چلا گیا اور راجہ علی خاں دکنی فوجوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہو گیا۔

اس واقعہ کے پانچ ماہ بعد اٹک بنارس میں جسے اٹک کٹک بھی کہتے ہیں خان خاناں کی عرضداشت پہنچی کہ حضور والا بدخشاں پر فوج کشی کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں میری خواہش ہے کہ میں بھی اس سفر میں ہم رکاب رہوں۔ جب اٹک سے لاہور کو لشکر پہنچ گیا تو اس کے نام فرمان گیا کہ تلچ خاں اور نظام الدین احمد تو گجرات میں ٹھہرے رہیں اور خان خاناں بارگاہ میں حاضر ہو جائے۔ خان خاناں کے دوبارہ لاہور حاضر ہونے اور عہد الدولہ کو ساتھ لانے کا یہی سبب تھا۔

خان خاناں کے غیاب میں گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے۔ جس کا ذکر انہوں نے تفصیل سے تاریخ نظامی میں بھی کیا ہے۔

اسی سال میرا بوالغیث بخاری جن کی تعریف حد بیان سے باہر ہے، لکھنؤ میں قتل ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات کے عارضہ میں انتقال فرما گئے۔ ان کی میت دہلی لا کر خاندانی مقبرہ میں دفن کی گئی۔ ان کی تاریخ وفات ”میر سترہ سیرے نکلتی ہے۔ میں نے ان کی شان میں حسب ذیل مرثیہ کہا تھا۔

مرثیہ :-

بگورستان اور روزے عبورے کردم از عبرت	جہاں نے دیدم از آسودگان یکسر بہ مے دانش
ازیں سو رفتہ انہو ہے وزہ آنسو نادمہ یک کس	کہ ازوے حال پرسم یا نشان باشد از ایشانش
در اں شہر خموشاں از نہ بانہ داناں من جمعے	نہ شادستان گیتی رفتہ و گردیدہ ممناںش
از اں جملہ امیرے پاک طینت بو تراب آئیں	ابوالغیث آنکہ گردوں غوث خواند قطب گہاناش
نہ ہے شائستہ سیرت سیدی فرخندہ طلعت ہم	کہ خلق مصطفیٰ بودی عیاں در روزے خنداناش
بخارائی کہ دہلی قبتہ الاسلام بود ازوے	چہ شد آں قبتہ و آں اسلام دیارب کو مسلماناش
چو درویش سپاہی بود خاک پایش اریابم	کشم در چشم نخت خویش چوں کحل صفائاش
بباینش نہ قندیل دل خود سوختہم قہقہے	اگرچہ مشعل ربانی آمد نور ایساناش

بساط مرقد او ساختہم نمناک از اشک

اگرچہ ابر رحمت مشت از باران غفراناش

عربی علوم پر پابندی | اسی سال حکم نافذ ہوا کہ لوگ علوم عربیہ کو پڑھنا ترک کر دیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفہ کے علاوہ



کچھ اور پڑھانہ جائے۔ اس حکم کی تاریخ نفاذ "کساد فضل" سے نکلتی ہے۔

اسی سال ماہ شعبان میں مان سنگھ دربار میں حاضر ہوا۔ خبر پہنچی کہ عبداللہ خاں نے ہرات فتح کر لیا ہے اور وہاں کے حاکم علی قلی خاں کو بے شمار ترکمانوں اور باشندگان ہرات کے ساتھ قتل کر دیا ہے۔ اس کی تاریخ "شکست ہری" سے نکالی گئی۔

**مان سنگھ کا بے باکانہ جواب** | محرم ۱۰۹۶ھ میں مان سنگھ کو بہار حاجی پور اور پٹنہ کے علاقہ پر مقرر کیا گیا۔ عاشورہ کی رات مان سنگھ اور خان خاناں کو خلوت میں بادشاہ نے بلا کر دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اپنے دین کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا اگر حضور کی مریدی سے مراد جاثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشاء ہے اور اس کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے؟ اس کے اس جواب پر اکبر نے اس معاملہ کو اسی جگہ ختم کر دیا اور مان سنگھ بنگالہ کی جانب رخصت ہو گیا۔

**تقرر اور تبادلے** | انہی دنوں بادشاہ نے کشمیر کی حکومت پر میرزا یوسف خاں رفوی مشہدی کا تقرر فرمایا اور محمد قاسم کو وہاں سے واپس بلا لیا۔

۱۲ صفر ۱۰۹۶ھ کو محمد صادق خاں کو یوسف زئی قبیلہ کی سرکوبی کے لیے بھور کی سرکوبی کے لیے بھور کی طرف رخصت کیا اور سیالکوٹ وغیرہ جو مان سنگھ کی جاگیر میں تھا اسے عطا کر دیا۔ اسماعیل قلی خاں کو بھور سے بلا کر گجرات میں قلیج خاں کی جگہ متعین فرمایا۔ قلیج خاں کو دربار میں بلا لیا۔

**ملا احمد کا قتل اور قصاص** | اسی مہینہ میرزا فولاد بیگ برلاس نے آدھی رات کے وقت ملا احمد راغی کو جو علانیہ صحابہ پر تبرا کرتا تھا کسی بہانہ گھر سے باہر بلوایا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کی تاریخ "زہی خنجر فولاد" سے نکلتی ہے۔ ایک دوسری تاریخ "خنجر سقری" ہے۔ میں نے خود اس کتے کو نزع کے وقت دیکھا تھا، خدا پناہ میں رکھے۔ اس کی شکل بالکل سورجیسی ہو گئی تھی۔ یہ میں نے ہی نہیں بلکہ دوسروں نے بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر شہر لاہور میں گھسیٹا گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ اکبر نے حکیم ابوالفتح کو بھیج کر اس سے پوچھا تھا کہ "تو نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ملا احمد کو قتل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا "اگر تعصب ہوتا تو اس کے بجائے میں اس سے کسی اور بڑے کو قتل کرتا۔ حکیم نے یہی جملہ جا کر بادشاہ کو سنا دیا۔ اکبر نے کہا "یہ تو بڑا حرام زادہ ہے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔" اسی لیے

لے اسماعیل قلی خاں :- بیرم خاں کا بھانجا اور خان جہاں حسین قلی خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ بیرم خاں کی بنیاد میں ساتھ تھا۔ جالندھر میں بیرم خاں کو شکست ہوئی تو یہ گرفتار ہو کر آیا اور اپنے بھائی کے ساتھ اکبر شاہی میں ملازم رہا۔ سلسلہ جلوس میں راجہ بھگوان داس کو جنون کا عارضہ ہوا تو اس کا قائم مقام بنا۔ سلسلہ جلوس میں گجرات پر حاکم ہنگر بھیجا گیا۔ اسی سال مالوہ میں شہزادہ مراد کی اتالیقی پر تقرر ہوا۔ سلسلہ جلوس میں کاپی اپنی جاگیر پر متعین رہا۔ سلسلہ جلوس میں چاند ہزاری منصب ملا۔ یہ نہایت عیاش شخص تھا۔ ۱۶ سو عورتیں حرم میں تھیں۔ مائثر الامراء میں لکھا ہے کہ حرم کی بعض عورتوں نے زہر دے کر مار ڈالا۔

اس کو موت کی سزا دی گئی۔ ویسے بادشاہ اس کی بہادری اور اہل حرم کی سفارش کی وجہ سے اس کو معاف ہی کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل کو موت کی سزا مل گئی۔ لیکن مقتول کاری زخم کھا کر ابھی زندہ تھا۔ اپنے قاتل کی موت کے تین چار دن بعد وہ فوت ہوا۔ شیعوں نے اپنے مذہب کے دستور پر اس کی مقعد میں ایک میخ ٹھونک کر دریا میں اسے غوطہ دیا۔ دفن کرنے کے بعد ابو الفضل اور فیضی نے اس کی قبر پر محافظوں کا پہرہ لگا دیا۔ اس کے باوجود لاہور والوں نے اس وقت جب کہ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کی ناپاک لاش کو جلا دیا۔

۲۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ کو نوروز واقع ہوا۔ اور جلوس کے ۳۳ ویں یا ۳۴ ویں سال کا آغاز ہوا۔ دربار عام میں جس کے ایک سو چودہ ایوان ہیں بڑے نفیس کپڑے اور مصور پردے لٹکائے گئے، بڑی آرائش و زیبائش عمل میں آئی۔ اس سال بھی بہت سے خلاف شرع احکام نافذ کیے گئے۔ اس سال کی تاریخ ”شیوعِ معصیت“ سے نکلتی ہے۔

انہی دنوں تلچ خاں گجرات سے آکر باریاب ہوا اور بہت سے نذرانے گزرانے۔ بادشاہ نے ٹوڈر مل پر قاتلانہ حملہ اسے حکم دیا کہ وہ راجہ ٹوڈر مل کے ساتھ دفتر شاہی میں ملکی اور مالی معاملات سرانجام دے۔ ان دنوں ٹوڈر مل نہایت خوف زدہ اور بدحواس ہو گیا تھا۔ کیوں کہ ایک رات اس کے کسی دشمن نے جو گھات میں لگا ہوا تھا۔ اس پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے راجہ زخمی ہو گیا تھا، لیکن زندگی بچ گیا۔

اسی سال کمایوں کا راجہ بادشاہ سے ملنے کے لیے کوہ سواک سے آیا۔ اس سے پہلے وہ یا اس کے کمایوں کے راجہ کی آمد آبا و اجداد میں سے کوئی کسی بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اس نے لاہور میں باریابی حاصل کی اور قسم قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ ان میں کچھ تو گایوں کی عجیب عجیب ڈیں تھیں اور ایک مشک ہرن بھی تھا۔ لیکن وہ گرمی کی وجہ سے راستہ ہی میں مر گیا تھا۔ میں نے بھی اس مردہ ہرن کو دیکھا، بالکل ٹوڑی جیسا تھا۔ اس کے دو چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور سینگوں کی جگہ کچھ ابھار سا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا پورا جسم دکھائی نہیں دیا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے ملک میں پر دار آدمی بھی ہوتے ہیں جو اڑتے ہیں اور آم کا ایک ایسا درخت بھی وہاں ہوتا ہے جو سال بھر پھل دیتا ہے۔

انہی دنوں حکیم عین الملک بھی میرزا جان کے سفیروں کے ساتھ حاضر ہوا۔ طرح طرح کے نذرانے پیش کیے اور بادشاہ کی مرحمتوں سے فیض یاب ہوا۔

ماہ جمادی الاول ۱۱۹۹ھ میں میں نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا۔ یہ ترجمہ میں نے چار سال میں ختم کیا تھا اور اس کے دو نسخے مرتب کر دیئے تھے۔ ترجمہ کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا

رامائن :- یہ ہندوؤں کی سب سے قدیم مذہبی کتاب ہے۔ ۶۰۰ قبل مسیح سے بھی بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ مشہور ہے کہ اسے بالیک رشی نے مرتب کیا تھا۔ اس میں منسکرت کے ایک لاکھ دس ہزار اشعار ہیں۔ کتاب کا مرکزی قصہ رام چندر جی کے بن ہاس سیتا جی کے اغوارا دن سے لڑائی کا قصہ مشہور ہے۔

کرشن جی میں تلہی داس نے بھی ہندی زبان میں رامائن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ آریوں کے زمانہ شجاعت کی کتابیں دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ ایک تو ”سقی“ الہامی کتابیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند  
جان سوختہ کردیم بہ جانال کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا ”یہ کتنے جزیں مکمل ہوا“ میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً ستر جزیں۔ اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ ایک سو بیس جزیں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے اس کا دیباچہ بھی لکھ دو۔ دیباچہ کی اتنی ضرورت نہ تھی پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا اس لیے میں نے دیباچہ کے معاملہ کو ٹال دیا۔ میں اپنے اس سیاہ نامہ سے جو میرے نامہ اعمال کی طرح داغدار ہے خدا کی پناہ چاہتا ہوں، لیکن ”نقل کفر کفر نیست“ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کرابتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے میرے لیے لعنت بن جائے گی۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور پناہ میں رکھے۔

انہی دنوں شیخ کمال بیابانی نامی ایک قلندر کو دریا کے کنارے سے لوگ لے کر آئے کہ یہ عجیب  
**مکار قلندر کا فریب** | باکمال آدمی ہے کہ ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے پلک جھپکتے میں دریا کے دوسرے کنارے پر چلا جاتا ہے۔ اور وہاں سے پکار کر کہتا ہے کہ ”اے فلاں اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔“ بادشاہ اس کو خلوت میں دریا کے کنارے لے کر گئے اور اس سے کہا کہ ہم ایسی چیزوں کے بڑے مشتاق ہیں، اگر تم یہ کرامت ہم کو دکھلا دو تو ہمارا ملک و مال سب تمہارا ہوگا اور ہم بھی تمہارے مرید بن جائیں گے۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولا نہ کوئی حرکت کی۔ اسے گم سم دیکھ کر بادشاہ نے کہا ”ہم تجھے ہاتھ پیر باندھ کر قلعہ پر سے دریا میں پھینک دیں گے۔ اگر تو پانی سے صحیح سلامت نکل آیا تو کیا کہنے ورنہ تو اپنے آپ جہنم رسید ہو جائے گا۔“ اب تو وہ بڑا شپٹایا اور اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں یہ سارا ڈھونگ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس نے یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے لڑکے کو جو اس کا ہم شکل تھا دریا کے دوسرے کنارے پر ٹھہرا دیتا تھا اور مغرب کے وقت کسی نہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچتا اور وضو کے بنائے وہاں کسی کھوہ میں چھپ جاتا۔ اس وقت اس کا بیٹا دوسرے کنارے سے اس کے ساتھی کا نام لے کر آواز دیتا تھا کہ ”بس اب تم اپنے گھر لوٹ جاؤ۔“ بادشاہ نے اس کو بکر میں بھیج دیا۔ وہاں بھی اس نے اپنی کرامتوں کا بڑا ڈھونگ کھرا کر دیا۔ خان خاناں اور اس کا نائب دولت خاں بھی اس کے پھیر میں آگئے۔ اس نے ان کو طرح طرح کے کرتب دکھائے اور ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو باری گروں کی طرح اپنے جسم کے عضو عضو کو الگ الگ کر کے دکھایا اور ان کرامتوں سے دولت خاں افغان کو جو خان خاناں کا نفس ناطقہ اور وکیل کل تھا، اپنا معتقد اور مرید بنالیا۔ خان خاناں نے بھی اس کی عقیدت میں دھوکا کھایا۔ اس چال باز نے خان خاناں سے ایک سونے کا گیند اپنے شیخ کے نام پر حاصل کر کے کہا کہ حضرت علیہ السلام نے تمہارے نام دعا سلام کھلویا ہے۔ پھر وہ اس گیند کو دریا میں لے کر گیا اور جعل و مکاری سے خان خاناں کے سامنے اس کے بجائے کانٹے کی ایک گیند دریا کے سندھ میں ڈال دی اور سونے کی گیند اڑا لے گیا۔

رامائن کے ترجمہ کا صلہ | انہی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمہ کا کچھ صلہ مجھے عنایت فرمایا جائے۔ چنانچہ ایک دن

(بقیہ صفحہ گزشتہ) سرتی کے معنی سنی ہوئی باتوں کے ہیں جیسے وید اپنشد آرنیک وغیرہ۔ دوسرے ”سرتی“ لفظی معنی یاد رکھنے کی باتیں سینہ بہ سینہ آنے والی

داستانیں جیسے رامائن مہابھارت وغیرہ ”وید“ میں رگ وید، یجور وید، سام وید، اتھرو وید، برہمن گرتھ اور اٹھارہ پران شامل ہیں۔ رامائن مہابھارت سے پہلے کی تصنیف ہے جسے ویاس جی نے لکھا تھا۔ اس پر ایک حاشیہ ہم لکھ چکے ہیں۔ مہابھارت میں رامائن کے اکثر کرداروں کا ذکر ہے لیکن مہابھارت کی شخصیتوں کا رامائن میں ذکر نہیں۔

شاہ فتح اللہ عہد الدولہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ فی الحال یہ شاہ عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچہ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔ بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو یسا و رکی جاگیر عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی اراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا ”یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے اس کی مدد معاش کو ہم کسی قصور کے بغیر دیدہ و دانستہ یسا و سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کیے دیتے ہیں۔“ شاہ فتح اللہ نے ایک ہزار روپیہ کی تعمیل حضور میں پیش کی کہ میرے کارندوں نے یہ رقم اماموں کی معاش سے بچا کر بھیجی ہے۔ حالانکہ یہ رقم اس کے شہدار نے پرگنہ یسا و کے ائمہ کی بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و تعدی کر کے وصول کی تھی۔ جب رقم پیش کی گئی تو بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا ”یہ تمہاری ہے ہم تمہیں بخشتے ہیں۔“ اس معاملہ پر تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ شاہ فتح اللہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا۔

جب میری مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہو گیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے یسا و پر وہاں سے بدایوں گیا۔ وہاں سے میرا ارادہ میرزا نظام الدین احمد سے ملنے اور سیر و تفریح کے لیے گجرات جانے کا تھا۔ لیکن کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ جانہ سکا۔

اسی سن جلوس میں سید عبداللہ خاں چوگان بگی اور میرزا دہ علی خاں جو صاحب اعتبار امیر تھے | امرائے کشمیر کی وفات | کشمیر میں فوت ہو گئے۔ سید عبداللہ خاں نے بارہ ماہ ربیع الاول کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوا یا اور فقیروں کو کھلایا اور گناہوں سے توبہ و استغفار کی۔ اسی دن وہ میرزا یوسف خاں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شکار میں اسے بخار ہو گیا اور اسی میں جان دے دی۔ اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میرزا دہ علی خاں اس رات جس رات یعقوب نے محمد قاسم خاں پر شب خون مارا تھا، لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا۔

۲۲ جمادی الثانی ۱۰۹۹ء کو بادشاہ سلامت کشمیر کی سیر کے لیے جسے بادشاہ نے ”باغ خاصہ“ کا نام دیا ہوا تھا کابل سے تشریف لے گئے۔ اہل حرم کو شہزادہ سلطان مراد کے ساتھ بھنبیر میں جہاں سے کشمیر کا پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا چھوڑ دیا اور خود بطور یلغار آگے روانہ ہو گئے۔ اس حسین خط کی سیر و تفریح میں کچھ عرصہ لگا پھر شہزادہ کے نام فرمان آیا کہ وہ محل والوں کو رہتاس لے جا کر وہاں ہماری آمد کا انتظار کرے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات | انہی دنوں ستمبر میں علامہ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی تپ عرق میں مبتلا ہو گیا۔ خود بھی حافق طبیب تھا۔ اس لیے اس نے بطور علاج ہر سیہ کھانا شروع کر دیا۔ حکیم علی نے ہر سیہ کھانے سے اسے بہت روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار موت اس کا گریباں پڑ کر عالم بقا کی طرف کھینچ لے گئی۔ شاہ فتح اللہ کو تحت سلیمان میں جو کشمیر کے ایک شہر سے متصل بڑا پہاڑ ہے۔ سید عبداللہ خاں چوگان بگی کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ ملک الشعراء شیخ فیضی نے اس کے رقیب میں ایک ترکیب بند کہا تھا جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں :-

در ہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد | جہاں عقل را در نیم روز علم شام افتد  
ہمہ گنجینہ اقبال در دست لیام افتد | ہمہ خونابہ او بار در کاس کرام افتد  
حقیقت گم کند سر رشته تحقیق مقصد | معانی از بیان ماند و ابداً ز کلام افتد

زبان جمل جنبہ بے محابا در سخن رانی      مطالب نادرست آید دلائل تمام افتد  
دل مشکلان و ہر در نقص ابد ماند      چونارس میوہ تر شاخ ناگہ نیم خام افتد  
گرامی اہمات فضل را فرزند روحانی      ابوالبائی معنی شاہ فتح اللہ شیرازی  
دو صد بونصرفت و بوعلی تا او پیدا آمد      بسی دارد قضا در نہ و کان زین گو نہ برازی  
گئے با نمل مشائیاں گرد زین گردی      گئے بامو کب اشراقیاں گوہ فلک تازی  
مہابات از وجود کامل و بود دوراں را      بدو راں جلال الدین محمد اکبر غسانی

شہنشاہ جہاں را از و فاقش دیدہ پر نم شد

سکندر اشک حسرت ریخت کاغذ اطلوں عالم شد

۲۷ رمضان المبارک کو بادشاہ کابل کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ پکھلی کے راستہ سے قلعہ انگ کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی موقع پر حکیم ابوالفتح بھی دمتور کے مقام پر فوت ہو گیا۔ اسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اس کی تاریخ وفات ”خدایش سزا دہا دے نکلتی ہے۔“

جب انگ کے سامنے خیمہ شاہی لگا ہوا تھا۔ شہزادہ اہل محل کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اسی منزل سے شہباز خاں کو یوسف زئی قبیلہ کے بقیہ بھائیوں پر حملہ کے لیے مامور کیا گیا۔

۲۲ ذی قعدہ ۱۰۹۹ھ کو بادشاہ کی سواری کابل پہنچی۔ اس موقع پر حکیم ہمام اور صدر جہاں عبداللہ خاں اوزبک کے پاس لوٹ کر آئے اور عبداللہ خاں کے دوستانہ خط پیش کیے۔

۱۰۹۸ھ میں راجہ ٹوڈر مل اور راجہ بھگوان داس امیر لالہ مراد جولا پور میں بٹھرے ہوئے ٹوڈر مل اور بھگوان داس کا انتقال | ان کی تاریخ ہے ”بگھتا ٹوڈر و بھگوان مردند“

۱۰۹۸ھ میں عبداللہ خاں اوزبک۔ بھائیوں کے فوجی سواروں میں سے تھا۔ ۱۰۹۸ھ میں اس نے مالوہ کے بازار کو شکست دی تھی۔ ۱۰۹۸ھ میں اکبر سے فاراض ہو کر گجرات اور دہلی سے توبہ چلا گیا وہیں اپنے قبیلہ کی مدد سے اس نے خود مختار حکومت قائم کر لی۔ مرزا سلیمان والی بدخشاں سے متعدد مرتبہ جنگ کر کے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۰۹۸ھ ٹوڈر مل۔ یہ اصل میں پنجاب کا باشندہ تھا پانچ برس میں باپ مرگیا ماں نے خلیج گجرات میں ایک پاٹ شالہ میں بٹھلایا۔ گیارہ برس کی عمر میں وہ راجہ ہر چند رائے کے پاس ملازم ہو گیا۔ حساب سے اس کو خطری لگاؤ تھا اپنے طور پر اس فوج میں دسترس حاصل کی اور ہر چند رائے کے حساب کتاب کا مختار بن گیا۔ ۱۸ برس کی عمر میں شاہی منشی عادی نام ہو گیا اور ترقی کر کے صدر محاسب بن گیا۔ اس کے چچہ ہر سوت کے محاسب بھی چکے۔ اکبر نے جو ہر قابل جان کر اس کی تربیت و ترقی کی طرف توجہ کی ۱۰۹۸ھ میں بنگال کی مہم میں اس نے جس بہادری اور کامیابی کا ثبوت دیا وہ اس کی آئینہ ترقی کا ذریعہ بن گیا اور وہ وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ ٹوڈر مل نے اراضی کی پیمائش سریندی محصور جنگی کے مقابلے میں شادی اور فوجی بھرتی کے قوانین مرتب کیے۔ فاقی طور پر ٹوڈر مل نہایت میندار پکا خرمی اور اکبر کا وفادار ملازم تھا۔ ٹوڈر مل قوم سے لاکھو تھا۔ ۱۰۹۸ھ میں وہ پور میں فوت ہوا۔ فی حساب میں اس کا ایک قدیم رسالہ ہے۔ جو عرصہ تک فیوں اور صاحبزادوں کو حسابی کر کا کام دیتا رہا۔ ایک کتاب خانہ بھلہ کے نام سے بھی ٹوڈر مل سے منسوب ہے جس کے ایک حصہ میں دھن کی باتیں اور دوسرے حصہ میں دنیاوی معاملات، علم اطلاق اور تہذیب و منزل پر بحث کی ہے۔

۱۰۹۸ھ راجہ بھگوان داس۔ ۱۰۹۸ھ وہ اکبری میں انبیر دار فاضل، پر مشہور راجپوت کچھواہہ خاندان حکمران تھا۔ راجہ کا نام بھاناول تھا۔ جیہو کی شکست کے بعد بھنوں خاں کے وسیلے سے بھاناول دہلی اکبری میں بادشاہ بن گیا۔ ۱۰۹۸ھ میں راجہ بھاناول کی بیٹی جس کا نام سروپی تھا بعد میں عارف النساء بیگم رکھا گیا، اسے اکبری شادی ہو گئی۔ یہ بیگم بھانوی کی بیوی اور بھگوان داس کی بیوی ہے۔ بھاناول کے بعد اس کا لڑکا بھگوان داس اکبر کے مغربی میں شامل رہا۔ بھگوان داس چتوڑ احمد آباد اور دوسرے معرکوں میں بیٹھے اکبر کے ساتھ رہا اور امیر احمد شاہ کا خطاب پایا۔ ۱۰۹۸ھ میں لاہور میں فوت ہوا۔



کسی نے ایک اور تاریخ کہی ہے :-

تو درمل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم  
تاریخ رفتش را از پیر عقل جستم  
چوں رفت سوئے وزخ خلقی شد خرم  
خوش گفتم پیر دانا "وے رفت در جہنم"

۲۰ محرم ۹۹۵ء کو کابل کی حکومت محمد قاسم خاں میر بحر کو تفویض کر کے بادشاہ نے ہندوستان کی طرف مراجعت فرمائی۔

گجرات پر اعظم خاں کی تقرری کا فرمان جاری کیا گیا اور اسے مالوہ سے وہاں تبدیل کر دیا گیا۔ نظام الدین احمد کو دربار میں طلب کر لیا گیا۔ خان خاناں کو گجرات کے بجائے جون پور دیا گیا۔ مالوہ پر شہاب خاں کی تعیناتی ہوئی۔ اعظم خاں نے شہاب خاں کی مخالفت میں مالوہ کو ویران کر کے وہاں دھول اڑادی۔

اسی سال خداوند خاں دکنی رافضی جس کا نکاح بادشاہ کے حکم سے شیخ ابوالفضل کی ہمیشہ سے ہوا تھا اور گجرات میں کری کا قصبہ اسے جاگیر میں ملا تھا فوت ہو گیا۔ اس کی تاریخ وفات ہے :-  
"خداوند دکنی مردہ"

۱۳ جمادی الاول ۹۹۵ء کو ۳۵ ویں جلوس کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے لاہور کے دیوان خانہ کو تیسرے دن نظام الدین احمد شتر سواروں کی جمعیت کے ہمراہ ایک سو کوس کا فاصلہ صرف بارہ دن میں طے کر کے حاضر خدمت ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس ہنیت میں یہ شتر سوار آئے ہیں۔ اسی طرح سیدھے ڈیوڑھی میں چلے آئیں۔ اس قافلہ کی آمد بھی اچھا خاصا تماشا بن گئی۔ نظام الدین احمد پر بڑی شاہانہ نوازشیں ہوئیں۔

بادشاہ نے بھگوان داس کی وفات پر مان سنگھ کو راجا کا خطاب عطا کیا اور تعزیت کے لیے اس کے نام فرمان صادر ہوا جس میں بڑی عنایتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ فرمان کے ساتھ خلعت خاصہ اور گھوڑا بھی بھیجا گیا۔

شرف آفتاب کے دن میں بھی بدواؤن سے آکر بارگاہ میں حاضر ہوا اور سات سال بعد میرزا نظام الدین احمد سے ملاقات ہوئی۔

اسی سال اعظم خاں نے گجرات سے سورت اور جو نا گڑھ پر حملہ کیا۔ وہاں کا حاکم جام ترسالی اور دولت خان ولد امین خاں غوری جو اپنے باپ کا جانشین بناتھا اور اپنے لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمڈ ہو گیا تھا۔ اعظم خاں کی فوج کشتی پر یہ دونوں بیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلہ پر آئے اور فریقین میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ اعظم خاں نے اپنی

لے خداوند خاں دکنی :- بہمنی سلطنت کے خاتمہ پر جب احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت قائم ہوئی تو اس کا دوسرا فرمان روا مرتضیٰ نظام شاہ ہوا۔ اس کا وکیل مطلق خواجہ میرک اسماعیل تھا۔ خداوند خاں اسی خواجہ کے ماتحت ملازم تھا۔ اس کا باپ مشہدی اور ماں حبشہ تھی۔ خداوند خاں نہایت قوی پہلی بادشاہی تھا۔ خواجہ میرک کے زمانہ میں برار کے بعض اضلاع پر حاکم رہا۔ روہن کھیوہ میں اس کی بنائی ہوئی مسجد اب تک یادگار کے طور پر قائم ہے۔ ۹۹۵ء میں مرتضیٰ سبزوئی کے ساتھ اکبر کے پاس چلا آیا اور ہزاری منصب پر تقرر ہو گیا۔ پھر گجرات جاگیر میں ملا۔ اکبر نے ابوالفضل کی بہن سے شادی کرادی۔ لیکن ابوالفضل سے نہ پال ہی رہی تھی۔ ملا صاحب نے ۹۹۵ء تاریخ وفات لکھی ہے۔ طبقات اکبری میں ہے ایک ہزار پانصدی منصب تھا۔ ۹۹۵ء میں ملا۔ ناشر الاماریں ۹۹۵ء کا سن دیا گیا۔

فوج کو سات دستوں میں تقسیم کر کے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ بادشاہی مہینہ کا سردار خواجہ رفیع بدخشی جو بڑا بہادر نوجوان تھا۔ اور محمد حسین شیخ جو امرائے قدیم میں سے تھا اس معرکہ میں شہید ہو گئے۔ ہراول کی فوج میں ابوتراب کا بھتیجا شرف الدین بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے چار ہزار آدمی مارے گئے۔ جام کا رڈ کا بھی قتل ہو گیا۔ اعظم خاں کو بڑی شاندار فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح بروز اتوار ۶ ماہ شوال ۹۹۸ھ کو ہوئی۔ شیخ فیضی نے "فتوحات عزیزی" سے اس کی تاریخ نکالی۔

**دوبزرگوں کا انتقال** | اسی سال صاحب تصانیف بزرگ شیخ وجیہ الدین کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ ان کے نام "شیخ وجیہ الدین" سے نکلتی ہے۔

اسی سال شیخ عبدالعزیز دہلوی کے خلیفہ شیخ جانلیدہ بھی قصبہ سیمنہ میں فوت ہو گئے۔ ان کے ایک مرید نے "حقیقت فقر" سے ان کی تاریخ نکالی۔

**سندھ اور بلوچستان پر حملہ** | بادشاہ نے خان خاناں کا جون پور سے بھی تبادلہ کر دیا اس کو ملتان اور بکر کی حکومت تفویض کر کے سندھ اور بلوچستان کی تسخیر اور میرزا جان کی سرکوبی پر متعین کر دیا۔ خان خاناں کو اس مہم پر چند بڑے بڑے امراء جیسے شاہ بیگ خاں سید بہادر الدین بخاری اور میر محمد معصوم بکری وغیرہ کے ساتھ ۹۹۸ھ میں رخصت کیا گیا۔ ان کے ساتھ ایک سو ہاتھی بھی بھیجے گئے۔ شیخ فیضی نے "قصۃ" اس روانگی کی تاریخ نکالی۔

**شہاب الدین احمد خاں کی وفات** | اسی سال مالوہ سے شہاب الدین احمد خاں کی وفات کی خبر پہنچی۔ شہاب خانم اور "ذیم الاوصاف" اس کی تاریخ وفات ہے۔

**تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین** | اسی سال مجھے حکم دیا گیا کہ تاریخ کشمیر کو جسے ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو بڑا عالم و فاضل شخص ہے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں نے اس کا انتخاب دومینہ میں مرتب کر دیا، اس کے آخر میں یہ شعر لکھا ہے

در عرض یک دو ماہ بہ تقریب حکم شاہ

این نامہ شد جو خط پر سی پکراں سیاہ

یہ نسخہ کتب خانہ شاہی میں داخل کر دیا گیا۔ بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پردھا جاتا ہے۔

**شیخ ابراہیم خشتی کا انتقال** | اسی سال شیخ ابراہیم خشتی نے فتح پور میں انتقال کیا۔ وہ اپنے پیچھے کافی دولت چھوڑ گیا۔ اس کے متروکہ مال میں سے ۲۵ کروڑ نقد روپیہ ہاتھی گھوڑے اور دوسرا بہت سا سامان خزانہ شاہی میں داخل ہو گیا۔ وہ نہایت کنجوس اور نجیل مشہور تھا اس لیے اس کی تاریخ "ذیم الاوصاف" اور "شیخ نسیم" نکالی گئی۔

**عرفی شیرازی کا انتقال** | لاہور کے چند امراء بھی اسی سال فوت ہوئے۔ جن میں سے خجری ترک تو بلو اسیر کے عارضہ میں اور شیخ احمد ہاتھی کے حادثہ میں مرے۔ اسی سال مشہور شاعر ملا عرفی شیرازی نے بھی انتقال کیا۔ مرتے وقت

شہاب الدین احمد خاں۔ اسلم شاہ کے عہد سے دہلی کے حاکم تھے منعم خاں کے ساتھ اچھے تعلقات رہے۔ اس وسیلہ سے شہاب خاں سے شہاب الدین احمد خاں بن گئے۔ منعم خاں کے بعد اکی وہ آؤ بھگت نہیں رہی۔ آخر میں گجرات کے علاقہ میں قلعہ داری کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے۔ مالوہ کی حکومت ملی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ۹۹۸ھ میں وفات پائی۔

اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

عرفی دم نزع است وہاں مستی تو آخر بچہ مایہ بار بر بستی تو  
فرد است کہ دوست نقد فردوس یکف بویائی قناع است و تنہی دستی تو  
عرفی متقدمین اور متاخرین تمام اساتذہ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے یہ تاریخ پائی۔  
”گفت عرفی جو اند مرگ شدی“

اس کی ایک دوسری تاریخ ہے ”دشمن خدا۔“

معجم البلدان کا فارسی میں ترجمہ | اسی زمانہ میں حکیم بہام نے ایک کتاب ”معجم البلدان“ کی جس کی ضخامت دو سو جز تھی۔ بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ اس کتاب میں بڑی عجیب و غریب حکایتیں اور مفید مضامین ہیں۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزاء تقسیم کر دیئے۔ میرے حصہ میں بھی دس جز آئے۔ ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینہ میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کیا اور اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایا جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی۔

چھتیسواں سن جلوس | ۲۴ جمادی الاول ۱۱۹۹ء جشن نوروز حسب دستور منعقد کیا گیا اور جلوس کا ۳۶ واں سال شروع ہوا اس سال گائے بھینس گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کر دیا گیا۔ ایک اور حکم مستی کے متعلق تھا کہ جو عورت برضا و رغبت اپنے شوہر کے ساتھ چتا پر جلنا چاہے اس کو نہ روکیں۔ لیکن کسی عورت کو نہ بردستی شوہر کے ساتھ نہ جلایا جائے۔ بارہ سال سے پہلے بچوں کی ختنہ نہ کی جائے۔ بارہ سال بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے نہیں تو نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو اگر کوئی کھانا کھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اگر اس کے گھروالے اس کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔

تہت کی سفارت | اس سال حاجی میرزا بیگ چھوٹا تہت سے واپس آیا اور اپنے ساتھ وہاں کے حاکم علی بدائے کی لڑکی کو لیتا آیا۔ بادشاہ نے اس لڑکی کا نکاح بڑے شہزادہ کے ساتھ کر دیا۔ تہت کو دوسری مرتبہ ملاطاب اصفہانی لہجی بن کر گیا تھا۔ اس کے اور حاجی میرزا بیگ کے بیانات سے وہاں کے جو حالات اور رسوم و عقائد سے متعلق معلومات ملی ہیں۔ وہ ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو چکی ہیں۔ اکبر نامہ میں بھی یہ حالات درج ہیں۔ کیوں کہ اس میں ہندوستان، کابل، تہت اور کشمیر کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد کو پرگنہ شمس آباد کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس سال شعبان کے آخر میں ان کو جاگیر پر روانہ کر دیا گیا۔ ان کا خالہ زاد بھائی شمس آباد کے معرکوں میں شہید ہو گیا۔ اس کا نام محمد جعفر تھا۔ یہ نہایت سعادت مند اور بہادر نوجوان تھا۔ اس کی تاریخ شہادت ہے۔

چو منشور شہادت یافت جعفر اندر داور  
بود تاریخ سال او شہید پاک شد جعفر

اس مرتبہ مجھے پانچ مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین نے سفار شاعر ض کیا کہ عبدالقادر کی والدہ کا انتقال مسجد سے آنکار ہو گیا ہے۔ بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی دلا سادینے کے لیے وہ جانا چاہتا ہے۔ اور رخصت کا طلب گار ہے تو بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی۔ صدر جہاں نے اس موقع پر دہرا دہرا کر کہا کہ ”بادشاہ کو سجدہ کرو“۔ لیکن میں نے سجدہ نہیں کیا۔ بادشاہ نے صرف اتنا کہا ”پھوڑو“۔ سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہو کر مجھے سفر خرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہر حال میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پھر وہاں سے بدایوں آ گیا۔ مرزا لاہور کو چلے گئے۔

شاہی کتب خانہ سے ”نامہ خرد افزا“ کا نسخہ گم ہو گیا تھا۔ سلیم سلطان بیگم نے اس سلسلہ میں مجھے چند مرتبہ یاد فرمایا۔ میرے پاس بدایوں میں کئی ایک قاصد طلبی کے لیے پہنچے۔ لیکن میں کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ جانہ سکا۔ آخر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اسکی مدد معاش موقوف کر دی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے لایا جائے۔ اس موقع پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا بردا حق ادا کیا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی بادشاہ سے ہر بار یہی کہا کہ کوئی نہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی۔ اس لیے وہ نہیں آ سکا اور وہاں رہ گیا۔

لے دور اکبری کی تصانیف:-

- ۱۔ مہاجرت۔ سنہ ۱۵۹۵ء میں اس کا ترجمہ وزم نامہ کے نام سے مکمل ہوا۔ اس کام کو نقیب خان، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا شیر، حاجی سلطان، قنایسری نے انجام دیا۔
- ۲۔ رامائن سنہ ۱۵۹۵ء تا ۱۵۹۷ء ملا عبدالقادر بدایونی نے ترجمہ کیا۔
- ۳۔ سنگھاسن جیسی (سہا سندو ترنتی) خرد افزا کے نام سے بدایونی نے ترجمہ کیا سنہ ۱۵۹۷ء۔
- ۴۔ حیوۃ النبیون دیرری کی مشہور کتاب کا فارسی میں ترجمہ شیخ مبارک نے سنہ ۱۵۹۷ء میں کیا۔
- ۵۔ اقرب: ہندوؤں کی قدیم مذہبی کتاب ہے۔ اسکی ترجمانی نو مسلم بھادوں نے کی اور عبدالقادر بدایونی، فیضی، شیخ ابراہیم سرہندی نے سنہ ۱۵۹۷ء میں ترجمہ کیا۔
- ۶۔ تزک بابری: بابری کی سرگزشت لائیک سے فارسی میں عبدالرحیم خان خاناں نے سنہ ۱۵۹۷ء میں ترجمہ کیا۔
- ۷۔ انجیل: ابوالفضل نے سنہ ۱۵۹۷ء میں اس کا ترجمہ کیا۔
- ۸۔ لطیفہ: ہندوؤں کے فخریاض کی مشہور کتاب ہے۔ فیضی نے ترجمہ کیا تھا۔
- ۹۔ تاجک: علم نجوم کی ایک کتاب۔ مکمل خان مجراتی نے ترجمہ کیا۔
- ۱۰۔ ہر فیس: کرشن جی کے حالات۔ مولانا بشری نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔
- ۱۱۔ معجم البلدان، شہاب الدین عبد اللہ یاقوت حوتی سنہ ۱۲۵۰ء کی کتاب ہے۔ ملا احمد رضا، تاسم بیگ، شیخ منور اور بدایونی نے ترجمہ کیا سنہ ۱۵۹۷ء۔
- ۱۲۔ تاریخ کشمیر: مشہور سنسکرت کی کتاب ”راج ترنگنی“ مصنفہ کھانا سلطان زین العابدین کے عہد کی کتاب ہے۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے ترجمہ کیا۔ پھر بدایونی نے سنہ ۱۵۹۷ء میں سلیس فارسی میں لکھا۔
- ۱۳۔ کلیلہ و منہ: سنسکرت کا قدیم حصہ ہے۔ ابوالفضل نے سنہ ۱۵۹۷ء میں ”غبار دانش“ کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔
- ۱۴۔ فل دمن: سنہ ۱۵۹۷ء میں فیضی نے خسرو کی لیلیٰ مجنوں کی بحر میں چار ہزار دو سو اشعار کی یہ شبنوی تصنیف کی۔
- ۱۵۔ جامع رشیدی: سنہ ۱۵۹۷ء میں عبدالقادر بدایونی نے عربی سے ترجمہ کیا۔
- ۱۶۔ بھرا لا سمار: ہندی انباد کی کتاب۔ عبدالقادر بدایونی نے سنہ ۱۵۹۷ء میں ترجمہ کیا۔
- ۱۷۔ تاریخ الحکماء: مصنفہ شہر زوری کا ترجمہ مقصود علی تبریزی نے نزہۃ الارواح کے نام سے کیا۔
- ۱۸۔ تاریخ مرزائی: فارسی سے سنسکرت میں اس کا ترجمہ میر فتح اللہ شیرازی ابوالفضل کشن جوتشی لگا دہر ہمیشہ جاننے کیا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

## دکن کو سفیروں کی روانگی

اس سال کے ماہ شوال میں دربار کے چار خاص مقرروں کو دکن کے چار حاکموں کے پاس سفارت پر بھیجا گیا۔ شیخ فیضی کو آسیر و برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کے پاس۔ امین الدین کا پٹے نام محمد امین تھا اس نے خود اپنا نام بدلنے کی درخواست کی دیکھ کر اس میں محمد کا لفظ آتا تھا جو بادشاہ کو پسند نہ تھا، اس کو امین الدین کا نام دیا گیا۔ امین الدین کو احمد نگر بھیجا گیا۔ احمد نگر میں اس وقت برہان الملک حاکم تھا جو دربار سے مدد لے کر وہاں کی سلطنت پر قابض ہوا تھا اور اب خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ بیجا پور کے حاکم عادل خاں کے پاس صادق خاں کے سابق ملازم میر محمد امین کو رخصت کیا گیا۔ گوکنڈہ کے حاکم قطب الملک کے پاس سفارت کے لیے میر مشیر کو نامزد کیا گیا۔

لے بیجا پور :- یوسف عادل شاہ نے ۱۱۹۹ھ میں عادل شاہی سلطنت کا پایہ تخت بنایا تھا۔ دوسو برس تک عادل شاہی سلاطین دکن کے بڑے حصہ پر قابض رہے۔ ۱۱۹۹ھ میں شاہ جہان نے اس کو دہلی کا باجگزار بنایا۔ ۱۱۹۹ھ میں اورنگ زیب نے سلطنت مغلیہ میں اس کو ضم کر لیا۔ اٹھارہویں صدی میں نظام الملک آصف جاہ نے قبضہ کر لیا، ان کے بعد مرہٹوں نے اسے تباہ کر دیا۔ ۱۱۹۹ھ میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ بیجا پور میں محمد عادل شاہ کا مقبرہ ”لول گنبد“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا گنبد بہت بڑا ہے۔ اندرون قطر ۱۲ فٹ ہے بلندی ۹ فٹ ۱۱ انچ محمد عادل شاہ ساتواں فرماں روا تھا۔ اس کی قبر اونچے چوڑے پر ہے۔ تین طہرے فارسی میں کندہ ہیں جن سے بادشاہ کا سن وفات نکلتا ہے۔ ایک طہرہ ”عاقبت محمد محمود شد“ ہے۔ جس سے ختم شدہ نکلتا ہے۔ سو لہویں صدی عیسوی تک دنیا کا سب سے بڑا گنبد رومنہ انگریزی کے پانچھین گرجا کا تھا جس کا رقبہ ۵۸۳۳ مربع فٹ ہے۔ لول گنبد کی تعمیر کے بعد اس کا دوسرا نمبر ہو گیا۔ کیوں کہ یوں گنبد کا رقبہ ۱۸۲۲۵ مربع فٹ ہے۔ بیجا پور کی جامع مسجد بھی مشہور عمارت ہے۔ پانچویں سلاطین علی عادل شاہ کی تعمیر ہے۔ یہی بادشاہ اکبر کا ہم عصر ہے۔ یہ مسجد ۱۱۹۹ھ میں تعمیر ہوئی تھی اس کی تعمیر سلطان محمد عادل شاہ کے عہد تک ہوئی رہی۔ اس کے علاوہ سلطان محمد عادل شاہ کا بنایا ہوا آثار محل قلعہ سلاطین عادل شاہی کے مقبرے مشہور عمارتیں ہیں۔ بیجا پور کی توپ بھی عجوبہ روزگار ہے۔ اتنی لابی چوڑی توپ شاید ہی کسی جگہ پائی گئی ہو۔ اس کو احمد نگر کے فرماں روا حسین نظام شاہ کے حکم سے حسین خاں رومی نے ۱۱۹۹ھ میں بنوایا تھا۔ اس کا وزن ۲۰ ہین طول ۵ فٹ ۵ انچ دائرہ قطر ۲ فٹ چار انچ ہے۔ ۱۱۹۹ھ میں سلطان محمد شاہ کے عہد میں بیجا پور لال گئی تھی۔ لے گوکنڈہ :- شہر حیدر آباد سے پانچ میل مغرب کی جانب واقع ہے۔ قطب شاہی سلاطین کا قدیم دار الحکومت تھا۔ قلعہ میں ۲۵۰ فٹ بلند پٹاری پر بالاحصار ہے۔ اس کے قریب قطب شاہی خاندان کے مقبرے ہیں۔ ان بادشاہوں نے پورے دوسو برس دیاست گوکنڈہ پر حکومت کی گوکنڈہ کی سیر کے لیے کان بھی مشہور تھی۔ مشہور ہیرا کوہ نور ایک روایت کے مطابق اسی جگہ سے نکلا تھا۔ اس قلعہ کو قلعہ قطب شاہ نے بنوایا تھا۔ جو دکن زبان کا صاحب دیوان شاعر گزمل ہے۔

ربقیہ صفحہ سابقہ ۱۹- کتاب لا حادیث :- ۱۱۹۹ھ میں ملا عبد القادر بدایونی نے نذر گزرائی جو انہوں نے ۱۱۹۹ھ میں فن تیر اندازی پر لکھی تھی۔

۲۰- تاریخ الفی :- نقیب خان شاہ فتح اللہ حکیم جام حکیم علی حاجی ابراہیم سرہندی نظام الدین احمد عبد القادر بدایونی، ششوی، جفریگ اور آصف خاں نے مل کر کام کیا تھا۔ بدایونی نے تین جلدوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر انڈیا آفس لائبریری میں اس کی چار جلدیں ہیں۔ پروفیسر ڈاؤس کا کہنا ہے کہ اس کی دو اور جلدیں بھی تھیں۔ ۱۱۹۹ھ میں اس کی تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۱۹۹ھ میں بدایونی نے نظر ثانی کر کے مکمل کر دی۔

۲۱- اکبر نامہ :- ابو الفضل کی تصنیف ہے۔ اس کی تیسری جلد آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔

۲۲- نجات الرشید :- ملا عبد القادر بدایونی کی تصنیف۔

۲۳- طبقات اکبر شاہی :- ۱۱۹۹ھ کے حالات مرزا نظام الدین احمد کی تصنیف۔

۲۴- سوانح الابرار :- فیضی نے ۱۱۹۹ھ میں بے نقط تفسیر جس کے ۷۵ جز ہیں (۱۲۵) نواد الملک :- فیضی کی بے نقط تصنیف۔

۲۶- مرکز ادوار :- فیضی کے اشعار کا مجموعہ مرتبہ ابو الفضل۔ (۱۷۷) کشکول :- ابو الفضل کی منتخب کردہ تحریریں۔

۲۸- جوتش :- خان خاناں نے جوتش پر مثنوی لکھی تھی۔ ہر شعر کا ایک مصرع فارسی میں دوسرا سنسکرت کا تھا۔

۲۹- ثمرۃ الفلاسفہ :- عبد الستار ابن قاسم کی تصنیف ہے۔ مشکوہ جلوس م ۱۱۹۹ھ میں یونانی سے ترجمہ کی گئی۔ عبد الستار کا کہنا ہے کہ میں نے یونانی پادری جو وہ شوق سے حاصل کی تھی۔ اس میں روم کی تاریخ اور مشاہیر و اہل کمال کا ذکر ہے۔

۳۰- خیرا بیان :- یہ پچھانوں کے باغی قبیہ کے پیر تاریکی (دو مثنوی قبیہ) نے لکھی تھی۔



شہزادہ مراد کی فوج کشتی | شہزادہ مراد کشور کشانی کے شوق میں مالوہ کی طرف چلا گیا۔ اور بہت سے لوگ شہزادہ مراد کی قدر و منزلت کو دیکھ کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے آگرہ قنوج، اور گوالیار سے بے شمار فوج جمع کر لی اور یہ لشکر لے کر ہندو چھ کے زمیندار مد بکر نامی پر حملہ کر دیا۔ یہ زمیندار اپنے کثیر لاؤ اشکر کی وجہ سے ہندوستان کے راجاؤں میں بڑا درجہ رکھتا تھا اور اس علاقہ میں اس نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ شہزادہ کے لشکر سے اس کا مقابلہ زور کے فوج میں ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر چھاپے مارنے لگا۔ اس کے آدمیوں نے شہزادہ کے بہت سے لشکریوں کو قتل کر دیا۔ اس کے چھاپوں سے لشکر میں بڑا انتشار پھیل گیا۔ اور وہ اس علاقہ میں نہایت پریشان اور خستہ حال ادھر ادھر کوچ کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مد بکر طبعی موت مر گیا اور اس کا لڑکا نہایت عمدہ نذرانے لے کر شہزادہ سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ شہزادہ مراد نے اسے یار محمد ولد صادق خان کے ہمراہ خدمت شاہی میں لاہور کو روانہ کر دیا۔ اور اجین کے شہر کو اپنا مستقر بنا کر ٹھہر گیا۔ شہزادہ مراد کا اپنے آدمیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا۔ لین دین، نشست و برخاست، تسلیم و تعظیم میں باپ کی دیکھا دیکھی بڑے غرور و تکبر سے پیش آتا تھا۔ اس کے اس رویہ سے لوگ ناراض ہو گئے۔ اور اجازت لے کر یا بغیر اجازت کے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

طرح شہزادہ :- یہ سب سے بڑا شہزادہ سلطان سلیم جہانگیر تھا۔ یہ ۱۰ ربیع الاول ۹۷۵ھ کو راجہ بھارمل کچھواہہ کی لڑکی کے بطن سے فتح پور میں پیدا ہوا تھا۔ راجہ بھگوان داس کا بھانجا اور مان سنگھ کی پھوپھی کا لڑکا ہوتا ہے۔ دوسرا شہزادہ سلطان مراد ۹۷۵ھ میں ۱۰ محرم کو فتح پور میں پیدا ہوا۔ اکبر اس کو فتح پور کی پہاڑی کی نسبت سے پہاڑی راجہ کہتا تھا۔ جہانگیر نے توڑک میں اس کا حلیہ لکھا ہے۔ "سبزہ رنگ، باریک اندام، خوش تند، بلند بالا"۔ دکن کی مہم پر بھیجا گیا۔ کثرت بے نوشی سے آخر ۹۷۵ھ ۲۰ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ تیسرا شہزادہ دانیال تھا جو مراد کے بعد دکن کی مہم پر بھیجا گیا۔ اجیر میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ ۳۳ برس کی عمر میں ۹۷۵ھ میں شراب نوشی کی علت میں انتقال ہوا۔ سلیم کو بارہ ہزاری، مراد کو دس ہزاری اور دانیال کو ہفت ہزاری منصب دیا گیا تھا۔

**جوناگرہ کی فتح** | انہی دنوں حاکم جونانگرہ دولت خاں ولایت میں خاں غوری جو جام کی روانی میں زخمی ہو گیا تھا فوت ہو گیا۔ اور اعظم خاں نے اس قلعہ کی تسخیر کے لیے فوج کشی کر دی۔ امین خاں کے زیریں نے دولت خاں کی سرداری میں کچھ دن تک توہان اعظم خاں کی مدافعت کی۔ آخر امان طلب کر کے قلعہ کی گنجی پانچ ذی قعدہ سال مذکور کو اس کے حوالہ کر دی۔

**ٹھٹھہ کی فتح** | ۲۶ محرم ستلہ جلوس کے چھتیسویں سال خان خانان نے جانی بیگ سے ایک رات اور ایک دن مسلسل جنگ کی۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا، آخر جانی بیگ کے دوست آدمی مارے گئے۔ اور اسے شکست ہو گئی۔ اس شکست کے بعد جانی بیگ اپنے لشکر کو لے کر جزیرہ میں چلا گیا اور وہاں قلعہ بندی کر لی۔ خان خانان دو مہینے تک اس کا محاصرہ کیے پر اڑھا۔ اس دوران میں بادشاہ نے خان خانان کی کمک کے لیے ایک مرتبہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور دوسری دفعہ ایک لاکھ روپیہ ایک لاکھ من گندم، سو بڑی توپیں، توپچیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دریا کے راستہ بھجوائیں۔ راستے سنگھ کو جو چار ہزاری امیر بے کمک کے لیے حبس گیر کے راستہ سے روانہ کیا گیا۔

جانی بیگ نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کئی ایک سخت لڑائیوں کے بعد آخر کار عاجز آ گیا۔ مصالحت کر لی اور اپنی لڑکی خان خانان کے لڑکے سے بیاہ دی۔ وہ کشمیر کی فتح کے بعد خان خانان کے ساتھ ملازمت میں داخل ہوا۔

**سینتیسواں سال** | پانچ جمادی الثانی سنہ کو نوروز ہوا۔ اور جلوس سلطان کا سینتیسواں سال شروع ہوا۔ اس سال درباریوں نے بڑے اجتماع سے اپنی ڈاڑھیاں منڈوائیں۔ اس لیے ان کی تاریخ ہوئی۔

بگھٹہ ریشہاں بادشاہ مفسدے چنڈے

**کرنسی کا نیا قانون** | اس سال بھی کئی ایک نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ ایک حکم یہ دیا گیا کہ پچھلے بادشاہوں کے جتنے بھی سکے ہیں۔ روپیہ اشتریاں وغیرہ وہ سب گلا کر سونے چاندی کے بھاؤ فروخت کر دیئے جائیں۔ پہلے سکوں کا نام و نشان تک نہ رہے اور بادشاہی کے روپے اشترنی وغیرہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ان کا چلن ایک مخرج پر رہے۔ اور سونوں کا فرق ان کے چلن پر اثر انداز نہ ہو۔ اس قانون کے نفاذ کے لیے خلیج خاں کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز صرافوں کو بلا بلا کر ان سے چھکے پیتا تھا اور جرمانے لگائے جاتے تھے۔ اس نے بڑی سختی سے کام لیا اور چند ایک کو قتل تک کرادیا۔ اس کے باوجود صراف جیل اور دھم سے باز نہ آتے تھے۔ بادشاہ نے کرنسی کے سلسلہ میں بڑے تاکید فرما دیں مگر بھجواتے۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر خواہشوں اور خوفی دیوان گل کی کوششوں سے اس حکم کا نفاذ ہو سکا۔

**جلالہ تاریکی پر فوج کشی** | یوم شرف آفتاب کو جب کہ سورج انیسویں درجہ حمل میں ہوتا ہے۔ جعفر بیگ آصف خاں غشی کو جلالہ تاریکی کے تعاقب پر مامور کیا گیا۔ جلالہ اس وقت عبد اللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل

لے آصف خاں۔ اصل نام خواجہ عبد الحمید تھا یزیدیاہرات اصل وطن تھا سیرا تاخرین میں حضرت زین الدین خاں کی اولاد بتایا ہے۔ مآثر الامار میں شیخ جلالہ اولاد میں لکھا ہے۔ قوم تاجیک تھی۔ پہلے ہابیوں کے دفتر کے اہل قلم میں شامل تھے۔ جب اکبر دل سے بیرم خاں کی ہم پر گیا تو ان کو آصف خاں کا خطاب دیا اور حاکم بنایا پھر سرہزاری منصب اہل ہوئے۔ مگر جلوس اکبر شاہی میں رانا درگاؤ کو شکست دے کر جوشنگ آباد پہنچے۔ خاں زمان کی بغاوت میں فوج کے سپہ سالار اس کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ کے دوران وزیر خاں کو ساتھ لے کر خود بھی بغاوت کر دی اور بھال کرجوناگرہ میں جا کر پناہ لی۔ جو پھر رانا کو روکے دریاں بہاؤ دیا۔ مگر کار کیا۔ شہنشاہ میں اکبر نے قصور معاف کر کے پرگنہ بھال جاگیر میں دیا۔ چوڑکی ہم میں آصف خاں نے بڑے کارنامے دکھائے تھے۔ اس کے بعد ان کو فوج کا بخش بنایا گیا۔

کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی کمک پر حاکم کابل محمد قاسم خاں کو مقرر کیا گیا۔ نظام الدین احمد کو ”نجشی گل“ کا عمدہ مرحمت ہوا۔ آخر شعبان میں زین خاں کو کہ کو بھی آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں دروشتائی قبیلہ کے مکمل استیصال کے لیے اور سواد اور بجوڑ کے علاقہ کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا گیا۔

اس سال وسط شوال میں حافظ سلطان رخنہ ہروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت مخیر شخص تھا۔ خاص طور سے سرہندی میں اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اور باغ ایسے خوش منظر اور عالی شان ہیں کہ ہندوستان میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ وفات اصول تعمیر پر نکالی گئی۔

رخنہ در باغ شد و آب نہ اند  
فیض سرہندی نے دو تاریخیں کہی ہیں: ایک ————— ”باغ بے آب شد“

دوسری ہے

چو او در گوشہ باغ است مدفون  
بجو تاریخ او از گوشہ باغ

ایک اور تاریخ ہے: ————— ”یا حافظ“

**یادگار گل کا کشمیر پر قبضہ** | یوسف خاں رضوی کشمیر میں اپنے بھتیجے یادگار گل کو نائب بنا کر ۲۴ شوال کو حاضر خدمت ہو گیا۔ اس کے آنے کے بعد بادشاہ سلامت نے لاہور کے نظم و نسق پر قلعہ خاں کا تقرر کیا اور عین موسم باران میں دریائے راوی کو عبور کیا۔ لشکر کو بڑے شہزادہ کے ہمراہ کر کے خود شکار کھیلتے ہوئے دریائے چناب پر پہنچے۔ چناب کی منزل میں یہ خبریں ملیں کہ یادگار گل نے کشمیر کے بادشاہی تحصیلدار حسین بیگ شیخ عمری بدخشی سے جنگ کر کے اسے شکست دے دی ہے۔ کشمیر کا سرکاری قاضی علی بغدادی اماموں کا برطانوی دشمن تھا اور کشمیر کی دیوانی کے عمدہ پرفائز تھا اور حساب کتاب میں الجھنیں پیدا کر کے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ یادگار گل نے اس کے ناک، کان کاٹ کر اسے وہاں سے نکال دیا۔ اس واقعہ کی تاریخ ہے ۵

چوں کہ قاضی علی بغدادی      حسرت یادگار با خود برد  
خسامہ نشی قضا بنوشت      سال تاریخ او کہ مودی مرد

**یادگار گل کی تخت نشینی** | اس کامیابی کے بعد یادگار گل نے وہاں کے قدیم امراء کی مدد سے تاج شاہی سر پر رکھا۔ کشمیر میں یہ رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء نئے بادشاہ کے اطراف نگلی تلواریں لیے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ کتے ہیں جب یادگار خطبہ پڑھنے کھڑا ہوا تو خوف سے لرزنے لگا۔ اور کافی دیر تک بدحواس رہا۔ ایک اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن اس کے صبر کے لیے سبج تجویز کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے نگینہ کھدوایا۔ اس وقت نگینہ کا ایک ربڑہ اڑ کر اس کی آنکھ میں پڑ گیا اور وہ دیر تک اس تکلیف سے بے چین و مضطرب رہا۔ ان بدشگونوں کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصہ قائم نہیں رہے گی۔

حسین بیگ شیخ عمری نے یادگار گل سے شکست کھائی۔ وہ کشمیر کے دروں سے اپنی جان بچا کر لے آیا اور راجپوری میں جو کشمیر کے راستہ پر ہے، حکم شاہی کا انتظار کرنے لگا۔

یادگار نے کشمیر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی لوگوں کو جاگیریں دیں۔ خطابات عطا کیے اور میرزا یوسف خاں کے خزانہ طویلے اور اسلمہ خانہ پر قبضہ کر لیا۔ یوسف خاں کے اہل و عیال سے سارا روپیہ زیور اور اناج وغیرہ چھین کر خچروں پر سوار کر دیا اور ان کو یوسف خاں کے بیٹے کے ہمراہ کشمیر سے باہر نکال دیا۔

یادگار گل کی شکست اور قتل | اس واقعہ پر بادشاہ نے سارا الزام یوسف خاں کے سر رکھا۔ اور اسے کچھ دن تک شیخ ابوالفضل کے پاس قید میں ڈلوادیا اور شیخ فرید بخش کو شیخ عبدالرحیم لکھنوی اور دوسرے چند امراء کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دے کر خود چناب پر شہزادہ کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔

ابھی بادشاہ نے وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا کہ خبر ملی کہ امراء شاہی کے مقابلہ کے لیے یادگار نے کشمیر سے نکل کر ہیراپور نامی درہ پر مورچے جمائے تھے۔ اور رات کے وقت وہ اپنے سر پر وہ میں عیش و عشرت میں مشغول تھا۔ میرزا یوسف خاں کے بعض نوکروں نے پٹھانوں کے ایک دستہ کو ساتھ لے کر آدھی رات کو شب خون مارا اور یادگار کو قتل کر دیا۔ تین دن بعد اس کا سر بھی بارگاہ شاہی میں پہنچ گیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کہ اس کی تخت نشینی کے چالیسویں دن ہی اس کا سر کٹ کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سر کو عبرت کے لیے قلعہ لاہور کے کنگرہ پر لٹکا دیا گیا۔

جامع رشیدی کے ترجمہ کا حکم | اسی سال ماہ ذی الحج کو حسب الحکم میں بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا۔ بھنبہ کی منزل میں حکیم بہام نے عرض کیا کہ بعد القادر کو رنش بجالانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدہ کے خلاف کتنے عرصہ تک غیر حاضر رہا، حکیم نے جواب دیا "پانچ مہینے"۔ بادشاہ نے پوچھا "غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟ لوگوں نے کہا" وہ بیمار ہو گیا تھا" تصدیق کے لیے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لیے تو فرمایا "بیماری پانچ مہینے تک نہیں رہتی" اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ اور میں نہایت شرمندہ و رنجیدہ اور غم زدہ شہزادہ دانیال کے لشکر میں جے رہتا ہوں متعین کیا گیا تھا ٹھہرا رہا۔ اور حضور اکرم پر درود بھیج کر اور قصیدہ برودہ کا وڈ کر کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی قبول ہوئیں۔ اور میرے پہنچنے کے پانچ ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور کو پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر توجہ اور عنایت فرمائی اور ایک کتاب "جامع رشیدی" کے ترجمہ کے لیے جو کافی ضخیم ہے۔ خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میرے غائبانہ تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی واپسی کے بعد ماہ الہی کی عید بھمن کے دن اس سال کی، اربعہ الاخر کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خٹکی باسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے علامی ابوالفضل کے مشورہ سے مجھے "جامع رشیدی" کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اس انتخاب میں عباسی مصری اموی خلفاء کے شجرہ کو جس کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام نبیوں اور آدم علیہ السلام تک جا کر ختم ہوتا ہے، عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے خدمت شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل کر دیا۔

**کشمیر کی سیر** | ۶ محرم سنہ ۱۰۷۷ کو شہنشاہ کشمیر پہنچ گئے۔ اور اٹھائیس دن تک اس باغ خاصہ کی سیر میں مصروف رہے۔ وہاں کی حکومت دوبارہ میرزا یوسف خاں کے حوالہ کر دی۔ ۶ صفر سنہ ۱۰۷۷ کو وہاں سے مراجعت فرمائی اور کشتی کے ذریعہ کشمیر کی سرحد پر پہنچ گئے۔ راستہ بارہ مولا جاسنچے۔ راستہ میں "زین شکا" نامی تالاب کی بھی سیر کی۔ یہ تالاب دو مشرق اور مغرب پہاڑیوں کے درمیان ہے۔ اس کا دور عیس کوس کا ہے اور بہت گہرا ہے۔ دریائے بیت (بہت) اسی جھیل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے جس کا ذکر تاریخ کشمیر کے تصحیح شدہ نسخہ میں کیا گیا ہے، اس تالاب میں تقریباً ایک جریب پتھر ڈلوا کر ایک بڑا پتھر بنوایا اور اس پر ایسی عالی شان خوش متظر سنگین عمارتیں تعمیر کرائیں کہ انکی مثال ہندوستان کے کسی شہر میں بھی نہیں ملتی۔

**لرزنے والا درخت** | لشکر والے کشمیر میں ایک نہایت انوکھی چیز دیکھ کر آئے تھے، یہ موضع خانپور میں ایک لرزنے والا درخت ہے جس کا تنہ تو دو ہاتھ موٹا اور اسکی بلندی ایک گز سے کچھ زیادہ ہوگی۔ اسکی شاخیں بید مجنوں کی ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ اسکی ایک شاخ کو پکڑ کر ہلادے تو پورا درخت حرکت میں آجاتا ہے۔ اور لرزنے لگتا ہے۔

کشمیر کے بعض عجائبات کا تذکرہ شاہ فتح اللہ شیرازی مرحوم نے اپنے ایک رسالہ میں بھی کیا تھا جو علامہ شیخ ابو الفضل کی تصنیف اکبر نامہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

**پشاور میں ورو دشاہانہ** | یکم ربیع الاول کو رہتاس میں منزل شاہانہ ہوئی اور اسی ماہ کی ۵ تاریخ کو پشاور کی طرف مراجعت فرمائی گئی، ۶ ربیع الثانی کو بادشاہ شہر پشاور میں داخل ہوئے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ بہادر کو درہ نے جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ حاکم اڑیسہ قتلونو خان کے انتقال کے بعد سکت سنگھ ولد مان سنگھ نے اس پر فوج کشی کر دی۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر جنگوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور سمندر کے کنارے تک بنگال کا سارا علاقہ بادشاہی قبضہ میں آگیا۔

لے راجہ مان سنگھ، کچھو بہ خانہ دار کے راجہ بھٹا مل اور بھگوان داس کا ذکر اس سے پہلے حاشیہ میں آچکا ہے۔ مان سنگھ بھگونت (بھگوان داس) کا بیٹا اور بھٹا مل کا پوتا تھا۔ اکبر نے اجمیر سے رانا کیکا کی سرکوبی کے لیے جو لشکر بھیجا تھا اسکی سرداری مان سنگھ کو مرحمت کی تھی۔ اس معرکہ میں مان سنگھ نے ایسی بہادری دکھائی کہ بادشاہ کی نظروں میں چلے گیا۔ رانا کیکا میوڑا کا راجہ تھا، چوڑکی فتح کے بعد تو وہ ہندو ارہ کے کوہستان میں تلحہ کو کندہ بنا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اسکے قبضہ میں اودے پور کنہیل میر جو اردل کے پہاڑوں میں اودے پور سے ۴۰ کوس پہلے تھا، رانا کیکا نے آخر وقت تک اکبر کی اطاعت نہیں کی۔ گو کندہ کے نواح میں مان سنگھ کے مقابل میں وہ شکست کھا کر بھاگا۔ مان سنگھ کی اولاد کی دہشت بدست لڑائی ہوئی تھی۔ ۱۵۹۹ء میں جب محمد حکیم مرزا نے پنجاب پر حملہ کیا تو مان سنگھ اس کے مقابلہ پر گیا اور پشاور سے آگے تک بھاگ دیا۔ ۱۶۰۰ء میں اکبر نے شہزادہ سلیم کی شادی مان سنگھ کی بہن سے کرادی۔ جب ۱۶۰۲ء میں کابل پر بادشاہی قبضہ ہوا۔ تو مان سنگھ کابل کا حاکم بنایا گیا۔ ۱۶۰۳ء میں مان سنگھ کو اڑیسہ بنگال پر قتلونو خان کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا۔ ۱۶۰۴ء میں کوہستان پنجاب پر تقرری ہوئی آخری دور اکبر کی میں مان سنگھ نے شہزادہ سلیم جہانگیر کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ اور جب بنگال میں بغاوت ہوئی تو حسب حکم شاہی خود ہی جا کر یہ بغاوت رفع کی اور ڈھاکہ میں بنگال کی حکمرانی کرتا رہا۔ اکبر کے بعد جہانگیر کے عہد میں بھی اس کی وہی عزت و آبرو رہی، دکن کی ہم میں ۱۶۰۷ء میں وفات پائی اس کا ایک رو کا بھاد سنگھ تھا جسے جہانگیر نے مرزا لاجا کا خطاب دیا تھا۔ کہتے ہیں اسکی ۵۰ سوراخیاں تھیں۔ آج کل بس جگہ تاج محل (روضہ تاج گنج) ہے وہ مان سنگھ کی جائگہ کی اراضی تھی۔



بروز اتوار، اجادی اثنی عشری سورج برج حوت سے برج حمل میں منتقل ہوا جشن نوروز جلوس سلطانی کا اتریسواں سال | منعقد کیا گیا اور جلوس شاہانہ کا ۳۸ واں سال شروع ہو گیا اور چند نئے قوانین اجراء کیے گئے۔

۲۴ جمادی اثنی کو خان خانان اور میرزا جان بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے۔ ان امیروں کو بھی جو اس مہم میں خان خانان کے ہمراہ گئے تھے حسب مراتب منصبوں اور جاگیروں میں ترقی ملی۔ ملتان پہلے میرزا جانی کی جاگیر میں دیا گیا۔ بعد میں اسے ٹھٹھہ اور میرزا رستم کو ملتان کا علاقہ سپرد ہوا جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

اس وقت خبر پہنچی کہ جب خان اعظم نے سورت پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے مظفر گجراتی بھاگ کر کچھ کے ایک مظفر گجراتی کی خودکشی | زمیندار کنکار نامی کے پاس چلا گیا۔ خان اعظم اس کے تعاقب میں کنکار کے سر پر جا پہنچا۔ زمیندار اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور مظفر کو غفلت کی حالت میں قید کر کے خان اعظم کے پاس بھجوا دیا۔ مظفر نے راستہ میں قضاے حاجت کا بہانہ کیا اور ایک استرہ سے جو اس کے بازو بند میں چھپا ہوا تھا اپنا گلا کاٹ لیا۔ اس کا سر خان اعظم کے پاس پہنچا گیا۔ خان اعظم نے اسے ملاحظہ شاہی کے لیے لاہور بھیج دیا۔

انہی دنوں ایک سو بیس ہاتھی جو اریسر کی فتح میں راجہ مان سنگھ کے ہاتھ آئے تھے بنگال سے آئے۔ اکبر نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقفہ وقفہ سے دربار میں حاضر ہوتے رہیں۔ اس سال خان اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا جو چھ سال سے دربار میں نہیں آیا تھا اس نے جونا گڑھ کو فتح کیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے جونا گڑھ لے کر راجہ رائے سنگھ کے حوالہ کر دیا۔

آخری مرتبہ جب خان اعظم بنگالہ سے فتح پور میں آکر باریاب ہوا تھا تو اس نے مذہبی معاملات میں خان اعظم کی حجاز کو روانگی | اکبر سے بہت بحث کی تھی۔ اور بادشاہ کے سامنے ابوالفضل اور بیربر سے سخت گفتگو کی تھی اس لیے

وہ حاضری میں متاثر تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس نے حاتم کی لڑائی میں اپنی منت کے مطابق دائرہ بھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں طنزاً یہ بھی لکھا تھا کہ ”تیری دائرہ اتنی بوجھل ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی ہے“ اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ روانہ کیا۔ یہ جواب بادشاہ کے دل میں کھٹک گیا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بڑی لگائی بھجائی کی۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خان اعظم اسی سال یکم رجب کو اپنے اہل و عیال کے ہمراہ تمام مال و خزانہ لے کر ایک جہاز میں جونا گڑھ سے بندر دیو کو چلا گیا اور جہاز چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس کی روانگی کی تاریخ ایک عدد کی کمی سے یہ کہی گئی ہے۔

بجائے راستاں شہر خان اعظم ولی در زعم شاہنشاہ کج رفت

لے سلطان مظفر گجراتی۔ یہ شخص شاہان گجرات کی وراثت کا دعویٰ دار تھا۔ لیکن گجرات کا آخری فرمان روا سلطان محمود گجراتی لاہور میں تھا اس کے سردار اعتماد خان نے اس سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے مظفر کو تخت پر بٹھا دیا اور یہ مشہور کیا کہ سلطان محمود نے اپنی ایک حرم کو قتل کرنے کے لیے میرے سپرد کر دیا تھا وہ حاملہ تھی اس لیے میں نے اسے چھپا دیا اس سے یہ لڑکا تولد ہوا۔ اصل نام ثمنو تھا۔ اسی لیے ابوالفضل نے اسے مظفر نہیں لکھا۔ تب ہی لکھا ہے۔ ۹۵۰ھ میں جب بادشاہی فوجوں نے گجرات فتح کیا تو مظفر کو شاہی ملازمت میں شامل کر دیا گیا۔ جب اکبر کو اعتماد خان کی زبان معلوم ہوا کہ یہ شاہی خاندان سے نہیں بلکہ گاڈی بان کا لڑکا ہے تو تیس روپیہ و تین سو روپے کے خدمت گاروں میں شامل کر دیا۔ چند روز کرم علی داروغہ خوشبو خانہ کے ماتحت رہا۔ پھر منعم خان خانان کے پاس قید رہا۔ اسکی وفات کے بعد خواجہ شاہ منصور کی نگرانی میں رہا۔ سلسلہ جلوس میں فرار ہو گیا۔ اور گجرات جا کر دوبارہ سرکشی کی آخر سلسلہ میں خودکشی کر کے مر گیا۔

چو پر سیدم نزل تاریخ این سال گفت میرزا کو کہ بہ حج رفت

اس کا یہ جرات مندانہ اقدام بلاشبہ ابن ادھم کے ترک سلطنت کے مشابہ تھا۔

گجرات کے امراء کے تباوے | گجرات کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ اس کی وکالت کے لیے اسماعیل تلی خاں کے بجائے محمد صادق خاں

کو مقرر کیا گیا۔ سورت اور بھدروچ کا علاقہ بھی تلچ خاں سے لے کر صادق خاں کی جاگیر میں دے دیا گیا۔

زین خاں کو کہ اور آصف خاں نے جو سواد اور بجڑ کے پٹھانوں اور جلالہ تاریکی دروشتائی کی سرکوبی کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ حملہ کر کے بہت سے پٹھانوں کو قتل کر دیا۔ اور اس کے بھائی وحدت علی کو اس کے اہل قبیلہ کے ساتھ جو تقریباً ۱۵ ہزار آدمی تھے۔ اسیر کر لیا اور اسی سال دربار میں بھجوا دیا۔

۲۹ ذی قعدہ کو مالوہ کی حکومت شاہ رخ میرزا کو سپرد کی گئی۔ شہباز خاں کنہوتین سال سے قید میں تھا، اس سے سات لاکھ روپیہ نقد لے کر کانگرہ کے قلعہ سے بلا کر رہا کر دیا۔ اسے شاہ رخ میرزا کی وکالت اور مالوہ کے نظم و نسق پر متعین کیا گیا۔

۱۴ ذی قعدہ ۱۰۱۱ھ شیخ مبارک دانشمند کا انتقال ہو گیا۔ اس کے لڑکوں نے تعزیت میں اپنے سر کے بال داڑھی مونچھیں اور ابرو منڈوا دیئے۔ ان کی تاریخ وفات ملک الشعراء شیخ فیضی نے "فخر المکمل" اور میں نے "شیخ کامل" نکالی۔

۸ محرم ۱۰۱۲ھ کو میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا بن ہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی جو ملک داوڑ اور اس کے نواحی علاقہ کا حاکم تھا۔ اور قندھار و گرم سیرپاس کے بڑے بھائی میرزا مظفر حسین کی حکمرانی تھی۔ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے تمام اہل و عیال بھائی بندوں کے ساتھ ہندوستان آگیا اور بادشاہ کے پاس باریاب ہوا۔ اس کے استقبال کے لیے بادشاہ نے حکیم عین الملک کو بھیجا تھا۔ اور اس کے لیے سراپردہ بارگاہ قالین اور فراش خانہ کا دوسرا ساز و سامان مرصع کمرپشہ اور خنجر بھی روانہ کیا۔ جب وہ لاہور سے چار کوس پر پہنچا تو حسب الحکم خان خاناں زین خاں کو کہ اور دوسرے تمام اکابر امرادیشوائی کے لیے روانہ ہوئے۔ باریابی کے وقت اس کو ایک کروڑ تک نقد انعام دیا گیا۔ اور پانچ ہزاری امراء میں اس کو داخل کیا گیا۔ اور ملتان اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

دکن کی مہم پر دانیال اور خان خاناں کا تقرر | ملک الشعراء شیخ فیضی کچھ دن پہلے دکن سے آچکا تھا اس کی آمد کے چار ماہ بعد حکام دکن کے ایچی دربار میں آئے۔ چونکہ برہان الملک نے خاطر خواہ پیش کش نہیں بھیجی تھی

اکبر نے ۱۱ محرم کو شہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر مقرر کیا۔ خان خاناں اور رائے سنگھ اس کے وکیل مقرر ہوئے۔ اور دوسرے

لے شاہ رخ میرزا۔ مرزا سلیمان کا پوتا اور میرزا ابراہیم کا بیٹا تھا، ماں کا نام محترمہ خانم تھا، باپ تو پیدا ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔ ماں اسے لے کر کاشغر چل گئی۔

جب جوان ہوا تو بدخشاں کے لیے دادا اور پوتے میں کئی ایک لڑائیاں ہوئیں۔ اس خانہ جنگی سے ناکدہ اٹھا کر اوزبکوں نے بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔ مرزا سلیمان کا بل اور شاہ رخ مرزا ۱۰۱۳ھ میں ہندوستان آگیا۔ سلسلہ میں اکبر نے اپنی بیٹی شکرن بیگم کی اس سے شادی کر دی، پانچ ہزاری منصب دے کر مالوہ بھیج دیا۔ آخری عہد اکبری میں ہفت ہزاری منصب ملا۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے: "یدہا سادہ حازک ہے اس نے مجھے کبھی نہیں تیا۔ ۲۰ برس ہوئے ہندوستان میں آیا ہے۔ ہندی زبان یا سنگل نہیں سانتا۔" سلسلہ میں، جین میں انتقال کیا۔ شہر کے باہر دفن کیا گیا ۱۱۰۰ھ میں۔ پیر خاں کا ذکر ۱۰۱۱ھ میں لاہور میں ہوا۔

بہت سے امراء ہمراہی کے لیے نامزد کیے گئے۔ اس مہم پر روانگی سے پہلے بادشاہ نے شہزادہ دانیال کا خان خانان کی بیٹی سے نکاح کرایا۔ اس خوشی میں ایک شاندار جشن منعقد ہوا۔ شہزادہ کو اس قدر نقد روپیہ اور مال و اسباب جمیز میں ملا کہ ایک لشکر کا پورا سامان اس سے ہو سکتا تھا۔ شادی کے بعد اکبر نے دانیال کو تمام شاہی لوازمات اور شان و شوکت کا سامان مرحمت کر کے اس مہم پر رخصت کر دیا۔ خود بھی اس کے پیچھے لشکر کے ارادہ سے سلطان پور کی ندی تک جو لاہور سے پچیس کوس پر ہے گیا، وہاں پہنچنے کے بعد بادشاہ کی رائے بدل گئی۔ اور شہزادہ کو مراجعت کا حکم دے کر خان خانان کو بھی جو سر ہند تک پہنچ چکا تھا مشورہ کے لیے بلوایا اور اس کو اس لشکر کا مستقل سردار بنا کر اور مہم کے ضروری انتظامات کر کے دوبارہ لشکر کو رخصت کر دیا اور وہاں سے لاہور لوٹ آیا۔

روز جمعہ ۸ جمادی الثانی ۹۷۸ھ میں شیخ عبداللہ خلف میاں شیخ داؤد نے انتقال فرمایا۔ انکی تاریخ "جان پاک شیخ داؤد" نکالی گئی۔

دقیقہ حاشیہ صفحہ سابقہ: میں پیدائش ہوئی، ان کی ماں سلیمہ سلطان بیگم جمال خاں میواتی کی بیٹی، حسن خاں میواتی کی بھتیجی تھی، بڑی بن اکبر کے حرم میں تھی، اکبر نامہ، اکبر نے روئے کا نام عبدالرحیم رکھا۔ بیگم خاں کی شہادت کے بعد ماں بچہ کو لے کر گجرات میں سے احمد آباد پہنچی، چار ماہ بعد اکبر نے ان کو فتح پور بلا لیا۔ سلیم بیگم سے بادشاہ نے نکاح کر لیا، عبدالرحیم کی اکبر کے سایہ عاطفت میں پرورش ہوئی۔ عربی، ترکی، فارسی، سنسکرت زبانوں کی تحصیل کی۔ اکبر اسے مرزا خاں کہا کرتا تھا۔ نہایت ثور و حسین جوان تھا۔ اکبر نے مرزا عزیز کو کھٹاش خان اعظم کی بن ماہ بانو بیگم سے نکاح کر دیا۔ ۹۷۸ھ میں جب اکبر احمد آباد گجرات گیا تو عبدالرحیم ۱۳ سال کا تھا اس کے باوجود اس نے بڑی بہادری سے اس معرکہ میں حصہ لیا۔ ۹۷۹ھ میں عرض بیگی کا منصب ملا۔ ۹۷۹ھ میں اس کی عمر ۲۸-۳۰ سال ہوئی۔ شہزادہ سلیم جہانگیر کی بارہ تیرہ برس۔ اکبر نے شہزادہ کا اتالیق مقرر کر دیا۔ ۹۷۹ھ میں مظفر گجرات کے مقابلہ میں سالار لشکر بن کر احمد آباد گجرات پر فوج کشی کی اور فتح پائی، خان خانان کا آبائی خطاب حاصل کیا۔ ۹۷۹ھ تک وہ گجرات کی حکومت پر رہے۔ ۹۷۹ھ میں وکیل مطلق کا عہدہ ملا اور باپ کی پرانی گدی ہاتھ آئی۔ ۹۷۹ھ میں عثمان اور بیکر کی جاگیر ملی اور مرزا جان کو شکست دے کر سیوستان پر قبضہ کر لیا۔ ۹۷۹ھ میں شہزادہ مراد کے ساتھ دکن کی مہم میں شامل رہے۔ لیکن چاندنی کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ۹۷۹ھ میں عادل بادشاہ کے سپہ سالار سبیل خاں کو شکست دی۔ خان خانان اور شہزادہ مراد میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اسی جھگڑے میں اکبر سے رنجش ہو گئی۔ ۹۷۹ھ میں شہزادہ دانیال کا خان خانان کی لڑکی چانان بیگم سے نکاح ہوا اور خان خانان دانیال کے ساتھ دکن کی مہم پر گئے۔ ۹۷۹ھ میں جب چاندنی کی کو اس کے ایروں نے شہید کر دیا تو خان خانان کا احمد نگر پر قبضہ ہو سکا۔ ۹۷۹ھ میں تلنگانہ کے علاقے فتح کیے۔ اکبر کے بعد جہانگیر بادشاہ ہوا تو خان خانان دکن ہی میں تھے۔ ۹۷۹ھ میں جہانگیری دربار میں آئے۔ جب حاجت خاں کا زور ٹوٹا تو خان خانان اس کے تعاقب میں شکرے کر دوبارہ سے رواد ہوئے اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، درہل پہنچے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ ۹۷۹ھ کے وسط میں انتقال ہو گیا، ان کی تاریخ وفات "۷۷ سپہ سالار کو" سے نکلتی ہے۔ خان خانان نہایت علم دوست، شیریں کلام، شاعر، منتظم، فارسی میں ان کی متفرق غزلیں اور رباعیاں ملتی ہیں جو نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کا ایک لڑکا میرزا ایرج تھا جسے ۹۷۹ھ میں جہانگیر نے شاہنواز خاں کا خطاب دیا۔ ۹۷۹ھ سے ۹۷۹ھ تک اس نے دکن میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ خان خانان کی بہادری، سخاوت، علم دوستی اور مزاج کے بڑے عمدے مشہور ہیں۔ ان کی غزل کے چند شعر ہیں:-

نثار شوق نہ انستہ ام کہ تاجند است  
جز این قدر کہ دلم سخت آرزو مند است  
ادائے حق، محبت عنایت ست نہ دوست  
وگر نہ خاطر عاشق بہ بیچ خوردند است  
نہ زلف دامن و نہ دامن این قدر دامن  
کہ پاتا بہ سرم ہر چہ بہت در بند است  
بدوستی کہ بجز دوستی نہ دامن  
خداوند آن کو مرا خداوند است  
ازین خوشم بہ سخن ہائے عالیہائے رحیم  
کہ اندکے بادا ہائے دوست مانند است

میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جتنے واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا ماخذ "طبقات اکبر شاہی" ہے، جس کا نام میں نے تاریخ کی رو سے "نظامی" رکھا ہے۔ یہ نام اس کے مصنف نے بھی پسند کیا تھا اور اسے اپنی کتاب کے ساتھ درج کیا تھا۔ اس کے بعد دو سال کے واقعات میں مجملہ بیان کروں گا۔

انتالیسواں سن جلوس | بروز پیر ۲۸ جمادی الثانی ۱۰۲۸ھ نوروز ہوا اور جلوس سلطانی کا ۳۹ واں سال شروع ہو گیا۔ حسب سابق ۸ دن تک بڑے عیش و طرب کے ہنگامے گرم رہے اور نئے نئے قوانین کا اجرا ہوا۔

کو توالی کے انتظامات | کو توالوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر کا کو توال اپنے شہر کے تمام محلوں اور گھروں کے حالات سے باخبر رہے اور ہر محلہ سے اس بات کا چمک لکھوا لے کہ جو شخص تاجر یا سپاہی یا کوئی اور پیشہ وران کے محلہ میں آکر ٹھہرے وہ ان کے حالات سے باخبر رہے گا۔ کسی مفسد یا چور کو اپنے محلہ میں رہنے نہیں دے گا۔ جس آدمی کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ دکھائی دے اس کی تحقیقات کر کے کو توال کو باخبر کر دے گا، کیونکہ اسکی فضول خرچیاں ناجائز آمدنی ہی کے سبب ہو سکتی ہیں۔ محلہ میں خوشی اور غمی کی جو تقریبیں ہوں خصوصاً نکاح، ولادت، قتل وغیرہ کے واقعات سے محلہ والے کو توال کو لازماً مطلع کر دیا کریں، کو توال ایک معتبر آدمی ہمیشہ ہر محلہ گلی بازار اور پانی کی گزرگاہ پر متعین رکھے اور لوگوں کی اچھائی برائی کو اپنی نظر میں رکھے راستوں کی ایسی ناکہ بندی کی جائے کہ بھاگا ہوا کوئی شخص یا بھولا بھٹکا آدمی بچ کر نہ جاسکے۔ کوئی سوداگر بغیر اجازت گھوڑے نہ لے جائے اور سوداگر ہندوستان سے غلاموں کو لے کر نہ جاسکیں۔

لین دین کے قاعدے | سونے چاندی اور کپڑوں کا نرخ بھی متعین کیا گیا کہ ان کا لین دین سرکاری شرح پر ہو اور منافع پر مقررہ ٹیکس سرکاری خزانہ میں داخل کیا جائے۔ میتوں کے مال پر ایک داروغہ مقرر کیا جائے تاکہ تحقیقات کے بعد اگر اس کے ذمہ کچھ سرکاری بقایا ہو یا مرنے والا کروڑی، عملدار یا فوطہ دار ہو تو اس کا مال ضبط کر لیا جائے ورنہ اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ جب تک بیت المال کے داروغہ کی اجازت نہ مل جائے میتوں کو دفن نہ کیا جائے۔

آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ شہر کی مشرقی جانب رکھا جائے۔ اگر کوئی "درشنی مرید" مرجائے تو خواہ مرد ہو یا عورت، کچا انج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن میں باندھ کر دریا میں بہا دیں، جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلادی جائے۔ یا چینیوں کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں۔

قانون ازدواج | نکاح سے پہلے دولہا اور دولہن کو کو توالی میں لا کر جب تک کو توال کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا قوانین سے عوام کو جو فائدہ یا نقصان ہوا وہ ہوا، لیکن ان کے نفاذ سے کو توالی کے ملازمین اور تمام بد معاشوں کی خوب بن آئی اور انہوں نے رشوت میں اپنے ہاتھ خوب رنگے۔

ایک حکم یہ دیا گیا کہ جو عورت اپنے شوہر سے بارہ سال بڑی ہو شوہر اس سے صحبت نہ کرے۔ جو نو جوان عورت شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے پردہ گھومتی نظر آئے یا ایسی مکار عورت جو شوہر سے لوطی جھگڑتی رہتی ہو فاحشہ عورتوں کے محلہ میں بھجوا دی جائے۔ بھوک اور حالت اضطرار میں ماں باپ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کر دیں اور جب ان کی نگلی رفع ہو جائے

تو وہ روپیہ دے کر اپنے بچوں کو چھوڑا۔

**تبدیل مذہب کی آزادی** | وہ ہندو جو بچپن میں یا یہ جبر مسلمان بنالیے گئے ہوں انہیں اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو دوبارہ اپنے کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریقت ہو کر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے۔

بت خانہ گرجا آتش کدہ کسی بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں کافروں پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔

**مالی قوانین کی تفصیلات** | یہ چند احکام تھے جن کا تعلق مذہبی معاملات سے تھا ان کو مختصر لکھ دیا گیا۔ ان کی تفصیل میری قوت تحریر سے باہر ہے۔ اسی طرح وہ سارے قوانین جو ملکی اور مالی امور سے متعلق ہیں جیسے بیوتات دارالضرب، فوج رعیت سوداگری، چوکی، واقعہ نویسی، کروڑی، داغ و محلی، ہاتھیوں کی لڑائی، ہرن، چتیا، مرغ، بکری، کتے اور سود کی لڑائی۔ اسی طرح اصطبل کے ضوابط، کھانے پینے، سونے اٹھنے کے اوقات، کاتین، غرض چھوٹے بڑے سارے معاملات سے متعلق جو قاعدے ضابطے بنائے گئے۔ انہیں بیان کرنے کے لیے بھی ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ یہ تفصیلات اکبر نامہ کے دوسرے دفتر آئین اکبری، میں جسے علامی شیخ ابوالفضل نے ایک ضخیم جلد میں تصنیف کیا ہے دیکھی جاسکتی ہیں۔

**تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب** | تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خاں مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے جو بڑا اچھا مددگار تھا اور اادیوں میں ملازم ہے انجام دیا اور اس کے پتے دفتر کو مکمل کر کے اس جشن نوروز میں شرف آفتاب کے دن ملاحظہ شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے ملا احمد، انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے۔ اس لیے اس کے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کر دو۔ میں نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کر دی۔ لیکن اس خوف سے کہ مبادا منجھ پر بھی تعصب کا الزام آجائے۔ میں نے اس کے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی۔ بس سنوں وغیرہ کی ترتیب درست کر دی۔ اور اس کو اسی حال میں رہنے دیا تاکہ میرے ساتھ کوئی نئی پرغاش پیدا نہ ہو جائے۔

**فیضی کی غیر منقوطہ تفسیر** | انہی دنوں ملک الشعراء شیخ فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر "سواطع الالہام" کے نام سے لکھی جس کی ضخامت ۵۷ جز کی تھی۔ اور اول سے آخر تک غیر منقوطہ تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے ۹۹ غیر منقوطہ

فقروں سے اس کی تاریخ بھی نکالی اور اس کے چند جز اشاعت کے لیے عراق بھجوائے۔ اس سال فیضی اس کے تصحیح و مقابلہ میں مصروف ہے۔ اس نظر ثانی کی تاریخ "امراۃ ثانی" سے نکلتی ہے۔ اکثر عالموں نے اس تفسیر پر ترقی یطیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی میں تقریب لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے اس کی تاریخ نکالی۔ "ذو الحلیف ولا یالس"

الافی کتاب قبیل "میر محمد حیدر معانی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۃ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی۔ میں نے من احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم علم القرآن سے تاریخ نکالی۔ ایک تقریب بھی میں نے اس پر لکھی جس کا ذکر مناسب مقام



پر آئے گا۔ میں نے لاہور کی شکارگاہ میں جو تیس تاریخی قعرے نکلے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔ ”الحمد لله حصل المرام اکرم سوا طبع الالہام“  
 ”اللہم المحرر وحده لا طار اس الکلام“ ”حدود اسرار کلام اللہ المرسل درر السرر“ ”سمو السرد الدرر علو“ وغیرہ۔  
 ماہ صفر ۱۲۸۵ھ میں خواجہ ابراہیم حسین احمدی جو میرے خاص آدمیوں میں سے تھا فوت ہو گیا۔ اس نے خواجہ ابراہیم حسین  
 تاریخ پائی۔

اس سال میں نے توفیق خداوندی سے کلام پاک کی خط نسخ میں نہایت روشن اور صاف کتابت کی۔ اور اسے پورا کر کے  
 یہاں شیخ داؤد حسین والی کے روضہ کے لیے وقف کرا دیا۔

محمد قاسم خاں میر بکر کا قتل | اسی سال، اذی قعدہ کو محمد قاسم خاں میر بکر اور میرزا محمد زماں جو شاہ رخ میرزا کا لڑکا تھا۔  
 کابل میں مارے گئے۔ محمد زماں میرزا حج سے واپسی کے بعد بدخشاں میں آیا۔ بدخشاں والے  
 اوزبکوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے انہوں نے اسی کو اپنا سردار بنالیا۔ اور ہندوستان کی مدد کے بل پر بڑی بہادری سے  
 اوزبکوں پر حملہ کر دیا۔ بعد میں اوزبک ایک کثیر فوج لے کر محمد زماں میرزا کے مقابلہ پر آئے۔ وہ اپنی قوت بھر چند سال تک برابر  
 اوزبکوں سے لڑتا رہا۔ آخر کار شکست کھا کر بھاگا۔ اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ ہندوستان کے ارادہ سے کابل کے  
 نواح میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اسے لوگوں نے بگایا تو کابل کے لیے اس کی نیت ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اس کے ارادوں  
 کو بھانپ کر حاکم کابل محمد قاسم خاں نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ اور اسے گھوڑا،  
 خرچ اور خلعت دے کر ڈیرہ سو سواروں کو اس کی ہمراہی کے لیے متعین کر دیا، اس کا ارادہ تھا کہ میرزا کو لاہور بھجوادے  
 اسی اثناء میں محمد قاسم خاں کے بعض بدخشی اور کابل ملازموں نے میرزا سے ساز باز کی اور دوپہر کو سرکاری حویلی کا دروازہ توڑ کر  
 زبردستی اندر داخل ہو گئے اور خواب گاہ میں جا کر محمد قاسم خاں کو تہ تیغ کر دیا۔

محمد ہاشم ولد محمد قاسم خاں اس وقت قلعہ سے باہر تھا۔ اس نے توپچیوں اور محافظ دستے کی ایک جمعیت لے کر میرزا محمد زماں  
 کا محاصرہ کر لیا اور ایک دن ایک رات مسلسل جنگ کر کے میرزا کو قتل کر دیا اور اس کا سردار بارہا میں بھجوا دیا۔

اس واقعہ کے بعد بادشاہ نے محمد قلیج خاں کو جو کچھ عرصہ تک جملہ الملک (مختار کل) رہ چکا تھا کابل کی حکومت پر مقرر کر کے روانہ کر دیا  
 دیوان مطلق کے عہدہ پر تمام ملکی اور مالی معاملات سرانجام دینے کے لیے خواجہ شمس الدین محمد خوانی کا تقرر عمل میں آیا۔

انہی دنوں آصف خاں بخش کو کشمیر کے انتظامی معاملات اور فوجی مہمات کی تحقیق و انتظام کے لیے روانہ کیا گیا۔

میں بعض ناشائستہ عادتوں میں مبتلا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سال مجھے توبہ کی توفیق عطا کی اور میں نے اپنی بد اعمالیوں سے سچے  
 دل سے ساتھ توبہ واستغفار کی۔ اس توبہ کی تاریخ لفظ ”استقامت“ سے حاصل ہوئی۔ میری توبہ پر ملک الشعراء فیض نے  
 یہ شعر کہا ہے

لَقَدْ تَابَ شَيْخِي عَنِ الْخُوبَةِ  
 تَابَ مِنْهُ سَابِقُ التَّوْبَةِ

غرض یہ کہ

رفت از سرم اندیشه سے و معشوق  
بشد ز خاطر آواز بر بط و طنبور

آغاز محرم سن ۱۱۷۰ھ میں شیخ فرید بخاری کو جوان دنوں آصف خاں کے ساتھ مددگار بخشی کے عہدہ پر مامور تھا حکم دیا گیا کہ وہ شمالی کوہستان پر فوج کشی کر کے وہاں کے سرکش راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کرے اور وہاں کی اراکیت کی جمع بندی کر کے عمدہ پیش کش لے کر آئے۔

آغاز سفر میں بادشاہ نے دریائے راوی کو عبور کیا اور اس علاقہ میں ۲۵ دن تک سیر و شکار میں مصروف رہا۔

**داستان نل و دمن کی تصنیف** | انہی دنوں بادشاہ نے ملک الشعراء فیضی کو "پنج گنج" تصنیف کرنے کا حکم دیا۔ اس نے تقریباً پانچ ماہ کی مدت میں ہندوستان کی مشہور عشقیہ داستان "نل و دمن" کو چار ہزار کچھ کم دوسو اشعار میں مرتب کر کے ہندوت شاہی میں چند اشرافیوں کے تذرانے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کو نہایت پسند آئی اس کی کتابت اور تصدیق میں ہوانے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کتاب کا مطلع ہے۔

اے درنگ و پوئی تو آغاز

عناقے نظر بلند پر واز

واقعہ یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان تین سو سال میں ایر خسرو کے بعد شاید ہی کسی نے ہندوستان میں ایسی عمدہ مثنوی لکھی ہو۔

**مرزا نظام الدین احمد کا انتقال** | میرزا نظام الدین کی تلج خاں کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرزا کا بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا۔ اس نے منوہ فرائض بھی نہایت دیانت داری و محنت اور خلوص سے انجام دیے۔ اس کی حسن کارگزاری کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ نے تلج خاں اور دوسرے مقربین کو تو مختلف مقامات پر تقرر کر کے دربار سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن نظام الدین احمد پر بادشاہ کی عنایات پہلے سے کہیں زیادہ مجذول رہیں۔ بادشاہ نے اس کو ہر قابل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن تقدیر کے فیصلے انسانی ارادوں کے پابند نہیں ہوتے۔ نظام الدین احمد اپنی ترقی اور اقتدار کے اس دور عروج میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ سال تھی۔ اس مرض میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تمام دوستوں کو آبدیدہ چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے حسن اخلاق نے سب کو ہی گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن خاص طور سے میرا ان کا تعلق نہایت بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ ان کی موت کا مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ بحر اشک حسرت بہانے اور صبر کرنے کے اور کیا چارہ تھا۔ میں نے اس صدمہ کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کسی کی محبت کا دم بھرنے اس دنیا میں بے فائدہ ہے۔ ان دوستیوں سے تو گوشہ عزلت ہی زیادہ بہتر۔

نظام الدین احمد کی وفات ۳ صفر سن ۱۱۷۰ھ میں ہوئی۔ ان کی میت لشکر سے لاہور میں لائی گئی۔ اور ان کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے جنازہ پر خاص کیا عام کیا بھی زار زار رو رہے تھے۔ لوگ ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے قصے یاد کر کے بڑی حسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی تاریخ وفات کے لیے یہ قطعہ موزون ہو گیا:

رفت میرزا نظام الدین احمد سوئے عقبی و حجت و زیارت  
جوہر او کہ زبس کہ عالی بود در جوار ملک تعالے رفت  
قادری یافت سال تاربخش  
گوہر بے باز دنیا رفت

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ فرید کو جس کو بخشی گری کی تقریباً تمام ذمہ داریاں سپرد ہو چکی تھیں اور وہ کوہستان سواک پر  
ہج کشی کے لیے گیا ہوا تھا واپس بلایا اور اس کی جگہ قاضی حسین قزوینی کا تقرر کر دیا گیا۔

انہی دنوں اعظم خاں جو کہ کو گیا ہوا تھا وہاں کے امراء کے ہاتھوں تنگ آ کر حج  
سے ہندوستان واپس آ گیا اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اس کی شان بے نیازی جاتی  
تھی چنانچہ اس نے اپنی ساری پسندیدہ خصوصیات کو خیر باد کہہ دیا۔ اور بادشاہی مریدوں میں داخل ہو کر تعظیم و تسلیم کے  
مقررہ لوازمات کی پابجائی کی۔ بادشاہی مسجد بھی کر گزارا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار سرکاری میں اس کا چراغ جلنے لگا اور محفلوں  
ملوؤں ہر جگہ اور ہر موقع پر وہ پیش پیش نظر آنے لگا۔ بادشاہ نے اسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں مرحمت فرمایا۔  
وہ ابوالفضل کے پاس بیٹھ کر نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا۔

اس سال (۱۰۳۳ھ) نومبر رجب کو نوروز واقع ہوا اور جلوس سلطانی کے چالیسویں سال کا  
آغاز ہو گیا۔ جشن نوروز کی ساری تیاریاں حسب سابق سرانجام پائیں۔

نوروز سے دو دن پہلے مجھے دیوان خانہ خاص و عام کے جھروکے میں بلوایا۔ اور  
براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”ہم  
آپ کو اشارہ میری طرف تھا، صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی تلوار  
آپ کے تعصب کی رگ کو کاٹ نہیں سکتی۔“ شیخ ابوالفضل نے پوچھا۔ ”صاحب اس نے کس کتاب میں ایسا کچھ لکھ دیا کہ آپ اس کے  
معلق یہ ارشاد فرماتے ہیں۔“ اکبر نے فرمایا ”اسی رزم نامہ یعنی مہاجرات میں کل رات ہم نے اس کی تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا  
ہے۔“ شیخ نے کہا ”اس سے غلطی ہو گئی“ اس وقت مجبوراً آگے بڑھ کر کہنا پڑا، ”کترین تو بس ایک مترجم ہے۔ اس سے زیادہ نہیں  
کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً میں  
موردار ہوں۔“ شیخ نے بھی اس بات کی تائید کی اور بادشاہ سلامت خاموش رہ گئے۔

اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ رزم نامہ میں میں نے ایک حکایت نقل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ ”ایک پنڈت نے عالم نزع  
میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ غفلت و جہالت ترک کر کے سب سے پہلے اس صانع حقیقی کو پہچانے۔ اور  
م حکمت کا راستہ اختیار کرے اور علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا بھروسہ نہ رکھے۔ حسن عمل کو اختیار کیے تاہم ان کا  
بلوؤں سے بچا ہے اور اس کا یقین کامل رکھے کہ ہر فعل کی باز پرس ہو کر رہے گی۔ اس موقع پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا

ہر عمل اجر سے و ہر کردہ جزائے دارد

## ہندومت میں جزائے اعمال کا تصور

بس یہ عبارت اور یہ مصرع تھا جو کھٹک گیا اور اکبر نے اس کو منکر نکیر کے سوال جواب

حشر و نشر آخرت کے حساب و میزان پر محمول کیا یہ بات چونکہ اس کے عقیدہ  
تناسخ کے خلاف تھی جس کے سوا وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس نے مجھ پر ملاپن اور تعصب پرستی کا الزام لگا دیا  
یہ بات خوب چھڑی اور اچھا موقع نکل آیا۔ چنانچہ میں نے مقربان شاہی کو بخوبی سمجھایا کہ ہندوستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی  
کے اچھے اور برے انجام کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو ایک عمر جو بندوں کے نامہ  
اعمال کو زندگی بھر لکھتا رہتا ہے۔ روحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کے سامنے جس کا نام بادشاہ عدل ہے لے جاتا ہے۔  
اور وہ نیکی اور بدی کے اندراجات دیکھ کر اور ان کی کمی زیادتی کا مقابلہ کر کے حکم لگاتا ہے کہ یہ شخص مجیر دیک، ہے۔ پھر اس  
نیک روح سے کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے تو تجھے جنت میں لے جائیں گے تاکہ تو وہاں اپنی نیکیوں کے برابر لذتوں سے لطف اندوز ہو  
جائے۔ بعد میں تجھے دوزخ میں ڈالا جائے گا تاکہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو پہلے تجھے دوزخ میں پھر بعد میں  
جنت میں لے جایا جائے جب وہ دوزخ و جنت کی اس مدت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر اسے دنیا میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے  
اعمال کے مطابق کسی جسم میں حلول کر کے زندگی کی چند گردشوں میں گھومتا رہے۔ یہاں تک کہ اسے نجات مطلق مل جائے اور وہ دنیا میں  
آنے اور جانے کی اس رحمت سے چھٹکارا پالے۔ میری اس توضیح و تقریر پر وہ معاند رفت گزشت ہو گیا۔

## اجمیر کی تولیت کی تجویز

شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر فلاں  
عبدالقادر مصنف کتاب، کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضہ کی تولیت دے دیں تو کیا رہے گا  
کیونکہ اس روضہ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔ صدر جہاں نے کہا یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ میں بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں  
سے کسی طرح نجات مل جائے۔ اس غرض کے لیے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں برسی کو ششیش بھی کیں اور دو تین عرضیاں  
بھی لکھ کر پیش کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس سال آخر ماہ رمضان کو صدر جہاں نے بارگاہ شاہی میں عرض کیا کہ فلاں عبدالقادر کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے۔  
بادشاہ نے فرمایا "یہاں بہت سے کام نکلتے رہتے ہیں اور ہم اسے کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کام کے  
آدمی کو مہیا کر لو تو دیکھا جائے گا۔ بہر حال خدا کی مصلحت میں تھی رخصت نہ ملے اور میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

انہی دنوں ایک دن میرے سہنے اکبر نے شیخ ابوالفضل سے فرمایا "فلاں عبدالقادر، اجمیر کی خدمت کو یہ حسن و خوبی انجام  
دے گا۔ لیکن ہم اس سے جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ نہایت اچھی طرح جاری خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے۔ اس لیے ہم اسے  
جدا نہیں کرنا چاہتے۔" شیخ ابوالفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

## بحر الاسماء کی تصنیف

اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جن ہندی افسانہ کا بحر الاسماء نام  
سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے کیسے کر دو۔

میں نے اس کام کو شروع کر دیا اور اس کتاب کی آخری جلد کو جس کی ضخامت ساٹھ جزو کی ہے پانچ مہینے میں پورا کر دیا۔ اسی اثنا  
میں بادشاہ - لانت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا کہ

بحر الاسما کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے۔ اس کو بھی تم مروجہ زبان میں تحریر کرو اور اس اپنے ترجمہ کیے ہوئے مسودہ کو حفاظت سے رکھے رہو۔ میں نے زمین بوس ہو کر سروسیم اس خدمت کو قبول کر لیا اور اس کام کو شروع کر دیا۔ بادشاہ نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ دس ہزار تنگہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ میں نے کہا انشاء اللہ یہ کتاب انہی دو تین ماہ کے اندر بہ حسن و خوبی مرتب ہو جائے گی تب کہیں جا کر مجھے وطن جانے کی رخصت مل سکے گی۔

دکن کی مہم پر شہزادہ مراد اور خان خانان کا تقرر | اسی سال ہندوستان سے حکیم عین الملک اور شہباز خاں کے عریضے پہنچے کہ برہان الملک کو اس کی بدسلوکی سے ناراض ہو کر امرائے قتل کرادیا اور ایک بارہ سالہ لڑکے کو اس کا ولی عہد بنا کر تخت نشین کر دیا ہے۔ بادشاہ نے ایک فرمان شہزادہ مراد کے اور دوسرا خان خانان کے نام لکھ کر بھیجا کہ دونوں جلد از جلد کوچ کر کے تسخیر دکن کے لیے سرحدوں پر پہنچ جائیں۔

شاہ بیگ خاں کی فوج کشی اور فتح | اس سال ادائل ماہ ذی الحجہ میں شاہ بیگ خاں کاہلی قندھار کو چلا گیا اور میرزا مظفر حسین حاکم قندھار قرا بیگ میر شکار کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا۔ بھاری نذرانوں ایک قیمتی جواہر بھی پیش کیا۔ بادشاہ نے اس پر عنایت فرمائی۔ شاہ بیگ خاں نے وادیں جا کر اوزبکوں کی ایک بڑی فوج کو شکست دی۔ ان کے اکثر سرداروں کو قتل کر دیا اور بقیہ اسیروں کو خلعتیں دے کر رہا کر دیا۔ اوزبکوں کی ایک جمعیت بھاگ کر قلعہ بند ہو گئی تھی۔ شاہ بیگ خاں نے توپ خانہ کے ساتھ قلعہ پر حملہ کیا۔ اور اس پر قبضہ کر کے آگے کوچ کر دیا۔ گرم سیر کے سارے علاقہ پر اس نے بھول قابو پایا۔

بادشاہ نے میرزا رستم کو صوبہ چیتور عطا کیا اور سنبل کا علاقہ ابو الفضل سے لے کر میرزا قندھاری کو جاگیر میں دے دیا۔ ملتان کو جو میرزا رستم کے مظالم سے تباہ ہو گیا تھا خالصہ میں شامل کر لیا۔ انہی دنوں سعید خان مغل بنگالہ سے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ عیسیٰ خاں زمیندار کے دیئے ہوئے نفیس تحفے روپیہ اور باتنی بہ طور پیش کش لے کر آیا۔

شیخ یعقوب کشمیری کی وفات | اسی سال شیخ یعقوب کشمیری صوفی جو دربار سے رخصت لے کر اپنے وطن گیا ہوا تھا فوت ہو گیا۔

یار ماں ہمہ رقتہ در رہ کعبہ گردش ماست قدم بردار خار بماندیم

از نکتہ مقصود نہ شد فہم حدیثے لادین دلا دنیا بے کار بماندیم

حکیم عین الملک کا انتقال | حکیم عین الملک راجہ علی خاں کے پاس سفیر بن کر گیا تھا۔ وہاں سے اپنی جاگیر ہندوستان میں لوٹ کر آیا۔ اور پانچ مہینے کی بیماری کے بعد ۲ ذی الحجہ ۱۰۳۱ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

اللہ کی شان ہے کہ تمام دوست اور رفیق ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جا رہے ہیں اور ہم اسی سیاہ ولی اور پریشان حال کے ساتھ آخرت سے غافل بے ہودہ مشاغل میں عمر عزیز گنوانے میں لگے ہوئے ہیں۔



حکیم حسن گیلانی کا انتقال | ۳ ماہ محرم سنہ ۱۲۸۵ھ کو حکیم حسن گیلانی کا بھی انتقال ہو گیا۔ حکیم حسن نہایت درویش مزاج مہربان اور صاحب اخلاق تھا۔

انہی دنوں مخدوم شیخ حامد کالہ کا شیخ موسیٰ گیلانی جو اچھ کے سجادہ نشین شیخ عبدالقادر کا چھوٹا بھائی ہے۔ ملازمت شاہوادی میں داخل ہوا بادشاہ نے اسے پانصدی کا منصب عطا کیا۔

مفتی صدر جہاں دین الہی کا پیرو | اسی مہینے مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں کو ہزاری منصب مرحمت ہوا۔ اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مریدان خاص میں شامل ہو گیا۔ ہزاری کی منصب اسی مریدی کا معاوضہ تھا۔

مرید ہونے کے بعد اس نے پوچھا "میری دائرہ کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے" بادشاہ نے کہا "رہنے دو"۔

اس عرصہ میں اور جو لوگ بادشاہی مرید بنے ان میں سے ایک تو ملا تقی شتری ہے جو اپنے آپ کو اعلم العلماء سمجھے ہوئے ہے۔ آج کل وہ حسب الحکم شاہنامہ کونٹریں لکھ رہا ہے۔ اپنی تحریر میں جہاں بھی آفتاب کا نام آتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ جلت غلظت و عزت شانہ۔ بڑی عظمت اور بڑی شان والا، یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ضرور لکھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ زادہ گو سالہ خام نامی بنارس۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور صوفی احمد مطرب مسند صادق دہلوی جو خود کو حضرت غوث الثقلین کی اولاد میں سے بتاتا ہے مرید بنائے گئے۔ ان سب لوگوں نے "مراتب اخلاص چارگانہ" کو قبول کر لیا۔ اور ایک صدی سے پانصدی تک کا منصب حاصل کر لیا۔ بڑی عقیدت سے دائرہ منڈواڈالی۔ ان کی تاریخ "موتراش چند" سے نکلتی ہے۔

ان نو مریدوں کا حال بس ایسا ہی تھا کہ ایک ہندو مسلمان ہو گیا۔ اس خوشی میں لوگوں نے اسے ایک سرخ شاں اور حادی۔ سرخ دوشالہ اور کراہ اس نے اپنے لوگوں کی طرف بڑے فخر و شان سے دیکھا۔ ان لوگوں نے کہا "حق یہ کہ تو کل پرانا جوکر پھٹ جائے گا۔ اور یہ مسلمان ہمیشہ کے لیے تیری گردن کا مار بن جائے گی۔"

صوفی احمد مطرب | یہ صوفی احمد وہی شخص ہے جو اپنے آپ کو شیخ احمد کبریٰ مصری کا مرید بلکہ خلیفہ کامل بتا کر کہا کرتا تھا کہ "میں اس مرشد زماں کے اشارہ سے دیار ہند میں آیا ہوں۔ میرے مرشد نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ "ہندوستان کے بادشاہ سے لغزش ہو گئی ہے۔ تو وہاں جا کر اس کی مدد کرے گا اور اسے طاقت سے بچائے گا" اور اب یہ معاملہ ہی برعکس ہو گیا کہ شکاری خود شکار کے پھندے میں پھنس گیا۔

لاف زن جو لاہرمی گفت من بس ماہرم  
شاید ارسانہ نذر دوا ہر حدم حلقہ باف  
آں شنید مستی کہ بائے جولہ دیگر چہ گفت  
کاسے برادر چند لاف اول یاف آنگہ بلاف

گو سالہ بنارسی کا معاشقہ | گو سالہ بنارسی نے شیخ ابوالفضل کے پاس بڑی رسائی پیدا کر لی اور مکاری و چاپلوسی سے کام لے کر بنارس کا کروڑی بن گیا۔ وہاں اس نے خوب کھیل کھیلے اور بنارس کی ایک طوائف سے عشق بازی کی۔

ابو الفضل فیضی کا چھوٹا بھائی شیخ مبارک کالہ کا تھا جس وقت دربار اکبری میں حاضر ہوا اس کی عمر صرف ۱۷ سال تھی۔ یہ بادشاہ کے جلوس کا اٹھارہ سال تھا۔ بہت جلد اسے چارہزاری منصب ملا۔ آخر کار وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہنچا۔ وہ ایک کامیاب سیاست دان مدبر ہوشیار سپہ سالار لہجہ شل ایچے تھا اور شاعر تھا۔ علامی کے لقب سے مشہور ہے۔ عبداللہ شاہ بخاری کا کہنا تھا کہ "وہ اکبر کے تیروں سے آٹا نہیں ڈھکتا تھا ابوالفضل کے قلم سے آکر نامہ اس کی مشہور تاریخ ہے جو تین دفتروں پر مشتمل ہے۔ دفتر سوم آئین اکبری کے نام سے مشہور ہے۔ ابوالفضل کی انشا کا کمال "کلیات طامی" میں دیکھا جاتا ہے باقی ملکہ مغربی،

شروع کر دی۔ ملا احمد صوفی مذکور بھی اسی طوائف پر عاشق تھا، بنارس نے احمد کو کافی روپیہ دست کر دیا اور اپنا ایک نگران اس طوائف کے دروازہ پر مقرر کر دیا۔ طوائفوں کے داروغہ نے یہ سارا حال بادشاہ کے پاس مکھ بھیجا۔ بادشاہ نے ایک محفل نوروزی میں احمد سفلی اور ملا شاہ محمد کی دو صدی جاگیر جو دامن کوہ میں تھی اور اس پر دونوں کا مشترک قبضہ تھا چھین لی۔ اور بنارس کو بنارس سے بلایا۔

**ملک اشعرار فیضی کا انتقال** | ملک اشعرار شیخ فیضی کئی ایک بیماریوں جیسے ضیق النفس، استسقا، ورم، خونی قے وغیرہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ چھ مہینے تک وہ مرض کی سختیاں برداشت کرتا رہا۔ آخر دس ماہ صفر ۱۰۱۱ھ کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑی انسیت تھی اور وہ رات دن ان کتوں میں گھبراتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منہ اور بے دینی کا متعصب حامی تھا۔ چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بے ہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس کی تاریخ وفات ہے۔

وے فلسفی و شعی و طبعی و دہری

ایک دوسری تاریخ ہے ”قاعده الحاد شکست“۔ ایک شناسا نے یہ تاریخ کہی:-

دیدم کہ فلک چہ مایہ نیرنگی کرد

مرغ دلم از نفس شب آہنگی کرد

آں سینہ کہ عالے دردے گنجید

تا نیم دے بر آورد تنگی کرد

اس کی تزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اور اس کا سراپے ہاتھوں سے تھام کر آوازیں دیں کہ ”شیخ جو ہم حکیم علی کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ تم آخر بات کہوں نہیں کرتے ہو؟ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرا دی۔ آخر بادشاہ شیخ ابوالفضل کو تسلی دلا سا دیکر لوٹ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہو گیا۔

**حکیم بہام کی وفات** | فیضی کے انتقال سے چند دن بعد ہی ۶ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ کو حکیم بہام بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بقیہ صفحہ سابقہ، جس میں اس کے کچھ خطوط اور مراسلات ہیں یہ بھی تین دفتروں پر مشتمل ہے۔ ”عیار دانش“ یہ سنسکرت کی ”کلیلہ دمنہ“ کا قصہ ہے۔ جو نو شرواں کے عہد میں ہلوی میں ترجمہ ہوئی۔ عباسی صدر میں عربی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ عربی سے ملا حسین واعظ کاشفی نے انوار سہیلی کے نام سے ترجمہ کیا۔ اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے ۱۰۱۱ھ میں سادہ فارسی میں مرتب کیا۔ اکبر نامہ کا دفتر سوم مرتب کیا۔ اکبر نامہ کا دفتر سوم آئین اکبری ۱۰۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔ ان کے علاوہ ”رقعات ابوالفضل“ کشکول ابوالفضل ”جامع اللغات“ بھارت کا ترجمہ ”رزم نامہ“ نظم میں کوئی کتاب نہیں۔ ابوالفضل شہزادہ سلیم کے اشارہ سے بندھیل کھنڈ کے ایک سیندار پر سنگ کے ہاتھوں ۱۰۱۱ھ میں قتل ہوا۔ اس کے قتل کی اطلاع پر اکبر نے یہ پڑھا تھا کہ

شیخ ما از شوق بے حد چوں سوئے مآندہ ز اشتیاق پائے یوس بے سرو پا آمدہ

اس کے لڑکے کا نام عبدالرحمن تھا۔ اکبر کے دینی اعتقادات کی تبدیلی میں ابوالفضل کا بڑا حصہ ہے۔ اسی نے علماء کی مخالفت میں ”دیوالی“ کا یہ ڈھونگ رچایا اور بادشاہ کو خدا کے درجہ تک پہنچا دیا۔

ساتویں ربیع الاول کو کمالاتی صدر کا انتقال ہوا۔ ان دونوں کا مال و اسباب اسی وقت ضبط کر لیا گیا۔ اور وہ دونوں کفن کے کپڑے تک کو محتاج ہو گئے۔

**خاتمہ** | یہ دور اکبر شاہی کے وہ واقعات ہیں جن کا ذکر میں نے ماہ صفر ۱۰۲۷ھ موافق سنہ ۱۶۱۸ء جلوس شاہی تک اجمالاً کیا ہے۔ میں نے اپنی دانست میں تو یہ سارے حالات ٹھیک ٹھیک طور پر ادا کر دیئے ہیں۔ بعض سنوں کے اندر راج میں جو تقدیریں و تاخیر تخریف اور تغیر ہو گیا ہے اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں بلکہ اس کی ساری ذمہ داری اس ماخذ تاریخ نظامی پر ہے۔ جس سے میں نے یہ منتخب مرتب کی ہے۔ اگر جتیار ہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو انشاء اللہ آنے والے حالات کا بھی میں انتخاب کر جاؤں گا۔ ورنہ جس شخص کو بھی میسر ہو وہ ان حالات کی ترتیب و تسوید کا فرض انجام دے کہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری رہی ہے۔

مرادِ مانصحت بود گفتیم  
حوالت با خدا کریم و نفیم

خدمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## جلد سوم

نظام الدین احمد مصنف تاریخ نظامی نے اپنی تاریخ کے آخر میں امراء بادشاہی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میری نگاہ میں ان امیروں میں سے اکثر متوفی غیر مرحوم دگمراہ اور بد عمل ہیں، کیونکہ

من وفسائی ندیدم زکساں

گر تو دیدی دعائی من برساں

ان امراء کی گرامیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں الجھنے نہیں دیا۔ بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخ کرام کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دور اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں ان کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں۔

(ملا عبد القادر بدایونی مصنف منتخب التواریخ)

میاں حاتم سنبلی بہت بڑے عالم تھے۔ مدتوں علوم کا فیض ان کی ذات سے جاری رہا۔ صوری اور معنوی کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے۔ ابھی وہ تحصیل علم میں مصروف تھے کہ ان پر حال غالب آگیا۔ اور قیل و قال کو ترک کر کے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ دانش مند طلبی کے جو اپنے عہد کے عالم ربانی اور ولی کامل تھے مرید ہو گئے۔ شیخ علاؤ الدین حشتی دہلوی کی خدمت میں بھی سلوک کے طریقے سیکھے ان دونوں بزرگوں نے تربیت و تعلیم اور مرید کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جذب کی ابتدائی کیفیت میں میاں صاحب سنبل اور امروہہ کے جنگوں میں دس سال تک تنگے سر تنگے پیر گھومتے رہے۔ اس ساری مدت میں بستر سے پیٹھ لگی نہ سر کو تکیہ میسر ہوا۔ ذوق سماع ان کی طبیعت پر غالب تھا۔ جب بھی بات کرتے یا مسکرتے ”اللہ“ کا کلمہ برابر ورد زبان رہتا۔ آخر جذب و کیفیت کا یہ عالم ہوا کہ راگ سننے کی تاب نہ رہی۔ راگ چھڑتے ہی بے خودی کے عالم میں کہاں سے کہاں جا پختے۔

سنہ ۹۶۰ھ میں جب کہ میری عمر صرف بارہ سال کی تھی میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں قصیدہ بردہ کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انہوں نے تبرکاً حنفی فقہ کی کتاب ”کنز“ کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کر لیا۔ میرے والد سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لڑکے کو اپنے استاد شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے۔ تاکہ اسے علوم ظاہری کا فائدہ بھی پہنچے۔



شیخ مدوح نے ۱۰۶۹ھ میں رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ رحلت ————— ”درویش دانش مند“ سے نکلتی ہے عجیب اتفاق ہے کہ میرے والد کا بھی اسی تاریخ کو انتقال ہوا۔ یہ ان کی حسن عقیدت کا ثمر تھا۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہر و باطن دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ عرصہ  
**شیخ جلال الدین تھانیسری** تک دینی علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ آخر میں علوم رسمی کو ترک دیا۔ جلوت چھوڑ  
 خلوت کو جا بسایا۔ ان کے اکثر اوقات قرآن پاک کے ختم، نوافل دعا اور درود ہی میں صرف ہوتے تھے۔ ترانوے سال کی عمر کو  
 پہنچے تو نہایت کمزور اور ضعیف ہو گئے، بس ہڈی چمڑا ہو کر رہ گئے تھے۔

پیر از نامرادی رگ چو پیدا شد ز پوست

بہر تعلیم مریداں راستی را مسطر است

اس عمر میں حال یہ ہو گیا تھا کہ بیٹھنے اور حرکت کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ ہر وقت غذا کی کمی اور کمزوری کی وجہ  
 سے ٹیک لگائے بس غنودگی میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن دل کی قوت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں  
 پڑتی۔ کسی کی مدد کے بغیر جھٹ سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ جوتیاں پہنتے۔ لاٹھی تھام کر اپنے آپ طہارت اور وضو  
 کر کے نماز ادا کرتے۔ یہ قوت جیسے نماز ہی کے لیے پیدا ہو جاتی تھی۔ چنانچہ نماز سے فارغ ہوتے ہی اسی طرح پھر  
 بستر پر لیٹ جاتے۔

مجھے دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی بار تو میں ۱۰۶۹ھ میں آگرہ میں ملا تھا جب کہ  
 وہ تھانیسری کے اماموں کی سفارش اور کار براری کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوسری بار ۱۰۷۵ھ میں یہ سعادت  
 نصیب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ حسین خاں الخ میرزا کا تعاقب کرتے ہوئے تھانیسری پہنچا تھا۔ یہ ملاقات میں نے  
 حسین خاں کے ساتھ کی تھی۔ اس وقت مجھے ان کی شخصیت مجسم نور دکھائی دی۔  
 شیخ جلال نے ۱۰۸۹ھ میں رحلت فرمائی۔

شیخ محمد غوث شیخ ظہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید ہیں۔ شطاری سلسلہ میں ان کا  
**شیخ محمد غوث گوالیاری** نسب سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامی سے ملتا ہے۔

ابتدائی حال میں وہ بارہ سال تک کوہستان چار کے دامن میں مقیم رہے۔ غار ان کا ٹھکانہ تھے۔ اور غذا درختوں کے  
 پتے۔ اس عرصہ میں انہوں نے بڑی سخت ریاضتیں کیں۔ علم ”اسرار الہی“ میں مقتدا اور صاحب تصوف تھے۔ اس علم کی اجازت  
 ان کو اپنے بڑے بھائی شیخ بہلول سے جو بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں حاصل تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے ہمایوں  
 بادشاہ مغرت پناہ کو بڑی مخلصانہ عقیدت تھی۔ ہمایوں کو شاید ہی کسی اور سے ایسی عقیدت رہی ہو۔ انہی سے ہمایوں نے بھی  
 ”دعوت اسماء“ کا طریقہ سیکھا تھا۔

جب شیر شاہ نے اقتدار سنبھالا تو ہمایوں کے تعلق کی وجہ سے وہ شیخ محمد غوث کے خلاف ہو گیا۔ اس لیے شیخ گہرات چھ گئے  
 وہاں کے حکام و سلاطین نے سرانگھوں پر لیا اور وہ سب شیخ کے عقیدت مند رہے۔

شیخ کی کرامتوں اور کمالات باطنی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو گا کہ میاں شیخ وجیہ الدین جیسا منہجر عالم ربانی بھی ان کی بارگاہ تقدس کا حاشیہ نشین بن گیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے دہلی گجرات اور بنگالہ میں کتنے ہی صاحب مرتبہ بزرگ پیدا ہوئے۔ ان کے کمالات روحانی کے آثار اب تک ہندوستان میں باقی ہیں۔

میں نے انہیں سب سے پہلے ۱۹۶۶ء میں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سوار ہو کر جا رہے تھے۔ اور ان کے آگے پیچھے دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم کر رکھا تھا کہ اس بھیر میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس قدر و منزلت پر ان کے انگسار و تواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اور اس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو محظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زمین کے تکیہ سے ٹکرائی جاتی تھی۔

اس سال شیخ مدوح گجرات سے آگرہ آئے تھے۔ اکبر کی نو عمری کا زمانہ تھا۔ وہ ان کی تحریص و ترغیب پر ان کے مریدوں میں شامل ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا منکر ہو گیا۔ خان خاناں بیرم خاں اور شیخ گدائی سے ان کی منہ نہ سکی۔ اس لیے وہ ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے مریدوں کی تربیت و تکمیل میں مشغول رہے۔ سماع و سرود اور وجد کا بھی ذوق تھا۔ بلکہ انہوں نے سماع کے متعلق رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔

لباس فقر میں یہ بڑے جاہ و جلال والے تھے۔ ان کی مدد معاش ایک ہزار تھکے تھی۔ جو کوئی اُن سے ملنے آتا تھا۔ وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کافروں سے بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اسی سبب سے بعض اہل فقر ان کے مخالف بھی ہو گئے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی۔

چوں رو و قبول ہم در پردہ غیب است

ز نہار کے را نکتی عیب کہ عیب است

اسی سال عمر پاکر ۹۷ھ میں آگرہ میں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے۔

شیخ نہایت سخی اور دریادل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انگسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو ”میں“ نہیں کہا۔ ہمیشہ خود کو ”فقیہ“ ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کو اتنا کچھ غلو تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے ”من“ کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کہتے تھے اتنے یم اور نون (من) فلاں آدمی کو دے دو۔

شیخ برہان بڑے زاہد متوکل گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں وہ میاں الہداد باری کی جن کا سلسلہ ایک واسطہ سے سید محمد جونپوری سے ملتا ہے۔ صحت میں صرف تین دن رہے۔ اور فقر و غنا کا یہ فیض حاصل کیا کہ درجہ کمال تک جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحب حضور تھے۔ تقریباً پچاس سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کر دیا۔ صرف تھوڑے سے دودھ اور مٹھاس پر گزار کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کاپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرہ

میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ ہمدوی طریقہ پر "پاس انفاس" میں مصروف رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے۔ پھر بھی قرآن کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

میں جب چنار کے سفر سے لوٹا، یہ سلسلہ کا کوئی مہینہ تھا۔ اور عبداللہ خاں اوزبک کا دور دورہ تھا۔ ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں۔ اور اپنے ہندی کے شعر جن میں وعظ نصیحت، تصوف، توحید اور تجرید کے مضامین تھے سنائے۔

دوسرے دن ہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکہ تھا۔ اور مردم آزاری ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے آیا۔ اتفاق یہ تھا کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی۔ اور ان کو مغلطہ گایاں دی تھیں۔ جب ہم پہنچے تو شیخ نے سب سے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ حدیث تھی۔

”قال النبی صلعمہ المسلمون من لسانہ ویدہ“

فرمایا نبی صلعمہ نے مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں،

یہ حدیث پردہ کرانہوں نے اس کے نکات کی بڑی عالمانہ دلکش تشریح کی۔ ہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے کپے پر نادم و شرمندہ ہو کر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا و فاتحہ کی درخواست کی۔ کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔

شیخ ممدوح کی عمر سو سال ہوئی ہے۔ سلسلہ میں رحلت فرمائی۔ میں نے ان کی تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے۔

”دل گفت کہ شیخ اولیاء بود“

ان کو وصیت کے مطابق اسی حجرہ میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ گوشہ نشین رہے تھے۔

شیخ محمد کنبو سنبلی | قادری سلسلہ کے بزرگ تھے۔ راہ سلوک میں انہوں نے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں۔ وجد و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ خود بھی نہایت خوش آواز تھے۔ جب ان پر حال و کیفیت طاری ہو جاتی تو بے اختیار خود بھی گانے لگ جاتے۔ اور اس درد بھری آواز میں کہ حاضرین پر رقت طاری ہو جاتی۔ ان کی محفلوں میں سماع کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کا خیال اب بھی مجھ کو ہر شام بکھڑ دیتا ہے۔

ابتداء میں علوم ظاہری کی تحصیل کی تھی۔ عشق و تعشق کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ کسی نہ کسی دربار صورت سے ان کے عشقیہ تعلقات ضرور قائم رہتے تھے۔ اس معاملہ میں ایسے آزاد مشرب تھے کہ لوگوں کی انگشت نمائی کی انہیں کوئی پروا نہ ہوتی تھی۔ کھلے بندوں دل کے معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ اس وجہ سے

وہ شیخ محمد عاشق مشہور ہو گئے۔

۱۹۵۵ء میں وصال ہوا۔ ان کی تاریخ وفات ”مستم از سوال“ سے نکلتی ہے۔

شیخ فخر الدین | ایک گوشہ نشین، متوکل عبادت گزار بزرگ تھے۔ ہمیشہ لوگوں سے دور خلوت میں رہا کرتے تھے۔

ہر جمعہ کو ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی مجلس منعقد ہوتی تھی۔ جس میں سماع لازماً ہوا کرتا تھا۔ ان کی محفل سماع میں سماع کا کوئی کیسا ہی شکر اور مخالف آجاتا، وجد حال سے بچ نہیں سکتا تھا۔ شیخ کی مستانہ کیفیت دوسروں کو متاثر کر دیتی تھی۔

اس مجلس کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر برابر کے ہم نشین ہوتے تھے۔ خان خاناں بیرم خان جمعہ کی نماز اکثر انہی کی مسجد میں ادا کرتا تھا۔ شیخ کی صحبت میں اس پر اکثر اوقات بڑی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ خانقاہ کے معمول کے مطابق خان خاناں وہاں نشست و برخاست تناول طعام وغیرہ میں دوسروں سے کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

شیخ عزیز اللہ | معرفت الہی اور عشق خداوندی کے سرتاپا مظہر تھے۔ صفائی قلب اور سوز و گداز ان کے بشرہ سے عیاں تھا۔ صاحب ذوق ایسے کہ دن رات گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔

گانے کی بھنگ بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تو اس طرح بے قرار ہو جاتے، جیسے کسی نے ان کے باطن میں آگ لگا دی ہو۔ ان کے ہاں صبح و شام سماع کی محفل جی رہتی تھی۔ اس وقت ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے۔

اپنے والد بزرگوار شیخ حسن سے بیعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد حسن سے جو شیخ مان پانی پتی کے پیر تھے۔ انہوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ طبیعت میں عجز و انکسار بہت تھا۔ خدمت خلق کا بڑا خیال و اہتمام کرتے تھے۔ اگر وہ چلہ میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی کافر کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حرج و اعتکاف سے نکل آتے۔ اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کر کے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت براری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے۔ گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روانی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کافر یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ نہ کرتا یا جان بوجہ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے۔ اور بے تکلف اس طرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے اس انکسار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہو جاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو جاتی۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاء کے مزار پر حسب معمول مجلس سماع میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک دیوانہ شخص نے

چینج ماری اور شیخ کو جھولی بھر کر اٹھایا۔ اور سر کے بل ان کو زمین پر ٹپک دیا۔ ان کی دستار کھل کر گر گئی۔ لیکن ایسا ضبط و تحمل تھا کہ چہرے پر ناگواری کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ اس کے وجد و حال کا خیال کر گئے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس پاگل نے دوبارہ یہی حرکت کی تو حاکم شہر نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا۔ لیکن شیخ نے اسے اپنی حمایت میں لے لیا۔ اور بڑی عذر خواہی کر کے اسے سزا سے بچایا۔

علوم ظاہری میں بھی ان کی بڑی دسترس تھی۔ اپنے شاگردوں کو عموماً تفسیر عرالیس۔ عوارف اور خصوص الحکم اور ان کی شرحیں پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ امان پانی پتی نے ایک رسالہ ”غیرہ“ لکھا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عزیز اللہ نے ایک رسالہ ”عینہ“ کے نام سے لکھا۔ اس رسالہ میں نظریہ وحدت الوجود کے بڑے اہم نکات بیان کیے ہیں۔

جس زمانہ میں خان خاناں کی سرکشی کے قصے ہو رہے تھے، کچھ عرصہ تک اور اس کے بعد بھی چند سال تک میں نے ان کی خدمت میں تصوف کی بعض کتابوں کی سماعت کی تھی۔

۱۵۹۰ء میں وہ عالم نلسے عالم بقا کو تشریف لے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے:

”قطب طریقت نمائند“

اپنے رسائل و تصنیفات اور خطوط میں وہ ہمیشہ خود کو ”ذره ناچیز عبدالعزیز“ لکھا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کسی نے ”ذره ناچیز“ سے بھی نکالی ہے۔

حضرت شیخ فرید گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلہ بیعت شیخ سلیم چشتی | میں خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ خواجہ ابراہیم چچ و اسطوں سے خواجہ فضل عیاض کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔

شیخ سلیم خٹکی اور تری کے راستوں سے دو مرتبہ حرمین کی زیارت و طواف کے لیے ہندوستان سے تشریف لے گئے تھے۔ روم، بغداد، شام، نجف اور مغرب کے دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ وہ سال بھر سیر و سیاحت میں رہتے تھے۔ لیکن حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ ضرور پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے بائیس حج ادا کیے۔ چودہ حج اپنی سیاحت کے پہلے دورہ میں اور آٹھ حج دوسرے دورہ میں۔ آخری بار جب حرمین پہنچے تو چار سال مکہ معظمہ میں اور چار سال مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ جس زمانہ میں وہ مکہ میں مقیم تھے میلاد کا زمانہ تو مدینہ میں گزارتے اور حج کا موسم مکہ میں گزارتے تھے۔ اس آخری دورہ میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ان کے ساتھ تھا۔ قیام کی تاریخ اس نے لکھی تھی ۷

شکر خدا را کہ بہ محض کرم منزل ما شد حرم محترم

ہر کہ بہ پرسید ز تاریخ سال سخن اجناہ دختنا الحرم

بلاد عرب میں شیخ سلیم ”شیخ البند“ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر ۹۵ سال کی ہوئی۔ ساری عمر انہوں نے



سیرت نبوی کی اتباع میں بڑی بڑی ریاضتوں اور سخت مجاہدوں میں گزار دی۔ ایسی ریاضت مشائخِ عمد میں سے کسی اور نے کم ہی کی ہوگی۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ طہارت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کبھی نماز پنج گانہ میں جماعت نہ ہوتی۔

جب شیخ امان پانی پتی ان سے ملنے آئے تو پوچھا سلوک و طریقت کا مقصود آپ کو استدلال کے ذریعہ ملایا کشف الہی ذریعہ؟ انہوں نے جواب دیا ”ہمارے مسلک کا تعلق بس دل ہی سے وابستہ رہا“

بہت سے اہل کمال شیوخ نے ان کے دامن تربیت سے استفادہ کیا، ان کے قائم مقام بنے۔ ان تربیت یافتگان میں ایک شیخ کمال الوری تھے۔ یہ نہایت بوڑھے آدمی تھے۔ لیکن دل میں عشق الہی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک اور بزرگ شیخ یارے بنگالی ہیں جو بنگالہ کے شہروں میں بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح شیخ فتح اللہ قرین سنبھلی شیخ رکن الدین اجودھنی حاجی حسین خادم ہیں جو فتح پور کی خانقاہ کے منتظم اور ان کے بہترین خلیفہ ہیں۔

جس زمانہ میں کہ شیخ دوسری مرتبہ ہندوستان تشریف لائے تھے مجھے پتہ چلا کہ وہ عربی انشاء میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کی تاریخ نکالی اور عربی میں مبارک بادی کا خط لکھ کر بدایوں سے بھجوا دیا تھا۔

۱۷۷۷ء میں شیخ اعظم بدایونی کے واسطے سے جو ان کے چچا کا رُخ کا اور داماد بھی تھا خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے دوران گفتگو مجھ سے پوچھا کہ ”احادیث میں حضور اکرمؐ اور شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کی قبروں کا حال کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ میں نے کہا ”احادیث میں تو اس طرح ذکر ہے اور بعض نے اس طرح بیان کیا ہے۔“ شیخ نے کہا ”سہروردی نے واقعہ صاعقہ“ کتاب کا نام، میں تینوں قبروں کی صورت بیان کی ہے۔ اور پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

میں حسب ارشاد دو روز شیخ اعظم مذکور کے ہمراہ پرانی خانقاہ کے حجرہ میں مقیم رہا۔ اس دوران میں تفصیل سے گفتگو نہ کی۔ پھر اجازت لے کر شاور چلا گیا۔ اس کے بعد ۱۷۷۸ء میں بھی میں نے کئی بار حاضری دی۔

میں نے شیخ کی جو کرامت دیکھی وہ یہ تھی کہ فتح پور کے اس کوہستان میں جہاں سردی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے، بحر ایک باریک کرتے اور مل کی چادر کے وہ دوسرا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ ہر روز دو مرتبہ غسل کرتے تھے۔ چلہ میں دھال کے روزے رکھتے تھے۔ اور صرف آدھے تریوز بلکہ اس سے بھی کم پر گزر کر لیتے تھے۔

شیخ سلیم ۱۷۷۹ء میں فوت ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات ہے — ”شیخ ہندی“۔

شیخ نظام الدین انبیشی وال | انبیشی لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ نظام الدین اس قصبہ کے رہنے والے اور شیخ معروف حشتی کے شاگرد اور مرید ہیں۔ ان کا سلسلہ شیخ نور قطب عالم سے ملتا ہے۔

پہلے اکتسابی علوم کے طالب رہے۔ لیکن ان کی فطرت بلند پرواز تھی۔ اس لیے علوم ظاہری سے فیوض باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کیے اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ذکر اور باطنی توجہ سے کبھی غافل نہ رہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشم  
ترسم کہ نگاہی کند آگاہ نباشم

تھوڑی ہی مدت میں اپنے پیر سے ارشاد و تکمیل کی اجازت لے کر قصبہ انبیٹھی میں آکر رہ گئے۔ یہاں وہ بڑے توکل و قناعت سے گزارتے تھے۔ خاص و عام سے دوسری رہتے تھے، بجز جامع مسجد کے کہیں اور نہیں جاتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی خیر آباد شیخ سعد کے مزار کی زیارت اور شیخ صوفی کے خلیفہ المدیہ سے ملنے چلے جاتے یا گوپاموئی میں اپنے خاص مرید قاضی مبارک گوپاموئی سے ملنے چلے جاتے۔ قاضی صاحب بھی بڑے متقی صاحب کمال اور دولت مند آدمی تھے۔ قاضی مبارک جب طالب علم تھے تو انہوں نے شیخ کو اپنے والد کی خانقاہ میں دیکھا تھا۔ اور ان میں بڑے اثر و جذبہ کو محسوس کیا تھا۔ شیخ عبدالغنی سے ملنے کے لیے وہ فتح پور بھی گئے تھے۔ شیخ عبدالغنی بھی بڑے صاحب مرتبہ بزرگ تھے۔ جس وقت بھی شیخ نظام الدین شیخ المدیہ کی خانقاہ میں جاتے تو ان کی خدمت میں ایک روپیہ یا ایک تنکہ یا کوئی اور چیز بطور ہدیہ ضرور پیش کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ انہوں نے شیخ المدیہ کے رو کے شیخ ابوالفتح کے ہاتھ میں جو اپنے والد کے سجاد نشین ہیں۔ ابن عربی کی "فصوص الحکم" دیکھی۔ شیخ نے یہ کتاب چھین کر رکھ لی۔ اور انہیں کوئی دوسری کتاب دے کر کہا۔ اس کا مطالعہ کیا۔

عبادات و معاملات میں وہ ہمیشہ "احیاء العلوم" "عوارف" "رسالہ مکہ" "آداب المریدین" اور اس جیسی دوسری کتابوں سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھ لیتے تھے۔ اس کے بعد جمعہ کی جماعت کرتے تھے۔ ان کے خطبہ جمعہ میں پادشاہوں کا قطعاً ذکر نہیں آتا تھا۔

میں نے ایک بار دیکھا کہ انہوں نے جمعہ کی نماز جوتے پہنے ہوئے ادا کی اور فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جوتے پہن کر نماز ادا کی تھی۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے کافیہ کی کتاب تبرکاً پر مہنی چاہی لیکن شیخ نے انہیں منع فرمایا۔ جب اس نے بڑی عجز اور اصرار کیا تو جواب دیا کہ کوئی دینی کتاب پڑھو۔ اس نے کہا یہ بھی تو دینی کتاب ہے اور علم دین کا اس پر انحصار ہے۔ یہ سن کر شیخ کو جذبہ آگیا اور فرمایا علم دین کا اس کتاب پر کس طرح انحصار ہو سکتا ہے کہ جس میں پہلی بحث یہ ہے کہ اس کے مصنف نے کس نفسی کے طور پر خدائے عز و جل کی حمد ہی درج نہیں کی۔

شیخ بہت کم مرید کیا کرتے تھے۔ کوئی شغل نہیں بتاتے تھے۔ تلقین بھی بہت کم کرتے تھے۔ ان کے معزز مریدوں میں سے بڑے شیخ حاتم گوپاموئی تھے۔ یہ بھی قاضی مبارک کی خانقاہ میں طالب علم تھے۔ انہیں اسی خانقاہ سے شیخ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ شیخ حاتم کو کبھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب عطا کر دیتے۔ اور دوسرے مشاغل کی تلقین بھی کرتے۔ اس طرح انہوں نے حاتم کو بالکل اپنا مطیع بنایا تھا۔ اسے دستار جو تا اور کپڑے بھی عطا کرتے رہتے تھے۔ قاضی مبارک اور دوسرے طالب علموں نے جب یہ عنایات دیکھیں تو وہ حاتم سے جلنے لگے۔ شیخ نے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا میں کیا کروں اللہ کی ہی مرضی ہے کہ اسے پھٹے کپڑوں، ٹپانے جو توں

اور منسی کے باوجود اللہ کی نعمت خاص مرحمت ہو۔ چنانچہ انہوں نے شیخ حاتم کے لیے اپنے پورے اثر و جذب سے کام لیا کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ درجہ کمال تک پہنچ گیا۔ شیخ حقائق و معارف کی گفتگو بس انہی شیخ حاتم سے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حاتم کی حالت میں تنزل ہونے لگا۔ اور اس سے بعض لغزشیں سرزد ہو گئیں۔ بعد میں پھر اس نے اپنی حالت سنبھال لی اور شیخ کے پاس وہی مرتبہ حاصل کر لیا۔ جب وہ حضرت کی خلافت اور وراثت کا پوری طرح اہل بن گیا تو خدا نے اسے دنیا سے اٹھالیا۔ شیخ نے اس کو یاد کر کے بار بار فرمایا کہ ”خدا کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے خدا کی باتیں کہتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا۔ وہ بھی اٹھ گیا۔ اب میں کس سے یہ بات کروں۔“

جس زمانہ میں یہ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت شیخ اپنے سالے عبدالرزاق کو جو بعد میں ان کا خسر بھی ہو گیا تھا گفتگو میں مخاطب بناتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بیٹے شیخ محمد کو بھی واسطہ بنا کر خطاب کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد اب ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہیں۔

محمد حسین خاں مرحوم کو جس کے حالات میں نے تاریخ میں بیان کیے ہیں حضرت سے بڑی عقیدت و ارادت تھی۔ حسین خاں کے اور میرے گہرے روابط تھے۔ جس وقت اسے لکھنؤ جاگیر میں ملا تھا تو میں سید اصغر بدایونی اور قاضی مبارک گوپا موٹی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ پہلی ہی ملاقات میں شیخ ہر شخص سے ایسی بات کرتے تھے جو اس کے حالات سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد للہ، درود سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، بسم اللہ، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کسی بزرگ کا قول ہی رہتا تھا۔ سید اصغر سے مصافحہ کیا تو درود پڑھا، قاضی احمد سے ملے تو سبحان اللہ کہا۔ میری باری آئی تو بسم اللہ۔ اسی طرح ہر ایک کے مطابق حال کوئی نہ کوئی کلمہ ارشاد فرمایا۔ اسی اثناء میں کہ ابھی وہ گفتگو نہ کر پائے تھے کہ ایک غریب طالب علم نہایت بُرے حال میں آکر ملا۔ اس سے مل کر شیخ نے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھا۔ پھر شیخ عبدالرزاق کو مخاطب کر کے کل شیئی ہالک الا وجہہ کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ وہ ہاں ہاں کرتے جاتے تھے۔ کبھی بطور تبلیغ کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے تھے کسی اور کو خوف اور رعب کے مارے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی مبہوت بناس رہا تھا۔ اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کر کے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے پوشیدہ حالات حضرت پر منکشف ہو گئے ہوں۔ اور وہ اسے ظاہر فرما دیں۔ اسی ڈر سے میں مجلس سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ طالب علم بول اٹھا۔ اس آیت میں ”وجہہ کی ضمیر کسی اور چیز کے لیے آئی ہو۔ جیسا کہ بعض اہل معرفت نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات سن کر حضرت جلال میں آ گئے۔ اُن کا چہرہ متمنا نہ لگا اور فرمایا میں نے اس شیطان سے ملتے ہی تعوذ پڑھا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو اس کی شیطنت ظاہر ہو گئی چونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس کے اعتراض کے پیچھے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ اسی لیے بار بار لا حول ولا قوۃ الا باللہ پڑھا۔ پھر قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا۔

یا لایبی فی ہول العذری معذرتہ  
صنی الیک ولو الصبغت لہم قلم

شیخ پر اس وقت بڑا جلال طاری تھا۔ آخر آپ نے حکم دیا کہ اسے مجلس سے اٹھا دو۔ پھر اسے اپنے پاس بلا کر ملائمت کا اظہار کیا۔ حاضرین کو یہ واقعہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ وہ رات ان کی خانقاہ میں میں نے بڑی مشکلوں سے کاٹی۔ اور بھاگ جانے کے لیے بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے رات کٹی۔ ابھی پو پھٹی تھی۔ لیکن اتنا اندھیرا تھا کہ بغیر چراغ کے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچانا مشکل تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی رات باقی ہے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی۔ جب سورج نکلا۔ حضرت حجرہ سے باہر تشریف لائے۔ اور مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ہم تین مہمانوں کے لیے شیخ محمد کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ میرے اضطراب کا یہ حال تھا کہ میں ہر لمحہ شیخ محمد کو واسطہ بنا کر رخصت ہونے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت شیخ ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے ہاتھ میں نمک لیے ہوئے کسی بات کے ضمن میں آیت کریمہ "واعذوا لہم ما استطعتم من قوۃ ومن سباط الخیل" کی وضاحت کر رہے تھے۔ میری روانگی کی اجازت کو ٹال گئے۔ ایک اور بات کے ذیل میں حسین خاں کو جو اس وقت پرگنہ اسول میں تھا بڑی توجہ سے یاد فرمایا اور کہا "وہ میرا طوطا ہے۔"

حضرت طبعاً بڑے فیاض تھے۔ امیر ہو یا فقیر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد یا نمک یا کوئی اور چیز ضرور دیتے تھے۔ مجھے انہوں نے ایک تنکے عنایت فرمایا۔ اس سفر میں میں نے ان کی ایک کرامت بھی دیکھی۔ جس وقت ہم تینوں آدمی انبیسی کو حضرت سے ملنے جا رہے تھے تو راستہ میں سپاہیوں نے ایک شخص کو چوری کے الزام میں پکڑ لیا تھا۔ اور اس کے کپڑے اتار لیے تھے۔ وہ صورت سے فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے بعد وہی شخص کسی طرح باریابی پا کر حضرت کے دروازہ پر آیا اور سوال کرنے لگا۔ بڑی عاجزی اور بجا جت کی لیکن حضرت نے اسے کچھ نہ دیا۔ حاضرین کو جو ان کی سخاوت اور دریادلی سے واقف تھے نہایت تعجب ہوا۔ انہیں متعجب دیکھ کر حضرت نے اچانک فرمایا "اس چور کو دیکھو کہ ساہزنی بھی کرتا ہے اور فقیری بھی۔" پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دیا۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت ہم نے جو غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چوری میں پکڑا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ دوسرے دن بھی پیش آیا۔ جس کا ذکر طویل ہو جائے گا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو حسین خاں کے ہمراہ ہم لوگ پرگنہ سے یلغار کرتے ہوئے انبیسی پہنچے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فجر کی نماز شیخ مدوح کے پیچھے ادا کریں۔ اس لیے تیزی سے کوچ کرتے رہے۔ صبح ہو چکی تھی۔ ابھی تین کو س باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں جماعت کے فوت ہو جانے کا افسوس ہوا۔ اور ہم نے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا۔ یہاں تک کہ طلوع آفتاب سے بس کچھ ہی پہلے شیخ موصوف کی مسجد میں پہنچے۔ اس وقت حضرت گھر سے برآمد ہوئے۔ جماعت قائم کی اور نماز پڑھائی۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کہ وقت باقی نہیں رہا۔ تاہم ہمیں جماعت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اتنی دیر سے جماعت کرنا حضرت کے معمول کے خلاف تھا۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ صبح کی نماز ایسے وقت ادا کرتے تھے کہ ابھی صبح صادق

کے طلوع کالس گمان ہی ہوتا تھا۔

اسی دن شام کو انہوں نے مسجد میں تصوف پر تقریر کی اور خواجہ حافظ کے چند شعر پڑھے۔ بیان کے دوران میں حسین خاں مرحوم کے ایک ساتھی نے پوچھا ”خواجہ حافظ کس کے مرید تھے؟“ فرمایا ”خواجہ نقشبندی کے“ کسی بات پر ایک شخص نے پوچھا ”گھوڑے کا گوشت امام اعظم کے مذہب میں حلال ہے؟“ آپ نے فرمایا ”امام اعظم نے خود گھوڑے کا گوشت کھایا تھا۔“ جب آپ اس شعر پہنچے

صونیاں درومی دو عید کنند

عنکبوتان لگس قدید کنند

مجھے اپنے خلوص پر پورا بھروسہ تھا۔ اس لیے میں نے بالکل ہی خالی ذہن و لیے ہی پوچھ لیا ”دو عید سے کیا مراد ہے؟“ یہ سوال انہیں پسند نہ آیا اور فرمایا ”یہ بات بایزید اور جنید کے پوچھنے کی ہے۔ شبلی اور منصور کے پوچھنے کی ہے۔ تو کہاں اور یہ سوال کہاں۔ پھر اس سلسلہ میں انہوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اور بردانام ہوا۔ حسین خاں حیرت سے دانتوں میں انگلی دا بے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور تمام ساتھی نہایت حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میری خوش نصیبی سے اس وقت عید کے چاند کے دکھائی دینے کا شور بلند ہوا۔ اور لوگ مبارک باد دینے اور مصافحہ کرنے میں مشغول ہو گئے۔ مجھے موقع مل گیا اور میں وہاں سے کھسک کر مغرب کے وقت اس خیمہ میں جو مسجد سے متصل باغ میں لگا ہوا تھا۔ نہایت رنجیدہ اور ادا اس چلا گیا اور زندگی سے بس بیزار ہو گیا۔ حضرت شیخ جب اندر تشریف لے گئے۔ اور مہمانوں کے لیے انہوں نے دسترخوان لگوایا تو اس وقت پوچھا ”خلاں کہاں ہے؟“ اُن کے لڑکے شیخ محمد نے جواب دیا ”وہ اپنی اس گستاخی کی وجہ سے مسجد میں ٹھہر نہیں سکا اور چلا گیا ہے۔“ جماعت میں بھی وہ شریک نہیں تھا۔ یہ سن کر حضرت نے اپنے سامنے سے کھانا اور جلوہ اٹھا کر تبرکاً میرے لیے بھجوایا۔ اس وقت مجھے بڑی تسکین اور اطمینان حاصل ہوا اور معافی کی امید بندھ گئی۔

صبح سویرے ہی حسین خاں عید کے لیے لکھنؤ چلا گیا اور میں انبیٹھی میں اکیلا رہ گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کی۔ اور نماز کے بعد کتاب ”عوارف“ کا درس دینے لگے۔ اسی موقع پر شیخ محمد نے میرا قصور معاف کرنے کے لیے سفارش کی۔ حضرت نے سبق بند کر دیا اور مجھے بلا کر بڑی توجہ سے التفات فرمایا۔ میں نے اس وقت روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگایا اور کہا ”میرے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی اور کینہ نہیں رہتا۔ میں کسی کو کچھ کہتا ہوں تو صرف نصیحت اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کہتا ہوں اور رسول اللہ کی طرح جس کسی کو سخت بات کہہ دیتا ہوں تو اس کا نتیجہ بھلائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھی بھیجوں تو وہ رحمت بن جاتی ہے۔“ پھر آپ نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر مجھے عنایت کی اور پاس کے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ تنہا لے کر گئے اور فرمایا ”میرے سامنے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو۔ یہ دو گانہ میں نے ایک عجیب ہی حالت میں ادا کیا۔ حضرت نے فرمایا ”لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں طالبوں کو تلقین نہیں کرتا۔ میں انہیں کیا تلقین کروں، میری تلقین تو بس یہی



کہ زبان پر خدا کا ذکر رہے اور دل شکر گزار۔ اس کے بعد میں حضرت کا دریا جوش میں آگیا۔ اور بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس موقع پر حضرت کی روش کے برخلاف باہر کسی نے ہندی راگ چھید دیا تھا اور اسے سن کر دوسندھی درویش نہایت درد بھری آواز میں آہ و فریاد کرنے لگے۔ اس وقت میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ پر حال طاری ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ ”معاہ جب المسلم بدوؤں کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن مجید سن کر رری طرح رونے لگتے ہیں تو خود پر افسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرمایا کرتے تھے ”کنا نحن امثالکم ثم قست قلوبنا ای تمکذت واستقرت قلوبنا“۔ ہم بھی تمہارے ہی جیسے تھے۔ لیکن اب ہمارے دل ٹھہر گئے ہیں، اس کے بعد حضرت نے کچھ اور اس طرح کی باتیں بیان کیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ پھر آپ نے مجھے یہ دعا پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی جسے میں ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔۔۔ ”اللهم انی اعوذ بک من الصمم والبکم والجنون والجمام والمبرص“

جب میں حضرت سے رخصت ہو کر مکنو میں آکر مقیم ہو گیا تھا کبھی نمک کبھی خاس چاول اور کبھی مٹی کا پیالہ وغیرہ میرے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت کی عادت تھی کہ عموماً مجلسوں میں بیٹھے ہوئے نمک چائا کرتے تھے۔ اور یہ حدیث پڑھتے تھے۔ ”الملمدوا لیسبعین دارالاسام“ (نمک بجز موت کے ستر بیماریوں کی دوا ہے)

حضرت نے میرے چھوٹے بھائی شیخ محمد مرحوم کو بھی اپنی بیعت سے نوازا تھا۔ چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا۔ اور اکثر اوقات ”طیئے کارونہ“ رکھے رہتا تھا۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت نوافل اور ذکر اذکار میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح کہ اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضایع نہیں ہوتا تھا۔ اور میری طرح وہ بیکار مشغلوں میں الجھا ہوا نہیں رہا۔

در حق گلاب و گل و حکم ازلی اس بود

کین شاہد بازاری و آں پردہ نشین باشد

انہی دنوں اسی قابل رشک حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ یقین ہے کہ وہ اپنے ایمان کے سایہ تلے جنت میں خوش و مسرور ہوگا۔

حضرت ممدوح کی عمر اسی سال سے زیادہ ہوئی ہے۔ اس کہنہ عمری میں بھی ان کے ہاں اولاد ہوئی رہی۔ آپ کی وفات ۱۳۷۰ھ میں ہوئی۔

شیخ بھیکن کا کری والے | مکنو کے توابع میں کاری نامی ایک قصبہ ہے۔ شیخ بھیکن اسی قصبہ کے رہتے والے تھے۔ یہ بڑے عالم متقی اور متشرع تھے۔ تقوٰے اس درجہ کا تھا کہ اس معاملہ میں وہ امام اعظم ثانی تھے۔ برسوں درس و انادہ میں مشغول رہے۔ سات قراءتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ شاطی کا درس دیا کرتے تھے۔ طریقت میں میر سید ابراہیم ایرچی کے خلیفہ تھے۔ ایرچی موصوف اپنے زمانہ کے بڑے عالم ہونگ گورے ہیں۔ شیخ بھیکن تصوف کی باتیں کبھی عام مخلوق میں نہیں کرتے تھے۔ یہ باتیں صرف خلوت میں وہ بھی مہربان رہتے تھے۔ ہمارے قریبی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر توحید کے رموز علانیہ بیان کیے جائیں تو وہ یا تو کھٹے واسے پڑ پڑتی ہیں یا سستے والوں پر

ماہر تو وہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی کیا کرتے تھے۔

ان کے بڑے بڑے صاحب کمال ہیں۔ وہ سب کے سب علم و حکمت، فضل و تقویٰ سے آراستہ ہیں۔ میں  
بزرگوار کی خدمت میں محمد حسین خاں مرحوم کے ہمراہ لکھنؤ میں حاضر ہوا تھا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس وقت کوئی  
مفصل علم منطق کی کوئی کتاب درس لینے کے لیے ان کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا ”علوم دینی کی کوئی کتاب پڑھو۔ انکی  
اوقات سناہ میں ہوتی۔“

یہ بڑے مشائخین میں سے تھے۔ اپنے والد بزرگوار شیخ محمد سے خلافت پائی۔ شیخ محمد وہی بزرگ ہیں  
شیخ سعدی جنہوں نے شاطبی پر فارسی میں ایک شرح ستر جزو میں لکھی ہے۔  
شیخ سعدی اکثر وجد و حال میں رہتے تھے۔ کیا ظاہر کیا باطن سراپا خلوص تھے۔ ہمیشہ خوش بشاش اور مسکراتے  
ہوتے تھے۔ اپنی عمر نہایت خوش اوقات اور آزادگی سے گزاری۔ انہوں نے اپنے ایک دوست کو رخصت کرتے ہوئے  
ایک پرچہ دیا جس میں یہ شعر درج تھا۔

دیدہ سعدی و دل ہمراہ تست  
تانا پنداری کہ تنہا میروی

ان کا انتقال ستائیس میں ہوا۔

شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ ”دعوت اسماء“ کے مجاز تھے۔ ریاضت، فقر اور توکل  
سید تاج الدین میں ان کی اپنی ایک شان تھی۔ نہایت ایشار پیشہ اور سخی آدمی تھے۔  
جب لکھنؤ آئے تو بہت سے آدمیوں نے ان کی صحبت سے استفادہ کیا۔ اور ارشاد و اصلاح کا مرتبہ حاصل کر لیا۔  
ان کا لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا تھا (مصنف نے ان بزرگ کا سن وفات نہیں لکھا)۔

شیخ محمد قلندر لکھنوی | پہلے یہ بزرگ سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں سپاہ گری کا پیشہ رکھتے تھے۔ جس وقت بابر  
بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کیا، سپاہ گری ترک کر کے فقر و عزلت گزینی کی راہ اختیار  
کر لی اور شیخ بہلول کے مرید بن کر عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ اپنے پیر سے اسماء الہی میں سے چند اسماء کی  
دعوت و تلقین حاصل فرمائی اور ایک باغ میں جس کے اکثر درخت انہوں نے خود لگائے تھے، گوشہ نشین ہو گئے۔ اور  
لوگوں سے میل جول اور تعلقات کا دروازہ بند کر دیا۔

کہتے ہیں کہ تیس سال سے زیادہ ہوئے کہ وہ صرف دو دفعہ پر گزارہ کرتے ہیں اور انداج وغیرہ کچھ نہیں کھاتے۔ ایک  
دن محمد حسین خاں ان کی ملاقات کے لیے گیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ایک بلی شیخ کے پاس آکر درد بھری آواز  
میں چلانے لگی۔ آپ نے فرمایا بلی فریاد کر رہی ہے کہ ”تم لوگوں نے آکر اپنے بھی اوقات ضائع کیے اور صاحب خانہ  
کے بھی اور حضور قلب میں خلل پیدا کر دیا۔“

**شیخ نظام نرنولی** | نرنول ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ وہ سلسلہ چشتیہ میں شیخ خانول کے جو قلعہ گوا یا ریہ میں رہتے تھے، مرید ہیں۔ لیکن انہوں نے زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی شیخ اسماعیل نامی سے ہی کیا اور تربیت و خلافت حاصل کی۔ ان کے بھائی ایسے صاحب ذوق صوفی تھے کہ ہمیشہ ان پر جذب و شوق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عزت نشین اصحاب خانقاہ کے احوال و کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ خود بھی بڑے صاحب تصوف اہل دل تھے۔

میں نے معتبر آدمیوں اور شیخ کے مریدوں سے سنا ہے کہ وہ چاند گرہن کی راتوں میں اپنے مریدوں کو بال کنگنی کا تیل کھلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں بڑی مشہور اور عام دوا ہے۔ اس کی تعریف میں اطباء نے رسالے لکھے ہیں۔ میں نے خود بھی اس کے بعض خواص کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس تیل کے کھانے سے ان پر آخرت کے حالات کا کشف ہو جاتا ہے۔ اور بڑے عجیب عجیب امور کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ واضحہ اعلم۔

شیخ نظام چالیس سال تک رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے۔ جو ان کے زمانہ سے آخر عمر تک ان کا معمول تھا کہ ہر سال بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین نجیاراوشی کی زیارت کے لیے پیدل دہلی کو جایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بڑے صاحبے اور بعض دوسرے موانعات کی وجہ سے خواجہ موصوف کا عرس انہوں نے نرنول میں منایا۔

شیخ نظام اپنے پر کی طرح کسی کی تعلیم نہیں بجالایا کرتے تھے۔ امیر مہوں یا غریب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ملتے تھے۔ یہی روش مرید بنانے میں بھی ملحوظ رہتی تھی۔ میں نے انہیں ایک بڑے ہجوم میں دیکھا تھا۔ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ان کی وفات سنہ ۱۳۹۷ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ ”آؤ نظام“ ہے۔

**شیخ الہدیہ خیر آبادی** | بڑے متبحر عالم تھے۔ ابتدائے حال میں درس و تلامذہ میں مشغول رہے۔ شیخ صفی خلیفہ شیخ سعید سے ارادت و ارشاد کا تعلق تھا۔ ابتدائی دور میں علوم ظاہری کی تدریس میں اس قدر مشغول رہے کہ بہت سے صاحب کمال اہل علم اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ بعد میں انہوں نے کلیتہاً صوفیہ کا مسلک اختیار کر لیا۔ فقر و توکل تجرید و ایثار تصوف کے تمام لوازمات پر عمل پیرا رہے۔ ان پر ہمیشہ سماع و ذکر کا ذوق غالب رہتا تھا۔ درود ہر وقت و روز زبان رہتا تھا۔ لوگوں سے خاص طور سے اہل دنیا امراء و حکام سے دور رہتے تھے اور محض اس لیے کسی کی ضیافت قبول نہیں کرتے تھے۔ ان کے تمام بچے اور متعلقین فقر و تہمت میں اپنے والد کی طرح صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کے صاحبزادے شیخ ابوالفتح جو صاحب سجادہ اور اپنے وقت کے بڑے عالم اور ظاہر و باطن میں اپنے والد کے مکمل نمونہ ہیں۔ مختلف علوم پر بڑے پایہ کی تصانیف کے مالک ہیں۔

شیخ الہدیہ کے دروازہ سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ایک دن محمد حسین خاں نے شیخ سے پوچھا سالار مسعود

جن کے معتقد ہندوستان کے عوام ہیں کیسے آدمی تھے؟ آپ نے جواب دیا "ایک افغانی تھا جو شہید ہو گیا۔" وہ آخر عمر میں بادشاہ کی طلبی پر فتح پور تشریف لائے تھے اور اس "خلیفہ زمان" (اکبر) سے ملاقات کی تھی۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کو بلانے جب آدمی گیا تو وہ خانقاہ سے باہر سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ طلبی کی اطلاع دی گئی تو وہیں سے کچھ تیاری کیے بغیر ہی ساتھ ہو لیے۔ ان کے خادم سفر کا سامان اور بالکی پیچھے لے کر آئے۔ اکبر کو یہ بات سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب اکبر نے ان سے کچھ دریافت کیا تو انہوں نے اشارہ سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اکبر نے کچھ رقم انہیں دی ان کی مدد معاش کا حکم صادر کر دیا اور اسی وقت رخصت ہونے کی اجازت دے دی۔

شیخ کی وفات ۱۰۹۳ھ میں ہوئی۔

**شیخ داؤد جہنی وال** | جہنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے آئے تھے۔ اور ملتان کے نواح میں بمقام سیت پور مقیم رہے۔ شیخ اس سیت پور میں پیدا ہوئے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی والدہ بھی فوت ہو گئیں اور وہ یتیم رہ گئے۔ انکی سرپرستی اور تربیت ان کے بڑے بھائی میاں رحمت اللہ نے کی۔ جس وقت وہ قرآن کا سبق لیا کرتے تھے تو آنسو رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ پڑھنے پڑھانے کی مصیبت میں نہ ڈالو۔ بس اللہ کے سپرد کرو۔ لوگوں نے آخر سمجھ لیا کہ انہیں کسی معلم کی ضرورت نہیں ہے۔

بہ تعلیم آداب اور اچھ حاجت  
کہ او خود ز آغاز آمد مؤدب

مشہور ہے کہ انہوں نے حضرت امام حسنؑ یا امام حسینؑ کو خواب میں دیکھا تھا کہ انہوں نے سورہ فاتحہ کی چند آیتیں ان کو سکھائیں۔ جب کبھی تفریح کی خاطر کھیلنے جاتے تو حیران رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ان لڑکوں کے چہرے نوچے ہوئے ان کے جسم خون آلود اور کھال ادھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض مجھے یوں دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے ان کے سر نہیں ہیں۔

عرصہ دراز کی مصیبتوں کے بعد حضرت اپنے وطن سے ستگرہ پھر وہاں سے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ نے مولانا عارف جامی کے شاگرد مولانا اسماعیل اچھر کے سامنے زانوئے تلمذہ کیا۔ اور کم عمری ہی میں اس خوبی کے ساتھ شرح اصفہانی پڑھ لی کہ ان کے ساتھ جو ولایتی (عرب و ایران کے) طالب علم پڑھتے تھے۔ وہ ان کی ذہانت و ذکاوت پر حیران رہ گئے۔ ان کے استاد کہا کرتے تھے کہ جس طرح ہم اپنے استاد مولانا جامی کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ نوجوان بھی ایسا صاحب مرتبہ ہو گا کہ لوگ اس کے دیدار کو ہی بڑی برکت جانیں گے۔ اور اس کی صلاحیتوں سے استفادہ کریں گے۔ آخر اسی طرح ظہور میں آکر رہا ہے

نگار من کہ بہ مکتب زلفت و خط نوشت

بغمرہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑی ریافتیں کیں۔ اس دوران میں خود بخود آپ پر ایک خاص جذبہ طاری ہوا۔ اور حضرت غوث الثقلین سے ایک باطنی مناسبت پیدا ہو گئی۔ عالم مراقبہ میں وہ جو کچھ سوال کرتے تھے اس کا جواب انہیں مل جاتا تھا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسی عالم جذب میں سر و پا برہنہ دیپال پور کے نواحی صحرا میں جسے اب شیر گردھ کہا جاتا ہے۔ اور جو جنگلی جانوروں کا مرکز ہے گھومتے رہتے تھے۔

### ما عاشق سرگشتہ صحرائی دمشقیم

کبھی کبھی جب وہ حضرت مخدوم عالم گنج شکر کے مزار پر چلے جاتے۔ تو وہاں ان کو باطنی اشارے ملتے۔ بشارتیں سنائی دیتیں۔ اور صاحب مزار سے گفتگو ہوتی۔ جس کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں نہیں دی جاسکتیں۔ شیخ ابوالمعالی ولد شیخ رحمت اللہ کی تصنیف ”نعمات داؤدی“ میں دیکھی جاسکتی ہے شیخ ابوالمعالی کی ولادت کی ایک تاریخ تو ”گدائی شیخ داؤد“ سے اور دوسری ”ابوالمعالی حق پرست“ نکلتی ہے۔ اب وہ حضرت شیخ داؤد کے جانشین ہیں، اس صحرا نوردی میں حضرت مدروح نے بیس سال گزار دیئے۔ اس کے بعد آپ کی توجہ سلوک و ارشاد کی طرف مائل ہوئی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بظاہر آپ کا کوئی پیرو مرشد نہ تھا۔ حضرت غوث اعظم نے اپنی روحانیت سے آپ کی راہ نمائی کی کہ سلسلہ طریقت کے تحفظ کے لیے وہ شیخ حامد قادری ولد شیخ عبدالقادر ثانی کے ہاتھ پر بیعت کریں شیخ حامد کے صاحب زادے شیخ عبدالقادر آج کل اپنے والد کے قائم مقام ہیں، شیخ حامد چوں کہ بارہا خود ان سے مقامات سلوک میں مدد لیتے رہے تھے۔ اور ہر مشکل مرحلہ میں ان سے دعا کرتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کو اپنا مرید بنانے، شجرہ لکھ کر دینے میں تامل تھا۔ یہاں تک کہ شیخ داؤد خود ایک دن سترگڑھ جہاں مخدوم شیخ حامد مقیم تھے تشریف لے گئے۔ اور نہایت عالم جذب میں ان سے فرمایا کہ یہ دیکھو خود غوث اعظم تشریف لائے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ ”سجادہ عصا شجرہ خلافت گھوڑا پاکی اور دوسرے لوازمات پیشوائی میرے حوالہ کر دو۔“ جب شیخ مخدوم کو بھی اس معاملہ میں عین یقین حاصل ہو گیا تو انہوں نے شیخ داؤد کی تمام فرمائشوں کی تکمیل کر دی۔ اور وہ وہاں سے شیر گردھ کے نئے شہر میں آکر جہنمی کے قریب مقیم ہو گئے۔ یہ مقام ملتان اور پٹن کے درمیان تھا۔ آپ نے یہاں قیام فرما کر سلسلہ سرور دیہ و حشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا۔ ان کے تلقین و ارشاد کی ایسی شہرت ہوئی کہ تاقیامت یہ شہرہ ختم نہیں ہو سکتا۔

جس زمانہ میں مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری اہل اللہ کے در پئے آزار ہو گیا تھا۔ اور بعض ظالمان حق کو شہید بھی کر دیا تھا۔ اسلم شاہ افغان سور نے گوالیار سے حضرت کی طلبی کے لیے بھی فرمان بھجوا دیا تھا۔ آپ تنہا ایک دو خادموں کے ساتھ گوالیار گئے۔ اسلم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اسی جگہ آپ نے قیام فرمایا۔ اسلم شاہ نے نہایت خلوص و عقیدت کے ساتھ حضرت سے بات چیت کی۔ اس رنگ کو دیکھ کر ہی فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے۔ اور وہ ادھر ادھر کھسک گئے۔ اور ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا۔ مخدوم الملک نے کہا ”یہ جھوٹ بولنے والے آدمی نہیں ہیں۔“ کچھ گفتگو کے بعد آپ نے دیکھا



کیا ”ہم فقہار کو طلب کرنے کا آخر سبب کیا تھا؟“ مخدوم الملک نے کہا ”ہم نے سنا تھا کہ آپ کے مرید ذکر کے وقت ”یا داؤد“ ”یا داؤد“ کا نعرہ لگاتے ہیں“ آپ نے جواب دیا یہ سننے والے کی غلط فہمی ہے۔ میرے مرید تو ”یاودود“ ”یاودود“ کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم الملک کے ساتھ آپ کی ایک دن یا ایک رات نشست رہی۔ آپ نے اسے حقائق و معارف کی باتیں بتائیں۔ اور چند نصیحتیں بھی کیں۔ وہ نہایت متاثر ہوا اور آپ کو اسی مقام سے پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں میاں حسام الدین طلبہ کے زہد و تقویٰ کا ذکر چہرہ گیا د میاں حسام الدین کے اوصاف و حالات کا ذکر ”نجات الرشید“ میں کیا گیا ہے، آپ نے کہا افسوس میاں ظاہری رسوم و اخلاق میں پھنس کر حق تعالیٰ کی محبت ذاتی سے دور رہ گیا۔

حضرت نہایت ایثار پیشہ اور فیاض دست تھے۔ ہر سال ایک بار یا دو بار اپنا سارا نقد و مال جو بدیوں اور نذرانوں میں جمع ہو جاتا تھا، راہِ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سکونتی حجرہ میں اس حال میں رہتے تھے کہ بجز مٹی کے پیلے اور پرانے پوریے کے کچھ اور باقی نہ رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس روپیہ جمع ہو جاتا۔ اسی طرح خیرات کر دیتے۔ اس دریا دلی اور کشادہ دستی کے باوجود حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پر ان کی خانقاہ کے نگر سے تقریباً ایک لاکھ زائرین کیا خاص کیا عام بھی کو کھانے پینے کی اشیاء دی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے نگر کی رونق اسی طرح قائم ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

آپ کی زبان مبارک سے بعض بڑے موثر کلمے ادا ہوئے ہیں۔ مثلاً ”بسم اللہ الدلیل الہادی غی ظلمات البہار والہوادی“ اس پاک کلمہ کا اثر خطرات اور حادثات کے موقع پر ظاہر ہوا ہے۔ اور بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ایسی ہی بہت سی تسبیحیں ذکر اذکار آپ سے منسوب ہیں۔

آپ نے اپنی ہر کا صبح خود ہی تجویز کیا تھا۔

محی داؤد عن اسم و رسم

قان الفقر یجو کل و رسم

میں بیرم خاں کے عہد میں جو بلاشبہ ایک بہترین زمانہ تھا اور اس وقت ہندوستان مجملہ عروسی کی طرح دلکش و بارونق تھا، آگرہ میں تعلیم پاتا تھا اس وقت میں نے بعض درویشوں سے آپ کی شان بزرگی کے قصے سنے تھے۔ اور آپ کی عقیدت و محبت کا بیج میرے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانہ میں چند بار میں نے حضرت کی خدمت میں جانے کے ارادہ سے شیرگڑھ کا ارادہ کیا۔ لیکن والد مرحوم مانع ہوئے۔ اور راستہ ہی سے مجھے واپس لوٹایا۔ بعض اوقات کچھ اور مواعظ پیدا ہوئے کہ میں اس برکت سے محروم ہی رہا اور انتظار میں بارہ سال نکل گئے۔

ایک مرتبہ حضرت کا ایک مرید شیخ کالونا می جس کی زبانی میں حضرت کا حال سن کر غائبانہ معتقد ہو گیا تھا، بدایوں آیا۔

وہ جب بھی ملتا مجھ سے کہتا تھا ”بڑا افسوس کہ حضرت میاں صاحب زندہ ہیں اور تم ان سے ملنے ایک بار بھی نہیں گئے۔“ اس کی یہ بات میرے خرمین اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ایک اچھا سبب پیدا کر دیا کہ محمد حسین خاں نے جس کی ملازمت سے میرا تعلق تھا، ابراہیم حسین میرزا کے تعاقب میں کانت و کولہ سے پنجاب کی طرف کوچ کیا۔ اور مجھے اس سعادت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں پنجاب سے حضرت کی ملاقات کے لیے شیرگڑھ پہنچا۔ میں نے حضرت کے جمال مبارک میں ایسا حسن پایا کہ کسی صاحبِ حسن کو اس سے نسبت نہیں دی جاسکتی۔ گفتگو کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آپ کے دانتوں سے نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا جس سے دل کی تاریکی چھٹ جاتی تھی۔

میں وہاں چند دن مقیم رہا۔ اس دوران میں کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جس میں کہ سو سو پچاس پچاس ہندو اپنے گھرانوں سمیت اگر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔ آپ کی شخصیت کی وجہ سے مجھے تو اس شہر کے در و دیوار شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حضرت نے مجھے ایک کلاہ عنایت کر کے کہا کہ میری طرف سے اپنے اہل و عیال میں تم نائب رہو۔ میرا یہی طریقہ ہے۔ پھر آپ نے میرے متعلقین کے لیے اپنے گھر سے ایک دوپٹہ اور دو مال منگا کر عنایت کیا۔ میں نے عرض کیا اگر ایک پیرا بن بھی عطا ہو جائے تو میرے لیے نوڑ علی نور ہے۔ بڑے تامل کے بعد فرمایا ”وہ بھی وقت پر مل جائے گا۔“ میں نے حضرت سے بعض دلی مقاصد اور اسرار بیان کیے اور ان کے جواب سنے۔ اس کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ اس اشار میں حضرت بھی کمزوری کی وجہ سے پانکی میں بیٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں نے ان کی پانکی کا پایہ اپنے کاندھے پر لے لیا اور کئی قدم چلا۔ اس وقت مجھ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ حضرت نے پانکی رکوالی اور مجھے بہت سی معرفت و محبت کی باتیں بتائیں۔

جس دن میں رخصت ہو رہا تھا۔ میں نے میاں عبدالوہاب کے وسیلہ سے حضرت سے عرض کیا کہ ہندوستان کے مشائخ کہتے ہیں کہ ایک سید کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ ان میں سے اکثر نے ایک سید پر اتفاق بھی کر لیا ہے۔ جس کے آباؤ اجداد اس سے پہلے کچھ عرصہ تک دہلی اور بدایوں پر حکمران بھی رہے ہیں۔ اور اب وہ لوگ جہاد کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حضرت غوث اعظم کی طرف سے اس اہم خدمت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے سرحد کے بعض امیروں کو بھی اپنا حامی بنایا ہے۔ بعض لوگوں نے مختلف مقامات پر بشارت پاکر اس گروہ میں شرکت کر لی ہے۔ اور اب یہ سب اپنے ارادوں کو عملی صورت دینے کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے پوچھا اس سید کی وضع اور حالت کیسی ہے؟ میں نے کہا وہ ایک گوشہ نشین متشرع اور متوکل فقیر ہے۔ بڑی عبادت و ریاضت کرتا ہے۔ دن کو مقبروں میں بیٹھا رہتا ہے۔ رات کو اپنے حجرہ میں عبادت کرتا رہتا ہے۔ فنونِ سپاہ گری میں بھی بے مثل اور لاثانی ہے۔ اس کے اخلاق و عادات نہایت شائستہ ہیں۔ شادی شدہ کنبہ والا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس جماعت کے لوگ درویش نہیں معلوم ہوتے کہ حضرت غوث اعظم پر یہ افترا باندھتے ہیں۔ اور اس بچارے سید کا بھی خانہ خراب کرنا چاہتے ہیں۔ انکی وہ سار کا

بشارتیں محض شیطانی وساوس ہیں۔ بھلا حضرت (غوث اعظم) اس بات پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟ ان کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت بالکل دل سے نکل جائے اور خلوص و سچائی کے ساتھ عشق خداوندی حاصل کیا جائے، حرم ہوس کا نام تک باقی نہ رہے۔ عبادت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر دنیا کے جال میں پھنسنے کہاں کی ہوش مندی ہے میری جانب سے تم اس سید سے کہنا کہ تم نے جو ارادہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم کو استقامت عطا کرے۔ اگر تمہارے دل میں اس دنیائے فانی کی لذتوں کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا ہے تو پہلے تم اس کو دور کرنے کی فکر کرو۔ اور اس نادان جماعت کے بہکانے سے مغرور ہو کر بے راہ نہ ہو جاؤ۔ طالب دنیا کا منتہا و مقصود صرف سلطنت ہے۔ جو چند روزہ اور فانی ہے۔ طالب عقیقی کو آخرت کی جاوداں نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اگر خدا کا طالب اپنے مطلب سے محروم رہ کر حسرت ہی میں رہ جائے تو اس کی ناکامی اول الذکر کی کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سلسلہ کلام میں انہوں نے بڑی نصیحت آمیز باتیں کیں۔ جنہیں سن کر حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب بے اختیار رونے لگے۔ میں بھی ہاں سے روتا اور آنسو بہاتا رخصت ہوا۔

اس زمانہ میں الخ بیگی مرزاؤں کی شورش کی وجہ سے شیر گڑھ سے لاہور تک کا راستہ خطرناک ہو گیا تھا۔ اور میں تنہا تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے ایک خادم کو میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شیخ ابوالسحاق مہرنگ کی خدمت میں جو حضرت کے بڑے عمدہ خلیفہ تھے پہنچا دے۔ پھر وہ مجھے حسین خاں کے لشکر میں جو طلبہ سے لاہور آیا ہوا تھا۔ اور وہاں سے کانت و کولہ جانے والا تھا پہنچا دیں۔

غرض میں لاہور پہنچ کر حسین خاں کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو گیا۔ ایک دن سہارن پور کی منزل میں ایک باغ میں بیٹھا ہوا حضرت کی یاد میں طویل تھا کہ ایک مسافر قادری پیرا ہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ لے لو ایک بزرگ پیر کے ہاں سے یہ مجھے حاصل ہوا تھا۔ اور مجھے اس کے عوض کچھ راستہ کا خرچ دے دو۔ میں نے اس سے جب اس کرتے کے ملنے کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں میرزا ابراہیم حسین کے لشکر میں تھا۔ جب اسے شکست ہوئی تو سپاہیوں کا ایک گروہ جس میں میں بھی تھا لٹ لٹا کر اس حال میں کہ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں رہے تھے۔ شیر گڑھ میں حضرت پر دستگیر کی خدمت میں پہنچا۔ انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عنایت کیا۔ جب میری باری آئی تو یہ گزتا اپنے بدن سے اتار کر مجھے دے دیا۔ میں نے اس کو پہننا بے ادبی جانا اور ہدیہ و تحفہ کے طور پر اسے محفوظ رکھے رہا۔ اب وہ میں تمیں دے رہا ہوں۔ میں نے یہ ہدیہ غیبی اس سے لے لیا ہے

نکست پیرا ہنت آمد بہ من      لذت جاں یافتہ زباں را بچہ  
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا      شد قبول الحمد للہ فاتحہ

مجھے حضرت کی وہ بات یاد آگئی کہ فرمایا تھا "کرتا بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے گا" بلاشبہ یہ آپ کی کرامت تھی۔ میں اس پیرا ہن یوسف کو جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں۔

شوق تو در ضمیر و مہر تو در دلم      با شیر اندروں شد و با جاں بروں شود

شیخ داؤد جہنی وال اپنے وقت کے قطب صاحب کشف و کرامات تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اور سخت مجاہدے کیے تھے۔ ابتدائے میں علوم ظاہری حاصل کیا اور ان کی تعلیم بھی دی۔ پھر ایسے متوکل اور خانہ نشین ہوئے کہ کبھی اہل دنیا سے ملنے نہیں گئے۔ صرف ایک بار شیخ گڑھ سے گواہ ہوا کہ وہ بھی اسلم شاہ کے طلب کرنے پر گئے تھے۔ اکبر بادشاہ جب تین کو گیا تو اس نے شہباز خاں کو شیخ کے بلانے کے لیے بھیجا تا کہ وہ ملاقات کا موقع دیں۔ لیکن آپ نے عذر فرمایا کہ ہماری غائبانہ دعا ہی کافی ہے۔ غرض آپ دنیا داروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہتے تھے۔ اور الفقر فخری پر عمل کر کے ہمیشہ بخشش و ایثار سے کام لیتے تھے۔ جو طالبان حق آتے ان کو تلقین و ارشاد فرماتے۔ جو شخص بھی حضرت کی صحبت میں پہنچ گیا وہ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہو کر لوٹا۔

آپ نے ۹۸۲ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات — "یا شیخ داؤد ولی" — ہے۔

شیخ ابن امروہہ | سالک طریقت اور مجذوب تھے۔ اس حالت جذب کے باوجود شریعت کے لوازم ترک نہیں ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی پابندی کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ ان کی بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ آزادانہ زندگی گزاری۔ لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔

جس زمانہ میں میں میاں شیخ داؤد سے مل کر پنجاب سے واپس ہوا تھا اور امروہہ کے راستے بدایوں جا رہا تھا۔ تو حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے بغیر کلام پاک کی ایک آیت بیان کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ انہوں نے اس وقت جزا اور صبر کرنے والوں کے اجر کی فضیلت بیان کی۔ اور اس سلسلہ میں آیت "والباقیات الصالحات میری طرف دیکھ کر تلاوت کی۔ اس تلقین کا مطلب جلد ہی ظاہر ہوا۔ ان کا اشارہ کسی مصیبت کی طرف تھا۔ چنانچہ میری ایک بچی تھی جس کو میں بہت چاہتا تھا۔ میں ابھی اسی سفر میں تھا کہ وہ بدایوں میں فوت ہو گئی۔ ان کے وہ تسلی آمیز ارشادات غالباً میرے ہی لیے تھے۔ واللہ اعلم۔

ان کی وفات ۹۸۲ھ میں ہوئی۔

خواجہ عبدالشہید | یہ خواجہ کا خواجہ کے صاحبزادے اور خواجہ کا خواجہ حضرت خواجہ احرار کے لڑکے ہیں۔ جس وقت خواجہ عبدالشہید پیدا ہوئے تو لوگ انہیں خواجہ احرار کی خدمت میں لے کر گئے۔ حضرت نے ان کو گود میں لے کر فرمایا "مرد حق آگاہ بنے گا۔"

خواجہ عبدالشہید ظاہری اور باطنی کمالات کا مجموعہ تھے۔ انہوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ ان کی شخصیت انسانی کمالات کا آئینہ تھی۔ خلق خدا نے ان کی تلقین و ہدایت سے بڑا فیض اٹھایا۔ وہ طریقہ سلوک میں حضرت خواجہ احرار کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سمرقند سے ہندوستان آکر یہاں اٹھارہ سال تک بسر کیے۔ ۹۸۲ھ میں فرمایا کرتے تھے "ہماری رحلت کا وقت قریب چکا ہے۔ اور یہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم اپنی بڑیوں کو سمرقند میں اپنے آبائی قبرستان میں پہنچا دیں۔" چنانچہ وہ سمرقند لیے روانہ ہو گئے۔ جس وقت وہ کابل پہنچے تھے تو میرزا شاہ رخ نے کابل والوں کو اسیر کر لیا تھا۔ اور بدخشاں جا رہا تھا۔

خواجہ صاحب کی سفارش سے تقریباً دس ہزار آدمی ظالموں کی قید سے رہائی پائے۔

خواجہ صاحب سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ مدفون ہوئے۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ ان کی کرامتوں کا ذکر کر کے ان کے مراتب کو ظاہر کیا جائے۔ میں نے حضرت کا دیدار اس وقت کیا تھا۔ جب کہ لشکر شاہی پٹنہ سے واپسی میں بھون گاؤں اور پٹیالی کی حدود میں پہنچا تھا۔ آپ اکبر بادشاہ سے وداع ہونے کے لیے تشریف لائے تھے۔ میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھا۔ ملاقات اور گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

**شیخ ادہن جون پوری** | چشتی سلسلہ میں اپنے والد شیخ بہاؤ الدین کے مرید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مقتدر اور پیشوا تھے۔ طویل عمر پائی۔ ان کی زندگی عمر طبعی سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے تک ان کے سامنے ستر ستر استی امتی برس کے ہو گئے۔ اسی طرح پوتوں کی بھی ان کی زندگی میں بڑی عمر ہوئی۔

شیخ ادہن نے اپنی ساری زندگی عبادات اور حصول معرفت میں گزار دی۔ علوم ظاہری بھی انہوں نے بہت حاصل کیے تھے۔ لیکن کبھی درس نہیں دیا۔ سماع کا بڑا ذوق تھا۔ آخر عمر میں جسمانی کمزوری کی وجہ سے وضو کرنے اور نماز پڑھنے اور ضروری حاجتوں کے لیے خادموں کی مدد کے بغیر اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس جال میں بھی اگر راگ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو سماع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر ان پر ایسا حال آتا کہ چند آدمی بھی مل کر ان کو یہ مشکل سنبھال سکتے۔ فرض نماز کے ادا کرنے میں بھی یہی حال تھا۔ سنت اور نفل تو بیٹھ کر پڑھ لیتے۔ لیکن فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے اور کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

مشہور ہے کہ ان سے کرامتیں اس بے تکلفی سے صادر ہوتی رہتی تھیں جیسے روزمرہ کی بشری ضروریات۔ انہیں اللہ نے بکثرت اولاد دی۔ محفل میں جب وہ اپنے ہوش مند سفید سفید داڑھی والے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو آنے والا بڑے شبہ میں پڑ جاتا کہ ان بڑھوں میں سے حضرت کون ہیں اور ان کے لڑکے کون۔ اپنی محفلوں میں طریقت و حقیقت کے باب میں ایسی گہری باتیں بیان کرتے تھے کہ عوام تو عوام خواص بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بوالہوس ان اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ ان کی یہی رمز بیانی ان کے متعلق شبہ کا باعث ہو گئی تھی۔

اکبر پہلی بار جب باغیوں کی سرکوبی کے لیے جون پور گیا تھا اور جون پور تین دن کے راستہ پر رہ گیا تھا کہ شیخ کا جون پور میں انتقال ہو گیا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم ہی رہا۔

وفات سنہ ۹۷۵ھ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ادہن" سے نکلتی ہے۔

**شیخ عبدالغفور اعظم پوری** | اعظم پور سنبل کا ایک ماتحت قصبہ ہے۔ شیخ موصوف شیخ عبدالقدوس چشتی کے مرید ہیں۔ ظاہری اور باطنی کمالات کا مظہر تھے۔ بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔ حضور اکرم کی طرح توفیق خداوندی ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ ان کا تصرف و اثر ملنے والوں پر بڑی جلدی ہوتا تھا۔



اگر طالب کی اہلیت و مناسبت کمتر بھی ہوتی۔ تو شیخ کی کشش بہت جلد اس کو آگے بڑھا دیتی۔ اور وہ بے اختیار خدمت گزاری پر مائل ہو جاتا۔

اکثر اوقات دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ ان کا روح افزا کلام پریشان دلوں کی راحت بن جاتا تھا۔ اور ان کی معجز بیان زبان بے قرار جانوں کے لیے مرہم کا کام کرتی تھی۔

حسن صورت اور حسن سیرت دونوں میں وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز تھے۔ مرید کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تصوف کے موضوع پر کئی ایک رسالے بھی لکھے تھے۔ بلاشبہ شیخ کے ظاہری اور روحانی کمالات میں کوئی کسر نہیں تھی۔

آپ نے سترہ سال میں رحلت فرمائی اور اعظم پور میں دفن ہوئے۔

میاں وجیہ الدین احمد آبادی | یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اپنے نسب کو انہوں نے مسافر ہونے کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ ہمیشہ دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ”صرف ہوائی“ سے لے کر ”قانون“ ”شفا“ ”شرح مفہاج“ اور ”عصری“ جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انہوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔

اللہ نے ان کی دعائیں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی۔ چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھر نہیں گئے۔ بجز ایک دو بار کے وہ بھی طلب کرنے پر نہایت استکراہ کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ان کا گھرانہ و اعلیٰ سب کا مرکز و مرجع تھا۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قانع رہتے تھے جو کچھ تندر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے۔

ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا۔ لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے۔ انہی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جب شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے۔ بلکہ دربار سرکاری میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا۔ ان کے قتل کا فتوے صادر کر دیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کر دیا۔ چونکہ میاں وجیہ الدین شیخ محمد غوث کے گھر جا چکے تھے اور علی ہمدانی کے شیدا و قریفہ ہو گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ فوراً سے ہوئے میاں کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیئے کہا آپ آخر کس لیے بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی

بن گئے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ”ہم اہل قاتل میں سے ہیں اور شیخ محمد غوث ارباب حال میں سے، ہم ان کے اعلیٰ کمالات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔“

شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ تھا۔ میاں صاحب کے اس رویہ کی وجہ سے شیخ موصوف پھانسی پانے سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے۔ جیسی شیخ علی متقی کی ہے۔ اور حقائق پر ایسی جیسے ہمارے پیر (یعنی شیخ محمد غوث) کی نظر ہے۔

میاں وجیہ الدین کا انتقال ۹۹۸ھ میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات ”وجیہ الدین“ سے نکلتی ہے۔ واضح رہے ان چار بزرگوں سے جن کا ذکر کر آیا ہوں۔ مجھے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

میاں عبد اللہ نیازی سرہندی | نیازی پٹھانوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ میاں عبد اللہ پہلے شیخ اسلم چشتی فتح پوری کے مرید تھے۔ آپ اس حجرہ میں جو نئی خانقاہ کے متصل ہے۔ اور اب وہاں عبادت خانہ شاہی کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ ہمیشہ معتکف رہا کرتے تھے۔

جس وقت شیخ اسلم پہل بار براہ خشکی حج کے سفر پر گئے تھے، وہاں سے لوٹ کر آئے تو میاں عبد اللہ نے شیخ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے ان تمام شیوخ و اہل اللہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک تذکرہ دیا۔ جن سے شیخ نے عرب عجم اور ہندوستان میں ملاقات کی تھی۔ میاں عبد اللہ نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی اور ان مشائخین سے ملاقاتیں کیں۔

سید محمد جون پوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ میاں عبد اللہ کا گجرات اور دکن میں اس سلسلہ سے تعلق ہوا اور انہوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔ بیان میں اگر کچھ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں دنیا سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرتے رہے۔ جب بیان کے شیخ علانی کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تو اسلم شاہ نے مخدوم الملک کے بہکانے سے میاں عبد اللہ کو بھی سخت ایندائیں دیں اور انہیں بری طرح پٹایا گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آخر عمر میں میاں عبد اللہ نے مہدوی عقائد کو ترک کر دیا تھا اور سرہند میں عزت گزیں ہو گئے تھے۔ تمام مشائخین کی طرح سلوک و طریقت پر کار بند تھے۔

جس زمانہ میں اکبر نے فتح پور میں ان کے حجرہ کو جو محل شاہی سے متصل تھا تعمیر کرایا تھا اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا تو اسی سلسلہ میں میاں عبد اللہ کا حال اکبر کو معلوم ہوا تھا۔ اکبر نے ان کو سرہند سے بلا کر تنہائی میں گفتگو کی اور ان کے حالات دریافت کیے۔ اس وقت انہوں نے مہدویت سے انکار کر کے کہا، چونکہ پہلے یہ جماعت مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی اس لیے میں نے اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا۔ جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے اس سے دست برداری کر لی۔

اکبر جب ۹۹۳ھ میں انک جاتے ہوئے سرہند پہنچا تو انہیں دوبارہ طلب کر کے ملاقات کی۔ اور ان کی مدد و معاش کے لیے

اراضی کی پیش کش کی۔ انہوں نے توکل و قناعت کی وجہ سے اس کو قبول نہ کیا۔ لیکن اکبر نے فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کر ہی دیا۔ انہوں نے مجبوراً وہ فرمان لے لیا۔ لیکن توکل و قناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس اراضی سے مرتے دم تک کوئی استفادہ نہ کیا۔ ان کے سارے عمل کا انحصار ”احیاء العلوم“ اور ”کیمیائے سعادت“ پر تھا۔

الخ میرزا کی بغاوت کے زمانہ میں میں محمد حسین خاں کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ان سے میں نے سرہند جا کر ملاقات کی تھی ان کے سامنے ”احیاء العلوم“ کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند مضامین انہوں نے بیان کیے۔ اس وقت محمود خاں ان کے ایک شناسا نے جو اسلم شاہ کے عہد سے ان کی مصاحبت میں تھا اور شیخ علانی کی تحریک کے وقت میاں نے اسے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا میاں صاحب سے پوچھا ”دل کیا ہے؟“ انہوں نے جواب دیا ”دل سے ہمارا فاصلہ ہزاروں منزلوں کا ہے۔ اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ اخلاق و عمل کی باتیں دریافت کرو۔“ اس کے بعد ایک بوڑھے مغل نے کسی ذکر میں میر سید محمد جون پوری کی مہدویت کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ان سے تصدیق و شہادت طلب کی۔ انہوں نے کہا ”جس وقت میر سید محمد جون پوری نے رحلت فرمائی تھی میں فراہ میں حاضر تھا۔ انہوں نے مہدویت کے دعوے سے انکار کیا تھا اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا ”میں مہدی موعود نہیں ہوں۔“ واللہ اعلم۔ ان کی بات سن کر محمود خاں نے آہستہ سے کہا۔ میاں عبداللہ نے بھی اچھا کام کیا کہ مہدویت کی حمایت کر کے بیچارے شیخ علانی کی گردن کٹوا دی اور خود دامن بچا کر اس دائرہ سے نکل آئے۔

میاں عبداللہ نے بعمر نوے سال ستلج میں اس سرائے فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔

**شیخ ابوالفتح گجراتی** | یہ حضرت میر سید محمد جون پوری کے داماد تھے۔ لیکن انہوں نے سید صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ یہ بڑے جاہ و جلال والے بزرگ تھے۔ سلسلہ مہدویت میں نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ تھے۔ مکہ معظمہ اور گجرات میں شیخ گدائی کے ساتھ ان کی خوب دوستی رہی تھی۔ بیرم خاں خان خاناں کے عہد میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آگرہ آگئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد جب بیرم خاں کی باطانت آگئی تو وہ گجرات چلے گئے۔

میں اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاجی مہدی لاہوری کے داماد مولانا عبداللہ قندھاری کے ساتھ آدمی رات کے وقت شیخ کی خدمت میں پہنچا تھا۔ وہ اس وقت آگرہ میں جانا کے پار شیخ ہاؤس میں مفتی کے محلہ میں مقیم تھے۔ ایک خالی حجرہ میں تنہا بیٹھے ہوئے کسی شغل میں مصروف تھے۔ ہم پہنچے تو انہوں نے حضور اکرم کی یہ حدیث ”لا یقعد قوسین ینکسرن اللہ الا حقنہم الملائکۃ وغشیتہم الرحمن و نزلت علیہم السکینۃ و ذکرہم اللہ فیمن عندہ“ پڑھی اور اس کی تشریح کی پھر انہوں نے مجھے اس حدیث کے ذکر کی تلقین کی۔ میں نے کچھ عرصہ تک اس حدیث کا ذکر کیا اور واقعی میں نے اس کا بڑا اثر اور فیض محسوس کیا اور قرآن کا مطلب مجھ پر واضح ہو گیا۔ چند بار تو ایسا معلوم ہوا کہ جو بھی آواز میرے کان میں پڑتی تھی میں اسے ذکر ہی سمجھتا تھا۔

میں نے ان کے بعض مریدوں کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے بھوں کو سریش لگا کر بند کر دیا تھا تاکہ بے فائدہ گفتگو سے بچے۔ بعض اس مطلب کے لیے منہ میں کنکریاں بھر لیا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا کہ کب اور کہاں ہوئی۔

حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے۔ اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر رکھا تھا اور ایسی مناسبت پیدا کر لی تھی کہ دونوں ایک ہی مطلب کی دو عبارتیں معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے الٹ پھیر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے بس دو تین رفیق تھے۔ جو ان کے پیر کے ہمراز اور ہم زبان تھے اور لاہور میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ سی کو اپنے ہاں نہیں بلاتے تھے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا۔ ہمیشہ ایک اندھیرے حجرہ میں جو ایک باغ میں تھا پوشہ نشین رہتے۔ جب کبھی حضرت میاں سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے۔ اور ایک رات میں چالیس دوس کا قافلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے۔ اور پیر کی آستان بوسی کر کے بغیر ملے اسی وقت لوٹ جاتے۔ کیوں کہ ان کو میاں صاحب کے دیدار کی تاب نہیں تھی۔

ایک سال میں بھی ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور ان کے ہاں ایک رات ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ حالانکہ وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا۔ راستہ میں ساہزن اور شیرے میرا راستہ روک دیتے تھے۔ اور حیران ہو کر پوچھتے تھے اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو۔ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں میاں شیخ ابواسحاق کی خدمت سے حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں جا رہا ہوں تو وہ محض ان کا نام سن کر ہی احترام و عقیدت سے پیش آتے۔ اور کھانے پینے کے لیے دودھ دیہی وغیرہ لے آتے۔ اور راستہ بتا کر قیادت و حفاظت کے لیے حضرت میاں کے نام کے ذکر اور ورد کرتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اس علاقہ میں حضرت کا نام ہر خاص و عام کے زبان زد تھا۔ غرض میں بحالت منزل پر پہنچ گیا۔

جس سال حضرت میاں نے وصال فرمایا تھا ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اس وبا میں تین چار لاکھ افراد امیر و فقیر کے تمام اہل خانہ ان اور مشہور خلفاء جو تقریباً پچاس سال آدمی تھے جن میں نرجاں مسود میاں عبد الوہاب جی کو میاں بابو بھی کہا جاتا تھا شامل تھے، ایک کے پیچھے ایک اس دنیا سے رخصت ہو کر حضرت سے جا ملے۔ حضرت کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد میاں شیخ ابواسحاق بھی انتقال فرما گئے۔

میاں شیخ داؤد کے بعد سلسلہ علیہ قادریہ کے نام لیوا ان کے صاحب زاوے میاں شیخ عبد اللہ۔ دکنے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے گوری نشین میاں شیخ ابوالعالی ہیں۔

سلام اللہ ما کر اللیالی  
علی شیخ الصغریٰ ابی الحسن

شیخ رکن الدین | شیخ عبدالقدوس کنگوسی کے صاحب زادے ہیں۔ قلم ان کے علم و کمال کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتا۔ انہوں نے جو "مکتوبات قدسی" جمع کیے ہیں وہ ان کی فضیلت کا واضح ثبوت ہیں۔ کنگوسی تھانیسر کے نواح میں ایک قصبہ ہے۔ یہی قصبہ ان کا وطن ہے۔

یہ بڑے صاحب مرتبہ بزرگ ہیں۔ ان کے بشرہ سے ہی ان کے کمالات چھلکتے ہیں۔ تصوف میں ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ ان کے سلوک کا معاملہ ان کے شیوخ کے طریقہ پر ہے۔ ذوق و حال سے بڑی مناسبت ہے۔ امرار و حکام کے گھر شدید ضرورت کے علاوہ نہیں جاتے۔ ہمیشہ گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں نے انہیں بیرم خاں کے ہنگاموں کے وقت دہلی میں شیخ عبدالعزیز کی محفل میں دیکھا تھا۔

میاں مصطفیٰ گجراتی | وہ اس بوہرہ فرقہ کے فرد تھے جو گجرات میں تجارت کرتا ہے۔ میرسید محمد جون پوری کے ایک مرید کے مرید ہوئے۔ اور فقر و فنا کا راستہ اختیار کر لیا اور مرتے دم تک اسی راہ پر گامزن رہے۔

جب اکبر بادشاہ بنگالہ کی تسخیر کے بعد پٹنہ سے لوٹ کر اجمیر گیا تھا۔ تو حسب الحکم آصف خاں ثانی میرنجشی ان کو گجرات سے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اکبر نے ایک رات دیوان خانہ کے صحن میں علماء کی مجلس منعقد کی اور شیخ مصطفیٰ سے مہدویت کے مسئلہ کی تحقیق چاہی۔ انہوں نے جواب دیا اور علماء سے ان کا بڑا طویل مناظرہ ہوا۔ اس بحث میں ابراہیم سرہندی نے اپنی منحوس عادت کے مطابق سخت کلامی سے کام لیا۔ اور شیخ کو بڑی اذیت پہنچائی۔

میرسید محمد کے ایک مرید شیخ محمد لاہی نے ایک کتاب "شرح گلشن" تصنیف کی تھی۔ اور خود بھی مہدویت کا دعویٰ کر کے بڑے قہقہے برپا کیے تھے۔ اس بحث کے دوران میں میں نے اس کتاب کے مضمون کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا یہ بات چونکہ شیخ کے مدعا کے خلاف پڑتی تھی اس لیے ان کو مجھ سے غایباً رنجش ہو گئی ہوگی۔ جب بادشاہ فتح پور پہنچ گئے تو ان کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ چند دن تک خواجہ عبدالصمد مصور شیریں قلم کے گھر مقیم رہیں۔ اس وقت میں ان کے ہاں معذرت خواہی کے لیے گیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

اس وقت وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اسی محفل میں ان کے لیے طشت لایا گیا۔ ان کے منہ سے بہت سا خون نکلا۔ جب ان کو گجرات جانے کی اجازت مل گئی تو وہ وطن پہنچنے کے بعد بارہ استنہ میں انتقال فرما گئے۔

یہ واقعہ ۱۱۲۷ھ میں ہوا۔ ان کے مکتوبات ان کی یادگار ہیں۔ جو فقر و فنا سوز و ساز سے بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ اسحاق کا کولہ پوری | ان کے والد کا نام شیخ کا کو تھا۔ لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ نہ کسی سے حاجت چاہی۔ ہمیشہ درس و تدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی اس وقت تک از خود



بات نہیں کرتے تھے۔

ایک دن ایک نامعلوم شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک مٹی کا دیگچہ ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا اس کو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلاتامل و انکار اسے سر پر اٹھایا اور بازار سے اس کے مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا۔ اور دنیا داری چھوڑ کر وہ آخر کار عالم دین بن گیا۔

میں نے سترہ سو سال میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ ایک دن میں نے شیخ فیضی سے جیسے انہی دنوں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا مذکورہ بالا حکایت بیان کی۔ فیضی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی کہ وہ ماضی و حال کے تمام علماء و مشائخ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا، حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں صبر کر کے خاموش رہا۔ ٹھیک یاد نہیں وہی رات تھی یا دوسری میں نے خواب میں دیکھا کہ شیخ ابو الفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اور ایک پرانے لکھنڈ میں جس کی بس دو تین دیواریں کھڑی ہوئی تھیں شیخ اسحاق ان تو بچپوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقین سر کرتے ہیں۔ انہوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلا دی۔ اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بجھ گئیں۔ یہ دیکھ کر میں خوف سے جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن میں شیخ کی خدمت میں تدریس کر گیا۔ جسے آپ نے قبول فرمایا۔ میں نے اپنا یہ قصہ بیان کیا تو کچھ نہ کہا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علماء کے استاد ہیں۔ جیسے شیخ سعد اللہ جو اپنے زمانہ کے بے مثل عالم ہیں۔ اور شیخ متور وغیرہ۔

جوانی میں حضرت شکار کے بڑے شوقین تھے۔ چنانچہ جب بھی سبق پڑھانے سے فارغ ہوتے باز عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکار گاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔ ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہوئی۔ سترہ سو سال میں انتقال فرمایا۔

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل | شیخ اسحاق کا کوئے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف کیفیتوں سے گزری۔ ابتداء میں شریعت کے بڑے پابند تھے۔ پھر اچانک سب چھوڑ ایک گانے والی کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ اور باوجود سفید داڑھی کے آوارہ گردی کرتے رہے۔

زین پیش اگر چہ خلق گرفت زما سبق  
عشق آمد و نماز نشان زما سبق

ان کا تو عشق نے یہ حال کیا۔ اور لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے اسے بھی ایک حال جان کر ان کو دلی سمجھنے لگے۔ وہ ابھی تباہی حالت میں عین نخاس میں کھڑے درس دینے لگ جاتے تھے۔ جو کچھ ان کے پاس تھا انہوں نے اپنے اس جنوب کے پیچھے لٹا دیا۔ ایک رات وہ اس کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ محتسبوں کی ایک جماعت نے ان کے طلباء کے ساتھ چھاپہ مارا اور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ لہو و لعب کا سارہ سامان توڑ دیا۔ اصلاح کی خاطر انہیں مزادینا چاہتے تھے کہ انہوں نے ان لوگوں سے وہی بات کہی جو کسی نے خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ میں نے

ایک کام خلاف شرع کیا اور تم لوگ تین غیر مشروع کاموں کے مرتکب ہوئے ہو، اس لیے تم مجھ سے کہیں زیادہ سزا کے مستحق ہو ایک تو یہ کہ تم نے میری برائیوں کی ٹوہ لگائی، دوسرے اجازت نہیں لی۔ تیسرے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے۔ یہ سن کر وہ لوگ نہایت خجل و شرمندہ وہاں سے لوٹ آئے۔

کچھ عرصہ بعد انہوں نے ان بد اعمالیوں سے توبہ کر لی اور ”احیاء العلوم“ کو اپنا دستور العمل بنا کر ہمیشہ عبادتوں اور ریافتوں میں بسر کرنے لگے۔

انہوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف ”جو اہل القرآن“ پر ایک شرح بھی لکھی تھی۔

اکبر نے ان کو خلوت میں بلا کر گفتگو کی تھی اور ان سے پوچھا کہ تم کس قوم کے ہو؟ انہوں نے برجستہ کہا لکھنے والوں کی قوم سے۔ جن کو ہندی زبان میں کاسٹھ کہتے ہیں۔ ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بڑی پسند آئی۔ اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

میں نے پہلی بار ان سے لاہور میں ملاقات کی تھی۔ کسی موضوع پر ملتان کی بربادی، لاہور کے آباد ہونے، سلاطین نگاہ خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انہوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ و تنقید سے حیران رہ گیا۔ گفتگو کی یہ حلاوت اور شیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی۔

وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا۔ ان کی نہ تو تجارت تھی نہ زراعت، بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش بھی نہیں ملی تھی۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ آمدنی کے بغیر وہ اس قدر اشیاء و فیاضی کس طرح کرتے ہیں۔ لوگ اس معاملہ میں ہمیشہ حیران ہی رہے۔

تقریباً اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے۔ اور بڑی عقیدت سے کاغذ ہادے رہے تھے۔

میاں صاحب اپنے زمانہ کی ایک زندہ ٹکی اور اللہ کی برکت ہیں۔ بچپن میں جب وہ بوٹا

پڑھ رہے تھے تو اس شعر پر پہنچے

محال است سعدی کہ راہ صفا

توان رفت جز در پے مصطفیٰ

انہوں نے استاد سے کہا اس شعر کا مطلب ہندی زبان میں بتا دیجئے۔ استاد نے کہا تجھے اس حکایت سے کیا غرض آپ نے فرمایا ”جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے میں آگے سبق نہیں پڑھوں گا۔“ جب معلم نے اس کے معنی بتا دیئے تو انہوں نے حضور اکرم کے متعلق پوچھا کہ وہ کون تھے؟ استاد نے حضور اکرم کے کچھ حالات اور معجزے بیان کیے۔ پس اتنا سننے ہی ایک جذبہ سا ان پر طاری ہوا۔ اپنا کرتہ پھاڑ دیا اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی جب ان کے والدین کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے۔ لیکن جب دیکھا کہ ڈرانے دھمکانے سے وہ اپنے خیال سے نہیں ہٹیں گے تو انہیں

ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آبائی وطن سامانہ سے قرآن سیکھنے، احکام دین معلوم کرنے کی خاطر دہلی چلے آئے اور بڑے بڑے علماء و مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھا کر اپنے زمانہ کے سربر آوردہ عالم بن گئے۔

شیخ عبدالباقی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ انہی سے ذکر کی تلقین حاصل کی، پھر شیخ صغی خیر آبادی اور دوسرے بزرگوں سے وابستہ رہے اور بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور طریقت و سلوک کا تکملہ کیا۔ اپنے زمانہ کے اکثر رہنماؤں سے فیض تربیت حاصل کیا، خاص طور سے میاں شیخ لاون دہلوی اور میرسید جلال بدایونی سے ان کو بڑی عقیدت رہی۔ میرسید جلال کی وفات کے بعد ان کے قائم مقام ہوئے۔ اور برسوں بدایوں میں درس دیتے رہے بڑے بڑے مشہور عالم ان کی ہی مجلس درس سے نکلے ہوئے ہیں۔

دور دور سے لوگ استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آخر حال میں ان پر حالت جذب کا غلبہ تھا تھا۔ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے اور انتہائی جذب و شوق میں نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور چند قدم تک جھومتے جلتے۔ لیکن رقص اور وجد کیے بغیر ہی اچانک لاجول پڑھ کر اپنی جگہ لوٹ کر کھڑے ہو جاتے۔

ایسی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ بزرگوں کی طرح اپنے گھر کی چھوٹی بڑی ضروریات خود ہی پیدل جا کر بازار سے خرید کر اپنے آپ ڈھو کر لے آتے۔ راستہ میں طالب علموں کو سبق بھی پڑھاتے جلتے۔ ان کے شاعر دہشت کہتے کہ حضرت تکلیف نہ کیا کریں بحیرہ ندست بجاتے ہیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کے چہرہ مبارک پر فقہ و فنا کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کو اپنے بزرگوں سے تلقین و ارشاد اور سند خلافت ملی ہوئی ہے۔ لیکن پیری مریدی کے بکھیرے میں نہ پڑے۔ بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے ہیں۔

میں ان کے پاس کلام تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ نہایت ذہین اور مخلص شاگرد شریک درس رہا کرتے تھے۔ اور سبق پڑھتے ہوئے بڑی الجھی ہوئی اور دقیق بحثیں اٹھاتے تھے۔ میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ان اونچی بحثوں اور گہرے نکات کے حل و افادہ میں انہیں کسی کتاب کے دیکھنے کی حاجت ہوئی ہو۔ تمام علمی نظریے ان پر بخوبی روشن تھے۔ اور حل و تحقیق کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ خدا کی تائید و توفیق بھی ان کے ساتھ تھی۔

اس وقت ان کی عمر نوے سال ہے۔

**شیخ جلال الدین قنوجی** | ایک مجذوب اور سالک تھے۔ ان کے بزرگ ملتان سے آکر ہندوستان کے قدیم شہر قنوج میں مقیم ہو گئے تھے۔ سلوک کا مرحلہ طے ہوا تو حالت جذب طاری ہو گئی۔ مگر

اس حال میں بھی اتباع شریعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

جب کبھی ان پر حال آجاتا تو وہ منہ کالا کر کے چار پائی کی رسی گردن میں ڈال کر بازاروں میں گھومنے لگتے اور بڑی درد انگیز آواز میں فریادیں کرتے رہتے۔ اس قسم کی حرکتیں ان سے اکثر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن مسجد حئی میں نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اٹھ کر صحن مسجد میں اپنے بزرگوں کی قبروں کی طرف چلے گئے۔ ایک خادم ان کے ساتھ تھا۔ ہر قبر پر علیحدہ علیحدہ فاتحہ پڑھی اور خادم سے ہر ایک

کا حال بیان کرتے رہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے فرائض میں سے ایک مسئلہ اس خادم سے پوچھا، اس نے جواب دیا کہ کوئی شخص 'مرجلے' ایک رو کا اور ایک رو کی وارث چھوڑ جائے تو رو کے کویت کے ترکہ میں سے دو حصے اور رو کی کو ایک حصہ ملے گا۔ مسئلہ بڑی توجہ سے سنا اور پھر کچھ کے بغیر چلے گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس حدیث کے مطابق کہ "قبروں پر علم فرائض کا کوئی مسئلہ کہا جائے اور ورثہ کی تقسیم کا ذکر کیا جائے تو اس کی برکت سے تمام اہل قبور کی مغفرت ہو جاتی ہے" حضرت کا یہ معمول رہتا تھا اور کسی جگہ کو ترک نہیں کرتے تھے۔

**شیخ کپور مجذوب گوالیاری** | حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے سپاہ گری پیشہ تھا۔ اچانک نوکری چھوڑ کر سقہ گیری کا کام شروع کر دیا۔ راتوں کو پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو بغیر اجرت کے پانی دے دیتے تھے۔ اسی حال میں ان پر جذب طاری ہو گیا۔ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے تھے۔

مے شدم دست بدیوار ز ضعف از کویت۔

آمدی جلوہ کناں صورت دیوار شدم

گوالیار کے بازار کے سرے پر ایک جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس جگہ ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں نظر آتے تھے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کے دل میں کوئی بات۔ پوچھنے کا خیال آ جاتا تو بے کلمے ہی وہ ہدیہ کی صورت میں برادر آتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے اور اس کی مشکل حل ہو جاتی۔ غیب کی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے۔ راتوں کو ہمیشہ قیام کی حالت میں رہتے۔ کبھی روتے اور کبھی ہنستے۔

میں نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایران سے ایک سید نے آکر ان سے سیادت کا ثبوت مانگا تھا۔ جواب میں آپ نے لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ پھر اس سید کا ہاتھ پکڑ کر کہا "آؤ ہم دونوں اس آگ میں داخل ہو جائیں۔ تاکہ جھوٹ سچ ظاہر ہو جائے۔ سید تو سہم کر کھڑا رہ گیا۔ اور وہ آگ میں جا کر صحیح سلامت نکل آئے۔ ان کی ایسی بہت سی خوارق مشہور ہیں۔

۹۷۹ھ کو ایک رات سانپ سانپ چلاتے ہوئے دوڑے اور دروازہ پر سے بچے گر پڑے۔ اور اسی وقت چلاں بختی ہو گئے۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات "کپور مجذوب" سے نکالی ہے۔

**شیخ اللہ بخش گرگنتیسی** | دریائے گنگا کے کنارے سنبھل کے تحت گرگنتیسی ایک قصبہ ہے۔ شیخ اللہ بخش اسی قصبہ میں چالیس سال تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے۔ ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔

ستر سال کی عمر میں آپ سنبھل تشریف لے گئے تھے۔ شیخ بنجورم سنبھل کی ایک بوڑھی خادمہ جو بڑی عبادت گزار، صائمہ الہیہ اپنے وقت کی بی بی رابعہ تھی، ۳۵ سال سے شوہر کے بغیر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیشہ افطار دودھ سے کیا کرتی

تھی۔ غائبانہ طور پر شیخ مدوح کی معتقد ہو گئی۔ اور ان سے درخواست کی کہ ”مجھے خدا کا راستہ دکھا دیجئے“ آپ نے جواب بھجوا دیا کہ ”جب تک تم حضور اکرم کی پیروی نہیں کرو گی۔ اور کسی سے نکاح نہ کرو گی۔ اللہ کے راستہ کی تلاش تمہارے لیے ایک وبال ہے۔“ وہ اسی وقت پاکی میں بیٹھ کر حضرت کے پاس پہنچ گئی۔ اور انہی سے اس کا نکاح ہو گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں آخرت کی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔ میں دہلی کے ایک معزز سید زادے سید قاسم کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے انہیں نہایت خوش کلام اور خوش باش پایا۔ جب ہاتھ دھونے کے لیے آفتاب اور طشت آیا تو انہوں نے فرمایا ”ان سید صاحب سے ابتداء کی جائے۔ کیونکہ ہاشمی کو اولیت حاصل ہے۔“

شیخ عارف حسینی | یہ صاحب دعوت بزرگ شاہ اسماعیل صفوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ انہوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ جلی ہوئی بخوکی روٹی اور کڑوی کیلی ترکاری سے افطار کر لیتے ہیں۔ ایسی غذا کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔

شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ دربار شاہی میں ابو الفضل کی بیٹھک کے بالکل ہی سامنے وہ بے جھجک پانچ وقت کی اذان کتے ہیں۔ ان کی بہت سی کرامتیں لوگوں میں مشہور ہیں۔ وہ کاغذ کی گول کترنیں جلتی انگلیٹھی میں ڈال دیتے ہیں۔ اور اس میں سے سک لگی ہوئی اشرفیاں نکال کر جتنے بھی حاضرین مجلس ہوں انہیں دے دیتے ہیں۔ اگر انہیں کسی حجرے میں مقفل کر دیا جائے تو وہاں سے غیر محسوس طور پر نکل کر کسی اور جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔

جب گجرات سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے لوگوں کو جاڑے کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے جاڑوں میں دیئے۔ اس کرامت پر پنجاب کے علماء خاص طور سے مخدوم الملک نے اعتراض کیا کہ یہ پھل ظاہر ہے لوگوں کے باغوں سے ہی ان کی اجازت کے بغیر حاصل کیے گئے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ ان علماء کی وجہ سے جب لاہور میں ان کی نمہ نہ سکی تو وہ کشمیر چلے گئے۔

کشمیر کے حاکم علی خاں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی۔ اس نے اپنی لڑکی کا ان سے نکاح کر دیا۔ جب دیکھا کہ وہ نکاح کر رہے والے آدمی نہیں ہیں تو ان سے لڑکی کا ہنرے کر طلاق دلوا دی۔ اور شاہ عارف حسینی وہاں سے نکل کر تبت چلے گئے۔

تبت میں بھی ان کی کرامتیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک عجوبہ یہ تھا کہ وہ درخت کو پکڑ کر ہلاتے تھے تو اس سے درجہم دینار جھرنے ٹپکتے تھے۔ غرض گجرات، ہندوستان، کشمیر اور تبت میں ان کے بڑے تصرفات اور اثرات رہے ہیں۔ مگر جہاں جاتے تھے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ اسی لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نکل جاتے تھے۔

جس وقت اکبر بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف سفر کر رہا تھا۔ شاہ صاحب نے اسی سفر میں اکبر سے ملاقات کی تھی۔



اکبر نے ان پر محافظ اور نگران کا مقرر کر دیئے۔ جب بھی وہ اکبر کی ملاقات کو آتے تھے تو ایک زریں پیالے میں مشک کا فور اور دوسری تمام خوشبویات ڈال کر بطور تحفہ لے آتے تھے۔ اکبر نے ان سے بہت کچھ کہا کہ ”آپ ہم سے کچھ سونایا کوئی جاگیر قبول فرمائیں“ وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ ”روپیہ تم اپنے اعدیوں کو دو کہ وہ بد حال ہیں۔ میں لے کر کیا کروں گا۔“

میں ایک مرتبہ تلچ خاں کے ساتھ ابوالفضل کی کچہری میں ملاقات کے لیے گیا۔ حضرت ابوالفضل کی ہی نگرانی اور حراست میں تھے۔ اس وقت وہ ابوالفضل کے بالا خانہ میں تھے۔ منہ پر نقاب ڈالے بیٹھے کتابت کر رہے تھے۔ کسے لگے یہ تلچ خاں ہے نا جو کہ رہا تھا میں تلچ ہوں تمہارا غلام اور غلام۔“

چہرہ چھپائے رکھنے کی عادت بہت پرانی تھی۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جائیں۔ تو کوئی انہیں پہچان نہ سکے۔ میں نے ایک قابل اعتماد مقرب سے سنا ہے کہ کشمیر میں اکبر نے ایک دن شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حسب الحکم ان سے پوچھا کہ ”اگر آپ نقاب اٹھالیں تو کیا حرج ہے۔ میں آپ کا دیدار کر لوں گا۔“ انہوں نے قبول نہ کیا اور کہا ”ہم فقیر منش آدمی ہیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔“ تکلیف نہ دو۔ حکیم ابوالفتح بڑا شوخ اور بے باک آدمی تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نقاب اتار لینا چاہا۔ شاہ صاحب نے اسے روک دیا اور نہایت غصہ میں آکر کہا ”میں جذامی یا بد شکل نہیں ہوں تو میرا چہرہ دیکھ لو۔“ یہ کہہ کر گریبان بھاڑ ڈالا۔ اور چہرہ سے نقاب اتار کر زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد کہا ”حکیم تو نے میرا چہرہ تو دیکھ لیا، لیکن اس کا نتیجہ انشاء اللہ دو ہفتہ میں تیرے سامنے آ جائے گا۔“ چنانچہ پندرہ دن پورے نہیں ہوئے تھے کہ حکیم ابوالفتح اسی سفر میں اسہال کے عارضہ میں فوت ہو گیا۔ ایسی کرامتیں بے شمار ہوتی رہی ہیں۔

ایک دن اکبر نے کہا ”شاہ یا تو آپ ہمارے جیسے ہو جائیں یا ہم کو اپنے جیسا بنالیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ ”ہم بدنصیب اپنے آپ کو تمہارے جیسا کس طرح بنا سکتے ہیں۔ ہاں اگر تم چاہتے ہو تو ہمارے برابر آکر بیٹھ جاؤ تاکہ ہمارے جیسے بن جاؤ۔“

میر سید علاؤ الدین اودھی | بڑے عالی مقامات پر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ ان کی کرامتیں اور کمالات نہایت روشن اور واضح تھے۔ لوگ ان کے عجیب و غریب خوارق بیان کرتے ہیں۔

صاحب کلام باذوق آدمی تھے۔ حقائق و معارف کو کبھی کبھی نظم میں بھی ادا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلع تو بہت مشہور رہا ہے۔

ندائے گل خود روچہ رنگ و بودار  
کہ مرغ ہر چہنی گفتگوئے او دارد

ان کے ایک ترجیع بند کا بند حسب ذیل ہے۔

کہ بچشماں دل مبین جز دوست  
ہر چہ مینی بدانکہ منظر اوست

شیخ عرفی نے اسی زمین میں کہا ہے

کہ جہاں صورت است ومعنی دوست  
وہ بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

کسی اور کا شعر ہے

کہ جہاں پر تو نیست از رخ دوست  
جملہ کائنات سایہ اوست

اسی مضمون پر میرا بھی ایک شعر ہے

اوست مغز جہاں جہاں ہمہ پوست  
خود چہ مغز و چہ پوست چوں ہمہ اوست

ان کے دامن تربیت سے بڑے بڑے مشائخ اٹھے ہیں۔ ان کے صاحب زادہ میر سید ماہر و اپنے والد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ایک اور مرید میر سید علی سلمی تھے جو بڑے صاحب حال تھے۔ ہمیشہ روپوش رہتے تھے۔ ان کا فقر بھی ایک خاص شان رکھتا تھا۔ تصوف کے مضامین بڑی عجیب زبان میں ادا کرتے تھے۔ میں کانت و کولہ (توابع سنبل) میں حسین خاں کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا تھا اور ان کی گفتگو سے استفادہ کیا تھا۔ میر سید علی ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ ”یا اللہ مجھے شہید اٹھاتا۔“

ایک مرتبہ ان کے گھر میں چور داخل ہوئے۔ جب شور و غل مچا تو میر صاحب نوے سال کے ضعیف ہونے کے باوجود ایک آہنی گرز اٹھانے ہوئے اللہ اللہ کہتے ہوئے ان کا تعاقب کرنے لگے اور ایک دو کو مار گرایا اور زخمی کر دیا آخر ایک ضرب ان کو گولی اور وہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ مشہورہ میں پیش آیا۔ انکی تاریخ وفات — ”چہ شد آں مرشد کامل سے نکال گئی ہے۔“

شیخ حمزہ لکھنوی | یہ ملک آدم کا کر کے پوتے ہیں۔ جو سلطان سکندر اور ابراہیم لودی کے امرا میں سے تھا۔ ہمیشہ اپنے دادا کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے۔ ملک آدم کی قبر دو عام قبروں کے برابر بلکہ اس سے بھی کچھ لابی تھی۔

شیخ حمزہ بلند بالا صاحب جذب اور بڑے باشکوہ بزرگ تھے۔ جب کبھی شہر میں آتے تو شیر کی طرح خراماں خراماں راستہ طے کرتے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے انہیں وہ ہر طرف پھینکتے جاتے۔ لیکن کمال یہ تھا کہ وہ پتھر کسی کو لگتے نہ تھے۔ ان کی گفتگو دلکش طرز عمل پاکیزہ تھا۔ ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ جس کسی کو اہل جانتے تھے اس سے بات کرتے تھے، اپنے پاس بلا کر بٹھاتے۔ میں بھی ان کے پسندیدہ آدمیوں میں سے تھا۔ ان سے ملاقات کو

میں اچھا شگون جانتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی حرکتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ پاس نہیں پھٹکتے تھے کہ کہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔

**شیخ پیرک** | شیخ پیرک بھی لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ دریائے کو دی کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں جہاں تک کسی شخص کا پہنچنا محال ہے چھپے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی رہتی تھی جو خشک روٹی اور اس پیری کے پیر جسے اس نے خود بویا تھا ان کے کھانے کے لیے لے آتی تھی۔

اگر کوئی بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان کی ملاقات کے لیے جاتا تو وہ مقررہ وقت پر اپنے حجرہ کے دروازہ پر آکر بیٹھ جاتے۔ لیکن کوئی بات نہیں کرتے تھے۔

جس زمانہ میں حسین خاں لکھنؤ پر حاکم تھا میں بھی اپنے ایک دوست عبدالرحمن نامی کے ساتھ جو حسین خاں کا خلیفہ تھا۔ شیخ پیرک سے ملنے کے لیے گیا۔ اتنے ضعیف تھے کہ بس ہڈی چمڑہ نظر آ رہے تھے۔ اس غار کے اندر اور باہر بہت سے بڑے بڑے سانپ پھنٹکائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے ڈر کر سانپ کو لکڑی سے مارنا چاہا۔ انہوں نے اشارہ سے روک دیا اور کہا "ان سانپوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ معلوم ہوا کہ تیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا وہ اس غار میں رہتے ہیں۔ اور یہ سانپ ان سے مانوس ہو چکے ہیں۔ کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچاتے۔

جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو انہوں نے چند باسی روٹی کے ٹکڑوں اور خشک میوہ کی طرف جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کیا کہ "یہ اٹھاؤ۔ میرے ساتھی نے سونے کا ایک ٹکڑا بطور تحفہ دینا چاہا انہوں نے قبول نہ کیا۔

لکھنؤ کے یہ دونوں بزرگ شیخ حمزہ لکھنوی اور شیخ پیرک انہی دنوں انتقال فرما گئے تھے۔  
**شیخ محمد حسین سکندری** | سکندر دو آب کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ محمد حسین بڑے صاحب ذوق بزرگ تھے۔ لوگوں سے دور عزت نشین رہتے تھے۔ ملازمت ترک کر کے پورے پچاس سال عبادت و ریاضت میں گزارے تھے۔ اس دوران میں کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ جب میں سکندری میں ابن سے ملنے گیا تو انہوں نے خواجہ حافظ کے اس شعر کے معنی پوچھے۔

عفو خدا بیش از جرم ماست

نکتہ سربستہ چہ گوئی عموش

میں نے پوچھا اس میں آپ کو کس جگہ اشکال پیدا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا "حافظ نے جب خود نکتہ سربستہ کہہ دیا تو پھر خاموش رہنے کا حکم کیوں لگا دیا ہے؟ میں نے کہا "اس کی وضاحت آپ خود فرمائی تو بہتر ہے۔" انہوں نے کہا "میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ "نکتہ سربستہ" غائبانہ ہو کہ "ہمارے سارے گناہ خدا ہی کے خلق کیے

ہوئے ہیں۔ یہ بات کہنا ہی حدِ ادب سے تجاوز کرنا ہے۔ اس لیے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں بھی جواب میں خاموش ہی رہا۔

اسی طرح کی تاویل انہوں نے اس آیت میں بھی کی — ”واعبدوا ربك حتى ياتيك اليقين“۔ ان کا کہنا تھا کہ یہاں ”حتى“ کا لفظ ”انتہائے غایت“ کے لیے آیا ہے اور انتہائے غایت کی یہاں گنجائش نہیں۔ شاید یہ انتہائے کاف خطاب کے لحاظ سے ہو۔ ان کی اس بات کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس سے ان کی کیا مراد تھی۔ ان سے وہ بس آخری ملاقات تھی۔

بلگرام قنوج کے تحت ایک قصبہ ہے۔ یہ بزرگ بڑے صاحب فضل و کمال تھے۔  
**شیخ عبدالواحد بلگرامی** | ریاضت و عبادت بہت کیا کرتے تھے۔ ان کی ذات تمام اخلاقِ حمیدہ کی جامع تھی۔  
 ابتداء میں وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے اور خود بخود حال میں آجاتے۔ کچھ عرصہ سے راگ راگنی کا یہ مشغلہ چھوڑ دیا۔ ”نزد ہتہ الارواح“ کی انہوں نے بڑی محققانہ شرح لکھی تھی۔ اسی طرح علمِ تصوف پر اور بھی کئی ایک رسالے لکھے۔ ان میں ایک ”سنابل“ نام کی کتاب بھی ہے۔ اور بھی دوسری عمدہ تصانیف ہیں۔  
 یہ اگرچہ کسی اور بزرگ کے مرید ہیں لیکن شیخ حسین سکندرہ سے فیض و تربیت پائی ہے۔ ہر سال بلگرام سے حضرت شیخ کے عرس پر تشریف لاتے ہیں۔ اب بنیائی کمزور ہو چکی ہے اس لیے جانہیں سکتے۔ قنوج میں متوطن ہو گئے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں میں لکھنؤ سے بلگرام گیا تھا۔ رات کو وہ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ یہ پہلی ملاقات تھی جو میرے لیے مرہم و شفاعت ثابت ہوئی۔ کہنے لگے ”یہ سب عشق کے پھول بوٹے ہیں۔“ اتفاق کی بات کہ اسی جگہ بدایوں سے مخدومی شیخ عبداللہ بدایونی بھی پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میرے لیے کوئی رات شب قدر ہے تو یہی رات ہے۔

شیخ عبدالواحد کو نظم سے بھی مناسبت تھی۔ چنانچہ اپنے ایک صلیح و خوش ادا محبوب راجا نامی کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

اسی کردہ خیال تو بہ تحت دل ما جا  
 ہرگز نبود در دل ما غیر ترا جا

انہی کا شعر ہے

مرد بھنگ چو اول بصلح آمدہ  
 دم بلطف نشین تاز خوش بر خیزم

یہ میاں عزیز اللہ طلبی کے شاگرد ہیں۔ معقول و منقول میں ان کی طرح جامع عالم کوڑاوا نہ تھا۔ خاص طور سے علم کلام، اصول فقہ اور عربیت میں بے نظیر تھے۔ مشہور ہے کہ شرح مفتاح اور مطول انہوں نے اول سے آخر تک چالیس مرتبہ پڑھائی تھی۔ دوسری منہی کتابیں اسی طرح پڑھاتے رہے تھے۔

ملا علاؤ الدین لاری شرح عقائد نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعویٰ سے لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ میاں صاحب نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات وارد کیے کہ ملا علاؤ الدین کو کوئی جواب بن نہ پڑا۔

میاں صاحب فقہ میں امام اعظم ثانی کے مثل تھے۔ ریاضت اور مجاہدہ بھی بہت کرتے تھے۔ تقویٰ صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ عرصہ تک مقتدر حاکم بھی رہے۔

خان خاناں بیرم خاں کے زمانہ میں ایک مرتبہ میں پانچ سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس زمانہ میں شیخ مبارک کے ہاں میں بھی پڑھتا رہا تھا، اس ملاقات پر میں نے ان کو شیخ مبارک کا ایک استفتاء دیا۔ پہلے میاں صاحب اس جدائی کے عرصہ کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر انہوں نے دریافت کیا؟ شیخ مبارک کیسے مولوی ہیں؟ میں نے جواب دیا "حقیقت" تقویٰ فقر و مجاہدہ" امر معروف و نہی منکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ اس زمانہ میں شیخ موصوف ان تمام باتوں کے بڑے پابند تھے۔ میاں حاتم نے کہا "ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے۔ لیکن مشہور ہے کہ وہ ممدوسی ہیں۔ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ میں نے کہا "وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں۔ ان کی ممدویت کے قائل نہیں" اس پر میاں صاحب نے کہا۔

فخاضرات یادداشت سخن موافق حال تذکرہ سلف و حکایات تاریخ معلومات وغیرہ دم،



”میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے۔“ اس مجلس میں میاں صاحب کے شاگرد میر سید محمد میر عدلی بھی موجود تھے۔ انہوں نے دریافت کیا۔ پھر ان کو ملا مبارک، مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا ”وہ چونکہ سب کو امر معروف اور نہی منکر کرتے رہتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھتے ہیں۔“ انہوں نے کہا ”ایک بار عبدالحی خراسانی (جس کو چند دن کے لیے منصب صدارت برائے نام مل گیا تھا، خان خاناں کے سامنے شیخ کی بڑی مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟ میں نے کہا ”شیخ مبارک نے اس کو ایک خط لکھ کر نصیحتیں کی تھیں، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھتے ہیں۔“ یہ سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا ”عبدالحی خراسانی کا اپنے رفض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں درست ہوگا جب کہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ تو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا۔ اور جو کوئی باجماعت نماز نہ پڑھے رافضی ہے اس لیے تو رافضی ہوا، حالانکہ اس کلیہ کا ”کبریٰ“ ممنوع ہے۔ اس طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر معروف کرتے ہیں۔ جو کوئی امر معروف کرے وہ مہدوی ہے۔“

اس کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اس استفتار پر فہر کردوں گا لیکن بعد میں میرے پاس ایک اور استفتار آیا ہوا ہے جس پر تمام علماء کے دستخط ہیں۔ مجھے اس پر کچھ شبہات ہیں۔ تم اسے شیخ بہاؤ الدین جوڑے محقق مفتی ہیں کے پاس لے جاؤ۔ اور ان سے کہنا کہ سفر کی وجہ سے میرے ساتھ کتابیں نہیں ہیں۔ اگر آپ اس روایت کو بعینہ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا۔ جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتار پر دستخط کیے ہیں۔ آپ نے فتوے دیا ہے کہ لوگ مصیبت کے عالم میں اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت صرف ”ابراہیم شاہی“ میں ملتی ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خود یہ ابراہیم شاہی علماء کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی کہ فتوے دینے کے لیے سزاوار ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی مرجوعہ روایتوں میں سے کسی روایت کو ترجیح دے سکتا ہے۔ تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطرار میں ابوین کو اولاد کی بیع جائز ہے۔ ظاہر ہے ”ابوین“ کا لفظ باپ دادا دونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کتاب نکاح میں جس کے ابوین مسلمان ہوں وہ اس کا کفو ہے۔ جس کے آباشراف اسلام سے مشرف ہوئے۔ اس لیے یہاں بالاتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے نہ کہ ماں اور باپ۔ ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو مل کر (بیطریق اجتماع)، اختیار حاصل ہے نہ کہ فرداً فرداً علیحدہ انفرادی حیثیت کے لیے آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

میاں صاحب نے شیخ مبارک کا تو استفتار رکھ لیا اور مذکورہ استفتار مجھے دے دیا۔ یہ استفتار میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو اس نے میاں حاتم کی قضاہت کو بہت سراہا اور کہا ”ان کو دعا کے بعد میری جانب سے کہنا، ہم نے بھی اس دقت کی وجہ سے اس پر فہم نہیں کی تھی۔“ جب میں نے وہ شیخ بہاؤ الدین کو دکھایا تو انہوں نے کہا ”چونکہ دوسرے مفتیوں نے اس کی تصدیق کر کے دستخط کر دیئے تھے۔ اس لیے میں نے اس کے قول پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا۔ بے شک مجھ سے سو ہو گیا۔ یہ بھی شیخ بہاؤ الدین کی حق بینی و حق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و

کمان کے انہوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی ہے

برسر آں نامہ کہ آصف نوشت

قدم رحم اللہ من نصف نوشت

میاں حاتم علی شہجلی ستر سال تک برابر لوگوں کو اپنے علم و اخلاق سے افادہ پہنچاتے رہے۔ ۹۶۸ھ میں اس دنیا کو وداع کیا۔ انہوں نے تاریخ و فائنات۔ "عند ملک مقتدر"۔ پائی ہے۔

میاں صاحب نے اپنے چچے شیخ عبدالحکیم کو جانشین چھوڑا۔ لیکن یہ جانشینی صرف پیشوائی اور مشیخت کی حد تک ہی رہی، علمیت میں نہیں۔ ۹۸۹ھ میں وہ بھی اپنے باپ سے جلے۔ ان کے چند نالائق لڑکے وارث رہ گئے ہیں۔

چند بنار پرورم مہرتباں سنگ دل

یاد پدر نمی کنند این پسران ناخلف

مولانا عبد اللہ سلطان پوری | قوم کے انصاری ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد نے سلطان پوری میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی۔ عبد اللہ سلطان پوری اپنے زمانہ کا منفرد یگانہ روزگار عالم تھا۔ خاص طور سے عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور دوسرے تمام علوم نقلی میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ بڑی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے "عصمت انبیاء" اور "شرح شمائل النبی" بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں بادشاہ جنت مکانی نے مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلامی کا عہدہ دیا تھا۔ شریعت کو پھیلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ نہایت متعصب سنی تھا۔ اس نے بہت سے محدوں و افسیوں کو قتل کر دیا تھا۔

وہ نہایت اصرار سے کہتا تھا کہ روضۃ الاحباب کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا نہیں ہے۔ جس سال کہ گجرات فتح ہوا تھا۔ اور وہ بادشاہی دیوان خانہ کا وکیل مختار تھا۔ اور یہ زمانہ اس کے عین جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ میں پنجاب کے سفر سے لوٹ کر آیا اور شیخ ابوالفضل دجوا بھی ملازم نہیں ہوا تھا، اور حاجی سلطان تھا تیسری کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا وہ تیسرے دفتر کو سامنے کھوئے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے "دیکھو ایرانی عالموں نے دیہی میں کیا خرابی پیدا کر دی"۔ پھر اس نے وہ شعر دکھایا جو حضرت علی کی تعریف میں کہا گیا تھا۔

ہمیں بس بود حق نمائی او

کہ کردند شک در خدائی او

اور کہنے لگا "اس نے تو رخص سے آگے بڑھ کر حلول خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ اس

جلد کو شیعوں کے سامنے جلادوں۔"

میں اس وقت نہایت گمنام اور غیر معروف تھا اور یہ اس سے پہلی ملاقات تھی۔ پھر بھی جرأت کر کے میں نے کہا یہ شعر

تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعی سے منسوب ہے۔

لصالح الناس طرہ مجدالہ

لوان الماتضی ابدی محلہ

کفی فی فضل مولانا علی وقوع الشک فیہ انہ اللہ

عبداللہ سلطان پوری نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا ”یہ کس جگہ کی روایت ہے؟“ میں نے کہا ”شرح دیوان امیر کی!“  
 میں نے کہا اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے اور وہ بھی رفض سے متہم ہے؟ میں نے کہا ”یہ دوسری بات  
 ہے۔“ شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے خاموش ہو جانے کا اشارہ کر رہے  
 تھے۔ پھر میں نے کہا کہ ”بعض معتبر آدمیوں سے میں نے سنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لڑکے میرک شاہ  
 سی دوسرے کا ہے“ اس لیے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں کی عبارت سے نہیں ملتی، کیونکہ اس کی عبارت شاعرانہ ہے اور  
 دو دفتروں کی عبارت محدثانہ۔ مخدوم الملک نے جواب دیا ”ارے بابا میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو  
 بیعت اور فاسد عقیدہ پر صریحاً دلالت کرتی ہیں۔ میں نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ  
 ”میں نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؑ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا ”ید شلاء و بیعتہ شلاء“ یعنی  
 تھ بھی شل اور بیعت بھی شل، غور کرو کہ جو ہاتھ احد کے دن حضور اکرمؐ کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر گیارہ زخم آئے تھے۔  
 اس کو حضرت علیؑ برا شگن کہیں جو شرعاً ممنوع ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا ”تفاوت  
 رنگوں میں تو بڑا فرق ہے۔“ اس وقت ابوالفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر رگڑ ڈالا اور روک  
 لیا۔ مخدوم الملک نے کہا ”ان کی تعریف کیا ہے؟“ ساتھیوں نے اس سے میرا کچھ حال بیان کیا اور وہ ملاقات  
 خیر و خوبی ختم ہو گئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا ”بڑی خیر ہو گئی کہ انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا، اگر پھنس جاتے  
 تو کون چھٹکارا دلاتا۔“

ابتداءً ابتداءً میں جب مخدوم الملک نے شیخ ابوالفضل کو دیکھا تھا تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا ”اس  
 شخص سے دین میں جتنا بھی خلل پیدا ہو کم ہی ہے۔“

چو بطفلیش بدیدم بمردم اہل دین را

کہ شود بلائے جانہا بہ شما سپردم این را

مخدوم الملک نے سنہ ۹۹۹ھ میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں انتقال کیا۔ اس کی تاریخ وفات میں  
 یہ قطعہ کہا گیا ہے

رفت مخدوم ملک با خود برو رحمتہ اللہ نشانی پشانی

جستم از دل چو سال تاریخش گفت بہ شمار مصرعہ ثانی

اس کی اولاد میں چند ناخلف لڑکے رہ گئے جو چنداں لائق ذکر نہیں۔ اس بارے میں تمام اسلاف اخلاف سے شاک  
 ہی رہیں گے۔ کیوں کہ زمانہ کا ماحول ان کو اچھا رکھ سکتا ہے، نہ اچھا ہی پیدا کرتا ہے

خوبی اندر جہاں نمی بینم گویا روزگار عنین شد

یہ تو وہی حکایت ہوئی کہ ایک متعصب سنی بادشاہ نے سبزوار پر جو رافضیوں کا مسکن و مرکز ہے حملہ کیا۔ وہاں کے رئیس اور سردار حاضر ہوئے اور کہا "ہم تو مسلمان ہیں کس گناہ میں آپ نے ہم پر شکر کشی کی ہے؟ اس نے کہا "اس جرم میں کہ تم لوگ رخصت میں بت غلو کرتے ہو؟ انہوں نے کہا "یہ تو ہم پر صریح بتان ہے۔" بادشاہ نے کہا "اگر تم سچے ہو تو اپنے شہر میں سے کسی ابو بکر نامی کو تو لا کر دکھاؤ تاکہ میں تمہارے قتل اور لوٹ سے باز آ جاؤں۔" ان لوگوں نے بڑی تلاش کے بعد ایک مفلوک الحال غیر معروف سے شخص کو پیش کیا کہ "یہ اس نام سے منسوب ہے۔" جو تم نے لیا تھا؟ بادشاہ نے جب اس کو پھینے پرانے کپڑوں اور بری حالت میں دیکھا تو کہا "تم اس سے بہتر کسی آدمی کو لا کر نہیں دکھا سکتے تھے۔" ان لوگوں نے کہا "بادشاہ سلامت تکلف برطرف سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابو بکر پیدا نہیں کر سکتی۔"

مولوی رومی نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے ۷

سبزوار است این جہاں ہمدار

ما چو بو بکریم در روی خوار و زار

اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی علماء میں سے تھے۔ تقویٰ توکل اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے۔ پہلے پہل انہوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ امر معروف اور

شیخ مبارک ناگوری

نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اگر ان کی محفل و عظیم کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آ جاتا تو اسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے۔ جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستہ میں کسی جگہ راگ نغمے کی بھنگ بھی پڑ جاتی تو وہاں سے قدم بڑھا کر تیزی سے نکل جاتے۔ مگر آخر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی راگ گانا یا ساز نے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے مسلک اور طریقے ہمیشہ بدلتے رہے۔ طبیعت میں بڑا تلون تھا۔

پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک وہ شیخ علانی کے ساتھ رہے۔ جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہو گیا تو خود کو اس سلسلہ سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک ہمدانی مشائخین سے منسوب رہے۔ آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جا لیا تو انہی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے "قلکمو الناس علی قد علی عقولہم" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کیا کرو) پر ان کا عمل تھا۔

ہمیشہ علوم دینی کے درس دینے میں مشغول رہتے تھے۔ ہندوستان کے علماء کے برخلاف انہوں نے شاعری، معرہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دسترس حاصل کی تھی۔ تمام علوم پر ان کی نگاہ تھی۔ خاص طور سے تصوف پر بڑا عبور حاصل تھا۔ شاطبی، توپوری کی پوری ان کو حفظ تھی۔ اس کے درس دینے کا انہی کو حق پہنچتا تھا۔ قرآن کی سات قراتوں کے حافظ اور فارسی تھے۔

کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے۔ ان کی ہذلہ گوئی اور نقیض بڑی

مشہور ہیں۔ آخر عمر میں جب بنیائی کمزور ہو گئی تو گوشہ نشین ہو گئے۔ اور اس فرصت میں ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کی طرح چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور بڑی اچھی معلومات و مضامین درج ہیں۔ انہوں نے اس کا نام "العیون" رکھا۔ اس کے دیباچہ میں انہوں نے ایسا مضمون لکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انہیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے جو کچھ تجدید کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ اس تفسیر کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ قصیدہ فارضیہ تائبہ جو سات سو اشعار کا قصیدہ ہے، قصیدہ بردہ شریف، قصیدہ کعب بن زہیر اور دوسرے قصیدے جو ان کو یاد تھے پڑھتے رہتے تھے۔

شیخ مبارک کالاہور میں سلسلہ میں انتقال ہوا۔ بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس دنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کانہ رکھا۔ لباس تو درویشی کا بنا رکھا تھا لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی علاقہ نہ رہا تھا۔

میں نے ابتدائے عمر میں آگرہ میں ان سے چند سبق پڑھے تھے۔ ان کی استاد کی کا مجھ پر بڑا حق ہے۔ لیکن انہوں نے جس طرح کی دنیا داری اور بے دینی اختیار کر رکھی تھی۔ روپیہ کے لالچ میں جو کمر و فریب اور زمانہ سازی کرتے رہتے تھے، دین و مذہب میں تحریف و تنسیخ کا جو جال بچھا رکھا تھا، اس سے میرا دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی استاد کی تعظیم کے سارے حق زائل ہو گئے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں بیٹے کی وجہ سے باپ پر بھی لعنت پڑتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں یزید اور اس کے باپ پر لعنت۔ اسی طرح ان کا اور ان کے لڑکوں کا معاملہ ہے۔

امروہہ سنبھل کا ماتحت قصبہ ہے۔ میر عدلی نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے۔ وہ اور میرے والد سنبھل اور بدایوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدایوں میں انہوں نے میر سید جلال دانش مند سے جو حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے پڑھا۔

تھیں علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رکھا۔ آخر عمر میں بادشاہی مقرروں میں شامل ہو گئے میر عدلی کا عہدہ انہیں تفویض کیا گیا۔ اپنے فرائض منصبی وہ نہایت انصاف سچائی اور دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاضی قضاات بھی ان کے خوف سے اپنی خیانتوں اور خباثتوں سے باز آگیا تھا۔

جب تک وہ دربار میں رہے کسی بدعتی اور ملحد کو دین میں رخنہ اندازی کی ہمت نہ ہو سکی۔ ان کے بعد میر عدلی کا عہدہ کسی کی ذات پر نہیں چھا۔ یہ خطاب بس برائے نام ہی رہ گیا۔

موروثی تعلقات اور قدیم روابط کی وجہ سے وہ مجھ پر بڑے مہربان رہتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو اور صدروں کی خوشامد درآمد کی ذلت نہ اٹھاؤ۔ باقاعدہ ملازمت میں داخل ہو کر پادشاہی داغ کراؤ۔ کیوں کہ یہ حکام بڑے فرعون اور تکبر ہیں۔ میں نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی تھی۔ اسی لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا کسی کو نہ دکھائے۔

سلسلہ میں میر سید محمد میر عدلی کو بکر کی عملداری مرحمت کی گئی اور وہ سلسلہ میں اپنے رب سے جا ملے۔



یہ مشہور شاعر شیخ جمال کے صاحب زادے ہیں۔ علوم ظاہری میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں دیکھی تھیں۔

بیرم خاں کے ساتھ محبت و دوستی کا تعلق تھا۔ چنانچہ خان خاناں نے ہندوستان کی صدارت کا عہدہ ان کے تفویض کر دیا چند سال تک ان کا مکان ہندوستان، خراسان، ماوراء النہر اور عراق کے اکابر و افاضل کا مرکز و مرجع بنا رہا۔ شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا۔ ہندی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بیکانیر کے نواح میں بیرم خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے۔ بیرم خاں کے قصیوں کے باوجود ان کی عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دہلی کے بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے دنوں میں وہ ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنی محفلیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتے تھے۔ ۱۰۷۸ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی اولاد بھی نالائق ہی نہ تھی۔ شیخ گدائی کا نمونہ کلام:-

### غزل

گئی جان منزل غم شد گئی دل	غمت را می برم منزل بہ منزل
مشتو غافل نہ حال درد مندی	کہ از حال تو یکدم نیست غافل
دل دیوانہ در زلف تو بستم	گرفتارم باں مشکیں سلاسل
بجاں دادن اگر آساں شدی کا	نبودی عاشقاں را کار مشکل
گدائی جاں بنا کامی بر آمد	نشد کامم نہ لعل یا ر حاصل

میں تھے یہ اشعار تذکرہ میر علاء الدولہ سے نقل کیے ہیں۔ یہ تذکرہ کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ اشعار شیخ گدائی کے نہیں۔

اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بھائی میاں لاون کے شاگرد ہیں۔ کنبہ برادری سے میاں جمال خاں مفتی دہلی تعلق تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ علوم عقلی اور نقلی خاص طور سے فقہ و کلام عربیت اور تفسیر میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ”مفتاح“ کی دونوں شرحوں پر بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ ”عصدی“ جو درس کی منتہی کتابوں میں سے ہے کتے ہیں انہوں نے اس کا چالیس بار اول سے آخر تک درس دیا تھا۔

ہمیشہ وہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ دینی علوم کا اناوہ عام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کے گھر نہیں جلتے تھے۔ ہمیشہ حاکموں کی نگاہ میں وہ معزز و محترم رہے۔ ان کے اکثر شاگرد اچھے عالم و مفکر ہوئے ہیں۔ نوے سال کی عمر پائی اور ۱۰۷۸ھ میں انتقال فرمایا۔

ان کا تعلق قلعہ بکر کے مضافات سے رہا ہے۔ نہایت متبحر حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے تجارت کیا کرتے تھے۔ پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ چند سال تک قاضی جلال الدین ملتانی

آگرہ میں پڑھتے رہے۔

جب بعض وجوہ سے قاضی یعقوب کو معزول کر دیا گیا تو انہیں قضات کا عہدہ دیا گیا۔ اپنی ذات میں وہ بلاشبہ نہایت متدین اور امین قاضی تھے۔ لیکن ان کا لڑکا نہایت بددیانت ناخلف تھا۔ محکمہ کے تمام وکیل بھی انتہائی بد نفس تھے۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کی پیٹ میں وہ بھی آگئے۔ چونکہ اہل زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دین حق پر ثابت قدمی کا ذکر سن چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر وہ وہاں سے کعبۂ اللہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی جگہ حق کو لبیک کہا۔

**قاضی طوائس** | طوائس خراسان کے توابع میں سے ہیں۔ یہ بہت دیانت دار قاضی تھے۔ لیکن بے علمی کی وجہ سے بعض احکام میں انہوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ امرا کے ہاتھوں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس لیے وہ ان امیروں سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ مقدمات میں امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی جانبداری کرتے تھے۔ خواہ ان ہی کی طرف سے زیادتی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس زمانہ میں ظالم ہی فریادی بن کر عدالت میں پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل کما کرتا تھا۔ اگر امام اعظم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو وہ ایک دوسری ہی فقہ لکھتے۔

جب خان زماں کا قصہ پیش آیا تو انہوں نے بادشاہ سے کہا تھا ”باغی کا مال لینا جائز نہیں ہے“ اس بات پر انہیں معزول کر کے قاضی یعقوب کو قاضی بنایا گیا۔ اور وہ انہی دنوں فوت ہو گئے۔

**قاضی یعقوب مانک پوری** | یہ قاضی فضیلت کے داماد ہیں۔ علم فقہ اور اصول میں بڑے کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ چند سال تک وہ ہندوستان کے قاضی قضاۃ رہے۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں وہ قوت باہ کے معجون بت کھایا کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہی مجلس میں سرور انگیز چیزیں پینے کھانے کے لیے لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو بھی شرکت کے لیے کہا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا ”تم کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟“ ایک ہندوستانی مصاحب نے برجستہ کہا۔ ”قاضی پارہ کھاتے ہیں“ ان کو قاضی قضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگالہ کی قضاوت پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے قوت باہ کے نسخے اور دوائیاں ظلم و تعدی کر کے حاصل کیے تھے۔ جب معصوم کاہلی نے بغاوت کی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس جرم میں انہیں بلا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار کے راستہ ہی میں انتقال کیا۔ اور میر معز الملک اور ملا احمد یزدی سے جا ملے۔

**شیخ عبدالنبی صدر الصدور** | یہ شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے بیٹے ہیں۔ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو اپنے بزرگوں کی روش پر

سماع کے منکر تھے۔ محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ تقویٰ پاک بازی اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔

جب انہیں صدارت کا عہدہ ملا تو انہوں نے لوگوں کو اتنی اراضی مدد معاش میں دی۔ اور اتنے وظیفے اور وقف قائم کیے کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں ایسا مقتدر صدر کوئی نہیں ہوا۔ جس قدر وظیفے اور اعانتیں اس نے جاری کیں۔ اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے نہ کیا ہوگا۔ اکبر کچھ عرصہ تک تو ان کا ایسا معتقد رہا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھا کرتا تھا۔ آخر مخدوم الملک اور دوسرے بدنفس علماء کے جھگڑوں کی وجہ سے بادشاہ کی عقیدت ان کے ساتھ ختم ہو گئی۔

جاہلانہ ہمد جاہ طلب!

خویش را علماء کردہ طلب

ان کے زوال کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں بادشاہ بانسوالہ کے سفر سے لوٹ کر فتح پور آیا تھا تو قاضی عبدالرحیم قاضی متھرا نے شیخ کے پاس ایک استغاثہ بھیجا کہ ہم ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں کے ایک سرکش مالدار برہمن نے ہمارا عمارتی ساز و سامان اٹھوا لیا۔ اور اس سے بت خانہ کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے جب اس کی گوشمالی کا ارادہ کیا تو گواہ موجود ہیں اس نے حضور اکرم کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شیخ نے اس برہمن کو بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ آخر بادشاہ نے بیربر اور شیخ ابوالفضل کو بھیجا اور وہ اسے لے آئے۔ شیخ ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بیان کیا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہو گئی ہے کہ اس نے گالی بکی تھی۔ اس کی سزا کے معاملہ میں علماء کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک تو اسے قتل کرانا چاہتا تھا۔ دوسرا اس کی تشہیر اور حرمان پر زور دے رہا تھا۔ اس معاملہ میں بحث طویل پکڑ گئی۔ شیخ نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ بادشاہ نے صراحتاً اجازت نہ دی اور گول مول کہہ دیا کہ شرعی سزائیں تم سے تعلق رکھتی ہیں ہم سے کیا پوچھتے ہو وہ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ بادشاہی محل کی عورتیں اس کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں۔ لیکن بادشاہ کو شیخ کا بڑا لحاظ تھا اس لیے رہائی کا حکم نہ دیا۔ شیخ نے اس کے قتل کے لیے جب اور زیادہ اصرار کیا۔ تو بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم تو تم سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تم جو مناسب جانو کرو۔ شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ بات بادشاہ کی عرض میں پہنچی تو اسے سخت غصہ آگیا۔ ہندو رانیوں نے حرم میں اور ہندو مصاحبوں نے محفل میں کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں سے سر پر چڑھایا ہے۔ اب تو ان کی یہ جرأت ہو گئی ہے کہ آپ کی مرضی اور پسند کا بھی ان کو خیال نہیں رہا اور آپ کے حکم کے بغیر ہی وہ اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ غرض اس طرح بدگوئیوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ مزید تحمل ممکن نہ رہا۔ اور جو مادہ عرصہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا پھوٹ کر بہہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ پیش کر کے اپنے دین کے نئے نئے مفتیوں سے اس مسئلہ پر رائے مانگی۔ کوئی کہتا تھا اس مقدمہ میں گواہوں پر اچھی طرح جرح اور تعدیل نہیں کی گئی۔ کوئی بول اٹھا شیخ عبدالغنی تو خود کو

امام اعظم کی اولاد کتنا ہے۔ حالانکہ امام اعظم کے مذہب میں اسلامی حکومت کے ماتحت کافر بنی علیہ السلام کے بارے میں بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور ابرائی ذمہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحتاً موجود ہے۔ حیرت ہے کہ شیخ نے اپنے دادا سے کس طرح اختلاف کیا۔ اچانک دور سے بادشاہ کی نگاہ مجھ پر پڑی دیریں طرف متوجہ ہو کر نام لے کر آگے بلایا اور کہا ”آگے آؤ“ میں جب پہنچا تو پوچھا کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر تناوے روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے؟ میں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ حضور فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ —————

”ان الحدود والعقوبات تنذرني بالشبهات“۔ میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھا یا دشبہات سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں، نہایت افسوس کے ساتھ پوچھا ”کیا شیخ عبدالنبی اس مسئلہ سے واقف نہیں تھا۔ اس نے بے چارہ برہمن کو قتل کر دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا شیخ خود بڑے عالم ہیں وہ ضرور جانتے ہوں گے۔ اس روایت کے ہوتے ہوئے انہوں نے اگر حکم دیا ہے تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ بادشاہ نے پوچھا ”کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟“ میں نے کہا فتنہ و فساد کی روک تھام اور عوام کی دیریں کا سد باب۔ اس سلسلہ میں قاضی عیاض کی ”شفا“ کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی بیان کی، لیکن بعض خبیثوں نے کہا ”قاضی عیاض مالکی ہیں“ ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔ بادشاہ نے مجھ سے پوچھا ”تمہارے پاس کیا جواب ہے؟“ میں نے کہا وہ یقیناً مالکی ہے۔ لیکن اگر کوئی محقق، مفتی، سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کے فتوے پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ہو گئی۔ شہنشاہ کے مونچھ کے بال لوگوں نے بخوبی دیکھا کہ شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہو گئے تھے۔ اور لوگ مجھے پیچھے سے ٹھو کے دے دے کر بحث سے روک رہے تھے۔ اچانک بادشاہ نے جھلا کر کہا ”تم جو کچھ کہہ رہے ہو نامعقول ہے۔“ میں اسی وقت تسلیمات بجالایا۔ اور واپس آکر حیرت میں کھڑا ہو گیا۔ اس دن سے میں نے پیش قدمی اور سبقت چھوڑ دی۔ اور بحث و مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ کہیں کہیں کورنش بجالاتا تھا اور بس۔

اس واقعہ کے بعد سے شیخ عبدالنبی کو برابر زوال ہوتا گیا۔ اس کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا پڑ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل ہی بند کر دیا۔ اسی زمانہ میں شیخ مبارک آگرہ سے فتح پور کو کسی معاملہ میں مبارک باد دینے کے لیے آیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہ ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا ”تم خود اپنے زمانہ کے مجتہد اور امام زماں ہو۔ شرعی اور ملکی احکام کے اجمار میں ان ملاؤں کے محتاج کیوں بنتے ہو؟ جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے واقف نہیں ہیں۔“ بادشاہ نے کہا ”تم ہمارے استاد ہو ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے“ کسی طرح مجھے ان ملاؤں کے دباؤ سے نکال لو۔“ شیخ مبارک کو پرانی دشمنیوں کا سودا چکانے کا خوب ہی موقع ملا۔ اس نے نہایت بد باطنی کے ساتھ کہا ”آپ اجنبی کا دعوے کر دیں اور اس دعویٰ پر ان عالموں سے محضر لکھوا لیں۔“

یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنیاد پر شیخ مبارک نے بادشاہ کے اجتہاد اور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضرت کیا اور پاجیوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو زبردستی پکڑ کر لایا گیا۔ کسی نے ان کی تعظیم نہ کی، بجا سے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ پھر ان کے ساتھ ایسی زبردستی کی گئی کہ انہوں نے بجز واکراہ اس محضر پر اپنا گواہی لکھ دی جیسا کہ ہم تاریخ میں بیان کر آئے ہیں۔ دونوں کو بادشاہ نے حجاز کے سفر پر روانہ کر دیا۔ شیخ عبدالنبی کی وفات ۱۱۹۸ھ میں ہوئی۔

**شیخ احمدی فیاض انبیہی وال** | یہ بڑے عالم متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بہت زیادہ معمر ہو گئے تھے۔ چنانچہ بڑھاپے کی ان مصیبتوں کے باوجود انہوں نے ایک سال کے اندر پورا کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کر جاتا تو محض یادداشت سے اسے ٹوک دیتے۔ تفسیر حدیث، سیرت اور تاریخ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ شیخ میاں نظام الدین انبیہی وال کے ہم شہر اور ہم عصر تھے۔ میاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟ میں جس وقت ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ شرح وقایہ کا درس دے رہے تھے۔ ایک ہزلیہ قطعہ کوئی شاگرد ان سے پڑھ رہا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے۔

ابو بکر الولد المنتخب | ادا الخرج لا صعب  
فقد قال انی عنمت الخرج | لکفارة ہی لی ام اب  
فقلت الم تسمعن یا نبی | نہمی اتی عن تلقی الجلب

شک یہ پڑ گیا تھا کہ یہاں لفظ "کفارة" ہے یا "کفارہ" جو کافر کی تائید میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ انہوں نے فرمایا معنی کے لحاظ سے "کفارہ" ہوگا اور "کفارة" کا لفظ تو فارسی ہے۔ میں نے کہا "بہر حال" "کفارة" "کفارہ" سے کہیں زیادہ واضح ہے۔

**قاضی صدر الدین جلندری** | بڑے عالم متبحر اہل تصوف و سلوک کے بڑے معتقد، نہایت خوش مزاج اور مجلس آدمی تھے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ انہوں نے کسی وقت شیخ عبداللہ مخدوم الملک سے پڑھا تھا۔ لیکن میں نے ان کی علمی تحقیقات کو مخدوم الملک سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا۔

اپنے مشرب میں ایک بے قیود آدمی تھے۔ مزاج میں آزادہ روی بہت تھی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے متعلق بے مینی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ وہ بڑا حسن ظن رکھتے تھے۔ جو شخص بھی تارک دنیا ہو جاتا۔ خواہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو۔ بڑے اعتقاد سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ اس کی باتوں کو حجت مان لیتے۔

مشہور ہے کہ ایک بدعتی مجذوب بنا پھرتا تھا۔ وہ ان کے سامنے سے گزرا۔ قاضی اپنی عادت کے مطابق



ہاتھ باندھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہ مکار کہنے لگا کہ ”خضر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں“ قاضی اس کے پیروں پر گر گئے اور کہا ”ہم کو بھی خضر سے ملا دو“ اس مکار نے کہا ”فی الحال میں اپنی رڑکی کی شادی کے سلسلہ میں سخت متفکر ہوں۔ اور یہ شادی سات سو تنکے کے لیے رکی ہوئی ہے، اس کام سے جب میں ناسخ ہو جاؤں گا تو تجھے ضرور خضر سے ملا دوں گا۔“ قاضی نے اسی وقت سات سو تنکے اسے دے دیا۔ اور وہ شخص دو دن بعد قاضی کے پاس آیا اور کہا ”آؤ میں تمہیں خضر سے ملاؤں۔“ انہیں لے کر وہ دریا پر گیا۔ وہ شخص نہایت بلند قامت اور قاضی پست قد تھے۔ وہ پانی میں گھونٹن تک جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا ”آؤ خضر یہاں ہے۔“ قاضی نے کہا میں تیرا نہیں جانتا کس طرح آؤں۔ اُس نے کہا میں نے تو تم کو خضر کا ٹھکانہ بتا دیا اب تم نہیں آتے تو میرا کیا قصور۔

لوگ ان کے متعلق ایسی ہی اور بھی مضحکہ خیز حکایتیں بیان کرتے ہیں جن کا لکھنا سنجیدگی کے شایان شان نہیں۔ اس واقعہ سے قاضی کی سادہ لوحی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جس زمانہ میں بادشاہ نے لاہور کے امرا و اکابر کو مختلف علاقوں پر نامزد کر کے بھیجا تھا تو ہر ایک کو ایک شہر میں کسی ایک عہدہ اور منصب پر مامور کر دیا تھا۔ قاضی صدر الدین کو اس وقت گجرات میں بندر بھڑوچ کا قاضی بنایا گیا۔ وہ وہیں جا کر رہ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

ان کا ایک رٹ کا شیخ محمد نامی ہے جو عالم و قابل آدمی ہے اور اسی مقام پر اپنے باپ کا جانشین بنایا گیا۔

**میاں الہداد لکھنوی** نہایت صاحب تصرف مستعد دانشور و عالم تھے۔ طبعاً نہایت ذہین تھے۔ خاص طور سے فقہ، اصول فقہ اور عربیت میں توان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انہوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر ”قطبی“ رکھا تھا۔ جس کی عبارت نہایت پر تکلف تھی۔

میں حسین خاں کی حکومت کے زمانہ میں جب لکھنوی گیا تھا تو میاں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و نادر تھیں۔ پہلا تو ایک رسالہ تھا جس کا طول چودہ سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی سطروں کا تھا۔ اس کے حاشیوں پر بھی مضمون لکھا تھا۔ اس رسالہ میں چودہ علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے پانچ حصے تھے۔ اس کا نام انہوں نے قیٹون رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

ان کے چچا زاد بھائیوں کا بیان ہے۔ یہ چودہ علمی رسالہ اور رسالہ قیٹون اصل میں حکیم زہر قی کی تصانیف ہیں جو جوانی میں آیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا۔ پھر زبانہ کی ٹھوکیں کھاتے ہوئے وہ شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانہ میں جنہیں ثانی امام اعظم کا خطاب ملا ہوا تھا پہنچا۔ ان کے بعد وہ میاں الہداد کے پاس مرتے دم تک رہا۔ میاں الہداد شیخ اعظم کے صاحب زادے تھے۔

**میر سید جلال الدین قادری اگرہ** اگرہ کے مشہور سید ہیں۔ توکل و زہد میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔ شروع سے آخر تک گوشہ رتنائی میں بسر کر گئے۔ امرار کی صحبت سے دور ہو

دور رہے۔ بڑی آزاد مشربی کے ساتھ زندگی گزاری۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف سے لوگوں کو مرید بناتے تھے۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے میر سید داؤد اپنے باپ کے قائم مقام ہوئے۔ وہ نہایت تنگ دستی اور فقر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو ان بیچاروں کا خاندان بھی ادبار و زوال کا نشانہ بن گیا۔

صدر ہزاراں طفل سر بریدہ شد

تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت قطب المشائخ سلطان الواصلین خواجہ معین الدین سنہری

شیخ حسین اجمیری

چشتی کے پوتوں میں سے ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جب اکبر کو حضرت خواجہ اجمیری سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ شیخ حسین سے اس کا مزاج مکر رہی رہا۔ بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر دشمنوں کی بن آئی اور انہوں نے فتح پور کے بعض مشائخین کے اشارہ پر اس بات کی گواہیاں دیں کہ شیخ حسین کا حضرت خواجہ صاحب سے کوئی رشتہ نہیں ہے کیوں کہ خواجہ صاحب نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملہ میں صدر اور قاضیوں نے بھی زمانہ سازی کے بموجب محضر لکھ دیئے۔ اس طرح اجمیری کا سال کی موروثی تو بیت دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔ دراصل شیخ کا وہاں بڑا عمل دخل تھا۔ اور وہ اس صوبہ میں ایک طرح سے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ اثر و رسوخ بادشاہ کو کھٹک گیا۔ پھر کچھ اور چھوٹے بڑے معاملات ایسے بھی پیش آئے کہ شاہانہ تکبر و غیرت بھر دکا اٹھی۔ آخر اکبر نے شیخ حسین کو جلا وطن کر کے مکہ کو بھجوا دیا۔ جب بادشاہی لشکر بانشوالہ کے سفر میں تھا۔ شیخ حسین اجازت لے کر مکہ گئے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ جس وقت اکبر فتح پور سے آکر محمد حکیم مرزا کی سرکوبی کے لیے کابل جا رہا تھا۔ شیخ حجاز کے سفر سے واپس آئے اور دربار میں پہنچے۔ دربار میں نئے مذہب کے نو مسلم مریدوں اور نو دولت مصاحبوں نے تعظیم و تسلیمات کے نئے نئے آداب وضع کر رکھے تھے۔ شیخ نے یہ دستور کاہل آداب و تسلیمات ادا نہیں کیں۔ بادشاہ نے جب ان کو مطیع و مخلص نہ پایا تو گرفتار کر کے قلعہ بکر میں بھجوا دیا۔ چند سال تک شیخ حسین بکر میں رہے۔

سنہ ۱۰۰۰ میں بعض مقربوں کی سعی و سفارش سے شیخ کو بکر سے طلب کیا گیا۔ شیخ جب بکر سے آئے تو ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ جن میں شیخ کمال بیابانی تھیں جیسے لوگ اور فتح پور کے قاضی بھی تھے جو شیخ ابراہیم چشتی کی کوششوں سے چودہ سال سے وہاں قید تھے۔ ان اسیروں کے نام میرزا نظام الدین احمد کے ذریعہ طلبی کا فرمان جاری کیا گیا تھا یہ سب لوگ دربار میں آئے۔ حسب قاعدہ کورنش بجالائے۔ بادشاہ کو سجدہ کیا۔ اکبر نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شیخ حسین جو اس وقت ستر سال کے بوڑھے ہو رہے تھے۔ کبھی شاہانہ تسلیمات کے نئے آداب پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس بار بھی انہوں نے قدیم وضع پر تعظیم کی اور بس اچلتی ہوئی تسلیمات بجالائے۔ ان کے اس رویہ کو دیکھ کر

اکبر دوبارہ ان سے خفا ہو گیا۔ اور مرزا نظام الدین سے کہا کہ ان کی مدد معاش کے لیے تین سو بیگھہ کی زمین بکرہ ہی میں دی جائے۔ اور دوبارہ اسی جگہ بھیج دیا جائے۔

اکبر کی والدہ بیگم بادشاہ نے محل میں ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا ”بوتم را کبر کا پیار کا نام، شیخ کی والدہ بہت ضعیف ہے اور اجیر میں رہتی ہے۔ بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل کباب ہو رہا ہے۔ اگر ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ وہ تو تم سے کسی مدد معاش کے خواستگار بھی نہیں ہیں۔“ اکبر نے ماں کا کہنا قبول نہ کیا اور کہا ”آچہ جو رہاں کو پکارنے کا نام، وہ وہاں جائے گا تو پھر اپنی دکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔ لوگ اس کے لیے نذر نیاز اور ہدیے بہت لے کر آئیں گے۔ اور وہ وہاں لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی والدہ کو اجیر سے یہاں بلا لے۔ والدہ کو بلانے کی بات شیخ کے لیے بکر جانے سے زیادہ ناقابل قبول اور دشوار گزار تھی۔

اجیر کی تولیت کے معاملہ میں بادشاہ نے خود میرا نام تجویز کیا تھا۔ ایک رات صدر جہاں نے اس سلسلہ میں مجھے خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کا خیال بدل گیا۔ اور اس تجویز کو جسے خود ہی پیش کیا تھا بدل دیا۔ اور مجھے دربار ہی میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر صدر جہاں سے دریافت کیا ”وہ سادہ لوح بوڑھا شیخ حسین، کہاں ہے؟“ میں نے یاد دلایا ”لاہور میں ہے۔“ میں نے صدر جہاں کو بڑے اصرار سے کہا کہ ”اگر اس سعادت کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم اسے دیشخ حسین کو کوشش کر کے متولی بنوادو۔ تاکہ حق حق دار کو پہنچ جائے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ ان ہندوستانی امیروں کو اپنے آدمیوں کی ترقی و تربیت کا ڈھنگ نہیں آتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے صفائی اور خلوص سے نہیں رہتے۔ اسی لیے صدر جہاں کی کوششوں کا مجھ بے کس کے حق میں کوئی نتیجہ نہ نکلا اور نہ بیچارے شیخ حسین کے لیے کچھ ہو سکا۔ شیخ حسین شکستہ دل اور مضطرب گوشہ گنما می میں پڑے ہوئے ہیں۔ نہ تو کسی کے گھر جانے کی قوت ہے نہ کچھ وسائل روزی پیدا کرنے کی طاقت۔ بادشاہ کے پاس اب عرض و گزارش اور سفارش کی بھی کوئی راہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال شیخ حسین کی ذات نہایت غنیمت اور اس زمانہ میں باعث برکت ہے۔ میری ان سے کوئی جان پہچان اور ربط و تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حج کر کے پھر قید و بند کی زنجیریں برداشت کر کے آئے ہیں مجھے تو وہ ایک نورانی وجود اور فرشتہ صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں۔ سنے جتنے میں کسی وقت بھی کسی سے وہ دنیا کی بات نہیں کرتے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کشائش عطا کرے گا۔ کیوں نہ ہو“ ان مع العسر يسيرا“

امید ہے ان صاحب خدا بزرگ کے طفیل میں مجھ اسیر شاہی کو بھی رہائی مل جائے تاکہ میں اس دربار کی بے معنی پریشان گفتاری، ہرزہ گوئی، بے ہودگی اور دروغ نویسی سے نجات پا جاؤں اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہوں اور بقیہ عمر کسی مفید مشغلہ میں گزار دوں۔

بسر آئم کہ گرز دست بر آید

دست بکاری زئم کہ غصہ سر آید

اس وقت جب کہ میں یہ سطرین لکھ رہا ہوں صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اور نسیم سحر چلنے لگی ہے۔ اگر میری اس دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جاگے تو کرم خداوندی سے کیا بعید کہ وہ میری مشکل حل کر دے۔

غالباً خوابد کشود از دولتہم کاری کہ دوش

من ہی کردم دعاؤ صبح صادق سے دید

اگرچہ کسی شکوہ شکایت کا محل نہیں لیکن کیا کروں ایسا مضطرب اور بے قرار ہو گیا ہوں کہ یہ ایک دودردناک آہیں بے اختیار نوک قلم پر آگئیں۔ خدا معاف کرے۔

ہرگز چنین نبودم کہ درد دل بنالم

ایں بار بردل من غم سے کند گرانی

**شیخ عبدالقادر** | اوچھ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم شیخ حامد قادری کے صاحب زادے ہیں۔ جس وقت بیرم خاں کے عہد میں حضرت مخدوم آگرہ میں تشریف رکھتے تھے۔ میں طالب علم تھا لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

بیرم خاں بعض اہل بغض حاسدوں خاص طور سے شیخ گدائی کے بہکانے سے حضرت مخدوم کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آیا اور ان کو اوچھ سے طلب کر لیا۔ مخدوم کو اس سلوک سے برا رہا۔ انہوں نے بیرم خاں کو بددعا دی، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیرم خاں کو جو بھگتنا تھا وہ بھگت کر چلا گیا۔ شیخ محمد غوث بیرم خاں کے اس وبال کو اپنا اثر سمجھتے تھے۔ غرض جب حضرت مخدوم ملتان پہنچے تو ان کا وہاں انتقال ہو گیا اور ان کی لاش ملتان کے قریب موضع حامد پور میں امانتاً دفن کی گئی۔

ان کی وفات کے بعد شیخ عبدالقادر اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ کے درمیان سالہا سال تک سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوتا رہا۔ شیخ موسیٰ اکثر لشکر میں رہا کرتے تھے اور شیخ عبدالقادر فتح پور میں۔ ایک رات اکبر نے شیخ عبدالقادر کو کوکنار (پوست) پینے کے لیے کہا۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے بادشاہ کا مزاج مکر رہ گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں جماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنے لگے تو بادشاہ نے فرمایا "شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو۔" شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا "بادشاہ سلامت یہ کوئی تمہاری ملکیت ہے کہ تمہارا حکم چلے۔ اکبر نے رنجیدہ ہو کر کہا "یہ شیخ کس قدر جاہل ہے! پھر انہوں نے حکم دیا "جب تم ہماری ملکیت تسلیم نہیں کرتے تو ہمارے ملک میں بھی نہ رہو۔" شیخ اسی وقت وہاں سے اٹھ آئے، مدد معاش کو چھوڑا، چھوٹے بھائی سے جانشینی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس سے دست بردار ہوئے اور اوچھ میں اپنے آبائی مقبرہ میں جا کر گوشہ نشین ہو گئے۔ شیخ موسیٰ کے غائبانہ مخدوم شیخ حامد کی بڑیاں بھی اوچھ لے جا کر اسی قبرستان میں دفن کر دیں اور اپنے

اسلاف کی اتباع میں فقر و توکل کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کی عزیمت کی یہ برکت ہے کہ لوگ انہیں اتنا کچھ ندر و ہدیہ دیتے ہیں کہ کسی مدد و معاش کے محتاج نہیں رہے۔

چھوٹے بجائی شیخ موسیٰ برسوں کے زبرد و عبادت مجاہدہ و مشیخت چھوڑ دربار میں پہنچے اور بادشاہ کے ساتھ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔ سپاہ گری کا پیشہ قبول کر کے فوج میں ملازم ہو گئے۔ اکبر نے ان کو پانصدی امیروں کی صف میں جگہ دے دی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص مسلمان ہوا تو دوسرے نے کہا بڑا اچھا کام کیا۔ مسلمانوں میں بس تیری ہی ایک کمی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ عین دیوان خانہ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو کچھ کہے۔

جب ان کے منصب پانے کی خبر عبدالقادر کو ملی تو انہوں نے کہا ”وہ تو ہزار سی منصب کا اہل تھا۔ اس سے بڑا منصب کیوں حاصل نہیں کیا۔ اور بے وجہ اب تک محروم پڑا رہا۔“ آخر شیخ موسیٰ کو ملتان میں جاگیر مل گئی۔ شیخ عبدالقادر نے دنیا کو ٹھوکر ماری۔ اور فقر و توکل کی بدولت وہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ خلق خدا کو ہدایت و ارشاد سے مستفید کرتے رہے۔ ان کے اکثر اوقات عبادتوں، سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں گزرتے ہیں۔ ان کی دینی سیادت کا سکھ سب کے دل پر نافذ ہے۔

ماتو بروئی فقر و قناعت نمی بریم  
با پادشہ بگوئی کہ روزی مقدار است

یہ مخدوم شیخ بہاؤ الدین زکریا کے سجادہ نشین ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کو اپنے وقت کا ولی کہتے ہیں۔ **شیخ کبیر** | ملتان والے ان کے اس قدر معتقد ہیں کہ اگر وہ کہہ دیں تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے زیادہ جمع ہو جائیں۔

ذکر و مشغل اس قدر کرتے تھے کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ انہوں نے نشہ پی رکھا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھیں اکثر سرخ رہتی تھیں۔ اس لیے لوگ ان کو مست سمجھا کرتے تھے۔  
از بسکہ خوں خورم ہمہ شب بے خود اوفتم  
مردم ہند سمت سے خوارگی مرا

شیخ موسیٰ قادری جن کا ذکر آچکا ہے۔ شیخ کبیر کے متعلق نشہ اور مستی کا ہی گمان رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ پچھلے اولیاء جن کا کتابوں میں ذکر ہے کہیں ایسے ہی نہ رہے ہوں جیسے ہمارے شیخ کبیر ہیں کہ ولی بنے بیٹھے ہیں اور پہلے کے شاعر کہیں شیخ فیضی اور اس جیسے دوسرے شاعروں کی طرح نہ گزرے ہوں کہ ملک الشعراء بنا ہوا ہے۔

میں نے ایک مرتبہ فتح پور میں شیخ کبیر سے حسین خاں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ شکوہ بزرگی تو ان کے ظاہر سے



عیاں تھا، باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ قطعہ

بہر کرا جامہ پارسا بینی      پارسا داں و نیک مردانگار  
ور تو احوال اوندانی چسیت      محاسب رادرون خانہ چکار

ان کی وفات ۱۹۵۰ء میں ہوئی۔ اپنے بزرگوں کے مقبروں میں دفن کیے گئے۔

**میر سید علی لودھیانہ** | یہ بزرگ جھنجھانہ کے شیخ عبدالرزاق کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم صاحب کمال تھے۔ وجد و حال کی کیفیت بڑی غالب تھی۔ اسی برس سے زیادہ عمر پائی۔

جب سے انہوں نے اپنے مرشد سے تلقین و ارشاد کی اجازت حاصل کی۔ اس وقت سے ساری عمر گھر پر ہی گزاری۔ قدم باہر نہیں نکالا۔ ان کی محفل میں کیا امیر کیا فقیر ساری مخلوق حاضر رہا کرتی تھی۔ ان کی بڑی کرامتیں مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت تو یہی تھی کہ جو بھی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی صحبت میں حاضر ہوتا وہ گنہ گاری اور دنیا داری چھوڑ کر اللہ کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا اور حقیقی منزل کو پالیتا۔

ان کے معتقدین میں میرزا نظام الدین احمد کا داماد محمد جعفر بھی تھا کہ یہ نہایت سلیم الطبع نوجوان تھا لیکن فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا۔ پرگنہ شمس آباد اسے جاگیر میں ملا ہوا تھا۔ وہ لاہور سے اس پرگنہ کی فوجداری کے لیے رخصت ہوا تو اٹھائے راہ میں لودھیانہ ٹھہرنا ہوا۔ یہاں میر موصوف کی خدمت میں پہنچنے کی اسے توفیق ہوئی۔ بس ایسا اثر ہوا کہ بد اعمالیوں سے توبہ کر لی۔ شہادت کا ایسا شوق اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ بے جھجک اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا تھا اور جان کی پروا نہ کرتا تھا۔ بار بار اس نے میر صاحب سے شہادت پانے کے لیے دعا کی التجا کی۔ انہوں نے اس پر پھونک ماری۔ تین چار مہینے کے اندر وہ اس قدر صالح عبادت گزار اور نیک بن گیا کہ بہت سے متقی اور پرہیزگار اس پر رشک کرنے لگے۔ اس کی خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ اس حکومت، شان و شوکت کے باوجود تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا۔ کسی خادم کو زحمت دیئے بغیر وضو کا پانی خود لے آتا۔ میر صاحب نے شہادت کے لیے جو پھونک ماری تھی اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ اور میرزا جعفر شمس آباد کے ایک موضع میں حربی کافروں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

اسی سال اس موقع پر جب کہ میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رخصت لے کر وطن جا رہا تھا تو میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت جعفر کی شہادت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے فرمایا ”شہیدوں کو اس عالم میں بڑی فرحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں بھی کہا گیا ہے۔

”بل احياء عند ربهم يرزقون فرحين“

وہ اللہ کے پاس زندہ ہیں اور خوشی و مسرت ان کے لیے مہیا کی گئی ہے،

اس سلسلہ گفتگو میں انہوں نے ایک قصہ بھی بیان کیا کہ ”ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس نواح میں شہید ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے اصل روپ میں جمعہ کی راتوں کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر گزارا کرتا تھا۔“

یہ قصہ مجھے معلوم تھا۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ میں نے تو لوگوں سے یہ تک سنا ہے کہ ان میاں بیوی کے بچے بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح یساور میں جو میرا وطن ہے۔ ایک اور قصہ مشہور ہے۔ وہاں اسحاق نامی پٹھان شہید ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بھی ہر جمعہ کی رات اپنی نئی نویلی دھن کے پاس آیا کرتا تھا۔ اور اس کو اس راز کے افشاء سے اس نے منع کر دیا تھا۔ انہی دنوں اس کی بیوی حاملہ ہو گئی۔ اور لوگوں نے اس پر ناجائز کام کا الزام لگا دیا تو اس نے بڑا اصرار کرنے کے بعد اپنی ساس یعنی اسحاق شہید کی ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ مقررہ رات کو اس کی ساس نے بھی اپنے بیٹے کو دیکھ لیا۔ اور وہ اس کا نام لے کر آغوش میں لینے کے لیے دوڑی مگر وہ شکل اچانک غائب ہو گئی۔ اس دن سے بس اسحاق کی وہاں آمد و رفت بند ہو گئی اور ماں نے اپنے بیٹے کے نام ایک کنواں کھدوایا۔ جواب تک موجود ہے۔

یساور کا قصہ بھی میں نے اس محفل میں بیان کر کے میر صاحب سے پوچھا کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ انہوں نے جواب دیا ”مکن ہے عقلاً بھی اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا“ میرزا نظام الدین نے کہا ”ہو سکتا ہے کوئی جن اس شہید کی صورت میں آتا ہو“ آپ نے فرمایا ”جنوں کو انبیاء، اولیاء، صلحاء اور شہدار کی تمثیل آتا رہنے پر قدرت حاصل نہیں ہے۔“

میر سید علی کی وفات سترہ سو تیس میں ہوئی۔ ایک اہل علم نے ”شیخ انام“ ان کی تاریخ کمی ہے۔ اب ان کے جانشین میر سید محمود ہیں۔

یہ مشہور واعظ ”معراج النبوة“ کے مصنف ملا معین کے پوتے ہیں۔ نہایت نیک نفس اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔ مدت تک لاہور میں قاضی رہے۔

ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی قصاصات کے دوران میں ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی مقدمہ کے فیصلہ پر اصرار کرتا تو وہ اسے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے تھے۔ خدارا تم دونوں آپس میں صلح کر لو تاکہ میں تمہارے جھگڑے میں اللہ کے پاس پکڑا نہ جاؤں اور مجھے آخرت میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ وہ فریقین سے کہا کرتے تھے کہ تم دونوں دانا ہو اور مجھے اکیلے نادان کو دو دہانوں سے سابقہ آ پڑا ہے۔ خدارا تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمسار نہ کرو۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے غائب رہنے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تاحدا مکان اپنے پاس سے اس کا خرچ دے دیتے اور کہتے یہ رقم لے کر جاؤ اور شوہر کا انتظار کر اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کر۔ اپنی مدد معاش کو جو کافی اچھی تھی، ساری کی ساری کاتبوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کاتبوں سے وہ قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے۔ ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے۔ پھر جلد بند ہوا کر طالب علموں کو مفت دے دیتے۔ ساری عمر ان کا یہی مشغلہ رہا اور انہوں نے لوگوں کو ہزاروں جلدیں بخش دیں۔

شکار میں انہوں نے انتقال کیا۔ ان کے دور کے رہ گئے ہیں۔ ایک تو پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور ہے۔ بادشاہ سلامت کے ہاں بھی ان کے ان فتنوں کا ذکر آیا تو بادشاہ نے دونوں کو بلا کر ان کے کھیل تماشے دیکھے۔

”یخرج المحی من المیت ویخرج المیت من المحی“

میر عبد اللطیف قزوینی | یہ سیفی حسینی سادات میں سے ہیں۔ علوم عقلی اور نقلی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے باپ دادوں سے علم تاریخ گویا ان کے ہاں موروثی ہے۔ چنانچہ حیرتی شاعر نے قاضی یحییٰ کے والد کی تعریف میں کہا ہے:

قصہ تاریخ ازو باید شنید

کس دریں تاریخ مثل او ندید

انہوں نے یا ان کے کسی عزیز نے شاہ اسماعیل کے خروج کی تاریخ ”مذہب تاحق“ سے نکالی تھی۔ جب اس گستاخی پر پکڑے گئے۔ اور مواخذہ ہوا تو کہہ دیا کہ ہم نے تو ”مذہب تاحق“ (ہمارا مذہب تاحق ہے) تاریخ کئی تھی۔ بس یہ معنی خیز جواب دے کر پھوٹ گئے۔

سیفی سید سب کے سب بڑے پکے سنی رہے ہیں۔ چنانچہ اس جرم میں شاہ طہماسپ نے ان کی زمینیں اور جاگیریں چھین لی تھیں۔ ہندوستان میں میر عبد اللطیف کے آنے کا بھی یہی سبب تھا۔ میں نے میرزا غیاث الدین آصف خاں کی زبانی سنا ہے کہ جب بادشاہ میر عبد اللطیف اور ان کے خاندان کا دشمن ہو گیا تھا۔ میر علاؤ الدولہ نے جو تذکرہ کا مصنف ہے اور عبد اللطیف کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے۔ اور انہی سے تربیت پائی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو ”حضرت آقا“ کہا کرتا تھا۔ کسی مصلحت کی وجہ سے اس نے اپنی مذمت میں آپ ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے:

لعنت کنم بر یحییٰ در حضرت آقا

لوگوں نے اس سے کہا تو نے تو میر صاحب کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ پھر ان کی توہین کیوں کی؟ اس نے جواب دیا۔ دیکھتے نہیں ہو۔ اسی حق کی وجہ سے تو اس کو میں نے ”حضرت آقا“ کہا ہے۔ اور اپنے باپ کا نام دیکھی، تو بغیر تعظیم ہی کے کیا ہے۔

جب فتنہ پردازوں نے شاہ طہماسپ کو میر یحییٰ کی طرف سے بدگمان کر دیا تو شاہ نے اپنے ایک عزیز شکر گشتہ کو آذر بانی جان فرمان دے کر بھیجا کہ میر یحییٰ اور ان کا لڑکا میر عبد اللطیف نہایت متعصب سنی ہیں۔ اور انہی کی وجہ سے قزوین میں سنیوں کا زور بندھا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ اور اہل سنت کی جو کتابیں ان کے پاس ہیں۔ ضبط کر کے ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ ان کے اہل و عیال اور قبیلہ والوں کو اصفہان میں منتقل کر دیا جائے۔ میر علاؤ الدولہ کو بھی جو ان دنوں آذر بانی جان میں تھا۔ ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ اس طرح کا خط لکھ کر

سیجا گیا۔

غرض حسب الحکم میربحی کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا۔ اور وہ ڈیڑھ سال تک اصفہان میں قید رہے۔ اور اسی بد میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میر عبد اللطیف وہاں سے فرار ہو کر کچھ عرصہ تک گیلانات کے پہاڑوں میں رہے۔ پھر بادشاہ نگران پناہ (بہایوں) کے وعدہ پر ہندوستان چلے آئے۔

یہاں آنے کے بعد ان کا بڑا اعزاز و اکرام ملحوظ رکھا گیا اور بے اندازہ شاہانہ سرفرازیوں سے نوازے گئے۔ میر نے ان کے پاس دیوان حافظ کے چند سبق اور کچھ دوسری چیزیں بھی پڑھیں۔ میر عبد اللطیف نے پانچ ماہ جب شہ کو فتح پور میں انتقال فرمایا۔ قلعہ اجیر پر میر سید حسین خٹک سوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ ”فخر آل یاسین“ نکالی ہے۔

میر عبد اللطیف قزوینی کا لڑکا ہے۔ اسے دربار سے نقیب خاں کا خطاب حاصل ہے۔ برز اغیاث الدین علی | یہ نہایت فرشتہ خصلت اور صاحب علم و کمال شخص ہے۔ علم سیر تاریخ اور اسرار جال میں تو عرب و عجم میں بھی اس جیسا ماہر فن داں اور کوئی نہ ہوگا۔

میرزا کے ساتھ میرا بڑا دوستانہ رہا۔ وہ اور میں ہم سبق بھی تھے۔ اب وہ سات دن بادشاہ سلامت ہی کی خدمت میں رہتا ہے۔ اور تقریباً ایک قرن سے وہ خلوت و جلوت میں تاریخ قصے حکایات فارسی اور ہندی افسانے کا اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا ہے۔ بادشاہ کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔

اکبر کے ساتھ اس کا ایسا خلا ملا ہے کہ وہ ذات شاہانہ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اکبر ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی رائی کو گوارا نہیں کرتا۔

ان دنوں اسے ہلکا سا بخار ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ جلد ہی اسے شفا ہو جائے گی۔ بہر حال نیک لوگ ہر جگہ عزت رہتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ بڑوں کی زندگی کی دعا کیوں کی جائے کہ وہ رہیں گے تو وہی اپنی رائی کرتے رہیں گے۔

حضرت خواجہ احرار سے تین واسطوں میں خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ فن تحریر میں بڑا عبور حاصل تھا۔ خواجہ محمد یحییٰ | سات خط بڑی عمدگی کے ساتھ لکھتے۔ اس فن میں وہ ماہر اور استاد تھے۔

نہایت اچھے اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ یہ خوبی تو ان کو موروثی ملی تھی۔ کم سخن تھے لیکن ہمیشہ ان کی محفل میں رہتی تھی۔ سخن ایسے تھے کہ جو بھی جاگیر کی آمدنی ہوتی۔ وہ ان کے دست پر لگ جاتی تھی۔ لوگوں کے آڑے وقتوں میں ہمیشہ کام آتے تھے۔

جب دربار میں مفسدوں کا عمل دخل بڑھ گیا اور پرانی محفل درہم برہم ہو گئی تو انہوں نے بھی دربار سرکار سے تارہ کشی کر لی اور حجاز جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے ان کو حجاج کے قافلہ کا میر حاج مقرر کیا اور کافی خرچ سے کراہیں رخصت کیا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ آئے۔

آگرہ میں ان کے اکثر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا انتقال ہوا۔

تر از کنگرہ عرش مے زند صغیر

ندانمت کہ دریں دام گرچہ افتاده است

**شیخ حسین بدخشی** | مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے۔ ان پر سکر کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہر روز کبرویہ سلسلہ کے طریقہ پر کتاب مصباح کو جو شیخ رشید کی تصنیف ہے۔

ان کی محفل میں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب سنتے سنتے ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے ہاں مثنوی مولوی معنوی بھی لازماً پڑھی جاتی تھی۔

شریعت پر ثابت قدم تھے۔ ان کی صحبت و گفتگو بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو کہتے ”اپنے اوپر تم ہمارا بھی قیاس کرتے ہو۔“

بدایوں میں چند ترک ان کے مرید تھے۔ ان سے ملنے وہ چند بار بدایوں تشریف لائے تھے۔ اور بدایوں والے ان کی صحبت مبارک سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے لوٹ کر جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کا دس سال ہو گیا۔

**شیخ عبدالقادر** | اوچھ کے شیخ عبدالقادر ثانی کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ بخش دونوں نے بڑے تقوے و پرہیزگاری کے ساتھ تربیت پائی۔ دونوں بڑے

صاحب کمال رہے۔

کچھ عرصہ تک یہ دونوں فتح پور میں رہے۔ جس زمانہ میں نئے مذہب کی باتیں شروع تھیں اکبر نے شیخ اللہ بخش پر مہربان ہو کر گجرات میں صدر کے عہدہ پر فائز کیا تھا اور شہباز خاں کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ تقرری درحقیقت ان کی جلا وطنی تھی۔ جب گجرات میں بغاوت ہوئی تو انہوں نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں اور وہاں سے باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاع تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ بھجواتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر تین صدی کے منصب کے لیے فرمان صادر کر دیا۔ اسی زمانہ میں ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔

اکبر نے ان کے بڑے بھائی شیخ عبدالقادر کے لیے مکہ معظمہ کی طرف خارج کر دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ جس زمانہ میں خان خاناں و بیرم خاں اور میرزا نظام الدین احمد گجرات کے نظم و نسق پر مامور تھے وہ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ان کے لیے سامان سفر درست کیا گیا۔ اور وہ حج و زیارت کی برکت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے۔ اب اپنے وطن لاہور میں عبادت الہی میں مشغول ہیں۔

**شیخ ابوالمعالی** | میاں شیخ داؤد کے بھتیجے داماد اور جانشین ہیں۔ احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند پایہ ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انہوں نے خود کو بالکل ہی شادیا۔ اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ خود ان کے اشعار ہیں۔

ہستم از جام محبت ہمدوم والد مست  
ایں و آن راجہ شناسم من داؤد پرست



دل افسردہ کے یابد بگفت ہر کسے گرمی  
دم داؤد سے باید کہ آہن زاد بد نرمی

بہ تخت فقر بہ نشینم چو حاصل گشت مقصودم  
سلیمانی کنم کز جاں غلام شاہ داؤدم  
رباعی

یارب نظری ز عین مقصودم بخش آزادگی ز بود و نابودم بخش  
ہر چند نیم در خور این دولت خالص یک ذرہ ز عشق شیخ داؤدم بخش  
ان کی زبان پر اکثر یہ جملے رہتے تھے۔

”یا ابا المعالی کن عبد الرب المتعالی ولا تکن عبد الدراہم ولا لی“

کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤد کے پاس لے کر گئے۔ اور ان سے  
نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ حضرت میاں نے فرمایا ”ان کا نام شاہ ابو المعالی رکھو“۔ اس زمانہ میں ایسے نام ہندوستان  
میں نہیں ہوا کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ مغلوں کے نام کے مشابہ تھا۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال سمجھا۔  
چنانچہ ایک برس بھی نہیں ہوا تھا کہ بہا یوں ہندوستان میں آگیا۔ اور اس نے اپنے محبوب ابو المعالی کو پنجاب  
کی حکومت عنایت کی۔

ابو المعالی کی پیدائش کی تاریخ ”ابو المعالی حق پرست“ سے نکلتی ہے۔ ان کے چند یہ شعر ان کی مستانہ وار  
محبت کے گواہ ہیں۔

غربتی از حال میگوید سخن بے سخن این قبل و تال دیگر است  
حالت عشقش بود گفتن محال در نمی گویم محال دیگر است

غربتی نقد جاں فدائیش کن  
دولت وصل رائگاں ندر بند

سخن عشق بدل ورنہ لب را بکشا  
سرای شیشہ فرو بند کہ بادل نخورد

غربتی بانگ ان سخن زن و از در مترس نہ انکہ معراج دریں راہ رسن دار بود

آنچه مازاں جان جانها دیده و دانسته ایم  
بهر گفتن نیست بر دیدن و دانستن است

انہوں نے مجھے لاہور میں یہ رقعہ بھجوا دیا تھا۔

”عزیزی! اس ہنگامہ پر ورنہ مانہ میں ہر آنے جانے والے سے ہم تمہاری خیر خیریت کے طالب رہے۔  
کہ اچانک تمہارا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس وقت حضرت قادری کے اشعار میری روح کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔  
اس لیے مزید کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ سب کو ہماری طرف سے دعا۔“  
ایک دوسرے رقعہ میں انہوں نے لکھا ہے

آں عزیزی کہ ہمہ شب بدل من گردد  
خرم آں روز کہ در دیدہ روشن گردد

سلام شوق۔ مولانا عبدالغفار اور شیخ عمر کا ایک ضروری کام ہے۔ جو آپ کی ذرا سی توجہ سے پورا ہو جائے گا  
اگر فرصت ہو تو ان کا کام کر دیجئے۔“

لاہور میں ان کے نام سے ایک محلہ بھی مشہور ہے۔ حاجی مہدی کے داماد ہیں۔ حاجی مہدی بہت  
مولانا جمال تلہ مشہور عالم گزرے ہیں۔ مولانا جمال احمد کے ملا اسماعیل کے شاگرد ہیں۔ لاہور میں مدرس ہیں۔  
اپنے وقت کے بہت بڑے عالم ہیں۔ تقریباً تمام علوم عقلی و نقلی کو انہوں نے حاصل کیا ہے۔ ذائقہ طور پر نہایت ذہین  
جدت طراز جوہر قابل ہیں۔

آٹھ سال سے برابر درس و تدریس کا مشغلہ ہے۔ ان کی خوش بیانی اور ترتیع و توضیح کا بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ وہ  
معقول و منقول کسی بھی علم کے مشکل مسائل باسانی شاگردوں کو سمجھا دیتے ہیں۔ نہایت مہربان و شفیق استاد سمجھے جاتے ہیں۔  
صلاح و تقویٰ سے آراستہ نہایت بااخلاق انسان ہیں۔ قرآن کے حافظ بھی ہیں۔  
شیخ فیضی کی تفسیر میں اکثر مقامات پر انہوں نے اصلاح دی ہے اور اس کی تحریر کو مربوط کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر  
پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔

چیت بحث علم اگر تا فرق فرد میرود

ذکر مولانا جمال الدین محمد سے رود

مولانا عبدالشکور لاہور سربراہ آئندہ دانش عالم ہیں۔ متانت فہم اور جدت طبع میں کافی مشہور ہیں۔ مشائخوں سے  
گہری عقیدت اور حسن ظن رکھتے ہیں۔ اور اپنے اکثر اقوال و موافقات کے اقوال کے مطالعہ  
میں صرف کرتے ہیں۔ ہمیشہ عبادتوں، نوافل و طائف دعاؤں اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ سخی ایسے کہ جو کچھ پونجی  
ہوتی ہے وہ فقراء اور اہل حاجت پر خرچ کر دیتے ہیں۔

جب علماء ابتلا و آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بادشاہ نے ان کو جلا وطن کر کے جون پور کا قاضی بنا دیا تھا۔

جب بادشاہ نے الہ آباد کا سفر کیا اور وہ دربار میں حاضر ہوئے تو وہاں کی قضاوت کا عمدہ قاضی زادہ رومی کو جو نہایت خوش مزاج باکمال عالم ہیں تفویض کر دیا گیا۔ اس وقت سے مولانا عبدالشکور معزول ہیں۔ تھوڑی سی آمدنی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ علمی افادہ میں اطمینان سے مشغول ہیں۔

اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔ یہ ایک صالح نوجوان ہیں جو چھوٹی عمر ہی میں بلند مدارج تک پہنچ گئے۔ اور ایسا کمال حاصل کیا کہ بوڑھے اساتذہ سے بھی آگے ہو گئے۔ اس آخری زمانہ میں لڑکا باپ سے بہتر نکلے تو اسے بس عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔

انہوں نے اکثر متداولہ علوم اپنے والد اور خسر میاں سعد اللہ بنی اسرائیل سے حاصل کیے۔ اور ان بزرگوں سے آداب محفل اور دوستی کا سلیقہ خوب سیکھا ہے۔ بادشاہ کے مزاج شناس ہیں۔ افیون کی بری لت لگی ہے۔ علاوہ ان میں تکبر جھوٹ اور شیخی کے بھی بیمار ہیں۔ خدا ان بری باتوں سے انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ جس زمانہ میں وہ بادشاہ کے حسب الحکم اپنے والد کے ہمراہ پرگنہ بجواڑہ اور کوہ شمالی کے دامن کی طرف گئے ہوئے تھے تو انہوں نے وہاں سے مجھے یہ رقعہ لکھا تھا

رقعہ

”کان لی قلب اعیش بہ ضاع منی ثقلیہ“۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ جناب من ہمارا دل عبادت کدہ خلوص میں مغتکف ہے۔ اور یہ خاکی جسم کہ اس پر خاک ہی پڑے تو بہتر۔ اس بیابان کثرت میں درندوں اور وحشیوں کے ساتھ آوارہ نہیں۔ بلکہ ایسے گروہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ وحشی جانور بھی ان کو دیکھ کر وحشت کھا جائیں۔ سبحان اللہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو کر رہے گا ذلیل نفس نے اب گوشہ عافیت کی قدر جانی ہے۔

جب سے میں من تیز پر پہنچا اس وقت سے اب تک کہ میری عمر چالیس سال ہو گئی ہے۔ میری ہمیشہ توجہ ایسی جانب ہی کہ روحانی درد مندوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفسانی عیوب اور باطنی بیماریوں کا علاج کروں لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسی سخت بیماری میں مبتلا کر دیا کہ اب اس کا علاج خود اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ہونے کا۔

بہر حال اب نہ وہ صحبت روحانی حاصل ہے نہ اطمینان قلب، وہ گوشہ عافیت بھی اجڑ کر رہ گیا۔

آپ براہ کرم تو اب فیاضی علامی فہامی ذغالبا ابوالفضل، کو سلام و شکر یہ پہنچادیں۔ دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے۔ امید ہے میاں احمد صحت و سلامتی سے ہوں گے۔ مجھے اپنا مشتاق سمجھئے۔

مشرقی ہند کے رہنے والے ہیں۔ بیانہ میں مقیم رہے۔ اور بچپن ہی سے شیخ محمد غوث کی خدمت سے مشرف رہے۔ اور ان کے فیض سے دعوت اسماء کے عمل و وظیفہ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے سیاحتیں کیں۔

بیانہ میں انہوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو برسوں طالب علموں اور اہل سلوک کا ملجا و دامن بنی رہی۔ وہ

لوگوں کی تلقین و ہدایت میں برابر لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے علم نحو میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے زمانہ کے بے مثل نحوی تھے۔

ستر سال تک بجز دودھ اور جنگل پھل پھلا ری کے سوا کسی اور چیز سے افطار نہیں کیا۔ سخاوت اور ایثار میں بھی بڑے دراز دست واقع ہوئے تھے۔

میں اسلم شاہ کے عہد میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے میں نے کافیہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ایک عالم حیرت میں ڈوبے رہتے اور ایک علیحدہ کمرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ بچوں تک کو اپنے پاس نہیں بلاتے تھے۔ اسی عالم میں ۸۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

کہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوا تھا۔ ایک چڑیا ان کی میت پر اچانک آکر گر پڑی۔ دیکھنے والے اس واقعہ پر نہایت حیران رہ گئے۔

ہندوؤں کے رہنے والے ہیں۔ کیسا گری میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمایوں بادشاہ شیخ نصیر الدین کے سفر و حضر کے رفیق و مصاحب تھے۔

جوئے کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرہ پہنچا تو اس نے شیخ سے کہا کہ نئے لشکر کی تیاری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تانبے کی تمام دنگیں نکال اور برتن جمع کرائے۔ اور بادشاہ کے سامنے انہیں خالص سونا بنا کر دے دیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی۔

میری رشتہ داری بھی انہی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے تحقیق کیا پتہ چلا کہ شیخ خود کیسا کے نسخہ سے واقف نہ تھے۔ انہیں کسی درویش نے کیسا کے اجزاء سے بھری ہوئی ایک زنبیل دے دی تھی۔ اس سے انہوں نے بہت سے تانبہ کو سونا بنالیا۔ جب وہ ختم ہو گئی تو سونا بنانا ان کے بس میں نہ رہا۔ کیوں کہ وہ اس علم سے واقف نہ تھے۔

میں نے ان کو بیرم خاں کے عہد میں میر سید رفیع الدین محدث کے بھتیجے سید شاہ میر کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڑے بااخلاق نورانی چہرہ بزرگ تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہندوؤں ہی میں دفن کیے گئے۔

شیخ مبارک الوری | اسلم شاہ ان کو شاہ مبارک کہا کرتا تھا۔ اور ان کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ وہ غالباً سید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ پٹانوں میں اہل بڑی عزت و توقیر تھی۔

جس زمانہ میں پٹانوں کو زوال ہوا اور وہ مغلوں سے شکست کھا کر بھاگے۔ بعض پٹانوں نے شیخ اسلام فتح پور کو اس مشہد میں کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے گرفتار کر کے رہنمبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ اس ممبر کو سن کر شیخ مبارک

اور سے لیا اور کے راستہ وہاں پہنچے اور شیخ اسلم کو چھڑا لیا۔

انہوں نے جب دوسری بار کعبۃ اللہ کی زیارت کی تھی تو میں سولہ سال کا تھا۔ اور اس وقت اپنے والد کے ساتھ لیا اور جا کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بعد میں ۹۸ھ میں جب کہ اکبر نے اجمیر کی آخری زیارت کی تھی اور اور کے راستہ فتح پور لوٹ رہا تھا میں نے دوبارہ حضرت سے ملاقات کی۔

بلاشبہ وہ نہایت صاحبِ کمال تھے۔ نہایت فیاض اور اثار پسند آدمی تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں نوے سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

**شیخ چائین لدہ سُنی** | قصبہ لدہ سوہنہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ قصبہ میوات میں دہلی سے اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ایک گرم چشمہ ہے جو گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔ اس کا پانی سبز رنگ کا ہے اور اس سے گندھک کی بو آتی ہے۔ جائڑوں میں بھی اتنا گرم رہتا ہے کہ جسم پر ڈالا نہیں جاسکتا۔ خارش سے مریض کے لیے اس چشمہ میں نہانا مفید ہے۔ اس کی بو اور پانی کا رنگ خود بڑا ثبوت ہے کہ یہ گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔

وہاں کا ایک اور عجوبہ ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں اس قصبہ کے پہاڑوں میں کسی کے جلانے بغیر جگہ جگہ تھوڑی تھوڑی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخ چائین حضرت عبدالعزیز دہلوی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ فقر و قناعت ان کا مسلک ہے۔ خاص خاص شاگردوں کو تصوف کی کتابیں جیسے قصوص اور ”نقد قصوص“ وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ آخری عمر میں شہنشاہ اکبر ان کا نہایت معتقد ہو گیا تھا۔ اور بعض مہموں میں ان سے دعا کرائی تھی۔ اپنے محل خاص کے قریب عبادت خانہ میں انکی ہائش کا انتظام کر دیا تھا۔ راتوں میں ان کے ساتھ خلوت میں باتیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن جب اکبر نے ان کو ”نماز معکوس“ پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت و ارادت جاتی رہی۔

۹۸ھ میں جب بستر مرگ سے جائگے تو شیخ عبدالعزیز کے لڑکے شیخ قطب عالم کو جو فوج میں ملازم تھا۔ دہلی سے بلوایا۔ اور خرقة عصا اور مشائخی کا سارا سامان اس کے سامنے رکھ کر کہا یہ تمہارے والد کی امانت تھی۔ اس کے لیے تم سے زیادہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ”حقیقت فقر“ سے نکلتی ہے۔

شیخ قطب عالم کے دل پر بھی ایسا اثر ہوا کہ ملازمت ترک کر کے اپنے مرحوم والد کی جانشینی اختیار کر لی۔ اب وہ دہلی میں مقیم ہے۔ اور حضور اکرم کے قدم مبارک کی تولیت کو سنبھالے ہوئے ہے۔

**شیخ عبدالغنی بدایونی** | یہ بھی شیخ عبدالعزیز کے خلیفہ ہیں۔ ترک تعلق میں اپنے وقت کے ادہم اور عالم تجرید میں اپنے زمانہ کے مشہور ہیں۔

بدایوں میں وہ طالب علم ہی تھے کہ ان پر کیفیت و حال طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میں سبق پڑھنے



کے دوران جب کہیں سے نغمہ کی آواز آ جاتی تو پہروں بے ہوش ہو جاتے۔ جب ان کے ساتھی پوچھتے کہ تم نے کیا دیکھا جو یہ حالت ہو گئی؟ تو کہا کرتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شادی شدہ ہونے کی وجہ سے روزی کی تلاش میں دہلی آئے اور وہاں کے حاکم تاتار خاں کی خدمت میں پہنچے۔ تاتار خاں تھا تو حاکم لیکن درحقیقت نہایت خدا رسیدہ آدمی تھا۔ اس ملازمت کے دوران شیخ موصوف شیخ عبدالعزیز کے مرید ہو گئے اور تمام مروجہ مشہور کتابیں ان سے پڑھیں اور تحصیل علم کے بعد برسوں سبق پڑھایا۔

درس و تدریس کے مشغلہ کے دوران ہی میں جذبہ باطنی اچانک جوش میں آیا اور تمام مشاغل ترک کر کے شیخ عبدالعزیز کی خانقاہ میں کچھ عرصہ تک عبادت گزار درویشوں میں شامل رہے۔ بڑے مجاہد سے اور ریاضتیں کیں۔ جب کمال باطنی حاصل کر لیا تو آبادی سے باہر قدم گاہ حضور اکرم کے قریب ایک مسجد میں جا کر جو خان جہاں کی مسجد مشہور ہے مقیم ہو گئے۔ اگرچہ اہل و عیال اور خاندان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں۔ لیکن انہوں نے توکل کا مسلک اختیار کر لیا اور تقریباً ایک قرن ہو چکا ہے۔ اس گوشہ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

سن ۱۱۰۰ھ میں جب خان خاناں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے نصیحت کرنے کی فرمائش کی۔ انہوں نے فرمایا۔ ”حضور اکرم کی پیروی اختیار کرو۔ اس تحریر کے قریبی زمانہ ہی میں احمد صوفی، حامی بنارسی جو اس آخری دورِ فتن کے سربراہ آدرہ اشخاص ہیں اور سنیہ دین الہی کے فوسلم ہیں۔

عذر از صوفیاں شہر و دیار ہمہ نامرد مند و مردم خوار  
ہرچہ دادی بدست شاں خود نہ ہرچہ آمد ز دست شاں کو نہ  
کار شاں غیر خواب و خور و نہ بیج شاں فکر و ز مردن نہ

ان لوگوں نے اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے اور اپنے فسق کو چھپانے کے لیے یہ چاہا کہ شیخ عبدالغنی اور ایک دو اور بقیۃ السیف بزرگوں کو اپنا ہمنا بنایا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کو دہلی سے لاہور حاضر ہونے کے لیے فرمان جاری کر دیئے گئے۔ شیخ نے میرے پاس ایک خط بھیجا جس میں انہوں نے آنے سے بڑی معذوری ظاہر کی تھی۔ میں نے احمد صوفی کو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھائیں۔ یہاں تک کہ اس نے ان بزرگوں کی حاضری کا خیال چھوڑ دیا اور معافی کا ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر و خوبی گزر گیا۔

شیخ بہلول دہلوی علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر و فاقہ کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے فقر و توکل کے راستہ پر نہایت ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی آپ کا تخلص حق تھا۔ علوم عقلی و نقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر و کمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا بلند درجہ تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تو ”تاریخ مدینہ سکینہ“ کا ترجمہ اور ہندوستان کے متاخر مشائخین کرام کے حالات کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کی تاریخ تصنیف ”ذکر الاولیاء“

سے نکلتی ہے۔

عنفوان شباب سے ہی انہیں علوم و فنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے قدیم روایات تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں رہے۔ اس زمانہ میں میں نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔

جب دین بادشاہی کا قضیہ پیدا ہوا اور حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تو دوستیوں اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ شیخ موصوف کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے اور انہوں نے کعبۃ اللہ جانے کا عزم کر لیا۔ جلد ہی وہ دہلی سے اس طرح روانہ ہو گئے کہ کوئی سامان سفر ساتھ نہ تھا۔ غرض کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچ گئے وہاں میرزا نظام الدین احمد نے ان کے لیے زاد سفر مہیا کر دیا اور ہر طرح سے مدد کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور وہ حجاز پہنچ گئے۔ بعض قدرتی موانعات کی وجہ سے وہ مدینہ کی زیارت نہیں کر سکے۔ چند روز مکہ معظمہ میں رہے۔ اور شیخ عبدالوہاب ہندسی خادم شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی اجازت حاصل کر لی اور وطن واپس ہو گئے۔ یہ شیخ عبدالوہاب حاجی بیگم کے ساتھ حج سے جب آگرہ واپس آئے تھے تو میں نے ان کے ہاتھ سے آب زمزم پیا تھا اور برکت کے لیے حدیث کا درس پڑھا تھا۔

شیخ عبدالحق اب اپنے حال و کیفیت کو چھپائے ہوئے علوم رسمی پڑھانے میں مشغول ہیں۔ نہایت عالی ہمت آدمی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے راستہ پر استقامت و کامیابی سے بڑھتے رہیں گے۔

جن دنوں وہ مکہ شریف سے دہلی تشریف لائے تھے۔ میں حسب طلب بڑی تشویش و عجلت میں بدایوں سے بادشاہی لشکر کی طرف جا رہا تھا۔ ان سے بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں لاہور پہنچ گیا تو انہوں نے ایک خط بھیجا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

”بندگی و نیاز کے بعد جس زمانہ میں آپ دہلی تشریف لائے تھے تو مجھے کچھ دیر کے لیے اپنی ملاقات سے نوازا تھا۔ لیکن یہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ شوق و اشتیاق کی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھ گئی۔ بہت سی باتیں کہنے سننے سے رہ گئیں آج اس دنیا میں دوستوں سے ملاقات و گفتگو کی ہمت ہی نہیں ملتی۔ اگر دوستی سچی ہے تو انشاء اللہ عالم فردا میں باطمینان صحبتیں جنیں گی۔ آج تو بس تعلقات کو درست رکھنے اور نیتوں کو پاک رکھنے کی سعی ہی کی جاسکتی ہے۔ ہم نشینی بس روز فردا ہی میں نصیب ہوگی جب کہ جدائی اور وصال کے سارے حجاب اٹھ جائیں گے۔ بہر حال آپ مجھے فراموش نہ کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ ہی کے خیال میں رہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کے دل میں محبت و حقیقت پسندی جاگزیں ہے۔ اہل حریم میں سے ایک بزرگ یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے۔ ”اللھم کما النعمت فذو کہ مازون خادم کما ادمت فبارک“ اللہ تعالیٰ محبت و دوستی کی نعمت کو بڑھائے برقرار رکھے اور مبارک بنائے۔ اگر کبھی آپ اپنے عنایت نامہ سے نوازیں تو حضرت شیخ کلیم اللہ کے حالات سے ضرور مطلع فرمائیں۔ چند باتیں آپ سے عرض کی تھیں۔ اس سلسلہ میں بھی کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم نہیں چلا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب ان کا ذکر میرزا سے آیا تو اس نے اسی مطلب کے شعر کہے۔ بلکہ صراحتاً لکھ دیا کہ یہ تکلف سے بعید ہے کہ اس خط کے

پہنچانے کی ذمہ داری آپ بجالائیں گے۔ والدہؑ۔

شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا۔ اور گرمی محفل کی خاطر دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خط لکھے۔ لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیئے۔ شیخ فیضی نے اس سلسلہ میں انہیں جو رقعہ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:-

”آپ سے ملاقات کا شوق محض رسمی اور ظاہری نہیں ہے، نہ احاطہ بیان میں آسکتا ہے۔ پہلے میں آپ کی مرضی و منشاء سے واقف نہ ہو سکا۔ یہی گمان رہا کہ آپ بھی ملنے کے خواہش مند ہوں گے۔ لیکن بعد میں جب پتہ چلا کہ آپ نے دوستی کی یہ راہ ہی سرے سے بند کر رکھی ہے تو میں نے بھی آپ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے دی۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے اپنے ”خلوت کدرہ تنگ“ پر کسی ہنگامہ کو پسند نہیں فرمایا۔ آج سے دو تین دن پہلے نقارۃ الاولیاء میاں شیخ موسے میرے ویرانہ پر تشریف لائے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بعید نہیں کہ جناب انہی دنوں آجائیں۔ ان سے میں نے اس کا سبب بت کچھ دریافت کیا۔ لیکن گول مول جواب دے کر ٹال گئے۔ خدا کی قسم اس میں میری جانب سے کوئی اشارہ نہیں اور نہ کہی ہوگا۔ ع۔

وقت گویا چہ حاجت طوٰ

اگر وہاں رہیں تو بھی منظور ہے اگر آجائیں تو نور علی نور۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے، نہ اپنی یاد کا ذکر کیا ہے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ، اور نہ میں ایسا کروں گا۔ اس لیے اس بار سے میں آپ زحمت نہ اٹھائیں، لیکن مجھے بال و پر ہوتے تو پرواز کر کے اس حجرہ کی چھت پر بیٹھتا اور نکاتِ محبت کی ریزہ چینی کرتا اور دالہ اند گیت گاتا۔ اب اور کیا لکھوں۔ آپ کی طرف سے ہی ساری تاخیر اور رکاوٹ ہے۔ خدا را مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ تو بند نہ کیجئے۔ واضح رہے اگر یہ راستہ اس طرف سے بند ہوگا بھی تو ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا کھلا ہی رہے گا۔ اس قدر فقر میاں پھول کو نیا زمندی پہنچا دیجئے۔ انہی دو دنوں میں کسی بہانہ یہ رباعی ہو گئی تھی۔

رباعی

فیض دم پیری ست قدم دیدہ بہنہ      ہر گام کہ می نمی پسندیدہ بہنہ  
از عنیک شیشہ بیچ نکشاید بیچ      لختی تراش از دل و بردیدہ بہنہ

خدا کی عجب شان کہ آج وہ شیخ فیضی نہیں رہا۔ اب تو ان گزر جانے والوں کی صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں، وہ بھی کب تک، کیونکہ ہمارا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کہ کب کوچ کر جائیں۔

عنقریب است کہ از ما اثری باقی نیست  
شیشہ بشکستہ و می رنجتہ و ساقی نیست

**مولانا الہداد سلطان پوری** | سندھ میں وہ قریہ نبودہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم الملک کے شاگرد رہے۔ شرافت اور حسب و نسب میں نہایت ممتاز و سربر آوردہ ہیں۔ ابتداء میں علم کے غرور اور جوانی کی ترنگ میں نہایت متکبر تھے۔ لیکن اب جب کہ دنیا کا اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہے۔ ان کا وہ تکبر فقر و انکسار میں تبدیل ہو گیا ہے۔

کچھ عرصہ تک پنجاب کی صدارت کے عہدہ پر فائز رہے، اب کافی عرصہ سے الہ آباد کے نئے شہر کی قضاوت کے عہدہ پر مامور ہیں۔ لیکن بادشاہ کی خدمت ہی میں رہتے ہیں۔ ان کو الہ آباد میں جو معمولی سی معاش ملی ہے۔ اسی پر قناعت کرتی ہے دنیا والوں کے گھروں پر دوڑ و دوپ نہیں کرتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

**مولانا عثمان سامانہ** | عقلیات میں حکیم الملک کے شاگرد ہیں، نقلیات دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ مولانا بڑے مستعد آدمی ہیں۔ کیف و حال سے خالی نہیں، بڑے سمجھ دار اور نیک عالم ہیں۔ اکثر اوقات عبادت ہی میں صرف کرتے ہیں۔ دربار شاہی کے خدام میں شامل ہیں۔

چند سال تک وہ تلچ خاں کے وسیلہ سے دوآبہ میں پرگنوں کے انتظام و بندوبست پر بھی مامور کیے گئے تھے اب دربار میں بلا لیے گئے ہیں۔ اور منصب داروں میں داخل کر لیے گئے ہیں۔

**حاجی سلطان تھانیسری** | مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ علوم تقی میں بڑی مہارت پیدا کی ہے۔ عرصہ دراز تک شاہی خدایات پر مامور رہے۔ چار سال تک مہابھارت کے ترجمہ میں جو ”زندنامہ“ سے موسوم ہے۔ تنہا بڑی مستقل مزاجی سے مصروف رہے۔ اس کا آغاز نقیب خاں سے ہوا تھا۔ مکمل انہوں نے کیا۔

ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چنلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤ کشی کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بس بادشاہ نے ان کو جلا وطن کر کے بکر کی طرف خارج کر دیا۔ اس زمانہ میں صوبہ بکر کا نظم و نسق خان خاناں کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی مہربانی و التفات سے کام لیا۔ اور چلے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو ان کو اپنے ساتھ لیتے آیا اور معافی و رہائی دلانے کا وعدہ بھی کیا۔ وہ پوشیدہ طور پر وطن چلے گئے۔ اسیر اور برہان پور کی فتح کے بعد خان خاناں نے ان کی رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی۔ اور حاجی کا معاملہ اللہ نے سدھار دیا۔ شیخ ابوالفضل کو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو تھانیسرو کرناں کا کروڑی بنا دیا جائے، اب بھی وہ اسی خدمت پر مامور ہیں۔

جس زمانہ میں وہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے۔ کسی نے پوچھا یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ انہوں نے کہا ”دس ہزار سال پرانی خرافات کو مروجہ زبان کے پیکر میں اتار رہا ہوں۔“

**سید شاہ میر سامانہ** | صحیح النسب سید ہیں۔ فضائل علمی سے آراستہ اور تقویٰ و زہد سے پیراستہ نہایت متوکل و قانع عالم تھے۔ دریائے آگرہ کے اس پار طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ شیخ بہار الدین مفتی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بہت سے عالم اور صوفی جمع رہتے ہیں۔ اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک خادم مولانا فرید نامی کا نا ایک چشم تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی علم حاصل نہیں کیا تھا۔ لیکن اس سے کوئی بھی مشکل مسئلہ یا دقیق و گہری بحث کسی بھی بڑی سے بڑی کتاب میں سے دریافت کی جائے۔ تو وہ گھڑی بھر میں دوات و قلم لے کر اس مسئلہ کو تحریری صورت میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے وہ جو کچھ لکھتا تھا خود اسے پڑھ نہیں سکتا تھا یا زبان طوڑ پر اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ ضیاء اللہ باوجود اپنے سلسلہ غوثیہ کے اس کے معتقد تھے تو پھر سید مشار الیہ کا کیا ذکر۔ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ایک رات مشرق یا مغرب میں ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع سید شاہ کو دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی جن اس نے مسخر کر رکھا ہے۔ بعض کچھ اور کہتے تھے۔

جس سال بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ بلا کر عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا اور علماء و مشائخین کا کافی بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک رات خلوت میں شیخ سے فرید کا تب کے متعلق دریافت کیا۔ اور اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ شیخ نے پہلے تو اپنے مفردات مولفات اور فضائل و کمالات اور ذاتی حالات بیان کیے۔ پھر کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ جو ساری نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ ان سب کے باوجود میں شیخ فرید کی خوشہ چینی کے بھی لائق نہیں ہوں۔ اور جو کچھ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ عشر عشر بھی نہیں ہے۔ اس کا درجہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور یہ سب اس کو حضرت مشار الیہ کے آستانہ کی جا رب کشتی کی بدولت نصیب ہوا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے میں نے سید شاہ میر کو بدایوں میں جہاں وہ مدد معاش کے سلسلہ میں آئے تھے دیکھا تھا۔ کتاب "مشارق الانوار" سامنے رکھی ہوئی تھی اور علمی مذاکرہ گرم تھا۔ بلاشبہ وہ جدت پسند طبیعت اور ناقدانہ ذہن کے مالک تھے۔ لیکن جس قدر کہ شیخ ضیاء اللہ اور دوسرے آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں میں نے ان کو اس درجہ کا نہیں پایا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے غالباً انہوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز سے کسی کو محروم رکھا گیا ہو وہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔

**سید یاسین** | سید شاہ میر کے چچیرے بھائی ہیں۔ اکثر درسی کتابیں گجرات میں میاں وجیہ الدین سے پڑھی تھیں علوم رسمی کی تحصیل کے بعد میاں صاحب کے مرید ہو گئے اور حج کے لیے چلے گئے۔ وہاں حدیث کا علم حاصل کیا اور اجازت حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور میں امراء اور حکام کی صحبت میں رہے پھر انہوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے۔ اور درویشی کا لباس پہن کر سرہند میں بقیہ عمر گزار دی۔ اپنے چند قبل پوش خلائق کی



بردی اچھی تربیت کی وہ پیشوائی میں صاحبِ ادعا تھے۔

ہمیشہ گجرات اور پھر وہاں سے حرمین شریفین کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ سرہند میں بھی زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکے اور بنگالہ چلے گئے۔ اب وہیں سیر و سیاحت میں لگے ہوئے ہیں۔ نہ معلوم ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اور وہ کس زمین کا پیوند بننے والے ہیں۔

شیخ ضیاء اللہ | شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے۔ صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ان کے باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آخر کون سا داعیہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھے۔

پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے باپ کی مسند فقر و ارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

سنہ ۱۳۹۷ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں آگرہ گیا۔ اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا۔ کیوں کہ میرا یہ خیال ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیاوی تکلفات برتنے جائیں تو یہ حصول مقصد میں آڑ بن جاتے ہیں۔ شیخ کی محفل میں بھی تعظیم و تکریم کے مراسم کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ان کو میری یہ بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی۔ اہل محفل نے مجھ سے پوچھا ”آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“ میں نے کہا ”سہسوان سے“۔ پھر پوچھا ”تم نے کچھ پرہا لکھا بھی ہے؟“ میں نے جواب دیا ”عرصہ پہلے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے۔“

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس وقت وہاں ان کے باپ کا مرید تلچ چوگان بیگ جاگیردار تھا۔ اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزاء کرنے لگے۔ ایک مسخرہ کو اشارہ کیا کہ مجھے تنگ کر کے محفل سے اٹھا دے۔ میں مشائخوں کی ایسی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بار بار ایسے مواقع پیش آئے تھے۔ میں ان باتوں سے انجان بنا رہا۔

وہ مسخرہ ہزل کرنے لگا کہ ”کیسے عطر کی مہک آرہی ہے۔ جس سے میرا دماغ جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں تاکہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچنے پائے۔“ یہ کہتے ہوئے اپنے منہ سے کف نکالنے لگا۔ ان کے ایک صوفی نامہ صاحب نے مجھ سے پوچھا ”یہ عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟“ میں نے کہا ”ہاں“ لیکن بات کیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”یہ جو باؤلا شخص ہے۔ اس کو کسی وقت کتے نے کاٹ کھا یا تھا۔ جس وقت بھی وہ خوشبو سونگھ لیتا ہے کف منہ سے نکالنے لگتا ہے۔ اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ آپ بھی ذرا ہوشیار رہیے۔ یہ سن کر حاضرین پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے ڈرانے کے لیے دیدہ و دانستہ اس طرف کو ہٹ گئے۔ جدھر نئی عمارت

بن رہی تھی۔ اس طرح انہوں نے ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر میں نے کہا ”بھڑی حیرت ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ بڑی دور دور سے اپنی حاجتیں پوری کرانے آتے ہیں اور یہاں ایک سگ گزیدہ دیوانہ کا علاج نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے کہا ”کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟ میں نے کہا ”ہاں۔“ پوچھا ”وہ کیا علاج ہے؟“ میں نے کہا ”اس کے سر پر ڈھیلے اور جوتے مارے جائیں تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔“

”سگ دیوانہ را دار و کلوخ است“

(دیوانہ کتے کا علاج ڈھیلا ہے،

میری بات سن کر سب فق سے ہو کر رہ گئے۔ پھر میں نے کہا ”کلوخ (ڈھیلا) ایک بوٹی کا نام بھی ہے جو کتے کاٹنے کی موثر دوا ہے۔“ شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو کہا ”اؤ اللہ رسول کے ذکر میں مشغول ہو جائیں۔“ پھر انہوں نے کلام پاک کو کھولا اور سورہ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کر دی۔ اور طرح طرح کی لچھے دار باتیں بیان کرنے لگے۔ شیخ جو بھی الٹی سیدھی بکواس کرتے جاہل شاگرد اس پر آمنا و صداقتا کہہ اٹھتے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں نے قصداً ٹوک دیا۔ اور ان سے پوچھا ”یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں کسی اور تفسیر میں بھی ہے؟“ کہنے لگے ”میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں۔ ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے۔“ میں نے کہا ”اچھا تو پھر یہ بتائیے یہ مطلب حقیقی ہے یا مجازی؟ انہوں نے جواب دیا ”مجازی“ میں نے کہا ”ان دو حقیقی اور مجازی، مطلبوں میں کونسا علاقہ ہے؟“ اس طرح میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھالیا انہوں نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کیں اور ہر طرف دوڑ لگانے لگے۔ اور جب میں نے ان کو کس کر گھیرا۔ تو بس اکھڑ گئے۔ قرآن کو ٹپک کر کہنے لگے ”میں نے علم جدل نہیں پڑھا ہے۔“ میں نے کہا ”آپ قرآن کا ایک ایسا مطلب بیان کرتے ہیں جو کسی اور جگہ منقول نہیں ہے۔ لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی رابطہ و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔“ شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے۔ تو بات کو ادھر ادھر پھیر کر میرا حال احوال پوچھنے لگے۔ میں نے انہی دنوں قصیدہ بردہ کی شرح لکھی تھی۔ اس کا ایک باب میں نے شیخ کے سامنے رکھ دیا۔ اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلہ میں جو نکتے میرے ذہن میں آئے تھے، بیان کیے بڑی تعریف کی۔ اور خود بھی اس بارے میں چند نکات بتائے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تو یہ رنگ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی۔ جب کہ میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا۔ اور شیخ حسب طلب حیران پریشان تنہا عبادت خانہ شاہی میں آکر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ میرزا غیاث الدین علی اخوند مہرزا اخوند اور میرزا علی آصف خاں کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو۔ دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے۔ چنانچہ آصف خاں نے گفتگو شروع کی اور ”لوائج“ کی یہ رباعی پیش کی۔

گرد و دل تو گل گزرد و گل باشی در بیل بے قرار بیل باشی

تو جزئی و حق کل است اگر روزی چند اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ ”اللہ تعالیٰ کو کل کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ جب کہ وہ جز اور کل ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے۔ شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے ان کا سارا غرور و پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے۔ نہایت عاجز و شرمندہ تھے۔ اس لیے انہوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے جسارت کر کے کہا مولوی جامی نے اگرچہ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ پر ”کل“ ہونے ہی کا اطلاق کیا ہے۔ لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے۔

ایں عشق کہ بہت جزر لاینفک ما حاشا کہ شود بہ عقل مادرک ما

خوش آنکہ دمد پر توی از نور یقین مارا بر ماند از ظلام شک ما

لیکن اس کل ہونے اور جز ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل دہمہ دوست، سب کچھ وہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے۔ اصل میں اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے اس کی تعبیر کبھی کل سے اور کبھی جز سے کی جاتی ہے۔ پھر میں نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور چند مسائل جن پر میں نے ان دنوں عبور حاصل کیا تھا شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے اور شیخ بھی۔

انہی دنوں شیخ کے موتیلے بھائی شیخ اسمعیل نے جو فتح پور کے محلہ خواجہ جہاں میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتا تھا اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات تھی اس نے عبادت خانہ میں تخلیہ کرا کے میری اس ملاقات کو یاد دلایا جو گیارہ سال پہلے شیخ سے ہوئی تھی۔ اور جس کا ذکر اس نے میری زبانی سن لیا تھا۔ یہ سن کر شیخ حیران رہ گئے اور کہا ”مجھے یاد نہیں کہ ایسا کبھی ہوا ہوگا۔“

شیخ اب آگرہ میں اپنے باپ کی طرح مشائخانہ وضع میں عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں۔ ان کی محفلوں میں مذہبی دکانداری کا رنگ ہے۔ اپنی پرانی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی عام فریب سادہ لوحی کے بڑے قصے مشہور ہیں۔ جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

میر ابو الغیث بخاری کہا کرتے تھے وہ جیسا کچھ بھی ہو ہوا کرے۔ لیکن وہ درویشانہ لباس، فقیرانہ مجلس اور تصوف کی باتیں کرنے کا (اس زمانہ میں) استہمام کرتا ہے۔ اور اپنی روش پر استقامت سے قائم ہے۔ بس اس کی ان اداؤں پر ہم دل و جان سے معتقد ہیں۔

جس سال کہ خان زماں کی ہم فتح ہوئی تھی۔ وہ لشکر کے ہمراہ انبیٹھی گئے تھے۔ وہاں حضرت میاں شیخ نظام الدین سے ملاقات کی وہ آیت کریمہ۔ ”وسيقول فيهما كاء ساكان مزاجهما نخبيل عينا فيهما تسمى سلسبيل“ کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ نے اپنی حیثیت ظاہر کی اور مداخلت کر کے کہا ”اس آیت میں اور ایک دوسری آیت میں تناقض ہے۔“

حضرت نے فرمایا ”سبحان اللہ باپ تو وہاں (عالم بالا) میں غوطے کھا رہا ہے۔ شفاعت کامل کا محتاج ہے۔ اور بیٹا یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض ثابت کر رہا ہے۔“ ع

”درسی نبود ہر آنچہ در سینہ بود“

**میرالو الغیث بخاری** | یہ بڑے پاک مشرب، عالی ہمت بزرگ تھے۔ ان کے اخلاق فرشتوں کے اخلاق تھے۔ غنا، کے پردہ میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انہوں نے بہت سے علماء و مشائخین سے استفادہ کیا تھا۔ سخاوت و بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدق معاملت اور میل ملاپ میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور مونیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کیا کرتے تھے۔ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ مرض موت میں بھی باوجود سخت بیماری کے تکبیر تحریمہ بھی ان سے فوت ہونے نہ پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ رسول کے ذکر اور بزرگوں کی باتوں سے خالی نہیں رہی۔ ان کی تاریخ وفات ”میرستودہ سیر“ ہے۔

**میاں کمال الدین حسین شیرازی** | اجاب کے تذکرے نے میرے دل کو کھول دیا ہے۔ ان کے ذکر میں اگر طوالت ہو تو عزیز قارئین تنگ دل نہ ہوں۔

میاں کمال الدین حسین مولانا حسن شیرازی کے لڑکے ہیں۔ جس وقت شاہ اسماعیل نے خروج کیا تھا وہ (مولانا حسن) شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ پھر وہاں سے گجرات پہنچے اور سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں سید رفیع الدین محدث اور میاں ابوالفتح خراسانی (جو میاں بدہ کے والد ہوئے ہیں) کے قافلہ کے ساتھ آگرہ آئے۔ اور اس جگہ بس گئے۔

شیخ زین الدین خوانی مشہور شاعر نے مولانا حسن کی شان میں کہا ہے ع  
ہست شعر من ز عقل و نقل خواہم بشنود  
جامع المعقول و المنقول مولانا حسن

مولانا حسن کے صاحب زادے میاں کمال الدین حسین نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا ذکر تحریر و تقریر سے بالا ہے۔ اکبران کی بزرگی اور بڑائی کے پیش نظر اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ بادشاہی ملازمت میں رہیں۔ لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور دنیاوی اعزازات سے منہ پھیر کر مختصر سی مدد معاش کی اراضی پر قناعت کر لی۔ فقر و ایمان کو اپنا سرمایہ بنالیا۔ وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں مصروف رہتے تھے۔ اور بڑے اطمینان و بے فکری کے ساتھ کبھی دہلی میں اور کبھی آگرہ میں رہا کرتے تھے۔

لڑکپن سے بڑھاپے تک عبادت، ذکر الہی، تلاوت کلام پاک، برابراں کا معمول رہا، کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ ان فضائل و کمالات کے علاوہ علمی استعداد بھی بہت اونچی تھی۔ شاعری، خوش خطی، حسن املار اور انشاء پرہیزی تو ان کی موروثی فضیلت تھی ہی۔

میں ابتدائی عمر میں بیرم خاں کے عہد میں آگرہ آیا تھا۔ میرا سب سے پہلا قیام مسجد فیض بخش میں انہی کے مکان پر رہا تھا۔ اس دوران میں میں نے ان کے آستانہ سے بڑی سعادتیں حاصل کیں۔ اس وقت سے اب تک کہ میں یہ سطرین لکھ رہا ہوں پورے چالیس سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انہوں نے تعارف و آشنائی کی ہمیشہ رعایت برتی۔ اور میرے ساتھ برابر ہربانی اور دل سوزی سے پیش آتے رہے۔ ان کی اتنی مہربانیاں ہیں کہ اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

بس عشق کہ آں کم شد و بس حسن کہ آں کاست  
عشق من و حسن تو ہماں بلکہ فزوں ہم

انہوں نے مجھے لکھا تھا۔

”ان دنوں جب کہ بندوں کی خدائی کا دور دورہ ہے محبت و دوستی اٹھ چکی ہے۔ میں تہائی اور جدائی کے فم میں مضطرب و بے چین رہا۔ بے قراری میں کبھی دہلی چلا جاتا۔ اور وہاں کے متبرک مزاروں کی زیارت میں لگا رہتا۔ کبھی اپنے بے سہارا بچوں کو دیکھنے کے لیے آگرہ چلا آتا۔ اسی افراتفری میں تھا کہ تمہارے متعدد خط یکے بعد دیگرے پہنچے۔ خدا گواہ ہے کہ تمہارے خطوط سے بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوئی۔ چند دن تک ان خطوط کو بار بار پڑھتا رہا۔ اور صبح و شام تمہارے لیے دعائیں کیں۔ ع۔  
الہی تا قیامت زندہ باشی

مکرم و محترم میرزا نظام الدین احمد کی رحلت کی خبر سن کر نہایت ملال اور رنج ہوا۔ ”انا لله وانا الیہ راجعون“ مرحوم خوبوں کا مجموعہ اور نادرہ روزگار تھے۔ بس کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ جو صدے مسلسل اور متواتر پہنچ رہے ہیں ان کا ذکر ہم آخر کس سے کریں۔ اب ہم اپنی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں۔ ہمیشہ یہ دعا ورد زبان ہے:-

”اللہم ارحمنا اذا عاق الجبین وکثر الالین وکیس منا الطیب وکی علینا الجیب اللہم ارحمنا اذا ادا سنا التراب ووعنا الاحباب وفاق النعیم و انقطع عنا النیم“ امید ہے کہ آخرت اچھی ہو بائگی اور دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے۔ خط کی روانگی میں عجلت تھی۔ اس لیے میں نے رات بڑی جلدی میں یہ چند سطرین لکھی ہیں۔ تمہارے ساتھ جو دلی اشتیاق ہے وہ بہر حال حد بیان سے باہر ہے۔ بس اس کو تم اپنے دل ہی سے محسوس کر سکتے ہو۔ الفاظ سے اسے محسوس نہیں کرایا جاسکتا۔“

شیخ ابوالفتح تھانیسری | اپنے زمانہ کے بڑے متبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا تھا۔ میر صاحب ہی کے محلہ میں آگرہ میں تقریباً پچاس سال تک عقلی و نقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس سے بڑے ذہین صاحب علم اٹھے ہیں۔ میں اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہے۔



ان کا لڑکا شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدہ پر متعین ہے۔

### مولانا عثمان بنگالی

پرانے بزرگوں میں سے تھے۔ سنبھل میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ کبھی کبھی وہ مولانا عثمان کی خدمت میں جا کر ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔

میں بھی لڑکپن میں میاں مرحوم کے ساتھ مولانا مذکور کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت اندوز ہوا تھا۔ بڑے خدا ترس بزرگ تھے۔

### شیخ حسین بڑہری

بڑے درجہ کے عالم تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندوستان میں جو علوم نقلی مروج و مشہور ہیں ان میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ وہ سب سے ممتاز و سربراہان تھے ساتھ ہی نہایت بااخلاق آدمی تھے۔ علم و اخلاق کے سارے محاسن ان کی شخصیت میں جمع تھے۔

### مولانا اسماعیل عرب

شیخ حسین کے ہم عصر اور ان کے برابر کے عالم تھے۔ خاص طور سے علم ہیئت، حکمت اور طب میں تو ان کی کوئی نظیر نہیں تھا۔ شیخ حسین کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے فیوض سے طالب علم پوری طرح استفادہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا کافی مال دار آدمی تھے۔ شہر کے بعض شریہ لوگوں کے اشارہ پر چوروں نے ان کے گھر میں ڈاکہ ڈالا۔ اور انہیں شہید کر دیا۔

علم کے اونچے مدارج پر ان کا مقام تھا۔ قضاوت کے عہدہ میں بڑی دیانتداری اور نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ علوم کی تحصیل اور اخلاق تربیت میاں شیخ نظام الدین انبیشی وال کی خدمت میں حاصل کی تھی۔ میاں صاحب نے انہیں اپنی خاص نگرانی میں رکھ کر تربیت دی تھی۔

جب کبھی قاضی مبارک میاں صاحب سے کہتے کہ اگر مسلک ولایت میں سے بھی کچھ برکتیں مجھے عنایت ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ میاں صاحب ان کو جواب دیتے "قاضی مبارک! تجھے تو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی۔"

قاضی مبارک آخر عمر تک بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بسر کرتے رہے اور دنیا سے محترم و معزز ہی اٹھے۔ قاضی مبارک سے استفادہ کے لیے دور دراز سے لوگ گویا مٹو آتے تھے۔ بہت سوں نے تو اسی جگہ اپنا وطن بنالیا تھا۔ اور ان کے فیض سے درجہ کمال تک پہنچے تھے۔ ان کے دامن تربیت سے فیض یاب ہونے والوں میں مخدوم بدہ بھی ہیں۔ جو اکثر دسی کتابوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے معلم سیدھی بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کا یہ قافلہ اپنے ٹھکانے پہنچ چکا ہے۔ اب ان کا کوئی قائم مقام نہیں رہا۔

علم کا میدان تو اب روز بروز شیروں سے خال ہوتا جا رہا ہے۔ اور ان کی جگہ روہاہ صفت لوگوں نے لے لی ہے۔

”مشارق الانوار کے مصنف نے بھی یہ فریاد اپنے زمانہ میں کی تھی کہ ————— ”لولا تخی الغاب عن دسامہ  
ذی الشبلین لما صبح بما ثقلۃ ابوالحسین“ —————

ہمیں ناقدہ مانند مسکین حسن را  
انراں روز ترسم کہ این ہم مانند

**مولانا ویس گوالیاری** | بڑے دانشور اور مناظرہ و مجادلہ کرنے والے عالم تھے۔ اصول و فرع کے مباحث میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ حافظہ کا یہ عالم کہ بحث مباحثہ کے وقت جب کسی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو کتاب کے صفحوں کے صفحے زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کہتے یہ عبارت فلاں کتاب میں ہے کہوں کر دیکھ لو۔ اس کے بعد ویس وہ اپنے حریف کے سر ہو جاتے اور اسے الزامات کی زد پر رکھ لیتے۔ لیکن اکثر ایسا ہوا کہ جب کتابوں میں حوالے کی جستجو کی گئی تو وہ عبارت کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح انہوں نے ایک دن بادشاہ کے سامنے مولانا ایاس مخم کو بھی جو ہالیوں بادشاہ کے استاد اور رصد و نجوم کے ماہر تھے۔ الزام دے دے کر زچ کر دیا مولانا ایاس کو اس کا ایسا رنج ہوا کہ سرکار لکھنؤ میں پرگنہ مویاں ان کی جاگیر میں تھا اس جاگیر کو چھوڑ دیا۔ سپاہ گری پر دو حرف بھیجے۔ اور کوچ پر کوچ کر کے گجرات چلے گئے۔ اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔

جب وہ عراق، آذربائیجان، اردبیل کی ولایت میں پہنچے جہاں ان کا وطن بھی تھا تو شاہ اسماعیل ثانی کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو بہت مشہور ہے۔ مولانا ایاس جب اردبیل پہنچے تو اس وقت شاہ طہماسپ نے شاہ اسماعیل کو قلعہ قمقمہ میں قید کر رکھا تھا۔ مولانا نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا کہ سیاروں کے حساب سے مجھے اس کا علم ہوا ہے کہ تمہیں فلاں مہینے رہائی مل جائے گی۔ اور اس چاہ ندرامت سے نکل کر مندر عزت پر قدم رکھو گے۔ اور تخت سلطنت پر جلوس کرو گے۔ جیسا کہ انہوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ طہماسپ کو زہر دے دیا گیا۔ اور عراق میں بروز انقلاب رونما ہو گیا۔ امیروں اور وزیروں نے شاہ اسماعیل کو قید خانہ سے نکال کر اردبیل کے راستہ تخت نشینی کے لیے لے کر گئے۔ مولوی ایاس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب تم قمقمہ سے اردبیل پہنچو مجھ سے لازم ملنا۔ تاکہ بالمشافہ بعض ضروری امور طے کر لیے جائیں اور اسمائے عظمیہ کا عمل رو برو انجام دیا جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شاہ اسماعیل کو وہاں سے عجلت میں گزرتا پڑا۔ اور وہ مولوی موصوف کے گھر پر نہ جاسکا۔ اردبیل سے روانہ ہونے کے بعد وہ لوٹ کر آیا اور مولوی ایاس سے ملنا چاہا۔ لیکن انہوں نے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بادشاہ نے مجبوراً دروازہ توڑ دیا اور زبردستی ان کے حجرہ میں گھس کر ملاقات کی۔ بادشاہ کے آنے پر انہوں نے اپنا چہرہ چھپایا اور دیوار کی طرف رخ کر کے کہا وہ مقررہ گھڑی گزر گئی اور تو نہیں آیا۔ اب میں تیرا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ شاہ اسماعیل مایوس لوٹ آیا۔ اگرچہ سلطنت اس کی جم جاگئی۔ لیکن ایک ہی سال بعد امیروں نے متفق ہو کر اس کی بہن پری جان خانم کو اس کے قتل پر مامور کیا۔ اسے بھی اس کا پتہ چل گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سدباب کرتا۔ پری جان خانم نے اس کو بے ہوش کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

**شیخ محمد شامی** | نسلا عرب ہیں اور شیعوں کے بڑے مجتہد شیخ زین الدین جبل عاملی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ شیخ زین الدین کو خلیفہ روم نے بڑے حیلہ و تدبیر سے مکہ معظمہ میں گرفتار کر کے استنبول بلوایا اور قتل کر دیا تھا۔

شیخ محمد منصب داروں میں شامل ہیں۔ بہادر اور شجاع آدمی ہیں۔ عربوں کی روایتی سخاوت بھی ان میں موجود ہے۔ نہایت متواضع اور بااخلاق بزرگ ہیں۔ عربی اور ادبی علوم میں ان کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کو ہو۔

مصنف نے شیخ محمد کے عربی میں پانچ خط نقل کیے ہیں جن کی عبارت اکثر جگہ غلط ہے۔ پیش نظر نسخہ کے مرتبین نے بھی یہی لکھا ہے کہ منتخب التواریخ کے متعدد نسخوں کو دیکھنے کے باوجود ان خطوط کی عبارت درست نہیں ہو سکی۔ یہ خط مصنف ہذا ملا عبدالقادر بدایونی کے موصومہ ہیں۔ بلاخط ملا صاحب کے جواب میں ہے دوسرا چند دن کی جدائی کے بعد شیخ صاحب نے لکھا تھا تیسرا رقعہ اس وقت لکھا جب کہ لشکر شاہ میں دکن گیا تھا پھر وہاں سے چھاؤنی اکٹھی تھی۔ چوتھا رقعہ شکایت و کتاب پر مشتمل ہے۔ پانچواں لشکر کے کوچ کے موقع پر۔ ان رقعوں میں رسمی دوستانہ باتیں ہیں اور بس دم۔

**شیخ حسن علی مصلی** | یہ شاہ فتح اللہ کے شاگرد رشید ہیں لیکن نہایت مخلص سنی۔ جس سال کابل فتح ہوا یہ شاہی ملازمت پر داخل ہوئے تھے۔ انہیں بڑے شہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیا گیا۔ وہ شاہزادہ کو فارسی کے رسالے اور علم حکمت کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک شیخ ابوالفضل نے بھی خفیہ طور پر ان سے ریاضی اور طبیعیات اور حکمت کے فنون کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم کے نکات و رموز سیکھے۔ اس حق استاد کی باوجود وہ کبھی ان کی تعظیم نہیں کرتا تھا۔ خود تو اوپر بیٹھتا تھا اور استاد زمین پر۔ اس جیسے لوگوں کے طور طریق ان کو ایک آنکھ نہ بھلتے تھے چنانچہ وہ ایسے بیزار ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک مرزا نظام الدین احمد کی صحبت میں رہے۔ مرزا نے اور ان کے لڑکے محمد شریف نے عقلی علوم میں ان سے استفادہ کیا اور بڑی دسترس و کمال حاصل کر لیا۔

شاہ فتح اللہ کے انتقال پر ابوالفضل اور دوسرے مصاحبوں نے دربار میں شیخ حسن علی کے علم و فضل کا ذکر کر کے بادشاہ کو بخوبی سمجھا دیا کہ آج شاہ فتح اللہ کے جانشین صرف وہی ہیں چنانچہ ان کے بلانے کے لیے شاہی فرمان جاری کیا گیا اور وہ حسب الطلب لاہور آئے۔ کورنش کے موقع پر نظام الدین احمد نے ان کو زبردستی مجبور کر لیا۔ اس بات کا انہیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ماں سے ملنے کا بہانہ کر کے وطن جانے کی رخصت حاصل کر لیں اور شہرہ میں خان خانان کے دور حکومت میں سہسہ پنچے اور خدا کے بھروسہ پر اپنے ملک کی سمت چل پڑے۔ جب ہرموز پنچے تو وہاں سے اکبر کے درباریوں کو پیام بھیجا۔

”الحمد للہ میں نے منافق دوستوں سے چھٹکارا پایا۔ انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا۔“

**قاضی نور اللہ شستری** | مذہباً یہ شیعہ تھے اور نہایت منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیا دار متقی تھے۔ شرفار کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ علم و فن، جدت طبع، تیزی فہم، ذہانت و ذکاوت تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔

ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں۔ شیخ فیضی کی مثل بے نقط تفسیر پر انہوں نے سرنامہ و توفیق لکھا جو حد تعریف

سے ماوراء ہے۔ شعر گوئی کا طبعی ملک ہے نہایت دلکش اشعار کہتے ہیں۔ حکیم ابوالفتح کے توسط سے بادشاہ کی بارگاہ میں رسائی ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں شاہی لشکر لاہور پہنچا تھا تو شیخ معین قاضی لاہور حاضری کے لیے آئے۔ بڑھاپے کے ضعف اور اعصابی کمزوری کی وجہ سے دربار میں بے ہوش ہو گئے۔ بادشاہ کو ان کے بڑھاپے پر بڑا ترس آیا اور فرمایا ”شیخ اب کام کے قابل نہیں رہے۔ اس لیے ان کی جگہ قاضی نور اللہ کو مقرر کر دیا جائے۔“

انہوں نے لاہور کے شریک مفتیوں اور مکار محاسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، سیدھا کر کے رکھ دیا۔ اور رشوت کے دروازے بخوبی بند کر دیئے۔ اور ان پر کڑی نگرانی رکھی کہ اس سے بڑھ کر ان کا انتظام نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کے متعلق بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ

توئی آں کس کہ نگر دی ہمہ عمر قبول  
در قضا ہیچ ز کس جز کہ شہادت نہ گواہ

ایک مرتبہ شیخ فیضی کے مکان پر محفل جمی ہوئی تھی اور قاضی موصوف تفسیر نیشاپوری سامنے رکھے آیت کریمہ۔ ”اذ یقول اصحابہ لا تحزن ان اللہ معنا“ جس کے متعلق تمام مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے، کے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ ”اگر یہاں صحبت لغوی مراد ہے تو یہ کوئی مدح کی بات نہیں اور اگر اصطلاحی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مسلک ہے تو ہم کو یہ تسلیم نہیں۔“ میں نے کہا ”اگر ایک بچہ سے بھی جو عربی زبان جانتا ہو پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ یہ آیت مدح پر صریحاً دلالت کرتی ہے۔ ذم کا کوئی پہلو نہیں۔ اسی طرح کوئی کافر حبشی یہودی ہندی جو عربی زبان جانتا ہو یہی کہے گا۔“

غرض قاضی سے اس موضوع پر بڑی گراں گرم بحث رہی۔ اور شیخ فیضی نے اپنی عادت کے مطابق قاضی کا ساتھ دیا۔ حالانکہ وہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے دونوں جانب سے بے تعلق سا تھا۔ اتفاق کی بات کہ نیشاپوری کی تفسیر سے بھی میری تائید ہو گئی بلکہ یہ اضافہ بھی تھا کہ ”اگر اس وقت حضور اکرمؐ داعی حق سے جا ملنے تو ان کے وصایا کے لیے صدیق اکبرؓ ہی نمائندہ ہوتے کوئی اور نہیں۔“

اگرہ میں زہد و تقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ علوم دینی خاص طور پر درس حدیث حاجی ابراہیم محدث | ان کا مشغلہ تھا۔ شریعت کی پابندی پر سختی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کیوں کہ وہ امر معروف اور نہی عن المنکر سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔

جب حسب طلب عبادت خانہ شاہی میں آئے تو شاہی مراسم اور تکلفات کی پابندی نہیں کی اور بے خوف و غلط ونصیحت کرنے لگے۔ خواجہ عبدالصمد شیرازی جو قدیم آراکشی سامان کراہیہ پر چلانے کی وجہ سے خواجہ عبداللہ کے نام سے مشہور تھے اور نماز روزہ اور عبادتوں میں بہت مشغول رہتے تھے حاجی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے ”خواجہ جب تک دل میں خلفائے راشدین کی محبت نہ ہو یہ نماز روزہ کچھ فائدہ نہیں دیتا۔“

**شیخ جلال و اصل کا پی والے** | یہ شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں۔ پہلے جو علوم حاصل کیے تھے بعد میں وہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ سماع و جد و حال ہی کا ذوق اور مشغلہ تھا۔ بادشاہ سلامت کو ان کے بارے میں بڑا احسن ظن تھا۔

شیخ غوث کے خلفاء میں شیخ سلیم کے خلفاء کی نسبت تصنع اور بناوٹ بہت کم تھی۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے۔ بعد میں چل کر تو وہی معاملہ پیش آیا کہ جب حضرت علیؑ کے سلمے آیت کریمہ "وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتْ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتْ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ" پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا صدقنا والحمد لله کہ اب ان دونوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

**ملک محمود پیارو** | عربی علوم تفسیر حدیث اور فارسی نظم و نثر کے اچھے عالم تھے۔ نہایت صالح مزاج اور ذوق و حال سے مناسبت رکھتے تھے۔ نسلان و سلاطین گجرات کے خاندان سے ہیں۔ والد کا نام ملک پیارو تھا۔

ملک محمود نہایت فصیح زبان دانشور اور مدبر تھے۔ چنانچہ بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انہیں شرف حاصل تھا۔ او بیار اللہ سے بڑا اعتقاد تھا۔ اس لیے اکبر نے انہیں چند روز کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے روضہ مبارک کا متولی بنادیا تھا۔

ملک محمود کو مخدوم جانیان بخاری کے جانشین مخدوم شاہ عالم بخاری سے ایسی عقیدت ہو گئی کہ انہوں نے بادشاہ سے اس درگاہ کی مجاورت کی درخواست کی جو بڑے پس و پیش اور رد و بدل کے بعد قبول کر لی گئی اور وہ احمد آباد جا کر اس آستانہ کے مجاور بن بیٹھے۔ توکل و قناعت کا گوشہ اختیار کر لیا اور اسی مجاورت میں انتقال ہوا۔

میں نے اجمیر اور فتح پور دونوں جگہ ان سے ملاقات کی تھی۔

شعر سے بھی ان کو بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ یہ مطلع انہی کا ہے۔

دارم ولی گرداں کہ من قبلہ نما سے خوانمش

رو سوئے ابرویش کند ہر چندے گردانمش

**صدر جہاں پہانی** | پہانی قنوج کا ایک ماتحت گاؤں ہے۔ صدر جہاں سید اور خوش مزاج عالم ہیں۔ انکی ساری عمر شکر ہی میں گزری۔ علوم و کمالات شیخ عبدالنبی سے حاصل کیے۔ اور شیخ موصوف ہی کی سعی و کوشش سے اتنے سال ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔

جب ہندوستان کے ائمہ پر زوال آیا تو انہوں نے اپنی خدمات زمانہ سازی اور دنیا داری کی بدولت بہت جلد اپنی عزت و احترام کو بجا ل کر لیا۔

جب وہ حکیم بہام کے ساتھ حاکم توران کے پاس سفارت پر گئے۔ پھر وہاں سے واپس آئے تو ان کو صدارت کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔



جن دنوں لاہور میں بچے کچھے علماء کو مکہ معظمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی، ایک دن صدر جہاں کہنے لگے ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس فہرست میں میرا بھی نام درج نہ کر دیا گیا ہو“ میرزا نظام الدین احمد جنہوں نے وہ فہرست مرتب کی تھی کہا ”تم کو بادشاہ کیوں بھیجنے لگے؟“ صدر جہاں نے کہا ”آخر کیوں نہیں۔“ میرزا نے جواب دیا ”تمہاری زبان سے کبھی کلمہ حق نکلا نہیں جو اخراج کا سبب بنتا۔“

طبیعت شاعرانہ ہے اور شعر و سخن سے بڑی اچھی مناسبت ہے۔ لیکن وہ شعر گوئی سے تائب ہی ہیں۔ یہ مطلع ان ہی کا ہے۔

ہر تار زلف یارِ خدا یا بلا شود  
وانگہ ہر بلا دلِ ما مبتلا شود

جس طرح شعر گوئی سے توبہ کرنی ہے توقع ہے بے مزہ بحثوں، ریاکاری، خود نمائی، خود پسندی اور بے ہودہ کوئی لاف و گزاف سے بھی توبہ کی توفیق ان کو نصیب ہو جائے گی۔

**شیخ یعقوب کشمیری** صوفی تخلص کرتے تھے۔ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔ شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ شیخ ابن حجر سے درس حدیث کی سند ملتی تھی۔ درویشی کے لباس میں بڑے سفر کیے اور بڑی دنیا دیکھی۔ اور عرب و عجم کے اکثر شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ ہندوستان اور کشمیر میں ان کے مرید بکثرت ہیں۔

شیخ یعقوب بڑی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنا ”خمسہ“ پورا کر لیا ہے۔ متعدد درسا لے فن معمار پر لکھے ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں رباعیات کہی ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ انہیں صوفیاء کی حالت و ذوق سے مناسبت ضرور ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ تمام عربی علوم تفسیر حدیث اور تصوف میں قابل اعتماد مستند عالم ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ تفسیر لکھ رہے تھے۔ جو ان کے کمال علم و فضل کا واضح ثبوت ہے۔

ہمایوں بادشاہ اور خود شہنشاہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو اور مصاحبت کا اعزاز حاصل تھا۔ بادشاہ کے منظور نظر اور بڑے مکرم و محترم تھے۔ طبعاً نہایت فیاض اور اثار پیشہ تھے۔

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ یہ چند شعر ان کے ہیں۔

در ہر چہ بمنیم آن رخ نیکوست جلوه گر      در صد ہزار آئینہ بیکر دست جلوه گر  
خلقے ہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دست      دیں طرفہ ترکہ دوست بہر دست جلوه گر

خالت از مکر براں گوشہ ابرو بہ نشست  
ہر کجا گوشہ نشینی است درد مری ہست

مشکن ائی غم دل مارا و میں کاں دل کیست  
دل ماہست ولی ہیں کہ در و منزل کیست

گر بکوشش گزری پائی نہ سر باید کرد  
قصہ کوتہ نہ سرخوش گزر باید کرد

اسم شیدا پر یہ معما انہی کا ہے

ماہ من از رخ نقاب انداختہ  
وہ کہ عمدہ روز را شب ساختہ

جس زمانہ میں لاہور سے اپنے وطن جانے کی ان کو اجازت ملی تھی، انہوں نے راوی کے اس پار سے یہ خط میرے نام لکھا تھا:-

”قادری! مخلصانہ دعا و نیاز

سفر کے وقت مشابعت سنت ہے۔ آپ جیسے مخلص حقیقی سے یہ سنت محض مجبوریوں کی وجہ سے ہی ترک ہوئی ہوگی۔ امید ہے جناب فراموش نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو مسودات کے لیے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مطلع فرمائیے۔ تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیر کے مسودات بھیج دوں۔ اگر آپ کاغذ کو دھو دیں تو اس کی تحریر اس طرح اڑ جاتی ہے کہ سیاہی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ آپ نے بھی تجربہ کیا ہوگا۔ والسلام“

جب وہ کشمیر گئے تو ایک اور رقعہ وہاں سے بھیجا جو بس آخری خط تھا۔  
مولانا شیخ عبدالقادر کے نام

قطعہ

ازدوانی بد اوئی بیشک در فنون فضیلت است فزوں  
پس دیل زیادت معنیش کہ بنائش بصورت مست فزوں

”آپ کے خطوط وصول ہوئے، کوتاہی لیاقت کی وجہ سے ان کے جواب میں قلم قاصر تھا لیکن خلوص و بندگی کے جذبات بے اختیار زبان قلم پر آ گئے۔ امید ہے کہ جس وقت آپ نواب فیاض کے خن خانہ میں دوپہر کے وقت کشمیر کی ہواؤں سے زیادہ سرد چٹائی پر بیٹھے برفاب کے گھونٹ مرے مزے سے لیتے ہوئے دلچسپ گفتگو میں مشغول ہوں گے، ہم اسیران غم محروموں کو بھی ضرور یاد کریں گے۔

اے بزم وصل حاضر غائبان را دستگیر  
ز انکہ دست حاضران از غائبان کوتاہ نیست

شیخ محی الدین محمد آپ کی خدمت میں نیاز مندی عرض کرتا ہے قبول فرمائیے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میرا سید قطب الدین نے میرے نیاز نامہ کا جواب نہیں دینا چاہا۔ اور غالباً آپ حق ہمسائیگی کی وجہ سے اس بات کا یقین کر لیں گے۔ لیکن حق بات کہیں کہ یہ حق اس حق پر ترجیح رکھتا ہے یا نہیں؟ آپ جناب میرا کے اظہار محبت و دوستی پر قطعاً بھروسہ نہ کریں کیوں کہ وہ پائدار نہیں ہے۔

”اظہار مضمر“ پر جدید آصف خانی طرز پر میں نے وہاں جو اشعار کہے تھے۔ ان کا مسودہ میرے پاس سے گم ہو گیا ہے۔ غالباً آپ نے اس مسودہ کی ایک نقل کر لی تھی، براہ کرم اپنے نسخہ میں سے اس کی نقل بھیج دیجئے۔“

جواب :-

”آپ کی تعریف کیا کروں۔ کیوں کہ عبدالقادر کے الفاظ کوزہ ہیں اور آپ کی تعریف سمندر۔ آپ کے لیے دعا کیا کروں۔“

بسوئے سدرہ زمن مرغ طاعتی نہ پرد

کہ نامہ نبرد از دعوات در منقار

ایسے شوق و اشتیاق کا کیسے اظہار کروں۔

یا من بایا دل یدہ طوقنی من صحتہ الزماں قد عوقنی

الا قدر ان لکتاب شوقی کم ما اشوقنی ایک ما اشوقنی

اس وقت سے جب سے کہ آپ اس طرف گئے ہیں نوروز سے پہلے اور اس کے چند دن بعد آپ کے دو خط پہنچے۔

مردی دراز نیکو در شہر خویش امروز

با خواستہ نشستہ از نجات خویش فیروز

جن میں سے ایک خط میں لکھا ہوا تھا کہ

از دوانی بد اوئی بیشک

اس کے جواب میں عرض ہے۔ (مثنوی)

اے زبانت کلید نامہ غیب دل پاکت نتیجہ لاریب

دادہ اعجاز کلمہ تو بیرون گنجائے نہاں کن فیکون

گفتی از منطق گھر پرورد کز دوانی بد اوئی خوشتر

گر دوانی و گر بد اوئینند ہمہ از گنج فضل تو غنیمند

دلم آئینہ جمال تو شد منظر فیض لایزال تو شد

چہ عجب گرز روئے حق بینی خوشن را در وہی بینی  
اگر خود نہائی کا تقاضا ہے تو بس اتنا ہی کافی ہے۔ ورنہ پھیکا پھیکا جواب لکھنے سے فائدہ۔ لیکن مخلصانہ  
خطوط کے لکھنے میں کوتاہی خواص کا طریقہ نہیں۔ اس لیے معذرت خواہی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس رقعہ  
کو سابقہ جرموں کا کفارہ تصور فرمائیے اور وہ جو آپ نے ہوائی خس خانہ اور برقاب کے متعلق لکھا ہے  
از عمر برف ست و آفتاب تموز

کافی دن ہوئے کہ میں اس ٹھنڈی آب و ہوا سے محروم ہی ہو گیا ہوں۔  
گرگ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ

والا مضمون ہے۔

بادشاہ سلامت نے اجیر کی تویت کے سلسلہ میں میرا نام لیا تھا لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ہوئی۔  
میری انتہائی آرزو ہے کہ یہ معاملہ جلد طے پا جائے تاکہ مجھے ملک ملک کی آب و ہوا سے نجات ملے اور  
دل کو یقین کی ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس دنیا کا خس خانہ تو بس برف کی طرح گھل جانے والا ہے۔

اے عجب دستان گرفت و نشد جانستان ملول

نریں ہوا ہائے عفن زریں آب ہائے ناگوار

آپ بھی اس معاملہ میں ممکنہ سعی فرمائیے۔ انشاء اللہ اجیر جانے کے بعد اجیر اور کشمیر کو ہم قافیہ سمجھتے  
ہوئے "جبالہ" کا پانی پیوں گا۔ جس طرح آپ وہاں "برفتن" کا پانی نوش جاں فرماتے ہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ ستندھ ہے۔ بندہ زادہ بداؤں چلا گیا ہے اور دعائیں مشغول ہے۔

یہ غزل بھی شیخ یعقوب کشمیری کی ہے۔ جو انہوں نے کسی سفر میں لکھ کر میرے پاس بھیجی تھی۔

درد می کیں نامہ میگردم رفتن کان یجری الدمع لزواج ابد

ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شدی کار یجوا معنی ذرک الرقم

محو حرف اشتیاق از لوح دل بیس نی وسعی و قد جف العظم

در بلائے ہجر حکمت با بود بیتنی کو شفت عن تلک الحکم

صرفی از دریا ئے اشکم نہ محیط بیس الاشمل اشف من دیم

مختصر یہ کہ شیخ یعقوب کشمیری کی تعریف و توصیف میری عاجز زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان کے اوصاف و کمالات  
کی نشانیاں ان کے حالات سے بخوبی نمایاں ہیں۔

شیخ نے ۱۲ ذی قعدہ ستندھ کو انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات "شیخ ام بود" کہی گئی ہے۔

سلام علی الدنیا و طیب نعیمہا کان لم یکن یعقوب فیہا یاس

دریں خرابہ فجورہ بسوئے گنج مرا کہ جائے محنت و رنج ست این خراباد

مولانا میرزا سمرقندی | مولانا انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کر آئے تھے۔ بیرم خاں خان ظہاں کے عہد میں آگرہ میں مقیم تھے۔ ایک مخلوق ان سے فیض یاب ہوئی تھی۔

منطق میں ”شرح شمس“ امیر سید محمد کی تصنیف ہے۔ جن کے والد امیر سید علی ہمدانی تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی تھی۔ میں نے ”شرح شمس“ کا کچھ حصہ اور پوری کی پوری ”مختصرات“ مولانا میرزا کے پاس پڑھی تھی۔ اور حضور اکرم کی یہ مستند حدیث — ”قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من قذی غیدہ ثم قتله دملہ ہد سا“ ان کی زبان سے سنی اور اس کی روایت کی اجازت حاصل کی جو چھ واسطوں سے حضور اکرم تک پہنچی ہے۔ اور اس حدیث کی سند کا قصہ ”نجات الرشید“ میں تفصیل سے درج ہے۔

مولانا خان زماں کی بغاوت کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آگئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے۔

قاضی ابوالمعالی | عزیز بخاری کے داماد شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عزیز بخاری کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر تمام فقہ حنفی کی کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ از سر نو ان سب کو لکھوا دیتے۔

انہوں نے عبداللہ خاں بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل کو بلیا میٹ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ماوراء النہر سے ملا عصام الدین الفرائینی اور اس کے خبیث طالب علم ان ہی کی وجہ سے شہر بدر کیے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارا و سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر یونڈے جہاں بھی کسی سلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے کہنے لگتے ”یہ گدھا ہے کیونکہ لا حیوان“ اس سے مسلوب ہے۔ چونکہ ”انتفائی عام“ ”مستلزم انتفائی خاص“ ہے۔ اس لیے انسانیت کا سلب ہونا لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب بکثرت پھیل گئے تو قاضی نے عبداللہ خاں کو اس کے سدباب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کا اخراج کرادیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کر دی۔

ایک روایت یہ بھی نکالی کہ اگر اس کاغذ سے جس پر منطق لکھی ہوئی ہو، استنجا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قاضی ہمیشہ ہرنماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے تھے اور مرید بناتے تھے۔ ۹۶۹ھ میں آگرہ میں آئے۔ میں نے شرح فقہ کے پہلے کے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بحر بے پایاں تھے۔

مولانا میر کلاں | ملا خواجہ کے پوتے ہیں۔ خراسان کے بڑے مشائخین میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے آراستہ نہایت متبحر دانشور اور عالم تھے، خاص طور سے علم حدیث میں تو اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ حدیث کی اجازت انہوں نے سید میرک شاہ سے لی تھی۔ اور مولانا زین الدین محمود کمان گر برائی کے منظور نظر تھے۔ اور نیکی ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ہمیشہ دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ اور ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے۔

عقیدت و مریدی کا تعلق شیخ جلال ہروی سے تھا جو سربراہ و رہبر مشائخین اور مشاہیر میں سے ہیں۔ مولانا میر کلاں بلاشبہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی منظر تھی۔ اسی سال کی عمر پائی۔ ان کی والدہ سیدہ تھیں



اور زندہ تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں ان کی بیوی ان کی والدہ کی نافرمان نہ نکلے انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔ اور والدہ کی زندگی ہی میں انتقال فرما گئے۔

جس وقت مولانا کا انتقال ہوا۔ ان کی والدہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ جب انہیں ایسے عزیز و سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ اور لوگ ان سے تجویز و تکفین کی اجازت مانگنے لگے تو اس نیک بی بی نے ”انا لله وانا الیہ راجعون“ پڑھا، اجازت دی، اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئیں۔ اور اس سیدہ نے کسی طرح کی بقرآن اور صدمہ کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا میرکلاں کی وفات ۱۲۸۹ھ میں آگرہ میں ہوئی۔ اور آگرہ ہی میں دفن کیے گئے۔ ان کے ایک سال بعد ہی ان کی والدہ بھی سدھار گئیں۔

یہ ان بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں۔ لیکن ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکا۔

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملا احمد جنید سے انہوں نے پڑھا ہے۔ ملا محمد مولانا سعید ترکستانی | سرخ سے بھی کچھ استفادہ کیا۔ اور کچھ عرصہ تک ملا عصام الدین ابراہیم کے بھی شاگرد رہے۔

ہندوستان آنے کے بعد اکبر سے ملاقات ہوئی تو اکبر کو ان کی مصاحبت نہایت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا بڑا غلبہ تھا۔ لیکن وہ نہایت خوش مزاج اور ذہین تھے۔ چنانچہ اس قریبی زمانہ میں ان جیسے فہم اور علمیت والا عالم شاید ہی پیدا ہوا ہو۔ گفتگو اور بیان نہایت فصیح اور دلکش ہوتا تھا۔ شاگردوں پر نہایت مہربان رہتے تھے۔

ہندوستان سے کابل لوٹ کر گئے۔ اور ۱۲۹۰ھ میں وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔

حافظ کوہکی | حافظ تاشقندی کے نام سے مشہور تھے۔ نہایت مجتہد عالم تھے۔ خاص طور سے عربی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مولانا عصام الدین کے شاگرد ہیں۔ تمام علوم بخوبی جانتے تھے۔ اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ ماوراء النہر میں تمام علماء ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ بظاہر وہ قوی وضع قطع میں رہتے تھے۔ ہمیشہ ترکوں کی طرح ترکش کمر سے باندھے ہوئے سوار رہا کرتے تھے۔

۱۲۹۰ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ اکبر نے ملاقات کی۔ اور بھاری انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ پھر بڑے گجرات حرمین شریفین کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے روم گئے۔ شاہ روم سے ملاقات کی۔ ہندوستان سے دس گنا زیادہ وہاں ان کی تعظیم و تکریم کی گئی۔ یہاں تک کہ وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا اور ماوراء النہر لوٹ آئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ میں ان سے اور مولانا سعید ترکستانی سے نہیں مل سکا۔

قاضی نظام بدخشی | قاضی خاں لقب تھا۔ بدخشاں کے رہنے والے ہیں۔ وہاں ان کا مقام اس پھاڑ سے قریب تھا جس میں لعل کی کان ہے۔ نصابی علوم میں مولانا عصام الدین ابراہیم کے شاگرد ہیں۔ ملا سعید

سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تصوف سے بڑی وابستگی تھی۔ چنانچہ علم تصوف پر بھی پورا عبور حاصل تھا۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی کے مرید تھے۔ خدا والوں کی صحبت کے طفیل دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ بدخشاں میں امرار شاہی میں داخل تھے۔ ہندوستان آئے تو اکبر بادشاہ نے اندازہ سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ پہلے تو قاضی خاں کا پھر غازی خاں کا خطاب ملا۔

قاضی نظام نہایت فصیح زبان اور خوش بیان عالم تھے۔ معتبر تصانیف کے مصنف ہیں۔ ایک رسالہ کلام و بیان ایمان تحقیق و تصدیق کے موضوعات پر لکھا۔ شرح عقائد پر حاشیہ لکھا ہے۔ تصوف میں بھی بہت سے رسالے تصنیف کیے ہیں۔ اودھ میں بھرتر سال ۱۱۹۲ھ میں انتقال فرمایا۔ فتح پور میں پہلا وہ شخص جس نے فتح پور میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی رسم ایجاد کی وہ یہی قاضی نظام بدخشی تھے۔ ملا عالم کابلی (غالباً طنزاً) بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے۔ افسوس اس کی (سجدہ) ابتداء و اختراع میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

**مولانا الہداد لنگر خانی** | لنگر خاں لاہور کا ایک محلہ ہے۔ مولانا اکثر علوم متداولہ میں ماہر اور متبحر عالم ہیں۔ شریعت کے بڑے پابند، نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں۔ اب بھی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ بے مروت دنیا داروں کے گھر کبھی نہیں جاتے۔ بادشاہوں اور امیروں سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سرکاری مدد معاش بھی قبول نہیں کی۔ اب ان کی عمر اسی سال ہے۔

**مولانا محمد مفتی** | لاہور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ بڑے صاحب کمال عالم ہیں۔ مفتی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا جب بھی ختم ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی محفل منعقد کرتے ہیں۔ جس میں بغرا اور حلوؤں سے ضیافت کی جاتی ہے۔

ان کا گھر علم اور فضلاء کا مرکز ہے۔ اس زمانہ میں ان کی عمر نوے سال کی ہو چکی ہے اور وہ نہایت کمزور و ضعیف ہو گئے ہیں اس لیے درس دینا چھوڑ دیا ہے۔ چار پانچ لڑکے ہیں جو سب کے سب علم و کمال میں اپنے باپ کا نمونہ اور جانشین ہیں۔

**میر فتح اللہ شیرازی** | شیراز کے سیدزادہ اپنے زمانہ کے بے مثل عالم تھے۔ مدتوں فارس کے حکام و اکابر کے مشیر و راہنما رہے۔ تمام علوم عقلی جیسے حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب، طلسمات و نیرنجات، جراثیمات و غیرہ کے عالم و ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دسترس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصد گاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم حدیث تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔

لہ بغرار۔ فرہنگ ترکستانی بحوالہ ناصری غیاث۔ بغرار ایک آش کا نام ہے۔ جسے بغرار خاں نے ایجاد کیا تھا۔ بغرار خاں ترکستان کا مشہور بادشاہ گذرا ہے، بحوالہ آئین اکبری۔ یہ ایک قسم کا پلاؤ ہے۔ جو چنے کے میدے، سرکہ، چاول، گوشت وغیرہ سے تیار ہوتا ہے۔

ان کی بڑی اچھی تصانیف ہیں۔ لیکن بلحاظ علم و تصنیف وہ میرزا جان شیرازی کی برابری نہیں کر سکے جو ماوراء النہر کے یگانہ روزگار عالم گزرے ہیں۔

میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت بااخلاق منکسر مزاج اور نیک نفس تھے۔ لیکن خدا کی پناہ جس وقت وہ پردہ خانے بیٹھتے تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے درس میں کچھ زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور کوئی اچھا شاگرد ان کے حلقہ سے نہیں نکلا۔

چند سال وہ دکن میں رہے۔ وہاں کے حاکم عادل خاں کو میر کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ جب اکبر کی خدمت میں آئے تو عہد الملک کا خطاب پایا۔ کشمیر میں ۱۱۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس مقام پر جو تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے مدفون ہیں۔

ان کی تاریخ وفات ”فرشتہ بود“ سے نکلتی ہے۔

**شیخ منصور لاہوری** | شیخ اسحاق کا کو کے شاگردوں میں سے ہیں۔ لیکن زیادہ تر افادہ انہوں نے مولانا سعد اللہ سے کیا۔ ان کے داماد بھی تھے۔ ہندوستان میں جتنے عقلی علوم رائج ہیں ان سب میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نہایت خوش طبع سمجھ دار اور چھا جانے والے آدمی ہیں۔ امرار و سلاطین سے تعلقات رکھنے کا خوب ملکہ آتا ہے۔

کچھ عرصہ تک تو مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ جس زمانہ میں لاہور میں اکبر کا قیام تھا مالوہ سے آکر باریاب ہوئے۔ اسی تاریخ سے پرگنہ بھارہ اور کوہستانی سرحدوں کے نظم و نسق پر مالوہ میں۔ ان کے لڑکے ملا علاؤ الدین مشہور دانشمند مدرس ہیں۔ عرصہ تک خان خانان کی صحبت میں عزت و اکرام سے رہے۔ جب بادشاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ تو وہاں بھی بڑی عزت پائی۔ بادشاہ نے فوجی ملازمت کی بہت کچھ پیش کش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور درس و افادہ میں مصروف رہے۔ جو کچھ انہیں جاگیر سے ملا کرتا تھا وہ طلباء پر صرف کر دیتے تھے۔ ہندوستان کے عالموں میں پیر محمد خاں کے بعد ان جیسا اور ملا نور محمد خاں جیسا کوئی اور شخص سخی، فیاض اور ایثار پیشہ نہیں گزرا۔ انہوں نے شرح عقائد پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔

حج و زیارت کے لیے حرمین تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

**ملا پیر محمد شیروانی** | نہایت خوش فہم شگفتہ طبیعت عالم تھا لیکن طبیعت میں سنگ دلی اور بے رحمی بہت تھی۔ شریعت کے اوامرو نواہی کی پابندی بھی نہیں کرتا تھا۔ شیروان سے قندھار پہنچا اور بیرم خاں خانخانان کے ہاں ملازمت کر لی۔ بہت جلد ترقی کے مدارج طے کیے۔ ہندوستان فتح ہو گیا تو اسے خان کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الملک کا خطاب ملا اور تین چار سال اس نے نہایت شان و شوکت سے بسر کیے۔ لیکن ظالم کو کبھی فروغ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ بھی کچھ ہی عرصہ بعد مالوہ کی ندی زربدا میں ڈوب کر مر گیا اور فرعون و نیل کی یاد تازہ کر دی۔ میں نے بس اسے دور ہی سے دیکھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میرزا مفلس اوزبیک | ملا احمد جند کے شاگرد ہیں۔ مناظرہ و مجادلہ کے فن میں نہایت تیز تھے لیکن ان کی تقریر بھی اچھی نہ تھی۔ لیکن نہایت نیک اور متقی آدمی تھے۔

ماوراء النہر سے ہندوستان آئے تو چار سال تک آگرہ میں جامع خواجہ معین الدین فرخوری میں سبق دیتے رہے پھر حرمین شریفین کی زیارت کی اور مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ اس وقت ان کی عمر ستر سال کی تھی۔

مولانا نور الدین محمد ترخان | تمام علوم حکمت و کلام پر مستند عالم تھے۔ علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ چنانچہ نہایت خوش طبع شاعر سمجھے جاتے تھے۔

آخر عمر میں شرگوئی سے توبہ کر لی تھی۔ اور حضرت غفران پناہ ہمایوں بادشاہ کے روضہ کے متولی بنادیئے گئے تھے۔

دہلی میں انتقال کیا۔

مولانا الہداد امروہہ | نہایت خوش طبع، آزاد مزاج، محنتی عالم، شیریں کلام، خوش باش اور ندیم پیشہ شخص تھے مزاج و ظرافت کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ غرض اہل مجلس کے لیے ”مایہ حضور اور مایہ سرور“ سمجھے جاتے تھے۔

شاہی فوجی ملازمت میں انہوں نے کچھ روپیہ پس انداز کر لیا تھا اسی پر گزر بسر تھی۔ ساری عمر میرے ساتھ بڑی محبت و خلوص سے پیش آتے رہے۔

۱۹۹۰ء میں جب کہ لشکر سیالکوٹ کے نواح میں ایک گنگ کی طرف جا رہا تھا ان کا انتقال ہو گیا۔ لاش امروہہ میں ایک مقام پر جہاں انہوں نے آخری ٹھکانے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی لے جا کر دفن کی گئی۔

اس عہد کے جو مشائخ اور علماء تھے ان کا ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی صحبت پائی ہے اور ان کے دیدار سے فیض یاب ہوا ہوں۔

ان تمام بزرگوں میں سے جن کا ذکر کیا گیا اس قحط الرجال کے دور میں بس کوئی کوئی رہ گیا ہے۔ بعض لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشہ نشین ہو گئے۔ ذہنوں سے ان کی یاد بھی جاتی رہی ہے۔ باقی ماندہ لوگ اپنی آخری سانسیں گنتے بہمتے بے چینی سے اس کوچ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بعد لوٹنا نہیں۔ ان کے کانوں میں برابر الرحیل الرحیل کی صدا گونج رہی ہے۔ چاہے کب اس آواز پر اٹھ کر چلے جائیں۔

تاریخ جہاں کہ قصہ خرد و کلاں درج ست دروچہ شیر مرداں چہ یلاں

قد مات فلان ابن فلان ابن فلان در بر و قتل خواں کہ فی عام کزا

تمام ممالک محروسہ ہندوستان کے طول و عرض میں دوسرے اور علماء و مشائخ اتنے ہیں کہ ان کا شمار خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ بھی جو شرارت، باطنی خباثت، دین فروش، کبخی اور رذالت، بے راہ روی اور بے اعتدالی میں مشہور و معروف ہیں، کچھ کم نہیں۔ ہم نے ایسے پس ہمت لوگوں کے تذکرہ میں اپنے قلم کو الجھانا مناسب نہیں جانا، کیونکہ ایک بڑا کام پیش نظر ہے اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

میرا اپنا حال اس نیشاپور کے برف فروش سے کچھ مختلف نہیں جو گرم ہوا میں برف بیچ رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو کتنے لگائے مسلمانوں خدا را نگاہ رحم سے مجھ نقصان کے مارے کو دیکھو کہ اس کی پونجی پھیل پھیل کر اس کے ہاتھوں سے ہی جا رہی ہے۔

عمر برف است و آفتاب تموز

اندکی ماند و خواجہ عزمہ ہنوز

اور میں یہ جو مرنے والوں کی تاریخ وفات لکھا رہتا ہوں، اس کی مثال اس درزی کی ہے جو قبرستان کے دروازہ پر اپنی دکان لگائے ہوئے تھا اور ایک کوزہ کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ جب بھی کوئی جنازہ شہر سے نکلتا وہ اس کوزہ میں ایک کنکر ڈال دیتا اور ہر مہینہ ان کنکریوں کو گن کر حساب لگالیتا کہ کتنے جنازے اٹھائے گئے۔ پھر وہ کوزہ خالی کر کے دوبارہ ٹانگ دیتا اور اسی طرح کنکریاں ڈالتا رہتا۔ یہاں تک کہ دوسرا مہینہ آجاتا۔ کافی عرصہ تک وہ اسی طرح کرتا رہا۔ اتفاق سے وہ درزی مر گیا۔ ایک شخص جسے اس کی وفات کی خبر نہ تھی اس سے ملنے آیا۔ دکان بند پا کر اس نے ہمسایہ سے دریافت کیا کہ ”درزی کہاں ہے؟“

ہمسایہ نے کہا ”وہ اسی کوزہ میں گر پڑا ہے۔“

بگر کہ بدیگرے کشاید

کز دے چو گزشت بر تو آید

بحمان اللہ ہماری زندگی بھی کیا زندگی، بس اثر دے کے حلق میں جا کر پھنس گئے ہیں کہ ہلنے اور تر پنے کی بھی مجال نہیں چھٹکارے کی امید کہاں۔ قطعہ

چو غنچہ خوں خور و دل تنگ باش لب کشا کہ نیست غنچہ این باغ را امید کشاد

نشان ز سر و تن دی مجہد کہ خاک شدہ است بہر نہ میں کہ فتادہ است سایہ شمشاد

چو ہر نفس ز چین سے رود بباد گلی مدرام جامہ کیود است سوس آزاد

غرض میں نے ان دو محترم گروہوں (صوفیاء و علماء) کا تذکرہ تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر درج کر دیا ہے۔ سخن شناس قارئین اعتراض نہ فرمائیں۔ کیوں کہ یہ انتخاب نہایت پریشان حالی میں بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ نیز میرے پاس یادداشت بھی نہیں تھی۔ کیوں کہ بیاض رکھنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔

میں تو وہ بخیہ گر ہوں جس کی سوئی ہر وقت کھو جاتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا ”مجھے کیا سمجھتے ہو، اگر میرا وقت سوئی کے ڈھونڈنے میں ضائع نہ ہوتا تو ہر روز میں ڈھیروں کام کر کے رکھ دیتا۔“



میں نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض تو اس قبیل کے ہیں کہ میری خواہش کے مطابق تو ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا کیوں کہ بہت سے ایسے صدیق ہیں جو بعد میں زندیق ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان تمام میں سے کوئی ایک شخصیت بھی ایسی ہو جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو تو بس میری نجات اور شفاعت کے لیے وہی ایک شخص کافی ہوگا۔ ویسے یہ سارا گروہ ولایت کے اعزاز سے موصوف ہے اور ان میں سے اکثر میں ولایت خاصہ جلوہ گر رہی ہے۔

میں نے بے دینوں اور دنیا داروں کا ذکر ان کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں میں نے عارف بسطامی کے قول پر عمل کیا ہے۔ وہ اپنے ایک معتقد کو نصیحت کر رہے تھے کہ اگر تم اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مشائخین کی باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو میرے لیے اور خود کے لیے اس سے دعا کرنا کیوں کہ وہ شخص یقیناً مقبول خدا ہے۔

الہی نمی برم و چارہ نمی دانم  
بجز محبتِ مرداں مستقیم الاحوال

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ ان صاحب دل اہل اللہ حضرات کی تعداد ایک سو گیارہ ہے۔ یہی لفظ ”قطب“ کے بھی اعداد نکلتے ہیں اور لفظ ”الف“ کے بھی کہ اس مسودہ کو لکھتے وقت ہزارواں ہی سن چل رہا ہے۔

ان بد بختوں کی طرف سے جنہوں نے دین اسلام پر صریحاً طعنہ زنی کی ہے جو نہایت بے حیا اور بے دین ہیں۔ جن کی وجہ سے ملک و ملت میں فتنہ و فساد برپا ہو گیا ہے اور ان کو بجا طور پر ”فتنہ آخر زمان“ کہا جاتا ہے۔ میرا دل سخت تالاں ہے۔ پھر بھی حکما کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے چند کا تذکرہ کر دیا جاتا ہے۔

## دور اکبری کے حکماء

”ان حکیموں میں سے بعض حکمت علمی و عملی میں ایسے طاق تھے جیسے  
ان کے ہاتھوں میں یدِ نبیائے موسوی آگیا ہو۔ اپنی عبارتِ فنی کے لحاظ  
سے اعجازِ سیحی کی یاد دلاتے تھے۔ بعض کی اہمیت بس اس حد تک ہے کہ انہوں نے  
طب کو ایک شریف فن سمجھ کر حاصل کر لیا اور اپنی مشق سے اسکو پیشہ بنالیا ہے  
یہ ہوں یا وہ ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ ہے دنیا پرستی اور اقتدار پرستی“

حکیم الملک گیلانی | اس کا اصل نام شمس الدین ہے۔ حکمت و طب میں جالینوس زماں اور میسج دوراں تھا۔ طب کے  
علاوہ دوسرے مروجہ نقلی علوم میں بھی سب سے نمایاں و ممتاز تھا۔

مجھے اس سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ جب میں نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا تو ”نامہ خروافرا“ کو پیش  
کرتے وقت اس نے بلا کسی سبب کے میرے ساتھ کچھ اچھا رویہ نہیں رکھا۔ جب بادشاہ نے مذکورہ کتاب کے متعلق  
اس سے پوچھا کہ فلاں کی تحریر و انشاء کیسی ہے؟ تو اس نے کہا اس کی عبارت فصیح تو ہے لیکن پڑھنے میں کچھ بھلی  
نہیں معلوم ہوتی۔

میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ بندگانِ خدا کا نہایت خیر خواہ اور لوگوں کے  
کام بنانے والا بامروت اور آشنا پرور شخص تھا۔ دین و عقیدہ میں بھی نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ رہا۔ ہمیشہ  
طالب علموں کو سبق پڑھانے میں مصروف رہتا۔ ان طالب علموں کے اخراجات کی کفالت اور ان کی سرپرستی بھی وہی کرتا  
تھا۔ کسی وقت بھی ان کو لیے بغیر دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اور محض انہی شاگردوں کے خیال سے لوگوں کے گھروں پر  
دعوتوں میں بہت کم شرکت کرتا تھا۔

ایک دن شیخ اسلم حشتی کی محفل میں بیٹھے ہوئے فقہ، نصاب اور فقیہوں کا حال اور حکماء کے طریقہ کی تعریف و توصیف  
اور شیخ بوعلی سینا کی خوبیاں گنارہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک  
کی بڑائی جتانے کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں نیا نیا گیا تھا کسی کو پہچاننا نہ تھا۔ اصل بحث کیا تھی۔ اس کا بھی علم نہیں  
تھا۔ تاہم میں نے اس وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کے یہ شعر پڑھ دیئے۔

و کہ قلت للقوم انتم علی شفا حضرة من کتاب الشفاء

فلما استها فو بتو بنحنا      فراغنا الى الله حسبى كفا  
فما تو على دين اسطاطليس      وغثنا على ملتنا المصطفا

مزید تائید کے لیے میں نے مولانا جامی کا یہ شعر جو تحفۃ الاحرار میں ہے سنایا ہے

نور دل از سینہ سینا مجوی

روشنی از چشم نہ بینا مجوی

میرے شعر سنانے پر حکیم بری طرح بگڑ گیا۔ شیخ سلیم نے کہا "ان لوگوں میں پہلے ہی آگ لگی ہوئی تھی۔ تو نے آکر اسے اور بھی بھڑکا دیا۔"

مشائخین اور علماء کا جب تختہ الٹ گیا تو حکیم دین کے مخالفوں اور مرتدوں کی بہ حد امکان خوب خبر لیتا رہتا تھا۔ آخر جب حالات بہت بگڑ گئے تو اس نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور ۹۸۸ھ یا ۹۸۹ھ میں حج پر چلا گیا اسی جگہ وفات پائی۔

حکیم سیف الملوک دماوندی | ایک طرف تو بڑا عالم و حکیم تھا، دوسری طرف شعر گوئی اور ہجو نویسی بھی کرتا رہتا تھا۔ اپنا تخلص شجاعی رکھے ہوئے تھا۔ اتفاق کے بھی عجیب کشتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حکیم جیسے ہی کسی بیمار کے سر ہانے پہنچا، بیمار ملک الموت کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گیا۔ مسخروں نے اس کا نام ہی "سیف الحکماء" مشہور کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جامی محمد جنو شانی کے ایک پوتے تھے جو مخدوم زادہ کے لقب سے مشہور تھے۔ حکیم نے ان کا علاج کیا اور بچاروں کا بیڑہ اس پار پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخ کے لیے دلچسپ فقرہ تراش لیا۔

"سیف الحکماء کشت"

سیف الحکماء نے مار ڈالا

ایک جلال طبیب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ قطعہ کہا تھا جو حکیم سیف الملوک پر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔

شکوہ برد و دوش پیش خدا

ملک الموت از جلال طبیب

مے کشم من یکے دا و صد ہا

بندہ عاجز شدم نہ دست طبیب

یا مرا خدمت دگر فرما

یا در اعزل کن ازین منصب

ہندوستان میں چند سال تک وہ بیرم خاں کی سرکار میں نہایت معزز و مکرم رہا لیکن جیسی اس کی خواہش تھی ویسی ترقی نہ ملی تو ناراض ہو کر ولایت (ایران) چلا گیا۔ اور وہاں سے ایک ہجو طبع لکھ کر بھیج دی کہ اس عمد میں شیرینی اور مزاج کے ساتھ شاید ہی کسی نے ایسی عمدہ واقعہ نگاری کی ہوگی۔ اس ہجو کے چند شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، تفریح طبع کے لیے درج کیے جاتے ہیں۔

قطعہ

صالح بزغالہ بے وقت برائے بربری  
بہمنی بے قشقہ و زنا یعنی شیخ ہند  
اے شفیع الدین محمد بسکہ می چاوی سخن !  
اے فریدیوں در تعرض روئے بے شرم ترا  
میر فریدیوں نے اس کے جواب میں کہا ہے

اشک حکمت باف لاف ایشک آقائی اجل  
آنکہ اورا در مصیبت خانہ درباں گفتہ ام  
جس زمانہ میں میر معز الملک سپاہ گری کو چھوڑ کر دہلی میں روپوش ہو گیا تھا اس نے کہا تھا  
شاہ درویشاں معز الملک از من درہم است  
بندہ اورا کئی نہ درویشی پشیاں گفتہ ام  
علم و دانش میں ممتاز حکیم تھا۔

حکیم زنیل شیرازی اور بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل تھا۔

حکیم عین الملک شیرازی اپنا تخلص دوائی کرتا تھا۔ علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ تھا۔ اچھے اخلاق و  
مادات کا مالک تھا۔ شہر بندیہ میں اس کا انتقال ہوا۔ جیسا کہ ہم بیان  
کر آئے ہیں۔

یہ اشعار اسی کے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد مرحوم کے باغ میں رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے ہاتھ سے  
لکھ کر بطور یادگار مجھے دیئے تھے۔ وداع ہونے کے بعد وہ لاہور سے راجہ علی خاں والی برہان پور کے پاس  
سفیر بن کر چلا گیا۔ بس یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

چناں از عشق برگشتم کہ در دنیا نمی گنم  
ہمہ جا پر ز عشق گشت و من در جانی گنم  
اگر باغیر عشق الفت نمی گیرم عجب نبود  
مثال عصمت میداں کہ در صبا نمی گنم  
نشان از من چرمی پرسی کہ من خود ہم نمیدانم  
ہمانا سر تو حیدم کہ در انجا نمی گنم

ہیچ ویرانی نہ شد پیدا کہ تعمیرے نہ داشت  
ورد بے درماں عشق است اینکہ تدبیرے نہ داشت  
مید آہوئے شدم کہ ہر طرف کردم نگاہ  
غیر جانے پاک در فراق تجھیرے نہ داشت

حکیم نجم الدین عبداللہ بن شرف الدین حسن کا تربیت یافتہ تھا۔ نہایت درویش صفت  
پاک اعتقاد آدمی تھا۔ فن طبابت میں اسے یدربفیاض حاصل تھا۔ دکن سے ہندوستان

آیا۔ پھر شہزادہ سلطان مراد کے ہمراہ گجرات اور دکن کی مہم پر متعین کیا گیا۔ لیکن مالوہ ہی میں فرشتہ اجل نے آگھیرا۔

**حکیم مصری** | طب میں نظری اور عملی طور پر نہایت دور رس اور ماہر شخص تھا۔ علوم نقلی پر بھی اچھا عبور حاصل تھا۔ عجب عجب علوم سیکھ رکھے تھے۔ جسے دعوت اسماء علم حروف، علم تکسیر وغیرہ۔

ہمیشہ مسکراتا نظر آتا، خندہ پیشانی سے ملتا اور گفتگو کرتا، لوگ اسے مبارک قدم کہا کرتے تھے۔ شیخ فیضی کے علاج میں اس نے بڑی سعی و کوشش کی۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بھی کہا کرتا، موت کے معاملہ میں تو سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر علم طب سے عمر میں اضافہ ہو جاتا تو پھر حکیم لوگ اس دنیا سے جاتے ہی نہیں۔

وہ کبھی کبھی مزاحیہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ یہ اسی کا شعر ہے کہ خواجہ شمس الدین دیوان خوانی کے متعلق کہا تھا ہے

خواجہ شمس الدین چہ ظلمی می کند  
در طبابت باش دغلی سے کند  
ایک دن اس نے کینر کے پھول جس کو عربی میں دغلی کہتے ہیں دیکھے تو فی الفور کہا  
چو آتش جست کا کل از سر دغلی

بادشاہ نے لاہور میں بادشاہی محل کے صحن میں ایک چوتھرہ بنوایا اور حکم دیا کہ ہر شخص اس جگہ ہمارے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس موقع پر حکیم مصری نے شعر کہا ہے

شاہ ما کرد مسجد سے بنیاد ایہا المومنین مبارک باد  
اندریں نیز مصلحت دارد تا نمازاں گزار بشمارد

حکیم مصری نہایت سادہ لوح، بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ برہان پور خاندیس میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

**حکیم علی** | حکیم الملک کا بھانجا اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ شیخ عبدالنبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی ہے۔ علوم شرعی پر اس کی اچھی نگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ”زیدیہ مذہب کا کٹر معتقد اور اس زمانہ کے بیشتر حکماء کی طرح متعصب شیعہ ہے۔

اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے۔ مریضوں کا علاج معالجہ بھی کرتا رہتا ہے۔ لیکن نوجوان اور خود پسند ہے۔ ابھی عملی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں، اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ لیکن جب شاہ صاحب بیمار ہوئے تو حکیم علی نے تپ محرقہ میں ”ہریہ“ کھانے کے لیے تجویز کیا، جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ”مرگ ہوش است شربت بہ او“



**حکیم ابوالفتح گیلانی** | بادشاہ کا چیتا مصاحب تھا۔ اس نے مزاج شاہانہ پر ایسا قابو پا لیا تھا کہ دوسرے تمام درباری اس سے حسد کرتے تھے۔ نہایت ہوشیار ذہین اور تمام ہنروں میں یکتا تھا۔ نظم اور نثر میں بھی باکمال ادیب تھا۔ اسی طرح بے دینی اور تمام بد اخلاقیوں میں بھی اس کی شخصیت ضرب المثل تھی۔

میں نے ان دنوں جب کہ حکیم بنایا آیا تھا خود اس سے سنا کہ تھا، خسرو کیا ہے بس بارہ شعر کا شاعر، انوری کو خوشامدی انوری کہا کرتا تھا۔ اور اس کو میر بادخاں سے تشبیہ دیتا تھا جو ایک مسخر تھا خاقانی کے متعلق کہتا تھا اگر اس زمانہ میں ہوتا تو بڑی ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب وہ (خاقانی) میرے گھر آتا تو میں تھپڑ مار کر اس کی سستی اور کاہلی کو دور کر دیتا۔ اور یہاں سے ابو الفضل کے گھر جاتا تو وہ اسے طماچہ لگاتا۔ اس طرح ہم اس کے اشعار میں اصلاح کرتے رہتے۔

**حکیم حسن گیلانی** | طبیب حاذق تھا۔ معالجہ میں اچھی شہرت تھی۔ عالم تو اتنا بردانہ نہیں تھا، لیکن نہایت با اخلاق اور خوش کردار آدمی تھا۔

**حکیم ہمام** | حکیم ابوالفتح کا چھوٹا بھائی، اخلاق میں اپنے بھائی سے بہتر تھا۔ اگرچہ بذاتہ نیک نہیں تھا لیکن عملاً شریک نہیں تھا۔

حکیم حسن، شیخ فیضی، کمالائی صدر اور حکیم ہمام حسب ترتیب ایک مہینہ کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ ان کا مدفن سے جمع کیا ہوا مال و اندوختہ ایک ہی گھڑی میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اور یہ حسرت و محرومی یہے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

جان بجاناں وہ و گرنہ از تو بستاند اجل

خود ہمدان صاف جان من کہ ایں یا آن نکوست

حکیم ہمام کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش بعد میں حسن ابدال لا کر اس کے بھائی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

**حکیم احمد تہتوی** | عالم تو بہت اچھا تھا، طب نہیں جانتا تھا، بس حکیم بنا ہوا تھا۔ ویسے تمام علوم کا جامع تھا۔ عرب اور عجم کی سیاحت کی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھا لیکن بہت سے فضول خطبے ہوئے تھے۔ طبیعت کا لالچی بھی تھا۔ اہل بیت ہونے کا دعوے کرتا تھا۔ میں نے اس سے اکثر کہا کہ تجھ میں یہ استعداد نہیں کہ تو اہل بیت میں سے ہونے کا دعویٰ کرے کیوں کہ ہندوستان میں ایسے دعوے چل نہیں سکتے۔ اگر تو واقعی دیندار ہے تو دین اسلام کی دعوت دے کہ اس زمانہ میں اسلام کا بس نام ہی رہ گیا ہے۔ لیکن میرے کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا آخر اس نے اپنے اعمال کو بھگت لیا۔ اور مرزا فولاد نے خیر مار کر ہلاک کر دیا۔

مرنے پر میں نے اسے دیکھا دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ خدا کی قسم اس کی خدائی بے شک و لاریب ہے۔ وہ میں میں سور کی شکل کا نظر آ رہا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے اس کی تائید نکالی۔ "خوک سقری"۔

شیخ فیضی نے اس کی تاریخ ”بیت و پنج ماہ صفر“ نکالی ہے۔  
میں نے حدیقہ کے اس شعر میں تھوڑا سا تغیر کر کے قاتل اور مقتول دونوں کی مناسبت سے دو تاریخیں

دالی ہیں۔

فرضینا بقرائن صادق

وخننا بوصف وی لائق

دوسری تاریخ ہے ”زہے خنجر فولاد“

بڑا حافظ طیب تھا۔

اس کا علم بھی بہت اچھا تھا۔

ملکیم لطف اللہ گیلانی

کم عمری ہی میں شاہ طہماسپ کے طبیعوں میں شامل تھا۔ ہندوستان آیا تو بڑی

ترقی کی۔ بڑا باصلاحیت نوجوان ہے۔ اخلاق نہایت عمدہ اور کردار پاکیزہ ہے

ملکیم مظفر از دستانی

یاروں کو اس کی آمد ہی بڑی بابرکت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ بلحاظ علم اتنا اونچا نہیں۔ لیکن اس کا تجربہ

ماشبہ بہت اچھا ہے۔

طب کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ علم بنیت سے بھی بخوبی واقف ہے۔ قانون ”پرفارسی

میں ایک شرح لکھی ہے۔ ان دنوں کابل میں قلعہ خاں کے علاج کے لیے گیا ہوا ہے۔

ملکیم فتح اللہ گیلانی

یہ سرہند کے شیخ حسن طیب کا لڑکا ہے۔ جراحی میں بڑا ماہر ہے۔ ہاتھیوں کے علاج میں تو وہ معالج

خصوصی تھا۔ آج کل بے قید اور بے حیا ہو گیا ہے۔

شیخ بنیا

اب تک ہم نے جتنے حکیموں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلمان اور ہندو حکیم بھی ہیں

لیکن ان جاہلوں اور ملعونوں کے تذکرہ پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔

## دورِ اکبری کے شاعر

”پیش نظر انتخاب میں جن شاعروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا  
ماخذ میر علاء الدولہ کا مشہور تذکرہ ”نفائس الاثر“ ہے۔ ان میں سے بعض  
صاحب دیوان شاعر ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کی ہے  
بعض کو دورِ یازدیک سے دیکھا ہے یا انکی شہرت کی وجہ سے ان کا ذکر کیا ہے۔“

غزالی مشہوری | ملحدانہ خیالات اور بے راہ روی کی وجہ سے جب عراق میں اسے لوگوں نے قتل کر دینا چاہا تو وہ  
وہاں سے بھاگ کر دکن چلا گیا۔ پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ خانِ زمان نے اس کو خرچ کے لیے  
ایک ہزار روپیہ بھجوا دیا تھا۔ اس نے جون پور سے یہ قطعہ بطور لطیفہ کے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس میں صنعت معما بھی موجود  
ہے۔ قطعہ

اے غزالی بحق شاہِ نجف کہ سوئے بندگان بے چوں آں  
چونکہ بے قدر بودہ آں جا سر خود را بگیرد بیروں آں

چند سال خانِ زمان کے پاس رہا، بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ دربار میں ملک الشعراء کا خطاب ملا  
اس کے اشعار کے چند دیوان اور ایک شنوی ہے۔ کہتے ہیں اس نے چالیس پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ اگرچہ اس کا  
کلام کچھ زیادہ بلند نہیں لیکن کبیت و کیفیت کے لحاظ سے اس کے اشعار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ ہیں۔  
تصوف کی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کی وفات جمعہ کی شب ۲۷ ماہِ رجب ۹۸۸ھ میں احمد آباد میں اچانک اور دفعتاً ہوئی اور اکبر کے حکم سے  
اس کو ”سرگنج“ میں جہاں بڑے بڑے مشائخین اور سلاطین دفن ہیں دفنایا گیا۔  
قاسم ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ تاریخ کہی۔ قطعہ ۱۔

دوش غزالی آں سبک ملعون مست جنب شد بسوئے جہنم

کاہی سال و فاقش نبوشت ملحد دونی رفت ز حال

بود گنج غزالی از معنی مدفنش خاک پاک سرگنج است

بعد یک سال تاریخش احمد آباد و خاک سرگنج است

دیگر:-

یہ مطلع اسی کے نام سے مشہور ہے لیکن میں نے غزالی کے دیوان میں اسے نہیں پایا  
شورے شد و از خوابِ عدم دیدہ کشودیم  
دیدیم کہ یاقیست شبِ قتنہ غنودیم

غزالی کا نمونہ کلام:

در کعبہ اگر دل سوئے غیر است ترا طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر است ترا  
در دل بحق است و ساکن میکہ می نوش کہ عاقبت بخیر است ترا

مازگرگِ خود نمی ترسیم اما این بلا است  
کز تماشائی بتاں محسوس می باید شدن

خفتگاں خاک یکسر کشته تیغ تواند  
ہیچ وحشی نیست شمشیر اجل را در میان

چوں فانوسِ خیال و علمے حیران درو  
مردماں چوں صوتِ فانوسِ سرگرداں درو

شده زہر بر کمان قامت زاہد روانی او  
ولی زنداں نمی ترسند از تیر و عانی او

رباعی

بحریت ضمیر من کہ گوہر دارد تیغی است ز بان من کہ جوہر دارد

صورت سلم غنم محشر دارد مرغ ملکوتی سخنم بر دارد

اس نے ایک قصیدہ میں صنعت "سیاق العدد" ایک تاسو کے اعداد میں بیان کی ہے جس کا مطلع ہے :-

بہ یک سخن زود وعدت بہ فیض یافت میجا

حیات باقی و نطق فیض و نشاۃ احیا

غزالی کا ایک شعر ہے :-

ما بادہ ایم و گردِ گریباں ما غم است

داریم نشاۃ کہ دو عالم درو گم است

**قاسم کاہی** | اصل نام میاں کالی کالی ہے۔ اس کے اشعار میں نچنگی نہیں۔ ان کا سارا مضمون دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کوئی شخص اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ علم تفسیر، ہیئت کلام اور تصوف پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی اس کی ایک کتاب ہے۔ تصوف، معما گوئی، تاریخ اور حسن ادایں وہ اپنے زمانے کا بے مثل شخص تھا۔

اگرچہ اس نے پہلے کے اور اس دور کے اکثر مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے اور مولوی جامی اور دوسرے بزرگوں کا زمانہ دیکھا ہے لیکن ساری عمر وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا۔ آزادی، سخاوت، ایثار پسندی اس میں بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اس کے پاس قلندروں کا وارہ لڑکوں کا جگمگا لگا رہتا تھا۔ کتوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ غالباً کتے ملک الشعرائی کے لیے لازم و ملزوم ہیں رفیعنی ملک الشعراء بھی سگ پرست تھا اسی پر طنز ہے۔ مترجم)

ایک قطعہ میں اس نے لڑکوں کے ساتھ فیفتگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔ قطعہ  
 ایں نصیحت بشنواز سیفی      تاہمہ عمر ترا بس باشد  
 شعر خوب و پیر زیبا را      معتقد باش نہ ہر کس باشد  
 ہم کو اس کے مذہب و مسلک سے کیا کام اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

چوں سایہ ہمارم بہر سوراں شوی      باشد کہ رفتہ رفتہ بامہرباں شوی  
 اے پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب      بنود محجب کہ ہچو زینجا جہاں شوی  
 کاہی تو ببل چمن آرائی کابی      زارغ و زرخن نہ کہ بہند و ستاں شوی

چوں تار عنکبوت نہ ہجر تو شد تنم  
 در گوشہ خرابہ ازاں ہست مسکنم  
 اس کی دو غزلیں صوفیانہ لحاظ سے بہت عمدہ ہیں۔ کافی مشہور ہوئی ہیں۔ انہیں مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے۔  
 اور بادشاہوں صوفیوں کی محفلوں میں بڑی پسند کی جاتی ہیں۔

مطلع:  
 مرغ تابہ فرق مجنوں پہ زدن انگیز کرد  
 آتش سودائی یلی بر سرا و تیز کرد

چوں نہ عکس عارضش آئینہ پر گل شود  
 گرداں آئینہ طوطی بنگر و بلسل شود

اسم اللہ پر اس کا معما ہے:



نیست از ہستیش کسی آگہ  
ابدا کان لائنا فہایتہ لہ

اسم نبیؐ کا سما ہے

تارہ شرع را شتافتہ ام  
از محمد نبیؐ شگافتہ ام

اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ بوستان کے جواب میں قافیہ بہ قافیہ ”گل افشان“ نامی مثنوی لکھی ہے جس کا مطلع ہے :

جہاں آفریدہ بجاں آفریں  
بجاں آفریں صد جہاں آفریں

اس کے چند شعرے

بنا ز کشت جہا فی بت ستم گیر من  
مہنوز بر سر ناز است ناز پرود من

رنجست باران بلا بر تن غم پرور ما  
چہ بلا ہا کہ نیا درد فلک بر ما

نہ نو گسست عیاں بر سر مزار مرا  
سفید شد بر بہت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کے لڑکے کے متعلق کہا ہے۔

آتشیں رویت ز خاکستر چو نیلوفر شدہ  
یا نقاب از آتش روئے تو خاکستر شدہ

کا ہی کے اس مطلع کا مضمون ملا و صفی کا بلی کے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ وصفی کا مطلع ہے ۔

از تپ ہجران نہ خاکستر مرا بستر شدہ  
بستر از سوز من بمیسا ر خاکستر شدہ

لوگوں نے جب ملا قاسم سے کہا کہ تمہارے اکثر اشعار میں دوسرے شاعروں کا مضمون ملتا ہے۔ اس نے جواب دیا ”اس معاملہ میں میں نے کوئی خاص التزام نہیں کیا، اگر تمہیں پسند نہیں ہیں تو قلم تراش لو اور ایسے اشعار میرے دیوان سے کاٹ دو۔“

اس نے اضطراب کے متعلق ایک بڑا اچھا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ہمایوں بادشاہ کی مدح ہے۔ بلاشبہ اس قصیدہ میں کمال کر دکھایا ہے۔

جب خواجہ معظم خاں پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود خیر آباد سے ملا قاسم کاہی کی عیادت کے لیے آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ غزل کہی اور اس کا ترنم بھی بتا دیا:

ماندی قدم زنا زبروں نیسا ز من      دروں مباد پلٹے ترا سرونا ز من  
ہر چند وصف وصل تو کو دم شبنام      کو نہ نگشت قصہ درو درنا ز من

ایک دن ملا بادشاہی باغ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا، صیوچی شاعر وہاں نکلا اور کہا: استاد آپ نے سنا ایک پرانا مومن عراق میں مر گیا، ملا کاہی نے کہا: خدا تم کو بحفاظت زندہ رکھے۔

گجرات کے پہلے سفر میں ملا غزالی شکر کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ملا قاسم کاہی کے فوت ہو جانے کی خبر اڑ گئی تھی غزالی نے اس وقت یہ تاریخ کہی تھی۔ قاسم کاہی تو مرے نہیں لیکن یہ قطع تاریخ خوب ہو گیا۔ قطعہ

رفت بے چارہ کاہی از دنیا      سال تاریخ او اگر خواہی  
چوں بنا چارہ رفت شد ناچار      از جہاں رفت قاسم کاہی

اس سے پہلے کہ اس افواہ کا جھوٹ سچ ظاہر ہو جاتا، ملا قاسم کاہی نے انتقاماً غزالی کی وفات کی ایک تاریخ اور پھر اس کی تلافی میں دوسری تاریخ کہی تھی۔

بہر حال جھوٹ جھوٹے کے آگے آکر ہی رہتا ہے۔ اس شعر کے مطابق کہہ

شاعراں ویدم ز روئی تجربت  
بے تعاقب بے عقب بے عاقبت

اس زمانہ کے سارے ہی چھوٹے بڑے شاعر بجز تین چار معمر قدما کے حیدری مشرب رہے قید اور آزاد ہیں لیکن یہ دونوں غزالی اور کاہی تو ان آوارہ مشرب شاعروں کے پیشوا اور مقتدا تھے کہ انھوں نے اپنی خجاستوں کو اپنے شاگردوں اور ماننے والوں میں خوب جی کھول کر تقسیم کیا۔ میں جب ان شاعروں کو دیکھتا ہوں تو اس فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں شعرائے متقدمین بھی ایسے ہی نہ گزرے ہوں۔

یہ حضرت شیخ ربانی رکن الدین علاؤ الدولہ سمنانی کا فرزند ہے۔ معقولات کا علم مولانا خواجہ حسین مروی عصام الدین اور ملا حنفی سے حاصل کیا اور شرعی علوم میں خاتم العلماء و محدثین شیخ ابن حجر ثانی کی شاگردی کی۔

شعر گوئی، انشاء پر داری، صنائع بدائع احسن بیان، فصاحت و بلاغت، مزاج و لطافت میں بے نظیر شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان مکمل ہو گیا ہے۔ اس کے شعر اور سطور جہ کے ہوتے ہیں۔ نمونہ کلام:

اے از مرثہ بے تو آب رفتہ      وز دیدہ خیال و خواب رفتہ

خود را بما چناں کہ نبودی نمودہ  
افسوس آں چناں کہ نبودی نمودہ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:-

گوئیم مگو نہ اہل وفا ئیم نہ ایم      واندہ صفت صدق و صفائیم نہ ایم  
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چناں      افسوس کہ آنچه می نماییم نہ ایم  
یہ اسی کے اشعار ہیں:

با ما گدہ چو غنچہ در ابر و گلندہ  
باغیر لب چو پستہ خنداں کشودہ

محبتے کہ مرا با تو ہست می خواہم  
ہمیں تو دانی و من دائم و خدا داند  
اکبر بادشاہ نے کتاب سنگھاسن تیبسی کا ترجمہ کرنے کا اسے حکم دیا تھا جسے وہ پورا نہیں کر سکا۔ اس ترجمہ پر  
اس نے جو نعت لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش الحان عندلیب بلخ ابلاغ      کحل نرگش از کحل ما زاغ  
کشیدہ در زبور نسخ بے قیل      قلم بد نسخہ توریت و انجیل  
نبوت مابدرد گاہش حوالہ      امام الانبیاء ختم الرسالہ

رباعی: آتم کہ ممالک سخن ملک من است      صراف خود صیر فی ملک من است  
دیباچہ کن از دفتر من و رقیست      اسرارہ دو کون بر سر ملک من است  
۱۹۷۹ء میں اس نے ہندوستان سے وطن جانے کی رخصت حاصل کی۔ شیخ فیضی نے جو اس کا ترجمہ بیت یافتہ تھا  
اس کی تاریخ "دام ظلہ" لکالی۔ وہ کابل چلا گیا۔ میرزا محمد حکیم نے اس کی عزت و تکریم کی۔ میرزا کو اس نے ہندوستان  
کے نفیس کپڑے اور قیمتی سامان کی پیشکش کی۔ دربار میں ایک محرران تحفوں کی فہرست لکھ رہا تھا۔ خواجہ حسین نے  
جلدبازی کر کے وہ کاغذ محرر کے ہاتھ سے پھین لیا اور ہر کپڑے کی قسم نام تفصیل و وضاحت سے لکھنے لگا اور خود  
ہی اس کی قیمت بھی مقرر کر دی۔ میرزا کو یہ جلدبازی اور اچھا پن اچھا نہ لگا اور وہ مکرر ہو کر محفل سے اٹھ گیا ہاتھتے  
ہوئے کہہ گیا کہ یہ سارے تحفے لوگ لوٹ لیں ہم کو نہیں چاہئیں۔ خواجہ حسین کا جلد ہی کابل میں انتقال ہو گیا۔

قاسم ارسلان | اس کا باپ اپنے آپ کو ارسلان جازب کی نسل سے بتاتا تھا یہ ارسلان سلطان محمود غزنوی کا  
ایک مشہور امیر گزرا ہے۔ قاسم نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص ارسلان رکھا تھا۔ اس کا وطن اصلی

طوس ہے۔ ماوراء النہر میں نشوونما پائی۔

قاسم ارسلان صاحب دیوان شیریں کلام شاعر اچھا خطاط تھا۔ خوش طبع اور خاص و عام میں ہر دلعزیز تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور بے تکلف آدمی تھا۔ تاریخ گوئی میں تو اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:-

خواہم کہ بر سر آرام در حشر از زمینی  
کابنجا بنانہ کیرہ پا ماندہ ناز زمینی

اے نیم جاں آمدہ برب ترا چہ قدر  
جلے کہ خود نگاہ بصد جاں برابر است

مجھے یاد آتا ہے کہ یہ آخری مصرع ایک اور غزل میں اس طرح ہے۔ جس کے کہنے والے کا نام معلوم نہیں ہے۔

وہ شعر یہ ہے

با نکہ بہت خلوت وصل تو بے رقیب  
مشرم تو با ہزار نگہاں برابر است

اسی کا شعر ہے

لفظ و معنی مجال من گریند  
بے تو چوں روی در کتاب کنم

گیاں چو بسر منزل احباب گزشتیم  
صدر تہہ در ہر قدم از آب گزشتیم

اس نے کوہ اجمیر کی تعریف میں جو حضرت خواجہ اجمیر کا مدفن ہے، مثنوی کہی ہے۔

زہے کوہ اجمیر غیب سرشت	مقام سر مقتدا یاں چست
چہ کوہے کہ چوں سود بہاوج سر	محیط پھر کش بود تا کر
من ایند جوم نہ و آفتاب	براہ کوہ مانند چشم عتاب
چو خود شید روی حیاں چشم ہا	کواکب بود رنگ آں چشم ہا
بے نہر طائر بگردوں شتفت	کہ بر قلہ اش راہ یا بد نیافت
شود گر ازاں قلعہ سگی رہا	بزیر فلک ساز نہم قلعہ ہا
نہ بر قست ہر سود رخشاں زینغ	کہ آں کوہ را سود بر چرخ تیغ
نہ بالائی آں قلعہ گاہ نگاہ	فلک چشمہ و چشم ماہی است ماہ

بروسیل آں قلعہ پر شکوہ      ہزاراں چو الوند و البرز کوہ  
چو بر خیز داند وامن آں عقاب      فتد سایہ اش بر مہ و آفتاب  
بیں ارسلان رفعت پایہ اش      کہ جا کردہ خورشید در سایہ اش  
ملانے اس سال جب کہ بادشاہ نے اٹک سے آکر لاہور میں قیام کیا تھا ۹۹۵ھ میں وفات پائی۔

یہاں تک میں نے بلا ترتیب ان چار شاعروں کا اس لیے تذکرہ کر دیا کہ یہ شاعری میں بڑے مشہور اور نامور ہیں۔  
اس کے بعد میں جن شاعروں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کروں گا  
بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آیا تھا۔ لشکر میں واقعہ نویس تھا۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانہ  
میں بھی وہ اچھے عہدوں پر فائز رہا۔ ۹۷۳ھ میں لاہور میں فوت ہوا۔

**انتشی قندھاری**

نمونہ کلام :  
سر شکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشاکن  
بیاد رکشتی چشم نشین و سیر و ریاکن

اسی کا شعر ہے :

خنجر بمیاں تیغ بکف چیں بہ جیں باش  
خونہ ریز و جفا پیشہ کنی و بوسہ کیں باش

از علی و نایب خبری را چکند کس      مانل بہ جفا سیمبری را چکت کس

در شفق گشت شب عید نمایاں مہ نو

تا کنیم از پئے جام مے گلگون تگ و دو

ہمایوں بادشاہ کی محفل میں قلعہ ظفر میں اس نے یہ رباعی کہی تھی۔ رباعی

صد شکر کہ شاہ از غم بیماری است      بر خاست و بر مسند اقبال بہ نشست

از صحت ذاتش خبری می گفتند      المنة للند کہ بہ صحت پیوست

مشہد مقدس کے حسینی سیدوں میں سے ہے۔ خوش نویسی میں بڑا ماہر اور سات قلم کا استاد  
انتشرف خاں میرنشی تھا۔ بادشاہ کے امیروں میں شامل تھا۔ شعر کہتا تھا لیکن شاعری تو اس کے لیے بس ایک  
تہمت ہی تھی، بس طبیعت موزوں تھی۔ چند شعر یہ ہیں :-

نار سیدہ زلف ساقی و دوراں جامی

میرسد سنگ ملامت بسبویم چکنم

مائیم بعالم کہ دل شاد نداریم      ناشاد و سے چوں دل خود یا دنداریم



رباعی:- یارب تو مرا باتش قہر مسوز درخانہ دل چراغ ایساں افروز  
ابن خلعت زندگی کہ شد پارہ بجرم از راہ کرم برشتہ عفو بدوز

رباعی

بیفش نمود چوں زہ خالص عیار عشق آں بہ کہ نقد عمر کنم صرف کار عشق  
تا صفحہ جمال تو گل گل شکفتہ است بلبیل صفت مراست بدل خار غار عشق

امیر قاضی اسیری | صاحب فضل و کمال شاعر، حکیم الملک کا ممتاز و پسندیدہ شاگرد تھا۔ اپنے زمانہ کا خوش کلام شاعر  
گزارا ہے۔ چونکہ ہندوستان کی آب و ہوا اس کے موافق نہ تھی اور بادشاہ کی محفل میں باوجود  
اچھی شناسائی کے کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکا تھا اس لیے ولایت چلا گیا اور اپنے آبائی وطن رے میں انتقال کر گیا۔  
یہ اشعار اس کی بلاغت فکر کا نمونہ ہیں:

قاصد رقیب بودہ من فاقل از فریب بے درود علیٰ خود اندر مہیا نہ ساخت

وے کہ بر حال من دل شدہ خندیدن درشت

اضطراب من و خندیدن او دیدن درشت

امروز اضطراب دل من زیادہ است گویا شدہ بکشتی من گرم خوئے تو

دل خستہ ام ز ناوک طفلہ کہ مدعا

در دست او علاوہ بازی کماں ہنر

امید وصل تو نگذاشت تا دم جاں دا و گرنہ روز فراق تو مردن آسان بود

از غیر کنم شکوہ چوں آں سیم تن آید

شاید بھوا داری اور در سخن آید

ہرگز نہ دانا دل من فوق وصالے کرنا زمین و سخن و چشم بہراہ داشت

میرا مامی بچو یہ | یہ کابل کے سید ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں گھوڑے سے گر کر جون پور میں انتقال کیا۔ صاحب دیہان  
شاعر گندے ہیں۔ انھوں نے ایک نازک اتمام محبوب چغتائی سلطان کے مرنے پر ایک تاریخ  
کسی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے

لیکن سوئے رنواں ابلش را ہنوں شد

دلما ز خمش تہ بتہ آخستہ بخوں شد

در نالہ شد و گفت گل از باغ برون شد

سلطان چغتای بود گل گلشن خوبی

در موسم گل عزم سفر کرد ازیں باغ

تا رخ وے از بیل ماتم زوہ جستم

یہ شعر بھی میرا مامی کے ہیں

وصف قدرت بالف چوں کنم اے نخل حیات کہ الف ساکن و قد تو بود در حرکات

دل بہ فکر آں وہاں در تنگنائے حیرت است  
حیرتش رو دادہ از جائے کہ جائے حیرت است  
غافل از یاد تو اے شیریں شمعانی میستم  
گر تو از من غافل من از تو غافل نیستم  
رباعی

اثبات وجود را چہ حاجت بہ بیان  
چوں خود ہمہ اوست آشکارا و نہاں  
گویند بہ نفی غیر بکشائے زباں  
نفی چہ کنم کجاست از غیر نشان  
رباعی

سجادہ نشین مشعبد چرخ کیود  
سیمائی صلاح صبح از رخ بنمود  
شد بہر قیام راست در نیمہ روز  
پیشین بر کوع رفت و دیگر بسجود  
نہایت با سلیقہ شاعر تھا۔ بیس سال تک ہندوستان میں درویشانہ حال میں  
رہا۔ نمونہ کلام:

میر شریف امانی اصفہانی

رو بہ سیل سر شکم بسوئے خانہ او  
کہ گو و غیر بشوید نہ آستانہ او

علت کہ آب زندگی اروی نشان ہد  
کو خضر تا بہ بندہ از ذوق جاں دہد  
تا بہ تیغ چو امانی سر خود در بازم

جاں سپر ساختہ در وصف سپاہ آندام

بزم وصل تو ز ایں غیر اضطراب نیام  
کہ سوئے غیر نظری کئی و تاب ندلم

قاضی احمد غفاری قزوینی | قاضی احمد امام نجم الدین عبدالغفار کی اولاد میں سے ہیں۔ امام موصوف شافعی  
مذہب کی کتاب "حادی" کے مصنف تھے۔ قاضی احمد بیٹے صاحب علم ،

انشاء پر داز مودع اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ان کی ایک کتاب "نگارستان" مشہور ہے جس میں نہایت عجیب  
غریب حالات لکھے ہیں۔ بلاشبہ ایسا دلکش و نادر مجموعہ اس دور میں کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ تاریخ پر ان کی تصنیف  
"نسخ جہاں آراء" ہے۔ جس میں حضرت آدمؑ سے حضور اکرمؐ تک کے حالات اجمالاً بیان کیے ہیں۔

آخر عمر میں سلاطین عراق کی وزارت سے استعفا دے کر بیت الحرام کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور حج  
کی سعادت حاصل کر کے بندرگاہ دایتیل سے ہندوستان آنا چاہتے تھے کہ اجل گریباں گیر ہوئی ۱۰۶۵ھ میں فوت ہوئے  
یہ شعر ان کا ہے

پس از عمرے نشیند گردمی در پیشم آں بد خو  
تہد دل در بزم تو رسم کہ ناگہ زود بر خیزد

میرا شکی قہی | اس کے اشعار میں خیال آفرینی نہایت بلند ہے۔ آصفی کی پیروی کرتا ہے۔ اگرہ میں وفات پائی۔ نمونہ کلام:

از بس کہ سنگ بر سر زد بے تو سینہ چاک  
آں سنگ در کھٹ او گردید مشت خاکی  
بے سنگ از غمت بر سر من دل تنگ خواہم ز  
شمعت نصیر دار شہا بندہ می شود  
صد بار اگر مرش بری زندہ می شود  
متانہ کشتگان تو ہر سو فتادہ اند تیغ ترا مگر کہ بے مئے آب دادہ اند  
بسکہ تن بگداخت بے روز آتش سودا مرا  
گر مہنی زنجیر بر گردن قند در پا مرا  
کہتے ہیں جب مندرجہ بالا مطلع کو میرا شکی نے قندھار میں مولینا صادق کے سامنے پڑھا تو انہوں نے کہا: تم  
نے یہ مضمون امیر خسرو سے اڑایا ہے۔ خسرو نے کہا ہے:

بسکہ بگداخت ز ہجرت تن پرور سودا یم  
کہ مہنی طوق بگردن قند اندر پایم

اشکی کا ایک اور شعر ہے:

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا رفتم  
زہر مورین آید سنگ و نگار و زیا رفتم  
اس نے ”سنگ“ پر اتنے مضمون باندھے ہیں کہ کسی اور کے لیے گنجائش نہیں رہی۔

لا غرتم میاں سگاں میں بکوسے خود  
ایں یک بسوئے خود کشد آں یک بسوئے خود

موتے ز ولیدہ کہ آید ز سر من تا پا ز اں میاں موئے سفید لیست تن من پیدا  
شاملو ترکمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں کے ہاں ملازم ہے۔ نہایت نرم و ملائم اشعار  
کہتا ہے۔ ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

بول قلی انیسی

نمونہ کلام:

آتش کدہ است دل ز خیال تو در برد  
داغ تو ہندوئے کہ نگہاں آتش است  
چو مہنی شعلہ مرا مطرب آتش پرستی ماں کہ روحش ز فتنہ و حشمش در آتش خار میر قصہ

عشق و مقناطیس یک جنس اند کز دل ناکش  
تا بروں می شد محبت جذب پیکاں کردہ بود  
نورسیدہ نوجوان ہے کچھ عرصہ تک گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پہلے خونی تخلص  
رکھا تھا۔ خواجہ مرحوم نے بدل کر ”امنی“ رکھوایا۔ اب بڑے شاہزادہ کی خدمت میں رہتا

املا غنی امنی

نہایت خوش طبع شاعر ہے۔ یہ رہا سہی اس کی ہے:

منم کہ غیر غم اند و ختن نمی دامنم  
تمام اشکم و دا سوختن نمی دامنم  
ہنوز خاطر اگر روشناس خورشیدم  
چراغ بخت خود افروختن نمی دامنم  
اسم بہ مسمیٰ ہے ”فتوحات“ اور ”قصص الحکم“ کی چند گمراہ کن باتیں یاد کر لی ہیں۔ چونکہ فرعون کے  
ایمان کے بارے میں ہر ایک سے بحث کیا کرتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کو ”وکیل فرعون“ کا  
خطاب دے دیا۔ یہ مطلع اسی کا ہے۔

گفتی وفا کنیم با حساب با جفا  
اے شوخ بندہ سخن اویم ما  
”جان قربانی“ نامی گروہ سے متعلق ہے۔ علمی اور حکمی فضیلتوں سے آراستہ ہے۔ اس وقت  
پنج ہزاری امیر ہے۔ دین کے بارے میں اس کا اعتقاد درست ہے۔ کچھ عرصہ تک جماعتہ الملک  
کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ ان دنوں کابل کی حکومت پر مامور کیا گیا ہے۔ طبیعت میں شعر و نظم کا اچھا سلیقہ  
اور ملکہ ہے۔

نمونہ کلام:

تازہ عارض آفتاب من نقاب انداختہ      ذرہ ساں خورشید را در اضطراب انداختہ  
کشتہ تاں نرگس مستم کہ در عین خمار      علمے را کشتہ و خود را بخواب انداختہ  
دو ترک مست تو آشوب عقل و دین مستند  
کماں کشیدہ زیر گوشہ در کین مستند  
نیست در دل غنچہ پیکاں آں قاتل مرا      بے لبش خونی کہ خود دم شد گره در دل مرا  
علوم ریاضی میں بڑا ماہر تھا۔ خان زمان کے ساتھیوں میں شامل تھا، انہی ہنگاموں میں گرفتار ہوا  
اگرچہ قتل ہونے سے بچ گیا لیکن موت سے جان نہ بچا سکا۔

افتی یزدی

اسی کا ایک مطلع ہے ۔

تاگر و صفت دامن یاری نگر فقیم  
از پانہ نشستیم و قرار ی نہ گر فقیم  
اس مطلع پر خان زمان نے ایک ہزار روپیہ صلہ دیا تھا ۔

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمراہ خویش  
دو نہود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

**افتی عراقی** | کچھ عرصہ تو وہ کشمیر میں میرزا یوسف خاں کے پاس رہا ۔ وہاں اس نے ایک ”شہر آشوب“ کہا  
تھا جس کا شعور ہے ۔

سرموئے مویشک پداں درخت شعراست  
قد جونا و بروت سرطان را عشق است  
اسی شہر آشوب میں میرزا یوسف خاں کے ایک محبوب کے متعلق کہا تھا ۔  
مرزا یوسف خاں زمان را عشق مست  
عشق پاک تو و خط دگراں را عشق مست

**بیرم خاں خان خاناں** | بیرم خاں مرزا جہان شاہ کی اولاد میں سے ہے ۔ دانائی، سخاوت، خلوص، حسن اخلاق  
نیاز مندی و انکساری میں کوئی اس کی مثال نہ تھا ۔

ابتدا میں بابر بادشاہ کے ساتھ رہا ۔ پھر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں ترقی کی اور خان خاناں کا خطاب پایا ۔ اکبر  
بادشاہ نے اس کے القاب میں ”بابام“ (میرے بابا) کا اضافہ کر دیا ۔

بیرم خاں فقراء اور درویشوں کا معتقد، خود صاحب حال اور خوش خیال آدمی تھا ۔ یہ اس کی کوشش، بہادری  
اور حسن تدبیر تھی کہ ہندوستان دوسری بار مغلوں کے ہاتھ پر فتح ہوا اور ایک مضبوط سلطنت قائم ہوئی ۔  
اس کی فیاضی کا ایسا شہرہ تھا کہ دور دراز سے اہل علم و فضل آتے تھے اور اس کی بارگاہ سے ملامتیں ہو کر جاتے  
تھے ۔ ایک دنیا اس کی شخصیت پر ناز کرتی تھی ۔ آخر زمانہ میں دشمنوں نے اکبر کو اس سے بدظن کر دیا، پھر اس کا جو حشر  
ہوا وہ ہم بیان کر آئے ہیں ۔

اس کا ایک دیوان فارسی میں اور ایک ترکی میں ہے جو نہایت مشہور ہوا ہے ۔  
نمونہ کلام :

رباعی

ارباب فنا بلند و پست ایشانند      وز جام بقا مدام مست ایشانند  
در معرض نیستی است ہر چیز کہ ہست      میداں یہ یقین کہ ہر چہ ہست ایشانند



اسے کوئے تو کعبہ سعادت مارا      رومی رومی تو قبلہ ارادت مارا  
خوش آنکہ بجز یہ عنایت سازی      داریستہ ز قید رسم و عادت مارا  
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے :

شہی کہ بگذرد از نہ سپہر افلاک      اگر غلام علی نیست خاک بر سر او  
محبت شہ مرداں مجوز ہے پیری      کہ دست غیر گرفت است پائے اور او

ایک اور قصیدہ اصغر لابل کے بارے میں کہا ہے جس کا مطلع ہے :

آں چرخ چسیت کا مدہ بہ محو رخ ملار      آں بدر کنہ میانہ شہابش کند گزار  
با آنکہ می کند بہ مہ و نور برابری      آمد بجاں ز حلقہ بگوشاں شہریار  
نار و بہ چشم کو کبہ آفتاب را      چوں مہچہ لہوائے شہنشاہ نامدار  
پیوستہ آسمان وز میں زیر حکم دوست      ہچوں نگین خاتم شاہ جم اقتدار  
برکت نہادہ خواں زری پر زرا شرفی      تا بر قدم اشرف شاہاں کند نثار  
شاہ بلند قدر ہمایوں کہ از شرف      بر در گیش سپہر نندروٹے افتقار

کہتے ہیں ایک رات ہمایوں بیرم خاں سے گفتگو کرتے رہا تھا۔ بات کرتے کرتے بیرم خاں پر غنودگی طاری ہو گئی۔ بادشاہ نے ہوشیار کرنے کے لیے کہا ”او بیرم میں تجھ سے کہہ رہا ہوں“ بیرم چونک کر اٹھ بیٹھا اور کہا ”ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں لیکن میں نے سنا ہوا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے آنکھوں کی، درویشوں کے سامنے دل کی اور عالموں کے سامنے زبان کی حفاظت و احتیاط رکھنی چاہیے۔ میں اس فکر میں گم تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی اور عالم بھی۔ میں آخر کن کن چیزوں کی حفاظت کروں۔ ہمایوں کو اس کا یہ جواب بہت پسند آیا اور بہت تعریف کی۔

بیرم خاں ۹۶۵ھ میں پٹن گجرات میں شہید ہو گیا۔ اس کی ہڈیاں وصیت کے مطابق مشہد میں لے جا کر دفن کی گئیں۔

نہایت فاضل و کامل شخص تھا۔ حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر ہندوستان آیا۔ عرب میں حدیث کی بعض کتابیں مشکوٰۃ وغیرہ پڑھیں اور میر مرتضیٰ شریفی سے سیرت و شمائل نبویؐ کا درس لیا۔

بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن لوٹ آیا لیکن بمقام پر شاہ ۹۷۳ھ کو اس کا انتقال ہو گیا۔

نمونہ کلام:

دردیر و کعبہ جز بتو مائل نبودہ ام      ہر جا کہ بودہ ام ز تو خافل نبودہ ام

فلک مار رسم بے مہری نہ در دوراں نابودہ      کہ دوران فلک تا بودہ بے مہر و وفا بودہ

بے کسی گزشتہ و طعنہ و دشمن صد بار      لائق آنست کہ آشفتنہ و درہم نشود

نہ آنکہ ایں بیت کمال است بعالم مشہور      ایں چنیں بیت چرا شہرہ عالم نشود

سنگ بدگوہر اگر کا سہ زریں شکند      قیمت سنگ نے فزائد و زر کم نشود

## رباعی

اے دل تو عین بغض و غم نہ ہی      یک لحظہ خوشی بملکت جم نہ ہی  
 یاری اگر ت بدست افتد ز نہار      خاک قدمش بہر دو عالم نہ ہی  
 مولینا بیکی نے لکھا ہے کہ — ”ایک دن غفران پناہ ہمایوں بادشاہ نے دارالخلافہ دہلی میں ایک محل  
 کے طاق پہرہ شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے خطِ خاص سے لکھا تھا کہ  
 شہیدہ ام کہ بریں طارم ز راند و داست  
 خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است  
 اتفاق کہ ہمایوں کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہو گیا اور اسے اسی محل میں دفن کیا گیا۔ یہ ہمایوں کی کرامت ہی کہی جاسکتی  
 ہے۔“

مولینا بیکی نے یہ واقعہ لکھ کر حسب ذیل قطعہ بھی درج کر دیا جو لکھتے ہوئے موزوں ہو گیا تھا۔ قطعہ:-  
 وریں کہ شاہ ہمایوں بوقت رحلت خویش      نوشت بہر درہر منزلے کہ ساکن بود  
 خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است      بجن کہ عاقبت خود اشارتے فرمود  
 چو شد بحکم قضا مدفنش ہماں منزل      کہ بود قبلہ صحابات و کعبہ مقصود  
 بنائیں پئے تاریخ رحلتش گفتم  
 بنائے منزل سلطان عاقبت محمود

شاعرانہ طبیعت دکھتا تھا۔ یہ اشعار اسی کے ہیں:

## باقی کولابی

ز فرقت تو گرفتار صدالم شدہ ام  
 تو شاو باش کہ من مبتلائے غم شدہ ام  
 خواباں اگر ندانند امروز قدر مارا      دانند قدر مارا فردا کہ مانہ شیم  
 بچشم گاہ خوں دل گئی خون جگر بستہ  
 من غم دیدہ راپے روی او ماہ نظر بستہ  
 نگردو ہچو سرو آزاد در باغ جہاں ہرگز  
 چو زنگس ہر کہ او چشم طمع در سیم و زر بستہ

باقی کافی عرصہ تک ہندوستان میں رہا۔ معصوم کابلی کی بغاوت میں مارا گیا۔

یہ آگرہ میں ایک آزاد مشرب وارفہ شخص تھا۔ اس کا مطلع ہے کہ

## بیاضی

ہر کہ براند و صل آں سرو سمن بر خود  
 از خوشی طالعست طالع خوش بر خود

اس نے ایک باغی میں کاہی اور غزالی کا محاکمہ کیا ہے:

کاہی و غزالی آں دو لا یعقل مست      در غیبت جامی و نوائی زودہ دست  
در دہر کسی بے مثل اینہاں نگذشت      کاہی چرخس است و ہم غزالی چہ گشت  
خواجہ آصفی کا پیرو ہے۔ مصوری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صورت سے حقیقت کی طرف کھینچ لے جانا  
اس کا فن ہے۔ اس نے ایک رسالہ "صورت و معنی" بھی لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے یہ  
خداوند از معنی تنگ و ستم      یہ بخشائی کہ بس صورت پر ستم  
ز لطف خویشتن اے ایزد پاک      چنان سازی بصورت خانہ خاک  
کہ ہر صورت مرا کنہ دیدہ آید      بسوئے معینم روئے مناید  
پیروی کے اور شعریہ ہیں یہ

بے درد را شراب محبت کجا دہند  
کیفیتی است عشق بتاں تا کردہند  
خواب دیدم بار قییش در دل افتاد اضطراب  
نظر چوں افگنم وقت تماشا بر مہ روش  
مردہ بوم دید اگر بیدار می گشتم ز خواب  
غتاب آلودہ بیند سوئے من تا نگرم سوش  
چوں بنگر و نہ شرم نظر بر ز میں کنم  
خوش تیجانہ دریں رہ قدمی پیش نہاد  
یا رسا نام جفا پیشہ و بد کیش نہاد  
کاں مہ مباد باد گری آشنا شود  
رفتم در اضطراب چو از من جدا شود

اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے۔ ہندوستان میں فوت ہوا۔

ولایت ایران سے بنایا آیا ہوا ہے۔ دکن میں ملک قلمی شاعر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں سے گجرات پہنچا اور  
میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہنے لگا۔ پہلے اس کا تخلص مشغولی تھا، مرزا نے بدل کر بقائی رکھ دیا اس

بقائی

کے اشعار میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے حالات باوضع و متوازن ہیں یہ

تا عشق ز مرگاں بتاں بیشتر آورد      خون از رگ از ریشہ من جوش بر آورد  
فریاد کہ تا چشم زدن تیر خیش      در دیدہ فرو رفت و سراز دل بر آورد  
بجائے اشک از چشمم دل افکار می بارد  
ہمہ خون جگر زیں ابر آتش یار می بارد

مرغ دل تا صید چشم او شکار اندازد بود      ہر مرغ بود بر سر چوں مرغ در پر واز بود  
اس نے اب خان خانان کی ملازمت ترک کر دی ہے۔ کہتے ہیں آگاہ آیا ہوا ہے اور لاہور کا ارادہ رکھتا ہے۔

**ملا نور الدین محمد ترخان** | پہلے نوری تخلص تھا۔ چند سال تک سر ہند کے مصنفات میں سفیدونی نامی پرگنہ کا جاگیردار رہا اس لیے سفیدونی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں بڑا ماہر و ممتاز تھا۔ ہمایوں کا ہم راز و ہم سخن مصاحب تھا۔ اسی ربا سے اسے ترخان کا خطاب ملا۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں بے مثل آدمی تھا۔ شعر کہنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ایک دن فتح پور میں چوگان بازی کے میدان میں ایک ہاتھی نے اسے زخمی کر دیا۔ کہا کرتا تھا: ”گواہ رہو کہ میں نے اس اذیت و پریشانی میں بعض باتوں سے توبہ کر لی ہے“ لوگوں نے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا کہ آخر کن باتوں سے توبہ کی؟ لیکن کسی خاص بات کا ذکر نہ کیا۔ اس وقت میں نے کہا: ”پہلی وہ چیز جس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ شعر ہی ہے مگر اس کو پتہ نہیں میرا فقرہ پسند آیا یا نہیں لیکن دوسرے بہت خوش ہوئے۔“

اس نے اپنے حمد حکومت میں جتنا سے ایک نر کھدوائی تھی جو پچاس کوس کرناں بلکہ اس سے بھی آگے تک جاتی تھی۔ اس نر سے اس واقعہ میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوش حالی ہو گئی۔ یہ نر اس نے شہزادہ سلیم کے نام پر بنائی تھی۔ اس کی تاریخ اس نے ”شیخوئی“ نکالی ہے (شیخو تو سلیم کا عرف تھا) اور نئی ہندی زبان میں نر کو کہتے ہیں۔

بعد میں اس کے حالات بہت ابتر ہو گئے اور اس نے بڑی مصیبتیں اور غم برداشت کیے۔ جس وقت اکبر بادشاہ ۹۹۴ھ میں انگ تشریف لے گئے تھے تو اسے دہلی میں ہمایوں کا مقبرہ کا متولی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ میں اس نے انتقال کیا۔ نمونہ کلام:

دل تنگ دور ازاں لب خنداں نشہ ام

مانند غنچہ سر بگریباں نشہ ام

زروئے مکرمت وز راہ احسان بہ ترخان داد خانی شاہ عادل

ازیں خانی ہمیں نامیت بروئے ازیں نام شگرت اورا چہ حاصل

ز ترخان ہم اورا شکوہ ہست بہ نزد خسرو دانائے کامل

کہ غیر از خان خشکی می ماند ز ترخان تری گردو چو زائل

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا پر لشکر کشی کی تھی خان مذکور حکم عدولی کر کے ۹۸۹ھ میں پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ بس یہ بات بادشاہ کی بدگمانی کا سبب بن گئی۔ جب اکبر اس سفر سے واپس آیا تو فتح پور میں شاہی عتاب میں رہا اور حساب کتاب کے سلسلہ میں چند سال تک سزائیں بھگتا رہا۔

واقف کار لوگ اس کے زوال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ تاتار خاں حاکم دہلی سے اس کی مخالفت تھی۔ اس نے تاتار خاں پر ایک ہجو کہی۔ اس ہجو میں دہلی کے بزرگوں کی شان میں بھی بے ادبی کر گیا۔ بس اسی بے ادبی کا وبال اس پر پڑا تھا۔

س نے یہ ہجو قاسم کا ہی کے نام سے منسوب کر کے مشہور کرادی تھی جس کے شعر یہ ہیں:-

مفتی دہلی ست میاں حناں جہاں      مفت ندادہ است فتاوات  
حاکم شہرست ز تاتار حناں      خادم اوچہرہ حمارات  
شیخ حسن چک زندہ بز مہری      چک چک بسیار وجکاجات  
وقت صلوة ست طہارت      مقری برآمد بہ منارات  
شہرکش و شہرکش و شہرکش      لک لک بسیار و لکالات  
اسی ہجو کا مطلع ہے یہ

آہ نہ دہلی و مزارات      واہ نہ خرابی عمارات  
اس ہجو میں دو سو پچاس شعر ہیں۔ دہلی کے ایک فاضل بزرگ نے جن کا نام شیخ محمد کنبوہ تھا۔ ان تمام اشعار  
جواب میں ایک ہی شعر میں دے دیا۔ قطع۔

نورالدین لادہ پدر او ازیں  
زادہ چنین لادہ ز لادات  
چک زندہ آں آبلہ بیہودہ گوئی  
لیس جواب بخسرات

اسی زمین میں مولوی نورالدین عبدالرحمن جامی کا قطع ہے:

آہ من العشق وحالات  
احرق قلبی بجزارات  
مانظر العین الی غیر کم  
اقسم باللہ و آیات

کہاں مولینا نورالدین جامی اور یہ نورالدین جو اپنے آپ کو جامی سمجھنے لگا تھا

گرفتہ ہمارے بانی کا نہ ہم نامی چہ سود  
یک میسج ابراہی اکہ کرد و دیگر عورت

بہر حال آدمی لائق تھا، ممکن ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوا ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو ان مصیبتوں اور دکھوں  
کو اس کی غلطیوں کا کفارہ بنا دے۔

جب نورالدین اپنے عہدہ سے معزول ہو کر آگرہ آیا ہوا تھا۔ ایک دن میں بازار جارا ہوا تھا کہ وہ اچانک سامنے  
سے نمودار ہوا۔ میرے ساتھیوں میں سے میاں کمال الدین حسین شیرازی نے جو نہایت خوش مزاج ظریف آدمی تھا اور  
آگرہ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، نورالدین سے کہا: نواب خاں دہلی کے بزرگوں کا نام تو آپ نے لیا



اب اگر آگرہ کے بزرگوں پر بھی جناب مہربانی فرمائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا: ”معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ کے بزرگوں میں کوئی قابلیت نہیں پاتے کہ ان کا تذکرہ کریں۔“ میری بات پر وہ مہنس دیا اور کہا: ”وہ ایک بہتان ہے جو محمد پر باندھا گیا ہے۔“

ماوراءالنہر کا رہنے والا ہے۔ لطیف طبع آدمی ہے۔ پہلے الف میرزا کے مصاحبوں میں تھا۔  
**تروی اودھ** جس زمانہ میں ان میرزاؤں نے قلعہ بھڑوچ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے یہ رباعی کہی تھی:

اولاد مگر کہ در شجاعت سر دند  
 شد فتح بہر کجا کہ رد آور دند  
 کہ دند چو فتح بہروج از روئے ستیز  
 تاریخ شد ایں کہ فتح بہروج کردند

اس کا نام منوہر ہے۔ سانبر کے صاحبہ لون کرن کا بیٹا ہے۔ سانبر کا نمک نادر مشہور ہے۔ توسنی کے کلام میں  
**توسنی** بھی بڑی نمکینی پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کا سارا نمک بس اسی کے کلام میں بس گیا ہے۔

توسنی نہایت خوب صورت اور ذہین شاعر ہے۔ پہلے اس کا نام محمد منوہر تھا بعد میں بادشاہ نے اسے میرزا منوہر کا خطاب دیا لیکن اس کا باپ باوجود کافر ہونے کے اسی پرانے نام محمد منوہر پر فخر کرتا تھا۔ اگرچہ ”محمد“ جیسے ناموں سے نسبت اکبر کو پسند نہ تھی۔

توسنی نہایت موزوں طبع تھا جس کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے۔

شیخ مستغنی بدیں و برہمن مغرور کفر  
 مست حسن دوست را با کفر و ایمان کل نیست

رباعی

بے عشق تو در جگر لبالب ناراست بے درد تو در سرم سدا سرخراست  
 بت خانہ و کعبہ ہر دو نزد م کفر است مارا بہ یگانگی ایزد و کار است  
 جس وقت بادشاہ نے اس کا تختہ رکھا تھا اس نے چند شعر کہے تھے:

شربت آشا مایا در بزم مادر وی نشا کز جگر در کف کباب و خون دل در ساغر است  
 تنگ مرعاست حرف از جان و دل گفتن عشق دل چو خون سخت بستہ جاں بہ باد مرصراست  
 توسنی ہر وہ سمند شوق در میدان عشق می رسی امین بمقصد ہیرت چوں اکبر است  
 ایک ہندو سے یہ جو دت طبع اور کمال شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے۔

**تذرونی ابھرتی** | حولینا ترگی کا بھانجلہ ہے۔ لطافت طبع اور ذہانت میں ممتاز تھا۔ بیرم خاں کے عہد اقتدار میں روم سے ہندوستان آیا اور اسی کے ہاں تربیت و ترقی پائی۔ ایک کوہستانی لڑائی میں انکے خاں نے اسے قید کر لیا اور اکبر خاں کے ساز و سامان امام ہشتم علی رضا کے علم کے ساتھ اسے بھی مال غنیمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو اس کا کلام نہایت پسند آیا۔ اس نے ”حسن و یوسف“ کے نام سے ایک رسالہ آنکھ خاں کے لڑکے یوسف محمد خاں کے نام پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے ۷

بنام آنکھ روئے دشمن و دوست

بہر جانب کہ باشد جانب دوست

محبوب کے سراپا کی تعریف اس مثنوی میں اس طرح کی ہے۔

رخش آئینہ گردن دستہ علاج	پہ پی رویاں یاں آئینہ محتاج
کفش چوں آفتاب آئینہ نور	شعاع آفتاب انگشت آں جود
بچشم عقل و سرق آں شکر لب	شہابی بود رخشاں در دل شب
ندانستم غلط کردم شہا بی	میاں سنبلیستاں جوئی آبی
ز تافش آرزو پریدہ امینہ	بچاہ نا امید می ماندہ جاوید
ہوس گردیدہ گردش گاہ بیگاہ	چو صید تشنہ بر پیرامن چاہ
فرز بنی آں غنل مقصود	مقوس ابرواں و سمہ آلود
دمیدہ بر خلافت رسم و آئین	دوبرگ سوسن از یک شاخ نسریں
بچشم بنی آں نور دیدہ	بود چوں شب غمی بر گل دمیدہ
بہر بیج عصمت آں در ناسفت	دوماہ نوشدہ بایک دگر جفت
بلطف از غنچہ سوسن زیلہ	زباں در کام و لب بر لب نہادہ

اس نے عماد کے ”وہ نامہ“ کا بھی جواب لکھا تھا، جس کے چند شعر ہیں :-

لذہ حسرت عمل آبدارت	وز فرقت زلف تابدارت
موتے شدہ جسم ناتوانش	در جسم منڈانہ بجائے جانش
خون ست دلش ز عرصہ و عشم	خوں می خورد و نمی زند دم

بیج کی تعریف میں لکھتا ہے ۷

خاکستر صبح رفت بر باد  
در پنبہ صبح آتش افتاد

سربز انوچوں نہم در ہجر آں پیمیاں گسل  
 تودہ خاکستری گرد و تنم از سوزِ دل  
 شود از بہر قلم چوں علم تیغ جفاے او      نظم را بہانہ سازم و رفتہ بیائے او  
 جفاے علمے بر خود پسندیدم نہ انتم      کہ چنداں اعتمادے نیست بر مہر و فائے او  
 در حقیقت بخیر ہائے خرقرہ پشیمین فقر  
 حرص را بر دستِ ماز بخیر استغنا ہند  
 گردے عشق بر سنجابِ سلطانی زند خدہ      چو با جسم غبار آلودہ از گلخن بروں آید  
 گرد ہستی رفت برباد و ہنوز از آب چشم  
 خاکساراں رہ عشق ترا پا در گل است

تیغ مرگان تو اندر بخودی آمد نیاز      چوں بخود باز آدم صدر خنہ در جان داشتم  
 بادشاہ کے حکم سے اس نے ہاتھی کی تعریف کی تھی ۵  
 ز خاک رہ شاہ گردوں سریر      پئے عطر بر خود فشاند عبیر  
 عقاب فلک بر ہر شش بے گزاف      بود پشہ فتد کوہ قاف  
 میاں را چو بند بند بنہ بخیر زہر      بود کمکشاں و فلک در نظر  
 چو آید بہ تنگ از تف آفتاب      فشاند چو نوارہ بر خویش آب  
 نشینند دامن بید و لبری      بی کوہ قاف است جائے پری  
 ۵۹ میں چوروں نے اسے تلوار مار کر شہید کر دیا۔ اگر وہ میں دفن کیا گیا۔

**تشبیہی کاشی** | دو تین بار ہندوستان آکر چلا گیا۔ اس زمانہ میں پھر آیا ہوا ہے اور اتحاد و یکے دینی پھیلانے میں مصروف ہے۔ بخوانی مسلک کا داعی ہے۔ اپنے آپ کو شیخ ابوالفضل سے بڑا مجتہد سمجھتا ہے تو سل و سفارش سے دربار میں باریابی حاصل کر لی ہے اور اکبر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ہے جس میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ایک شوہر کو تقلید پرستوں کو بالکل ختم کر دو تاکہ حق اپنے مرکز پر پوری طرح استوار ہو جائے اور خالص توحید رواج پائے۔ اس نے ایک رسالہ شیخ ابوالفضل کے نام سے منسوب کیا ہے جو حروف و نقطوں کی ترتیب بازی کا نمونہ ہے اور اس میں عددی مناسبتیں پیدا کی ہیں۔

حکیم عین الملک نے اس کے تخلص "تشبیہی" کے اعداد و لفظ "تذریقی" کے مطابق نکالے ہیں جو اس کے مکرور ذوق سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی بکواس کا نمونہ یہ ہے۔

یکے بر خود ببال ال خاک گورستان ز شادابی      کہ چوں من کشتہ زان دست و خنجر و لحد واری

تو ہر رنگ کے خواہی جامہ می پوش  
 کہ من آن جلوہ قد می شناسم  
 وردست این جہاں و آں جہاں پوچ کچہ وردست تست این پوچ و آں پوچ  
 اس نے شیخ ابوالفضل کی محفل میں محمود بسا خوانی کا رسالہ مجھے دیا تھا، جس کا دیباچہ تھا:  
 ”یا اللہ المصمود فی کل مغالہ استعین بنفسک الذی لا الہ الا هو الحمد للہ الذی  
 وجدہ بعدہ بوجود کلیاتہ واظہر وجود الکلیات عن نفسه سہوہم کلیا وهو یعلم  
 نفسه ولا تعلم نفوسنا ولا ہو کون لا یکن الایہ و مکان لا بغیرہ وهو  
 الواحد الرحیمین“

سوال: یہ جو ”خلق“ کہا جاتا ہے وہ کون ہے؟

جواب: یہ جو ”خلق“ کہا جاتا ہے وہ اللہ ہے!

اس کے منہ میں خاک دیکھو کیسی بکو اس کی ہے۔ اس کے مذہبی جعل کا چارہ نقطوں پر انحصار ہے جنہیں اس  
 نے اس رسالہ کے آخر میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ ”کتب مکر الکرار بجانب عجی مجتہدی طبارع ای کرب لت شب  
 ی ہ ی النوی اخروی صاحب مقام“ — بقیہ رسالہ کا اسی پر قیاس کر لو۔

دربار شاہی میں نووارد ہے۔ علوم عقلی و نقلی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ شعر بھی اچھے کہہ لیتا  
 ہے۔ طبیعت موزوں اور شاعرانہ ہے۔

**تقی الدین شستری**

نمونہ کلام:

گردست ندہم کہ برویم نظر کنم  
 باری دہان بیا و لبنت پر شکر کنم  
 با آنکہ ہچو سبزہ بجا کم نشاندہ  
 دست دولی کجاست کہ خاکی لبہم کنم

ان دنوں وہ بادشاہ کے حکم سے شاہنامہ کو نثر میں لکھ رہا ہے گویا محفل کو ٹاٹ سے بدلنے میں مصروف ہے۔

پڑھے قدیم امیروں میں سے ہے۔ دانائی، تدبیر اور حسن ذوق میں مشہور ہے اس کے پاس  
 جب کسی شخص کے علم و فضل کی تعریف کر کے پیش کیا جاتا تو وہ پہلی ہی ملاقات میں...

**ثانی خاں ہروی**

اس سے کتا تھا کہ ہمارے ساتھ دوستی اور محبت کی شرط یہ ہے کہ ہمارے متعلق کمینوں اور باتوں کی کہی ہوئی باتوں پر کان  
 نہ دھرو کیونکہ یہ لوگ خلوص کے دشمن اور نفاق کے بانی ہوتے ہیں۔ اس کے اشعار بے نمک ہوتے ہیں۔ تاہم اس نے اپنا  
 دیوان مکمل کر لیا ہے۔ نمونہ کلام:

اے رسم تو آنرا بہ من وقاعدہ بیداو بیداد ازیں رسم و ازیں قاعدہ فریاد

بگذر ز ناخوش کہ درین دیر دیر گیر  
 نیکی ندید ہر کہ بدی کرد با فقیر  
 از بہر سلام تو رقیب آمدہ در راہ یارب کہ ازین رہ نبرد سر سلامت  
 رباعی :-

دیدم ز فراق آنکہ یعقوب ندید  
 در عشق کشیدم آنچہ مجنوں نکشید  
 ایں واقعہ کنہ ہجر تو آمدہ بسم  
 فرہاد گماں نبرد و دامت تشنید

ثانی خاں کا اصل نام علی اکبر ہے۔ شاید یہی نام کی مناسبت ہے کہ اس نے بھی الحاد و بے دینی کی تائید میں رسالے لکھے ہیں اور فنِ نقط کی منابتیں پیدا کر کے بادشاہ کو اور شاید خود کو وہ شخصیت سمجھتا ہے جو لفظ "شخص" کے اعداد کے مطابق ۹۹۰ میں ظہور کرنے والی ہے۔ محمود بخوانی کے عقاید بھی ان رسالوں میں بیان کیے ہیں ان سب پر خدا کی لعنت، نصوت پر بھی ایک منظوم رسالہ لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ بیت اسی کی ہے۔ ۸

احرنجم بحسب نجم احرنجما مصدر  
 غالباً آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی۔

اس کا نام خواجہ حسین ہے۔ ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کی شہرت پہنچ چکی تھی، چنانچہ  
**ثنائی مشہدی** | یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو طرح بنا کر محفلِ سخن منعقد کیا کرتے تھے اور ہر شاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ بلا اختلاف سب اس کی استاد کی قائل تھیں، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کو جھلسا کر رکھ دیا اور وہ بچار اگوشہ و گنگامی میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا۔

اس کا دیوان مشہور ہے۔ ایک بہت اچھی شنوی بھی لکھی ہے۔ کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح شان دار نہیں۔ شاعرانہ ذوق نہایت بلند ہے، بجز تو حید و منقبت کے تمام اصنافِ سخن میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اسی کا شعر ہے: ۵

چناں ناز بارو نہ پا تا سرکش  
 کہ رفتن تو اں ناز از بسترکش

مگر اس کے استاد کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے ۵

عشورہ انداز ز میں ناز فشاندا ز ہوا  
 طرز خرام کردن و پا بز میں نہادش

نمونہ کلام:

گر بشل جا کند در پیش آئینہ شخص بند تماشال خویش تافتہ رو بر قضا  
 بسکہ از خانہ غم بروں ریزم تنگی رخانہ از بروں وز است



ایچی کی تعریف اس طرح کی ہے :

چو مہر فلک دہر گر دیدہ  
مگر شمع دست تست آفتاب  
سیاہی دریاں قوم طالع زحل  
شود بیدن شمع ہر موئے شاں

اس کے مزید اشعار :

آواز کفش شاں بدروز ہرہ از حیات  
رفتار شاں چو آتش و گفتار شاں چو جنگ  
گر در خیال دایہ کند شخص شاں گذر  
اصوات زشت شاں نبرد راہ در ضمیر  
ویدار شاں عقوبت و آواز شاں نفیر  
کودک ز بیم شاں نبرد لب بسوئے شیر

امی از فروغ شمع رخت انور آئینہ  
آئینہ بس دیدن خود پیش رو منہ  
آئینہ دار در دلم آتش علم کشید  
تف سموم قہر تو گر شعلہ در شود

### ساقی نامہ

بیاد دل بہ مے حسانہ اصل راز  
چناں خویش را کن از صورت بری  
مگر شوق آں رہنمایت شود  
بیا ساقی آن شمع خلوت نشیں  
بدستم دہ درو شمن ساز دست  
بیا ساقی از ہر رندان مست  
نگہ کن بدو و مہر س از و بال  
بدہ ساقی آں کسد با فی وجہ و  
زخم خیمہ پیروں از میں جائے پست  
بیا ساقی آں بادہ گوم خوں  
بدہ تا کتم آشنائی بد دست

اس ساقی نامہ میں عامیانہ رنگ ہے۔ ہر جگہ اس نے ”بیا“ (آؤ)، کا لفظ ”بیار“ (لاؤ) کے معنوں میں

استعمال کیا ہے۔ غالباً اساتذہ کی نگارشات کو بھی اس نے اسی طرح قیاس کیا ہے حالانکہ ان کی عبارت قطعہ ہوتی ہے اور پہلا شعر دوسرے سے مل کر معنی دیتا ہے۔

اس نے آفتاب پر بھی قصیدہ کہا ہے جس کا ایک شعر ہے۔

عکس کند طبیعت یمن عیاں در آب  
ساز و ز خاک قدرش اگر افسر آفتاب

اس کے قصائد میں مضمون کی تو بلندی مانتی ہے لیکن عبارت بڑی پست ہوتی ہے، وہی مثل ہوئی ہے

خانہاں شان بلند و ہمت پست

یارب این ہر دورا برابر کن

نام میر سید علی ہے۔ یہ مصود بھی ہے اور کئی حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ہر تصویر شاہکار ہے۔ ہندوستان میں وہ اپنے دور کا مافی ہے۔ داستان امیر حمزہ جو مصود سولہ جلدوں میں ہے اس کے اہتمام میں مکمل ہوئی۔ اس کی ہر جلد ایک گنجینہ اور ہر ورق ایک مرقع اور صفحہ صفحہ منقش ہے۔ شاعری میں اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام:

صبح دم خار دم از ہمدی گل میزد  
ناخن در دل صد پارہ بلبل میزد  
حسن بتاں کعبہ ایست عشق بیا باں او  
سرزنش ناکساں خار مغیلاں او  
پرورم از داغ سودائی تو سرتاپائی ماست  
تاجر عشقیم وایتھا مایہ سودائی ماست  
نیم بمل صیدم واقفا وہ دور از کوئے دوست  
میر دم افتاں و خیزاں تا بہ بنیم روئے دوست  
خواستم گویم از احوال خود آں بد خورا  
ہمہ دم ہمدم غیر است چگویم اورا  
نام بادشاہ قلی ہے۔ شاہ قلی خاں نارنجی کا بیٹا ہے موزوں طبع شاعر ہے۔

جذبہ

نمونہ کلام:

ایں چاشنی کہ حسن ازل بابتاں دہد  
جائے رسید عشق کہ بے درد جاں دہد  
غایت ز شکم نگہ کنز بیخودی ایم بہ ہوش۔ گے آگاہ شود کیں گفتگو زیاد کیست  
تو آں شکاری بے قیدی دمن آں صیدم  
کہ از نہایت خصمی نمی کشد صیاد  
آنی کہ لذت شب ہجراں ندیدہ  
خود را روز وصل گرینہاں ندیدہ  
خار ملاستی نگر فتنہ است دامن  
خود را چوں غنچہ سر بگریباں ندیدہ

ہرگز نبودہ عشق ترا استقامتی      فوق کم التفاتی جانان ندیدہ  
بایچ کس جواب دسولے نہ کردہ      داری دے کہ یسچ پشیمان ندیدہ

بودن از نگاہ غیر در ستش چو آن مرغ  
کہ طفل مکتب از بیم معلم سر دہد ز روش  
پس از عمرے کہ چشم بر جمال لسان افتد      نقاب شرم تار ویش نہ بینم در میاں افتد  
من آن نیم کہ بقاصد و ہم فسانہ خویش  
کہ ساز و دش ز پئے مدعا بسانہ خویش  
زیک نگاہ تو در بزم ما و ہم نفساں  
چہ جنگہا کہ نکردیم در میاں ز خویش  
اس کے باپ شاہ قلی خاں کی رباعی ہے:

گاہ تو بہ و گاہ کوزہ سے شکتم  
یکبار دوبار نے پیالے شکتم  
یارب نہد آموزی نفسم بر ہاں  
تا چند کنم تو بہ و تا کے شکتم

پٹنہ کے سفر سے واپسی پر ایک دن راستہ میں جذبی، قاضی شمس الدین قزوی نے اور بعض نئے نئے شاعر حسین  
ثنائی کہ اس شعر پر

گر بیش جاکنی در پس آئینہ شخص  
بہند تمثال خویش تافتہ رو بر قضا

بحث کر رہے تھے، میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے اس شعر کا جس پر اختلاف تھا مجھ سے مطلب دریافت کیا۔ میں نے  
کہا: اب تو یہ معاملہ ہو گیا ہے کہ یار لوگ شعر اور "تیتال" میں فرق نہیں کر پاتے۔  
یہ تیتال سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں ایک مسخرا تھا جو بڑا باتونی اور زبان دراز تھا۔ عالموں کا لباس جب عمامہ  
پہن کر علما کی محفلوں اور مدرسوں میں طالب علموں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جاتا اور پہلے نہایت معقول عالمانہ  
انداز میں مناظرہ اور مباحثہ شروع کر دیتا۔ جب لوگ اس کی تقریر سے متاثر ہوتے، پھر وہ بحث میں مہمل اور بیہودہ باتیں  
خلط ملط کر دیتا جس سے عالم اور ملاشبہ میں پڑ جاتے۔

اس کے والد شیخ جلال حاصل تھے جو شیخ محمد غوث کے خلیفہ میں اور سرود و سماع کا بڑا ذوق  
رکھتے تھے۔ جمیلی کو اپنے باپ کی یہ کیفیت و حال تو نصیب نہ ہوا لیکن وہ حصول علم اور ذوق

جمیلی کا لپی وال

سے محروم نہ رہا۔ اگرچہ اس کے اکثر اشعار مضحکہ خیز ہیں۔

یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

گر شادی وصل تو مرادست نداد

باری بہ غمت خاطر خود شاد کتم

سہر زلفش مرا سوتے جنوں تار ہنموں گشتہ

دل دیوانہ ام پابستہ قید جنوں گشتہ

اس نے حاکم کاپی قاسم علی خاں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

بو و نسبت تو بہ خیل خوانیں

بے ناملا تم بے ناماسب

یہ شعر اسی سے منسوب ہے۔

موش دل را کہ بصد خون جگر پروردم

ناگہاں گریہ عشق آمد و دندان زود برد

اس کا بڑا بھائی شیخ فضیل ہے جسے عربی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اس نے عربی میں بڑے فصیح شعر بھی کہے ہیں۔

اس نے معین الدین طنطرائی کے جواب میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے۔

یا جمیل الوجہ و جہی عن قدیم ابحال حال

راح روحی بالنوی والد مع کالسل سال

ایک دن اس نے یہ مطلع پڑھ کر سنا یا۔ چونکہ یہ دونوں بھائی سب زفا م ہیں، میں نے کہا ”ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے

اس مطلع میں اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا ہے“ اس جملہ پر وہ بہت ہنسنا۔

طنطرائی کے قصیدہ کا مطلع ہے۔

یا خلی البال قد بلبلت باللبال بال

بالنوی زلزلت قلبی فہو بالزلزل زال

شیخ فضیل نے شیخ فیضی کی تفسیر پر عربی نثر و نظم میں جو ”توقیع“ لکھی ہے وہ اس کے علم و کمال کا واضح ثبوت ہے۔ ان دنوں دونوں بھائی لاہور سے اپنے وطن کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

شیخ حسین صوفی نام ہے، وطن دہلی ہے۔ چونکہ وہ شیخ اسلم چشتی کا مرید تھا اس لیے یہ تخلص رکھا تھا۔ فتح پور

چشتی عرف سیکری کی خانقاہ کے صوفیوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے اور چند دوسری تصانیف بھی ہیں۔

جن میں ایک کتاب ”دل و جان“ کے نام سے نظم میں لکھی ہے مگر اس میں ہندوستانی رنگ ہے اور مضمون بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ

تفاہی استاد میر علی شیر کی کتاب ”حسن و دل“ سے لیا ہوا ہے جس میں تفاحی نے خوب ہی داد و سخن دی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے چشتی کی

”حسن و دل“ کا مزید ذکر بے فائدہ ہے۔ اس کے کئی ہزار اشعار ہیں، اگر کوئی شعر قابل ذکر ہے تو بس یہ مطلع ہے:

چنین کہ با پر طاؤس قیس رامیلی است  
مگر کہ نہ پائے ناقہ لیسی است  
ہرات کے سیدوں میں سے ہے۔ شعر اور فن معما گوئی میں خاصا سلیقہ رکھتا ہے۔ انکے خاں کا میر بخشی  
تھا اس نے میرزا عزیز کے نام پر ایک غزل معما میں لکھی ہے۔

جعفر

نمونہ کلام:

شانہ برہم زدہ آں سلسلہ مشکیں را  
آہ اگر باد بگوش تو رسا ندایں را

غبار مشک خواہم براں عذار نشیند  
ازیں مباد کہ با خاطر غبار نشیند

سبزہ را در باغ باشد جائے زیر پائے گل  
باغ جنت را فتادہ سبزہ بر بالائے گل

آصف خاں قزوینی کے لقب سے مشہور ہے سابق میر بخشی آصف خاں میرزا غیاث الدین علی کا بھتیجا  
ہوتا ہے۔ اب وہ دربار کے اعلیٰ مرتبہ کے بخشوں میں شامل ہے۔ اس کو اپنے چچا سے بڑی شکایت  
تھی کیونکہ اس نے اپنے عہد میں اسے ترقی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اب بھی وہ اپنے مرحوم چچا کے خلاف بغض و عناد  
ظاہر کرتا رہتا ہے۔

جعفر بیگ

اپنے ہم عصروں میں اس کی شعری صلاحیتیں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن عیش و آرام اور گونا گوں مصروفیات  
کی وجہ سے شعر گوئی کی مشق کچھ زیادہ نہیں۔ علم سے بھی بے برہ نہیں۔ اگر وہ صرف شاعری کی طرف متوجہ رہتا تو زمانے  
کو اپنا مداح بنا لیتا۔

نمونہ کلام:

کارم امروز بہ بیداد گری افتادہ است  
کہ بہر جا کہ نہد پائے مہری افتادہ است  
گر گردِ شمع مرگشت مرگشتہ چوں پڑنہ ام آخر بکشتن میدہد پرداز گستاخانہ ام  
گل ہر کس بتا راج خزاں رفت  
مراہم گلبن و ہم گلستاں رفت

باتش کارت افتادہ است جعفر  
دو صد بلبل بایں خبا یک سمندر



بہ پرکشش گنہم روز حشر آخر شد  
 تمسکات گناہاں خلق پارہ کنسید  
 اب چہ صحرا بود و بس میا و میدان گن کہ بود  
 میچ پنجیرے نہ شد پیدا کر و تیرے نہشت  
 نامہ درد سے سوئے دلدار می باید نہشت  
 در و دل بسیار شد بایار می باید نہشت  
 گوز جعفر بہ ہمیں دین و دے خرسندی  
 من و کیلش کہ دل و دین بتو از دانی داشت  
 بہت نگر کہ صد ورق دفتر امید  
 صد پارہ کردہ ایم و بخوناب شمشہ ایم  
 گلستاں را گلے از نوشگفت است  
 کہ امشب تا سحر بلبیل نخفتہ است  
 شہر گنجائش غمہائے دل من چوں داشت  
 آفریدند برائے دل من محراب را  
 گلہائے تو تمام از گلہ سہر کردین من  
 گلہ من ہمگی از گلہ نشیندن تست  
 میا در خاطرش لے رحم و انجم را مکن ضائع  
 کہ خونہامی خورم تا بر سر بیدار می آید  
 جعفرہ کوئے یار دانست  
 مشکل کہ دگر ز پانہ نشیند  
 رسید و مضطرب کردہ آنقدر نہ نشست  
 کہ آشنائی دل خود کنم تسلی را

**حیدری تبریزی** | یہ حاجی تھا، لسانی کا شاگرد ہے۔ شریف تبریزی بھی اس کا استاد تھا جس نے لسانی کی تعریف کرتے ہوئے "لسان الغیب" کہا ہے۔ حیدری ہندوستان میں عرصہ تک رہا۔ ایک بار جا کر پھر آگیا۔ مدسری رزنیہ جو گیا تو بوٹ کر نہ آیا۔ اس کا دیوان چودہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، مگر اس میں اچھے شعر بہت تھوڑے ہیں۔ شاہی ہاتھیوں کی اس طرح تعریف کرتا ہے۔

نمود پشت ہائے ریگ رواں  
 فیلمائیش کہ در ہیجا ست  
 کن پئے غرق کہ دن اعدا  
 ہر طرف موجہائے بحر بلا ست  
 اس قصیدہ کے صلہ میں اکبر نے خزانہ عامرہ سے گھوڑے اور خلعت مرحمت فرمائی لیکن جب شاہی خازن نے صلہ دینے میں ٹال مٹول کی تو اس نے یہ قطعہ کہا :

مشکلم دارم شہا خواہم کنم پیش تو عرض  
 نہ انکہ زین مشکل مرا صد لہر حسرت بردست  
 بسم و ذرا نعام کردی لیکن از خازن مرا  
 ہم گر فتن مشکل و ہم ناگر فتن مشکل ست

اسی کے اشعار ہیں :-

مہر و مہ رویاں عالم را نباشد اعتبار  
پر تو خوردشید و ریک جانمی گیرد قرار  
سوزم ہمہ دم سوزِ دروں کہ چنپیل است    خوارم ہمہ جا بخت زبوں کہ چنپیل است  
چو پا کاں حیدری تائی توانی  
کمالے کسب کن در عالم خاک  
کہ ناقص رفتن از عالم چنپیل است  
کہ بیروں رفتن از حمام ناپاک  
یہ عراق کے عالموں میں سے تھا۔ جب ہرات میں شور و شین برپا ہوئیں تو وہ وہاں کے خطرات سے بچ کر ہندوستان  
چلا آیا لیکن یہاں بھی وہ محروم و مجبور ہی رہا اور انتقال کر گیا۔

نمونہ کلام :-

مرا بر سادہ لوحیہائے حزنی خندہ می آید    کہ عاشق گشتہ و چشم و فاذ یار ہم دارد  
ز نادانی بہرا و کردہ ہمدم کاہ من ضائع    عجیب تر این کہ بر من منت بسیار ہم دارد  
خوہ بر آتش نہم تابوئے ایماں بشنوی  
از کہن و لقی کزو یکتا رہے ز نار نیست

بیانی گیلانی | بڑا درد مند اور مخلص دوست ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف و توصیف سے بالہے۔  
حکیم ابوالفتح کے وسیلہ سے بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا اور ترقی کی۔

اس کا ایک دیوان مکمل ہے۔  
اس کے کلام میں اکابر شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں لیکن ذکاوت و ذہانت  
فطری ہے۔

نمونہ کلام :-

بہر سخن کہ کنی خوش را نگہباں باش    ز گفتن کہ دے نہ شگفتہ پشیمان باش  
چہ بالی مرغ کہ گر شغل بدگاراں است    ز مور ہم قدمے دام کن گریزاں باش  
خدا نہ شکوہ زبان من آستان کند  
من و شکایت دانگہ نہ تو خدا نکند

رباعی: دائم تو ستم نمودہ معذوری    نامی ز وفا شنودہ معذوری  
گفتی کہ بہن حرف جفا بہتان است    خود را تو نیا ز مودہ معذوری

رباعی:

تا بختن آرزو بود پیشہ تو  
جز پائے تو مینجی نزد تیشہ تو  
دشمنی نکند انجہ تو با خویش کنی  
اے خوں تو برگردن اندیشہ تو  
در میان کافراں ہم بودہ ایم یک کمر شاستہ ز نار نیست

تا در فرد بندم بخود غم خانہ باید مرا آباد کردہ ہمتم ویرانہ باید مرا  
از قصہ فردا دوی عالم پریشان میشود از گفتگوئے درد خود افسانہ باید مرا  
از کشت پانی ایں جہاں کاں خرمن کا و حراست  
نہ خرمن نے خوشہ نے دانہ باید مرا  
گریخت عتازی می کشد و زتیر کافر را عظیم  
من تشہ خون خودم پیماہ باید مرا  
منشیں جیاتی پیش من شور مرا بر من من عاشقم تو عاقلی دیوانہ باید مرا  
یہ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔  
جیاتی نمونہ کلام:

پیغام دوست داغ جگر تازہ می کند  
درد و دواع و رنج سفر تازہ می کند  
عاشق رنج خویش بردت سود و رفت  
واں مہر کہ با تو داشت بنمود و رفت  
یک شب بہ ہزار جیلہ در بزم وصال  
پروانہ بہ شمع دیدہ بکشود و رفت

رباعی:

حالتی | اس کا اصل نام یادگار ہے۔ خود سلطان سبخر ماضی کی اولاد بتاتا ہے لیکن میرزا احمد نے تاریخ نظامی  
میں اسے چغتائی نسل بتایا ہے۔ بڑا نیک اور خوش عقیدہ آدمی ہے صاحب دیوان شاعر ہے۔  
نمونہ کلام:

نماز آنقدر از گریہ آب در جگر  
کہ مرغ تیر تو منقار تر تواند کرد  
بجائے رشتہ پیراہنت اے کاش من باشم بایں تقریب شاید با تو در یک پیرہن باشم

بر صفحہ عذار تو آں خط مشک شود  
مضمون تازہ ایست کہ از غیب رونمود  
از قضا گیرم بیا ز می ہر زماں چشم رقیب تا شود از دولت دیدار جاناں بے نصیب  
کردہ جا بر گوشہ چشم تو خالی عتبری  
باز بہر صید صیادے نشسته در کیس  
در نالہ زر عنائی آں گل شدہ ام باز گل دیدہ ام امروز کہ بیل شدہ ام باز  
لعل دلجوئی تو ازہ بتخالہ بس آزار دید  
وہ کہ گلبرگ ترا از زالہ آفتاب رسید  
حالتی کے باپ کا تخلص والی تھا۔ یہ مطلع اسی کا ہے :

ماہ عید ابرو نمود و خاطر م ارشاد کرد  
شکر للہ کہ غم سی روزہ ام آزاد کرد  
حالتی کے بڑے کے کا تخلص بقائی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے کشمیر سے  
لاہور لایا گیا اور یہاں کو تو ال نے قصاص میں قتل کرادیا۔ وہ بھی موزوں طبع تھا۔ اس کا شعر ہے۔  
تا غزہ خون ریز تو غارت گر جاں ست  
چشم اجل از دور بحسرت نگراں ست  
اصل خطاب آنکہ خاں ہے۔ جس وقت جو سا پر ہمایوں کو شکست ہوئی تو وہ گنگا عبور کر کے  
فرار ہونا چاہتا تھا لیکن دریا میں غوطے کھانے لگا، اس وقت خان اعظم نے سہارا دیا اور مدد  
دے کر کنارے پر لے آیا۔ یہ خدمت اس کی آئندہ ترقیوں کا ذریعہ ہو گئی۔ اس کا مرتبہ شعر و شاعری کے مقام سے بالاتر  
ہے لیکن وہ نہایت موزوں طبیعت کا مالک تھا۔  
نمونہ کلام :

منہ اے عقل اشک ارخانہ چشم قدم بیروں  
کہ می آیند مردم زاد ہا از خانہ کم بیروں  
گر بخورشید رخت لاف زند بدر منیر  
آخر از گنبد فیروزہ نگوں خواہد شد

یہ رباعی اس کے بڑے کے یوسف محمد خاں کی ہے :

در کوئے مراد خود پسنداں دگر اند  
در وادی عشق مستمنداں دگر اند  
آنا کہ بجز رضائے جاناں طلبند  
آناں دگر ند و دردمنداں دگر اند

**خنجر بیگ** | چغتائی امیروں میں سے ہے۔ تودی بیگ خاں کا داماد ہے۔ اس نے اپنے حالات اور بادشاہ کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں تین سو شعر ہیں۔ گونا گوں صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سپاہی کا خوش خطی، شعر و مہما، اصطرباب و نجوم، تطابق اعداد و غرض تمام علوم و فنون کا جامع ہے۔ صاحب تصنیف ہے۔ اپنی مثنوی میں اس نے اپنے ان تمام اوصاف کو گنایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور ہندی راگ راگینوں میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بجز بلند مرتبہ سلاطین و امراء کے کسی کی محفل میں سننے میں نہیں آتے اور اس زمانہ میں تو ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا ہے۔ موسیقی میں اس کا مقابل کوئی نہیں تھا۔ اس نے بادشاہ کی نصیحت کے لیے جو مثنوی کہی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

شہر یار ا جہاں عجب حسائی است	ہر زمان اندر و تماشائی است
چرخ نیرنگ ساز شعبدہ باز	ہر زمان بازی کند آغواز
پیش ازین بودہ اند در عالم	تا جداراں با سپاہ و چشم
زاں دلیراں پر ہوا و ہوس	ماند تاریخ ہائے کمنہ و بس
گر بدنیات دیندی	انبیا زو چہرا رمیدندی
خسروا کار ایں جہان حدود	ایں چنین ہست و بود و خواہد بود
زین ہمہ کار و بار پر چشم و پیچ	نام نیک است اصل و آں ہمہ پیچ
غرض ہم ایں بود ز پر سختی	بتو نوبت رسید تا چہر کئی
ایں زمان کز تو یافت عالم زیب	حق نگہدار بادت از آسب
گر ہمائے پرید زین گلشن	بر سرما تو باش سایہ نگین
سخن من کہ بے ریا باشد	گر نصیحت کنم روا باشد
چوں بہ خیریت تو می کو چشم	سخن حق ز تو چہرا پر چشم
سخن زید یا کہ عسرو بود	بشنو گر ز نفس امر بود
شاہ باید کہ در گہ و بیگاہ	از خود و خلق و حق بود آگاہ
سہو مسکین زیاں ناں باشد	سہوشہ آفت جہاں باشد
بگدا فک خلق و دلق بود	در دل شاہ فکر خلق بود
بہ شود کار سلطنت بہ تو ذک	ہمچو فرمان شہ بہ مسدا و ذک
چوں ترا نوبت جہان داری است	لازمیت احتیاط و ہوشیاری است
تو چو شمع و ملک تو حسانہ	خلق گرد تو ہم چو پروانہ
ذرہ نبود چو نور خود نبود	نیست پروانہ شمع اگر نبود



تو شبانی و اصل ملک روم  
گلہ را چوں توان گذاشت یدہ  
منصب انبیاء ست چو پانی  
از خود آگاہ باش و از مردم  
دولت و ملک را غنیمت دان  
در جہاں از برائے کاری تو  
لطف و احسان و خلق مہر و وفا  
چکنم قدر خود بخنے وانی  
خلاق در گریہ بر سر دیوار  
مردم انگشت فکہ در دندان  
آستین ما نشانده از دنیا  
مردم از وہم ہر طرف کنندہ  
روکناں ما بہ پنجہر و تاخن  
بہ تعجب ز دور خود و بزرگ  
خلق عالم بہ پیچ و تاب ز وہم  
بر لبش است شستہ مار از جاں  
خلق از ترس و وہم از بیرون  
مردم از پیے بنور مشعل آہ  
خلق در زیر جامہ لرزیدہ  
خلق عرق عرق بنیر درخت  
ما سوارہ ز کوفت در ماندہ  
شکر از ہر طرف تماشا گر  
کہ با و بخویشتن داری  
ایں شجاعت بتو بود تازہ  
لیک از پادشاہ باشد عیب  
مردم ملک در اماں باشد  
ہمہ زیر و زبر شود عالم

یعنی از تست زندگی ہمہ  
بہ چرا گاہت آمدہ است گلہ  
بتو فرمود حق نگہبانی  
بس مکن رسم انبیا را گم  
عمر خوش گوہر است قیمت دان  
پادشاہ ولی شعاری تو  
عدل و انصاف وجود و علم و سخا  
ہمہ داری ز لطف یزدانی  
تو بختندہ بہ فیل مست سوا  
تو بدندان فیل دست زنان  
تو بخراطوم فیل پنجہر کشا  
تو متابل بہ شیر درندہ  
تو بجنگ پلنگ بازی کن  
تو ستادہ بہ پیش حملہ گرگ  
تو گلوگیر مار از در سہم  
تو شناور بہ بحر بے پایاں  
تو بہ جنگل پیے شکار دروں  
تو شب تیرہ رفتہ یک ماہ را  
تو بہ مہر ما بر ہنر گر دیدہ  
تو بگر ما دواں بجامہ درشت  
تو بہیادہ ہر طرف راندہ  
تو بمیدان خصم جنگ آور  
ایں چہ لطف است این چہ غم خواری  
ایں دلیری ست دور از اندازہ  
گر چہ اینہا ہنر بود بے ریب  
شاہ اگر دور از زیاں باشد  
شاہ از خویش اگر بود بے غم

بتو مارا جہاں و جاں باید بے تو جان و جہاں چکار آید  
 خنجر آخور در فضول مکن خاطر شاہ را ملول مکن  
 اس حدیث تو دور از معنی است شاہ ازیں گفتگوئے مستغنی است  
 اور جو پیش خدائے مقبول است دولت او بکار مشغول است  
 خواب اوست عین بیداری مستی او کمال ہوشیاری  
 حق ہاں کس کہ کار ساز بود از ہمہ کار بے نیاز بود  
 خنجر بیگ نے جب یہ مثنوی بادشاہ کے سامنے پڑھی تو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔  
 اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہے جس کے شعر بہت مشہور ہیں۔ اس کے چند اور شعر یہ ہیں:

آہم از دل چند در کوشش نہاں آید برون

بعد از اں چنداں کنم افغاں کہ جاں آید برون

آہم گزشت از سرو پایا در رفت جہاں

تن خاک گشت و آتش دل شعلہ زن مہنوز

جس زمانہ میں خان زماں اور بہادر خاں نے سرکشی و بغاوت کی تھی، خنجر بیگ بھی اس کے ساتھ ہو گیا تھا اور بنگالہ چلا گیا تھا۔ غالباً اسی فتنہ میں وہ ہلاک ہو گیا۔

یہ میرزا قاسم جہا بدی کا بھانجا ہے۔ حجاز کے سفر کے بعد ہندوستان آیا اور بڑے شاہزادہ کے  
 دن ملازم ہو گیا۔ یہ بھی بہر حال قابل ذکر شخص ہے۔

خسروی

ز نود عشق باشد خسروی را دل خیال و شوق

کہ شمع مرقد او میتواں کرد استخوانش را

نیلا بند شیراں خرم سر پنچہ از خرم سگان ویرا لے ہنیش زیں طہر مہماں کی

اس کا نام سلطان بایزید اور خطاب کاتب الملک ہے۔ ہندوستان میں خط نستعلیق کو اس سے

بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا۔ شعر گوئی میں بھی خاصا ملکہ حاصل تھا۔ آخری عمر میں حج سے بوہر مندر ہوا۔

میردوری

نورنگا کلام:

گہ در درون جانے گہ در دل حسرتی

از شوخی کہ داری یک جا نمی نشینی

گر ہوصل تو بد آموز سنے گردیدم از فراق تو بدیں روز نمی گردیدم

سوخت پروانہ صفت مرغ دل من لے کاش گرد آں شمع شب افروز نمی گردیدم

گر بہ تیر مژہ اش سترخ نمی کردم چشم ہفت ناوک دل دوز نمی گردیدم

رباعی:

تا از نظر آں یار پسندیدہ برقت  
خون دلم از دیدہ سمندیدہ برقت  
رفت از نظر و زول زفت این غلطت  
کز دل برو دہر آنچہ از دیدہ برقت

خوش خطی میں میر موصوف کا ایک شاگرد خواجہ ابراہیم حسین احمدی میرا ہم سبق تھا۔ یہ شہر بلوط کے بزرگوں کی اولاد میں سے اور شیخ عبدالرحمن لاہوری بلوطی کے قریبی عزیزوں میں سے ہے۔ بزرگی اور ولایت میں اپنے زمانے کا شہرہ آفاق شخص تھا۔ عین جوانی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ایک ہی سال میں تھوڑے سے فرق سے مجھے اس کی اولاد میرزا نظام الدین احمد کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ دل کے داغ ہرے ہو گئے اور قدیم دوستوں کا غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے۔

درینا درد را مرہم ندیدم

امید وصل بود آں ہم ندیدم

آہ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں" اب تو محسوس کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ افسوس بھی کیا کریں، ہم سب ایک ہی گنبد کے نیچے سرگرداں ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے گا۔ میں نے خواجہ ابراہیم کی تاریخ وفات کہی ہے:

بر موجب حکم پادشاہ کونین

در ماہ صفر خواجہ ابراہیم حسین

بچوں کو سفرز عالم پر مشرو شین

تاریخ شدش خواجہ ابراہیم حسین

وہ اسی قریبی زمانہ میں عراق سے آکر اہلیوں میں شامل ہوا تھا۔ ابھی وہ اس عہدہ پر فائز نہیں ہوا تھا کہ اس نے شریف سرمدی چوکی نویس کے لیے جو اہلیوں کا داروغہ تھا اور اس کی پٹی ہوئی مونچھیں تھیں یہ رباعی کہی تھی:

این سادہ دل آخر احمدی خواہد شد محتاج کلاہ نموی خواہد شد

از غایت اضطراب روزی صمدیار قربان برویت سرمدی خواہد شد

دانہ نیشاپور کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں وہ کھیتی باڑی میں توکل و قناعت سے بسر کیا کرتا تھا۔ دل میں

دانی

سیاحت کی سمائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔

اس کے اکثر اشعار اسی دہقانی زبان میں ہیں لیکن فصیح زبان میں اس نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کا دہقانی کلام پڑھنے لکھنے میں دشوار تھا اس لیے وہ زبان زد نہ ہو سکا۔

ایک دن الفتی شاعر کے ہاتھ سے چوگان چھوٹ کر ناک پر پڑا، دانتی نے فی البدیہہ کہا:

الفتی بسکہ شعر بد می گفت  
نیک زو باطن نودانش  
چرخ چو گانی از قضیہ شکست  
پشت بینی بجائے دندانیش

دوانی | یہ حکیم عین الملک کا تخلص ہے۔ ماں کی طرف سے علامہ جلال الدین دوانی کی اولاد میں سے ہے۔  
بڑی خوبیوں کا مالک اور ممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ آنکھ کے علاج میں اس کا کوئی ہمسر نہیں کبھی  
کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔  
نمونہ کلام:

ترا برغم نہ ترالہ بر من دل تنگ می بارد      نہ تاثیر حوادث بر مہر من سنگ می بارد  
چناں تدرست با اہل دل آں شوخ چنا پیشہ      کہ گاہ آشتی از غمزہ او جگ می بارد  
دوانی از در احسان او کفر است نو میدی      کہ ابر فیض او فرسنگ و فرسنگ می بارد

اسد ہر شب بگردوں تالہ ام با آہ وزاری ہا  
سپہ روزے چو من یارب چہ ساز و چنیں شب ہا  
یہج ویرانی نشد پیدا کہ تعمیرے نہ داشت  
درو بے دریاں عشق است اینکہ تدبیرے نہ داشت  
در شب زلف سیاحش خواب مرگم در ربود  
بوالعجب خوابے پریشانی کہ تعبیرے نہ داشت  
وہ چہ عاشق کش نگاہی بود و اں منزل کجا  
کاندرو پیدا نہ شد یک سینہ کو تیرے نہ داشت  
ہر کس کہ قطرہ زمی دوستی کشید  
بیزار شد نہ بادہ و جام و سبب شکست

خیزاے دل گہ یار در جنگ است      نہ ندگی نزد عاشقان تنگ است  
عاشقان را براہ سربازی      ہر قدم صد ہزار فرسنگ است  
وسعت آباد کارخانہ عشق      بر سپاہ مجتہم تنگ است  
بس دراز است دست ہمت من      چکنم پائے بخت من تنگ است  
اے دوانی حذر کہ در کولیش      فتنہ بیدار و عشق در رنگ است

روشن آں دیدہ کہ دیدن دانست      خرم آں دل کہ تپیدن دانست  
کے کشد محنت ورتنگ قفس      مرغ روحم کہ پریدن دانست  
درکنارم نہ نشیند ہرگز      طفل اشکم کہ رویدن دانست  
نتواں یافت دگر درحسانہ      صید وحشی کہ رمیدن دانست  
نکند میل دوائی بہ بہشت      بچوں گل از باغ توچیدن دانست

روز ہجراں کہ دم سوختن است      کارجاں شعلہ برافروختن است  
درشب ہجر کہ جان باید باخت      کار دل درد و غم اندوختن است  
اے جدائی چہ بلائے کہ ملدم      دوزخ از بیم تو در سوختن است  
زاں دو جادو طلب عشق و ناز      مست را غریدہ آموختن است  
اے دوائی طلب وصل بستن      شعلہ و پنبہ بسم دوختن است

**رفیعی** | اہل نام میر حیدر معما فی وطن کا شان۔ نہایت سمجھ دار، ذہین اور مہنمندانہ آدمی ہے۔ خاص طور سے فن معما اور تاریخ کہنے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ ان دونوں کے سوا وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایک دن شیخ فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں معما متروک ہو گیا ہے اور اب اسے عجیب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: میں نے ولایت میں برسوں اس معما گئی میں اپنی جان کھپاتی ہے۔ اب جب کہ اس فن میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ گجرات سے لاہور آیا۔ شاہی سرکار اور دوسرے عمدہ داروں سے تھوڑی بہت رقم لے کر وطن کے لیے رخصت ہوا لیکن ہرز پنچنے پر کچھ دیکران کے قریب اس کا جہاز ٹوٹ گیا اور اس کی ساری پونجی دریائے سندھ ہو گئی، اس کے سامان میں شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر کے چند جزد بھی تھے جو علماء کی توقیعات سے آراستہ تھے۔ یہ جزد اور فیضی کا دیوان جو اس نے ولایت میں شہرت کی خاطر روانہ کیا تھا، سب طوفان کی نذر ہو گیا۔  
رفیعی کے اشعار کا نمونہ:

نازک دلم اے شوق حلاجسم چہ توں کرد  
من عاشق و معشوق مزا جم چہ توں کرد  
من بتابوت رفیعی اشکما بر دم کہ تو  
ہم ہریش گریاں ترا از اہل عزامی آمدی

رباعی: زہد نکند گنہ کہ ہمت ساری تو      ما عنرق گنہ ہم کہ غفاری تو  
او ہمت سارت خواند و ما غفارت      یارب بکدام نام خوش داری تو



ایک رباعی اور ہے جس سے ۲۶ تاریخیں نکلتی ہیں۔  
 یہ شیخ زین الدین خوانی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہے۔  
**رباعی** نمونہ کلام:

کردی امید دارم از لطفِ خویش یار  
 بہ تافتی زہر سوروستے امید مارا  
 سفر کردم کہ شاید خاطر از غم بیاساید چہ دانستم کہ صد کوہ غم در ساہ پیش آید  
 ما ز ہا زان گل مرا چوں غنچہ از خوں دل ست  
 ما ز دل گفتن بہر کس بہ نہایت مشکل ست  
 ز حتم من چو اشک سے تازنین من داں مگد ز مانی مرد می کن این چہیں از مرد ماں مگد  
 ز ناب قہر نشانے مرا میسانہ آتش  
 بنا ز گرم کنی است از کراہہ آتش  
 بہ شکر آں دہن تنگ و ابروے چو لعل چاں شدم کہ نیا رد مرا کس بہ خیال  
 جفا ہمیں کہ ازاں شوخ بے وفادیدم  
 زہر کہ حتم وفا داشتہم جفا دیدم  
 تو اے رفیق ز در دلم نہ آگاہ کہ من ازاں مہ نامہ راں چہا دیدم  
**روحانی** یہ ایک مسخرہ تھا۔ بے حیائی پیشہ تھا۔ اس کی بے شمار ہزلیات ہیں۔ برسوں بادشاہی ملازمت میں رہا۔  
 اس کے دیوان میں تقریباً تین ہزار شعر ہیں۔  
 نمونہ کلام:

حیات جاوداں وار و شہید تیغ بیدارش  
 مگر دلا بگیری آب حیواں دادہ استادش  
 اس شعر میں میرا شکی کے شعر کا مضمون پایا جاتا ہے۔ اشکی کا شعر ہے:  
 مستانہ کشکاکاں تو ہر سو فتادہ اند  
 تیغ ترا مگر کہ بمئے آب دادہ اند  
 روحانی کے اور اشعار یہ ہیں:

از جفائے اونہی نالم کہ می تو رسم کہ رقیب  
 یابد از تاثیر فریادم کہ از بنیاد کیست  
 بوہوں انگری دردست و پاچھے او دل گرم کہ بردار و بازی لعل از دست انگند زردش

چناں وقار تو بہ کوہ پائے حسلم فشر و  
کہ شد زہرِ رگ او چشمہائے آبِ رواں  
زبانی گوئی قاصد شرح عالم را کہ در نامہ دوست بخودی حرف از قلم بسیار افتاد  
قاصد از آمدنش می کند آگاہ مرا  
تا کشد جذبہ شوقش بسر راہ مرا

اس نے ۹۸ھ میں جبکہ شاہی لشکر گجرات جا رہا تھا، قلعہ آبو گڑھ کے قریب انتقال کیا اور اسی جگہ دفن ہوا۔  
قاسم ارسلان نے اس کی تاریخ وفات کہی ہے:

”دادہ چو سگے بکا فرستایاں جاں“

**زین خاں کو کہ** | ہندی ساز اور دوت کے بجانے میں اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار  
ہے۔ خوش خلی کے سوا دوسری اور خوبیاں نہیں رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔ اس  
کا شعر ہے۔

آرام من نمی دہد این چرخ کج خرام  
تار شستہ مراد بسوزن در آورم

**سلطان سپلی** | سپلک قندھار کا ایک گاؤں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اسے سپلی کہتے تھے۔ سپلک ایک  
گھناؤنا جانور ہے۔ وہ بڑا تنگ ہوتا تھا اور کتا تھا کہ عجب مصیبت ہے لوگ مجھے ایسے  
گندے جانور کے نام سے پکارتے ہیں۔

نہایت آزاد منش قلند آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کا ہی سے اس نے پوچھا آپ کی عمر کیا ہوگی؟ انہوں نے  
کہا: خدا سے دو سال چھوٹا ہوں۔ سلطان نے کہا: محترم ہم تو سمجھتے تھے آپ دو سال بڑے ہیں آپ اپنی عمر  
گھٹا کر بتا رہے ہیں۔ مولانا قاسم ہنس پڑے اور کہا تم ہماری صحبت کے قابل ہو۔ واضح رہے ملا قاسم کا ہی دوسرو  
کی باتیں نقل کرنے کے عادی تھے۔ یہ بات بھی شیخ بایزید بسطامی کی تھی جو اس موقع پر جڑوی شیخ نے کہا تھا: انا اقل  
من ربی سنتین، اور یہ بس ایک صوفیانہ ترنگ تھی۔ ان کے اس قول کی عارفوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خدا سے دو سال  
کم ہونے کا مطلب دو صفتوں میں کم ہونا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی تمام صفات کا مظہر بن سکتا ہے بجز وجوب اور  
قدرت کے۔ ظاہر ہے بندہ حدوث و عجز سے بچ نہیں سکتا۔ بہر حال خدا اس قسم کی صوفیانہ حشویات اور شطحیات  
سے بچائے رکھے۔

سلطان نہایت موزوں طبع آدمی تھا۔ خان زماں کا تخلص بھی سلطان تھا۔ جب سلطان نے اسی کی شان میں  
ایک قصیدہ کہا اور پیش کیا تو خان زماں نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت بطور صلہ اس کے پاس بھجوایا اور اس سے دعا  
کی کہ اپنا تخلص ہماری خاطر بدل دو۔ اس نے صلہ واپس کر دیا اور کہا میرا نام سلطان محمد باپ کا رکھا ہوا ہے

اسے میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ نیز میں تم سے کئی سال پہلے اس تخلص پر شعر کہتا رہا ہوں اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوں۔ خان زمان کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا اگر تم یہ تخلص نہیں چھوڑو گے تو میں ہاتھی کے پیر سے بندھوا دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اس غرض کے لیے ہاتھی کو لے آیا۔ سلطان نے کہا: میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میں شہادت کا درجہ پاؤں۔ خان زمان نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ آخر مولانا علاء الدین لاری خاں زمان کے استاد نے کہا کہ جامی کی کوئی غزل محفل میں پڑھی جائے۔ اگر سلطان فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہہ دے تو پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے ورنہ تم جو چاہتے ہو اس سے سلوک کرو۔ چنانچہ جامی کی یہ غزل پیش کی گئی۔

دل خطت را رقم صنع الہی دانست

بر سر سارہ رخاں محبت شاہی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہی، جس کا مطلع ہے۔

ہر کہ دل را صدف سر الہی دانست

قیمت گوہر خود را بکماہی دانست

اگرچہ یہ غزل اتنی زیادہ اچھی نہ تھی لیکن خان زمان سن کر پھرک اٹھا۔ بڑی تعریف و توصیف کی اور دگنا صلہ دے کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ وہاں نہ ٹھہر سکا اور خان زمان سے اجازت لیے بغیر بدایوں چلا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ کی سیر کرتا رہا۔ آخر دکن چلا گیا۔

جس سال دکن کے چاروں حکمرانوں نے متحد ہو کر بیجا نگر پر چڑھائی کی تھی اور ایک سخت لڑائی کے بعد اسے فتح کر لیا تھا اور اس قدیم اور مشہور ریت کدہ کو ڈھا دیا تھا۔ اسی سال سلطان دکن میں تھا اور اس لشکر کے ہمراہ جنگ میں شریک تھا چنانچہ اسے بڑا مال غنیمت بھی ہاتھ آیا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا اور کیا ہوا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بڑی بے مروتی کا ثبوت دیا تھا کہ خان زمان جیسے قدر دان آدمی کی درخواست ٹھکرا دی اور بزرگوں کے منہ آنے کی کوشش کی۔

غزالی کا مطلع ہے ۷

زاہد عرفان بدلق و سبوح و مسواک نیست

عشق پیدا کن کہ اینہا داخل اداک نیست

۱۰ اے نئے مطلع کے جواب میں سلطان کا مطلع ہے :

گر بدل دار و رقیب از ما خبری باک نیست

روشن است این پیش کا یکنہ او پاک نیست

گاہ در چشم نشیند گاہ در دل آں پری بیچ جاتسکیں نثار و زانکہ جادو دیدہ است

چوں کنم تشبیه ابرویت بماه نو کہ من  
 ہر مہر موشے ابرویت ہلالی دیدہ ام  
 یہ خان زماں کا تخلص ہے اس کے حالات ہم نے اس منتخب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں بلکہ ہندوستان  
 سلطان کی ساری تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے مزید تفصیل کی حاجت نہیں۔  
 اس کا شعر ہے

باریک چو موثیت میسائے کہ تو داری  
 گویا سراں مومت دہانے کہ تو داری  
 جب اس کی یہ غزل سامنے آئی تو اس کے صوبہ کے بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں غزلیں کہیں،  
 گفتہ کہ گماں نیست دہانے کہ تو داری  
 گفتہ کہ یقین است گمانے کہ تو داری  
 میں نے بھی غزل کہی تھی

سہر چشمہ و خضر است دہانے کہ تو داری  
 ماہی است دران چشمہ زبانی کہ تو داری  
 اب تو ایسی شاعری سے جو اس دور جاہلیت میں رائج تھی ادراک وہ فضولیات میں سے معلوم ہوتی ہے،  
 تو بہ ہی بھلی۔  
 خان زمان کا نمونہ کلام:

فغاں و نالہ لبان جو س کن اسے دل  
 ز جو رہ یار شکایت بکس کن اسے دل  
 صبا بھرت جانا یاں زباں کہ تو دانی نیا نہ مندی من عرض وہ چناں کہ تو دانی  
 دلیری دارم کہ رویش چو گل و مونسبست  
 سنبل پر چین ادا فتادہ بر برگ گل است  
 جانا نہ دیشل تو جانا نہ دیگر مانند من دل شدہ دیوانہ دیگر  
 اسے مرغ بچہ اند دست تو پیمانہ نوشیم ماست السیم ز پیمانہ دیگر  
 اس کا بھائی بہادر خاں بھی شعر کہتا تھا۔ ملا آصفی کی زمین میں اس نے اچھے شعر نکالے ہیں۔ ملا آصفی کا مطلع  
 بہر ما شب غم کار بست نگ گرفتہ کو صبح کہ آئینہ ماند نگ گرفتہ  
 بہادر خاں نے کہا ہے،  
 آں شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ گویا بمن خستہ رہ جنگ گرفتہ

بہ نشستہ مہ من بسر مند خوبی شاہی است کہ جابر میر اور نگ گزفتہ  
از نالہ من بس نکند بے تو بہادر ز نیساں کہ نئے غم ز تو در چنگ گزفتہ  
قافیہ اور فقیہ ہونے کے باوجود خوش طبع شاعر تھا۔ علم عروض، قافیہ اور معما میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد حج کے لیے چلا گیا۔

سیری

رباعی:

سیری بحریم جان و دل منزل کن  
قطع نظر از صورت آب و گل کن  
جز معرفت خدائی یسج است ہمہ  
بگذر نہ ہمہ معسرتی حاصل کن  
نہ بہر چشم درد آں نرگس بیماری بند  
در رحمت بروئے عاشقاں نار می بند  
ناصح مگو برائے بتے نامنرا مرا  
دیگر مکن عذاب برائے خدا مرا

خواجہ مینا رجو خواجہ جہاں کے خطاب سے مشہور ہے، کے بھتیجے میرزا بیگ کا تخلص ہے۔ یہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ اشعار اس کی روشنی طبع کا نمونہ ہیں:

سپہری

از تبتم دفع نہ بہر چشم خشم آلود کن  
کز نمک سازند شیریں چوں بود با دام تلخ  
دل غریب بکوئے بلا گذاری کہ د  
عزیز کوئے تو شد دل غریب کاری کرد  
چوں لالہ جام گیر سپہری بدور شاہ  
اکنوں کہ گل شگفت و گلستاں معطر است

شاہ بلند قدر ہمایوں کے از شرف خاک درش بر تریہ افلاک بر تر است  
یہ بیرم خاں کے ہاں ملازم تھا۔ بیرم خاں نے اس کے ذریعہ حضرت امام رضا کے آستانہ کے لیے سات ہزار روپیہ کی نذر بھجوائی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم خرچ کر دی جس کے مواخذہ میں شاہ ظہا سب نے اسے قید کر دیا۔ ۹۷۹ء میں وہ اس مصیبت سے چھوٹے سکا۔  
نمونہ کلام:

رخسارہ زردم چو در آئینہ عیاں شد  
آئینہ ز عکس رخ من برگ خزاں شد  
سینہ تنگم کہ جا دار و غم حب ناں شد  
جائے آں دار و کد از شادی نگیند جاں شد



اس کا باپ تیر ساز تھا۔ اس پیشہ کی مناسبت سے اس نے یہ تخلص رکھا تھا۔ مرزا عزیز کو کا کی خدمت میں تربیت پائی تھی۔ بارہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی مشق بہت اچھی تھی اور جلد ہی مشہور ہو گیا تھا۔

امیدی رازی کے اس قصیدہ کے جواب میں

اے تو سلطان ملک زیبائی

ماگدا پیشگاں تماشاائی

اس نے اپنا قصیدہ دربا میں پیش کیا۔ جب وہ اس مصرع پر پہنچا:

سُنی پاکم و نجارائی

تو لشکر خاں میر بخش نے جو خراسانی اور کٹر افضی تھا لیکن اپنا رخص چھپائے رہتا تھا، اس سے پوچھا: ملا کیا سُنی ناپاک بھی ہوتا ہے؟ میرزا عزیز کو کانے ترکی بہ ترکی کہا: ہاں، جیسے تم!

قاسم ارسلان نے مہمی کے بارے میں کہا ہے:

مہمی و ظریفی و فریدوں دزدند

بچوں گریہ و بچوں شغال و میمون دزدند

زہارہ برایشاں سخن خویش بخواں

کاینہا دوسہ تا شاعر مضمون دزدند

مہمی نے امیدی کے قصیدہ کے جواب میں کہا ہے:

در دل خیال خالت پیوستہ داشت منزل

در مزاج محبت تخم امید کشتیم

مدا یکتہ چو دیدی ز خرابیوں قشاں را

پیشیت نہ کرد اظہار این مرغ ماند بر دل

جز کشت نامیدی چیزے نگشت حاصل

آئینہ آب گر دید از شرم در مقابل

نہ بہر کشتن من تیغ در ہوا کردہ

اگر بودی ہلالی دیگری پیوستہ پہلویش

کہ چوں تیغ ز بانہش می شگافد در سخن ہوا

من چہ بکروم کہ با من این چنین پیش آمدی

شیخ جامی کے مریدوں میں یہ ایک فانی مشرب درویش تھے۔ جذب و حال طاری رہتا تھا۔ آگرہ کے گلی کوچوں میں سقا چند شاگردوں کو ساتھ لیے لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار بھی پانی کی طرح رواں دواں تھے۔

ان کے ایک پیرزادہ ہندوستان آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا انہوں نے پیرزادہ کی نذر کر دیا اور خود سمراندیپ کی طرف چلے گئے۔ سیلون کے راستہ میں وفات پائی کہتے ہیں اس کفرستان میں ایک شخص نے جسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے خواب میں اشارہ کیا تھا خیب سے ظاہر ہوا اور سقا کی تجمیز و تکفین کی۔  
انھوں نے اپنے کلام کے چند دیوان مرتب کر لیے تھے، لیکن جب بھی ان پر جذب طاری ہوتا تھا اپنے دیوان  
کو دھو ڈالتے تھے۔ جو کلام بچ رہا وہ بھی اچھا خاصا دیوان ہے۔  
نمونہ کلام:

بخیال عارفش در ہر نظر حیرانی دارم  
بدور نقطہ چوں پر کار سرگردانی دارم  
من دیوانہ از خواباں ازاں قطع نظر کردم  
کہ در کاشانہ دل چوں تو یار جانی دارم  
اساسِ پارستانی را شکستم تا چہ پیش آید  
دل دیوانہ را سرگشتہ روئے تو می بینم  
بہر سوبستہ زنجیر گیسوئے تو می بینم  
از گریہ شدم مرق بخورنے جگر امروز  
عشق آں گل پیرہن بازم بگریباں می کشد  
وہ کہ چاک جیم آخرتا بداماں می کشد  
خواجہ کلاں یگ کا پوتا ہے۔ یہ رباعی اسی کی ہے :  
انسوس کہ وقت گل بزودی بگذشت  
فریاد کہ تا چشم کشودی بگذشت  
بے چشم و خطت بنفشہ و زرگس را  
ایام بکودی و کبودی بگذشت

سپاہی

شہرہ میں شہر آگرہ میں انتقال ہوا۔

سہرمدی اصفہانی | کچھ عرصہ تک شاہی چوکی نویس رہا، اب شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں متعین ہے۔ پہلے فیضی  
تخلص رکھتا تھا جب بادشاہ کی مجلس میں شیخ فیضی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا اس نے اپنا  
تخلص سہرمدی رکھ لیا۔ موزوں طبع آدمی ہے۔

نمونہ کلام:

تایخ ناز آں بت مغرور شد بلند  
صد گردن نظارگی از دور شد بلند  
مئی در سرو گل در بغل آئی چو در کاشانہ ام  
بہر تماشا بشگفت خاشاک محنت خانہ ام

تا بر سر کونین نہادیم قدم را  
دستی نمود بر دل ماشادی و غم را  
یہ عرب ہے۔ اس کا باپ شیخ ابراہیم بڑا فاضل فقیہ تھا۔ شیعہ اس کو اپنے مسلک کا مجتہد  
سمجھتے تھے۔ مشہد کارہنہ والا تھا۔ ساقی بھی مشہد میں پیدا ہوا۔ کچھ علم حاصل کرنے کے بعد دکن  
پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ اب بنگالہ میں رہتا ہے۔ نہایت خوش طبع شیریں کلام شاعر ہے۔  
نمونہ کلام:

ز جانم گاہ گریہ آہ درد آلود می خیزد  
بلی چوں آب بر آتش فشانی دود می خیزد  
آزردہ دلم از ستم یار نگہ دود تا باعث خوش حالی اغیار نگردد  
چو تیز بگذرد از من زویدہ آب بر آید  
زویدہ آب ز تیزی آفتاب بر آید  
تبد دلم کہ مبساوا بخوابش آمدہ باشی  
بر پیش من چو کس مضطرب ز خواب در آید

بر نفس دل نہ ہوائے مژدہ خنبار کند  
زاں نگہ یافت کہ جاں گشت شکار آری  
دل ہماں گرم محبت تو ہماں مستغنی  
ساقی این درد بگو پیش کہ اظہار کند  
اس کا اصل سید شاہی ہے، جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ یہ گریہ سیر کے سیدوں میں سے ہے جو کالپی  
سیدی میں متوطن ہو گئے تھے۔

سیدی خوش کلام شاعر ہے، تصوف سے بھی بہرہ مند ہے اور شیخ اسلام چشتی کا مرید ہے۔ کچھ عرصہ تک  
بادشاہی ملازمت میں رہا۔ مختلف امراء کے ساتھ بسر کرتا رہا۔ اب کابل میں قلیچ محمد خاں کے پاس ہے۔  
نمونہ کلام:

اول مگر می مستیست و دل در اضطراب  
ہیچو طفلی کہ تپد ہنگام بیداری ز خواب  
گل جمائل کرد تا سر دسی بالائی من  
من ز گل در رشک و گل در غیرت از پیر اسدش  
نیافت از دل گم گشتہ ام فشاں کہ چہ شد  
نیم اگر چہ دوزخ تو تار تار کشاد  
در خانہ از ادب نتوانم قدم نہاد  
کز پر تو رخ تو ہمہ خانہ پر شدہ است

از لطف و عتاب تو ز ما را زنجیر زد  
از کشتہء تسلیم تو آواز نغیزد  
گرچہ کس را بہ حمدِ شاہِ جہاں جز دم آب و کمنہ دلق نماند  
لیک صد شکر کنہایت فقر جسدی در میان خلق نماند

قصیدہ بتوائی صاحب عطا گفتم کہ بہست نسخہ فضل و کمال را فرست  
باین عطا کہ نمودی تو در برابر آں ز دولت تو مرا شستہ امید گست  
نہ در برابر شعر من این عطائی تو بود عطائی خویش نگذارد شعر من بفرست  
استغفر اللہ از دل بے چاشنی درد

پیکاں بہ سیتہ بہ نہ دل مردہ در بغل

شاہ ابوالمعالی | اس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتا تھا۔  
نمونہء کلام:

جان من ہم محبت اغیار بودن نیک نیست جز من یکس بہر یک یار بودن نیک نیست  
خوش بود آمدن عاشق گئی کہ لطف نیز دایما بر مسند آئے ار بودن نیک نیست  
بر امید وصل خوش می باش در کنج فراق تا امید از دولت بیدار بودن نیک نیست

جدا نہ وصل تو اے دلبر یگانہ شدم

اسیر بند فراق بہر بہانہ شدم

ز بس فسانہء عشق تو خواندہ ام ہر جا

میان مردم عالم بدیں فسانہ شدم

ہزارگونہ غم حاصل است و ردل ازو اگر مرا نکشد غم و گرچہ حاصل ازو

شیری | پنجاب کے ایک گاؤں کو کووالا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ایک بہت بڑے اور مشہور قبیلہ ماجیاں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ماں کے متعلق کہتا تھا کہ سید نادری ہے۔

شیری ناخواندہ ہے لیکن فطرت عالی اور طبع رسا پائی ہے۔ وضع کا پابند ہے۔ اس کے باپ مولانا یحییٰ کی تربیت سے بہت سی خوبیاں پیدا ہو گئیں۔ اس کے والد کا مطلع ہے۔

ہست از بابان لطف اے کریم کار ساز

در دل دانا ہر یک قطرہ صد دیائے راز

شیریں کو شعر کہنے پر پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ایک رات میں تیس غزلیں کہی ہیں۔

ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا۔ ع  
 ”چار دفتر شعر در آب چناب انداختم“  
 مولانا النداء امروہی مرحوم نے بہ حبستہ کہا: ”اگر تم اس پتھرے کو بھی ڈال دیتے تو کیا حرج ہوتا؟“  
 تیسری نہایت خوددار، دردمند اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس بات کی طرف اس نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے

صاحب خواں فقیرم و ہر گز  
 ہمت من نخواہد از جانان  
 قرض ہندو بشرط وہ پتجاہ  
 بہ کہ الغم این مسلمانان  
 خاص طور سے ”شکوہ شکایات“ کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا  
 گذشتگان ہمہ عشرت کنید کا سودید  
 ازاں کہ عیش بر افتاد از میانہ ما  
 ایکساں کہ پس از مار سید فاتحہ  
 بشکر آں کہ بنوید در زمانہ ما

بلاشبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے گیا ہے، دوسروں کی فصاحت اس  
 کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر ہر لگا دی۔ جیسا کہ خود اس نے اس قطعہ میں کہا ہے:

اگر از شعر شیریم پرسی گویم از در میانہ انصاف است  
 نہ ہمہ شعر شاعری سرہ است نہ ہمہ بادہ کساں صاف است  
 شیریں ابدال را کن مدحی کہ مناسب بحال اشراف است  
 غزل و مثنویں حیلہ سقط دیں سخن نے ستیزہ نے لاف است

نمونہ کلام:

چنان ز ریفۃ شد دل جمال سلمی را کہ باد است بدر گشتگی تسلی را  
 دماں دلی کہ توئی یاد دیگری کردن دروں کعبہ پرستیدن ست عزئی را  
 ہجوم ناز چنان گرد و پیش یار گرفت کہ ماہ نیست دران تنگہا تمنی را  
 کارواں گو تیز تر میراں کہ از درد فراق  
 مصر فریاد نہ لیتا بر تابہ بیش ازین  
 بتم بنامہ تار سفید و اشارتی است کنز دوری تو در رگ جاں خوں نمائندہ است  
 بے رخت دریلے درد و غم وجود ما بود استخوان پس لوسے ما موج آں دیدا بود



بکف تیغ ستم از بہر قلم تیر سزمی آید  
نہ پیدا و آنچہ نیگویند از اں خونریزی آید  
ز بس امیدواری قاصدے پندار از شیرین  
سوئے فر باد مسکین گزہمہ پر دیزی آید

چرا اے شک در چشم از وداع یار می گردی  
سراپا جان اے با و صبا دور تالہ بشوم  
اس کے قصیدے کے "جواب رسوال" کے چند شعر ہیں :-  
گفت خاموش کہ در مغز خال رفتہ خال  
گفت کونہ بود از دوسے رسن طول امل  
گفت در خواب نمایند پس از خواب اجل  
گفت قولیت کہ ہر گز نہ در آید بہ عمل  
گفت با صاحب بدخو نتوان کرد بدل  
گفت کو مصقائے بود کہ گیر و میقل  
گفت ایں ہا نتوان گفت بار باب دول  
گفت فریاد از یں قوم جفا جوئے و غل  
گفت باید بہ شہنشاہ بگوئے مجمل  
گفت خاقان بلند اختر خورشید محل  
گفت آں خلق خدا را بہ تفضل اول  
گفت لطف و گرمش حامی ملکست و مل

گفتم بے دل ز چہ او سارخہ از گشت بد  
گفتم از چاہ امید آب تمنہ اندر سد  
گفتم آسائش او بہت بگوئید کجاست  
گفتم ز یل نفس شاد تو اں بر دوسر  
گفتم آں یار چرا ابرو سے پڑ چیں دارد  
گفتم آئینہ دانش ہمہ جازنگ گرفت  
گفتم اہل عن آسائش مجلس باشند  
گفتم افسوس از یں مردم دور از معنی  
گفتم از بخت بہ تفصیل شکایت دارم  
گفتمش اکبر جم قدر سلیمان دانش  
گفتم آں ذات نبی را بہ تعظیم ثانی  
گفتم اصل و نسبش لازم تاج است و مرید  
یہ دو شعر بھی اسی قصیدہ کے ہیں جس میں ہاتھی کا ذکر ہے :

اے خوش آں شب ہا کہ ہر دم درد دے قیل و  
فیل رفتاں آہو چغم کو کو وال سا  
یہ مطلع اس کے ایک قصیدہ کا ہے جس میں چھ باتوں کا لزوم رکھا ہے :

سورہ واللیل خزانم برب آب بیاہ  
می کنم ہر لحظہ یاد و می کشم از سینہ آہ  
لے جہاں در قبضہ حکمت بضر تیغ و تیر  
تاج و تخت و تیرت مرد مرہ برق و شہاب  
تاجدار تخت و بخت از قیل و سپ آفاق گیر  
در شمار قیل و اسپت گشتہ عاجز مرد ویر

اس کا دیوان بہت مشہور ہے جس زمانہ میں وہ مہاجرات کے ترجمہ کے لیے مامور کیا گیا تھا تو کہا کرتا تھا کہ یہ  
فرسودہ داستانیں کسی بخار میں مبتلا مرعیں کے خواب ہیں ۔

ملاشیری نے ۱۹۹۷ء میں کوہستان یوسف زئی میں وفات پائی ۔

شکیبی اصفہانی | وہ حال ہی میں ہندوستان آیا ہے۔ میرم خاں کے لڑکے خان خاناں کے ساتھ رہتا ہے۔  
سلیقہ شعر سے بہرہ مند ہے۔

ہنوز نالہ شب ہائے من اثر دارد      کمان شکستہ من تیر کا رگہ دارد  
دل بہ ہجر و آویخت رجمتی اے بخت      کہ دست عربدہ باکوہ در کمر دارد  
تو گل بدامن یاراں قشاں کہ خستہ ہجر      بنوک ہر مژہ صد بارہ جگر دارد  
اے خدا جنس مرا از غیب بازاری بدہ

می فروشم دل بدیداری خسریداری بدہ  
در دست متاعم نہ طرب نہ رخ چہ پرسی      و اتم کو توستانی و من ہم نفسروشم  
لذت درد محبت کے قراموشم شود  
آں نمک را من بمغز استخوان افشانده ام

یہ سیف الملک حکیم کا تخلص ہے۔ وہ میر سید محمد جامہ باف دکن کا تخلص فکری تھا لیکن ”میر رباعی“  
کے نام سے مشہور تھے، کا علاج کر رہا تھا۔ میر نے اس کے بارے میں کہا تھا:

سیف قاطع بندگاں مولوی سیف الملک      آنکہ طرح نو بکمت در عمل آورہ بود  
وی اجل میگفت ہر بتاں جان مریض      ہر کجا رفیقیم پیش از ما علاجے کردہ بود  
شجاعی نے میر سید محمد کی نفس پرستی اور بد پرہیزی پر اس طرح چوٹ کی ہے:

رباعی مستزاد

اے میردو من عصیدہ چوں می گنجد      در معدہ سست  
در می گنجد نریدہ چوں می گنجد      زاد خال نخست  
لوحی کہ درد رباعی جانکیند      با خط غبار  
خود گو کہ درد قصیدہ چوں می گنجد      با لبت درست

یہ اشعار مولینا شجاعی کے کلام کا نمونہ ہیں:

ز سودائی بتاں داری مرے باموئے تولید  
مرت گردم کہ با عاشق مرے داری و سودائی  
نازلف افتادہ بر رخسارہ جاناں من است  
یا مگر بروئے آتش رشتہ جاں من است

جائے مازیر زمین یہ کہ برائی نفس شوم  
منت روئے زمین از اہل عالم می کو شوم

شعوری ترقی | یہ ایک طالب علم ہے۔  
اس کی مشق سخن کا نمونہ یہ شعر ہیں:

اے کہ زہیم ہجر اور در سکرات مردنی  
مزار خانہ برون ہر دم آرزوئے تو آرد  
ہزار گونہ جفا می کند رقیب معظم  
عشق در آمد رگ جاننش گرفت  
زلف کجش بر رخ مہوش فتاد  
عید بود تخم وفا کا شتن  
غیب آں دہر ابرو ہلال  
نے کہ چو خورشید گرفت ارتفاع

مژدہ کہ آن میسج دم میرسد و رسید است  
گرفتہ شوق گریباں من بسوئے تو آرد  
وے شعوری مسکین جہاں بوئے تو آرد  
حیرت دیدار ز باننش گرفت  
لعل برائے تو در آتش نہاد  
چسیت وفا عہد نگدا شتن  
عکس ہلالی ست در آب زلال  
ماہ عیاں گشت ز تحت اشعاع

ملا صدوق حلوانی سمرقندی | نہایت بلند مرتبہ عالم تھا۔ نہایت خوش کلام اور صاحب فضل۔ اس کا مرتبہ  
اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ اس کا ذکر شاعروں کی ذیل میں کیا جائے۔

لیکن افسوس ہم پر اور اس پر بھی کہ ایسا کرنا پڑا۔

سنتے ہیں وہ بڑی کوششوں سے ہندوستان آیا، پھر یہاں سے زیارت بیت اللہ کے لیے گیا وہاں سے  
۹۷۸ھ میں لوٹ کر آیا اور اپنے وطن چلا گیا۔ مرزا محمد حکیم نے اس سے کابل ٹھہرنے کی فرمائش کی تھی اور اس  
سے درس لینے لگا تھا۔

ان دنوں وہ ماوراء النہر میں درس و تدریس میں مصروف ہے۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، اس کا ذوق  
نہایت بلند ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔  
نمونہ کلام:

دل گم شد و نمی دہم کس نشان ازو  
در خندہ است لعل تو دارم گماں ازو  
جز درت جائے دل آوارہ را منزل نشد از درت گفتم شوم آوارہ ما دل نہ شد  
ہم چہ خورشید از سفر اے ماہ سیمای مدی  
خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی  
چہرہ گلی گل شمع ہر محفل نمی خواہم ترا ہر طریقت چوں شاخ گل مائل نمی خواہم ترا  
ضمیر دوست چوں آئینہ در مقابل ماست  
در و معائنہ پیدا است آنچہ در دل ماست

در عشقی کن تو پنہاں در دل و جاں داشتہ  
شد عیاں از چہرہ ام ہر چند پنہاں داشتہ  
سہی سروی کہ پرودم در دل چشم خونبارش  
بچشم خویش می بینم کنوں باہر خس و خارش  
بیایے اشک ازین رقتن ز چشم تر می خواہی  
مرا سوائی عالم ساختی دیگر چہ می خواہی  
چغتائی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا نہایت بے قید و لاابالی شخص تھا۔ شعر خوب کہہ لیتا تھا۔

صبوحی

بے حجابانہ دراز در کاشانہ ما کہ کسے نیست بجز در تو در خانہ ما  
عاشق نشدی محنت ہجران تکشیدی کس پیش تو غنما مہ ہجران چہ کشاید  
پس بجائے نہ نشستی کہ رقیبت نہ نشست جز دل من کہ تو جا کر دی داو بیرون اند  
من امشب از جفائے ہجر جاں بروم خیالت در میاں جاں در آمد و نمی بروم  
فغاں کن چشم آں تا مہرباں زان گو نہ قنالم کہ ہرگز چشم او بر من نیفتادہ است پنداری  
خیالت در نظر آوردہ میگویم وصال است ای وصال آتمنامی کم لیکن خیال است ای  
فغف غالب شد و از نالہ فروماندہ و لم و گر از حال من اورا کہ خبر خواہد کرد  
حالت خویش چہ حاجت کہ بد و شرح دہم کہ مرا سوز و لی ہست اثر خواہد کرد

در از افتادن مژگاں بلا انگیز می باشد بیاض دیدہ چوں گلاگوں شود خونریزی باشد  
اس نے آگرہ میں ۹۴۳ھ میں وفات پائی تاریخ وفات "صبوحی میخوار" سے نکلتی ہے۔  
صالحی کا رہنے والا ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اچھا خوش نویس ہے۔ عرصہ تک منشیوں میں کام کرتا رہا، پھر اپنے وطن چلا گیا۔

صالحی

نمونہ کلام:  
شب فراق تو در خانہائے دیدہ مرا۔  
نہ بستہ خون جگر آں چناں کہ خواب درآید

امیر خسرو کا شعر ہے۔

بگرد و دیدہ شود غار بستی از مژہ کریم کہ نے خیال تو بیرون رود نہ خواب آید

اس کے اور شعر یہ ہیں :

بد و چشم خوں نشاتم ز غمت شب جدائی      چہ کنم کہ هست اینها گل اوند آشنائی  
سرو برگ گل ندارم چہ روم بگشت گلشن      کہ شنیده ام ز گلهام ہمہ پوئے آشنائی  
چوسگاں بر آستان تواناں گرفته ام جا      کہ رقیب در نیاید بہ بہانہ گدائی

تا سرم گشت ازاں خنجر پیدا و جدا

مہر جدا غرقہ بخوں شد دل ناشاد جدا

عاشقی مایہ و دوست چہ ہجراں چہ وصال

خسرو از عشق جدا نالہ و فرہا و جدا

قندھار میں پیدا ہوا، اصل تعلق ہرات سے ہے کچھ عرصہ تک ہندوستان میں رہا، پھر چلا گیا۔

**صادقی**

مرا از بسکہ از تیغ تو در تن چاک می افتد

بہر پہلو کہ می رفتم دلم بر چاک می افتد

دل مجروح را پروائی تن نیست      شہید عشق محتاج کفن نیست

مرا چوں تنگ سوزی آنسریدند      چرا ایچم نصیبی ز اں دہن نیست

خیالی از تنم باقی است و آن ہم      چونیکو بنگری جز پیر سن نیست

روزیکہ قسمت ہمہ کس از قضا رسید

شادی نصیب غیر شد و غم بار رسید

اے دل گو کہ مے رسد آں مہ بنالہ ام

چندیں ہزار نالہ کہ کردم کجا رسید

اے قصر جفا یافتہ بنیاد از تو      دے رفتہ بنائے عمر بہ باد از تو

تو گنج ملاحظتی و لیکن ہر گز      دیرانہ مانگشت آباد از تو

یہ شیخ یعقوب کشمیری کا تخلص ہے۔ اس کا ہم کچھ ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ

تھا۔ اس نے تصوف اور دوسرے علوم و فنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی طبیعت بڑی شاعرانہ تھی

**صرفی**

بر رخ فلکند چاشت کہ آں مہ نقاب را

پیش از زوال شام رسید آفتاب را

از تو تیا میرس و ز اں خاک در بہرس      خاصیتش ز مردم صاحب نظر بہرس

آخری عمر میں اس نے تفسیر کبیر کی طرح ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، کچھ لکھ بھی لیا تھا لیکن اپنے وطن میں

انتقال کر گیا۔



کچھ عرصہ گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پھر لاہور چلا آیا۔ درویشانہ وضع میں رہتا تھا۔ جس زمانہ میں شیخ فیضی دکن میں مامور ہو کر گیا تھا یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکن ہی میں فوت ہو گیا۔ اپنی یادگار ایک دیوان چھوڑ گیا۔ قصیدہ وغزل میں خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔

## صرفی ساو جی

زراہ کعبہ ممنوعہ و گرنہ میفرستام  
کف پائے بزحمت چینی خار مغیلا نش

گل فروشی میں کہ خواہد گل بازار آورد بایدا دل تاب غوغائے خریدار آورد

گرم خواہی بسوزی آتش رخسار روشن کن

کہ از خاکستر من تا قیامت نور بر خیزد

خان زمان کے قتل کے دن یہ قید ہوا تھا۔ قتل ہونے سے توڑچ گیا مگر موت سے جان نہ بچا سکا۔  
صبری ہمدانی اس کے اشعار اوسط درجہ کے ہیں۔

سپر دم جان من بے صبر دل از داغ ہجرانش چہ دردست این کہ غیر از جاں سپرن نیست درنش

چوسوز آشکارا پیش او ظاہر نمی گردد جہاں گاہ سازم از جراح تہائے پنهانش

چو در شگون لباس آن مہر شیریں آید فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریہانش

کاش از خنجر من سینہ او چاک شود

تا بہ بیند دل پاکم دل او پاک شود

تھا تو دیوانہ لیکن دربار سے عاقل کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب تک خضر علیہ السلام کے نام پر کھانے کے پانچ چھ تھال کسی دریا یا چشمہ پر نہیں بھجوا دیتا کھانا نہیں کھاتا تھا۔

## صالح دیوانہ

یہ کام قاسم ہندی کے سپرد تھا جو ایک مہات کا لڑکے۔ یہ بھی شاعر ہے لیکن نہایت کمینہ آدمی ہے۔ قاسم ہندی یہ تھال

اٹھوا کر باہر لاتا اور شہدوں اور قلندروں سے کتنا کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ صالح دیوانہ اس سے پوچھتا تھا: تم نے خواجہ

خضر کو بھی کھانے پر دیکھا؟ وہ بے حیا جواب دیتا: ہاں ہاں حضرت خواجہ نے تو بڑے شوق سے کھانا تناول کیا۔ اسی

طرح اور بھی جھوٹی سچی باتیں لگا دیتا۔ دیوانہ کو ان باتوں کا یقین آجاتا۔

بہر حال دیوانہ موزوں طبع آدمی تھا، بس وہی مثل تھی کہ

شعر نگار نگ از طبع کج حیدر کلج

ہمچنان سر میزند کہ تودہ انبار گل

دیوانہ کا شعر ہے۔

چو سودا بی سر زلفش بیا انگندہ زنجیر

ددیں سودا بغیر از جاں سپردن نیست تدیر

کچھ عرصہ تک تو وہ بارگاہ شاہی میں مقرب و محرز رہا پھر معنوب ہو کر کابل چلا گیا۔ دوبارہ ہندوستان آیا جہڑ  
 سلطان المشائخ کا متولی بنایا گیا، لیکن اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا اور اجازت لے کر کابل لوٹ گیا۔  
 نام ملا علی محدث ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ملا صادق کا بھائی ہے۔ اس نے عرب میں حدیث کا علم حاصل  
 کیا تھا۔ نہایت متقی اور پیرہیزگار آدمی تھا۔ ہندوستان دو مرتبہ آیا تھا۔ ۹۸۱ھ میں وفات پائی۔ ملا  
 عالم کابلی نے تاریخ وفات کسی:

درینا کہ ناگاہ ملا علی را ربود از میاں دستبر و جہاڑ  
 پے سال تاریخ اوسال دیگر بگو "مردہ ملا علی محدث"  
 شعر کہنے کا سلیقہ تھا کبھی کبھی اس کی شوخ طبعی اشعار کا جامہ پہن لیتی تھی۔

تنی خاکی چنال افسردہ شد از داغ ہجرانم  
 رود پیروں چو گرد از جامہ گردامن برافشام  
 درون روضہ جاں قامت نہال من است نہال قد تو نازک تر از خیال من است  
 مردم چشم از اں جا در میان اکب کرد  
 تاکہ نتواند و می باخورد خیال خواب کرد  
 در میان مردماں چون نیست مار اعتبار ہچو اشک خویش میخوایم از مردم کنار  
 تا دل اندر قید زلف مہوشاں انداختم  
 از برائے خویشتن دام بلائے ساختم

طریقہ ساوجبی | بڑھا کھوسٹ اور مسخرہ تھا۔ اپنی بے حیائی کی وجہ سے دوبارہ میں سب شاعروں کو تنگ کرتا رہتا  
 تھا۔ آخر حج کی توفیق ہوئی، گیا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔

عشق بازی را بغیر از جاں سپردی پیشہ چیت  
 من کہ از مردن نیندیشم و گراں دیشہ چیت  
 کسے را جاں ز دست محنت ہجراں نہی ماند اگر ایل است ہجراں ہیچ کس را جاں نہی ماند  
 دریں دیار بخوں خواہ کہ دل بستم  
 بدام زلف پری چہرہ کہ اقدام  
 من سگ آفم کہ پا در دامن ہمت کشد نے بکس منت نہی نہی کہے منت کشد  
 دیدیم بر فتن قد آں سرور رواں را ہر چند ندیدہ است کہے رفتن جاں را

گفتی کہ زار میکشمت گرد من مگر د  
 گرد تو گردم از سخن خویشتم مگر د  
 دوعار صنت بخیا لم جو وقت خواب دل آید بخواب من ہمہ شب ماہ و آفتاب در آید  
 بیاد آمدنت با وجود آنکہ نیسانی زجاں قرار رود و دل اضطراب در آید  
 درد عشق افزود و ہمدردی دریں عالم نہاد  
 درد مند بود مجنوں در جہاں او ہم نہاید  
 کردہ ام از شاہد دنیا بکلی انقطاع تا نباشد با کسم از بہر دنیا ئے نزاع  
 نمی توان نفسی بے تو در جہاں بودن  
 چرا کہ جانی بے جاں نمی توان بودن  
 کسے نگفت و تپرسید کیں چہ مرحلہ بود کہ خضر آبکش واپسین قافلہ بود  
 شہر و لم سپاہ غمت را مسحراست  
 ایں داغ ہلے تازہ سیاہی لشکراست

**طالب اصفہانی** | آٹھ سال سے کشمیر میں مقیم ہے۔ پہلے ایک قلندر آدمی تھا، آخر ملازمت کر لی اور یاد شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا، اکبر نے اسے کشمیر سے چھوٹا بت کے حاکم علی رائے کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، وہاں سے لوٹ کر آیا تو وہاں کے حیرت انگیز حالات اور نوادرات کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور شیخ ابو الفضل کو دیا۔ اس نے اس رسالہ کو اکبر نامہ میں شامل کر لیا۔ نہایت درد مند غم گسار آدمی ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔ رباعی:

ز ہر دم بفراق خود چستانی کہ چہ شد  
 خوں ریزی و آستیں نشانی کہ چہ شد  
 اسے غافل از آنکہ تیغ ہجر تو چہ کرد  
 حاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد  
 غم نامہ من نخوانی و کہنت شود مجور  
 ہی من نہ دانی و کہنت شود  
 دید آمدنت مباد کیں ز خم فراق تو رسم کہ تو ویرانی و کہنت شود  
 یک روز من خستہ رہ منزل دل  
 از آبلہ پائے طلب ساختہ کل  
 جاں صرف رہی کنم کہ از رہبر نیانہ  
 جاں بہر جاں باشد و دل بہر دل

بعیش کوش کہ این بکر عمر حید نشین  
چو گل بر فتن از غنچہ مادر افکنده  
چو برگ گل کہ آباد بہار می افتد  
رویم از غم دل خاک بر سر افکنده  
شادم از اہل جہاں کہ صحبت فتاں بجہانی ندہم گوشہ تنہائی را  
خوش خط نستعلیق نویس ہے - کچھ پڑھا لکھا بھی ہے - آگرہ میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔  
**طالعی بزدی**

ساقیاں چند تو ان خور و غم عالم را  
بادہ پیش ار کہ پیروں کنم از دل غم را  
ہر دم کند از دل کنز خویش بیزارش کند دل کے شود بیزار از دہر چند ازارش کند  
بغیر خود ترا اے نار میں ہمد نمی خواہم  
ترامی خواہم وغیر تو در عالم نمی خواہم  
گر بصد و در دل از من سخنے گوش کند بشنود قول غرض کوئی و فراموش کند  
شود بے خود اگر گویم ز حال خود سخن باو  
چہ حالت این کہ نتوان گفت حال خوشتن باو

رباعی

پیش آرقناعتی گر از اہل ہشی  
باشد کہ سگ نفس دنی را بکشی  
ز نہار کہ آب و آتش کم کاسہ مخور  
کو داگوید بصد بخاب و ترشی

زاد بصلاح و زہد خود می نازد عاشق بر دوست نقد جہاں می یازد  
دارند امید نظر این ہر روز دوست تا دوست بسوئے کہ نظر اندازد  
ملا درویش فتح پوری کا لڑکا ہے - اس کا چچا ملا صالح اب خانقاہ فتح پور میں مدرس ہے - طفلی تیرہ سال  
کی عمر میں ہی "شرح شمسیدہ" پڑھنے لگا تھا - نہایت فیاض طبع آدمی ہے - شعر کا ذوق بھی بڑی حد تک  
مناسب و عمدہ ہے - بڑے شاہزادہ کی ملازمت میں رہتا ہے - یہ تخلص اسی دربار سے اسے ملا ہے - بڑے شاہزادہ  
کی تعریف میں اس نے جو قصیدہ کہا ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں :-

ایا شہی کہ جہاں راز رہزنان خال بدور معدلت فتنہ پاسبان آمد  
امید لطف تو بہت آنچنانکہ عاصی ا گناہ از آتش و زرخ نگاہاں آمد

توئی کہ مرکب عزم ترا بروز وعت      ظفر علم کش و اقبال ہم نماں آمد  
رساند نامہ اقبال دوش مرغ شرف      کہ صیت شہپریش ازواج لامکان آمد  
نوشته کاتب قدرت عبارتی کاں را      امید ترجمہ و شوق ترجمہاں آمد

گر حسن صنم جلوہ گر صومعہ گر و د      سجادہ کناں سبجہ بز ناز فروشند  
نقد و جہاں کس تشاسد ز خریدار      آں جا کہ متاع دل افکار فروشند

صنم کہ یافتہ ام ذوق نشتر صنم را

ز ریش سینہ من مچلت است مرہم را

آنچہ ما کہ دیم با اسلام در روز جزا      جائے آں دارد کہ گرد کفر دامن گیر ما

نوائے بزم عشق آتش زن مضرب بود امشب

اشارت نغمہ سنج ابرو بر شیم تاب بود امشب

یک اے دل خندہ را در لب گرہ زن      کہ امشب رونق خون تاب عشق است

ہر اس سر ز نشم نیست زانکہ طعن رقیب

بود بزمہب عشاق آفریں خوانی

زہے نگاہے تو غارت گر مسلمان      امید وعدہ تو مایہ پشیمانی

ز سجدہ صنم اے برہمن مشو نو مید      کہ ہست آئینہ بخت داغ پیشانی

کجا ز پنبہ و مرہم فرو نشیند درد

مرا کہ مرغ دل خستہ شعلہ بار آرد

توجیع بند:۔ اے گریہ بشارتی کہ امشب      خواب جگہ بدیدہ ز دجوش

وے وصل شفاعتی کہ شوقش      تاراج نمود کشور ہوش

از ذوق سخن مگو کہ ما را      نشتر بجراحتست ہم دوش

ایں قصہ کبس نمی توان گفت      الماس بزم ریز و مخز دوش

اس عمر میں فارسی کہنا اور سمجھنا ہی بڑی بات ہے کجا کہ شعر گوئی اور اتنی عمدہ آثار تو یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے بڑے بوڑھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

دکن میں رہتا تھا۔ نہایت آزاد منش اور بے قید لیکن دردمند آدمی تھا۔ امیروں کے گھروں پر کم ہی آیا  
ظہوری جاکر تا تھا شیخ فیضی اس کی اور ملک قمی کی جو ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا بہت تعریف کیا  
کرتا تھا۔ یہ دونوں فیضی کے ساتھ پائے تخت لاہور آنا چاہتے تھے لیکن برہان الملک راضی نہ ہوا۔ ان دنوں سننے



میں آیا کہ دکن میں غدر ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مولینا ظہوری صاحب طرز اور صاحب دیوان شاعر گزر رہے۔ یہ شعر اس کی یادگار ہے :

ظہوری شکوہ ات اذ یار بے جاست

تو بے طالع فتاویٰ جسم او چیت

**عالم کا بلی** عارف تخلص تھا۔ نہایت دلچسپ، خوش مزاج، خوش اطوار ملا تھا۔ بحث کے دوران اور دوسرے مواقع پر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتیں۔ اپنی بیاض میں "مترج مقاصد" کی بحث پر ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ جگہ جگہ اشعار بھی دیئے تھے لکھا تھا کہ یہ عبارت میری کتاب "مقصد" سے ماخوذ ہے اسی طرح اس نے "مترج تجدید" کے جواب میں "تجدید" کے نام سے اور "مطلوں" پر بھی ایک دو حاشیے لکھ رکھے تھے کہ یہ عبارت کتاب "طلوں" سے ہے۔ "مطلوں" اور "اطول" کے مقابل کی کتاب ہے۔ اس نے ہندوستان کے مشائخین کے حالات میں بھی ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس میں جس مجاور اور فقیر سے بھی کوئی بات سنی درج کر لی اور کچھ توہیں اندازہ پر اضافہ کر دیا۔ اس کا نام رکھا "فتح الولاية" لوگوں نے کہا بھائی اس واؤ عطف کا معطوف کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا "معطوف معطوف علیہ میں چھپا ہوا ہے جس کا نکالنا ممکن نہیں۔ اگر تم "ولایہ" کے واؤ کو زبردستی پڑھو تو پتہ چلے گا۔" ملا ہمیشہ قاضی خاں بدخشی پر اس وجہ سے رشک کیا کرتا تھا کہ سجدہ تعظیم ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر بندھ گیا تھا۔

ایک دن فتح پور میں مجھے اور مرزا نظام الدین احمد کو صبح صبح بڑا اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ اشتہا بڑھانے والے معجون اور اپنی کتابوں کا بستہ لے کر بیٹھ گیا۔ ہم صبح سے دوپہر تک بھوکے بیٹھے رہے، کہنے سننے کا کوئی موقع نہ تھا، آخر میرزا سے رہا نہیں گیا اور وہ بول اٹھے "کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟" اس نے جواب دیا "میں تو اس خیال میں تھا کہ تم لوگ کھانا کھا کر آئے ہو، میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے اگر فرمائیں تو ابھی ذبح کر دوں؟" ناچار ہم اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔ اس کی ان حرکتوں پر آخر اسے کیا سمجھا جائے؟

اس نے جب دیکھا کہ شیخ ابوالفضل اور قاضی خاں اور دوسرے اس کے برابر کے لوگ ملاگیری سے امارت کے منصب پر پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی ہر دم بادشاہ سے یہ عرض کرنے کی فکر میں رہتا تھا کہ اسے بھی فوج میں داخل کر لیا جائے جب اس کی درخواست قبول نہ ہوئی تو ایک دن شام کو چوکی کی سلامی کے موقع پر مانگی ہوئی ایک تلوار کمر سے باندھ کر فوجی وضع بنائے نہایت مضحکہ خیز حالت میں صف سے باہر نکل کر بادشاہ سلامت کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور خلافتِ قاعدہ کسی واسطہ کے بغیر براہ راست اکبر سے پوچھنے لگا "ہمیں کس منصب دار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے اور ہم کس جگہ سے تسلیمات بجالائیں؟" بادشاہ اس کا مطلب بھانپ گئے اور کہا "تم جس جگہ ہو وہیں سے تسلیمات بجالاؤ۔" جب یہ تدبیر بھی بے نتیجہ رہی تو ایک دن اپنی شان دکھانے کے لیے تاکہ فوجیوں میں داخلہ مل جاے یہی دوپہر کے وقت گرمی میں روٹی کا لبادہ جو میل سے چکٹ رہا تھا کسی کا بخشا ہوا یا مانگے مانگے کا تھا، پس کر دربار میں

آیا۔ مرزا کو کہنے اس لبادہ پر بڑی پڑ مذاق باتیں کیں وہ بھی ان کا اسی طرح جواب دیتا رہا۔  
اس کی جائے پیدائش کابل کے نواح میں گلپیار نامی ایک گاؤں تھا۔ اسی مناسبت سے عرصہ تک اپنا تخلص  
بہاری رکھے ہوئے تھا۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ تخلص کنیزوں کے نام جیسا ہے تو بدل کر ربیع رکھ لیا۔ اپنی نثر  
کے لیے اسی کا سجع بھی بنوایا۔ بہر حال عالم کابلی موزوں طبع شاعر تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

می پر و چشمی کہ می گشتم از و ہر لحظہ شاد

غالباً کا ہی نہ دیوارش بد و خواہم نہاد

شکست شیشہ عشرت ہر کہ بہ شستم گسست رشتہ صحبت ہر کہ پیوستم

برائے کشتن من تیغ کیں بد خاست ہر کہ یک نفس از روئے ہر بنشستم

چند شعر اس نے "سلسلہ الذہب" کی زمین میں کہے تھے اور اپنے اس مہمل مجموعہ کا نام "مصلحتہ الجوس" رکھا تھا۔ اس میں اپنی بہت سی ان تصانیف کے نام دیئے ہیں جو ابھی اس کے ذہن ہی میں مستور ہیں اور خارج میں نمودار نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے نام بھی بڑے عجیب عجیب گناٹے ہیں۔ مثلاً

ویدہ باشی بہ نسخہ تجدد کہ محب دور سید فیض جدید

کاندرو صد مواقف است نہال و از بیانش مقاصد است عیاں

تم تجرید پیش او لنگ است گلشن از قحط آب بیرنگ است

لمعہ اش بے تکلف و اعراق حکمت عین و حکمت اشتراق

وانکہ وصفش نہ مرتبہ فضل است اسم و رسمش دلالتہ العقل است

واں دزی کاں نہ بحر جود آمد لجنۃ الجود فی الوجود آمد

جامع آں عوالم الآثار من تعالیٰ ہم عالم الاخبار

کاندرو نوع علم تا صد و بیست کردہ ام این صفت بگور کیست

اس سحرہ پن سے قطع نظر ملا عالم بڑا اچھا دوست تھا، لائق فاضل، ہمدرد، بے غرض انسان تھا، ہزل گو مگر دلچسپ اور ہرول عزیز آدمی تھا۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و کرم سے بہشت جادو دانی عطا فرمائے گا۔

یہ کچھ عرصہ تک ہمایوں کے زمانہ میں صدر کے عہدہ پر رہے۔ ان کا بھائی میر عبد اللہ  
**میر عبدالحی مشہدی** قانونی خاص مصاحبوں میں تھا۔ یہ دونوں بھائی نہایت منتقی پرہیز گار تھے۔ میر عبدالحی

خطا بری سے بھی خوب واقف تھے۔ یہ خطا بابر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر  
مکہ معظمہ بھی بھجوا یا تھا، اب اس خط کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

میر علاؤ الدولہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر مذکور بہت سی حیثیتوں کے مالک تھے۔ خطا بابر جو نہایت  
مشکل خط ہے ان کے سوا کسی اور نے اس قدر جلدی اور خوبی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا۔ اس کے حاشیہ پر میرزا عزیز کو کہ

نے لکھا ہے: "میر کسی علم سے واقف نہیں تھا بس ایک ہنر جانتا تھا کہ بابر می خط اچھا لکھ لیتا تھا، عجب سادہ لوح ہے کہ ایسی سب سے مرد پا حکایتیں جنھیں کوئی بچہ بھی باور نہیں کرے گا، بے سوچے سمجھے، بے موقع و محل مجلسوں میں بیان کرنے لگتا ہے۔" چونکہ میرزا اس سے بہت پہلے سے واقف تھا اس لیے اس کی رائے زیادہ صحیح اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر علاء الدولہ کے تذکرہ میں بڑی شتر گری پائی جاتی ہے۔

میر عبدالحی شعر سے پوری مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس مصنوع رباعی کا جواب بھی کہا تھا جسے کسی فاضل شاعر نے میرزا ہندال کے نام مربع کی طرز میں کہا تھا۔ یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ بچے بھی پہلی جو چیز یاد کرتے ہیں وہ یہی رباعی ہے۔

رباعی  
اے تاج بدرگاہ تو صدر ستم زال  
تو بادشاہ ہند اہل کمال  
میرزا بکھرے تیرے ہزار ہر  
میر عبدالحی کے مزاج میں بھی بچکانہ پن تھا اس نے اس کے جواب میں یہ رباعی لکھی:  
اے تاج دلت ہزار حسم پوقیصر  
تو بدو دور و زبانی شام و صبح  
میرزا بکھرے تیرے ہزار ہر  
میرزا بکھرے تیرے ہزار ہر

یہ بچکانہ کھیل کے سوا کچھ نہیں۔ اہل علم اس کا "ترجعات" میں شمار نہیں کرتے بلکہ "الصنائع" اور "ہفت قلم" میں جو "ربعات" ہیں وہ بس ایسے ہی ہیں کہ چار مصرعوں کو جو کوہ لکھ دیا ان میں اور بھی قرینے ہوتے ہیں (رم)

**عتابی** | سید محمد نجی نام تھا۔ دکن میں نہایت معتبر و معزز تھا۔ ہندوستان آیا تو الہ آباد میں بادشاہ کے حضور رسائی ہوئی۔ وہ اکبر کو نہایت ہی لالہ بالی بے باک اور اکھڑا اکھڑا سا آدمی نظر آیا۔ یہ بھی بات عرض میں پہنچی کہ اس نے دکن میں شاہ فتح اللہ کی ہجو کی تھی۔ جب بادشاہ نے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا: وہاں دکن میں میں شاہ جیسے آدمیوں کو کہاں لائق توجہ سمجھتا تھا؟ یہ بات اکبر کی بدگمانی کو اور بڑھا گئی اور اس نے اسے قید کر دیا۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اس کے مسودات کی تلاشی لیں اور دیکھیں کہ اس نے اس عرصہ میں کس کس کی ہجو کی ہے۔ بعض چیزیں برآمد ہوئیں اور وہ دس سال تک قلعہ گوالیار میں قید رہا۔ آخر بڑے شاہزادہ اور دوسرے مقربوں کی سفارش پر اس کو معافی دی گئی اور لاہور بلا لیا گیا۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔ وہی بد مزاجی اب بھی موجود تھی۔

ایک دن قاضی حسن قزوینی جس کو خاں کا خطاب حاصل تھا اسے ملنے گیا، دربان نے روک دیا۔ دربان سے لڑ بھڑ کر قاضی کی محفل میں جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا پہنچ گیا اور قاضی حسن سے کہنے لگا کہ ”اچھا تو یہ کھانا ہے جس کی وجہ سے اہل علم کو دروازہ پر روکا جاتا ہے“ صاحب خانہ اور دوسرے حاضرین نے بہت معذرت کی کہ دربان نے آپ کو پہچانا نہیں لیکن عتابی نے مان کر نہ دیا اور کھانے میں شرکت نہ کی۔

عربی فارسی شعر کہنے میں بڑی اچھی مہارت رکھتا ہے ایک دیوان بھی مکمل ہے۔

نمونہ کلام:

ور گلخن ہوا دل فرزانہ سوختیم

قندیل کعبہ ہر وہ بت حنا نہ سوختیم

ما رخصت این خوں بجل را بتو دادیم	گفتیم و نوشیتیم و بجل را بتو دادیم
بہ عزت تو کہ ما بلبلاں این چنیم	کہ گل شکفت و ندانستہ ایم باغ کجاست
در کشور تو نام وفا گریہ آورد	قاصد جدا و نامہ جدا گریہ آورد
کوس سخا بلند و رہ آفتاب نیست	این طرز خاص و مجلس عام تو می کشد
از سر کوئی تو آوردہ بہتہ ان رفتم	عصمت اور دم و ترا دامن عصیاں رفتم
شب زلف تو ز جمیع دلہا خوش کرد	کہ رکویت من آزرده پریشاں رفتم
چشمہ خضر بختاک قدم می نازد	گرچہ لب تشنه تہ از چاہ ز ننداں رفتم
قدمی ریخت ہر در کہ ز دم پنداری	کہ بد و بیزہ سوئے آب لب خنداں رفتم
در ہفتاد و دو ملت زوم و اندر یاس	تا میدانہ مدد گبر و مسلمان رفتم

ز بے تابی عتابی دوری او حستم و اکنون

چو در دل بگذرو بے اختیارم گریہ می آید

رباعی

در عشق رخت علم و خرد با خستہ ام  
چہ علم و خرد کہ جان خود با خستہ ام  
در راہ تو ہر چہ داشتہ ام آخر عمر  
در با ختم و ہنوز بد با خستہ ام

عجبی نیست کہ از آب و ہولتے رخ تو نہ آہن دل برد مہر گیب آئینہ را  
رہائی کے بعد بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ نقد دے کر قلیج خاں کے حوالہ کر دیا کہ اسے سورت سے حجاز  
روانہ کر دیا جائے، لیکن وہ راستہ ہی سے بھاگ کر دکن چلا گیا اور وہاں کے حکام کے پاس پہلے کی طرح اعزاز و اکرام  
سے رہنے لگا۔

نور سیدہ جوان ہے، اس کا شعر ہے

عبدیدی

متاع دل کہ پر سیدم نمی ارزد  
کرشمہ کہ بہ پر سیدنتی نمی ارزم

اس کے اس شعر نے لاہور میں بڑی ہلچل مچا دی اور اسی لیے حکیم ابوالفتح نے بڑی تعریف کر کے اسے بادشاہ  
کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جب اس سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اس شعر کے بجائے ایک اور شعر جس میں  
زمانہ کی شکایت بیان کی تھی پڑھا جو بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعر کے اثر کی طرح ہمیشہ کے لیے  
غائب ہو گیا۔

عشقی خاں | یہ ترک پیرزادوں میں سے ہے۔ علم "سیاق" سے واقف ہے کچھ عرصہ تک سرکار اعلیٰ میں میر بخشی  
بھی رہا۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا ہے۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ  
میں حضور میں کلیات پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت ایک نیا قصیدہ اور غزل سنانے لگ گیا۔ اس کے مضحکہ انگیز  
شعر جیسے بھی ہوتے تھے سب کو معلوم تھا اسی لیے بادشاہ نے اسے روک دیا اور کہا ابھی رہنے دو جس وقت تم اپنی کلیات  
پیش کرنا ان اشعار کو بھی اس میں شامل کر لینا ہم سب کچھ ایک ہی بار سن لیں گے۔ خنجر بیگ کی شنوی کی طرح ایک طویل  
شنوی بھی کہی ہے۔

خوار و بے اعتبار و زشتہ من  
چہ بلا مردک پاشتم من

اس کے رٹکے رحمن قلی سلطان کو تار یخ کہنے میں بڑی ہمارت تھی۔ اس نے اس مصرع کو اپنی ٹھہر کا بیج بنایا  
تھا "بندہ رحمن قلی سلطان ولد عشقی خاں"۔

ازاں پر ہنر بے ہنر چوں بود

اس منتخب میں ہم نے شاعروں کے اشعار بلا کسی انتخاب کے جیسے تھے ویسے ہی پیش کر دیے ہیں اور اصل ماخذ میں



جو بھی رطب و یابس تھا، نقل کر دیا ہے، خان مذکور کے شعر بھی اسی طرح کسی تزیج کے بغیر نقل کیے جاتے ہیں۔ ان کے اچھے بُرے ہونے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ میر علاؤ الدولہ پر آتی ہے۔

عکس چشم بر خمارت در شراب افتاده است  
ہمچو مستی کنز سر مستی در آب افتاده است

غنیجہ از شوق ببت در صبح دم خنداں بوں      بلکہ بہر دیدن روئے تو چشم دل کشود  
بوقت خط نوشتن میکنم از گریہ تہ کاغذ      ز رشک آنکہ بنویسد قلم نام تو بر کاغذ

بہر حال بڑا نرم مزاج اور باوقار آدمی ہے۔ قدما کی چال ڈھال رکھتا ہے اب تو وہ فانی شرب پیر بن گیا ہے۔

اس کا لقب میر مرتضیٰ ہے۔ دو غلباد کے سیدوں میں ہے۔ خان زمان کا معتبر امیر رہا ہے۔ ایک وقت بدایوں  
اس کے زیر حکم تھا۔ صاحب علم و فضل اور نہایت خوش طبع آدمی تھا۔ بدایوں کے اکابرین میں سے جہا رخا نامی  
ایک شخص نے جس کا تخلص زاہد تھا، اپنی مثنوی کا ایک شعر جو لیم اللہ کی تعریف میں تھا اس کے سامنے پڑھا۔

کنگرہ سین چو خنداں شدہ

خندہ اوانہ بن دنداں شدہ

میر نے کہا ”کنگرہ سین کیا ہوتا ہے تمہارے شعر پر تو درو دیوار بھی خنداں ہیں“ کبھی کبھی شوخی طبع شعر کے قالب  
میں ڈھل جاتی تھی۔ چنانچہ اس کا شعر ہے۔

اے دل ہمہ شب آں سگ کو خواب ندارد

انزالہ و فریاد و فغاں کہ تو داری

میر عزیز اللہ قزوینی کے سیغی سیدوں میں سے ہے۔ فن سیاق اور منشی گری میں بہت ماہر تھا۔ دوسرے علوم سے  
بھی بخوبی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک شاہی دیوان بھی رہا۔ جب ہندوستان میں کروڑیوں کا تقرر  
کیا گیا تو وہ پانچ کروڑ کی تحصیل پر سفیل میں متعین کیا گیا اور اس صوبہ کا نظم و نسق اور مالیات کا انتظام کرتا رہا۔ آخر  
دنوں میں بادشاہی دفتر کے محاسبہ کی زد میں آگیا۔ جو کچھ پونجی جمع کی تھی وہ سب سرکاری خزانہ میں جمع کرنی پڑی اور  
اسی مصیبت میں فوت ہو گیا۔ اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ایک نظم شہر آشوب اور ایک منظوم رسالہ ”گل و گل“  
ہے۔ اس کے اشعار سلطان حسین مرزا کے عہد کے شاعروں کے رنگ میں ہیں، اس سے پہلے جن شاعروں کا ذکر ہوا  
ان میں سے اکثر یہی رنگ رکھتے ہیں۔

نمونہ و کلام : سبزہ خطر رستہ ز لعلش بسی با آب و تاب

زانکہ دائم می خود و از چشمہ خود شید آب

چنین کا فتادہ در راہ غم و محنت چو حنا شاکم

نسیم و لطف و احسانت مگر بردار و از حنا کم

یارب از جمیعت عصیاں پریشانم لبے رحمتی فرما کہ زیر بار عصیانم بے  
غم فراواں، غصہ بیحد، صبر کم، غمخوارنے چوں کنم یاراں بکار خویش حیرانم بے  
معلوم ہوتا ہے یہ اشعار اس نے زمانہ قید میں کہے تھے۔

**میرزا عزیز کو کہ** | اعظم خاں کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت با اخلاق نیک صاحب علم و فضل آدمی ہے۔ امرات  
شاہی میں اس جیسا سمجھ دار اور مدبر کوئی اور نہیں۔ وہ پہلے کبھی شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی  
کر تا تھا۔ ان صفحات کو ہم اس کے کلام سے خالی نہیں رکھنا چاہتے۔

بچوں نشد حاصل مرا کام دل از فانوس و تنگ  
بعد ازین خواہم نہ دن بر شیشہ ناموس سنگ  
اس کی ایک غزل کا مطلع ہے:

اے زلف چلیپائی تو نہ بنجیر دل من  
وے عشق تو آمیختہ با آب و گل من  
نیست کار و بار عالم را مدار دل ز کار و بار ادا فرودہ بہ  
گشت بیمار دل از درد غم تنہائی  
اے طیب دل بیمار چہ می فرمائی

جان من فرود من شد خاک در راہ وفا بیوفا یا را طریق خاکساری را بییں  
اگرہ میں باغ جہاں آرا بنایا اور اس میں ایک مکان کو نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ کتبہ پر یہ رباعی لکھوائی:  
یارب بصفائی دل از باب تمیز کاں نزد تو ہست خوب تر از ہمہ چیز  
چوں گشت بتوفیق تو این خانہ تمام از راہ کرم فرست مہمان عزیز  
اس کے جو کار نامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ان میں سب سے بڑا تو اس کا وہ دلیرانہ جج پر جانا ہے لیکن  
آہ اس کا وہ لوٹ کر آنا:

**عہدی شیرازی** | قصیدہ اور غزل ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔ جب دہلی  
آیا تو قاضی محمد کی معزولی کے بعد جو ایک کٹر شیعہ اور بد معاش آدمی تھا حکیم عین الملک مرحوم  
نے لاہور میں اس عہدہ پر عہدی کو مقرر کرانے کی بڑی کوشش کی اور صدور سے سفارش کی درخواست کی۔ قبل از قبل  
فال کے طور پر تاریخ بھی نکالی۔ قاضی عہدی "لیکن اس کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بس شیخ جلی کا خواب دیکھ کر  
رہ گیا اور حکیم کے ساتھ دکن چلا گیا۔ حکیم کے مرنے کے بعد اس کے حالات کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا کیا ہوا۔

از خوں لب شکوہ ام اگر تو می شد از روزن دیدہ دودل بر می شد  
اشکم ہمہ شعلہ ربز آتش می ریخت آہم ہمہ تاب دادہ انگر می شد

حکیم عین الملک جس وقت لاہور سے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا حکیم سنائی کی یہ رباعی محفل میں پڑھی گئی۔

مئی زن نفس کہ ہم نفس نزدیکست      ویں مرغ مرا و از نفس نزدیکست  
تا کئی گوئی کہ دورم از دلیر خویش      در خود بنگر کہ یار بس نزدیکست  
محمی نے اسی وقت فی البدیہہ کہا:

محمی کہ دلش با ہمہ کس نزدیکست      باغچہ باغ و خار و خس نزدیکست  
زاں دور نکر و ند ز محل او را      کش نالہ بنالہ جر کس نزدیکست  
حکیم عین الملک نے ان دونوں رباعیوں کے جواب میں بے ساختہ کہا:

چوں یار تو با تو ہر نفس نزدیکست      ہشدار کہ آتش نجنس نزدیکست  
اے ماندہ زہر ہاں و گم کردہ طریق      بشتاب کہ آواز جر جس نزدیکست  
علامہ مدنی نے بھی اسی وقت یہ رباعی کہی جسے میں نے اپنی بیاض میں لکھ لیا تھا۔

آزادیٰ ایں مرغِ قفس نزدیکست      ویں شعلہ بکار خار و خس نزدیکست  
از من ہزار بال و پر بگریزد      گر غم داند کہ با چہ کس نزدیکست  
میری بھی سنگدل کا کیا کہنا کہ میں کیسے کیسے لوگوں کی جدائی کا پتھر سینہ پر اٹھائے زندہ بیٹھا ہوں۔

عنایت اللہ کاتب | شیراز کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں شاہی کتب خانہ میں منتظم ہے۔ نہایت خوش طبع اور ذہین ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔

رباعی: افتادہ چو مرغ بے نوا در قفسم

بے ساز صدا چو دل شکستہ جو رسم

با آنکہ حقیر تر ز مور و گسم

بگرفت ز تنگی دو عالم نفسم

تا کابل و زلف نیکیاں غم نیم است      تا فیوہ و رفتا با چم نیم است

تا نادرک غمزہ در کمان ستم است      مرگ من و زندگی من دم بدم است

بارہ علاج خویش آموختہ ایم

با خرمن عصیاں خود اندوختہ ایم

ما آتش دوزخ از خود فروختہ ایم

خود را بہ گناہ خویشتن سوختہ ایم

در گشتن ایں جہاں گل نیست      کا لودہ بخوں لبس نیست

گھوڑے کی تعریف میں کہا ہے :

گہ پو یہ اعضا ش از بس شتاب

بہم دب رود ہچو اجزائے آب

عرفی شیرازی

بلند فطرت صاحب فہم نوجوان تھا۔ ہر طرح کے شعر بہت اچھے کہے ہیں لیکن کچھ اتنا متکبر اور مغرور تھا کہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ بڑھا پے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

جب ولایت سے فتح پور آیا تو سب سے پہلے شیخ فیضی سے اس کی دوستی ہوئی۔ شیخ نے بھی اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس آخری سفر میں ملک کے قریب فیضی کے مکان پر ہی رہتا تھا اور اس کی ضروریات شیخ کے ہاں سے پوری ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ فیضی کی عادت تھی وہ ہر شخص کے ساتھ بس ہفتہ دو ہفتہ کی دوستی کرتا تھا پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا تھا۔ دونوں میں شکر رنجی ہو گئی اور عرفی نے حکیم ابو الفتح سے دوستی کر لی اور اس کی سفارش سے خانقاہ کی خدمت میں چلا گیا وہاں اس کے جوہر کھلے۔ روز بروز اس کی شعر گوئی اور مراتب میں ترقی ہونے لگی۔

ایک دن شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا۔ فیضی ایک کتے کے پلے سے کھیل رہا تھا۔ عرفی نے پوچھا کہ اس صاحبزادہ کا کیا نام ہے؟ فیضی نے کہا ”عرفی“ اس نے برحستہ جواب دیا ”مبارک ہو“ (مبارک فیضی کے باپ کا نام تھا، اس چوڑے فیضی تلملا اٹھا لیکن کبھی کیا سکتا تھا، چپ ہو رہا۔

عرفی اور حسین ثنائی نے شاعری میں بڑا انہیبہ پایا ہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے ہوئے کھڑے نظر نہ آئیں۔ ان کے دیوان، عراقی ہندوستانی سب تبرکاً خریدتے ہیں۔ اس کے برعکس شیخ فیضی وہ اپنی کتابوں کے لکھوانے، ان کا زکاء کرنے میں بے دریغ رویہ اٹھاتا ہے لیکن کوئی اس کی کتابوں کو جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھتا، بجز ان مسودوں کے جو خود وہ ادھر ادھر بھیجتا رہتا ہے۔

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے ”مخزن اسرار“ کی بحر میں ایک ثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی۔

رباعی

نمونہ کلام :

فروا کہ معاملان ہر فن طلبند

حسن عمل از شیخ و برہمن طلبند

آہنا کہ درودہ جوئی نہ تاند

و آہن کہ نکشتہ بخرمن طلبند

کے کہ تشنہ لب ناز تست میدان کہ موج آب حیات است چیں پیشانی

قابل درد محبت کس نیا مدد و مدد

رنگ روئے خویش را ہر کس بدستانی شکست

marfat.com

Marfat.com

عشق می گویم و می گویم زار  
 طفل نادانم و اول سابق است  
 منہ بروں قدم از جہل یا فلاطوں باش  
 کہ گر میانہ گزینی سراب و تشنہ لبی است  
 اس کی اس غزل کا مطلع خوب ہے:

مدار مجلس ما بر حدیث زہر لبی است کہ اہل ہوش عوامند و گفتگو عربی است  
 بشوقِ دوست چہ سازم کہ در شریعت عشق نگاہ بے ادبی و خیال رسوائی است  
 زمانہ مرگ مرا بد کلام درد نوشت کہ من بیدہ جانم نگر دم استقبال  
 یک سخن نیست کہ خاموشی ازاں بہتر نیست نیست علمی کہ فراموشی ازاں بہتر نیست  
 گرد مہر گشتی و کردی طواف کعبہ اگر بال و پری داشتی

**غزنوی** | یہ میر محمد خاں کلال کا تخلص ہے جو بڑے اعلیٰ مرتبہ مشہور امیر تھا۔ اس کی محفل کبھی اہل علم اور شعراء سے خالی نہ رہتی تھی۔ باوجود سرکاری مصروفیات کے وہ شعر کہنے کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ ایک بڑا دیوان مرتب کر لیا تھا اور بادشاہ سے کہتا تھا کہ تمہارے عہد کی بڑائی یہی ہے کہ مجھ جیسا آدمی اس عہد میں موجود ہے۔

در جوانی حاصل عمر بنا دانی گذشت  
 آنچه باقی بود آں ہم در پشیمانی گذشت  
 اے جوان جز تحم نومیدی نکشتی در جہاں  
 موسم پیری رسید وقت دہقانی گذشت

برو اے غزنوی دم از سگاں یار ہند زن قناعت کن بنان خشک و استغناء عالم زن  
 بہ تاج تکبر از سرو از ما و من بگذر اساس سلطنت بر ہم چو ابرہیم ادھم زن  
 ز خویش و آشتنا قطع نظر کن تا بیا مائی اگر نور و حشمت و اخور و در راہ بس خم زن  
 جس زمانہ میں وہ سنبھل کا حاکم تھا اس نے شیخ سعدی کی اس غزل کو طبع آنہ مائی کے لیے پیش کیا۔  
 ولی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است  
 ز عشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است  
 اور خود اس پر یہ شعر کہا:

و می کہ چہرہ ساقی زیادہ گل رنگ است  
 بنوش بادہ بر آواز نہ کہ دل تنگ است

میرامانی اور دوسرے شاعروں نے اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق اور اس زمانہ کی زبان کے مطابق جواب دیئے۔ جمال خاں مرحوم بدایونی خاں موصوف کے مقرب و صاحب تھے اور بڑے لطیف طبع آدمی تھے۔ انھوں نے جو



غزل کی تھی اس کا مطلع ہے ۷

تراخ از منی عشرت مدام گل رنگ است

مرا بہ فکر و ہانت چو خنجر دل تنگ است

اس زمانہ میں میں کانت و کولہ میں حسین خاں کی خدمت میں تھا کہ رات کے وقت یہ غزل میاں جمال خاں کے خط کے ہمراہ وصول ہوئی۔ دوسری صبح کو ہی خبر ملی کہ وہ سنبھل کی عید گاہ میں عید قربان کے دن بیہوش ہو گیا اور عین جوانی میں محبوب حقیقی سے جا ملا۔ اس کی لاشس بدایوں بھیجی گئی۔ اس کی تاریخ وفات ”آہ جمال خاں بمر“ نکالی گئی ۷

گردوں در آفتاب سلامت کرانشا ند

کو را چو صبح روشن اندک بقا نکر د

یہ قاسم علی ولد حیدر بقال کا تخلص ہے جو بڑا بد مزاج مغرور اور متکبر مشہور تھا۔ اپنے آپ کو قریشی جتلاتا تھا لیکن یہ بات طے شدہ تھی کہ جس کا نسب اونچا نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو قریش سے منسوب کر دیتا ہے۔ اس کی محفل میں اگر اس کا باپ چلا آتا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی اور بگڑنے لگتا تھا۔ اس کا باپ اس سے کہا کرتا تو چاہے کتنی ہی شیخی کرے، میں تو اپنے اگرہ والی دکان پر بیٹھتا ہوں پھل اور معجون وغیرہ بیچتا ہوں اور ہر آنے والے سے چاہے وہ پوچھے یا نہ پوچھے میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ قاسم علی خاں میرا حقیقی بیٹا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟ کہنے لگا آٹھ اور ان کی تفصیل یہ ہے ۷

دوازہ من ست و دوازہ بی بی و دوازہ ہر د

دوئی دگر کہ نہ از بی بی است و نہ از من

قاسم پہلے بڑا حسین جوان تھا اور مجلس شاہی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے بادشاہ کا نائب ہی گیا اور خان کا خطاب و منصب پایا۔ وہی مثل ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا تو نے سنا فلاں کو خان بنا دیا گیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا اچھا ہوا وہ کہینہ اسی قابل تھا۔

اس کی تحریر اور علم بس بادشاہ سلامت کی طرح ہی تھا ۷

اورا چو طفلکاں خطکی و سواد کی

با آں خط و سوادک خود اعتقاد کی

میں اسے اکیس سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ ”متوسط“ کا سبق پڑھتا رہتا ہے اور اپنے استادوں سے زبردستی تسلیمات کراتا ہے۔ اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو پھر اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مار ہے کہ اس کا سبق کبھی تک ”وضع لمعنی مفرد“ کے قاعدہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اس کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ اس کے اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

ماسوائی آب مائل و حمام جائے ماست  
حمام خانہ ایست کہ خاص از برائے ماست

کسی کا مطلع ہے ۵

تارے زلف خم بہ خم یارم آرزوست  
یعنی کہ درد مند و اظہارم آرزوست

اس نے اس مطلع کے جواب میں کہا ۵

اظہار و پیش سگ یارم آرزوست  
یعنی کہ درد مند و اظہارم آرزوست  
ز چشم او نرسد جز بلا ہرگز ندیدہ پیچ کس این چنین بلا ہرگز  
رباعی ۱

ہر کس کہ بہ عشق مبتلا می گردد  
با محنت و درد آشنا می گردد  
در دائرہ عشق ہر آن کورہ یافت  
پر کار صفت گرد بلا می گردد

سلسلہ میں باہر از حسرت اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی تاریخ مد قاسم خاں ابلہ سے نکلتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی تاریخ وفات سلسلہ ہے اس کے مطابق بجائے "ابلہ" کے "جاہل" کا لفظ پورا اترتا ہے ۵  
چوں تو جاہل باش از ابلہ بخواندت مرنج  
ز انکہ این ہر دو عبارت وہ نزدیک گراست

صاحب دیوان شاعر ہے۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی ہے۔ کہا کرتا تھا کہ "میں ایک دن ماوراء النہر  
غزنی حصار میں سلطان الاولیا رشیخ حسین خواجہ زمی کی محفل سماع میں حاضر تھا اور قوال یہ رباعی گارہے تھے

عمریت کہ من ز پوست پوشان توام در دائرہ حلقہ بگوشان توام  
گر بنوازی من از خروشان توام و ز نوازی من از خموشان توام

حضرت شیخ آخوی میت پر سر دھن رہے تھے۔ اس وقت اچانک ان کی صحبت کی برکت سے مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہو گئی میں اپنے ہوش میں نہ رہا اور میری زبان سے یہ شعر نکل گیا۔

گر بنوازی مرا و گر نوازی در دائرہ حلقہ بگوشان توام

یہ سن کر حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی وجد میں گھمانے لگے۔ اس وقت جولذت نصیب ہوئی وہ دل سے جاتی نہیں۔

۱۹۶۶ء میں اگر وہ میں شیخ فرید کے مدرسہ کے قریب انتقال کر گیا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے:

دہان یار با من دوش ریزے گفت نہانی  
کہ من سرچشمہ آب حیاتم بیچ می دانی  
قضا جہان تو خنم چرا نمی ریزد مگر ز دست قضا این قدر نمی آید  
مختصر بود حدیثی ز لبش فہم نہ شد  
خط بگرہ دلب او حاشیہ مختصر است

برہم عشق تو در بیچ منزلی نہ رسیدم کہ درو عشق ترا پیشتر رسیدہ ندیدم

عرصہ تک ہندوستان میں رہا، پھر شیراز چلا گیا  
بقتل غیر راضی نیم زہرا کہ می دامن  
اجل زہر ہلاک از خنجر جلاد من بردہ

غیرتی شیرازی

ز تار سجہ اے زاہد گرہ بے صدق نکشاید برویک چنداں را رشتہ ز ناز گہراں کن  
خوش دیار سیت سر کوئے محبت کہ شود ہم با ہر بدل کینہ افلاک آنجا  
ہلاک خنجر آں قاتلم کہ خون مرا چناں بر بخت کہ یک قطرہ بر زمین نہ چکید

یہ شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے جس کا ذکر اسچکا ہے۔ ایک مرتبہ ہندوستان آیا تھا۔ بیرم خاں خانخانان  
نے اس سے درخواست کی فارغی شیخ ابوالوہید خوانی کا تخلص ہے اور مجھے ان کے ساتھ بڑی حقیقت  
ہے، اس لیے تم اپنا تخلص فائقی رکھ لو۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے فائقی ہی تخلص رکھا لیکن جب عراق گیا تو اپنا پہلا تخلص  
اختیار کر لیا۔ دوسری بار ہندوستان آیا اور یہیں پیوند خاک ہو گیا۔

فارغی شیرازی

اس کا لڑکا میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔ میں نے اصطراب کے بیس باب اسے  
پیش کیے تھے۔ نہایت بلند فطرت اور باہمت آدمی تھا۔ اس کا بھائی میر شریف بھی بڑا عالم و فاضل تھا۔ میر تقی کہا  
کہ ناتھا میرے خاندان میں ہم دو بھائی اور شاہ فتح اللہ سنی مذہب ہیں باقی سب کٹر شیعہ ہیں۔  
یہ شعر میر فارغی کے ہیں:

خوش آن کر وعدہات خوشحال در محنت مرا فی خود

نشیم منتظر ساعت بہ ساعت سوئے در طہیم

بجائی میر ساند عشق آخر آشنائی ہا کہ عاشق خویش را بیگانہ یا بد از جدائی ہا  
برتن خاکی مجنوں نبود داغ عیاں کز پی قافلہ لیلی است بروماندہ نشاں

رسید ایام عید و فکر من پیوستہ آن باشد

کہ بہر تہنیت یارب کہ با او ہمز باں باشد

بلکہ دل چناں شد عام جور شکر عشقت کہ آں جا کارواں صبر ہر گز بار نکشاید

جنوں آں عقدہ در عشق بکشايد آسانی کہ با صد گونه محنت عقل و عوید از نکشاید  
بشرطی فارغی در خدمت آں بت کمر بستہ کہ تا روز قیامت از میان ز تار نکشاید

در ہجر ساختیم بحیات خودائی اجل

تتوان در انتظار تو ہم بیش ازین نشست

امام ثامن امام رضا کی شنا میں اس کے قصیدہ کا مطلع ہے :

صراف چرخ صبح کہ دکان خود کشا د

ہر خروہ کہ داشت بہ یک اشرفی نداد

بڑا جہاں نور و سیاح تھا ہندوستان آنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ موزوں طبع آدمی تھا

ز عشق آں شعلہ خواہم در تن غم پرور افتد

کہ تا گریم ز سوزش آب در خاکستم افتد

دل را با حتمال پیامش و ہم قراہ ہر چند ایں محال میسر نمی شود

روم زن دم نہ سوزد تا دم صور

کہ جہاں جز سرائے ماتم نیست

یہ خوش طبع معمر گو شاعر نادری سمرقندی کا بیٹا ہے۔ ہندوستان آیا تھا لیکن واپس چلا گیا۔

تا خاصیت مے میں پیر معاں گفت

از توبہ پشیمان نہ چنانم کہ توان گفت

نہ موئے معتبریں چوں بہ تلمش پیرا ہئی یک لباس کعبہ اش بہ خویش بچیپدم

اصل نام سید محمد جامہ باف ہے اور رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعیات میں وہ اپنے زمانے کا خیام تھا۔

جون پور کے سفر میں ۱۱۷۷ھ میں فوت ہوا۔ اس کی تاریخ ”میر رباعی سفر نمود“ سے نکالی گئی۔

رباعی : دار و فکری سری سامانش نیست در ویست بدل نہاں کہ در مانش نیست

عمر نیست کہ پا کردہ ز سرحد رہ عشق سر کردہ رہے کہ ہیج پایانش نیست

اس کے اشعار بہت مشہور ہیں اس لیے چند رباعیوں اور بیت پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔

اے دل اگر تیار سپاہی است مترس کارش ہمہ جور و کینہ خواہی است مترس

در شکر حسن او دو چشمش جنگی است باقی خط و خال او سپاہی است مترس

چو ہسر کے کہ تیغ بہ سر نگرفت سرتا قدمش سپر در زر نگرفت

گل پیریں جو غنچہ در بر نگرفت گل پیریں جو غنچہ در بر نگرفت

فردا کہ نماں از جہاں جز خبری ظاہر شود از بہار عشر اثنی

چو بنبھرا ز خاک بر آہند بیتاں مانیز بہ عاشقی بر آہیم سری

فہمی طہرانی

فہمی سمرقندی

فکری

## فنائی

میروی بازلف شنگوں وچوں شبنم ہر طرف از تو میبارد و نمکای وائی بردہائی ریش  
چغتائی کنیز زادہ ہے۔ سفر بہت کیے ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوا۔ لڑائی میں بہادری کی وجہ  
سے خان کا خطاب حاصل کیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔ کہتا تھا تین  
شین یعنی شمشیر، شعر، شطرنج کوئی مجھ سے جیت کر نہ لے جاسکا۔ اس کی اس عادت پر اکبر نے برہنہ کہا شیطنیت  
کا شین بھی ”کچھ عرصہ تک قید میں رہا۔ رہائی پائی تو دیوانہ ہو گیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔  
اس کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس کے شعر بھی بگڑے ہوئے چغتائی میرزاؤں کے رنگ میں ہیں۔

رسم کس بمقصود ی زیارب یارب شہا چرا مقصود من حاصل تشدایب یارب  
اس کا ایک مطلع مجھے پچاس سال سے برابر یاد ہے۔ تاریخ نظامی میں بھی لکھا ہوا دیکھا:

نگویم بہر تشریف قدومت خانہ دارم

غریبم خاکسارم گوشہ ویرانہ دارم

تا گل روئی تا از بادہ گلغام شگفت بادہ از عکس گل روئی تو در جام شگفت

سید اور قصہ گو ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھٹھ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہو  
فسونی یزدی گیا ہے

بے بہت از پیش نا جنسی گذر کردن پود گر گذر افتاد سوئی او نظر کردن چہ بود

در سخن بودی بغیر از دور چوں دیدی مرا گر حجاب از من نہ کردی مختصر کردن چہ بود

چوں شدم حاضر کہ با غیار می گوئی سخن کردی اورا غافل و دیدی نہانی سوئی من

کہ در تغنیم فسونی بفریب و گراں ورتہ آں بے سرو پا لایق تعظیم نبود

بعد از ہزارہ وعدہ کہ یک بار رخ نمود آں ہم نہ بیم غیر ز مانی نمود و رفت

کشتہ غمزہ جانان نمنہ چشم بہم دم آخر شدہ حیران بر رخ قاتل خویش

میرزا محمد حکیم کا خانہ زاد ہے۔ اس کا تعلق سند کا قبیلہ سے ہے، غالباً ہندوستان کے جنگلوں  
میں فوج کے ہاتھ آگیا اور سہایوں بادشاہ کی ملازمت میں رہا اور میرزا محمد حکیم کے ساتھ پردش

پائی۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے نہ اس کا خط ہی اچھا ہے، البتہ موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور طنبورہ کو ایک خاص انداز میں

بجاتا ہے۔ پٹنہ کے سفر سے واپسی کے وقت قاضی خاں بدخشی کے ہمراہ جون پور سے آکر شاہی ملازمت اختیار کی۔ علم

تو اسے نصیب نہ ہوا لیکن اس کے اشعار اثر و شوخی سے خالی نہیں ہیں۔

غیر منظور نظر ساختہ یعنی چہ بندہ را از نظر انداختہ یعنی چہ

کس ندیدیم بدور تو باں حسن و جمال قیمت سخن بر انداختہ یعنی چہ

عللج ایں تن بیمار چسیت جز مردن بروئے طبیب مکن رنج خورشین ضائع



سن ہے کہ اب وہ اکثر متقدمین و متاخرین کے دیوان کے جواب کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

بڑا مستعد آدمی تھا، دہلی میں قوت ہوا۔

**فہمی الہ آبادی**

رباعی

بے رونے تو در عرق گل آب زدہ زلف تو در وینقشہ تاب زدہ  
چشماں تو چوں دوست در یک بالین مہر بہر ہم نہادہ و خواب زدہ  
دریں زمانہ فراغت فسانہ شدہ است کجا روم چکنم بد زمانہ شدہ است  
جاں بلب اہل وفاراز جفا گدہ تست تیغ بردار کہ خون ہمہ در گدہ تست

**ملک الشعراء شیخ فیضی** مختلف فنون شعر معما گوئی عروض و قافیہ تاریخ لغت طب اور انشا میں بے مثل

شخص گزرا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص مشہور رکھا تھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو رابو الفضل، علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا لیکن یہ تخلص سازگار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ فیضی بڑا جدت پسند ہزل گو متکبر مغرور تھا۔ نفاق، خباثت، ریاکاری، حب جاہ اور رعونت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مسلمانوں سے تو اسے دلی عناد تھا۔ اصول دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابہ کرام متقدمین اور متاخرین اہل علم اور مشائخین زندہ یا مرحوم ہر ایک کی مذمت اور بے ادبی کرنے میں اسے باک نہیں ہوتا تھا۔ تمام علماء صلیحا و فضلاء کی رات دن توہین کرتا رہتا تھا اس سے تو یہودی نصرانی ہندو اور مجوسی لاکھ درجہ بہتر تھے۔ ایسا بد عقیدہ تھا کہ تمام حرام باتوں کو شریعت کی ضد میں حلال اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے جو بے نقط تفسیر لکھی تھی وہ بھی بس اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تھی۔ کم بخت نے تفسیر بھی مستی اور ناپاکی کی حالت ہی میں لکھی۔ اس کے پائے ہوئے کتے بھی اس کے مسودوں کو ناپاک کرتے رہے۔ اس کا عجب وغرور، ہٹ دھرمی اور بے دینی دھری کی دھری رہ گئی اور اسے اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہونا پڑا کہ خدا نہ کسی کو دکھائے نہ سنوائے۔

جس وقت بادشاہ اس کے آخری دم پر پہنچے تو ان کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوچ گیا تھا اور لب سیاہ پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے شیخ ابو الفضل سے پوچھا۔ اس کے بیوں پر اس قدر سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے اپنے ہونٹوں پر مٹی لگائی ہوئی ہے؟ ابو الفضل نے کہا: نہیں یہ خون جم گیا ہے جو قے میں نکلا تھا۔ اس ناپاک بد بخت اور حضور اکرمؐ پر طعن کرنے والے کا ایسا ہی حشر ہونا چاہیے تھا اور یہ بھی کم تھا؟ اس کی مذمت میں لوگوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں۔

فیضی بیدین چور مرد سال و قاتلش گفت سگے از جہاں رفتہ بحالِ قلع

ایک اور تاریخ ہے:

سال تاریخ فیضی مردار شد مقرر بجا مذہب نار

کسی اور نے کہا:

فیضی نجس دشمن نبویؐ رفت و با خویش داغ لغت برد  
سگای بود و دوزخی زان شد سال فوتش چہ سگ پرستی مرد  
اسی طرح :- ”قاعدہ الحاد شکست“ ”بود فیضی ملحدی“ اور

بچوں بنا چارہ رفت شد ناچار سال تاریخ ”خالد فی السار“  
پورے چالیس سال تک شعر کہتا رہا لیکن اس کے سب شعر بس عجیب ہی ہیں۔ ہڈیاں خوب جمع کیں مگر مغز کسی  
میں نہیں ملتا۔ سارے شعر بے مزہ ہیں، البتہ مہمل باتوں کے بیان کرنے، فخر و شان دکھانے اور کفر بکنے میں سب سے  
آگے تھا۔ اس کے کلام میں نہ تو ذوقِ عشق کا پتہ چلتا ہے نہ معرفتِ ملتی ہے اور نہ درد کی لذت، حالانکہ اس کے دیوان  
اور مثنویوں میں بیس ہزار سے زائد ہی شعر ہوں گے۔ اس کے کسی شعر نے کبھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی اور اس  
کی بد بختی کہ اس کا کوئی شعر کسی نے خواہش سے پڑھا نہ یاد کیا۔ اس سے تو معمولی انداد فی شاعر زیادہ خوش نصیب  
رہے۔

شعرے کہ بود ز تکتہ سادہ ماند ہمہ عسریک سوادہ  
لطف یہ کہ اپنی جاگیر کا سارا روپیہ اپنے جھوٹے خیالات کی تشریح میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اشعار اور تحریریں لکھوا  
لکھوا کر دور و نزدیک کے شناساؤں کو بھیجتا رہتا تھا، لیکن کوئی شخص دوبارہ ان کو چھپونے کا بھی روادار نہیں ہوتا  
تھا۔

شعر تو مگر از حرمت ستر آموخت  
کز گوشہ سخا نہ میل بیروں کند

اس کے خود منتخب کردہ شعر جو بطور یادگار اس نے لکھ کر میرزا نظام الدین وغیرہ کو دیے تھے۔ ان میں سے  
چند شعر یہ ہیں:

مژگاں مہند چوں قدم از دیدہ میکنی	مرداں رہ برہنہ نہادند پاسے ما
چہ دست می بری اے تیغ عشق اگر داست	بیر زباں ملامت گز ز لیف را
نظر فیض چو بر خاک نشیناں نگینم	مور را مغز سیماں رسد از قسمت ما
مشکل کہ سیل دیدہ بگروش در آورد	طوفانی لوح می طلبد آسیائی تو
کعبہ را ویران کن اے عشق کا بنجایک نفس	گہ گئی بس ماندگان عشق منزل می کنند
اے عشق رخصت است کہ از دل آسمان	بردوش خود ہم علم کبریا ئی تو
تا چند دل بہ عشوہ خواہاں گرو کم	ایں دل بسوزم و دل دیگر نہ فرو کم
فیضی کم تنی ورہ عاشقی بہ پیش	دیوان خود مگر بدو عالم گرو کم

ایک قصیدہ فخریہ کہا تھا اس پر بڑا تازہ کرتا تھا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے :

شکر خدا کہ عشق بتاں است بہر دم      در ملت بہر دم و در دین آذر دم  
وریں دیار گروہی شکر لباب ہستند      کہ مادہ بانمک آمیختند و بدستند  
خود گو مزہ در کھائی این ست

”محزون خیال“ کی زمین میں ایک شبنوی ”مرکز ادوار“ لکھی تھی اس کے چند شعر ہیں :

تا بچہ در دیزہ بریں در شدم      تا بدل و دست تو انگر شدم  
کم طلبیدم گہم بیش رفت      پس بہ نشستم قدم پیش رفت  
شبنوی میں خیالی سلیمان و بلقیس کا یوں ذکر ہے۔  
وگرہ رفتم بگذارم متابل  
ازاں روزن بایں روزن درآید  
اگرچہ رفت ازیں دیوان بیداد  
بمن آمد یکے تدبیر کردن  
بہ تخت معنی از سرمایہ بستن  
شگاف خانہ را با روزن دل  
خود آن نوری کہ جاں را رہبر آید  
سلیمان سخن را تخت برداد  
بافسون دیو را زنجیر کردن  
ز گنج خود برو پیرایہ بستن

اسم قادری پر معما کہا ہے۔

ز داغ عشق بگذارم نشانی  
چو در دل یادگار است و یگانہ

جس زمانہ میں وہ سفارت پر دکن گیا ہوا تھا تو اسے کشمیر سے میرے دو خط وصول ہوئے جن سے اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ نے مجھے کورنش سے محروم کر دیا ہے۔ وہاں سے اس نے جب بادشاہ کو عرض لکھا تو میرے لیے سفارشی بھی تحریر کی۔ بادشاہ نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اس خط کو اکبر نامہ میں شامل کر لو۔ اس کی نقل یہ ہے :

”عالم پناہ ! انہی دنوں ملا عبد القادر کے دو عزیز بدایوں سے نہایت پریشانی حال آئے اور بتلایا کہ ملا عبد القادر کچھ عرصہ تک سخت بیمار رہا اور اپنے وعدہ پر دربار میں نہیں پہنچ سکا، اسے بادشاہی آدمی زبردستی پکڑ لے گئے ہیں، معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے مرض کی طوالت کی حضور کو خبر نہیں پہنچ سکی۔“

شکستہ نواز :- ملا عبد القادر قابل شخص ہے اور وہ تمام علوم جو ہندوستان کے عالم پڑھتے رہے ہیں حاصل کر چکا ہے اور میرے والد کا شاگرد ہے۔ تقریباً ۳۷ سال سے میں اسے جانتا ہوں۔ علمی فصاحت کے علاوہ شعر گوئی، عربی فارسی انشا اور کچھ ہندی نجوم اور حساب کتاب سے بھی بخوبی واقف ہے۔ ولایتی اور ہندی موسیقی

اور چھوٹی بڑی شطرنج بھی جانتا ہے۔ ان فضائل سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نہایت بے طمع، قانع، راست پسند اور باادب آدمی ہے۔ بڑا ہی شکستہ دل اور پریشان حال ہے۔ اکثر مقلدانہ رسوم کو ترک کر چکا ہے۔ آزاد منش اور درگاہ والا کا عقیدت مند اور مخلص ہے۔ جس وقت کہ کوئٹہ پر لشکر کشی کی گئی تھی اس نے خود درخواست کر کے جاں نثاری کی خاطر محاذ پر جانا قبول کیا تھا۔ وہاں زخمی بھی ہو گیا تھا اور حضور سے انعام بھی پایا تھا۔ پہلی بار جلال خاں تودہ جی نے دوبارہ میں اس کی تعریف کی تھی اور عرض کیا تھا کہ میں حضور کے لیے ایک امام لے کر آیا ہوں جس کی امامت حضور کو پسند آئے گی۔ میر فتح اللہ نے بھی اس کا کچھ حال حضور سے بیان کیا تھا۔ میرا بھائی بھی اس کے حالات سے واقف ہے لیکن مشہور ہے:

جوئی طالع از خردوار ہنر بہرہ

میں نے اس وقت خود کو حضور کی بارگاہ میں موجود سمجھتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت کی۔ اس وقت جب کہ مجھ پر ضعف کا غلبہ ہے۔ اگر میں اس کے بارے میں عرض نہ کرتا تو یہ بڑی نامناسب بات ہوتی۔ اللہ تعالیٰ بندگانِ دربار کو حضور بادشاہ سلامت کے زیر سایہ راستی حق گذاری اور حقیقت شناسی پر ثابت قدم رکھے اور حضور والا کو دنیا اور اہل دنیا پر سایہ گستر، غریب پرور، عطا پاش، خطا پوش تادیر سلامت رکھے آمین۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس نے تو ایسی محبت اور خلوص کا ثبوت دیا اس کے خلاف یہ مذمت اور عقہہ مروت اور وفا کے خلاف ہے۔ خاص طور سے اس کے مرنے کے بعد اس بڑے انداز میں اس کا ذکر کرنا بڑی زیادتی اور بے مروتی ہے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے لیکن دین کی حفاظت اور حق سارے حقوق سے بالاتر ہے۔ ہماری ساری دوستی اور دشمنی تو صرف اللہ کے لیے ہے چنانچہ اس کے ساتھ چالیس سال تک دوستی رہی لیکن جب اس کے طو طریق اور مزاج بدل گیا تو دوستی دشمنی میں بدل گئی اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ہم تو سارا معاملہ خدا پر چھوڑنے میں، وہی صحیح فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس کے متروکہ میں چار ہزار چھ سو مجلد نفیس تصنیف کردہ کتابیں تھیں جن میں اکثر کتابیں تو خود مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ ساری کتابیں شاہی سرکار میں داخل کر دی گئیں۔ جس وقت یہ کتابیں ملاحظہ میں پیش کی جا رہی تھیں تو ذخیرہ کوئٹہ میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ نظم، طب، نجوم اور موسیقی کو اعلیٰ درجہ دیا گیا اور حکمت، تصوف، ہیئت، ہند کو اوسط درجہ، تفسیر، حدیث، فقہ اور شرعی علوم کو ادنیٰ درجہ میں رکھا گیا۔ ایک سو ایک نسخے تو تل و من کتاب کے تھے۔ دوسروں کا شمار کہاں تک ہوتا۔

لے مراۃ العالم میں لکھا ہے کہ فیضی فیاضی نے ایک سو ایک کتابیں بھی تھیں۔

موت سے پہلے اس نے حضور اکرم کی معراج اور نعت میں چند شعر کہے اور نل دمن میں درج کر دیئے تھے وہ بھی لوگوں کے بڑے اصرار اور کہنے سننے کے بعد اس کتاب کے خاتمہ کے چند شعر یہ ہیں:

شہنشاہ خود پڑو ہا      دریا گرا فلک شکو ہا  
 بزجی ست جہاں بعیش پیوست      دور تو شراب و آسماں مست  
 من مطرب پرو ہائے خوفی      کلکم بنوائے ارغنون فی  
 ایں بزم کہ عشرت تو ساقی است      گرم من بروم ترانہ باقی است  
 سازند سب کو کشاں فسانہ      مطرب نہ و بزم پڑ ترانہ  
 امروز بایں نوائے چو شہد      من بارہ بدم تو خسرو عہد  
 ایں خامہ کہ کردہ ام فلک سائی      پیش تو ستارہ ام بیک پائی  
 ترکیب طلسم خوانیم بین      دیں خدمت جاو دانیم بین  
 ایں نالہ کہ عشق بر زباں برد      طغرائی ترا باسماں برد  
 من یادہ مست کار ہوشم      عیبم نبود اگر بجوشم  
 از قافیات منم درائے      معذورم اگر کنم صدائے  
 ایں دیدہ بہائی دست کارم      کہ دادہ ایزدی شمارم  
 صد بیل مست نغمہ گر خاست      کہ ہند گل عراق برخاست  
 پیراستہ ام معافی بکر      در گنجہ طبع و دہلی فکر  
 زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود      فیضی رقم نگیں من بود  
 اکھوں کہ مشدم بہ عشق مراض      فیا ضمیم از محیط فیا ض  
 در دور تو خسرو یگانہ      چیدم گل بخت از زمانہ  
 بزم ز نسیم طبع گل خیز      جام ز مئے نشاط لب ریز  
 من خندہ شکن چو جام بادہ      ساقی چو صراحی ایستادہ  
 از ہم من و بخت ہر عہ کشش تر      روزم خوشش و روزگار خوش تر  
 بچوں دور تو گشت باغبانم      بالید نہال ضمیر انم  
 ایں چار ہزار گوہر نایاب      کاں گنجتہ ام با تشیں آب  
 پذیر کہ آب گوہر تست      از ہر نشار افسر تست  
 کہ بیشتر کس نشار کردم      بے کسر در و شمار کردم  
 زیں بحر کہ ہر باوج ہوشد      گوہر ہمہ موج موج ہوشد



زین ساں بفتون نکتہ در زنی  
 ہر نکتہ کہ حنا بہ بلاست بستش  
 دارم ز قلم بہ غیب را ہی  
 نسخی است بخون دل طرازش  
 بہر کوشش اگر کنند این ساز  
 پیچیدم ازین دم سبک سیر  
 فکرم کہ بود معانی انگیز  
 این خط کہ دید بنور مایہ  
 پر معنی از دجوا آب در جوشے  
 این در کہ تو اندکش بہا داد  
 دید این بت کار گاہ آذر  
 سی و نہم از جلوس شاہی  
 چوں سال عرب شمار کردم  
 بہ نشست سخن بنگ در زنی  
 آورد دلم ز دور دستش  
 کوہی بہ نہفتہ زیر کاہی  
 لبریز حقیقت از مجازش  
 در ریگ رواں بر قصد آواز  
 زنا بہ برہمتاں نہ دیر  
 بحریت ز آب خود گریز  
 از کلب من ست نیم سایہ  
 ہر نکتہ در و چو تاب در موئے  
 کا قبال دو کون روناداد  
 پیراستگی بہماہ آذر  
 تاریخ بعدو الہی  
 الف و سہ الف نگار کردم

**فارسی** شریف نام ہے خواجہ عبدالعزیز مصور کا بیٹا ہے۔ پنج برونو جوان ہے خوش خلق اور مصوری میں بے مثل مہارت رکھتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کے باپ نے شخص کے ایک دانہ کے ایک طرف تو پوری سورۃ اخلاص جو پڑھی جاسکتی تھی لکھی اور دوسری طرف کوئی مقولہ لکھا۔ اس کے بیٹے شریف کے متعلق کہتے ہیں کہ اس نے شخص کے ایک دانہ میں اکٹھے بارہ سو باغ کر کے تاریخ دیئے اور چاول کے ایک دانہ پر ایک مسلح سوار کی تصویر بنائی جس کے سامنے محافظ اور دوسرے سارے لوازمات تھے۔ شریف بڑے اچھے ذوق کا مالک ہے۔ صاحب دیوان ہے۔ یہ اشعار اس نے خود انتخاب کر کے مجھے دیئے تھے:

مرا بنالہ در آرد شب رواں غمت  
 کرم تراست ولیکن تمام جرم من  
 شمر نہالہ بغربال ادب می یز م  
 زمین عشق بکونین صلح کل کردیم  
 فضائی سینہ ام از دوستی چناں پر شد  
 توفیق در طریقت ما پائے مرد نیست  
 غمے دارم کہ شادی با فدائیش  
 چو دل بہ آتشم پروانگی کرد  
 کہ از اشعہ آں نور طے راہ کنند  
 مرا چو عفو نمائی ہمہ گناہ کنند  
 کہ بگوش تو مبادا رسد آواز درشت  
 تو خصم گرد نہ ما دوستی تماشاکن  
 کہ با کمال طلب ذرہ نیفزاید  
 ما دوست را بحالت دیگر شناختیم  
 نہ چشم بدنگہ دار و خدا شش  
 تو کل ہم باد بیگانگی کرد

دل اگر نہ دھندلایا بشاش برساں      ہجراں کہ بخونِ دل آسمیختہ بود  
ز طبعِ خود چہ سہرایم ز عقلِ دم چہ زخم      بعلتی کہ کراہم و لیسل بطلانم  
ای خرد دست تھی تا چند در بانا عشق      قیمت ہر جنس پر سی نجلت از کالابری

رباعی

عشقی دارم کہ دین و ایمانِ من است      دردی دارم کہ میر سامانِ من است  
گر عشق جسد شود ز من می میرد      گوید کہ شریف فارسی جانِ من است  
بصد حسن ز دل داشتن چنان عجب است  
کہ چون ہلال نمایندش اندکی دیدار  
جنس کسا و شکر را زرخ ازاں بندشد      کہ طرف دیار غم قافلہ نمی رسد  
ایں دل کہ رہوہ میسندانہ  
گنجی بہراند گہاں نماید  
صبا بہ عشق ہمتی کہ ما رہ فقیم      دگر بکوی تو از آب دیدہ گل نشود  
ز رشک عشق خموشم نہ از تکبر عشق  
کہ جز حدیث تو ام بر زباں نمی آید

**قراری گیلانی** | یہ مولانا عبدالنفاق کا بیٹا اور حکیم ابوالفتح اور حکیم ہمام کا حقیقی بھائی ہے۔ صاحب علم، خوشنویس اور شعر گوئی سے واقف تھا۔ نہایت درویش صفت اور منکسر مزاج آدمی تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ جب دربار میں اپنے بھائیوں کے ساتھ تسلیات کے لیے حاضر ہوا تو چونکہ اس کو تلوار باندھنی نہ آتی تھی اس لیے نہایت بے ڈھنگے پن سے سب کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ اسے دربار کے بعض ظریف چہرے سے دیکھنے لگے تو اس نے کہا ہم لوگ فوج سپاہ گری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس نے امیر تیمور کا قصہ بھی بیان کیا کہ امیر نے ایک جنگ میں ایک لشکر کے ٹھیرنے کے لیے کسی مقام کا تعین کیا کہ باربر دارا و نٹ پیدل سپاہی تمام سواریاں مال اسباب کے ساتھ فوجوں کی صفوں کی پناہ میں اور خواتین لشکر کے پیچھے ٹھہریں۔ اس دوران میں عمامہ پوش (علماء وغیرہ) گہوہ نے پوچھا کہ ہم کہاں ٹھہریں تو تیمور نے کہا بیگمات کے عقب میں۔ اس کی یہ بات لوگوں نے بادشاہ تک پہنچادی۔ اس لیے بادشاہ نے اسے بنگالہ جانے کا حکم دے دیا اور وہ وہاں مظفر خاں کے ہنگاموں میں مارا گیا۔ یہ اشعار اس کے نتیجہ فکر کا ثبوت ہیں:

چہ باک گر ہمہ عالم شوند یلی دوست  
کہ میل خاطر یلی بسوئے مجنوں است  
از پی رنج من فلک طبع خلیل می دہد      نقد آتش از کف بجفت سیہ گلیم را

چہ تہمت بر اجل بندم ز چشمت خورده ام تیر  
 روشن شدم ز آتش عشقت بساں شمع  
 کہ آنم می کشد کہ بعد صد سال دگر میرم  
 ہم بد مزار خویش غریبانہ سو ختم  
 موجزن شد بجز آتش از دل سوزان ما  
 نوح گو بگریز کآتش بار شد طوفان ما  
 دردم این است کہ ہر چند بین جور کنی  
 لذت جور تو نایافتہ از دل برود

ز آزارش دل افکار را افکار می خواہم  
 بلطف او مقید نیستم آزارہ می خواہم  
 ز دردم بجز بے خود بودہ ام ای وقت مدتها  
 دے ہم بخودی از لذت دیدار می خواہم  
 مبادا دل شود از دیدن دیدار مستغنی

کہ ما بسیار بے جرمیم و او بسیار مستغنی  
 اندامت را ہجران شاوم کہ میتوان کرد  
 بیگانہ دار بادی آغازہ آشنائی  
 در دیگ غضب اگر بسجوشانندم  
 در شعلہ دوزخ اند گذرانندم  
 بہتر کہ ز رونے لطف بخشد گناہ  
 مد آتش انفصال سوزانندم

رباعی: گر عشق دل مرا خریدار افتد  
 کار بکنم کہ پرودہ از کار افتد  
 سجادہ پرہیز چنان افشانم  
 کہ ہر تارہش ہزارہ ز نار افتد  
 کہ حسرت وصال تواند دل بدہ کنم  
 بہ کہ وصال حسرت دل بیشتر کنم

قومی | یہ خاں کلاں کی خدمت میں رہتا تھا۔ خلال کنگھا اداس جیسی چیزیں بنانے میں بڑا ماہر تھا۔ ایک خلال کے اوپر  
 اس نے اپنا یہ شعر بڑی خوشخطی کے ساتھ لکھا تھا۔

کار قومی مدہم اندرہ نجیر زلف یا دوست  
 ہم چو زلف بارہ دائم مدگرہ درکار دوست

قیدی شیرازی | مکہ معظمہ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہوا اور بہت جلد مقر میں شاہی میں شمار کیا جانے لگا۔  
 ایک دن محفل میں یہ کہہ دیا کہ حضور نے یہ جو داغ و محلی کا قانون نافذ کیا ہے اس سے لوگ بہت  
 تنگ آ گئے ہیں۔ بس اس دن سے راندہ درگاہ ہو گیا اور پھر اسے وہ تقرب حاصل نہ ہوا۔ کچھ عرصہ تک بیانہ کے  
 جنگل میں قلندرانہ وضع میں پھرتا رہا اور فتح پور آیا تو بجا سیرودن میں مبتلا ہو گیا۔ ایک انارٹی طبیب نے اس کی مقعد  
 کی رگ کاٹ دی۔ بس اس کا رشتہ نہایت منقطع ہو گیا۔ نہایت خوش طبع شاعر تھا۔

متاع شکوہ بسیار است عاشق را ہماں بہتر کہ جز مدد روز بازار قیامت باز نکشاید  
 بے قدم ننہادہ ہرگز از دل تنگم برول حیرتے دارم کہ چوں در ہر لے جا کردہ  
 گوہ میرم من و غیرے بودا عشق نرسد سارباں گرم حدی باشی کہ محمل برود  
 کدام مرہم لطف از تو بر دل است مرا  
 کہ جاں گداز ترا ز داغملے حسرت نیست

موزوں طبع شاعر تھا۔

**قدری**

چنداں اماں نی دہم بے خودی کہ جاں  
 داند کہ چوں بر آید و قربان او شود

**قدری** بیرم خاں کے عہد میں ماوراء النہر سے آگرہ آیا اور حصول علم میں مشغول تھا۔ اس کی صرف یہی ایک غزل  
 نظر سے گذری ہے:

صومعہ طاعتم گوشہ میخانہ شد صیغہ درویشیم نعرہ مستانہ شد  
 خرقہ زہد و صلاح در گردبادہ رفت غلغل تبسبح و ذکر قلقل پیما نہ شد  
 قدی بے خانماں سوئے حرم می ثنافت زو صمنے راہ او جانب بتخانہ شد

**کامی** میر علاؤ الدولہ مصنف تذکرہ شعراء کا تخلص ہے جو اس انتخاب کا ماخذ ہے۔ اس کے حالات اور اشعار کا  
 ذکر تحصیل حاصل ہے۔ مجھے شعر شناسی اور شعروں کے انتخاب کا اتنا سلیقہ نہیں ہے، اپنے عیوب سے  
 خوب واقف ہوں اس لیے کسی اور کی برائی کیا کروں؟

**کلاہی** علوم و فنون سے بہرہ ور تھا۔ اس کا لقب افضل خاں تھا۔ دکن سے ہندوستان آیا۔ شرعی حاکموں میں شامل  
 کر لیا گیا۔ جب ملا عبداللہ لاہوری کے فتویٰ پر میرزا امین اور حبش کو رخصت کے الزام میں سزا دی گئی تھی  
 تو وہ ڈر کر دکن چلا گیا اور وہیں انتقال کیا۔

ز عشق جز بدل خویش تنگم راز کہ دل سخن شنود از من و نگوید باز  
 صرب پائے او نہادم سرگراں از من گذشت چوں گرفتہ دامنش دامن کشاں از من گذشت  
 تا کئی رقیب ازاں در راہ سفر نہ بند بند و کمر بہ کینم یارب کمر نہ بند  
 ہر گز آید بجدل تو عدد خود بفرق بر سر خود چو شمشیر نہ فی وقت جدل  
 می کشد صفحہ میدان جدل را جدول میکشد صفحہ میدان جدل را جدول

**کلاہی** چغتائی نسل سے تھا۔ ملا نیازی سے ہمیشہ مباحثہ اور مجادلہ ہوتا رہتا تھا۔ بکوسے آیا تو کچھ عرصہ آگرہ میں مقیم  
 رہا۔ اس کے اشعار ماوراء النہر کے رنگ میں ہیں۔

بستم بہ خیال سر زلفت رہ گر یہ لیکن نتوان آب بزنجیر نگہداشت

رخ تو چشمہ مہر است و قطرہ ہائے عرق      حجاب دار بر دہر طرف نمایاں است  
 نہ غنچہ دل پر خون من نظارہ کنید      کہ چاک چاک شد از تیغ یار و خنداں است  
 نشین بچشم کلامی ز روئے لطف دے  
 کہ گوشہ ایست مصفا آب در نظر است

**کامی قمری** | نوسیدہ جوان ہے۔ حال ہی میں ہندوستان آیا ہے۔ اس کا کلام شوخی و لطافت سے خالی نہیں

ہم تن خون شوم نہ دیدہ چکم  
 گم بدنام کہ گریہ را اثر است

**نقائی استرآبادی** | عالم و فاضل ہے۔ کچھ عرصہ تک خان زمان کے ساتھ رہا تھا۔ اس کا شعر ہے:

بر زبانی حرف تیغ و لسان من گذشت  
 خیر باشد طور حرفی بر زبان من گذشت

سبزوار کا پیر زادہ تھا، عرصہ تک دربار میں رہا۔ با ذوق اور پر لطف شاعر تھا۔

**لوامی** | از پئے نظارہ چوں اغیار آید صوئے تو      در میاں حائل شوم شاید نہ بیند روئے تو  
 در پیش غیر ازاں نکم گفتگوئے تو      تا عجبے درویش نکند آرزوئے تو  
 اہل ہوس ز شوق چو نام بتاں برند      تڑسم کہ نام او بہ غلط در میاں برند  
 ۱۹۹۵ء میں لاہور میں آنڈھی سے ایک دیوار اس پر گر پڑی اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ اچھا موسیقار اور معنی تھا  
 اس لیے اس کی تاریخ وفات نکالی گئی۔

فغاں کہ قسمت چرخ جفا کیش      خوش الحان بلبلے از بوستان رفت  
 چنانش چرخ سنگی بہ کمر زد      کز اں مجروح گشت داز میاں رفت

نہ پیر عقل جستم سال فوتش  
 بگفتا پیر زادہ از جہاں رفت

**علی** | میرزا اعل بیگ ولد شاہ قلی سلطان بخشی کا تخلص ہے۔ یہ بڑا شریف نوجوان ہے۔ حسن صورت اور  
 حسن سیرت، ادب، تواضع، اخلاق، حیا اور نرمی میں بہت مشہور ہے۔ شاہی مقربوں میں شامل ہے۔ حال  
 ہی میں بادشاہ کافرمان دکن گیا ہے کہ وہ سلطان مراد کے ہاں سے لاہور آجائے۔ علم تاریخ اور سیرت پر اس کی بڑی  
 اچھی نظر ہے۔ میری اس کے ساتھ بڑی دوستی اور تعلقات ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔ اس کا ایک شعر یاد  
 رہ گیا ہے:

بر بگذارد تو چوں خاک رہ سچدم تہ سم  
 کہ نگذرے بمن و بگذرے براہ دیگر



لطیفی منجم | بادشاہ کا مصاحب تھا مگر بڑا نیک آدمی تھا۔ اسے اساتذہ کے شعر بہت یاد تھے۔ کسی بھی موضوع پر وہ رات بھر میں ایک ہزار شعر سناسکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہا اور ان کی مدد سے نادر شاہ حاصل کردہ کے سفر پر چلا گیا۔

گلگل از تاب شراب آں روئے چوں گلزار شد  
گلغروشاں مژدہ تاں بادا کہ گل بسیار شد  
دلہ گہ شعلہ آتش شود اسرودگی دارد  
گل بختم گہ از جنت دور پٹہ مردگی دارد

ہر آہ کہ در حسرت بالائے تو کردم  
نخل چمن آرائی پشیمانی من شد

میر تقی شریف شیرازی | یہ میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں۔ ریاضی، حکمت، منطق، کلام اور دیگر علوم میں تمام علمائے زمانہ سے لائق و فائق تھے۔ شیرازہ سے مکہ معظمہ جا کر ابن حجر سے علم حدیث کا درس لیا تھا اور تدریس کی اجازت حاصل کی تھی۔ وہاں سے دکن اور دکن سے آگرہ آئے اور قدیم و جدید بیشتر علماء سے آگے بڑھ گئے۔ پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے تھے۔ ۹۴۷ھ میں انتقال کیا۔ انھیں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا۔ میر حسن رضوی نے یہ تاریخ پائی۔

رفت تا میر تقی از دہر علم گویا ز نسل آمد رفت  
بہر تاریخ رفتش محسن گفت علامہ ز عالم رفت

یہ شعر ان کی یادگار ہے:

خاطر جمع ز اسباب میتر نہ شد

تخم جمیعت دل تفرقہ اسباب است

یہ شعر غالباً مدون ہے کی اس عبارت سے ماخوذ ہے: ایک گروہ نے خیال کیا کہ اطمینان اسباب کے جمع کرنے میں ہے اور یہ لوگ ابدی تفرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ کا یہ یقین تھا کہ اسباب کو جمع کرنا تفرقہ کا باعث ہے اور انھوں نے ساری چیزوں سے ہاتھ اٹھالیا۔

محوی | یہ میر محمود منشی کا تخلص ہے جو تقریباً ۲۵ سال ممالک محروسہ ہندوستان کا منشی رہا۔ نقیب خاں اس کا داماد ہے۔ موزوں طبع تھا۔ منشیانہ اشعار کہتا تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے جو بیرم خاں کے دیوان میں لکھی ہوئی ہے۔

از کون و مکان نخست آثار نبود  
کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود

آمد چو ہمیں دو حرف مفتاح وجود  
شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

اسم قاسم کا معما کہا ہے:

شوخی کہ بود خاک درش منزل من جز جو روحانیست از و حاصل من  
از گوشہ ایام چوں رخسارِ بستم چشمش فگند تیر جفا بر دل من

از مشک ناب غالبہ بر سیمیں مکش

بر گرد آفتاب خطِ عنبریں مکش

منشی نے یہ رباعی بہایوں بادشاہ کے عطا کردہ گھوڑے کی تعریف میں کہی تھی :

اے خسروِ جم سپاہ عالی مقدار دارم اسپہی کہ ہست بس لاغر و ناز

بروے چو شوم سوار در ہر دوسہ گام افتد کہ تو ہم یک دوسہ گامے بردار

اس رباعی کا ماخذ ایک مشہور شعر ہے :

میرد و یک دو گام و میگوید کہ تو ہم ساجتے مرا بردار

اس کے استاد کا شعر ہے :

اے بت سنگیں دل سیمیں بدن

وے لب تو راحت و غمزہ بلا

اسی زمین میں اس کی غزل ہے :

اے رخ زیبائی تو رشک سمن قامت رعنائی تو سروچمن

پستہ بخنداں تو تنگ شکر دستہ و نداں تو دُرِ عدن

کاکل مشکیں تو دارم بلا نرگس فنان تو عینِ فتن

آہوئے چشمان تو مردم شکار غمزہ خوں ریز تو نازک فگن

کار و زلفت ہمہ جادوگری شیوہ چشمت ہمہ خوں رینختن

میکشد از مشک خط جاں فزائی سبزہ نوخیز تو بر یا سمن

جانب محوی نگر از روئے لطف

اے بت سنگیں دل سیمیں بدن

شیخ فیضی نے بھی اپنے لڑکپن اور ایام جاہلیت میں اسی صنف پر ایک غزل چار بحر میں کہی تھی۔

اے قد نیکوئی تو سرو رواں دے خم ابروئے تو شکل کماں

حلقہ گیسوئے تو دام جنوں طرہ ہندوئے تو کام جنان

ہم لب جادوئے تو آبِ حیات ہم خط و لچوئی تو خضرِ زباں

آمدہ آہوئے تو عینِ بلا کشتہ آہوئے تو شیرِ ثیاں

بستہ گیسوئے تو فیضی زار خستہ ہندوئے تو خلقِ جہاں

اس انتخاب کی تصنیف کے دنوں میں فیضی نے ایک دن میرے ہاتھ میں میر علاؤ الدولہ کا تذکرہ دیکھ کر لے لیا اور اس ورق کو جس میں اس کا ذکر تھا، پھاڑ ڈالا۔

میں نے بھی کہ ان دنوں ان خام خیالیوں سے تائب نہیں تھا چار سجروں میں ایک مطلع کہا تھا۔ اب یہ شہوتِ قابلِ ذکر نہیں، خدا معاف فرمائے۔

کبھی کبھی شعر کہتا ہے۔ میر محمود منشی کے انداز کا آدمی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی۔

**میر محسن رضوی مشہدی**

نخواہم مہرباں باخویشتن درپیش اغیارش  
کہ می ترسم کہ غیرے بیند و گم و دگر قنارش

دل برو ز من سر و قدی غنچہ ہانی رسوائی جہاں ساخت مراتزہ جوانی

اے نہال قامتت خرم نہ آب زندگی

سمرور اور پیش بالایت بے شرمندگی

اس شعر میں بجائے خرم کے شاداب زیادہ اچھا ہوتا۔

یہ اسم روح پر معما کہا ہے:

اے زلفِ کجبت رہزن جانہ از ختاب

ولے درد تو مرہم نہ دلہائے خراب

عکسے زلب تو گشتہ در آب حیاں

یا برگ گل قتادہ در جام شراب

حسین شاہ کے نام کا بھی معما کہا ہے:

آں مہ کہ بدیدہ جلے گاہش نیکوست

منظور نظر رخے چو ماہش نیکوست

محسن سر خود نہادہ یر پائیش

چوں ہر صفت عارض ماہش نیکوست

یہ قاسم خاں بدغشی کا تخلص ہے جو بہالیوں کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اصنافِ شعر کو بخوبی

موجی | جانتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ یوسف زلیخا کی طرز میں ایک مثنوی بھی کہی جس میں چھ ہزار اشعار ہیں۔

اس مثنوی میں محبوب کی تعریف یوں کرتا ہے:

مرصع موئے بندی بے بہائیش زبے قدری قتادہ در قفائیش

نکرد از لعل ناب آویزہ گوش کہ بود آویختہ دلہائے مدہوش

نکرد اندکمالی لطف دوراں ز لولوئے ترش زیب گریباں

کہ ہر زینت جیب نکویش  
چو زرخود را بپائش دیدہ پا مال  
بیاض گہ و نش چوں شمع کا نور  
ز بازو سیم را ساعد شکستہ  
اڑاں گلستہ ہائے ناز نینش  
کفش برگ گلی آوردہ در مشت  
برودوشش کہ بردہ عقل را ہوش  
چو آمد در بیاض حسن تقریر  
در پستانش کہ در خوبی ست یکتا  
میانہ برتر از حد بیان ست  
ایک مثنوی یلی مجنوں بھی لکھی ہے۔ کہتے ہیں یہ شعر اسی مثنوی کا ہے :

پیری ز قبیلہ معرزد  
ریشش چو گل سفید یک گز

اس رباعی کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ خواب میں اس نے کہی ہے۔

اے باد خبر ز کوئے جاناں برساں  
دشوار بود مراد سیدن آبخاں  
با ایں تن مردہ مژدہ جاں برساں  
لطفی کن و خویش را تو آساں برساں

خمار بادہ خم چند دارد سرگراں مارا  
بیاساقی داز غمہائے عالم وارہاں مارا

ساقیا تا کی ز دوراں شرح بد حالی کنیم  
آخر عمر میں سپہ گری کا پیشہ ترک کر کے گوشہ عزلت اختیار کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شاعری سے بھی  
استعفا دے دیتا۔ اس کی وفات آگرہ میں ۹۷۹ھ میں ہوئی۔

میرزا وہ علی خاں | محترم بیگ کا لڑکا ہے جو ہمایوں کا مشہور امیر تھا۔ میرزا وہ نہایت با اخلاق اور موزوں  
طبع آدمی تھا۔ کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔

شام چو از چہرہ فگندی نقاب  
تاب نیاورد و نشست آفتاب

۹۹۶ھ میں کشمیر میں جب کہ یعقوب ولد یوسف خاں کشمیری نے محمد قاسم خاں میرز بحر پرشب خون مارا تھا تو  
یہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

معزی ہروی | طباطبائی سیدوں میں سے ہے۔ بچپن میں کامران مرزا کا ہم سبق تھا۔ ہندوستان میں پچاس سال تک رہا۔ ۱۹۸۲ء میں اسی جگہ فوت ہوا۔ یہ دو شعر اسی کے ہیں۔

چند داری لے فلک چوں ذرہ سرگرداں مرا      تاکے داری بغربت بے ہر داماں مرا

گفتم باہ درودوں خود بدوں کنم

در دم باہ کم نشود آہ چوں کنم

مرادی استر آبادی | استر آباد کے سیدوں میں سے تھا۔ ۱۹۷۹ء میں فوت ہوا۔ اس کے اشعار مشہور ہیں۔ نمونہ کلام:

یہ نمود رخ ز پردہ کہ صبح صفاست این      یعنی کمال قدرت صنع خداست این  
طالع نہ شد شبے ز رخت کوکب مراد      بے طالعی و تیرگی بخت ماست این  
ز ہمار خوش ولی و فراغت طبع مدار      در خاکدان و ہر کہ محنت ماست این  
بگذشت دلی بخاک مرادی و گفت یار      در راہ عشق کشتہ سنگ جفاست این  
اے سیل غم ز دیدہ غبار ہمیش مشوی      مارا چو یادگار ازاں خاک پاست این

کفر زلفش کہ بود مایہ ایم نام ازو

نام سلیمان اگر روئے بگردانم ازو

گر سنگ کوئے تو در مرتبہ از من پیش است

لیک در راہ و فایح نمی مانم ازو

خواباں کہ زلف زینت رخسار ساختند      خلقے بدام خویش گرفتار ساختند

کیم من دور ازاں گل چہرہ ہمچوں غنچہ سول تنگی

گرفتار جنوں دیوانہ و با سایہ ہم جنگی

بروئے یار قضا یا خط غیب نوشت      نیاز مندی مارا براں کت نوشت

مشفقی بخاری | مرثیہ کار بننے والا ہے۔ بعض تو اسے قصیدہ میں اپنے زمانہ کا سلمان سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ وہ مادی عالمی رنگ میں شعر کہہ لیتا تھا۔ اس کا کلام ہر داور بے سوز تھا۔ دو مرتبہ ہندوستان آکر واپس چلا گیا۔

چوں نقد ہستی مجنوں غم فگاری بود

خدا بہ نقد بیا مرزدش کہ یاری بود

در ماضی ملامت بسیار بودہ است      آسان خیال کردم و دشوار بودہ است

تا جہی ہر شب چراغ از گل بیاغ افروختہ است      کشتہ برک لالہ آتش برک و داغش سوختہ است



اس کی ہجو نہایت رکیک زبان میں ہے۔ اس کی ہجو طبع اس قطعہ سے نمایاں ہے جو اس نے آخری بار ہندوستان  
انے پر کہی تھی:

کشور ہند شکر ستانی است  
طوطیانہ شکر فروشش ہمہ  
ہندوان سیاہ چو لکساں  
چہرہ بند ہنکوچہ پوشش ہمہ

نام میرزا قلی تھا۔ صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ اس کی شعر گوئی کا لکھ اس درجہ پہنچا کہ اگر وہ  
اس زمانہ تک زندہ ہوتا تو اس زمانہ کے اکثر خام کار شعر گوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ متاخرین  
میں سے کوئی اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ برسوں نورنگ خاں کی خدمت میں رہا اور اس کی مدح میں بڑے عمدہ قصیدے  
کے۔ کہتے ہیں نورنگ خاں نے بدگمانی کی وجہ سے اسے زہر دے کر مروا ڈالا۔ اس کی وفات مالوہ میں ہوئی۔

دانستہ کہ مہر تو باجہاں نمی رود  
کز خاک کشتگاں گزری ہر گراں ہنوز  
نہ آشنا و نہ بیگانہ غمی دائم کہ اختلاط چہیں را کسے چہ نام کند  
بے قرار است دل اندر بدن کشتہ عشق  
دیگر اندازہ نہ اتم چہ تمنا دارد  
امتحان نام ہند دل ستمی کز تو کشد  
خویش را چند باں حیلہ شکیباء دارد

جاں بہ عزم خلعت و من شاد زین معنی کہ دل در و چندین سالہ را امید و ماں یافتہ  
در فراق زان نیک میرم کہ ناید در دولت  
کیں ستم نایدہ ہلذی چند باجہم نہ ساخت

با آنکہ بہ پرسیدن ما آمد مردیم کایا ز کہ پرسید رہ خانہ مارا  
میرم و بہ زندگالم رحم می آید کہ تو  
خوایاں بیدا و دلاہی کہ با ما کردہ

بعض لوگ اس شعر میں رحم کے بجائے رشک پڑھتے ہیں۔ ناقدان سخن ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

منم از رحم دل آن نیم ہاں صیدی کہ بہ جانش  
ترحم می کند صیاد و سہل می کند زودش

یار خواہد کہ برگم شود آسودہ و من شرمساری برم از محنت جاں کند و خویش

افکنده ام ترا بزبان و خوش دلم  
 کز شرم آن نگاه بزدم نمی کنی  
 بخت بدین که به میلی نکند غیر جفا خود سالی که جفا را از وفایه شناسد  
 منم و دل خرابی بتو می سپارم او را  
 بچه کار نخواهد آمد که نگاه دارم او را  
 دم آخر است دشمن به سنش گذار یک دم  
 که بعد هزار حسرت بتو می گذارم او را  
 نه خواهم با چنین خواری زبده مش زود بو بخیرم که پندارم اگر مانم و می خوشنود به خیرم  
 پس از عمری چو به نشینم بعد تقویب بدیز مش سخن از مدعائے من کند تا زود بو بخیرم  
 میا بپر کشش من چوں امید صحت نیست  
 بحال مرگ مرا دیدن از محبت نیست  
 بغایتی ہو س گفتگو ست با تو مرا  
 که تاب خامشیم با وجود حیرت نیست  
 می نمایم خویش را وارسته از سودائی او تا فریب عشق من کم سازد استغنائی او  
 صد بار رنج گشته ام و صلح کرده ام  
 کال من خبر نداشته از صلح و جنگ من  
 چه شد که می گذری و حشیانه از میسی مگر به تازه کسے عاشکار خود کردی  
 ببالیں تو آن عیسی نفس می آید بے میلی  
 که از شوق قد و مش مرده صد ساله بر خیزد  
 وفائے حمد گماں از تو بے وفا داریم کمال ساده دلیهاست این که ما داریم  
 کسے اگر سبب وصل یا ر من شده است  
 زمر گرانی او شرمسار من شده است  
 به طنز مرده وصلی که داده غیر مرا  
 ز سادگی سبب انتظار من شده است  
 تا بماند به میاں حرف نهان من و تو غیر در بزم نشیند به میاں من و تو  
 تو نیائی ز حیا در سخن و من ز حجاب تا چه سازند رقیباں ز زبان من و تو  
 غافل به من رسید و وفار ا بهانه ساخت افکنده سر به پیش و حیا را بهانه ساخت

اسی رنگ میں میں نے بھی شعر کہا ہے :

ملک قہمی | اسے ملک الکلام بھی کہتے ہیں۔ درویشانہ وضع قطع تھی۔ دکن میں رہتا تھا۔ نہایت درو منہ آدمی تھا ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ دکنیوں نے ایک فساد میں اسے ملک عدم پہنچا دیا۔

آب شمشیر شہادت شست گرد اختلاف  
گبر و ترسا و مسلمان کشتہ یک خنجر اند  
سازند لخت لخت دروں نسر و گال وانگاہ بر جراحات دلمانک زند  
تو مرہم دل ریشی بچندہ نمکیں  
ولے باں مژدہ تلخ نشتر جگری  
بقدر حوصلہ عشق نیست بادہ عشق  
تو شیر بیشہ مانستی کہ با حنبری  
سحاب چشم کہ دادہ است زنگست را کہ از نگاہ تو بڑے ستم نمی آید  
خوں چکاں ست ملک تیغ ستم می ترسم  
کہ پئے ابو بدر خسانہ قاتل برود  
خزانہ خیال من اند ذخیرہ وصل چناں پرست کہ چشم مبہم نمی آید  
سپاہ عافیت چوں بر ملک گستاخ می آید سمند فتنہ زیں کن خویش را بر قلب شکران  
چند پاس وعدہ ہر بے وفادار و کسے  
چشم بر در گوش بر آواز پا وارد کسے  
درد را این عافیت خصماں بمنت می دهند  
ولے گرد ایشان تمنائی و فادار و کسے  
کد میں باد این نشاط کی کرد کہ سنبل بر گل رویت پراگند  
ازل را بامہ روئے تو پیمیاں ابد را با سر زلف تو پیوند  
شکر را گرم روئے با تبسم ملک را آشنائی با شکر خند  
بود ناقوس سخن سبجہ سنجان  
دراں کشور کہ بت باشد خداوند

شیخ فیضی دکن سے اس کی کلیات لے آیا تھا۔ اس کے سارے اشعار شعرائی عہد کے رنگ میں تھے اسی

قدیم طرز سے اس نے نکلنے کی کوشش کی نہ کوئی نیا مضمون پیدا کیا۔ اس کی زبان دانی جیسی کچھ بھی تھی وہ اس کے دیوان کے مطلع سے ظاہر ہے۔

اے حمد تو مسلم مقالات دے ذکر تو منبر مقامات  
بڑا بھلا جو کچھ بھی کہہ لیتا تھا کہہ لیتا تھا۔ مجھے اس کا سب سے اچھا شعر یہ معلوم ہوا:  
رفتہ کہ خارا نہ پاکشم محل ہنساں شد از نظر  
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ را ہم دور شد  
شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ میرزا عزیز کو کہ کے ہاں ملازم تھا۔  
مدامی بدخشی | اس کا شعر ہے:

ولا صد فتنہ بر پا زان قدو بالاست می گوئی  
ازاں بالا بلا بسیار دیدم راست می گوئی  
اس زمین میں بہتوں نے طبع آزمائی کی اور ایک دوسرے کے مضمون کو پا مال کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ  
زمین بالکل ہی بے جان ہو گئی۔ انہیں میں سے یہ شعر بھی ہیں:

بلا و فتنہ در عالم نہ قدم خاست می گوئی  
بلی می آید از بالا بلا راست می گوئی  
بہ شہر از قائم ہر سو قیامت خاست می گوئی  
قیامت قائمی داری نہ من راست می گوئی  
اس طرح یہ اشعار آخری زمانہ کے فتنوں میں سے ایک فتنہ ہیں۔  
شعلہ شمع ست گاہی نگ در فانوس آل  
یا مگر برگ خزاں مدلالہ جا کرد از شمال  
چوں گشت تمام شرح و مدیش از قطرہ اشک مہر کردش  
اپنے زمانہ کا نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ملا مقصود قزوینی

در عالم و فاسک کوئے تو رام ماست  
اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست  
عشاق را مت تمام نظر بر جمال تست  
اے شاہ حسن روئے تو ماہ تمام ماست  
نہال آرزوئے افشاندم در زین دل و ذراں شاخ گلیم جز بار غم چیزے نہ شد حاصل  
بود امید کا دم حلقہ زلف او بکف دہ کہ مدیں خیال کج عمر عزیز شد تلف

اس نے یہ قصیدہ نقیب خاں کے داماد قاضی یحییٰ قزوی کے نام پر کہا ہے اور خواجہ سلمان مدیل کے رنگ میں :-

دگر نہ سروئی وی رفت آسماں در تاب  
فلک بردے زمین ساخت جوشنی از آب  
نہنگ بحر ز بیم سہام مر مروی  
دگر ز کثرت برف وز شدت سرما  
سفید گشت سوار زمین ز لشکر برف  
کہ جا بردے زمین تنگ شد باماں گونہ  
بہ محن باغ بجائے شگوفہ و سبزہ  
فتاد لرزہ در اشجار در چین و دیگر  
دریں ہوا بدن من چو بید لرزاں است  
سحر ز ہاتف غیبم رسید مرثوہ بگوش  
از جور حادثہ خود را بباں جناب رساں  
امین شرح کہ یک شمع وصف اخلاقش  
علی خصال و محمد شعار و یحییٰ نام

ز تاب صاعقہ خورشید ماند زیر نقاب  
نہاد بر سر خود خود آہنیں ز حجاب  
زمین بلرزہ در آمد چو قلم سیماب  
سیاہی از دل آفاق شد چیاں نایاب  
کہ بہ زمین نتواند نہاد پاسے غراب  
دگر ز برف و تیغ افتاد قائم سنجاب  
چو من شدند ز بے برگی این چنین بے تاب  
تم ز صنعت گئی ورتب است گہ در تاب  
کہ تا بکے کشی از جور روزگار عذاب  
کہ ہست ہمچو سپر بریں بلند جناب  
نہ شد تمام بہ صد دفتر و ہزار کتاب  
چو روشن است کماش چہ حاجت القاب

لامقصود نے ۱۷۹۷ء آگرہ میں وفات پائی۔ اس کا باپ ملا فضل اللہ بھی بڑا نیک اور معزز شخص تھا۔ یہ قطعہ اس کا ہے :

فضلی چو غنچہ خلعت ہستی بخود پیچ  
چوں گل شکفتہ باش و چہ سرو از غم جہاں  
کچھ پڑھا لکھا تھا۔ دہلی کے مدرسہ میں رہتا تھا، بعد میں حسب الحکم اسے سرہند کی قضاۃ پر مامور کیا گیا۔ دربار سے محنتی کا تخلص مرحمت ہوا تھا۔ سرہند میں وفات پائی۔

**محنتی ہزاری**

یا فتم در گذر سے جائے کف پایش را  
بچوں نماں رخ خود یا فتم ام جایش را

بکھرموئے میانت دل کساں گم شد

دل شکستہ ماہم دماں میاں گم شد

اس کی نسبت اس کے تخلص سے ظاہر ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

**موسوی مشہدی**

تراپنہاں نظر سوئے من زار است میداںم  
تغافل کردنت از بیم اغیار است میداںم



چشم او میکشم زار بخت مودہ او  
می نماید زنگاہ غضب آلودہ او  
یہ اکبر کاموں اور حضرت شیخ جام کی اولاد میں سے تھا۔ خطی اور پاگل سا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کو  
بے وجہ قتل کر دیا اور قصاص میں ۹۷ھ میں قتل کیا گیا، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ لوگوں  
نے تاریخ کہی ہے:

خواجہ اعظم معظم تام کہ از دہر زبور  
زن خود را بکشت و کشت اور از غضب شہ جلال الدین اکبر

بے رخ آں بت جہاں انروز  
گشت آخر شہادت تم اکبر  
صاف ظاہر ہے کہ یہ تاریخ میر علاؤ الدولہ مصنف تذکرہ شعراء کی ہے۔  
خواجہ معظم کا مطلع یہ ہے:

درد دل رانتواں پیش تو اے جاں گفتن  
مختی دارم ازیں درد کہ نتوان گفتن  
میر علاؤ الدولہ نے اسی رنگ میں مطلع کہا ہے جو اس کے سامنے حضور مطلق ہے۔

تا فیدم کہ تو اں عل ترا جاں گفتن  
آتش دردلم افتاد کہ نتوان گفتن

شیخ پیراگرہ کا لڑکا ہے۔ سات طریقوں پر خوش نویسی کرتا تھا۔ میں نے اسے سلیم شاہ کے عہد میں پشاور  
موزوں میں دیکھا تھا اس کا لڑکا بھی نو جوان قابل تھا۔ معما اور خوش خطی میں ماہر تھا۔ چھوٹی بڑی شطرنج خوب  
کھیتا تھا۔ یہ چند شعرا اس کی یادگار ہیں۔

مراچہ سود ز گلہائے رنگ رنگ بہار چون نیست بے تو دلم را بہر سچ رنگ قرار  
گماہ دد من درد مند محزونند ہر شک سرخ و رخ درد و دیدہ بیدار  
اے یافتہ ز عارض تو ماہنتاب تاب دے سوختہ ز رشک جالی تو آفتاب

ہر ناوک تو اے مر ابرو کمان ما  
بچوں مغز جا گرفتہ بہر استخوان ما  
تیرے کہ بردل آں مر ابرو کمان زوہ  
مرہم نہادہ بر سر داغ نہان ما  
ایک ہندوستانی سے اس سے زیادہ موزوں طبعی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بڑا حسین جوان تھا۔ کابل میں پیدا ہوا اور ہندوستان میں نشوونما پائی۔ خوش خطی میں اشرف خاں کا شاگرد تھا۔ عینی عالم شباب میں ۹۸ھ میں قلعہ سورت کے محاصرہ میں گجرات میں فوت ہوا۔ اشرف خاں نے اس کے لیے مصرع تاریخ کہا اور اس پر میر علاؤ الدولہ نے قطعہ مکمل کیا۔

**محمد یوسف**

محمد یوسف آں مصر ملاح  
برقت از دہرا شک زدیدہ ریناں  
پئے تاریخ او گفتا عزیزے  
دکھا شد یوسف مصرے عزیزاں

یہ غزل محمد یوسف کی ہے

خوش وقت آن کہ جائے بہ میخانہ ساختہ  
در پائے غم بہ ساغر و پیمانہ ساختہ  
آں کس کہ دادہ شبیوہ مستی بچشم یار  
ستم از ازاں دو زر گس متانہ ساختہ  
معموریٰ بعالم فانی نیانت چنبد  
منزل از ازاں بگوشہ ویرانہ ساختہ  
گفتم کہ جا بدیدہ من کن نیانہ گفت  
در رہگذارہ سیل کے خانہ ساختہ  
زلف تو کردشانہ پریشاں شکستہ باد  
وستے کہ ہر زلف تو آں شانہ ساختہ

در ہجر تو آرام بنا کام گرفتیم  
نا کام بہ ہجراں تو آرام گرفتیم

**منظری سمرقندی** | خوش کلام شاعر تھا۔ آگرہ میں بیرم خاں کی سرکاری ملازم تھا۔ ایک شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا، چند داستانیں بھی لکھ لی تھیں، جن میں ایک قطعہ سکندر سور کی داستان سے متعلق تھا۔ اس میں محمد حسین خاں کی بہادری کا ذکر کیا تھا۔ پنیالی میں اس نے یہ نظم پیش کی۔ حسین خاں نے اس سے اس واقعہ کو شروع سے آخر تک بیان کیا۔ اس نے رات بھر بیٹھ کر تین سو چار شعروں کی خاطر خواہ تصحیح اور اصلاح کی اور صبح صبح مجلس میں آکر نظم سنائی۔ خان نے بڑا اچھا صلہ دیا۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

ز فرغش فلک گشت کر  
ملک شد سرا سیمہ ز اں کر وفر

اس کا یہ مطلع بہت مشہور ہے:

ہمیشہ ماز فراق تو بے سرو پایم  
ترا کس کہ بخاطر نمی رسد مایم  
خط گرد ماہ عارض آں سیم برنگر  
ہر دو نشان فتنہ دود قمر برنگر  
بر روئے ماہ سلسلہ عنبریں ہیں  
جد بنفشہ پردہ گلبرگ ترنگر  
میں چشم رہزن دثرہ ناوک انگلش  
در رہگذار عشق خطر در خطر ترنگر  
یہ آخری شعر ہی اس کے اپنے خاص رنگ میں ہے، بقیہ کا مضمون پامال اور کافی سنا ہوا ہے۔

ہندوستان میں حیدری کے نام سے مشہور تھا۔ میر محمد خاں کلال کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے  
 کہے ہیں۔ بد مزاج ایسا تھا کہ ہر ایک سے جھگڑا کرتا تھا۔ ہمیشہ اپنی اس عادت سے مصیبتوں  
 میں مبتلا رہا۔

نمی دانست مجنوں عاشقے رسوائی عالم شد  
 منم رسوائی عشق و عاشقی بر من مسلم شد  
 در نظر آید ہلال عید مانند کلید تاکشاید قفل از مے خانہ ساقی شام عید  
 شد عیاں از پردہ دیگر شاہد خضر انقاب  
 خندہ زد چوں صبح غنچہ گشت ظاہر آفتاب  
 مراہست بر سینہ از تیغ و لبر الفبا چو بر صفحہ خطبائے مسطر  
 خان اعظم کے سلسلہ کا شاعر تھا۔ خوش طبع آدمی تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد اپنے ملک  
 مقیمی سبزواری کو چلا گیا۔

خوش آنکہ چوں شمار سگ خویشتن کند  
 ہر چند در شمار نیم یاد من کند  
 عاشقانیم و سر کوئے بلا ماوائے ماست  
 ہر کجا اندوہ و محنت بیش آنجا سائیم  
 عالمے پر فتنہ و آشوب از غولے ماست  
 ہر کجا آشوب و غم بسیار آنجا جائے ماست  
 باچنین بد حالی کا مرد ز داریم از غمش  
 دریا بان غمش سرگشتہ ایم و ساہر است  
 آں سیدہ سختی کہ در روز چنیں ہمایے ماست  
 آری آری کی بایں خوبی ترا پردائے ماست  
 اس کا لڑکا قاضی الہام المعانی ایک شکستہ دل، فانی مشرب نوجوان ہے۔ اپنے باپ کے رنگ میں رنگا ہوا  
 تھا۔ بھاسیر کے عارضہ میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ شیخ سعدی کا مطلع ہے:  
 کافراں از بت بے جاں چہ تمتع دارند  
 بارے آں بت بہر بستید کہ بجانی دارد  
 اس نے اسی زمین میں کہا ہے:

مردہ حسرت برداں دم کہ بری دست بہ تیغ  
 کیں عطار روزی آنست کہ جانی دارد  
 حال ہی میں ہندوستان آیا۔ خان خاناں میرم خاں کی ملازمت میں تھا۔ اب مکہ معظمہ کی زیارت کے  
 لیے چلا گیا ہے۔ رباحی کہنے میں بے مثل تھا۔

تازلف بروں ہم چومہ خواہد بود  
تا خط شہ حسن را سپہ خواہد بود  
گر خانہ رخت آفتابم سازند  
روز من بے چارہ سپہ خواہد بود  
من جان و دل حزیں نمی دانستم  
من گریہ آتشیں نمی دانستم  
نہ نام بہ من گذاشتی و نہ نشان  
اے عشق ترا چہیں نمی دانستم  
محو کی کہ ز کوئے عقل بیرون جی گشت  
آوارہ تراز ہزار مجنوں جی گشت  
دور از تو نہ دور دیدم آں گم شدہ را  
در باد یہ کہ باد و رخسار جی گشت

**منظری کشمیری** | صاحب دیوان شاعر ہے۔ اپنے وطن میں سرکاری خدمت پر مامور ہے۔ ان چند اشعار سے اس کے ذوق شعری کا پتہ چل سکتا ہے:

اقبال حسن کار تو را پیش می بود  
ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چہیت

یہ اس کے استاد کا مطلع ہے:

تو عہدا ستوار ندانستہ کہ چہیت  
بودن بہ یک قرار ندانستہ کہ چہیت  
فدائی آئینہ گروم کہ داستان مرا دروں خانہ بہ گلگشت بوستان دارد  
منظر بجاں چو بی نصیبیاں می باش  
وز گل بنوائے عندلیباں می باش  
بادیدنی از خوئے عالم می ساز  
ہماں نظارہ چوں غریباں می باش

**شیخ محمد دہلوی** | کیا حسب نسب کیا علم و فضل ہر لحاظ سے یگانہ روزگار تھا۔ مدتوں کی شناسائی کے بعد اس سال جب کہ شاہی لشکر قلعہ چٹوڑ کی فتح کے لیے جا رہا تھا، اتفاقاً قصبہ باری کے قریب میری اس سے ملاقات ہو گئی، لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ وہ محفل گھڑی بھر سے زیادہ نہ رہی وہ ایک طرف اور میں دوسری طرف رخصت ہو گیا۔ اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے قابل قدر احوال کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا ذکر شاعروں کی ذیل میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ کبھی کبھی شعر کہتا تھا اس لیے ہم اس کی یاد میں یہ مطلع نقل کرتے ہیں:

اگر بروز غمت صبر اختیار کنم  
جو اختیار نماند بگو چہ کارہ کنم

**نویدی ترمذی** | صاحب دیوان شاعر ہے۔ بیرم خاں کے بخشی کچک بیگ کی بیوی اس نے ایک ترجیع بند کہا ہے جو رہتی دنیا تک لوح زمانہ سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں۔

اے بدوراں شریف تو مباہی ایام  
عاجز از وادئی فہم تو سمند اوراق  
سخنے ہست مرا شرح کنم بہ نواب  
دادہ منصب بخشی گری عالی را  
نیستی واقف از افعال ذمیش گویا  
امدی بود خود آرا و لوندی مے کش  
کار او نوکری خواجہ امیر بیگ وزیر  
چیز ہائے دگر از وہی برہی معلوم است  
قصہ کوتہ بسر قصہ روم القصہ  
ہر کجا بود چناں بود در اظہار سلوک  
اے کہ بہر تن پیشیت ز خدامی خوانند  
تپ و قولنج و بوا سیر و وق و استسقا  
نہار و سیار چو از پائے در آئی بہ علاج  
قی میمون و گہ سگ بچہ وہ روزہ  
اسے خوش آں دم کہ شوی قبض ز قولنج بول  
دست خراپائے شتر شاخ بز و گردن قاز  
خان بن خان سر و سرخیل سلاطین پیرام  
قاصر از قصر جلال تو کنت اہام  
مشکلے ہست مرا عرض کنم بہ خدام  
بکچک بیگ سبب چہیت ایا فخر انام  
گر چہ تحقیق خدم فرض بود بہ حکام  
پسری بود بزر مائل و نرم خود کام  
عامل سلسلہ حضرت مرزا بہرام  
دارم از حضرت خاں شرم کہ سازم اعلام  
قصہ خوانی کنم از حالت آں بے اندام  
کہ بروز آمدہ نفرین ز خواص و ز عوام  
ہمہ سکاں سادات چہ در صبح و چہ شام  
خصیئہ کرم و کدودانہ و صرع و سرسام  
بنویسند غذائے حکیمان بہ تمام  
آلت خوس و دم گریہ و سرگیں حمام  
نسخہ حقیقہ نویسند اطبائے اعظام  
کلہ خوس و سراسترد و دندان کراہ

اس کی بیوی اس کا ایک جملہ بھی مشہور ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ "ایک دن کچک بیگ کچری میں ایک پرانی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا مجھ سے کہنے لگا: "اے کتے میرے سامنے تو گو کھاتا ہے؟" میں نے اسے جواب دیا: "کون کتا ہے جو تمہارے سامنے گو کھاسکے؟"

نویدی کا نام تھا۔ اصل تذکرہ کے مصنف میر علاؤ الدولہ نے چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور یہ قصہ لکھ دیا ہے۔ فحش نویسی میرا بھی وطیرہ نہیں ہے لیکن گرمی سخن کے لیے بعینہ میں نے اسے نقل کر دیا۔ صاحب بینا حضرات! ان راہ کرم چشم پوشی سے کام لیں تو بہتر۔

یہ شعر نویدی کے دیوان کے ہیں۔ معلوم نہیں یہ اسی نویدی کا دیوان ہے یا کسی اور کا۔



خندنگت را کہ عمرے جاں در دل داشتہ دارم  
ہماں قیدی کہ در دل من مسکین ہر گز دل  
نہاں آرزوئے کز تو حاصل داشتہ دارم  
ازاں لیلی و شمشکیں شہماں داشتہ دارم  
بدان صورت کہ در آئینہ دل داشتہ دارم  
بوادی جنوں پائے کہ در گل داشتہ دارم  
بخاک و خوں چو مرغ نیم بمل داشتہ دارم  
نوبیدی مرغ دل را کہ خندنگ غمزہ اش عمرے

ساخت سودائی سر زلف تو بیتاب مرا  
آرم تاب جفایت ہمہ عمر و لے  
جانم آمد بلب از ہجر تو دریاب مرا  
ایں کہ با غیر نشینی نبود تاب مرا  
کز سر کوئے تو ترسم کہ برد آب مرا  
نگذار دشب ہجرال تو در خواب مرا  
رفت از یاد پریشانی اسباب مرا  
بے قراری سر زلف تو بیک چشم زدن  
گشت تاجع نویدی دل من با غم تو

گر زار بمیرم ز غم و میدم خویش  
از بیخودی عشق اگر پیش تو ظاہر  
با غیر شکایت نکم از الم خویش  
کردم غم دل مراد گزلاں از کرم خویش  
میخواست نویدی غم دل پیش تو گوید  
بچوں درخت کرد فراموش غم خویش

تا خندنگت از دل افکار می آید ہر دل  
ناوک و لدوز او در سینہ افکار من  
جاں غم فرسود من صد بار می آید ہر دل  
جا گرفت آساں و لے دشواری آید ہر دل  
میروم صد بار تا یک بار می آید ہر دل  
گر مسلمانی چہ از نار می آید ہر دل  
اے نویدی از دوزخ خرقہ پیشینہ ات  
بے طاقتی

نہ فکر آخرت داری نہ دنیا

منی دامن نویدی در چکار کا

**نشانی** مولینا علی احمد کا تخلص ہے۔ مولینا حسین نقشی مہرکن کے ربکے ہیں۔ بڑے عالم فاضل ولی مشرب آدمی تھے بڑے شاہزادہ کے استاد تھے۔ باپ بیٹے دونوں نے مہرکنی کے فن کو بڑا فروغ دیا۔ خاص طور سے مولینا مذکور کہ نگینہ پر نقش سازی میں ان کے کارنامے بے مثل ہیں۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک ان کے نقش و سکہ کو تبرکائے جاتے ہیں۔

علم و کمال میں بھی ان کا بڑا اونچا مقام ہے لیکن نقش سازی کے فن نے ان کے سارے کمالات پر پردہ

ڈال دیا ہے، اسی لیے سپاہ گری اور ملازمت میں جیسا کہ چاہیئے تھا ترقی نہیں پاسکے، پھر بھی قابل عزت عہدہ پر فائز ہوئے۔ امرائے نامدار سے ان کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں رہا۔

علم ہیئت اور طبیعیات کے ماہر ہیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ تک رسائی ہے۔ ہر طرز کی خوشنویسی جانتے ہیں املا اور انشاء میں بے مثل آدمی ہیں۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تو بلاشبہ ان کے شعر صفحہ یادداشت پر یادگار رہتے۔ شعریں کبھی کبھی کہتے ہیں تخلص اپنے پیشہ کے مطابق رکھا ہے۔

میں عنفوان شباب سے اس منتخب کے لکھنے کے وقت تک کہ میرے بڑھاپے کا زمانہ ہے، ان کے دوستوں میں رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے نہایت گہرے مراسم رہے ہیں۔

ان کا نمونہ کلام مندرجہ ذیل ہے:

ترا تا سبزہ خط بربلب جان بخش پیداشد  
میسجا بود تنہا خضر ہمراہ میسجا شد  
محتسب لے خم شکست و آب آتشناک بخت خاک من بر باد داد و خون من بر خاک بخت  
باد از یار خبر بر دل ناشاد آورد  
اعتمادی نتوان بر سخن باد آورد  
مرا ہر شب چو فنداں خواب گیر و چشم تر گرد  
دلم را با غمت بیدار بیند باز برگردد  
میں نے اسی رنگ میں کہا ہے:

بہ صد امید قاصد میفرستم سوئے آن بدخو  
معاذ اللہ از آن ساعت کز تو امید گردد

ان کا ایک شعر ہے:

تا سینہ از خدنگ جھلنے تو خستہ ایم  
مرہم نماندہ ایم و جراحات نیستہ ایم  
جس زمانہ میں گجرات فتح ہوا، انھوں نے بادشاہ کے نام کا سکہ کندہ کر کے پیش کیا اور تاریخ میں یہ شعر پیش کیے:

خسروا سکہ گجرات بنام تو زند ملک یا سایہ عدل تو تبارک بادا  
لے خوش آں دم کہ چو تاریخ و لے از من پسا گویت۔ سکہ گجرات مبارک بادا  
ان کے اور شعر ہیں:

کار بجانم رسید و یار نیامد  
جاں گراں مایہ میج کار نیامد

مارا دل مجروح دیتاں رانمکیں لب

تا روز اجل بہ شدن این ریش نباشد

سورت ومعنی نگر دو جمع در ہر پادشاہ پادشاہ صورت ومعنی است اکبر پادشاہ

آن شہنشاہی کہ می افتد بر وز بار او از نہیب چوب دریاں پادشہ بر پادشاہ

زنگ حادثہ دل نہ شکند بہ سینہ ما

کہ ساختند ز الماس آہگینہ ما

جس زمانہ میں لشکر شاہی پہلی مرتبہ کشمیر کی طرف گیا تھا، میں رخصت لے کر پشاور کو جو میری جائے ولادت

ہے چلا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے یہ اشعار لکھ کر میرے پاس بھجوائے تھے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ انہوں نے

دوسروں کو بھی اسی شوق و محبت میں اشعار لکھے ہوں گے لیکن میں ان اشعار سے اپنی نسبت کو خاص سمجھتا ہوں

تاکہ دوسرا دعویٰ نہ کرے ۛ

مرا دور از تو اے ماہ دل افروز نہ شب خوابست و نہ آرام در روز

چکیدہ اشک گلگونم بر خضار شگفتہ لالہ اندر نہ عفران زار

نہ خون دیدہ شد آلودہ مژگاں کشیدہ سر زور یا شاخ مرجاں

نہ ہجرت و مہدم خون و دل من نشستہ چوں صراحی تا بگردن

بسوزد ہر نفس از آتش عسّم علم بیروں زند از سینہ ہر دم

کنوں چشمم بخون دل ستیزد بجائے قطرہ آتش پارہ ریزد

نہ مژگانست گرد دیدہ من سپہ شد آتش دل گرد روزن

ملک خواب مرا زیں سیرناشاد کز و جان عزیزیاں رفتہ برباد

چناں ضعیف تن و دل گشتہ حاصل کہ نے از تن خبر دارم نہ از دل

تنے از محنت تپ بے حضور سے دے در دلی چو آتش در تنور سے

شیخ فیضی نے جو فخر یہ لکھا ہے اس کا مطلع ہے ۛ

شکر خدا کہ عشق بتاں ست رہم

در ملت بہرہمن و در دین آفرم

نشاطی نے اس کے جواب میں قصیدہ لکھا تھا جس کے چند شعر ہیں :

شکر خدا کہ پیر و دین پیہرم حب رسول و آل رسول ست رہم

بیزارم از بہرہمن و ناقوس داہرین شکر ز دین راہب و قیس و آفرم

قائل بدوزخ و قیام قیاس متم امیدوار جنت و حوری و کوثرم

حاصل ہوئے من بختارت نظر مکن  
 زبیر نگین من شدہ روئے زمین تمام  
 از شرق تا بہ غرب فضیلت معدم  
 سطح محرب فلک فضل خصم را  
 کہ در زمین چو نقطہ مہوم ساکنم  
 دست قضا کشیدہ بہ پرکار روزگار  
 ہر چند کم نہ نقطہ دو وضع مرکز م  
 کہ خصم صد ہزار کند سحر سامری  
 نعت میں ان کا شعر ہے :-

خاتم ختم توبہ شکستہ نگینائے قدیم  
 طرح نقش تازہ ونہ ورنشان انداختہ

اپنے ساتھیوں میں سے ایک معزز ستم ظریف کے بارے میں یہ اشعار لکھے ہیں :-

چند زنی لاف کہ در ساحری  
 ہر نفس معجزہ عیسوی است  
 در سخنم نادرہ روزگار  
 ہر نفسم برودہ ز جادو شکیب  
 خسرو ملک ہمہ دانی منہم  
 جو ہری سلک سخن دانیم  
 ایں منم امروز دریں داوری  
 دعویٰ ایچہ دمعانی مکن  
 شعلہ ہرشتاز گہر ہائے پاک  
 طمع تو ہر چند در ہوشش زد  
 آنچہ تو گفتی دگر اں گفتہ اند  
 خانہ کہ از نظم بیباستی  
 سقف منقش کہ دریں خانہ است  
 طمع تو دارد روکش باغبان  
 سبزہ آں باغ نہ زباغ دگر

سامریم ۔ سامریم ۔ سامری  
 شعلہ نور شجر موسویست  
 اہل سخن را منم آموزگار  
 ہر سخنم سحر ملائک فریب  
 عالم اتلیم معانی منم  
 صیرقی نقد سخن دانیم  
 شعلہ آتش بزبان آوری  
 شمع نہ چوب زبانی مکن  
 لاف مزین نیست چو در کیسہ خاک  
 یک سخن تازہ نہ شد گوش زد  
 در کہ تو سفتی دگر اں سفتہ اند  
 آب و گلشن از دگر اں خواستی  
 رنگ دے از خامہ بیگانہ است  
 ساختہ باغی نہ مال کساں  
 ہر گل رعناش ز باغ دگر

غنیمت آں گہ چہ رواں پر و راست  
 بید کہ بے میوہ سر بر کشید  
 تازگی آں نہ ز باران تست  
 چند پئے نقد کساں سوختن  
 جمع مکن نقد سخن پر و راں  
 ثمریت بیگانہ فراموش کن  
 گر خضری آب حیات تو کو  
 نخل صفت سر بہ فلک می بری  
 سرو کہ بر چو رخ بساید سرش  
 بر سخن خویش تفاح سر چراست  
 من اگر از شرم نگویم سخن  
 نے چو رطب سینہ پر از خستہ ام  
 من اگر از بند کشایم زباں  
 طعنہ چو ابلیس با دم مز ن  
 سامریم من کہ بزورِ فسون  
 غلغلہ در زہرہ و ماہ افکنم  
 ایں منم آں ساحر جادو مزاج  
 منکہ بہ جادو سخن شہرہ ام  
 سامریاں در گہ موئے من  
 دولت ایں کار بکام من است  
 از سخن طرز سخن یاد گیر  
 ہر کہ با استاد ارادت برد  
 یک سخن از نظم تو نبود درست  
 گہ چہ بروئے تو نگوید کسے  
 لیک بہ غیب تو ملامت گراں  
 شعر ترا گہ مہیاں آورند  
 شعر ترا پیش تو تحسین کنند

لیک ز خون جگر دگر است  
 برگش ازاں دانہ مشجر کشید  
 از خوشے پیشانی یاں تست  
 چشم بہ مال و گراں دوختن  
 کیسہ مکن پوز زہر دیگران  
 آب ز سر چشمہ خود نوش کن  
 وز شکری شاخ بنات تو کو  
 میوہ بجز خستہ نمی آوری  
 چاشنی میوہ نباشد برکش  
 بر من دل حستہ تسخر چراست  
 حمل بہ بیدانش من مکن  
 ہم چو صدف پرور و لب بستہ ام  
 لب نکشایند زباں آوراں  
 حالت من در نگر و دم مز ن  
 لعبتی از سحر بر آرم بروں  
 نغمہ ہاروت بچاہ افکنم  
 کز سخنم یافتہ جادو رواج  
 ہم فلک و ہم نہ دہم زہرہ ام  
 باہلہ اور چہ جادوئے من  
 سکہ ایں ملک بنام من است  
 عار مکن دامن استاد گیر  
 در دو جہاں گنج سعادت برد  
 مضحکہ اہل سخن نظم تست  
 عیب تو پیش تو بخوید کسے  
 انجن آرائے سخن پر و راں  
 عیب تو یک یک بزباں آورند  
 وز پس تو لعنت و نفرین کنند



انے تو بکس یار نہ کس با تو یار عیب تو بر تو نشود آشکار  
 وہ کہ یکے یار نداری درینغ مونس غم خوار نداری درینغ  
 تاب تو عیب تو نماید کہ چسیت و آنچہ عجیب تو کشاید کہ چسیت  
 جس زمانہ میں میں یہ تذکرہ لکھ رہا تھا، ان کے چند شعر میں نے منگوائے تھے۔ جواب میں انھوں نے یہ فقرہ لکھا تھا:

”وقت یہ آن پڑا ہے کہ اپنی متفرق خرافات کو جمع کروں۔ بہر حال آپ کے احسان پر آفریں ہے۔ دو جزو لکھے ہیں، ایک نثر ہے اور دوسری مثنوی، جو ادھوری رہ گئی ہے۔ انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اکٹھا دے دوں گا، فی الحال مثنوی کے چند شعر: ”سامریم سامریم سامری“ روانہ کر رہا ہوں، اصلاح فرمادیں اور جو کچھ لکھنے کے قابل ہوں علیحدہ کر لیں۔“  
 ایک اور رقعہ میں اولگون بادشاہ اور اکبر کے بزرگوں کے سکے صاحب قرآن تک لکھ کر میرے پاس بھیجے تھے۔ یہ جلال خاں ولد میاں منگن بدایونی کا تخلص ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ نہایت قابل با اخلاق نوجوان تھا۔ اسی کی محبت تھی کہ میں نے بدایون کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ شعر گوئی کے عمدہ نمونے چھوڑ گیا۔ اگر زندگی رستہ تو علم و فضل میں بڑی ترقی کر لیتا۔  
 نمونہ کلام:

بشنو ایں نکتہ سنجیدہ ز پروردہ عشق  
 کہ بہ از زندہ بے عشق بود مردہ عشق  
 ترک من زخم بہ ہنگام سواری زدہ لذتے دارم ازین عشق کہ کاری زدہ  
 خان کلال کا مطلع ہے ع

در جوانی حاصل عمر بہ نادانی گذشت

اس نے اس پر شعر کہا ہے

ہر سلیمانے کہ خود را کمتر از مورے ندید  
 عاقبت بر باد رفت و آں سلیمانی گذشت

نیا نیا خان خاناں کی خدمت میں شامل ہوا تھا ہے  
 قضا کہ نامہ سہرم شراب خوارہ نوشت  
 نوید عفو خداوند بر کنارہ نوشت

ملا نویدی

**نہانی** | یہ آگرہ میں ایک بوڑھی شاعرہ تھی۔ غالباً ہرات کی رہنے والی تھی۔ یہ اس کا مطلع ہے:

مغذ غم شب در دے آرام پیدا کردہ ام

درد مند بہا دریں ایام پیدا کردہ ام

بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں شعر کے یکن کوئی اس کے برابر کا نہیں۔

چہ مڑے بودی کز زنے کم بود

اس کا لڑکا جفر اب کشمیر میں احمدی ہے، یہ ایک قابل نوجوان ہے اور میرزہ بحر معین کی سرکار میں ملازم ہے۔

**نجاتی گیلانی** | ہندوستان آنے کے بعد فوت ہو گیا۔ شعر و معما خوب کہتا تھا۔

اے دلم دور اند تو در آتش دودہ خوں فشاں

بے تو ام در آب و آتش آشکارا و نہاں

مد ابل کے اسم کا معما کہا ہے۔

حل نہ شد از دل تو مشکل ما

از دولت وہ کہ آب شد دل ما

**نوعی** | اپنے آپ کو شیخ حاجی محمد خجوشانی کا پوتا بتاتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعویٰ کو جھٹلاتے تھے۔ نہایت شوخ طبع آدمی تھا۔ اب چھوٹے شاہزادہ کی ملازمت میں ہے۔

نوعی سبکدوش میم و بعد مردم

خورشید دار آبلہ ام جوش می زند

غم نوعی نہ زبیری در دوالم است غم از انست کہ در حوصلہ گنجانی نیست

باز شوقم رہے گرفتہ بہ پیش

کہ در اں راہ خضر پر حذر است

گل صحراش حصار مرگاں است

سنگ آں راہ کاہلئے مراست

**نیازی** | بخارا کا رہنے والا ہے۔ نہایت بدست بے حیا آدمی تھا لیکن صحیح معنوں میں شاعر تھا۔ شعر عروض معما، تاریخ اور دوسری تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر اس کی تصنیفیں بھی ہیں۔

جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجلس میں اس نے بایاں پیر آگے بڑھا دیا۔ ہمایوں ادب آداب کا نہایت پابند تھا۔ اس لیے کہا ملا یہ بایاں پیر ہے۔ پھر حکم دیا کہ اس کو باہر سے جا کر دوبارہ مجلس میں ملاؤ۔ جب اسے بیٹھنے کا حکم ملا تو اس نے بیہودہ باتیں شروع کر دیں اور ملا بیگی سے بحث کرنے لگا اور میر عبدالحی مدد سے جو

یکیتی کی تائید کر رہا تھا کہا بے کسی کے چہرہ پر پھٹکار کیا کریں کہ ہم بھی بے کس بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت خواجہ حسین مروی نے جو منقل آدمی تھا، میر عبدالحی کی تائید میں کچھ کہا تو اس نے ان سے کہا: ”خواجہ تم کیوں پشتی ے کر گئے۔“

ہمایوں کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزریں اور وہ محفل سے اٹھ گیا، اسے سزا ملتی لیکن ہمایوں کی بردباری اور حلم ایسا تھا کہ کچھ نہ کہا۔

ماورائے نہر کو چھوڑنے کا سبب اس کی غزل کا یہ مقطع تھا:

بر فلک نیست شفق بادہ گلغام من است  
رند دردی کشم و طاس فلک جام من است  
تا نیازی شدہ در ملک سخن خسرو عہد  
نام جامی شدہ فسوخ کنوں نام من است

کتے ہیں ٹھٹھے میں ایک دن وہ اپنی یہ غزل سنا رہا تھا۔ مولانا جامی کا دیوان بھی موجود تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو اس کے حسب حال یہ شعر نکل آیا۔

چرخ ما جام نگوں داں کز مئے عشرت تہی ست  
بادہ از جام نگوں جستن نشان ایلہی است

ایک دن نیازی نے فسوفی شاعر کو خواب میں دیکھا کہ اس نے اس کی داڑھی پر پیشاب کر دیا۔ کسی شاعر نے یہ سن کر قطعہ کہا:

فسوفی را نیازی دید در خواب  
بیش او ز شیشہ آب پاشید  
اگر شاشید بر رویش میا رید  
سگے بر بوتہ شاشید شاشید

نیازی کے شعر ہیں:

بروئے آتشیں زلف تو لے سیمیں بدن بیچید  
بلے چوں موئے ہر آتش فتد بہ خوشن بچید

چو توانم کہ بر گرد سر آں تند خو گردم خیالش در نظر آید ہر دم گردا گردم

در تحریک نیست از باد صبا پیرا ہنش  
بلکہ جانی یافتہ پیرا ہن از لطفت ہنش

اس کی وفات ٹھٹھے میں ہوئی۔

**نامی** | یہ میر محمد معصوم صفوی ولد میر سید صفائی کا تخلص ہے جو بیکر کے اکابر سادات میں سے ہے۔ میر محمد امرائے شاہی میں شامل ہے اور کسی خدمت پر سندھ اور قندھار کے علاقہ میں متعین ہے۔ نہایت درویش مزاج، بااخلاق، دیانت دار، بہادر اور سخی ہے۔ تقویٰ، پرہیزگاری، نماز اور تلاوت کا بڑا پابند ہے۔

کسی نے اس سے کہا اس راستہ میں راہنمائی کے بغیر کام نہیں چلتا، کسی مرشد سے تلقین حاصل کرو۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال دو تین مرشد ہیں اب کسی اور کی کیا حاجت۔ میں جس وقت وطن سے دار الخلافہ میں پہنچا تو ہوا و ہوس کا یہ زور تھا کہ ہزاری دو ہزاری منصب نظروں میں نہیں جھٹکتا تھا لیکن جب دربار میں پہنچ کر چوبداروں اور دربانوں کے ڈنڈے کھائے اور خوب ذلتیں اٹھائیں تو اپنی حیثیت معلوم ہو گئی۔ پھر بڑے انتظام بعد بیتی کا عمدہ نصیب ہوا اور جوانی کے وہ سارے دعوے ہوا بن کر اٹھ گئے، ناچار راضی برضا تسلیم کی خود پیدا کر لی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ وہی مثل ہے کہ میں نے کچھ بن جانا چاہا کچھ بھی نہ رہا اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ بن گیا۔

نیم ملوں کہ کارم نکو نہ شد بد شد

شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

اگر کوئی مرشد بھی ہوتا تو وہ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم دیتا۔

ہمارا دو سرامرشد میر ابو الغیث بخاری ہے۔ جو عمدہ اور مرتبہ میں ہم سے کئی درجہ بڑا تھا۔ جب تک اس سے شناسائی نہیں ہوتی تھی ہمارا یہ حال تھا کہ اگر کسی دن ہمارے گھوڑوں کو دانہ چارہ نہیں ملتا تھا تو غم و غصہ کے مارے کسی سے بولتے نہیں تھے، لیکن جب میر کی صحبت نصیب ہوئی تو ہم نے ان کا یہ رویہ دیکھا کہ کبھی کبھی دو چار روٹے اچھے گزر جاتے تھے ورنہ ان کے طریقہ میں گھانس کا ایک ٹکڑا رہتا تھا نہ مطبخ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا باوجود اس کے وہ اس قدر خوش و خرم ہنستے بولتے رہتے تھے کہ کسی پر ان کی تنگ دستی کا حال نہیں کھلتا تھا، نہ وہ اس سلسلہ میں کسی سے کچھ بولتے سنتے تھے۔ ان کے نزدیک خوش حالی اور بد حالی دونوں بس ایک جیسے ہی تھے۔

ان حادثات در صف آں صوفیاں گریز

کز بود غم کنند و نہ نابود شادمان

اس وقت ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ جب ایسے بڑے آدمی پر بھی یہ وقت گزرتے رہتے ہیں اور وہ حالات کی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ تو ہمارے لیے تو بے فکر رہنا کیوں زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس دولت و مرتبہ کا دسواں حصہ بھی نہیں رکھتے۔

ہماری تیسری مرشد ایک کینر ہے جو بادشاہ سلامت نے مرحمت فرمائی تھی۔ جس وقت بھی شیطان بہکاتا ہے

اور ہوا دم ہوس زدہ کرتے ہیں اور طبیعت نظر باز ہی، شہوت پرستی کی طرف جھکنے لگتی ہے تو ہم فوراً جا کر اس کی صحبت میں آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اور پاک و صاف ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ مرشد کا کام اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ ناشائستہ کاموں سے بچلے۔

میر طلب علم میں بھی بڑے کوشاں ہے۔ شعر گوئی اور مہمکنے میں بڑا اچھا ذوق ملا ہے۔ نہایت بلند فطرت آدمی ہے۔ یوسف زلیخا کے بحر میں ایک مثنوی کہی ہے۔ ایک دیوان بھی ہے۔

نمونہ کلام:

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پریا بتو شرح حال گویم بزبان بے زبانی

چو گر یہ من دیدتہاں کہ دہ تبسم

پیدا ست کہ این گر یہ من بے اثری نیست

در عشق نشہ ایست کہ عشاق خستہ را

ذوقی ست در فراق کہ اندر وصال نیست

وادی پیام بہ قاصد مہ من خندہ کنی ظاہر است از سخن اد اثر خندہ بنور

اس نے احمد آباد سے ایک میں میرے پاس اپنا قصیدہ بہت بخت روانہ کیا تھا، جس کے چند شعر ہیں:

داغی کہ بود بر دلم از عشق درازل از دولت نراق تو باد و شد بدل

طوفان آتشی کہ دل از درد بکشید افگندہ در مزاج زمین و زمان خلل

ہستم نہ آفتاب شفیع امیدوار روز یکہ بیچ جان بود سایہ امل

بامان ابر رحمت و ساقی روز حشر آں دیں پناہ اعظم و آں صاحب اجل

### رباعیات

تنہا با خود در انجمن باید بود با خویش ہمیشہ در سخن باید بود

ہم بیل و ہم گل چمن باید بود دیوانہ کار خویشتن باید بود

فریاد رحیل از ہمہ کس می شنوی آواز دراز از پیش و پس می شنوی

کردہ ہمہ شب گیر بسر منزل دور تو خفتہ برہ بانگ جوس می شنوی

اے آں کہ بر اں رحمت نظر می باید چشم تو درائی چشم سہر می باید

خواہی کہ از عشوہ اش فاقل نشوی در چشم دلت چشم دگر می باید

عشقت نہ متاع ہر خریدار بود اوراد و جہاں بہلے یکتا رہ بود

گل نیست کہ در کوچہ و بازار بود یا مشک کہ درد کان عطار بود



نہ آلائش روزگار اندر گلہ  
عیب دیگران مکن تو ہم زان گلہ  
پرہیز از آلودگی دامن خویش  
نامی دوسرے روزے کہ دریں مرحلہ

در عشق بتاں مشق جنوں باید کرد  
جہاں را بہ فراق رہنمویں باید کرد  
چوں شیشہ تمام پر ز خون باید شد  
وانگاہ دل از دیدہ بروں باید کرد  
در مذہب ما بہ جملہ یکساں می باش  
در دائرہ کفر بائیاں می باش  
این است طریق عشق جانانہ ما  
زنارہ بگردن و مسلمان می باش  
گلزار جمال عارض دلدارم  
چوں جلوہ دہد بخاطر افکارم  
دریا و دریا جہاں جہاں خوریزم  
بتاں بتاں چمن چمن گل بارم

نظیری نیشاپوری  
لطافت طبع اور تفاسط ذوق میں دوسرا شکیمی اصفہانی ہے۔ خاں خاناں کی سرکاری  
خسلہ شعراء میں شامل ہے۔  
شیخ نظامی گنجوی کا قصیدہ ہے۔

ملک الملوک فضل بہ فضیلت معانی  
زمین وزماں گرفتہ بہ مثال آسمانی

اسی زمین میں نظیری کا قصیدہ ہے:

زہر بہ خود گنجم چو بہ خم مسی معانی  
بہ فسانہ ام مزین رہ کہ ز آتش عزیمت  
شدہ ام باعتمادی بہ سوال و صل پویا  
سگ آستانم اما ہمہ شب قلادہ خایم  
بدر و لباس برتن چو بہ شدم معانی  
یدماغ و دیدہ خواہم ہمہ شب کند و خانی  
کہ نمی کنم توجہ بہ جواب لن ترانی  
کہ ہوائے صید دارم نہ خیال پاسبانی

مگر در خدمت عمریت میں دم چہ شد قدم  
برہن می شدم کہ این قدر زنار می بستم  
خونخوارہ را ہی میروم تا خود بہ پایاں کی رسد  
پائے کہ این رہ سر کند آخر بداماں کی رسد  
اثر نگہ کہ بلب نار سیدہ آہ ہنوز

ہزار آبلہ دل بر سر زباں دارد

نوائی  
میر محمد شریف نام تھا۔ میر قدسی کہ بلائی اس کا بھائی ہے جس کا یہ شعر مشہور ہے۔  
گر ذوق خرمی نہ شناسم عجب مداں قدسی بہ عمر خویش چو خرم نبودہ ام

نوائی ہندوستان میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے۔

نمونہ کلام:

منم نشستہ بکنجے ز بے وفائی تو      قرار دادہ بخود محنت جبر رائی تو  
بگرم خوئیت از جانمی روم چکنم      کہ اعتماد ندارم بر آشنائی تو  
تو در طریقہ ہر وقتا نہ آئی شمی      کہ نور دیدہ فرزند ز بدشنائی تو

بہ بیچ جاں نرسیدم بہ بیچ رہ نگذشتم  
کہ در دلم نگذشتی بہ خاطر م نہ رسیدی

بہ نشیں بہ غمزہ و ستم آلود بہ مخیز      دیدہ آمدی بہ پرکشش مازود بہ مخیز  
خاصا پڑھا لکھا تھا۔ شعر گوئی میں صاحب مرتبہ شاعر ہے۔ اس کا انتقال ۱۹۷۲ء میں  
نویدی نیشاپوری

اگر م نہ اشک گلگوں شدہ لالہ گوں نہینا  
نقواں شدن پریشان گل عاشقیت اینہا

نمونہ کلام:

ہلال خواست شدن حلقہ درت شب عید      ز دوریست خیالی دلے ہم نہ رسید  
چہ شوقیت ہر لحظہ روئے تو دیدن      چہ ذوقیت ہر دم بکویت رسیدن  
چنانغم فتادہ است پیوند با تو      کہ نتوان بہ صد تیغ از تو بہ دیدن  
نویدی ز لعل لب او چہ حاصل      جز انگشت حسرت بدنداں گزیدن

جو ہر شناس شاعر تھا۔ طبیعت شعر میں خوب لڑتی تھی ایک دیوان مرتب کر چکا تھا۔ جو بہت  
نظمی تبریزی

مشہور ہوا۔

نمونہ کلام:

شوخی کہ بولب بہ فنون آلودہ  
اہل نظرند ازو جنوں آلودہ  
بہ بستہ لبہر چہرہ سرخ است اورا  
یار شستہ بجای ماست خون آلودہ

داغ جفائے یار کہ بر سینہ من است      داغش مخواں کہ مونس دیرینہ من است  
چنان خواہم نوشتن صورت احوال در نامہ      کہ میگردد ز آب چشم من فی الحال تر نامہ  
کہوتر نامسات آلود و ماندہ زندہ می روم      نمی آرد آں مرغ ہمایوں فال گر نامہ  
سراسری نویسم حال نظمی را با و اما      کجا خواہد گذشت آں سرو فارغ بال بزم  
بحام پری خانم پری رخسارہ دیدم      نشستہ در میان آب آتش پارہ دیدم

ز دل ربودن و بیگانگیت ظاہر شد

کہ بہر بردن دل بود آشنائی تو

خطی کہ برگل رخسارہ یار پیدا شد بنفشہ ایست کہ اندالہ زارہ پیدا شد

**وقوعی نیشاپوری** | شہاب الدین احمد خاں کا داماد ہے۔ اس کا نام محمد شریف ہے لیکن اعمال ایسے کثیف ہیں کہ اس کے نام کی مٹی پلید ہو گئی۔ بے دینی اور احمادیہ میں وہ ہر لمحہ بدنام سے آگے تھا۔ اعتقاد میں نہ تو بسخاوی تھا نہ صبا حی بلکہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ ادوار و تاسخ کا قائل، بلکہ اس عقیدہ کا پکا پیرو تھا۔

ایک دن بھمبر میں جو کشمیر کا سرحدی شہر ہے، وہ میرے پاس کشمیر جانے کے لیے کچھ ہمراہیوں کی تلاش میں آیا وہاں پتھر کی بھاری بھاری سلیں پڑی ہوئی تھیں، انہیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ کہنے لگا: ”آہ یہ بیچارے انسانی قالب میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

اس بد اعتقادی کے باوجود اس نے ائمہ علیہ السلام کی شان میں منقبت بھی کہی ہے، شاید یہ اس کے ابتدائی زمانہ کی چیز ہو۔ خوش نویسی، انشا پر دازی وغیرہ میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ علم تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن عربی تاریخیں پڑھنے کی مہارت از خود پیدا کر لی تھی۔  
نمونہ کلام:

نالہ تا از تو جدا فاش ساز دمازم  
بر نیاید شب غم کاش ز صنعت آواز  
جہاں پیشیت ز خصمت سر بر آرم چوں ایمنی کہ ماند از دست عشقم بر زبانا گفتگوئے تو  
مرا تاب جھلے غیر در دل آتش افکندہ کہ صد بارش گر آزاری نمی آرد بروئے تو  
در زیر زخم تیغ تو عمداً نمی تیم  
شاید ز ناتوانی خویشت خبر کنم  
مرا از بے قراری ہائے ہجراں میکند آگاہ در ایام جوانی حال من پر سید پنداری  
ہر کراہیم ز خواباں بسکہ دارم ذوق عشق  
شعلہ از جانم بر آرد آتش سودائے او  
ہر ساعت بجز دگر متہم کنی آزار جوئے من ز تو اینہا عجب نیست  
نمی خواہم کہ در روز جزا پریش کنی  
کہ ترسم بایم گفتن کہ در عشقت چہاں دیدم  
یہی کس را ندہی غیر من آزار و خوشم کہ سرو کار ہیں با من تنہا داری

شب فراق تو صد گونہ ماتم است مرا دریں بہانہ یآہ و فغاں کہ سر دار د

میتوان دید از بدون سوز دلم را در بدن  
ہیچو نور شمع فانوس از دروں پیر من  
از غم افتادم بحال مرگ ہنگام وداع  
تاشوی آگہ کہ در ہجراں نخواہم زیستن

امام حسینؑ کی منقبت میں کہتا ہے :

ہر گہ از طغیان سوز عشق در گیم چو شمع  
گر ز فیض خاطر گزد و طبیعت بہرود  
شاہان بکر معنی چو شود دست کم بلند  
شعلہ خود را ہر زمان بر من زند پڑانہ سال  
میتوان پرداختن و یک سخن صد داستان  
عرض حسینؑ خود کنند از عرفہائے آسمان

گر جو را یاد از تو دلم تن دراں دہد  
دارد ہلاک غیرت اینم کہ عشق تو  
شبہا کہ بر فروزم از اندیشہ تو دل  
یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں جو حضرت خاتون جنت بی بی زہراؑ کی منقبت میں کہے ہیں۔ لیکن یہ طرز مجھے بے ادباً  
معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے مرجع کے شعر درج نہیں کیے۔  
شریف و قوی نے سلسلہ میں انتقال کیا۔ اس کے تدرک میں نفیس کتابیں تھیں جو شاہی کتب خانہ کے پیٹ  
میں سما گئیں۔

تھوٹا بہت لکھا پڑھا آدمی تھا۔ ہندوستان میں آنے کے بعد انتقال ہوا۔

**وداعی ہروی**

سولہ ہند کہ پر ظلمت ست چوں شب ہجراں  
کھے کہ آمدہ این جا بہ حسرت ست و فغان  
زمک ہند وداعی مجو غنیمت و بگذر  
غنیمت است اگر جاں بروی ز ہند سلامت

اس مطلع کے رنگ میں :

خوش آن زماں کہ بہر دیت نظر کتاں روم از خود  
زماں زماں بخود آیم زماں زماں روم از خود

اس نے کہا ہے :

مذاذ شراب بہ بزم تو ہر زماں روم از خود  
پیالہ لعل تو بوسد ز رشک آن روم از خود

واقعی ہر وہی | ابن علی نام تھا۔ بادشاہی ملازمت میں تھا۔

نہ بزمیں تو از روئے ناز نہیں پیدا است کہ بحر حسن تو ز موج و این چنیں پیدا است  
 ہنوزت ارے ناز است نشہ دہر نہ مرگرائیت اے ترک ناز نہیں پیدا است  
 چو شمع سوز دل خود چہ آورم بزبان کہ سوز را اثر از آہ آتشیں پیدا است  
 چہ احتیاج بہ ماہ نواست در شب عید ترا کہ ماہ نواز چاک آستیں پیدا است

در لعل او بہم دارند آب زندگانی را  
 بلی جاں در میاں باشد بہم یاران جانی را  
 دلم چو آئینہ ز امروز کس خباہ ندارد کہ چشم مردمی از اہل روزگار ندارد  
 بے خوش آن مستی کہ ارد بے خبر سوئے توام  
 قاں چناں باشد کہ نتوان دن از کوئے توام  
 شود ہرز بے تابی ہوائی کوئے آن ماہم خیال بے وفائی ہائے او گیرد سر راہم  
 سر زلفش بر آن رخ از نسیم آہ مالزد  
 چو دودہ شمع کز آمد شد باد صبار زد

وصفی | میر عبد اللہ نام ہے۔ بڑا اچھا خوش نویس ہے۔ سات قلم میں خوش نویسی کرتا ہے۔ شاہ غیاث اور  
 مولینا راقمی کا شاگرد ہے۔ اعدیوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ اپنی والدہ کی طرف سے میرزا نظام الدین  
 احمد کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے۔

کنوں کہ لذت اندوہ عشق دانستم  
 ہزار رنگ بہر خندہ گرہیا دارم

رباعی: تو عشق کہ باطمین شب و یچود است اسرار حق از دانش من مستور است  
 باشد کہ محبتہ رساند و ر فی زیں سعی شکستہ مقصد دور است  
 اگر ابادہ مدح بزرگی تو کند زجان نہ جنبہ اندیشہ از گراں باری  
 چناں نزاع بہ عہد تو از میاں برخاست کہ پیہ را کند از صدق شعہ غمخواری

وصلی | بٹانہ بان آور، خوش طبع شاہ ہے۔ عراق سے حجاز گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا ہندوستان آیا  
 جہاز وائے طوفان میں بہہ گئے۔ وہ بھی بہتا بہتا قطب شاہ دکن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور  
 اس کے دربار میں آگیا۔

ایک موقع پر اس نے ایک پہوان کو کشتی میں پھپھاڑ دیا تھا۔ پہوانوں نے حد کے مارے سے زہر دلوادیا



اور وہ شہر میں فوت ہو گیا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہیں:

دل فریبانہ برہمی رود و می ترسم  
کہ میاوا بودش دل نگدانی از پیے  
نگار من تو چنان تند خو بر آمدہ کہ کس بہ تندی خوشے تو بر نمی آید  
میر واعظ کے نام سے مشہور ہے۔ بدخشاں اس کا وطن ہے۔ اس کی وعظ کی مجلس میں بڑی رونق  
**وقوفی ہروی** رہتی تھی۔

گر سرم خاک بہت گرد و دو بر باد رود نیست ممکن کہ خیال رخت از یاد رود

بچوں سر زلف تو گردید پریشان دل من  
یک سر مونک شادی گرہ از مشکل من  
بے تکلف گرد یاد وادی غم گشتہ ام بہر نفس شوم سرگردان عالم گشتہ ام  
یگذشت ز حد قصہ درد و الم ما  
عشق آمد و گرفت ز سر تا قدم ما

**وفائی اصفہانی** کچھ عرصہ تک کشمیر میں رہا پھر لاہور آکر زمین خاں کو کہہ کے ہاں رہنے لگا۔

در دل نیم شبہاں کوب کہ چوں روز شو  
ہمہ در ہا بکشاید و درشس بر بندند  
قحط و قاست پس کہ نکو یاں روزگار  
خوانی نہند و خوں دل میہاں خوردند

یہ میرزا بر خورد و از خاک عالم ولد ہمد م بیگ کا تخلص ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مشہور امیر تھا۔ بہادری  
**ہمدی** اور نیکی میں اس کی بہت شہرت رہی ہے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

دل من میں دہر سوتا زہ داغی از جنوں دردی  
محیط محنت است و ہر طرف گرداب خوں دردی

آصفی کی غزل کا مطلع ہے:

قاتل من چشم می بندد دم یسمل مرا  
تا بماند حسرت دیدار او در دل مرا

اس کے رنگ میں بادشاہ کے حکم سے اس نے کہا:

آمد و یگذشت از دل تیر آں قاتل مرا  
ماند تا روز قیامت داغ او در دل مرا

جس زمانہ میں یہ غزل آگرہ میں محفلوں کی چیز بنی ہوئی تھی، شیخ فیضی نے اسی رنگ میں کہا تھا:

پا برو بگذار اے فتاکل دم بمل مرا  
تا بایں تقریب پا بوسی شود حاصل مرا

فیضی نے ان دونوں اپنے دیوان میں سے اس طرز کی غزلیں نکال نکال کر مقبول عام بنانے کی کوشش کی تھی۔ یہ شیخ جامی کی اولاد میں سے ہیں۔ نہایت متقی اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

ہجری

رباعی:

اے گل کہ نمی رسد بدامان تو دوست  
بر نام تو عاشقیم و بر بوئے تو مست  
ایں طرفہ کہ حاضری و غائب زمیں  
پنهانی و ظاہر از تو ہر چیز کہ هست

سحر نوائی طرب زن کہ شوق انگیز است      انیس محاس گل بلسل سحر خیز است  
ہمائے سدرہ نشیں شوز اوج دولت عشق      کہ باغ و منظر ایں وہ کدویت آمیز است  
دہان ز درد معاصی باب تو بہ بشوی      کہ رفت عمر بہ بھیاں و وقت پر ہیز است  
بہ پوش جوش طاعت کہ در کمینگہ عمر      بدست رہزن ایام تیغ خوں ریز است  
مساز قصر امدت دریں رباط دو در      کہ فتنہ رخنے گہ و صرصر اجل تیز است  
بحسن نظم حسن ہجری از طریق کمال      مرید عارف شیرانہ و پیر تبریز است

خوش است موسم ولے خاصہ در بہار شباب      گل نشاط اگر بہ شگفتہ ز جام شراب

خوش آں شبی کہ سر کوئے ویر منزل بود

فروغ طلعت ساقی چراغ محفل بود

نیم وصل و لا رام زندگی بخشید

و گرنہ زیستن از دست ہجر مشکل بود

سحر کہ وقت گل و حبس و شقائق بود      ہماں فاختہ پر نکتہ حقائق بود

مراہ کوئے رسوائی سرائے است

درے افتادہ دیوارے شکستہ

دی ہوائے حرم و عزم گلستاں کردم      رنم و طوف سہرا پر دہ حبا ناں کردم

گل مگر از نعل یار بہ گلزار آمد کہ ز گل بوئے خوش پیرہن یار آمد  
باز دل آشفته چشماں سحر انگیز کیست باز زنجیر جنونم زلف عنبر بیز کیست

انداں تا مہرباں ترسم خلل در کار جاں افتد

مبادا سچ کس را دلبرے تا مہرباں افتد

من کیم افتادہ بر خاک و در شہ بے چارہ نامرادی بے کسی از خان ماں آوارہ

اے دل آوارہ بر خاک درش جا کر دے نیک جانی از برائی خویش پیدا کر دے

گر ترا ہست بہ یارباں وفادار مری بوفایت کہ ز من نیست وفادار تری

طلب گار وصال گشتہ عمرے جستجو کردم

میسر حوں نہ شد وصال بھجران تو خود کردم

محمد ہاشم کا ذکر میرم خاں خاں خاں کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ یہ مولینا شاہ محمد انسی کا بھتیجا ہے۔ کبھی سمائی اور کبھی دانی تخلص کرتا تھا۔ آخر اسی تخلص پر وفات پائی۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔

ہاشم  
رباعی:

گویا ز سر و قامت او یاد می کنی

نہ می کنی مرا و نہ آزاد می کنی

بیائے بد گل بہ نشینم و از دیدہ خوں ریزم

کہ در بزم تو این خونابہ را از دل بروں ریزم

برود آبروئے خویش تن بر خاک چوں ریزم

ز اشک دانہ دانہ دمیدم تخم جنوں ریزم

مشرک ارغوانی از نواسے ارغنون ریزم

مردم چشم من است غرقہ بخون جگر

شیدائی آں دوزلف عنبر سایم

عمر لیت کہ من ہلاک این سودایم

قمری بیباغ بیرہہ سر یاد چہ کنی

کنجشک وار بستہ دام تو گشتہ ام

روم در باغ بے لدی تو اشک لالہ گوں ریزم

دو نم چوں صراحی خوں شد از اندوہ و می خواہم

بجز خاک درت جائے نہ ریزم اشک از دیدہ

بیاد روئے گندم گوں او در مزرع سودا

صراحی دار ہاشم دمیدم از غزل می گویش

عکس نہ در می فلند خالی تو اے سیم بر

اے زلف تو زنجیر دل شیدا یم

گفتی کہ ہلاک شو بسودائی غم

رباعی:

ہم بیان کر آئے ہیں کہ اس کی ایک غزل خاں خاں خاں میرم خاں نے ایک لاکھ تئکہ میں خریدی تھی۔

من کیستم جنان دل از دست دادم

وز دست دل براہ غم از چافتادہ

اس کا انتقال لاہور میں ۱۹۷۲ء میں ہوا۔

# خاتمہ

یہ ان چند شاعروں کا تذکرہ تھا جن میں سے اکثر مؤلف کے ہم عصر ہیں اور ان کے اشعار دیوان مشہور اور بن زد عام ہیں۔

جن شاعروں کا ذکر اس انتخاب میں نہیں آیا ان کے تذکرہ کی ذمہ داری بعد میں آنے والوں پر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ بہت دراز ہے اور کسی ایک زمانہ میں اس کا احاطہ کرنا محال ہے۔

دہ بیستم جسگر کرد روزی کباب کہ می گفت گویندہ بار باب  
بساتیرودی ماہ و اردی بہشت بیاید کہ ما خاک با شیم و خشت  
کسانیکہ از ما غیب اندر اند بیایند و بر خاک ما بگذرند

میرے اس سودا کی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانہ کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنوں کے ہر قطرہ کو صفحہ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زارخ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ بہر حال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا

مراتو محمد شکن خواندہ و می ترسم

کہ باتو روز قیامت ہمیں عتاب رود

لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شریعہ میں کی حمایت اور دین متین کی طرف داری میں ہے۔ میرا حال اس شخص کے بالکل مشابہ ہے کہ ایک گنوا آدمی ایک محفل میں پہنچا۔ وہاں دسترخوان بچھا ہوا دیکھا تو بے محابا ٹوٹ پڑا اور کھانے لگا۔ سارے تھال اپنے سامنے سمیٹ کر رکھ لیے۔ کسی نے پوچھا "بابا تم کون ہو اور اس زیادتی کا کیا مطلب؟" کہنے لگا "میں ترک ہوں اور دار و فر کا لوگر اور بھوکا ہوں۔" اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا دروہی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں تو ان لوگوں پر فدا ہو جاؤں جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کر دیں ورنہ وہ شرم سے گریبان میں اپنا منہ چھپالیں۔

اصل میں دیکھا جائے کہ میرا یہ بلند پرواز تیز منقار قلم تو قیامت کے "دابۃ الارض" کی طرح ہے جو اس آخری زمانہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ مسلم وہ کافر کا نشان لگاتا گیا اور کسی کو رحمت سے اور کسی کو لعنت سے سرفراز کرتا رہا حضور اکرمؐ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔ صاحب مرصاد العبادہؒ نے چار سو سال پہلے ہی بڑے درد سے کہا تھا۔

شاہاں جہاں بجملگی بہ شتائید  
تا بو کہ بقیہ ز دین دریا بید  
اسلام ز دست رفت پس بے خبرید  
بگرفت جہاں کفر و شما در خوابید

ارباب تصنیف و تالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی برائی کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں اور کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف کو منسوب کر کے اپنی اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی طبع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کر سکیں۔

اگر شراب خوری جو عہ فشاں بر خاک  
ازاں گناہ کہ نفی رسد بغیر چہ پاک

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ املا و انشاء کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ صاحب اقتدار کی خوشامدیا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنا پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات و حشویات کو خیرات و حسنات جملانے میں باک نہیں رکھتا۔

اُولَئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوْا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَیَحْتُ رِیْجًا رَ تَهُمْ

یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے میں نے کہ میں ان معاملات سے بخوبی واقف ہوں بلکہ اس کو رکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، قلمبند کر دوں۔

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

تاکہ میری سابقہ بیروہ نگاری کا کفارہ ہو جائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔

مگر صاحب دلے روزی ہمت  
کند در کار این مسکین دعائے

مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چند معلومات درج کر دی گئی ہیں۔ اس لیے اس پر تصنیف یا تالیف کے وزنی نام کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ لاف گزاف



شرقاء کی سیرت کے معارض ہے مجھے تو اپنی اس نگارش پر شرم سی آرہی ہے۔ فخر و مباہات کا کیا موقع اور اگر میں بلند پروازی سے بھی کام لیتا تو کیا ہوتا۔ یہ کھوٹی اور بے قیمت متاع میرے دعوے کے جھٹلانے کے لیے بہت کافی ہے۔

روہی گفت با شتر کہ عمو  
از کجا میرسی تو راست بگو  
می رسم گفت ایں کہ از حمام  
شستہ ام ز آب گرم و سرد اندام  
گفت آری کہ شاید اینت  
بس بود دست و پائے چو کینت  
اب بس دعا اور مناجات کا موقع ہے اور بس

خندے جہاں را ہزاراں سپاس

کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

میرے پیش نظر تھا کہ اس شیرازہ میں کشمیر کی تاریخ اور سلاطین گجرات، بنگالہ و سندھ کے حالات اور ہندوستان کے عجائب و غرائب کا ذکر بھی شامل کر دیتا لیکن کہاں وہ تذکرے اور کہاں یہ مجموعہ، دونوں میں کوئی نسبت نہیں؛ قالین میں ٹاٹ کا پیوند۔ ریشم میں ریشم ہی کا بخیہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بروز جمعہ ۲۳ ماہ جمادی الثانی نکتہ کو اپنے رہوارِ قلم کی ہالیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھا گیا، اس پر اکتفا کر لیا۔ بطور تہنیت یہ قطعہ تاریخ کما گیا ہے:

فکر لشکر کہ با تمام رسید  
منتخب از کرم ربانی  
سال تاریخ ز دل جتم گفت  
انتخابی کہ ندارد ثانی

۱۔ لفظ انتخاب سے لکھنا نہ نکلتا ہے۔ اگر اس لفظ انتخابی میں سے دو سر ا حرف "ی" نکال دیا جائے تو نکلتا نکلتا ہے۔

# مصنف کے حالات

منتخب التواریخ کے مصنف کا نام عبدالقادر ابن ملوک شاہ بدایونی ہے۔ سخنوری اور حقیقت بیانی میں خاص طور سے تاریخ گوئی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ تخلص قادری تھا۔

مولف کی ولادت ۹۴۷ھ میں ہوئی۔ یہ تاریخ مصنف کے اس بیان سے نکلتی ہے جو اسی کتاب میں درج ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کی عمر میں بیٹھا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا گیا، اس کی ولادت یساور میں ہوئی ہے۔  
دوسری ایک عبارت جلد اول میں ہے کہ اس منتخب کا جامع ان دنوں (۹۶۱ھ) میں اپنے والد مرحوم کے ہمراہ بارہ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔

مولف نے اسلم شاہ کے عہد میں میرسید محمد کی کے پاس قرآن پڑھا تھا، جس کا ذکر اس نے جلد دوم میں کیا ہے۔ ”میرسید محمد کی سات قرأتوں کے قاری تھے۔ میں نے سنبھل میں ان کے ہاں قرآن کی تلاوت درست کی تھی۔“  
عربی علوم کی تحصیل اس نے اپنے نانا مخدوم اشرف کے پاس کی۔ اس کے والد ۹۶۸ھ میں ۲۷ رجب کو آگرہ میں اسہال کے عارضہ میں فوت ہوئے۔ ان کی لاش یساور لے جا کر دفن کی گئی۔

۹۶۸ھ میں بارہ سال کی عمر میں اس نے شیخ میاں حاتم سنبھلی کے ہاں قصیدہ بردہ شریف اور فقہ کی کتاب کنز چند سبق پڑھے اور خود بقول مصنف اس نے بہت سے علوم کی تحصیل شیخ مبارک ناگوری سے کی۔ مصنف کے ہم سبق اور دوستوں میں میر خیاث الدین بھی تھا۔ جس کا لقب لقیب خاں تھا۔

۹۷۵ھ میں عبدالقادر کی شادی بدایوں میں ہوئی۔

اکبر کے ہاں سلسلہ ملازمت ۹۸۱ھ سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ جلد دوم میں ذکر ہے کہ مصنف حسین خاں کی سرکار سے قطع تعلق کو کے بدایوں سے آگاہ آیا اور جلال خاں قوری اور حکیم عین الملک کے وسیلہ سے بادشاہ کے ہاں بار آیا ہوا۔ اکبر نے اس موقع پر کہا تھا: ”یہ بدایونی عالم حاجا ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا۔“ اسی زمانہ میں شیخ مبارک کا بیٹا شیخ ابوالفضل بھی بارگاہ خسروی میں باریاب ہوا تھا۔

ماہ رمضان ۹۸۷ھ میں قاضی علی کی کوششوں سے مصنف کے نام ہزار میگھہ اراضی کی مدد و معاش منظور کی گئی۔  
ملاح عبدالقادر بدایونی و مبارکی کتابوں کے ترجمہ اور تصنیف و تالیف کے کاموں اور کتابوں کے انتخاب پر مامور تھے۔ انہیں سے ایک کتاب اتر بن وید ہے جس کے ترجمے کا مصنف کو حکم دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اس کا خاطر خواہ ترجمہ نہ کر سکے۔

اور یہ کام فیضی کے سپرد کر دیا گیا۔

ان کی دوسری کتاب "الاحادیث" ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلہ کی چالیس حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ تیسری تاریخ الفی ہے جس کی تصنیف پر سات آدمیوں کو اکبر نے مقرر کیا تھا۔ جس میں سے ایک ملا عبدالقادر بھی تھے۔

چوتھی کتاب مہا بھارت کا ترجمہ ہے جس کا نام رزم نامہ رکھا گیا ہے جسے عبدالقادر نے نقیب خاں کے ساتھ مل کر مرتب کیا۔

پانچویں کتاب رامائن ہے۔ جس کا ترجمہ ملا صاحب نے ۹۹۷ھ میں چار سال میں کیا۔ چھٹی کتاب جامع رشیدی ہے جسے حسب الحکم علامی شیخ ابوالفضل کے مشورہ سے ترجمہ کیا۔ ساتویں کتاب بحر الاسماء ہے جو کشمیر کی تاریخ ہے۔ اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا، لیکن بہت کچھ اوصد ارہ گیا تھا جس کی تکمیل حسب الحکم ملا صاحب نے کی۔ آٹھویں کتاب نجات الرشید ہے۔

نویں کتاب انتخاب تاریخ کشمیر ہے جو حسب الحکم بادشاہی تالیف کی گئی۔ دسویں کتاب معجم البلدان کے دس جزو کا ترجمہ جو عربی سے فارسی میں کیا گیا۔ گیارھویں تصنیف یہ کتاب منتخب التواریخ ہے، جو تین جلدوں میں ہے۔

ملا عبدالقادر بایونی معقولات و منقولات دونوں طرح کے علوم کے فاضل تھے۔ عربی اور فارسی کے اچھے انشا پر دانہ تھے۔ نجوم، حساب اور ولایتی اور ہندی راگ ناگنیوں سے بھی واقف تھے۔

اپنی اس تاریخ میں انھوں نے عہد اکبری کے چالیس سالہ واقعات کو جمع کیا ہے اور اس تصنیف کو اپنی زندگی تک چھپائے رکھا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں جب اس کا چرچا ہوا تو جہانگیر نے ان کے بچوں کو بلا کر عتاب نازل کیا اور باز پرس کی۔ انھوں نے کہا ہم تو چھوٹے تھے میں اس کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ پھر مچکھ مکھ کر دیا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے سزاوار ہوں گے۔

اس کتاب کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ نظامی ہے۔ آخر دو سال کے حالات خود مصنف نے جمع کیے ہیں۔ ملا قادری کو تاریخ گوئی میں بڑی مہارت تھی۔

ملا صاحب کو چونکہ میر سید محمد جون پوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے محبت و عقیدت تھی اسی لیے لوگ انہیں بھی ہندی ہونے کا الزام لگاتے ہیں۔



# مسلم شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا

تاریخ اسلام کے آئینے میں نامور شخصیتوں کا تعارف

حضرت آدمؑ سے لے کر حضور سرکارِ دو عالم ﷺ تک اور پھر اس کے بعد کے دورِ خلافت سے حضرت امام حسینؑ تک کے حالات پر مکمل انسائیکلو پیڈیا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شخصیتوں کے حالات زندگی اور کارناموں کو تاریخ کے پس منظر میں متعارف کرایا گیا ہے۔ گویا شخصیات کے عہد بہ عہد کی کہانی تاریخ اسلام کے دور کی زبانی!

اس موضوع پر آج تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ یہ روشن کتابوں کے سلسلہ میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مترجم: ایم۔ ایس۔ ناز

کاغذ: سفید

- ۱ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک منصفہ شہود پر آنے والی شخصیات کا مکمل جائزہ
- ۲ زمانہ قبل اسلام سے موجودہ دور تک کا تاریخی پس منظر تاریخ کی نظر میں
- ۳ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات طیبہ اور سیرت مقدمہ کا اجمالی تذکرہ
- ۴ غزوہ بدر کے صحابہ کی تعداد ۳۱۳ نہیں ۳۳۳ تھی۔ قرآن حدیث کی روشنی میں اصحاب بدر کا تذکرہ
- ۵ ۲ ہجری سے ۱۱ ہجری پر محیط ۴۴ غزوات و سرایا اور ۵۵ مسلم شخصیات کی ایک اہم دستاویز
- ۶ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت، حالات زندگی اور خلافت کا تفصیلی تذکرہ اور جائزہ
- ۷ حضرت عمرؓ کی شخصیت، حالات زندگی اور ان کی خلافت کے سنہری دور کے تفصیلی واقعات
- ۸ حضرت عثمانؓ کی شخصیت، حالات زندگی اور خلافت کے دور کا تفصیلی تذکرہ تاریخ کی روشنی میں
- ۹ حضرت علیؓ کی شخصیت، حالات زندگی اور ان کی خلافت کے سنہری دور کے تفصیلی واقعات
- ۱۰ فضیلت صحابہ اکرامؓ انصارِ مہاجرین کا تذکرہ اور ۳۷ صحابہ اکرامؓ کے حالات زندگی اور کارنامے
- ۱۱ حضرت عمرو بن العاصؓ ابویوب انصاریؓ سے عمیر بن سعدؓ کے حالات زندگی اور کارناموں کی سرگزشت
- ۱۲ انسائیکلو پیڈیا کے ۱۲ اقساط میں پیش کی جانے والی شخصیات کا اشاریہ اور ۱۲۴ اہل کتاب اصحاب کے حالات
- ۱۳ حضرت امام حسینؑ اور ان کے عہد کی پوری تفصیل تاریخ اسلام کے حوالے سے
- ۱۴ خلافت راشدہ دور امیہ سے امیر معاویہؓ تک کے تاریخی اور دستاویزی حالات
- ۱۵ سیدنا امام حسینؑ کے حالات زندگی واقع میدانِ کربلا اور اس کے پس منظر پر اہم تاریخی دستاویز

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

199- سرکلر روڈ - چوک انارکلی - لاہور 54000



e-mail: niazasad@hotmail.com

www.ghulamali.com.pk

کراچی  
Tel: 2722784  
Tel: 2723092

حیدرآباد  
Tel: 022-3641831

لاہور  
Tel: 7323951  
Tel: 7352908  
Fax: 042-6315478